تفسیر نعیمی

مفسر
حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر
نعیمی کتب خانہ
مفتی احمد یار خان روڈ چوک پاکستان، گجرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پنجتن پاک

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

• حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ • حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ • حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ • حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

• حضرت جبرائیل علیہ السلام • حضرت میکائیل علیہ السلام • حضرت اسرافیل علیہ السلام • حضرت عزرائیل علیہ السلام

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

• حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ • حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا • حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ • حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ
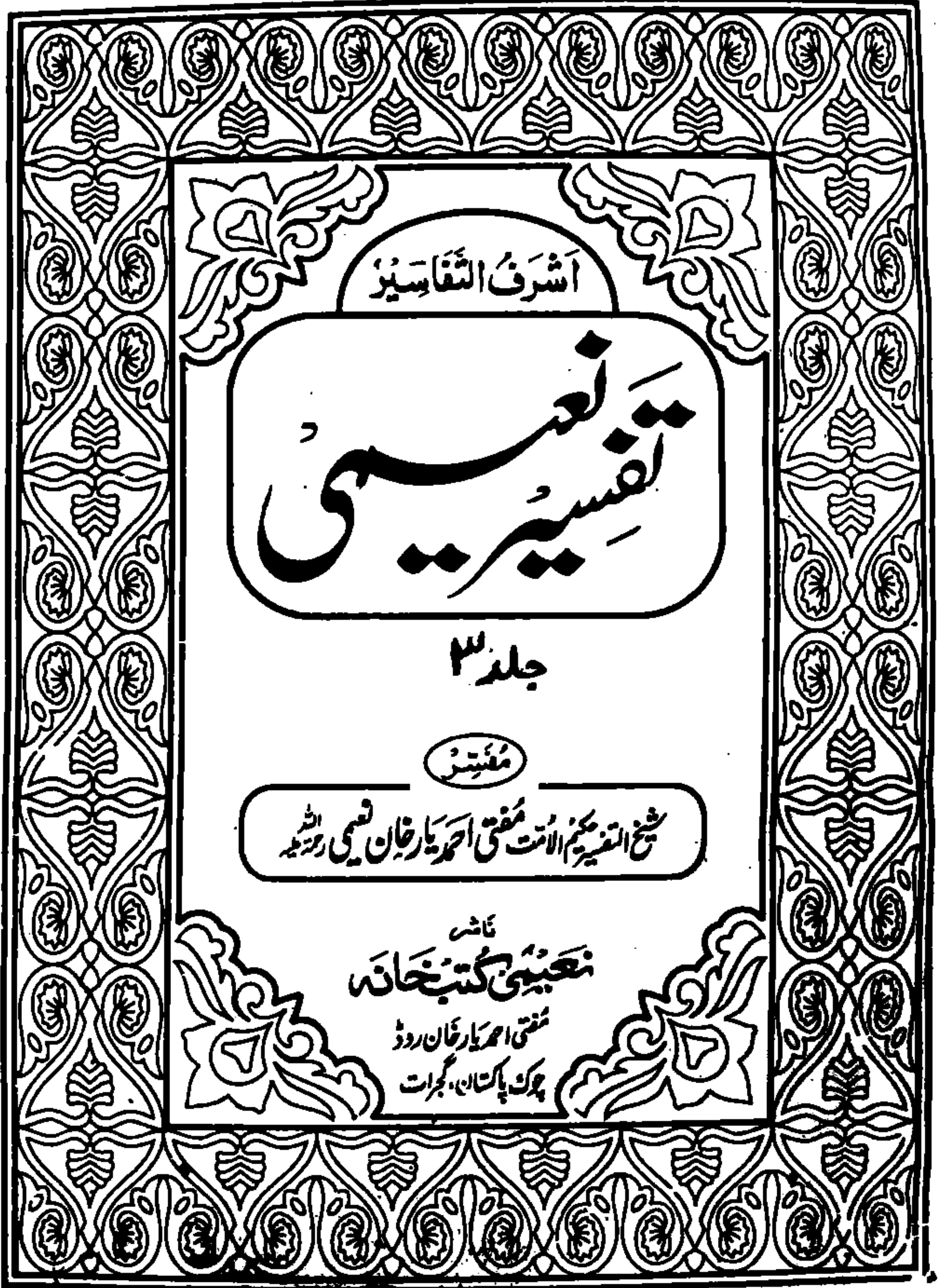
اَشرفُ التَّفاسِیرُ

تفسیرِ نعیمی

جلد ۳

مُفسّر

شیخ التفسیر حکیم الاُمت مُفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر
نعیمی کُتب خانہ
مُفتی احمد یار خان روڈ
چوک پاکستان، گجرات

کتاب	تفسیر نعیمی پارہ سوم
مصنف	حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	نعیمی کتب خانہ مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات
تعداد	گیارہ سو
سال اشاعت	2002ء
ہدیہ	

تقسیم کار

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا گنج بخش روڈ، لاہور۔فون:۔7221953

فیکس:۔7238010

فہرست مضامین تفسیر نعیمی جلد سوم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ۘ مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ
یہ پیغمبر ہیں کہ بزرگی دی ہم نے بعض کو ان میں سے اوپر بعض کے ان میں سے وہ ہیں کہ کلام فرمایا اللہ
یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک دوسرے پر افضل کیا ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا
وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ
نے اور بلند کیا بعض کو ان میں سے درجوں اور دیں ہم نے عیسیٰ بیٹے مریم کو کھلی نشانیاں
اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں
وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ ؕ
اور تائید کی ہم نے ان کی ساتھ روح پاکیزہ کے
دیں اور پاکیزہ روح سے اس کی مدد کی

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** گذشتہ آیتوں میں پچھلے پیغمبروں کے مختلف واقعات بیان ہوئے کہ کسی نے کعبہ بنایا' کسی نے رب سے کلام کیا۔ کسی نے کفار سے جہاد کیا۔ جس سے پتہ لگا کہ حضرات انبیاء کرام کے کام مختلف رہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ جیسے ان سب کے کام یکساں نہیں ایسے ہی ان کے درجات بھی یکساں نہیں تو گویا یہ آیت کریمہ گذشتہ آیتوں کا نتیجہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ اے محبوب ﷺ آپ مرسلین میں سے ہیں جس سے وہم ہوتا تھا۔ کہ سارے پیغمبر یکساں ہیں۔ اور نبی آخر الزماں ﷺ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ اب یہ وہم دور فرمایا جا رہا ہے کہ نہیں ان میں فرق مراتب ہے۔ اور آپ سب سے افضل ہیں۔

تفسیر

تِلۡكَ اسم اشارہ ہے۔ اس سے یا تو ان پیغمبروں کی طرف اشارہ ہے جن کے واقعات پہلے گزر چکے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم اور داؤد و اسمٰعیل علیہم السلام یا ان پیغمبروں کی طرف اشارہ ہے۔ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم میں ہے چونکہ ان کا زمانہ حضور علیہ السلام سے بہت دور تھا۔ نیز وہ حضرات بڑے درجے والے ہیں۔ اس لئے تِلۡكَ اشارہ بعید فرمایا گیا۔ خیال رہے کہ قرآن مجید میں صراحۃً تمام پیغمبروں کا ذکر نہیں۔ صرف بعض کا ہے۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ مِنۡهُمۡ مَنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَمِنۡهُمۡ مَنۡ لَمۡ نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ (مومن:۷۸) یعنی ہم نے قرآن میں بعض رسولوں کا ذکر کیا اور بعض کا نہ کیا۔ لیکن حضور کو علم سارے ہی پیغمبروں کا دیا گیا۔ بلکہ معراج میں سارے پیغمبر دکھائے گئے۔ رب فرماتا ہے وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ (ہود:۱۲۰) اس آیت کریمہ [illegible] علاوہ اور وحی وکلام میں ہم نے تمام

رسولوں کے قصے آپ کو سنا دیئے۔ ان دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں لہٰذا اگر یہاں تِلْکَ الرُّسُلُ سے وہ انبیاء ورسول مراد ہوں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ تو بعض رسول ہوں گے اور اگر وہ رسل مراد ہوں جو حضور کے علم میں ہیں۔ تو سارے رسول مراد ہوں گے اَلرُّسُلُ یہ رسول کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں۔ قاصد اصطلاح میں رسول وہ باکمال مرد ہیں۔ جو رب کی طرف سے تبلیغ کے لئے بھیجے گئے۔ اور ان کے ساتھ کوئی نئی یا پرانی آسمانی کتاب بھی ہو؟ نبی میں کتاب کی قید نہیں لہٰذا ہر رسول نبی ہے۔ اور ہر نبی رسول نہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱۲۴۰۰۰) یا کم و بیش ہیں۔ اور رسول تین سو تیرہ (۳۱۳) مگر کبھی رسول بمعنی نبی بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں ایسا ہی ہے۔ خیال رہے کہ رسول لغوی معنی سے فرشتے بھی ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ (فاطر:۱) اور فرماتا ہے اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا مِّنَ النَّاسِ (حج:۷۵) مگر شرعی معنی سے رسول صرف انسان ہیں۔ یعنی مبعوث مِنَ اللّٰهِ لِلتَّبْلِیْغِ صرف انسان ہی رسول ہوئے۔ حضرت جبرائیل وغیرہ علیہم السلام نہ کسی قوم کے مبلغ ہوئے نہ کوئی قوم ان کی امت ہوئی۔ قرآن کریم میں جب رسول مطلق ہوتا ہے تو اس سے شرعی رسول یعنی انسان پیغمبر مراد ہوتے ہیں۔ جیسے رجل سے مراد صرف انسان مرد ہیں۔ اگرچہ جنات کو رجال فرمایا گیا ہے۔ بہر حال مِنَ الْجِنِّ رب فرماتا ہے۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ: ۲۸۵) لہٰذا یہاں انسان رسول مراد ہیں۔ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یہ تفضیل سے بنا جس کا مادہ فضل ہے۔ بمعنی بزرگی تفضیل فضیلت عطاء کرنے یا کسی وصف خصوصی میں ممتاز کرنے کو کہتے ہیں۔ یا تو تِلْکَ الرُّسُلُ مبتدا تھا۔ اور یہ اس کی خبر یا مبتدا اور رُسُلُ اسی جملہ سے مل کر خبر یعنی یہ وہ رسول ہیں جن میں بعض کو بعض سے ہم نے بزرگی دی۔ اور خاص صفتوں سے ممتاز فرمایا۔ یا یہ انبیاء مذکورین بعض بعض سے افضل ہیں۔ خیال رہے کہ یہ فرق نبوت کے سوا دیگر اوصاف میں ہے نبوت میں سب یکساں ہیں۔ اسی لئے تِلْکَ الرُّسُلُ میں سب کو شامل فرما کر فرق مراتب بیان فرمایا گیا رسول وہ ہی ہو سکتا ہے جو بھیجنے والے سے لے سکے اور جس کی طرف بھیجا گیا ہے اسے دے سکے کہ اس کے بغیر رسالت ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی نسبت بھیجنے والے سے کی جاتی ہے اور جس کی طرف بھیجا گیا اس سے بھی۔ حضور اللہ کے بھی رسول ہیں یعنی اس سے لینے والے اور ہمارے بھی رسول یعنی ہم کو دینے والے جو کہے رسول کچھ نہیں دیتے وہ درحقیقت ان کی رسالت کا انکار کر رہا ہے۔ ایسے ہی جو کہے اللہ نے رسول کو کچھ نہ دیا وہ بھی ان کی رسالت کا منکر ہے۔ جب ان میں رب سے لینے ہم کو دینے کی طاقت نہیں تو وہ رسول کیوں کہلائے۔ خلق اور خالق میں رشتہ قائم کرنے والے رسول ہی تو ہیں۔ ورنہ خلق تو خالق سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ پھر جیسے رب تعالیٰ نے آسمان کے تارے زمین کی تاثیریں اور دیگر تمام مخلوق میں فرق مراتب رکھا۔ تاروں کی روشنیاں اور رنگ مختلف صفات الٰہیہ کے مظہر ہیں۔ اسی اجمال کی کچھ تفصیل یہ ہے۔ کہ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ اس ضمیر کا مرجع رُسُل ہیں كَلَّمَ کلام سے بنا کلام بامعنی منظوم الفاظ کا نام ہے۔ بندہ سے رب کا کلام چند طرح ہوتا ہے۔ ایک دل میں ڈال کر جسے وحی خفی کہتے ہیں۔ ایک حجاب کے پیچھے سے۔ ایک بواسطہ ایک بلا واسطہ ظاہر ہو کر اس کا ذکر سورہ شوریٰ میں بھی ہے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ الخ (شوریٰ:۵۱) یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی پس پردہ بلا واسطہ فرشتہ کلام فرمانا۔ اور مَنْ سے موسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے۔ رب نے ان سے کوہ طور پر بلا واسطہ فرشتہ کلام کیا۔

اسی لئے انہیں کلیم اللہ کہا جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے کلام قدیم بغیر حروف اور آواز کے سنا۔ جس کی کیفیت ہماری عقل سے بالاتر ہے۔ امام اشعری فرماتے ہیں کہ سنا تو کلام ازلی ہی مگر حروف اور آواز سے (روح البیان) اس کلام کی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو بیچ میں سکتہ ہوتا تھا۔ جیسا کہ ہم سانس لے لے کر کلام کرتے ہیں۔ اور نہ اس کے لئے کوئی جہت تھی۔ بلکہ ہر طرف سے ندا آ رہی تھی۔ اور صرف کان سے ہی نہ سنا۔ بلکہ ہمہ تن گوش ہو کر مگر معراج میں ہمارے نبی ﷺ سے چوتھی قسم کا کلام ہوا۔ ﷺ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ رفع کے معنی اٹھانا بلند کرنا اور نیچے سے اوپر پہنچانا ہیں۔ جہاں اس کے بعد علی یا الی ہو تو اس سے رفع مکانی یعنی اٹھانا یا نیچے سے اوپر پہنچانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَی الْعَرْشِ (یوسف: ۱۰۰) یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھالیا۔ اور بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (النساء: ۱۵۸) رب نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف یعنی آسمان پر اٹھالیا۔ اور اگر رفع کا مفعول کوئی جسم ہو۔ تو اس کے معنی اونچا کرنا یا بلند کرنا ہوتے ہیں۔ جیسے وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ (بقرہ: ۱۲۷) حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام بیت اللہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔ یعنی اونچی کر رہے تھے۔ اور جہاں یہ کوئی چیز نہ ہو۔ وہاں رفع سے بلندی مراتب اور شرف مراد ہوتا ہے یہاں یہ معنی مراد ہیں بَعْضَهُمْ سے ہمارے نبی ﷺ مقصود ہیں۔ ابہاماً اشارہ کرنے میں اعلیٰ درجہ کی اظہار شان ہے۔ جیسا کہ ذوق والوں پر ظاہر ہے درجۃ کی جمع ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں۔ زینہ کی سیڑھیاں مگر اصطلاح میں مراتب و فضائل کو درجات کہا جاتا ہے۔ جس میں کوئی ترقی کرے۔ یہاں تو فی پوشیدہ ہے۔ اور یہ رَفَعَ کا ظرف ہے۔ یا باب مقدر یا من محذوف یا بعضہم کی تمیز خیال رہے کہ درجات کی جمع کثرت کی طرف اور اس کی تنکیر عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یعنی بے شمار اور عظیم الشان درجوں میں بلند کیا۔ درجات کی سکر و جمع سے معلوم ہوا کہ دائرہ عبدیت میں رہ کر جس قدر بلندی درجات دی جا سکتی ہے۔ وہ سب حضور کو عطا فرما دی گئی۔ کوئی درجہ ایسا نہیں جو حضور کو عطا نہ فرمایا گیا ہو۔ حضور انور عبدیت کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔ کہ آپ کے بعد صرف الوہیت کا درجہ ہے۔ کیونکہ یہاں درجات سے قید ارشاد ہوا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل کے پہلے صاحب شریعت پیغمبر موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور ان کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس لئے حضور علیہ السلام کا ذکر ان عظیم الشان پیغمبروں کے درمیان کرنے کے لئے فرمایا۔ وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ بغیر والد پیدا ہوئے اور ابہاماً بیان کرنے میں ان کا یہ وصف ظاہر نہ ہوتا۔ لہٰذا صراحتاً ان کا اسم شریف بیان ہوا۔ آپ کا نام بزبان عبرانی یسوع تھا۔ بمعنی مخلص مریم اسی زبان کا لفظ ہے۔ بمعنی خادمہ ہر جگہ انہیں ابن مریم فرمانے سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ صرف والدہ سے پیدا ہوئے۔ خیال رہے کہ اسے بھی ابن کہتے ہیں۔ جو اپنے نطفہ سے پیدا ہو۔ اور اسے بھی ابن کہا جاتا ہے جو کسی کے بطن سے اس کا مثل خارج ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام دوسرے معنی سے ابن مریم ہیں نہ کہ پہلے معنی سے کیونکہ وہاں نطفہ تھا ہی نہیں اور حضرت حوا کسی لحاظ سے آدم علیہ السلام کی بیٹی نہیں کہ نہ تو ان کے نطفہ سے پیدا ہوئیں۔ اور نہ ان کے بطن شریف سے خارج ہوئیں۔ بلکہ ان کی ایک پسلی علیحدہ کر کے سیدہ حوا کا قالب تیار کیا گیا۔ بَیِّنٰتٌ بینہ کی جمع ہے۔ بمعنی کھلی دلیل چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو بہت سے معجزات عطا فرمائے گئے۔ اس لئے بینات جمع ارشاد ہوا۔ وَاَیَّدْنٰهُ یہ لفظ اید سے بنا بمعنی قوت ہے لئے رائے شامل کرنے کو تائید کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلی

رائے کو قوت ملتی ہے۔ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یہاں موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے روح حضرت جبرائیل علیہ السلام کا نام ہے۔ کیونکہ ان سے زندگی ملتی ہے۔ انہیں کے گھوڑے کی ٹاپ کی خاک سامری کے بچھڑے کے منہ میں پہنچی تو اسے زندگی بخش دی۔ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش انہیں کی سانس سے ہوئی تھی۔ اس لئے آپ کے ساتھ ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ نیز وحی لانے والے جبرائیل ہی ہیں۔ اور وحی بھی روح ہے جس سے ایمان کی زندگی ہے۔ رب فرماتا ہے۔ كَذٰلِكَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحاً مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ: ۵۲) انہیں کہا جاتا ہے۔ قدس بمعنی بزرگ جیسے کہا جاتا ہے۔ رَجُلُ صِدْقٍ بعض علماء نے فرمایا۔ کہ قدس سے رب تعالیٰ مراد ہے اور اس کی طرف روح کی اضافت تشریفی ہے۔ جیسے بیت اللہ (روح البیان)

یعنی ہم نے بذریعہ جبرائیل عیسیٰ علیہ السلام کو قوت دی کہ انہی کی سانس سے انہیں پیدا فرمایا۔ اور انہی کے ذریعہ سے حضرت کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھا کہ حضرت جبرائیل امین ہر وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے۔ جیسے سلطان کے ساتھ ان کے باڈی گارڈ یا خاص خدام۔ اور آخر کار یہود نے آپ کو شہید کرنا چاہا۔ تو انہی کے ذریعہ انہیں آسمان پر بلایا گیا۔ ان وجوہ سے صرف عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا۔ ورنہ حضرت جبرائیل امین سارے ہی نبیوں کے معاون و مددگار ہیں۔ سب پر وہ ہی وحی لاتے تھے۔ اور ان کی خدمات انجام دیتے تھے۔ اور ہوسکتا ہے کہ روح القدس سے مراد حضور ﷺ ہوں۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے حضور ﷺ کو روح القدس ہی فرمایا کہ میں جاتا ہوں تاکہ روح القدس آئے اگر میں نہ جاؤں تو وہ نہ آئے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں'' (برنباس) اور ظاہر ہے کہ حضور ہی کی طفیل ان کی والدہ ماجدہ کنواری بتول مریم کی عصمت کے خطبے پڑھے گئے۔ اور ان کی حقانیت کا دنیا نے اقرار کیا ورنہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر دیا تھا۔ اور ان کی والدہ طیبہ طاہرہ کو تہمت لگا دی تھی۔ دنیا والے ان کی نبوت سے مشکوک ہو چکے تھے۔ ان کی نبوت کا اعلان ان کی والدہ ماجدہ کی عصمت کے خطبے فرمائے حتیٰ کہ قرآن شریف میں سوائے بی بی مریم کے کسی عورت کا نام نہ لیا۔ اور حضرت مریم کا نام جگہ جگہ لیا۔ یہاں تک کہ ان کے نام کی ایک سورت یعنی سورۂ مریم قائم فرمائی یہ ہے جناب مسیح کی تائید و تقویت۔ تو معنی ہوئے اللہ کی روح جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا نام شریف ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہ جو رسول مذکور ہوئے یہ فضل و درجات میں یکساں نہیں۔ بلکہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بزرگیاں دیں۔ اور یہ حضرات اپنی خصوصیات و کمالات میں مختلف ہیں۔ ان میں سے بعض یعنی موسیٰ علیہ السلام سے رب نے بلا واسطہ فرشتہ کلام فرمایا۔ اور انہیں کلیم اللہ کا خطاب بخشا۔ اور ان میں سے بعض یعنی محمد ﷺ کو تو بدرجہا بلند و بالا کیا۔ کہ ان کی عظمت اور درجات انسانی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اور وہ سید الانبیاء ہونے میں اس قدر مشہور ہیں کہ ان کے نام پاک لینے کی بھی حاجت نہیں ہر ایک خود بخود ہی سمجھ جاتا ہے کہ اس شان والے حضور ہی ہیں اور بنی اسرائیل کے آخری نبی یعنی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو کھلی ہوئی نشانیاں اور معجزات عطا فرمائے کہ انہیں بغیر باپ پیدا فرمایا۔ انہوں نے مردوں کو زندہ اور مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کیا۔ مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں جان ڈالی۔ غیب کی خبریں دیں۔ انجیل جیسی عظیم الشان کتاب انہیں ملی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روح القدس یعنی جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ ان کی تائید فرمائی گئی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے افضل الانبیاء ہونے کے دلائل

حضور ﷺ تمام پیغمبروں سے افضل ہیں۔ بلکہ بعد خدا آپ ہی کا درجہ ہے۔ اسی پر امت کا اجماع ہے اور اس پر بے شمار دلائل عقلیہ ونقلیہ قائم ہیں۔ ہم کچھ دلائل تفسیر کبیر وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔ (۱) رب نے اپنے لئے فرمایا رب العالمین اور حضور کے لئے فرمایا وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء: ۱۰۷) یعنی جس کا خدا رب ہے اس کے لئے حضور رحمت ہوئے۔ اور یقیناً رحمت مرحوم سے افضل ہے۔ (۲) رب نے فرمایا وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (الانشراح: ۴) اے محبوب ہم نے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔ چنانچہ کلمہ اذان۔ التحیات بلکہ تقریباً ہر جگہ اپنے نام کے ساتھ حضور کا نام رکھا۔ یہ درجہ کسی پیغمبر کو نہ ملا (۳) رب نے حضور کی اطاعت کو اپنی اطاعت حضور کی بیعت کو اپنی بیعت حضور کی عزت کو اپنی عزت حضور کی رضا کو اپنی رضا حضور کی اجابت کو اپنی اجابت قرار دیا۔ کہ فرمایا مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (النساء: ۸۰) اور فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (الفتح: ۱۰) اور فرمایا وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ (منافقون: ۸) اور فرمایا وَاللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْہُ (التوبہ: ۶۲) اور فرمایا۔ اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ۔ (انفال: ۲۴) سارا عالم رب کی رضا چاہتا ہے۔ مگر رب تعالیٰ حضور کی رضا آپ ہی کی خوشی کے لئے کعبہ کو قبلہ بنایا فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبْلَۃً تَرْضٰهَا (بقرہ: ۱۴۴) اور فرمایا وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (الضحیٰ: ۵) کسی پیغمبر کو یہ شرف نہیں ملا (۵) قرآن کریم میں سارے پیغمبروں کو نام لے کر پکارا گیا۔ مگر حضور علیہ السلام کو پیارے پیارے القاب سے یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ۔ یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ۔ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ وغیرہ (۶) حضور کو سب سے زیادہ معجزے ملے۔ کیونکہ قرآن کریم کی آیتیں چھ ہزار (۶۰۰۰) ہیں اور ہر آیت معجزہ۔ تو چھ ہزار معجزے تو یہ ہی ہو گئے۔ اس کے علاوہ آپ خود سرتاپا معجزہ ہیں اس کے علاوہ بیشمار معجزے آپ سے ظاہر ہوئے۔ دیگر انبیاء کرام کو صرف گنتی کے معجزات ملے۔ ان سب میں زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطاء ہوئے۔ یعنی کل نو جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام سب سے افضل ہیں (۷) حضور علیہ السلام کے معجزات تمام پیغمبروں کے معجزات سے افضل اور اعلیٰ ہیں۔ اولاً تو اس لئے کہ ان معجزات کے قصے ہی رہ گئے۔ نہ عصاء سوٹی رہا نہ ید بیضا مگر حضور ﷺ کا بڑا معجزہ یعنی قرآن کریم قیامت تک باقی ہے کہ دنیا آج تک اس کے مقابلہ سے عاجز ہے دوم اس لئے کہ حضور کے معجزات سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے طور پر حجاب میں رب سے کلام کیا۔ مگر حضور نے معراج میں عرش پر بلا حجاب کلام فرمایا۔ عیسیٰ علیہ السلام چہارم آسمان پر بلائے گئے۔ مگر میرے آقا علیہ السلام وہاں پہنچے۔ جہاں نہ کہاں تھا نہ وہاں تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ فرمائے۔ مگر حضور علیہ السلام نے خشک لکڑیوں اور بے جان کنکروں کو زندگی بخش کر اپنا کلمہ پڑھوالیا۔ اور آپ کو شجر وحجر نے سلام کیا۔ جانوروں نے سجدے کئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پتھر سے پانی کے بارہ چشمے جاری فرمائے حضور علیہ السلام نے انگلیوں سے پانی کے چشمے بہا دیئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عصا سے دریا نیل کو پھاڑا۔ میرے شہنشاہ نے انگلی کے اشارے سے چاند چیر دیا وغیرہ وغیرہ (۸) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام صفات انبیاء کے جامع ہیں۔ کہ ہر نبی کے کمالات آپ ﷺ میں موجود ہیں۔ رب فرماتا ہے اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰہُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِہْ

(انعام:۹۰) نہ تو اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اے محبوب آپ اصول دین میں سارے پیغمبروں کی پیروی کیجئے۔ کہ اصول دین میں تقلید ناجائز ہے۔ اور نہ یہ مراد ہے کہ آپ فروع دین میں ان کی اطاعت کریں۔ کیونکہ آپ کا دین تمام دینوں کا ناسخ ہے۔ یہ ہی مطلب ہے کہ آپ ان سب کے اخلاق سے متصف ہو جایئے۔ (۹) سارے پیغمبر خاص خاص جماعتوں کی طرف آئے۔ مگر نبی ﷺ ساری مخلوق کے لئے نبی ہوئے کہ فرمایا گیا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سباء:۲۸) اور فرمایا گیا لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان:۱) اور جس کا رقبہ سلطنت بڑا وہ سلطان بھی عظیم الشان۔

خیال رہے کہ آدم و نوح علیہما السلام ساری مخلوق کے نبی تھے۔ بلکہ اس وقت انسان تھوڑے ہی تھے۔ اس وجہ سے ان تھوڑے انسانوں کے نبی ہوئے۔ (۱۰) حضور کا دین تمام دینوں سے افضل کہ وہ سب کا ناسخ ہے لہٰذا حضور بھی سارے پیغمبروں سے افضل (۱۱) حضور کی امت ساری امتوں سے افضل رب نے فرمایا کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ (آل عمران:۱۱۰) حضور کی بیبیاں تمام عورتوں سے افضل رب نے فرمایا یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب:۳۲) حضور بھی سارے پیغمبروں سے افضل جن کے دم کی یہ ساری بہار ہے۔ (۱۲) حدیث شریف میں ہے کہ قیامت میں آدم و ماسواء آدم حضور کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ آپ ہی اولاد آدم کے سردار ہیں۔ آپ ہی جنت میں سب پیغمبروں سے پہلے تشریف لے جائیں گے۔ آپ کی امت سب امتوں سے پہلے جنت میں داخل ہوگی۔ سب سے پہلے قیامت میں آپ ہی اٹھیں گے۔ جب سب خاموش ہوں گے تو آپ ہی رب سے کلام فرمائیں گے۔ آپ ہی کے ہاتھ میں لواء الحمد ہوگا۔ آپ ہی کو حبیب اللہ کا خطاب ملا۔ آپ ہی شفیع المذنبین ہیں۔ آپ ہی اولین آخرین کے سردار ہیں۔ حضور ہی کو معراج کرائی گئی۔ حضور ہی نے معراج کی شب تمام نبیوں کی امامت کی حضور ہی نے رب کو بلا حجاب دیکھا اور بلا حجاب رب تعالیٰ سے کلام کیا۔ یہ عظمتیں حضور کے سوا کسی کو نہیں ملی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی ○ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی (النجم:۱۳) اور فرماتا ہے فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی (النجم:۱۰) دیدار الٰہی کی بحث ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں ملاحظہ کرو۔ نیز اس آیت میں حضور کی بلندی درجات بغیر کسی قید کے مطلق ارشاد ہوئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ امکانی درجہ جو کسی بندہ کو دیا جاسکتا ہے۔ وہ حضور انور کو عطا فرما دیا گیا۔ حضور انور عبدیت کے اعلیٰ درجہ پر ہیں۔ ایمان۔ تقویٰ۔ ولایت۔ قطبیت۔ غوثیت۔ قرب الٰہی وغیرہ تمام درجے حضور کی منزلیں تھیں۔ جنہیں طے فرماتے ہوئے سرکار اعلیٰ درجہ پر پہنچے۔ جس کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ شعر۔

جو ہوتی خدائی بھی تحت مشیت　　خدا بن کے آتا ہو وہ بندہ خدا کا

(۱۳) حضور فرماتے ہیں۔ کہ چند چیزوں سے ہمیں بزرگی دی گئی۔ (۱۴) سارے عالم کے ہم نبی ہیں۔ (۱۵) ساری زمین ہمارے لئے مسجد اور طہارت گاہ ہے۔ (۱۶) ایک مہینہ کی راہ سے ہمارا رعب قائم کیا گیا۔ (۱۷) ہمارے ہی لئے غنیمتیں حلال ہوئیں۔ (۱۸) ہم ہی کو شفاعت کبریٰ عطا ہوئی۔ (۱۹) ہم ہی پر نبی ختم کئے گئے۔ کہ ہمارے بعد کوئی نیا نبی نہیں آسکتا۔ (۲۰) قاعدہ ہے کہ جتنی بڑی سلطنت اتنا ہی زیادہ سلطان کا خزانہ لشکر اور علم اور انتظام کی قابلیت بڑھ کر آدم علیہ السلام کو علم اسماء عطا ہوا سلیمان علیہ السلام کو جانوروں کی بولیاں بتائی گئیں۔ حالانکہ ان کا رقبہ سلطنت محدود تھا۔ تو جب نبی ﷺ مشرق و مغرب جن و انس کے نبی ہیں۔ تو ضروری ہے کہ آپ کا علم و معرفت اور خزانہ حکمت سب سے زائد ہوں۔ اور آپ کو وہ علوم دیئے گئے

ہوں جو کسی کو نہ ملے۔ اسی لئے رب نے فرمایا فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی اور ظاہر ہے کہ جس کا علم زیادہ اس کا درجہ زیادہ (تفسیر کبیر) (۲۱) حضور علیہ السلام قصر نبوت کی آخری اینٹ اور چمن نبوت کی آخری بہار اور گلشن رسالت کا آخری اور بہترین پھول ہیں۔ یہ خوبیاں کسی پیغمبر کو نہ ملیں' غرضکہ آپ بے مثل خدا کے بے مثل بندے ہیں۔ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** سارے پیغمبر اصل نبوت میں یکساں ہیں۔ جو کوئی بعض کی نبوت اصلی اور بعض کی عارضی یا بروزی یا ظلی مانے وہ کافر ہے۔ جیسے قادیانی اور دیوبندی جیسا کہ تِلْکَ الرُّسُلُ سے معلوم ہوا۔ نیز رب فرماتا ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ۔ (بقرہ: ۲۸۵) **دوسرا فائدہ:** انبیاء کرام درجات میں یکساں نہیں۔ جو سب کا درجہ یکساں مانے وہ اس حدیث کا منکر ہے اور بے دین ہے۔ **تیسرا فائدہ:** حضور علیہ السلام تمام نبیوں سے افضل ہیں۔ ان کا منکر بے دین ہے جیسا کہ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** رب نے بعض پیغمبروں سے بلاواسطہ کلام فرمایا جیسا کہ مَنْ کَلَّمَ اللّٰہُ سے معلوم ہوا اس کا منکر بے دین ہے۔ **پانچواں فائدہ:** یہ کہنا درست ہے کہ بعض نبی بعض سے افضل ہیں۔ مگر یہ کہنا حرام ہے کہ بعض پیغمبر بعض سے کمتر کہ اس میں نبی کی توہین ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا کہ بعض کو بعض نبی سے افضل کیا۔ یہ نہ فرمایا کہ بعض سے کمتر کیا۔ **چھٹا فائدہ:** بزرگان دین سے امداد لینا برحق ہے۔ رب نے فرمایا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کی حضرت جبرائیل کے ذریعہ مدد کی۔ حضرت جبرائیل مدد کر سکتے ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** اگر بزرگوں کی بعض جہلا حد سے زیادہ تعظیم کریں اور انہیں خدا بھی کہہ دیں سو تم بزرگوں کو برا نہ کہو۔ ان کی تردید کرو۔ دیکھو عیسیٰ علیہ السلام کو عیسائیوں نے خدا کہہ دیا۔ مگر رب نے ان کی تعریف ہی فرمائی۔ عیسائیوں کی تردید ہی کی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کے درجے مختلف ہیں۔ کہ بعض سے بعض افضل ہیں مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے نبی یکساں ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ نیز حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے یونس علیہ السلام پر بھی فضیلت مت دو۔ یا موسیٰ علیہ السلام سے افضل نہ کہو۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب:** آیت لَا نُفَرِّقُ الخ کے چند مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یہود و نصاریٰ کی طرح انبیاء کرام پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کا انکار کریں۔ بلکہ سب پر ایمان لاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ہم نفس نبوت میں فرق نہیں کرتے۔ کہ دیوبندیوں قادیانیوں کی طرح بعض کی نبوت اصلی اور بعض کی عارضی مانیں۔ بلکہ اس میں سب کو یکساں مانتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ ہم انبیاء میں اس طرح فرق نہیں کرتے۔ کہ بعض کی توہین ہو جائے۔ بلکہ سب کا احترام کرتے ہیں۔ چوتھا یہ کہ ہم انبیاء کرام میں اپنی رائے سے فرق نہیں کرتے۔ رب کے دیئے ہوئے درجات کو مانتے ہیں۔ یہ ہی اس حدیث کا مطلب ہے کہ تم ہمیں یونس یا موسیٰ علیہم السلام پر اس طرح فضیلت نہ دو۔ کہ ان کی توہین ہو جائے۔ لہٰذا آیتیں اور احادیث مطابق ہیں۔ **لطیفہ** اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے سامنے کسی نعت خواں نے پڑھا۔ شان یوسف جو دبی وہ بھی یہیں آ کے دبی۔

فرمایا یوں نہ کہو۔ بلکہ یوں کہو کہ ''شان یوسف جو بڑھی وہ بھی اسی در سے بڑھی'' حضور سے بلندیاں ملتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تمام انبیاء نبوت میں یکساں ہیں۔ کوئی نبی عارضی نہیں۔ مگر امام بوصیری قصیدہ بردہ میں فرماتے ہیں۔ شعر۔

فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا　　يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

دوسرا اعتراض: کہ حضور آپ تو بزرگی کا سورج ہیں۔ اور دیگر انبیاء تارے۔ معلوم ہوا کہ حضور اصلی نبی ہیں باقی رسول عارضی ہیں۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس شعر میں نبوت کا ذکر نہیں۔ بلکہ فضل کی بزرگی کا ذکر ہے۔ یعنی دیگر انبیاء کرام نے آپ کے ذریعہ بزرگیاں لیں۔ جیسے تاروں نے سورج کے ذریعہ نور لیا۔ رہی نبوت وہ تمام میں یکساں۔ دوسرا یہ کہ اس شعر میں اصلیت وعارضی کا ذکر نہیں۔ بلکہ توسل وساطت کا ذکر ہے۔ یعنی آپ کے توسل سے نبیوں کو نبوت ملی۔ مگر ملی اصلی ہی نہ کہ عارضی۔ چنانچہ تاروں نے اگرچہ سورج ہی سے نور لیا۔ مگر وہ سب اصلی منور ہیں۔ ذروں اور آئینوں کی طرح عارضی نورانی نہیں۔ کسی کو ہم نے اپنا مکان رہنے کو عارضی طور پر دیا۔ یہ شخص وہاں عارضی طور پر ہے۔ دوسرے کو ہم نے مکان کا مستقل مالک بنا دیا۔ وہ مکان کا اصل مالک بن گیا۔ مگر بنا ہمارے دینے سے۔ انبیاء کرام قصر نبوت کے اصلی مالک ہی ہیں۔ مگر حضور کی عطا سے کہ اللہ معطی ہے حضور قاسم۔ **تیسرا اعتراض:** بعض انبیاء کرام کے معجزات حضور کے معجزات سے کہیں بڑھ کر ہیں نمبر ۱ آدم علیہ السلام کو ملائکہ نے سجدہ کیا نہ کہ حضور علیہ السلام کو ابراہیم علیہ السلام پر آگ گلزار ہوئی نہ کہ حضور پر موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ید بیضا ملا نہ کہ حضور کو داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں لوہا نرم ہوا نہ کہ حضور کے ہاتھ میں۔ سلیمان علیہ السلام کے قبضہ میں جن وانس وحوش وطیور اور ہوائیں تھیں۔ نہ کہ حضور ﷺ کے قبضہ میں عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ نہ کہ حضور عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کئے۔ بیماروں کو شفا بخشی نہ کہ حضور ﷺ نے ان کا لقب کلمۃ اللہ ہے نہ کہ حضور ﷺ کا لہٰذا یہ حضرات حضور ﷺ سے افضل ہوئے۔ **جواب:** اس قسم کے اعتراضات کے دو جواب ہیں۔ ایک اجمالی دوسرا تفصیلی۔ اجمالی تو یہ ہے کہ یہ خصوصی فضیلتیں ہیں۔ اور حضور علیہ السلام کو فضیلت کلی حاصل ہے۔ اگر بادشاہ کسی جرنیل کو کوئی خاص تمغہ عنایت فرمائے۔ تو اگرچہ یہ تمغہ وزیر اعظم کو نہ ملا۔ مگر درجہ اسی کا بڑا ہے اور قرب اسی کو زیادہ۔ جواب تفصیلی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام مسجود ملائکہ ہونے کی وجہ سے حضور ﷺ سے افضل نہ ہوئے۔ کیونکہ قیامت میں حضور ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ نیز حضور ﷺ اس وقت نبی تھے۔ جب حضرت آدم آب وگل میں جلوہ گر تھے۔ نیز معراج کی رات جبرائیل امین نے براق مصطفیٰ کی رکاب تھامی سارے ملائکہ حضور کو جھرمٹ میں لے کر دولہا بنا کر لے گئے۔ یہ سجدے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ نیز سارے فرشتے اور خود رب حضور پر ہمیشہ درود بھیجتے ہیں۔ سجدہ ایک وقت خاص بھی ہوا اور صرف ملائکہ نے کیا۔ مگر یہ درود قیامت تک جاری ہے نیز اس سجدہ کا انتظام ملائکہ نے کیا اور صلوٰۃ کا انتظام خود رب نے۔ نیز آدم علیہ السلام کو سجدہ اسی لئے کرایا گیا کہ ان کی پیشانی میں نور محمدی تھا۔ (کبیر) نمبر ۲ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام پر آگ کا باغ بننا بھی اسی لئے ہوا کہ ان کی پیشانی میں نور محمدی تھا۔ نیز حضور کے غلاموں پر دوزخ کی آگ گلزار ہو جائے گی۔ بلکہ پکارے گی۔ کہ خدایا ان کو جلد یہاں سے نکال حضور علیہ السلام کے لئے پتھر نرم ہوئے۔ نیز سارے وحوش وطیور حضور کے قبضہ میں بھی تھے۔ ایک بار استنجا کی ضرورت ہوئی تو درختوں کو حکم دیا گیا۔ وہ مل گئے اشارے

سے ڈوبا ہوا سورج واپس ہوا۔ چودہویں رات کا چاند پھٹا۔ اشارۂ ابرو پر بادل آ کر برسا۔ دوسرا اشارہ پا کر کھل گیا۔ معلوم ہوا کہ جن وانس تو کیا چاند و سورج بھی قبضہ میں ہیں جیسا کہ حدیث پڑھنے والوں پر مخفی نہیں۔ نیز حضور ﷺ نے پیدا ہوتے ہی رب کو سجدہ کیا اور امت کی شفاعت فرمائی۔ دیکھو مدارج النبوت و شفا شریف چھ دن کے بچہ نے آپ پر صلوٰۃ و سلام پڑھا۔ اپنے والدین ماجدین کو ان کی وفات کے بعد زندہ فرما کر انہیں کلمہ پڑھا کر اپنا صحابی بنایا۔ جابر کے ذبح شدہ بچوں کو زندہ فرما کر اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن کا مطالعہ کرو۔ ایک دفعہ صدیق اکبر کو اندھیری رات میں ایک لاٹھی عطا فرمائی جس نے اندھیرے میں گیس کا کام دیا۔ عمر فاروق نے اپنی لکڑی اس سے مس کی تو اس میں بھی روشنی پیدا ہوگئی۔ حضور ﷺ کے دندان مبارک کی روشنی میں گمی ہوئی سوئی تلاش کی جاتی تھی۔ شعر

سوزنِ گم شدہ ملتی ہے تبسم سے تیرے ‏ شام کو صبح بناتا ہے اجالا تیرا!

مولانا جامی نے کیا خوب فرمایا

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری ! ‏ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری !

اگر عیسیٰ علیہ السلام اس عالم میں بغیر باپ پیدا ہوئے۔ تو نور محمدی عالم انوار میں بلا واسطہ پیدا ہوا اور تمام مخلوق آپ کے واسطے سے خود فرماتے ہیں۔ اَنَا نُوْرٌ مِّنْ نُوْرِ اللّٰهِ وَكُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُّوْرِیْ نیز اللہ تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کی محبوبیت تمام محبوبوں سے اعلیٰ عطا فرمائی کہ تمام حسینوں پر انسان فریفتہ ہوئے حضور ﷺ پر جن وانس جانور بلکہ فرشتے بھی فدا کہ لکڑیاں اور جانور بھی حضور ﷺ کے فراق میں روتے دیکھے گئے۔ نیز اور حسینوں کو دیکھنے والے ہزاروں مگر ان کا عاشق صرف ایک مگر آج حضور ﷺ کو دیکھنے والا کوئی نہیں مگر عاشق لاکھوں۔ نیز تمام محبوبوں کی محبوبیت کو فنا ہے۔ مگر حضور ﷺ کی محبوبیت ابدالآباد تک باقی ہے۔ آج حسن یوسفی کا عاشق کوئی نہیں ملتا مگر حسن محمدی کے عاشقوں کی انتہا نہیں۔ محبوبیت بھی درجات میں سے ایک عظیم الشان درجہ ہے۔ رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ (طٰهٰ: ۳۹)

چوتھا اعتراض: رب سے ہم کلام ہونے میں کوئی فضیلت نہیں۔ شیطان نے بھی خدا سے کلام کیا۔ (آریہ)

جواب: موسیٰ علیہ السلام سے کلام بلا واسطہ ہے اور شیطان سے بالواسطہ نیز ان سے محبت کا کلام تھا اور ابلیس سے غضب کا۔ بادشاہ وزراء سے بھی کلام فرماتا ہے۔ اور مجرمین سے بھی مگر ان کلاموں میں فرق ہے۔ **پانچواں اعتراض:** تِلْكَ الرُّسُلُ میں سارے پیغمبر آ گئے تھے۔ پھر موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کا علیحدہ ذکر کیوں فرمایا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصیت سے نام کیوں لیا۔ **جواب:** اس لئے کہ مدینہ منورہ میں یہودی اور عیسائی ہی تھے۔ دیگر پیغمبروں کی امتیں نہ تھیں۔ نیز یہودی عیسیٰ علیہ السلام کے سخت دشمن تھے۔ کہ اس جناب کی نبوت کے انکاری تھے اور حضرت بتول مریم کو بہتان لگاتے تھے۔ اسی لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔ اور ہم کو سکھایا گیا۔ کہ ہمیشہ حضرات انبیاء و اولیاء کے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیا کرو۔ اور ان بزرگوں کی حمایت کیا کرو۔ ان کی حمایت سنت الٰہیہ ہے۔

تفسیر صوفیانہ

انبیاء کرام صفات الٰہی کے مظہر ہیں۔ اور صفات الٰہی تو مختلف لہٰذا ان کی شانیں بھی مختلف۔ نیز رب کی بعض صفات۔ بعض پر

غالب ہیں۔ سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ اس لئے بعض انبیاء بعض سے افضل ہیں۔ جمالی پیغمبر مثلاً ابراہیم علیہ السلام جلالی نبی (موسیٰ علیہ السلام) سے افضل اور چونکہ ہمارے نبی ﷺ مظہر ذات ہیں۔ لہٰذا ان سب سے افضل اسی طرح اولیاء اللہ انبیاء کے قدم پر ہیں۔ اور انبیاء کی شانیں مختلف لہٰذا ان کے درجات بھی جداگانہ ولایت عیسوی والے تارک الدنیا ولایت موسوی والے جلالی ہوتے ہیں۔ ولایت سلیمانی والے بہت شان وشوکت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ولایت محمدی والے جامع صفات اور تمام اولیاء اللہ سے افضل ہوتے ہیں۔ حضور غوث الثقلین محی الدین عبدالقادر جیلانی قدس سرہ فرماتے ہیں شعر

وَ کُلُّ وَلِیٍّ لَهٗ قَدَمٌ وَاِنِّیْ عَلٰی قَدَمِ النَّبِیِّ بَدْرِ الْکَمَالِیْ

اس کی تحقیق پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ساری مخلوق کا یہ ہی حال ہے۔ نہ سب فرشتے برابر نہ عالم کی دیگر چیزیں مساوی۔

دوسری تفسیر

گروہ انبیاء نورانی جماعت ہے۔ نور کی تجلیات مختلف لہٰذا ان کے درجات بھی متفاوت بلکہ (علم) نور ذات کی چمک ہے۔ نبی کا جس قدر علم زیادہ اتنا ہی درجہ بلند حضور علیہ السلام نے معراج میں آدم علیہ السلام کو پہلے آسمان پر یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو دوسرے پر یوسف علیہ السلام کو تیسرے پر ادریس علیہ السلام کو چوتھے پر حضرت ہارون کو پانچویں پر موسیٰ علیہ السلام کو چھٹے پر اور ابراہیم علیہ السلام کو ساتویں آسمان پر ملاحظہ فرمایا۔ اس کی یہ ہی وجہ تھی۔ اور خود سدرۃ المنتہیٰ ہوتے ہوئے عرش سے گزرتے ہوئے قاب قوسین اوادنیٰ تک پہنچے۔ جہاں نہ مکان تھا نہ امکان کیونکہ آپ علم میں سب سے افضل اور آپ کی نورانیت سب سے اعلیٰ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نور وحدانیت ظلمت انسانیت پر اتنا غالب ہوا کہ وہ ظلمت تجلی صفات جمال وجلال میں فنا ہو گئی۔ اسی لئے رب نے انہیں عین نور فرمایا۔ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ (مائدہ: ۱۵) اور ظاہر ہے کہ زینہ کی سیڑھیاں عمارت کی بلندی کے بقدر ہوتی ہیں۔ جتنی عمارت اونچی زینہ بھی اتنا ہی دراز (روح البیان) بلکہ حق یہ ہے کہ آپ کے درجات تک نہ کسی کا وہم پہنچے نہ گمان نہ قیاس بس یہ ہی کہتے بن پڑے گی۔ کہ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ بعض نادان لوگ تمام اولیاء کو یکساں رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ بے وقوف ہیں۔ جب صفات الٰہیہ اور حضرات انبیاء کرام یکساں نہیں تو مظہر انبیاء یعنی اولیاء اللہ یکساں کیسے ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ولی وہ جو تارک الدنیا ہو۔ ولایت ودولت جمع نہیں ہو سکتی۔ وہ بے وقوف ہیں۔ دیکھو حضور غوث پاک بڑے غنی تھے مگر ولی تھی۔ بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو نبی تھے مگر بڑی دولت ومملکت والے تھے۔ ہاں یہ درست ہے کہ ولی کے دل میں دنیا نہیں رہتی وہ دنیا میں رہتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ حضرت جبرائیل امین تمام فرشتوں سے افضل ہیں کیوں؟ اس لئے یہ حضرات انبیاء کرام کے خادم خاص ہیں۔ اور وحی لانے والے۔ جب حضرات انبیاء اور وحی الٰہی کی خدمت کرنے والا فرشتہ تمام فرشتوں سے افضل ہے تو حضرات صحابہ کرام تمام مسلمانوں سے افضل کہ انہیں حضور ﷺ کی خدمت کا موقع ملا۔ پھر صحابہ میں خلفاء راشدین پھر ان میں حضرت ابوبکر صدیق بعد از انبیاء تمام خلق سے افضل ہیں۔ کہ ان حضرات نے حضور ﷺ کی اعلیٰ درجہ کی خدمت کی۔ جب قرآن کی رحل اور کعبہ کا غلاف یوسف علیہ السلام کی قمیض سب سے اعلیٰ تو حضرت صدیق کا زانو عائشہ صدیقہ کی گود جن پر حضور انور نے آرام فرمایا کہ

غار میں حضور ﷺ نے صدیق اکبر کے زانو پر آرام کیا۔ بوقت وفات جناب عائشہ کی گود میں استراحت فرما ہوئے سب سے اعلیٰ ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ

اور اگر چاہتا اللہ تو آپس میں نہ لڑتے وہ لوگ جو ان کے بعد تھے پیچھے سے اس کے لئے کہ آ گئیں ان کے پاس

اور اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی

الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ

نشانیاں اور لیکن اختلاف کیا انہوں نے پس ان میں سے وہ ہیں جو ایمان لائے اور ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا

نشانیاں آ چکیں لیکن وہ تو مختلف ہو گئے ان میں کوئی ایمان پر رہا اور کوئی کافر ہو گیا

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

اور اگر چاہتا اللہ تو آپس میں نہ لڑتے اور لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے

اور اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہے کرے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** بہت دور سے جہاد کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہ اولاً جہاد کا حکم دیا گیا۔ پھر جہاد میں مال خرچ کرنے کا فرمان دیا۔ پھر گذشتہ امتوں کے جہاد کا واقعہ بیان ہوا۔ اس کے درمیان میں انبیاء کرام کے درجات مذکور ہوئے۔ اب وجہ جہاد بیان ہو رہی ہے۔ کہ چونکہ لوگوں میں دینی اختلاف ہے۔ کہ بعض مومن ہیں بعض کافر اور عالم کے نظام کے لئے کفر کو دبانا ضروری ہے۔ لہٰذا جہاد بھی ضروری۔ **دوسرا تعلق:** گذشتہ آیت میں بتایا گیا کہ دنیا میں مختلف شان والے پیغمبر آئے جنہوں نے حسبِ مراتب معجزات دکھائے' اور دلائل بیان فرمائے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ سب لوگ کبھی مومن نہ ہوئے۔ نیک بختوں نے اطاعت کی بدبختوں نے سرکشی کی تو اے نبی ﷺ اگر آپ پر بھی سب ایمان نہ لائیں تو آپ رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے ارادہ سے ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ سب نبی ایک درجہ کے نہیں۔ بعض بڑے' بعض بہت بڑے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ عام لوگ بھی یکساں نہیں۔ بعض سعید ہیں اور بعض شقی اور یہ سب کچھ ہمارے ارادہ سے ہے۔

شان نزول

ابن عساکر نے بروایت ضعیف عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اور وہاں حضرت ابوبکر و عمر و عثمان و معاویہ رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔ کہ اچانک حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر بارگاہ ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے امیر معاویہ سے پوچھا کہ کیا تم علی سے محبت کرتے ہو۔ عرض کیا کہ ہاں فرمایا عنقریب تم میں ان میں

جنگ ہوگی۔عرض کیا کہ یا حبیب اللہ جنگ کے بعد کیا ہوگا۔فرمایا معافی اور رضا امیر معاویہ کہنے لگے۔رَضِینَا بِقَضَاءِ اللّٰهِ تب یہ جملہ نازل ہوا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا الخ (درمنثور) یعنی اس جنگ کا انجام آپس کی صلح صفائی ہوگی۔کہ آخر کار صلح ہو جائے گی۔یا بارگاہ الٰہی میں حضرت علی مرتضٰی کے لئے رضا ہوگی۔اور امیر معاویہ کے لئے معافی ہوگی۔گو جناب علی کی ڈگری اور امیر معاویہ کی معافی' کیونکہ اس جنگ کی بنیاد نفسانیت پر نہیں للّٰہیت پر ہے۔

تفسیر

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ. شَآءَ مشیت سے بنا مشیت اور ارادہ کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں۔خیال رہے کہ رضا اور ارادہ میں فرق ہے۔اسی فرق سے غفلت کی وجہ سے مسئلہ تقدیر پر اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ اقْتَتَلَ اقتتال سے بنا یہ مقاتلۃ کے ہم معنی ہے۔یعنی آپس میں جنگ کرنا اَلَّذِیْنَ سے گزشتہ پیغمبروں کی امتیں مراد ہیں۔اور ہم کا مرجع وہ انبیاء ہیں۔یعنی اگر اللہ چاہتا کہ سب لوگ ہدایت پر متفق ہو جائیں۔تو ان پیغمبروں کی امتیں ان کے بعد کبھی جنگ نہ کرتیں۔رب ہی کے ارادے سے ان میں لڑائیاں ہوئیں اور اس ارادہ میں صدہا حکمتیں ہیں۔مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ یہ اقْتَتَلَ کے متعلق ہے۔مَا یا موصولہ ہے یا مصدریہ بینات سے انبیاء کرام کے معجزات اور ان کی ہدایت اور دلائل مراد ہیں۔یعنی یہ معجزات غلطی سے بچانے ہدایت پر رکھنے کے لئے کافی تھے۔ان کے ہوتے ہوئے اختلاف ہونا ہی نہ چاہیے تھا۔وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا مگر چونکہ رب نے ان کے متفق نہ رہنے کا ارادہ فرمایا لہٰذا وہ اختلاف کر بیٹھے۔یا تو اخْتَلَفُوْا کا فاعل گزشتہ امتوں کے کفار اور مومنین ہیں۔یا صرف وہ مومنین جن میں سے بعض لوگ بگڑ گئے۔یعنی وہ مختلف رہے۔یا وہ اختلاف کر بیٹھے۔اور یہ اختلاف نسبی یا رہی نہ تھا۔بلکہ دینی کہ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ اگر اخْتَلَفُوْا کا فاعل گزشتہ مومنین ہیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان میں سے بعض مومن رہے۔اور بعض کافر ہو گئے۔اور اگر اس کا فاعل سارے مومنین اور کفار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض ان میں سے ایمان لے آئے۔اور بعض کافر رہے پہلی توجیہ نہایت قوی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا۔ اقْتَتَلُوْا کا فاعل گزشتہ لوگ ہی ہیں یا تو یہ جملہ پہلے کی تاکید ہے اور یا اس میں بعد کی جنگیں مراد ہیں۔یعنی اگر رب چاہتا تو پھر آپس میں نہ لڑتے مگر وہ لڑتے ہی رہے لیکن ہم نے جو درمنثور سے ان کا شان نزول نقل کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فاعل حضور ﷺ کی امت اور اس سے مسلمانوں کی آئندہ جنگیں مراد ہیں یعنی اے نبی ﷺ اگر رب چاہتا تو آئندہ آپ ﷺ کے امتی نہ لڑتے مگر چونکہ ارادہ الٰہی ہو چکا۔لہٰذا ان میں بھی جنگیں ہوں گی۔وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔اس کو کوئی نہیں روک سکتا۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ اگر رب چاہتا تو گزشتہ پیغمبروں کے بعد ان کی امتوں میں جنگ نہ ہوتی کیونکہ ان کے پاس بے شمار معجزات آ چکے تھے۔جو انہیں ہدایت پر رکھنے کے لئے کافی تھے۔لیکن رب کا ارادہ ہی یہ ہوا۔کہ ان میں دینی اختلاف پیدا ہوں اور جنگ و جدال بھی واقع ہوں۔کہ اس میں صدہا حکمتیں ہیں لہٰذا ان میں اختلاف ہوا کہ بعض تو ایمان پر قائم رہے اور بعض کافر ہو گئے۔اور ان میں سخت جنگیں واقع ہوئیں۔اور اگر رب چاہتا تو ان لڑائیوں کے بعد بھی ان کی آنکھ کھل جاتی۔اور وہ

لوگ اپنے جانی مالی نقصان کو دیکھ کر پھر نہ لڑتے مگر اللہ جہان کا مالک ہے۔ سب اس کی ملک اس کے ارادے کے خلاف کچھ نہیں ہوسکتا۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** دنیا کی ہر اچھی بری چیز ایمان و کفر رب کے ارادے سے ہے کہ رب ہر چیز کا خالق بھی ہے اور اسی کے ارادے سے ہر چیز واقع ہوئی ہے۔ **دوسرا فائدہ:** جو کہے کہ خیر تو رب کی طرف سے ہے۔ اور شر کسی اور کی طرف سے ہے وہ بے دین ہے جیسا معتزلہ کہ اس صورت میں رب کی سلطنت قائم نہیں رہتی۔ **لطیفہ:** ایک یہودی ایک معتزلی کے ساتھ کشتی میں سفر کر رہا تھا۔ معتزلی بولا کہ اے یہودی تو مسلمان کیوں نہیں ہوتا۔ اس نے کہا کہ خدا نہیں چاہتا کہ میں مسلمان ہوں میں کیسے ایمان لا سکتا ہوں۔ معتزلی نے کہا کہ خدا تو چاہتا ہے کہ تو ایمان لے آئے۔ مگر شیطان تجھے روکے ہوئے ہے۔ یہودی بولا کہ پھر تو شیطان غالب ہوا۔ خدا مغلوب کہ رب کا چاہا نہ ہوا۔ اور شیطان کا چاہا ہو گیا۔ میں ایسے مغلوب خدا کو نہیں مانتا۔ شیطان ہی کے ساتھ رہوں گا۔ جو خدا پر غالب ہے معتزلی حیران رہ گیا۔ (شرح عقائد) **تیسرا فائدہ:** ارادہ اور رضا ایک نہیں ہم کڑوی دوائیں پینے کا ارادہ کرتے ہیں مگر ان سے راضی نہیں۔ حکومتوں کو جرمانے دینے کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس سے راضی نہیں۔ **چوتھا فائدہ:** برائی کا ارادہ برا نہیں۔ بلکہ اس سے راضی ہونا اسے پسند کرنا برا ہے اگر کوئی مجبوراً شراب پی لے۔ یا کلمۂ کفر منہ سے نکالے تو گنہگار نہ ہوگا۔ کہ اس نے برائی کا ارادہ تو کیا مگر اسے اچھا نہ سمجھا۔ ہاں اس سے راضی ہونا کفر ہے۔ رب تعالیٰ برائی کا ارادہ فرماتا ہے اس سے راضی نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جتنی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ وہ خدا ہی کی مرضی سے ہوتی ہیں۔ تو کیا وہ خود بھی گناہ کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے والا خدا ہی نہیں۔ امن میں خلل ڈالنا کسی اچھے آدمی کا کام نہیں (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی مرضی اور ہے۔ ارادہ کچھ اور یہاں **وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ** ہے رضی اللہ عنہ نہیں خدا تعالیٰ کسی بُرائی سے راضی نہیں ہاں اس کے ملک میں جو ہوتا ہے وہ اس کے چاہنے اور ارادہ سے ہوتا ہے۔ اگر خدا انسان کو گناہ کرنے کی طاقت نہ دیتا یا اس کے دل میں برائی کا خیال نہ آنے دیتا۔ یا گناہ پیدا ہی نہ کرتا۔ تو کوئی بھی گناہ نہ کر سکتا۔ لوگ اس کی دی ہوئی طاقت سے اسی کے پیدا کیے ہوئے خیال سے اسی کے پیدا کیے ہوئے گناہ کرتے ہیں۔ اگر چھری پیدا نہ ہوتی۔ یا قصائی کے ہاتھ میں نہ ہوتی یا قصائی کا دل نہ چاہتا تو کبھی تمہاری گاؤ ماتا کو ذبح نہ کرتا۔ بولو پنڈت جی شراب نوشی حرام خوری اور گاؤ ہتیا جو دنیا میں ہو رہی ہے۔ اس کی خدا کو خبر ہے یا نہیں اگر نہیں ہے تو وہ بے علم ہے۔ خدا کیسا اور اگر ہے تو اسے ان کے روکنے پر قدرت بھی ہے کہ نہیں اگر نہیں تو مجبوراً ہوا پر ماتما کیسا اور اگر ہے تو اس کے چاہے سے یہ کام ہوا یا بغیر چاہے۔ اگر بغیر ارادہ کے ہو گیا۔ تو اس کا جہاں پر پورا قبضہ نہ رہا۔ وہ خدا کیسا اور اگر اس کے ارادہ سے ہوا تو یہ ہی ہم کہتے ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** بُرے کام کا ارادہ بھی بُرا ہے بندہ برے کام کے ارادہ پر پکڑا جاتا ہے تو رب تعالیٰ کا برے کاموں کا ارادہ برا ہونا چاہیے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ برائیوں سے پاک ہے۔ **جواب:** نہ برا کام کرنے کا ارادہ برا ہے۔ نہ رب تعالیٰ برائی کرتا ہے۔ نہ برائی کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔ بندہ

سے بُرے کام صادر ہونے کا ارادہ برا نہیں۔ سلطان چاہتا ہے کہ میری مملکت کے چھپے بدمعاشوں سے ایسے جرم صادر ہو جائیں۔ جن سے انکی بدمعاشی ظاہر ہو جائے۔ اور وہ قانونی شکنجہ کے لائق ہو جائیں۔ یہ ملکی انتظام ہے۔ برا نہیں۔ بعض لوگوں کے دل میں برائی کا تخم ہے۔ ان سے برے کام صادر ہونا انکی بدمعاشی کا ظہور ہے۔ ان ہی اعمال کی بنا پر وہ قانونی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ برے بندوں کی توبہ پسند فرماتا ہے اسکا حکم بھی دیا ہے۔ مگر ان برائیوں کے صدور کا ارادہ فرماتا ہے۔ **تیسرا اعتراض:** جبکہ ہمارے کل اچھے برے کام لوح محفوظ پر تحریر ہو چکے اور ان سب کا فیصلہ ہو چکا ہے تو وہ سب کچھ ضرور ہو کر رہے گا۔ پھر اس طے شدہ چیز پر پکڑ دھکڑ کیسی؟ **جواب:** جی ہاں فیصلہ اور تحریر اس طرح ہوئی ہے کہ فلاں بندہ فلاں وقت فلاں کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرے گا۔ یعنی ہمارے کاموں کی بھی تحریر ہے اور ہمارے ارادوں کی بھی۔ ان ارادوں ہی کی وجہ سے ہم پر جرم و سزا ہے۔ یعنی ہمارا اپنے ارادے سے یہ سب کچھ کر لینا ضروری ہو گیا۔ **چوتھا اعتراض:** رب نے جنگ اور لڑائیوں کا ارادہ ہی کیوں کیا۔ سب کو ہدایت کیوں نہ دے دی۔ **جواب:** اس کا جواب بار بار دیا جا چکا کہ اچھی بری چیزوں سے دنیا قائم ہے۔ اگر برائیاں نہ ہوں تو خوبیوں کی قدر معلوم نہ ہو۔ مدرسوں، مکتبوں اور سلطنتوں کی ضرورت ہی نہ رہے۔ یہ سوال تو ایسا ہے کہ کوئی کہے رب نے بھوک اور بیماریاں پیدا ہی کیوں کیں۔ اور پھر انسان کی پیدائش ہی کی کیا ضرورت تھی۔ فرشتے ہی کافی تھے۔ وہ سب بے گناہ تھے۔ دنیا جوڑ توڑ کا ہی نام ہے۔ اندھیرا اجالے سے۔ بھوک غذا سے۔ بیماری دوا سے توڑی جاتی ہے۔ سانپ بنایا۔ اسے ہلاک کرنے کے لئے لاٹھی دی۔ اس کا نام دنیا۔ ایسے ہی اچھے آدمی اچھی چیزیں اس لئے پیدا کیں کہ ان سے برے آدمی اور بری چیزیں ہلاک کی جائیں۔ **پانچواں اعتراض:** پھر ہم گناہ کرنے میں مجرم کیوں ہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں رب کے ارادہ سے کرتے ہیں۔ ہمارا کیا قصور۔ **جواب:** بعض کام وہ ہیں جن میں ہمارے ارادہ کو کوئی دخل نہیں۔ ان پر سزا اور جزا بھی نہیں۔ بعض وہ کام ہیں جن میں ہمارے ارادہ کو دخل ہے اس کی وجہ سے ہم اس کام کے مختار کہلاتے ہیں۔ نہ کہ مجبور اس اختیار کی بنا پر جزا و سزا ہے۔ جیسے ہم ارادتاً نیکی کر کے جنت کے مستحق ہیں۔ ایسے ہی ارادتاً گناہ کر کے سزا کے لائق رعشہ میں بھی ہاتھ ہلتا ہے اور ارادہ سے بھی مگر اس جنبش پر پکڑ نہیں۔ اس پر پکڑ ہے۔ خیال رہے کہ ہمارے کام بھی خدا کے ارادے سے ہیں۔ اور ہمارا ارادہ بھی رب کے ارادے سے ہے کہ رب کا ارادہ یہ ہوا کہ بندہ فلاں وقت فلاں کام کا ارادہ کرے۔ اور اپنے اختیار و ارادے سے فلاں کام کرے تو جیسے وہ کام رب کے ارادے سے ہے۔ ایسے ہی اس کام کا ارادہ بھی رب کے ارادے سے ہے۔ ہمارا یہ ارادہ ہم کو مختار اور ہمارے کام کو اختیاری بنا دیتا ہے۔ اور اسی ارادے کے درمیان آ جانے کی وجہ سے بندہ دنیا میں بھی سزا اجزاء کا مستحق بن جاتا ہے۔ اور آخرت میں بھی قتل خطاء اور قتل عمد کی سزائیں مختلف ہیں۔ فرق ان میں صرف ارادہ کا ہے۔ یہ ارادہ ہی انسان اور پتھر میں فرق کا باعث ہے۔ معترض اس ارادے کا لحاظ نہیں رکھتا۔ اس لئے شبہ میں پڑ جاتا ہے۔

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک جبریہ مذہب کا آدمی انگور کے باغ میں گیا۔ اور پھل کھانے لگا۔ اتفاقاً باغ کا مالک آ گیا۔ اور بولا کہ میری اجازت بغیر پھل کیوں توڑتا ہے۔ وہ بولا خدا کا بندہ خدا کے حکم سے خدا کے پھل کھا رہا ہے۔ میرا اس میں کیا اختیار تو رب سے کہہ۔ کہ تیرے پھل کیوں توڑ وا رہا ہے۔ مالک بولا بہت اچھا غلام کو حکم دیا۔ اسے باندھ دو۔ بندھوا

کر پیٹنے لگا۔ جبریا نے شور مچایا۔ مالک نے کہا کیوں چیختا ہے۔ خدا کا بندہ خدا کا ڈنڈا خدا کی رسی میں تجھے خدا کے حکم سے پیٹ رہا ہوں۔ تو اسی سے کہو کہ مجھے کیوں پٹوارہا ہے تب جبریا نے کہا۔

گفت توبہ کردم از جبر اختیار اختیار است اختیار است اختیار

میں جبر سے توبہ کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ واقعی بندہ کو بھی اختیار ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اے بیوقوف اگر تو کتے کو پتھر مارے تو کتا پتھر کو نہیں کاٹتا تجھے کاٹتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ پتھر مجبور ہے۔ تو مختار بے عقل کتا تجھ میں اور پتھر میں کیا فرق کرتا ہے۔ اگر تو فرق نہ کرے تو کتے سے بھی زیادہ بے وقوف ہے۔

ھدایت: مسئلہ تقدیر میں تین مذہب ہیں۔ جبریہ۔ قدریہ۔ اہل سنت جبریہ بندہ کو پتھر کی طرح مجبور محض مانتے ہیں۔ ان بے وقوفوں کے نزدیک پنکھے اور ہاتھ کی حرکت میں کوئی فرق ہی نہیں۔ ان کے ہاں قلم اور کاتب دونوں یکساں ہیں۔ کہ نہ تو قلم کو اختیار ہے نہ کاتب کو دونوں خدا کے حکم سے کٹھ پتلی کی طرح چل رہے ہیں۔ قدریہ بندہ کو مختار مطلق مانتے ہیں۔ اور تقدیر کے منکر ہیں۔ ان بیوقوفوں کے نزدیک رب اور بندہ میں کوئی فرق نہیں ہم اہل سنت بندہ کو خلق میں مجبور اور کسب میں بعطاء الٰہی مختار مانتے ہیں۔ خلق کے معنی نیست کو ہست کر دینا۔ معدوم کو وجود بخش دینا۔ یہ صرف رب کا کام ہے۔ فرماتا ہے۔ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (انعام: ۱۰۲) اور فرماتا ہے۔ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصافات: ۹۶) کسب کے معنی ہیں ہستی کے اسباب کو جمع کر دینا یہ کام بندے کا ہے۔ حلق پر چھری چلانا بندے کا کام ہے پھر جانور کو مردہ کر دینا رب کا کام ہے۔ لہٰذا بندہ ذابح تو ہے مگر ممیت نہیں ممیت یعنی موت دینے والا رب تعالیٰ ہی ہے۔ ہمارے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر کام رب کے ارادہ سے ہوتا ہے مگر بعض وہ کام ہیں جن میں بندہ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں۔ جیسے ہماری نبض اور قلب کی حرکت اس پر نہ عذاب نہ ثواب اور بعض وہ کام ہیں جن میں بندہ کے اختیار کو بھی دخل ہے۔ جیسے ہمارے ہاتھ پاؤں وغیرہ کی اختیاری حرکتیں ان پر ثواب و عذاب ہے۔ کوئی شخص مسئلہ تقدیر کا انکار کر کے خدا کو نہیں مان سکتا۔ اس کا جیسا عمدہ فیصلہ اسلام نے کیا۔ کسی نے نہیں کیا۔ آج اگر ہم قتل یا چوری کر کے حاکم سے کہیں۔ کہ ہم بے قصور ہیں۔ رب نے کرایا کبھی نہ مانے گا۔

تفسیر صوفیانہ

عالم کی بعض چیزیں ملائکہ یا جنات وانس و جمادات کے واسطہ سے ہیں اور بعض بلا واسطہ۔ مگر سب کچھ رب ہی کی طرف سے ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ زہر خود قتل کر دیتا ہے اور پانی اپنے آپ پیاس بجھا دیتا ہے۔ اور شیطان خود بخود گمراہ کر دیتا ہے بلکہ یہ سب اسباب ہیں۔ اور خالق کے زیر فرمان جاہل سمجھتا ہے کہ قلم نے لکھا مگر عاقل جانتا ہے۔ کہ قلم والے نے لکھا۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ قلم والا حکم دے رہا ہے مگر عارف جانتا ہے کہ قلم تو کاتب کے ہاتھ میں ہے اور کاتب خالق کے قبضہ میں۔ شعر

گرچہ تیر از کمان ہے گزرد از کماندار بیند اہل خرد

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دنیوی اسباب مظہر اسماء الٰہی ہیں۔ سورج اسم حی کا مظہر ہے۔ زہرہ۔ مرید کا۔ عطارد۔ مسقط کا۔ مریخ۔ قادر کا اور مشتری علیم کا زحل جواد کا۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ اصول اسماء چار ہیں۔ حیات۔ علم۔ قدرت اور ارادہ اسرافیل مظہر حیات ہیں اور جبریل مظہر علم وقول۔ اسی لئے انہیں روح القدس اور روح الامین کہتے ہیں۔ اور وہ حامل وحی ہیں۔

اور میکائیل مظہر ارادہ جس میں جود شامل ہے۔ اس لئے وہ رزق پر مقرر ہیں۔ اور عزرائیل مظہر قدرت اسی لئے وہ جابرین ومتکبرین کو موت دے کر ذلیل کرتے ہیں۔ (روح البیان) انسان میں خیر وشر دونوں کی قوتیں ہیں۔ خیر کا مرکز قلب اور شر کا مرکز نفس امارہ ہے۔ شیطان اور برے ساتھی شر کو قوت دیتے ہیں۔ اور انبیاء کرام اور مقررہ فرشتہ خیر کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان میں آپس میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے۔ اگر رب چاہتا تو یہ کچھ نہ ہوتا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ حضرات انبیاء کی عطا میں فرق نہیں۔ اور نہ بینات میں تفریق ہے۔ وہ سب کے پاس پہنچیں اور نبیوں نے سب پر جود وکرم کیا۔ مگر لوگوں کے اخذ میں فرق ہے۔ کسی کو فیض حاصل کرنے کی توفیق ہے کسی کو نہیں۔ اس لئے رب تعالیٰ نے فرمایا۔ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا سورج کی روشنی اور شعاعوں کی پہنچ ہر جگہ ہے مگر چمگادڑ میں یہ نور لینے کی توفیق نہیں۔ اور لینے والے اپنی حیثیت کے مطابق فیض لیتے ہیں۔ اگر رب چاہتا تو سب کو یہ توفیق بخش دیتا۔ مگر یہ حکمت خلق کے خلاف ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ
اے وہ لوگو جو ایمان لائے خرچ کرو اس میں سے جو دیا ہم نے تم کو پہلے سے اس کے کہ آئے وہ دن کہ نہیں ہے
اے ایمان والو اللہ کی راہ میں ہمارے دیئے میں سے خرچ کرو وہ دن آنے سے پہلے جس میں
لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾
تجارت بیچ اس کے اور نہ دوستی اور نہ سفارش اور کفار ہی ظالم ہیں
نہ خرید وفروخت ہے نہ کافروں کیلئے دوستی اور نہ شفاعت اور کافر خود ہی ظالم ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** بہت دور سے جہاد کا ذکر چلا آ رہا ہے جس میں جان ومال خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور یہ دونوں چیزیں نفس پر گراں ہیں۔ لہٰذا جانی قربانی کے بعد اب مالی قربانی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں ہمیشہ دینی اختلاف رہے گا جس کی وجہ سے ان میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہے گی۔ اب مسلمانوں کو جہاد کفار کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ کہ اپنا مال خرچ کر کے ان کے مقابلہ کی تیاری کرو۔

تفسیر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا چونکہ اس آیت میں عمل یعنی صدقہ کا حکم دیا جا رہا ہے اور کوئی نیکی بغیر ایمان قبول نہیں ہوتی۔ اس لئے انہیں بصفت ایمان پکارا۔ اعمال میں بدنی اعمال کے بعد مالی اعمال کا درجہ ہے۔ مال کمانا سب جانتے ہیں مگر خرچ کرنا کوئی کوئی جانتا ہے۔ اور جسے خرچ کرنا آ گیا اس نے دین ودنیا کی بھلائی جمع کر لی۔ حضرت صدیق وعثمان غنی خرچ کی برکت سے بڑے درجات لے گئے۔ اس لئے رب نے بہت اہتمام سے مسلمانوں کو پکار کر خرچ کا حکم دیا۔ نیز اچھے القاب سے سننے والے کو خوشی ہوتی ہے۔ اور بولنے والے کا کرم ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ اے وہ لوگو جو رب پر ایمان لا چکے خیال رہے کہ پکارنا کبھی سوتے کو جگانے کے لئے ہوتا ہے کبھی غافل کو متوجہ کرنے کے لئے بھی۔ اظہار کرم کے لئے بھی۔ اظہار

غضب کے لئے۔ کبھی کچھ مانگنے کے لئے۔ یہاں یہ ندایا غافلوں کو متوجہ کرنے کے لئے یا اظہار کرم کے لئے۔ اور جیسے رب تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نام سے پکارا مگر ہمارے حضور ﷺ کو خصوصی صفات سے۔ ایسے دوسری قوموں کو ان کے خاندانی ناموں سے پکارا مگر محبوب کی امت کو صفت ایمان سے۔ دوسروں سے فرمایا یابنی اسرائیل اور ہم کو پکارا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یہ نہ فرمایا یا اے پٹھانو۔ اے شیخو وغیرہ کہ رب کے نزدیک ایمان اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ جسے یہ نعمت ملی۔ اسے سب کچھ مل گیا۔ اَنْفِقُوْا یہ انفاق سے بنا جس کا مادہ نفقٌ ہے بمعنی بکھرنا پراگندہ ہونا۔ اس کی پوری تحقیق سورہ بقر کے شروع میں یُنْفِقُوْنَ کی تحت میں ہو چکی۔ اگر اس سے زکوٰۃ مراد ہے تو یہ امر وجوبی ہے۔ اور اگر دیگر صدقات مقصود ہیں۔ تو استحبابی اور اگر جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے تو یہ امر مطلق ہے۔ کیونکہ حاجت کے وقت جہاد میں خرچ کرنا فرض ہے ورنہ مستحب نیز اگر اس سے زکوٰۃ مراد ہے تو صرف مالداروں سے خطاب ہے۔ ورنہ عام غربا سے بھی کہ ان پر بھی اہل وعیال کا نفقہ واجب دیگر نفلی صدقات وخیرات مستحب غرضیکہ اَنْفِقُوْا میں تین چار احتمال ہیں۔ اور ہر احتمال کے ماتحت صدہا مسائل ہیں۔ صدقات واجبہ میں خرچ کرنا۔ اس کی تفسیر حضور ﷺ کی زندگی اور آپ کے احکام ہیں۔ منکرین حدیث اس اَنْفِقُوْا کی تفسیر ہرگز نہیں کر سکتے۔ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ۔ اَنْفِقُوْا کے متعلق ہے۔ مِنْ تبعیضیہ اور مَا موصولہ ہے۔ رَزَقْنَا۔ رزقٌ سے بنا۔ بمعنی حصہ و عطیہ یعنی ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ حصہ خرچ کرو۔ خیال رہے کہ مال بالکل خرچ نہ کرنا۔ نہ اپنے پر اور نہ دوسرں پر امساک ہے۔ اور اپنے پر خرچ کرنا دوسروں پر نہ کرنا بخل ہے۔ یہ دونوں عیب بُرے ہیں۔ خود بھی کھانا۔ دوسروں کو بھی کھلانا سخاوت ہے۔ خود نہ کھانا دوسروں کو کھلانا جود ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی صفات ہیں۔ یہاں انفاق سے مراد سخاوت ہے۔ ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے اور ناجائز مقام پر خرچ کرنا تبذیر یہ بدترین عیوب ہیں۔ رب نے بخل و امساک سے بھی منع فرمایا۔ اور اسراف وتبذیر سے بھی۔ بلکہ درمیانی حالت میں انفاق کا حکم دیا۔ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ۔ جار مجرور اَنْفِقُوْا کے متعلق ہے۔ اور یومٌ سے قیامت مراد ہے نہ کہ انسان کی موت کا دن۔ کیونکہ مسلمانوں کی موت کے بعد بھی ثواب پہنچتے رہتے ہیں۔ بعض ثواب تو اپنے اعمال کے جیسے صدقہ جاریہ کے ذریعہ اور بعض ثواب لوگوں کے عطا کئے ہوئے۔ جیسے ختم ممات اور ایصال ثواب کے ثواب یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا۔ مگر قیامت کا دن وہ ہوگا۔ جس میں یہ سارے سلسلے بھی منقطع ہو جائیں گے آیت کا مقصد یہ ہے کہ اے مسلمانو! قیامت آنے سے پہلے صدقات وخیرات کرلو۔ خواہ وہ صدقات تمہیں صرف زندگی میں ہی مفید ہوں یا بعد موت بھی ان کا ثواب تمہیں پہنچتا رہے۔ یوم بمعنی وقت بھی آتا ہے۔ اور بمعنی دن بھی یہاں دونوں بن سکتے ہیں۔ کیونکہ اس دن سورج طلوع ہوگا۔ لہٰذا وہ دن ہوگا نہ کہ رات لَا بَیْعٌ فِیْهِ۔ بیع کے معنی مبادلہ مال بالمال ہیں۔ یعنی تجارتی لین دین۔ کبھی فدیہ کو بھی مجازاً بیع کہتے ہیں۔ یہاں اگر حقیقی معنی مراد ہوں تو یہ حکم مومن کافر سب کے لئے ہے کہ وہاں کوئی بھی مال سے اعمال نہیں خرید سکتا۔ اور اگر فدیہ مراد ہو جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ (حدید:۱۵) تو اس میں کفار سے خطاب کیونکہ وہاں انشاء اللہ مسلمانوں کا فدیہ کفار ہوں گے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ ہاں فدیہ مالی مومن کے لئے بھی نہ ہوگا۔ وَلَا خُلَّةٌ یہ لفظ خلل سے بنا بمعنی کشادگی دوستی کو خلت اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ دل کے وسط میں ہوتی ہے۔ یا اس لئے کہ وہ دل میں گھس جاتی ہے محبت کو بھی اسی لئے محبت کہتے ہیں کہ وہ حبۃ القلب۔ یعنی

قلب کے سیاہ دانہ میں ہوتی ہے۔ خلۃ سے خلیل اور حب سے حبیب مشتق ہے یہ نفی خاص کفار کے لئے ہے کہ مسلمانوں کی دوستیاں وہاں کام آئیں گی۔ رب فرماتا ہے۔ اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِيۡنَ (زخرف:۶۷) وَلَا شَفَاعَةٌ یہ شفیعٌ سے بنا بمعنی جوڑا اسی لئے طاق عدد کو فرد اور جفت کو شفع کہتے ہیں۔ سفارش کو اسی لئے شفاعت کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے مشفوع اکیلا نہیں رہتا۔ شفاعت کی نفی بھی کفار ہی کے ساتھ ہے۔ مسلمانوں کی شفاعت ہوگی۔ رب فرماتا ہے۔ فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيۡنَ (المدثر:۴۸) یہ ہی بتانے کے لئے فرمایا جارہا ہے۔ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ کافر ہی ظالم ہیں۔ کافر بمعنی منکر ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہاں منکر زکوٰۃ مراد ہو۔ اسی لئے روح البیان نے اس کی تفسیر میں فرمایا۔ اے التَّارِكُوۡنَ لِلزَّكٰوةِ۔ ھم حصر کے لئے اور الظّٰلِمِيۡنَ کا الف لام عہدی ہے۔ یہ لفظ ظلمٌ سے بنا۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کے غیر محل میں خرچ کرنا یا مالک کی بلا اجازت صرف کرنا کبھی منع کرنے کو بھی ظلم کہہ دیتے ہیں جیسے اٰتَتۡ اُكُلَهَا وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـئًا (کہف:۳۳) (کبیر) یعنی کافر ہی اپنے نفس یا مساکین پر ظلم کرتے ہیں۔ یا کافر ہی بخیل ہوتے ہیں۔ خیال رہے کہ کافر کو دو وجہ سے ظالم فرمایا گیا۔ ایک یہ کہ ظالم کی ساری چیزیں اللہ کی ہیں۔ اور انسان اللہ کے بندے۔ فرمانبردار بندے کو مالک کی چیزیں استعمال کرنے کا حق ہوتا ہے۔ نافرمان کو حق نہیں ہوتا۔ کافر نافرمان بندہ ہے۔ اس کا اللہ کی چیزوں کو استعمال کرنا ناحق ہے۔ اور کسی کی چیز ناحق پر خرچ کرنا ظلم ہے۔ دوسرا اس لئے برات کی دعوت کھانے کا اس کو حق ہے جو دولہا سے تعلق رکھتا ہے۔ تعلق نہ رکھنے والا چور بن کر کھاتا ہے۔ مہمان بن کر نہیں۔ عالم برات ہے۔ اور محمد مصطفیٰ ﷺ دولہا۔ مسلمان ان کے بندے غلام ہیں۔ کفار ان کے دشمن لہٰذا کفار جو کچھ کھا رہے ہیں وہ چور بن کر ظلماً کھا رہے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو ہماری دی ہوئی نعمتوں میں سے حسب موقعہ خرچ کرو۔ اور اس دن سے پہلے خیرات کرلو۔ جس میں نہ تجارت ہوگی کہ کچھ کما کر خیرات کرو یا کسی سے اعمال خرید کر نامہ اعمال بھرلو۔ اور منکرین زکوٰۃ یعنی کفار کے لئے کسی کی دوستی بھی کام نہ آئے گی۔ جس کا وہ یہاں بھروسہ کئے بیٹھے ہیں۔ اور نہ انہیں کسی کی سفارش ہو اور بخیل کافر تو بڑے ہی ظالم ہیں۔ کہ فقراء کا حق مار کر ان پر ظلم کرتے ہیں۔ شرک کفر کر کے اپنی جان پر ظلم کرتے ہیں۔ بغیر اذن خداوندی مال خرچ کر کے اپنے پر ظلم کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ دنیوی مقدمات میں تین ہی چیزوں سے کام لیا جاتا ہے۔ رشوت۔ دوستی۔ سفارش۔ حاکم کی مٹھی گرم کردی چھوٹ گئے۔ حاکم کے ساتھ دوستی ہے۔ اس نے رعایت کردی۔ حاکم کے پاس کوئی زبردست سفارش پہنچی۔ جس سے جرم معاف ہوگیا۔ یہاں ان تینوں کی نفی فرما کر بتایا گیا کہ وہاں کوئی حیلہ کارگر نہ ہوگا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** شفاعت اور محبت کا کام نہ آنا کفار کے لئے ہے جیسا کہ وَالۡكٰفِرُوۡنَ الخ سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** عوام کو سارا مال خیرات نہ کرنا چاہیے بلکہ بعض جیسا کہ مِمَّا سے پتہ لگا۔ **تیسرا فائدہ:** صدقہ حلال مال سے چاہیے نہ کہ حرام مال سے جیسا کہ رزقنا میں رزق کو رب کی طرف نسبت دینے سے معلوم ہوا۔ کیونکہ اگر چہ ہر مال خدا کا ہی عطیہ ہے مگر اس کی طرف نسبت صرف حلال مال کی کی جاتی ہے۔ **چوتھا**

فائدہ: بخل صفت کفار ہے۔ جیسا کہ اس جگہ کفار کے ذکر کرنے سے معلوم ہوا جس مسلمان میں یہ عیب ہو جلد دور کرے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت اور دوستی اور شفاعت مسلمانوں کے لئے بھی نہ ہوگی کیونکہ یہاں مسلمانوں کو خطاب فرمایا گیا یٰٓ اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ یا کہ یٰٓ اَیُّھَا النَّاسُ نہ ارشاد ہوا۔ **جواب:** ان نعمتوں سے کفار ہی محروم ہیں ورنہ ساتھ ہی کافروں کا ذکر نہ فرمایا جاتا۔ دیگر آیات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو اس لئے خطاب فرمایا گیا کہ وہ زکوٰۃ کا انکار کر کے کافر نہ بنیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ یوم سے مراد انسان کی موت کا دن ہو۔ یعنی اس دن سے پہلے خرچ کرلو۔ جبکہ تم نہ تو کسی کی دولت دے کر اس کی زندگی کا ایک سانس خرید سکو اور نہ ملک الموت سے دوستی کی بنا پر ایک دم کی مہلت لے سکو۔ اور نہ انہیں کسی کی سفارش سے ایک آن کے لئے ٹال سکو۔ اس کی تفسیر وہ آیت ہے۔ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ الخ (منافقون:۱۰) اور ہوسکتا ہے کہ یوم سے قیامت کے دن کا اوّل وقت مراد ہو۔ جبکہ عدل کا ظہور ہوگا۔ اس وقت نہ شفاعت ہوسکے نہ دوستی کام آئے۔ قیامت میں پھر فضل کا ظہور ہوگا۔ تب وہاں بیع بھی ہوگی کہ تین پیسہ قرضہ کے عوض مقروض کی سات سو نمازیں قرض خواہ کو دی جائیں گی۔ (شامی) اور دوستی و محبت بھی کام دے گی۔ رب فرماتا ہے۔ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ (زخرف:۶۷) اور فرماتا ہے یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (شعراء:۸۹) اور شفاعت بھی ہوگی۔ حتیٰ کہ کعبہ معظمہ و قرآن و رمضان بھی شفاعت کریں گے۔ رب فرماتا ہے۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (بقرہ:۲۵۵) **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافر ہی ظالم ہیں۔ حالانکہ بعض مسلمان بھی بڑے بڑے ظلم کرتے ہیں۔ **جواب:** یہاں ظلم سے خاص ظلم مراد ہے۔ جیسا کہ تفسیر میں گزر چکا ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حرام مال خدا کا رزق نہیں۔ کیونکہ یہاں رزق میں سے خیرات کرنے کا حکم دیا گیا اور حرام کمائی سے خیرات کرنا حرام ہے۔ (معتزلہ) **جواب:** اس کا جواب تیسرے فائدہ میں گزر چکا ہے کہ یہ اضافت تشریفی ہے۔

چوتھا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو قیامت آنے سے پہلے خیرات کرنی چاہیے۔ اس میں تو بعد موت کا زمانہ بھی داخل ہے کہ وہ بھی قیامت سے پہلے ہی ہے۔ حالانکہ بعد موت خیرات کون کرسکتا ہے۔ لہٰذا یہاں موت سے مراد اپنی موت کا دن ہونا چاہیے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو مر گیا اس کی قیامت تو آگئی۔ **جواب:** قیامت سے پہلے یعنی موت کے بعد اگرچہ عمل کا وقت نہیں مگر اعمال کے ثواب ملنے کا وقت تو ہے۔ جیسے صدقات جاریہ کے ثواب مگر قیامت میں نہ عمل ہوگا۔ نہ عمل کا ثواب پہنچے۔

تفسیر صوفیانہ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ مال والوں کی خصوصیت نہیں۔ لہٰذا انفقوا اور مَا رَزَقْنَا کے عام معنی ہی کرنے چاہئیں۔ جس پر امیر و غریب سب عمل کرسکیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو ہماری دی ہوئی نعمت میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو۔ مال' بدن' نفس' وقت' سانس' خیالات میں سے زکوٰۃ نکالو۔ چوبیس ۲۴ گھنٹے میں سے کچھ ساعتیں

ہمارے ذکر کے لئے وقف کردو۔ چوبیں ہزار سانسوں میں سے کچھ سانس ہماری راہ میں خرچ کرو۔ چلنے۔ چھونے۔ دیکھنے۔ بولنے۔ سمجھنے کی قوتیں جو تم کو ملی ہیں۔ یہ ہماری دی ہوئی روزیاں ہیں۔ ان سب میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو۔ کہ کچھ ہمارے لئے بولو۔ ہمارے لئے چلو۔ ہمارے لئے چھوؤ۔ ہمارے لئے دیکھو۔ ہمارے لئے سوچو۔ چونکہ دنیا میں کمائی کے تین ہی طریقے ہیں۔ تجارت دوستوں کے ہدیہ بڑوں کی مدد۔ انہیں تین کی نفی کردی گئی۔ کہ قیامت میں ان میں سے کچھ نہ ہوگا۔ خیال رہے کہ بدزعیب بخل ہے کہ یہ کبھی کفر تک پہنچادیتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جیسے رب نے بعض لوگوں کو ان کی ضرورت سے زیادہ مال دیا جنہیں غنی کہا جاتا ہے اور بعض کو ان کی ضرورت سے کم دیا جنہیں فقیر کہا جاتا ہے۔ یوں ہی رب نے اندرونی روزی یعنی اعمال وکمال بعض کو ان کی ضرورت سے زیادہ بخشی ہے۔ جیسے حضرات انبیاء' صحابہ' اولیاء اور بعض کو ان کی ضرورت سے کم جیسے ہم گنہگار۔ پھر جیسے اغنیاء کو حکم دیا کہ اپنے مال میں غریبوں کو شریک کرلو۔ تم ان کی روزی کا وسیلہ ہو۔ ہم بلاوسیلہ انہیں بھی دے سکتے تھے۔ مگر تمہیں ثواب دینے کے لئے انہیں فقیر تمہیں غنی کیا۔ ایسے ہی باطنی اغنیاء کو حکم دیا کہ اپنے اعمال وکمال میں گنہگاروں کا بھی حصہ رکھو۔ اس آیت میں ان سے بھی خطاب ہے کہ ہماری دی ہوئی روزی یعنی اعمال وکمال میں سے گنہگاروں پر خرچ کرو۔ اس لئے حضور علیہ السلام اپنی امت کی طرف سے بھی قربانی فرماتے تھے۔ لہٰذا اس آیت سے ایصال ثواب بھی ثابت ہے۔

حکایت: کسی بزرگ نے شیطان سے پوچھا۔ کہ تو لوگوں کو کس طرح بہکاتا ہے۔ وہ بولا تین ذریعوں سے۔ بخل' غصہ اور نشے میں۔ غصہ ور آدمی کو ایسا گھماتا ہوں جیسے بچے گیند کو اور نشہ والے آدمی کو ایسے ہانکتا ہوں جیسے چرواہا بکریوں کو محمد بن اسمٰعیل بخاری سے روایت ہے کہ رب تعالٰی نے حضرت جبرائیل سے پوچھا کہ اگر ہم تم کو زمین پر رکھتے تو تم کیا کرتے۔ عرض کیا کہ تین کام' غریبوں کی مدد کرتا۔ خلق کے عیب چھپاتا۔ پیاسوں کو پانی پلاتا (روح البیان) نیز یہاں خرچ کا تو حکم دیا مگر اس کا مصرف نہ بتایا۔ کیونکہ ہر خرچ کا مصرف جداگانہ ہے۔ صدقات کا مصرف فقراء ہدیہ کا مصرف اہل قرابت۔ جان کا مصرف جہاد کا میدان' سانس کا مصرف ذکر رحمٰن غرضکہ بیشمار مصرف ہیں۔ ان سب کا اجمال یہ ہے کہ ساری نیکیوں کا مصرف رضاء خدا ومصطفٰی علیہ السلام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس عبادت سے وہ محبوب راضی ہوجائیں۔ وہ ہی درست ہے۔ باقی برباد رب فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (التوبہ: ۶۲) نماز روزہ سے یہ ہی مقصود ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب فرمایا۔ شعر

مجھے فکر کب تھا رکوع کا مجھے کام کیا تھا سجود سے کسی نقش پا کی تلاش تھی جو جھکا رہا میں نماز میں
در مصطفٰی پہ رکھا جو سر تو ندا ہوئی کہ اے بے خبر تیرے وہ بھی سجدے ادا ہوئے جو قضا ہوئے تھے نماز میں

بظاہر وہ عابد معبود ہیں۔ مگر درحقیقت عابدوں کے اصل مقصود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کیا خوب کہا۔ شعر

نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر
وہ بزم طیبہ میں لاکھ بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ۬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اللہ نہیں ہے کوئی معبود سوا اس کے زندہ قائم رکھنے والا نہیں پکڑتی ہے اس کو اونگھ اور نہ نیند
اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ آپ زندہ اور اوروں کا قائم رکھنے والا اسے نہ اونگھ آئے اور نہ نیند
لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ
واسطے اسی کے ہیں جو بیچ آسمانوں کے اور بیچ زمین کے ہیں کون ہے وہ جو کہ شفاعت کرے نزدیک اس کے مگر ساتھ اجازت اسکی کے
اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے بے اس کے حکم کے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: اس سے پہلے انبیاء کرام کے مراتب کا ذکر تھا۔ اور ان کی اطاعت فرمانبرداری کا حکم۔ اب رب کی ذات وصفات کا تذکرہ ہے کیونکہ ذکر نبوت بغیر ذکر توحید اور ذکر توحید بغیر ذکر نبوت مکمل نہیں۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ قیامت میں کفار کے لئے شفاعت نہ ہوگی۔ اس سے جہاں اس دن کی عظمت کا پتہ چلا وہاں ہی رب تعالیٰ کی عظمت شان معلوم ہوئی کہ اس کے سامنے کسی کو بلا اجازت دم مارنے کی اجازت نہیں۔ اب اس آیت الکرسی میں اسی عظمت ذات اور کمال صفات کا صراحۃً ذکر ہے گویا یہ آیت پچھلی آیت کی تاکید ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیت میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فرما کر مسلمانوں کو اعمال کا حکم دیا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ بغیر درستی عقائد عمل درست نہیں۔ لہٰذا اب ذات وصفات کا ذکر فرمایا کہ اس پر ایمان لائیں۔ **چوتھا تعلق**: قرآن کریم کا طریقہ ہے کہ علم توحید علم احکام علم قصص ملا کر بیان فرماتا ہے۔ تاکہ سننے والا ایک مضمون سے اُکتا نہ جائے۔ اب تک انبیاء کرام کے قصے اور شرعی احکام بیان فرمائے۔ اب توحید کا ذکر ہے۔ وہ ہی بازار مکمل ہے۔ جس میں ہر قسم کی دکانیں یکجا ہوں۔ **پانچواں تعلق**: پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ تمام کفار ظالم ہیں جس سے معلوم ہوا کہ کفار بہت قسم کے ہیں۔ رب کے منکر توحید کے منکر رب کی صفات کے منکر انبیاء کی شفاعت کے منکر سب کافر ہی ہیں۔ اس آیت کریمہ میں ان تمام قسم کے کفار کی پرزور تردید ہو رہی ہے۔

تفسیر

اَللّٰهُ رب تعالیٰ کے سارے نام صفاتی ہیں۔ اور یہ اسم ذات اسی لئے قادر علیم رحیم وغیرہ مخلوق کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اللہ کسی کو نہیں کہہ سکتے۔ اس لفظ کی پوری تفسیر ہم بسم اللہ میں کہہ چکے۔ خیال رہے کہ اسماء الٰہیہ میں مختلف تاثیریں ہیں۔ اللہ تزکیہ نفس کے لئے بہت مجرب ہے۔ اسم ذات یعنی اللہ کے نام کا نقش جو ۱۸ سے شروع ہو کر ۲۶ پر ختم ہوتا ہے۔ اور پندرہ کے نقش کی چال سے بھرا جاتا ہے۔ ہر مقصد کے حصول کے لئے اکسیر اعظم ہے۔ بعض نے اللہ کو اسم اعظم مانا ہے۔ کہ یہ ذاتی نام ہے۔ باقی صفاتی ذات اعظم ہے۔ یہاں یہ مبتدا ہے۔ اور آئندہ جملہ اس کی خبر لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلٰهَ کے معنی ہیں معبود خیال رہے کہ معبود سے مراد لائق عبادت ہے۔ نہ وہ جس کی عبادت ہوتی ہو۔ کیونکہ رب تعالیٰ معبود ازلی ہے اور مخلوق حادث جب کوئی عابد نہ تھا اس وقت اس کی معبودیت میں کمی نہ تھی۔ رب کی تمام صفات کا یہ ہی حال ہے چنانچہ وہ ہمیشہ سے رزاق۔ سمیع۔ علیم۔ بصیر ہے۔ اگرچہ

مرزوق، مسموع، مبصر حادث ہیں۔ وہ رازق ہے خواہ کوئی اس سے روزی لے یا نہ لے۔ آفتاب چمکانے والا ہے کوئی اس سے چمکے یا نہ چمکے غرضیکہ چمکانا صفت اور ہے چمکانا فعل اور فعل چمکانا چمکنے والے پر موقوف ہے۔ مگر صفت اس پر موقوف نہیں۔ اسی طرح صفات الٰہیہ قدیم ہیں۔ افعال الٰہیہ حادث۔ دیکھو انسان سونے میں بھی بصیر ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت کچھ نہیں دیکھ رہا۔ دیکھنا اور ہے۔ دیکھنے والا ہونا کچھ اور ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ یہاں اللہ سے سچا معبود مراد ہے کیونکہ جھوٹے معبود تو بت وغیرہ بھی ہیں۔ یعنی اس کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ عبادت کے معنی ہیں انتہائی عجز و نیاز۔ عابد انتہائی عاجز۔ معبود انتہائی عزت والا جس کے سامنے دوسرے انتہائی عاجزی کریں۔ بندہ جو کام اپنے کو بندہ سمجھ کر اور دوسرے کو رب یا رب کی مثل سمجھ کر کرے وہ عبادت ہے۔ سجدۂ تعظیمی عبادت نہیں۔ وہ تو دوسری شریعتوں میں جائز تھا۔ مگر سجدۂ تعبدی عبادت ہے۔ وہ ہمیشہ اللہ ہی کو کیا گیا۔ کسی آسمانی دین میں غیر اللہ کو جائز نہ ہوا۔ دونوں سجدوں میں فرق صرف نیت کا ہے۔ محترم سمجھ کر سجدہ تعظیمی ہے۔ ربّ یا ربّ کی مثل سمجھ کر سجدہ تعبدی ہے۔ مشرکین سورج، گنگا وغیرہ کو ربّ کی مثل سمجھ کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (الشعراء:۹۸) اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ یہ اللہ کی خبر بعد خبر ہے۔ حي اصل میں حیو تھا۔ واؤ ی ہو کر ی میں مدغم ہو گیا۔ یہ حیات سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ زندگی۔ تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ ہر کامل کو حي کہا جاتا ہے۔ اسی لئے زمین کے آباد کرنے کو احیاء اموات کہتے ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (الروم:۵۰) چونکہ زندگی ہی جسم کا کمال ہے۔ اور وہ تمام صفات کا موقوف علیہ ہے۔ اسی لئے اسے بھی حیات کہہ دیتے ہیں۔ درختوں کی سرسبزی کو بھی حیات کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب ہے۔ اپنی صفات میں کامل کہ وہ اور اس کی صفات حقیقیہ و صفات اضافیہ قابل عدم نہیں۔ اور نہ اس کے کمال کی کوئی حد بندی ہے۔ اَلْقَيُّوْمُ یہ قیام کا مبالغہ ہے۔ خیال رہے کہ قائم کے تین مبالغے ہیں۔ قیوم قیام اور قیم جیسے دار کا مبالغہ دیار۔ دیور اور دیر یہ اصل میں قیووم تھا۔ بروزن فیعول واؤ ی ہو کر ی میں مدغم ہوا (کبیر) اس کے معنی خود قائم اور سارے عالم کا قائم رکھنے والا کہ سب اسی سے قائم ہیں۔ نہ وہ کسی میں ہے نہ کسی سے ہے۔ بلکہ سب اس سے ہیں۔ اس کا وجود کسی پر موقوف نہیں۔ موجودات تین طرح کے ہیں بعض وہ جو دوسرے سے قائم ہیں۔ جیسے جسم کا رنگ و بو یا اجسام کا سایہ کہ رنگ و بو تو اپنے محل کا محتاج ہے۔ اور سایہ تین چیزوں کا حاجتمند۔ سایہ دار جسم کا۔ نور کا اور اس محل کا جہاں سایہ پڑے۔ انہیں عرض کہتے ہیں۔ دوسرا وہ جو بغیر کسی محل کے خود موجود ہیں۔ جیسا اجسام انہیں جوہر یا قائم بالذات کہا جاتا ہے۔ تیسرے وہ جو خود بھی آپ موجود اور اس سے دوسرے موجود اسے قیوم کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ قیوم حقیقی ہے کہ اس کے ارادہ و اذن سے عالم موجود و قائم ہے۔ اور بعض حضرات اولیاء قیوم بالعرض ہیں جن کے ذریعہ عالم کو ربّ نے قائم رکھا ہے یہاں قیوم حقیقی یعنی جہان کو رکھنے والا مراد ہے۔ یہ رب تعالیٰ ہی کی صفت ہے۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ تَاْخُذُ اَخْذٌ سے بنا بمعنی پکڑنا یہ کبھی غلبہ کے ساتھ ہوتا ہے جسے بطش کہتے ہیں اور کبھی عارضی یہاں ہر قسم کی پکڑ کی نفی ہے۔ سِنَةٌ وسنٌ سے بنا بمعنی غفلت اصطلاح میں نیند کے مقدمہ کو جس سے اعضاء بے قابو ہو جائیں اور پوری غفلت طاری نہ ہو۔ سِنَةٌ کہتے ہیں۔ بمعنی اونگھ۔

شاعر کہتا ہے۔ مصرع:

فِيْ عَيْنِهٖ سِنَةٌ وَّلَيْسَ بِنَائِمٍ

پوری غفلت کی نیند کو نوم کہتے ہیں۔ نیند سے پہلے اونگھ کا اس لئے ذکر کیا کہ اخذ کے معنی میں غلبہ بھی ہے۔ اور اونگھ اور نیند انسان پر غالب ہی آتی ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ جب اس پر نیند اور اونگھ جیسی چیزیں بھی غالب نہیں آتیں جو سلاطین اور شہنشاہوں کو بھی دبا لیتی ہیں تو اور کوئی چیز کیا غالب آسکتی ہے۔ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ یہ جملہ رب کی قیومیت اور اس کی معبودیت کا ثبوت ہے۔ یعنی آسمانوں وزمین کی ساری چیزیں اسی کی مخلوق اور اسی کی حقیقی مملوک ہیں۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ خیال رہے کہ کسی چیز کی طرف نسبت چار طرح ہوتی ہے۔ ملکیت کی' قبضہ کی' شئے کی' استحقاق کی' مالک کہتا ہے میرا مکان کرایہ دار کہتا ہے میرا مکان مالک کا بیٹا کہتا ہے میرا مکان۔ اور جس کے پاس گروی ہے وہ کہتا ہے میرا مکان۔ اس میں چار احتمال ہیں۔ ساری چیزیں اللہ کی مخلوق ہیں۔ اس کی مملوک ہیں۔ اس کی محکوم ہیں۔ اس کی عبادت گزار ہیں۔ پہلے اور چوتھے معنی سے یہ رب کی خاص صفت ہے۔ کوئی چیز کسی بندے کی نہ مخلوق ہے نہ عبادت گزار مگر دوسرے تیسرے معنی کی تجلی بعض بندوں میں پڑی ہے۔ چنانچہ ہم اپنے گھربار کے مالک وحاکم ہیں۔ حضرت سلیمان کو رب نے تمام جہان کا مالک وحاکم بنایا تھا۔ فرمایا وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ (انبیاء:۸۱) ہمارے حضور ﷺ کو تمام جہاں کا مالک بنایا۔ فرماتا ہے۔ اِنَّا اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (الکوثر:۱) ہم نے تم کو عالم کثرت بخش دیا۔ حضور غوث پاک فرماتے ہیں اللہ کے شہر میرا ملک میرے زیر فرمان ہے۔ یہ چیزیں نہ اس آیت کے خلاف ہیں۔ نہ غلط ہیں۔ رب مالک حقیقی ہے بندے مالک مجازی اگر چہ لفظ ما غیر عاقلین کے لئے وضع ہوا۔ مگر یہاں اس سے عاقل وغیر عاقل سب ہی مراد ہیں چونکہ عالم میں عاقل کی قسمیں کم اور غیر عاقل کی زیادہ ہیں۔ اس لئے سب کو لفظ ما سے تعبیر کر دیا گیا۔ اگر چہ آسمان بھی سات ہیں۔ اور زمین بھی سات چونکہ ہر آسمان کی حقیقت جداگانہ ہے۔ کوئی چاندی کا کوئی سونے کا اور ہر زمین کی حقیقت ایک یعنی مٹی۔ نیز ہر دو آسمانوں میں بہت فاصلہ ہے۔ اور زمین کے طبقے پیاز کے چھلکوں کی طرح چپٹے ہوئے لہٰذا آسمان کو جمع اور زمین کو واحد فرمایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آسمان وزمین کا مالک نہیں بلکہ سب کا مالک ہے چونکہ ہماری نگاہ عالم اجسام پر ہی ہے۔ اس لئے آسمانوں و زمین کا ذکر ہوا۔ کہ عالم اجسام انہی کے درمیان ہے۔ ورنہ رب تعالیٰ عالم اجسام۔ عالم انوار۔ عالم امر وغیرہ سب کا خالق و مالک ہے۔ خیال رہے کہ جس کا رب مالک وخالق ہے۔ ان سب کے حضور نبی ہیں۔ اپنے لئے فرماتا ہے۔ رب العالمین۔ حضور کے لئے فرماتا ہے۔ رحمۃ اللعالمین اور فرماتا ہے۔ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان ۱) وزیر اعظم کی وزارت ساری مملکت میں ہوتی ہے۔ کفار اپنے بتوں کی شفاعت کے امیدوار تھے۔ انکا عقیدہ تھا کہ چونکہ یہ بت حکومت الٰہیہ کے ممبر اور اس کے چلانے والے ہیں۔ اس لئے رب کو ان کی شفاعت ماننی پڑے گی۔ ان کی تردید کے لئے ارشاد ہوا۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ من استفہامیہ مبتداء ہے اور ذا خبر الذی ذا کی صفت ہے۔ یا بدل چونکہ مَن میں استفہام انکاری ہے۔ اس لئے اس کے بعد اِلَّا صحیح ہوا اذن بمعنی اجازت ہے۔ عندہٗ یا یشفعُ کے متعلق ہے۔ اور یا کسی محذوف کے (روح البیان) لہٰذا اس جملہ کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ کون ہے جو رب کے نزدیک بلا اجازت کسی کی سفارش کر سکے۔ دوسرا یہ کہ جو بندے رب کے نزدیک رہتے ہیں۔ ان میں سے بھی بغیر اجازت کون کسی کی سفارش کرسکتا ہے۔ جب نزدیکوں کا یہ حال ہے تو وہ بت جنہیں رب سے دور کا بھی تعلق نہیں وہ کیا شفاعت کر سکتے ہیں۔ (روح البیان) اس جملہ میں دھونس کی شفاعت کا

انکار ہے۔ اور شفاعت بالاذن کا ثبوت شفاعت کا انکار کرنا نادانی ہے۔

خلاصہ تفسیر

آیت الکرسی اول سے آخر تک کفار اور بد مذہبوں کا رد ہے۔ خالق کے منکر دہریوں کی تردید اللہ سے ہوئی۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ میں مشرکین کا رد ہے۔ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ منکرین کی صفات کی تردید ہے۔ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے مجوس کا رد ہے جو دو خدا مانتے ہیں ایک یزدان خالق خیر دوسرا اھرمن خالق شر معتزلہ کی بھی پوری تردید ہوگئی۔ جو ہر بندہ کو اپنے برے اعمال کا خالق مانتے ہیں۔ من ذالذی میں بتوں کی شفاعت ماننے والوں کی تردید ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِہٖ میں معتزلہ اور عام دیوبندی وہابیوں کا رد ہے جو شفاعت کے منکر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں وہ ہی ازلی ابدی زندہ ہے اور تمام عالم کا قائم رکھنے والا غفلت سے پاک نہ اسے اونگھ آئے نہ اس پر نیند غلبہ کرے۔ آسمانوں زمین کی ساری چیزیں اسی کی مخلوق و مملوک ہیں۔ اس کے دربار کے دبدبے کا یہ عالم ہے کہ کسی کو بلا اجازت دم مارنے کی بھی جرأت نہیں۔ لہٰذا مشرکین جو اپنے بتوں کی شفاعت کے بھروسہ میں ہیں۔ سخت غلطی پر ہیں۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہیں۔ بعض وہ ہیں۔ جن کی تجلی مخلوق پر نہیں پڑی اور ان کو کسی معنی سے مخلوق کے لئے استعمال نہیں کر سکتے جیسے واجب الوجود۔ معبود۔ خالق۔ قدیم۔ بعض کے نزدیک رحمان بھی اور بعض صفات وہ ہیں جن کی جھلک مخلوق پر ڈالی گئی اور مخلوق پر بھی ان کا بول دینا درست ہے۔ جیسے حی۔ سمیع۔ بصیر۔ مالک۔ ملک۔ عزیز رؤف رحیم آیۃ الکرسی میں جو رب کی پہلی صفت ہے لا الٰہ الا ھو۔ یہ پہلی قسم کی صفت ہے کہ کسی بندے کو اَللّٰہُ یالَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ نہیں کہہ سکتے۔ مگر حی وقیوم وغیرہ دوسری قسم کی صفات ہیں۔ کہ بندے پر بھی مجازاً بولی جاتی ہیں۔ دیکھو اونگھ و نیند نہ آنا رب کی بھی صفت ہے۔ اور اللہ نے فرشتوں کو اور بعد قیامت جنتیوں کو بھی یہ صفات بخشے ہیں۔ کہ نہ انہیں اونگھ ہے نہ نیند ایسے ہی آسمان و زمین کی ملکیت کہ رب نے بعض بندوں کو بخشی جیسے ابھی تفسیر میں عرض کیا گیا۔

شفاعت

ہم مسئلہ شفاعت پہلے سیپارہ میں وَلَا یُقْبَلُ مِنْھَا شَفَاعَۃٌ (بقرہ:۴۸) کی تفسیر میں بہت کچھ عرض کر چکے ہیں۔ یہاں چند ضروری باتیں بتاتے ہیں۔ کفار اپنے بتوں کے متعلق دو عقیدے رکھتے تھے۔ ایک یہ کہ ان میں الوہیت ایسے حلول کئے ہوئے ہے۔ جیسے پھول میں رنگ و بو اسی لئے ان کو آلہ اور شُرَ کا کہتے تھے اور خدا تعالیٰ الہ اکبر۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اکیلا اللہ تعالیٰ اتنا بڑا جہان نہ سنبھال سکتا ہے نہ چلا سکتا ہے۔ اس نے اپنی مدد کے لئے اپنے کچھ بندوں کو اپنا معاون و مددگار بنایا ہے اور ان میں کام تقسیم کر دیئے ہیں۔ ان بندوں میں بعض تو اللہ کی لڑکیاں ہیں۔ اور بعض اللہ کی بیویاں و بیٹے اور بعض اگرچہ ہیں تو نرے بندے ہی مگر الوہیت کی پارلیمنٹ کے ممبر ہیں۔ اسلئے انہیں خدا کا بندہ بھی کہتے ہیں۔ اور خدا کا شریک بھی انہی کی تردید کے لئے رب نے فرمایا لَمْ یَکُنْ لَّہٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ (اسراء:۱۱۱) اللہ نے مجبوری کی بنا پر کسی کو ولی نہ بنایا انہی کو ولی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فرمایا گیا۔ یہ عقیدہ صریحی شرک ہے۔ دوسرا یہ کہ چھوٹے خدا بڑے خدا کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ اور اس بڑے کو جبراً ان کی شفاعت ماننی پڑے گی۔ جیسے بادشاہ کو ارکان سلطنت کی سفارش اس لئے ماننی پڑتی ہے کہ ان کے بگڑ جانے سے زوال سلطنت کا اندیشہ ہے۔ اس آیت میں دونوں عقیدوں کا رد بلیغ فرمایا گیا۔ گویا فرمایا گیا کہ وہاں تو وہ ہی

شفاعت کر سکے گا۔ جسے اس کی اجازت مل چکی ہو۔ یعنی انبیاء ملائکہ اور مومنین غرضکہ دباؤ کی شفاعت کا انکار ہے۔ اور شفاعت بالوجاہت اور شفاعت بالمحبت جو شفاعت بالاذن کی قسمیں ہیں۔ ان کا ثبوت اگر شفاعت نہ ہو تو نماز جنازہ اور زیارت قبور اور مومنین کے لئے دعا سب بیکار ہو جائیں۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند کے جنازے کے لئے چالیس نمازیوں کا انتظار فرمایا اور فرمایا کہ جہاں چالیس صالح مسلمان جمع ہوتے ہیں وہاں کوئی ولی ضرور ہوتا ہے (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

شفاعت کون کرے گا: انبیاء۔ اولیاء۔ علماء۔ مشائخ۔ حجر اسود۔ قرآن مجید۔ خانہ کعبہ۔ ماہ رمضان۔ اور مسلمانوں کے نابالغ بچے۔ مقدمہ ہدایہ میں، مولوی عبدالحی صاحب نے لکھا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سنگ اسود کو چوم کر فرمایا کہ تو محض ایک پتھر ہے نہ نفع دے نہ نقصان تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ کہ میں نے حضور ﷺ کو فرماتے سنا۔ کہ قیامت میں اس کی آنکھیں اور منہ ہوں گے اور حاجیوں کی شفاعت کرے گا۔ (رواہ الحاکم) مگر چونکہ قیامت کے اول وقت جب سب نفسی نفسی پکارتے ہوں گے۔ حضور ﷺ ہی شفاعت کی ابتداء فرمائیں گے۔ اور دروازۂ شفاعت آپ ﷺ کے ہاتھ پر کھلے گا۔ اسی لئے آپ ﷺ کا لقب 'شفیع المذنبین' ہے۔

شفاعت کی قسمیں: شفاعت تین طرح کی ہوگی۔ بلندی درجات کے لئے اور معافی سیئات کے لئے۔ میدان محشر سے نجات دلانے کے لئے۔ پہلی شفاعت بے گناہوں کے لئے ہے۔ اور دوسری صرف گنہگار مسلمانوں کے لئے اور تیسری شفاعت سے فائدہ کفار بھی حاصل کریں گے۔ معلوم ہوا کہ سارا جہان حضور ﷺ کی شفاعت کا حاجتمند ہے۔ وہ جو حدیث میں ہے کہ تارک سنت شفاعت سے محروم ہے۔ اس سے پہلی شفاعت مراد ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ میری شفاعت گناہ کبیرہ والوں کے لئے بھی ہوگی۔ اس سے دوسری شفاعت مراد یعنی عفو سیئات (شامی کتاب الصلوٰۃ) جب سب شفیع شفاعت کر چکیں گے تب رب فرمائیگا کہ شفیع شفاعت کر چکے۔ اور جن کے قلب میں رائی کے برابر بھی ایمان تھا۔ انہیں بھی جہنم سے نکال کر لے گئے۔ اب ہماری باری ہے۔ تب اپنا ایک لپ جیسا اس کی شان کے لائق ہے جہنمیوں سے بھر کر جنت میں داخل فرمائے گا۔ اس میں وہ لوگ ہوں گے جو عنداللہ مومن تھے اور شرعاً غیر مومن جیسے زمانہ فترت کے موحدین اور وہ لوگ جن کے دل میں ایمان تھا۔ اور زبان سے اقرار کا موقعہ نہ ملا ممکن ہے کہ ابو طالب بھی اسی لپ میں ہوں کیونکہ یہ دل سے رسالت کے قائل تھے۔ اور حضور ﷺ کے آرام کی خاطر بظاہر ایمان نہ لائے تاکہ میری رعایت سے کفار مکہ حضور ﷺ کو ایذا نہ پہنچائیں۔ اس کی تحقیق کے لئے دیکھو رسالہ مبارکہ اسنی المطالب فی ایمان ابی طالب۔

شفاعت کب ہوگی: بعض گنہگاروں کو تو بغیر عذاب شفاعت پہنچ جائے گی۔ بعض کی مدت عذاب میں کمی ہو جائے گی۔ اور بعض گنہگار اپنی پوری سزا بھگت کر شفاعت پائیں گے۔ بعض جنت میں پہنچ کر شفاعت کی بدولت بلند درجے پائیں گے۔

فائدے

اس سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بندوں کے برے بھلے اعمال رب کی مخلوق ہیں۔ جیسا کہ لَهٗ مَا فِی

السَّمٰوٰتِ سے معلوم ہوا جب وہ ساری آسمانی زمینی چیزوں کا خالق ہے تو اعمال کا بھی خالق ہوا کہ وہ بھی اسی میں داخل ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** کفار کے لئے دعاء مغفرت کرنا ان پر نماز جنازہ پڑھنا انہیں مرحوم ومغفور کہنا حرام ہے کیونکہ یہ سب شفاعتیں ہی ہیں اور کفار کے لئے شفاعت منع۔ **تیسرا فائدہ:** رب کے لئے غفلت بے توجہی بے علمی محال ہے۔ جو کوئی ایک آن کے لئے اسے بے علم مانے وہ بے دین ہے۔ جیسے بعض دیوبندی جو رب کو ہر وقت عالم الغیب نہیں مانتے۔ دیکھو تقویت الایمان اور کتاب بلغۃ الحیر ان۔

حکایت: ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا کہ کیا رب کو نیند اور اونگھ آسکتی ہے حکم الٰہی پہنچا کہ تم اپنے ہاتھ میں دو پانی سے بھری ہوئی کچی شیشیاں لو۔ آپ نے اس پر عمل کیا۔ کچھ دیر بعد نیند کا جھونکا جو آیا تو ہاتھ سے شیشیاں گر کر ٹوٹ گئیں۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ جب تم نیند میں دو شیشیاں نہ سنبھال سکے تو اگر مجھے نیند آتی تو میں زمین وآسمان کیسے سنبھال سکتا۔ (کبیر وروح البیان) خیال رہے کہ یہ سوال اطمینان قلب کے لئے تھا نہ کہ بدعقیدگی سے انبیاء کرام پیدائشی عارف باللہ ہوتے ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب نے ہر چیز اپنے لئے بنائی وہ تو ان باتوں سے پاک ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ:۲۹) ہر چیز تمہارے لئے پیدا کی ان دونوں آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** یہاں لام ملکیت کا ہے اور خَلَقَ لَكُمْ میں نفع کا یعنی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے اور مخلوق کے نفع کے لئے خدا نفع حاصل کرنے سے پاک ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر چیز کا مالک رب تعالیٰ ہی ہے۔ پھر تم کیوں کہتے ہو کہ حضور ﷺ دونوں جہاں کے مالک ہیں۔ کیا وہ خدا کے شریک ہیں۔ (دیوبندی) **جواب:** رب کی ملکیت حقیقی ذاتی اور قدیم ہے۔ اس کی مخلوق کی ملکیت مجازی۔ عطائی اور حادث کہا جاتا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ قسطنطنیہ ترکوں کا ہے۔ یہ گھر میرا ہے یہ ہی معنی وہاں بھی ہیں۔ **تیسرا اعتراض:** مسئلہ شفاعت عقل کے خلاف ہے کیونکہ جو لوگ شفاعت سے بخشے جائیں گے۔ رب انہیں بخشا چاہتا تھا یا نہیں۔ اگر چاہتا تھا تو شفاعت بیکار ہوئی۔ وہ تو ویسے ہی بخشے جاتے اور اگر نہ چاہتا تھا تو رب تعالیٰ کی مجبوری لازم آئی کہ رب بخشنا تو چاہتا نہ تھا۔ شفیع کی وجہ سے اسے بخشنا پڑ گیا۔ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی۔ دوسرا تحقیقی۔ الزامی جواب یہ ہے کہ پھر تو دوائیں دعائیں بلکہ عالم کے تمام اسباب بیکار ہوئے۔ بیمار نے دوا کھائی۔ شفا پائی۔ بتاؤ رب نے اس کی شفا چاہی تھی یا نہیں۔ اگر چاہی تھی تو دوا کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہی آرام ہو جاتا۔ اور اگر نہ چاہی تھی تو خدا کے ارادے کے خلاف کیسے ہو گیا۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں بخشنا چاہا تھا۔ بذریعہ شفاعت کے۔ یعنی بخشش بھی رب کے حکم سے اور شفاعت بھی اس کے حکم سے ہے۔ رب نے بیمار کی شفا بھی چاہی اور دوا بھی۔ یہ معنی ہیں اسباب کے۔

چوتھا اعتراض: حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تارک سنت کی شفاعت نہ ہوگی اور فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ نہ دینے والے میرے پاس کندھوں پر مال لادے ہوئے شفاعت چاہنے آئیں گے ہم شفاعت سے انکار کر دیں گے۔ جب حضور ﷺ

ان معمولی مجرموں کی شفاعت نہیں کر سکتے تو گناہ کبیرہ والوں کی شفاعت کیسے کریں گے۔ **جواب:** ان حدیثوں میں وہ لوگ مراد ہیں جو سنت رسول اللہ کو حقیر جان کر چھوڑیں اور زکوٰۃ کے منکر ہوں۔ یہ دونوں کافر ہو گئے۔ اور کافر کے لئے شفاعت کیسی یا شفاعت سے رفع درجات والی شفاعت مراد ہے کہ تارک سنت اس سے محروم ہے۔ عفوسیئات کی شفاعت تو گناہ کبیرہ والوں کے لئے بھی ہوگی۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ یا یہ فرمان دھمکانے ڈرانے کے طور پر ہے۔

تفسیر صوفیانہ

توحید کے تین مرتبے ہیں۔ مبتدئین کی توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور متوسطین کی توحید لَا اِلٰـہَ اِلَّا اَنْتَ کیونکہ مقام شہود میں ہیں۔ کاملین جو فنافی الذات ہیں۔ وہ واحد حقیقی کی ندائیں سنتے ہیں۔ ان کی توحید لَا اِلٰـہَ اِلَّا اَنَا ہے۔ قطب الاقطاب کی توحید یاھو یامن ھُو ھُو یَا مَنْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ ہے جب بندہ قال سے گزر کر بزبان حال یہ کہتا ہے۔ تو عالم میں تصرف کرنے کا اسے حق حاصل ہوتا ہے علماء کرام لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ کے معنی کرتے ہیں۔ لا معبود الا ہو۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا ھُوَ وہ ہی موجود ہے۔ باقی سب اس کے ظل و پرتو ہیں۔ سب کی زندگی عارضی اس کی حیات عین ذات اور ہر ما سوا اس کی حیات سے زندہ۔ جیسا کہ مقابل آفتاب آئینہ کا نور آفتاب سے قائم ایسا ہی عالم اس سے قائم۔ اگر اس کا قیام نہ ہوتا۔ یا عالم کو اس سے نسبت نہ ہوتی تو کوئی شئی موجود نہ ہوتی۔ اسی لئے نہ اسے غفلت آئے نہ نیند کہ یہ موت کے مشابہ ہے۔ کہ اگر اس کو یہ عیوب عارض ہوں تو عالم فنا ہو جائے۔ افضل الذکر ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (روح البیان وابن عربی)

ھدایت ضروری: صوفیاء کی اصطلاح میں ولایت کا ایک درجہ قیومیت بھی ہے۔ اس درجہ والے لوگ قیوم عالم کہلاتے ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کی کتب میں بعض اولیاء کو قیوم اول اور قیوم دوم وغیرہ کہا گیا ہے۔ وہاں قیوم کے معنی ہی اور ہیں۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ کسی بندہ کو قیوم کہنا کفر ہے۔ ان کا یہ مطلب ہے کہ جس معنی سے خدا کو قیوم کہتے ہیں۔ اس معنی میں اوروں کو قیوم کہنا کفر ہے۔ خدا تعالیٰ عالم کا قائم رکھنے والا ہے۔ لہٰذا وہ قیوم ہے۔ ان حضرات کے ذریعہ عالم قائم ہے۔ جیسے مرکز سے دائرہ اور دیوار سے چھت۔ لہٰذا وہ قیوم عالم ہوئے۔ چونکہ آسمان و زمین مثل دائرہ گول ہیں۔ اور دائرہ میں مرکز قطبین وغیرہ سب ہی ہوتے ہیں ایسے ہی عالم میں ابدال اوتاد و قطب اور قیوم ہونا ضروری ہیں۔ جن سے عالم باقی رہے۔ دیکھو رب کا نام بھی علی ہے۔ سیدنا علی المرتضیٰ کو بھی علی کہتے ہیں۔ ان دونوں کے معنی میں بڑا فرق ہے۔ آیۃ الکرسی کے فضائل آئندہ بیان ہوں گے۔ ان حضرات کے نزدیک قطب عالم یا قیوم عالم سے تمام جہاں اسی طرح قائم ہے جیسے خیمے کی چوب سے خیمہ۔ یا دل سے تمام جسم کہ خیمے اور جسم کو رب تعالیٰ ہی قائم رکھے ہوئے ہے، مگر ان اسباب کے ذریعہ سے یہ بات ضرور خیال رکھیں کہ اسی لفظ قیوم پر بہت دھوکا ہوتا ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ شفاعت بہت قسم کی ہے۔ دھونس کی شفاعت یعنی جبری شفاعت، شفاعت بالمحبت۔ شفاعت بالوجاہت۔ دھونس کی شفاعت کی یہاں نفی ہے۔ شفاعت بالمحبت و شفاعت بالوجاہت کا ثبوت رب تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے لئے فرماتا ہے۔ وَکَانَ عِنْدَ اللّٰہِ وَجِیْھًا (احزاب: ۶۹) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے فرمایا ہے۔ وَجِیْھًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (ال عمران: ۴۵) محبت کے

متعلق فرماتا ہے۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْعَنْهُ. (مائدہ ۱۱۹) اور فرماتا ہے يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ (مائدہ: ۵۴) اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا دھونس کی شفاعت ماننا کفر و شرک ہے۔ مگر محبت یا وجاہت کی شفاعت محبوب بندوں کے لئے ماننا ایمان ہے۔ کعبہ کی طرف سجدہ کرنا ایمان ہے۔ بت کی طرف سجدہ کرنا کفر۔ زمزم کی تعظیم ایمان ہے، گنگا کی تعظیم کفر۔ رمضان کا احترام ایمان ہے۔ ہولی دیوالی کا احترام کفر ہے افعال یکساں ہیں مگر نیت جداگانہ۔ اسی طرح بتوں کی شفاعت ماننا کفر ہے۔ اور حضرات انبیاء و اولیاء کی شفاعت ماننا ایمان۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا
جانتا ہے اس کو جو درمیان ہاتھوں ان کے ہے اور جو پیچھے ان کے اور نہیں گھیر سکتے وہ کسی چیز کو علم سے اس کے مگر ساتھ اس کے
جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے مگر جتنا
بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ
کہ چاہے گھیر لیا ہے کرسی نے اس کی آسمانوں اور زمین کو اور نہیں بھاری ہوتی ہے اسے حفاظت ان کی
وہ چاہے اس کی کرسی میں سمائے ہوئے آسمان اور زمین اور اسے بھاری نہیں ان کی نگہبانی
وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾
اور وہ بلند عظمت والا ہے
اور وہی ہے بلند بڑائی والا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلے جملہ میں رب تعالیٰ کی چند صفات کا ذکر ہوا۔ اب اس کی صفت علم کا ذکر ہے کہ بغیر علم سلطنت وغیرہ نہیں چل سکتی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں رب تعالیٰ سے چند عیوب کی نفی کی گئی۔ کہ اسے نیند اور اونگھ عارض نہیں ہوتی۔ اب علم ثابت کر کے جہالت سے پاکی بیان ہو رہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں فرمایا گیا تھا کہ اس کی بارگاہ میں بلا اجازت کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ رب تعالیٰ شفیع و مشفوع دونوں کے حالات جانتا ہے کہ کون قابل شفاعت ہے اور کون نہیں اور کسے شفیع ہونا چاہیے اور کسے نہیں لہٰذا ضروری ہے کہ شفاعت اس کی اجازت سے ہی ہو۔

تفسیر

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ يَعْلَمُ حال استمراری ہے یعنی ہمیشہ سے جانتا ہے۔ مَا سے مراد مخلوق کے سارے حالات ہیں۔ عربی میں بین ایدی سامنے کی چیز کو اور خلف پیچھے کی چیز کو کہتے ہیں۔ اَيْدِيْهِمْ میں ھم ضمیر یا تو مَا فِي السَّمٰوٰتِ الخ کی طرف لوٹتی ہے۔ چونکہ ملائکہ انبیاء و دیگر انسان اہل عقل ہیں۔ انہیں کی تغلیب فرما کر عقلاء کی ضمیر ارشاد ہوئی یعنی رب تعالیٰ اس

قدر وسیع سلطنت کی تمام چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں کے تمام جزوی وکلی حالات جانتا ہے۔ دنیاوی بادشاہ مملکت کے بڑوں لوگوں سے تو خبردار ہوتے ہیں چھوٹوں کا انہیں پتہ بھی نہیں ہوتا۔ رب تعالیٰ ہی ہے کہ چیونٹی کی بھی خبر رکھتا ہے۔ اور ہاتھی کی بھی ذرہ کو بھی جانتا ہے پہاڑ کو بھی اس کی حاجتیں جانتا ہے اور سب کی حاجت روائی کرتا ہے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز اس سے مانگی جاتی ہے۔ یا شفعاء کی طرف یا مشفوعین کی جانب سامنے سے مراد آخرت ہے کہ وہ آ رہی ہے اور پیچھے سے مراد دنیا کہ وہ جا رہی ہے۔ یا سامنے سے مراد زمین کی چیزیں اور پیچھے سے آسمانی چیزیں مراد ہیں۔ یا سامنے سے بعد موت کے حالات اور پیچھے سے قبل پیدائش کے واقعات یا سامنے سے آئندہ کے اعمال اور پیچھے سے گذشتہ افعال مراد ہیں۔ یا سامنے سے سب کے ظاہری حالات مراد ہیں۔ جنہیں خود حال والا بھی جانے اور دوسرے بھی۔ پیچھے سے مراد خفیہ حالات جو حال والا تو جانے مگر دوسرے نہ جانیں۔ یا سامنے سے وہ حالات مراد ہیں جنہیں حال والا جانے اور پیچھے سے وہ حالات مراد جنہیں حال والا بھی نہ جانے۔ ہمیں اپنے دل و دماغ پھیپھڑے اور اپنے اندرونی حالات کی خود اپنے کو خبر نہیں۔ مگر ربّ تعالیٰ یہ سب کچھ جانتا ہے۔ ہماری ضروریات سے ہم بے خبر ہیں۔ رب تعالیٰ علیم وخبیر ہے۔ وہ پوری فرماتا رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ما نبودیم و تقاضاء ما نبود !!! لطف تو ناگفتہء ما می شنود

یعنی رب تعالیٰ ساری مخلوق کے سارے اگلے پچھلے حالات جانتا ہے۔ کہ کیا ہو چکا۔ کہ اور کیا ہوگا۔ مگر وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ۔ یہ احاطہ سے بنا بمعنی گھیر لینا مگر یہاں معلوم کرنا اور پالینا مراد ہے کہ عالم کا علم معلوم کو گھیرے ہوتا ہے۔ اسکا فاعل ملائکہ انبیاء و دیگر عقلاء ہیں۔ مِنْ عِلْمِهٖ میں علم سے معلومات مراد ہیں اور من تبعیضیہ کہ خدا کی صفت میں بعضیت محال ہے (کبیر و روح البیان) بِمَا شَآءَ میں مَا مصدریہ اور ب استعانت کی ہے۔ یا ب زائدہ اور مَا موصولہ ہے۔ یعنی کوئی بھی اسکی معلومات کو نہیں جانتا۔ مگر اسی کے چاہنے سے۔ اسکی تفسیر وہ آیت ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (جن: ۲۷) اس استثناء میں انبیاء کرام اور اولیاء اللہ داخل ہیں کہ رب تعالیٰ انہیں علوم غیبیہ عطا فرماتا ہے۔ (کبیر و خازن) اس کی وسعت علمی کا تو یہ حال ہے اور وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسِعَ وُسْعَةً سے بنا بمعنی اندر لے لینا سما لینا گھیر لینا وسعت اور احاطہ قریب المعنی ہیں۔ برداشت کرنے اور طاقت رکھنے کو بھی وسعت کہہ دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے مَا وَسِعَهُ اِلَّا اتِّبَاعِيْ۔ مگر یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ کرسی کرسٌ سے بنا بمعنی ایک شیئی کے اجزاء کا اوپر نیچے ہونا۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ اکرست الدار یعنی گھر میں مینگنیاں تہہ بہ تہہ جمع ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے تکارس الشیئ یعنی مرکب ہو گیا۔ کتابوں کے تھیلہ کو کراسہ کہا جاتا ہے۔ کہ اس میں کتابیں اوپر تلے رکھی جاتی ہیں (کبیر) اصطلاح میں کرسی اس چھوٹے تخت کو کہتے ہیں۔ جو بیٹھنے والے سے نہ بچے کہ وہ بھی تختوں سے مرکب ہوتا ہے۔ کبھی پائیدان کو بھی کرسی کہا جاتا ہے۔ جہاں بیٹھنے والے کے پاؤں ہوں۔ سلاطین جس جگہ بیٹھتے ہیں وہ تخت کہلاتا ہے۔ اور انکے سامنے کچھ نشیب میں امراء وزراء کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس کو کرسی کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کا پائیدان ہے۔ یہاں کرسی میں چار قول منقول ہیں۔ نمبر ۱ اس سے رب کا علم وقدرت مراد ہے کہ اہل عرب وسیع علم کو کرسی کہہ دیتے ہیں۔ اسی لئے علماء کو کراسی کہا جاتا ہے علامہ زمخشری نے قطرب کا قول نقل کیا۔ وَخَيْرُ الْاَنَاسِيِّ الْكَرَاسِيُّ یعنی انسانوں میں سب سے بہتر علماء ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس کا علم

آسمان وزمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ یَعْلَمُ کی تفسیر ہے نمبر ۲ کرسی سے مراد خود عرش ہے نمبر ۳ کرسی وہ چیز ہے جو عرش کے نیچے اور ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے جسے فلاسفہ آٹھواں آسمان یا فلک بروج کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ کرسی کے مقابلہ میں ساتوں آسمان وزمین ایسے ہیں۔ جیسے جنگل میں انگوٹھی۔ اور یہ ہی نسبت کرسی کو عرش کے مقابلہ میں ہے (درمنثور) اس کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔ ایک فرشتہ حضرت آدم کی شکل پر ہے دوسرا گدھ کی شکل پر تیسرا بیل کی شکل پر اور چوتھا شیر کی شکل پر۔ (روح البیان از ابن عباس ذو درمنثور) بعض روایت میں ہے کہ حاملین عرش اور حاملین کرسی کے درمیان ستر حجاب ظلمت کے اور ستر حجاب نور کے ہیں ہر حجاب کی موٹائی پانچ سو سال کا راہ ہے۔ اگر یہ حجاب حائل نہ ہوتے تو ملائکہ حاملین عرش کے نور سے حاملین کرسی جل جاتے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ کرسی کوئی جسم وغیرہ نہیں۔ اس کلام سے لوگوں کے ذہن میں رب کی عظمت کا نقشہ کھینچنا مقصود ہے جیسے کعبہ کو بیت اللہ قرار دیا گیا۔ اس میں دروازہ لگایا گیا' وہاں دعائیں منگائیں گئیں۔ حالانکہ نہ وہاں رب رہتا ہے اور نہ وہ رب کا مکان ہے یہ سب کچھ اظہار عظمت کیلئے ہے۔ ایسے ہی اس کیلئے عرش وکرسی کا ثابت کرنا اس کی سلطنت کا خیال جمانے کے لئے ہے۔ وَلَا یَؤُدُہٗ۔ یہ اوڈ سے بنا بمعنی مشقت اور بوجھ یہ نَصَرَ یَنْصُرُ سے ہے اور اَوْ یَؤُدُہٗ کا مرجع رب تعالیٰ ہے۔ حِفْظُهُمَا حفظ کے معنی ہیں۔ نگہبانی ھما کا مرجع آسمان وزمین ہیں کہ یہ دو جنسیں ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ کو اتنے بڑے آسمان وزمین کی نگہبانی بھاری نہیں۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ یہ دونوں لفظ قریب المعنی ہیں۔ علی بمعنی بلند اس سے مکانی بلندی مراد نہیں بلکہ کمالات میں اعلیٰ ہونا مراد ہے۔ یعنی وہ علم سلطنت۔ غلبہ اور صفات میں سب سے اعلیٰ درجہ والا اور عظیم ہے کہ اس کے سامنے ہر شئی حقیر خیال رہے کہ عظمت صفت اضافی ہے۔ ہر چیز اپنے حقیر کے مقابل عظیم ہوتی ہے۔ اسی لئے رب تعالیٰ سب سے عظیم ہے۔ نبی علیہ السلام اپنی امت سے عظیم شیخ اپنے مریدین سے اور استاد اپنے شاگردوں سے کیونکہ ان چھوٹوں کی عقلیں اپنے بڑوں کے صفات کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ فرما کر اشارۃً بتایا گیا کہ رب تعالیٰ کی شان بہت ہی بلند وبالا ہے۔ اور آسمان وزمین معمولی حقیر چیزیں ایسے شان والے رب کو ایسی حقیر چیزوں کی حفاظت بھاری کیسے ہوسکتی ہے۔ تو یہ کلمے لَا یَؤُدُہٗ کی دلیل ہے۔ جو نادان ریل کی قطار دیکھ کر کہے کہ ایک انجن اسے کھینچ نہیں سکتا اس نے ابھی انجن دیکھا ہی نہیں۔ صرف ریل دیکھی ہے۔ ایسے ہی جو کہے کہ اتنے بڑے زمین وآسمان کو ایک خدا نہیں سنبھال سکتا۔ اس نے آسمان وزمین کو تو دیکھا۔ مگر رب کی شان میں غور نہ کیا۔ اگر رب کی شان میں غور کر لیتے تو یقین کرتے کہ ایسے لاکھوں عالم ربّ تعالیٰ قائم رکھ سکتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

رب تعالیٰ اپنی مخلوق کے سارے اگلے پچھلے حال واعمال جانتا ہے اور کوئی مخلوق اس کی معلومات کو نہیں جان سکتی مگر اتنا ہی جتنا وہ چاہے اور بتائے۔ اور وہ بقدر قابلیت ہر ایک کو بتاتا ہے۔ سمندر سے کوئی مشک بھر کر لاتا ہے۔ کوئی گھڑا کوئی لوٹا کوئی پیالہ اس کے عرش کا تو پوچھنا کیا۔ کرسی کی عظمت کا یہ حال ہے کہ تمام آسمان وزمین اس میں سمائے ہوئے ہیں۔ رب تعالیٰ کو اتنی وسیع مملکت کا سنبھالنا اور زمین وآسمان کی نگہبانی کچھ دشوار نہیں۔ نہایت آسانی سے ان سب کی نگرانی فرما رہا ہے۔ وہ اپنی صفات میں اعلیٰ وبالا ہے۔ کہ اس کی عظمت تک کسی کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض بندوں کو اپنے علم

کا مظہر بنایا کہ وہ حضرات رب تعالیٰ کے بتائے سکھائے سے سارے حالات جانتے ہیں۔ دیکھو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ (آل عمران: ۴۹) ما سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہر دانہ اور پانی کے ہر قطرہ کے متعلق جانتے تھے۔ کہ یہ کس کے نصیب کا ہے اور اسے کون کھائے گا۔ نیز لوگ جو گھروں کے اندر کھاتے ہیں۔ آپ اسے دیکھتے ہیں۔ مکان کی دیواریں آپ کی نگاہ کے لئے حجاب نہیں۔ یہ ہے انبیاء کا ظاہر و باطن کا علم۔ پیدا ہوتے ہی فرمایا کہ مجھے رب نے کتاب دی نبی بنایا کتاب میں سارے علوم موجود تھے۔ اور نبی کہتے ہیں خبر والے کو۔ معلوم ہوا کہ پیدائشی باخبر ہیں۔ بے خبر نہیں۔ ہم لوگ حضرات انبیاء اولیاء کے علوم کا احاطہ نہیں کر سکتے ہم کو تو سورج کی روشنی سمندر کے پانی اور ہوا کا آج تک احاطہ نہ ہو سکا۔ پھر آسمان نبوت کے چاند سورجوں کا احاطہ کیسے ہو سکتا ہے۔

آیۃ الکرسی کے فضائل وفوائد

اس آیت کا نام آیت الکرسی ہے کیونکہ اس میں کرسی کا ذکر ہے اس کے فضائل وفوائد بے شمار ہیں۔ ہم اولاً کچھ فضائل اور پھر کچھ فوائد تفسیر خازن وکبیر ودر منثور وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔

فضائل: نمبر ۱۔ اس آیت میں الٰہیات کے اعلیٰ مسائل کا ذکر ہے اور ذات وصفات کا بے مثل بیان نمبر ۲۔ اسی آیت میں رب تعالیٰ کے نام ظاہر اور محذوف سترہ جگہ ذکر ہوئے اَللّٰهُ هُوَ الْحَيُّ۔ اَلْقَيُّوْمُ اور لَا تَاْخُذُهٗ۔ لَهٗ۔ عِنْدَهٗ۔ بِاِذْنِهٖ۔ يَعْلَمُ۔ عِلْمِهٖ۔ شَآءَ۔ كُرْسِيُّهٗ۔ يَئُوْدُهٗ۔ کی ضمیریں حِفْظُهُمَا میں ضمیر پوشیدہ۔ وَهُوَ۔ اَلْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ نمبر ۳۔ آیت الکرسی میں اسم اعظم بھی ہے اور وہ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ہے۔ یا لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اولیاء اللہ اسی اسم سے طی الارض کرتے ہیں۔ کہ آن کی آن میں مشرق ومغرب طے کر لیتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اسی اسم سے مردے زندہ فرماتے تھے۔ نمبر ۴۔ حدیث شریف میں ہے کہ آدم علیہ السلام سید البشر ہیں۔ نبی ﷺ سید عرب وعجم سلمان فارسی سید اہل فارس صہیب سردار روم بلال سردار حبشہ طور پہاڑوں کا سردار جمعہ سید الایام قرآن سید الکلام۔ سورۂ بقرہ سید القرآن۔ اور آیۃ الکرسی سید البقر۔ نمبر ۵۔ ذکر کی عظمت مذکور کی عظمت سے ہے مذکور جس قدر اعلیٰ اسی قدر ذکر بھی اشرف چونکہ آیۃ الکرسی میں رب کی ذات وصفات ہی مذکور ہیں۔ لہٰذا یہ دیگر آیتوں سے افضل واعلیٰ ہے خیال رہے کہ سورۂ اخلاص میں پندرہ حرف ہیں۔ اور آیۃ الکرسی میں پچاس حرف۔ اور ان دونوں میں توحید کا ذکر ہے۔ سورۂ اخلاص تہائی قرآن کا ثواب رکھتی ہے۔ تو آیۃ الکرسی اس سے کہیں بڑھ کر ہونی چاہیے (روح) نمبر ۶۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ہمیں آیت الکرسی عرش کے نیچے عنایت فرمائی گئی۔ (درمنثور) نمبر ۷۔ احمد نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ آیت الکرسی چہارم قرآن ہے۔ نمبر ۸۔ ترمذی شریف میں ہے کہ ہر چیز کی کوئی زینت ہے قرآن کی زینت سورہ بقر ہے اور اس میں آیت الکرسی قرآن کی سردار ہے (خازن) نمبر ۹ علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے جنگ بدر کے دن حضور ﷺ کو دیکھا کہ سجدہ میں سر رکھے ہوئے یا حیی یا قیوم پڑھ رہے تھے۔ میں میدان میں گیا۔ پھر لوٹ کر آیا تو یہ ہی پڑھتے ہوئے پایا۔ بار بار جاتا آتا رہا مگر یہ ہی پڑھتا ہوا پاتا رہا یہاں تک کہ فتح ہو گئی۔ (کبیر) نمبر ۱۰ آیۃ الکرسی پڑھنے والے پر ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جو اس کی نیکیاں لکھتا اور

گناہ مٹاتا رہتا ہے۔ دوسرے دن کی اسی ساعت تک یہ ہی کرتا رہتا ہے۔ (درمنثور)

آیۃ الکرسی کے فوائد: نمبر ۱ علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو کوئی ہر فرض نماز کے پیچھے آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرے تو اس میں اور جنت میں صرف موت کی آڑ ہوگی کہ مرتے ہی جنت میں داخل ہو جائے اور اس پر ہمیشگی کرنے والا صدیقین و عابدین کے زمرہ میں شمار ہوگا۔ (کبیر) نمبر ۲ جو کوئی سوتے وقت بستر پر لیٹ کر آیۃ الکرسی پڑھ لے تو اس کا اور اس کے پڑوسیوں کا گھر چوری ڈکیتی اور آگ لگ جانے غرض ساری اچانک مصیبتوں سے صبح تک محفوظ رہے گا۔ (کبیر) نمبر ۳ جس گھر میں آیت الکرسی پڑھی جائے۔ اس گھر سے شیطان ایک ماہ تک اور جادوگر چالیس دن تک دور رہتے ہیں۔ (کبیر و درمنثور) نمبر ۴ ایک بار ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ایک جن کو پکڑ لیا اور اس سے پوچھا کہ انسان تم سے کیونکر بچیں۔ اس نے عرض کیا کہ صبح و شام آیۃ الکرسی پڑھ لیا کریں۔ صبح کو یہ واقعہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو فرمایا اس خبیث نے سچ کہا (روح البیان) نمبر ۵ جو کوئی صبح و شام اپنے اور اپنے بچوں پر آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کر دے۔ وہ شیطان اور جادو اور نظر بد سے محفوظ رہے گا نمبر ۶ ابن سنّی نے امام زین العابدین سے نقل کیا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو دردزہ کی تکلیف تھی۔ حضور علیہ السلام نے ام سلمہ اور زینب بنت جحش کو حکم دیا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر آیت الکرسی اور فلق و ناس پڑھیں۔ (درمنثور) اس سے معلوم ہوا کہ آیت الکرسی دردزہ میں مفید ہے۔ نمبر ۷ ایک صحابی نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں بے برکتی کی شکایت کی کہ میرے گھر میں برکت نہیں ہوتی۔ فرمایا آیۃ الکرسی پڑھا کرو۔ (درمنثور) اس سے معلوم ہوا کہ آیت الکرسی برکت کے لئے مفید ہے نمبر ۸ جو کوئی سوتے وقت آیت الکرسی پڑھ لے تو رات بھر دو فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں (درمنثور) نمبر ۹ جو کوئی سفر کے وقت اپنے گھر پر آیت الکرسی پڑھ کر دم کر جائے تو اس کا مال و اہل و عیال اس کی واپسی تک محفوظ رہیں گے۔ (درمنثور) نمبر ۱۰ جو کوئی کہیں پارسل وغیرہ بھیجے اس پر آیۃ الکرسی دم کر دے تو انشاء اللہ خیریت سے پہنچے گا۔ (مجرب) نمبر ۱۱ جو کوئی فجر اور مغرب کے بعد اول آخر تین تین بار درود شریف اور درمیان میں اکتالیس بار یا حیی یا قیوم پڑھ لیا کرے۔ تو انشاء اللہ اسے خاتمہ بالخیر نصیب ہوگا۔ نمبر ۱۲ جو کوئی نماز پنجگانہ کے بعد آیت الکرسی پڑھے اور جب وَلَا یَؤُدُہٗ حِفۡظُهُمَا تک پہنچے تو اپنی پانچوں انگلیوں کے پورے دونوں آنکھوں پر رکھ کر گیارہ بار یہ لفظ پڑھے۔ اور پھر ایک بار وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ پڑھ کر اپنے پوروں پر دم کر کے آنکھوں پر پھیرے تو انشاء اللہ اندھا نہ ہوگا۔ نہایت مجرب ہے۔ نمبر ۱۳ جو کوئی سفر میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوۡمُ بِرَحۡمَتِکَ اَسۡتَغِیۡثُ پڑھتا رہتا ہے تو انشاء اللہ اس پر سفر آسان ہوگا۔ نمبر ۱۴ آیت الکرسی سے شیطان بھاگتے ہیں۔ بے چین دل کو چین آتا ہے۔ مرگی والے کو فائدہ ہوتا ہے۔ اس سے غصہ شر اور حرام شہوت دور ہوتی ہے۔ ظالم کا ظلم کم ہوتا ہے۔ مگر اخلاص شرط ہے۔ (روح البیان) شعر۔

دل پردرد را دوا قرآن جانِ مجروح را شفا قرآن
ہر چہ جوئی زنص قرآن جو کہ بود گنج علمہاء قرآن

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** سارا قرآن رب کا کلام ہے۔ مگر اس کی آیتوں کی تاثیریں

جداگانہ سارے انبیاء اور اولیاء رب کے پیارے ہیں۔ مگر ان کے مراتب مختلف (خازن) **دوسرا فائدہ** حمد و نعت کی آیتیں ان آیتوں سے افضل ہیں۔ جن میں کفار کا ذکر ہے کیونکہ ان میں ذکر بھی افضل اور مذکور بھی اعلیٰ مگران آیتوں میں ذکر اعلیٰ اور مذکور خبیث **تیسرا فائدہ:** اصول اسماء و صفات یہ ہیں۔ وحدانیت۔ حیات۔ علم۔ قیومیت۔ ملک۔ قدرت۔ ارادہ۔ چونکہ آیت الکرسی میں ان سب کا ذکر لہٰذا یہ آیت اعظم اذکار ہے۔ **چوتھا فائدہ:** رب تعالیٰ بندوں کے عیوب بے علمی غفلت اونگھ نیند عجز وغیرہ سے پاک ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کی کرسی ہے تو لازم آیا کہ وہ ایک جگہ رہنے والا ہے اور جو ایک جگہ میں رہنے والا ہو وہ محدود ہے۔ اور محدود خدا نہیں ہو سکتا (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی قرآن سمجھنے کے لئے عقل چاہیے۔ اس آیت میں یہ کہاں ہے کہ خدا اس کرسی پر بیٹھا ہے۔ یہاں تو یہ ارشاد ہوا کہ اس کی کرسی آسمان و زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی کرسی کے یہ معنی ہیں کہ اس کی پیدا کی ہوئی اس کی مملوک کرسی جیسے کہا جاتا ہے اللہ کا آسمان اور اس کی زمین اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ان میں رہتا ہے اور کرسی سے مراد یہ میز کرسی نہیں ہے اس کا مطلب ہم تفسیر میں بتا چکے کہ یا تو اس سے رب کا علم مراد ہے یا اس کی قدرت و ملکیت یا آٹھواں آسمان فلک بروج یا یہ صرف ایک مثال ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ بارگاہ الٰہی میں شفاعت باالاذن ہوگی اور شفاعت کا اذن بہت چیزوں کو ملے گا۔ حضور ﷺ۔ انبیاء۔ اولیاء۔ علماء۔ چھوٹے بچے۔ قرآن۔ رمضان۔ کعبہ وغیرہ تو حضور ﷺ کو شفیع المذنبین کیوں کہتے ہیں۔ **جواب:** اس لئے کہ ان تمام حضرات کی شفاعت صغریٰ ہوگی اور حضور ﷺ کی شفاعت' شفاعتِ کبریٰ ہوگی۔ شفاعت کبریٰ صرف حضور ﷺ ہی کریں گے۔ اس شفاعت میں چند خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ اول قیامت میں جبکہ عدل الٰہی جلوہ گر ہوگا۔ سوا حضور ﷺ کے کوئی شفاعت نہ کرے گا۔ حضور ﷺ کے دست اکبر پر دروازہ شفاعت کھل جانے کے بعد دوسرے حضرات شفاعت صغریٰ کریں گے۔ دوسرا یہ کہ تمام شفیعوں کی شفاعت مخصوص طرح اور محدود دائرے میں ہوگی۔ چنانچہ قرآن شریف تو اپنے تلاوت کرنے والوں کی۔ کعبہ معظمہ حاجیوں کی۔ علماء اور اولیاء اپنے قرابت والے دوستوں کی۔ چھوٹے بچے اپنے ماں باپ کی۔ رمضان روزہ داروں کی شفاعت کریں گے مگر حضور ﷺ کی شفاعت سارے مسلمانوں کے لئے بلکہ ایک قسم کی شفاعت سارے جہان کے لئے اور ایک قسم کی شفاعت انبیاء و اولیاء کے لئے ہوگی۔ اس لئے اسے شفاعت کبریٰ کہتے ہیں اور حضور ﷺ کو شفیع المذنبین ﷺ۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کا دل گویا عرش ہے۔ کہ روح کا تجلی گاہ ہے۔ اور سر یا سینہ گویا کرسی۔ اتنا بڑا عرش قلب مومن کی وسعت کے مقابلہ میں ایسا ہے جیسے میدان میں انگوٹھی۔ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس عالم جیسے دس لاکھ عالم عارف کے قلب میں رکھے جائیں تو وہ محسوس بھی نہ ہوں۔ حسن فرماتے ہیں کہ مومن کا دل عرش الٰہی ہے۔ (ابن عربی و روح البیان) مولانا فرماتے ہیں۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است — من نہ گنجم ہیچ در بالاؤ پست !!
در زمین و آسمان و عرش نیز — من نہ گنجم از یقین داں اے عزیز
در دل مومن بگنجم اے عجب — گر مرا جوئی دراں دلہا طلب
خود بزرگی عرش باشد بس مدید — لیک صورت چیست چوں معنی رسید

دوسری تفسیر

آیۃ الکرسی میں اللہ سے عظیم تک گیارہ صفات کا ذکر ہے۔ بعض صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مَنْ ذَالَّذِیْ سے بِمَا شَآءَ تک حضور ﷺ کی تین صفات ہیں۔ اور اس سے پہلے کی پانچ اور آخر کی تین خدا کے صفات مطلب یہ ہے کہ رب کی بارگاہ میں کون کسی کی شفاعت کر سکتا ہے۔ سوا اس ایک محبوب ﷺ کے جنہیں شفاعت کا اذن مل چکا کہ شفاعت کبریٰ کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ اس شفیع المذنبین کی صفت یہ ہے کہ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ سب کے سارے اگلے حالات جانتے ہیں کیونکہ سب سے پہلے انہیں کا نور پیدا ہوا سارا عالم ان کا دیکھا بھالا ہوا ہے۔ وَمَا خَلْفَهُمْ اور پچھلے حالات قیامت کی وحشت خلق کی گھبراہٹ رب کا غضب انبیاء کرام کا نفسی نفسی کہنا اور پھر سارے عالم کا بھکاری بن کر اس محبوب کے دروازہ پر آنا غرضیکہ سب کچھ جانتے ہیں کیونکہ بغیر علم شفاعت ناممکن علم والا جان سکتا ہے کہ کون کس قسم کی شفاعت کا مستحق ہے اور کون محروم جو طبیب بیماروں کی بیماریوں سے بے خبر ہو وہ علاج کیا کر سکتا ہے۔ اور اگر حضور ﷺ لوگوں کے ایمان و کفر وغیرہ سے بے خبر ہوں تو شفاعت کیسے کر سکتے ہیں۔ پھر آپ کو پتہ کیسے لگے۔ کہ کون شفاعت کے لائق ہے۔ اور کون نہیں۔ اور کون کس شفاعت کے لائق ہے۔ وہ شفیع المذنبین تو سب کے حالات جانتے ہیں مگر وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْئٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ملائکہ انبیاء اولیاء بلکہ سارا عالم اس شفیع المذنبین کے علوم میں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے مگر اسی قدر جتنا کہ محبوب عطا فرمائیں۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ اولیاء اللہ کا علم انبیاء کے مقابلہ میں ایسا ہے۔ جیسے سات سمندروں کے مقابلہ میں ایک قطرہ اور سارے انبیاء کے علوم حضور علیہ السلام کے مقابل ایسے ہی ہیں۔ جیسا سات سمندروں کے مقابل ایک قطرہ اور یہ ہی نسبت ہمارے حضور ﷺ کے علم کو خدا کے علم سے ہے۔ خیال رہے کہ انبیاء اور اولیاء میں حضرت آدم و ابراہیم علیہم السلام اور حضرت خضر بھی داخل ہیں۔ قصیدہ بردہ شریف میں خوب فیصلہ کیا گیا کہ فرمایا۔ شعر۔

وَکُلُّهُمْ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ مُلْتَمِسٌ — غُرْفًا مِّنَ الْبَحْرِ اَوْرَشْفًا مِنَ الدِّیَمِ
وَ وَاقِفُوْنَ لَدَیْهِ عِنْدَ حَدِّهِمْ — مِنْ نُّقْطَةِ الْعِلْمِ اَوْ مِنْ شَکْلَةِ الْحِکَمِ

یعنی سارے انبیاء اولیاء اپنی قابلیت کے مطابق حضور ﷺ سے علم حاصل کرتے ہیں اور ان کے علوم حضور ﷺ کے علم کے سامنے ایسے ہیں۔ جیسے کتب خانہ کے مقابل ایک نقطہ یا تیز بارش کے مقابلہ ایک چھینٹا (روح البیان از تاویلات نجمیہ) یہ نہایت نفیس تفسیر ہے۔ اور اس پر کوئی شرعی الزام نہیں۔ اس کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے ہوتی ہے جو مشکوٰۃ شریف باب مناقب ابی بکر و عمر میں ہے۔ کہ انہوں نے ایک بار حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا کسی کی نیکیاں تاروں کے برابر بھی ہیں۔ فرمایا ہاں عمر کی تو عرض کیا کہ ابوبکر کی نیکیوں کا کیا حال ہے فرمایا عمر کی ساری نیکیاں ابوبکر کی ایک نیکی کی طرح

ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو سارے عالم کے سارے اعمال کی خبر ہے۔ اور آسمان کے چھوٹے بڑے سارے تاروں کی بھی گنتی معلوم ہے۔ تب ہی تو فرمارہے ہیں کہ ساری امت میں حضرت عمر کی نیکیاں تاروں کے برابر ہیں۔ یہ جواب وہ ہی دے گا جو دونوں کی خبر رکھتا ہو۔ آسمان میں بعض تارے چھپے ہوئے ہیں۔ اور انسان صدہا اعمال چھپ کر ہی کرتے ہیں۔ نیز آپ ﷺ نے لوگوں کے ایمان وکفر بلکہ درجات ایمان کی بھی دنیا ہی میں خبر دے دی کہ فاطمہ جنتی بیبیوں کی سردار ہیں۔ حسن حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ ایک بار ازواج مطہرات نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ سرکار آپ ﷺ کی وفات کے بعد پہلے کون بی بی صاحبہ حضور ﷺ سے ملیں گی۔ فرمایا لمبے ہاتھ والی سب نے اپنے ہاتھ ماپے تو بی بی سودہ کے ہاتھ لمبے تھے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ لمبے ہاتھ سے مراد سخاوت تھی۔ اور زینب نے تمام ازواج میں سے پہلے وفات پائی۔ وہ بہت سخیہ تھیں۔ اس سوال سے معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات کا عقیدہ تھا کہ حضور انور سب کے وقت موت۔ کیفیت موت اور سعادت وشقاوت اور جنت کے ٹھکانے کو جانتے پہچانتے ہیں کیونکہ اس سوال میں وقت موت۔ حسن خاتمہ اور حضور ﷺ کے ساتھ جنت میں رہنا سب ہی پوچھا گیا ہے۔ اور حضور ﷺ نے جواب میں تمام ازواج کا جنتی ہونا۔ جنت میں حضور ﷺ کے ساتھ رہنا اور پہلے بی بی زینب کا وفات پانا بیان فرمادیا۔ یہ ہے حضور ﷺ کا علم۔ رضی اللہ عنہم قیامت میں مرتدین کو اصحابی فرمانا ان کو شرمندہ کرنے کے لئے ہوگا نہ کہ بے علمی کی وجہ سے جیسا کہ رب تعالیٰ جہنمی سرداروں کو فرمائے گا۔ ذُقۡ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡکَرِیۡمُ (الدخان:۴۹) ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ یہاں تو آپ یہ واقعہ بیان فرمائیں اور وہاں بھول جائیں۔ ان کے متعلق حضور ﷺ خود فرماتے ہیں کہ میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ مجھے پہچانتے ہیں۔

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۟ۙ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ
نہیں ہے جبر بیچ دین کے بیشک ظاہر ہوگئی ہدایت گمراہی سے پس جو کوئی انکار کرے شیطان کا
کچھ زبردستی نہیں دین میں بیشک خوب جدا ہوگئی ہے نیک راہ گمراہی سے تو جو شیطان کو نہ مانے
بِالطَّاغُوۡتِ وَ یُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ٭
اور ایمان لائے ساتھ اللہ کے پس بے شک مضبوط پکڑ لیا مضبوط رسی کو
اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی جسے کبھی کھلنا
لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۵۶﴾
نہیں ہے کھلنا واسطے اس کے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے
نہیں اور اللہ سنتا جانتا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق: پچھلی آیتوں میں نبوت اور رسالت اور رب کی ذات و

صفات کا نہایت بہترین ذکر فرمایا گیا۔ اور یہ ہی چیزیں اسلام کے اصول ہیں۔ اب اسلام کی حقانیت کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ گویا پہلے اسلامی اصول کا تذکرہ تھا۔ اور اب اسلامی حقانیت کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** آیت الکرسی میں صفات الٰہیہ کا کچھ اس طرح ذکر فرمایا گیا جس کے قبول کرنے پر ہر عاقل مجبور ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ چونکہ اس بیان کے بعد عاقل کے لئے قبول حق میں کوئی تامل کی گنجائش باقی نہ رہی۔ لہٰذا اسلام پر کسی کو مجبور نہ کیا جائے۔ جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے حجت پوری ہو چکی۔ **تیسرا تعلق:** آیت الکرسی میں فرمایا گیا تھا۔ کہ رب تعالیٰ لوگوں کے اگلے پچھلے حالات جانتا ہے اب فرمایا جارہا ہے کہ کسی کو اسلام لانے میں مجبور نہ کیا جائے کیونکہ جن کا کفر علم الٰہی میں آچکا وہ جبر سے مومن نہ ہوں گے۔ لہٰذا یہ چیز بے کار ہے۔

شان نزول

انصار کے قبیلہ بنی سالم میں ایک صاحب تھے۔ حصین جن کے دو بیٹے عیسائی تھے وہ ایک بار مدینہ منورہ میں روغن کی تجارت کے لئے آئے حضرت حصین نے انہیں پکڑ لیا۔ اور فرمایا کہ تمہیں ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جب تک ایمان نہ لے آؤ۔ انہوں نے انکار کیا یہ مقدمہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا۔ حضرت حصین نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ میں یہ کبھی نہیں برداشت کرسکتا کہ میرے جگر کے ٹکڑے دوزخ میں جائیں اور میں دیکھوں۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری۔ اور حضور ﷺ نے حکم دیا کہ انہیں چھوڑ دو۔ (درمنثور) دوسری روایت انصار میں رواج تھا کہ جن عورتوں کے بچے نہیں جیتے تھے۔ وہ نذر مانتی تھیں کہ خدایا اگر تو ہمارا بچہ زندہ رکھے تو ہم اسے یہودی کردیں گے۔ اگر ان کی حاجت پوری ہو جاتی تو وہ نذر پوری کرتیں۔ اور ان کے یہ بیٹے یہودی ہی رہتے جب مدینہ منورہ میں اسلام کا آفتاب چمکا اور وہاں سے قبیلہ بنی نضیر کو ملک بدر کیا گیا۔ تو ان میں انصار کی ایسی اولاد بھی تھی۔ انصار نے چاہا کہ ان کو نہ جانے دیں۔ کہ یہ ہماری اولاد اور ہمارے بھائی بھتیجے ہیں۔ اس موقعہ پر یہ آیت آئی۔ اور ان لوگوں کو اختیار دیا گیا۔ کہ چاہیں تو ایمان لے آئیں اور چاہیں تو اپنے کفر پر قائم رہ کر نکل جائیں۔ (خازن و درمنثور) مگر ممکن ہے کہ حصین کے وہ دونوں بچے بھی اسی قسم کے ہوں لہٰذا ان روایتوں میں اختلاف نہیں۔

تفسیر

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ۔ اِکْرَاہَ کرہٌ سے بنا بمعنی ناپسندیدگی اکراہ انسان سے ایسا بوجھ اٹھوانا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو یا زبردستی اور مجبوراً منوانا الدین میں الف لام عہدی ہے۔ یا مضاف الیہ کے عوض میں یعنی دین اللہ اس سے مراد اسلام ہے (کبیر) اس جملہ کے دو معنی کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دین میں جبر جائز نہیں۔ کہ کسی کو ڈرا دھمکا کر مسلمان کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ جو کافر جنگ کے بعد ایمان لائے۔ اسے صحیح مسلمان جانو یہ نہ کہو کہ مجبوراً ڈر کے مارے ایمان لایا۔ جس کی تفسیر یہ آیت ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء: ۹۴) (کبیر) پہلی صورت میں باب افعال تعدیہ کے لئے ہے اور دوسری صورت میں نسبت کیلئے یعنی اسلام میں مجبوری کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں۔ خیال رہے کہ کسی کافر کو جبراً مسلمان بنانا جائز نہیں۔ مگر مسلمان سے جبراً دین پر عمل کرانا جائز بلکہ ضروری ہے۔ لہٰذا بے نمازی پر سختی درست ہے۔ ماہ رمضان کی

بے حرمتی کرنے پر سخت سزا دینا درست ہے۔ زانی کو رجم اور چور کے ہاتھ کاٹنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ کے منکرین پر حضرت صدیق اکبر نے فوج کشی کی۔ یہ تمام امور اس آیت کے خلاف نہیں۔ اس کیلئے وہ آیت کریمہ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ:۷۱) امر بالمعروف زبانی بھی ہوتا ہے۔ قلمی بھی ہاتھ سے بھی۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔ یہ جملہ پچھلے جملہ کی علت ہے۔ تبیّن۔ بین سے بنا بمعنی فاصلہ اور جدائی طلاق کا بائنہ اور کلام کو بیان اسلیے کہتے ہیں کہ اس سے تو عورت کی جدائی اور اس سے مقصود و غیر مقصود میں فرق ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ظاہر کو بیّن کہا جاتا ہے کہ وہ ظہور کی وجہ سے دوسروں سے جدا ہو گیا یہاں یہ ہی معنی مراد ہیں۔ رشد میں تین لغت ہیں۔ رُشْدٌ رَاشِدٌ اور رشادٌ ہر خیر کو رشد اور ہر شر کو غی کہا جاتا ہے مگر یہاں رشد سے ایمان مراد ہے۔ جو دائمی سعادت کا ذریعہ ہے کیونکہ اس سے پہلے دین کا ذکر ہو چکا۔ اور غی سے کفر مراد امام راغب فرماتے ہیں کہ غی مثل جہالت کے ہے۔ البتہ عملی جہالت کو جہل اور اعتقادی جہالت کو غی کہا جاتا ہے۔ اہل عرب بولتے ہیں۔ جہل کا زوال علم سے اور غی کا زوال رشد سے ہے۔ یعنی دلائل اور آیات کے ذریعہ ایمان وکفر سے جدا ہو گیا۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے۔ یا مطلب یہ ہے کہ دیگر انبیاء کرام کے ذریعہ رشد و غی ظاہر ہوئے تھے۔ مگر حضور ﷺ کے ذریعہ دونوں خوب ہی ظاہر ہو گئیں۔ چاند تارے اور گیس بجلی وغیرہ بھی اجالا کر کے چیزیں ظاہر کر دیتے ہیں۔ مگر سورج تو دن نکال دیتا ہے۔ جس سے تمام چیزیں خوب ہی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ حضور ﷺ سورج ہیں۔ جن سے ہدایت و گمراہی ایسی واضح و ظاہر ہو گئی۔ جس سے زیادہ ظاہر ہونا غیر ممکن ہے۔ یہ سورج ظاہری آنکھیں کھول دیتا ہے اور حضور ﷺ نے دلوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اسلئے رب نے فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِیْنٌ (مائدہ:۱۵) فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ کفر بمعنی چھپانا ہے۔ انکار کو اسی لئے کفر کہتے ہیں کہ اس سے کوئی بات چھپائی جاتی ہے۔ یہاں انکار ہی مراد ہے۔ کفر کی بحث ہم پہلے پارہ میں کر چکے۔ طاغوت طغی سے بنا بمعنی حد سے گزرنا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ سیلاب کو اسی لئے طغیانی کہتے ہیں اور طاغوت بروزن فعلوت مصدر ہے۔ ت زائدہ جیسے جبر سے جبروت اور رغب سے رغبوت اور رھب سے رھبوت اور ملک سے ملکوت یہ مصدر ہونے کی وجہ سے واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسے اَوْلِیٰٓءُهُمُ الطَّاغُوْتُ (بقرہ:۲۵۷) اور اَنْ یَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (النساء:۶۰) یہ اصل میں طغووت تھا مگر پہلے واؤ کو غین پر مقدم کر دیا گیا۔ جیسے صائقہ کو صاقعہ کہہ دیتے ہیں پھر واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔ (کبیر) ہر سرکش اور گمراہ کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ شیطان۔ کاہن۔ جادوگر۔ بت۔ سب ہی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے یہاں معنی درست ہیں کیونکہ یہ طغیان کے اسباب ہیں۔ اس زمانہ کے نئے مفسر مولوی رشید احمد صاحب کے شاگرد رشید یعنی مولوی حسین علی واں بھچری نے اپنی کتاب تفسیر بلغۃ الحیر ان میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ طاغوت میں انبیاء کرام بھی داخل ہیں کہ لوگوں نے انہیں بھی خدا سے ملا دیا اور ان کی وجہ سے لوگ مشرک ہو گئے۔ حتیٰ کہ بعض کفار نے نبیوں کو خدا کا بیٹا مان لیا۔ نعوذ باللہ۔ اگر یہ تفسیر درست ہو تو لازم آئے گا کہ قرآن شریف اور اللہ تعالیٰ بھی طاغوت میں داخل ہو جاویں کیونکہ بہت لوگوں نے رب کے شریک ٹھہرائے پھر آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ جو اللہ کو مانے اور نبی کا کفر کرے۔ حالانکہ نبی پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری ہے جیسے اللہ پر ایمان لانا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (النساء:۱۳۶) اس ظالم نے انبیاء

کرام کو بجائے مومن بہ کے ما یکفر بنایا ہے۔ یہ ہے تحریف طاغوت وہ ہے جو لوگوں کو گمراہ کرے۔ جیسا شیطان اور سرداران کفر یا وہ جسے گمراہی کے لئے بنایا گیا ہو اور وہ ذریعہ گمراہی ہو جیسے بت وغیرہ حضرات انبیاء کرام نے نہ کسی کو گمراہ کیا۔ نہ انہیں رب نے گمراہی کے لئے بنایا۔ یہ حضرات ہادی اور سبب ہدایۃ ہیں۔ اگر کوئی انہیں خدا کا بیٹا مان لے تو یہ اس کی اپنی بدقسمتی ہے۔ وہاں سے طغیان نہ ملا۔ یہ تفسیر اس آیۃ کے صریحی خلاف ہے۔ اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْ بِهٖ (النساء: ٦٠) معلوم ہوا کہ طاغوت کو حاکم بنانا حرام و کفر ہے۔ دوسری جگہ رب فرماتا ہے۔ فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ (النساء: ٦٥) معلوم ہوا کہ نبی کو حاکم بنانا مدار ایمان ہے۔ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی۔ اِسْتَمْسَکَ سک سے بنا بمعنی اخذ بالقوۃ مضبوطی سے تھامنا عروۃ اصل میں عری تھا۔ بمعنی ننگا ہونا۔ اس لئے چٹیل میدان کو عراء کہا جاتا ہے۔ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ اور عراء کے معنی جانب یا پہلو کے بھی ہیں۔ عروۃ دستہ کو بھی کہتے ہیں۔ جو برتن کے ایک کنارے پر ہو جس سے برتن پکڑا جائے۔ اسی لئے ڈول اور کوزہ کی جائے گرفت کو بھی عروہ کہا جاتا ہے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ عروہ وہ چیز جس کو پکڑ کر لٹکا جائے یعنی رسی وثقٰی وثیق کا مونث ہے۔ بمعنی مضبوط یہاں قوی دلائل کو مضبوط گرہ والی رسی سے تشبیہہ دی گئی ہے جو ہاتھ سے نہ چھوٹے لَا انْفِصَامَ لَهَا یہ وثقٰی کا بیان ہے۔ انفصام فصم سے بنا بمعنی کھل کر ٹوٹنا کٹنے کو ابانت کہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ سمیع کا مفعول اقوال اور علیم کا مفعول عقائد و خطرات اور ارادے ہیں۔ یعنی اللہ ہر ایک کی بات سننے والا اور ہر ایک کی نیت جاننے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو دین میں کسی پر زبردستی نہیں کسی کو مجبور کر کے مسلمان نہ بناؤ کیونکہ قرآن کریم سے ہدایت اور گمراہی پوری ظاہر ہو چکیں کہ کسی ہوشیار کو اس میں دم مارنے کی گنجائش نہیں اب جو کوئی شیطان سے دور رہے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے دین کی ایسی مضبوط رسی پکڑ لی۔ اور ایسی محکم گرہ تھام لی جو کبھی کھل سکتی ہی نہیں۔ وہ اس کے ذریعے یقیناً جنت میں پہنچے گا۔ تم کسی کی فکر کیوں کرتے ہو۔ اللہ ہر ایک کی بات سنتا ہے۔ اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔ ہر ایک کو اس کے لائق سزا و جزا دے گا۔ دنیا مذہبوں کا جنکشن ہے۔ جنکشن پر تحقیق کر کے گاڑی میں بیٹھو۔ تب منزل مقصود پر پہنچو گے۔ طغیان کی ریل میں بیٹھ کر رحمٰن تک نہیں پہنچ سکتے۔ طغیان کے ذریعہ نیران تک ہی پہنچو گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کسی کو جبراً مسلمان کرنا جائز نہیں۔ اس لئے جہاد سے پہلے اسلام پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کفار نہ مانیں تو جزیہ کی پیش کش ہوتی ہے۔ اگر اس کا بھی انکار کریں تب جنگ۔ اگر اسلام میں جبر ہوتا تو جزیہ کی پیش کش نہ ہوتی۔ مگر اس حکم سے مرتدین اور مشرکین عرب مستثنٰی ہیں کہ ان کے لئے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا اسلام یا تلوار۔ **دوسرا فائدہ:** اس آیت سے موجودہ کفار کا یہ الزام بھی اٹھ گیا کہ اسلام تلوار سے پھیلا یا مسلمانوں نے کفار کو جبراً کلمہ پڑھایا جبراً مسلمان کرنا اسلام کا قانون ہی نہیں اگر یہ قانون ہوتا تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد صرف دس کروڑ ہندوؤں کی تعداد پچیس کروڑ نہ ہوتی۔ بلکہ یہاں سب مسلمان ہی ہوتے اور ملک بجائے ہندوستان کے اسلام استان

ہوتا۔ کیونکہ یہاں مسلمانوں کی حکومت تقریباً آٹھ سو سال رہی۔ پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ پیغمبر اسلام ﷺ دنیا میں توحید کے علمبردار تھے اور ان کے پاس دنیاوی ساز و سامان کچھ نہ تھا۔ تمام عرب ان کا مخالف اکیلی ذات دنیا پر کیسے تلوار چلا سکتی ہے وہ کونسی کشش تھی کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں لوگ مسلمان ہوتے تھے۔ اور اسلام لا کر ہزار ہا مصیبتیں جھیلتے اور دنیا کے مظالم سہتے تھے۔ دیکھو حضرت بلال' حضرت صہیب' سلمان فارسی' ابوذر غفاری وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات۔ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے پاس کونسی تلوار ہے۔ اب بھی جب مردم شماری ہوتی ہے تو مسلمانوں کا تناسب آبادی بڑھتا ہی ہے قبیلے کے قبیلے حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ بیشک اسلام تلوار سے پھیلا مگر لوہے کی تلوار سے نہیں بلکہ حقانیت و صداقت کی تلوار سے۔ **مسئلہ:** کسی کو مجبوراً مسلمان کرنا جائز نہیں لیکن اگر کوئی لالچ یا مجبوری سے مسلمان ہو جائے تو شرعاً وہ مسلمان ہو گا۔ اور اس پر اسلامی احکام نماز جنازہ وغیرہ جاری ہوں گے۔ اگر مرتد جان کے خوف سے یا کافر بحالت جنگ مسلمان کی زد میں آ کر کلمہ پڑھ لے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ مگر عند اللہ مومن ہونے کے لئے اخلاص شرط ہے۔ **مسئلہ:** اگر کوئی ہندو یا پارسی یہودی ہو جائے یا عیسائی و یہودی مجوسی یا بت پرست بن جاوے تو ہمارے نزدیک اسے اپنے مذہب کی طرف لوٹ جانے پر مجبور نہ کیا جاوے گا بلکہ اسے دینی آزادی ہو گی۔ (احکام القرآن) **مسئلہ:** اگر کوئی کافر جبراً مسلمان کیا گیا ہو تو اب اسلام پر قائم رکھا جاوے گا۔ اپنے مذہب کی طرف پھر جانے کی اجازت نہ ہو گی۔ مگر مرتد ہو جانے پر وہ قتل نہ کیا جاوے گا۔ (احکام القرآن) **فائدہ:** حضرت ضحاک سعدی سلیمان ابن موسیٰ وغیرہم نے اس آیت کو جاہد الکفار والمنافقین سے منسوخ مانا۔ (احکام القرآن و روح البیان) ان کے نزدیک اکراہ کے معنی ہی کچھ اور ہیں۔ اور یہ آیت مرتدین و کفار عرب سب کو عام ہے۔ مگر جمہور علماء نے اسے محکمات سے مانا۔ ان کے نزدیک اکراہ سے مراد ہے۔ دین پر مجبور کرنا۔ اور اس سے مرتدین و مشرکین عرب مستثنیٰ ہیں۔ (احکام القرآن) بعض نے فرمایا کہ **لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ** کے معنی یہ ہیں۔ کہ رب کی طرف کسی پر دین میں جبر نہیں بلکہ اختیار تام دیا گیا ہے۔ **فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ** (الکہف: ۲۹) (روح المعانی) بعض کے نزدیک یہ آیت ذمی اہل کتاب کے حق میں ہے۔ **فائدہ:** ایمانیات کے اقرار سے پہلے کفریات سے بیزاری ضروری ہے۔ دیکھو یہاں ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت کا ذکر ہوا۔ اسی لئے کلمہ طیبہ لا الٰہ پہلے ہے اور الا اللہ بعد میں کفریات سے بیزاری کامل یہ ہے کہ کفار سے نفرت ہو۔ ان کے کفر سے نفرت ہو۔ ان کی شکل و صورت۔ اخلاق۔ ان کے لباس وغیرہ تمام چیزوں سے نفرت ہو۔ اگر کفار کے کفر سے تو نفرت ہو۔ مگر ان کی وضع قطع سے محبت ہو تو یہ بیزاری کامل نہیں۔ **فائدہ:** کفر کے لغوی معنی ہیں۔ انکار کرنا یا چھپانا۔ شرعی معنی ہیں اسلامی عقائد کا انکار کرنا مطلق کفر سے شرعی معنی ہی مراد ہوتے ہیں۔ لغوی معنی کے لئے کچھ قید لگانی ہوتی ہے۔ جیسے یہاں کفر کے ساتھ طاغوت ارشاد ہوا۔ مولٰینا خسرو فرماتے ہیں۔ "کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست" یعنی میں عشق کا چھپانے والا ہوں۔ مجھے اظہار کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا جو کہے کہ میں کافر ہوں اور اس سے لغوی معنی مراد لے تب بھی شرعاً کافر ہو گا۔ اور اس پر تجدید ایمان لازم ہو گی۔ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ کی ذات و صفات اس کے احکام اس کے انبیاء و مرسل تمام پر ایمان لائے۔ صرف اللہ کی توحید تو شیطان بھی مانتا ہے۔ اور بہت سے کفار بھی موحد ہیں۔ اس لئے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔ **اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ** (النساء: ۱۳۶)

اور ارشاد ہوا۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ. (بقرہ:۲۸۵)

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب دین میں جبر نہیں تو مسلمانوں نے جہاد کیوں کئے۔ (آریہ) **جواب:** دنیا میں امن قائم کرنے کفر کا زور مٹانے اور اسلامی آزادی کے لئے تاکہ نیک لوگوں کو اللہ اللہ کرنے میں رکاوٹ نہ ہو۔ جہاد سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ جبراً کافروں کو مسلمان کیا جائے۔ **دوسرا اعتراض:** جب جبراً مسلمان کرنا جائز نہیں۔ تو جبر یہ ایمان کا اعتبار کیوں کیا گیا۔ اور ایسے مسلم کو مسلمان رہنے میں مجبور کیوں کیا گیا چاہیے تھا کہ ایسے ایمان پر اسلام کے احکام جاری نہ ہوں۔ **جواب:** شریعت کا حکم ظاہر پر ہوتا ہے اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں دل کی خوشی ناخوشی کا اعتبار نہیں زبانی اقرار کا لحاظ ہے جیسے طلاق اور غلام کا آزاد کرنا ایسے ہی اسلام بھی ہے۔ ورنہ لوگوں کو مرتد بننے کا بہانہ مل جاتا کہ جب چاہتے اسلام چھوڑ دیتے۔ اور حیلہ کر دیا کرتے کہ ہم جبراً مسلمان ہوئے تھے (از احکام القرآن) **تیسرا اعتراض:** جب دین میں جبر نہیں تو مرتد کو جبراً کیوں مسلمان کیا جاتا ہے؟ **جواب:** اسی لئے کہ وہ سلطنت الٰہیہ کا باغی ہے۔ جس کی سزا قتل یا اطاعت ہے۔ جبراً مسلمان کرنا منع مسلمان کو اسلام پر جبراً قائم رکھنا ضروری۔ **چوتھا اعتراض:** جب دین میں جبر نہیں تو مشرکین عرب کو مذہبی آزادی کیوں نہ دی گئی؟ **جواب:** اسی لئے کہ وہ سلطنت الٰہیہ کا دارالخلافہ ہے۔ وہاں صرف خدام ہی رہنا چاہئیں۔ شاہی عمارتوں میں صرف خدام رہ سکتے ہیں۔ **پانچواں اعتراض:** جن لوگوں نے اس آیت کو منسوخ مانا کیا ان کے نزدیک کفار کو جبراً مسلمان کرنا جائز ہے۔ **جواب:** نہیں ان کے نزدیک اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں کسی پر کسی قسم کی سختی نہیں نہ مرتد پر نہ مشرکین عرب پر اور نہ کسی اور پر اور ظاہر ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے جو لوگ اس آیت کو باقی مانتے ہیں ان کے نزدیک آیت کے وہ معنی ہیں جو ہم عرض کر چکے۔ **چھٹا اعتراض:** جب اسلام مضبوط رسی ہے کہ اس کے پکڑنے والا خطرے سے نکل جاتا ہے تو لوگ مرتد کیوں ہو جاتے ہیں۔ **جواب:** بعض لوگوں کا ارتداد اسلام کی کمزوری سے نہیں بلکہ اپنی کمزوری سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مضبوط رسی کو مضبوطی سے پکڑا نہیں۔ ان کی گرفت کمزور تھی۔

تفسیر صوفیانہ

علماء کے ہاں لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے معنی ہیں کسی کو دینِ اسلام جبراً نہ دو۔ یعنی کافر کو جبراً مسلمان نہیں کر سکتے۔ صوفیاء کے ہاں اس کے معنی ہیں کہ کسی سے نورِ ایمانی جبراً نہیں لے سکتے۔ یعنی نہیں ہے جبر نورِ ایمان میں یہ نور ایمانی جسے معرفت کہتے ہیں۔ چار طریقے سے ملتا ہے۔ محض عطاء الٰہی سے پیدائشی طور پر۔ جیسے غوث پاک پیدائشی ولی۔ دوسرا مصیبت و آفات کے ذریعہ جیسے نصوح کو آفت میں مبتلا ہو کر ایمان و معرفت نصیب ہوا۔ جس کا قصہ مثنوی میں ہے۔ عیش میں غفلت مصیبت میں توبہ میسر ہوتی ہے۔ تیسرا نورانی لوگوں کی صحبت سے جیسا صحابہ کرام کو حضور ﷺ کی صحبت سے وہ کمال معرفت ملا جو دوسرے کو نہیں مل سکتا۔ آگ میں رہنے سے بعض چیزیں آگ بن جاتی ہیں۔ اور بعض چیزیں گرم ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی نور کے ساتھ رہنے سے بعض نور بن جاتے ہیں اور بعض نورانی ہو جاتے ہیں۔ چوتھا کسی کے فیض نظر سے جیسے موسیٰ علیہ السلام

کے جادوگر جو ایک نگاہ کلیمی سے فاسق تھے عارف بن گئے۔ صوفیاء کے ہاں دین یعنی نور معرفت نہ زور سے ملتا ہے نہ زر سے ملتا ہے۔ بلکہ زاری عطا باری سے ملتا ہے۔

علم و حکمت از کتب دین از نظر　　　دین مجو اندر کتب اے بے خبر !!!

صوفیاء کرام کے نزدیک ایمان کی دو قسمیں ہیں۔ ایمان حقیقی اور ایمان رسمی جسے ایمان مجازی بھی کہتے ہیں۔ ایمان حقیقی وہ ہے جو دربار یار کی حاضری کے بعد بطریقہ عیاں ہوں۔ اور ایمان رسمی وہ ہے جو وہاں سے غائب رہ کر بطریقہ بیان ہو۔ یعنی سن سنا کر مان لینا۔ نیز کفر کی چند قسمیں ہیں۔ کفر نعمت کفر وحدت کفر طاغوت وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو رب سے غافل کرے وہ طاغوت ہے۔ خواہ نفس ہو یا مال یا غافل کرنے والی اولاد ان کے نزدیک انسانوں کے بھی تین گروہ ہیں۔ ایک اصحاب میمنہ۔ یعنی صاحب جمال دوسرے اصحاب مشمہ وہ صاحب جلال ہیں۔ تیسرے مقربین وہ صاحب کمال ہیں۔ پہلے گروہ کے دل ملائکہ مقربین کے ہاتھوں میں ہیں۔ اور دوسرے گروہ کے دل شیاطین کے قبضہ میں اور تیسرے گروہ کے قلوب خاص رب تعالیٰ کے ہاتھ میں یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ اس آیت میں اس تیسرے گروہ کا بھی ذکر ہے یعنی جو ہر قسم کے طاغوت سے الگ رہا۔ اور رب پر بطریقہ شہود وعیان ایمان لے آیا اور عالم مجاز سے نکل کر عالم حقیقت میں پہنچا انہوں نے ایسی مضبوط رسی پکڑی جو کبھی ٹوٹ سکتی ہی نہیں اور ان کا بہکنا ناممکن ہے۔ جیسے انبیاء و خاص اولیاء عشرہ مبشرہ جن کے بارے میں فرمایا گیا۔ کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ قَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ۔ (حدیث قدسی) جو چاہو کرو تمہاری بخشش ہوگئی۔ جب ان کا دل رب کے ہاتھ میں ہے تو وہ رضاء الٰہی کے سوا اور کیا چاہ سکتے ہیں۔ رہا دوسرا فریق یعنی ازلی کافر چونکہ ان کا تعلق طاغوت سے ہے اور رب سے انہیں کوئی تعلق نہیں یہ مردود ہیں۔ مگر پہلے لوگ چونکہ ان کا ایمان شہودی وعیانی نہیں۔ بلکہ رسمی و بیانی ہے اور ابھی یہ لوگ مجاز سے نکلے نہیں۔ یہ سمندر کی موجوں میں ہیں۔ اگر خاتمہ بالخیر نصیب ہو جائے تو کامیاب ہیں۔ ورنہ ناکام خلاصہ یہ کہ ایک فریق کا کفر یقینی اور ایک فریق کا ایمان قطعی مگر ایک جماعت وہ بھی ہے کہ جن کی کشتی منجدھار میں ہے۔ اللہ ان کا بیڑا پار کرے یہاں اس فریق کا ذکر ہے جس کا ایمان قطعی ہے (روح البیان)

دوسری تفسیر

اصطلاح صوفیا میں دین حقیقی نور قلبی کا نام ہے جو فطرت انسانیہ پر لازم ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ظاہری اسلام دین کا مظہر اور اس کی دلیل ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ اس نور میں جبر کو دخل نہیں۔ وہ محض عطاء ربانی ہے۔ جبراً کلمہ پڑھایا جاسکتا ہے۔ مگر دل منور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہی معنی ہیں لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ کے پھر چونکہ سیرت صورت سے اور قلب کا حال قالب سے معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ جو کوئی ماسوا اللہ کا انکار کرے۔ بلکہ غیر کے وجود تاثیر کا بھی منکر ہو جائے۔ اور اللہ پر شہودی ایمان لے آئے۔ تو اس نے توحید حقیقی کو پکڑ لیا اور یہ توحید ہی موجود ہے۔ ماسوا سب معدوم کیونکہ ممکن قابل انفصام ہے کہ واجب کے تعلق سے سب کچھ ہے۔ اور جہاں اس سے تعلق چھوٹا کہ اس کی رسی ٹوٹی لہٰذا توحید کا پکڑنے والا مضبوط رسی کو پکڑے ہے۔ اور ممکنات میں الجھنے والا کمزور دھاگوں سے بندھا ہوا ہے۔ (ابن عربی)

صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسا کنوئیں میں صاف پانی بھی ہوتا ہے۔ اور تہ میں ریت کیچڑ وغیرہ بھی پانی بھرنے والا ڈول میں رسی باندھ کر کنوئیں میں ڈالتا ہے۔ رسی کا ایک کنارہ ڈول کے کنڈے میں ہوتا ہے۔ دوسرا کنارہ مالک کے ہاتھ میں پھر اس رسی سے مالک ڈول اوپر کھینچ لیتا ہے۔ ڈول خالی گیا تھا۔ پانی سے بھر کر آتا ہے۔ ایسے ہی دنیا کنواں ہے اور یہاں کی عبادات صاف پانی ہیں۔ یہاں کے کفر و گناہ کیچڑ و ریت۔ رب نے انسان کو اس کنوئیں میں بھیجا۔ تاکہ نیکیوں کا پانی بھر کر لائے۔ مگر ایک مضبوط رسی اس کے ہاتھ میں دی۔ اس رسی کا ایک کنارہ بندے کے ہاتھ میں ہے۔ دوسرا کنارہ رب کے ہاتھ میں۔ رب کی پکڑ مضبوط ہے۔ رسی بھی بہت پختہ ہے۔ اگر کمزوری ہے تو ہماری پکڑ میں ہے۔ اگر ہم نے ایک ہاتھ دنیا میں رکھا دوسرے ہاتھ میں رسی پکڑے رہے تو انشاء اللہ اعمال کا پانی لے کر جائیں گے۔ اگر رسی چھوڑ کر دونوں ہاتھ دنیا میں ڈال دیئے تو پانی نہ ملے گا۔ ہم دلدل میں پھنس جائیں گے۔ یہ رسی کیا ہے یا تو دین اسلام ہے۔ یا حضور ﷺ کی ذات بابرکات۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی وہ مضبوط رسی ہیں جو ہم نیچوں کو اوپر پہنچانے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ امام بوصیری قصیدہ بردہ میں فرماتے ہیں دعا اِلَی اللّٰہِ فَالْمُسْتَمْسِکُوْنَ بِہٖ مُسْتَمْسِکُوْنَ بِحَبْلٍ غَیْرِ مُنْفَصِمٖ۔ یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ جو کفر اور کفار سے متنفر ہو اللہ اور رسول پر ایمان لاوے وہ ہی اس عروہ وثقیٰ یعنی اللہ کی رسی اسلام یا حضور ﷺ کے دامن کو صحیح طور پر تھامنے والا ہے اور جس نے کفر کی طرف میلان کیا۔ یا اللہ پر درست طرح ایمان نہ لایا یہ رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گی۔ خیال رہے کہ رب تک پہنچنے کے لئے حضور وسیلہ عظمٰی اور عروہ وثقیٰ ہیں مگر حضور ﷺ تک پہنچنے کے لئے سلسلہ مشائخ عروہ وثقیٰ ہیں۔ ریل کراچی پہنچاتی ہے۔ مگر ریل تک پہنچانے کے لئے بھی بس وغیرہ چاہیے۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ۬ وَ الَّذِیْنَ
اللہ مددگار ہے ان کا جو ایمان لائے کہ نکالتے ہیں انہیں اندھیروں سے طرف روشنی کے اور وہ جو
اللہ والی ہے مسلمانوں کا انہیں اندھیروں سے نور کی طرف نکالتا ہے اور کافروں کے
كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ
کافر ہو گئے مددگار ان کے شیاطین ہیں کہ نکالتے ہیں ان کو روشنی سے طرف اندھیروں کے
حمایتی شیطان ہیں وہ انہیں نور سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں
اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾
یہ لوگ آگ والے ہیں۔ وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں
یہ ہی لوگ دوزخ والے ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے مومنین و کفار میں ایک فرق بیان فرمایا گیا تھا۔ کہ

مسلمان تو دین کی مضبوط رسی کی گرہ پکڑے ہوئے ہیں۔ جو کھل نہیں سکتی۔ معلوم ہوا کہ کفار کی رسی کمزور اور جلد ٹوٹنے والی ہے۔ اب انہی دو فریق میں دوسرا فرق بتایا جا رہا ہے۔ کہ مسلمانوں کا والی اللہ ہے اور کفار کے حمایتی شیاطین۔ اور ظاہر ہے کہ جن کا والی رب ہے وہ ہی کامیاب۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے اسلام کی حقانیت اور کفر کا بطلان معلوم ہوا تھا۔ کہ اسلام مضبوط رسی ہے اور کفر کمزور اب خود صاحب ایمان کی خوبی اور کافر کی برائی کا تذکرہ ہے کہ مومن کا مددگار اللہ ہے۔ اور کافر کا شیاطین۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے مسلمانوں کی کامیابی معلوم ہوئی تھی۔ کہ ان کا دین بڑا مضبوط ہے۔ اور ان کی بنیاد نہایت پختہ اب دوسری نوعیت سے مسلمانوں کی کامیابی کا ذکر ہے کہ ان کا ناصر و حافظ اللہ ہے۔ گویا ایک قسم کی کامیابی کا ذکر پہلے ہوا تھا۔ اور دوسری کا اب کہ مسلمان دو طرح پختہ ہیں کہ مضبوط دین پر ہیں اور قوی و قادر کا ان پر ہاتھ ہے۔

شان نزول

اس کے شان نزول میں کئی قول ہیں۔ ا۔ یہ آیت مرتدین کے بارے میں آئی (بیضاوی) ۲۔ اسلام سے پہلے بعض لوگ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے اور بعض ان کے منکر تھے۔ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری کے بعد حضرت مسیح کے منکر یعنی مشرکین وغیرہ تو حضور ﷺ پر ایمان لا کر ان پر بھی ایمان لے آئے۔ اور بعض عیسائی حضور ﷺ کا انکار کر کے در پردہ حضرت مسیح کے بھی منکر ہو گئے۔ ان دو جماعتوں کے بارے میں یہ آیت اُتری (کبیر) ۳۔ بعض عیسائی پہلے نصرانیت پر تھے پھر حضور ﷺ پر بھی ایمان لے آئے۔ اور بعض حضور ﷺ سے پہلے نبی آخر الزمان کی تشریف آوری کی بشارتیں دیا کرتے تھے۔ مگر آپ ﷺ کی تشریف آوری پر حسد سے آپ ﷺ کے منکر ہو گئے۔ ان دو جماعتوں کے بارے میں یہ آیت اتری (کبیر) ۴۔ بعض نے فرمایا کہ یہ آیت ہر کافر اور مومن کے متعلق ہے۔

تفسیر

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ وَلِیّ بروزن فعیل بمعنی والی ہے۔ یہ وَلِیٌ سے بنا بمعنی قرب ہر قریب کو ولی کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ جگہ میں قریب ہو یا نسبت میں یا دین یا صداقت یا نصرت و مدد میں یا اعتقاد کے لحاظ سے لہٰذا مددگار کو بھی ولی کہتے ہیں۔ دوست کو بھی والی کو بھی محافظ کو بھی اور حمایتی کو بھی بعض نے فرمایا۔ کہ ولایت (واؤ کے زیر سے) بمعنی مدد ہے۔ اور ولایت (واؤ کے فتح سے) بمعنی متولی ہونا۔ اسی سے مولیٰ اور متولی ہے۔ اس کا مقابل عداوت ہے۔ بمعنی حد سے نکل جانا۔ یہاں قرب مکانی واعتقادی کے سوا باقی سارے معنی بن سکتے ہیں۔ خیال رہے کہ رب مسلمانوں کا ولی ہے۔ بمعنی مددگار و والی وغیرہ اور متقی مسلمان رب کے ولی بایں معنی کہ اس کے دین کے مددگار ہیں۔ اور اس سے قرب رکھتے ہیں۔ اِنْ اَوْلِیَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔ (انفال: ۳۴) لہٰذا اس جملے کی پانچ تفسیریں ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے قریب ہے۔ مسلمانوں کا دوست ہے۔ مسلمانوں کا مددگار ہے مسلمان کے امور کا متولی ہے۔ ان کا والی وارث ہے۔ مدد سے مراد دینی مدد ہے کیونکہ دنیاوی مدد تو تمام بندوں کو پہنچتی ہے۔ اور کفار آپس میں ایک دوسرے کے ولی وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ (انفال: ۷۳) مگر کفار کی ولایت جلد ختم ہونے والی۔ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَیْئًا (الدخان: ۴۱) مسلمانوں کی ولایت ہمیشہ قائم منوا سے یا تو موجودہ مومنین مراد ہیں۔ یا نو مسلمین یا وہ جو علم الٰہی میں مومن ہو چکے (روح المعانی و روح البیان)

یعنی اللہ مسلمانوں کا والی یا مددگار یا ان سے قریب یا ان کا پیارا یا ان کا کام بنانے والا متولی ہے۔خیال رہے کہ جب مسلمانوں کا رب تعالیٰ ولی ووارث ہوگیا تو اس کے تمام مقبول بندے فرشتے' انبیاء کرام' اولیاء اللہ ان کے ولی ووارث مددگار اور تمام زمین' ہوا' پانی وغیرہ خدمت گار ہو گئے۔جس پر بادشاہ مہربان ہو گیا اس پر تمام احکام ارکان و دولت مہربان ہو گئے اور مملکت کی ہر چیز پر گویا اس کا قبضہ ہو گیا۔اس لئے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا۔اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مائدہ:۵۵) مولانا فرماتے ہیں ۔

ہر کہ دیوانہ بود در ذکر حق!　　زیر پائش عرش و کرسی نہ طبق

لہٰذا یہ ولایت اپنے میں صدہا ولایتیں لئے ہوئے ہے۔کیا تمہیں نہیں پتہ کہ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لئے فرشتے آئے اور غزوۂ خندق میں مسلمانوں کی خدمت کے لئے ہوا مامور ہوئی اور تمام کفار کو درہم برہم کر دیا۔کہ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ ظُلُمَاتِ جمع ظلمۃ کی ہے' بمعنی اندھیری اور نور بمعنی روشنی جو خود ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرے۔اگر مومنین سے نومسلم یا جو علم الٰہی میں مؤمن تھے وہ مراد ہیں۔تو ظلمات سے کفر اور نور سے ایمان مراد ہے۔کیونکہ کفر میں اصل راستہ کا پتہ نہیں لگتا اور ایمان میں حق و باطل ممتاز ہو جاتا ہے۔اسی لئے کفر کو اندھیری اور ایمان کو نور فرمایا گیا۔سر کی آنکھوں کے لئے تاریکی و روشنی اور ہے۔دل کی آنکھوں کے لئے تاریکی و روشنی کچھ اور۔دل کے لئے کفر گمراہی' حسد' بغض' گناہ تاریکی ہے۔ایمان' عرفان' رحمت رحمان' نیک اعمال نور ہے۔آنکھ کا سرمہ و عینک اور ہے دل کا سرمہ و عینک کچھ اور ہے......اور چونکہ کفر کی صدہا قسمیں ہیں دھریت۔عیسائیت۔یہودیت بت پرستی وغیرہ اور اسلام ایک ہی دین ہے۔اس لئے ظلمت کو جمع اور نور کو واحد فرمایا گیا۔اور اگر مومنین سے قدیمی مسلمان مراد ہیں تو ظلمات سے گناہ یا شبہات یا شکوک مراد اور نور سے یقین و اطمینان قلب کیونکہ پرانا مسلمان تو کبھی کفر میں تھا ہی نہیں۔اس کے کفر سے نکلنے کے کیا معنی۔تفسیر کبیر نے فرمایا کہ ان مسلمانوں کو کفر سے نکالنے سے مراد ہے کفر سے بچانا کبھی بچنے کو نکلنا اور چھوڑنا کہہ دیتے ہیں۔یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔تَرَکْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۔ (یوسف:۳۷) یعنی اختیار نہ کیا۔حضور ﷺ نے ایک شخص کو کلمہ پڑھتے ہوئے سن کر فرمایا۔خَرَجَ مِنَ النَّارِ۔ یعنی آگ سے بچ گیا نہ یہ کہ آگ میں تھا اور نکلا۔یعنی اللہ مسلمانوں کو ظلمت کفر سے نور ایمان کی طرف نکالتا ہے۔یا قدیمی مسلمانوں کو ظلمت کفر سے بچا کر نور ایمان میں رکھتا ہے۔یا انہیں شہادت اور شکوک کی تاریکیوں سے نکال کر نور یقین عطا فرماتا ہے۔یا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ولی ہے جو مدینہ میں پہلے تو مشرک تھے۔مگر حضور ﷺ کی تشریف آوری پر مسلمان صحابی ہو گئے۔انصار کہلائے۔رب نے انہیں شرک کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی میں داخل فرما لیا۔یہ لوگ پہلے شرک' کفر' عناد و حسد' آپس کی لڑائی بھڑائی' غرضیکہ صدہا تاریکیوں میں پھنسے تھے۔ایک آفتاب نبوت کے طفیل تمام تاریکیاں چھٹ گئیں۔اجالا ہو گیا۔یہ رب تعالیٰ کا کرم ہے۔وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓـؤُهُمُ الطَّاغُوْتُ۔ یہاں بھی کفروا سے یا مرتدین مراد ہیں یا وہ جو علم الٰہی میں کافر ہیں۔اگرچہ فی الحال مومن ہوں۔یا قدیمی کفار۔اولیاء ولی کی جمع ہے۔جس کے معنی پہلے معلوم ہو چکے۔طاغوت واحد جمع۔مذکر مؤنث سب پر بولا جاتا ہے۔اس کی تحقیق پچھلی آیت میں ہو چکی اس سے یا شیاطین مراد ہیں۔یا کافروں کے سردار یا کاہن یا بت یا سارے ہی گمراہ کرنے والے (روح البیان و

خازن) یعنی کفار کے مددگار شیاطین ہیں جو انہیں کفر میں مدد دیتے ہیں۔ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ۔ یخرجون کا فاعل طاغوت یا اولیاء ہیں۔ ھم کا مرجع کفار ظلمات سے کفر اور نور سے ایمان مراد ہے۔ اگر کفار سے مرتدین مراد ہیں تو ان کا ایمان سے نکلنا ظاہر ہے اور اگر قدیمی کفار مراد ہیں تو نور سے فطری ایمان مراد ہے۔ جو میثاق کے دن حاصل ہوا تھا۔ اور جس پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے یا نور سے دلائل ایمانی اور ظلمات سے شکوک اور کفر مراد یا نکالنے سے نہ آنے دینا مراد ہے۔ یعنی مرتدین کو شیاطین نور ایمانی سے نکال کر تاریکی کفر میں داخل کر دیتے ہیں۔ یا قدیمی کفار کو شیاطین دلائل ایمانی سے ہٹا کر شبہات کفر پر متوجہ رکھتے ہیں۔ کہ انہیں ان دلائل میں غور کرنے ہی نہیں دیتے یا انہیں اسلام میں آنے ہی نہیں دیتے۔ یا مدینہ منورہ کے وہ یہود و عیسائی جو پہلے قدرے نور نبوت سے منور تھے۔ کہ گذشتہ انبیاء کرام اور پچھلی کتب آسمانیہ کو مانتے تھے۔ مگر حضور انور پر حسد کی وجہ سے اپنے دین کو بالکل ہی چھوڑ بیٹھے انہیں شیاطین نے توریت و انجیل نیز نبوت کے نور سے نکال کر صریح کفر و شرک حسد بغض کی اندھیریوں میں پھنسا دیا۔ خیال رہے کہ کافر کرنے کی نسبت شیاطین کی طرف سببیت کے لحاظ سے ہے کہ وہ اسباب کفر ہیں۔ ورنہ سب کا خالق رب تعالیٰ ہے۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ سے یا طاغوت کی طرف اشارہ ہے۔ یا اولیاء یا کفار کی طرف یا سب کی جانب۔ اخیری معنی زیادہ قوی ہے۔ (کبیر) یعنی یہ شیاطین یا کفار کے حمایتی یا یہ سارے جہنمی ہیں کہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ ھم سے معلوم ہوا کہ جہنم میں ہمیشگی صرف کفار کے لئے ہے۔ مومن کیسا ہی گنہگار ہو آخر کار نجات پائے گا۔

خلاصہ تفسیر

مسلمانوں کی ایک پختگی تو یہ تھی کہ ان کا دین نہایت مضبوط جو نہ زندگی میں چھوٹے نہ موت کے وقت نہ قبر میں نہ حشر میں کفر اتنا کمزور دھاگہ ہے کہ دنیوی بلاؤں میں بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ نزع اور قبر حشر میں تو کیا کام آئے ان کی دوسری پختگی یہ ہے کہ مسلمان کا ناصر اور والی ایک اللہ ہے۔ جو ان کے سارے کام بنا دیتا ہے انہیں کفر و شرک بے دینی شبہات کی ظلمت سے بچا کر ایمان وایقان کے نور میں رکھتا ہے اور کفار کے حمایتی صدہا شیاطین بت اور سردار ہیں۔ جو انہیں ایمان وایقان و دلائل و اطاعت کی روشنی سے ہٹا کر کفر طغیان کی ظلمت میں لے جاتے ہیں۔ اس کا انجام یہ ہے کہ یہ کفار اور ان کے سردار و شیاطین سارے جہنمی ہیں کہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ مومن رب کے ہیں۔ اور کفار سب کے لہٰذا مومن ہی نفع میں خدا کے فضل سے ہر مومن آخر کار برے عقائد گندے رسم و رواج فاسد خیالات سے نکل جاتا ہے اسکا ایمان ہر قسم کی تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آتا ہے۔ کافر کا ہر قدم برائی کی طرف پڑتا ہے۔ اور دن بدن اس کا تعلق ظلمت سے بڑھتا جاتا ہے کہ ہمیشہ ایک بدی سے دوسری بدی کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** مومن کیسا ہی گنہگار ہو مگر اس کے قلب میں نور ایمانی ہوتا ہے جو اسے بدعقیدگی و بد مذہبی سے دور رکھتا ہے۔ وہ اپنے کو گنہگار و خطا کار مانتا ہے۔ کافر بظاہر کتنے ہی بھلے کام کرے مگر اس کے دل میں نور ایمانی نہیں ہوتا۔ جس کا دل نور ایمانی سے خالی ہے وہ بے ایمان ہے۔ **دوسرا فائدہ:** ہر قسم کی ظلمت سے

نکلنا محض فضل ربانی ہے۔ ہمارا اپنا کوئی کمال نہیں۔ دیکھو یہاں ظلمۃ کے نکالنے کو رب کی طرف منسوب قرار دیا گیا۔ ہم تو مٹی کے بنے ہیں۔ جب چھوڑ دیئے جائیں تو نیچے ہی گریں گے۔ اوپر تو کسی اور ہی کی طاقت سے جائیں گے۔ **تیسرا فائدہ:** جو رب سے قرب چاہے وہ رب کے مقبول بندوں کے پاس بیٹھے کہ یہ شخص ان بزرگوں کے قریب ہوگا۔ اور رب تعالیٰ ان کے قریب ہے۔ قریب سے قریب خود اس سے قریب ہوتا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے قرب الٰہی معلوم ہو ایمان والے زندہ ہوں یا وفات یافتہ سب سے رب قریب ہے۔ اور جو شیطان سے قریب ہونا چاہے وہ کفار کے پاس جائے۔ اس لئے بت خانہ مندر گرجے میں نماز مکروہ ہے کہ وہاں شیاطین کا قرب ہے۔ بزرگوں کے آستانہ میں نماز بہتر کہ وہاں رب کا قرب ہے۔ **چوتھا فائدہ:** ابلیس اور اس کی ذریت تمام دنیا کے کفار کے قریب ہے۔ دیکھو یہاں فرمایا گیا۔ اَوْلِیٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ اور سب کو دیکھتے ان کے دلوں کا حال جانتے ہیں رب فرماتا ہے۔ اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (اعراف: ۲۷) جب اس ناری کی یہ طاقت ہے کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے تو رب کی نوری مخلوق جو اس مردود سے کہیں زیادہ قوت و طاقت رکھتی ہے۔ اس کا تصرف و علم اس سے کہیں زیادہ ہے۔ دوا کی طاقت بیماری سے زیادہ چاہیے۔ **پانچواں فائدہ:** اگرچہ ہر چیز خیر و شر رب کی طرف سے ہے۔ مگر تقاضا ادب یہ ہے کہ خیر کو رب کی طرف اور شر کو اپنی یا اپنے برے ساتھیوں کی طرف نسبت کرے۔ جیسا اس آیت میں کیا گیا۔ شیطان نے کہا تھا۔ فَبِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ (اعراف: ۱۶) اے رب تو نے مجھے گمراہ کر دیا۔ مردود ہوا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کیا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف: ۲۳) اے مولیٰ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ محبوب ہوئے۔ **چھٹا فائدہ:** اسی طرح اگرچہ ساری مخلوق اللہ کی ہے۔ مگر اسے اعلیٰ مخلوق کی طرف نسبت کرو۔ رب العالمین۔ رب العرش۔ رب محمد ﷺ۔ رب کعبہ کہو۔ رب کفار یا رب شیطان نہ کہو۔ **ساتواں فائدہ:** برے ساتھی اللہ کا عذاب ہیں کہ سب کو بہکاتے ہیں۔ اور اچھے ساتھی اللہ کی رحمت اسی لئے صحابہ کرام پردیس میں پہنچ کر رب سے اچھے ساتھی مانگتے تھے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مومن تو پہلے ہی سے نور میں تھا۔ اور کافر ہمیشہ سے اندھیرے میں پھر مومن کو ظلمت سے اور کافر کو نور سے نکالنے کے کیا معنی نکالا اسے جائے جو پہلے وہاں موجود ہو (آریہ) **جواب:** اس کے نہایت نفیس جواب تفسیر میں گزر گئے کہ یا تو مومن سے مراد نو مسلم اور کافر سے مراد مرتدین ہیں۔ اور یا نکالنے سے مراد روکنا اور باز رکھنا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان رب کی طرف سے ہے اور کفر شیطان کی طرف سے پھر تم یہ کیوں کہتے ہو کہ ہر خیر و شر رب کی طرف سے ہے (معتزلی) **جواب:** اس کا جواب فوائد میں گزر گیا۔ کہ ہر خیر و شر رب کی طرف سے ہے۔ مگر چونکہ شیاطین شر کا سبب ہیں اس لئے شر کو انہیں کی طرف نسبت کر دیا گیا تا کہ مسلمان ادب سیکھیں۔

تیسرا اعتراض: جیسے کفر کا سبب شیطان ہے ویسے ہی ہمارے ایمان کا ذریعہ اللہ کے نیک بندے انبیاء۔ اولیاء۔ مشائخ و علماء ہیں۔ تو یوں کہنا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے ولی۔ انبیاء۔ اولیاء۔ علماء ہیں۔ اور کفار کے ولی شیاطین۔ **جواب** اللہ کے پیارے فنافی اللہ ہونے کی وجہ سے خدا کے غیر میں داخل نہیں۔ ان کا فعل رب کا فعل ہے۔ شیاطین ہر طرح اس کے

غیر ہیں لہٰذا ان کے افعال رب کے فعل نہیں کہلاتے۔ **چوتھا اعتراض:** جب مسلمانوں کا ولی رب ہی ہے اور وہ ہی ان کا ناصر و مددگار تو تم بندوں کو اپنا ولی اور مددگار کیوں سمجھتے ہو۔ اور ان سے حاجتیں کیوں مانگتے ہو (دیوبندی) **جواب:** اس کا تفصیلی جواب وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفسیر میں گزر گیا۔ کہ رب کی ولایت حقیقی ہے وہ حقیقی مددگار اور حقیقی ناصر اور حقیقی حاجت روا ہے۔ اس کے مقبول بندے اس کے مظہر ہیں۔ ان کی مدد اس ہی کی مدد ہے۔ جیسا کہ رب شافی الامراض ہے اور رازق العباد ہے۔ مگر دوا کے لئے ڈاکٹروں اور رزق کے لئے مالداروں کے دروازے پر جاتے ہیں۔ رب نے فرمایا اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ (مائدہ: ۵۵) جب اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے تو ہم رزق کے لئے بازار۔ کھیت۔ کنوئیں پر کیوں جاتے ہیں جیسا وہ تمام چیزیں ربوبیت الٰہیہ کی مظہر ہیں۔ ایسا ہی ان بزرگوں کے آستانے ولایت ربانی کے مظہر ہیں۔ پیاسا کنوئیں پر جاسکتا ہے۔ بھوکا روٹی کی دوکان پر بیمار طبیب کے پاس مظلوم حاکم کی کچہری میں تو یوں ہی گنہگار حضور انور کے آستانہ پر حاضری دے سکتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ الخ (النساء: ۶۴)

تفسیر صوفیانہ

مومنین کے طبقے تین ہیں۔ عام خاص اور خاص الخاص۔ اسی لحاظ سے ظلمت اور نور کے تین درجے ہیں۔ رب تعالیٰ عام مسلمانوں کو تاریکی کفر و ضلالت سے نور ایمان اور ہدایت کی طرف نکالتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد: ۱۷) اور خواص کو نفسانی جسمانی ظلمتوں سے رحمانی ربانی انوار کی طرف نکالتا ہے۔ اور خاص الخاص کو ظلمت حدوث سے نور قدم کی طرف نکالتا ہے۔ کہ وہ فانی ہو کر باقی سے ملتے ہیں۔ اور بعد فنا بقا کے لطف لیتے ہیں۔ رب تعالیٰ ان کے دینی اور دنیاوی سارے امور کا خود متولی ہے۔ یہاں تینوں صورتوں کی طرف اشارہ ہے۔ (روح البیان)

خیال رھے کہ جیسے جسمانیات میں بہت قسم کی ظلمتیں ہیں۔ اور ان کو توڑنے والے نور بھی بہت قسم کے۔ (۱) آنکھ کی ظلمت اندھاپن اس کا توڑ آنکھوں کا نور یعنی انکھارین (۲) دل کی ظلمت جہالت اس کا توڑ دل کا نور یعنی علم (۳) دماغ کی ظلمت دیوانگی بے عقلی اس کا توڑ دماغ کا نور یعنی عقل۔ ایسے ہی روحانیات میں ظلمتیں بھی بہت ہیں اور انکے توڑ نور بھی بہت۔ چنانچہ ظلمت طغیانی اس کا توڑ نور ایمانی۔ ظلمت عصیانی اس کا توڑ نور غفرانی کیونکہ گناہ تاریکی ہے تو یہ مغفرت نور۔ ظلمت نفسانی اس کا توڑ نور عرفانی کیونکہ غفلت تاریکی ہے۔ معرفت الٰہی نور ظلمت فنا اس کا توڑ نور بقا دنیا کی مشغولیت تاریکی ہے اور رب میں فنا ہو کر بقا باللہ نور ہے۔ اسی طرح حسد۔ بغض۔ عداوتیں۔ ریا۔ تکبر سب ظلمۂ فانی ہیں ان کے مقابل کی خوبیاں نور ہیں۔ اور انکا توڑ ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مومنوں کو تمام تاریکیوں سے نکال کر ان کو انوار میں داخل فرماتا ہے۔ چونکہ ان تاریکیوں کے مرکز مختلف تھے۔ اس نے انہیں جمع کر کے فرمایا ظلمات مگر تمام انوار کا مرکز ایک ہی ذات کریمہ الابرار احمد مختار علیہ السلام کی ذات وصفات تھی۔ اس نے اسے واحد کر کے فرمایا نور۔ رب نے فرمایا قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ: ۱۵) جس کی رسائی دامن پاک مصطفیٰ علیہ السلام تک ہوگئی۔ اسے تمام انوار مل گئے۔ حضور علیہ السلام کے نور سے تو جانور بھی فائدے اٹھاتے تھے چیل حضور علیہ السلام کے سر مبارک کے مقابل ہوئی تو تحت الثریٰ تک اس کی نگاہ پہنچ گئی۔

دوسری تفسیر

عالم دو ہیں۔ ا۔ عالم اجسام جسے ظلمت کہتے ہیں۔ ۲۔ عالم ارواح جسے عالم نور بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ اسی عالم اجسام میں۔ نفس، خیال، وہم دنیوی تعلقات مال اولاد وغیرہ ہزار ہا حجاب ہیں۔ گویا یہ مجموعہ ظلمات ہے۔ رب تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے سارے معاملات اور محبت کا خود متولی اور منتظم کار ہے۔ کہ انہیں خود ان کی کوشش سے نہیں بلکہ اپنے کرم خاص سے ان ظلمات سے نکال کر عالم نور میں پہنچا دیتا ہے کہ یہاں کی کوئی چیز ان کے لئے حجاب نہیں رہتی کفار کے مددگار وہ اغیار ہیں۔ جن پر ان کی ہر وقت نظر ہے۔ وہ انہیں فطری ہدایت کے نور سے نکال کر صفات نفس اور شکوک وشبہات کی اندھیریوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ ہر ایک کے کلام کو سننے والا اور ہر ایک کی حالت جاننے والا ہے۔ سب کو ان کی استعداد کے لائق دیتا ہے (ابن عربی) فرعون نے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (النازعات: ۲۴) کہا بے ایمان ہوا۔ حضرت منصور نے اَنَا الْحَقُّ کہا مومن رہے۔ کہ وہ حجاب میں رہ کر کہتا تھا۔ اور یہ ظلمت حجاب سے گزر کر۔ صوفیاء کرام کے ہاں دل کی بے چینیاں ظلمات وتاریکیاں ہیں۔ اور دل کا چین واطمینان نور ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کو بے چینیوں سے نکال کر چین کے نور میں داخل کرتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد: ۲۸) دنیا میں عیش بے چینی کا باعث ہے۔ رب سے تعلق چین کا ذریعہ اس زندگی کا نام حیات طیبہ ہے۔ شعر۔

نانک دکھیا سب سنسار　　وہ سکھیا جسے نام اُدھار

خیال رہے کہ روح سب کی نور ہے کہ عالم امر کی چڑیا ہے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء: ۸۵) اور نفس امارہ ظلمات۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (یوسف: ۵۳) مومن کو اللہ تعالیٰ نفس کی ظلمات سے نکال کر روح کے نور میں داخل فرماتا ہے۔ اور کافر کو روح کے نور سے نکال کر نفس کی ظلمت میں داخل کر دیتا ہے۔ یا یوں کہو کہ مومن کا نفس روح کی صحبت سے منور ہو جاتا ہے۔ اور کافر کی روح نفس کی صحبت سے سیاہ وتاریک۔ کہ انسان کا دل نفس وروح کے درمیان ہے۔ جیسے زمین پر کبھی دن آتا ہے کبھی رات ایسے دل پر کبھی نفس کی رات ہوتی ہے کبھی روح کا دن۔ اللہ تعالیٰ مومن کے دل کو نفس کی رات سے نکال کر روح کے نور یا دن میں لاتا ہے۔ اور کافر کے دل کو روح کے نور سے نکال کر نفس کی رات میں داخل کر دیتا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ روز ازل میں جس پر نور کا چھینٹا پڑ چکا ہے وہ اگر دنیا میں کافر بھی ہو گیا تو اسکا کفر عارضی ہوگا۔ آخر کار مومن ہو جائے گا۔ جیسے سونا کیچڑ میں پڑ کر عارضی طور پر گندہ ہو جائے۔ اور جس پر وہ چھینٹا نہ پڑا ہے۔ اگر وہ دنیا میں مومن بھی ہو جائے تو اسکا ایمان عارضی ہوگا۔ آخر کافر ہو جائے گا۔ جیسے کوئلہ پر چونا لگ کر سفید ہو جائے۔ مگر دھلتے ہی کالا نکلے گا۔ یہ اس آیت کا منشا ہے مومن کو ظلمات سے نور کی طرف اور کافر کو نور سے ظلمات کی طرف نکالنے کا۔ خیال رہے کہ یہ آیۃ تمام ان آیات کی تفسیر ہے۔ جن میں اولیاء مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی برائیاں ہیں۔ یا انہیں بھی اتنا کفر قرار دیا گیا۔ اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ نے بتایا کہ وہ اولیاء مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ. ہیں ان ہی کو ماننا شرک ہے۔ عربی میں اِلَّا۔ غیر۔ سوا۔ دشمن سب کے معنی ہی سوا یا علاوہ مگر الا تو مطلقاً علاوہ کو کہتے ہیں۔ اور غیر اجنبی کو کہا جاتا ہے مگر دون مقابل یا دشمنی پر بولا جاتا ہے۔ جس میں علیحدگی ہو۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ. (قصص: ۲۳) بعض بندے رب کے دشمن ہیں جنہیں حزب الشیطان

کہتے ہیں۔ بعض مذہب سے اجنبی جیسے دنیا واہل دنیا بعض اللہ کے اپنے ہیں جنہیں حزب اللہ کہتے ہیں۔ پہلے دو اولیاء مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ہیں اور تیسری جماعت اولیاء اللہ ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ
کیا نہ دیکھا آپ نے طرف اس کے کہ جھگڑا کیا اس نے ابراہیم سے بیچ رب ان کے یہ کہ دیا اس کو اللہ نے ملک جب
اے محبوب کیا تم نے نہ دیکھا تھا اسے جو ابراہیم سے جھگڑا اس کے رب کے بارے میں اس پر کہ اللہ نے اسے بادشاہی دی
اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ
کہا ابراہیم نے کہ رب میرا وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے کہا اس نے میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں
جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے کہ جلاتا اور مارتا ہے بولا میں جلاتا اور مارتا ہوں
قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ
کہا ابراہیم نے پس تحقیق اللہ لاتا ہے سورج کی طرف سے پورب کے پس لا تو اسے طرف سے پچھم کے
ابراہیم نے فرمایا تو اللہ سورج کو لاتا ہے پورب سے تو اس کو پچھم سے لے آ
فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾
پس حیران کر دیا گیا وہ جس نے کفر کیا اور اللہ نہیں ہدایت دیتا قوم ظالم کو
تو ہوش اڑ گئے کافر کے اور اللہ راہ نہیں دکھاتا ظالموں کو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مومنوں کے نور اور کفار کی تاریکی کا ذکر تھا۔ اب اسی کی تائید کے لئے یہ قصہ ارشاد ہو رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نور ہدایت عطا ہوا اور نمرود گمراہی میں پھنسا رہا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ مسلمانوں کا ولی ہے اور کفار کے ولی شیاطین۔ اب اس کے ثبوت میں ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہو رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے ایسے جابر بادشاہ کے سامنے ان کی مدد فرمائی۔ اور نمرود ان کے مقابلہ میں بے دلیل رہ گیا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ رب تعالیٰ مومنوں کا ہی ولی ہے۔ اور کفار کے مددگار شیاطین جس سے وہم ہوتا تھا کہ رب ان کی ہدایت کے سامان بھی پیدا نہیں فرماتا اس وہم کو دور کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ارشاد ہو رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی طرف ہادی بھیجے جاتے ہیں مگر وہ ان سے فیض نہیں لیتے۔

تفسیر

اَلَمْ تَرَ یہ استفہام انکاری ہے اور اس میں حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ روایت سے آنکھ کا دیکھنا مراد ہے۔ اور لَمْ کی وجہ

سے مستقبل بمعنی ماضی یعنی اے محبوب کیا آپ نے اس سے پہلے حضرت خلیل جلیل اور ایک کافر ذلیل کا مناظرہ ان آنکھوں سے ملاحظہ نہ فرمایا تھا۔ یعنی ضرور دیکھا تھا۔ کیونکہ آپ ولادت پاک سے پہلے سارے عالم کو دیکھ رہے تھے۔ اِلَی الَّذِیْ حَاجَّ اِبْرٰهِیْمَ فِیْ رَبِّهٖ۔ اَلَّذِیْ سے اس وقت کا بادشاہ مراد ہے۔ جس کا نام نمرود ابن کنعان ابن سنجاریب تھا۔ (روح المعانی) یا نمرود ابن کنعان ابن سام ابن نوح علیہ السلام (روح البیان) یہ ہی پہلا وہ بادشاہ ہے۔ جس نے تاج پہنا رعایا پر ظلم کیا۔ خدائی کا دعویٰ کیا۔ اور سارے جہان کی بادشاہت کی اس کی عمر آٹھ سو ۸۰۰ برس ہوئی۔ چار سو ۴۰۰ سال عزت کے ساتھ اور چار سو برس مچھر کی وجہ سے پٹ کٹ کر اس نے رب سے مقابلہ کرنے کے لئے نہایت اونچا قلعہ بنایا تھا۔ اس کا پایۂ تخت بابل تھا۔ (روح البیان وخازن) حَاجَّ حاجۃ سے بنا۔ جس کا مادہ حج اور حجۃ ہے بمعنی غلبہ حاجۃ کے معنی ایک دوسرے کے مقابلہ میں غلبہ کی کوشش کرنا دلیل کو اسی لئے حجت کہتے ہے کہ وہ غلبہ کا ذریعہ ہے۔ چونکہ اس مناظرہ کی ابتداء نمرود نے کی تھی۔ اس لئے حَاجَّ کا فاعل اسے ہی قرار دیا گیا۔ یا حَاجَّ سے مراد ہے کم بختی اور ناجائز حجۃ بازی کی جو دلیل وحجۃ حق بات پر کی جاوے وہ حجۃ بھی حق حجۃ والا بھی حق وہ حجۃ اللہ کی حجۃ ہے۔ رب فرماتا ہے تِلْکَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰهَآ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰی قَوْمِهٖ (انعام: ۸۳) اور جو حجت حق کے خلاف کی جاوے وہ حجۃ باطل ہے۔ حجۃ والا بھی باطل یہاں باطل حجۃ مراد ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ مناظرہ ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے ہوا۔ جبکہ آپ نے بت شکنی فرمائی۔ اور نمرود مناظرہ سے عاجز ہو کر آپ کو آگ میں ڈالنے پر آمادہ ہوا۔ یہ قول مقاتل کا ہے۔ امام جعفر صادق سے مروی ہے کہ یہ مناظرہ ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے کے بعد ہوا کہ جب آپ پر آگ گلزار ہوگئی۔ تب اس نے پوچھا کہ بتاؤ تو آپ کا رب کون ہے۔ جس کی طرف مجھے بلاتے ہو۔ (روح المعانی وکبیر) فی سے پہلے حق یا صفات پوشیدہ ہے۔ اگرچہ حق تعالیٰ ان دونوں کا رب ہے۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کی عزت افزائی کے لئے اپنے کو انہیں کی طرف نسبت کیا یا چونکہ ابراہیم علیہ السلام حق تعالیٰ کی ربوبیت کے مدعی تھے۔ اور نمرود اپنی خدائی کا اس لئے رَبِّهٖ فرمایا گیا۔ یعنی اس بادشاہ نے ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب کے بارے میں مناظرہ کیا۔ صوفیاء کے مشرب میں حق تعالیٰ خصوصی رب صرف ابراہیم علیہ السلام کا ہی ہے نہ کہ نمرود کا رب۔ اللہ کی ربوبیّت عام ساری خلق کے لئے ہے۔ یعنی پرورش جسم اور جسمانی روزیاں دینا۔ مگر ربوبیت خاصہ یعنی روحانی پرورش اور روحانی روزیاں دینا صرف مومنوں سے خاص پر ایک کو ایمان تقویٰ۔ ولایت۔ نبوت نہیں ملتی۔ پھر جیسے جسمانی ربوبیت بندوں کے توسل سے ظاہر ہوتی ہے۔ یوں ہی روحانی ربوبیت حضرات انبیاء و اولیاء کے توسل سے حاصل ہوتی ہے کہ ایمان عرفان وغیرہ انہی کے ذریعہ ملتی ہے چونکہ نمرود حضرت خلیل سے دور رہا اس لئے رب کی خصوصی ربوبیّت سے حصہ نہ پاسکا۔ یا یوں کہو کہ رب تعالیٰ کو اچھوں کی طرف نسبت کرنا اچھا ہے۔ یہ نہ کہو کہ اے ابوجہل کے رب یوں کہو اے محمد ﷺ کے رب یہ نہ کہو اے گھروں کے رب یوں کہو اے کعبہ کے رب۔ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْکَ۔ یا تو ان سے پہلے لام پوشیدہ ہے اور یہ جملہ مناظرہ کی علت ہے نہ کہ حاجّ کا مفعول لہ کیونکہ مفعول لہ میں لام وہاں پوشیدہ ہوسکتا ہے۔ جہاں فعل اور اس کا فاعل ایک ہی ہو۔ اور یہاں حَاجَّ کا فاعل نمرود ہے۔ اور اٰتٰىهُ کا فاعل اللہ تعالیٰ یا اس سے پہلے علیٰ پوشیدہ ہے۔ یا فی شکر یا وقت آخیری توجیہ پر یہ حَاجَّ کا ظرف ہے۔ اور خیال رہے کہ مصدر جعلی بھی ظرف بن

سکتا ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ ہٗ کا مرجع نمرود ہے۔ اور بعض نے کہا کہ اس کا مرجع ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ مگر قول صحیح جمہور کا ہے کیونکہ مناظرہ کے وقت ابراہیم علیہ السلام کو ملک اور ظاہری سلطنت نہیں ملی تھی۔ ملک سے مراد تمام جہان کی سلطنت ہے۔ کیونکہ نمرود عالم کا بادشاہ گزرا ہے۔ یعنی نمرود نے اس لئے یا اس وقت یا اس نعمت کے شکریہ میں یا اس کے باوجود مناظرہ کیا کہ رب نے اسے تمام جہان کی سلطنت دی تھی۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ تو میری مخالفت اس لئے کرتا ہے کہ میں نے تجھ پر احسان کئے۔

نوٹ: سارے جہان کے مالک صرف چار بادشاہ گزرے ہیں۔ دو مومن حضرت سلیمان علیہ السلام اور سکندر ذوالقرنین۔ اور دو کافر نمرود اور بخت نصر جس کا لقب شداد بن عاد ہے جس نے عدن کے جنگلوں میں جنت بنائی (روح البیان)۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ۔ اِذْ...... یا تو حَاجَّ کی طرف ہے یا اٰتٰهُ کا بدل (روح المعانی) پہلے اس نے پوچھا تھا کہ اے ابراہیم تمہارا رب کون ہے۔ تو آپ نے جواب دیا۔ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ۔ یا تو یُحْیٖ سے زندہ کرنا مراد ہے یا زندہ رکھنا اور یُمِیْتُ سے مراد موت دینا ہے۔ چونکہ رب تعالیٰ نظر نہیں آتا۔ اس لئے اس کے صفات اور افعال سے اس کا نشان دیا یعنی میرا رب وہ ہے جو رحم میں بے جان نطفہ کو زندگی بخشتا ہے۔ حالانکہ رحم میں نہ ہوا پہنچے نہ غذا ایسی بند جگہ میں زندگی بخشنا قدرت ہی ہے۔ انڈے میں نہ کھڑکی نہ روشن دان وہاں چوزے کو زندگی بخشتا ہے۔ یوں ہی مخلوق کو زندہ رکھنا بھی اس کی قدرت کاملہ ہے۔ ورنہ داخلی و خارجی دشمن اتنے زیادہ ہیں۔ کہ ان میں گھرا ہوا شخص زندہ نہ رہنا چاہیے۔ لہٰذا یُحْیٖ کے دو معنی ہیں زندہ کرنا اور زندہ رکھنا۔ اور جاندار کو بے جان کرتا ہے۔ یا رب میرا وہ ہے جو عالم کو زندہ رکھتا ہے اور موت دیتا ہے۔ یعنی اے نمرود خود تو اور تیری زندگی میرے رب کی دلیل ہے۔ یا رب تعالیٰ جسم کو جان سے زندہ کرتا ہے۔ جان کو ایمان سے دل کو عرفان سے دماغ کو بادۂ عشق کے جام سے زمین کو سبزہ سے کنوؤں کو تالابوں دریاؤں کی آب رواں سے قوموں کو اتفاق و اتحاد سے ملک کو عادل سلطان سے زندگی بخشتا ہے۔ اور ان اوصاف کی ضدوں کے ذریعہ انہیں فوت کر دیتا ہے زندگیاں بہت قسم کی ہیں اور ان کے مقابل موت بھی بہت قسم کی آپ کا یہ کلام بہت جامع ہے آپ کا مقصد یہ تھا کہ تو ان میں غور کر اس نے یہ نفیس دلیل سن کر قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ۔ کہا کہ یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ چنانچہ فوراً دشمنوں کو بلا کر ایک کو قتل کیا۔ اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔ اور بولا کہ دیکھا مقتول کو میں نے موت دی۔ اور دوسرے کو میں نے زندہ رکھا۔ لہٰذا میں ہی رب ہوا۔ آپ نے اس کی یہ بے عقلی اور ہٹ دھرمی ملاحظہ فرما کر اپنی دلیل کو دوسرے طریقہ سے بیان فرمایا۔ کہ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ۔ یعنی تجھے معلوم ہے کہ سورج حرکت ارادی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی حرکت قسری ہے۔ کہ کوئی چلانے والا اسے چلا رہا ہے جو چلا رہا ہے وہ ہی رب ہے۔ تو رب وہ ہے جو اسے پورب پچھم لے جا رہا ہے۔ اگر تو خدا ہے تو تجھ میں اس کے چلانے کی طاقت ہونی چاہیے۔ اگر تو یہ کہے کہ سورج کو یہ حرکت میں ہی دے رہا ہوں۔ تو فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ مہربانی کر کے اسے ایک دفعہ ہی پچھم کی طرف سے نکال دے۔ اور اگر تو یہ کہے کہ سورج اپنے ارادے و اختیار سے یہ حرکت کر رہا ہے کوئی چلانے والا اسے نہیں چلا رہا ہے تب چونکہ تو خدا ہے اور سورج خدا نہیں۔ بلکہ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ تیرا بندہ ہے خدا کی طاقت بندہ سے زیادہ چاہیے اور خدا بندے پر غالب بندہ رب سے مغلوب چاہیے۔ لہٰذا تو ایک بار ہی

سورج کو مغلوب کر کے اس کے ارادے کے بغیر الٹی حرکت دیدے بہر حال آپ کی یہ دلیل نہایت مکمل تھی کسی پہلو کو اس میں چھوڑ انہیں گیا تھا۔ خیال رہے کہ یہ ترک دلیل نہیں ہے۔ ترک دلیل تو مغلوب کیا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی دلیل کو دوسری واضح...... عبارت سے بیان فرمایا ہے آپ یہ فرماتے تھے کہ رب وہ جس کا عالم میں عمل در آمد ہو۔ اس کا تصرف موت زندگی سے بیان فرمایا۔ جب نمرود نے اس میں کج بحثی کی تو اس تصرف کو اور واضح طریق سے بیان فرمایا۔ جس سے وہ آسانی سے شکست کھا گیا۔ اور انجام یہ ہوا کہ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ۔ بُهِتَ بهتٌ سے بنا بمعنی حیرانی تہمت کو بہتان اسی لئے کہتے ہیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ کبھی دلیل نہ سوچنے کو بھی بُهتٌ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ بُهِتَ یعنی وهبت فعل مجہول سے اس جانب اشارہ ہے کہ وہ کافر رب کی طرف سے حیران کر دیا گیا۔ ورنہ کج بحثی اس میں بھی کر سکتا تھا۔ کہتا کہ آپ ہی رب سے عرض کر کے یہ کام کرادو۔ كَفَرَ میں اس جانب اشارہ ہے کہ اس کی یہ حیرانی و پریشانی کفر کی وجہ سے تھی۔ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ یَهْدِیْ ہدایۃ سے بنا اس کے معنی ہم اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ میں بیان کر چکے۔ قوم ظالمین سے کفار مراد ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا متعلق یا تو الی الدلائل ہے۔ یا الی طریق الجنۃ اور یهدی بمعنی حال ہے۔ یا بمعنی مستقبل یعنی رب تعالیٰ کافروں کو آخرت میں جنت کے راستہ کی ہدایت نہ دے گا۔ یا دنیا میں انہیں دلائل حق نہیں سوجھتا یا ظالم رہنے کی حالت میں اسے ہدایت نہیں دیتا۔ اور جب ہدایت دیتا ہے تو ظالم نہیں رہتا۔ چنانچہ دیکھ لو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایسی پاکیزہ و نفیس دلیل سے وہ ہدایت نہ پا سکا جیسے اندھی آنکھ سورج سے روشنی نہیں پاتی ایسے ہی ظالم دل نبی سے کوئی ہدایت حاصل نہیں کرتا۔ بصارت سے سورج مفید ہوتا ہے اور بصیرت سے نبوت فائدہ مند ہوتی ہے۔

خلاصہ تفسیر

نمرود تمام دنیا کا بادشاہ تھا۔ اسکا پائے تخت شہر بابل میں تھا جب ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا تو اس نے آپ کو قید کر دیا۔ پھر قید سے نکال کر آگ میں ڈالا۔ رب تعالیٰ نے آپ پر آگ کو گلزار بنا دیا۔ کچھ دنوں بعد سخت قحط سالی پڑی نمرود نے غلہ تقسیم کرنا شروع کیا جو کوئی اس کے پاس غلہ لینے آتا۔ وہ پوچھتا کہ تیرا رب کون ہے۔ وہ کہہ دیتا کہ تو ہے۔ اسے غلہ دے دیتا اسی سلسلہ میں ابراہیم علیہ السلام بھی غلہ کے لئے اس کے پاس گئے۔ اس نے آپ سے بھی یہ ہی پوچھا کہ آپ کا رب کون ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وہ ہے جو زندگی اور موت بخشتا اور عالم میں تصرف کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ قدرت تو مجھ میں بھی ہے دو قیدی بلا کر ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرے کو چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ جسے چھوڑا ہے اسے میں نے زندگی دی اور جسے قتل کیا اسے مار دیا۔ لہٰذا آپ کے اس قائدہ سے میں ہی خدا ہوا۔ کہ میرے قبضہ میں موت و زندگی ہے۔ یا تو وہ بہت غبی تھا۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کا مقصد نہ سمجھ سکا۔ یا اپنی جھینپ اتارنے کے لئے اس نے یہ کج بحثی کی۔ خیال رہے کہ عقلی علوم سمجھنے کے لئے عقل کامل درکار ہے کیونکہ وہ علوم عقل نے ایجاد کئے ہیں۔ عقل سے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر نقلی علوم عرشی ہیں۔ یہ محض عقل سے نہیں سمجھے جاتے بلکہ ان کے لئے اللہ کا فضل اور عرفان کا نور ضروری ہے۔ کلام نبی کی فہم نور عرفان سے ہوتی ہے آج بھی بے نورے بے بہرے لوگ قرآن و حدیث میں وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ رب کی پناہ رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (الواقعہ:۷۹) قرآن کو پاکوں کے سوا کوئی مس بھی نہ کرے گا۔ بہر حال ابراہیم علیہ السلام نے اسی

دلیل کو اور واضح مثال میں یوں بیان فرمایا۔ کہ رب وہ قدرت والا ہے جو ہمیشہ سورج کو پورب سے نکالتا اور پچھم میں غروب کرتا ہے۔ اگر تو قابل عبادت ہے تو اس کی رفتار بدل دے کہ ایک دفعہ ہی پچھم سے نکال دے۔ اس مثال پر وہ حیران رہ گیا۔ اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ کھسیا کر بولا کہ آپ کے لئے میرے پاس غلہ نہیں۔ اس رب سے مانگو جس کی عبادت کرتے ہو۔ آپ خالی واپس ہوئے راستہ میں ریت کے ٹیلے پر گزرے وہاں سے ایک بورے میں ریت بھر کر مکان پر پہنچے۔ تھیلا تو رکھ دیا اور خود سو گئے۔ آپ کی بیوی حضرت سارہ نے جو اسے کھولا تو اس میں نہایت نفیس گیہوں پائے۔ فوراً اس کی روٹیاں تیار کیں۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا۔ آپ نے پوچھا کہ گیہوں کہاں سے آئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس تھیلہ میں سے۔ ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ رب نے مجھے رزق دیا۔ پھر رب تعالیٰ نے ظالم نمرود کے پاس شکل انسانی میں ایک فرشتہ بھیجا جس نے آ کر کہا کہ تیرا رب کہتا ہے تو مجھ پر ایمان لا ہم تیری سلطنت برقرار رکھیں گے۔ وہ بولا رب تو میں ہی ہوں۔ میرا رب کون۔ تین دفعہ یہ واقعہ ہوا۔ تب اس کے لشکریوں پر مچھروں کا عذاب بھیجا گیا۔ مچھروں کی زیادتی کا یہ حال تھا کہ ان سے سورج چھپ گیا تھا۔ زمین پر دھوپ نہ آتی تھی۔ مچھروں نے ان کے خون چوس لئے گوشت چاٹ لئے۔ سوا نمرود کے باقی سب کی ہڈیاں ہی باقی رہ گئیں۔ نمرود دیکھتا تھا مگر کچھ نہ کر سکتا تھا۔ پھر ایک مچھر اس کی ناک کے ذریعہ دماغ میں گھس گیا اور چار سو برس تک مغز میں کاٹتا رہا۔ جب اوپر سے دھمک پہنچتی تو کاٹنا چھوڑ دیتا۔ ورنہ کاٹتا چنانچہ دن رات اسکے سر پر جوتے اور تھپڑ پڑتے رہتے تھے۔ اب اسکے دربار کا ادب یہ تھا کہ جو آئے اس کے سر پر جوتا رسید کرے۔ اس سے پہلے چار سو سال بہت آرام سے سلطنت کی اور چار سو برس پٹتا رہا۔ پھر بہزار ذلت مرا اس کی عمر آٹھ سو سال سے کچھ زیادہ ہوئی۔ (تفسیر خازن)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار سے مناظرہ کرنا سنت انبیاء ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کیا۔ **دوسرا فائدہ:** مناظرہ میں مقابل اگر آسانی سے شکست کھا سکے تو دشوار طریقہ اختیار نہ کرنا چاہیے۔ ابراہیم علیہ السلام زندگی اور موت کے مسئلہ پر نمرود سے بہت زیادہ جرح قدح کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے اس کی حماقت محسوس فرما کر دوسری واضح تر مثال پیش فرما دی۔ جس سے وہ بآسانی خاموش ہو گیا۔ **تیسرا فائدہ:** انبیاء کے مقابلہ کا انجام برا ہے۔ دیکھو نمرود جیسا بادشاہ مخالفت خلیل سے ذلیل ہو کر مرا۔ **چوتھا فائدہ:** رب تعالیٰ دنیا میں کفار کو بھی تخت کا مالک بنا دیتا ہے۔ یہ اس کی رضا کی علامت نہیں دیکھو نمرود جیسے کافر کو جہان کا بادشاہ بنا دیا۔ **پانچواں فائدہ:** مومن کے لئے مال ذریعہ ہدایت ہے۔ اور کافر کے لئے ذریعہ گمراہی دیکھو نمرود وغیرہ اپنے ملک مال کے دھوکے میں دعویٰ خدائی کر بیٹھے۔ مال سانپ ہے دین اس کے شر سے محفوظ رہنے کا منتر' دنیا زہر ہے دین تریاق۔ دنیا دریا ہے دین اس کی کشتی کہ بغیر دین کے دنیا ہلاکت و بربادی کا سبب ہے۔ مگر دین کی برکت سے اس بیڑے کو دنیا کی شر سے بچالیتا ہے۔ بعض نیک بختوں کی دنیا دین بن جاتی ہے۔ جیسے حضرت عثمان کی دنیا۔ خیال رہے کہ کسان دانہ کے لئے تخم بوتا ہے۔ مگر بھوسا بھی اسے مل جاتا ہے۔ بلکہ بھوسا پہلے پیدا ہوتا ہے۔ اور بہت پیدا ہوتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ آخرت کے

لئے کوشش کرے اعمال کا تخم بوئے دنیا اسے خود ملے گی۔ اعمال تخم ہے آخرت دانہ دنیا بھوسا۔ **چھٹا فائدہ:** بندے کا اصلاح قلب کی طرف مائل ہونا فضل الٰہی کی علامت ہے۔ اور سرکشی غضب کی نشانی کوئی سرکش ہدایت نہیں پا سکتا۔ اور جب ہدایت کا وقت آتا ہے تو اس سے سرکشی نکل جاتی ہے۔ جیسا کہ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** سارا عالم اور خود ہماری ذات رب تعالیٰ کا پتہ ہے۔ مگر یہ تمام چیزیں ناقص ہیں۔ جن سے رب تعالیٰ کی معرفت پوری حاصل نہیں ہوتی۔ حضرات انبیاء رب کا کامل پتہ ہیں۔ جن کے ذریعہ رب کو پہچاننا معرفت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں نے سجدہ میں گر کر کہا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ (اعراف: ۱۲۲) ہم اس پر ایمان لائے جو حضرت موسیٰ وہارون کا رب ہے۔ برادران یوسف علیہ السلام نے یعقوب علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔ نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِیْمَ الخ (بقرہ: ۱۳۳) ہم اس کی عبادت کریں گے۔ جو آپ کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہم کا رب ہے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ربی فرما کر رب کا پورا پتہ بتایا۔ پھر یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ فرما کر بتایا کہ خود تیری زندگی وموت رب کا پتہ ہے تو اپنے ہی میں رب کو دیکھ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات: ۲۱) مثنوی شریف میں ایک جوہری اور ایک چور کا واقعہ بیان فرمایا۔ کہ جوہری رات کو چور کی جیب میں شب چراغ موتی ڈال دیتا تھا۔ اور چور جوہری کا سامان تلاش کرتا تھا۔ موتی نہ پاتا تھا۔ آخر جوہری سے پوچھا کہ تو موتی کہاں رکھتا ہے وہ بولا تیری جیب میں اگر تو اپنے کو ڈھونڈھتا موتی پالیتا۔ یونہی معرفت الٰہی کا موتی خود ہمارے میں موجود ہے۔ تلاش کی کمی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں دلیل اول کیوں چھوڑ دی۔ مناظرہ میں دلیل چھوڑنا مغلوبیت کی علامت ہے۔ **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ یہ ترک دلیل نہیں۔ بلکہ ترک مثال ہے۔ یعنی ایک ہی دلیل دوسری واضح مثال سے سمجھائی گئی۔ مطلب یہ تھا کہ رب وہ ہے جو جہاں میں تصرف کرنے جیسے موت وحیات جب وہ اسے نہ سمجھا تو آپ نے فرمایا جیسے آفتاب کی حرکت۔ **دوسرا اعتراض:** نمرود نے جیسے موت وحیات پر جرح کی ایسے ہی اس مثال پر بھی کج بحثی کر سکتا تھا۔ کہ سورج میرے حکم سے ادھر جا رہا ہے۔ اگر رب کوئی اور ہے تو اس سے کہو کہ اسے پچھم سے طلوع کر دے وہ خاموش کیوں ہو گیا۔ **جواب:** وہ سمجھ گیا کہ اگر میں نے جرح کی تو ابھی ان کے کہنے سے آفتاب الٹے پاؤں لوٹے گا جس سے عالم میں انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا۔ اور لوگ اس معجزہ کو دیکھ کر مجھ سے پھر کر ان کے ساتھ ہو لیں گے۔ اس لئے منہ تکتا رہ گیا (بیان القرآن مصنفہ مولوی اشرف علی صاحب) **(نوٹ)** الحمد للہ کہ مولوی صاحب دیو بندی ہو کر قدرت پیغمبر کے قائل تو ہو گئے۔ روح المعانی وکبیر نے فرمایا کہ اگر وہ اس وقت یہ کہہ دیتا تو یقیناً آفتاب مغرب سے طلوع ہو جاتا۔ روح البیان نے فرمایا کہ یہ کلام ابراہیم علیہ السلام کے منہ سے نکلا تھا۔ رب قریب قیامت آفتاب مغرب سے نکالے گا۔ تاکہ ان کی بات نہ ٹلے۔ بلکہ حضرت خلیل کے فرزند جلیل رب کے مختار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ نے خیبر میں علی کی نماز عصر کے لئے پچھم سے سورج نکال دیا۔ باپ کے فرمان کو فرزند نے پورا کر دکھایا۔ **تیسرا اعتراض:** سورج نہ مشرق سے مغرب کی طرف اور نہ مغرب سے مشرق کی طرف آتا جاتا ہے وہ تو اپنے محور پر گھومتا

ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو علم ہیئت نہ آتا تھا۔(ستیارتھ پرکاش) **جواب:** اس کا جواب کیا دیا جائے۔شاید پنڈت جی عقل کے بھی اندھے تھے۔اور آنکھ کے بھی پاگل بھی دیکھتے ہیں کہ سورج پورب سے آتا ہے اور پچھم میں جاتا ہے۔شاید پنڈت جی کو یہ دھوکا لگا ہے۔کہ حرکت ستدیرہ میں آنا جانا اور ابتدا انتہا مقرر نہیں۔جیسے محیط دائرہ کی حرکت مگر پنڈت جی کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب پورا دائرہ دیکھنے والے کے سامنے نہ ہو اسکی صرف ایک قوس نظر آتی ہو تو اس پر حرکت کرنے والا آتا جاتا معلوم ہوتا ہے اس حرکت کی ابتداء انتہاء بھی محسوس ہوتی ہے۔چونکہ تقریباً آدھا آسمان ہمیں نظر آتا ہے۔اس محسوس حصہ کا ایک کنارہ مشرق ہے ایک مغرب اس لئے ہمیں آفتاب کی حرکت کی ابتداء انتہاء معلوم ہوتی ہے۔اور اس سے دن رات پیدا ہوتے ہیں۔ہاں اگر آفتاب کا پورا مدار ہمارے سامنے ہو۔جیسا کہ قطب شمالی کے نیچے ہے۔تو وہاں مشرق و مغرب مقرر نہ ہو سکے گا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کا منشا یہ تھا کہ سورج کی محسوس حرکت خلاف توالی ہے۔تو علی التوالی گھما کر دکھادے پنڈت جی قرآن شریف سمجھنے کے لئے عقل و دماغ کی ضرورت ہے۔**چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا گنہگاروں کو راستہ نہیں دکھاتا۔تو پارساؤں کو مسلمانوں کے خدا کی ضرورت نہیں۔کہ وہ تو دھرم کے راستہ پر ہوتے ہی ہیں۔راستہ گنہگاروں کو ہی دکھانا چاہیے (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی نے آیت کے معنی غلط کئے۔معنی یہ ہیں کہ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔اور اس اعتراض کے چند جواب ہیں۔بہترین جواب وہ ہے جو امام راغب نے دیا۔کہ ہدایت اور تعلیم دو چیزوں کو چاہتی ہے دینا اور لینا۔کہ بغیر لینے دینے کی تکمیل نہیں ہوتی۔روپیہ دینا جب مکمل ہوگا جب کوئی لے بھی لے۔جب ہادی اور معلم نے تعلیم دی۔مگر دوسرے نے قبول نہ کی تو اس لحاظ سے کہا جائے گا۔کہ اس نے ہدایت دی نہیں۔کہ بغیر لئے دینا کیسا۔ایسے ہی رب سب کو ہدایت دیتا ہے۔مگر جو نہیں لیتے ان کے حق میں دینا ثابت نہیں ہوتا۔اس لحاظ سے یہاں فرمایا گیا۔لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا هُدًى لِّلنَّاسِ۔ سب انسانوں کا ہادی ہے۔یا یہاں ہدایت سے راہ جنت دکھانا مراد ہے۔یعنی جو لوگ بحالت کفر مریں گے۔رب تعالیٰ انہیں آخرت میں جنت کا راستہ نہ دکھائے گا۔یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالم ظالم رہ کر ہدایت نہیں پاتا کہ اجتماع ضدین ناممکن ہیں جو ہدایت لیتا ہے وہ پہلے سے ظلم چھوڑ کر ظالمین کے زمرہ میں سے نکل جاتا ہے۔سورج کا کام ہے اندھیری جگہ سے اندھیرا دور کرنا اور وہاں روشنی دینا مگر جس جگہ اندھیرا لازم ہو گیا ہو کہ وہاں سے مٹ نہ سکے تو سورج روشنی بھی نہیں دیتا۔جیسے تہ خانے اور گہرے غار قبر و سمندر کی تہ یوں ہی جن سینوں میں کفر جم گیا کہ ان سے نکل سکتا ہی نہیں۔وہاں رب تعالیٰ ایمانی نور نہیں پہنچاتا مگر اس میں ان سینوں کا قصور ہے۔رب کی عطا میں کمی نہیں۔جیسے سورج میں کمی نہیں چمگادڑ کی آنکھ کا یا ان خاص تاریک جگہ کا اپنا قصور ہے۔یہ کہا جا سکتا ہے کہ سورج چمگادڑ کی آنکھ میں روشنی نہیں دیتا۔

تفسیر صوفیانہ

رب نے نمرود کو وہ ملک دیا جو اس سے پہلے کسی کو نہ دیا تھا۔مگر اس نے وہ دعویٰ کیا جو اس سے پہلے کسی نے نہ کیا تھا۔یعنی دعویٰ خدائی اس کی وجہ یہ ہے کہ طلب کمال فطرت انسانی کا تقاضا ہے ہر ایک کمال کی طرف دوڑتا ہے پھر طالبین کمال دو قسم کے ہیں۔ایک وہ جن کی رب تائید فرماتا ہے۔اور قدرت دستگیری کرتی ہے۔دوسرے وہ جو اپنے نفس کے قبضہ میں ہیں۔تائید

ربانی ان کے شامل حال نہیں۔ یہ آخری جماعت ہر چیز کو ظاہری حواس سے دیکھتی ہے۔ اور اسے بجز دنیا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ چونکہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہے۔ اور مٹی ہمیشہ نیچے گرتی ہے۔ ایسے ہی نفسانی خواہشات انسان کو نیچے گراتے ہیں۔ وہ نفسانی قدم سے دنیاوی کمالات کی طرف بھاگتا ہے۔ اس طرح کہ اولاً جمع مال کو کمال سمجھ کر مالدار بنتا ہے پھر عزت و آبرو کو کمال جان کر حاصل کرتا ہے۔ پھر عہدے کو کمال جان کر ادھر دوڑتا ہے پھر سلطنت کو اعلیٰ درجہ کا کمال سمجھ کر اسے طلب کرتا ہے اور اگر موقع ملے تو نمرود کی طرح ساری دنیا کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ پھر بھی اس کی ہوس کی آگ نہیں بجھتی۔ اتنے کمالات حاصل کر کے اب عالم بالا کی طرف نظر اٹھاتا ہے۔ یعنی جس قدر اس کی غنا بڑھتی ہے اسی قدر ہوس کی آگ زیادہ بھڑکتی ہے۔ یہاں تک کہ سلاطین کو شکست دے کر رب العالمین سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (نازعات: ۲۴) کا دم بھرتا ہے۔ جیسا کہ نمرود کا حال ہوا کہ جتنا اس کا کمال بڑھا طغیان میں زیادتی ہوئی۔ مگر وہ طالبین جو قبضہ قدرت میں ہیں۔ اور تائید ربانی ان کی شامل حال ہے اور ان کے ہاتھوں میں کسی پیغمبر اور نائب پیغمبر عالم دین یا شیخ طریقت کا دامن ہے وہ ماسوی اللہ سے بچنے کو کمال جانتے ہیں۔ اولاً ہر چیز کو رب کی دلیل سمجھ کر اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر اپنے ذرات وجود کو واجب الوجود میں فنا اور قطرۂ ہستی کو بحر احدیت میں گم کر دیتے ہیں۔ وہ بجائے اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ کے یہ کہتے ہیں مَا فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہُ ان کا شیخ نمرود نفس کے دماغ کو الا اللہ کے ہتھوڑوں سے یہاں تک کوٹتا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لا کر طاغوت وجود ماسویٰ اللہ کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ مگر رب تعالیٰ مشرکین کو اس میدان میں نہیں آنے دیتا۔ شرک ظلم عظیم ہے۔ عاقل کو چاہیے کہ دوئی کے شرک سے بچے اور زیادتی مال و متاع سے دھوکہ نہ کھائے (روح البیان) خلاصہ یہ ہے کہ انسان مٹی سے بنا اور مٹی کی تین خصوصیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طبعاً نیچے گرتی ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر کوئی پھینکنے والا اسے اوپر پھینکے تو اس کی طاقت سے اوپر جاتی ہے۔ تیسرا یہ کہ اگر اسے اوپر روکنے والی کوئی چیز نہ ہو تو نیچے لوٹ آتی ہے یہ ہی انسان کی حالت ہے کہ جب وہ اپنی رائے سے ترقی کرتا ہے تو نیچے ہی گرتا ہے اور گرنے کو کمال جانتا ہے۔ ہاں روحانیت والے شیخ کی امداد سے ترقی کرتے ہیں۔ لیکن اگر فیض ربانی شامل حال نہ ہو تو پھر گر جاتا ہے ورنہ کمال کو پہنچتا ہے۔ ایک پتھر پایا گیا جس پر تین سطریں لکھی تھیں۔ ۱۔ دنیا سے خوش ہونا اللہ سے دور ہونے کی نشانی ہے۔ ۲۔ اپنی چیز پر بھروسہ کرنا رب پر بھروسہ کم ہونے کی علامت۔ ۳۔ مصیبت میں لوگوں کی طرف رجوع کرنا رب کو نہ پہچاننے کی علامت ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا۔ شعر۔

شنیدم کہ جمشید فرخ سرشت — بسر چشمۂ بر بسنگے نوشت
بریں چشمہ چوں ما بسے دم زدند — برفتند چوں چشم برہم زدند
گرفتیم عالم بمردی و زور — و لیکن نہ بردیم با خود بگور
برفتند و ہر کس درود آنچہ کشت — نماند بجز نام نیکو و زشت

رب تعالیٰ ہمیں عمر لمبی اعمال نیک دینوی امیدیں تھوڑی اور عقل کامل اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفسانی انسان چند چیزوں کو کمال سمجھ کر ان کے لئے دوڑتا ہے۔ مال، عزت، شہرت، حکومت، سلطنت، پھر الوہیت اور رحمانی انسان

دوسری چند چیزوں کو کمال سمجھ کر انہیں حاصل کرتا ہے۔ اعمال رضا ذوالجلال۔ پھر فنافی اللہ ہو کر بقاء لا یزل یقیناً یہ کمالات واقعی کمال ہیں۔ اور وہ کمالات بظاہر کمال ہیں۔ اور درحقیقت باعث زوال دیکھو نمرود نے اپنی دانست میں مذکورہ بالا سارے کمالات حاصل کر لئے تھے۔ مگر کس خواری سے مرا اور آج تک کس طرح بدنام ہے۔ کہ کوئی بغیر لعنت ملامت کئے اس کا نام بھی نہیں لیتا۔ مبارک ہے وہ شخص جو حقیقی کمال حاصل کر کے بقاء لازوال پالے۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ
یا مثل اس کے جو گزرا اوپر بستی کے حالانکہ وہ گری ہوئی تھی اوپر چھتوں کے اپنے کہا کہ کیسے زندہ کرے گا
یا اس کی طرح جو گزرا ایک بستی پر اور وہ ڈھی پڑی تھی اپنی چھتوں پر بولا اسے کیونکر جلائے گا
هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ
اس کو اللہ پیچھے مرنے اس کے پس موت دی اسے اللہ نے سو برس پھر اٹھایا اسے کہا کتنا ٹھہرا
اللہ اس کی موت کے بعد تو اللہ نے اسے مردہ رکھا سو برس پھر زندہ کر دیا فرمایا تو یہاں کتنا ٹھہرا
قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ
تو کہا ٹھہرا میں ایک دن یا کچھ حصہ دن کا
عرض کی دن بھر ٹھہرا ہوں گا یا کچھ کم

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں فرمایا گیا تھا۔ کہ اللہ مسلمانوں کا والی ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے تین واقع ارشاد ہوئے۔ ایک کا ذکر پہلے ہو گیا اور دوسرے کا ذکر اب فرمایا جا رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کا پتہ زندگی اور موت سے دیا کہ جس کے قبضہ میں یہ دونوں ہیں وہ رب ہے۔ اب اس واقعہ میں اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے کہ رب زندہ کرنے پر اس طرح قادر ہے کہ اپنے ایک بندہ کو سو سال مردہ رکھ کر جلا دیا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ چونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ لہٰذا اب فرمایا جا رہا ہے کہ پرہیزگاروں کو ہدایت کاملہ اور یقین کے بعد عین الیقین وحق الیقین عطا فرماتا ہے۔ خیال رکھنا چاہیے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش انبیاء کرام دنیا میں تشریف لائے مگر قرآن وحدیث میں بہت تھوڑے نبیوں کے نام یا حالات مذکور ہیں۔ قرآن مجید نے خصوصیت سے ان انبیاء کرام کے حالات بہت بیان فرمائے ہیں۔ جن کے متعلق اہل کتاب نے افراط یا تفریط کر دی تھی۔ زیادتی محبت یا عداوت کی وجہ سے ان کے متعلق عجیب قصے گھڑ لئے تھے جن سے ان بزرگوں کے اصلی حالات چھپ گئے تھے جیسے آج جاہل مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ یا غوث پاک کے متعلق عجیب روایت گھڑی ہیں۔ کہ معراج میں حضور انور کو غوث پاک نے کندھا

دے کر عرش پر چڑھایا۔ یا یہ کہ غوث پاک نے ملک الموت کی زنبیل چھین لی اور تمام قبض کردہ روحیں اس سے چھڑا دیں۔ یا حضور علیہ السلام نے معراج کی شب قاب قوسین میں پہنچ کر جب پردہ اٹھا کر دیکھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پردہ کے اندر سے بول رہے تھے یعنی وہ ہی خدا تھے نعوذ باللہ! ان انبیاء کرام میں سے حضرت عزیر علیہ السلام بھی ہیں جنہیں یہود خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اور ان کے متعلق نہایت لغو بیہودہ روایات گھڑ لی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کے کچھ صحیح حالات بیان فرمائے۔

تفسیر

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ۔ اَوْ عاطفہ ہے۔ اور کاف یا اسمیہ ہے بمعنی مثل یا حرف تشبیہ کے لئے یا زائدہ یہ الذی پچھلی آیت کے اَلَّذِی حَآجَّ پر معطوف ہے۔ اور اَلَمْ تَرَ کا مفعول چونکہ دعویٰ ربوبیت کرنے والے بہت تھوڑے گزرے اور قیامت کے منکر بہت ہیں اس لئے اس آیت میں اَلَّذِیْ پر کاف نہ آیا۔ اور یہاں لایا گیا خیال رہے کہ اگر یہ کاف زائدہ ہو تب تو عطف میں کوئی دشواری نہیں۔ اور اگر زائدہ نہیں ہے تو عطف کی چند صورتیں ہیں۔ یا یہاں اَلَمْ تَرَ۔ پوشیدہ مان کر جملہ کو جملہ پر عطف کیا جائے یا وہاں بھی کاف پوشیدہ مانا جائے اس گزرنے والے میں اختلاف ہے کہ وہ کون تھے۔ بعض نے فرمایا کہ ارمیاء ابن حلقیا علیہ السلام تھے۔ جن کا لقب حضرت خضر ہے۔ آپ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ یہ ہی حضرت ابن عباس کا فرمان ہے (کبیر و خازن) مگر حضرت قتادہ اور عکرمہ ضحاک وغیرہم نے فرمایا کہ وہ حضرت عزیر ابن شرخیہ علیہ السلام تھے۔ یہ ہی قول زیادہ ترصحیح ہے۔ مَرَّ مرور سے بنا بمعنی گزرنا معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں یہ بستی پڑی عَلٰی قَرْيَةٍ قریۃ قریٰ سے بنا بمعنی جمع ہونا اسی لئے مہمان کے کھانے کو قری حیض کو قروء کہا جاتا ہے چونکہ بستی میں بھی ہر قسم کے انسان جمع ہوتے ہیں اسلئے اسے قریہ کہتے ہیں۔ اس کا استعمال گاؤں اور شہر دونوں کے لئے ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے بڑے شہروں کو کئی جگہ قریہ فرمایا ہے۔ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف:۳۱) مکہ معظمہ اور طائف شریف کو قریہ فرمایا۔ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ (بقرہ :۵۸) یہاں بھی شہر ہی کے لئے استعمال ہوا۔ لہٰذا وہ جو حدیث شریف میں ہے کہ پہلا جمعہ قریہ جواثی میں ہوا وہاں بھی قریہ سے مراد شہر ہے نہ کہ گاؤں۔ اور اس حدیث کی بنا پر گاؤں میں جمعہ جائز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی مکمل بحث ہمارے فتاویٰ نعیمیہ میں ملاحظہ فرماؤ۔ حق یہ ہے کہ قریہ مطلقاً بستی کو کہتے ہیں۔ بلکہ صرف شہر کو اور بدو گاؤں کو اس لئے گاؤں والوں کو بدو ہی کہا جاتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ کہ یہ کونسی بستی تھی۔ بعض نے فرمایا کہ یہ مقام داوردان تھا جو طاعون سے ویران ہوا تھا۔ بعض نے فرمایا کہ وہ سابر آباد تھا۔ جو فارس کا مشہور شہر ہے بعض نے فرمایا سلمہ آباد تھا۔ جو جرجان یا ہمدان کے متصل ہے بعض نے کہا کہ وہ دیر ہرقل تھا جو بصرہ اور عسکر مکرم کے درمیان ہے۔ بعض نے کہا وہ قریہ غصب ہے جو بیت المقدس سے دو کوس دور ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ وہ بستی خود بیت المقدس تھی جسے بخت نصر بادشاہ نے ویران کر دیا تھا (خازن) یعنی اے نبی کیا آپ نے ان کی مثل کو نہ دیکھا جو ایک بستی پر گزرے۔ وَهِیَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا خاویۃ خویٰ سے بنا بمعنی خالی ہونا کہا جاتا ہے۔ المرۃ یعنی عورت جننے سے فارغ ہو کر خالی ہو گئی جس گھر کی چھت گر جائے اسے بیت خاویہ کہتے ہیں کہ وہ بھی چھت سے خالی ہو گیا۔ عروش جمع عرش کی ہے بمعنی چھت چھپر ہر چھتی ہوئی چیز کو عرش کہا جاتا ہے۔ جس سے سایہ لیا جائے تخت کو بھی عرش اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اکثر چھتا ہوتا ہے علیٰ یا بمعنی عن ہے یا اپنے ہی معنی میں اگر بمعنی عن ہو تو مطلب یہ ہے کہ وہ بستی چھتوں سے خالی تھی۔ فقط دیواریں کھڑی رہ

گئی تھیں۔ اگر اپنے معنی میں ہے تو یہ مطلب کہ اولاً چھتیں گریں۔ اور ان پر دیواریں یعنی وہ بستی اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ اَنّٰی بمعنی کیف ہے۔ یہ سوال شک کی بناء پر نہیں۔ بلکہ حیرت سے ہے کیونکہ انبیاء کرام شک سے محفوظ ہیں۔ اگر هذا سے خود یہ بستی مراد ہے تو حیات سے اس کی آبادی مراد اور موت سے اس کی ویرانی اور اگر هذا سے وہاں کی آبادی مراد ہے تو حیات سے زندگی اور موت سے مرنا مقصود۔ یعنی حیرت ہے کہ رب تعالیٰ اس بستی کو ویرانی کے بعد آباد کیسے کرے گا۔ یا یہاں کے مرے ہوئے لوگوں کو کیسے جلائے گا۔ رب نے چاہا کہ انہیں مار کر جلانا دکھا دے۔ لہٰذا فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ۔ اَمَاتَ اماتۃ سے بنا بمعنی موت دینا اور مردہ رکھنا۔ یہاں دوسرے معنی میں ہے کیونکہ آگے اس کا ظرف سو سال آ رہا ہے۔ یہاں موت سے نیند مراد لینا یا غشی وغیرہ کوئی اور حالت سمجھنا سخت غلطی ہے۔ بلاوجہ حقیقی معنی نہیں چھوڑے جا سکتے۔ عام عوم سے بنا بمعنی تیرنا اور گھومنا سال کو عام اس لئے کہتے ہیں کہ اسمیں بھی سورج سارے برجوں میں تیر کر گھوم جاتا ہے یعنی رب نے ان کو سو برس تک مردہ رکھا ثُمَّ بَعَثَهٗ بعث بمعنی اٹھانا خیال رہے کہ یہاں ثُمَّ اَحْيَاهُ نہ کہا۔ کہ پھر انہیں زندہ کر دیا کیونکہ اس میں یہ پتہ نہ لگتا۔ کہ وہ کس حال میں زندہ ہوئے بعثہ فرما کر بتایا کہ جس حال میں انہوں نے وفات پائی تھی۔ عاقل بالغ عالم تروتازہ ویسے ہی زندہ ہو گئے۔ گویا سو کر اٹھے ہیں۔ قیامت کے دن کو اسی لئے یوم البعث کہتے ہیں۔ کہ وہاں سب عاقل بالغ جوان اٹھیں گے۔ دنیا کی طرح ناسمجھ بچے اور پھر ہشیار ہوں۔ ایسا نہ ہوگا۔ جو لوگ لفظ بعث کی بناء پر کہتے ہیں کہ آپ مرے نہ تھے بلکہ سوئے تھے یا آپ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ اب جاگ گئے۔ یا ہوش میں آ گئے اس لئے رب نے بعث فرمایا نہ کہ احیاء۔ انہیں چاہیے کہ تمام مردوں کو مردہ نہ مانیں بلکہ سویا ہوا یا غشی والا مانیں کہ قیامت کے متعلق بھی بعث یا مبعث ارشاد ہوا۔ خیال رہے کہ بعث کے معنی بھیجنا بھی ہے جیسے اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا (آل عمران: ۱۶۴) زندہ ہونا بھی جیسے مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: ۵۲) لفظ مشترک سے دھوکا نہ کھانا چاہیے یہاں دوسرے معنی میں ہے یعنی زندہ کرنا بعد موت اٹھانا۔ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ۔ ظاہر یہ ہے کہ بلاواسطہ رب نے ہی پوچھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ کسی فرشتہ نے سوال کیا ہو۔ چونکہ آپ نبی تھے۔ اس لئے یہ سوال بطور وحی ہوا کہ اے عزیر علیہ السلام آپ یہاں کتنا ٹھہرے۔ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ آپ کا یہ جواب بطور اندازہ ہے۔ دن کے شروع حصہ میں آپ کو وفات ہوئی۔ اور آخر دن اٹھے تو سمجھے کہ وہ ہی دن ہے۔ اس لئے عرض کیا کہ میں دن بھر ٹھہرا یا دن سے بھی کم۔ آپ نے یہ جواب دیتے وقت نہ تو گدھے کو دیکھا نہ سامنے والے شہر بیت المقدس پر نظر ڈالی کہ اگر ہم آج ہی سوئے تھے تو گدھا سڑ گل کیسے گیا۔ اور صرف چند گھنٹے میں عالم میں انقلاب کیسے آ گیا اور اجڑا شہر آباد کیسے ہو گیا۔ سو برس میں عالم میں بڑا تغیر و تبدل ہو جاتا ہے بلکہ صرف آسمان کو دیکھا اور سورج پر نظر کی اور فرمایا کہ ہم نے یہاں ایک دن یا اس سے بھی کم قیام فرمایا ہے۔ چونکہ ابھی آیت ختم نہیں ہوئی اس لئے خلاصہ تفسیر اور اس کا پورا واقعہ اور فوائد اور سوال جواب آئندہ جملہ کی تفسیر میں بیان ہوں گے۔

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ

کہا بلکہ ٹھہرے تم سو برس پس دیکھو تم طرف کھانے اپنے اور پانی اپنے کے نہ بسا اور دیکھو طرف گدھے

فرمایا نہیں بلکہ تجھے سو برس گزر گئے اور اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ کہ اب تک بو نہ لایا اور اپنے گدھے

اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اپنے کے اور تا کہ کریں ہم تم کو نشانی واسطے لوگوں کے اور دیکھو طرف ہڈیوں کے کیسے اٹھاتے ہیں ہم انکو پھر پہناتے ہیں

کو دیکھ (جس کی ہڈیا تک سلامت نہ رہیں) اور یہ اس لئے کہ تجھے ہم لوگوں کے واسطے نشانی کریں اور ان ہڈیوں کو دیکھ کیونکر ہم انہیں

نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

ہم ان کو گوشت پس جبکہ ظاہر ہوا واسطے اس کے تو کہا کہ جانتا ہوں میں کہ تحقیق اللہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے

اٹھان دیتے پھر انہیں گوشت پہناتے ہیں جب یہ معاملہ اس پر ظاہر ہو گیا بولا میں خوب جانتا ہوں کہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے

تعلق

پچھلے جملہ میں حضرت عزیر علیہ السلام کے سو برس بعد زندہ ہونے اور وہاں مدت قیام کے اندازہ لگانے کا ذکر تھا۔ اب انہیں غلطی اندازہ پر متوجہ کرنے کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے اندازہ میں غلطی کی اور ہم نے صحیح مدت بتائی۔

تفسیر

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ قَالَ کا فاعل یا رب تعالیٰ ہے یا فرشتہ بَلْ اضراب کے لئے ہے جو دو کلاموں کے درمیان ہوتا ہے۔ اور اگلے کی نفی کر کے مابعد کو ثابت کرتا ہے۔ اس لئے یہاں لا پوشیدہ ہے۔ روح المعانی نے فرمایا کہ بَلْ سے پہلے۔ مَا لَبِثْتَ پوشیدہ ہے۔ اور بل عاطفہ اس کا مابعد جملہ اس پوشیدہ جملہ پر معطوف ہے۔ خیال رہے کہ لَبِثْتَ سے ان کے جسم شریف کا وہاں رہنا مراد ہے۔ نہ کہ جسم مع روح کا کہ روح تو نکال لی گئی تھی۔ یعنی رب نے فرمایا۔ کہ اے عزیر علیہ السلام آپ کا جسم شریف ایک دن نہیں۔ بلکہ سو سال یہاں رہا۔ چونکہ بعد موت روح کو جسم سے کچھ تعلق رہتا ہے۔ اس لئے جسم کے مقام کو ان کا مقام قرار دیا۔ جیسے زندگی میں بھی نیند یا غشی کی حالت میں انسان کو بے خبر بنا دیا جاتا ہے۔ کہ وہ جاگنے یا ہوش میں آنے کے بعد اپنے متعلق کچھ خبر نہیں رکھتا کہ میں کہاں رہا اور کتنا رہا ایسے ہی رب تعالیٰ نے انہیں اس زمانہ میں ایسا غیر متوجہ رکھا کہ آپکو پتہ نہ چلا کہ ہم یہاں کتنے دن رہے لہٰذا آیۃ پر یہ اعتراض نہیں کہ بعد موت انسان اپنی جگہ رہ کر جہاں اس کے روح کا مقام ہے۔ وہاں کے حالات تو جانتا ہی ہے پھر آپ کو برزخی حالات بھی کیوں یاد نہ آئے۔ رب نے اس وقت انہیں سب کچھ بھلا دیا تھا تا کہ اگلا کلام درست ہو۔ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ نظرٌ سے آنکھ سے دیکھنا مراد ہے نہ کہ فقط غور کرنا کیونکہ اس کے بعد اِلٰی آ رہا ہے۔ نیز غذا اور پانی آنکھ سے ہی دیکھے جاتے ہیں۔ طعام سے مراد انگور و انجیر ہیں۔ اور شراب سے پینے کی چیز یعنی شیرہ انگور یا دودھ جسے وہ اپنے پاس رکھ کر سو گئے تھے۔ یعنی اپنی اس غذا اور شربت وغیرہ کی طرف دیکھو کہ لَمْ يَتَسَنَّهْ یہ لفظ یا سنوٌ ناقص واوی سے بنا۔ اور ہ وقفی ہے جیسے واقتدہ مالیہ سلطانیہ ماھیہ یا سِنَۃٌ سے بنا اور ہ اصلی ہے۔ ان دونوں کے معنی برس اور سال ہیں۔ باب تفعل میں آ کر اس کے معنی ہوئے۔ کسی پر سال گزرنا۔ چونکہ چیز پرانی ہو کر گل سڑ جاتی ہے۔ اس لئے اصطلاح میں اس سے گلنا سڑنا بدبو دینا مراد ہوتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ سنن سے مشتق ہو بمعنی سڑ جانا مِنْ

حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر:۲۶) اور وہ نونِ محذوفہ کے عوض ہو (کبیر و روح المعانی وغیرہ) یعنی باوجودیکہ غذائیں بہت جلد گل سڑ جاتی ہیں مگر تمہاری غذا سو سال گزرنے پر بھی نہ بگڑی وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ یہ ان کے سو برس ٹھہرنے کی دلیل ہے۔ کہ اے عزیر اپنے گدھے کو تو دیکھو کہ اس کا گوشت اور پوست تو کیا ہڈیاں بھی گل کر ختم ہو گئیں۔ ایک دن میں گدھے کا یہ حال نہیں ہو سکتا۔ وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ واؤ یا تو زائدہ ہے اور جار مجرور لِنجعل کے متعلق یا واؤ ابتدائیہ ہے۔ اور جار مجرور فعلنا پوشیدہ کے متعلق یا واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ پوشیدہ جملہ پر معطوف آیت کے معنی نشانی قدرت ہے اور ناس سے مراد ان کی اولاد یا قبیلہ والے یا تمام لوگ ہیں۔ یعنی ہم نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ تم لوگوں کے لئے سراپا نشانی قدرت ہو جاؤ کہ تم جوان ہو اور تمہارے پوتوں کی اولاد بڈھی (خازن و کبیر) وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ۔ یہ واؤ عاطفہ ہے۔ اور اَنْظُرْ پہلے اَنْظُرْ پر معطوف پہلی نظرؔ اپنے مدت قیام معلوم کرنے کے لئے تھی اور یہ نظر احیاء مردہ دیکھنے کے لئے لہٰذا دونوں نظروں میں فرق ہے۔ اور عطف صحیح عظام عظم کی جمع ہے۔ بمعنی ہڈی الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے۔ اس لئے یا تو اپنی ہڈیاں مراد ہیں کیونکہ آپ کی آنکھ پہلے کھلی اور باقی جسم شریف بعد میں زندہ ہوا اور بیت المقدس والوں کی ہڈیاں مگر صحیح یہ ہے کہ خود گدھے کی ہڈیاں مراد ہیں جو ان کے سامنے گلی ہوئی پڑی تھیں۔ کَیْفَ نُنْشِزُھَا۔ یہ نشزؔ سے بنا بمعنی بلند جگہ پھر اونچی طرف اٹھانے کو بھی نشزؔ کہنے لگے۔ اصطلاح میں ہر اٹھنے کو نشزؔ بولا جانے لگا۔ وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا۔ (مجادلہ:۱۱) نافرمان عورت کو اسی لئے ناشزہ کہتے ہیں۔ یعنی دیکھو ہم ان ہڈیوں کو کس طرح متفرق زمین سے اٹھا کر ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ ایک قرأت میں نُنْشِرُھَا ر سے ہے۔ اس کا مادہ نشر بمعنی جمع کرنا یا زندہ کرنا یا پھیلانا ہے۔ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَہٗ۔ (عبس:۲۲) (کبیر) ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا۔ نَکْسُوْ کسوۃٌ سے بنا بمعنی پہننا لباس کو کسوہ اور کمبل کو کساء اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ پہنا جاتا ہے چونکہ گوشت ہڈیوں پر ایسے لپٹا ہوتا ہے جیسے جسم پر لباس اس لئے یہاں نکسوا فرمایا گیا۔ اور چونکہ ہڈیوں کے نام کام شکل مختلف ہیں۔ اور گوشت یکساں اسی لئے ہڈی کو جمع اور گوشت کو واحد لایا گیا۔ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ یہاں پورا واقعہ پوشیدہ ہے کہ انہوں نے گدھے کو زندہ ہوتے دیکھ لیا۔ اگرچہ رب تعالیٰ کے اس فرمان سے ہی حضرت عزیر علیہ السلام کو یقین ہو گیا تھا کہ ہم سو سال تک یہاں رہے۔ رب کی خبر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں مگر رب نے انہیں اس مدت ٹھہرنے کا حق الیقین دلانے کے لئے تمام کلام ارشاد فرمایا کہ گدھے کی ہڈیاں دیکھو یہ پکار کر کہیں گی کہ آپ یہاں ایک دن نہ ٹھہرے بلکہ دراز مدت تک رہے۔ لہٰذا اس گفتگو پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ کیا حضرت عزیر کو رب کے فرمان پر اعتبار نہ تھا۔ کہ اس کے دلائل قائم فرمائے۔ پھر جبکہ ان کو احیاء موتا ظاہر ہو گئی۔ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ قال کا فاعل عزیر علیہ السلام ہیں اور علم سے مراد علم مشاہدہ اور حق الیقین ہے۔ کیونکہ علم الیقین تو پہلے ہی حاصل تھا۔ بعض قرأت میں اعلم بصیغہ امر ہے۔ (خازن) تو قال کا فاعل اللہ اور علم بمعنی نظر ہے۔ شیئی سے یا تو موت اور زندگی مراد ہے یا ہر چیز یعنی عزیر علیہ السلام نے کہا کہ میں بحق الیقین جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یا رب نے فرمایا کہ اے عزیر دیکھ لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یا عزیر علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں پہلے سے ہی جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مجھے انکار نہ تھا۔ حیرت تھی۔ اس سے پتہ لگا کہ حضرات انبیاء کرام کو خطاء اجتہادی ہو سکتی ہے مگر رب تعالیٰ انہیں اس خطا پر قائم نہیں رہنے دیتا حضرت عزیر کا یہ عرض کرنا کہ میں

یہاں دن بھر یا اس سے کم ٹھہرا اجتہادی خطا تھی جو سورج کو دیکھ کر پیدا ہوئی۔ رب تعالیٰ نے انہیں فوراً اس خطا سے مطلع فرما دیا اس پر کوئی عتاب نہ فرمایا اس سے اجتہاد کے متعلق بہت سے مسائل نکل سکتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر اور حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ

بیت المقدس میں بنی اسرائیل آباد تھے۔ جب ان کا فسق و فجور نافرمانی وطغیانی حد سے بڑھا۔ اور انہوں نے پیغمبر وقت کی ہدایت پر عمل نہ کیا تو عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً چھ سو برس پیشتر بخت نصر بابلی نے بیت المقدس پر سخت حملہ کیا۔ ان کے ساتھ چھ لاکھ جھنڈے تھے۔ اور ہر جھنڈے کے ساتھ بے شمار فوج اس نے بیت المقدس کو ویران کر ڈالا۔ توریت شریف کے نسخے جلا دیے بنی اسرائیل کے تین حصے کئے۔ ایک گروہ کو قتل کر ڈالا۔ دوسرے کو بہت ذلت وخواری سے شام میں رکھا۔ تیسرے کو قید کیا اس قیدی گروہ کی تعداد دس لاکھ تھی۔ ان قیدیوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ انہیں قیدیوں میں حضرت عزیر و دانیال علیہما السلام بھی تھے جو اس وقت بچے تھے۔ (روح البیان) جب بہت عرصہ بعد ان میں سے بعض لوگ قید سے چھوٹے تو حضرت عزیر علیہ السلام بیت المقدس پر گزرے جو اس وقت تک اجڑا پڑا تھا۔ آپ تمام شہر گھومے کوئی آدمی نہ ملا۔ مگر وہاں کے باغات قسم قسم کے میوے سے لدے ہوئے تھے۔ جن کا کوئی کھانے والا نہ تھا۔ آپ نے کچھ انگور اور انجیر توڑ کر کھائے اور کچھ انگوروں کا رس نکال کر پیا اور کچھ انگور و انجیر توشہ دان میں رکھ لئے اور تھوڑا سا شیرۂ انگور ساتھ لے لیا۔ حدود آبادی سے باہر نکل کر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولے کہ رب تعالیٰ اسے کیونکر آباد کرے گا اور اب یہاں رونق کیسے ہوگی۔ منظور الٰہی یہ ہوا کہ اپنی قدرت کاملہ انہیں دکھائے آپ نے اپنے دراز گوش کو وہاں باندھ دیا۔ انجیر و انگور کا توشہ دان اپنے سرہانہ ایک جانب اور شیرۂ انگور کا برتن دوسری جانب رکھ کر خود آرام کے لئے لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی اور سوتے میں جان نکال لی گئی گدھا بھی مر گیا۔ یہ واقعہ صبح کے وقت ہوا۔ رب تعالیٰ نے بخت نصر بادشاہ کو نمرود کی طرح مچھر سے ہلاک فرما دیا۔ باقی بنی اسرائیل کو آزادی مل گئی۔ ستر برس کے بعد حق تعالیٰ نے شاہان فارس میں سے کسی کو مسلط کیا۔ جو اپنی فوجیں لے کر بیت المقدس پہنچا۔ اور اس کو پہلے سے بھی بہتر طریقہ پر آباد کیا بکھرے ہوئے بنی اسرائیل پھر وہاں آ کر آباد ہو گئے۔ اور تیس سال کے عرصہ میں یہ لوگ بہت بڑھ گئے۔ حق تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم شریف وغیرہ کو ایسا غائب فرما دیا کہ نہ تو آپ کو کسی انسان نے دیکھا نہ کسی چرند و پرند و درند جانور نے جب آپ کی وفات کو سو سال پورے ہو گئے تب آپ کو زندہ کیا گیا۔ اولاً آنکھ کھلی آپ نے اپنے سارے جسم کو بے جان پایا۔ پھر آپ کے دیکھتے دیکھتے سارا جسم شریف زندہ ہو گیا۔ یہ واقعہ شام کے وقت ہوا۔ تب رب نے پوچھا کہ آپ یہاں کتنی مدت رہے۔ آپ نے خیال فرمایا کہ یہ وہ ہی دن ہے جب میں لیٹا تھا۔ تو اندازاً فرما دیا۔ کہ ایک دن بلکہ اس سے بھی کچھ کم چونکہ آپ اپنے خیال و اندازے کی حکایت فرما رہے تھے۔ نہ کہ واقعہ کی یعنی میرا اندازہ یہ ہے کہ میں دن بھر یہاں رہا۔ اس لئے نہ یہ کلام جھوٹ ہے اور نہ آپ کا ایسے بولنا کذب' کلام بھی سچا ہے اور آپ کا بولنا بھی حق جیسے کہا جاتا ہے۔ زَيْدٌ قَائِمٌ فِيْ ظَنِّيْ۔ میرے خیال میں زید کھڑا ہوا ہوگا لہٰذا اس جواب میں یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ غلط بات پیغمبر کی زبان پر کیوں آئی اس لئے رب نے اس جواب پر عتاب نہ فرمایا بلکہ واقعہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ یا کہو کہ

حضرت عزیر نے عالم ارواح کا حال بتایا جہاں آپ کی روح تھی وہاں ابھی تک ایک دن بھی نہ گزرا تھا۔ وہاں کا ایک دن ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (حج: ۴۷) اور رب تعالیٰ نے اس دنیا کا ذکر فرمایا جہاں آپ کا جسم شریف تھا۔ یا یہ کہو کہ اس دنیا میں ہی گدھے پر سو سال گزر گئے تھے۔ اور غذا و شربت پر ایک دن گزرا تھا۔ بہر حال یہ کلام جھوٹ نہ تھا۔ چنانچہ رب نے فرمایا۔ کہ نہیں آپ سو سال ٹھہرے رہے۔ اب ہماری قدرت کا نظارہ کیجئے کہ اتنی دراز مدت میں جلد بگڑنے والی غذا و شراب تو نہ بگڑی ایسی ہے جیسے ابھی تیار ہوئی ہے اور گدھا گل سڑ کر برابر ہو گیا۔ اعضاء بکھر گئے۔ ہڈیاں سفید سفید چمک رہی ہیں۔ اب دیکھئے ہم کیسے مردہ زندہ کرتے ہیں۔ ایک غیبی آواز آئی کہ اے گلی ہڈیو جمع ہو کر گوشت و پوست کا لباس پہن لو۔ آناً فاناً ہڈیاں درست ہو کر تمام جسم تیار ہو گیا۔ دوسری آواز آئی کہ زندہ ہو جاؤ فوراً گدھا زندہ ہو کر آواز کرنے لگا۔ آپ نے قدرت خدا کا نظارہ کیا۔ اور فرمایا کہ میں خوب جانتا ہوں۔ کہ رب ہر چیز پر قادر ہے۔ پھر آپ اسی سواری پر سوار ہو کر آبادی کی طرف چلے دیکھا کہ وہ ہی ویران شہر بہت بارونق ہو گیا ہے۔ محلے گلی کوچے سڑکیں وغیرہ سب آباد ہو چکے ہیں آپ کی عمر شریف وہ ہی چالیس سال تھی۔ جو سوتے وقت تھی۔ شہر والوں میں سے کوئی بھی آپ کو نہ پہچانتا تھا۔ آپ اندازے سے اپنے مکان پر پہنچے۔ ایک ضعیف نابینا بڑھیا ملی جس کے پاؤں رہ گئے تھے۔ وہ آپ کی لونڈی تھی اور اس نے آپ کو دیکھا تھا۔ اس کی عمر اس وقت ایک سو بیس سال تھی۔ کہ آپ کے وفات کے وقت بیس سال کی تھی۔ اور سو (۱۰۰) سال یہ گزرے آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا یہ عزیر کا مکان ہے وہ بولی ہاں آج کون ہے جو سو برس بعد عزیر کا نام لے رہا ہے ان کو تو گم ہوئے ایک صدی ہو چکی یہ کہہ کر بہت روئی۔ آپ نے فرمایا میں ہی عزیر ہوں اس نے کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے سو برس مردہ رکھ کر پھر زندہ کیا اس نے کہا کہ حضرت عزیر مقبول الدعاء تھے۔ ان کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ آپ دعا کریں کہ میں انکھیاری ہو جاؤں تا کہ دیکھ کر آپ کو پہچان لوں۔ آپ نے دعا کی وہ بینا ہوئی آپ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا اٹھ خدا کے حکم سے یہ فرماتے ہی اس کے مارے ہوئے پاؤں درست ہو گئے۔ وہ دیکھ کر پہچان گئی۔ اور کہنے لگی واقعی آپ عزیر ہیں۔ اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بنی اسرائیل کی ایک مجلس میں لے گئی۔ جہاں حضرت عزیر کے فرزند جن کی عمر ایک سو اٹھارہ سال تھی اور آپ کے بڈھے پوتے بھی موجود تھے۔ اور چیخ کر بولی مبارک ہو عزیر آ گئے سب نے کہا تو جھوٹی ہے۔ وہ بولی میں وہ ہی اندھی لنگڑی بڑھیا ہوں۔ دیکھ لو ان کی دعا سے اچھی ہو گئی۔ یہ کہتے ہیں کہ مجھے رب نے سو برس مردہ رکھ کر زندہ فرمایا لوگ اٹھ کر ان کی زیارت کرنے لگے۔ آپ کے بیٹے نے کہا۔ کہ میرے والد کے دوشانوں کے درمیان بالوں کا ایک ہلال تھا جسم مبارک کھول کر دکھایا گیا تو وہ موجود تھا۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت عزیر کو توریت شریف حفظ تھی۔ آج کل اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اگر آپ عزیر ہیں تو توریت شریف سنائیے۔ آپ نے توریت سنائی ہی نہیں بلکہ لکھوا بھی دی۔ مجمع میں سے ایک بولا کہ میں نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے والد سے سنا تھا کہ بخت نصر کے ستم انگیزیوں کے بعد گرفتاری کے زمانہ میں میرے دادا نے ایک جگہ توریت دفن کر دی۔ اس کا پتہ مجھے معلوم ہے چلو تلاش کریں شاید مل جاوے جستجو سے وہ نسخہ ملا۔ اس نسخہ مدفونہ کو حضرت عزیر کے لکھوائے ہوئے نسخے سے مقابلہ کیا گیا تو حرف بحرف مطابق نکلا۔ تب سب کو یقین ہوا کہ عزیر علیہ السلام ... نے آپ کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔ (تفسیر

خزائن عرفان وجمل وخازن وروح وغیرہ)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** قدرت الٰہی پر حیرت وتعجب کرنا گناہ نہیں۔ انکار کرنا جرم ہے کیونکہ حیرت بشری کمزوری سے ہے۔ نہ کہ رب کی قدرت کے انکار سے دیکھو پیغمبر نے حیرت کی۔ **دوسرا فائدہ:** انبیاء کرام کی بارگاہ الٰہی میں وہ عزت ہے کہ سبحان اللہ رب تعالیٰ ہر طرح ان کی تسلی تشفی فرماتا ہے۔ دیکھو حضرت عزیر نے تعجب ہی کیا تھا کہ تسلی کر دی گئی کیونکہ یہ تو دنیا کی تسلی کرنے آتے ہیں۔ اگر خود ان کو حیرت وتعجب رہے تو دوسروں کی تشفی کیسے کریں۔ **تیسرا فائدہ:** داعی کے مراتب اور آداب دعا کے لحاظ سے دعا کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت عزیر کی تسلی سو برس بعد کی گئی۔ مگر حضرت ابراہیم کی تسلی فوراً ہی کر دی گئی جس کا قصہ اگلی آیت میں ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کی خواہش کو پورا فرما دیتا ہے۔ انہیں منہ سے دعا مانگنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دیکھو حضرت عزیر علیہ السلام نے بیت المقدس کی آبادی کی صراحۃً دعا نہ کی صرف حیرت کا اظہار کیا۔ ہاں دل میں تمنا ضرور تھی کہ یہ شہر پھر آباد ہو جائے رب تعالیٰ نے ان کی تمنا کس شاندار طریقہ سے پوری فرما دی حضور ﷺ نے تبدیل قبلہ کی دعا نہ کی صرف شوق وحی میں آسمان کو دیکھا۔ کہ تبدیلی قبلہ واقعہ ہوگئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرودی آگ سے بچنے کی دعا نہ کی صرف دل میں آرزو تھی کہ رب نے انہیں آگ کے شر سے صرف بچا نہ لیا بلکہ آگ کو ہی ٹھنڈا وسلامت کر دیا۔ یہ ہے ان کی محبوبیت۔ **پانچواں فائدہ:** کسی شخص کا ایمان نبی کے ایمان کی مثل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سب کا ایمان بالغیب ہے۔ مگر نبی کا ایمان بالشہادۃ بھی ہے۔ ان حضرات کے لئے اکثر غیوب مشاہدہ کرا دیئے جاتے ہیں۔ دیکھو مر کر جینے پر ہم سب کا ایمان بالغیب ہے۔ مگر حضرت عزیر وابراہیم وعیسیٰ علیہم السلام کا ایمان بالشہادہ کہ انہوں نے مردے جیتے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہمارے حضور ﷺ نے تو سارا عالم الغیب حتیٰ کہ رب تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ نیز ہمارے ایمان علم حصول ان کا ایمان علم حضوری کیونکہ نبوت ان کی اپنی صفت ہے۔ اور اپنی ذات وصفات کا علم حضوری ہوتا ہے نیز ہم محض مومن ہیں۔ مگر وہ حضرات مومن بھی اور ایمان بھی کہ ان کا ماننا ہمارے ایمان کا رکن ہے۔ ہمارے کلمہ میں حضور انور کا نام ہے حضور ﷺ کے کلمہ میں ہمارا نام نہیں کہ وہ میرا امتی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** بعد موت اور قبل پیدائش کا زمانہ عمر میں محسوب نہیں ہوتا۔ دیکھو حضرت عزیر نے چالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ سو سال بعد جب زندہ ہوئے تو وہ ہی چالیس سال عمر شریف تھی۔ اسی کو رب نے آیت فرمایا کہ والد چالیس سال کے اور فرزند ایک سو اٹھارہ سال کے بلکہ دادا جوان اور پوتے بوڑھے۔ تفسیر خازن نے فرمایا کہ حضرت عزیر کے بال کالے تھے اور آپ خوب جوان اور آپ کے پوتوں کے بال سفید اور وہ بالکل بوڑھے تھے۔ یہ قدرت رب کی عجیب نشانی ہے۔ **قرآنی معمہ:** وہ کون صاحب ہیں جو خود چالیس سالہ جوان اور ان کے فرزند ایک سو بیس سالہ اور پوتے نوے سالہ بوڑھے۔ **جواب:** وہ حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ جنہوں نے سو سال کی مدت زمانہ موت میں گزاری اور جب زندہ ہوئے تو خود جوان تھے۔ مگر آپ کی اولاد بڈھی۔ **ساتواں فائدہ:** کبھی فساق کی وجہ سے بے گناہوں پر بھی مصیبت آ جاتی ہے دیکھو بنی اسرائیل کے فساق کی وجہ سے بے گناہ بچے بھی بخت نصر کی مصیبت میں گرفتار ہوئے

اعتراضات

پہلا اعتراض: حضرت عزیر کی عمر شریف اس عارضی موت کے وقت پوری ہو چکی تھی۔ یا نہیں۔ اگر ہو چکی تھی تو دوبارہ زندہ ہو کر کونسی عمر گزاری اور اگر نہیں تو عمر باقی رہتے ہوئے موت کیوں آئی۔ (آریہ) **جواب:** آپ کی عمر باقی تھی اور موت عارضی اسی لئے دوبارہ زندہ رہے۔ عارضی موت قدرت الٰہی کا نظارہ کرانے کے لئے تھی۔ چراغ بجھنے کی دو صورتیں ہیں۔ تیل بتی ہی ختم ہو جائے یا دونوں موجود ہوں مگر ہوا سے گل ہو جاوے۔ آپ کی یہ وفات دوسری قسم کی تھی۔ عمر کا روغن وبتی باقی تھا مگر ارادہ الٰہی کی ہوا نے شمع حیات گل کر کے پھر روشن کر دی۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیۃ سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام بعد وفات اس عالم سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ تب ہی تو حضرت عزیر کو معلوم نہ ہوا کہ ہم یہاں کتنا رہے اور نہ آپ اپنے محلہ و مکان کو آسانی سے پہچان سکے۔ اگر اس عالم کی خبر رکھتے تو ان کو یہاں کے دن و رات و واقعات معلوم رہتے۔ پھر تم ان سے دعائیں کیوں مانگتے ہو۔ اور حاجت کے وقت کیوں پکارتے ہو۔ وہ تو بعد وفات اپنے سے بھی بے خبر ہیں۔ تمہاری کیا خبر رکھیں۔ (دیوبندی) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی دوسرا تحقیقی الزامی یہ ہے کہ پھر تو نماز میں اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ پڑھنا درود پاک کی تلاوت نعت شریف لکھنا تمہارے مولوی قاسم صاحب کا یہ شعر کہنا کہ شعر۔

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا — نہیں ہے قاسم بے کس کا کوئی حامی کار

اور روضہ پاک کی حاضری یہ سب بیکار بلکہ ناجائز ہوئیں کہ جب انہیں اس دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں تو انہیں پکارنا بے فائدہ ہے جواب تحقیقی یہ ہے کہ جیسے عزیر علیہ السلام کا سو برس بے حیات رہ کر زندہ ہونا بغیر دفن ہوئے۔ سارے عالم کی نگاہوں سے چھپا رہنا۔ غذا اور شربت کا نہ بگڑنا عجائبات قدرت میں سے ہے ایسے ہی ان کا زمانہ وفات میں اس عالم سے بے توجہ رہنا بھی کرشمہ قدرت ہے۔ تمام پیغمبروں کا یہ حال نہیں بلکہ انہوں نے زندہ ہو کر بھی گدھے کی سفید ہڈیاں' عالم کی بدلی ہوئی ہوا' باغات اور کھیتوں کے تغیر پر توجہ نہ کی اور بے اختیار کہہ دیا کہ میں یہاں ایک دن رہا اور نہ اگر ان چیزوں میں سے ایک پر بھی غور کر لیتے تو معلوم فرما لیتے کہ مجھے یہاں ٹھہرے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا۔ دیکھو حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہماری آنکھیں سوتی ہیں۔ اور دل بیدار رہتا ہے۔ یعنی سونے کی حالت میں بھی اس عالم سے بے خبر نہیں ہوتے۔ اسی لئے نیند سے ان کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ مگر شب تعریس میں جب رب کو قضاء نماز کے احکام بتانا منظور ہوئے تو حضور ﷺ کو نیند میں اپنی طرف ایسا متوجہ فرما لیا کہ دن چڑھے آپ کی آنکھ کھلی اور نماز فجر قضاء ہو گئی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر نیند میں آپ کو اس جہاں سے بے توجہی رہتی ہو۔ نیز ہم کو بہت پرانے گزرے ہوئے واقعات ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کل گزرے۔ قیامت میں لوگ دنیوی زندگی کو ایک دن یا دو دن سمجھیں گے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انہیں وہ مدت معلوم نہیں۔ وہ تو یہاں رہ کر کام کاج کر کے عمر گزار کر گئے۔ صرف اس وقت کی ہیبت سے اندازہ میں غلطی کریں گے۔ جب رب تعالیٰ قیامت میں انبیاء کرام سے پوچھے گا۔ کہ تمہیں تمہاری امتوں نے کیا جواب دیا تھا تو رعب سلطانی کی وجہ سے بے ساختہ منہ سے نکلے گا۔ لَا عِلْمَ لَنَا۔ ہو سکتا ہے کہ کلام ربانی کی ہیبت کی وجہ سے اندازہ میں خطا ہو گئی ہو۔ کہ صرف ڈوبتے ہوئے دن پر نظر پہنچی اور بہت سی علامات پر توجہ نہ ہوئی۔ نیز وہاں حقیقتاً تو سو سال گزرے اور حسی ایک دن۔ جیسے محشر کا دن حقیقتاً ایک ہزار سال کا ہو گا لیکن مومنین کے لئے بقدر

نماز۔ اور یہاں دونوں قسم کے دن کا اثر موجود تھا۔ کہ گدھے پر سو سال گزر گئے تھے اور کھانے شربت پر ایک دن ہی گزرا تھا۔ لہٰذا عزیر علیہ السلام کا اسے ایک دن فرمانا بھی درست تھا اور رب کا سو سال فرمانا بھی ٹھیک تھا۔ وہ حس کے لحاظ سے تھا۔ اور یہ حقیقت کے لحاظ سے اور یہ بھی معجزہ کے طور پر ہوا۔ اگر یہ حضرات بعد وفات اس جہان سے بے خبر تھے۔ تو انہیں حضور ﷺ کے حج اور معراج کی کیسے خبر ہوئی۔ کہ حضور ﷺ کے حج میں حضرت یونس علیہ السلام و دیگر انبیاء شریک ہوئے۔ اور معراج میں سارے نبیوں نے حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ اس دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ۔ (زخرف: ۴۵) اے محبوب اگلے رسولوں سے پوچھ لو۔ کیا ہم نے رب کے سوا اور معبود مقرر کئے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ گزشتہ نبیوں سے ملاقات بھی کرتے ہیں ان سے گفتگو بھی۔ تب ہی تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے عذاب سے ہلاک شدہ قوم سے کلام فرمایا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ الخ (اعراف: ۹۳) ہمارے حضور ﷺ نے جنگ بدر کے بعد ابو جہل امیہ ابن خلف وغیرہم کی نعشوں سے کلام فرمایا کہ بولوں میں سچا ہوں یا نہیں۔ اب تمہیں میری حقانیت معلوم ہوئی یا نہیں۔ غرض کہ سماع موتی اور حیات اموات پر بیشمار دلائل قائم ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

بہت سے لوگ حشر ارواح کے معتقد ہیں حشر اجسام کے منکر وہ کہتے ہیں کہ روح کو جسموں میں کمال حاصل کرنے کے لئے ایسا بھیجا گیا تھا۔ جیسے بچہ کو مکتب میں علم حاصل کرنے کے بعد میں بچہ کو دوبارہ مدرسہ میں نہیں بھیجتے۔ بلکہ دفاتر و اعلیٰ مقامات پر ایسے ہی جب روح بقدر استعداد شر یا خیر کما کر جسم سے نکل گئی۔ تو اب دوبارہ اسے جسم میں ڈالنا اور اس حجرہ میں قید کرنا خلاف حکمت ہے۔ صرف روح کو ہی جنت یا دوزخ میں جانا چاہیے۔ رب نے اپنے کمال فضل و رحمت سے عزیر علیہ السلام اور ان کے گدھے کو موت دے کر غذا اور شراب کو محفوظ اور گدھے کے جسم کو خاکستر کر کے ان شک کا جواب سمجھا دیا۔ روح گویا عزیر ہے جسم گویا گدھا۔ شراب گویا عشق ہے اور غذا اس کے اعمال۔ جیسے کہ عزیر علیہ السلام کا جسم شریف اور غذا شراب محفوظ رکھا گیا۔ اور گدھا خاکستر کر دیا گیا۔ پھر دوبارہ گدھے کو زندہ کر کے انہیں بیت المقدس میں داخل کیا گیا۔ ایسے ہی جب عزیر روح کو حیات بخشی جائے گی تو اس کے ساتھ اس کا دراز گوش (جسم) بھی زندہ کیا جائے گا اور اسکے اعمال و عقائد بعینہ اس عالم میں محفوظ ملیں گے۔ پھر جہاں روح پہنچے گی وہاں اسکا جسم بھی کہ جب جسم اعمال کے وقت روح کے ساتھ رہا تو جزا اور سزا کے وقت بھی ساتھ ہی رہنا چاہیے کیونکہ جسم اس کی سواری ہے۔ عارفین کی روح تجلی جلال و جمال کے جام پئے گی۔ اور وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (الدھر: ۲۱) کا ظہور ہوگا۔ تب جسم جنت کے باغوں میں چرے گا۔ اور کوثر و سلسبیل کے حوضوں سے پانی پئے گا (تفسیر روح البیان و ابن عربی) خیال رہے کہ نیک اعمال دو قسم کے ہیں۔ نفسانی و رحمانی نفسانی وہ ہیں جو رضاء رحمان کے لئے کئے جاویں۔ ریا۔ نام۔ نمود۔ حصول دنیا ان کا مقصد ہے۔ اور رحمانی وہ ہیں جو رضاء رحمان کے لئے کئے جائیں یعنی اخلاص خشوع و خضوع ان میں داخل ہو۔ چونکہ جسم کو فنا ہے لہٰذا جسمانی اعمال کو بھی فنا یہ اعمال برباد ہو جائیں گے۔ رب فرماتا ہے۔ وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (فرقان: ۲۳) حدیث شریف میں ہے کہ ریا

کارشہید۔ عالم۔ سخی سب دوزخ میں پھینکے جائیں گے۔ اور رحمانی اعمال باقی غیر فانی ہیں۔ کیونکہ رحمان باقی ہے تو رحمانی اعمال بھی باقی۔ بلکہ وہ اعمال قیامت میں مع اضافہ کے ملیں گے۔ ان کے لئے رب فرماتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (بقرہ:۲۶۱) اسی طرح عشق و محبت چند قسم کی ہے۔ عشق نفسانی، جسمانی، روحانی، ایمانی، رحمانی۔ محبت نفسانی جیسے شہوت کی محبت اور محبت جسمانی اولاد ماں باپ سے رشتہ داروں سے محبت فانی ہے۔ کہ بعد موت ختم ہو جاتی ہے۔ رب فرماتا ہے۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ۔ (عبس:۳۶) اس دن انسان اپنے بھائی سے۔ ماں اپنی جائی سے خاوند بیوی بچوں سے بھاگے گا مگر محبت روحانی جیسے اللہ کے مقبولوں سے محبت ایسے ہی محبت ایمانی نیک اعمال اور اچھی چیزوں سے محبت۔ اور نماز، قرآن، مدینہ منورہ سے محبت ایسے ہی محبت رحمانی جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب سے محبت باقی ہے جو قیامت میں کام آدے گی۔ رب فرماتا ہے۔ اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (زخرف:۶۷) صوفیاء فرماتے ہیں کہ طلب جنت کے لئے بھی نیکیاں نہ کرو صرف رضاء الٰہی کے لئے کرو۔

دوسری تفسیر

عقل انسان گویا عزیر ہے۔ قلب گویا بیت المقدس شیطان گویا بخت نصر اس دل کا تجلیات الٰہی سے خالی ہونا گویا اس شہر کی ویرانی ہے کہ اس کی صورت تو قائم مگر اس کا نفع زائل عقل نے دل پر گزر کی اور بارگاہ الٰہی میں اس کی حیات کے متعلق عرض کی کہ مولیٰ یہ غافل دل اور اجڑی بستی تیری تجلیات جمال وجلال سے کیونکر آباد ہو گی۔ اور جہالت کی موت کے بعد اب اسے حیات علم کیونکر آئے گی۔ تو رب نے اس عقل کو سو سال یعنی مدت دراز تک جہالت کی موت میں رکھا پھر اسے حیات علم عطا فرمائی۔ اور اسے فرمایا کہ تو اپنی غذا معلومات کلیہ اور جزیہ کو دیکھ ویسے ہی موجود ہیں اور اپنے شراب عشق کو دیکھ کہ خراب نہ ہوئی۔ جیسی تجھ کو میثاق کے دن پلائی گئی تھی۔ اب تک موجود ہے اور اب تو اپنے گدھے یعنی قالب کو دیکھ کر بچپن کی جہالت اور لڑکپن کی غفلت اور ضعف کمزوری سے نکل کر کس طرح زندہ ہوتا ہے۔ کہ ہم اولاً اس کی بکھری ہوئی قوتیں جمع کرتے ہیں۔ اور پھر اسے عرفان کا لباس پہناتے ہیں اور جیسے کہ روح کو غذاء شہوت اور شربت وصال سے پرورش کیا تھا۔ ایسے ہی اس جسم کو مختلف غذاؤں اور شربتوں سے پرورش کریں گے۔ جب عقل نے جسم کی یہ حیات اور کمزوری کے بعد قوت اور بے علمی کے بعد علم وغیرہ دیکھے تو چیخ پڑی کہ اللہ ہر شئی پر قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ

اور جبکہ کہا ابراہیم نے کہ اے رب میرے دکھا تو مجھے کہ کیسے زندہ کرے گا تو مردے کو فرمایا کیا اور نہ ایمان لایا تو کہا

اور جب عرض کی حضرت ابراہیم نے اے رب میرے مجھے دکھا دے تو کیونکر مردے جلائے گا فرمایا کیا تجھے یقین نہیں

بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ

ہاں اور لیکن تاکہ مطمئن ہو جاوے قلب میرا فرمایا پس لے چار پرندوں میں سے پس ہلا لے

عرض کی یقین کیوں نہیں مگر یہ چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے فرمایا تو اچھا چار پرندے لے کر اپنے ساتھ ہلا لے
اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا
ان کو طرف اپنے پھر کر دے اوپر ہر پہاڑ کے ان میں سے ایک حصہ پھر بلا تو انہیں آئیں گے وہ تیرے پاس دوڑتے ہوئے
پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا پہاڑ پر رکھ دے پھر انہیں بلا وہ تیرے پاس چلے آئیں گے پاؤں سے دوڑتے
وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾
اور جان کہ تحقیق اللہ غالب حکمت والا ہے
اور جان رکھ کہ اللہ غالب حکمت والا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مناظرہ بیان ہوا تھا۔ جس میں نمرود کی کج بحثی کا ذکر تھا۔ کہ اس نے قتل نہ کرنے کو زندہ کرنا اور قتل کر دینے کو موت دینا سمجھ کر اپنے کو خدا کہا۔ اب ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے زندہ کرنے کا طریقہ یعنی احیاء دیکھنے کی رب سے درخواست کی۔ جس سے رب اور بندہ میں فرق ہوا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت عزیر کا واقعہ بیان ہوا جس میں بتایا گیا کہ انہوں نے احیاء موتی پر تعجب فرمایا تو خود انہیں پر یہ عمل کر کے دکھایا گیا۔ اب اس سے عجیب تر واقعہ کا ذکر ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس پر تعجب کیا تو آناً فاناً ان کے سامنے ہی مردہ جانور زندہ کر کے دکھا دیئے گئے۔ غرضکہ پہلے بھی مردہ زندہ ہونے کا ہی ذکر تھا۔ اب بھی اسی کا ذکر ہے۔ مگر کچھ فرق کے ساتھ۔

تفسیر

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ۔ اِذْ یا اگلے قال کا مفعول ہے۔ یا اُذْكُرْ یا اَلَمْ تَرَ فعل پوشیدہ کا مگر پہلی توجیہہ قوی ہے کہ اذ ایک پوشیدہ فعل اُذْكُرْ کا ظرف ہے۔ اذکر ذکر سے بنا بمعنی یاد کرنا۔ یاد دلانا۔ یا تذکرہ کرنا یعنی اے ہمارے محبوب وہ جو تم نے حضرت ابراہیم کا واقعہ دیکھا بھالا ہے اسے یاد کرو یا بنی اسرائیل کو وہ واقعہ ابراہیم کا یاد دلاؤ جو توریت وانجیل میں مذکور ہے یا اپنے صحابہ سے اس واقعہ کا ذکر کرو۔ تاکہ مسلمانوں کے دل میں رب کی ہیبت اور بزرگی عظمت پیدا ہو کہ رب مارنے جلانے پر قادر ہے۔ اور پیغمبر کی ضدیں رب تعالیٰ پوری فرماتا ہے۔ کہ حضرت ابراہیم کی عرض پر مردہ پرندوں کو زندہ فرمایا۔ اس ہیبت و عظمت سے ہی ایمان کی بقا ہے۔ باپ کی ہیبت سے گھر کا استاد کی ہیبت سے مدرسہ کا سلطان کی ہیبت سے ملک کا نظام قائم ہے۔ نبی کی ہیبت سے دین وایمان کا نظام قائم ہے بلکہ اسلام کا وقار حضور ﷺ کے وقار سے قائم ہے۔ کہ فعل کی عظمت فاعل کے وقار سے ہوتی ہے یا اے مسلمانو! اس واقعہ کا کبھی کبھی تذکرہ کیا کرو۔ تاکہ تمہارے ایمان تازہ ہوتے رہیں۔ بزرگوں کی یادگاریں ایمان میں تازگی پیدا کرتی ہیں۔ غرضکہ اس اِذْ کی پانچ تفسیریں ہو سکتی ہیں۔ اسمیں اختلاف ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ عرض کب کی بعض نے کہا کہ ایک بار آپ نے سمندر کے کنارے مردار پڑا ہوا دیکھا کہ جب سمندر چڑھ کر آتا ہے تو

مچھلیاں اس کا گوشت نوچتی ہیں۔ اور جب ہٹ جاتا ہے تو اسے درندے کھاتے ہیں۔ اور اس کے بعد چیل کوے وغیرہ اسے نوچتے ہیں۔ تو عرض کیا کہ مولیٰ تو ان مختلف جانوروں کے پیٹ سے اسے کیسے نکال کر زندہ فرمائے گا کہ ایک جانور کا گوشت چرندے۔ پرندے۔ تیرندے جانوروں میں تقسیم ہو گیا۔ پھر ان مقامات سے جمع کیسے ہوگا۔ نیز ایک ہی پیٹ میں سینکڑوں جانوروں کے اجزاء پہنچ جاتے ہیں۔ مرغ۔ بٹیر۔ بکری۔ گائے۔ بھینس وغیرہ سب کو کھائے جاتے ہیں۔ ایک ایک پیٹ گویا قبرستان بنا ہوا ہے۔ اس صورت میں اجزاء جسم کیونکر جمع ہوں گے۔ ۲۔ جب آپ کا مناظرہ نمرود کے ساتھ ہوا اور اس نے قتل کو موت دینا اور معافی کو زندہ کرنا سمجھا۔ تو آپ نے جواب دیا کہ میرا رب مرے ہوئے کو زندہ فرماتا ہے۔ وہ بولا کہ کیا کبھی آپ نے یہ دیکھا ہے تب آپ نے یہ دعا کی تا کہ آئندہ کبھی بے دین سے اس قسم کا مناظرہ ہو جائے تو آپ احیاء موتی کی عینی شہادت دے سکیں۔ حضرات انبیاء کے لئے ایمان بالغیب ضروری نہیں ان کو ایمان بالشہادہ بھی ہوتا ہے۔ ۳۔ رب تعالیٰ نے آپ کی خدمت میں ملک الموت کے ذریعہ خوشخبری بھیجی کہ آپ علیہ السلام کو رب نے خلیل بنایا۔ آپ نے پوچھا کہ اس کی علامت کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کی دعا سے مردے زندہ ہوں گے۔ تب آپ نے یہ دعا فرمائی۔ ۴۔ آپ سے بعض لوگ سوال کرتے تھے کہ مردے کیونکر زندہ ہوں گے۔ تب آپ نے انہیں دکھانے کے لئے رب سے دعا کی۔ ۵۔ آپ نے صحیفوں میں پڑھا تھا کہ میری اولاد میں عیسیٰ علیہ السلام مردے زندہ کریں گے۔ تو رب سے یہ دعا کی۔ ۶۔ جب آپ کو ذبح فرزند کا حکم ملا۔ آپ نے اس میں جلدی کی اور آپ کی قربانی قبول ہوئی۔ تب آپ نے دعا کی کہ مولیٰ تو نے مجھے جاندار کو بے جان کرنے کا حکم دیا میں تیار ہو گیا۔ اب میری خواہش ہے کہ مجھے بے جان کو جاندار کر کے دکھادے۔ ۷۔ آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ قیامت کے دن سب ہی مردوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔ مولیٰ مجھے دنیا ہی میں دکھادے۔ ۸۔ بعض نے فرمایا کہ احیاء ہوتا دیکھنا آپ کا اصل مقصود نہ تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ کسی صورت رب تعالیٰ سے بلاواسطہ کلام کریں۔ اس کے لئے آپ نے یہ ذریعہ اختیار فرمایا۔ (از کبیر و خازن وغیرہ) رَبِّ اَرِنِیْ۔ رب حق تعالیٰ کی حمد ہے اور قبول دعا کا ذریعہ۔ رب تعالیٰ کبھی تو اپنے نبی کی دلی تمنا بغیر کچھ عرض کئے ہی پوری فرما دیتا ہے جیسے تبدیلی قبلہ کا واقع ہوا اور کبھی اشارۃً عرض پر جیسے حضرت زکریا کے اشارے پر انہیں فرزند کی بخشش ہوئی۔ اور کبھی صراحۃً عرض پر اس قال سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم نے صراحۃً دعا کی دعا کے وقت رب کو پکارنا سنت ہے بہتر یہ ہے کہ اسے ربنا یا رب کہہ کر پکارے کہ اکثر انبیاء کرام نے اس نام سے پکارا ہے۔ اَرِ اراءۃ کا امر ہے جس کا مادہ رئی ہے۔ آنکھ کی بصارت کو بھی رویت کہتے ہیں۔ اور دل کی بصیرت کو بھی۔ یعنی دکھانا یا سمجھانا و بتانا جیسے رب فرماتا ہے۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا (بقرہ: ۱۲۸) خدایا ہمیں ارکان حج دکھا دے یعنی بتادے سمجھادے مگر یہاں آنکھ سے دکھا دینا مراد ہے۔ کیونکہ وہ دل سے تو پہلے ہی جانتے تھے سمجھے ہوئے تھے۔ بلکہ لوگوں کو سمجھاتے و بتاتے تھے۔ نیز اگلا واقعہ بتا رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں دلائل سے نہ سمجھایا بلکہ آنکھوں دکھایا لہٰذا یہاں آنکھوں دکھانا ہی مراد ہے۔ مرزائیوں کا اسے سمجھا دینے کے معنی میں کرنا تفسیر نہیں تحریف ہے باب افعال میں آ کر اس نے دو مفعولوں کو چاہا۔ پہلا مفعول یہ ہے اور دوسرا كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى۔ یہ کیف بمعنی کیفیت ہے۔ جیسے وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ۔ (ابراہیم: ۴۵) (روح المعانی) یعنی اے میرے پالنے والے تو مردہ زندہ کرنے کی کیفیت مجھے آنکھوں سے دکھا

دے۔ خیال رہے کہ احیاءِ موتیٰ کا سوال نہیں فرمایا کہ تو زندہ کرے گا یا نہیں۔ بلکہ عرض کیا کہ یہ تو مجھے یقین ہے کہ تو زندہ کرے گا۔ مگر مجھے دکھا دے کہ کیسے زندہ کرے گا۔ چونکہ معترض کو یہ کہنے کا موقعہ مل سکتا تھا۔ کہ آپ کو مردوں کی زندگی میں شک تھا اس لئے رب نے ان سے کہلوا لیا۔ کہ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ۔ قَالَ سے نیا جملہ ہے۔ اور اَوَلَمْ میں ہمزہ استفہامیہ اور واؤ عاطفہ ہے۔ اور ہمزہ کے بعد ایک فعل پوشیدہ یعنی اَلَمْ تَعْلَمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ اگر سوال کے موقعہ پر یہ آیت آئی ہے تو ایمان بمعنی یقین ہے اور اگر خلت کی بشارت پر یہ آیت آئی تو ایمان بمعنی اطمینان رب نے فرمایا کہ کیا تمہیں احیاءِ موتی کا یقین نہیں یا کیا تمہیں اطمینان نہیں کہ فرشتہ نے یہی بشارت دی ہے اور آپ خلیل اللہ ہیں۔ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ۔ بَلٰی منفی کا ثبوت ہے۔ اور نعم نفی کا یعنی ہاں میں ایمان لایا۔ اگر نعم ہوتا تو معنی یہ ہوتے کہ ہاں میں ایمان نہ لایا۔ اسی لئے میثاق کے دن تمام روحوں نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (اعراف: ۱۷۲) کے جواب میں بَلٰی عرض کیا۔ نہ کہ نعم لِیَطْمَئِنَّ اطمینان سے بنا اس کا مادہ طمئن بمعنی سکون باب اقشعراء کا مضارع ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ اصل میں لیطمئِنَّ تھا۔ قلب ہو کر یطمئن ہوا۔ یعنی خداوندا میں ایمان تو لایا مگر علم الیقین سے ترقی کر کے عین الیقین چاہتا ہوں۔ تاکہ مجھے حق الیقین کا اطمینان حاصل ہو۔ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ۔ فخذ میں ف جزائیہ ہے۔ اور طیر صفت مشبہ یا طار یطیر کا مصدر ہے۔ بمعنی اسم فاعل یعنی رب نے فرمایا کہ تم چار پرندے پکڑ لو۔ آپ کو اختیار تھا کہ جو چاہیں لے لیں مگر آپ نے مور۔ مرغ۔ کبوتر یا گدھ اور کوا لیا۔ (خزائن العرفان و کبیر وغیرہ) چونکہ حضرت خلیل کو تین چیزیں دکھانا تھیں مردوں کے اجزاء جسم کا مختلف مقامات میں آ کر ملنا۔ ہر قسم کے مخلوط گوشتوں کی چھانٹ۔ مردہ میں جان پڑنا اس لئے رب نے چار پرندے ذبح کرنے کا اور انہیں چار پہاڑوں پر رکھنے کا حکم دیا یہ پہاڑ گویا درندوں کے پیٹ ہیں اور مخلوط گوشت پوست گویا ان پیٹوں میں مختلف جانوروں کے گوشت ہیں حضرت عزیر کو صرف مردہ جلانا دکھانا تھا۔ اس لئے وہاں صرف ایک مردہ جلایا گیا۔ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ۔ ہماری قرأت ص کے پیش سے ہے۔ بعض قرأتوں میں ص کے زیر سے بھی ہے۔ اس کا مادہ صور یا صیر ہے۔ صار یصور اور صار یصیر بمعنی کاٹنا اور مائل کرنا صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عربی ہے بعض نے اسے حبشی یا رومی مانا ہے (روح المعانی) اگر یہاں صیر بمعنی کاٹنا اور ذبح کرنا ہو تو الی کا متعلق پوشیدہ ہے۔ اور اگر بمعنی پالنا اور ملا لینا ہے تو الیٰ صرهُنَّ کے متعلق یعنی انہیں اپنی طرف مائل کر لو اور ہلا لو۔ تاکہ تمہیں پہچان رہے کہ تمہارے ہی پرندے زندہ ہوئے ہیں۔ دوسرے نہیں آ گئے۔ یا انہیں ذبح کر دو اور ان کے سر اپنی طرف رکھ لو۔ عبداللہ ابن عباس کی قرأت میں صرّهُن ہے تصریہ سے ہے باب تفعیل کا امراس کے معنی ہیں جمع کرنا۔ جس گائے کا دودھ چندروز نہ دوہا جائے اسے مصرات کہتے ہیں۔ (روح المعانی) یعنی ان سب پرندوں کو جمع کر لو کہ یہ کام ایک دم ہو نہ کہ آگے پیچھے ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ...... ثُمَّ مہلت کے لئے ہے۔ اِجْعَلْ کے معنی ہیں رکھ دو یا ڈال دو۔ جبل لغت میں مضبوط گڑی ہوئی میخ کو کہتے ہیں اصطلاح میں ہر مضبوط چیز کو جبل کہہ دیتے ہیں۔ اسی لئے پیدائشی خصلت کو جبلت اور مضبوط جماعت کو جبل کہتے ہیں۔ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْکُمْ جِبِلًّا کَثِیْرًا (یٰسین: ۶۲) (روح البیان) آیت وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْجِبَالِ (طٰہٰ: ۱۰۵) پہاڑ کو بھی اس کی مضبوطی کی وجہ سے جبل کہا جاتا ہے دنیا میں کل چھ ہزار چھ سو تہتر (۶۶۷۳) پہاڑ ہیں۔ یہاں کل جبل سے یا چار پہاڑ مراد ہیں۔ شرقی غربی جنوبی شمالی یا سات یا دس یا اس میدان کے سارے پہاڑ (روح

المعانی) مِنْهُنَّ کا مرجع یا بمعنی جمع ہے۔ جز بمعنی ٹکڑا یعنی اے ابراہیم علیہ السلام تم ان چاروں پرندوں کے ٹکڑے کر کے ان کا قیمہ بال و پر کے ساتھ ملا کر مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ۔ پھر ان مردوں کو بلاؤ کہ اے ٹوٹی ہڈیو اور بکھرے ہوئے گوشت اور کٹی ہوئی رگو! رب کے حکم سے جمع ہو جاؤ۔ تو تمہاری آواز نفخہ صور کا کام دے گی کہ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا۔ وہ پرندے اڑتے ہوئے نہیں دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے۔ سعیًا یا تسعیٰ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ یا بمعنی اسم فاعل حال ہے۔ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے اسے کوئی شے مجبور نہیں کر سکتی حکمت والا ہے کہ اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں۔

خلاصہ تفسیر

ایک دفعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمندر کے کنارے گذرے۔ ملاحظہ فرمایا کہ وہاں ایک مردار پڑا ہے۔ جب سمندر جوش مار کر اس تک پہنچتا ہے تو مچھلیاں اس کا گوشت نوچتی ہیں اور جب سمندر اتر جاتا ہے تو کبھی چرندے جانور اسے کھاتے ہیں اور کبھی پرندے۔ آپ نے خیال فرمایا کہ ایک مردار کتنے پیٹوں میں پہنچا۔ اس کا گوشت پوست قیامت کے دن جمع کیونکر ہوگا اور یہ کس طرح زندہ کیا جائے گا۔ تب بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ مولیٰ مجھے احیاء موتیٰ کی کیفیت دکھا دے۔ رب نے فرمایا۔ کیا تم اس پر ایمان نہ لائے۔ عرض کیا کہ ہاں ایمان تو لایا مگر چاہتا یہ ہوں کہ بجائے خبر کے مشاہدہ کرلوں اور علم یقین سے ترقی کر کے عین الیقین تک پہنچوں اور میرے قلب کو مشاہدہ کا اطمینان اور سکون حاصل ہو جائے۔ تب ارشاد ہوا کہ اچھا تم چار پرندے لو اور انہیں پال پوس کر اپنے سے خوب ہلالو تا کہ تمہیں ان کی خوب پہچان ہو جائے۔ پھر ان سب کو ذبح کر کے معہ ہڈی پر و بال وغیرہ کے ان کا خوب قیمہ کر ڈالو۔ پھر اس کے کئی حصے کر کے کسی پہاڑی میدان میں چند پہاڑوں پر ان کا ایک ایک حصہ رکھ دو اور میدان میں کھڑے ہو کر انہیں آواز دو کہ اے پرندو اللہ کے حکم سے میرے پاس آؤ۔ وہ فوراً زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے آ جائیں گے۔ اور جان رکھو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ چنانچہ آپ نے مور۔ مرغ۔ کبوتر یا گدھ اور کوے کو ذبح کر کے ان کے گوشتوں کا قیمہ کر کے سب کے اجزاء خلط ملط کر کے چار یا سات یا دس پہاڑوں پر ان کا ایک ایک حصہ رکھا اور ان سب کے سر اپنے پاس رکھے پھر پکارا اے چڑیو۔ میرے پاس حکم الٰہی سے آ جاؤ۔ یہ فرماتے ہی وہ اجزاء اڑے اور ہر ہر جانور کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر اپنی ترتیب سے جمع ہوئے۔ یہاں تک کہ خون کا ہر قطرہ دوسرے قطرہ سے ملا اور ہر پر اڑ کر دوسرے پر سے مخلوط ہوا۔ اور ہر ہڈی اڑ کر دوسری ہڈی تک اور ہر پارۂ گوشت دوسرے پارۂ گوشت تک پہنچا۔ یہاں تک کہ فضا میں چاروں جانوروں کے جسم بن کر دوڑتے ہوئے آپ کی طرف آئے اور اپنے سروں سے مل کر پورے پرندے بن گئے۔ سبحان اللہ۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ایمان چونکہ بسیط چیز ہے۔ اس لئے اس میں مقداری زیادتی کمی نہیں ہو سکتی۔ مگر کیفیت کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی ہے کہ دیکھی بات کا یقین سنے ہوئے سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ ہمیں آج بھی قیامت کا یقین ہے اور قیامت دیکھ کر بھی یقین ہی ہوگا مگر اس سے اعلیٰ۔ **دوسرا فائدہ:** یقین کے تین درجے ہیں علم الیقین ... عین الیقین ... ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ۔ حق

الیقین اس چیز میں فنا ہو کر رب فرماتا ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ایمان کے لئے علم الیقین کافی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے حاصل تھا۔ دیکھو ہم کو آج بھی مکہ معظمہ کا یقین ہے مگر سن کر اور جب دور سے وہ شہر دیکھ لیں تو بھی یقین ہوگا مگر اس میں داخل ہو کر سما کر پہلا علم الیقین ہے۔ دوسرا عین الیقین۔ تیسرا حق الیقین۔ جب ہم خود مر کر جئیں گے تو اس کا حق الیقین ہم کو حاصل ہوگا۔ **تیسرا فائدہ:** حضور علیہ السلام سید الانبیاء اور افضل البشر ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے احیاء موتیٰ کا مشاہدہ کیا۔ مگر حضور علیہ السلام نے جنت و دوزخ، حشر و نشر بلکہ رب تعالیٰ کو بچشم سر دیکھا۔ **چوتھا فائدہ:** دعا کی قبولیت دعا مانگنے والے کے درجہ کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ عزیر علیہ السلام نے بھی یہ ہی تمنا کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام نے بھی مگر ان کی دعا ۸۰ برس بعد ظاہر ہوئی اور آپ کی فوراً۔ **پانچواں فائدہ:** زیادتی علم کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے مال کی حرص بری مگر علم کی حرص اچھی ہے۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے وسیع علم کے باوجود ترقی علم کی کوشش کی۔ حضور علیہ السلام کو حکم ہوا۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ (طٰہ: ۱۱۴) کم مال پر قناعت صبر ہے۔ مگر کم علم پر قناعت کرنا غلطی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی ضد پوری فرماتا ہے اور ان کے عرض پر اپنے قوانین بدل دیتا ہے۔ دیکھو مردے زندہ ہونا قیامت میں بذریعہ صور اسرافیل ہوگا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عرض پر ابھی دنیا میں مردے زندہ کر دیئے گئے قانون اور ہے محبوبیت کا اظہار کچھ اور۔ **ساتواں فائدہ:** اگر حضرت خلیل اللہ کی دعا سے مردے زندہ ہو سکتے ہیں تو حضور محمد رسول اللہ ﷺ کی نگاہ کرم سے مردہ دل بھی زندہ ہو سکتے ہیں۔ شعر۔

تو جو چاہے تو ابھی میل میرے دل کے دھلیں

کہ خدا دل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا

کیوں نہ ہو کہ یہ حضرات رب کی مانتے ہیں تو رب بھی ان کی مانتا ہے۔

آٹھواں فائدہ: ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کا شک نہ تھا بلکہ کامل ایمان سے اکمل کی طرف ترقی کرنے کا شوق' اس لئے رب نے ان سے اس کا اقرار کرا لیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرٰهِيْمَ۔ یعنی بمقابلہ ابراہیم کے ہم زیادہ شک کے مستحق ہیں۔ اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ انہیں شک نہیں تھا۔ اگر انہیں ہوتا تو ہمیں بدرجہ اولیٰ ہوتا مگر ہمیں تو ہے نہیں تو انہیں بھی نہیں۔ **نواں فائدہ:** علم استدلالی سے علم معائنہ افضل ہے کہ دلیل میں ضعف اور معائنہ میں قوت ہے۔ اسی لئے علماء ظاہری سے صوفیاء کرام اعلیٰ ہیں۔ **دسواں فائدہ:** اگرچہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے مگر وسیلہ و واسطہ سے۔ دیکھو ان پرندوں کو رب نے زندہ کیا مگر حضرت ابراہیم کی آواز کے وسیلہ سے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کو شفا دی مگر ان کے قدم سے پیدا شدہ پانی کے ذریعہ سے تاکہ کوئی شخص اپنے کو نبی سے مستغنی نہ جانے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مسلمانوں کا خدا' دیا بھان متی کا تماشا کرتا ہے۔ کیا ایسی ہی باتوں سے خدا کی خدائی ظاہر ہوتی ہے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** نہ معلوم پنڈت دیانند کی وہ کون سی بھان متی تھی اور کہاں رہتی تھی جو مردے زندہ کرتی ہو۔ اگر قدرت کا اظہار بھان متی کا تماشا ہے اگر ... ماں کے پیٹ میں بچہ بنانا، چاند سورج کا طلوع و غروب۔ جانداروں کا بے جان

کرنا۔ سب تماشا ہی ہو جاوے۔ شاید پنڈت جی کے دھرم میں دنیا کے یہ سارے کام ایشور نہ کرتا ہوگا۔ کوئی بازی گر کر رہا ہو گا۔ پنڈت جی قدرت کے نظارے رب کے دلائل ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ ابراہیم علیہ السلام سے افضل ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میرے سامنے پردہ اٹھا دیا جائے تو میرے یقین میں کوئی زیادتی نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ وہ بغیر دیکھے کامل یقین پر ہیں۔ (روافض) **جواب:** ہر چیز کا کمال کمال والے کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ نبی کا کمال یقین کچھ اور ہے اور ولی کا کچھ اور ولایت کا کامل یقین نبوت کے اصلی یقین سے بھی ضعیف ہے سیدنا علی کو ولایت کا کمال یقین حاصل تھا۔ جس سے ابراہیم علیہ السلام کا نفس یقین کہیں اعلیٰ ہے۔ آپ نے اپنے لحاظ سے کمال یقین کی درخواست کی۔ انبیاء کی بشریت دوسروں کی بشریت سے تو کیا فرشتوں کی ملکیت سے بھی افضل ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم کو بھی سہو ہوتا ہے۔ صدیق اکبر نے سن کر عرض کی يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ سَهْوَ مُحَمَّدٍ (روح المعانی) وہ سمجھتے تھے کہ حضور کا سہو تمام کی یاد سے افضل ہے۔ ان کی نیند شریف ہماری بیداری سے ان کا دنیوی کاروبار فرمانا ہمارے ساری عمر کے سجدوں سے افضل۔ **تیسرا اعتراض:** حضرت شیخ اکبر ابن عربی اور حضور غوث پاک نے فرمایا کہ اے گروہ انبیاء ہم میں اور تم میں فرق صرف نام کا ہے ورنہ ہمیں وہ چیزیں ملی جو تمہیں نہ ملیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ امت مصطفیٰ ﷺ کے ولی دیگر انبیاء سے افضل ہیں؟ **جواب:** حضور سرکار بغداد پر یہ اتہام ہے۔ ہاں شیخ اکبر کی طرف اس قول کی نسبت ضرور ہے مگر وہ دوسرے مقام پر یہ بھی فرماتے ہیں کہ مجھے دور سے مقامِ نبوت کی تجلی سوئی کے ناکہ کے برابر دکھائی گئی۔ تو قریب تھا کہ میں جل جاتا۔ اس میں اپنے عجز و ضعف اور انبیائے کرام کی قوت کا پورا اقرار ہے۔ اگر انہوں نے پہلی بات فرمائی بھی ہو تو وہ حقیقت محمدیہ اور ذات احمدیہ میں فنا ہونے کی حالت میں ہے جبکہ ان کی زبان اس کی زبان تھی۔ اور ان کا کلام اس کا کلام ہے۔ جیسے فنافی اللہ کو۔ حضرت منصور نے کہہ دیا تھا اَنَا الْحَقُّ۔ **چوتھا اعتراض:** رب نے اظہارِ قدرت کے لئے پرندے کیوں مقرر فرمائے؟ **جواب:** اس لئے کہ پرندہ انسان سے قریب تر ہے اور اس میں خصوصیات انسانی زیادہ ہیں اور بعض اعضاء میں انسان سے بڑھ کر نیز پرندے ہوا میں اڑتے ہیں اور اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی ہمت بھی ملک سے ملکوت تک تھی۔ تو یہ معجزہ ان کی ہمت کے مشابہ دکھایا گیا نیز اس کے ذبح کرنے قیمہ وغیرہ کرنے میں آسانی بھی تھی۔ **پانچواں اعتراض:** لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اب تک قیامت میں اٹھنے پر اطمینان دلی نہ تھا۔ اس میں کچھ تردد و شک شبہ تھا پھر وہ مومن کیونکر ہوئے۔ ایمان میں تو ایسے یقین کی ضرورت ہے کہ نہ تو فی الحال تردد ہو اور نہ آئندہ شک و شبہ پیدا ہو سکے۔ فی الحال تردد ہو تو ظن ہے اور آئندہ تردد ہو سکے تو تقلید کہلاتا ہے۔ نہ کہ یقین ایمان یقین کا نام ہے؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جو اطمینان ایمان کیلئے ضروری ہے وہ تو آپ کو حاصل تھا۔ یعنی علم الیقین اور جس اطمینان کی خواہش کی وہ کمال ایمان کے لئے ضروری ہے یعنی عین الیقین غرضکہ کمال ایمان اَور نفس ایمان کچھ اَور۔ دوسرے یہ کہ یہاں اطمینان سے مراد وہ عینی گواہ بننا ہے جس کے بعد گواہی عین دی جا سکے۔ آپ کا خیال تھا کہ جیسے میں نے نمرود سے رب کی قدرت کا ذکر کیا۔ وہ نہ سمجھا اس نے مارنے جلانے کے معنی کچھ اور ہی لئے۔ اگر میں کہتا کہ رب تعالیٰ مردوں میں جان ڈال کر اسے زندہ کرتا ہے تو وہ پوچھ سکتا تھا۔ کیا

آپ نے ایسا ہوتے دیکھا ہے تو نہ ہی اس کا دعویٰ یا گواہی کر سکتا تھا۔ اب میں اپنی آنکھوں سے مردہ جیتے دیکھوں تا کہ موقعہ پر عینی گواہی دے سکوں۔ اپنے علم کے لئے اطمینان اور ہے۔ دوسرا سامنے گواہی دینے کے لئے اطمینان کچھ اور۔

تفسیر صوفیانہ

جہالت قلب کی موت اور علم اس کی زندگی ہے۔ جسم گویا قفس ہے جس میں چار غیبی پرندے قید ہیں۔ عقل۔ قلب۔ نفس اور روح فرمایا جا رہا ہے کہ حیات چاہنے والے کو چاہیے کہ باب ملکوت پر عقل کو محبت کی چھری سے ذبح کرے اور جبروت کے دروازہ پر قلب کو شوق کی چھری سے میدان فردیت میں نفس کو عشق کی چھری سے اور بارگاہ ربانی میں روح کو عجز کی چھری سے ذبح کر ڈالے اور سب کے چار حصے کرے۔ پھر عقل کو عظمت کے پہاڑ پر اور قلب کو کبریائی کے پہاڑ پر اور نفس کو کوہ عزت پر اور روح کو جبل جمال پر رکھے تا کہ عقل پر ربوبیت کے انوار چھا جائیں اور قلب قدسی صفات سے موصوف ہو جائے اور نفس نور عظمت سے منور ہو جائے اور روح نور الانوار اور سر الاسرار بن جائے۔ پھر ان کو سرِ عشق کی آواز سے پکارو تا کہ وہ تم تک جمالِ احدیت سے محض عبدیت تک دوڑتے ہوئے آئیں۔ (روح المعانی)

دوسری تفسیر

ان چار پرندوں میں چار عیوب ہیں اور یہ چاروں نفس میں موجود۔ مور میں زینت۔ کوے میں امید۔ مرغ میں شہوت اور گدھ میں حرص۔ جب تک کہ ان چاروں عیوب کو مجاہدہ کی تلوار سے ذبح نہ کیا جائے گا قلب کو حیاتِ مشاہدہ نہ ملے گی۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

حرص بط یکتا ست ایں پنجاہ تاست	حرص شہوت مارو منصب اژدہا ست
صد خورندہ گنجد اندر گرد خواں	دو ریاست درنہ گنجد در جہاں
کاغ کاغ و نعرۂ زاغ سیاہ	دائما باشد بدنیا عمر خواہ
ہمچو ابلیس از خدائے پاک فرد	تا قیامت عمر تن درخواست کرد
عمر و مرگ ایں ہر دو با حق خوش بود	بے خدا آب حیات آتش بود
عمر خوش در قرب جاں پرور دن است	عمر زاغ از بہر سرگیں خوردن است

تیسری تفسیر

چار پرندے نفس کے چار عیب ہیں جو چار عناصر سے پیدا ہوئے۔ ہر دو عنصروں کے ملنے سے دو عیب، مٹی اور پانی سے حرص و بخل، آگ اور ہوا سے غضب اور شہوت۔ پھر ان عیوب سے صدہا دوسرے عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ حرص حسد کی زوجہ ہے۔ بخل کینہ کی اور غصہ تکبر کی زوجہ شہوت ان سب کی ساتھی۔ ان جوروؤں کے ملنے سے جس قدر ان کی ذریت پیدا ہوتی ہے وہ شمار سے باہر ہے۔ حضرت خلیل کو حکم دیا گیا کہ صدق کی تلوار سے ان عیوب کی جڑوں کو کاٹو کہ ان کے آثار تک مٹا دو۔ پھر انہیں چار پہاڑوں پر رکھو جو کہ انسان کے چار نفوس ہیں۔ نفس نامیہ۔ نفس امارہ۔ قوت شیطانیہ اور قوت ملکیہ۔ جب ان پر شریعت کا پانی پڑے گا اور انہیں طریقت کی [illegible] لگے گی تو ان سے اعمال کی [illegible] پیدا ہونگی جن سے ثواب کے پھل

کھائے جائیں گے۔ خیال رہے کہ عمدہ بیج جب پاک مٹی اور گندھے کھاد سے ملتا ہے اور اس پر کسان کامل محنت کرتا ہے تب اس سے اچھے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے ہی جب شیخ اپنے مرید کے ان چار عیوب کو چار قوتوں کے ساتھ مخلوط کرے گا تو اس سے اچھے پھل پیدا ہوں گے اور روح کو حیات ابدی حاصل ہوگی (روح البیان) صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہمارے عقل۔ دل۔ دماغ۔ روح وہ پرندے ہیں جو دنیا میں آکر گویا مردے ہو گئے اور دنیا سے ایسے خلط ملط ہو گئے کہ ممتاز نہ رہے اب ان کی زندگی کسی ایسے کامل مرشد کی نگاہ کرم سے ہو سکتی ہے جس کی آواز صور اسرافیل کا کام دے۔ یہ چار پرندے ہمارے اندر موجود ہیں اور آواز خلیل بھی آپ ہی ہیں۔ انہیں زندگی بخش دی ہے۔ تاقیامت یہ سلسلہ قائم رہے گا۔ یا ہماری عبادات پر چار چیزیں ہیں۔ فرائض۔ واجبات۔ سنتیں۔ مستحبات۔ یہ چار چیزیں اگر آواز پیغمبر اور ہدایت نبی سے خالی ہیں تو مردہ ہیں۔ اگر ادھر سے فیضان آجاوے تو زندہ ہو جاویں۔ شعر۔

گر بہ اداء نماز تو نہ شوی بے نقاب ہست رکوعم حجاب ہست سجودم حجاب

ضروری نوٹ: قادیانی اور مولوی ثناء اللہ امرتسری' ابراہیم علیہ السلام کے اس معجزے کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان پرندوں کو ذبح نہ کیا گیا تھا۔ جزءٌ سے ان کے گوشت کے اجزاء مراد نہیں۔ بلکہ چار کا ایک جز ہے وہ ہی یہاں مراد۔ جیسے رب فرماتا ہے لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ۔ جہنم میں انسانوں کے گوشت نہ جائیں گے بلکہ خود انسان۔ مولوی ثناء اللہ پر غیر مقلدوں نے اسی وجہ سے الحاد اور بے دین کا فتویٰ دیا۔ دیکھو غزنوی پارٹی کی کتاب الاربعین فی ان ثناء اللہ من المحدثین اور جب ان کی تفسیر ثنائی ابن سعود والیء حجاز کی نظر سے گزری۔ تو سنا گیا ہے کہ اس نے بھی انہیں توبہ کا حکم دیا وہ کہتے ہیں کہ مردہ پرندوں کو پکارنے کے کیا معنی۔ زندہ کو ہی پکارا جاتا ہے مگر سمجھ نہیں آتا کہ اس معجزے کے انکار کی کیا وجہ ہے۔ مفسرین' محدثین' تابعین' صحابہ کرام بلکہ خود نبی کریم ﷺ نے اس کی تفسیر یہ ہی فرمائی۔ ابن جریر ابن ابی حاتم عبد حمید و بیہقی ابن منذر وغیرہم نے عبد اللہ ابن عباس سے یہ ہی روایت فرمائی۔ کہ انہوں نے ذبح فرما کر گوشت کا قیمہ چار پہاڑوں پر رکھا تھا۔ دیکھو تفسیر درمنثور و کبیر۔ نیز اگر زندہ پرندے اڑا کر کھائے گئے تو ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا جواب کیسے بنا۔ وہ تو احیاء موتیٰ دیکھنا چاہتے تھے۔ نیز پلے ہوئے جانوروں کو دن رات پکارا ہی کرتے ہیں۔ پھر انہیں پہاڑوں پر بٹھا کر کیوں بلوایا گیا ہے۔ خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا مردہ پرندوں کو پکارنا تکوینی تھا۔ جیسے رب تعالیٰ کا کن فرمانا اگرچہ ہر ایک چار کا جز ہے۔ مگر جب کے معنی صحابہ کرام سے وہ منقول ہیں جو ہم نے بیان کئے تو فقط رائے سے تفسیر کرنا کیونکر جائز ہوگا۔ تفسیر میں نقل چاہیے۔ محض قیاس کا اعتبار نہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ

مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں مال اپنے بیج راستے اللہ کے مثل اس دانہ کے ہے جس نے اگائیں سات

ان کی کہاوت جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانا کی طرح جس نے اگائیں سات

سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ

بالیں بیچ ہر بالی کے سو دانہ ہیں اور اللہ بڑھاتا ہے واسطے جس کے چاہے

بالیں ہر بال میں سو دانہ اور اللہ اس سے بھی زیادہ بڑھائے جس کے لئے چاہے
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾
اور اللہ وسعت والا علم والا ہے
اور اللہ وسعت والا علم والا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس آیت میں بے جان انسان کو زندہ کر کے اور دوسری آیت میں مردہ پرندوں کو جان بخش کر اپنی قدرت اور قیامت کے آنے کا ثبوت دیا گیا۔ اب خشک دانہ کو پودہ بنانے اس سے صدہا دانے پیدا فرمانے سے اسی قیامت اور قدرت کا ثبوت ہے۔ کہ جو مدفون دانہ کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔ وہ مدفون مردوں کو اٹھانے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا کہ رب نے حضرت عزیر کی جان لے کر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پرندوں کو مردہ کر کے انہیں جان اور کمال ایمان عطا فرمایا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ جو راہ الٰہی میں مال فنا کرے گا۔ اسے بھی بہتر بدلہ عطا فرمایا جائے گا۔ گویا پہلے جانی قربانی اور اس کی جزا کا ذکر تھا۔ اور اب مالی قربانی اور اس کے بدلے کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ جو خدا کو قرض حسن دے گا رب اس کا بدلہ بہت زیادہ عطا فرمائے گا۔ اب کچھ فاصلہ کے بعد اس بہت زیادہ کی تفسیر فرمائی جا رہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عقائد کی اصطلاح کی گئی تھی کہ لوگ ان واقعات کو سن کر قیامت کے قائل ہوں۔ اب نیک اعمال کا ذکر ہے۔ گویا عقائد کے بعد اعمال کا ذکر ہوا۔

تفسیر

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ مَثَل بمعنی مثال اور مثل بمعنی مشہور مثال یعنی کہاوت یا تو یہاں کے مثل کے بعد صدقات پوشیدہ ہے۔ یا کمثل کے بعد باذر پوشیدہ یعنی مَثَلُ صَدَقَاتِ الَّذِيْنَ كَمَثَلِ حَبَّةٍ یا مَثَلُ الَّذِيْنَ كَمَثَلِ بَاذِرِ حَبَّةٍ۔ دنیا میں اشجار عموماً تین قسم کے ہیں۔ باردار۔ خاردار۔ بیکار باردار وہ تو اپنے سایہ میں پھل۔ پھول سے مخلوق کو نفع دیتے ہیں تو مخلوق انہیں لگاتی ہے۔ ان کی خدمت کرتی ہے۔ انہیں پانی دیتے ہیں۔ حکومت ان کے لئے محکمے بناتی ہے۔ بیکار درخت برابر کاٹے اور جلائے جاتے ہیں۔ جیسے ببول کے درخت مگر درخت خاردار کا ہر شخص دشمن ہے جہاں دیکھا اسے کاٹا پھینکا ایسے ہی اسرار تین طرح کے ہیں۔ باردار جو رحمانی جگہ مال خرچ کریں اور بیکار جیسے وہ جو مال جمع کر گئے اور مر گئے۔ اور خاردار جن کا مال شہوات نفسانی اور لوگوں کے ستانے میں خرچ ہو۔ عثمان غنی باردار تھے اور ابوجہل۔ ابولہب وغیرہ خاردار۔ اس آیت میں باردار مال داروں کی کہاوت بیان فرمائی گئی۔ يُنْفِقُوْنَ۔ سے ہر خرچ اور اَمْوَال۔ سے ہر قسم کا مال اور سبیل اللہ سے ہر مصرف خیر مراد ہے۔ یعنی ان لوگوں کے صدق کی مثال جو اپنے کسی قسم کے مال کو کسی طرح اور کسی کار خیر میں خرچ کریں۔ جیسے دانہ بوریوں میں بند رکھنے سے یا گل سڑ جاتا ہے یا چوہوں کیڑوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ مگر کھیت میں بکھیرنے سے دوگنا چوگنا ہو

جاتا ہے یا کنوئیں کا پانی روکے رکھنے سے بگڑ جاتا ہے۔ کیاریوں میں پھیلانے سے سب کو سیراب کر دیتا ہے۔ ایسے ہی مال روک رکھنے سے برباد ہوتا ہے۔ راہ مولیٰ میں ہر طرف خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ دنیا کی چیز متحرک ہے۔ تو مال کو بھی متحرک رکھو۔ بقا آخرت کے لئے ہے۔ اچھی جگہ بخوشی خرچ کرو۔ ورنہ بری جگہ خرچ ہو جائے گا۔ یا تمہارے بغیر اجازت نکل جاوے گا۔ حاکم وکیل کھا جائیں گے۔ یُنۡفِقُوۡنَ مضارع میں بنایا گیا۔ صرف ایک بار ہی خرچ پر بس نہ کریں بلکہ ہمیشہ خرچ کرتے رہیں۔ احوال فرمایا۔ بتایا کہ کھانا۔ لباس زمین ہر قسم کی خیرات کرو ہر جگہ خرچ کرو کَمَثَلِ حَبَّةٍ یہ مثل الذین کی خبر ہے۔ کاف تشبیہ کا اور مثل بمعنی کہاوت ہے۔ نہ کاف زائدہ ہے نہ مثل کیونکہ کاف بمعنی مثل ہے اور مثل بمعنی کہاوت۔ خیال رہے کہ حبۃ حبٌ کا واحد ہے۔ بمعنی بیج عربی میں حبۃٌ بفتح ح غلہ وغیرہ کے بیج کو بولتے ہیں۔ جس کا پھل عرصہ تک باقی رہے۔ اور حِبہ بکسر ح ترکاریوں کے بیج کو (روح المعانی) اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ انبات بمعنی اخراج ہے۔ اصطلاح میں زمین سے نکالنے یعنی اگانے کو انبات کہا جاتا ہے۔ اسی لئے گھاس کو نبات کہتے ہیں۔ سنابل جمع سنبلہ کی ہے یا تو اس کا نون زائد ہے اور اس کا مادہ سبل کہا جاتا ہے۔ اَسۡبَلَ الزَّرۡعُ۔ کھیتی بالی والی ہو گئی بعض نے فرمایا کہ بروزن فعلۃٌ ہے۔ لہٰذا اس کا نون اصلی ہے۔ انبات کو دانہ کی طرف نسبت دینا مجازاً ہے کہ وہ ذریعہ پیداوار ہے۔ حقیقتاً اگانے والا رب تعالیٰ ہے۔ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ یہ سَبۡعَ سنابل کا بیان ہے۔ اگرچہ اکثر درختوں میں سات بالیاں اور اکثر بالوں میں سو دانے نہیں ہوتے مگر جوار یا باجرہ جب اچھی زمین میں بو دیا جائے تو ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنۡ يَّشَآءُ۔ یہ علیحدہ جملہ ہے۔ یُضۡعِفُ ضِعۡفٌ سے بنا بمعنی زیادتی۔ یہاں علیہ پوشیدہ ہے یعنی اللہ جس کے لئے چاہے اس سے بھی زیادتی فرمادے۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ۔ وَاسِعٌ وسع بمعنی گنجائش سے بنا ہے۔ یہ ضیق کا مقابل ہے اور یہ جملہ گویا گذشتہ کلام کی دلیل ہے۔ جو لوگ کسی کار خیر میں اپنا کسی قسم کا مال کسی طرح خرچ کریں۔ خواہ زکوٰۃ فطرہ ادا کریں یا مسجدیں اور مدرسے بنائیں یا شفا خانے اور مسافر خانے تیار کریں یا اہل قرابت کے ساتھ سلوک کریں یا مساکین اور فقراء کو صدقہ نفلی دیں یا طلبہ کو کتابیں خرید دیں وغیرہ وغیرہ ان کے صدقات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ زمین میں بو دیا جائے جس سے سات شاخیں پھوٹیں۔ ہر شاخ میں ایک ایک بال ہو۔ اور ہر بال میں سو سو دانے کل سات سو دانہ جیسے دنیا میں ایک دانہ سے سات سو دانے حاصل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی آخرت میں ایک صدقہ سے سات سو حاصل ہوں گے۔ اسی پر ہی بس نہیں بلکہ رب تعالیٰ جس کو چاہے بقدر اخلاص و مشقت اور زیادہ بھی عطا فرما دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا جو جہاد میں روپیہ بھیج دے تو اسے ہر درم کے عوض سات سو ملیں گے۔ اور جو خود میدان جنگ میں جا کر خرچ کرے۔ اس کے لئے ہر درم کے عوض سات لاکھ دوسری روایت میں ہے کہ خرچ کرنے والے نمازیوں کے لئے اللہ نے رحمت کے اتنے خزانے رکھے ہیں جو انسان کے علم میں نہیں آ سکتے (روح المعانی) عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حج اور جہاد کے خرچہ کا یکساں ثواب ہے یعنی ایک کا سات لاکھ (درمنثور) بلکہ بعض روایات میں ہے کہ صدقہ دنیوی مصیبتوں اور فتنہ قبر اور عذاب قیامت کو دور کرتا ہے اور سخاوت ایسا درخت ہے جس کی جڑ جنت میں اور شاخیں دنیا میں لٹکی ہوئی ہیں جو کوئی اس کی کسی شاخ کو پکڑے گا وہ جنت تک پہنچ جائے گا اور بخل ایسا درخت ہے جس کی جڑ جہنم میں اور شاخیں دنیا میں ہیں جو اس کی ایک شاخ پکڑے گا جہنم میں جائے گا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** میت کا تیجہ' دسواں چالیسواں ثواب ہے کیونکہ وہ بھی اللہ کی راہ میں خیرات ہے اور ہر خیرات پر سات سو کا وعدہ۔ اسے حرام کہنا اپنی طرف سے قید لگانا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** اسناد مجازی جائز ہے۔ دیکھو یہاں فرمایا گیا کہ دانہ سات بالیاں اگاتا ہے حالانکہ حقیقتاً اگانے والا رب تعالیٰ ہے۔ لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ مال' اولاد' عزت و آبرو عطا فرماتے ہیں کہا جاتا ہے کہ دوا دافع بخار ہے۔ ماں باپ پالنے والے' علماء برائی سے بچانیوالے' بادشاہ و حکام حاجت روائی کرنیوالے ہیں۔ ان سب میں اسناد مجازی ہے۔ **تیسرا فائدہ:** رب کی عطا مختلف ہے۔ ایک ہی فعل پر مختلف لوگوں کو چند طرح جزائیں عطا فرماتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مسلمانوں کا خدا طرفدار معلوم ہوتا ہے کہ بعض کو صدقہ کا ثواب سات سو گنا اور بعض کو اس سے زیادہ دیتا ہے چاہیے کہ سب کی جزا یکساں ہو (آریہ) **جواب:** پنڈت جی جزا کا گھٹنا بڑھنا بندے کی طرف سے ہے۔ مخلص کو ثواب زیادہ اور لالچی کو کم ثواب ملتا ہے۔ اچھی زمین کا دانہ زائد پھل دیتا ہے اور خراب زمین کا کم۔ **دوسرا اعتراض:** یہاں اموال فرمانے سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کا سارا مال راہ خدا میں خرچ کر دینا چاہیے تو پھر اپنے واسطے کیا رکھے۔ نیز دوسری آیتوں میں من تَبۡعِیۡضِیۡہ۔ داخل ہے جیسے **مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ**۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ بعض مال خیرات کرنا چاہیے۔ آیات میں تعارض ہے۔ **جواب:** من والی آیتیں اس آیت کی تفسیر ہیں انہوں نے بتایا کہ یہاں بھی بعض مال کی خیرات ہی مراد ہے۔ اموال مطلقاً مال ہی کل ہوں یا بعض اگر جمع اموالہم ہو تو تعارض تھا یا کہو کہ یہاں سبیل اللہ سے مراد ہر کار خیر ہے۔ لہٰذا بہ نیت اداء سنت اپنا کھانا پینا اولاد کی پرورش' بلکہ بعد موت ترکہ چھوڑنا بھی سبیل اللہ میں خرچ ہے جن پر ثواب ہے۔ لہٰذا ساری ضروریات میں سارا مال خرچ کرے۔

تفسیر صوفیانہ

جیسے پیداوار کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں۔ قابل کسان' اچھا بیج' طاقتور زمین اور وقت پر بونا۔ ایسے ہی صدقہ کے لئے چار چیزیں لازم ہیں۔ خیرات کرنے والا صالح' مال حلال' مصرف بہتر اور وقت مناسب' زندگی کا صدقہ' مرتے وقت کی خیرات سے افضل ہے کہ مرنے والا وقت نکال کر صدقہ کر رہا ہے۔ ایسے ہی حلال مال کے صدقے کا ثواب زیادہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو کوئی حلال مال سے کھجور کا ٹکڑا بھی خیرات کرے تو رب تعالیٰ اسے ایسے پرورش فرماتا ہے جیسے گھوڑے والا اپنے گھوڑی کے بچہ کو۔ اس کے مرتے وقت یہ صدقہ پہاڑ بن جاتا ہے۔ جیسے دنیا میں راستہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو آگے سے بند ہو جسے گلی بند کہتے ہیں دوسرا جو آگے سے کھلا ہو مگر کسی باغ وغیرہ میں پہنچائے۔ تیسرا وہ جو کسی خراب جگہ پہنچائے مقصد کے اعتبار سے راستہ کے نام آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کچہری روڈ' ریلوے روڈ وغیرہ ایسے آخرت کے لحاظ سے راستے مختلف قسم کے ہیں۔ نفس کے لئے جو خرچ کیا وہ آگے سے بند ہے کہ مرتے ہی ختم ہو جاتا ہے جو شیطان کے لئے خرچ ہو وہ دوزخ کا راستہ ہے۔ یعنی دوزخ میں پہنچاتا ہے جو اللہ کے لئے خرچ ہو وہ رضاء رحمٰن تک پہنچ جاتا ہے۔ بہشت

روڈ ہے۔ مسلمانوں کو بہشت روڈ پر چلنا چاہیئے کام رضاء الٰہی کے لئے کرنا چاہیے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ صدقہ کے چند درجے ہیں۔ عوام کی خیرات مال ہے اور اس کی جزا جنت۔ اور خواص کی خیرات اصلاح حال ہے اور صفائی نفس۔ اس کی جزاء رضاء رب مومن کو چاہیے کہ اپنے حال کی اصلاح کرے (روح البیان) صوفیاء فرماتے ہیں کہ صدقات کے ثواب میں زیادتی کمی چند وجہ سے ہوتی ہے اخلاص کا فرق۔ زمان کا فرق۔ زمین کا فرق۔ فقیر کا فرق۔ مقام خیرات کا فرق۔ جس قدر اخلاص زیادہ اسی قدر ثواب زیادہ صحابہ کرام کے سوا سیر جو ہمارے پہاڑ بھر سونے کی خیرات سے کیوں افضل ہے۔ اس لئے کہ ان کا سا اخلاص ہم کو کیسے میسر ہو۔ ماہ رمضان۔ جمعہ شب قدر کا صدقہ بہت ثواب کا باعث ہے دوسرے زمانہ کے صدقات کا وہ ثواب نہیں مکہ معظمہ مدینہ منورہ کے صدقات کا ثواب ایک کا ایک لاکھ یا پچاس ہزار ہے۔ اور زمین میں یہ نہیں عالم فقیر اور زیادہ حاجتمند پر صدقہ دوسروں پر صدقہ سے زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ جیسے دانہ کی پیداوار زمین و زمان کے فرق سے مختلف ہوتی ہے۔ غرضکہ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ بالکل حق و درست ہے صدقہ مقبول کی توفیق بھی وہ ہی دیتا ہے۔ صدقہ کا یہ ثواب جو بیان ہوا اس کے ملنے کی جگہ آخرت ہے۔ اگر دنیا میں رب تعالیٰ سخی کو کچھ برکت دیدے تو اس کا کرم ہے مگر یہ بدلہ نہیں بدلہ تو قیامت میں ملے گا۔ لہٰذا کوئی شخص آج خیرات دے کر کل ہی سات سو کا مطالبہ نہ کرے۔ کھیت بونے کا وقت اور ہے کاٹنے کا وقت اور۔ دوسرا آج بو کر آج ہی کاٹنے کی کوشش نہ کرو صدقہ کا ایک فائدہ تو یہاں بیان ہوا اور دوسرے فائدے دیگر آیات اور احادیث میں مذکور ہیں۔ صدقہ کی برکت سے مصیبت ٹل جاتی ہے۔ صدقہ کی برکت سے ایمان پر خاتمہ نصیب ہوتا ہے۔ صدقہ کی برکت سے گناہوں کی معافی ہوتی ہے۔ صدقہ کی برکت سے غضب الٰہی کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ ایک رنڈی مرتے ہوئے کتے کو پانی پلانے سے بخش دی گئی۔ غرضکہ صدقہ کے بہت فوائد ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں مالوں کو اپنے بیچ راستہ اللہ کے پھر نہیں پیچھے کرتے ہیں اس کے جو خرچ کیا احسان کو

وہ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر دیئے پیچھے نہ احسان رکھیں

وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

اور نہ ایذا کو واسطے ان کے ثواب ہے ان کا نزدیک رب ان کے اور نہیں ہے ڈر اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین

نہ تکلیف دیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم

يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ط

ہوں گے بات بھلی اور بخشش اچھی ہے اس صدقہ سے کہ پیچھے ہو اس کے ایذا

اچھی بات کہنا اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے
اور اللہ بے پرواہ حلم والا ہے

تعلق

اس آیت کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح سے ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ کے ثواب کا ذکر تھا اور اب اس کی کیفیت کا تذکرہ ہے کہ صدقہ کیسا ہونا چاہیے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ مقبول کے فضائل بیان ہوئے۔ اب شرائط قبول کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ صدقات کا ثواب یکساں نہیں۔ بعض کا سات سو گنا اور بعض کا اس سے بھی زیادہ اب گویا ان کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ صدقہ کرنے والوں کا حال یکساں نہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ مقبول کے بدلہ کا ذکر تھا۔ اب اس کے دیگر فوائد کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ مقبول دینے کا ذکر تھا جو فی سبیل اللہ ہو اب دیئے ہوئے صدقہ کو سنبھالنے کا ذکر ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ ہو جس سے صدقہ باطل ہو جائے۔ کمانا ایک کمال ہے اور کمائی کا سنبھالنا اس سے بڑا کمال ہے۔

شان نزول

یہ آیت حضرت عثمان ابن عفان اور عبدالرحمٰن ابن عوف کے بارے میں اُتری عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تبوک کے موقعہ پر ایک ہزار اونٹ معہ ساز و سامان کے پیش کئے۔ اس کے علاوہ اعلان فرمایا۔ کہ جس غازی کے پاس سامان نہ ہو، میں دوں گا۔ مدینہ منورہ میں میٹھے پانی کی کمی تھی تو آپ نے بیر رومہ خرید کر وقف فرما دیا۔ حضور علیہ السلام نے رات بھر ان کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعائیں فرمائیں کہ مولیٰ میں عثمان بن عفان سے راضی ہوا۔ تو بھی راضی ہو جا۔ جب دعا کرتے کرتے سویرا ہو گیا۔ تب یہ آیت اُتری۔ عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس آٹھ ہزار درہم تھے۔ آپ چار ہزار تو گھر رکھ آئے۔ اور چار ہزار لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کرنے لگے کہ یا حبیب اللہ چار ہزار بچوں کے لئے چھوڑے ہیں اور چار ہزار رب کو قرض دیتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تمہارے خرچ کئے اور رکھے ہوئے مال میں برکت دے۔ تب یہ آیت اُتری۔ (خزائن العرفان، روح المعانی و کبیر) بعض روایات میں اس کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر ایک بار کھانا نہ تھا۔ آپ نے مجبوراً فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی قمیص چھ درم میں فروخت کی۔ درہم لے کر آ ہی رہے تھے کہ کوئی سائل مل گیا۔ سب درم اسے عطا فرما دیئے۔ آگے بڑھے کہ ایک شخص آپ کو اونٹنی بیچتا ہوا ملا۔ آپ نے اس سے قرض خرید لی۔ لے کر چلے ہی تھی کہ خریدار مل گیا۔ جس نے بہت نفع سے خرید لی۔ آپ نے چاہا کہ قرض خواہ کا قرض ادا کر دیں۔ بازار میں بہت تلاش کیا۔ نہ پایا تب آ کر یہ واقعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ فرمایا کہ سائل رضوان (مالک جنت) تھے اور بائع میکائیل اور خریدار حضرت جبرائیل۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری۔ (روح البیان) ہو سکتا ہے کہ یہ تینوں واقعات بیک وقت ہوئے ہوں۔ تب یہ آیت آئی ہو۔

تفسیر

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اس کی تفسیر پچھلی آیت میں گزر چکی کہ اَلَّذِیْنَ سے مراد مسلمان ہیں اور یُنْفِقُوْنَ

سے ہر نفلی و ہر فرضی صدقہ مراد۔ اور اموال سے ہر قسم کا ادنیٰ و اعلیٰ مال، اور سبیل اللہ سے ہر مصرف خیر مراد ہے۔ یعنی جو لوگ کہ اپنے مال حسبِ موقعہ اللہ کی راہ میں صدقہ و خیرات کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ خرچ سات قسم کے ہیں۔ خرچ فرض جیسے زکوٰۃ نذر اور اہل حقوق کے مالی حق پورے کرنا قرض۔ نفقہ وغیرہ۔ خرچ واجب جیسے فطرہ و قربانی۔ خرچ سنت جیسے مسجدیں بنانا۔ کنوئیں سرائیں تیار کرانا۔ خرچ مباح جیسے عام دنیاوی ضروریات میں خرچ۔ خرچ مکروہ تنزیہی خرچ مکروہ تحریمی، خرچ حرام جیسے اسراف تبذیر اور محرمات میں خرچ کھیل تماشا وغیرہ میں مال برباد کرنا۔ پہلی قسم کے خرچ انفاق فی سبیل اللہ ہیں ان کی مکمل تفسیر حضور ﷺ اور صحابہ کرام کے وہ تمام خرچ ہیں جو ان سے منقول ہیں۔ اس ایک لفظ فی سبیل اللہ میں ان تمام کی طرف اشارہ ہے۔ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا ثم ترتیب رتبی یا زمانی کیلئے ہے کیونکہ احسان نہ جتانے کا درجہ خیرات سے بہت اعلیٰ ہے۔ اسی لئے یہاں ثم لایا گیا۔ اور چونکہ خیرات کے بعد بہت وقت ملتا ہے اور بار ہا فقیر سے ملاقات ہوتی ہے۔ اسلئے ثم لایا گیا یعنی خیرات کے بعد عمر میں کبھی بھی احسان نہ جتائیں۔ يُتْبِعُوْنَ، تبعٌ سے بنا بمعنی پیچھے ہونا۔ اسی لئے خدمت گار کو تابع کہتے ہیں۔ مَآ اَنْفَقُوْا میں ما یا تو مصدریہ ہے یا موصولہ اور فعل میں ضمیر پوشیدہ مَنًّا وَّلَآ اَذًى۔ مَن کے چند معنی ہیں۔ بوجھ بڑی بھاری نعمت قطع کرنا۔ کم کرنا۔ اسی لئے عربی اور اردو میں ایک وزن کا نام بھی مَن ہے۔ رب فرماتا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (ال عمران: ۱۶۴) بڑا احسان کیا اللہ نے رب فرماتا ہے۔ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ۔ (القلم: ۳) آپ کے لئے غیر منقطع ثواب ہے، موت کو منون کہتے ہیں کہ وہ عمر قطع کر دیتی ہے احسان جتانے اور طعنہ دینے کو من کہا جاتا ہے کہ اس سے دوسرے کی خوشی کم اور دل مکدر ہوتا ہے۔ یہاں اخیری معنی مراد ہیں۔ یعنی احسان جتانا۔ اذی۔ ہر تکلیف دہ چیز کو کہتے ہیں۔ یہاں مَنّ سے زبانی طعنے مراد ہیں۔ اور اذی سے حقارت والے فعل یعنی خیرات کے بعد فقیر کو نہ زبانی طور پر طعنے دیں نہ احسان جتائیں اور نہ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کریں چونکہ عملی ایذا سے زبانی طعنے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے مَنّ کا ذکر پہلے ہوا۔ اور اذی کا بعد میں۔ اور ثم فرما کر یہ بتایا کہ یہ لوگ خیرات کرنے سے مرتے وقت تک ان چیزوں سے بچیں کہ نہ بذات خود کسی فقیر کو طعنہ و ایذا دیں نہ اپنے کسی عزیز کو دینے دیں بلکہ رب کا شکریہ ادا کریں کہ اس نے انہیں دینے کے لائق کیا خیرات لینے کے لائق نہ کیا اور اچھے مقام پر خرچ کی توفیق بخشی۔ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ لَهُمْ کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ ہوا اور اجر سے مراد وہی ثواب ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا عِنْدَ رَبِّهِمْ سے معلوم ہوا کہ صدقات کا حقیقی ثواب قیامت ہی میں ملے گا۔ یعنی صرف انہی لوگوں کو رب کے پاس ثواب ملے گا اور ثواب کے علاوہ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (بقرہ: ۶۲) نہ انہیں دنیا اور قبر میں آئندہ کا اندیشہ ہو اور نہ حشر میں گذشتہ کا غم۔ خیال رہے کہ انسان کی زندگیاں تین ہیں۔ دنیاوی زندگی جو پیدائش اور قبر کے درمیان ہے۔ برزخی زندگی جو مرنے سے نفخ صور تک ہے اخروی زندگی جو نفخہ صور سے ابدالاباد تک ہے۔ دنیا میں تین قسم کے خوف و غم ہیں مفید۔ بیکار اور مضر اللہ سے رسول سے قیامت سے خوف اپنے گناہوں کا غم مفید ہے جس سے ایمان و عرفان کامل ہوتا ہے۔ دنیا کے خوف و غم بیکاری جو لگے ہی رہتے ہیں لوگوں کا خوف جو ایمان و عرفان سے روک دے۔ مال نہ ہونے کا غم کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی مکر زیان کرتا یہ مضر ہے۔ یہاں بیکار یا مضر خوف و غم کی نفی ہے۔ یعنی بعض کو ہم وہ دل بخشتے ہیں جس میں یہ رنج و غم اثر نہیں کرتے۔ نیز

انہیں مرتے وقت اور برزخ وحشر میں خوف وغم سے بچائیں گے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے۔ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ۔ قول مصدر ہے یا حاصل مصدر یعنی بات کہنا یا بات معروف بمعنی مشہور یا معلوم ہے۔ یہاں شرعاً مشہور مراد ہے۔ یعنی اچھی اور بہتر مغفرت۔ غفر سے بنا بمعنی ڈھکنا۔ یہاں قول معروف سے سائل کو نرمی سے منع کر دینا مراد ہے۔ اور مغفرت سے فقیر کی سختی برداشت کرنا اور اس کے عیب کا چھپانا یعنی نرمی سے منع کر دینا اور منع کرنے پر جو سائل سختی کرے اس سے درگزر کرنا۔ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا اَذًى۔ اس صدقہ دینے سے اچھا ہے۔ جس کے بعد فقیر کو ایذا اور تکلیف ہو خیال رہے کہ یہاں اذٰی میں احسان جتانا بھی داخل ہے۔ اور یہ بہتر ہونا سائل کے حق میں بھی ہے اور دینے والے کے حق میں بھی کہ سائل تو ایذا سے اور دینے والا عذاب الٰہی سے بچ جاتا ہے۔ یا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے خوش خلقی سے بات کر لینا اور ان کی خطاؤں سے درگزر کرنا بد خلقی کے صدقہ سے بہتر ہے۔ جب رب تعالیٰ غنی ہو کر حلیم ہے کہ نافرمانوں کو روزی دیتا ہے تو تم حلم و بردباری کیوں اختیار نہیں کرتے۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ۔ اللہ تمام صدقات سے بے پرواہ ہے اور حلیم ہے کہ طعنہ باز کو جلد عذاب نہیں دیتا۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ اپنے مختلف مال حسب ضرورت اللہ کی راہ میں خرچ کریں پھر خرچ کرنے کے بعد آخر دم تک نہ تو احسان جتائیں کہ دوسروں کے سامنے فقیر سے کہیں کہ ہم نے تیرے ساتھ فلاں موقعہ پر یہ سلوک کیا اور اسے لوگوں میں ذلیل کریں۔ اور نہ اسے طعنہ دیں کہ تو نادار، مفلس، مجبور، قلاش نکمہ تھا۔ ہم نے تیری خبر گیری کی اور آج تو ہمارے مقابلہ میں آ گیا اور نہ کسی اور طرح اس پر دباؤ ڈالیں کہ صدقہ دے کر اس سے اپنے گھر کے کام لیں۔ یا اسے نظر حقارت سے دیکھیں یا اس وجہ سے اسے اپنے پاس نہ بیٹھنے دیں۔ صرف ایسے ہی لوگوں کو رب کے پاس صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اور یہ ہی صدقہ ثواب کا پھل دے گا۔ انہیں نہ کسی قسم کا دنیا اور قبر میں خوف کا اندیشہ ہو اور نہ محشر میں یہ لوگ غمگیں ہوں۔ خوب خیال رکھو کہ سائل کو مجبوری کے وقت میں کچھ نہ دینا۔ اور اس سے اچھی بات کہنا اور خوش خلقی سے منع کر دینا۔ اور اگر وہ سوال میں اصرار کرے یا منع کرنے پر زبان درازی کرے تو اس سے درگزر کرنا، اس صدقہ دینے سے بہتر ہے جس کے بعد طعن تشنیع دیئے جائیں کہ اس میں مال بھی گیا اور بجائے ثواب کے عذاب ہوا، اور فقیر کو رنج و غم بڑھا یہ سمجھ رکھو کہ اللہ کو تمہارے صدقات کی ضرورت نہیں۔ اور نہ فقیری کا رزق تمہارے دینے پر موقوف ہے۔ اگر تم نہ دو گے تو اسے اور دروازہ سے ملے جائے گا۔ اللہ غنی ہے۔ اس نے تمہارے ہی نفع کے لئے صدقات کا حکم دیا۔ اور وہ بہت علم والا ہے کہ گناہ پر جلد عذاب نہیں دیتا۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر صدقہ دے کر سلام کرنے سے بھی فقیر کو تکلیف ہو تو اسے سلام بھی نہ کرے تا کہ تمہارا سلام صدقہ کی یاد کا سبب نہ بن جائے (خازن) امام شعبی فرماتے ہیں کہ جتنا تمہارے صدقہ کا فقیر محتاج ہے۔ اس سے زیادہ ثواب کے تم محتاج ہو۔ تمہارا فقیر پر دے کر احسان ہوا، تو فقیر کا بھی تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایک فرض سے ہلکا کر دیا۔ امام ہدائی فرماتے ہیں کہ چونکہ مال سے جسم کو راحت ہوتی ہے اور اچھی بات سے قلب کو، اور قلب جسم سے اعلیٰ لہٰذا اچھی بات خالی صدقہ سے اعلیٰ۔ سب سے بہتر وہ شخص ہے جو فقیر کو خوش کر کے دے۔ اور بڑا خبیث وہ شخص ہے جو صدقہ بھی نہ دے۔ اور فقیر کو ایذا بھی پہنچائے۔ اور بد نصیب وہ ہے جو صدقہ دے۔ اور ایذا بھی پہنچائے کہ اس کا مال بھی گیا اور ثواب بھی نہ ملا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** صدقہ پر طعنہ دینا گناہ کبیرہ ہے کیونکہ اس سے صدقہ برباد ہوتا ہے اور جس سے نیکیاں برباد ہوں وہ کبیرہ (کبیر) **دوسرا فائدہ:** جس کا صدقہ بارگاہ الٰہی میں قبول ہو جائے۔ اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہے کیونکہ رب تعالیٰ نے اس کے لئے بھی فرمایا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ الخ اور اولیاء اللہ کے لئے بھی۔ **مسئلہ:** اس میں اختلاف ہے کہ ایذا دینے سے صدقہ کا صرف ثواب ہی جاتا ہے یا عذاب بھی ہوتا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ اس پر عذاب ہوتا ہے۔ جیسے حلیم سے معلوم ہوا بعض نے فرمایا کہ صرف ثواب باطل ہوتا ہے۔ جیسے کہ لَهُمْ اَجْرُهُمْ سے معلوم ہوا (کبیر) مگر تمام اہلسنت کا اس پر اتفاق ہے کہ ایذا پہنچانے سے خود صدقہ باطل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر وہ زکوٰۃ دے کر ایذا پہنچائی تو زکوٰۃ شرعاً ادا ہو گئی۔ **مسئلہ:** صحت کے لئے قبول لازم نہیں مگر قبول عمل کے لئے صحت ضروری۔ دیکھو زکوٰۃ غیر مقبول شرعاً صحیح ہے۔ **مسئلہ:** سائل کو منع کرنا حرام نہیں بلکہ سخت جواب دینا حرام ہے۔ **تیسرا فائدہ:** چیزیں سانچے میں ڈھالی جاتی ہیں اور نمونہ پر تیار کی جاتی ہیں۔ بغیر سانچے اور بے نمونہ کی چیز خراب ہوتی ہے۔ اعمال صالحہ کے سانچے تو حضور ﷺ نے تیار فرمائے اور ان کے نمونہ صحابہ کرام کے اعمال ہیں۔ جس مسلمان کے اعمال اس سانچے میں ڈھلے ہوئے اور صحابہ کرام کے نمونہ پر تیار ہوئے وہ قبول ہیں ورنہ مردود۔ دیکھو رب نے حضرت عثمان غنی یا عبدالرحمٰن ابن عوف یا علی مرتضٰی کی ان مخصوص خیراتوں کو بطور نمونہ اس آیت میں مسلمانوں پر پیش فرمایا' جن کے صدقہ اس نمونہ کے ہوں گے ان کے لئے اجر بھی ہے اور خوف وغم سے آزادی بھی۔ رب فرماتا ہے۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا الخ (بقرہ: ۱۳۷) اگر یہ لوگ تمہارے ایمان جیسا ایمان لاویں تو ہدایت پا جائیں گے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ بِاَيِّهِمْ اِقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ الخ۔ میرے صحابہ تارے ہیں تم جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے' غرضکہ ایمان و اعمال میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی پیروی باعث کامیابی ہے۔ **چوتھا فائدہ:** خوش خلقی کا ثواب بد خلقی کے صدقہ سے زیادہ ہے۔ دیکھو یہاں صرف قول معروف یعنی اچھی خوش خلقی کی بات اور لوگوں سے درگزر کرنے کو اس صدقہ سے بہتر فرمایا کیونکہ نہ ہو کہ مال سے جسم کو راحت ہے اور اچھی بات سے دل کو خوشی اور مومن کا دل خوش کرنا بہترین عبادت ہے زبان کا زخم سنان کے زخم سے بدتر ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ کے بعد احسان اور ایذا کا مجموعہ حرام ہے۔ ان میں سے صرف ایک حرام نہیں لہٰذا فقط احسان جتانے والا یا فقط موذی گنہگار نہ ہونا چاہیے۔ **جواب:** نہیں بلکہ ہر ایک حرام ہے اسی لئے درمیان میں لَا بڑھایا گیا مَنًّا وَّ لَا اَذًى تاکہ معلوم ہو کہ ہر ایک کام مستقل حرام ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اگر احسان جتانا حرام ہے تو رب نے کیوں جتلایا اس کا تو نام ہی منان ہے۔ یعنی بہت احسان جتانے والا۔ **جواب:** رب کے منان ہونے کے معنی ہیں بہت احسان کرنیوالا۔ نہ کہ احسان جتانے والا' ایک ہی لفظ کے مخلوق کے لئے کچھ معنی ہوتے ہیں۔ اور خالق کے لئے کچھ اور۔ بندہ بھی شاکر ہے اور رب بھی۔ بندہ بھی تواب ہے اور رب تعالیٰ بھی۔ مگر مختلف معانی سے۔ **تیسرا اعتراض:** رب نے احسان جتاتے ہیں لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ الخ (آل عمران: ۱۶۴) پھر

ہمیں اس سے کیوں منع فرمایا۔ **جواب:** رب کے احسان جتانے سے بندہ کو شکر کا شوق پیدا ہوتا ہے اور انسان کے احسان جتانے سے فقیر کو صدمہ۔ نیز رب کا احسان بلاغرض ہے اور بندہ کا صدقہ ثواب کی غرض سے جب وہ ثواب چاہتا ہے تو احسان کیوں جتاتا ہے۔ نیز رب تعالیٰ حقیقی محسن ہے' اور بندہ مجازی' اس کا احسان جتانا حق ہے۔ ہمارا باطل۔ **چوتھا اعتراض:** احسان جتانے سے صدقہ کا ثواب کیوں جاتا رہتا ہے تعجب ہے کہ اتنا قیمتی مال دو باتوں میں برباد؟ **جواب:** اس لئے کہ صدقہ سے فقیر کو راحت دینا اور رب کو راضی کرنا منظور تھا۔ احسان جتانے سے یہ دونوں باتیں جاتی رہیں۔ یہ تو حقیر سا مال ہے بات سے تو جان بھی جاتی رہتی ہے کفر کی بات منہ سے بکی' قتل کے مستحق ہو گئے۔ بادشاہ کو گالی دی پھانسی پر لٹکا دیئے گئے بات بڑی چیز ہے۔ **پانچواں اعتراض:** لَهُمْ کے مقدم فرمانے سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا ثواب درست نہ ہوا کہ خیرات تو ہم کریں اور ثواب دوسرے کو بخش دیں؟ **جواب:** لَهُمْ میں لام ملکیت کا ہے یعنی اجر کی ملکیت صرف صدقہ دینے والے کو ہے اگر وہ چاہے تو کسی کو بخشے چاہے نہ بخشے' نیز ایصال ثواب کرنے سے خود صدقہ دینے والا ثواب سے محروم نہیں ہو جاتا' اسے پورا ثواب مل جاتا ہے۔ دوسرا بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ جیسے ہماری شمع سے اگر دوسرا آدمی بھی روشنی حاصل کرے تو ہم محروم نہیں ہو جاتے' اگر تم کسی کو علم سکھاؤ تو اپنا پڑھا نہیں بھول جاتے علماء تو فرماتے ہیں کہ ایصال ثواب کرنے والوں کو ان تمام کے برابر ثواب ملتا ہے جنہیں ثواب بخشا گیا۔ مثلاً اگر ایک قرآن پاک کا ثواب ساری امت رسول کو بخشا تو تمام امت کو ایک ایک قرآن کا ثواب ملا کسی کو کٹ کر نہ ملا' مگر اس بخشنے والے کو تمام افراد امت کے برابر ثواب ملا۔ اللہ اکبر جب رب دیتا ہے تو لیتے کیوں نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

جیسے کھیتی کے لئے صدہا آفتیں ہیں۔ جن سے ہری بھری کھیتی ایک دم برباد ہو جاتی ہے اور اس کے نشو ونما کے لئے بہت سے اسباب ایسے ہی عبادات کے لئے صدہا آفتیں ہیں اور اس کی ترقی کے بہت سے اسباب۔ احسان جتانا' طعنے دینا یہ ایسی آفت ہے۔ جس سے صدقہ کی ہری بھری کھیتی آن کی آن میں فنا ہو جاتی ہے۔ فقیر پریشان دل ہوتا ہے اس کو طعنہ دے کر اس کی پریشانی میں اور زیادتی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ شخص بجائے ثواب کے عذاب کما لیتا ہے۔ اس کے طعنے ہتھوڑے کا کام دیتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اونچا ہاتھ نیچے ہاتھ سے بہتر۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ اونچا ہاتھ دینے والے کا ہے۔ اور نیچا ہاتھ لینے والے کا۔ مگر صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اونچا ہاتھ لینے والا ہے۔ اور نیچا دینے والے کا کہ دینے والا فانی مال دیتا ہے مگر لینے والا ثواب دائمی کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا یہ قطرہ دے کر دریا لیتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

قرض دہ زیں دولت اندر اَقْرِضُوا ۔۔۔ تا کہ صد دولت بہ بینی پیش رو !

اند کے زیں شرب کم کن بہر خویش ۔۔۔ تا کہ حوض کوثرے یابی بہ پیش !

صدقہ کرنے والوں کے تین طبقے ہیں۔ ایک قوی بہادر جو اپنا سارا مال خرچ کرنے پر قادر ہیں۔ جیسا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔ دوسرا درمیانی لوگ جو سارا مال نہیں خرچ کر سکتے' بلکہ کچھ اپنے پاس بھی رکھتے ہیں مگر عیش کیلئے نہیں دینی ضروریات کیلئے تیسرا کمزور لوگ جو فقط صدقہ واجبہ پر قناعت کرتے ہیں اور گویا سانپ ہے اور بخل بچھو۔ یہ دونوں جمع ہو کر بڑے خطرناک

ہیں۔خیال رہے کہ صدقہ صرف مال ہی کا نہیں ہوتا بلکہ ہر نیکی کا ہوتا ہے اور سب میں اخلاص شرط۔(از روح البیان)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰىۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ
اے وہ لوگو جو ایمان لائے نہ باطل کرو اپنے صدقے ساتھ احسان جتانے اور ایذا کے مثل اس کے جو خرچ کرتا ہے
اے ایمان والو اپنے صدقے باطل نہ کردو احسان رکھ کر اور ایذا دے کر اس کی طرح
مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
مال کو اپنے دکھانے کیلئے لوگوں کو اور نہیں ایمان لاتا ہے ساتھ اللہ اور دن آخرت کے کہاوت اس کی مثل
جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کیلئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت پر ایمان نہ لائے تو اس کی کہاوت ایسی ہے
صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًاؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰى
کہاوت اس چٹان کے ہے کہ او پر اس کے مٹی ہے پس پہنچی اس کو تیز بارش پس چھوڑ دیا اس کو چکنا نہیں قادر ہوتے ہیں
جیسے ایک چٹان کہ اس پر اس کے مٹی ہے اب اس پر زور کا پانی پڑا جس نے اسے نرا پتھر کر چھوڑا اپنی کمائی سے
شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْاؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾
وہ اوپر کسی چیز کے اس میں سے جو کمایا اور اللہ نہیں راہ دکھاتا قوم کفار کو
کسی چیز پر قادر نہ پائیں گے اور اللہ کافروں کو راہ نہیں دیتا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔**پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقہ پر احسان بتانے اور فقیر کو ایذا پہنچانے کی اخروی برائی بیان کی گئی۔اب اس کی وضاحت کے لئے نہایت نفیس دو محسوس مثالیں بیان کی جارہی ہیں۔گویا پہلے مسئلہ بیان ہوا تھا اور اب اس کی وضاحت۔**دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ دے کر احسان جتانے کی ممانعت تھی۔اب احسان جتا کر صدقہ دینے کی ممانعت ہے۔گویا احسان کی ایک نوعیت سے پہلے منع کیا گیا اور دوسری نوعیت سے اب منع کیا جارہا ہے۔**تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں احسان وایذا کے کچھ عیوب بیان ہوئے اور ترک احسان وایذا کے فوائد اب اس احسان وایذا کے پہلے سے بڑھ کر عیب بیان ہو رہے ہیں۔**چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ترک احسان و ایذا کے فوائد بیان ہوئے کہ اس سے رب کے جزا خوف وغم سے آزادی میسر ہوتی ہے۔اب عمل احسان وایذا کے نقصانات کا ذکر ہے طبیب حاذق مضر چیزوں کے دورُخ بیان فرماتا ہے۔ان سے بچنے کے فائدے اور ان سے پرہیز نہ کرنے کے نقصانات قرآن کریم طبیب روحانی کی کتاب ہے اس کا بھی یہ ہی طریقہ ہے۔

تفسیر

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ پچھلی آیت بطریقہ غیب مسلمانوں سے کلام تھا۔ اب مخاطب فرما کر کلام ہو رہا ہے کیونکہ اگلے احکام گذشتہ کے مقابلہ میں سخت ہیں۔ اور بوصف ایمان پکارنے میں اسی جانب اشارہ ہے کہ کوئی مسلمان مومن ہو کر ایسے جرم کی ہمت ہی نہ کرے گا۔ چونکہ طعنہ ایذا دینے سے بچنا بہت مشکل ہے بجز کرم پروردگار نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے رب نے پہلے مسلمانوں کو پکارا' پھر اس کا حکم دیا محبوب کی محبوبانہ پکار سے سخت کام بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ عشاق جان دے کر بھی ان کی تعمیل کرتے ہیں۔ نیز چونکہ کفار کے صدقات بہر حال باطل ہیں خواہ وہ ریا سے کریں یا اخلاص سے۔ احسان جتائیں نہ جتائیں۔ ایذا دیں یا نہ دیں مگر مسلمانوں کے اعمال کی دو نوعیتیں ہیں۔ صحیح ہوں تو فائدہ مند ورنہ برباد اس لئے مسلمانوں سے ہی خطاب ہوا کہ تم فوراً سنبھل کے کام کرنا اور فرمایا گیا کہ اے ایمان والو لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی۔ لَا تُبْطِلُوْا سے یا تو صحیح عمل کا ثواب باطل کرنا مراد ہے اور احسان و ایذا سے صدقہ دے کر احسان جتانا مراد یا اپنے صدقات کو باطل بنانے کی ممانعت ہے' اور احسان و ایذا سے صدقہ کے وقت طعنہ دینا مراد یعنی اپنے دیئے ہوئے درست صدقوں کے ثواب کو احسان جتا کر باطل نہ کر لو' یا احسان اور تکلیف کے ساتھ صدقہ' باطل نہ دو کہ تمہارا صدقہ باطل ہو کر متحقق نہ ہو (کبیر وغیرہ) خیال رہے کہ باطل حق کا مقابل ہے۔ حق کے بہت معنی ہیں یعنی واقعات کے مطابق' واقعہ اس کے مطابق' ثابت و قائم' ناقابل زوال' مفید اور حکمتوں والا' لہٰذا اس کے مقابل باطل کے بھی بہت سے معنی ہیں۔ جھوٹ' غلط زائل اور قابل فنا عبث بیکار جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ رب حق ہے ماسوی سب باطل یعنی رب کو فنا نہیں' باقی سب فانی اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ رب نے کوئی چیز باطل نہ پیدا کی رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا یعنی عبث و بیکار نہ بنائی یہاں باطل سے مراد یا بیکار ہے یا فنا یعنی وہ چیز جس کو ثبات نہ ہو۔ اور ابطال کسی چیز کے خراب کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور نیست و نابود کر دینے کو بھی۔ خواہ وہ خود حق ہو یا باطل یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ یہ جملہ یا تو ابطالاً پوشیدہ کی صفت ہے۔ اور کاف کے بعد ایک ابطال پوشیدہ یعنی لَا تُبْطِلُوْا هَا اِبْطَالًا كَاِبْطَالِ الَّذِیْ۔ یا لَا تُبْطِلُوْا کے فاعل کا حال یعنی لَا تُبْطِلُوْاهَا مُشَابِهِیْنَ الَّذِیْ رِئَآءَ باب مفاعلت کا مصدر ہے۔ جیسے لقاء اس کا مادہ رایٔ ہے۔ یہاں یُنْفِقُ کا مفعول لہٗ۔ ریا کے معنی ہیں ایک دوسرے کو دکھانا چونکہ ریاء کار کی نیت یہ ہی ہوتی ہے کہ میں اپنی خیرات لوگوں کو دکھاؤں تاکہ لوگ میری منہ پر تعریف کریں۔ اس لئے اسے ریاء کہتے ہیں۔ یعنی اس کی طرح تم صدقے باطل نہ کر لو۔ جو ریاء کاری کے لئے مال خرچ کرتا ہے۔ مفسرین نے فرمایا الَّذِیْ سے مراد منافق ہیں۔ گویا ریاء کاری طریقہ منافقین کا ہے کیونکہ آگے آرہا ہے وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ یعنی ساتھ ہی وہ اللہ اور قیامت پر ایمان بھی نہیں رکھتا۔ اگر مومن ہوتا تو اس کے دل میں اخلاص ہوتا۔ اگرچہ منافقین اللہ کو بھی مانتے تھے اور قیامت کو بھی وہ یہود تھے مگر چونکہ حضور ﷺ کے انکاری تھے اس لئے اسے ماننے کا رب تعالیٰ کے ہاں کوئی اعتبار نہیں۔ دیکھو ابلیس توحید' قیامت کو مانتا ہے۔ مگر اس کا ماننا معتبر نہیں کہ انبیاء کا منکر ہے۔ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ۔ صفوان واحد بھی ہے اور صفونۃ کی جمع بھی' اور صفا کا اسم جنس بھی جیسے مرجان اور مرجانۃ۔ سعدان اور سعدانۃ۔ یہاں واحد ہے کہ آگے فَاَصَابَهٗ آرہا ہے۔ اور تشبیہ مرکب ہے یعنی اس ریاکار کی کہاوت اس بڑی چٹان کی طرح ہے کہ عَلَیْهِ

تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا تراب خشک مٹی کو کہتے ہیں۔ اور وابل وہ بارش ہے جس کے قطرے وزنی ہوں۔ اس کا مادہ وبلٌ ہے بمعنی بوجھ۔ اسی سے وبال بمعنی مصیبت اور وبیل بمعنی مصیبت کا خوف بھی ہے۔ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ (تغابن: ۵) اور جیسے فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا۔ (مزمل: ۱۶) صلد وہ سخت اور چکنا پتھر جس پر نہ غبار ہو اور نہ کچھ اُگے۔ اسی لئے گنجے سر کو اس صلد کہتے ہیں۔ جس پر بال نہ اگیں۔ ریاء کار منافق بے وقوف کسان ہے۔ اور اس کا صدقہ پتھر کا غبار' اس سے نفع کی امید اس گھاس کی طرح ہے جو پتھر پر کبھی اگ آئے اور اس کا کفر یا نفاق یا موت یا قیامت' تیز بارش ہے۔ اور وہاں ثواب کا نہ ملنا اس پتھر کا غبار سے صاف ہو جانا ہے۔ یا یوں سمجھو کہ کافر چٹان ہے۔ اس کی خیرات مٹی' کفر تیز بارش اور عمل کی بربادی۔ اس پتھر کا دھل جانا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا۔ اس کا فاعل الَّذِیْ ہے کیونکہ اس سے ایک گروہ مراد تھا۔ نہ قدرت رکھنے سے نہ پانا مراد ہے۔ اور شَیْءٍ سے ثواب' اور كَسَبُوْا سے اعمال یعنی وہ اپنے کسی عمل کا ثواب نہیں پاتے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ لَا يَهْدِیْ یا تو بمعنی مستقبل ہے یا بمعنی حال یعنی اللہ کفار کو قیامت کے دن راہ جنت کی ہدایت نہ دے گا۔ یا دنیا میں انہیں اعمال درست کرنے کی ہدایت نہیں دیتا۔ وہ ہر کام بگاڑ کر ہی کرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کی تفسیر و تشبیہ سمجھنے سے پہلے ایک مثال ذہن نشین کر لو کسی بادشاہ نے کارخانہ والے کو جہاں ہر قسم کا مال تیار ہوتا ہے، بہت بڑا آرڈر دیا کہ ایک لاکھ فوجی وردیاں دو لاکھ گھوڑوں کی کاٹھیاں بہت جلدی جلدی تیار کر دو جن کا میٹریل فلاں فلاں قسم کا ہو۔ اور ساتھ ہی نمونے دیئے کہ اس اندازے اور اس نمونے کی چیزیں ہوں۔ کارخانہ والوں نے میٹریل تو صحیح استعمال کیا۔ مگر نمونہ بدل دیا ناپ نمونہ میں فرق کر دیا۔ لہٰذا بادشاہ اس مال کو نہ قبول کرے گا۔ نہ قیمت دے گا۔ اب سمجھو کہ ہم لوگ کارخانہ دار ہیں۔ ہماری زندگیاں کارخانہ ہیں۔ جن میں اعمال تیار ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ خریدار شہنشاہ اس نے ہم کو نماز' روزے' حج' زکوٰۃ وغیرہ کا آرڈر دیا۔ جس کے ارکان بتا دیئے گئے۔ مگر ساتھ ہی فرما دیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (احزاب: ۲۱) ہمارے رسول کے نمونہ پر اعمال تیار کر لو۔ اب جس کے اعمال اس نمونے کے مطابق ہوں گے وہ قبول ہوں گے جنت بھی ملے گی اور جس کے اعمال کفار۔ شیاطین کے نمونہ کے ہوں گے وہ رد ہوں گے۔ صدقہ پر طعن و تشنیع کرنا کفار کا نمونہ ہے۔ ہمارے محبوب نے ایسا صدقہ نہ کیا تھا لہٰذا وہ رد ہو گا حضور انور تو وہ صدقہ دیتے تھے شعر۔

جب لینے کو بھیک آئے سر کوئے گدایاں	لب پر یہ دعا تھی تیرے منگتے کا بھلا ہو

یہ ہی حال نماز' حج بلکہ زندگی موت کا ہے۔ جب یہ مثال سمجھ لی تو اب تفسیر سنو۔ اے مسلمانو! فقیر پر احسان رکھ کر یا اسے ایذا پہنچا کر اپنے خیرات کا ثواب اس منافق کی طرح برباد نہ کر لو۔ جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے کہ لوگ مجھے سخی کہیں۔ نہ اس کا ایمان خدا پر ہے' نہ قیامت پر' اس منافق کی حالت یا طعنہ اور تکلیف سے ثواب برباد کرنے والے کی کہاوت ایسی ہے جیسے کوئی نادان کسان ایسے پتھر پر بیج بو دے' جس پر ہلکی سی گرد و غبار کی تہ جمی ہوئی ہے۔ اس کے بیج سے کچھ سبزی اگ آئے۔ وہ سمجھے کہ میں اس بونے میں کامیاب ہوا۔ اور دوسرے کسانوں کی طرح وقت پر میں بھی کھیت کاٹوں گا۔ وہ اسی خیال میں تھا کہ اچانک تیز بارش آ گئی جس نے اس مٹی کی تہ کو دھو دیا اس پر جمے ہوئے گھاس پھوس کو بالکل ختم کر دیا۔ اور

اس پتھر کو دھو دھلا کر بالکل صاف بنا دیا۔ کہ نہ اس پر گھاس پھوس رہی نہ وہ مٹی کی تہ' ایسے لوگوں کو قیامت کے دن اپنے ان اعمال میں سے کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ اور رب تعالیٰ انہیں اس دن جنت کا راستہ نہ بتائے گا۔ ریا سے دیا ہوا مال اس بیج کی طرح ہے جو پتھر پر بویا جائے۔ اس کے عمل اس ظاہری گھاس پھوس کی طرح جو اس پتھر پر جم گیا۔ اس کا کفر یا ریا کاری یا اسکی موت' یا قیامت' اس تیز بارش کی طرح ہے جو پتھر کو دھو کر صاف کر دے۔ قیامت کے دن مخلصین اپنے صدقات کے پھل کاٹیں گے اور ریاء کار حسرت سے اپنے ہاتھ۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** طعن' تشنیع' ایذاء قلبی بدترین جرم ہے۔ جس سے اعمال برباد ہو جاتے ہیں۔ حتی کہ زانی کو سنگسار کر دو چور کے ہاتھ کاٹ دو مگر اسے طعن تشنیع نہ دو۔ نبی ﷺ نے حضرت ابن عمر کو ماغیر پر لعنت کرنے' طعن دینے سے روکا اگرچہ اسے سنگسار کر دیا۔ ہندہ زوجہ ابوسفیان نے جنگ احد میں حضرت حمزہ کا مثلہ کیا۔ ان کی آنکھیں وجگر نکال کر چبائیں۔ ان ہی کی بیٹی حضرت ام حبیبہ حضور ﷺ کے نکاح میں تھیں مگر حضور ﷺ نے انہیں طعن نہ کیا کہ تمہارے ماں باپ نے ہمارے چچا سے یہ سلوک کیا۔ ان پر افسوس ہے جو آج کل اپنے گھروں میں طعن و تشنیع کی وجہ سے فساد رکھتے ہیں۔ رب تعالیٰ حضور ﷺ کی سنتوں پر عمل کی توفیق دے۔ آمین۔ **دوسرا فائدہ:** نیکیوں کی درستی اور بقا کے لئے جیسے ایمان شرط ہے کہ کافر کی کوئی نیکی قبول نہیں اور اگر اطاعت کے بعد کافر ہو جائے تو وہ باقی نہیں رہتی' جس کو اصطلاح میں حبط اعمال کہتے ہیں۔ ایسے ہی اعمال کی صحت اور بقاء کے لئے اخلاص اور دیگر برباد کرنے والی چیزوں سے پاک رہنا بھی شرط ہے۔ اسی لئے نفاق' ریاء' طعنہ' ایذا رسانی کو مبطل اعمال کہا گیا۔ **تیسرا فائدہ:** ریا اور طعنہ وغیرہ سے اصل عمل باطل نہیں ہوتا بلکہ اس کا ثواب' لہٰذا اگر کوئی ریا کار بعد میں توبہ کر کے مخلص بن جائے تو امید ہے کہ ثواب پائے۔ **چوتھا فائدہ:** ریا کار منافق عملی ہے کہ منافقوں کے سے کام کرتا ہے ریاء کاری اور طعنہ وغیرہ کفار کی خصوصیات ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ چند شخص جنت میں نہ جائیں گے۔ احسان جتانے والا۔ والدین کا عاق' شرابی' جادوگر' کاہن' دیوث۔ **پانچواں فائدہ:** ریاء طعنے اور ایذا کے ساتھ جو بھلائی کی جائے وہ بھلائی ہی نہیں۔ وہ شروع سے ہی باطل ہے اس لئے کہ اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ طعنے اور ایذا کے ساتھ باطل صدقے نہ دو۔ (تفسیر) **چھٹا فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیکیوں کو ہر اس چیز سے پاک رکھنا ضروری ہے جس سے نیکی نیکی نہ رہے۔ دنیوی فعل بن جائے' لہٰذا عبادات پر اجرت لینا جائز نہیں کہ اجرت سے عبادت عادت بن جاتی ہے (احکام القرآن) البتہ علمائے متاخرین نے ضروری باتوں پر مجبوراً اجرت لینا جائز رکھی جیسے تعلیم دین و آذان' امامت وغیرہ کہ اگر ان پر اجرت جائز نہ ہو تو یہ کام بند ہو جائیں گے۔ اور دین میں حرج واقع ہوگا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ احسان اور ایذا دونوں کے مجموعہ سے صدقہ باطل ہوتا ہے نہ کہ فقط ایک سے تو چاہیے کہ نہ صرف ایذا حرام ہو اور نہ صرف احسان۔ **جواب:** یا تو یہ واؤ بمعنی اَوْ ہے یا دو کا ذکر تقویت کیلئے ہے ورنہ

باطل کرنے کے لئے ایک ہی کافی ہے۔ **دوسرا اعتراض:** بارش کی مثال غلط ہے وہ تو رب کی رحمت ہے جس سے کھیت کو قوت ملتی ہے اور اس سے پتھر صاف ہو جاتا ہے۔ منافق کے عمل کو اس سے کیوں تشبیہ دی گئی (بعض بے دین) **جواب:** تشبیہ کی وجہ ہم تفسیر میں بیان کر چکے۔ بارش اس کھیت کے لئے فائدہ مند ہے جو صحیح زمین میں بویا جائے۔ اینٹوں' پتھروں پر جو گھاس اگ آتی ہے وہ بارش سے برباد ہو جاتی ہے۔ یہی یہاں بتانا منظور ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جیسے نیکیوں سے برائیاں مٹ جاتی ہیں اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (ہود: ۱۱۴) ایسے ہی گناہوں سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ دیکھو طعنہ' ایذا گناہ ہیں۔ جن سے صدقے برباد ہو گئے۔ (معتزلہ) **جواب:** اس آیت کے معنی یا تو یہ ہیں کہ باطل صدقے نہ دو۔ نہ یہ کہ صدقہ صحیحہ کو طعنہ سے باطل نہ بناؤ ریاء کار کا صدقہ اول ہی سے غلط ہے۔ یا یہ مطلب کہ اس کا ثواب مت کھوؤ' ریا سے عمل باقی رہتا ہے۔ محض ثواب جاتا رہتا ہے۔ بخلاف گناہوں کے کہ وہ نیکیوں کی برکت سے اصل سے ہی مٹ جاتے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اگر لوگوں کو دکھا کر اعمال کرنا ریا اور برا ہے۔ تو نبی ﷺ نے اونٹ پر طواف اور ممبر پر نماز لوگوں کو دکھانے کے لیے کیوں ادا فرمائی؟ **جواب:** لوگوں کو اپنے ایمان دکھانے کی تین وجہ ہوتی ہیں۔ تبلیغ' ترغیب' اپنی ناموری۔ پہلی دو صورتیں تو بڑی اہم عبادت ہیں۔ آخر صورت بری۔ اس آخری صورت کو ہی ریا کہا جاتا ہے۔ یہی بری ہے حضور انور ﷺ کا اپنے اعمال لوگوں کو دکھانا' تعلیم' تبلیغ کے لیے تھا۔ حضور انور ﷺ اس کے مامور تھے۔ صحابہ کرام کا بعض اعمال لوگوں کو دکھا کر کرنا ترغیب کے لیے تھا۔ موجد نیکی کو بہت ثواب ملتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صدقہ صدق سے بنا بمعنی سچائی' جس صدقہ میں صداقت اور سچائی نہ ہو' وہ صدقہ ہی نہیں۔ صدقہ میں چار حروف ہیں۔ ص' د' ق' ہ' ص سے صد بمعنی (رکاوٹ) کی طرف' اور' د' سے دلالت (بمعنی رہنمائی) کی طرف اشارہ ہے۔ ق سے قرب الی اللہ اور ہ سے ہدایت کا پتہ لگتا ہے گویا صدقہ کے چار فائدے ہیں۔ (۱) صدقہ نقصان' چوری' ڈکیتی وغیرہ ہر مصیبت کے مقابلہ میں رکاوٹ ہے۔ (۲) صدقہ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ (۳) رب سے قریب تر کرتا ہے۔ جنت کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ جب صدقہ فقیر کے ہاتھ میں پہنچتا ہے تو دینے والے کو خطاب کر کے پانچ باتیں عرض کرتا ہے۔ اے خیرات کرنے والے! میں قلیل تھا تو نے مجھے کثیر بنا دیا۔ (۲) میں حقیر تھا' تو نے مجھے عظیم بنا دیا۔ (۳) میں فانی تھا تو نے مجھے باقی کر دیا۔ (۴) میں دنیا کی گھومنے والی حقیر دولت تھا تو نے اپنے صدق و اخلاص سے مجھے آخرت کی پائیدار نعمت بنا دیا۔ (۵) مہربانی کر کے مجھے برباد نہ کرنا۔ زندہ اور آباد رکھنا۔ مجھے اخلاص کے پانی اور ایمان کی ہوا سے سرسبز رکھنا۔ مگر یہ تمام خوبیاں اس صدقہ میں ہیں جو اخلاص سے ہو۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ریاکار بندہ اس شخص کی طرح ہے جس کے کیسہ میں ٹھیکریوں کے روپیہ بندھے ہوں۔ لوگ اسے دیکھ کر مالدار سمجھیں۔ مگر بازار میں اس کی کوئی قیمت نہ ہو ایسے ہی ریاکار کو صرف لوگوں کی تعریف ملے گی۔ بازار قیامت میں اس سے کوئی سودا نہ خرید سکے گا۔ ضروری ہے کہ سکہ کی چاندی بھی کھری ہو۔ اور اس کی مہر بھی درست' مال حلال اس کی چاندی ہے۔ اور اخلاص اس کی مہر اس لئے بعض لوگ نابینا فقیروں کو خیرات دیتے ہیں بعض علمائے کرام سوتے ہوئے فقیر کے کپڑے میں کچھ باندھ آتے تھے تاکہ اسے خبر نہ ہو کہ کون دے گیا۔ مولانا فرماتے ہیں ۔

گفت پیغمبر بیک صاحب ریا　　صَلِّ اِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ اَیْ فَتیٰ
از برائے چارۂ ایں خوف ہا !!　　آمد اندر ہر نمازے اِھْدِنَا
کیں نمازم را میامیز اے خدا　　با نماز ضَآلِّیْنَ و اھل ریا

خیال رہے کہ دنیا داروں کو دکھانا اور انہیں راضی کرنا ریا کاری ہے۔اور رسول اللہ ﷺ کو اپنی نیکیاں دکھانا اور انہیں راضی کرنا عین عبادت۔ کیونکہ ان کی رضا میں رب کی رضا ہے، جس عمل سے حضور ﷺ راضی نہ ہوں اس سے رب بھی راضی نہیں۔ رب فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (التوبہ ۶۲) ایک بار حضور ﷺ نے ابو موسیٰ اشعری سے فرمایا کہ آج آخر رات ہم تمہارے دروازہ پر گئے اور تمہارا قرآن پاک سنا۔ تمہیں رب نے لحن داؤدی دی ہے۔ عرض کیا کہ اگر مجھے خبر ہوتی کہ میرا قرآن صاحب قرآن ﷺ سن رہے ہیں۔ تو اور بھی عمدہ طریقے سے پڑھتا۔ اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب سلطنت مصطفٰے اور شانِ حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ دیکھو ہجرت کے بعد فتح مکہ کے پہلے مسلمانوں کو مکہ معظمہ میں رہنا حرام ہو گیا۔ سوائے معذورین کے جو لوگ وہاں رہے ان پر قرآن کریم میں سخت عتاب ہوا حالانکہ مکہ معظمہ کعبہ مقام ابراہیم عرفات و منیٰ سب تھے کیوں اس لئے کہ اس وقت وہاں رہنے سے اللہ کے حبیب راضی نہ تھے۔ ایک بار حضور ﷺ نے بعض صحابہ کو حکم دیا کہ کل فجر کے بعد جہاد میں روانہ ہو جائیں۔ سب چلے گئے ایک صحابی نے خیال کیا کہ آج جمعہ ہے۔ نماز جمعہ کو حضور کے پیچھے پڑھ کر جاؤں گا اور لشکر سے مل لوں گا۔ نماز جمعہ کے بعد حضور نے ٹھہر جانے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے ماجرا عرض کر دیا۔ فرمایا کہ جو ثواب ان لوگوں کو صبح نکل جانے اور جنگل میں ظہر پڑھنے کا مل گیا۔ وہ تم کو یہاں میرے پیچھے صدہا جمعہ پڑھنے کا نہیں مل سکتا۔ کیوں حضور انور کی رضا کی وجہ سے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ معاملات میں دنیوی اغراض کا شامل ہونا حق سے اعراض (منہ پھیرنا) کی علامت ہے۔ جس نے حق سے اعراض کیا اس نے باطل کو لیا۔ اور جس نے باطل کو لیا اس نے اپنے اعمال کے حقوق باطل کر دیئے۔ جب تم نے فقیر پر صدقہ کا احسان جتایا تو معلوم ہوا کہ صدقہ سے تم طالبِ حق نہ تھے۔ ورنہ تم فقیر کا احسان مانتے کہ اس نے تم سے چند پیسے لے کر تمہیں رب تک پہنچا دیا۔ ہمارے مشرب میں جنت حاصل کرنے یا جہنم سے بچنے کے لئے نیکی کرنا بھی غلطی ہے۔ عاشق کی نظر صرف محبوب پر چاہیے۔ جب کسی بندہ پر عشق الٰہی غالب ہوتا ہے تو مال و اولاد اور نفس میں شرکت کی رگ کاٹ ڈالتا ہے۔ وہ اپنے کام کی اجرت دیدار یار کو قرار دیتا ہے۔ مولینا فرماتے ہیں۔

عاشقاں را شاد مانی و غم اوست　　دست مزدو اجرت خدمت ہم اوست
غیر معشوق ار تماشائی بود !!　　عشق نہ بود ھرزہ سودائی بود
عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت　　ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(روح البیان) مولینا غنیمت فرماتے ہیں ۔

بر آمد در مکتب خروشم　　کہ من سیپارۂ دل مے فروشم
بگفتہ قیمتش گفتم نگاہے　　بگفتہ کم ترک گفتم کہ گاہے

سیپارۂ دل کی قیمت یار کی نگاہ ناز ہے۔ اگر وہ کم کرائے تو نگاہ گاہ بگاہ کر لیا کرے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ قدرت نے قریباً

تمام چیزوں میں ظاہر و باطن رکھا ہے۔ ان دو کے ملنے سے چیز کام کی ہوتی ہے۔ ان کے بغیر بے کار' درخت کی شاخیں ظاہر ہیں۔ جڑ باطنی' مکان کی چھت و دیواریں ظاہر ہیں۔ بنیاد باطن۔ انجن کا ڈھانچہ ظاہر ہے۔ مشین باطن۔ انسان کے آنکھ' ناک' کان ظاہر ہیں۔ دل روح وغیرہ باطن ظاہر چھپاؤ تو چیز خراب ہو جاتی ہے۔ باطن کھولو تو چیز برباد' اگر درخت کی جڑ' مکان کی بنیاد کھل جائیں تو درخت سوکھ جائے گا۔ مکان خراب ہو جائے گا۔ ایسے ہی اعمال کا ایک ظاہر ہے دوسرا باطن' ظاہری اعضاء سے عمل کی شکل ظاہر ہے۔ دل کا اخلاص باطن ریاکار کے عمل کا باطن کوئی نہیں لہٰذا برباد ہے۔ اس کی مثال رب تعالیٰ نے پتھر کی چٹان پر دانہ بونے سے دی ہے کہ اس درخت کی جڑ باطن نہ بنی برباد ہو گیا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا
اور کہاوت ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں مالوں اپنے کو تلاش کرنے کے لئے مرضی اللہ کی اور ٹھہرانے کیلئے
اور ان کی کہاوت جو اپنے مال اللہ کی رضا چاہنے میں خرچ کرتے ہیں اور اپنے دل جمانے کو
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ
دلوں اپنوں کو مثل کہاوت اس باغ کے ہے جو اونچی جگہ میں ہے کہ پہنچا اسے تیز مینہ پس دے پھل اپنے وہ دوگنے
اس باغ کی سی ہے جو بھوڑ پر ہو اس پر زور کا پانی پڑا تو دونے میوے لائے پھر اگر زور
فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾
پس اگر نہ پہنچے اسے تیز مینہ پس اوس اور اللہ ساتھ اس کے جو کرتے ہو دیکھنے والا ہے
کا مینہ اسے نہ پہنچے تو اوس کافی ہے اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں باطل اور غیر مقبول صدقوں کی ایک مثال دی گئی تھی۔ اب صدقات مقبولہ کی نہایت نفیس مثال ارشاد ہو رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقات باطل ہونے کے اسباب بیان ہوئے۔ طعنے وایذا وغیرہ۔ اب قبولیت صدقات کے اسباب بتائے جا رہے ہیں۔ یعنی اخلاص اور اطمینان قلب۔ **تیسرا تعلق:** پہلے بھی صدقہ مقبول کی دانہ سے مثال دی جا چکی ہے اب اس کی مثال بہترین باغ سے دی جا رہی ہے۔ یعنی پہلے صدقہ کامل کی مثال تھی اور اب کامل تر کی۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ریا کے اعمال خصوصاً صدقے کا ذکر تھا۔ اب رضائے اعمال خصوصاً صدقات کا ذکر ہے۔ صدقات تین طرح کے ہیں۔ ریا کے لئے' طلب حیثیت کیلئے' رب کی رضا کیلئے۔ پہلا صدقہ بدترین ہے۔ تیسرا بہترین دو درمیانی درمیانی ہے۔

تفسیر

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ۔ مثل بمعنی مشہور مثال یعنی کہاوت ہے۔ الَّذِيْنَ سے مسلمان مراد ہے کیونکہ انہی کی خیرات

قبول ہوتی ہے۔ نفقہ سے صدقات وخیرات اور اموال سے ہر قسم کے مال مراد۔ اَمْوَالَهُمْ فرمانے میں اس جانب اشارہ ہے کہ جب وہ ان کے اپنے ہوں تب خیرات کریں۔ (یعنی زندگی وتندرستی میں مرتے وقت) مرنے کے بعد مال ورثاء کا ہو جاتا ہے۔ خیال رہے کہ قیمت اجرت ہدیہ نذرانہ عطیہ یہ کام نفقے ہیں۔ اگر یہ رضاء الٰہی کے لئے ہوں تو سب کا ثواب ہے۔ حج کی سواری کا کرایہ مسجد کی زمین خریدنا فقیر کو کچھ دینا۔ بچوں پر خرچ یہ سب اس یُنْفِقُوْنَ میں داخل ہیں۔ یعنی ان مسلمانوں کی کہاوت جو اپنے مال خیرات کرتے ہیں۔ اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ۔ اِبْتِغَا۔ باب افتعال کا مصدر ہے۔ بغی بمعنی طلب وتلاش سے بنا۔ کہا جاتا ہے بغیت خیال رہے کہ باغی بغاوت سے بنا ہے۔ نہ کہ بغی سے۔ یہاں ینفقون کا مفعول لہٗ ہے۔ لام پوشیدہ مرضات بمعنی رضا ہے۔ یعنی اللہ کی رضا تلاش کرنے کے لئے۔ بعض نے کہا کہ ابتغاء بمعنی اسم فاعل ینفقون کے فاعل سے حلال ہے۔ ابتغا اور مرضات میں دو طرف اشارہ ہے ایک یہ کہ تلاش کرنے والا ہر جگہ پر دروازہ پر جستجو کرتا ہے دنیا کا تلاشی نوکری تجارت کاشت غرضکہ جہاں تک اس کا بس چلتا ہے وہاں تک کاروبار کرتا ہے گمشدہ پیسے کا جویاں ہر دروازے پر ہر محلہ ہر شہر میں ڈھونڈتا ہے لہٰذا طالب مولیٰ کو چاہیے کہ اسے ہر دروازے پر ڈھونڈے جتنی نیکیاں کر سکے کرے حضرات اولیاء اللہ کے آستانوں کی حاضری دے۔ ہر جگہ صدقے دے حج زکوٰۃ نفلی صدقے غرضکہ صدقات کا تخم ہر جگہ بکھیرے نہ معلوم کہاں اور کب اگ پڑے ہر طلب میں جئے جستجو میں مرے دوسرا یہ کہ رب کی رضا چاہے۔ بلکہ مرضات چاہے پوری پوری اور خالص اس کی رضا تلاش کرے جس میں اپنے نفع کی خواہشات کا شائبہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ جنت حاصل کرنے دوزخ سے بچنے کی آرزو بھی شامل نہ ہو محض رضاء الٰہی کی نیت ہو وہ چیزیں مل ہی جائیں گی۔ جسے بادشاہ مل گیا اسے سب کچھ مل گیا۔ شعر

مروت نہ باشد کہ اہل صفا بخواہند غیر از خدا از خدا

وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ...... تثبیت ثبات سے بنا اس کے معنی تصدیق یا یقین یا تحقیق یا قرار یا برقرار رکھنا ہے مِنْ یا تو زائدہ ہے یا تبعیضیہ یا ابتدائیہ یا بمعنی لام (روح المعانی وکبیر وغیرہ) یہ ترکیب میں یا تو اَبتغاء پر معطوف ہے۔ اور ینفقون کا مفعول لہٗ یا تثبتون فعل محذوف کا مفعول مطلق یعنی اپنے نفس کو سکون وقرار دینے کے لئے خیرات کرتے ہیں کہ عبادات سے دل کا چین ہے۔ یا پہلے تحقیق کر لیتے ہیں کہ یہاں خرچ کرنے سے رب راضی ہوگا یا نہیں پھر خرچ کرتے ہیں۔ یا دلی اطمینان اور قبولیت کے یقین پر خرچ کرتے ہیں۔ یا صداقت ایمانی پر خرچ کرتے ہیں۔ یا اپنے نفسوں کو عبادت کا عادی بنانے کے لئے یا اپنے بعض نفس کو ایمان پر ثابت رکھنے کے لئے خیرات کرتے ہیں۔ یا خوشی سے اور رب تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خیرات کرتے ہیں کہ اس نے ہم کو اس عبادت کی توفیق بخشی۔ زکوٰۃ کو بوجھ ٹیکس سمجھ کر نہیں دیتے۔ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ۔ کاف تشبیہ کا اور مثل بمعنی کہاوت ہے۔ جنت کا مادہ جن بمعنی چھپنا ہے۔ جو باغ چار دیواری سے محفوظ کیا جائے۔ وہ جنت کہلاتا ہے۔ فراء نے کہا کہ بستان ہر باغ کو کہتے ہیں۔ اور جس باغ میں کھجوریں ہوں وہ جنت اور جس میں انگور ہوں وہ فردوس کہلاتا ہے۔ (خازن) ربوۃ ربوٌ سے بنا بمعنی زیادتی اور بلندی اسی لئے سود اور اونچی کھیتی کو ربو کہا جاتا ہے۔ اونچی نالی کو بھی رابیہ کہتے ہیں۔ اصطلاح میں اونچی اور اعلیٰ درجہ کی ہموار زمین کو ربوہ بولا جاتا ہے جو دریا کے سیلابوں اور شہر کے گندے پانیوں سے محفوظ رہے۔ جس کے درخت خوش نما اور پھل بے شمار ہوں۔ یعنی مسلمانوں کی خیرات اس باغ کی طرح ہے جو بلند اور اعلیٰ

درجہ کی زمین میں لگا ہو۔ اَصَابَهَا وَابِلٌ اَصَابَ اصابۃً سے بنا' بمعنی پہنچنا۔ وابل بمعنی تیز بوندوں والی بارش۔ اس لفظ کی تحقیق پچھلی آیت میں ہو چکی فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ۔ اکل اکلۃ کی جمع ہے بمعنی لقمہ اور کھانے کے قابل غلہ یہاں مراد باغ کے پھل ہیں۔ بعض نے کہا کہ اکل طعمہ کا ہم معنی ہے۔ ابو زید نے کہا کہ اکل بمعنی لذت بھی آتا ہے۔ ضِعْفَيْنِ ضعف کا تثنیہ ہے یہ بمعنی مثل بھی آتا ہے۔ اور بمعنی دگنا بھی یعنی اس باغ نے تیز بارش کی وجہ سے اپنے پھل دو مثل یعنی دگنے دیئے یا دگنے کے دگنے یعنی چوگنے دیئے۔ بعض نے فرمایا کہ تثنیہ کثرت کے لئے ہے۔ جیسے فَارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ یعنی اس نے بے شمار پھل دیئے (کبیر وغیرہ) خیال رہے کہ کسی فقیر کو ناگہانی آفت یا مصیبت سے بذریعہ صدقہ بچالینا۔ اور کسی کی آڑی حاجت نکال دینا کسی کسی کو میسر ہوتا ہے اور یہ ہی وہ تیز بارش کی مثل ہے جس سے اس کے پھل بہت ہوتے ہیں۔ اور کسی مسلمان کو پھانسی دینا بدترین جرم ہے جو بندہ مومن کی مدد کرتا ہے تو رب تعالیٰ ان کی مدد فرماتا ہے۔ آج مسلمان یہ سبق بھول گئے مومن کو پھانسی دینا کمال سمجھتے ہیں۔ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ۔ طل چھوٹی بوندوں والی ہلکی بارش تو شبنم ہی کافی ہوتی ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ۔ یہ مخلصین و منافقین سب ہی سے خطاب ہے یعنی اے لوگو اللہ تمہارے سارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ رضاء الٰہی کی طلب میں دلی اطمینان اور تصدیق قلبی کی بنا پر اپنے مال خیرات کرتے ہیں ان کی خیرات کی مثال اس باغ کی سی ہے جو اعلیٰ اور قابل پیداوار بلند میدان میں ہو کہ نہ وہاں گندی نالیوں کا پانی پہنچے اور نہ دریاؤں کے سیلاب' نہ گندی ہوائیں کہ جب اسے تیز بارش مل جائے تو دیگر باغوں سے دگنے پھل دے۔ اور اگر خشک سالی ہو جائے تو اسے شبنم ہی کافی ہو کہ اور باغ خشک ہو جائیں۔ مگر یہ جب بھی پھل دے۔ ایسے ہی مسلمانوں کی خیرات ہے کہ کبھی کمال اخلاص اور اعلیٰ مصرف میں خرچ ہو جانے کی وجہ انہیں دنیا میں بھی صدقہ کا نفع مل جاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ اور کبھی محض اخلاص کی وجہ سے اگر دنیا میں بدلہ نہ بھی ملے تو آخرت میں ضرور ملتا ہے۔ غرضکہ ان کا صدقہ کبھی برباد نہیں جاتا۔ یا کبھی کسی مصیبت زدہ کی دعا کی برکت سے ان کی آئی ہوئی مصیبتیں بھی ٹل جاتی ہیں۔ فرض بھی ادا ہو جاتا ہے رب کی رضا حاصل ہوتی ہے۔ اور جنت مل جاتی ہے۔ اگر ان کے صدقہ کو ایسی جوش کی دعا نہ ملے تب بھی رضاء الٰہی اور جنت کا استحقاق حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ خیال رہے کہ یہاں یا تو تشبیہ مرکب ہے یا مفرد' مسلمان گویا قابل کسان ہے اس کا صدقہ بہتر بیج' بہترین مصرف گویا عمدہ زمین کہ جہاں طعن و ایذا وغیرہ کے گندے پانی' اور ریا اور نام و نمود کی گندی ہوائیں نہیں پہنچتیں' دینے والے کا کمال اخلاص اور مصیبت زدہ فقیر کی جوش دل کی دعا گویا تیز بارش ہے۔ دنیا میں مال کا بڑھنا' بلاؤں کا ٹلنا آخرت میں رب کی رضاء جہنم سے نجات' جنت کی لذات' اس کا دگنا پھل' خیرات کے وقت کمال اخلاص کا نہ ہونا' یا کسی مصیبت زدہ کی پر جوش دعا کا نہ ملنا' یہ گویا تیز بارش کا نہ پہنچنا ہے۔ اور اصل اخلاص یہ گویا شبنم ہے۔ رب تعالیٰ سب کے اعمال سے خبردار ہے۔ بقدر عمل جزا عطاء فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اس صدقہ کو جو رضاء الٰہی کے لئے ہو۔ باغ سے تشبیہ دی ہے نہ کہ کھیت سے یہ چند وجہ سے ہے ایک یہ کہ کھیت صرف ایک بار ہی پھل دیتا ہے پھر کٹ جاتا ہے مگر ایک بار کا لگا ہوا باغ ہمیشہ پھل دیتا ہے۔ اچھے مومن کا صدقہ مقبول دنیا'

حشر' قبر ہر جگہ پھل دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ کھیت صرف پھل دیتا ہے سایہ ٹھنڈک زینت نہیں دیتا مگر باغ پھل بھی دیتا ہے سایہ رونق بھی دیتا ہے۔ ایسے مومن کا صدقہ مقبول ثواب کے پھل بھی دے گا اور قیامت میں سایہ و رونق بھی۔ تیسرا یہ کہ کھیت کی نگرانی آخر تک کرنی پڑتی ہے مگر باغ کی نگرانی ایک بار کر لی گئی پھر ہمیشہ کے لئے فارغ ہو گئے۔ نہ اسے پانی دینے کی ضرورت نہ صفائی کی حاجت مومن مرتے وقت تک اپنے صدقہ کی نگرانی کرتا ہے۔ پھر ابدالاباد تک وہ صدقہ محفوظ رہتا ہے چوتھا یہ کہ اگر کھیت پر آفت آ جائے تو بالکل بے کار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر باغ کو آفت پہنچ جائے تو صرف پھل برباد ہوں گے۔ لکڑی وغیرہ فائدہ دے گی۔ ایسے ہی مومن کا صدقہ اگر دنیا کا کام بھی نہ دے تو دوسری جگہ فائدہ مند ہے۔ پانچواں یہ کہ کھیت ایک ہی پھل دیتا ہے مگر باغ قسم قسم کے پھل دیتا ہے ایک باغ میں صدہا قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ ہر درخت کا پھل علیحدہ ایسے ہی مومن کا مقبول صدقہ بہت سے پھل دیتا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** چار چیزیں خیرات کو باطل کرنے والی ہیں۔ بے ایمانی' ریا کاری' احسان جتانا' فقیر کو ایذا پہنچانا' اور دو چیزیں خیرات کو قبول کرنے والی۔ ایمان اور اخلاص۔ **دوسرا فائدہ:** بوجھ یا ٹیکس سمجھ کر صدقہ دینا غیر مقبول ہے۔ خوش دلی سے ادا کرنا ضروری کہ تَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ کے ایک یہ بھی معنی کئے گئے۔ **تیسرا فائدہ:** صدقہ مقبول کے بھی مختلف درجے ہیں۔ بعض بہت نافع' بعض کم' جیسا کہ تیز بارش اور شبنم کی مثال سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: تم نے تثبیتاً کو مفعول لہٗ بنایا' اور معنی یہ کئے کہ خیرات کریں دل کو سکون دینے کے لئے حالانکہ سکون سے خیرات ہوتی ہے۔ نہ کہ خیرات سے سکون۔ **جواب:** محبت مال اور بخل وغیرہ نفس کی خاص صفتیں ہیں۔ خیرات کے وقت نفس مخالفت کرتا ہے اور صدقہ دینے والے کا مقابلہ' جو کوئی اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے خیرات کئے جائے تو آخر کار وہ اس کا عادی بن جاتا ہے اور نفس اس کی مخالفت چھوڑ دیتا ہے۔ تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کی طاقت توڑنے اور اسے مغلوب کرنے اور خیرات کا عادی بنانے کے لئے جو صدقہ کرے گا۔ اس کو یہ درجہ ملے گا۔ **دوسرا اعتراض:** مِّنْ أَنفُسِهِمْ میں مِنْ تبعیضیہ کیونکر درست ہوتا ہے۔ نفس تثبیت کا جزو نہیں؟ **جواب:** نفس زندگی اور مال کا عاشق ہے۔ جب خیرات کر کے اس کو دبایا گیا تو یہ بعض اعتبار سے دب گیا اور جب جہاد سے دبایا گیا تو بھی بعض لحاظ سے دبایا گیا اور اگر خیرات اور جہاد دونوں سے دبایا گیا تو پورا دب جاتا ہے گویا مال نفس کا جزو ہو چکا ہے (کشاف و کبیر) **تیسرا اعتراض:** اونچی زمین پر تو پیداوار کم ہوتی ہے کہ وہاں تک نہروں کا پانی نہیں پہنچتا۔ اور وہاں کی ہوا مضر ہے۔ پھر یہ تشبیہ کیونکر صحیح ہوئی؟ **جواب:** بلند زمینوں میں پیداوار زیادہ اور اس کے پھل اعلیٰ ہوتے ہیں۔ پہاڑی میوے' میدانی میوؤں سے بڑے ہوتے ہیں۔ نیز ربوہ سے اتنی اونچی زمین مراد نہیں کہ جہاں تک پانی ہی نہ پہنچے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ نشیب میں نہ ہو۔ جہاں نالیاں گرتی ہیں اور زمین گندی رہتی ہے اور بہت تری کی وجہ سے پیداوار اچھی نہیں ہوتی۔

تفسیر صوفیانہ

اعمال مثل تانبہ کے ہیں اور صدق و اخلاص ان کی کیمیا' جیسے کیمیا سے تانبا سونا جاتا ہے۔ ایسے ہی اخلاص سے اعمال مقبول' دنیا میں اضطراب ہے۔ اور دین میں سکون مراسم اور حرام موقعوں پر خرچ کرنے سے نفس تو خوش ہوتا ہے۔ مگر روح بے چین۔ اور اللہ کے لئے خیرات کرنے پر اگرچہ اولاً نفس کو تکلیف ہوتی ہے۔ مگر روح کو سکون۔ عوام مال خرچ کرتے ہیں۔ خواص اعمال اور خاص الخاص لوگ جان جیسا خرچ ویسی ہی جزاء مولینا فرماتے ہیں ؎

آں درم دادن سخی را لائق است — جان سپردن خود سخائے عاشق است

ناں دہی از بہر حق نانت دہند — جان دہی از بہر حق جانت دہند

در شریعت مال ہر کس مالِ اوست — در طریقت ملک ما مملوک دوست

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ صدقہ فقیر کے ہاتھ میں پہنچ کر نخی سے کہتا ہے کہ اب تک تو میرا محافظ تھا' اور اب میں تیرا محافظ ہوں۔ اب تک میں تیرا دشمن تھا اب سے تیرا دوست ہوں' مکحول شامی فرماتے ہیں کہ صدقہ کرتے وقت جہنم رب سے درخواست کرتا ہے کہ مولیٰ مجھے سجدۂ شکر کی اجازت دے۔ کہ آج امتِ محمدیہ میں سے ایک شخص مجھ سے آزاد ہوا کیونکہ مجھے محمد ﷺ سے حیا آتی ہے کہ ان کے امتی کو عذاب دوں مگر تیری اطاعت ضروری ہے (روح البیان) ثواب کی نیت سے خیرات کرنا بھی اخلاص ہے۔ مگر رضائے رب الارباب کی نیت سے خیرات کامل تر اخلاص کہ اس کی جزاء رفع درجات ہے اور اس کی جزاء قرب حق دولت وصال اور شہود جمال ذوالجلال' جنت و نعیم جنت تو نفع میں ہیں۔ وہ جنت کا طالب مگر اس کی جنت طلبگار۔ اس پر یہ صادق آتا ہے۔ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ۔ پہلے کے حق میں یہ جملہ ہے۔ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ یوں تو رب تعالیٰ کی ہر صفت کمال بے مثل ہے۔ مگر چند امور قابل لحاظ ہیں۔ دولت مند انسان غریب کے حقیر ہدیہ کو نظر میں نہیں لاتا۔ مگر رب غنی اخلاص کے ایک پیسہ سے خوش ہوتا ہے۔ دولت مند زیادہ مانگنے سے خفا ہوتے ہیں مگر رب تعالیٰ کے دروازہ پر بے شمار فقراء کا ہر وقت ہجوم اور سب کی حاجت روائی مولینا فرماتے ہیں۔ ؎

اے کہ باہر دل ترا راز دگر — ہر گدا را بر درت نازِ دگر

چاہیے کہ اپنے اعمال میں رضائے الٰہی کی نیت کرے کہ تمام نعمتیں اس کے تابع ہیں۔ مالک کو مقصود سمجھو تو ہر مقصود خود بخود موجود ہوگا۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ خرچ فی سبیل اللہ عام ہے اور خرچ رضاء الٰہی کے لئے خاص جنت حاصل کرنے' دوزخ سے بچنے' اپنے گناہوں کی معافی چاہنے' نعمت الٰہی پر صدقہ کرنے اور رب کو راضی کرنے کے لئے خرچ یہ تمام فی سبیل اللہ ہیں۔ مگر مرضات اللہ خرچ صرف وہ ہی ہے جس میں اپنی کوئی دینی و دنیاوی غرض شامل نہ ہو۔ نہ حصول جنت کی نہ نجات دوزخ کی صرف رب کو خوش کرنا منظور ہے اس لئے رب نے پہلے خرچ فی سبیل اللہ کو اس دانہ سے تشبیہ دی جس سے سات سو دانہ پیدا ہوں۔ اور اس آیت میں خرچ مرضات اللہ کو پورے باغ سے تشبیہ دی۔ یہ باغ اس دانہ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے خرچ فی سبیل اللہ ابتدائی منزلیں ہیں اور رضاء مولیٰ کے لئے خرچ سالک کی انتہائی منزلیں جو کسی خوش نصیب کو کبھی نصیب ہوتی ہے۔ انسان اس کی کوشش ضرور کرے۔ مگر اس کے انتظار میں خرچ فی سبیل اللہ سے باز نہ رہے کئے جائے کبھی یہ منزل بھی میسر ہو جائے گی۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
کیا پسند کرتا ہے کوئی تمہارا یہ کہ ہو واسطے اس کے باغ کھجوروں اور انگوروں سے بہتی ہوں نیچے سے اس کے
کیا تم میں سے کوئی اسے پسند رکھے گا کہ اس کے پاس ایک باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا جس کے نیچے
الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ
نہریں واسطے اس کے بیچ اس کے ہر پھلوں میں سے ہے اور پہنچا اس کو بڑھاپا اور واسطے اس کے اولاد ہے کمزور
ندیاں بہتیں اس کے لئے اس میں ہر قسم کے پھلوں سے ہے اور اسے بڑھاپا آیا اور اس کے ناتوان
فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
پس پہنچا اس باغ کو بگولا کہ بیچ اس کے آگ ہے پس جل گیا اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ واسطے تمہارے آیتوں
بچے ہیں تو آیا اس پر ایک بگولا جس میں آگ تھی تو جل گیا ایسا ہی بیان کرتا ہے اللہ تم سے اپنی آیتیں
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾
کو تاکہ تم غور کرو
کہ کہیں تم دھیان لگاؤ

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس رکوع میں تین قسم کے صدقات کا بیان ہوا ہے۔ پہلی قسم وہ جس میں صحت اور بقاء کے شرائط پائے جائیں۔ جس کا ذکر شروع رکوع اور مثالوں کے ضمن میں ہوا۔ دوسری قسم وہ جس میں شرط صحت یعنی ایمان و اخلاص ہی نہ پایا جائے۔ اس کا ذکر کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ (بقرہ: ۲۶۴) میں ہوا۔ اب تیسری قسم کا بیان ہے کہ جس میں صحت کی شرط تو تھی مگر شرط بقاء یعنی احسان اور ایذا سے محفوظ ہونا ندارد۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقہ غیر مقبول کی وہ صورت بیان کی گئی کہ جس کی زمین ہی خراب ہو اب اس کا ذکر ہو رہا ہے کہ جس کی زمین بھی عمدہ ہو اور اسے پانی بھی مناسب ملے مگر خراب ہوا سے بگڑ جائے۔ گویا پہلے اس صدقہ کا ذکر تھا جو اصل سے باطل ہو۔ اب اس کا ذکر ہے جو اصل سے صحیح اور کسی عارضہ سے برباد۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اعلیٰ درجہ کے صدقے مقبول کی مثال دی گئی تھی اور اب اس صدقہ کی مثال دی جا رہی ہے جو اصل میں اعلیٰ اور آخر میں باطل ہو۔

تفسیر

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ۔ یہ استفہام انکاری ہے یَوَدُّ وِدٌ سے بنا بمعنی کامل محبت اسی سے ودودٌ ہے۔ اَحَدُكُمْ میں یا مسلمانوں سے خطاب ہے یا کفار سے یا سب سے اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ۔ یہ جملہ یَوَدُّ کا مفعول ہے۔ جنت گھنے باغ

کی زمین کو بھی کہتے ہیں اور درختوں کو بھی۔ مگر یہاں درخت مراد ہیں کیونکہ درختوں ہی کے نیچے نہر جاری ہوتی ہے نہ کہ زمین کے نیچے اور لو یا بگولے سے درخت جلتے ہیں نہ کہ زمین مِنْ بیانیہ ہے کائنۃ پوشیدہ کے متعلق اور یہ جنت کی صفت ہے۔ نخیلٍ یا تو نخل کی جمع ہے یا اسم جمع' یا اسم جنس بمعنی درخت کھجور اعناب عنبۃ کی جمع ہے۔ عنب انگور کی بیل اور پھل دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جہاں کہیں قرآن میں نخل اور عنب جمع ہو کر آتا ہے تو نخل سے درخت کھجور مراد ہوتا ہے نہ کہ پھل' اور اعناب سے انگور کا پھل مراد ہوتا ہے نہ کہ بیل (روح المعانی) یا تو یہ مراد ہے کہ وہ کھجور اور انگور ہی کا باغ ہے یا یہ کہ اس باغ میں انگور اور کھجور بھی کثرت سے ہیں لَهٗ جَنَّةٌ میں چند لطیف اشارے ہیں۔ ایک یہ کہ باغ اس بڈھے کا اپنا ہے کسی دوسرے کا پٹہ پر لیا ہوا نہیں دوسرا یہ کہ وہ باغ خود اس بڈھے نے ہی لگایا ہے۔ اس کے باپ دادا کا لگایا ہوا نہیں خود اپنی محنت کی چیز بڑی پیاری ہوتی ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ باغ ہے کھیت نہیں' کھیت جلنے پر صدمہ کم ہوتا ہے یا مالک سمجھتا ہے کہ میں نے ابھی بویا تھا۔ اور اب پھر دوسرا بو لوں گا۔ باغ جلنے کا صدمہ زیادہ کہ عمر بھر میں ایک بار بویا جاتا ہے اس کے جل جانے کے بعد اب دوسرا باغ بو کر بہار نہیں کھا سکتا۔ چوتھا یہ کہ وہ باغ ایک پھل کا نہ تھا سال میں چار ماہ پھل دے آٹھ ماہ یوں ہی رہے۔ بلکہ ہر قسم کے پھلوں کا باغ تھا۔ جس کے پھل سال بھر تک بازار میں پہنچتے ہیں۔ آمدنی ہوتی رہتی ہے۔ پانچواں یہ کہ اس باغ میں کھجور بکثرت ہے۔ جس کا پھل' لکڑی' پتے وغیرہ سب ہی کام آتے ہیں۔ عرب لوگ کھجور کا شربت' گڑ بناتے اس میں چائے پکاتے ہیں۔ اس کے تنے شہتیر شاخوں کی کڑیاں' پتوں کی چھت مکان میں ڈالتے ہیں۔ غرضکہ کھجور ان کی زندگی کا سہارا ہے۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ یہ جملہ جنت کی صفت ہے' یا اس کا حال۔ انہار سے مراد پانی کی چوڑی نالیاں ہیں۔ جو مختلف سمتوں میں بہتی ہوں۔ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ۔ لَهٗ پوشیدہ مبتدا کی خبر ہے ثابت کا متعلق فِیْهَا ثَابِتٌ کی ضمیر سے حال اور مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ۔ اس پوشیدہ مبتدا کی صفت مِنْ زائدہ ہے یا بیانیہ یعنی اس باغ میں باغ والے کے لئے ہر قسم کا رزق ہے ثمرات سے بہت پھل مراد ہیں نہ کہ عام کیونکہ وہ باغ تو صرف انگور اور کھجور کا ہی ہے اور اگر مختلف میووں کا بھی ہو تب بھی عام پھل مراد نہیں لئے جاسکتے کیونکہ ایسا باغ دنیا میں کوئی نہیں جس میں دنیا بھر کے سارے پھل ہوں۔ بعض زمین بعض پھلوں کے لئے موزوں ہوتی ہے اور دوسری دوسرے پھلوں کے لئے اس لئے تمام پھلوں کا اجتماع ایک زمین میں ہونا ناممکن ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ ثمرات سے مراد منافع ہیں۔ یعنی اس باغ سے مالک کو ہر قسم کا نفع ہے کہ پھلوں کو کھاتا ہے۔ درختوں کی لکڑیاں جلاتا' اور ان سے عمارات بناتا ہے۔ اور پیداوار کی قیمت سے اپنی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ۔ ظاہر یہ ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور قد پوشیدہ اور یہ جملہ یَوَدُّ کے فاعل کا حال اور ہو سکتا ہے کہ عاطفہ ہو اور تکون پر معطوف' اور یہ ماضی بمعنی مضارع ہو' یا تکون بمعنی ماضی کبر بمعنی بڑھانا یعنی بڑی عمر' یعنی اس باغ کے سوا کسی اور ذریعہ سے وہ روزی حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ بوڑھا ہے۔ محنت مزدوری کے لائق نہیں۔ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ یہ جملہ اصابہ کی ضمیر سے حال ہے۔ لہٗ خبر۔ ذریۃ مبتداء۔ ذریت' ذرّ سے بنا بمعنی چھوٹی چیونٹی۔ اسی مناسبت سے ریت کے ذروں کو ذرہ کہتے ہیں۔ یہاں چھوٹی اولاد کے معنی میں ہے۔ ضعفاء جمع ضعیف کی ہے جیسے امیر کی جمع امراء اور غریب کی غربا یعنی وہ باغ والا خود بڈھا ہو اور اس کی اولاد کمزور ناتواں کہ اس کا بوجھ بھی اسی پر ہو جس کی وجہ سے باغ کی اور بھی زیادہ حاجت ہو کہ اگر باغ نہ رہے تو خود بھی بھوکا مرے اور

بچوں کو بھی بھوک سے بلکتے دیکھے۔ ماں باپ پر اولاد کی تکلیف بہت گراں ہوتی ہے۔ فَاَصَابَهَا اِعْصَارٌ اعصار عصر سے بنا بمعنی نچوڑنا' اصطلاح میں اس گھومنے والی ہوا کو کہتے ہیں۔ جس میں غبار مینارے کی طرح بن کر گھومتا ہوا بھاگتا ہے۔ اسے عربی میں زوبعہ بھی کہتے ہیں۔ اردو میں بگولا' اعصار کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جیسے کپڑے کو نچوڑتے وقت بل دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ ہوا بھی بل کھاتی ہوئی جاتی ہے۔ یا یہ ہوا بادل کو نچوڑ دیتی ہے۔ یا کبھی جس جسم کو لگ جائے اس کا خون نچوڑ کر مردہ کر دیتی ہے۔ خیال رہے کہ اعصار کی تنوین تعظیمی ہے۔ یعنی عظیم الشان بگولا' اور بگولا بھی عام نہیں بلکہ فِيْهِ نَارٌ اس میں غضب کی آگ ہے چونکہ اعصار مذکر ہے۔ اس لئے ضمیر مذکر لائی گئی۔ اور نار سے مراد تیز لو ہے۔ فَاحْتَرَقَتْ۔ یہ حرق سے بنا بمعنی جلنا' اس کا فاعل جنت ہے۔ باب افتعال میں آ کر مبالغہ کے معنی پیدا ہوئے یعنی وہ باغ بالکل جل گیا کہ نہ پھل بچے نہ شاخیں نہ جڑ كَذٰلِكَ ذالک سے۔ یا تو اسی مثال کی طرف اشارہ ہے یا ساری مثالوں کی طرف يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ۔ اٰيٰتِ سے یا قرآنی آیتیں مراد ہیں' یا تمام دلائل قدرت لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۔ لَعَلَّ بمعنی کے ہے (روح المعانی) تفکر بمعنی عبرت پکڑنا' یا فکر کا استعمال کرنا اور قوت فکریہ کو حرکت دینا۔

خلاصہ تفسیر

اے خیرات کرنے والو! بھلا سوچو تو کہ تم میں سے یہ بات کسے پسند ہوگی کہ اس کے پاس کھجور اور انگور کا گھنا باغ ہو۔ جس کے نیچے پانی کی نہریں چلتی ہوں' جس سے وہ باغ خوب ہرا بھرا ہو کر دیکھنے میں بھلا معلوم ہوتا ہو اور اس میں ہر طرح کا آرام بھی ہو۔ اور خوب پھلوں سے لدا بھی ہو یا کھجور' انگور کے علاوہ اس میں اور بھی ہر قسم کے پھل اور میوے ہوں اور باغ والا بڈھا ہو جس کی گزر اوقات اس باغ پر ہو۔ کسی اور کمائی کے لائق نہ ہو۔ اس کے باوجود اس کے چھوٹے ناتواں بچے بھی ہوں جن میں کمانے کی قوت نہیں۔ اور اس بڈھے کو ان بچوں سے خبر گیری کی کوئی امید نہ ہو بلکہ ان سب کا بوجھ اسی پر ہو۔ اور سب کا ذریعہ معاش یہ باغ ہی ہو۔ ایسی حالت میں اچانک اس باغ پر ایک لو کا بگولا آئے جس میں سخت مہلک آگ ہو۔ جس سے وہ ہرا بھرا باغ آن کی آن میں جل کر تباہ ہو جائے کہ نہ پھل رہے نہ شاخیں' نہ پتے' نہ لکڑیاں' نہ جڑ بلکہ راکھ کا ڈھیر نظر آئے۔ اس وقت اس کا رنج و غم بیان سے باہر ہوگا کہ اس بڈھے کا خرچ پورا' آمدنی کے اسباب ندارد' سخت بے کسی' بے بسی کا وقت ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کوئی پسند نہ کرے گا۔ اسی کی مثل یہ ہے کہ کوئی اولاً صدقہ دے یا نیک اعمال کرے' جس کے قیامت میں کار آمد ہونے کی امید ہو۔ بعد میں اس خیرات پر طعنہ دے کر یا ایذا پہنچا کر اسے برباد کر دے۔ جب قیامت کا دن آئے اور یہ سخت محتاج و مجبور ہو' اور کوئی اس کی دستگیری کرنے والا بھی نہ ہو' اس وقت اسے عبادات کا باغ اجڑا ہوا اور پھل تباہ شدہ ملیں۔ بتاؤ اس دن اسے کیسے بے بسی اور حسرت ہوگی۔ اور اس کی آرزوؤں کا کس بری طرح خون ہوگا۔ جب تم اس ہرے بھرے باغ کا اجڑنا پسند نہیں کرتے' تو اپنے صدقات اور عبادات کے باغ کو ریاکاری' احسان وایذا سے کیوں آگ لگاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ تم ان میں سوچ و بچار کر کے اپنی حالت سنبھالو۔ **خیال رہے** کہ یہ تشبیہ' تشبیہ مفرد بھی ہو سکتی ہے اور مرکب بھی۔ ایمان باغ کی زمین ہے۔ مختلف اعمال اس کے پھل والے درخت' اخلاص اور اچھی نیت اس باغ کی نہریں' امید ثواب اس باغ کے کچے پھل' جن کے پکنے کا انتظار ہو' یا احسان جتانا فقیر کو ایذا دینا وغیرہ یہ آگ والا

بگولا جس سے یہ باغ تباہ ہو جائے' قیامت کا دن گویا اس کے بڑھاپے کا وقت' نہ کام آنے والے اہل قرابت واولاد اس کی کمزور ذریت' اس دن کی انتہائی پریشانی' یہ گویا باغ والے کی حسرت ہے (روح المعانی وغیرہ نے بحوالہ بخاری وحاکم وغیرہ) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جماعت صحابہ کرام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سے عرض کیا کہ یہ ہر اس شخص کی مثال ہے جو پہلے نیکیاں کرے اور پھر شیطان اس سے گناہ کرا کے اس کے نیکیوں کے باغ کو آگ لگا دے۔ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اس قول کی بنا پر یہ آیت فقط صدقات کے لئے ہی نہیں' بلکہ ساری نیکیوں کے لئے ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** تبلیغ ووعظ کے لئے مثالیں بہت ضروری ہیں کہ اس سے غیر محسوس مثل محسوس ہو جاتا ہے اسی لئے رب تعالیٰ نے بہت مثالیں بیان فرمائیں۔ ہم اس کی پوری تحقیق اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ (بقرہ:۲۶) کی تفسیر میں کر چکے۔ **دوسرا فائدہ:** عمل کا مدار خاتمہ پر ہے۔ زندگی میں سارے اعمال اس کچی کھیتی کی طرح ہیں۔ جس پر بہت سی آفتوں کا خطرہ ہے۔ لہٰذا کوئی بھی اپنے مال پر نازاں نہ ہو۔ **تیسرا فائدہ:** رب کے افعال کو مجازاً مخلوق کی طرف نسبت کر سکتے ہیں کہ یہاں باغ کے جلانے اور برباد کرنے کو بگولے کی طرف نسبت کیا گیا۔ ورنہ فاعل حقیقی رب تعالیٰ ہے۔ **چوتھا فائدہ:** ادب یہ ہے کہ بندہ بھلائی کو رب کی طرف اور برائی کو اپنی طرف نسبت دے۔ دیکھو باغ کا جلانا بگولے کی طرف نسبت کیا گیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَھُوَ یَشۡفِیۡنِ۔ (شعراء:۸۰) اور جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو رب مجھے شفا دے دیتا ہے۔ بیماری کو اپنی طرف اور شفاء کو رب کی طرف نسبت دی۔ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو وداع کرتے وقت فرمایا فَاَرَدۡتُّ اَنۡ اَعِیۡبَھَا۔ (کہف:۷۹) میں نے چاہا کہ کشتی کو عیب ناک بنا دوں عیب دار کرنے کو اپنی طرف نسبت کیا وہاں بھی فرمایا فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنۡ یَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّھُمَا (کہف:۸۲) رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے جوان ہو جائیں یہ ہے ان حضرات کا ادب۔ **پانچواں فائدہ:** جیسے دنیا میں کام بگاڑنا آسان ہے مگر بنانا مشکل باغ لگانا مشکل' مکان بنانا مشکل مگر انہیں اجاڑ دینا آسان' کسی کو دوست بنانا مشکل ہے مگر دوستی ختم کر دینا آسان کنویں سے نکلنا مشکل ہے مگر گر جانا آسان۔ ایسے ہی آخرت کے متعلق سوچ لو کہ اسے بنانا مشکل ہے بگاڑنا آسان' شیطان کی لاکھوں برس کی عبادتیں صرف سجدہ کے انکار کر دینے پر برباد ہو گئیں برباد ہوتے ایک منٹ نہ لگا رب تعالیٰ بنانے کی توفیق دے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہ تشبیہ صحیح نہیں کیونکہ اس باغ میں صرف کھجور اور انگور کے درختوں کا ذکر تھا مگر بعد میں فرمایا گیا کہ اس میں ہر قسم کے پھل ہو سکتے ہیں دو قسم کے درخت میں دو ہی طرح کے پھل ہوتے ہیں۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ یا تو کھجور اور انگور کا ذکر عظمت کی وجہ سے کیا گیا ہے ورنہ اس باغ میں ہر قسم کے درخت ہیں یا مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ سے بہت سے انگور اور کھجور مراد ہیں۔ کُلٌّ بمعنی کثیر۔ **دوسرا اعتراض:** وَاَصَابَہُ الۡکِبَرُ۔ میں اصاب فعل ماضی ہے۔

اس کا عطف تکون مضارع پر کیونکر صحیح ہے۔ عطف میں معطوف اور معطوف الیہ یکساں چاہئیں؟ **جواب:** تفسیر سے معلوم ہوا کہ واؤ یا تو حالیہ ہے یا اَصَابَ بمعنی مضارع۔ یا اَنْ تَكُوْنَ بمعنی ماضی یعنی لَوْ كَانَتْ بِهٖ۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت میں دو شخصوں کی مثال دی ہے ایک راہِ حق میں خرچ کرنے والا دوسرا باطل رسموں میں۔ کہ پہلے شخص کو اچھا بدلہ' دونوں جہان میں عزت' رب تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے کو ضبطی اعمال' خسارہ مال' برائی حال اور انقال وبال۔ کانٹے بونے والا کانٹے ہی کاٹے گا۔ اور پھل کے بیج بونے والا' عمدہ پھل' معاذ ابن جبل فرماتے ہیں کہ اپنے دین کو خالص کر دو۔ تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ریا کے دو علاج ہیں۔ ایک ریا کے اسباب کا ختم کر دینا دوسرا ریا کے شبہات سے بچنا۔ پندرہ شخصوں کا شیطان دشمن ہے۔ (۱) نبی (۲) بادشاہ عادل (۳) انکسار کرنے والا غنی (۴) سچا تاجر (۵) عاجزی کرنے والا عالم (۶) خیر خواہ مومن (۷) رقیق القلب مومن (۸) تائب بندہ (۹) متقی (۱۰) ہمیشہ باوضو رہنے والا آدمی (۱۱) سخی مرد (۱۲) خلیق (۱۳) لوگوں کو نفع پہنچانے والا۔ (۱۴) ہمیشہ تلاوت قرآن کرنے والا (۱۵) تہجد گزار دس ۱۰ شخصوں سے شیطان کو بہت محبت ہے۔ (۱) ظالم بادشاہ۔ (۲) غنی متکبر (۳) بددیانت بیوپاری (۴) شرابی (۵) چغل خور (۶) ریا کار (۷) سود خور (۸) مال یتیم کھانے والا (۹) زکوٰۃ نہ دینے والا۔ (۱۰) لمبی امیدیں رکھنے والا۔ ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ اپنی کشتی کی مرمت کرتے رہو۔ کیونکہ سمندر بہت گہرا ہے۔ زیادہ توشہ ساتھ لو۔ کہ سفر دراز ہے۔ اپنا بوجھ ہلکا رکھو کیونکہ راستہ خطرناک ہے۔ عمل کو ریا سے پاک رکھو۔ پرکھنے والا سمیع بصیر ہے۔ جہاں کسی کا دھوکا نہیں چل سکتا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اسی زمین سے پھل بوٹے' پھل پھول سبزے نکلتے ہیں اور اس زمین سے خاردار درخت اور زہریلی گیس زہریلے جانور نکلتے ہیں ایک ہی زمین کے مہر و قہر کی مظہر ہے یوں ہی ہمارا جسم گویا زمین ہے۔ اس سے ایمان' نماز' حج وغیرہ عبادات حاصل ہوتی ہیں۔ اور اسی سے کفر' شرک' گناہ وغیرہ صادر ہوتے ہیں۔ انسان بعض کام ایسے کر لیتا ہے' جس سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور بعض بات ایسی بک دیتا ہے جس سے ساری نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ اس خیمہ میں دل و نفس دو متضاد چیزیں جمع ہیں۔ دل کا میلان نیکیوں کی طرف ہے۔ نفس کا میلان برائیوں کی طرف' گویا ایک کمرہ میں رومی و حبشی بٹھا دیئے گئے ہیں۔ رومی کو گرمی کی برداشت نہیں اور حبشی کو سردی کا تحمل نہیں۔ اس کشمکش میں اللہ تعالیٰ ہی دستگیری کرے تو بیڑا پار ہو جائے۔ کوشش کی جائے کہ عبادات و ایمان کا لہلہاتا باغ اجڑ نہ جائے مگر صرف اپنی کوشش پر اعتماد نہ کرے۔ رب کی مہربانی مانگے۔ ہم ضعیفوں کو وہ ہی اپنی مہربانی میں لینے والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ

اے وہ لوگو جو ایمان لائے خرچ کرو پاک چیزوں میں سے جو کمایا تم نے اور اس سے جو نکالا ہم نے واسطے تمہارے

اے ایمان والو اپنی کمائیوں سے کچھ دو اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا اور

مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ

زمین سے اور نہ قصد کرو خراب کا اس سے خرچ کرتے ہو حالانکہ نہیں ہو تم لینے والے اس کے
خاص ناقص کا ارادہ نہ کرو تو کہ دو اس میں سے اور تمہیں ملے تو نہ لو گے جب تک
اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾
مگر یہ کہ چشم پوشی کرو بیچ اس کے اور جانو کہ تحقیق اللہ بے پرواہ حمد کیا ہوا ہے
اس میں چشم پوشی نہ کرو اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہ سراہا گیا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں خیرات رد ہونے کے اسباب بیان ہوئے۔ اب قبولیت صدقہ کے اسباب بیان ہو رہے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** قبولیت صدقہ کے لئے بہت سی شرطیں ہیں۔ کچھ وہ جو خیرات کرنے والے میں ہونی چاہئیں جیسے اخلاص اور ریا وغیرہ سے دوری' اور کچھ وہ جو مال میں ہونی چاہئیں۔ پہلی قسم کی شرائط کا ذکر پہلی آیت میں ہوا۔ دوسری قسم کی شرائط کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقے کو اصل سے برباد کرنے والے عیوب کا ذکر تھا۔ اب ان چیزوں کا ذکر ہے جن سے صدقہ بالکل تو برباد نہیں ہوتا مگر اعلیٰ درجہ کا مقبول بھی نہیں ہوتا۔

شانِ نزول

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت زکوٰۃ کے متعلق نازل ہوئی کچھ لوگ اپنے خرموں کے دو حصے کر دیتے تھے۔ کھرے علیحدہ اور ردی علیحدہ جب صدقہ وصول کرنے والا ان کے باغ میں پہنچتا' تو ردی میں سے دیتے۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری (روح المعانی) تفسیر درمنثور نے بحوالہ بیہقی وطبرانی ابو داؤد ونسائی روایت کی کہ ایک بار نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو صدقہ کا حکم دیا تو بعض لوگ ردی خرموں کے خوشے لے کر حاضر ہوئے۔ ان کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ بعض انصاری ردی خرموں کے خوشے مسجد نبوی میں ٹانگ دیتے تھے تاکہ اہل صفہ کھالیں۔ ایک بار حضور ﷺ نے ان میں سے کچھ خرمے جھاڑ کر فرمایا کہ کیا ان کا خیرات کرنے والا ناقص ثواب ہی چاہتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی (درمنثور وکبیر وغیرہ)

تفسیر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔ یہاں صرف مسلمانوں سے خطاب ہے کہ ثواب کے مستحق یہ ہی لوگ ہیں۔ کفار کیسا ہی نفیس مال خرچ کریں۔ اجر کے ہرگز مستحق نہیں۔ **اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ** یہ امر وجوب کے لئے ہے جیسا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے معلوم ہوا اور خرچ سے صدقات واجبہ زکوٰۃ' فطرانے وغیرہ مراد ہیں اور ہو سکتا ہے کہ امر استحبابی ہو اور خرچ سے نفلی صدقے مراد ہوں جیسا کہ دوسری روایتوں سے پتہ لگتا ہے مگر پہلا قول قوی ہے۔ طیبات' طیبۃ کی جمع ہے یہ خبیث کا مقابل ہے۔ اس کے معنی حلال بھی ہیں اور کھرا بھی۔ مگر یہاں کھرا مال مراد ہے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا اور ہو سکتا ہے کہ

دونوں ہی معنی مراد ہوں یعنی شرعاً وعقلاً وطبعاً پسندیدہ مال وہ ہی ہوگا جو حلال بھی ہو اور کھرا بھی۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اَنْفِقُوْا سے حلال مال مراد ہے۔ اور طیبات سے کھرا' کیونکہ حرام مال کی خیرات بھی حرام ہے۔ دراصل طیبۃ طیب سے بنا بمعنی دل کی پسندیدگی رب فرماتا ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء: ۳) اس لئے خوشبو کو طیب کہتے ہیں کہ وہ دل پسند چیز ہے پھر کھری اور چنی ہوئی اچھی چیز کو طیب کہتے ہیں۔ اس لئے مدینہ منورہ کا نام طیبہ بھی ہے یعنی صاف کی ہوئی چھانٹی ہوئی بستی کہ رب نے یہاں کی وبا نکال کر اسے مقام شفاء بنا دیا طیبات جمع فرما کر بتایا کہ اپنی ہر دل پسند چیز میں سے خیرات کرو' روپیہ پیسہ' کھانا' پانی' لباس' پھل فروٹ وغیرہ میں مرغوب' پاکیزہ چیز سے خرچ کرو۔ مَا كَسَبْتُمْ میں ما یا موصولہ ہے اور كَسَبْتُمْ اس کا صلہ۔ یا ما مصدریہ بمعنی مکسوب۔ خیال رہے کہ کسب وہ ہر کام ہے جو نفع کی غرض سے کیا جائے اس میں تجارتی مال سونا' چاندی' جانور وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کھرے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو' بہترین خیرات وہ ہے جو اپنی کمائی سے ہو۔ کسب سے حلال کسب مراد ہے لہٰذا ناچ گا کر' جوئے شراب سے پیسہ کمانا ہی حرام ہے اور اس حرام کمائی سے خیرات کرنا بھی حرام ہے اس لئے بعض لوگ خیرات میں سب وحج میں بہت حلال کمائی خرچ کرتے ہیں۔ بعض محتاط لوگ قرض لے کر خیرات یا حج کرتے ہیں پھر قرض اپنی کمائی سے ادا کرتے ہیں۔ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ واؤ عاطفہ ہے۔ اور مِنْ تبعیضیہ' اور ما سے ہر زمینی پیداوار مراد ہے۔ خواہ ترکاریاں ہوں یا پھل یا غلے وغیرہ یعنی اس میں سے بھی خیرات کرو۔ جو ہم تمہارے لئے زمین سے نکالیں۔ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ۔ تَيَمَّمُوا ام سے بنا بمعنی قصد اَمَمْتَ' تَمَمْتُ اور تَاَمَّمْتُ وَيَتَمَمْتُ سب کے ایک ہی معنی ہیں تیمم کو بھی اس لئے تیمم کہا جاتا ہے کہ اس میں پانی چھوڑ کر مٹی کا قصد ہے۔ خبیث طیب کا مقابل ہے۔ بمعنی ناپسندیدہ' ہر خسیس چیز خبیث ہے۔ خواہ محسوس ہو' یا معقول۔ غلط اعتقاد۔ برے افعال گندی چیزیں برے لوگ سب کو خبیث کہا جاتا ہے۔ جیسے يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷) بمعنی گندی چیزیں كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ (انبیاء ۷۴) بمعنی بدعملیاں اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ۔ (النور: ۲۶) بمعنے گندے لوگ۔ یہاں اگر طیب سے حلال مراد تھا تو خبیث سے حرام اور اگر اس سے کھرا مال مراد تھا تو خبیث سے ردی مال۔ اور اگر طیب سے مراد خوش دلی سے دیا ہوا مال تھا۔ تو خبیث سے مراد ہوگا ناخوشی سے دیا ہوا مال غرضکہ خبیث یا خبث بمعنی میل کچیل سے بنا یا خباثت یعنی باطنی واندرونی نجاست سے بنائی ہے ظاہری پاکی کو طہارت کہتے ہیں اور ظاہری گندگی کو نجاست اور باطنی پاکی کو طیب کہتے ہیں۔ باطنی ناپاکی کو خباثت' یہاں طیب وخبیث کی بہت تفسیریں ہو سکتی ہیں۔ یعنی حرام اور ردی مال کی خیرات کا ارادہ بھی نہ کرو مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ جار مجرور' تنفقون کے متعلق ہے۔ اور ضمیر کا مرجع خبیث ہے متعلق کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ یہ جملہ تَيَمَّمُوا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی کہ صرف ردی ہی سے خرچ کرو۔ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ یہ تُنْفِقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی تم ردی مال خیرات تو کرتے ہو مگر خود تم اس کا لینا گوارا نہیں کرتے۔ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔ یا تو ظرف ہے اور اَنْ سے پہلے وقت پوشیدہ ہے یا باپ پوشیدہ ہے۔ تُغْمِضُوْا' اغماض سے بنا بمعنی آنکھ بند کرنا۔ غفلت سستی کو بھی اسی مناسبت سے اغماض کہا جاتا ہے۔ چھپی بات کو کلام غامض اور محفوظ جگہ کو ارض غمض کہتے ہیں۔ یہاں درگزر' چشم پوشی مراد ہے۔ واعلموا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ۔ حمید یا تو بمعنی اسم فاعل ہے یا اسم مفعول یعنی جان رکھو کہ اللہ تمہاری

خیرات سے بے پرواہ اور مستحق حمد یا خیرات کرنے والوں کی حمد فرمانے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! راہ خدا میں اپنی حلال اور کھری کمائیوں اور اپنی زمین کی پیداوار میں سے اعلیٰ چیزیں خرچ کرو۔ ردی اور حرام چیزوں کے خیرات کرنے کا ارادہ بھی نہ کرو کہ تم خیرات تو ردی میں سے کرو۔ اگر تمہیں کوئی ردی چیز ہدیہ دے یا تمہارا حق ردی سے ادا کرے تو تم کبھی اسے نہ لو۔ ہاں اگر درگذر کر جاؤ اور چشم پوشی اور رعایت سے کام لو اور قبول کرلو تو دوسری بات ہے تو جو چیز تم لینا نہیں پسند کرتے وہ خدا کے لئے کیوں دیتے ہو۔ یقین رکھو کہ رب تعالیٰ تمہارے صدقات کا محتاج نہیں جو ایسی ناکارہ چیزوں سے بھی خوش ہو جائے۔ وہ بڑا غنی تعریف کے لائق ہے۔ یعنی ذات وصفات میں کامل ہے۔ تو اس کے دربار میں بھی کامل۔ اور قابل تعریف چیز ہی پیش کرنی چاہیے۔ یا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ غنی اور بندوں کے اعمال کی تعریف فرمانے والا ہے۔ تو چاہیے کہ قابل تعریف چیز پیش کی جائے تاکہ دینے والے کی تعریف ہوں۔ خیال رکھو کہ غنی کی بارگاہ میں وہ ہدیہ پیش کرو جو وہ قبول فرمائے۔ اس کی بارگاہ میں تو اخلاص والا ہدیہ قبول ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کمائی کرنا' مال حلال حاصل کرنا شرعاً ضروری ہے کہ جب کمائی میں سے خیرات ضروری' تو کمائی بھی ضروری۔ **دوسرا فائدہ:** ہر تجارتی مال پر زکوٰۃ فرض ہے جیسا کہ اَنْفِقُوْا سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کی ہر پیداوار پر زکوٰۃ واجب ہے۔ خواہ تھوڑی ہو یا بہت۔ اور خواہ سڑنے گلنے والی چیز ہو۔ یا باقی رہنے والی۔ لہٰذا غلہ' پھل' ترکاریاں' سب میں زکوٰۃ واجب ہے۔ جیسا کہ مَا اَخْرَجْنَا کے عموم سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** اگر کرایہ کی زمین میں کھیتی کی گئی تو بیج والے پر زکوٰۃ ہے نہ کہ مالک زمین پر۔ جیسا کہ لَكُمْ کے لام سے معلوم ہوا کہ جس کی پیداوار اُسی پر زکوٰۃ۔ **پانچواں فائدہ:** حق والا اپنے حق میں رعایت بھی کرسکتا ہے کہ معیوب چیزیں لے لے اور پورے کا مطالبہ بھی کرسکتا ہے۔ جیسا کہ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اور اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** اگر کسی نے زکوٰۃ میں ردی مال دے بھی دیا تو صحیح یہ ہے کہ زکوٰۃ تو ادا ہو جائے گی۔ ہاں ثواب ناقص ملے گا۔ **مسئلہ:** مصدق کو چاہیے کہ نہ تو بہت اعلیٰ مال زکوٰۃ میں لے۔ اور نہ بہت ادنیٰ بلکہ درمیانی۔ **ساتواں فائدہ:** حرام پیشہ اختیار کرنا حرام ہے۔ جیسے شراب وسُور کی تجارت' یا جوا وغیرہ کہ اس آیت میں حلال مال خیرات کرنے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ حرام پیشہ سے مال حرام ہی حاصل ہوگا۔ **آٹھواں فائدہ:** ہر قسم کے مال میں سے بعض حصہ خیرات کرنا چاہیے۔ جیسا کہ مِن تبعیضیہ سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** کھرا کھوٹا ہونا مال کا وصف ہے۔ مستقل اس کی قیمت نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی قرض خواہ دھوکے سے کھوٹے روپے لے کر خرچ کرے اور بعد میں پتہ لگے تو مقروض سے کچھ مطالبہ نہیں کرسکتا اسی طرح دس کھرے روپیہ کے عوض گیارہ کھوٹے روپیہ نہیں خرید سکتا (احکام القرآن) **مسئلہ:** جس کے پاس کھرا مال ہو ہی نہیں۔ کھوٹا ہی ہو۔ وہ کھوٹا ہی خیرات کرے' باجرہ کی روٹی والا خیرات کے لئے گیہوں کی روٹی کہاں سے لائے۔ گاڑھا پہننے والا ململ کی خیرات کہاں سے کرے۔ جیسا کہ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** جس کے پاس

مال حرام ہی ہو۔ وہ یہ مال خیرات نہ کرے۔ اگر خیرات کا شوق ہو تو کسی سے مال حلال قرض لے کر خیرات کرے پھر قرض اپنے مال سے ادا کرے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ صرف کسانوں' زمینداروں اور کمائی کرنے والوں پر زکوٰۃ ہے جنہیں میراث یا ہبہ کا پیسہ مل جائے ان پر نہ صدقہ ضروری نہ زکوٰۃ' کیونکہ یہاں کسب اور زمینی پیداوار کی قید ہے۔ **جواب:** کسب' سے مراد ہر حلال آمدنی کا حلال ذریعہ ہے۔ میراث و ہبہ بھی کسب میں ہی داخل ہے۔ اسی لئے حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے۔ یعنی ماں باپ کو اولاد جو کچھ دے اس میں سے وہ خیرات کرے۔ **دوسرا اعتراض:** طلباء' علماء و مشائخ کو چاہیے کہ دین کو ذریعہ معاش نہ بنائیں بلکہ کسب کریں۔ جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسب کی روزی طیب و حلال ہے۔ باقی خبیث۔ **جواب:** اس کا جواب سوال نمبر ۱ کے جواب میں گزر گیا۔ اور تفصیلی جواب وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ۔ (بقرہ:۴۱) کی تفسیر سے معلوم ہو چکا کہ جو لوگ اپنے کو دین کے لئے وقف کر دیں۔ مسلمانوں پر ان کی خدمت لازم ہے کہ اگر یہ لوگ بھی دنیا کمانے میں مشغول ہو جائیں تو دینی ضروریات کون پوری کرے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ (بقرہ: ۲۷۳) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بزمانہ خلافت بیت المال سے وظیفہ لیا۔ شاہان اسلام نے علمائے کرام کو وظیفے دیئے۔ یہ ہی ان کا کسب ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اگر طیبات کے معنی دل پسند چیزیں ہوں تو چاہیے کہ حقہ پینے والا تمباکو خیرات کرے بلکہ بھنگی' چرسی اپنی بھنگ چرس سے صدقہ کریں۔ اور شرابی' کبابی اسی سے خیرات کیا کریں۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ طیب ہر مرغوب چیز کو نہیں کہتے بلکہ وہ چیز طیب ہے جو حلال بھی ہو مرغوب بھی ہو۔ دوسرا یہ کہ مذکورہ چیزیں مومن کے لئے دل پسند نہیں بلکہ نفس پسند ہیں دل ان کا بھی ان سے نفرت ہی کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے نشے ور کو جب اس پر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ یہ ہی کہتا ہے کہ میری عادت ہی پڑ گئی ہے۔ اب چھوٹتی نہیں کیا کریں۔ بھائی تم بہت اچھے ہو' جو چرس سے بچے ہوئے ہو۔ خدا سب کو بچائے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خود خیرات کرنا چاہیے۔ اگر بلا ارادہ مال فقراء نے کھا لیا تو اس پر ثواب نہیں۔ حالانکہ حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ کھیت سے جو دانہ جانور یا فقرا کھا جائیں۔ اس پر بھی ثواب ملتا ہے۔ اس آیت اور حدیث میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** آیت و حدیث میں کوئی مخالفت نہیں۔ حدیث شریف میں رب کے کرم کا ذکر ہے اور آیت میں اسلامی قانون کا۔ یعنی خدا تعالیٰ کا کرم یہ ہے کہ مالک کے بغیر ارادہ بھی جو مال خلقت کے کام آئے اس پر بھی ثواب بخشتا ہے اور قانون یہ ہے کہ بغیر قصدی خیرات سے صدقہ واجب ادا نہ ہوگا۔ اس کے لئے قصداً خیرات کرنا پڑے گی۔ لہٰذا جانوروں اور فقراء کا کھایا ہوا دانہ زمین کی زکوٰۃ (عشر) میں محسوب نہ ہوگا۔ وہ علیحدہ دینا ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ

قدرت نے ہمیں دو چیزیں عطا فرمائی ہیں ایک جسم دوسری روح' جسم میں کسب کو دخل ہے کہ ماں باپ کے اختلاط سے بنا۔ اور غذا سے اس کی بقاء ہے۔ یہ گویا مَا کَسَبْتُمْ میں داخل ہے یہ اور روح میں انسانی کسب کو بالکل دخل نہیں۔ یہ گویا مِمَّآ اَخْرَجْنَا

لکُم میں شمار پھر جسم میں دو قسم کے اعضاء ہیں۔ اعلیٰ جیسے دل، دماغ اور ادنیٰ جیسے ہاتھ پاؤں وغیرہ فرمایا جا رہا ہے کہ جسم کے ادنیٰ اعضاء ہاتھ وغیرہ کو اگرچہ کسی دنیاوی کام میں لگا دو۔ مگر اعلیٰ اعضاء یعنی دل و دماغ کو صرف راہ الٰہی میں خرچ کرو کہ دل میں محبت ہو تو اللہ و رسول (علیہ السلام) کی اور دماغ میں خیال رہے۔ تو صرف اسی کا جس گھر میں مالک نہ رہتا ہو وہاں کوڑا کیڑا سانپ بچھو وغیرہ گھر بنا لیتے ہیں اور جہاں مالک رہتا ہے وہاں یہ کوئی چیز نہیں رہتی۔ دل بھی گھر ہے۔ اگر اس میں اللہ کا خوف، رسول کی محبت ہو گی تو گندگیوں سے صاف اور ایمان و عرفان سے روشنی تقویٰ سے آراستہ رہے گا لیکن اگر وہ ان سے خالی ہو گیا تو پھر اسی میں کفر و طغیان۔ کینہ۔ حسد گھر کر لیں گے اس لئے ان میں مالک ہی رہے تو اچھا ہے۔ شعر۔

گر سر میں اپنے سودا سر گنبد خضرا ہو جائے گر دل میں کھنچے نقشہ ان کا دل عرش معلّٰی ہو جائے

ظاہری اعضاء کو بھی اعلیٰ وقتوں میں یعنی نماز کے اوقات میں رب کی راہ میں لگاؤ۔ اور باقی فضول وقت میں دنیاوی کاروبار میں رہیں۔ روح، یہ تمہاری نفیس ترین چیز ہے۔ اس سے نفیس کام ہی لو۔ اگرچہ یہ جسم کی پرورش بھی کرتی ہے مگر اس کی پرورش اعمال صالح سے ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک صرف مال ہی کی زکوٰۃ نہیں بلکہ ہر پیاری چیز کی۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے جب خواب میں حکم پایا کہ اپنی پیاری چیز راہ حق میں قربان کرو تو آپ فرزند کی قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ اولاد میں سے اعلیٰ اولاد، اوقات میں سے اعلیٰ وقت، سانسوں میں سے اعلیٰ سانس، کاموں میں سے اعلیٰ کام، مال میں سے اعلیٰ مال، غرضکہ ہر اعلیٰ کو راہ الٰہی میں خرچ کرو۔ ان میں سے ہر ایک کا مصرف علیحدہ ہے۔ مسجد میں وقت کی خیرات کرو۔ زکوٰۃ کے وقت مال کی، جہاد میں جان کی۔ غرض سب موقعہ پر پیاری چیز کی خیرات چاہیے۔ اسی لئے اس آیت میں طیبات جمع فرمایا گیا۔ ایک دفعہ صحابہ کرام حضور علیہ السلام کے حکم سے صدقات حاضر کر رہے تھے۔ حضرت ابوامامہ باھلی وہاں بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ حضور (علیہ السلام) نے ارشاد فرمایا کہ کیا پڑھتے ہو۔ عرض کیا کہ لوگ مال خیرات کر رہے ہیں۔ میں غریب آدمی مال نہیں رکھتا۔ یہ پڑھ رہا ہوں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ الفاظ تمہارے لئے بہت سونا خیرات کرنے سے بہتر ہیں۔ غرض ہر پیاری چیز کی خیرات چاہیے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے اللہ کی راہ میں وہ اعلیٰ چیز خیرات کرو جو دوسرے سے خود بھی قبول کر سکو۔ ایسے ہی دوسرے سے وہ کلام یا وہ برتاوا یا وہ معاملہ کرو جو دوسرا تمہارے ساتھ کرے تو تم بے تکلف اسے گوارہ کرو غرضکہ دوسروں سے وہی سلوک کرو۔ جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ شعر

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو کلام ایسا کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

اس صورت میں یہ آیت کریمہ اخلاقیات کی بہترین تعلیم ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ

شیطان ڈراتا ہے تم کو فقیری سے اور حکم کرتا ہے تم کو ساتھ بے غیرتی کے اور اللہ وعدہ کرتا ہے تم سے بخشش کا طرف

شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا اور حکم دیتا ہے بے حیائی کا اور اللہ تم سے وعدہ فرماتا ہے بخشش

وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ

سے اپنے اور فضل کا اور اللہ وسعت والا علم والا ہے دیتا ہے حکمت اس کو جسے چاہتا ہے اور وہ جو دیا جائے
اور فضل کا اور اللہ وسعت والا علم والا ہے اللہ حکمت دیتا ہے جسے چاہے اور جسے
الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾
حکمت پس بے شک دیا گیا بھلائی بہت اور نہیں نصیحت پکڑتے مگر صاحبان عقل
حکمت ملی اسے بہت بھلائی ملی اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں قبولیت صدقہ کے چند شرائط کا ذکر ہوا کہ مال حلال سے ہو خیرات کرنے والا فقیر کو طعن وایذا نہ دے وغیرہ۔ اب اسی قبول کی ایک اور شرط بتائی جارہی ہے کہ خوش دلی سے ہو۔ خیرات کے وقت اپنے غریب ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو۔ **دوسرا تعلق:** بہت دور سے خیرات کے فضائل وفوائد بیان ہورہے ہیں جس سے اس کی عظمت معلوم ہوئی اب بتایا جارہا ہے کہ خیرات ہے تو بڑی اعلیٰ چیز مگر اس کے لئے رکاوٹیں بہت ہیں۔ شیطان طرح طرح کے دھوکے دیتا ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا۔ گویا اب تک اس کے فضائل کا ذکر تھا۔ اب اس کے موانع کا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا کہ اچھی چیز خیرات کرو۔ اب علم وحکمت کی زکوٰۃ کا ذکر ہے کہ علم بھی اعلیٰ نعمت ہے۔ اس کی بھی زکوٰۃ دو۔ اس کی زکوٰۃ درس وفتویٰ ہے۔ (تفسیر احمدی)

خیرات ہر چیز سے دینی چاہیے۔ مال، اعمال، کمال، علم، ہنر تمام سے چونکہ مال کی خیرات سے علم کی خیرات بہت اکمل وافضل ہے اس لئے رب تعالیٰ نے مال کی خیرات کا ذکر فرمایا پھر علم کی خیرات کا ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔

تفسیر

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ۔ شیطان کی لفظی تحقیق ہم پارہ الٓمٓ میں کر چکے یہاں اس سے مراد یا تو ابلیس ہے یا نفس امارہ یا برے مشیر و یار (کبیر) یا ساتھ رہنے والا شیطان یعنی قرین یا سرداران کفر رب تعالیٰ نے کفار کو شیطان فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ (بقرہ: ۱۴) اور فرمایا اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ (آل عمران: ۱۷۵) غرضیکہ فریبی دھوکہ باز شیطان ہے کہ بری چیز کو اچھا دکھاوے اور اچھی چیز کو برا۔ يَعِدُ وَعْدٌ سے بنا، وعدہ ہر اس آئندہ کی خبر کو کہتے ہیں جس سے کسی خیر کا امیدوار بنایا جائے۔ وعید وہ خبر جس سے شر کا اندیشہ دلایا جائے۔ مگر اکثر وعدہ خیر وشر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ مگر لفظ وعید شر کے لئے خاص ہے۔ یہاں وعدہ بمعنی ڈرانا اور اندیشہ دلانا ہے۔ فقر کے معنی ہیں۔ جوڑ، ذوالفقار جوڑوں والی تلوار، فقرہ مضمون کے جملے کو بھی کہتے ہیں کہ یہ اس کا جوڑ ہے۔ پیٹھ کی ہڈی کو بھی فقر کہا جاتا ہے۔ غریبی وتنگدستی کو فقر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس سے گویا پیٹھ کے جوڑ ٹوٹ جاتے ہیں۔ نیز فقر بمعنی کسر یعنی توڑنا بھی آتا ہے۔ (کبیر ومعانی) یعنی شیطان تمہیں صدقہ پر فقیری وتنگدستی سے ڈراتا ہے۔ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ امر بمعنی حکم ہوتا ہے مگر یہاں اس سے وسوسہ یا مشورہ مراد ہے۔ اس کا فاعل شیطان ہے۔ فَحْشَآءِ فَحْشٌ سے بنا۔ بمعنی حد

سے گزرنا اسی سے مباشرت فاحشہ ہے۔ بدکار عورت کو بھی فاحشہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بدکاری میں حد سے بڑھ گئی۔ یہاں اس سے یا تو بخل مراد ہے کہ اہل عرب بخل کو فاحشہ کہتے ہیں۔ کعب کہتا ہے ۔

اَخِیْ یَا اَخِیْ لَا فَاحِشًا عِنْدَ بَیْتِهٖ وَلَا برم عِنْدَ اللِّقَآءِ هُیُوْبُ

یا اس سے بخل کے بُرے نتائج مراد ہیں۔ جیسے مال کی حرص' رب سے ناامیدی' وعدہ الٰہی میں شک' رب سے بدگمانی۔ خالق سے منہ پھیر کر خلق پر توجہ۔ قلب کا غیر اللہ سے تعلق۔ خواہشات کی اطاعت' ترک قناعت' حب دنیا وغیرہ یا اس سے گندی و معیوب باتیں مراد ہیں۔ یعنی شیطان تمہیں بخل یا حرص وہوس' یا برے رسم ورواج میں خرچ کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ کُمْ میں سارے مسلمانوں کی طرف خطاب ہے کسی درجہ کے ہوں اور کسی جگہ کے' یعنی اے مسلمانو! شیطان سے بےفکر نہ رہنا۔ وہ ہمیشہ تمہاری تاک میں ہے۔ تم کتنے ہی بڑے متقی ہو' کسی جگہ رہتے ہو' مکہ شریف میں یا مدینہ منورہ میں' یا خاص خانہ کعبہ میں رہتے ہو' داؤں لگانے سے نہیں چوکتا اس سے ہمیشہ چوکنے رہو۔ وَاللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ یہاں یَعِدُ وعدہ خبر میں استعمال ہوا' رب تعالیٰ کے وعدے دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جو براہ راست اس نے بندوں سے کئے۔ دوسرے وہ جو حضرات انبیاء کرام نے کئے وہ بھی رب کے ہی وعدے ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ (آل عمران: ۱۹۴) خدایا اپنے وہ وعدے پورے کر جو تو نے اپنے رسولوں کی زبان پر ہم سے کئے' ان کی زبان رب کا قلم ہے۔ مَغْفِرَةً سے مراد یا گناہوں کی بخشش یا عیب پوشی دنیا وآخرت میں' کہ سخی کے عیب دنیا میں بھی چھپ جاتے ہیں اور آخرت میں بھی چھپے رہیں گے۔ انشاء اللہ باری تعالیٰ سخی کے گناہ مٹا دیتا ہے یا ثواب آخرت ہے۔ اور فضل سے دنیا میں وسعتِ رزق' لوگوں کی محبت' اور صدقہ کا اچھا عوض مراد یعنی رب تعالیٰ صدقہ پر دونوں جہان کی نعمتوں کا تم سے وعدہ فرماتا ہے کہ دنیا میں رزق کی برکت' آخرت میں مغفرت ورحمت عطا فرمائے گا' خیال رہے کہ فضل عدل سے وراء ہے' اجرت دینا عدل ہے بلا استحقاق بچہ بخشا فضل رب تعالیٰ صدقہ کا عوض بھی دے گا فضل بھی' اور یہ رب کو کچھ مشکل نہیں کیونکہ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ رب وسعت والا بھی ہے کہ اس کے خزانے میں کمی نہیں' اور علم والا بھی۔ اہل ہی کو نعمتیں بخشتا ہے۔ اس کا کرم تو دیکھو کہ یُؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ علم جیسی نعمت جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ حکمت کے معنی ہیں واقعی چیزوں کو صحیح طور پر جاننا' وہمی باتوں کا جاننا حکمت نہیں۔ یوں ہی غلط تحقیق علم نہیں' جہالت ہے۔ یہاں حکمت میں ۲۹ قول ہیں کہ اس سے مراد یا تو نبوت ہے' یا قرآن کا علم ناسخ ومنسوخ ومحکم ومتشابہ کی پہچان' یا علم فقہ یا قرآن کا تدبر یا اچھے اعمال' یا علم نافع' یا علم باعمل' یا رب کی معرفت' یا قلبی نور جو الہام ووسوسہ میں فرق کر دے' یا الہام' یا قرآنی اسرار' یا توفیق خیر' یا خوف الٰہی وغیرہ (معانی وغیرہ) حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں لفظ حکمت اکثر چار معنی میں استعمال ہوا' قرآنی وعظ' جیسے۔ وَمَا اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ یَعِظُكُمْ بِهٖ (بقرہ: ۲۳۱) فہم وعلم وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا۔ (مریم: ۱۲) فَقَدْ اٰتَیْنَا اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (النساء: ۵۴) قرآن واسرار قرآن اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (نحل: ۱۲۵) (کبیر) یہاں سارے معنی درست ہیں۔ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا۔ یہ نیا جملہ ہے جس میں علم وحکمت کی فضیلت ارشاد ہوئی۔ حکمت میں لام جنسی ہے۔ خیر شر کا مقابل (بھلائی) یعنی جسے کچھ بھی حکمت عطا ہوئی۔ اسے بہت بھلائی

ملی۔ گویا تھوڑی حکمت تمام دنیاوی سامان سے افضل ہے کہ اسے قلیل فرمایا گیا۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (النسآء:۷۷) اور یہاں نفس حکم کو خیر کثیر فرمایا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ يَذَّكَّرُ تَذَكُّرٌ سے بنا بمعنی یاد کرنا' نصیحت لینا' غور و فکر کرنا' اَلْبَابُ لُبٌّ کی جمع ہے۔ بمعنی مغز و گودا و اصل و خلاصہ' یہاں لب سے وہ خالص عقل مراد ہے جو وہم و خیالات سے صاف ہو۔ ہر عقل لب نہیں۔ مگر ہر لب عقل ہے۔ یعنی ان آیتوں سے خالص عقل والے ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ بے عقل اور مغلوب العقل ان پر توجہ نہیں کرتے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! صدقہ و خیرات بہت اعلیٰ چیزیں ہیں مگر اس سے روکنے والے بھی بہت ابلیس' نفس امارہ' برے یار' صاف صاف تو بخل کی تعریف اور سخاوت کی مذمت کر سکتے نہیں۔ اس لئے اولاً وہ تمہیں' فقیری کا خوف دلا کر صدقہ سے روکیں گے کہ اگر تم نے خیرات کی تو غریب ہو جاؤ گے۔ جتنا پیسہ فقیر کو دے رہے ہو' اتنا تمہارے بچوں کے ہی کام آئے گا وغیرہ' جب اس میں کامیاب ہو گئے' تب تمہیں بخل' ہوس' حرص وغیرہ کی رغبت دیں گے۔ وہ ہی فقیری سے ڈرنے والے' بیاہ شادی' موت غمی کے مراسم' تھیٹر' سینما' مقدمہ بازی وغیرہ کا مشورہ دیں گے۔ مگر رب تمہیں صدقہ دینے پر دونوں جہاں کی نعمتوں کا وعدہ کرتا ہے کہ سخی کے مال میں برکت' لوگوں کی محبت' آفات کی دوری' اپنی منظوری' آخرت میں مغفرت' جہنم سے نجات' جنت الفردوس کی نعمتیں عطا فرمائے گا۔ اب تم خود سوچ لو کہ کس کی ماننی چاہیے۔ شیطان کی یا اپنے رب رحمٰن کی' اور خیال رکھو کہ اللہ بڑی وسعت اور بڑے علم والا ہے اس کے خزانہ میں کمی نہیں اس کی وسعت و علم کی ظاہر دلیل یہ ہے کہ جس پر کرم فرمائے اسے علم و عمل' خوف الٰہی' عقل' اپنی معرفت وغیرہ جیسی نہ مٹنے والی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ جنہیں کبھی زوال نہیں۔ جسے یہ نعمت مل گئی' اسے بڑی بھلائی ملی' مگر ان باتوں سے خالص عقل والے ہی نصیحت لیتے ہیں۔ ورنہ جہلا کے نزدیک مال سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ابلیس کی نظر تمام جہان پر ہے کہ وہ بیک وقت سب کو دیکھتا ہے اور تمام مسلمانوں کے ارادوں' بلکہ دل کے خطرات سے خبردار ہے کہ نیک ارادے سے باز رکھتا ہے اور برے ارادے کی حمایت کرتا ہے جیسا کہ الشیطان کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا' جب اس بہکانے والے کی وسعت علم کا یہ حال ہے تو اللہ کی طرف سے ہادی بندوں حضرات انبیاء و اولیاء کے علم کا کیا پوچھنا کہ وہ ابلیس کا توڑ ہیں۔ توڑنے والا کا علم وزور زیادہ ہوتا ہے۔ لکڑی لوہے سے توڑی جاتی ہے۔ نہ کہ لوہا لکڑی سے لہٰذا اس آیت سے حضور ﷺ اور حضور کے غلاموں کی وسعت علم ثابت ہوئی۔ **دوسرا فائدہ:** خیرات سے کبھی غریبی نہیں آتی' تجربہ ہے کہ بیاہ شادی کی حرام رسموں' مقدمہ بازی' عیاشی سے صدہا گھر برباد ہو گئے۔ مگر خیرات سے برباد ہوتے ہوئے آج تک نہیں دیکھا گیا۔ **تیسرا فائدہ:** سخاوت سے مال' عزت و آبرو بڑھتی ہے بشرطیکہ اخلاص سے ہو۔ صحابہ کرام بمقابلہ موجودہ مسلمانوں کے تعداد میں بھی کم تھے۔ اور مال میں بھی مگر جو کام وہ کر گئے' وہ ہم سے نہیں ہوتے کہ وہ حضرات صحیح جگہ مال خرچ کرنا جانتے تھے۔ ہم اس سے بے خبر ہیں۔ **چوتھا فائدہ:** بخیل کا مال ہمیشہ حرام جگہ خرچ ہوتا ہے دیکھا گیا ہے کہ خیرات سے گھبرانے والے صدہا بازیوں اور بیماریوں میں

بے دریغ مال خرچ کر دیتے ہیں۔ رب کے نام پر چار پیسہ خرچ نہیں کر سکتے مگر شادی' موت' ممبری' بیماری' مقدمہ بازی میں خوب خرچ کرتے ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** خیرات سے روکنے والا' یا روکنے کے حیلے کرنے والا شیطان ہے۔ لہٰذا فی زمانہ دیوبندی' وہابی جو ہزار حیلوں سے کار خیر روکتے ہیں یہ بھی اخوان الشیٰطین ہیں۔ مثلاً میلاد شریف' تیجہ' دسواں' چالیسواں پر چار پیسہ خرچ کرنا بدعت بھی ہے' حرام بھی مگر سیاسی جلسوں پر ہزار ہا روپیہ برباد کرنا بدعت ہے نہ حرام' رب سمجھ عطا فرمائے۔ آج کل نئی تہذیب کے دلدادا قربانی کے موقعہ پر کہتے ہیں کہ قربانی نہ کرو۔ اس سے پیسہ برباد ہوتا ہے۔ قوم غریب ہے۔ اتنا پیسہ کالجوں سکولوں میں لگاؤ۔ آج تک ان کی نظر سینما و دیگر عیاشیوں پر نہ گئی۔ ایک سال کی قربانی کا خرچ مسلمانوں کے ایک رات کی سینما بینی سے کم ہے۔ مگر اسے بند کرنے کا خیال بھی نہیں۔ یہ ہے اس آیۃ کریمہ کا ظہور مگر انشاء اللہ کوئی دینی کام بند نہ ہوگا گرگٹ کی پھونک سے حضرت خلیل کی آگ تیز نہ ہوگئی تھی۔ **چھٹا فائدہ:** علم بڑی نعمت ہے کہ یہ باقی ہے دیگر سب فانی۔ دین کی تمام بہار علم دین سے ہے مسجد میں نمازیں' میدان جنگ میں جہاد' عدالتوں میں انصاف' بازار کی رونق' موت کے وقت مدد قبر کا نور' محشر کی نجات علم دین کی برکت سے ہے۔ **ساتواں فائدہ:** تھوڑا علم دین' بہت مال سے افضل ہے کہ رب نے ساری دنیا کو قلیل فرمایا۔ مگر تھوڑے علم و حکمت کو خیر کثیر' حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بارگاہ نبوی میں اپنے شوہر کی غربت کی شکایت کی۔ حضور علیہ السلام نے اسکے شوہر سے پوچھا کہ تجھے کچھ قرآن بھی یاد ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ہاں۔ فلاں فلاں سورۃ فرمایا خوب خوب! تو بہت بڑا غنی ہے۔ وہ بیوی بھی راضی ہوگئی۔ کچھ روز بعد وہ مالدار ہوگیا۔ (درمنثور) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جسے رب نے قرآن کریم کا علم دیا پھر وہ اپنے غریب اور مالداروں کو امیر جانے وہ نعمت رب کا ناقدرہ ہے۔ (تاریخ بخاری) ابو العالیہ فرماتے ہیں کہ خوف الٰہی حکمت و معرفت کی اصل ہے۔ (ابن ابی حاتم) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن وہ غنا ہے جس کے بعد فقیری نہیں (ابونعیم) **آٹھواں فائدہ:** قرآن کی صحیح فہم نعمت ہے۔ اور اس کی کج فہمی رب کا عذاب' قرآن کی غلط فہمی کے باعث مسلمانوں میں بارہا کشت و خون ہوا۔ کفار کی آیتوں کو مسلمانوں پر اور بتوں کی مذمت کی آیات انبیاء کرام پر چسپاں کرنا وہ جہالت ہے جس نے صدہا مسلمانوں کا خون کرا دیا (از خازن و روح البیان) **نواں فائدہ:** فلسفہ' منطق' ریاضی وغیرہ حکمت نہیں صرف قرآن و حدیث' فقہ وغیرہ علوم دینیہ حکمت ہیں جس کی یہاں تعریف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے توریت جمع فرمانے اور اس کا مطالعہ کرنے کی اجازت چاہی۔ منع فرما دیا گیا اور فرمایا کہ اگر صاحب توریت موسیٰ علیہ السلام بھی آج زندہ ہوتے تو ہماری پیروی کرتے (تفسیر روح المعانی) تو کیا بوعلی' جالینوس کی خلاف شرع بکواس توریت سے بڑھ کر ہے۔ **دسواں فائدہ:** حضور علیہ السلام کے پاس خیر کثیر ہے کہ رب نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا اور حضور علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ نبی علیہ السلام علم و حکمت دیتے ہیں۔ لہٰذا دیوبندیوں کا یہ کہنا کہ اگر حضور علیہ السلام کو علم غیب ہوتا تو خیر کثیر جمع کر لیتے۔ اور خیر تو جمع کی نہیں۔ لہٰذا آپ کو علم غیب بھی نہیں' غلط ہے۔ آیت لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (اعراف ۱۸۸) کے معنی یہ بھی ہیں کہ سمجھ لو اگر میرے پاس علم غیب ہے تو خیر کثیر بھی ہے اور خیر کثیر تو ہے لہٰذا علم غیب بھی ہے تاکہ آیات میں تعارض نہ ہو۔ خیال رہے کہ مال و دولت خیر کثیر نہیں۔ اسے تو رب تعالیٰ نے قلیل فرمایا۔ اگر یہ خیر کثیر ہے تو چاہیے تھا کہ اکثر انبیاء کرام جیسے حضرت عیسیٰ' یحییٰ' جو مال نہ رکھتے تھے۔ وہ خیر

کثیر سے محروم ہوتے۔ اور فرعون' نمرود' قارون وغیرہ بے دین مالدار خیر کثیر والے ہوتے۔ ایسے ہی حضرت بلال وصہیب تو خیر کثیر سے محروم ہوتے۔ اور ابو جہل خیر کثیر والا ہوتا۔ **گیارھواں فائدہ:** ہر میٹھی باتیں کرنے والا دوست نہیں۔ ہر چمکتی چیز سونا نہیں۔ کبھی دشمن کے لئے خیر خواہی ظاہری کی جاتی ہے۔ دیکھو شیاطین فقر سے ڈرا کر صدقہ سے روکتے ہیں۔ لہٰذا ہر ایک کی اچھی باتیں نہ سننی چاہئیں۔ **بارھواں فائدہ:** حکمت یعنی علم دین محض اپنی کوشش سے نہیں ملتا۔ رب کی کرم نوازی سے ملتا ہے دیکھو ارشاد باری ہوا۔ جسے چاہے حکمت عطا فرمائے۔ کتب اور استاد تو اس علم کے حاصل ہونے کے اسباب ہیں۔ کام مسبب الاسباب کے ہاتھ ہے۔ کتب واستاد سے جو علم ملتا ہے وہ ایسا ہے جیسا بجلی کی فیٹنگ کر دینا۔ اور فیض ربانی ایسا ہے جیسے اس میں پاور کا آ جانا کہ بغیر پاور ساری فٹنگ دیکھنے میں سب کچھ ہے مگر بے کار۔ **تیرھواں فائدہ:** حضور ﷺ کا آستانہ دربار الٰہی ہے اور حضور ﷺ کی عطا رب کی عطا ہے۔ دیکھو یہاں رب نے فرمایا کہ جسے اللہ چاہے حکمت دے۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کہ نبی ﷺ انہیں علم وحکمت سکھاتے ہیں۔ عطا حکمت کو یہاں رب کی طرف نسبت فرمایا وہاں انہیں حبیب کی طرف۔ **چودھواں فائدہ:** جیسے دنیاوی نعمتیں بعض عمومی بعض خصوصی ہیں۔ جیسے دھوپ پانی اور سلطنت ایسے ہی دینی نعمتیں بعض عمومی ہیں بعض خصوصی' حکمت خصوصی نعمت ہے جو کسی کو ملتی ہے اور جیسے دنیاوی روزیوں کے لئے دروازے مختلف ہیں کہ کسی کو کچہری سے روزی ملتی ہے کسی کو سکول سے کسی کو بازار سے کسی کو مسجد سے ہر ایک اپنے دروازہ سے وابستہ ہے۔ ایسے ہی حکمت کسی کو پیدائشی ملتی ہے کسی کو مدرسہ وکتب سے کسی کو کسی کی نظر سے صحابہ کرام نے کوئی کتاب نہ پڑھی' مگر حکمت میں سب کے استاد تھے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں فرمایا' کہ رب جس کو چاہے حکمت دیتا ہے تو جسے چاہے حماقت بھی دیتا ہوگا۔ خدا ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ طرفداری سے پاک ہے وہ سب کا رب ہے۔ سب پر یکساں فضل کرتا ہے ہمیں تو ایسا خدا پسند نہیں ہے۔ جو سب سے یکساں سلوک نہ کرے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی کو بہت دور کی سوجھتی ہے۔ جناب دنیا میں یکسانیت ہو سکتی ہی نہیں۔ یہاں ہر چیز رنگ برنگی ہر انسان کی علیحدہ شان چاہیے۔ بعض زمینیں کھاری ہیں۔ بعض ریتلی۔ بعض سرسبز و شاداب' جیسے زمین کشمیر' بعض درخت پھل پھول والے ہیں۔ بعض محض خاردار' ایک ہی شیشم کے تختے تو عمارات میں کام آتے ہیں مگر شاخیں چولہے میں۔ ایسے ہی انسان کوئی عالم' کوئی جاہل' کوئی بدنصیب' کوئی بختاور' کوئی کالا' کوئی گورا' کوئی وزیر دامیر' کوئی غریب' غرضکہ جو جس کے لائق ہے۔ رب اسے وہ ہی عطا فرماتا ہے۔ رب حلیم وحکیم ہے۔ عالم کی حالت مختلف چیزیں چاہتی ہیں۔ اگر انسان محض اعمال کی وجہ سے دولت مند وغریب ہوتا ہے تو ایک ہی شخص کبھی بادشاہ کبھی گھسیارا کیوں ہوتا۔ ہم اس کی پوری بحث پارہ الٓمّ میں کر چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ ایک کمہار کو تو یہ قوت ہو کہ ایک ہی مٹی سے آبخورے بھی بنا دے جس میں ہمیشہ پانی رہے اور ہانڈی بھی جو ہمیشہ آگ پر جلے مگر رب تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر اتنا بھی اختیار نہ ہو۔

تفسیر صوفیانہ

ہر ایک چاہتا ہے کہ میرے ہم جنس زیادہ ہوں۔ تاجر کی خواہش ہے کہ سب تاجر ہو جائیں۔ عالم کی تمنا ہے کہ دنیا علم و معرفت

سے بھر جائے وغیرہ۔ شیطان دیوالیہ فقیر ہے کہ اپنی تمام عبادات کا دیوالہ نکال چکا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ سب میری طرح اعمال کے فقیر ہو جائیں۔ اس لئے بظاہر فقیری سے ڈراتا ہے مگر حقیقتاً فقیری کی طرف بلاتا ہے کہ انسان میں حب دنیا پیدا ہو۔ جو تمام برائیوں کی اصل ہے جو وسوسہ شیطانی کو دل میں راہ دے گا۔ وہ اپنے پر تمام آفات کا دروازہ کھول لے گا۔ اور جو اس کا دروازہ بند کرے گا۔ رب تعالیٰ اس پر مغفرت' فضل وکرم وانعامات ورفع درجات کا دروازہ کھول دے گا۔ اس کے عیوب کو اپنے نور سے ڈھک دے گا۔ اور اپنی تجلیات عطا فرمادے گا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ حکمت نور ربانی ہے جو عیوب بشری فنا کرنے اور اپنے کو نور جلال و جمال میں فنا کرنے کے بعد حق تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے۔ رب نے عقل تو قریباً ہر انسان کو دی مگر حکمت خاص خاص کو۔ معقول وہ ہے جو دلائل عقل سے معلوم ہو جائے۔ کوئی عاقل خود بخود کوئی استاد و کتاب کی مدد سے معقولات تک پہنچ جاتا ہے۔ مگر حکمت نہ خود بخود حاصل ہو نہ کسی کتاب واستاد سے ملے۔ یہ انبیائے کرام کی غلامی یا شیخ کامل کی نظر سے ملتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

چند خوانی حکمت یونانیاں   حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں

اس حکمت کا پہلا اثر یہ ہے کہ انسان وسوسہ والہام نیز شیطانی وملکی آواز ریا وخلوص اور عادت وعبادت میں فرق کرنے لگتا ہے۔ ورنہ جہلا بسا اوقات وساوس کو الہام بلکہ وحی سمجھ کر عادت کو عبادت گمان کر کے تباہ وبرباد ہوتے ہیں۔ اللہ بڑی عطا فرماتا ہے۔ اس کا دعاء وجود عطا مخلوق سے تنگ نہیں مگر اپنی تجلی گاہ اور استعداد عباد کا جاننے والا ہے۔ حکمت اس کو عطا فرماتا ہے جو اس کے اہل ہوں۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ صدقات تین قسم کے ہیں اور ان کی جزائیں بھی تین۔ صدقۂ مال جس کی جزا زیادتی مال ورضائے ذوالجلال۔ قربانی صفات بشری جس کی جزاء صفائی قلب۔ قربانی نفس جس کی جزاء عطائے حکمت۔ جتنا ان قربانیوں میں فرق ہے اتنا ہی ان کی جزاؤں میں (از روح البیان وابن عربی) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ علم تین قسم کا ہے علم مضر ونقصان دہ' علم عبث' علم مفید' پھر مفید علم بہت سی قسم کا ہے۔ صرف عالم کو مفید۔ ایک خاندان کو مفید' ایک شہر کو مفید ایک ملک کو مفید۔ ساری مسلمان قوم کو مفید' پھر کچھ روز تک مفید' اور قیامت تک مفید' حکمت علم مفید کو کہتے ہیں اس کا فائدہ جتنا زیادہ اور دیرپا ایسی ہی حکمت اعلیٰ۔ نیز فرماتے ہیں کہ علم کے تین مقام ہیں۔ عالم کی زبان۔ عالم کا دماغ عالم کا دل۔ زبان ودماغ میں رہنے والا علم اگرچہ علم ہے مگر حکمت نہیں دل میں رہنے والا علم اس تخم کی طرح ہے جس کی جڑیں گہرائی میں اتر جائیں اور درخت خوب پھل پھول سایہ دار' اور زبان ودماغ میں رہنے والا علم اس تخم کی طرح ہے جو پتھر پر جمی ہوئی مٹی کی تہ کی طرح ہو جائے۔ نہ درخت پیدا ہو۔ نہ پھل پھول وسایہ' اس دل میں اترے ہوئے علم کا نام حکمت ہے۔ یہ ہی خود عالم کو بھی مفید ہے اور تمام جہان کو بھی فائدہ مند۔

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ
اور وہ جو خرچ کرو تم کوئی خرچ یا منت مانو تم کوئی منت پس تحقیق اللہ جانتا ہے اس کو
اور تم جو خرچ کرو یا منت مانو اللہ کو اس کی خبر ہے

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

اور نہیں ہے واسطے ظالموں کے کوئی مددگار

اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مقبول و مردود صدقات کا ذکر ہوا۔ اب ان دونوں کے انجام کا اجمالی تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** صدقات چند قسم کے ہیں۔ واجب و نفلی پھر واجب کی دو قسمیں ہیں۔ خود رب کے واجب فرمائے ہوئے اور وہ جو انسان اپنے پر خود لازم کرے اگلی قسموں کا ذکر پچھلی آیتوں میں ہو گیا۔ اب تیسری قسم یعنی منت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں شرائط صدقہ کا بیان تھا۔ اب ایک نئے طریقہ سے ان شرائط کی پابندی کی تاکید فرمائی جارہی ہے۔

تفسیر

وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ۔ مَا موصولہ ہے بعد کی عبارت اس کا صلہ انفاق سے مطلقاً خرچ کرنا مراد ہے۔ خواہ راہ الٰہی میں ہو یا دنیاوی کاروبار میں' نفقہ نکرہ ہے جس کا عموم مِنْ کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اس سے حرام و حلال' قلیل و کثیر' نفاق و ریاء و اخلاص' حق و باطل' پوشیدہ و ظاہر سارے خرچہ مراد ہیں۔ (روح البیان و معانی وغیرہ) گویا یہ آیت سارے نفقات کا حکم کلی بیان فرما رہی ہے۔ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ۔ نَذْرٍ کے لغوی معنی ہیں خوف و ڈر' اسی سے نذیر و انذار ہے۔ عرف میں کسی چیز کے لازم کرنے کو نذر کہا جاتا ہے کہ ڈر ہی کے وقت صدقہ وغیرہ لازم کیا جاتا ہے اور التزام کے بعد ادا نہ کرنے سے ڈر بھی لگتا ہے۔ لہٰذا اسے نذر کہتے ہیں۔ شریعت میں کوئی عبادت اپنے پر لازم کر لینے کو نذر کہا جاتا ہے۔ مگر اس کی کچھ شرائط ہیں جو فوائد میں بیان ہوں گی۔ نذر کی تنکیر اور مِنْ کی زیادتی سے اس کے عموم کا فائدہ ہوا۔ یعنی تم کوئی سی منت مانو مال کی یا اعمال کی' طاعت کی یا معصیت کی شرط سے یا بغیر شرط مبہم یا معین۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ یہ ما مبتدا بمعنی شرط کی خبر بمعنی جزاء ہے ہٗ کا مرجع یا مَا ہے یا نذر' کیونکہ نفقہ مؤنث ہے۔ اس کی طرف ضمیر مذکر نہیں لوٹ سکتی۔ چند چیزیں بول کر کبھی مقدم کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی ہے۔ جیسے وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا (جمعہ:۱۱) اور کبھی مؤخر کی جانب جیسے۔ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا (النساء:۱۱۲) یعنی اللہ ان سب کو جانتا ہے۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ یہ مَا نافیہ ہے۔ اور ظالمین ظلم بمعنی تاریکی سے بنا' اصطلاح میں ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو غیر محل میں استعمال کرنا۔ چونکہ اندھیرے میں بھی چیز جگہ سے بے جگہ ہوتی ہے اس مناسبت سے اسے ظلم کہا جاتا ہے۔ ظلم کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جان پر ظلم' مال یا اولاد یا غیروں پر ظلم' اس لئے ظالمین جمع فرمایا گیا۔ یا تو اس سے کفار مراد ہیں یا بخیل یا منت پوری نہ کرنے والے یا سارے ظالم۔ انصار' ناصر یا نصیر کی جمع ہے۔ جیسے حبیب کی احباب' یا شاہد کی اشہاد۔ یہاں یہ جمع ظالمین جمع کے مقابلہ میں ہے اور نوعیت کے لئے یعنی ظالمین کے لئے کوئی قسم کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔

خلاصہ تفسیر

اے لوگو تم جتنا اور جس قسم کا کوئی خرچ کرو۔ راہ الٰہی میں یا دنیا میں حرام یا حلال' تھوڑا یا بہت' ریا سے یا اخلاص سے ظاہر یا پوشیدہ' طعن ایذا سے یا اس سے پاک اور تم جو بھی نذر مانو مال کی یا اعمال کی جائز یا ناجائز' معین یا غیر معین' رب کو ان سب کی خبر ہے۔ ہر ایک کو اس کی نیت کے مطابق سزا و جزا دے گا۔ اور بخیل یا مشرک' یا نذر مان کر پوری نہ کرنے والا۔ غرض کوئی کسی قسم کا ظالم ہو' اس کا کوئی مددگار نہیں۔ یہ آیت رغبت و خوف دونوں کو شامل ہے۔ اس میں مخلصین کو امید ثواب دلائی گئی۔ اور ریاکاروں بدعملوں کو خوف سزا' خیال رہے کہ مَا اَنْفَقْتُمْ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ روئے سخن کفار کی طرف ہو۔ دوسرا یہ کہ مسلمانوں کی جانب ہو۔ اور انفقتم میں تین احتمال ہیں بمعنی ماضی یا بمعنی حال یا بمعنی استقبال لہٰذا آیہ کریمہ کی چھ تفسیریں ہوئیں۔ پہلی تین صورتوں میں یہ آیت عتاب کی ہے آخری تین صورتوں میں رحمت کی اس سے پہلے مسلمانوں سے خطاب تھا اور آئندہ آیتوں میں بھی ان ہی سے خطاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی مسلمانوں سے مخاطب ہیں۔ مگر آخر آیہ میں ظالموں پر عتاب ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاب کفار سے ہے۔ یعنی اے کافرو جو کچھ تم اس سے پہلے خرچ کر چکے یا جو کچھ اب خرچ کر رہے ہو یا جو کچھ آئندہ خرچ کرو گے۔ وہ ہمارے علم میں ہے۔ یا اے مسلمانو جو کچھ تم خرچ کر رہے ہو یا کر چکے' یا کرو گے ہم جانتے ہیں کفار کے اچھے خرچ پر کوئی ثواب نہیں' کہ صدقہ کی قبولیت کے لئے ایمان ضروری ہے مگر ان کے برے خرچ پہ سزا ہے مسلمانوں کے اچھے خرچ پر ثواب ہے بُرے خرچ پر عتاب اور بعد میں ثواب وغیرہ سے معافی کی امید ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ سارے قرآن مجید میں ایسی ایک آیہ نہ ملے گی۔ کہ مسلمانوں کا کوئی مددگار نہیں۔ ہاں ایسی آیات ملیں گی کہ مسلمانوں کے مددگار بہت ہیں۔ جیسے اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (مائدہ:۵۵) یا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْکَ نَصِیْرًا (النساء:۷۵) یہاں فرمایا گیا کہ تمہارا مددگار کوئی نہیں۔ وہاں مراد ہے کہ اگر تم کفر کرو تو مددگار کوئی نہیں۔ نیز کفار کا مددگار ہونا اس وجہ سے نہیں کہ کسی میں مدد کرنے کی طاقت نہیں مگر اس لئے ہے کہ کفار میں مدد لینے کی طاقت نہیں جیسے چمگادڑ کی آنکھ میں ہی سورج سے نور لینے کی یا مردہ جسم ہی دواؤں سے فائدہ حاصل کرنے کی یا زمین شورہ میں بارش سے فیض لینے کی طاقت نہیں۔ ان سب میں لینے والے کا قصور ہے نہ کہ دینے والے کا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** نذر مشروع چیز ہے۔ اس کا پورا کرنا لازم بشرطیکہ معصیت کی نہ ہو۔ **مسئلہ:** عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ نذر چار قسم کی ہے۔ نذر مبہم کہ اگر میرا یہ کام ہو جائے تو مجھ پر نذر ہے۔ نام نہ لے۔ نذر معصیت کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں فلاں گناہ کروں گا۔ طاقت سے باہر کام کی نذر۔ مشروع عبادت کی نذر۔ پہلی تین نذروں میں کفارۂ قسم واجب ہے اور اخیری نذر کا پورا کرنا لازم۔ (درمنثور) **مسئلہ:** نذر پوری کرنا فرض ہے۔ بشرطیکہ اللہ کے لئے ہو۔ اور جنس واجب سے ہو یعنی ایسی چیز کی نذر مانے جو شرعاً کہیں واجب ہے۔ جیسے نماز' روزہ' حج' قربانی' وغیرہ۔ اولیاء کے نام کی نذر' ایسے ہی غیر واجب فعل کی نذر پورا کرنا واجب نہیں۔ جیسے مسجد میں چراغ جلانا' وہاں جھاڑو دینا وغیرہ کی نذر۔ کہ یہ کام شرعاً کہیں [illegible] نہیں۔ [illegible] لئے یہاں یہ مسئلہ خیرات کے

ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ **مسئلہ:** اولیاء کے نام کی نذر شرعی نذر نہیں۔ بلکہ لغوی ہے۔ بمعنی نذرانہ (ہدیہ) جیسے کہا جاتا ہے کہ یہ روپیہ آپ کی نذر ہے اور اس کا ادا کرنا ایسا ضروری ہے جیسا وعدہ کا پورا کرنا۔ **مسئلہ:** اگر نذر رب کے نام کی ہو اور اس کا مصرف کسی خانقاہ یا کسی درگاہ کے مجاور ہوں تو جائز ہے جیسے کوئی کہے کہ خدایا اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں خواجہ اجمیری کے مجاوروں کو اتنا روپیہ خیرات کروں۔ (شامی کتاب الصوم) **مسئلہ:** نذر کی چند قسمیں ہیں۔ نذر معلق جو کسی شے پر موقوف ہو نذر مطلق جو کسی شے پر موقوف نہ ہو۔ پھر نذر معین و غیر معین ان کے مختلف احکام میں نذر معلق شرط کے بعد واجب نہ ہوگی اور مطلق فوراً۔ **مسئلہ:** نذر شرعی کی پانچ شرطیں ہیں۔ (۱) حرام بعینہٖ کی نذر نہ ہو۔ (۲) وہ فعل بغیر نذر واجب نہ ہو۔ (۳) اپنی ملکیت سے زائد کی نذر نہ ہو۔ (۴) غیر ممکن کام کی نذر نہ ہو۔ (۵) واجب کی جنس سے ہو (درمختار) اس کے پورے مسائل انشاء اللہ سورۂ حج میں آئیں گے۔ **دوسرا فائدہ:** ہر قسم کے خرچ کا حساب ہوگا۔ خواہ حرام ہو یا حلال' تھوڑا ہو یا بہت۔ جیسا کہ نفقہ کی تعلیم سے معلوم ہوا۔ مگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان میں روزہ داروں کے خرچ کا حساب نہیں۔ ایسے ہی جو کھانا مہمان' ماں باپ یا چھوٹے بچوں کے ساتھ کھایا جائے اس کا حساب نہیں شعر۔

قطرہ قطرہ سوال خواہد شد　　ذرہ ذرہ حساب خواہد شد

مگر قبر میں صرف ایمان کا حساب ہے۔ حشر میں ایمان و اعمال دونوں کا حساب' خیال رہے کہ دنیا میں ہم رب تعالیٰ کے امین ہیں اور ہمارے اعضاء مال وغیرہ رب کی امانت ہیں امین اور کارگزار سے حساب لیا جاتا ہے مگر جنت میں مومن رب تعالیٰ کے مہمان ہوں گے۔ مہمان سے حساب نہیں ہوتا' ان کے لئے فرمایا۔ یہ حساب ہونا قانون ہے۔ اور اگر رب چاہے تو بغیر حساب بخش دے۔ یہ اس کا فضل ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت سے ستر ہزار بغیر حساب بخشے جائیں گے۔ **تیسرا فائدہ:** قیامت میں مشرکین کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ مگر بحمدہٖ تعالیٰ مسلمانوں کے بہت سے مددگار ہوں گے جیسا کہ للظلمین کے تقدم سے معلوم ہوا' انصار جمع فرما کر بتایا گیا کہ کل قیامت میں لوگوں کو بہت قسم کے مددگار کی ضرورت ہوگی مگر کفار کے لئے ان میں سے کوئی مددگار نہ ہوگا۔ جیسے دنیا میں ہم صدہا مددگاروں کے حاجت مند ہیں۔ پیدائش میں ماں کے تعلیم و تربیت میں باپ و استاد کے' کھانے پینے میں کسانوں کے' لباس میں درزی و بزاز کے۔ جب فانی جسم کے لئے اتنی مددوں کی ضرورت ہے تو باقی رہنے والی روح کے لئے ان سے زیادہ اور مددوں کی ضرورت پڑے گی۔ کسی کی مدد سے ایمان پر خاتمہ' کسی کی مدد سے حساب قبر میں کامیابی' کسی کی مدد سے قیامت میں گناہوں کی تخفیف یا معافی' کسی کی مدد سے پل صراط پر آسانی سے گزر' کسی کی مدد سے بھی وہاں کی گرمی سے امان۔ **مسئلہ:** حرام لغیرہٖ کی نذر صحیح ہے۔ جیسے روزہ عید' اور حرام لعینہٖ کی نذر باطل' مگر امام طحاوی نے فرمایا کہ وہ بھی صحیح ہے۔ جس میں کفارہ قسم واجب ہو (شامی باب النذر)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نذر پوری کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ۔ (حج: ۲۹) مگر مسلم میں بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے نذر سے منع فرمایا اور فرمایا کہ نذر خیر نہیں لاتی بلکہ اس کے ذریعہ بخیل سے مال خرچ کرایا جاتا ہے۔ اس حدیث اور آیت میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے

چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ حدیث میں نذر ماننے سے منع کیا گیا اور آیت میں ماننے کے بعد وجوب ادا کا ذکر ہے۔ یعنی مانو مت' مگر جب مان لی' تو پوری کرو۔ دوسرا یہ کہ بطور معاوضہ نذر ماننا منع' اور بطور شکر یہ جائز۔ یعنی یہ سمجھنا کہ میری نذر رب کی نعمت کا بدلہ ہے۔ باطل ہے' تیسرا یہ کہ ان لوگوں کے لئے نذر منع ہے جن پر ادائے نذر بھاری ہو۔ چوتھا یہ کہ بغیر نذر عبادت کرنا نذر کی عبادت سے بہتر ہے کہ اس میں بندہ کی غرض کو دخل نہیں ۔لہٰذا ممانعت تنزیہی ہے۔ پانچواں یہ کہ اس اعتقاد سے نذر ماننا کہ اس سے تقدیر پلٹ جائے گی۔ منع ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوا کہ وہ خیر نہیں لاتی مگر اس خیال سے نذر ماننا کہ صدقہ رد بلا ہے جائز ہے۔ (تفسیر خازن) **دوسرا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ نذر کے لئے یہ شرط ہے کہ واجب کی جنس سے ہو مگر حضرت مریم کی والدہ نے اپنا بچہ بیت المقدس پر وقف کرنے کی نذر مانی اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا۔ (آل عمران:۳۵) نیز حضرت مریم کو خاموشی کی نذر ماننے کا حکم دیا گیا۔ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا۔ (مریم:۲۶) **جواب:** ان شریعتوں میں اس قسم کی نذریں جائز تھیں۔ ہمارے ہاں منع جیسا کہ احادیث میں ہے۔ **تیسرا اعتراض:** عبداللہ ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوا کہ گناہ کی نذر سے بھی کفارہ قسم واجب ہے تو کیا اگر کوئی گانے' بجانے' زنا اور قتل وغیرہ کی نذر مان کر ادا نہ کرے اس پر کفارہ واجب ہوگا۔ **جواب:** شائد ان کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کوئی ایسے حرام کام کی نذر مانے جو کہیں واجب بھی ہوتا ہے تو کفارہ دے۔ جیسے روزہ عید' اور قتل انسان کہ یہ افعال کہیں واجب بھی ہیں۔ روزہ رمضان اور قتل مرتد و کافر حربی فرض ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ظالموں کا مددگار کوئی نہیں۔ حالانکہ وہاں کفار کے مددگار بہت ہوتے' قیامت میں گنہگار مسلمانوں کے مددگار ہوں گے۔ گنہگار مسلمان بھی تو ظالم ہیں۔ **جواب:** قرآن شریف میں ظالم تین قسم کے لوگوں کو فرمایا گیا۔ کفار کو' گنہگار کو' خطا کار اور لغزش والوں کو رب فرماتا ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (لقمان:۱۳) اور فرماتا ہے مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ (فاطر:۳۲) اور فرماتا ہے۔ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (انبیاء:۸۷) مگر یہاں ظالم مطلق ہوتا ہے۔ وہاں کافر مراد ہوتا ہے اور مددگار سے مراد بعد موت کے مددگار مطلب یہ ہے کہ بعد موت کفار کا مددگار کوئی نہیں۔ **پانچواں اعتراض:** دوسرے مقام پر رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَوْلِیٰٓئُهُمُ الطَّاغُوْتُ (بقرہ:۲۵۷) کافروں کے مددگار شیاطین ہیں اور یہاں فرماتا ہے کہ کفار کا مددگار کوئی نہیں' آیات میں تعارض ہے۔ **جواب:** وہاں دنیا میں کفر و بے دینی کی مدد یعنی بہکانا' بُرے کام کرانا مراد ہے اور یہاں آخرت میں اور پھر یعنی عذاب سے بچانے کی نفی ہے۔ لہٰذا دونوں آیات درست ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

خرچ اور نذر کی بہت سی اقسام ہیں اور ہر ایک کے مختلف درجے۔ جس درجہ کی خیرات یا نذر ہو گی وہ ہی درجہ ملے گا۔ یعنی رب جانتا ہے کہ تمہاری خیرات اور نذر قبولیت کے کون سے درجے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ اس کے مطابق جزا دے گا۔ جان پر خرچ' اولاد پر خرچ' فقراء پر خرچ' مسجد پر خرچ' دینی مدرسہ پر خرچ' جہاد پر خرچ' پھر جان پر خرچ' مال کا خرچ' اولاد کا خرچ۔ پھر جنت کی نیت سے خیرات' جہنم سے بچنے کے لئے خیرات' رضائے مصطفیٰ ﷺ کے لئے خیرات' رضائے الٰہی کے لئے خیرات

اگرچہ یہ سب خرچ درست ہیں مگر ان کے درجے مختلف' عقلمند ایک پیسہ کی خیرات پر وہ ثواب پالیتا ہے جو بے وقوف لاکھوں روپیہ کی خیرات پر نہیں پاتا۔ یہ ہی نذر کا حال ہے کوئی مال کی نذر مانتا ہے' کوئی اعمال کی اور کوئی جان کی' حضرت طلحہ نے حضور علیہ السلام کی ڈھال بن کر اسی (۸۳) زخم کھائے۔ جب میدان جنگ سے لوٹے تو چہرہ سے خون پونچھتے تھے اور کہتے تھے کہ جس مقصد کے لئے میری ماں نے مجھے جنا تھا۔ الحمد للہ میں نے پورا کر دیا۔ یہ بہادروں کی نذر تھی۔ ظالمین یعنی ریا کار بے موقعہ خرچ کرنے والے یا مال خبیث سے خیرات کرنے والے یا طعن و ایذا سے صدقات باطل کرنے والے والوں کا کوئی مددگار نہیں۔ جو ان کے صدقات قبول کرادے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ
اور ظاہر کرو تم صدقوں کو پس بہت اچھا ہے وہ اور اگر چھپاؤ تم انہیں اور دو تم اسے فقیروں کو پس وہ اچھا ہے
اگر خیرات علانیہ دو تو وہ کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر چھپا کر فقیروں کو دو تو تمہارے لئے سب سے
لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾
واسطے تمہارے اور مٹادے گا تم سے تمہارے گناہوں میں سے اور اللہ اس کا جو تم کرتے ہوئے خبر رکھنے والا ہے
بہتر ہے اور اس میں تمہارے کچھ گناہ گھٹیں گے اور اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقہ کی بہت سی اقسام و احکام کا ذکر ہوا۔ مثلاً پہلے ریاء و اخلاص کے صدقات اور ان کے احکام بیان ہوئے پھر کھرے' کھوٹے مال کی خیرات اور ان کے احکام کا ذکر ہوا۔ اب بھی صدقہ ہی کی بعض دوسری قسموں کا ذکر ہے یعنی صدقہ ظاہری و پوشیدہ ان کے احکام کیا ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اجمالی طور پر ارشاد ہوا تھا کہ ہر خرچ اور نذر کی رب کو خبر ہے۔ اب اس کی قدرے تفصیل ہے کہ صدقہ ظاہر کی بھی خبر ہے اور پوشیدہ کی بھی کہ ان کا انجام یہ ہوگا۔ **تیسرا تعلق:** صدقہ کا تعلق چند چیزوں سے ہے۔ دینے والے سے لینے والے سے' مال سے' اور دیگر مسلمانوں سے اگلے تین تعلقات کا ذکر پہلے ہوا کہ دینے والا دے کر فقیر کو ایذا نہ دے' اچھے مال سے صدقہ دے' ریاکاری کو دخل نہ دے۔ اب چوتھے تعلق کا ذکر ہے کہ کیا صدقہ کی خبر دوسروں کو بھی دے یا نہ دے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ رب ہر خرچ کو جانتا ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ مخلوق کو بتانا بھی درست ہے یا نہیں۔ گویا پہلے خالق کے علم کا ذکر تھا اب مخلوق کے علم کا۔ **پانچواں تعلق:** جیسے تخم بونے کے لئے چند چیزوں کی ضرورت ہے' اعلیٰ زمین' قابل تجربہ کار بونے والا۔ بونے کا طریقہ' ایسے ہی صدقہ کے لئے چند چیزیں درکار ہیں۔ صدقہ دینے والا جو گویا کاشتکار ہے۔ صدقہ جو گویا تخم ہے۔ فقیر جو گویا صدقہ کی زمین ہے۔ بونے اور کاشت کرنے کا طریقہ کہ کیسے بوئے' ظاہر کر کے دے یا چھپا کر۔ پہلی تین چیزوں کا ذکر پہلے ہو چکا۔ اب چوتھی چیز یعنی طریقہ کاشت کا ذکر ہے۔

شان نزول

امام کلبی فرماتے ہیں کہ جب آیت وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ (بقرہ: ۲۷۰) نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ جب خدا کو ہر صدقہ کی خبر ہے تو علانیہ صدقہ بہتر ہے یا پوشیدہ۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (روح المعانی)

تفسیر

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ چونکہ یہ جملہ پچھلی آیت کی گویا تفصیل ہے۔ اس لئے یہاں واؤ نہ لایا گیا۔ تبدوا 'بدءٌ' سے بنا۔ بمعنی ظہور اور یہاں وہ اظہار مراد ہے جو ریا کاری اور شہرت کی غرض سے نہ ہو بلکہ اس لئے ہو کہ دیکھا دیکھی لوگ بھی خیرات کریں۔ خیال رہے کہ ابداءٌ۔ اظہار' جہران سب کے معنی ہیں۔ اعلان و اظہار مگر جہر میں ہے بتانا اظہار میں ہے دکھانا' ابداءٌ دونوں کو شامل ہے۔ ظاہر ظہور صدقہ دینا' یا صدقہ سے پہلے اس کا اعلان کر دینا کہ ہم یہ دیں گے۔ یا صدقہ کے بعد اعلان کرنا کہ ہم نے یہ دیا۔ سب ابدا میں داخل ہیں۔ حضرت عثمان غنی نے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر نو سو اونٹ' نو سو دینار دینے کا اولاً اعلان فرمایا۔ پھر سب کے سامنے لا کر حاضر کر دیئے۔ یہ ابداءٌ سے دو معنی پر عمل ہوا' پھر رومہ اپنے بہو سے خریدا پھر اس کے وقف کا اعلان فرما دیا۔ یہ ابداء کی تیسری صورت پر عمل ہوا۔ غرضکہ ان حضرات کے اعمال اس آیت کریمہ کی تفسیریں ہیں۔ صَدَقَاتٌ صدقۃٌ کی جمع ہے۔ اس کی لفظی تحقیق پہلے گزر چکی۔ یہاں اس سے صدقہ کی اقسام مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ صدقہ نفلی مراد ہے بعض نے فرمایا۔ صدقہ فرض بعض کے نزدیک عام صدقات۔ صدقہ فرض و نفلی ہر خیرات کو کہتے ہیں۔ (کبیر) یعنی اگر تم اپنے صدقات لوگوں پر ظاہر کرو۔ فَنِعِمَّا ھِیَ۔ ف جزائیہ اور نعما نعم فعل مدح اور ما تنکیریہ کا جملہ ہے۔ یہ جملہ ھی کی خبر اور ھی کا مرجع یا صَدَقَاتٌ ہیں۔ یا تُبْدُوْا کا مصدر یعنی ظاہر صدقے یا صدقات کا ظاہر کرنا۔ کیا ہی اچھا' یا بہت ہی اچھا ہے۔ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ۔ اخفاء اظہار کا مقابل ہے۔ جیسے معنی ابداء و اظہار میں ملحوظ تھے ان سب کی نفی اخفاء میں معتبر ہو گی کہ نہ پہلے صدقہ کا اعلان ہو نہ صدقہ دیتے وقت نہ بعد میں۔ ھا کا مرجع یا مطلقاً صدقات ہیں یا اس کی خاص نوع۔ یعنی صدقہ واجبہ جیسے کہا جاتا ہے۔ عِنْدِیْ دَرَاھِمُ وَ نِصْفُهٗ اس نصفهٗ میں ہٗ کا مرجع دوسرا درم ہے نہ کہ یہ مذکورہ۔ اظہار اور اخفاء کو جمع کرنے میں صنعت طباق لفظی ہے اور چونکہ صدقہ پوشیدہ میں فقیر و غنی کی پہچان دشوار ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ یہ قید لگا دی کہ فقیر کو دو۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ کا ظاہر کرنا بہتر۔ اس لئے وہاں فقراء کا ذکر نہ کیا اور چونکہ زکوٰۃ میں فقیر ہی مصرف نہیں۔ دیگر مصارف بھی ہیں اور صدقہ نفل پوشیدہ کرنا بہتر۔ اور اس کا مصرف صرف فقراء اس لئے یہاں فقراء کی قید لگا دی (روح المعانی) فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ یہ ف بھی جزائیہ ہے اور ھُوَ کا مرجع تُخْفُوْا کا مصدر چونکہ علانیہ صدقہ اکثر دینے والے کے لئے مضر اور دوسرے کو فائدہ مند ہوتا ہے اور پوشیدہ خیرات اس کے برعکس۔ اس لئے یہاں لَكُمْ فرمایا گیا نہ کہ پہلی صورت میں یعنی صدقہ پوشیدہ کر کے دینا تمہارے واسطے بہتر ہے۔ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ یُکَفِّرُ کفر سے بنا' بمعنی ڈھانپنا۔ اسی سے کفارہ ہے۔ اس کا فاعل یا تو اللہ ہے' یا صدقہ پوشیدہ یا صدقہ علانیہ یا ہر صدقہ۔ مِنْ تبعیضیہ ہے سَیِّاٰت جمع سیئۃٌ کی ہے' بمعنی ناگوار چیز' یہاں گناہ مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ مِنْ' بمعنی مِنْ اجل ہے۔ بعض کے نزدیک مِنْ زائدہ یعنی رب تعالیٰ یا وہ صدقہ تمہارے سامنے گناہوں کو یا بعض گناہوں کو ڈھانک دے گا یا مٹا دے گا۔ (کبیر) خیال رہے کہ

یہ جملہ جزاء شرط پر معطوف نہیں۔ بلکہ مستقل جملہ ہے چونکہ اس سے پہلے ساکن مضارع گزر چکے ہیں۔ اس لئے اسے بھی ساکن کر دیا گیا۔ (روح المعانی) وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ مَا موصولہ ہے۔ یا مصدریہ۔ اس سے یا تو صدقات مراد ہیں یا سارے اعمال یعنی خدائے تعالیٰ تمہارے سارے اعمال سے خبردار ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اگر تم اپنے صدقات وخیرات علانیہ طور پر دو تو اچھا ہے کہ اس میں اوروں کو بھی خیرات کی رغبت ہوگی اور تم سے تہمت بخل دور ہوگی اور تمہاری پیروی میں جو بھی صدقہ کرے گا اس کا ثواب تمہیں بھی ملے گا اور گویا کہ تم عملاً مبلغ بھی ہو گئے اور اس صورت میں فقیر کی تحقیق بھی ہو جائے گی اور اس سے فقیر کا کام بھی نکلے گا اور اگر چھپا کے خیرات کرو تو تمہارے واسطے بہت بہتر ہے۔ بشرطیکہ فقیر ہی کو خیرات دو۔ بے احتیاطی سے غنی کو نہ دے دو۔ اس لئے کہ چھپا کر دینے میں زیادہ اخلاص ہے۔ نیز تمہارا نفس شہرت اور واہ واہ کا خواستگار ہے۔ اس صورت میں نفس کی مخالفت بھی ہے۔ نیز چھپا کر دینے میں فقیر کی پردہ پوشی بھی ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہ میں ذلیل نہ ہو۔ نیز خفیہ خیرات میں لوگوں کو تمہارے مال کا اندازہ بھی نہ ہوگا جس سے تم صدہا آفات سے محفوظ رہو گے۔ نیز فقیر میں مانگنے کی عادت نہ پیدا ہوگی۔ غرضکہ علانیہ خیرات میں بھی بہت فائدے ہیں اور خفیہ میں بھی۔ لہٰذا وہ بھی اچھی اور یہ بھی۔ اس صدقہ کی برکت سے رب تعالیٰ تمہارے بہت سے گناہ معاف کر دے گا۔ وہ تو ہر ایک کے اعمال نیت ارادوں سے خبردار ہے۔ صدقہ کی طرح دیگر بدنی عبادات کا بھی یہ ہی حال ہے کہ کبھی ان کا اظہار افضل ہوتا ہے کبھی اخفاء نیز عبادات کا اظہار بہتر بلکہ ضروری ہے اور بعض کا اخفاء پھر اپنے ایمان کا اظہار فرض ہے کہ اس اظہار پر شرعی احکام کفنی دفنی وغیرہ موقوف ہیں۔ نماز پنجگانہ کا اظہار واجب ہے کہ ان میں جماعت واجب نماز جمعہ وعید کا اظہار فرض ہے کہ ان کے لئے جماعت فرض، حج ظاہر کر کے ادا کرنا سنت ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے حج کا اعلان فرمایا تھا۔ سب کو جمع کر کے حج کو لے گئے تھے۔ نماز تہجد وغیرہ کا اخفاء لازم ہے۔ خیال رہے کہ اخفاء لازم یا مستحب ہے حضور ﷺ نے کہیں ظاہر کر کے کیں۔ تاکہ لوگ طریقہ سیکھ لیں حتیٰ کہ نماز منبر پر پڑھائی طواف وسعی اونٹ پر کی وہاں اظہار کی وجہ دوسری ہے۔ یہ حضور ﷺ کی خصوصیت ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** نیت خیر کے ساتھ ہر طرح کی خیرات معتبر ہے۔ علانیہ ہو یا پوشیدہ بدنیتی سے کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ **دوسرا فائدہ:** صدقات واجبہ ظاہر کر کے اور نفلی صدقے چھپا کر دینا بہتر ہے۔ جیسا کہ اس آیت کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** نفلی صدقے بھی اگر دوسروں کو خیرات کی رغبت دینے کے لئے ظاہر کر کے دیئے تو بھی افضل ہے۔ (مدارک وخزائن) **مسئلہ:** جب خیرات لینے والا کھلا فقیر نہ ہو تو اسے ہر قسم کا صدقہ چھپا کر دینا ہی بہتر ہے۔ **مسئلہ:** اگر خیرات دینے والا اغنیا میں مشہور نہ ہو تو اسے بھی چھپا کر خیرات کرنا ہی افضل ہے۔ (مدارک) **مسئلہ:** چندہ کے موقعہ پر علانیہ خیرات خفیہ سے افضل ہے۔ اسی لئے صحابہ کرام جو مخلصین کے امام ہیں۔ چندہ علانیہ دیا کرتے تھے۔ ورنہ عثمان غنی وصدیق اکبر کے صدقات مشہور نہ ہوتے تھے۔ لوگ اب تک انکے واقعات سن کر جوش سے خیرات کرتے ہیں۔ ان سب کا ثواب ان کو بھی ملتا ہے۔ **چوتھا فائدہ:** صدقات صرف فقراء وغیرہ کیلئے

ہیں جیسا کہ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ سے معلوم ہوا اغنیا کو نہ دیئے جائیں۔ **پانچواں فائدہ:** اس سے معلوم ہوا کہ کبھی ذکر بالجہر بھی افضل ہے کہ اس میں دوسروں کو ذکر کی ترغیب ہے۔ شیطان کو بھگانا ہے۔ اپنی نیند دفع کرنا ہے۔ جیسے صدقہ کا اظہار کبھی افضل ہے کہ وہ عبادت ہے اور اظہار عبادت بھی افضل۔ ایسے ہی ذکر اللہ عبادت ہے اس کا اظہار کبھی افضل ہے۔ **مسئلہ:** صدقات جاریہ کو اغنیاء بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ جیسے قبرستان اور مسجد کی زمین اور وقف کنوئیں کا پانی' مسافر خانے وغیرہ۔ **مسئلہ:** ظاہری مال یعنی جانور اور زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ سلطانِ اسلام ہی کو دیئے جائیں۔ خود فقراء کو نہ دیئے جائیں (احکام القرآن) **مسئلہ:** جیسے صدقات واجبہ اور بعض نفلی صدقے علانیہ دینا بہتر اور اکثر نفلی صدقے خفیہ دینا افضل ایسے ہی دیگر عبادات' نماز' حج وغیرہ کا بھی یہ ہی حکم ہے۔ نماز پنجگانہ' عید' جمعہ جماعت ہی سے پڑھے۔ اشراق' تحیۃ الوضو' نماز سفر' تحیۃ المسجد وغیرہ مسجد میں افضل' باقی نوافل گھر میں بہتر (احکام القرآن) **مسئلہ:** اعلان کے ساتھ حج کو جانا اسی لئے بہتر ہے کہ اس میں دوسروں کو حج کی رغبت ہوتی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** خفیہ صدقہ اکثر علانیہ سے افضل ہے جیسا کہ خَیْرٌ لَّکُمْ سے معلوم ہوا۔ حدیث شریف میں ہے کہ سات شخص قیامت کے دن سایہ عرش پر ہوں گے۔ (۱) عادل سلطان۔ (۲) جوان صالح۔ (۳) اور وہ شخص جسے حسینہ عورت حرام کاری کے لئے بلائے اور وہ رب سے ڈر کر باز رہے۔ (۴) وہ شخص جس کا دل مسجد سے لگا رہتا ہو۔ (۵) جو محض اللہ کے لئے محبت یا عداوت رکھیں۔ (۶) وہ شخص جو اکیلے میں رب کو یاد کر کے روئے۔ (۷) وہ شخص جو صدقہ اس قدر چھپا کر دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر بھی نہ ہو (مسلم بخاری) **ساتواں فائدہ:** صدقات سے گناہ معاف ہوتے ہیں جیسا کہ ویکفر سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** صدقہ سے گناہ ہی معاف ہوں گے نہ کہ شرعی یا بندوں کے حقوق' جیسا کہ من تبعیضیہ سے معلوم ہوا۔ خیرات سے قضا نمازیں معاف نہ ہو جائیں گی۔ **مسئلہ:** کبھی صدقہ حقوق العباد اور حقوق شریعت سے بھی بری کر دیتا ہے۔ کمزور بڈھا روزہ کا فدیہ دے سکتا ہے۔ میت کے فوت شدہ روزے' نمازوں کا کفارہ مال دیا جا سکتا ہے۔ جب قرض خواہ کا پتہ نہ لگے۔ یا امین کے پاس امانت کا مال پڑا ہے اور مالک گم ہو گیا تو اگر اسکے ورثاء موجود ہیں تب تو انہیں دے دے' ورنہ بعد انتظار اسکے نام پر خیرات کر دے (کتب فقہ) یہ بھی مِنْ سَيِّاٰتِكُمْ سے معلوم ہوا۔ **نواں فائدہ:** کسی علانیہ عبادت کرنے والے کو ریا کار نہ کہنا چاہیے۔ دیکھو رب نے علانیہ صدقہ دینے کی تعریف فرمائی' محض مصنفین نے اپنی کتب اپنے نام پر رکھی جیسے موطاء امام محمد۔ یا موطا امام ابوحنیفہ یا حاشیہ عبدالحکیم تا کہ لوگ ان کی زندگی میں ان کتب کے متعلق ان سے کچھ دریافت کرنے کی اور بعد وفات دعائے خیر سے یاد کریں۔ اور بعض مصنفین نے اپنا نام بھی ظاہر نہ کیا۔ جیسے صاحب مشکوٰۃ وغیرہم تا کہ ریا نہ پیدا ہو۔ ہر ایک کی نیت خیر ہے۔ اس سے وہ دیوبندی حضرات عبرت پکڑیں جو میلاد شریف' گیارھویں' عید معراج منانے والوں اور جلوس میلاد نکالنے والوں کو ریا کار وغیرہ کہتے ہیں تاحقیقی نے محض علانیہ خیرات کرنے والے صحابہ کو ریا کار کہا تو رب نے ان منافقوں پر غضب کا اظہار فرمایا کہ ارشاد کیا۔ وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوْا مِنْهَا۔ (التوبہ:۵۸)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں علانیہ صدقے کے متعلق نِعِمَّا هِيَ اور خفیہ کے بارے میں خَیْرٌ لَّکُمْ کیوں ارشاد ہوا اس

میں فرق کیا ہے؟ **جواب:** دوسرے کے مقابلہ میں بہتر کو خیر کہا جاتا ہے۔ اور مطلقاً بہتر کو نعم۔ مقصود یہ ہے کہ خفیہ خیرات علانیہ سے بہتر ہے۔ **دوسرا اعتراض:** خَیْرٌ کے ساتھ لَکُمْ کیوں ارشاد ہوا اور نِعِمَّا کے بعد کیوں نہ ہوا۔ **جواب:** اس لئے کہ خفیہ خیرات کا فائدہ صرف خیرات دینے والے کو ہے اور علانیہ کا فائدہ اس کو بھی اور دوسرے مسلمانوں کو بھی۔ کہ اس کی پیروی سے وہ بھی خیرات کریں گے۔ گویا یہ لازم ہے اور وہ متعدی اس لئے یہاں تخصیص کلام ارشاد ہوا۔ **تیسرا اعتراض:** خفیہ صدقہ کے ساتھ یہ قید کیوں لگائی کہ فقراء کو دو اعلانیہ کے ساتھ یہ قید کیوں نہ لگی؟ **جواب:** اس لئے کہ علانیہ صدقہ امیر لینے کی ہمت ہی نہ کرے گا۔ کہ اس میں ذلت ہے نیز اگر لینا چاہیے گا تب بھی واقف کار لوگ کہہ دیں گے کہ تو مالدار ہو کر خیرات کیوں لیتا ہے مگر خفیہ صدقہ ہر ایک لینے کی ہمت کرسکتا ہے۔ اسلئے وہاں زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ نیز خفیہ صدقہ کرنے والا فقیر کی زیادہ چھان بین نہیں کرسکتا' کہ تحقیقات میں اظہار کا اندیشہ ہے۔ اس لئے زیادہ احتیاط کا حکم دیا گیا۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقات صرف فقراء لیں اور دوسری آیت میں اس کے مصرف آٹھ بیان کئے گئے۔ فقراء' مساکین' یتیم' مسافر' وغیرہ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں تمام مصارف کا ذکر نہ ہوا بلکہ بعض کا۔ اور ایک کے ذکر سے دوسرے کی نفی نہیں ہوجاتی۔ دوسرا یہ کہ وہ آٹھوں قسمیں فقراء کی ہی اقسام ہیں۔ کہ جو یتیمی کی وجہ سے یا مسافر ہو کر فقیر ہوجائے۔ ورنہ غنی یتیم زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ عامل زکوٰۃ کو بھی زکوٰۃ میں سے تنخواہ اسی لئے دی جاتی ہے کہ وہ فقراء کا خدمت گار ہے۔ **پانچواں اعتراض:** فقراء کے جمع لانے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کم از کم تین فقیروں کو دینا چاہیے (شافعی)؟ **جواب:** الفقراء میں الف لام جنسی ہے جس نے اس کی جمعیت باطل کردی۔ نیز صدقات بھی جمع ہیں اور واقعی جمیع فقراء کو دیئے جائیں گے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ وخیرات ہر قسم کے فقراء کو دیا جائے مگر احادیث وفقہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ سید کو اور اپنے اصول وفروع کو نہ دے خاوند وبیوی کو نہ دے۔ وہ احادیث وفقہی مسائل اسی آیت کے خلاف ہیں۔ لہٰذا انہیں رد کردینا چاہیے۔ **جواب:** وہ احادیث وفقہی عبارت اس آیت کی تفسیر وشرح ہیں جن سے معلوم ہوا کہ یہاں فقراء سے فلاں قسم کے فقراء مراد ہیں۔ جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (بقرہ: ۸۳) قرآن کریم میں مجمل ہے جسے حدیث وفقہ نے واضح فرمایا کہ فلاں فلاں وقت فلاں فلاں نماز اتنی رکعات اور اس شرائط سے پڑھو۔ یہ آیات مطلق نہیں بلکہ مجمل ہیں۔ مجمل کی تفصیل حدیث سے بھی ہوسکتی ہے۔ فقہ سے بھی' منکرین حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں کرسکتے۔

تفسیر صوفیانہ

شریعت میں صدقہ علانیہ وہ ہے جو لوگوں پر ظاہر ہو اور خفیہ وہ جو لوگوں سے پوشیدہ مگر طریقت میں صدقہ علانیہ وہ ہے جس میں شہواتِ نفسانیہ داخل ہوں۔ اور خفیہ وہ جو خالص رب کے لئے ہو۔ فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم صدقات میں حور وقصورِ جنت وغیرہ کی نیت کرکے اسے علانیہ بنادو تو بھی اچھا ہے لیکن اگر تمہارا صدقہ ان سب سے خالی ہو صرف رب کی رضا جوئی کے لئے ہو اور اس کا اجرا اپنے اعضاء ظاہری اور باطنی کو دو جو کہ حقیقی فقیر ہیں تو تمہارے واسطے بہتر ہے۔ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد: ۳۸) سخی قیامت کے دن اپنے صدقہ کے سایہ میں ہوگا صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر سخی کا صدقہ رب کے لیے ہے

تو وہ اللہ کے سایہ میں ہوگا اور اگر جنت کے لئے ہے تو جنت کے سایہ میں۔ اور اگر ہوائے نفسانی اور خواہش شیطان کے لئے ہے تو وہ ہاویہ کے سایہ میں صدقہ میں سواء رضائے الٰہی اور دوسری نیت کرنا ہمارے مشرب میں شرک ہے اور شرک ظلم عظیم (ماخوذ از روح البیان) صوفیاء فرماتے ہیں کہ مومن کی نیت ہی وہ چیز ہے جو عادات کو عبادات بنا دیتی ہے جس سے کھانا پینا سونا بھی عبادت بن جاتے ہیں۔ اور نیت کے بغیر عبادات عادات بن جاتی ہیں کہ انسان کی نماز روزے بھی عادات بن جاتی ہیں۔ نیت درست ہو تو علانیہ وخفیہ ہر طرح کی عبادت قبول ہے۔ مگر مومن اخلاص کے انتظار میں عبادات چھوڑے نہیں۔ کیے جائے اخلاص کی دعا کرتے ہیں کبھی وہ بھی نصیب ہو جائے گا۔ عبادات میں حضور ﷺ کی نقل کی نیت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی طفیل نقل پر ہی رحمت کرے گا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ

نہیں ہے اوپر تمہارے ہدایت ان کی اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور جو کچھ خرچ کرو گے

انہیں راہ دینا تمہارے ذمے لازم نہیں ہاں اللہ راہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم جو اچھی چیز دو

خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

تم بھلائی سے پس واسطے جانوں تمہاری کے ہے اور نہیں خرچ کرتے ہو تم مگر تلاش کرنے کے لئے رضا اللہ کی جو کچھ خرچ کرو گے

تو تمہارا ہی بھلا ہے اور تمہیں خرچ کرنا مناسب نہیں مگر اللہ کی مرضی چاہنے کے لئے اور جو مال دو تمہیں

مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

تم بھلائی سے پورا کیا جاوے گا طرف تمہاری اور تم نہ ظلم کئے جاؤ گے

پورا ملے گا اور نقصان نہ دیئے جاؤ گے

تعلق

اس آیت کریمہ کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقات وخیرات کا ذکر تھا۔ اب اس کے مصارف کا بیان ہے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوگا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ صدقہ فقراء کو دو۔ اب فقراء کی تعمیم کی جا رہی ہے کہ خواہ کفار ہوں یا مسلمان سب کو دے سکتے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقہ مقبول ومردودہ کا ذکر تھا۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اے نبی ﷺ صدقہ مقبول کی توفیق دینا ہمارا کام ہے نہ کہ آپ ﷺ کا۔ **چوتھا تعلق:** صدقہ میں چند چیزیں ہیں دینے والا مال' اس کی ادا' اور لینے والا' اگلی چیزوں کا ذکر پچھلی آیات میں ہو چکا۔ اب آخری چیز یعنی لینے والے کا ذکر ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیات میں صدقات کا ذکر تھا اس کے فضائل' مسائل' فوائد ارشاد ہوئے تھے۔ اس آیۃ میں تحفہ' ہدیئے وغیرہ دینے اس کے فضائل' مسائل فوائد بیان ہو رہے ہیں چونکہ ہدیہ تحفہ وغیرہ صدقہ کی مثل ہیں اس لئے رب تعالیٰ نے صدقہ کے بعد ہدیہ کا ذکر فرمایا۔ صدقہ بذات خود

عبادت ہے اور صدقہ بذات خود تو معاملہ ہے مگر نیت خیر سے ہو تو اس کا ثواب عبادت کا سا ہے۔

شان نزول

اس کے شان نزول میں چند روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت اسماء بنت ابی بکر کی والدہ نقیلہ اور ان کی دادی حضرت اسماء کے پاس کچھ حاجت لے کر آئیں۔ مگر یہ دونوں مشرکہ تھیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں حضور ﷺ کی بغیر اجازت تمہیں کچھ نہیں دے سکتی کیونکہ تم بے دین ہو۔ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئیں تب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے انہیں مشرکہ ماں و دادی پر صدقہ کرنے کا حکم دیا (کبیر) دوسرا یہ کہ بعض انصار کی یہود بنی نضیر و بنی قریظہ سے قرابت تھی۔ انصار انہیں اپنی خیرات نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم جب تک مسلمان نہ ہو جاؤ۔ ہماری خیرات کے مستحق نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (کبیر) تیسرا یہ کہ اسلام سے پہلے مسلمانوں کی یہود سے رشتہ داریاں تھیں۔ اس وجہ سے وہ ان کے ساتھ سلوک کیا کرتے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہیں یہود کے ساتھ سلوک کرنا ناگوار ہونے لگا اور انہوں نے اس سے ہاتھ روکنا چاہا تا کہ یہود اسلام کی طرف مائل ہوں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (خزائن العرفان و خازن) چوتھا یہ کہ مدینہ کے مسلمان پہلے عام فقرائے مدینہ پر صدقہ کرتے تھے۔ خواہ کافر ہوں یا مومن۔ جب مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تو نبی ﷺ نے مشرکین کو خیرات دینے سے ممانعت کردی تا کہ وہ اسلام لانے پر مجبور ہو جائیں۔ تب یہ آیت کریمہ اتری (خازن) غرضیکہ یہ آیت کفار اہل قرابت کے ساتھ سلوک کرنے کے لئے اُتری۔ اور ان روایات میں کوئی تعارض بھی نہیں۔ ممکن ہے کہ سارے واقعات پیش آئے ہوں۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری ہو۔

تفسیر

لَیْسَ عَلَیْکَ ھُدٰھُمْ۔ عَلٰی ضرر یا الزام کے لئے آتا ہے یہاں الزام کے لئے ہے۔ کاف سے خطاب یا نبی ﷺ کو ہے یا ہر قرآن پڑھنے والے کو۔ کیونکہ اس سے پہلے اور بعد مسلمانوں سے ہی خطاب ہو رہا ہے۔ ھُدٰی بمعنی ہدایت ہے۔ ھُمْ کا مرجع کفار ہیں جن کے متعلق سوالات ہوئے تھے ہدایت سے یا تو مطلوب تک پہنچانا مراد ہے یا توفیق خیر دینا' یا اسلام پر مجبور کرنا' نہ کہ راہ دکھانا کیونکہ نبی ﷺ نے سب کو راہ دکھائی' اور آپ اس لئے بھیجے گئے تھے۔ یعنی اے نبی ﷺ اے قرآن پڑھنے والے یا اے کفار کو خیرات دینے سے انکار کرنے والے تم پر انہیں ہدایت دے دینا واجب نہیں کیونکہ آپ صرف بشیر و نذیر ہیں اور آپ کے ذمہ صرف تبلیغ' اس دعوت پر آپ کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ لٰکِنَّ دفع وہم کے لئے آیا۔ یَھْدِیْ سے ہدایت خاصہ مراد ہے یعنی مقصود تک پہنچا دینا یا توفیق خیر دینا۔ یَشَآءَ کا مفعول (ہدایۃ) پوشیدہ ہے لیکن جسے رب ہدایت دینا چاہے' اسے ہدایت دے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ مَا شرطیہ ہے اور انفاق سے خیرات مراد ہے۔ اور مِن تنکیریہ یا بیانیہ ہے۔ خیر سے زیادہ مال مقصود یعنی نفلی صدقات لِاَنْفُسِکُمْ سے پہلے ہو پوشیدہ ہے یعنی جو کچھ تم مال راہ الٰہی میں خرچ کرو گے۔ وہ درحقیقت تمہارے ہی لئے ہوگا۔ لہٰذا تم نہ تو ردی مال خیرات کرو نہ فقیر کو طعنے دو۔ نہ ریا کاری کو دخل دو۔ نہ فقیر کے کفر و ایمان کو دیکھو۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰہِ۔ یہ مَا نافیہ ہے اور تُنْفِقُوْنَ سے صدقات مراد ابْتِغَآءَ مفعول لہٗ وَجْہِ اللّٰہِ سے مراد رضائے الٰہی ہے یا تو یہ جملہ نفی ہی ہے یا بمعنی

نہی جیسے وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ (بقرہ: ۲۳۳) اور جیسے وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ (بقرہ: ۲۲۸) یعنی تم نہیں خرچ کرتے ہو مگر رضائے الٰہی کے لئے۔ یا نہ خرچ کرو مگر طلب رضاء کے لئے۔ (کبیر و خازن) وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَیْرٍ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ۔ یہ جملہ یا پچھلے وَمَا تُنفِقُوْنَ کی تاکید ہے۔ یا مستقل عبارت' یہاں بھی ما شرطیہ ہے اور مِنْ تنکیریہ یا بیانیہ ہے۔ خَیْرٍ سے ہر صدقہ نفلی مراد ہے یُوَفَّ' وفاءٌ سے بنا' بمعنی پورا کرنا' باب تفعیل میں زیادتی کے معنی پیدا ہوئے۔ اس سے یا دنیوی بدلہ مراد ہے یا اخروی بھی۔ چونکہ یوف میں ادا کے معنی شامل ہیں۔ اس لئے اس کے بعد الیٰ آیا یعنی جو کچھ مال تم خیرات کرو گے تمہیں اس کا بدلہ پورا پورا دیا جائے گا۔ لہٰذا فقیر کے سامنے کفر پر نظر مت کرو۔ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ واؤ حالیہ ہے اور جملہ الیکم کی ضمیر سے حال اس کا عامل یُوَفَّ ہے اور ظلم بمعنی کم کرنا یعنی تمہارا ثواب کچھ کم نہ کیا جائے گا یا تم ظلم نہ کئے جاؤ گے کہ بلاوجہ اعمال کے ثواب سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! تم اسلام پھیلانے کے لئے صدقات روکنے کی تدبیر کیوں اختیار کرتے ہو۔ تم کو کفار پر ہدایت دے دینا واجب نہیں۔ یا اے نبی ﷺ آپ تبلیغ دین کے لئے کفار سے خیرات روکنے کا طریقہ اختیار نہ فرمائیں۔ آپ پر یہ واجب نہیں کہ ان کو ہدایت دے دیں۔ آپ ﷺ کا فرض صرف احکام پہنچا دینا ہے اس سے زیادہ مشقت کیوں کرتے ہیں۔ ہدایت تو اللہ کے قبضہ میں ہے جسے چاہے دے۔ جس کے نصیب میں ہدایت ہے وہ بہر حال مسلمان ہو جائے گا۔ خواہ اسے صدقہ ملے یا نہ ملے اور شقی ازلی کبھی ایمان نہ لائے گا اور اے مسلمانو تم جو کچھ خیرات کرتے ہو اپنے لئے کرتے ہو نہ کہ فقراء کیلئے تمہیں ان کے کفر و ایمان سے کیا بحث تم صرف رضائے الٰہی کے لئے صدقہ دو۔ تمہارا مدعا بہر حال حاصل ہے۔ لینے والا خواہ کوئی ہو' کافر یا مومن' تم یقین رکھو کہ جو کچھ صدق دل سے خیرات کرو گے۔ تمہیں اسکا بدلہ پورا دیا جائے گا کہ دنیا میں تمہارے مال میں برکت ہوگی اور آخرت میں بے شمار ثواب اور تم پر کسی قسم کا ظلم بھی نہ ہوگا اور نہ تمہیں نقصان پہنچایا جائے کہ تمہارا ثواب کم کر دیا جائے۔ ثواب کا مدار اخلاص پر ہے نہ کہ فقیر کے مومن و کافر ہونے پر۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کافر اہل قرابت کے ساتھ سلوک کرنا ضروری ہے۔ کفر سے رشتہ نہیں ٹوٹ جاتا۔ رشتہ سے مراد نسبی رشتہ ہے یعنی کفر کی وجہ سے بیٹا بنوت سے یا باپ ماں ابوت سے نکل نہیں جاتے بلکہ ان کے حقوق ابوت ادا کرنا ضروری ہے۔ رہا رشتہ زوجیت' وہ کفر سے ٹوٹ جاتا ہے کہ اگر زوجین میں سے کوئی مسلمان ہو جائے' دوسرا کافر رہے یا مسلمان زوجین میں سے خاوند کافر ہو جائے تو نکاح جاتا رہے گا۔ ہاں کافر و مومن میں میراث نہیں کہ کافر و مومن ایک دوسرے کے وارث نہیں۔ **دوسرا فائدہ:** ذمی کفار کو صدقہ نفلی دینا جائز ہے نہ کہ فرضی جیسا کہ مِنْ خَیْرٍ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ صدقہ فرضی صرف مسلمان کو ہی دیا جا سکتا ہے کفار اس کے مصرف نہیں۔ جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** کافر حربی کو کوئی صدقہ نفلی یا فرضی دینا جائز نہیں۔ ہاں ان کے حقوق قرابت ادا کئے جائیں گے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے مشرک بھائی کو مدینہ پاک سے مال بھیجا۔

پانچواں فائدہ: تبلیغ دین کے لئے ناجائز ذریعہ اختیار کرنا منع ہے۔ دیکھو مسلمانوں نے تبلیغ کی نیت سے اہل قرابت کفار کے حقوق روکنا چاہے۔ جس سے منع کر دیا گیا۔ **چھٹا فائدہ:** مصرف کی خباثت سے صدقہ خبیث نہیں ہو جاتا۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ اگر بدترین مخلوق پر خیرات کی جائے جب بھی ثواب ملے گا۔ (خازن) کتے کو پانی پلانا بھی ثواب ہے۔ اگرچہ وہ گندا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا۔ **اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ۔** **مسئلہ:** صدقات واجبہ جیسے فطرہ ونذر میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کافر ذمی کو دیا جاسکتا ہے۔ دیگر آئمہ کے ہاں نہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ جو صدقہ سلطانِ اسلام وصول کر سکتا ہے اسکے سوا تمام صدقات ذمی کفار کو دیئے جاسکتے ہیں چونکہ فطرہ اور سنت کا مال سلطانِ اسلام نہیں لے سکتا۔ لہٰذا کفار ذمی کو دیا جاسکتا ہے۔ (احکام القرآن) امام صاحب کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔ **وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا** (الدھر: ۸) یعنی مسلمان کھانا کھلاتے ہیں۔ مسکین یتیم اور قیدیوں کو اور ظاہر ہے کہ دار السلام میں مشرکین بھی قیدی ہونگے (روح المعانی) **مسئلہ:** ہندوستان دار السلام ہے کیونکہ یہ افغانستان سے ملحق ہے اور یہاں روزہ نماز وغیرہ بہت سے ارکان اسلامی کی آزادی ہے۔ مگر یہاں کے کفار سب حربی ہیں انہیں کسی قسم کا صدقہ دینا جائز نہیں۔ صدقہ نفل وفرض کا اختلاف ذمی کفار کے حق میں ہے۔ **ساتواں فائدہ:** مال حلال سے خیرات کرنی چاہیے نہ کہ حرام سے جیسا کہ من خیر سے معلوم ہوا۔ لینے والا کیسا بھی ہو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا۔

گر او می برد پیش آتش سجود　　تو واپس چرا می کشی دست جود

آٹھواں فائدہ: اگر فقیر خیرات کا مال حرام جگہ صرف کر دے تو اس سے دینے والے کے ثواب میں کمی نہ ہوگی۔ دیکھو کافر خیرات کھا کر بت پرستی کرے گا اور ممکن ہے کہ وہ خیرات کا پیسہ بتوں پر چڑھا دے مگر اندیشہ سے انہیں خیرات دینا منع نہ ہوا۔ **نواں فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کے صدقات' خیرات اخلاص پر مبنی تھا وہ حضرات ریا' نام ونمود دکھلاوے سے بالکل پاک وصاف تھے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان سے خطاب کر کے فرمایا۔ **وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ** ۔ ہم گواہ ہیں کہ تم لوگ رضاء الٰہی کی تلاش میں مال خرچ کرتے ہو بلکہ جن لوگوں نے انہیں ریاکار کہا۔ ان خبیثوں پر سخت عتاب ہوا۔ کہ فرمایا **وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا** (التوبہ: ۵۸) حتیٰ کہ فرمایا **اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ** (التوبہ: ۸۰) آپ ان کے لئے ستر بار دعاء مغفرت کریں ہم تو انہیں نہ بخشیں گے کہ وہ دشمن صحابہ ہیں۔ **مسئلہ:** ذمی کافر کو خیرات دینا جائز نہیں مگر ان کی خیرات لینا مسلمانوں کے لئے بے غیرتی ہے کہ اس میں ذلت ورسوائی ہے۔ صحابہ کرام نے سخت مجبوری کی حالت میں بھی کفار کے سامنے دستِ سوال نہ پھیلایا۔ ہاں ان سے قرض لینا یا ان کا مال غنیمت میں لینا جائز ہے۔ جب حضور ﷺ کی وفات شریف ہوئی تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں گروی تھی مگر انہیں سود دینا سخت حرام ہے۔ **مسئلہ:** کفار کی نوکری جائز مگر ان کے ہاں ذلیل نوکری یا بت سازی وغیرہ حرام کام کی نوکری بہت بری ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کو صدقہ دینا جائز ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ تمہارا کھانا متقی کھائے

کریں آیت وحدیث میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ایک یہ کہ آیت میں جواز کا بیان ہے اور حدیث میں استحباب کا۔یعنی صدقہ کفار کو بھی جائز مگر پرہیز گار کو بہتر۔دوسرا یہ کہ حدیث میں طعام دعوت مراد ہے اور آیت میں طعام حاجت یعنی دعوت پرہیز گاروں کی کرو اور صدقہ ہر محتاج کو دے دو۔تیسرا یہ کہ حدیث میں تحفے ہدیے مراد ہیں اور آیت میں صدقات وخیرات۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر صدقہ ہر کافر کو دیا جا سکتا ہے۔ پھر علماء نے نفلی کی قید کہاں سے لگائی اور یہ تقسیم کیسے کی کہ ذمی کو صدقہ جائز اور حربی کو منع یا ذمی کو صدقہ نفلی جائز اور فرضی منع؟ **جواب:** رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ (الممتحنہ:۸) اس کے بعد ارشاد ہے۔ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ الخ (الممتحنہ:۹) یہاں دو باتیں بیان کی گئیں۔ایک یہ کہ کافر غیر حربی سے احسان جائز۔حربی سے منع۔دوسرا یہ کہ کافر غیر حربی (ذمی) سے بر وقسط یعنی نفلی خیرات وغیرہ جائز ہے نہ کہ فرضی۔احادیث شریفہ نے بھی اسی کی تائید کی۔لہٰذا قرآن وحدیث بلکہ خود آیات قرآن میں اس تقسیم کے بغیر مطابقت ہو سکتی ہی نہیں۔اس لئے یہاں یہ قیدیں بڑھائی گئیں۔ **تیسرا اعتراض:** امام صاحب نے فرمایا کہ جو صدقہ سلطان اسلام لے سکتا ہے۔وہ ذمی کفار کو نہ دیا جائے تو چاہیے کہ چاندی سونے کی زکوٰۃ کفار کو دی جا سکے کیونکہ سلطانِ اسلام صرف پیداوار اور جانوروں کی زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے نہ کہ سونے چاندی کی۔ **جواب:** ہر زکوٰۃ لینے کا سلطان کو حق ہے۔چنانچہ حضور ﷺ وحضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہر قسم کی زکوٰۃ وصول فرماتے تھے۔عثمان غنی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اعلان فرمایا کہ چاندی سونے کی زکوٰۃ ہر شخص اپنے آپ دے۔ گویا آپ نے مال والوں کو اداء زکوٰۃ کا وکیل کیا۔رب فرماتا ہے۔ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (التوبہ:۱۰۳) اے محبوب ان کے ہر مال زکوٰۃ آپ وصول پا کر انہیں پاک فرمائیں۔ہاں فطرہ وغیرہ امام کو لینے کا حق نہیں (احکام القرآن) **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ کا ثواب پورا پورا ملتا ہے کہ فرمایا گیا۔ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ مگر دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ مقبولہ کے ایک کا ثواب سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (بقرہ:۲۶۱) دونوں آیات میں تعارض ہے؟ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔ایک یہ کہ يُوَفَّ کا مقصد یہ ہے کہ کمی نہ ہوگی۔زیادتی کا انکار اس لئے فرمایا گیا کہ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔اور دوسری آیات میں زیادتی کا ثبوت ہے۔اس آیہ میں کمی کی نفی لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔دوسرا یہ کہ یہاں دنیاوی جزا کا ذکر ہے اور دوسری آیات میں اخروی کی جزاء کا تذکرہ یعنی صدقات سے تمہارے مال کم نہ ہوں گے بلکہ پورے کر دیئے جائیں گے رہی آخرت وہاں تو تمہیں بہت زیادتیاں دی جائیں گی۔یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں تم جیسا برتاوا اپنے ماں باپ سے کرو گے اور جیسا سلوک اپنے اہل قرابت سے کرو گے کل تمہاری اولاد اور تمہارے عزیز تمہارے ساتھ کریں گے جیسا کرو گے ویسا بھرو گے جو بوؤ گے وہ کاٹو گے لہٰذا آیات میں تعارض نہیں ہے۔

تفسیر صوفیانہ

حق تعالیٰ رب العالمین ہے۔اس کی ربوبیت کا مظہر تمام جہان ہے خواہ کفار ہوں یا مسلمان اس لئے بعض صدقات کفار کو

دینا جائز ہوئے کہ ان کی بقا سے اسلام کی رونق ظاہر ہوتی ہے پانی اور گندا کھاد دونوں ہی سے کھیت کی تروتازگی ہے۔ ایسے ہی روح طیب ہے اور نفس خبیث کافر اپنے اوقات ضروری خدمتِ روح پر خرچ کرو۔ یہ گویا فرضی زکوٰۃ ہے مگر زائد اوقات نفلی صدقہ کی طرح خدمت نفس پر بھی صرف کرو کہ وہ اگر چہ کافر ہے مگر ہے تو تمہارا رفیق۔ روح گویا سوار ہے اور نفس اماّرہ اس کی سواری سوار کو چاہیے کہ اپنے ساتھ اپنی سواری کی غذا کی بھی فکر رکھے۔ جہاں اپنے لئے اعلیٰ نعمتیں جمع کرے۔ وہاں سواری کے لئے بھی گھاس بھوسہ وغیرہ ادنیٰ غذاؤں کا بھی انتظام کرے۔ تم یہ نہیں کر سکتے کہ نفس کو مسلمان کرلو۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اسے کافر ذمی کا غلام بنالو۔ مگر جب یہ کافر حربی بن جائے تو پھر اس کی کوئی رعایت نہیں۔ یہ تمام صدقات وخیرات دراصل تمہارے اپنے لئے ہیں۔ خواہ اس سے نفس خبیث فائدہ اٹھائے یا پاک روح۔ مگر خیال رہے کہ نفس اگر چہ خبیث ہے مگر اسے غذا حلال ہی دینا۔ حلال نیند سوؤ حلال جماع کرو۔ دنیا کے حلال مشاغل میں مشغول ہو۔ تو تم اس کا بھی ثواب پاؤ گے۔ یہ نہ کرو کہ خبیث کو خبیث غذائیں دو۔ لہٰذا حرام جماع، حرام غذا سے بچو۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ
واسطے ان فقیروں کے جو روکے گئے بیچ راستہ اللہ کے نہیں طاقت رکھتے ہیں وہ چلنے کی بیچ زمین کے سمجھتا ہے
ان فقیروں کے لئے جو راہ خدا میں روکے گئے زمین میں چل نہیں سکتے
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ
انہیں ناواقف مالدار بوجہ بچنے کے پہچانے گا تو انہیں ساتھ نشانی ان کی کے نہیں سوال کرتے لوگوں سے زاری
نادان انہیں تونگر سمجھے بچنے کے سبب تو انہیں ان کی صورت سے پہچان لے گا لوگوں سے سوال نہیں کرتے
النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾
کر کے اور جو کچھ کرو گے تم بھلائی سے پس تحقیق اللہ ساتھ اس کے جاننے والا ہے
کہ گڑگڑانا پڑے اور تم جو خیرات کرو اللہ اسے جانتا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقات کے عارضی مستحقین کا ذکر تھا۔ اب اصلی مستحقین کا بیان ہے کیونکہ کافر فقیر خاص مصیبت میں خیرات کا مستحق ہے۔ ورنہ مسلمانوں کے صدقہ کا اصلی مستحق مسلمان فقیر ہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صرف نفلی خیرات کا مصرف بیان ہوا۔ اب عام صدقات کے مصرف کا ذکر ہے۔ خواہ نفلی ہوں یا فرضی۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں خیرات کے جائز مصرف کا ذکر تھا۔ اب مستحب مصرف کا بیان ہے کہ اگر چہ کافر فقیر کو بھی خیرات دینا واجب ہے مگر مسلمان کو بہتر۔ **چوتھا تعلق:** کچھ پہلے ارشاد ہوا تھا کہ اگر تم چھپا کر فقراء کو خیرات دو تو تمہارے واسطے بہتر ہے اب ان ہی فقراء کا تفصیلی بیان ہے جن کو خیرات دینا بہتر۔

شان نزول

مسجد نبوی کے پاس ایک صفہ (چبوترہ) تھا۔ جہاں چار پانچ سو فقراء مہاجرین رہتے تھے۔ جن کے پاس نہ گھر تھا' نہ دنیوی سامان' نہ کوئی کاروبار ہمیشہ مسجد میں حاضر رہنا' دن میں روزہ و تلاوت قرآن اور رات میں شب بیداری ہر جہاد میں لشکر اسلام کے ساتھ جانا' ان کا کام تھا۔ انہیں اصحاب صفہ کہتے ہیں یعنی چبوترہ پر رہنے والے۔ نہ ان حضرات کی شادی ہوئی تھی نہ ان کا یہاں کنبہ و قبیلہ تھا۔ ان کی غریبی کا یہ حال تھا کہ ان میں سے ستر (۷۰) کے پاس ستر پوشی کے لئے پورا کپڑا بھی نہ تھا۔ ان کے متعلق یہ آیت کریمہ اتری جس میں مسلمانوں کو انہیں صدقہ و خیرات دینے کی رغبت دی گئی۔ (کبیر و خزائن العرفان) ایک بار حضور علیہ السلام ان کے پاس تشریف فرما ہوئے۔ ان کی سخت فقیری اور بھوک کی شدت ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے صفہ والو میری امت میں سے جو تمہاری طرح صابر شاکر اور پرہیزگار ہوگا۔ وہ قیامت میں میرا رفیق ہوگا۔ پھر فرمایا کہ اے لوگو! ایک وقت وہ آنے والا ہے جب تمہارے سامنے دسترخوان پر غذاؤں کے پیالوں کے پیالے رکھے جائیں گے۔ انہوں نے عرض کیا یا حبیب اللہ اس دن ہم بڑے ہی خیر میں ہوں گے۔ فرمایا بلکہ خیر میں آج ہی ہو۔

تفسیر

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ۔ یہ لام جارہ ہے اور فُقَرَآء فقیر کی جمع' لفظ فقیر کی تحقیق پچھلی آیت میں ہو چکی۔ جار مجرور فعل پوشیدہ اِجْعَلُوْا صَدَقَاتِكُمْ کے متعلق ہے۔ اگر صدقات سے فرضی زکوٰۃ مراد ہے تو اِجْعَلُوْا امر وجوب کے لئے ہے اور اگر صدقہ نفلی مراد ہو تو استحباب کے لئے کیونکہ صدقہ فرض کسی کافر کو دینا جائز نہیں' ہو سکتا ہے کہ یہ عبارت صَدَقَاتِكُمْ مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ یعنی اپنے صدقے ان فقراء کے لئے مقرر کر دو یا تمہارے صدقے ان فقراء کے لئے ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ یہ جار مجرور وَمَا تُنْفِقُوْنَ کے متعلق ہے۔ اور وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ جملہ معترضہ یعنی جو کچھ تم ایسے فقراء پر خرچ کرو گے تو تمہیں پورا اجر ملے گا۔ (روح المعانی) فقراء فرما کر یہ بتایا گیا کہ اگر یہ لوگ بفضلہ تعالیٰ غنی ہوں تو انہیں زکوٰۃ صدقات سے بچنا چاہیے۔ فی سبیل اللہ دینی خدمات کرنی چاہئیں۔ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اُحْصِرُوْا۔ احصار سے بنا جس کا مادہ حصر ہے بمعنی رک جانا' اصطلاح میں بیماری' یا حاجت یا خوف کی وجہ سے مقصود سے رک جانے کو احصار کہا جاتا ہے۔ جو حاجی ادائے حج سے مرض یا خوف کی وجہ سے رک جائے' وہ محصر کہلاتا ہے۔ اُحْصِرُ کا نائب فاعل فقراء ہیں۔ روکنے والا کون۔ اس میں چند احتمال ہیں۔ سبیل اللہ سے ہر نیک کام مراد ہے۔ جہاد ہو یا طلب علم یا دیگر عبادات یعنی وہ فقراء جو جہاد یا طلب علم یا ضروری عبادات کی وجہ سے دنیوی کاروبار سے روک دیئے گئے۔ اس میں طلباء کی طرح فقیر' علماء' قاضی' مصنف وغیرہ تمام ہی داخل ہیں کہ یہ لوگ دینی خدمات کرتے ہیں اگر دنیا کی طلب میں مشغول ہو جائیں تو دین برباد ہو جائے گا۔ روک دیئے گئے کا مطلب یہ ہے کہ یا تو انہیں طلب علم سے روک دیا گیا۔ یا رب تعالیٰ نے روک دیا۔ یا حضور علیہ السلام کے حکم نے روک دیا کیونکہ فرض کفایہ شروع کر دینے سے فرض عین ہو جاتا ہے جیسے نماز جنازہ کہ فرض کفایہ ہے۔ مگر جو شروع کر دے اس پر فرض عین ہے۔ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ۔ یہ احصروا کا بیان ہے۔ ضرب سے چلنا پھرنا اور دنیوی کاروبار کے لئے نقل و حرکت مراد ہے۔ یعنی یہ حضرات طلب علم اور تیاری جہاد میں اس قدر مشغول ہیں کہ زمین میں چل پھر کر کمائی نہیں کر سکتے۔ یعنی کمائی

کے لئے نہ تو سفر کر سکتے ہیں جیسا کہ تجار کا قاعدہ ہے اور نہ کاروباری سلسلہ میں ہی بازار میں چل پھر کر کمائی کر سکتے ہیں۔ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ دونوں کو شامل ہے اگر وہ بازار یا سفر میں رہیں تو سبق ناغہ ہو جائیں۔ گویا اسباق نے انہیں نقل وحرکت سے روک دیا۔ حضرت ابن جبیر فرماتے ہیں کہ اس سے جہاد کے زخمی مراد ہیں۔ جو بیماری کی وجہ سے کمانے سے مجبور ہو گئے یا جو جہاد میں اپاہج ہو کر رہ گئے۔ ان کا مسلمانوں کے مال میں حق ہے کچھ بھی صحیح ہر وہ شخص جو کمائی سے مجبور ہو۔ خواہ اس کی مجبوری حسی ہو یا دین کی مشغولی' وہ اس میں داخل ہے اور یہ حکم قیامت تک جاری۔ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ...... یَحْسَبُ حسبان بمعنی ظن سے بنا' نہ کہ حساب سے' جاہل جہل سے مشتق ہے۔ یہاں خبر کا مقابل ہے نہ کہ علم وعقل کا۔ تَعَفُّفٌ' عف یا عفةٌ سے بنا۔ عف اور کف کے معنی ہیں۔ رکنا' چھوڑنا اور صبر کرنا۔ اصطلاح میں ناجائز مرغوب چیز سے بچنے کو عفت استعفاف اور تعفف کہا جاتا ہے۔ اسی لئے عفیفہ وہ عورت کہلاتی ہے جس کا دامن بے غیرتی کے دھبہ سے پاک صاف ہو اور کف مطلقاً رکنے کو کہتے ہیں۔ یعنی ان کے سوال سے باز رہنے اور اپنے فقر کو چھپانے کی وجہ سے ناواقف آدمی انہیں غنی و مالدار سمجھتا ہے مگر۔ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمٰهُمْ یہ خطاب یا تو نبی علیہ السلام کو ہے یا عام مسلمانوں کو۔ تَعْرِفُ عرفان یا معرفت سے بنا۔ اصطلاح میں کلی علم کو علم اور جزء جزئیات کے پہچاننے کو معرفت کہا جاتا ہے۔ سِيمَا سمتٌ سے بنا جس کی اصل وسم ہے بمعنی علامت وبلندی' واؤ ف کلمہ سے ہٹا کر سین کے بعد لایا گیا۔ یہاں اس سے ان کے خشوع وخضوع کے ساتھ آثار یا بھوک کے اثرات مراد ہیں جو ان کے چہروں پر نمودار ہیں۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یہ لوگ کبھی کبھی دن کو لکڑیاں بھی بیچا کرتے تھے۔ روح المعانی نے فرمایا کہ اصحاب صفہ میں سے بعض بھوک کی وجہ سے نماز میں گر جاتے تھے۔ لوگ انہیں دیوانہ کہتے تھے حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ میں بھی اصحاب صفہ میں سے تھا۔ کبھی بھوک سے گر جاتا تو گزرنے والوں سے آیت پوچھتا تھا کہ شاید میری آواز سے کمزوری محسوس کر کے کچھ کھلا دیں۔ مگر اس وقت تقریباً سب کے گھر میں اللہ کا نام ہی تھا۔ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا۔ یہ جملہ تعفف کا بیان ہے۔ الحاف لحفٌ سے بنا بمعنی ڈھانک لینا۔ اسی لئے رضائی کو لحاف کہتے ہیں کہ وہ اوڑھنے والے کے سارے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے اصطلاح میں گڑگڑا کر مانگنے یا سوال میں اصرار کرنے کو الحاف یا الحاح کہتے ہیں کہ اس سے سامنے والے کا دل غیرت سے گویا ڈھک جاتا ہے۔ یہاں یا تو الحاف بمعنی اسم فاعل لَا يَسْئَلُوْنَ کی ضمیر کا حال ہے یعنی وہ لوگوں سے اصرار سے نہیں مانگتے۔ خیال رہے کہ یہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں کیونکہ وہ بالکل نہ مانگتے تھے۔ جیسا کہ تعفف میں بیان ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ الحاف بمعنی شدت فقر ہو۔ جو انسان کی عقل کو ڈھک لے اور يَسْئَلُوْنَ کا ظرف یعنی وہ سخت مشکل میں بھی لوگوں سے نہیں مانگتے۔ مگر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ يَسْئَلُوْنَ کا مفعول لہٗ ہے۔ اس کی تائید تفسیر کبیر سے ہوتی ہے یعنی وہ کسی سے مانگتے ہی نہیں۔ تاکہ انہیں گڑگڑانا پڑے کیونکہ سوال کا انجام زاری ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ نفی کا مفعول مطلق ہے کہ وہ تعفف اور ترک سوال میں نہایت ہی مضبوط ہیں یعنی يَنْتَفُوْنَ السُّوَالَ اِلْحَاحًا (روح المعانی) وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ۔ اس میں مسلمانوں کو خیرات کی رغبت دی گئی ہے خیر کے معنی پہلے بیان ہو چکے یعنی جو کچھ تم کار خیر میں خرچ کرو گے رب اسے جانتا ہے بقدر اخلاص ثواب دے گا۔ مَا کے عموم سے معلوم ہوا کہ ہر چھوٹا بڑا صدقہ رب کی بارگاہ میں مقبول ہے۔ بشرط اخلاص

خلاصه تفسیر

صدقہ اصل حق ان فقیروں کا ہے جو راہ الٰہی میں مقید ہو گئے ہوں اور دین کی خدمت میں ایسے مشغول ہوں کہ اس کی وجہ سے طلب معاش کے لئے زمین میں نقل وحرکت کی عادۃً طاقت نہ رکھتے ہوں۔ ان کے طلب معاش میں مشغول ہونے سے دینی کام بند ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی سوال سے بالکل دور ہوں۔ جس سے ناواقف آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے۔ لیکن تم ان کی طرز پریشان ہیئت اور قدرتی علامات سے پہچان سکتے ہو کہ یہ فقیر ہیں۔ ان کے چہروں پر فاقہ کے آثار آواز کی کمزوری رفتار میں ضعف ان کے فقروفاقہ کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ سخت شدت میں بھی لوگوں سے کچھ نہیں مانگتے تا کہ انہیں گڑگڑانا پڑے اور تم ان لوگوں کی خدمت میں جو کچھ تھوڑا بہت مال خرچ کرو گے۔ حق تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے۔ تمہیں بقدر اخلاص ثواب دے گا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پهلا فائده:** زندگی ہر شخص کی گزرتی ہی ہے مگر بہترین زندگی وہ ہے جو رب کے لئے وقف ہو جائے کہ وہ شخص جو کام کرے نفس کے لئے نہیں' بلکہ اللہ کے لئے کرے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے صدقات کا حکم خصوصی دیا جو اپنی زندگی اللہ کے لئے وقف کر چکے جنہیں اُحْصِرُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فرمایا گیا۔ دیکھو اگر زمین اللہ کے لئے وقف مسجد بن جائے تو اس کی عظمت بڑھ جاتی ہے۔ اصحاب کہف کے کتے نے اپنی زندگی اللہ کے پیاروں کی خدمت کے لئے وقف کی تو اسے حیات جاودانی ملی۔ تو زمین اور ناپاک کتا اس وقف زندگی کی وجہ سے شان والے ہو گئے تو اگر انسان اپنی زندگی وقف کرے تو انشاء اللہ فرشتوں سے افضل ہو جائے۔ دیکھو حضرات صدیق و فاروق کی شان۔ **دوسرا فائده:** خاص ضرورت کے وقت گنہگار بلکہ کفار کے ساتھ بھی احسان کرنا بہتر ہے مگر فی نفسہ متقی پرہیزگار کی خدمت کرنا بہت ثواب کہ عمدہ زمین کا تخم زیادہ پھل دیتا ہے۔ **تیسرا فائده:** بمقابلہ عام فقراء کے غریب علماء دینی طلباء مدرسین کو خیرات دینا افضل ہے۔ جنہوں نے اپنے کو دینی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اگر ان کی خدمت نہ کی گئی اور یہ طلب معاش کے لئے مجبور ہو گئے تو دین کا سخت نقصان ہوگا۔ یہ سب لوگ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ میں داخل ہیں ایک شخص بیک وقت دو کام نہیں کر سکتا۔ **چوتھا فائده:** بمقابلہ پیشہ ور بھکاریوں کے چھپے فقیروں کو صدقہ دینا زیادہ اچھا ہے۔ جیسا کہ تَعَفُّف سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائده:** مخلوق سے اپنی تنگ دستی اور فقروفاقہ چھپانا بہت اچھا عمل ہے۔ دیکھو رب نے اصحاب صفہ کے لئے اسی عمل کی تعریف فرمائی۔ **چھٹا فائده:** قیمتی لباس والے فقیر کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ دیکھو رب نے ان کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا جو بظاہر غنی معلوم ہوتے ہیں۔ (احکام القرآن) **ساتواں فائده:** تندرست فقیر کو بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ دیکھو رب نے ان مہاجرین کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا جو تندرست مجاہد تھے۔ اپاہج یا نابینا نہ تھے۔ **آٹھواں فائده:** جس پر فقیر کی علامت دیکھے اسے زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ جیسا کہ سِیْمٰهُمْ' سے معلوم ہوا۔ **نواں فائده:** علامات پر احکام شرعی جاری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا میت کی زنار چوٹی وغیرہ اس کے کفر کی علامت ہے۔ اسے غسل وکفن نہ دیا جائے اور نہ اسلامی قبرستان میں دفن کیا جائے اور ختنہ علامت ایمان کی ہے۔ اگر کوئی علامت بھی نہ ہو تو مسلمان کے محلے

یا اسلامی ممالک میں ہونا' علامت ایمان اور دار الکفر میں ہونا علامت کفر ہے۔ یہ ہی حکم پڑے ہوئے بچہ کا ہے۔ دیکھو رب نے ظاہر علامت کو دلیل فقر قرار دے کر انہیں زکوٰۃ دینے کا حکم دیا۔ شیر خوار بچہ نے عزیز مصر سے کہا تھا۔ وَاِنْ کَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَکَذَبَتْ وَ هُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (یوسف:۲۷) یوسف علیہ السلام کی چاک دامنی ان کی پاکدامنی کی دلیل ہوئی۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ۔ (الفتح:۲۹) سجدہ کا داغ قلبی ایمان کی نشانی (احکام القرآن) **دسواں فائدہ:** سوال میں اصرار و ضد کرنا منع ہے جیسا کہ الحافا سے معلوم ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** استعمالی کپڑے اور گھر کا ضروری سامان زکوٰۃ لینے سے محروم نہیں کر دیتا۔ خواہ کتنا ہی قیمتی ہو (احکام القرآن)

مسئلہ: فقر کے تین درجے ہیں۔ (۱) قدر نصاب سے کم مال کا مالک ہونا۔ اس درجہ میں زکوٰۃ لینا جائز' مگر سوال حرام۔ (۲) چند فاقے یا مقروض ہونا' اس صورت میں سوال بھی جائز ہے۔ (۳) بھوک سے قریب المرگ ہو جانا اور کوئی حلال غذا میسر نہ ہونا' اس صورت میں مردار کھانا بھی جائز' حدیث شریف میں ہے کہ تین شخصوں کے سوا کسی کو سوال جائز نہیں۔ مقروض جب ادائے قرض کی کوئی صورت نہ دیکھے' ہلاکت مال اور فاقہ (مسلم) دوسری روایت میں ہے کہ جو کوئی اپنے پر سوال کا دروازہ کھولے گا۔ رب اس پر فقر کا دروازہ کھول دے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ جو بلا ضرورت لوگوں سے سوال کرے گا۔ روز قیامت اس کے چہرے پر کھرونچے وغیرہ ذلت کے آثار ہوں گے۔ (ابو داؤد) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو مسلمان بھیک نہ مانگنے کا عہد کرلے میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ) فرماتے ہیں نبی ﷺ جو کوئی مال بڑھانے کے لئے بھیک مانگے' وہ آگ کے انگارے جمع کرتا ہے۔ (ابن ماجہ) بعض صحابہ کرام کا طریقہ یہ تھا کہ اگر گھوڑے سے کوڑا گر جاتا تو بھی کسی سے نہ مانگتے' بلکہ خود اتر کر لیتے۔ **مسئلہ:** ذلت کا سوال منع ہے۔ عام معمولی استعمالی چیزوں کا سوال جائز' جیسے ضرورتاً آگ پانی یا سوئی دھاگہ' یا تھوڑے نمک کا سوال۔ کیونکہ یہ چیزیں سید المحبوبین ﷺ نے بھی طلب فرمائی ہیں۔ **مسئلہ:** دوسرے کے لئے سوال جائز ہے۔ حضور ﷺ نے اغنیاء صحابہ سے فقراء کے لئے مال طلب فرمایا ہے۔ **مسئلہ:** مسجد میں اپنے لئے سوال سخت منع' ہاں دیگر فقراء یا دینی ضرورت کے لئے چندہ کرنا جائز ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مقید کی نفی قید کی نفی ہے۔ لہٰذا اس آیت کے یہ معنی ہونے چاہئیں کہ وہ فقراء لوگوں سے مانگتے تو ہیں گڑگڑاتے نہیں۔ **جواب:** یہ قاعدہ کلیہ نہیں۔ اکثر تو یہ ہے مگر قید اتفاقی اور قرائن کی موجودگی اس سے خارج ہے یہاں تعفف سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ بالکل سوال نہیں کرتے رب فرماتا ہے۔ لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دگنا' تگنا سود نہ کھاؤ' سوایا' ڈیوڑھا کھالو بلکہ بالکل نہ کھاؤ۔ رب فرماتا ہے۔ وَلَا تُکْرِهُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (النور:۳۳) اگر تمہاری لونڈیاں زنا سے بچنا چاہیں تو انہیں اس پر مجبور نہ کرو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر وہ چاہیں تو زنا کرلیں بلکہ ہرگز نہ کرنے دو۔ نیز ہم نے تفسیر میں عرض کر دیا کہ اِلْحَافًا نفی کا ظرف بھی ہوسکتا ہے اور منفی کا مفعول لہٗ بھی یعنی وہ سخت مصیبت میں بھی سوال نہیں کرتے' اگر حال بھی ہو تو بھی قرینہ کی وجہ سے مقید ہی کی نفی ہوگی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الحافا سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ایسی چیزوں کا سوال کسی سے نہیں کرتے۔ جس کا مانگنا ذلت و

خواری ہو۔ جس میں گڑگڑانا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس سے ان چیزوں کا سوال نکل گیا جو ذلت و رسوائی کا باعث ہی خود حضور انور ﷺ نے پانی وغیرہ لوگوں سے مانگا ہے۔ عموماً لوگ آس پڑوس سے ایک دوسرے سے سوئی دھاگہ نمک مرچ آگ پانی مانگتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی ہتک نہیں سمجھتا اس لئے مرقاتا ارشاد ہوا یا یہ مطلب ہے کہ اپنے لئے نہیں مانگتے تاکہ انہیں زاری عاجزی گڑگڑاہٹ کرنا پڑے۔ دوسرں کیلئے اگر مانگی تو پریشانی الحاف ہے۔ غرضکہ الحاف کی تفسیر بہت مفید ہے اور اس سے بہت مسائل کا استنباط ہوسکتا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں اجتماع نقیضین معلوم ہوتا ہے۔ اولاً فرمایا گیا کہ انہیں ناواقف غنی سمجھتا ہے۔ بعد میں ارشاد ہوا کہ تم انہیں نشانی سے پہچان لوگے۔ اگر ان میں علامت فقر موجود تھی تو غنی سمجھنے کے کیا معنی؟ اگر نہ تھی تو سِیْمَاهُمْ سے کیا مراد؟ **جواب:** یہاں مصنوعی علامت کا انکار ہے اور قدرتی نشانی کا ثبوت یعنی وہ اپنے فقر کو چھپاتے ہیں اپنے پر اس کی علامتیں ظاہر نہیں ہونے دیتے مگر قدرتی نشانیاں چہرکی زردی آنکھوں میں آنسو کا ڈگڈگانا۔ رفتار میں ضعف ان کی قلبی حالت کا پتہ دے دیتی ہے۔ ثبوت اور چیز کا ہے انکار دوسری چیز کا۔ **تیسرا اعتراض:** لِلْفُقَرَا کے لام سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات صرف انہیں مساکین کو دیئے جائیں جو دینی کاموں میں مشغول ہوں تو چاہیے کہ دوسرے لوگ خیرات کے مستحق نہ ہوں۔ لام تخصیص کیلئے آتا ہے حالانکہ دوسری آیت سے پتہ چلتا ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہیں اور پچھلی آیت میں بھی کفار فقیروں کو خیرات دینے کا اشارہ کیا گیا۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** یہ حصر اضافی یا استحبابی ہے یعنی ایسے فقراء کو ہی خیرات دینا زیادہ ثواب ہے یا اغنیاء کے مقابلہ میں حصر ہے۔ یعنی مالداروں کو نہ دو۔ ایسے فقیروں کو دو نیز وہ آٹھ مصارف فقراء کی ہی قسمیں ہیں کہ مسافر سفر کی وجہ سے اور یتیم یتیمی کے باعث اور مقروض قرضہ کے سبب سے فقیر ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فقراء نقل و حرکت پر قدرت ہی نہیں رکھتے۔ حالانکہ ان میں قوت موجود ہے۔ پھر نہ سکنے کے کیا معنی؟ **جواب:** یہاں عرفی مجبوری مراد ہے نہ کہ منطقی یعنی دینی مشغولی کے باعث وہ سفر وغیرہ سے مجبور ہیں کہ ان کا طلب معاش کے لئے نکلنا دینی نقصان کا سبب ہے۔ **پانچواں اعتراض:** علماء طلباء و مشائخ عظام کو چاہیے کہ امام ابوحنیفہ اور حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرح خود کمائیں اور مفت دینی خدمت کریں۔ نذر نذرانہ صدقہ خیرات کو ذریعہ معاش نہ بنائیں۔ دین سے دنیا نہ کمائیں۔ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب۔ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (بقرہ:۴۱) کی تفسیر میں گزر چکا۔ اس آیت میں ان لوگوں کو رب نے معذور فرمایا کہ یہ حضرات کسب معاش کر سکتے ہی نہیں۔ حضور غوث پاک و امام اعظم وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سوا اور کتنے علماء و مشائخ ایسے گزرے جنہوں نے کسب معاش بھی کیا ہو اور تبلیغ دین بھی کوئی نہیں۔ امام ابو یوسف نے ہارون رشید بادشاہ سے قضا کی تنخواہ لی۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں سے نذرانے قبول فرمائے۔ سوا حضرت عثمان غنی کے تمام خلفائے راشدین نے خلافت پر تنخواہ لی۔ افسوس ہے کہ دنیوی بادشاہوں کے معمولی نوکر شاہی خزانہ سے تنخواہیں لیں۔ مگر شہنشاہ کونین ﷺ کے خدام علماء جو دین کو سنبھالے بیٹھے ہیں وہ ایک پائی کے مستحق نہ ہوں اسلامی بادشاہوں نے علماء کی بڑی خدمتیں کیں۔ علامہ نیشاپوری جو مدرسہ نظامیہ بغداد کے مدرس اول تھے۔ نظام الملک نے ان کی تنخواہ ایک لاکھ درہم ماہوار مقرر کی تھی۔ اس مدرسہ کے طالب علم حضور غوث پاک امام غزالی شیخ سعدی شیرازی ہیں۔ دیکھو مناقب غوث

اعظم اس مدرسہ کا نام مدرسہ نظامیہ اور اس کے مقرر کردہ درس کا نام درس نظامی ہے جو آج تک پڑھایا جاتا ہے۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ نے جن علماء سے فتاویٰ عالمگیری لکھوایا انہیں دو لاکھ روپے اور دو سو قرش سونا نذرانہ میں دیا۔ رب تعالیٰ تو فرماتا ہے ایسے لوگوں کو دو۔ اور مسلمان کہتے ہیں کہ مت دو۔ کس کی مانیں' رب کی یا ان کی۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ لوگوں سے کچھ نہ مانگنا چاہیے۔ اللہ اور صرف اللہ سے مانگے تو چاہیے کہ نبیوں ولیوں سے کچھ نہ مانگے۔ تم لوگ بزرگوں کی قبروں تک سے مانگتے ہو اس آیت کی مخالفت کرتے ہو؟ **جواب:** اَلنَّاسُ سے دنیا دار مراد ہوئے ہیں۔ حضرات محبوبین بارگاہ الٰہی عموم اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں لوگوں سے بھیک مانگنا ذلت وخواری ہے۔ حضور انور ﷺ سے رب کی تمام نعمتیں مانگنا ہر مومن سلاطین کے لئے فخر ہے۔ دیکھو لوگوں کو راضی کرنے کے لئے انہیں دکھلاوے کے لئے اعمال کرتا رہا ہے۔ مگر حضور انور اور رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے نیکیاں کرنا بہت ہی محبوب' رب فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ۔ (التوبہ: ۶۲) غرضکہ لوگوں سے بھیک مانگنا اور ہے اور اللہ کے پیاروں سے شفاعت وغیرہ مانگنا کچھ اور۔

تفسیر صوفیانہ

مشائخ کی خانقاہیں اور ان کی مساجد وعبادت گاہیں ومصلیٰ سب سبیل اللہ ہیں اور ان حضرات کا اللہ سے مشغول رہنا' حالات میں مستغرق ہونا۔ اپنے اوقات کو عبادت میں گھیر دینا ان کا مشغلہ۔ اس پر ان لوگوں سے بے پرواہ رہنا' کسی سے سوال نہ کرنا یہ تعفف پھر ان کے چہروں کا نور پیشانیوں پر سجدوں کے داغ اور عرفان کی چمک' ان کی علامت وپہچان۔ فرمایا جا رہا ہے کہ جو سبیل اللہ یعنی مساجد اور خانقاہوں میں گھرے ہوئے ہیں اور عبادات اور اشتغال باللہ کی وجہ سے کسب وتجارت نہیں کر سکتے۔ عام مسلمان ان کا استغناء دیکھ کر انہیں غنی سمجھتے ہیں مگر ان کے چہرے کا نور اور آثار فقر ان کے قلب کا پتہ دیتے ہیں۔ انہیں یا تو خدا ہی پہچانتا ہے یا ان کے گروہ کا آدمی' لوگوں سے بالکل نہیں سوال کرتے۔ ہر حاجت رب پر پیش کرتے ہیں۔ اے مسلمانو! تم حلال کمائیوں میں ان کا حصہ رکھو تاکہ تمہارے مال میں برکت رہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ مال اللہ کا مال ہے اور فقراء اللہ کے عیال۔ جو اس کا مال اس کے عیال پر خرچ نہ کرے گا اس پر وبال آئے گا۔ اور رب کو اس کی پرواہ بھی نہ ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ ان فقراء نے رب سے مانگا اور رب نے ہم سے فرمایا کہ جاؤ انہیں دے آؤ۔ تو گویا جو ان مقبولین پر خیرات کرے وہ رب کا وکیل ہے (از ابن عربی) صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ سبیل اللہ دو ہیں۔ ایک تو کھلا ہوا واضح وصاف راستہ جسے شریعت کہتے ہیں۔ دوسرا چھپا ہوا پیچ دار راستہ' یعنی گلی در گلی' جسے طریقت کہا جاتا ہے۔ علماء نے تو اپنے کو شریعت کیلئے وقف کیا ہے کہ عام لوگوں کو اس پر چلائیں۔ صوفیاء نے اپنے کو طریقت کے لئے وقف کیا کہ خواص کو ان گلی کوچوں سے واقف کریں۔ دونوں جماعتیں مدد فی سبیل اللہ میں شامل ہیں۔ سبیل مطلق ہے اور شریعت وطریقت اس کی دو قسمیں ہیں۔ دونوں جماعتیں دینی خدمات کے باعث سفر وکمائی کے قابل نہ رہیں جو مال ان کی خدمات میں خرچ ہو وہ اچھے راہ میں گیا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ

وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں مال اپنے رات اور دن میں چھپا کر اور ظاہر پس واسطے ان کے اجر ہے ان کا نزدیک
وہ لوگ جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات میں اور دن میں چھپے اور ظاہر ان کے لئے ان کا نیگ ہوتا ہے ان کے
رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾
رب ان کے اور نہیں ہے ڈر اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین ہوں گے
رب کے پاس ان کو نہ کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں خیرات کا بہترین مصرف بیان کیا گیا تھا۔ اب اس کے بہترین اوقات و حالات کا ذکر ہے۔ (کبیر) پچھلی آیت میں اجمالاً فرمایا گیا تھا کہ تم جو خرچ کرو گے۔ اللہ اسے جانتا ہے اب اس اجمال (جو) کی کچھ تفصیل ارشاد ہو رہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں صدقہ لینے والے فقیر کی صفت بیان ہوئی کہ راہ الٰہی میں پابند ہوئے۔ دنیوی کاروبار نہ کر سکے۔ بھیک نہ مانگتا ہو وغیرہ۔ اب صدقہ دینے والے سخی کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں کہ جو ہر وقت اور ہر حال میں خیرات کرتا رہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلے رکوع میں خیرات کی بہت سی اقسام بیان ہوئیں۔ اس رکوع میں سود کا ذکر ہے۔ مسئلہ سود شروع فرمانے سے پیشتر صدقات کے متعلق ایک ایسا اجمالی قانون ارشاد فرمایا جو ساری قسموں کو شامل ہے۔ گویا یہ آیت صدقہ کے مضمون کا تتمہ ہے۔

شان نزول

اس کے نزول کے بارے میں چند روایتیں ہیں۔ (۱) جب لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا الخ (بقرہ: ۲۷۳) نازل ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے اصحاب صفہ کے پاس دن کے وقت بہت دینار بھیجے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رات میں ایک وسق (ساٹھ صاع) (ہر صاع تقریباً چار سیر کل تقریباً چھ من) کھجوریں ان کے پاس بھیجیں تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں ان دونوں صاحبوں کو قبولیت کا پروانہ عطا ہوا (خازن و کبیر) گویا اس کا پہلا جز سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں اور دوسرا جز حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے حق میں ہے۔ (۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چالیس ہزار دینار (ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ) خیرات کیا۔ دس ہزار دینار رات میں، دس ہزار دن میں، دس ہزار پوشیدہ، دس ہزار علانیہ تب یہ آیت کریمہ اُتری۔ جس میں انہیں تمام صدقات کی قبولیت کی سند دی گئی (خزائن و بیضاوی و مدارک) (۳) ایک بار حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس صرف چار درم تھے۔ انہوں نے چاروں خیرات کر دیئے۔ ایک رات میں ایک دن میں ایک خفیہ ایک ظاہر۔ حضور ﷺ نے پوچھا کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ عرض کیا کہ وعدہ الٰہی کا اپنے آپ کو حقدار بنانے کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا لَکَ ذٰلِکَ اس کی تائید میں یہ آیت آئی (کبیر و ابن عباس و بیضاوی) (۴) بعض صحابہ کرام نے جہاد کی نیت سے گھوڑے پالے تھے جن کی دن رات خدمت کرتے تھے۔ ان کے متعلق یہ آیت کریمہ آئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر موٹے گھوڑے [illegible] کوئی تعارض نہیں۔ ممکن ہے

کہ یہ سارے واقعات متصل ہوئے ہوں۔ جن پر یہ آیت اُتری ہو (۵) یہ ساری آیت حضرت عثمان غنی کے بارہ میں آئی۔ جنہوں نے لشکر عسرت کو سامان دیا۔ (روح المعانی)

تفسیر

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ۔ اگر یہ آیت ایک یا دو صحابی کے بارے میں آئی ہو۔ تب تو اَلَّذِیْنَ سے اس قسم کے خیرات کرنے والوں کی جماعت مراد ہے کیونکہ عموم الفاظ کا لحاظ ہوتا ہے نہ کہ خصوص نزول کا۔ اور اگر مجاہدین کے بارے میں آئی تو اَلَّذِیْنَ کا جمع ہونا بالکل ظاہر ہے یُنْفِقُوْنَ سے انفاق فی سبیل اللہ یعنی صدقات وخیرات مراد ہیں نہ کہ ہر خرچ۔ اموال سے ادنیٰ اعلیٰ تھوڑا بہت بلکہ ہر نوعیت کا مال مراد ہے۔ یعنی جو مسلمان راہ الٰہی میں اپنے کسی قسم کے مال خرچ کرتے ہیں۔ بہر حال الذین ہی روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ خواہ صحابہ کرام ہوں یا تا قیامت سارے مسلمان۔ کفار اس سے خارج ہیں کیونکہ کفار کا صدقہ خیرات بلکہ تمام عبادات برباد ہیں۔ عبادات کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے۔ بغیر وضو نماز برباد بغیر ایمان اعمال برباد یُنْفِقُوْنَ کے معنی ہی خرچ کرتے رہنا ہے یعنی ایک بار کے خرچ پر قناعت نہیں کرتے بلکہ یہ خرچ ان کی عادت ہو چکی ہے خرچ سے مراد یا تو نفلی صدقات ہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ وہ لوگ صرف فرض واجب صدقات پر قناعت نہیں کرتے بلکہ نفلی صدقات بھی دیتے رہتے ہیں یا فرض صدقے مراد ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ شروع سال سے زکوٰۃ دینا شروع کر دیتے ہیں اور سال گزرنے پر حساب لگا لیتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ حساب سے بڑھ گئی تو اگلے سال میں وضع کر لیتے ہیں اگر کم رہی تو اور نکال دیتے ہیں۔ اگر برابر رہی تو خیر اسی صورت میں یہ کلمہ اوقات کی دلیل ہے کہ زکوٰۃ سال سے پہلے بھی دینا جائز ہے اموال اس لئے فرمایا کہ ہر مال کی زکوٰۃ علیحدہ ہے چنانچہ وہ ہر مال میں سے زکوٰۃ نکالتے رہتے ہیں۔ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ ان لفظوں کی تحقیق پہلے پارہ میں ہو چکی۔ اس سے یا تو رات ودن مراد ہیں جیسا کہ اگلے شان نزول سے معلوم ہوا۔ یا سارے اوقات یعنی رات ودن میں یا بلا تخصیص ہر وقت سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً اس سے یا تو خفیہ اور پوشیدہ حالات مراد ہیں۔ یا عام احوال یعنی خیرات کرتے ہیں ہر حال میں۔ ان خیراتوں کا خفیہ یا علانیہ ہونا لوگوں کے اعتبار سے ہے نہ کہ اللہ رسول کے لحاظ سے یعنی وہ لوگ بعض صدقے تو چھپا کر دیتے ہیں۔ بعض ظاہر کر کے۔ دونوں طریقے محمود ہیں۔ اخفاء ہیں۔ اخلاص زیادہ ہے اور اعلان میں دوسرں کو صدقہ کی ترغیب ہے۔ فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ ۔ لَھُمْ کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ ہوا کہ اجر کا سبب صدقات ہیں۔ عِنْدَ رَبِّھِمْ۔ یہ یا تو اجر کا ظرف ہے یا ثابت پوشیدہ کا اور وہ اجر کی صفت یعنی ان کا ثواب قیامت میں ملے گا نہ کہ صرف دنیا میں۔ خیال رہے کہ عند سے مراد قرب شرف ہے نہ کہ قرب مکانی' کیونکہ رب تعالیٰ جگہ سے پاک ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ آئندہ پر وحشت کو خوف اور گذشتہ پر غم کو حزن کہتے ہیں اور یہ جملہ یا قیامت کے متعلق ہے یا نزع کے یا دنیوی زندگی کے' چونکہ خوف ہر وقت رہ سکتا ہے اور حزن اکثر عارضی ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں کا خوف اور یہاں یَحْزَنُوْنَ مضارع ارشاد ہوا۔

خلاصہ تفسیر

جو مسلمان اپنے ہر قسم کے مال ہر وقت (دن اور رات) ہر حال میں (خفیہ وعلانیہ) راہ الٰہی میں خرچ کرتے ہیں ان کا اجر انہی کو ملے گا نہ کہ ان کے غیر او[illegible] نہیں [illegible] ظ ہوگا۔ اجر کے علاوہ انہیں یہ کمال بھی

حاصل ہوگا کہ نہ دنیا میں انہیں مال برباد ہونے کا خوف ہو اور نہ وہ خیرات پر غمگین ہوں یا نہ مرتے وقت انہیں اپنے مال وعیال چھوٹنے کا غم ہو اور نہ آئندہ مال کی بربادی کا خطرہ کیونکہ ان کے قلب میں مال کی محبت ہوگی ہی نہیں۔ اور رب تعالیٰ ان کے مال کا خود متولی ہوگا یا آخرت میں نہ ان پر دوزخ وعذاب وغیرہ کا خوف وخطر ہو اور نہ گذشتہ عمر کی بربادی کا غم کیونکہ ان کا صدقہ انہیں عذاب سے بچائے گا اور اجر تک پہنچائے گا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** نیکی میں معمولی اور بڑی کا لحاظ نہ کرے۔ صدقات میں تھوڑے اور زیادہ مال کی پرواہ نہ کرے جو ہو سکے کر گزرے۔ رب کے ہاں اخلاص دیکھا جاتا ہے نہ کہ محض زیادتی مال۔ جیسا کہ اَمْوَالَهُمْ سے معلوم ہوا۔ معمولی نیکی' اس تھوڑے پانی کی طرح ہے جو کبھی پیاسے کی جان بچالیتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** نیکی میں دیر نہ کرے۔ جب ممکن ہو کر گزرے جیسا کہ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سے معلوم ہوا۔ دیر لگانے میں محرومی کا اندیشہ ہے بعض لوگ صدقات کے لئے جمعہ' رمضان کا انتظار کرتے ہیں یہ غلطی ہے زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ **تیسرا فائدہ:** نیکی ہمیشہ اور پابندی سے کرنی چاہیے۔ اگرچہ تھوڑی ہو۔ حدیث شریف میں ہے۔ خَيْرُ الْاُمُوْرِ مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهَا وَاِنْ قَلَّ۔ دوسری روایت میں ہے۔ اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ اَدْوَمُهَا وَاِنْ قَلَّ (بخاری رحمۃ اللہ علیہ و مسلم رحمۃ اللہ علیہ) یعنی دائمی عمل اچھا۔ اگرچہ تھوڑا ہو۔ یہ بھی باللیل والنہار سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** ہر حال میں نیکی کرے' غصہ میں' خوشی میں' رنج میں' راحت میں' تکلیف میں' آرام میں' خلوت اور جلوت میں۔ جیسا کہ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** خفیہ خیرات علانیہ سے افضل۔ اسی لئے لیل کو نہار پر اور سر کو علانیہ پر مقدم کیا۔ **چھٹا فائدہ:** نیکی کا ثواب کرنے والے کو ضرور ملتا ہے۔ جیسا کہ وَلَهُمْ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** صدقات کا ثواب قیامت میں ضرور ملے گا' سخی کے مال کی برکت' اس کا عیش و آرام اور بلاؤں سے محفوظ رہنا۔ یہ صدقہ کا اجر نہیں ہوگیا۔ جس سے آخرت میں کچھ کمی ہو جائے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے سرکاری نوکر کے لئے بھتہ۔ جیسا کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** سخی مسلمان انشاء اللہ قیامت میں زمرۂ اولیاء اللہ میں ہوں گے کیونکہ اولیاء اللہ کے لئے بھی۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ فرمایا گیا ہے اور یہاں سخی کے لئے بھی۔ **نواں فائدہ:** صدقہ و خیرات خوف و غم دور کرتے ہیں کہ سخی دنیا میں بھی بربادی و مال کے خوف و غم سے اور مرتے وقت بھی اور آخرت میں بھی ہر قسم کے خوف و غم سے دور رہے گا۔ بخیل مرتے وقت اپنے مال پر حسرت کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ سخی یہ سمجھ کر کہ میرا مال میرے ساتھ جا رہا ہے باآرام سفر کرتا ہے۔ یہ سب لاخوف الخ سے معلوم ہوا۔ **دسواں فائدہ:** لالچی آدمی زیادہ مصیبت زدہ ہے اگرچہ کتنا ہی مالدار ہو۔ سخی آدمی آرام میں ہے اگرچہ کتنا ہی غریب ہو۔ حضرت عمر جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ بعض طمع فقیری ہے اور بعض ناامیدی غنا تم اتنا مال جمع کرتے ہو جتنا کھا نہیں سکتے اور وہ امیدیں باندھتے ہو جو پا نہیں سکتے۔ یاد رکھو کہ بخل نفاق کا ایک حصہ ہے پس سخاوت اختیار کرو۔ اور یہی آیت تلاوت فرمائی (روح المعانی)

اعتراضات

پہلا اعتراض: لَهُمْ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا کہ خیرات کا ثواب صرف خیرات کرنے والے کو ملے گا نہ کہ دوسرے کو' جس سے لازم آیا کہ ایصال ثواب باطل ہے کیونکہ اس میں خیرات تو کوئی کرتا ہے اور ثواب کسی دوسرے کو بخشا جاتا ہے؟ **جواب:** آیت سے معلوم ہوا کہ ثواب کا مستحق صرف خیرات کرنے والا ہے۔ لَهُمْ کا لام ملکیت کا ہے۔ اب اگر خود مستحق اپنی خوشی سے دوسرے کو اپنا ثواب دے دے تو دے سکتا ہے۔ آیت میں استحقاق کا حصر ہے اور ایصال ثواب میں اپنا حق دوسرے کو دیا جاتا ہے۔ میرا مال میری ملکیت کا ہے مگر میں جسے چاہوں دے دوں۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ سورۂ بقرہ کے آخر میں لَهَا مَا كَسَبَتْ کی تفسیر میں آئے گی۔ خیال رہے کہ عبادت کا ادا ہونا کچھ اور ہے اور عبادت کا ثواب مل جانا کچھ اور ہے بدنی عبادت کوئی دوسرے کی طرف سے نہیں کر سکتا' خود کرنی پڑے گی۔ اس کے لئے وہ آیات ہیں لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم:۳۹) اور لَهَا مَا كَسَبَتْ۔ (بقرہ:۲۸۶) وغیرہ اس لئے وہاں کسب اور سعی کا ذکر ہے اور کسی کو دوسرے کے عمل کا ثواب مل جائے گا دوسری آیات ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ اولاد کی نیکی میں ماں باپ کا بھی حصہ ہوتا ہے عالم کے باپ کو بروزِ قیامت تاج پہنایا جائے گا تو سخی کے باپ کو اولاد کی سخاوت سے ضرور حصہ ملنا چاہیے مگر اس آیت سے استحقاق کا حصر معلوم ہوا۔ اب اس آیت و حدیث میں مطابقت کیونکر معلوم ہو؟ **جواب:** ماں باپ وغیرہم کا اولاد کی اصل نیکی میں حصہ نہیں۔ وہ تو اس کی اپنی ہے۔ ہاں انہیں اچھی تربیت کا یہ ثواب ملتا ہے کہ اولاد کی ہر نیکی کا ثواب ان کے ماں باپ کو بھی مل جاتا ہے اور اولاد کے ثواب میں کچھ کمی نہیں ہوتی یعنی عمل کا ثواب عامل کو اور ذریعہ عمل کا ثواب ذریعہ کو ملتا ہے۔ روایات سے ثابت ہے کہ صدقہ دینے والا' دلوانے والا' صدقہ کا خزانچی سب ہی ثواب میں شریک ہیں اس کا یہ ہی مطلب ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ثواب کے مستحق وہ لوگ ہیں جو رات و دن اور خفیہ و علانیہ ہر طرح خیرات کریں' تو چاہیے کہ صرف رات یا صرف دن میں خیرات کرنے والا یا صرف علانیہ یا صرف خفیہ خیرات کرنے والا یہ ثواب نہ پائے؟ **جواب:** یہ حکم کل مجموعی کا نہیں' بلکہ کل افرادی کا ہے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک ثواب کا مستحق ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے جو جماعت آئے گی اسے انعام ملے گا۔ یعنی ہر آنے والے کو۔ یعنی صدقہ اختلاف حالات یا اوقات سے نہیں بدلتا' بلکہ نیت و ارادے سے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کا ثواب ہر قسم کے صدقہ والے کو ملے گا۔ ہر ایک طرح کا صدقہ کرنے والا ثواب بھی ہر ایک طرح کا پائے گا اور ان چاروں قسموں کا صدقہ کرنے والا ثواب بھی چاروں قسموں کا پائے گا۔ لَهُمْ اَجْرُهُمْ۔ سے اجر کامل مراد ہے۔ يُنْفِقُوْنَ میں نفقہ مطلق مراد ہے اور اَمْوَالَهُمْ میں مال مطلق لیل النہار میں وقت مطلق مراد۔ عَلَانِيَةً میں حال مطلق' تو لَهُمْ اَجْرُهُمْ میں اجر بھی مطلق ہی مراد ہوگا۔ ہر طرح کا مال ہر طرح کا خرچ کرو۔ ہر وقت خرچ کرو ہر حال میں خرچ کرو۔ رب سے ہر طرح کا اجر و ثواب لے لو۔

تفسیر صوفیانہ

عام سخی دن رات اور ہر حال میں مال خرچ کرتے ہیں جس کا ثواب پاتے ہیں اور خاص سخی اعمال کی جن کا ثواب ان سے الگ ہے اور خاص الخاص [illegible] صفات ہیں مگر اخص الخاص حضرات ہر حال میں

نفس کی سخاوت میں مشغول کہ کونین سے منہ موڑ کر اور دارین کی نعمتیں دوسروں کے لئے چھوڑ کر خود خالق کونین کی طرف متوجہ رہتے ہیں سوتے ہیں تو رب کے لئے جاگتے ہیں تو اس کے لئے کھاتے ہیں تو اس کے لئے' پیتے ہیں تو اس کے لئے' بولتے ہیں یا خاموش رہتے ہیں تو اسی کے لئے ان کا ہر کام رب کی رضا جوئی میں ہے۔ ان کا ثواب یہ ہے کہ۔ شعر ۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

حکایت: اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز کے ملفوظات میں ہے کہ ایک دن سخت بارش ہو رہی تھی۔ اندھیری رات تھی۔ حضرت سلطان الاولیاء محبوب الٰہی صاحب قدس سرہٗ بدایونی ثم الدھلوی نے اپنے کسی خاص خادم سے فرمایا کہ دہلی کے اس کنارے جمنا پار ایک قطب تشریف فرما ہیں۔ انہیں کھیر کھلا آؤ انہوں نے عرض کیا کہ جمنا جوش پر ہے کوئی کشتی وغیرہ بھی نہیں ہے۔ اسے کیونکر پار کروں گا فرمایا۔ جمنا سے کہہ دینا کہ میں اس کے پاس سے آیا ہوں جو کبھی اپنی بیوی کے پاس نہ گیا۔ مجھے راستہ دے۔ وہ نیک بخت شخص بہت متعجب ہوا سوچا کہ آپ صاحب اولاد ہیں۔ بیوی صاحبہ گھر میں ہیں' پھر یہ کیا فرما رہے ہیں۔ مگر باادب تھے کچھ نہ کہا اور چل دیئے' دریا سے یہ ہی کہا۔ اس میں خشک راستہ بن گیا۔ اس طرف جا کر ان بزرگ کو کھیر کھلائی' جب واپس ہونے لگا تو انہوں نے فرمایا کہ جمنا سے کہہ دینا کہ میں اس کے پاس سے آیا ہوں جس نے کبھی کچھ کھایا ہی نہیں۔ اس کا تعجب اور بڑھ گیا کہ میرے سامنے کھیر کھائی اور یہ فرما رہے ہیں۔ غرض دریا پر آ کر یہ ہی کہا۔ اس میں خشک راہ پیدا ہوا۔ حضرت سلطان الاولیاء کے پاس آ گیا۔ مگر تعجب تھا کہ دریا نے بھی ان کی خلاف واقعہ بات مان لی۔ ایک دن موقعہ پا کر حضرت محبوب الٰہی سے عرض کیا کہ اس دن کیا ماجرا تھا۔ فرمایا کہ ہم اپنے نفس کے لئے کچھ نہیں کرتے جو کرتے ہیں رب کے لئے اس کے لئے کھاتے ہیں۔ اسی کے لئے ازواج سے اختلاط کرتے ہیں۔ اس چوتھی قسم کی سخاوت کی یہ جزا ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ چھ چیزوں کی عمدگی چھ چیزوں سے ہے۔ علم کی خوبی عمل سے' سلطنت کی عدل سے غنا کی سخاوت سے' جوانی کی توبہ سے' فقر کی صبر سے' عورتوں کی حیا سے۔ علم بلا عمل ایسا ہے جیسے گھر بغیر چھت' بادشاہ بغیر عدل ایسا ہے جیسا کنواں بغیر پانی کے۔ غنا بغیر سخاوت ایسی ہے جیسے بادل بغیر بارش' جوانی بغیر توبہ ایسی جیسے درخت بغیر پھل' فقیری بغیر صبر ایسی ہے جیسے قندیل بے روشنی' عورت بے حیا ایسی جیسے کھانا بغیر نمک۔ غنی پر لازم ہے کہ غنا کے بادل سے دین و دنیا کی برکتیں برسائے' اور فقراء کے دل کو جو فقر کی خشکی سے سوکھ گئے ہیں تر و تازہ کرے تاکہ رب تعالیٰ اسے ہرا بھرا رکھے۔ جو شخص جمع کرے اور نہ کھائے' وہ درحقیقت اپنے غیر یعنی ورثاء کے لئے جمع کرتا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ سخی مال کو دنیا میں چور ڈاکو دشمن کا خوف نہیں کہ اس کا کوئی دشمن ہوتا ہی نہیں۔ سب اس کی زندگی چاہتے ہیں۔ اگر اتفاقاً اس کا مال ضائع ہو جائے تو اسے غم نہیں کہ اسے مال سے محبت ہوتی ہی نہیں۔ بیماری میں موت کا خوف اس بنا پر نہیں کہ ہائے میرا مال کہاں جائے گا کہ اسے مال سے الفت نہیں۔ نیز اسے موت پر مال چھوٹنے کا غم نہیں بلکہ آگے کی خوشی ہوتی ہے کہ دیدار یار رب کی رحمت نصیب ہوگی۔ مال کے ہوس والے کو موت پر ڈبل صدمہ ہوتا ہے۔ ایک جان نکلنے کا دوسرا مال چھوٹنے کا۔ حشر میں انشاء اللہ اسے اولیاء اللہ کے ساتھ حشر نصیب ہوگا۔ یہ تمام فضائل لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ میں بیان ہو گئے۔ صوفیاء یہ بھی فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے وطن کی چیز سے الفت ہوتی ہے۔ نفس دنیا کی شے ہے اسے یہاں کے مال سے الفت ہے۔ روح اس جہاں کی

چڑیا ہے۔ اسے اپنے وطن کی چیزوں عبادت' ریاضت ایمان واعمال سے محبت ہے۔ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ نفسانی شہوتوں کو بار
کم کیا جائے۔ روحانی الفتوں کو بڑھایا جائے اور نفسانی الفتوں کو حتی الامکان کم کیا جائے۔ اس لئے سخاوت کا حکم ہے تا کہ مال
سے محبت کم ہو۔ درود شریف وغیرہ کی کثرت کی ترغیب ہے تا کہ حضور ﷺ سے محبت زیادہ ہو۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ

وہ لوگ جو کھاتے ہیں سود نہیں کھڑے ہوں گے مگر اس طرح کہ کھڑا ہوتا ہے وہ کہ خبطی بنا دیا ہوا سے شیطان نے

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں قیامت کے دن نہ کھڑے ہوں گے مگر کھڑا ہوتا ہے وہ جسے آسیب نے چھو کر

مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ

چھوئے سے یہ اس وجہ سے کہ تحقیق انہوں نے کہا کہ اس کے سوا نہیں کہ تجارت مثل سود کے ہے حالانکہ حلال کیا اللہ نے تجارت کو

مخبوط بنا دیا ہو یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے اور اللہ نے حلال کیا ہے بیع کو

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ

اور حرام کیا سود کو پس وہ جو آئے اس کو نصیحت طرف سے رب اس کے پس باز رہے پس واسطے اس کے ہے وہ جو گذر گیا اور معاملہ

اور حرام کیا سود کو تو جسے اس کے رب کے پاس سے نصیحت آئی اور وہ باز رہا تو اسے حلال ہے جو پہلے لے چکا اور اس کا کام

اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اس کا طرف اللہ کے ہے اور جو لوٹے پس یہ لوگ آگ والے ہیں وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں

خدا کے سپرد ہے اور جو اب ایسی حرکت کرے گا تو وہ دوزخی ہے وہ اس میں مدتوں رہیں گے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں خرچ کا ذکر تھا۔ اب آمدنی کا بیان ہے
کیونکہ آمدنی اور خرچ کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ **دوسرا تعلق:** اب تک اس مال کا ذکر تھا جو مالداروں سے لے کر
غریبوں کو دیا جاتا ہے۔ یعنی صدقہ وخیرات' اب اس مال کا ذکر ہے جو غریبوں سے چھین کر اغنیاء کو دیا جائے یعنی سود گویا
متقابلین میں سے ایک کے بعد دوسرے کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ان قواعد کا ذکر تھا۔ جس پر دنیا کی
خوشحالی کا مدار ہے۔ یعنی فقراء کو مدد دے کر غنی بنانا۔ اب ان قواعد کا ذکر ہے جو دنیا کی بربادی کا ذریعہ ہیں۔ یعنی درمیانی لوگوں
کا مال چھین کر انہیں غریب بنا دینا۔ گویا انسانی مساوات کے دو پہلو ہیں۔ ایک صدقہ دینا' دوسرا سود نہ لینا' ایک پہلو کا ذکر تو
پچھلی آیتوں میں ہوا اور دوسرے پہلو کا ذکر اس آیت میں ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقہ کی ترغیب تھی
جس میں بظاہر مال گھٹتا' اور حقیقتاً بڑھتا ہے۔ اب سود کی ممانعت ہے جس میں بظاہر مال بڑھتا اور حقیقتاً گھٹتا ہے۔

پانچواں تعلق: بہت دور سے مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنے کے احکام بیان ہو رہے ہیں جن میں سے صدقہ بھی ہے۔ اب سود سے منع کیا جا رہا ہے کہ یہ بھی خلق کے ساتھ ایک بھلائی ہے۔ **چھٹا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عبادات کا ذکر تھا۔ یعنی صدقہ وخیرات دینا۔ اب مالی معاملات کا بیان ہے۔ یعنی سودی لین دین نہ کرنا۔

تفسیر

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا۔ یہاں اَلَّذِیْنَ سے ان امرائے عرب کی طرف اشارہ ہے جو سودی کاروبار کرتے تھے مگر لفظی عموم کی وجہ سے سارے سود خور مراد ہیں۔ اَلَّذِیْنَ سے کبھی تو مراد صحابہ کرام ہوتے ہیں جیسے اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (حجرات: ۳) اور کبھی عام مسلمان جیسے اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (مائدہ: ۵۵) اور کبھی سارے انسان سے مومن ہو یا کافر متقی یا فاسق جیسے یہاں اَلَّذِیْنَ تیسرے معنی میں ہے کیونکہ سود لینا ہر انسان کو منع ہے۔ مومن ہو یا کافر اسلامی سلطان کفار کو سود کھانے' شراب پینے کی اجازت تو دے گا مگر سود خوری' قتل و غارت چوری' زنا کی اجازت نہ دے گا کہ یہ معاملات ہیں۔ کسی دین میں زنا چوری حلال ہو اور وہ دارالسلام میں رہتے ہوں تو انہیں اس کی اجازت نہیں۔ غرضکہ اَلَّذِیْنَ کے متعلق آئندہ مضمون کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ یہاں چونکہ سود کی حرمت کا ذکر ہے جس کا تعلق سب لوگوں سے ہے۔ اس لئے اَلَّذِیْنَ سے مراد سارے انسان ہیں۔ یَاْکُلُوْنَ سے سود لینا مراد ہے مگر چونکہ کھانا مال کا مقصد اعلیٰ ہے اس لئے اس کا ذکر فرمایا گیا۔ جیسے اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا۔ (النساء: ۱۰) اور جیسے وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ (بقرہ: ۱۸۸) ہماری اردو زبان میں سود لینے والے کو سود خور اور حرام کمانے والے کو حرام خور کہتے ہیں یعنی سود کھانے والے حرام کھانے والے مطلب پر ناچنے والے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یَاْکُلُوْنَ سے یُعَامِلُوْنَ مراد ہے یعنی جو سود کا معاملہ کرتے ہیں۔ اس معاملہ سے بھی لینا ہی مراد ہے نہ کہ دینا کیونکہ آیت میں سود لینے ہی کا ذکر ہے سود دینے کی حرمت دیگر دلائل سے معلوم ہوئی۔ رَبٰو دراصل ربوٌ تھا۔ بمعنی زیادتی۔ اسی لئے چوڑی نالی کو رابیہ اور اونچی جگہ کو ربوہ اور کسی پر زیادتی کرنے کو ربو کہا جاتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اِهْتَزَّتْ وَرَبَتْ۔ (حج: ۵) اور فرماتا ہے۔ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ۔ (الروم: ۳۹) یہ لکھنے میں صلوٰۃ وزکوٰۃ کی طرح ربوٰ اور ربیٰ اور ربا الف سے ہر طرح مستعمل ہے۔ اس کے لغوی معنی مطلقاً زیادتی ہیں۔ مگر اصطلاح شریعت میں ناپنے تولنے والی ہم جنس چیز میں بلاعوض زیادتی کو ربو' کہتے ہیں۔ اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ جیسا کہ انشاء اللہ آئندہ معلوم ہوگا۔ یعنی جو لوگ سود لیتے ہیں۔ **لَا یَقُوْمُوْنَ۔** اس قیام سے یا میدان قیامت میں کھڑا ہونا مراد ہے (روح البیان) یا اپنی قبروں سے اٹھنا اور محشر کی طرف چلنا (روح البیان) کیونکہ اس دن سود خور کی یہی ہی پہچان ہوگی اور ہو سکتا ہے کہ یَقُوْمُوْنَ حال کے معنی میں ہی ہوں' اور قیام سے مراد سود دینا ہی قائم و موجود رہنا یعنی سود خور دنیا میں ایسے دیوانے و محبت مال میں خبطی ہو رہتے ہیں۔ جیسا کسی کو شیطان سے وار پڑ جائے اور وہ دیوانہ ہو جاتا ہے کہ انہیں بجز سودوں کے اور کوئی دھن ہی نہیں ہوتی اگرچہ یہ معنی بعید ہے مگر محتمل ضرور ہے قیام کے معنی ٹھہرنا اور رہنا بھی لغت میں ہے۔ **اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔** یہ نفس قیام میں تشبیہ ہے نہ کہ وجہ میں۔ یَتَخَبَّطُ۔ خبطٌ سے بنا بمعنی خلط۔ جس کی رفتار و گفتار میں یکسانیت نہ ہو چلنے اور بولنے میں بہکتا ہو۔ ایسے خبطی کہا جاتا ہے۔ تخبط بمعنی خبطی ہونا' اور تخبیط خبطی کرنا۔ یہاں

تفعل بمعنی تفعیل ہے۔ شیطان سے یا ابلیس مراد ہے یا ہمزاد یا عام جن' یا تو مَسّ لمسّ کی طرح بمعنی چھونا ہے۔ یا بمعنے جنون مجنون کو ممسوس کہا جاتا ہے۔ یعنی سود خور اپنی قبروں سے اٹھ کر محشر کی طرف ایسے گرتے پڑتے چلیں گے جیسے کسی پر شیطان سوار ہو کر اسے دیوانہ کر دے' جس سے وہ یکساں نہ چل سکے۔ ایسے ہی یہ لوگ اپنے پیٹ کے بوجھ یا جنون سے یکساں نہ چل سکیں گے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا۔ ذٰلِکَ سے یا تو کھانے کی طرف اشارہ ہے۔ یا ان کے عذاب کی طرف (روح المعانی) بِاَنَّھُمْ میں ب سببیہ ہے۔ ھُمْ کا مرجع یا سود خور ہیں یا ان کے وہ حمایتی جو سود کو حلال ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قَالُوْا سے یا زبانی قول مراد ہے یعنی کہنا یا دل کا قول یعنی سمجھنا' یا عملی قول' انما حصر کے لئے ہے اور بیع سے مراد عام حلال تجارتیں ہیں۔ اس کلام میں ان لوگوں نے سود کو جائز کہنے میں اتنا غلو کیا کہ تجارت کو مشبہ اور سود کو مشبہ بہ بنایا گویا سود ایسا حلال ہے کہ عام بیعیں بھی مثل اس کی حلال ہیں۔ یعنی ان کی یہ سود خوری یا یہ سزا اس لئے ہے کہ انہوں نے دل سے سمجھا' یا عمل سے ثابت کر دیا یا زبان سے صاف صاف کہا کہ دیگر نفع بخش تجارتیں۔ سود کی طرح حلال ہیں کہ ان سے بھی نفع حاصل کیا جاتا ہے اور سود سے بھی اس کی کیا وجہ کہ اگر ایک روپیہ کا کپڑا دو روپے میں بیچیں تو حلال ہو اور اگر ایک روپیہ دو روپے کے بدلے میں بیچیں تو حرام حالانکہ وہاں بھی ایک ہی روپیہ نفع ملا' اور یہاں بھی۔ حق تعالیٰ جواب ارشاد فرماتا ہے۔ وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ واو یا حالیہ ہے یا استینافیہ' یہاں بیع مطلق ہے اور ربو' مجمل جیسا کہ انشاء اللہ فوائد میں معلوم ہوگا۔ یعنی اللہ نے تجارتوں کو حلال کیا اور سود کو حرام۔ اتنا فرق ہوتے ہوئے جو تجارت اور سود کو یکساں کہے گا وہ پاگل ہے۔ فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ۔ مَنْ شرطیہ یا موصولہ ہے۔ جَآءَ بمعنی بلغ ہے مَوْعِظَۃٌ وَعْظٌ سے بنا بمعنی نصیحت یا جھڑک۔ مِنْ رَّبِّہٖ یا جَآءَ کے متعلق ہے۔ یا کسی پوشیدہ چیز کے اور موعظہ کی صفت یعنی جس کو خدائی نصیحت اور زجر پہنچی فَانْتَھٰی ف عاطفہ ہے یعنی وہ فوراً ہی سود خوری سے باز رہ گیا اور آئندہ کے لئے توبہ کر لی فَلَہٗ مَا سَلَفَ۔ فَلَہٗ کاف جزائیہ ہے لہٗ جاءٗ کے متعلق ہے۔ اور مَا سے مراد سود' سَلَفَ بمعنی گزر گیا۔ اسی سے ہے۔ امت سالفہ گزری ہوئی امت' سلافۃ الخمر اوپر کی صاف شراب اور سلفۃ الطعام کھانے سے پہلے جو میوہ جات کھائے جائیں (کبیر) یعنی اس کو پچھلا لیا ہوا سود جائز ہے کیونکہ وہ ممانعت سے پہلے لے چکا۔ اب اسے واپس کرنے کی ضرورت نہیں وَاَمْرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ۔ امر سے مراد یا نیت ہے یا معاملہ یا باز رہنا یعنی اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ بلا وجہ کسی پر بدگمانی نہ کرو۔ وَمَنْ عَادَ۔ عَادَ عَوْدٌ سے بنا بمعنی لوٹنا یہاں یا عقیدہ کی طرف لوٹنا مراد ہے یا عمل کی طرف یعنی جو کوئی سود کو حرام سمجھ کر پھر حلال کہنے لگے یا اسے چھوڑ کر پھر لینے لگے۔ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ سے مَنْ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ معنی جمع ہے۔ نَارْ سے دوزخ مراد ہے خواہ وہاں کا ٹھنڈا عذاب ہو یا گرم کیونکہ دوزخ میں اصلی چیز نار ہے اگر عود سے حلال سمجھنا مراد تھا تو خلود بمعنی ہیشگی ہے اور اگر دوبارہ سود لینا مراد تھا تو خلود بمعنی دراز مدت یعنی جو کوئی سود کو حرام سمجھ کر پھر حلال سمجھنے لگے تو وہ دوزخی ہے اور اس میں ہمیشہ ہی رہے گا یا جو کوئی سود چھوڑ کر پھر لینے لگے تو وہ جہنمی ہے۔ اس میں مدتوں رہے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ دوسرے گنہگاروں کے مقابل سود خور دوزخ میں زیادہ رہے گا کہ یہ رب کا مجرم بھی ہے اور انسانوں کا ظالم بھی حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے بوجھ اس کے سر پر ہیں۔ سود خور ایک مقروض سے جب سود لیتا ہے تو وہ اس مقروض پر اس کے بال بچوں پر اس کے تمام

اہل قرابت پر ظلم کرتا ہے ان کے منہ کا لقمہ چھین کر ظلماً خود کھاتا ہے اسلئے اسے اَصْحَابُ النَّارِ بھی فرمایا اور خَالِدُوْنَ بھی۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ سود لیتے ہیں ان کی پہچان قیامت میں یہ ہوگی کہ اس دن مردے اپنی قبروں سے اٹھ کر سواریوں پر' کوئی پیدل' اور کوئی آہستہ' کوئی دوڑتا ہوا' زمین محشر کی طرف چلیں گے مگر سود خور یا تو اپنے پیٹ کے بوجھ سے یا جنون کی وجہ سے ایسے گرتے پڑتے چلیں گے جیسے وہ مجنون دیوانہ چلتا ہے۔ جس پر خبیث' جن (بھوت) سوار ہو کر اسے دیوانہ کر دیتا ہے کیونکہ وہ دنیا میں انسان نما شیطان تھے کہ ایک مقروض پر ترس نہ کھاتے تھے۔ اس کے مکانات' جائیداد نیلام کراتے وقت اس کی خانماں بربادی پر رحم نہ کرتے تھے۔ یہ سزا ان کی بکواس کی وجہ ہے کہ انہوں نے قولاً یا اعتقاداً یا عملاً کہا کہ عام تجارت سود کی طرح فائدہ مند' ضروری اور جائز ہیں جیسا تجارت کے بند ہونے سے دنیاوی کاروبار بند ہو جاویں گے ایسا سود کے بند ہو جانے سے' کہ نہ تو حاجت مند کو کوئی قرض دے گا اور نہ مقروض کو قرضہ ادا کرنے کی فکر ہوگی۔ اور سود کی صورت میں ہر شخص کو وقت پر قرض بھی مل جائے گا اور مقروض کو سود بڑھنے کے خوف سے جلد ادائ قرض کی فکر ہوگی اور جیسے تجارت سے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ ایسے سود سے یہ بکواس لغو ہے۔ کیونکہ رب نے تجارتیں تو حلال کیں اور سود حرام فرمایا' اور بندے کو مالک کے حکم پر سر خم کرنا چاہیے۔ شیطان کی طرح خوض قیاس سے اس کا مقابلہ نہ کرنا چاہیے جس تک یہ مخالفت کا حکم پہنچے اور وہ فوراً سود سے توبہ کرے تو ممانعت سے پہلے وہ جو کچھ سود لے چکا۔ وہ اس کے لئے مباح ہے اس کا واپس کرنا ضروری نہیں۔ بندے کا کام خدا کے سپرد ہے۔ جو چاہے حلال کرے جو چاہے حرام۔ بندے کو دم مارنے کی کیا مجال اور جو کوئی اب ایسی حرکت کرے گا کہ توبہ کر کے پھر سود لے تو وہ دوزخی ہے۔ بہت عرصہ دوزخ میں رہے گا یا جو کوئی پھر سود کو حلال سمجھنے لگے' وہ کافر جہنمی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** خبیث جن (بھوت پلید) کا وجود برحق ہے۔ اس کا انکار اس آیت کا انکار ہے۔ **دوسرا فائدہ:** یہ خبیث جن (بھوت' پریت وغیرہ) انسان کو دیوانہ و مجنون کر دیتے ہیں کہ ان کے لپٹنے یا پکڑ لینے سے انسان بدحواس ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ (۱) چھوٹے بچوں کو سورج نکلتے وڈوبتے وقت باہر نہ نکالو (۲) خود بھی زیادہ رات گئے بلا وجہ گھر سے باہر نہ نکلو کہ یہ وقت شیاطین و جنات کے پھیلنے کا ہے۔ (۳) بحالت سفر بیچ راستہ پر نہ اُترو' بلکہ علیحدہ ہٹ کر' کہ وہ شیاطین کی گزرگاہ ہے۔ (۴) مرگی و طاعون جنات کے اثر سے ہے۔ اسی لئے طاعون میں اذانیں دی جاتی ہیں کہ شیاطین اذان سے بھاگتے ہیں۔ (۵) ہر بچہ کو بوقت پیدائش شیطان اس کی کوکھ میں مارتا ہے جس سے وہ روتا ہے۔ بجز حضرت عیسٰی و حضرت مریم کے (۶) سوراخ میں پیشاب نہ کرو۔ ممکن ہے کہ اس میں سانپ' بچھو یا جن ہو۔ غرضکہ قرآن و حدیث سے آسیب کا تکلیف پہنچانا ثابت ہے اور دن رات اس کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے لہٰذا اس کا انکار کرنا عقل و نقل کی مخالفت ہے۔ ہاں مزاج کی قوت وضعف کی وجہ سے اس کے اثر مختلف ہوتے ہیں۔ ضعیف المزاج لوگوں کو زیادہ تکلیف پہنچ جاتی ہے اور قوی مزاج والوں کو کم۔ یہ ہی عام بیماریوں کا حال ہے کہ کمزور آدمی معمولی سردی گرمی سے بیمار ہو جاتا ہے مگر قوی انسان برداشت کر جاتا ہے۔ (روح المعانی) **تیسرا فائدہ:** سود لینا گناہ کبیرہ و حرام قطعی ہے کہ لینے والا

فاسق اور حلال جاننے والا کافر ہے جیسا کہ خَالِدُوْنَ کی دو تفسیروں سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** سود لینے کی سزا دیگر کبیرہ گناہوں سے سخت تر ہے کہ قیامت میں کفار بھی قبور سے اٹھ کر آسانی سے چلیں گے مگر سود خور کو چلنا پھرنا مشکل ہوگا اور یہ ہی سود خور کی اس دن پہچان ہوگی کیونکہ سود خور مجرم بھی ہے اور ظالم و خونخوار بھی کہ گھر کے گھر تباہ اور دنیا کو برباد کرتا ہے۔ سب کو اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے اور مال کی طلب میں دیوانہ وار سرگرداں رہتا ہے لہٰذا اس کے لئے یہ سزا تجویز ہوئی۔ **پانچواں فائدہ:** تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یا تو سود خور واقعی اس دن دیوانہ ہوگا جیسا کہ اس تشبیہ سے معلوم ہوا یا اس کا پیٹ اتنا بڑا ہوگا جس کے بوجھ سے گرتا پڑتا چلے گا۔ جیسا کہ حدیث معراج میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے سود خوروں کے پیٹ بڑی کوٹھڑیوں کی طرح دیکھے جس سے وہ گرتے پڑتے ہیں۔ گویا اس دن اُن کی اس ہوس کا ظہور ہوگا جو انہیں دنیا میں تھی یا اس جنون مال کا اظہار ہوگا جس میں وہ مبتلا تھے۔ **چھٹا فائدہ:** ممانعت سے پہلے کے جرم معاف ہیں بشرطیکہ اب توبہ کرے جیسا کہ فَانْتَهٰی سے معلوم ہوا اور جو کوئی ممانعت کے بعد بھی باز نہ آئے اس پر اگلے پچھلے سارے گناہوں کا وبال ہے۔ **ساتواں فائدہ:** قیامت میں ہر مجرم چہرے سے ہی پہچان لیا جائے گا کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ دیکھو سود خور گرتا پڑتا دیکھ کر ہی پہچان لیا جائے گا۔ اسی طرح دوسرے مجرم پہچانے جائیں گے بلکہ اللہ والے تو دنیا ہی میں دوزخی جنتی کو پہچان لیتے ہیں کیونکہ ہر ایک کے گلے میں اس کی تختی رب نے ڈال دی ہے جسے آنکھ والے دیکھ بھی لیتے ہیں۔ پڑھ بھی لیتے ہیں۔ رب فرماتا ہے۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا (الاسراء: ۱۳) ہر ایک کی تختی اس کے گلے میں پڑی ہے۔ کل قیامت میں یہ ہی تختی نامہ اعمال کی شکل میں نمودار ہوگی۔ **مسئلہ:** مسائل شرعیہ میں بے علمی عذر نہیں۔ لہٰذا جو کوئی بے خبری سے سود لیتا رہا وہ گنہگار ہے۔ **مسئلہ:** سود کا پیسہ قبضہ سے بھی ملک میں نہیں آتا۔ لہٰذا سود خوار سود کا مالک نہیں۔ اس پر واجب ہے کہ مقروض کو واپس دے۔ اگر مقروض مر گیا ہو تو اس کے ورثاء کو واپس کرے ورثاء بھی نہ ہوں تو مقروض کے نام پر خیرات کر دے یہ حق العباد ہے توبہ سے معاف نہیں ہو سکتا۔ **مسئلہ:** اگر مقروض بعینہٖ سود کا پیسہ قرض خواہ سے چھین لے تو جائز ہے مگر بعینہٖ کی قید کا لحاظ رہے کیونکہ یہ سود کا پیسہ خود مقروض کا اپنا پیسہ ہے نہ کہ قرض خواہ کا۔

ممانعت سود کی حکمتیں اور سود کی دینی و دنیاوی خرابیاں

سود میں صدہا خرابیاں ہیں جس کی وجہ سے شریعت نے اسے حرام فرمایا' اُن میں سے چند وجوہ ہم عرض کرتے ہیں۔

(۱) سود میں دوسرے کا مال بلا عوض لیا جاتا ہے۔ یہ ظلم ہے مثلاً کسی نے ایک روپیہ کے عوض دو روپیہ لئے روپیہ تو روپیہ کے بدلے میں ہو گیا۔ دوسرا روپیہ بلا عوض رہا۔ یہ ظلم ہوا۔

(۲) سود سے تجارت بند ہونے کا قوی اندیشہ ہے کہ جب سود خوار کو بلا محنت اور بلا خوف و خطرہ نفع ملے گا تو وہ تجارت کی محنت اور اس کے خطرات کیوں برداشت کرے گا۔ تجارت بند ہونے سے عالم برباد ہو جائے گا۔

(۳) سود سے پرانی محبت اور مروت ختم ہو جاتی ہے۔ سود خوار میں بہیمیت و خونخواری پیدا ہوتی ہے کہ مقروض بھائی کی تباہی

بخوشی گوارا کرتا بلکہ اس پر خوش ہوتا ہے۔

(۴) سود سے صدہا غربا اور متوسط الحال لوگوں کو تباہ کر کے ایک مہاجن کا گھر بھرا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ غربا کی بربادی عالم کی تباہی ہے۔

(۵) تاجروں کے دن رات دیوالیہ سود کی بدولت ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ سودی قرض لے کر طاقت سے زیادہ کام نہ کریں تو اس طرح تباہ نہ ہوں۔

(۶) سودخوار قرض حسن دینا گوارا نہیں کرتا۔ صدقہ وخیرات سے جی چراتا ہے کیونکہ ہر پیسہ پر اس کی نگاہ رہتی ہے کہ اس سے چار پیسہ بنائے جاسکتے ہیں۔

(۷) بلکہ سودخوار اپنے اور بال بچوں پر بھی خرچ نہیں کرتا۔ مال بچا کر خود پر اٹھاتا ہے۔ جس سے خود اس کی زندگی دشوار ہو جاتی ہے جیسا کہ عام مہاجن بنیوں کو دیکھا جاتا ہے۔

(۸) کسی مجرم کو رب نے اعلان جنگ نہ دیا۔ سوائے سودخوار کے۔ کہ اعلان فرمایا۔ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (بقرہ:۲۷۹) اللہ ورسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔

(۹) عبداللہ ابن سلام فرماتے ہیں کہ سود لینا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے ستر درجہ زیادہ گناہ ہے۔ (بیہقی از درمنثور)

(۱۰) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو گوشت حرام پیسہ (سود وغیرہ) سے اگے گا اسے نار جہنم بہت تیزی سے جلائے گی (درمنثور)

(۱۱) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ سود کا پیسہ ستر (۷۰) بار ماں کے ساتھ زنا کرنے سے بدتر ہے۔

نوٹ: موجودہ بینک کے سود کا حکم علیحدہ ہے جو ہم بعد میں عرض کریں گے اگرچہ سود لینا بھی گناہ ہے اور سود دینا بھی بلکہ سود لکھنا۔ اس کا گواہ بننا سب ہی جرم ہے مگر چونکہ سود دینا حرام ہے۔ جرم ہے گناہ ہے مگر کسی پر ظلم نہیں کسی کا حق مارنا نہیں مگر سود لینا جرم بھی ہے اور انسان بلکہ انسانوں پر ظلم بھی۔ اسلئے رب نے اسکی ممانعت میں بہت سختی فرمائی حتی کہ سودخور کو اللہ ورسول سے جنگ کرنے کا اعلان فرمایا وہ جو حدیث شریف میں ہے کہ سود دینے والا اور لینے والا دونوں برابر ہیں۔ وہاں نفس گناہ میں برابری مراد ہے نہ کہ مقدار گناہ میں' سود دینے والا مقدار گناہ میں زیادہ ہے لہٰذا یہ آیت اور وہ حدیث آپس میں متعارض نہیں۔

سود کی حقیقت اور اس کے مسائل: سود کی دو صورتیں ہیں۔ زیادتی کا سود' اور ادھار کا۔ زیادتی کے سود کی حقیقت یہ ہے کہ دوطرفہ ایک جنس اور ایک ناپ وتول کا مال ہو۔ اور پھر ایک طرف زیادہ ہو' اور دوسری طرف کم مثلاً چاندی کے عوض چاندی دی مگر دی چار تولہ اور لی پانچ تولہ۔ یہ سود ہے کہ چاندی چاندی کی ہم جنس بھی ہے اور ہم وزن بھی کہ تولہ ماشہ رتی سے تولی جاتی ہے۔ خیال رہے کہ ہم جنس وہ ہے جو نام اور کام میں یکساں ہوں اگر نام تو یکساں ہو مگر کام جداگانہ تو ہم جنس نہیں۔ جیسے سرسوں' تل اور مٹی کا تیل کہ سب کو تیل ہی کہا جاتا ہے یا جیسے بکری' گائے' اونٹ کے گوشت و دودھ۔ کہ ان سب کو گوشت یا دودھ ہی کہا جاتا ہے مگر ان کی تاثیریں اور فائدے جداگانہ لہٰذا ان میں زیادتی کرنا سود نہیں' ایک سیر بکری کے گوشت یا دودھ کو دو سیر گائے کے گوشت یا دودھ سے فروخت کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ایک سیر گیہوں کو دو سیر جو کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: کاغذ اور چاندی ہم جنس نہیں۔ لہٰذا سو روپیہ کا نوٹ ایک سو دس نقد روپیہ کے عوض فروخت کرنا جائز ہے۔ ایک روپیہ نقد کے ۱۷ آنہ پیسوں یا اکنی کے عوض فروخت کر سکتے ہیں کہ روپیہ چاندی کا ہے اور پیسہ تانبہ کا۔ اس کی تحقیق کے لئے اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے نہایت نفیس رسالہ لکھا۔ کفل الفقیہ القاھم۔ اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ دوسرا سود ادھار۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ صرف ہم جنس یا ہم قدر چیزیں ادھار حرام ہیں یعنی صرف ایک وصف میں یکساں ہونا کافی ہے۔ لہٰذا گندم نقد دے کر جو ادھار خریدنا حرام ہے کہ یہ دونوں اگرچہ ہم جنس تو نہیں مگر ہم وزن تو ہیں کہ دونوں سیر یا من سے تولے جاتے ہیں۔

مسئلہ: احناف کے نزدیک بیع کا جواز مطلق اور ربوٰ کی حرمت مجمل ہے (کبیر) مگر شافعی مذہب میں دونوں مجمل یعنی ہمارے یہاں ہر بیع حلال ہے۔ سوائے اس کے جس کی حرمت نص میں آ گئی اور ہر سود حرام ہے مگر سود میں اجمال کیونکہ ہر تجارت نفع ہی کے لئے ہوتی ہے تو خاص نفع حرام ہو نہ کہ عام۔

سود سے بچنے کی تدبیر: یہ تو معلوم ہو چکا کہ سود میں دو شرطیں ہیں دونوں مالوں کا ہم جنس ہونا اور ناپ تول میں یکساں ہونا۔ اگر ان میں سے ایک بھی شرط نہ ہوگی تو زیادتی حلال ہوگی۔ دیکھو ایک من گیہوں کے عوض دو من جو لینا جائز کہ گیہوں اور جو ایک جنس نہیں۔ ایسے ہی مرغی کے دس انڈے دے کر پندرہ لینا جائز کہ یہ اگرچہ ہم جنس ہے مگر ناپ تول کی چیز نہیں بلکہ گن کر بکتے ہیں۔ ایسے ہی حربی کفار سے نفع لینا سود نہیں (شامی باب الربوٰ) خواہ دار السلام میں لے یا دار الحرب میں (شامی) ایسے ہی دار الحرب میں ان مسلمانوں سے نفع لینا سود نہیں جو بالکل دار السلام میں نہ آئے ہوں (شامی وغیرہ) جب یہ سمجھ آ گیا تو سود سے بچنے کی چند تدبیریں خیال میں رکھنی چاہئیں۔

(۱) نوٹ کی تجارت نفع کے ساتھ جائز ہے۔ دس کا نوٹ پندرہ میں اور سو کا سوا سو میں بیچ سکتے ہیں کیونکہ نوٹ کاغذ ہے اور روپیہ چاندی ہم جنس نہیں۔ بلکہ اگر دو طرفہ نوٹ ہوں تب بھی نفع جائز کیونکہ نوٹ ناپنے تلنے کی چیز نہیں۔ گن کر لین دین ہوتی ہے۔

(۲) چاندی کا روپیہ سترہ اٹھارہ آنے' پیسہ یا اکنیوں سے فروخت کرنا جائز ہے کہ روپیہ چاندی ہے اور ریزگاری تانبہ یا نکل ہم جنس نہیں۔ ہندوستانی حجاج عرب شریف پہنچ کر اپنے نوٹ عربی نوٹ سے تبدیل کرتے ہیں جس کے بھاؤ مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی ہمارا سو کا نوٹ ساٹھ ستر روپیہ میں فروخت ہوتا ہے اور کبھی ایک سو سات بلکہ ایک سو دس روپیہ تک ہی یہ بتاؤ کہ تمام صالحین حجاج ہمیشہ کرتے ہیں۔ کبھی کوئی اعتراض ہی نہیں کرتا۔ آج اگر حکومت چاہے تو سو کا نوٹ پانچ روپیہ کا کر دے۔ اور پانچ کا نوٹ سو کا بنا دے۔ معلوم ہوا کہ یہ قیمت اس کاغذ کی نہیں بلکہ حکم سرکاری کی ہے۔ ابھی پاکستان نے ایک روپیہ بجائے چونسٹھ پیسوں کے ایک سو پیسوں کا بنا دیا اور ڈاک خانہ کا چھ پیسہ یعنی ڈیڑھ آنہ کا ٹکٹ ایک نئے پیسہ کا کر دیا ہے اور وہ چل رہا ہے۔

(۳) ہندوستان میں موجودہ کفار سے نفع لینا سود نہیں کہ اگرچہ یہ ملک دار السلام ہے مگر یہاں کے کفار سب حربی' کتب فقیہ میں دار الحرب کی قید یا تو اتفاقی ہے یا مستامن کو نکالنے کے لئے (دیکھو شامی باب الربٰو اور فتح القدیر) بلکہ کفار حربی سے ہر عقد فاسد جائز ہے۔ بشرطیکہ اس میں مسلمان کا نفع ہو اور اس میں ظلم اور دغا نہ ہو۔

(۴) پنجاب کا مروجہ رہن حرام ہے کیونکہ یہاں زمین رہن لے کر اس کا نفع قرض خواہ کھاتا رہتا ہے اور پھر پورا قرض وصول کر کے زمین واپس کرتا ہے۔ یہ خالص سود ہے اس کی تدبیر یہ ہے کہ زمین کی بیع وفا کر دی جائے اب اس کا منافع حلال ہوگا۔

اور مقصود بھی حاصل ہو جائے گا۔ یعنی بجائے رہن نامہ کے بیع نامہ لکھا جائے اور ساتھ ہی اقرار نامہ رجسٹری کرا دیا جائے کہ جس وقت بائع چاہے اپنی زمین کسی قیمت سے واپس کرلے۔ اب زمین کا منافع قرض خواہ کو حلال ہے کہ وہ زمین اس کی ملک ہو چکی۔ مشکوٰۃ شریف باب الربوٰ میں ہے کہ ایک بار حضرت بلال نے دو صاع ردی خرمے ایک صاع کھرے خرموں سے بیچے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ سود ہو گیا' یوں نہ کرو۔ بلکہ پہلے ردی خرمے روپیہ کے عوض فروخت کر دو پھر اس روپیہ سے کھرے خرمے خرید لو۔ لہٰذا اگر تمہیں دو سیر خراب گیہوں دے کر ایک سیر اچھے گیہوں لینا ہے تو گندم گندم کے عوض نہ دو بلکہ یہ دو سیر مثلاً آٹھ آنے میں بیچ دو پھر اس آٹھ آنے کے کھرے گیہوں ایک سیر خرید لو۔

بنک کا سود: پہلے معلوم ہو چکا کہ کفار سے نفع لینا سود نہیں بلکہ حلال ہے۔ لہٰذا آج کل سیونگ بنک' پنجاب بنک' بنک آف انڈیا وغیرہ کفار کے سارے بنک سے نفع لینا حلال ہے اگرچہ وہ لوگ اسے سود کہتے ہیں مگر یہ شرعاً سود نہیں البتہ مسلمانوں کے بنک سے نفع لینا حرام ہوگا مگر نوٹ کے لین دین میں سب سے نفع لیا جا سکتا ہے۔ **مسئلہ:** چھ صورتوں میں روپیہ پر نفع حلال ہے۔ سود نہیں (۱) مولا اپنے غلام سے روپیہ کا نفع لے۔ (۲) معاوضہ یا عنان کے شریک آپس میں ایک دوسرے سے نفع لیں (۴) مسلمان' کافر' حربی سے لے۔ (۵) مسلمان دار الحرب میں۔ (۶) بعض مسلمان بعض سے نفع لیں۔ بشرطیکہ یہ دونوں کبھی دار السلام میں نہ آئے ہوں۔ (درمختار باب الربوٰ)

بیمہ کرانا: بنک کے مسئلہ سے زندگی یا مال کا بیمہ کرانے کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ اگر بیمہ کمپنی خالص کفار کی ہے تو بیمہ حلال ورنہ حرام کہ بیمہ میں بھی روپیہ پر نفع لیا جاتا ہے۔ **مسئلہ:** سود کے شبہ سے بچنا بھی ضروری۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم علیہ السلام نے سود کا تفصیلی بیان فرمانے سے پیشتر وفات پائی۔ لہٰذا سود اور مشبہ سود سے بچو (احکام القرآن)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ شیطان انسان کو دیوانہ کر سکتا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ (حجر:۴۲) اے شیطان میرے خاص بندوں پر تجھے دسترس نہ ہوگی۔ خود شیطان قیامت کے دن کفار سے کہے گا۔ مَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ (ابراہیم:۲۲) مجھے تم پر غلبہ نہ تھا جس سے معلوم ہوا کہ ابلیس انسان پر غلبہ نہیں پا سکتا' ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** ان دونوں آیتوں میں سلطان سے مراد جبراً گناہ یا کفر کرانا ہے اور یہاں عقل خراب کر دینا مراد ہے۔ جیسے شراب افیون اور سانپ کے زہر سے عقل اور زندگی برباد ہو جاتی ہے ایسے ہی شیطانی اثر سے بھی دیوانہ ہونا ممکن ہے۔ لہٰذا ان آیتوں میں کچھ تعارض نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیاس کرنا طریقہ کفار ہے۔ دیکھو کفار عرب نے سود کو تجارت پر قیاس کیا۔ لہٰذا وہ عذاب کے مستحق ہوئے۔ (غیر مقلد) علمائے مجتہدین بھی قیاس کر کے انہی کے ساتھی ہوئے؟ **جواب:** نص کے مقابل قیاس کرنا طریقہ ابلیس او طریقہ کفار ہے۔ اسی کی مذمت ہے مجتہدین کا قیاس نص کے مقابل نہیں بلکہ موافق ہے اس کی پوری تحقیق پہلے سیپارہ میں ہو چکی اور ہم نے اپنی کتاب جاء الحق میں بھی کی ہے۔ **تیسرا اعتراض:** سود میں بہت سے فائدے ہیں۔ پھر اسے حرام کیوں کیا گیا۔ آج بغیر سود کوئی تجارت نہیں چل سکتی۔ **جواب:** سود میں کچھ ظاہر فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی مگر

نقصان فائدوں سے زیادہ' سود میں ہزاروں کو غریب بنا کر ایک کو امیر بنایا جاتا ہے۔ قوموں کی تباہی۔ عام دیوالے سود ہی کی بدولت ہیں۔ سود سے انسان میں درندگی پیدا ہوتی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جس کا نقصان نفع سے زیادہ وہ حرام' ہاں فی زمانہ بہت منافع حلال ہیں مگر مسلمان سود سمجھ کر ان سے بچتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی غلطی ہے نہ کہ مسئلہ کی۔ غضب ہے کہ مسلمان کفار کو سود دیتے تو ہیں مگر لینا حرام سمجھتے ہیں حالانکہ معاملہ برعکس تھا۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت میں ارشاد ہوا کہ جو کوئی سود سے باز رہے تو اسے گذشتہ لیا ہوا سود حلال ہے۔ اگر کوئی باز نہ رہے تو کیا حرمت سے پہلے کا سود اس کے لئے حرام ہو گا۔ **جواب:** بے شک جو اس آیت کے بعد سود کو حلال مانے وہ کافر ہے اور کفار کے لئے معافی کیسی؟ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود خور جہنم میں ہمیشہ رہے گا۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ جہنم کی ہیشگی صرف کفار کے لئے ہے ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ یا تو اس سے سود کی حرمت کا منکر مراد ہے اور سود خوار کافر ہے۔ یا خلود سے دراز مدت مقصود' یا مقصد یہ ہے کہ سود خور کے خاتمہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ جس سے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے کیونکہ ماں باپ کو ستانا ہمیشہ افیون بھنگ نشہ کے لئے کھانا' سود لینے کی عادت ان سے خرابی خاتمہ کا اندیشہ ہے اور ماں باپ کی خدمت۔ اذان کا احترام۔ صدقہ وخیرات کی کثرت ان سے حسن خاتمہ کی امید ہے۔ انشاء اللہ **چھٹا اعتراض:** سود کے علاوہ رشوت' چوری' ڈکیتی وغیرہ اور بھی بڑے بڑے گناہ ہیں۔ قرآن کریم میں ان پر اتنا زور کیوں نہیں دیا یا سود پر اس قدر زور کیوں دیا؟ **جواب:** دو وجہ سے ایک یہ کہ رشوت چوری وغیرہ بیماریاں ہیں اور سود وبائی بیماری جس میں بہت لوگ گرفتار ہیں۔ حکومتیں وبائی امراض روکنے پر بہت زور دیتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ رشوت چوری وغیرہ کو لوگ خود بھی برا سمجھتے ہیں اس لئے ان کے روکنے کو حکومتوں میں محکمہ بنائے ہیں۔ مگر سود کو لوگ برا نہیں سمجھتے' حکومتیں سود کی سر پرستی کرتی ہیں۔ خود بھی سود لیتی دیتی ہیں۔ آج محکمہ انسداد رشوت ستانی بنے ہیں چوریاں روکنے کے لئے محکمہ پولیس موجود ہے مگر سود روکنے کے لئے کوئی محکمہ نہیں۔ اس لئے اس مسئلہ پر قرآن کریم نے بہت زور دیا۔

تفسیر صوفیانہ

سود خور سارے گنہگاروں سے بدتر ہے کیونکہ ہر شخص اپنی کمائی میں رب پر توکل کرتا ہے نہ کہ اپنی عقل پر' تاجر' کسان' پیشہ ور کوشش کر کے رب کی طرف توجہ کرتے ہیں اگر وہ اس میں گناہ بھی کریں تب بھی ہلکے گناہ گار ہیں۔ نیز ان سب نے اپنے معاملہ کو نفع اور نقصان کے درمیان سمجھ کر رب کی طرف رجوع کیا۔ مگر سود خور توکل چھوڑ کر اپنے معاملہ کو نقصان سے بچا کر اپنی عقل پر اعتماد کرتا ہے۔ اور رب کے دروازہ سے ہٹ جاتا ہے۔ مقروض متوکل ہے۔ مگر وہ معاند چونکہ اس نے اپنا رزق اپنی عقل پر رکھا۔ اس لئے نفسانی حجاب میں پھنس کر ربانی نور سے محجوب ہو گیا اور چونکہ اس نے رزق کے معاملہ میں اللہ سے رشتہ توڑا۔ رب نے بھی اس کی حفاظت چھوڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر شیاطین نے قبضہ جما لیا۔ چونکہ قیامت میں ہر شئے کی اصل ظاہر ہو گی۔ اس لئے سود خور پر قبضہ شیاطین کا اثر بھی اسی دن نمودار ہو گا کہ یہ تو خدا سے بے تعلق ہو گا اور تمام لوگ اس سے متعلق اور ان کا یہ حجاب اس لئے ہے کہ انہوں نے بمقابلہ حکم الٰہی قیاس کرنے میں شیطان کی شاگردی کی کہ اس نے بھی حکم سجدہ پا کر قیاس ہی کیا تھا اور چونکہ قیامت میں ہر شخص اپنے ہم جنس کے ساتھ ہو گا۔ لہٰذا سود خور اپنے ہم جنس شیطان کے ساتھ

اور اسی کے زیر سایہ اٹھے گا۔ (از ابن عربی)

دوسری تفسیر

سود خور بھوکے کتے کی طرح دنیا کا حریص ہے کہ کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھول جاتا ہے۔ جس سے اسے چلنا پھرنا مشکل ہوتا ہے۔ قیامت میں اس کا ظہور ہوگا۔ عاقل وہ غذا نہیں کھاتا جو ہضم نہ کر سکے۔ سود وہ ثقیل غذا ہے جسے مومن کا معدہ برداشت نہیں کر سکتا۔ صوفیائے کرام شبہ سود سے بھی بچتے ہیں۔ **حکایت:** امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک شخص پر کچھ سیاہ درہم قرض تھے۔ وہ سفید درم لایا۔ آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ خوف کرتا ہوں کہ درموں کی یہ سفیدی سود نہ ہو جائے۔ اس سے کالے ہی درم وصول کیے۔ امام ابوبکر فرماتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہ کو دیکھا کہ ایک شخص کے دروازہ پر کھڑے ہیں سخت دھوپ ہے مگر کواڑ بجا کر دھوپ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ دیوار کے سایہ میں کیوں نہیں کھڑے ہوتے۔ آپ نے فرمایا کہ اس گھر والے پر میرا قرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی دیوار کا سایہ سود میں شمار ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی نے ہمدان شہر سے کچھ غلہ خریدا۔ جب لوٹ کر بسطام آئے تو اس میں دو چیونٹیاں پائیں۔ پھر لوٹ کر ہمدان شہر گئے اور چیونٹیاں اسی دوکان پر چھوڑ آئے۔ یہ وہ تقویٰ ہے۔ جس کی برکت سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ (از روح البیان)

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾
مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیراتوں کو اور اللہ نہیں پسند کرتا ہر کفر کرنے والے گنہگار کو تحقیق
اللہ ہلاک کرتا ہے سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو اور اللہ کو پسند نہیں آتا کوئی ناشکرا بڑا گنہگار بیشک
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ
وہ لوگ جو ایمان لائے اور کام کیے انہوں نے اچھے اور قائم کیا نماز کو اور دیا زکوٰۃ کو واسطے ان کے
وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی ان کا
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾
ثواب ہے ان کا نزدیک رب ان کے اور نہیں ہے ڈر اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین ہوں گے
نیگ ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے اولاً خیرات کی رغبت دی گئی تھی اور پھر سود سے ڈرایا گیا تھا۔ اب ان دونوں کو اسی ایک آیت میں جمع فرما کر سود کی برائی اور صدقہ کی خوبیاں بیان ہو رہی ہیں۔ گویا یہ اجمال کے بعد تفصیل ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صدقات کے شرعی فائدے اور سود کے شرعی نقصان بیان

ہوئے کہ رب نے سود حرام فرمایا۔ سود خور دوزخی ہے وغیرہ۔ اب ان دونوں کے عقلی فوائد و نقصانات کا تذکرہ ہے کہ سود سے مال گھٹتا ہے اور صدقہ سے بڑھتا ہے۔ گویا پچھلی آیت میں سود کی ایک نوعیت سے ممانعت کی گئی۔ اور اب دوسری طرح۔

تیسرا تعلق: پچھلی آیتوں میں صدقات کا حکم دیا گیا اور سود سے روکا گیا مگر چونکہ نفس انسانی ظاہری نفع کو دیکھ کر سود لینے اور خیرات سے بچنے پر مائل ہے۔ لہٰذا اب اس کے میلان کو روکا جا رہا ہے اور سود کی وہ برائی بیان ہو رہی ہے جس سے نفس اس سے بچنے پر راغب ہو۔ **چوتھا تعلق:** قرآن پاک کا طریقہ ہے کہ ضدین کا ذکر فرماتا ہے۔ بھلوں کے ساتھ بُروں اور بُروں کے ساتھ بھلوں کا تذکرہ کرتا ہے کیونکہ چیز اپنے مقابل سے پہچانی جاتی ہے۔ یہاں بھی پہلے سود خور بد اعتقاد اور بدعمل لوگوں کا ذکر فرمایا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خوش اعتقاد نیک کار صالحین کی مدحت و ثنا فرماتا ہے تاکہ قرآن پڑھنے والے بدکاریوں سے بچیں اور نیکی اختیار کریں۔

تفسیر

یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا۔ یَمْحَقُ محق یا محاقٌ سے بنا جس کے معنی ہیں گھٹ کر فنا ہو جانا' یا پورا ہو کر کم ہو جانا' نقصان اور محاق میں فرق یہ ہے کہ نقصان ہر کمی کو کہتے ہیں اور محاق خاص کمی کو اسی لئے چاند گھٹنے کو محاق بولا جاتا ہے۔ شروع ماہ کے چاند کو محق نہیں کہتے کیونکہ وہ نقصان سے کمال کی طرف ترقی کر رہا ہے بلکہ اخیری گھٹنے کو محق کہتے ہیں۔ یہاں یا تو دنیوی کمی اور بے برکتی مراد ہے یا اخروی نقصان و خسارا جیسا کہ ہم انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں عرض کریں گے یعنی اللہ دنیا میں سود کو گھٹاتا' یا مٹاتا' یا بے برکت فرماتا ہے یا قیامت میں ہلاک فرمائے گا۔ غرضکہ محق کے چار معنی ہو گئے۔ مٹاتا ہے' یا مٹائے گا۔ گھٹاتا ہے یا گھٹائے گا۔ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کا سود آخرت میں مٹا دے گا کہ سودی صدقات' خیرات بالکل برباد ہوں گے یا گھٹا دے گا کہ سودی غذا کھا کر سودی لباس پہن کر جو نماز وغیرہ ادا کی گئی ان کے ثواب گھٹ جائیں گے۔ مال' عبادات جو سود سے ادا ہوں وہ مٹ جائیں گی۔ یہ ہی عبادات جن میں سودی غذا' لباس استعمال کیا گیا ہے گھٹ جائیں گی یا دنیا میں مسلمانوں کا سودی مال مٹ جاتا ہے اگرچہ کفار کا نہ مٹے' یا تمام انسانوں کے سودی کاروبار میں برکت نہیں ہوتی اگرچہ کبھی کثرت ہو جائے' کثرت و برکت میں فرق ہے۔ وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ۔ یُرْبِیْ رباءٌ سے بنا۔ جس کا مادہ ربو ہے بمعنی بڑھانا۔ اس کی تحقیق ہم کَمَثَلِ جَنَّۃٍۭ بِرَبْوَۃٍ۔ (بقرہ: ۲۶۵) کی تفسیر میں کر چکے اس سے بھی یہ دنیوی برکت اور بڑھانا مراد ہے یا اخروی ترقی دینا۔ صدقات سے عام خیرات مراد ہے۔ صدقہ فرضی ہو یا نفلی۔ یعنی اللہ ہر قسم کے صدقات کو دنیا میں بڑھاتا ہے کہ اس سے بقیہ مال میں برکت دیتا ہے یا آخرت میں بڑھائے گا کہ تھوڑا صدقہ بہت زیادہ فرما کر عطا کرے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے صدقہ کی ایسی پرورش کرتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے گھوڑی یا گائے کے بچے کی جب بندہ آخرت میں اٹھے گا تو اپنے ایک پیسہ کے صدقہ کو پہاڑ پائے گا۔ دنیا میں بھی دیکھا گیا ہے کہ سخی کبھی فقیر نہیں ہوتا۔ بفضلہٖ تعالیٰ اس کا مال بڑھتا رہتا ہے۔ سخی کی اولاد بھی اپنے ماں باپ کی سخاوت کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ۔ یہ جملہ یا تو مستقل مضمون ہے یا پہلے مضمون کی علت۔ لَا یُحِبُّ بمعنی لَا یَرْضٰی ہے کیونکہ محبت توبہ کرنے والوں سے خاص ہے (روح البیان و روح المعانی) کَفَّارٍ' کفر کا مبالغہ ہے جیسے ضرب کا ضراب اور قول کا قوال' یہ کفور کے ہم معنی ہے۔ کافر کی جمع کفار (کاف کے پیش

سے) یہاں کفار سے اڑیل کافر مراد ہے اہل عرب ہر ہٹ دھرم پر یہ صیغہ بولتے ہیں جیسے فَعَّالُ الْخَيْرِ یا مَنَّاعٌ لِلْخَيْرِ کفر سے یا اصطلاحی کفر مراد ہے یعنی بے ایمانی' یا لغوی کفر یعنی ناشکری' اَثِیْمٍ اثم کا مبالغہ کا صیغہ ہے بمعنی گناہ' اس سے بھی دائمی گنہگار مراد ہے یعنی اللہ ہر اڑیل کافر اور دائمی گنہگار سے راضی نہیں ہوتا اور اللہ ہر ناشکرے گنہگار سے ناراض ہے۔ مردودین کے ذکر کے بعد اب مقبولین کا تذکرہ ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ایمان کے معنی اور اس کی لغوی تحقیق پہلے سیپارہ میں ہو چکی۔ اٰمَنُوْا کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی وہ لوگ کہ ان ساری چیزوں پر ایمان لائے۔ جن پر ایمان لانا ضروری ہے چونکہ ایمان اعمال صالح پر مقدم ہے کہ یہ مثل شرط ہے۔ نیز ایمان لڑکپن ہی سے ملتا ہے کہ بچے کے کان میں پیدا ہوتے ہی اذان دیتے ہیں اور نا سمجھی سے ہی اسے ایمان سکھاتے ہیں۔ اعمال ہوش سنبھالنے کے بعد سکھائے جاتے ہیں اور بعد بلوغ لازم ہوتے ہیں۔ نیز عالم ارواح میں ایمان عطا ہو گیا تھا۔ مگر اعمال دنیا میں آ کر پیش ہوئے۔ ان وجوہ سے ایمان کو اعمال سے پہلے بیان فرمایا۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ اور انہوں نے نیکیاں کیں الصّٰلِحٰتِ میں الف لام جنسی ہے یا استغراقی۔ اس سے بقدر طاقت نیکیاں مراد ہیں۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ۔ اَقَامُوْا۔ اِقَامَةٌ سے بنا بمعنی سیدھا کرنا اور درست رکھنا' یہاں نماز پر پابندی کرنا اسے صحیح طریقہ پر مستحبات و واجبات کے ساتھ ادا کرنا مراد ہے اور زکوٰۃ سے صدقہ فرضی مقصود' خواہ روپیہ پیسہ کا صدقہ ہو یا دیگر مال کا' اگرچہ نیکیوں میں نماز اور زکوٰۃ بھی داخل تھی مگر اظہار عظمت کے لئے ان کا ذکر علیحدہ بھی کیا گیا کیونکہ نماز بدنی اور زکوٰۃ مالی اطاعت میں افضل عمل ہے۔ یعنی انہوں نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں بڑھا ہوا یا پاکیزگی' چونکہ زکوٰۃ دینے سے مال بڑھتا ہے اور اس کی برکت سے بقیہ مال پاک ہو جاتا ہے اس لئے اسے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ جیسے انگور کی بیل کاٹ دینے سے پھل زیادہ آتے ہیں یا ذبح میں خون نکل جانے سے گوشت چربی وغیرہ سب پاک ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی زکوٰۃ نکالنے سے مال میں زیادتی بھی ہو جاتی ہے اور پاکی بھی شعر۔

زکوٰۃ مال بدر کن کرد ابدر ذرا　　　چو باغ بان بدرد بیشتر دہد انگور

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ لَهُمْ کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ اجر طے شدہ معاوضہ کو کہتے ہیں جیسے اجرۃ۔ یہاں ثواب اعمال مراد ہے۔ جس کا مسلمانوں سے وعدہ کر لیا گیا۔ یعنی ان کا ثواب ان کے رب کے نزدیک محفوظ ہے۔ جس کے مارے جانے کا خوف ہی نہیں۔ اس کے سوا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ آئندہ اندیشہ کو خوف اور گزشتہ کے رنج و غم کو حزن کہتے ہیں۔ یہ یا دنیا میں ہے یا آخرت میں ہوگا یعنی نیک کار کو نہ دنیا میں اپنی بربادی کا خوف ہو اور نہ گذشتہ پر غم' یا نیک کار بروز قیامت اگلے اندیشہ اور پچھلے غم سے بے کھٹک ہوگا۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ دنیا میں سودی مال کو برباد کرتا ہے۔ اور جس مال سے زکوٰۃ نکالی جائے اسے بڑھاتا ہے کیونکہ اکثر سود خوار کا انجام فقر ہے۔ سود خوار کو لوگ برا جانتے ہیں اسے کوئی امین سمجھ کر اپنی امانت نہیں سونپتا۔ اسے ہر ایک فاجر و فاسق کہتا ہے۔ وہ فقراء اور غرباء جو اس کے ہاتھوں تباہ ہوئے۔ دن رات اس پر لعنت کرتے' بددعا دیتے ہیں اور اس کے مال پر ہر ظالم دچور دست درازی کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ پیسہ اس کی محنت کا جمع کیا ہوا نہیں۔ مگر سخی کے مال میں بہت برکت ہوتی ہے کیونکہ وہ

جب اللہ کے بندوں کی پرورش کرتا ہے تو رب تعالیٰ ضرور اس پر کرم فرماتا ہے روزانہ اس کی عزت بڑھتی ہے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ دل اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ فقراء اور مساکین اس کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور ایسے آدمی کے مال پر ظالم اور چور نظر کم کرتے ہیں یا اللہ تعالیٰ آخرت میں سود خوار کو ہلاک کرے گا کہ اس کا صدقہ، حج، جہاد، صلہ رحمی سب برباد ہوگا کیونکہ اس نے ساری نیکیاں سودی پیسہ سے کیں۔ خراب تخم سے پھل بھی خراب ہوتے ہیں۔ اس کا مال نہ اسے موت کے وقت کام آئے نہ بعد موت، جب حلال مال جمع کرنے والے امراء پانچ سو برس بعد جنت میں جائیں گے تو اس حرام خوار غنی کا کیا پوچھنا۔ رہا سخی تو اللہ اس کے صدقے قبول فرمائے گا۔ اسے بڑھائے گا۔ اس کے صدقات جاریہ سے بعد موت بھی اسے ثواب ملتا رہے گا۔ رب تعالیٰ کسی ناشکرے گنہگار یا کسی اڑیل کافر اور ضدی گنہگار سے راضی نہیں لہٰذا سود کو حلال جاننے والا کافر یا سود خوار مجرم بارگاہ الٰہی کا مجرم ہے اور جو ایمان لائے اور انہوں نے بقدر طاقت نیکیاں کیں۔ خصوصاً نماز کے پابند رہے، زکوٰۃ دیتے رہے۔ ان کا ثواب ان کے رب کے نزدیک محفوظ ہے جو نہ گھٹے نہ برباد ہو نہ انہیں دنیا میں آئندہ کا خطرہ ہو اور نہ گذشتہ کا غم یا آخرت میں ان پر کوئی خطرہ واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ کسی مقصود کے فوت ہو جانے سے مغموم ہوں گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حلال میں برکت ہے، حرام میں بے برکتی سود خوار اگرچہ مالدار ہو جائے مگر برکت سے محروم ہے کتیا سال میں چھ بچے دیتی ہے اور کوئی ذبح نہیں ہوتا۔ بکری، گائے بھینس سال میں ایک یا دو بچے دیتی ہیں اور روزانہ ہزاروں ذبح ہوتی ہیں مگر ریوڑ بکری اور گائے بھینس کے نکلتے ہیں نہ کہ کتے کے، کیونکہ وہ حلال ہیں، اور یہ حرام، خیال رہے کہ کثرت و برکت میں فرق ہے۔ کثرت کے معنی ہیں زیادتی، برکت کے معنی جم جانا نہ نکلنا تھوڑی سی نعمت مبارک ہو تو بہت فائدہ دیتی ہے۔ برکت والی تھوڑی بارش رحمت ہے اور کثرت کی بارش کبھی عذاب بھی بن جاتی ہے یوں یہ سود سے اگرچہ کبھی مال کی کثرت ہو جاتی ہے اور یہ کثرت بھی باعثِ عذاب ہوتی ہے مگر اس سے برکت مٹ جاتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت بالکل برحق ہے۔ **دوسرا فائدہ:** جس چیز میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہو اسے شریعت منع کر دیتی ہے۔ دیکھو سود میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نقصان زیادہ لہٰذا حرام کر دیا گیا۔ شراب اور جوئے کے بارے میں رب فرماتا ہے وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (بقرہ: ۲۱۹) **تیسرا فائدہ:** کوئی مسلمان خیرات سے غریب نہیں ہو سکتا اور سود سے مالدار نہیں ہوتا۔ دیکھا گیا ہے کہ سود خوار کی اولاد سودی مال سے نفع کم اٹھاتی ہے۔ اس کا انجام خواری و بربادی ہے (روح البیان) دیکھا گیا ہے کہ مسلمان اگر جوئے میں کبھی جیت بھی جائے تو یہ جوے کا جیتا ہوا اس کا اپنا اصلی مال لے آتا ہے کہ پھر جواری کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ زیادہ جواء کھیلتا ہے اور بہت سا مال ہار جاتا ہے جیسا کہ بارہا کا تجربہ ہے۔ **چوتھا فائدہ:** کامیابی کیلئے ایمان و اعمال دونوں ضروری ہیں۔ جیسا کہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** مسلمان کو نیکیوں کا بدلہ آخرت میں ملے گا کہ دنیا میں کچھ نفع پہنچ جائے تو یہ اجر نہیں بلکہ رب کا فضل ہے جیسا کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** اعمال ایمان میں داخل نہیں کیونکہ یہاں عمل کا ایمان پر عطف کیا

گیا اور معطوف معطوف الیہ کا غیر ہوتا ہے۔ لہٰذا بدترین فاسق بھی مومن ہے۔ **ساتواں فائدہ:** نماز و زکوٰۃ افضل عبادات ہیں۔ اسی لئے نیکیوں کے بعد ان کا ذکر خصوصیت سے ہوا علمائے کرام فرماتے ہیں کہ جو کوئی نماز و زکوٰۃ درست کرے۔ رب تعالیٰ اس کے باقی اعمال بھی درست فرمائے گا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود کا انجام بربادی ہے مگر تجربہ یہ ہے کہ سود خوار خوب پھولتے پھلتے ہیں۔ انگریز' ہندو' مہاجن' یہودی سب ہی سود خوار ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی برباد نہ ہوا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ آیت آخرت کے متعلق ہے۔ یعنی سود خوار کی مالی عبادات قیامت میں برباد ہوں گی۔ جیسا کہ صدقہ کی زیادتی آخرت میں محسوس ہوگی۔ دوسرا یہ کہ آیت مسلمانوں کے لئے ہے تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمان کو سود پھلتا ہی نہیں۔ بیشک پاخانہ کا کیڑا گھو کھا کر جیتا ہے' بلبل اس سے زندگی نہیں گزار سکتی۔ سود پاخانہ ہے اور کفار اس کے کیڑے۔ مسلمان بلبلیں۔ انہیں سود پھلتا نہیں۔ ہماری غذا حلال پھول ہیں۔ جیسا کہ ہر جانور کی غذا جداگانہ ہے اور وہ اپنی ہی غذا کھا کر جی سکتا ہے بکری گوشت نہیں کھا سکتی۔ کتے چارہ نہیں چر سکتے۔ اگر ایسا کریں گے تو جان گنوا دیں گے۔ ایسا ہی مومن و کافر کی غذائیں مختلف ہیں۔ مومنوں کی غذا حلال۔ طیب غذائیں دواس سے پھولے گا کافر حرام غذا سے پلے گا۔ ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں شعر۔

اپنی ملت کو قیاس اقوام ملت پر نہ کر ہے جدا تعمیر میں قوم رسول ﷺ ہاشمی

تیسرا یہ کہ یہ قاعدہ اکثریہ ہے نہ کہ کلیہ' چوتھا یہ کہ یہاں قومی ہلاکت مراد ہے نہ کہ شخصی کہ اگر سود کا عام رواج ہو جائے تو مالدار بنیں گے تو فقراء برباد ہوں گے اور فقراء کی بربادی قوم کی بربادی ہے۔ نیز سود خوار تجارتی خطرات اور مشقتیں برداشت نہیں کر سکتا۔ جب آرام سے مال ملے تو محنت کیوں کرے۔ لہٰذا سود کا رواج' تجارتوں کی تباہی اور بازاروں کی بے رونقی کا ذریعہ ہے۔ جس سے عالم کی بربادی ہے یہ ساری سود خوار قومیں تجارتیں بھی کرتی ہیں۔ ان کی بقا تجارت سے ہے نہ کہ محض سود سے۔

دوسرا اعتراض: آج کل بغیر سود تجارت نہیں چل سکتی۔ اب سود کی ممانعت طاقت سے زیادہ تکلیف ہے۔ مسلمان کی پستی کا سبب سود کی ممانعت اور زکوٰۃ کی فرضیت ہے (عام نیچری) **جواب:** یہ محض شیطانی دھوکہ ہے۔ ہمیشہ سے مسلمانوں نے کروڑوں روپے کے بیوپار کئے اور سود بالکل نہ لیا' عثمان غنی' امام ابو حنیفہ اور حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تجارتیں۔ اور ان کے خزانوں کی وسعتیں دنیا میں مشہور ہیں۔ یہ حضرات سود کے قریب بھی نہ گئے۔ اب بھی کاٹھیاواڑ اور پنجاب میں بعضے بڑے بڑے تاجر سودی لین دین سے بالکل دور ہیں اور بڑے مزے میں ہیں۔ آج کل مسلمانوں کی پستی زکوٰۃ کی فرضیت اور سود کی ممانعت سے نہیں۔ یہ دونوں مسئلے تو ہمیشہ سے موجود تھے۔ مگر مسلمانوں کی پستی ایک صدی سے ہوئی۔ اس کا سبب جوانوں کی بیکاری' آرام طلبی' قرض کی عادت' اور بچوں کی آوارگی ہے نہ کہ احکام شرعیہ اور ہر بربادی کی اصل دین سے آزادی ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ثواب کا مستحق وہ ہے جسے ایمان و نیک اعمال دونوں میسر ہوں تو چاہیے کہ جو مسلمان نیکیاں نہ کر سکیں۔ مثلاً عورت بالغہ ہوتے ہی حائضہ ہو جائے اور حیض سے فارغ ہوتے ہی مر جائے' یا کوئی بالغ ہوتے ہی دیوانہ ہو جائے۔ وہ ثواب کا مستحق نہ ہو حالانکہ یہ احادیث کے خلاف ہے۔ **جواب:**

اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ اعمال سے بقدر طاقت اعمال مراد ہیں یا یہ کہ اس مجموعہ میں سے ہر ایک ثواب کا سبب ہے نہ کہ پورا مجموعہ (کبیر) خیال رہے کہ اسلام میں پہلے صرف ایمان ہی فرض ہوا ظہور نبوت سے گیارہ سال تک کوئی حکم شرعی مسلمانوں پر نہ آیا۔ گیارہویں سال معراج میں صرف نماز آئی پھر بعد ہجرت زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بہت آہستگی سے آئے۔ اس عرصہ میں نجات وبخشش حصول جنت کے لئے صرف ایمان ہی کافی تھا۔ پھر اعمال آتے گئے اور مسلمانوں پر لازم ہوتے گئے۔ اب بھی غریب کی نجات صرف بدنی عبادات سے ہے۔ امیر کی نجات بدنی ومالی دونوں عبادات سے جن میں جہاد کی طاقت ہو۔ ان کی نجات جہاد سے ہے وغیرہ وغیرہ۔ **چوتھا اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ دوسرے صدقات کے لئے اَنۡفِقُوۡا یا یُنۡفِقُوۡنَ ارشاد ہوتا ہے بمعنی خرچ کرنا مگر زکوٰۃ کے لئے آتُوۡ یا یوتون فرمایا جاتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** اس لئے کہ دیگر صدقات میں صرف خرچ کر دینا کافی ہے جیسا بھی ہو مگر زکوٰۃ دینا یعنی فقیر کو مالک کر دینا ضروری ہے۔ دینا بغیر لینے کے نہیں پایا جاتا۔ اس لئے زکوٰۃ کے لئے یُوۡتُوۡنَ ارشاد ہوتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

نفع ونقصان نتیجے کے اعتبار سے ہے۔ سودی مال چونکہ رب کی مخالفت سے حاصل ہوا۔ لہٰذا اس کا انجام نقصان ہے چونکہ سود خوار سارے گناہ کرتا ہے لہٰذا اس کی سزا سب گناہوں سے بڑھ کر' کیونکہ جیسی غذا' ویسا نتیجہ حرام غذا سے حرام فعل صادر ہوتے ہیں۔ مکروہ غذا سے مکروہ فعل' مباح غذا سے مباح افعال' بہتر غذا سے' بہترین اعمال کی توفیق ملتی ہے لہٰذا سود خوار پر سود کا گناہ بھی ہے' اور ان حرام افعال کا بھی' جو سود کھانے سے پیدا ہوئے' حدیث شریف میں ہے کہ پچھلا گناہ اگلے گناہ کی سزا ہوتا ہے اور اس کے بُرے نتائج بڑھتے رہتے ہیں۔ سود خوار اپنے مال کا نتیجہ نہ زندگی میں دیکھے نہ قبر میں' نہ آخرت میں' مگر صدقہ اس باغ کی طرح ہے' جس کے پھل ہمیشہ کھائے جائیں اور اس کی جڑ ہمیشہ محفوظ رہے۔ یہ بھی معنے ہیں سود کی بربادی اور صدقہ کی برکت کے سخی کا مال' اس کی اولاد اور مسلمانوں میں باقی رہتا ہے۔ اس کی مسجدوں میں نمازیں ہوتی ہیں۔ اس کی سراؤں میں مسافر آرام پاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنے مال کا پھل' زندگی' قبر اور حشر میں پاتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اپنی غذا سنبھالو تا کہ سارے اعمال سنبھل جائیں (از ابن عربی) صوفیاء فرماتے ہیں کہ جنت اور وہاں کی نعمتیں ہمارے اعمال کی جزا مگر دیدار الٰہی کسی عمل کا بدلہ نہیں بلکہ محض رب تعالیٰ کا فضل ہے اور جیسے تخم اچھی زمین میں بو دو تو پھل اعلیٰ پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی زکوٰۃ وغیرہ کا اجر عند اللہ یعنی اللہ کے نزدیک ہے اس کا پھل بھی بہت زیادہ اور جیسے سرکاری بنک میں مال ضائع نہیں ہوتا۔ ایسے ہی رب کے بنک کا جمع شدہ مال برباد نہیں ہوتا۔ مال ہو یا اعمال جزاء کا استحقاق از روئے قانون اس کو ہے جو عمل کرے بغیر عمل جزا کی امید خیال خام ہے۔ تخم بو کر کاٹنے کی امید کرو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوۡا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۷۸﴾
اے وہ لوگو جو ایمان لائے ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو وہ جو باقی رہ گیا سود سے اگر ہو تم ایمان لانے والے
اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود اگر مسلمان ہو

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ
پس اگر نہ کرو تم تو مطلع ہو جاؤ ساتھ لڑائی کے اللہ سے اور رسول سے اس کے سے اور اگر تم توبہ کرو پس
پھر اگر ایسا نہ کرو تو یقین کرلو اللہ اور اللہ کے رسول سے لڑائی کا اور اگر تم توبہ کرو
رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾
واسطے ہے تمہارے اصل مالوں تمہارے کا نہ ظلم کرو گے تم اور نہ ظلم کئے جاؤ گے
تو اپنا اصل مال لے لو نہ تم کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ تمہیں کوئی ہو

تعلق

اس آیت کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں آئندہ سود لینے سے ممانعت کی گئی تھی۔ اب پچھلا چڑھا ہوا سود وصول کرنے سے منع فرمایا جارہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا فَلَهٗ مَا سَلَفَ۔ کہ جو آئندہ سود سے باز رہے تو اس کے لئے گذشتہ سود حلال ہے۔ اس سے دھوکہ پڑھ سکتا تھا کہ پچھلا غیر مقبوض سود بھی وصول کرنا جائز ہے اس آیت میں یہ وہم دور کیا جارہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے وہم ہوسکتا تھا کہ جو کوئی ممانعت سے پہلے اپنے اصل مال کے برابر یا اس سے زیادہ سود وصول کر چکا ہو وہ اب ممانعت کے بعض مقروض سے اپنا اصلی مال بھی نہ لے اس آیت میں یہ شبہ دور کیا جارہا ہے کہ نہیں اصل مال لے سکتا ہے۔ پچھلے سود میں نہ کٹے گا۔

شانِ نزول

اس کے شانِ نزول میں چند روایتیں ہیں۔ (۱) کفارہ مکہ سود کے بہت عادی تھے۔ جب فتح مکہ کے دن اسلام لائے اور حرمت سود کے احکام سنے تو انہوں نے چاہا کہ آئندہ باز رہیں مگر پچھلا وصول کرلیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری (کبیر) (۲) قبیلہ بنی ثقیف میں چار بھائی تھے مسعود، عبد یالیل، حبیب اور ربیعہ، یہ لوگ بنی مغیرہ کو سودی قرض دیا کرتے تھے۔ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لے آئے۔ تب انہوں نے بنی مغیرہ سے اپنا پچھلا سود مانگا، انہوں نے کہا، قسم رب کی ہم نہ دیں گے کیونکہ سود حرام ہو چکا۔ یہ مقدمہ حضرت عتاب ابن اسید کی کچہری میں آیا۔ حضرت عتاب نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں یہ واقعہ لکھا تب یہ آیت کریمہ اُتری، اور ان چار بھائیوں کو سود لینے سے روک دیا گیا۔ (خازن وکبیر) (۳) حضرت عباس اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما نے ممانعت سود سے پہلے کچھ کھجوریں سود پر قرض دی تھیں۔ جب مقروض کے باغ کے پھل کٹے تو انہوں نے کچھ لے لئے، کچھ باقی رہے۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری (کبیر) حضرت عباس اور خالد ابن ولید شرکت میں تجارت کرتے تھے اور سودی لین دین بھی کیا کرتے تھے۔ ان صاحبوں کا مقروض پر بہت مال پھیلا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں یہ آیت کریمہ آئی۔ (کبیر وروح المعانی)

تفسیر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ۔ چونکہ سود اہل عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ نفس کو یہ مفت کی آمدنی پسند بھی تھی جس کا چھوڑنا

نفس پر گراں تھا۔ اس لئے رب نے پہلے پیارے خطاب سے پکارا' پھر حکم دیا تا کہ خطاب کی مدت سے مشکل حکم آسان ہو جائے۔ یعنی اے لوگو جو ایمان لا کر ہمارے وفادار بندے بن چکے ہو۔ ہم جو کہیں سنو سود چھوڑ دو۔ اگر چہ اسلامی حکومت میں کفار کو بھی مسلمانوں سے سود لینے کی اجازت نہیں مگر چونکہ مسلمانوں کا سود چھوڑنا کفار کے لئے عملی تبلیغ ہوگی۔ اس لئے خصوصیت سے انہیں ہی حکم دیا۔ اِتَّقُوْا۔ وَقْیٌ' یا وَقَایَۃٌ سے بنا۔ اس کے معنی ڈرنا بھی ہیں۔ بچنا بھی۔ اگر یہاں بچنے کے معنی میں ہو تو عذاب پوشیدہ ہوگا۔ یعنی اے مسلمانوں اللہ سے ڈرو' یا اللہ کے عذاب سے بچو' یا اپنی جانوں کو اللہ کے عذاب سے بچاؤ (روح المعانی و روح البیان) وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا۔ وَذَرُوْا امر ہے محققین کے نزدیک اس کا کوئی مصدر نہیں بلکہ یہ ترکٌ کا امر ہے جیسے ذُوْ کی جمع اُذُوْ (لغات فیروزی) بعض کا خیال ہے کہ اس کا مصدر ذرءٌ ہے اور ذرءٌ و ودءٌ دفع کرنے' پھینکنے چھوڑنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے ذوراءٌ ہے۔ یہ اصل میں اذرءٌ تھا۔ کُلُوْا اور مردا کی طرح اس کے دونوں ہمزہ تخفیف کے لئے گرادیئے گئے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ ذرءٌ بمعنی خَلَقَ آتا ہے۔ جیسے ذَرَءَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ (انعام:۱۳۶) ما موصولہ ہے اور بقی سے باقی ماندہ سود مراد ہے۔ خواہ بالکل باقی ہو' یا کچھ لے لیا ہو اور کچھ باقی۔ من بیانیہ ہے۔ یا تبعیضیہ' الرِّبوا کا الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے۔ دراصل مِنْ رِبَاکُمْ تھا۔ یعنی تمہارا جو سود مقروضوں پر باقی ہوا اسے چھوڑ دو۔ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ یہاں مومنین سے حقیقی مسلمان یا مطیع یا متقی مراد ہیں۔ اور اٰمَنُوْا سے ہر ظاہری مومن یعنی اگر تم مخلص مومن یا مطیع یا متقی ہو' تو اب سود نہ لینا۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا۔ تَفْعَلُوْا کا مفعول پوشیدہ ہے یعنی ترک سود۔ اگر تم بقیہ سود لینے سے پرہیز نہ کرو خواہ حرام جانتے ہوئے یا حرمت کے منکر ہو کر لَمْ تَفْعَلُوْا میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ صرف سود خواروں سے خطاب ہو' دوسرا یہ کہ سود دینے والوں سے خطاب ہو۔ تیسرا یہ کہ دونوں ہی سے خطاب ہو۔ یعنی اے سود خوارو اگر تم نے سود لینا نہ چھوڑا یا اے مسلمانو اگر تم نے سودی قرض لینے اور سود دینے کی عادت نہ چھوڑی' یا اے لوگو اگر تم نے سود کا لین دین نہ چھوڑا' مگر پہلا احتمال زیادہ قوی ہے کہ پہلے سود خواروں سے خطاب تھا۔ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ فَاْذَنُوْا' اذن سے بنا' بمعنی سننا' اسی لئے کان کو اذن کہتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال ہر سنی بات میں ہونے لگا۔ اجازت کو اذن' اطلاع اور اعلانِ نماز کو اذان کہتے ہیں۔ پھر ہر علم کو اذن کہا جانے لگا۔ یہاں تیسرے معنی میں استعمال ہوا' ہماری قرأت میں فَأْذَنُوْا ذال کے زبر سے ہے۔ یعنی جان لو' یا اطلاع پالو' یقین کرلو' ایک قرأت میں فَاٰذِنُوْا الف کے مد اور ذال کے زیر سے ہے یعنی منکرین کو بتادو۔ اٰذَنْتُکُمْ عَلٰی سَوَآءٍ (انبیاء:۱۰۹) (کبیر) حرب سے یا اخروی مقابلہ مراد ہے یا دنیوی اور یا یہ کلمہ ڈرانے اور باز رکھنے کے لئے استعمال ہوا' مِنَ اللّٰہِ کا متعلق پوشیدہ ہے۔ کائنٍ یہ حرب کی صفت ہے یعنی تم اللہ و رسول سے اخروی یا دنیوی جنگ کا یقین کرلو' کہ تمہیں آخرت میں عذاب بھی ہوگا اور دنیا میں قتل و غارت بھی۔ جیسا کہ ہم انشاء اللہ فوائد میں عرض کریں گے۔ خلاصہ مضمون یہ ہے کہ تم غور کرلو' کیا تم اللہ اور رسول سے لڑسکتے ہو' یا کیا تم اس کے عذاب کو برداشت کر سکتے ہو' ہر گز نہیں کر سکتے۔ تم سے مکھی' مچھر و چیونٹی کا مقابلہ بھی نہیں ہو سکتا اور تم ایک معمولی سی بیماری برداشت نہیں کر سکتے' تو گناہ کس ہمت و دلیری پر کرتے ہو۔ لہٰذا تم توبہ کر کے معافی چاہ لو' ہم بخش دیں گے۔ مجبور کو عاجزی لازم ہے۔ وَاِنْ تُبْتُمْ یہ لفظ توبٌ سے بنا' بمعنی لوٹنا' رجوع کرنا' بندے کے حق میں گناہ سے رجوع کرنا' اور رب کے حق میں عذاب سے رجوع

توبہ ہے۔ یعنی اگر تم اس ارادہ سے باز آ جاؤ تو فَلَكُمْ رُءُوسُ اَمْوَالِكُمْ۔ لَكُمْ کا متعلق پوشیدہ ہے۔ جاز یا ثبت یا احل۔ رؤس راس کی جمع ہے۔ بمعنی سر۔ یہاں اصل مراد ہے جو بطور قرض مقروض کو دیا گیا تھا چونکہ سر سے تمام جسم کی بقا ہے۔ ایسے ہی اصل قرض پر سود کا دارومدار۔ اس لئے اسے رأس المال کہتے ہیں۔ یعنی تمہارے لئے اپنا اصل مال لینا جائز ہے۔ گذشتہ لئے ہوئے سود میں نہ کٹے گا۔ چونکہ بنی ثقیف کے چند قسموں کے مال قرض تھے۔ یا چند لوگوں نے قرض دے رکھا تھا۔ اسی لئے یہاں اموال جمع فرمایا گیا۔ غرض کہ مال کا جمع لانا یا قرض خواہوں کی کثرت کی وجہ سے ہے یا خود مال کی۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ یہ ظلم سے بنا جس کے معنی بارہا بیان ہو چکے۔ پہلے تُظْلِمُوْنَ کا مفعول بہ پوشیدہ ہے یہ جملہ یا مستقل ہے یا لَكُمْ کی ضمیر سے حال یعنی نہ تم مقروضوں پر زیادتی کرو کہ اصل قرض سے زیادہ کا مطالبہ کرو اور نہ ان کی طرف سے تم پر ظلم کیا جائے کہ وہ تمہارے اصل مال میں کمی کریں۔ یا بلا وجہ ادائے قرض میں دیر لگائیں۔ یا تو یہ بمعنی نہی ہے یا نفی۔

خلاصہ تفسیر

اے وہ لوگو جو بظاہر مومن ہو چکے تم اللہ سے ڈرو اور اس کے عذاب سے بچو اور تمہارے مقروضوں پر جو کچھ تمہارا سود باقی رہ گیا ہے وہ ایک دم چھوڑ دو اگر تم مخلص مومن ہو کیونکہ ایمان کا تقاضا اطاعت ہے اگر تم اس پر عمل نہ کرو تو اللہ اور رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔ یعنی تم پر دنیا میں جہاد بھی ہوگا اور آخرت میں عذاب بھی۔ اور اگر تم اس بدعقیدگی یا بدعملی سے توبہ کر لو اور آئندہ سود لینے کا ارادہ چھوڑ دو تو تم کو تمہارے اصل مال جو مقروض پر ہیں مل جائیں گے اس قانون کے بعد نہ تم کسی مقروض پر ظلم کرو نہ سود وصول کرو یا مسکین کو نہ دو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے کہ تمہارے اصل مال میں کمی کی جائے یا بلا وجہ ٹال مٹول کی جائے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** سود خوری سخت گناہ ہے۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ دو جرموں کے سوا کسی گناہ پر رب کی طرف سے اعلان جنگ نہیں دیا گیا۔ ایک سود لینا دوسرا اولیاء اللہ سے عداوت رکھنا حدیث پاک میں ہے کہ حضور ﷺ نے چند لوگوں پر لعنت فرمائی سود لینے والا سود دینے والا سود لکھنے والا سود کا گواہ نیل سے بدن پر داغ لگوانے والا زکوٰۃ نہ دینے والا طلاق مغلظہ میں حلالہ کرانے والا جبکہ زبان سے حلالہ بولے مرتد اور ماں باپ کا نافرمان یتیم کا مال ظلماً کھانے والا جاندار کا فوٹو کھینچنے والا (درمنثور) دوسری روایت میں ہے کہ سود خوری سے قحط سالی اور رشوت سے عیب اور بدکاری سے وبا پھیلتی ہے (احمد) **دوسرا فائدہ:** صحابہ کرام اور حضور ﷺ کو رب تعالیٰ سے وہ خصوصی قرب حاصل ہے کہ ان سے جنگ رب سے جنگ ہے اور ان سے صلح رب سے صلح ہے۔ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ میں اگر دنیا میں جنگ مراد ہو تو ظاہر ہے کہ سود خوروں کی لڑائی تو حضور ﷺ سے اور صحابہ کرام سے ہوگی مگر رب نے فرمایا کہ اللہ سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ان سے لڑنا گویا اللہ سے لڑنا ہے ایسے ہی ان سے صلح رب تعالیٰ سے صلح ہے۔ **تیسرا فائدہ:** اگر سود خوار سود پر اڑ جائے تو حاکم جبراً اس سے سود چھڑائے اگر وہ حاکم کا مقابلہ کرے تو اس پر جہاد کیا جائے کیونکہ اگر وہ سود کی حرمت کا منکر ہے تو مرتد ہے ورنہ باغی جیسا کہ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ سے معلوم۔ ہر مسئلہ شرعی کا یہی حکم ہے۔ اسی لئے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ نہ دینے والوں پر لشکر کشی فرمائی حالانکہ ان میں سے بعض فرضیت زکوٰۃ کے منکر نہ تھے بلکہ مال ظاہری کی

زکوٰۃ سلطان اسلام کو دینا نہ چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جو مجھے بکری کا بچہ بھی نہ دیں گے میں ان پر جہاد کروں گا۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قوم اذان یا مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دے' تو ان سے حاکم جنگ کرے کہ وہ باغی ہیں۔ (روح البیان و کبیر وغیرہ) یہ سب مسائل بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ سے معلوم ہوئے کیونکہ یہاں بِحَرْبِ اللّٰهِ نہ فرمایا۔ بلکہ بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ فرمایا۔ **چوتھا فائدہ:** جو مقروض بلا وجہ ادائے قرض میں دیر لگائے وہ ظالم ہے۔ حاکم جبراً اس سے قرض ادا کرائے ورنہ اسے قید کر دے۔ جیسا کہ وَلَا تُظْلَمُوْنَ سے معلوم ہوا۔ (روح المعانی) فقہ میں مقروض کے احکام کی بہت تفصیل ہے۔ ہم نے بلا وجہ کی قید اس لئے لگائی کہ دیوالیہ مقروض کا نہ نکل جائے۔ **پانچواں فائدہ:** جو قرض خواہ سود لینا چاہے وہ بھی ظالم ہے۔ حاکم اسے اس ارادہ سے جبراً روک سکتا ہے۔ جیسا کہ لَا تُظْلَمُوْنَ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** اسلام کے بعد زمانہ کفر کے گناہ مٹ جاتے ہیں۔ مگر آئندہ گناہ سے روکا جائے گا۔ لہٰذا جو حربی کافر سودی لین دین کے بعد اسلام لائے تو اس پر گذشتہ سود واپس کرنا واجب نہ ہوگا ہاں زمانہ کفر کے قرض پر اب سود نہ لے سکے گا۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ اس آیت سے صدہا احکام کفار مستنبط ہو سکتے ہیں مثلاً اگر کافر نے سود یا شراب پر نکاح کیا اور پھر مسلمان ہو گیا تو اگر یہ مہر ادا کر چکا تو جائز ہے۔ اگر ادا نہ کر چکا ہو تو اب وہ خنزیر پر شراب نہیں دے سکتا۔ یہ تمام مسائل۔ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ سے معلوم ہوئے۔ **ساتواں فائدہ:** دار الحرب کے فاسد عقود فسخ نہ کئے جائیں گے۔ ہاں آئندہ کیلئے بند کر دیئے جائیں گے (احکام القرآن) **آٹھواں فائدہ:** کفار کے خلاف قاعدہ اسلامی نکاح باقی رکھے جائیں گے۔ لہٰذا اگر شوہر و بیوی مسلمان ہو جائیں تو انہیں دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا پہلا نکاح قائم رہے گا اگرچہ بغیر مہر بغیر ایجاب قبول ہوا ہو۔ **نواں فائدہ:** اگر تجارت میں قبضہ سے پہلے مفسد پایا جائے تو بیع باطل ہے اور قبضہ کے بعد پایا جائے تو بیع درست ہوگی۔ مثلاً دو کافروں نے آپس میں شراب کی بیع کی اور قبضہ سے پہلے مسلمان ہو گئے تو بیع فاسد ہے اور اگر قبضہ کے بعد اسلام لائے تو بیع درست ہے کہ تاجر روپیہ اپنے استعمال میں لائے اور خریدار شراب کا سرکہ بنائے۔ ایسے ہی اگر مسلمان نے شکار خرید کر احرام باندھا تو اگر قبضہ سے پہلے احرام باندھا ہو تو بیع فاسد ہے۔ ورنہ درست (احکام القرآن) دیکھو اسی آیت نے مقبوض سود کو حلال رکھا اور غیر مقبوض سے روک دیا۔ یہ سارے احکام اسی سے مستنبط ہوئے۔ **مسئلہ:** کافر نے بحالتِ کفر شراب ادھار بیچی۔ اگر قبضہ دے کر مسلمان ہوا تو خریدار سے قیمت وصول کرے ورنہ بیع فاسد ہوگئی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود خور کافر ہے کیونکہ اسے رب نے اعلان جنگ دیا۔ حالانکہ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ بدعملی کفر نہیں؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں لَمْ تَفْعَلُوْا سے مراد سود کو حلال جان کر اس سے باز نہ رہنا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کافر ہو گیا' دوسرا یہ کہ یہ اعلان جنگ ڈرانے کے لئے ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ریاء شرک ہے یا اولیاء اللہ سے مخالفت کرنے والے کو رب کا اعلانِ جنگ ہے یا حضور ﷺ نے علی اور فاطمہ زہرہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم سے فرمایا۔ اَنَا حَرْبٌ لِّمَنْ حَارَبْتُمْ ان سب صورتوں میں گناہ پر اعلان جنگ دیا گیا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** فَاِنْ تُبْتُمْ سے معلوم ہوا کہ جو سود نہ بچے اسے اس کا راس مال بھی نہ دیا جائے یہ تو ظلم

ہے؟ **جواب:** بے شک اگر سود کو حلال جانتا ہے تو مرتد ہے اس کا راس جسم (سر) بھی نہ بچے گا۔ چہ جائیکہ راس المال اور اگر حرمت سود کا منکر نہیں اور بادشاہ اسلام کا مقابلہ کرتا ہے تو باغی ہے اور باغی کا مال توبہ سے پہلے اسے نہیں ملتا' بلکہ یہ سلطان کے پاس امانتاً محفوظ رہتا ہے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بالکل ضبط ہو جاتا ہے۔ (روح المعانی)

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود خوار سے قتال کیا جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ کسی مسلمان کو بجز تین صورتوں کے قتل کرنا جائز نہیں۔ ارتداد' قتل' اور زنا۔ اس حدیث اور آیت میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اگر سود خوار سود حلال سمجھ کر اس پر اڑتا ہے تو مرتد ہے۔ اس سے ایسا ہی جہاد کیا جائے جیسا کفار سے اور اگر سود کو حرام تو سمجھتا ہے مگر چھوڑتا نہیں تو سلطانِ اسلام جبراً اسے روکے اگر وہ جبر کو نہ مانے اور گروہ بنا کر مقابلہ کرے تو باغی ہے۔ اس سے ایسی جنگ کی جائے گی جیسے باغیوں سے' غرض بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کی دو نوعیتیں ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** سود میں ایسی کونسی خصوصیت ہے کہ سود خوار کو اعلان جنگ دیا گیا۔ شرابی' جواری' بے نماز سب ہی گنہگار ہیں۔ انہیں اعلان جنگ نہیں؟ **جواب:** حقوق دو قسم کے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق مخلوق۔ دیگر گناہ میں یا صرف رب کی حق تلفی ہے یا کسی خاص بندہ کی' مگر سود میں خالق و مخلوق دونوں ہی کی حق تلفی ہے کہ سود خوار رب کی مخالفت' شریعت کا مقابلہ کرتے ہوئے عام خلق کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا سزا بھی اس کی سخت ہوئی۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود خوار توبہ کرنے کے بعد اصل قرض مقروض سے لے گا۔ اگرچہ توبہ سے پہلے وہ قرض سے کہیں زیادہ وصول کر چکا ہو تو کیا اب بھی سود خوار کو یہ رعایت ملے گی کہ پہلے تو خوب سود وصول کرے پھر توبہ کر کے پورا قرض بھی لے لے اس پر تو یہ شعر صادق آتا ہے۔

رات بھر مے پی اور پھر صبح کو توبہ کر لی رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

جواب: ہرگز نہیں یہ رعایت صرف اس وقت کے لئے ہے جب کہ حرمت سود کا قانون بننے سے پہلے لوگوں نے سود لے لیا تھا اور وہ سود اسی وقت ان کے لئے جائز تھا۔ اب جبکہ سود حرام ہو چکا ہے تو جو بھی لے گا حرام ہی لے گا اور اب توبہ کرنے پر لیا ہوا سود وضع کرنا پڑے گا اور اگر قرض سے زیادہ لے چکا ہے تو واپس کرنا ہوگا۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت میں ارشاد ہوا کہ اگر تم توبہ کر لو تو بھی اصل قرض ملے گا۔ ان لوگوں نے اس وقت گناہ کونسا کیا تھا۔ جس سے توبہ کرائی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے جو سود لیا تھا وہ تو گناہ تھا ہی نہیں کہ اس وقت سود حلال تھا۔ اس سے توبہ کرانے کے کیا معنی؟ **جواب:** بنی ثقیف کے ان چار صاحبوں نے حرمت سود کے بعد گزشتہ قرض کا سود لینا چاہا تھا یہ جرم تھا کہ ارادہ گناہ ہے۔ اس سے یہاں توبہ کا حکم دیا' یا توبہ سے مراد ہے آئندہ سود سے بچنے کا عہد۔

تفسیر صوفیانہ

سود کی حرمت صرف مال میں ہی نہیں بلکہ ہر چیز میں ہے۔ اعضائے ظاہری و باطنی سے جائز کام لینا حلال اور ان سے حرام کام لینا گویا سود ہے۔ اور حرام۔ یہاں حکم ہو رہا ہے۔ کہ اے غافل مسلمانو تم زمانہ غفلت میں اپنے اعضاء سے جو کچھ حرام کام کر چکے۔ اب ہوش آنے پر اس سود خوری سے بچو اور گزشتہ گناہوں کا اثر مٹا دو یہ مت سمجھو کہ۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

جو دم ملے غنیمت جانو اور جو نیکی ممکن ہو اسے نہ چھوڑو ممکن ہے کہ ایک نیکی تمام گناہوں کو فنا کر دے۔ اگر تم ہوش آنے پر بھی اس سود خوری سے باز نہ آئے تو اب تک تو غافل مجرم ہے اور اب عاقل باغی قرار دیئے جاؤ گے کہ جان بوجھ کر رب کی نافرمانی کرتے ہو لہٰذا اللہ و رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر تم گناہوں سے توبہ کر لو تو زمانہ غفلت کی نیکیوں کے ثواب سے محروم نہ رہو گے اور ممکن ہے کہ اس توبہ کی برکت سے تمہارا گذشتہ لیا ہوا یہ سود بھی معاف ہو جائے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک رب سے ناامیدی کفر ہے بڑے سے بڑے مجرم کو رحمت الٰہی کا اعلان عام ہے کہ اب بھی آ جاؤ۔ یاد رکھو کہ اپنے اعضاء سے دنیوی کام لینے کا اسی کو حق ہے۔ جوان سے دینی کام بھی لے۔ دین سے غافل ہر وقت ظالم ہے کہ وہ اپنے پر ہر دم ظلم ہی کرتا رہتا ہے لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ نہ اپنے بدن پر ظلم کرو۔ اور نہ بروز قیامت یہ تم پر ظلم کرے۔ ورنہ سمجھ لو جزاء سیئۃ سیئۃ آج یہ اعضاء تمہارے تابع ہیں تمہارا ظلم سہہ لیں گے مگر بروز قیامت جب انہیں موقعہ ملے گا تو بارگاہ الٰہی میں تمہاری شکایت کر کے تمہیں ضرور سزا دلوائیں گے۔ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (یٰسین: ۶۵) صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جیسے مال کو صرف سنبھال کر نہ رکھو۔ اسے کاروبار میں لگا کر بڑھاؤ، جمع شدہ مال برباد ہو جاتا ہے۔ کاروبار میں لگا ہوا روپیہ بڑھتا ہے۔ پھر روپیہ حلال کاروبار میں لگاؤ۔ حرام کے ذریعہ اسے نہ بڑھاؤ۔ تجارت سے بڑھاؤ جوئے سود وغیرہ سے نہ بڑھاؤ، ایسے ہی اعضاء ظاہری اور دلی کو بیکار نہ رکھو۔ ورنہ ضائع ہو جائیں گے۔ رب نے بیکاری کے لئے یہ نعمتیں نہیں دی ہیں۔ فرماتا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (المومنون: ۱۱۵) بلکہ انہیں کام میں لگاؤ، تاکہ ان سے برکتیں نصیب ہوں، مگر پھر یہ خیال رکھو کہ انہیں ناجائز کاروبار، کفر و شرک، بدکاری فسق و فجور میں نہ پھنساؤ، ورنہ بجائے نفع کے تمہیں نقصان دیں گے جیسے سود میں لگا ہوا مال بلکہ جائز کاروبار میں اور اداء حقوق الٰہیہ و حقوق شرعیہ میں مصروف رکھو، تاکہ ان سے خاطر خواہ نفع کماؤ جیسے کچھ مال زکوٰۃ و صدقات دے کر آگے کے لئے توشہ بناتے ہیں کچھ اپنی ضروریات میں صرف کرتے ہیں۔ ایسے ہی ان ظاہری باطنی اعضاء سے کچھ اپنے کام لو کچھ آخرت کے لئے توشہ بناؤ۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

اور اگر ہو تنگی والا پس مہلت ہے آسانی تک اور یہ کہ صدقہ کرو تم بہتر ہے واسطے تمہارے

اور اگر قرض دار تنگی والا ہے تو اسے مہلت دو آسانی تک اور قرض اس پر بالکل چھوڑ دینا تمہارے لئے بھلا ہے

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ

اگر ہو تم جانتے اور ڈرو اس دن سے کہ لوٹائے جاؤ گے بیچ اس کے طرف اللہ کے پھر پورا دیا جائے گا

اگر جانو اور ڈرو اس دن سے جس میں اللہ کی طرف پھرو گے اور ہر جان کو اس کی کمائی

نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

ہر نفس وہ جو کمایا اس نے اور وہ نہ ظلم کیے جاویں گے

پوری بھر دی جاوے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مقروضوں پر ایک آسانی کی گئی تھی کہ انہیں سود کے بوجھ سے ہلکا کر دیا گیا۔ اب ان کے لئے دوسری آسانی یہ ہو رہی ہے کہ انہیں ادائے قرض میں مہلت دی جا رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عام مقروضوں کے احکام بیان ہوئے۔ اب خاص مقروض یعنی دیوالیہ کے احکام بیان ہو رہے ہیں کہ اسے اتنی مہلت دو کہ کما کر قرض ادا کر سکے۔ **تیسرا تعلق:** سود کی آیتوں سے پہلے صدقہ کی رغبت دی گئی تھی۔ اب مسلمانوں کو ایک خاص خیرات کی طرف مائل کیا جا رہا ہے یعنی معافیٔ قرض۔

شان نزول

جب پچھلی آیت نازل ہوئی تو ان چاروں ثقفی بھائیوں نے جن کے بارے میں وہ ہدایت آئی تھی کہا کہ ہم میں اللہ تعالیٰ اور حضور ﷺ سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں۔ ہم سود لینے سے توبہ کرتے ہیں۔ اپنا اصل قرض ہی لیں گے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے مقروضین بنی مغیرہ کے پاس گئے اور بولے کہ سود سب معاف ہمارا اصل قرض ادا کرو۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تو ہم تنگ دست ہیں، کچھ مہلت دو۔ آمدنی ہوتے ہی سب سے پہلے تمہارا قرض ادا کر دیں گے۔ انہوں نے انکار کیا، اور فوراً ادا کا مطالبہ کیا۔ تب یہ آیت اُتری (کبیر و روح المعانی واحمدی)

تفسیر

وَاِنۡ كَانَ ذُوۡ عُسۡرَةٍ ظاہر یہ ہے کہ کان تامہ ہے، بمعنی وقع یا ثبت اور ذُوۡ عُسۡرَةٍ اس کا فاعل اور ممکن ہے کہ کان ناقصہ ہو، اور ذُوۡ عُسۡرَةٍ اس کا اسم اور خبر اور خبر محذوف یعنی مغرماً عسرا اعسار کا ہم معنی ہے بمعنی تنگی اور مشکل ہونا۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ اعسر الرجل۔ اس کا مقابل یسر ہے بمعنی آسانی اور غنا، یعنی اگر مقروض تنگ دست ثابت ہو۔ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيۡسَرَةٍ۔ نظرۃٌ پوشیدہ مبتدا الحکم کی خبر ہے۔ یہ انظار کا ہم معنی بمعنی ڈھیل اور مہلت دینا ہے۔ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِىۡ اور اِنَّكَ لَمِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ۔ (الحجر: ۳۷) اسی سے انتظار ہے۔ غور کرنے کو بھی نظر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے لئے مہلت درکار ہے۔ اسی سے ہے مناظرہ یعنی ایک مسئلہ میں باہم غور کرنا دیکھنے کو نظر اس واسطے کہتے ہیں کہ اس میں قوت باصرہ کو اپنے کام کرنے کی ڈھیل دی جاتی ہے۔ آنکھ بند کرنے والا گویا اسے مقید کرتا ہے۔ (از کبیر) میسرہ بروزن مفعلہ یسار کا ہم معنی ہے۔ بمعنی آسانی اور غنا یا اسم ظرف ہے۔ اسی کا مادہ یسر ہے۔ یعنی پس حکم یہ ہے کہ اسے غنا تک مہلت دو۔ خیال رہے کہ یہ حکم وجوبی ہے۔ جیسا کہ انشاء اللہ فوائد میں عرض کیا جائے گا۔ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا۔ اَنۡ مصدریہ ہے۔ اور تَصَدَّقُوۡا صدقةٌ سے بنا تصدق کے معنی صدقہ دینا ہوتے ہیں مگر کبھی حق معاف کر دینے کو بھی تصدق کہا جاتا ہے۔ یہاں یہ ہی مراد ہے۔ بعض نے کہا کہ اس صدقہ سے مہلت دینا مراد ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ مہلت کا حکم تو پہلے ہو چکا۔ نیز مہلت دینا واجب اور معاف کر دینا مستحب لہٰذا صحیح یہ ہی ہے کہ اس سے قرض کی معافی مراد ہے۔ خواہ کُلا ہو یا بعضاً مگر ظاہر یہ ہے کہ کل معافی مراد ہے اسی لئے بجائے معافی کے صدقہ فرمایا گیا۔ یعنی تمہارا سارا قرض معاف کر دینا خَيۡرٌ لَّكُمۡ یہاں خیر کا متعلق پوشیدہ ہے (مِنَ الۡاِنۡظَارِ) خیر سے زیادہ ثواب مراد

ہے۔ یعنی معافی مہلت دینے سے تمہارے لئے زیادہ باعث ثواب ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر دیوالیہ مقروض کے پاس اداء قرض کے لئے پیسہ نہ ہو مگر مکان جائیداد وغیرہ ہو تو اسے مہلت دو۔ اس کی جائیداد نیلام نہ کراؤ۔ وہ اس مہلت میں کما کر تمہارا قرض ادا کر دے گا۔ اور اگر اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو معافی دیں۔ اس کا آخرت کا معاملہ صاف کر دو تم اپنے مقروض پر رحم کرو تا کہ رحم کئے جاؤ۔ غرضیکہ مہلت ایک صورت میں ہے اور معافی دوسری صورت میں۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اس فعل کا مفعول اور شرط کی جزا پوشیدہ ہے' یعنی اگر تم یہ جانتے ہو تو معافی پر عمل کرو۔ جیسے قیدی آزاد کرنا ثواب ہے۔ ایسے ہی کسی مقروض کی گردن چھوڑانا ثواب ہے کہ قرض بھی ایک قید ہے' جس میں مقروض دنیا وآخرت میں پھنسا ہوا ہے۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ۔ یہاں تقویٰ سے ڈرنا مراد ہے اور یوم سے وقت یا قیامت کا دن مراد اور یہ اتقوا کا مفعول بہ اور ممکن ہے کہ اس سے وقت موت مراد ہو۔ اِلَى اللّٰهِ سے الیٰ امر الله یا اِلٰى حفظ الله مراد یعنی اس دن یا اس وقت سے ڈرو جس میں تم رب کے حکم یا حفاظت کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور اگر خدا کی طرف ہی لوٹنا مراد ہو تو رجوع مکانی نہ ہوگا۔ بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ تم قیامت میں اس حالت میں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو گے کہ سوائے اس کے رحم وکرم کے کوئی ذریعہ دنیاوی نہیں چھڑا سکے گا اور جس دن کسی کی ظاہری بادشاہت بھی نہ ہوگی اور جہاں کوئی حیلہ بہانہ نہ بن سکے گا۔ غرضکہ مصرعہ

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے۔ اس کا سماں ہوگا

خیال رہے کہ اتقوا کا مطلب یہ نہیں کہ صرف دل میں خوف رکھو بلکہ عملی خوف مراد ہے۔ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ۔ توفی' توفیۃ سے بنا' اس کا مادہ وفاءٌ ہے' بمعنی پورا پورا دینا۔ ما کسبت کا مضاف جزاءٌ پوشیدہ ہے یعنی ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ خیر کا خیر' شر کا شر' خیال رہے کہ کسب ہر اختیاری فعل کو کہتے ہیں۔ خواہ ہاتھ سے صادر ہو یا دیگر اعضاء سے اور كُلُّ نَفْسٍ سے ہر عاقل وبالغ انسان مراد ہے کیونکہ بچے دیوانے اور جانور کے اعمال کی اخروی جزا نہیں۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ یہ جملہ کل نفس کا حال ہے اور چونکہ وہ معناً جمع تھا اس لئے ضمیر جمع لائی گئی یعنی ان لوگوں پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا کہ ان کی نیکیاں گھٹ جائیں یا گناہ بڑھ جائیں۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اگر تمہارا مقروض تنگ دست ہو اور وعدہ پر قرض ادا نہ کر سکے تو اس کو مہلت دے دو کہ جب گنجائش ہو تب ادا کرے اور ایسے فقراء مساکین سے بالکل قرض معاف کر دینا تمہارے لئے مہلت دینے سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ اگر تم اپنے قرض سے آزاد کرو گے تو رب تمہیں اپنے قرض سے آزاد کرے گا۔ اگر تمہیں اس کی خبر ہو تو تم ضرور معاف کر دو۔ تم بھی کسی کے مقروض ہو' اپنی اس پیشی کے دن سے ڈرتے رہو۔ جب تمہیں بارگاہ الٰہی میں واپس کیا جائے گا اور ہر شخص کو اس کے سارے برے بھلے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا نہ تو ان کی نیکیاں گھٹیں۔ نہ گناہ بڑھیں۔ اگر تم اس دن اپنی رہائی چاہتے ہو تو آج اپنے مقروض قیدیوں کو رہا کر دو۔ **نوٹ:** مفسرین فرماتے ہیں کہ وَاتَّقُوْا يَوْمًا الخ یہ سب سے اخیری آیت ہے جو حضور ﷺ پر نازل ہوئی۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اسے سورۂ بقرہ میں ۲۸۰ آیتوں کے بعد رکھئے' چنانچہ یہاں رکھی گئی اس کے بعد حضور علیہ السلام دنیا میں اکیس روز تشریف فرما رہے۔ بعض

روایات میں ہے کہ سات روز اور بعض میں ہے نو دن (خازن وخزائن العرفان) بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت وفات شریف سے تین گھنٹے پہلے نازل ہوئی (روح المعانی) مگر عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اخیری آیت سود کی آیت ہے۔ ہو سکتا ہے احکام کی آیت میں سود کی آیت اخیری ہو اور مطلقاً آیات میں یہ آیت اخیری۔ خیال رہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہے اس دراز عرصہ میں بہت کام ہوں گے۔ اولاً حیرانی' پھر پریشانی' پھر شفیع کی تلاش' پھر نامۂ اعمال کی تقسیم پھر مقدمات کی تحقیق و تنقیح گواہیاں وغیرہ' سب سے آخر میں فیصلے' پھر ہر ایک کو اس کے ٹھکانے پر پہنچانا۔ چونکہ فیصلے اور ٹھکانوں پر پہنچانا سب سے آخر میں ہوگا اس لئے یہاں ثم توفی ارشاد ہوا۔ ثم تراخی ومہلت چاہتا ہے۔ اور توفی کل نفس کی تفسیر اس جملہ نے کی وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ یعنی پورا بدلہ دینے کا یہ مطلب ہے کہ ان پر ظلم نہ ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ فضل ربانی بھی نہ ہوگا۔ نفس سے مراد صرف مکلف انسان ہیں۔ جنہیں اعمال کا موقعہ ملا۔ جنات' فرشتے کل نفس سے علیحدہ ہیں کہ فرشتوں کے لئے جزاء سزا نہیں' کافر مجرم جنات کے لئے سزا تو ہے مگر مومن حق کے لئے جزاء یعنی جنت نہیں' ان کی جزاء صرف سزا سے بچ جانا ہے۔ انسانوں کے چھوٹے بچے دیوانے وغیرہ اپنے اعمال سے نہیں بلکہ فضل ذوالجلال سے بخشے جائیں گے۔ لہٰذا آیت کریمہ بالکل واضح ہے۔ نہ تو دوسری آیات کے خلاف ہے نہ احادیث کے مخالف۔

قرض لینے کی برائی

بلاضرورت قرض لینا بہت برا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی ﷺ اس غریب مقروض کی نماز جنازہ نہ پڑھتے تھے جس نے ادا کے لئے مال نہ چھوڑا ہو۔ مسلمانوں سے فرماتے تھے تم نماز پڑھ لو (مسلم ومشکوٰۃ باب الافلاس) (۲) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شہید کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے سوائے قرض کے (مسلم ومشکوٰۃ باب الافلاس) (۳) فرماتے ہیں نبی ﷺ جو ادا کی نیت سے قرض لے گا رب تعالیٰ ادا کرا دے گا۔ اور جس کی نیت پہلے ہی سے نہ دینے کی ہوگی اس کا کبھی ادا نہیں ہو سکتا (بخاری ومشکوٰۃ) (۴) تین پیسہ کے عوض مقروض کی سات سو نمازیں مسلمان قرض خواہ کو قیامت میں دلوائی جائیں گی (شامی) (۵) وہ قیامت کے دن یا تو مقروض کی عبادات مسلمان قرض خواہ کو دلوائی جائیں گی۔ یا قرض خواہ کے گناہ مقروض پر ڈالے جائیں گے۔ مسلمان ان روایات سے عبرت پکڑیں۔ آج کل شادی وموت کی حرام رسمیں پوری کرنے کے لئے قرض لینے کی عام عادت ہوگئی۔ اور سودی قرض اور بھی وبال ہے۔ آپ تفسیر میں پڑھ چکے کہ حضور علیہ السلام نے سود دینے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ (۶) احمد کی روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص سات بار بھی زندہ ہو کر شہید ہوتا رہے' جنت میں نہیں جا سکتا جب تک کہ قرض ادا نہ کر دے۔ (مشکوٰۃ باب الافلاس) (۷) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ گناہ کبائر کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ انسان مقروض ہو کر مرے اور ادا کے لئے مال نہ چھوڑے (احمد وابوداؤد ومشکوٰۃ) (۸) فرماتے ہیں ﷺ اگر جنت میں جانا چاہتے ہو تو تین چیزوں سے بچو' غرور' خیانت وقرض (ترمذی' ابن ماجہ' مشکوٰۃ) (۹) مقروض بعد موت قرض میں گرفتار رہتا ہے جب تک کہ ادا نہ کر دیا جائے (مشکوٰۃ) رب تعالیٰ مسلمان کی یہ عادت چھڑائے۔

قرض دینے کے فضائل

حاجت مند کو قرض دینا باعث ثواب ہے (۱) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تین شخصوں کو اجازت ہوگی کہ جنت میں جس دروازہ سے چاہیں جائیں اور وہاں کی جو نعمت چاہیں اختیار کریں۔ مقتول کے ورثاء جو قاتل کا خون معاف کردیں۔ جو ہر فرض نماز کے بعد گیارہ بار قل ہو اللہ پڑھا کرے' جو حاجتمند کو قرض دے۔ (روح البیان) (۲) ابو عمر امامہ باھلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ جنت کے دروازہ پر لکھا ہے کہ صدقہ کا ثواب دس گناہ ہے اور قرض دینے کا اٹھارہ گنا پوچھا اس کی وجہ کیا؟ جواب ملا کہ صدقہ تو غیر ضرورت مند بھی لے لیتا ہے مگر قرض حاجتمند ہی لیتا ہے۔ (روح البیان) (۳) جو کوئی قرض کی میعاد کے بعد مہلت دے اسے ہر دن کے عوض اتنی خیرات کا ثواب ملتا ہے۔ مثلاً کسی پر سو روپے ایک ماہ کے وعدہ پر قرض تھے۔ اب ایک ماہ کے بعد قرض خواہ کو سو روپے روز خیرات کرنیکا ثواب ملے گا۔ (روح البیان) (۴) رب تعالیٰ نے صدقات وخیرات کو قرض فرمایا تا کہ مسلمانوں کو قرض دینے کے فضائل معلوم ہوں۔ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ:۲۴۵)

حکایت: ایک شخص لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اپنے نوکروں سے کہتا تھا کہ جب کوئی مقروض تنگ دست ہو اس سے درگزر کرو' شاید رب تعالیٰ مجھ سے درگزر فرمائے' اسی پر اس کی نجات ہوگئی (مسلم و بخاری و مشکوٰۃ باب الافلاس)

مقروض کو مہلت دینے کے فضائل

غریب مقروض کو مہلت دینے یا معاف کرنے کے بڑے فضائل ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جو کوئی غریب مقروض کو مہلت دے اسے رب تعالیٰ قیامت کی مصیبتوں سے بچائے گا اور اپنے سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا۔ (مسلم و مشکوٰۃ) (۱) ہم پہلے بیان کر چکے کہ مہلت دینے میں روزانہ صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔ (۲) روایت میں ہے کہ جس نے ضرورتاً قرض لیا تو قرض خواہ کے لئے ملائکہ دعا کرتے ہیں۔ **لطیفہ:** بعض سنتوں کا ثواب فرض وواجب سے زیادہ ہے۔ سلام کرنا سنت اور جواب دینا فرض ہے مگر سلام کا ثواب جواب سے زیادہ ہے۔ میعاد پر ادائے قرض واجب ہے اور میعاد سے پہلے سنت ہے مگر ثواب اس کا زیادہ کہ میعاد سے پہلے ادا کیا جائے۔

مسائل و فوائد: شرعاً قرض اور دَین میں فرق ہے۔ دست گردان یعنی نقدی کے لین دین کو قرض کہا جاتا ہے اور معاوضات کے ذمہ رہ جانے کو دَین کسی سے چھ روپے ادھار لئے یہ قرض ہے لیکن چھ روپے کا مال خریدا اور قیمت ادا نہ کی یہ دین قرض کی میعاد کوئی نہیں' قرض خواہ جب چاہے مانگ لے۔ طے شدہ میعاد کی لازم پابندی نہیں۔ مگر دَین کی مقررہ میعاد کی پابندی کرنی ہوگی کہ وقت مقرر سے پہلے تقاضا نہیں ہوسکتا۔ نیز قرض میں زیادتی حرام کہ سود ہے اور دَین میں جائز' تاجر کہہ سکتا ہے کہ اس کپڑے کی نقد قیمت روپیہ گز ہے اور ادھار ڈیڑھ روپیہ گز (کتب فقہ) **مسئلہ:** صحیح یہ ہے کہ ہر غریب مقروض کو مہلت دینا واجب ہے اور قرضہ معاف کرنا مستحب (کبیر) **مسئلہ:** معسر یعنی دیوالیہ وہ مقروض ہے جس کے پاس ادائے قرض کے لائق مال نہ ہو۔ **مسئلہ:** اس کی مہلت دینا واجب ہے مگر اس سے قرض معاف نہ ہو جائے گا۔ جب اسے گنجائش ہو قرض خواہ پھر تقاضا کرسکتا **مسئلہ:** اگر کسی مقروض کا معسر ہونا مشتبہ ہو اور احتمال ہو کہ شاید یہ اپنے مال کو چھپاتا

ہے تو قرض خواہ کی درخواست پر حاکم مقروض کو قید کر دے اور جب قرینہ سے معلوم ہو جائے کہ واقعی یہ غریب ہے اگر اس کے پاس مال ہوتا تو ظاہر کر دیتا' تب اسے چھوڑ دے۔ آج کل بھی یہ ہی عمل ہے۔ **مسئلہ:** قرض خواہ کو یہ بھی حق ہے کہ مقروض کو پکڑ لے کہ ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ پھرے۔ **مسئلہ:** حاکم کو یہ حق نہیں کہ مقروض کی جائیداد اور مکانات خود فروخت کر کے اس کا قرض ادا کر دے بلکہ اسے قید کر کے بیچنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ ہاں اس کے پیسہ پر قبضہ کر کے بقدر حصہ قرض ادا کر دے (درمختار کتاب القضا) **مسئلہ:** مگر اب فتویٰ اس پر ہے کہ قاضی دیوالیہ کی ہر چیز فروخت کر دے یعنی کچھ کپڑے اور رہنے کا مکان حرفت کے آلات کے سواء سب کچھ فروخت کر کے قرض ادا کر دے (شامی) اسی پر آج کل عمل ہے۔

مسئلہ: نادہند مقروض کی آبرو حلال ہے کہ اس سے سخت کلامی بھی کی جائے اور قید بھی (احکام القرآن) **مسئلہ:** مہلت دینا اس قرض میں واجب ہے جو مالی کاروبار کا ہو۔ جیسے تجارتی قرض مگر دین مہر کفالہ حوالہ صلح کے روپیہ پر مہلت واجب نہیں (احکام القرآن) **مسئلہ:** جو مقروض ظاہر ظہور فقیر ہو اسے قید نہیں کر سکتے کیونکہ قید تو ظہور فقر کے لئے ہے۔

مسئلہ: شرعاً مہلت کی کوئی مدت مقرر نہیں۔ غنا تک مہلت دی جائے جیسا کہ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ سے معلوم ہوا۔

لطیفہ: چند صورتوں میں قرض لینا ثواب ہے اور انشاء اللہ وہ جلد ادا بھی ہو جائے گا۔ راہ الٰہی میں خرچ کرنے کے لئے۔ غریب کو کفن دینے اور نکاح کے لئے۔ جب اس سے پاکدامنی مقصود ہو۔ مگر بیاہ کی حرام رسموں کے لئے نہیں۔ حضور ﷺ نے بھی قرض لیا اور جب آپ کی وفات شریف ہوئی تو آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی تھی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن بندے رب تعالیٰ کی طرف لوٹیں گے یا لوٹائے جائیں گے اور لوٹنا کہتے ہیں پہلی حالت کی طرف یا پہلے گھر کی طرف پھر جانے کو تو کیا بندے پہلے رب تعالیٰ کے پاس تھے اور کیا اب بندے رب کے قبضے سے باہر ہیں اب بھی تو اسی کی ملکیت و قبضہ میں ہیں۔ **جواب:** ہاں بیشک بندے پہلے اسی عالم میں تھے۔ یہاں نہ کوئی ان کا عزیز و قریبی تھا نہ کسی کی سلطنت و بادشاہت تھی اس دنیا میں آ کر سب چیزیں سامنے آ گئیں......اور بندہ رب کو بھول گیا۔ پھر اس جہان میں جائے گا۔ جہاں یہ ہی نقشہ ہوگا یہ ہی مطلب ہے کہ رب کی طرف رجوع کرنے کا۔ نیز دنیا میں انسان مصیبت میں اسباب کی طرف بھاگتا ہے پھر مایوس ہو کر رب کی طرف رجوع کرتا ہے قیامت میں پہلے سے ہی رب کی طرف رجوع ہوگا۔ نیز دنیا میں ظاہری بادشاہ و سلاطین سلطنت و ملک کے دعویدار ہوتے ہیں مگر وہاں کوئی ظاہری دعویدار بھی نہ ہوگا۔ ان وجوہ سے قیامت کی حاضری کو رجوع الی اللہ فرمایا گیا۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ غریب مقروض کو مہلت دینا واجب ہے اور فقہاء فرماتے ہیں کہ دیوالیہ کا سامان فروخت کر کے اس کا قرض ادا کر دیا جائے۔ انہوں نے آیت کے خلاف کیوں حکم دیا؟ **جواب:** جس دیوالیہ کے پاس سامان ہو وہ غریب نہیں بلکہ نادہندہ ہے۔ غریب کو مہلت دینے کا حکم ہے نہ کہ نادہندہ کو۔ اگر اس کے سامان کی قیمت سے قرض زیادہ ہو' تو وہ مسکین ہے اور اسے زیادتی میں مہلت دی جائے گی۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں غریب مقروض کو مہلت دینے کا حکم ہے اور فقہاء اسے قید کر دینے کا حکم دیتے ہیں [illegible] میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** یہ قید و بند اسکی غربت کی تحقیق کیلئے ہے کہ یہ غریب

بھی ہے کہ نہیں۔ اسلئے تحقیق ہو جانے پر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** قیامت کے دن مسلمان قرض خواہ کو مقروض کی نیکیاں ملیں گی۔ یا اس کے گناہ مقروض پر ڈالے جائیں گے تو کافر قرض خواہ کو کیا ملے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ اس کا کفر مسلمان مقروض کو دیا جائے گا اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی نیکیاں اس کافر قرض خواہ کو ملیں کہ وہ نیکیوں کا اہل ہی نہیں۔ اسی طرح اگر مسلمان کا کافر پر قرض رہ گیا تو قیامت میں اسے کیا ملے گا؟ **جواب:** کافر قرض خواہ اگر حربی ہے تو قیامت میں اس کا قرض برباد۔ اور اگر ذمی ہے تو ممکن ہے کہ مقروض کو کچھ سزا دے دی جائے۔ اور قرض خواہ کے عذاب میں کچھ تخفیف کر دی جائے کہ کفار کی عذاب سے رہائی تو ناممکن ہے مگر تخفیف ممکن' یونہی کافر مقروض کے عذاب میں اور مسلمان قرض خواہ کے ثواب میں زیادتی کر دی جائے گی۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت میں ہر نفس کو اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا تو نہ ضبط کا مسئلہ درست رہا اور نہ معافی کا نہ بخشش کا نہ شفاعت کا۔ **جواب:** جہاں قانون و عدل کا ذکر ہے ضبطی اعمال غضب سے ہوگا جو عدل کی ایک نوعیت ہے اور معافی و بخشش فضل و کرم سے' نیز نوعیت کے یہ معنی ہیں کہ نیکیوں میں کمی نہ کی جائے گی اور گناہوں میں اضافہ نہ ہوگا۔ رہا نیکیوں کو بڑھا دینا' گناہوں کو معاف فرما دینا تو فی کے خلاف نہیں۔ یہاں ایک چیز کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں معافی کا بھی ذکر ہے اور ضبطی اعمال کا بھی۔

تفسیر صوفیانہ

قرض سخت خطرناک چیز ہے۔ خواہ مخلوق کا ہو یا خالق کا' عاقل وہ ہے جو فرض و قرض دونوں سے بچے' جو رب کے فرض سے نہ ڈرا وہ کسی کے قرض سے کیا ڈرے گا' رب تعالیٰ نے قرض خواہوں کو مہلت دینے کا حکم اور معاف کرنے کی رغبت دی۔ وہ خود بھی گنہگار بندوں کو بہت مہلت دیتا ہے اور اگر وہ بندہ بندہ بن کر رہے' تو بہت جلد معاف فرما دیتا ہے۔ آیت وَاتَّقُوْا یَوْمًا الخ سب سے اخیر میں نازل ہوئی۔ نبی ﷺ کی پیدائش پیر کے دن' عطائے نبوت اور مدینہ شریف میں تشریف آوری اور وفات سب کچھ پیر کے دن ہوئی۔ ایک قول کی بناء پر یہ آیت بھی پیر کے دن ہی نازل ہوئی۔ جیسے قرآن خاتم الکتب ہے۔ حضور ﷺ خاتم الانبیاء' ایسے ہی یہ آیت کریمہ سارے قرآن کریم کا خلاصہ اور اس کے مضامین کی جامع ہے کیونکہ قرآن بلکہ ساری کتب سے انسانوں کو دو فائدے حاصل ہوئے۔ مہلکات سے نجات اور ترقی درجات و مہلکات کل سات چیزیں ہیں۔ (۱) کفر (۲) شرک (۳) جہالت (۴) گناہ (۵) برے اخلاق (۶) حجاب صفات (۷) حجاب نفس' اور ترقی درجات کے آٹھ اسباب ہیں۔ معرفت الٰہی' توحید' علم' اطاعت' اچھے اخلاق' جذب حقانی' انانیت سے فناہ اور ہوتیہ میں بقا' ان ساری چیزوں کو ایک کلمہ اتقوٰی نے بیان کر دیا کیونکہ تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ رب سے دور کرنے والے عیوب سے بچے' اور قریب کرنے والے صفات اختیار کرے۔ لہٰذا اس میں ان سات عیوب سے بچنا بھی داخل ہے اور آٹھ صفتوں کا حاصل کرنا بھی۔ عوام کا تقویٰ کفر سے معرفت کی طرف' شرک سے توحید کی جانب' جہالت سے علم کی طرف' گناہ سے اطاعت کی طرف اور گندے اخلاق سے پاکیزہ صفات کی طرف نکلنا ہے۔ ان کے سیر کی یہ انتہا ہے۔ مگر خاص مجذوبین کی۔ یہاں سے ابتداء انہیں جذب الٰہی صفات نفسانی سے نکال کر تجلی صفات حق پر پہنچاتا ہے۔ خواص کی یہاں انتہاء ہے وہ جنت ماویٰ کے پاس سدرۃ المنتہیٰ کے سایہ میں رہتے ہیں۔ اور اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی (النجم: ۱۶) کے میوہ جات سے نفع حاصل کرتے ہیں لیکن خاص

الخاص کا تقویٰ یہ ہے کہ انہیں رحمت الٰہی مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی (النجم:۱۷) کی کشش کے ذریعہ اوصاف نفس کے سدرۃ المنتہیٰ سے نکال کر انوار اقدس کے قاب قوسین تک پہنچاتا ہے وہ اس تقویٰ حقیقی کے ذریعہ سے ایمان حقیقی کی لذت پاتے ہیں ان کے حق میں اس آیت کے معنی یہ ہیں۔ وَاتَّقُوْا ہماری راہ میں بقدر طاقت کوشش کرو یَوْمًا اس دن کے لئے جس میں تمہیں عنایت ربانی کشش کرے گی۔ کہ تُرْجَعُوْنَ اِلَى اللّٰهِ تم انوار اقدس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جہاں سے گئے تھے ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر مجاہد نفس کو بقدر مجاہدہ کرم سے نوازا جائے گا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ اور کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے گا (روح البیان) صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ انسان کو قدرتی طور پر مال کی طرف میلان ہے۔ اور یہ میلان تمام گناہوں کی جڑ ہے نفس سود سے بچنا نہیں چاہتا' زکوٰۃ دینا گوارا نہیں کرتا' کیوں محبت مال کے سبب' رب تعالیٰ نے اس محبت کو چند طرح توڑا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی بیان فرما کر' قیامت یاد دلا کر اپنا عذاب بیان فرما کر اپنی رحمت و جنت کے تذکرے فرما کر یہاں فرمایا گیا کہ سود چھوڑ دو ورنہ قیامت میں پکڑے جاؤ گے' قیامت سے ڈرو' یہ خوف' شوق' ذوق وہ ٹیکہ ہے جس سے ترک دنیا آسان ہو جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ
اے وہ لوگو جو ایمان لائے جب معاملہ کرو تم ادھار کے ساتھ میعاد مقررہ تک پس لکھ لو اس کو اور
اے ایمان والو جب تم ایک مقرر مدت تک کسی دین کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور
وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا
چاہئے کہ لکھے درمیان تمہارے منشی ساتھ انصاف کے اور نہ انکار کرے منشی یہ کہ لکھے مثل اس کے کہ سکھایا
چاہئے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ
عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ
اسے اللہ نے پس چاہئے کہ لکھے
اسے اللہ نے سکھایا تو اسے لکھ دینا چاہئے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں قرض کے احکام بیان ہوئے اب دین کے احکام بیان ہو رہے ہیں۔ قرض اور دین کا فرق ہم پچھلی آیت کے فوائد میں بیان کر چکے۔ **دوسرا تعلق:** اب تک ان قوانین کا ذکر تھا جو مقروض کے لئے فائدہ مند ہیں۔ سود کی ممانعت' غریب کو مہلت دینے کا حکم اور معافی قرض کی رغبت' اب وہ قوانین ارشاد ہو رہے ہیں جو قرض خواہ کے لئے مفید ہوں۔ دین کا لکھ لینا' اس پر گواہ بنانا وغیرہ وغیرہ تا کہ مقروض انکار نہ کر سکے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ نہ تم ستاؤ' نہ ستائے جاؤ' اِنْ كَانَ

ذُوْ عُسْرَۃٍ میں نہ ستانے کی تفسیر ہوئی اور اب نہ ستائے جانے کی تفسیر ہو رہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** اب تک مال خرچ کرنے کے احکام بیان ہوئے کہ صدقہ دو سود نہ لو قرض معاف کر دو اب مال کمانے کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے کہ اپنے معاملات لکھ لو۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں ایک نفع بخش تجارت یعنی سود سے کچھ مصالح کی بنا پر روکا گیا۔ اب نہایت نفع بخش تجارت یعنی بیع سلم کی اجازت دی جا رہی ہے۔

شان نزول

عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی (بیہقی و ابن جریر و تفسیر در منثور) بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ حضور ﷺ جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو اہل مدینہ کو پھلوں میں بیع سلم کرتے ہوئے پایا کہ دو دو تین تین سال پہلے غلہ کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام نے اس بیع کو جائز رکھا مگر یہ پابندی لگا دی کہ میعاد اور وزن وغیرہ پہلے طے ہو جانا چاہیے (در منثور)

تفسیر

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ۔ عبادات کے مکلف صرف مسلمان ہیں، کفار نہیں۔ چنانچہ کفار پر نہ نماز فرض ہے نہ روزہ نہ حج، نہ زکوٰۃ رہے معاملات ان میں سے بعض معاملات کی صرف کفار کو اجازت ہے مسلمانوں کو نہیں جیسے شراب یا سور کی تجارت مگر عام کاروبار معاملات مسلمان و کفار سب کر سکتے ہیں۔ جیسے تجارتیں، کرائے، مزدوری وغیرہ۔ اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے مگر یہ قواعد سارے انسانوں کے لئے ہیں کہ جو بھی دستاویز لکھے وہ ان قواعد پر لکھے۔ لہٰذا صرف مسلمانوں کو پکارنا اور یٰٓاَیُّهَا ان سے نہ فرمانا ایسا ہے جیسے رب کا فرمان یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (طلاق:۱) کہ وہاں خطاب نبی ﷺ کو ہے مگر حکم سارے مسلمانوں کو ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ بیع سلم کی یہ پابندیاں صرف مسلمانوں کے لئے ہوں۔ کفار اگر آپس میں بیع سلم کریں اور ان قواعد کی پابندی نہ کریں تو مجرم نہیں۔ اس لئے یہاں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ارشاد ہوا۔ تُدَایَنْتُمْ دین سے بنا بمعنی قرض کا معاملہ کرنا۔ اگر ایک ہی جنس میں ادھار کا لین دین ہو تو اسے قرض کہا جاتا ہے۔ جیسے روپیہ یا گیہوں یا کھجوریں ادھار لی جائیں کہ چند روز کے بعد ایسا ہی مال واپس کر دیا جائے گا۔ اس میں زیادتی حرام اور اس کی میعاد کوئی نہیں اور دین خلاف جنسی ادھار کو کہتے ہیں۔ مثلاً غلہ آج خرید لیا۔ اس کی قیمت پھر دیں گے۔ اس میں زیادتی بھی حلال اور میعاد بھی معتبر (احمدی و کبیر وغیرہ) یہاں یہ ہی مراد ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس لفظ سے ہر ادھار مراد ہے مگر عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ بیع سلم مراد انشاء اللہ اس کی تفصیل و مسائل فوائد میں بیان ہوں گے چونکہ تداینتم میں شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ لفظ دینی بمعنی بدلہ سے بنا ہو یا اس سے وہ تجارت مراد ہو جس میں مال بھی ادھار اور قیمت بھی ان دونوں وہموں کو دفع فرمانے کے لئے ارشاد ہوا۔ بِدَیْنٍ جس سے معلوم ہو گیا کہ تجارت میں ادھار ایک طرفہ ہی ہو سکتا ہے۔ دو طرفہ ادھار کی بیع (سٹہ) منع ہے۔ بدین کی تنوین کی تنکیر کا بھی احتمال ہے اور تفصیل کا بھی تکثر و تعظیم کا بھی یعنی مطلقاً قرض کا لین دین کر دیا معمولی قرض یا بڑے قرض کا جس میں جھگڑے کا اندیشہ ہوگا کہ حضور ﷺ کے عمل شریف نے بتا دیا کہ تنوین تعظیم کی ہے اگر ہر معمولی دین کا لکھنا ضروری ہوتا تو سارا کاروبار معطل ہو جاتا حضور انور نے بھی ہر دین تحریر نہ فرمایا۔ اِلٰٓی اَجَلٍ

مُسَمًّى یہ یا تو تداینتم کا متعلق ہے یا موخراً پوشیدہ کے اور دین کی صفت' اجل کے معنی دیر لگانا ہے۔ اسی لئے موت کو اجل کہا جاتا ہے کہ وہ انتہائے عمر کے لئے مقرر ہے (کبیر) اجل کی کم سے کم مدت ایک مہینہ ہے (احمدی) چونکہ میعاد دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جس میں کم وبیشی بالکل ناممکن ہو۔ جیسے سال مہینے اور تاریخ کا تقرر' یہ اجل مبہم ہے۔ مُسَمًّى فرما کر مبہم کو نکال دیا۔ یعنی اے مسلمانو! جب تم آپس میں ادھار کا لین دین کرو کہ مال ادھار قیمت پر بیچو یا قیمت نقد لے کر مال ادھار دو اور اس میں صحیح طور پر میعاد مقرر ہو تو اس کے لئے دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ فَاكْتُبُوْهُ یہ حکم سب کو ہے۔ خواہ قرض دینے والا ہو یا لینے والا۔ ہ کا مرجع یا دین ہے یا اجل' یہ حکم استحبابی ہے اور اگر وجوبی ہو تو فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (بقرہ: ۲۸۳) سے منسوخ ہے۔ (کبیر) اسی لئے حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام نے بارہا ادھار کے معاملات بغیر تحریر بھی کئے۔ خود لکھنا اور کسی سے لکھوانا دونوں ہی اس میں داخل ہیں بلکہ کسی تیسرے سے لکھوانا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ اگلے جملہ سے معلوم ہوتا ہے بلکہ لکھواتے وقت گواہ شاہدوں کی موجودگی ان کی گواہی ڈلوالینا بہت ہی مناسب ہے۔ اس لئے فاکتبوہ وغیرہ تمام صیغے جمع فرمائے گئے۔ یعنی تم سب اس قرض کو لکھ لو یا لکھوالو۔ خیال رہے کہ اجل مسمی فرما کر اس جانب اشارہ ہے کہ دراز مدت کے قرض جن میں بھول چوک کا خطرہ ہو وہ لکھے جائیں۔ ایک آدھ گھنٹے کا قرض کہ کوئی چیز خریدی جیب میں پوری رقم نہیں ہے کہہ دیا کہ ابھی گھر سے بھجوائے دیتا ہوں یا کل تک پہنچ جائے گی اس کے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اتنی سی مدت میں بھول چوک جھگڑے شاذو نادر ہیں۔ اس لئے لکھنے کو اجل مسمی پر مرتب فرمایا۔ غرضکہ اس مختصر سی عبارت میں دیوان کے بہت سے قوانین بیان فرما دیئے گئے۔ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ یہ فکتبوہ کا بیان ہے اور کیفیت کتابت کی تفصیل۔ يَكْتُبْ کا مفعول بہ پوشیدہ ہے۔ بَيْنَكُمْ یا یکتب کا ظرف ہے یا جالساً' قاعداً اور موجوداً پوشیدہ کا جو کاتب کا حال مقدم ہے۔ كَاتِبٌ یکتب کا فاعل بِالْعَدْلِ یا یکتب کے متعلق ہے یا متصفاً پوشیدہ کے اور کاتب کی صفت' پہلی صورت میں اس کے معنی انصاف یا برابری یا وضاحت ہیں۔ اور اگر کاتب کی صفت ہو تو بمعنی عدالت و پرہیز گاری۔ خیال رہے کہ یہ بھی حکم استحبابی ہے۔ اگر وجوبی ہو تو وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (بقرہ: ۲۸۲) سے منسوخ ہے۔ یعنی تم معاملہ کرنے والوں کے درمیان بیٹھ کر کاتب انصاف کے ساتھ صاف صاف دستاویز لکھے یا جاننے والا پرہیز گار متقی کاتب دستاویز لکھے چونکہ دستاویز و تمسک ہر لکھا پڑھا آدمی نہیں لکھ سکتا اس کے لئے قانون دان کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے کاتب محرر سے لکھوانے کا خصوصیت سے ذکر فرمایا' لہٰذا ہو سکتا ہے کہ کاتبٌ کی تنوین بھی تعظیمی ہو یعنی کوئی شاندار قانون دان کاتب دستاویز لکھے۔ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ۔ لَا يَاْبَ اباءٌ سے بنا' بمعنی انکار کرنا۔ اَنْ يَّكْتُبَ کا مفعول پوشیدہ ہے كَمَا یا تو یکتب کے متعلق ہے اور بمعنی علت یا کتاباً پوشیدہ کے اور بمعنی تشبیہ یعنی وثیقہ نویس دستاویز لکھنے سے بلاوجہ انکار نہ کردے کیونکہ اس پر رب نے کرم فرمایا کہ اسے علم دیا۔ اس کا شکر یہ ہے کہ اپنے علم سے لوگوں کے کام نکالے اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص: ۷۷) (روح المعانی) اس صورت میں یہ ممانعت تنزیہی ہے اور اگر تحریمی ہو تو۔ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (بقرہ: ۲۸۲) سے منسوخ (کبیر) یا کوئی کاتب ایسی دستاویز لکھنے سے انکار نہ کرے جو قانون الٰہی کے مطابق ہو اور جیسے لکھنے کا اسے رب نے حکم دیا۔ اس صورت میں یہ ممانعت تحریمی ہے جیسے کہا جائے بے وضو نفل نہ پڑھو۔ یعنی کاتب یہ نہ کہے کہ میں

سچی دستاویز نہیں لکھوں گا۔ جھوٹی لکھوں گا۔ فَلْيَكْتُبْ۔ یا تو یہ جملہ کما علمہ کا متعلق ہے جیسے وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ (مدثر: ۳) اور لَا يَأْبَ کی تاکید کہ وہاں انکار کی ممانعت تھی اور یہاں لکھنے کا حکم یا شرط محذوف کی جزاء ہے یعنی چاہیے کہ کاتب دستاویز ایسی ہی لکھے جیسے لکھنے کا اسے اللہ نے حکم دیا یعنی سچی اور صاف صاف یا جب کاتب سے لکھنے کو کہا جائے تو ضرور لکھ دے۔ انکار نہ کرے۔ خیال رہے کہ یہ امر بھی استحبابی ہے اور اگر وجوبی ہو تو منسوخ (کبیر وغیرہ)

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! جب تم ایک معیاد معین تک کے لئے ادھار کا معاملہ کرنے لگو خواہ اس طرح کہ ادھار کی بیع کرو (جیسے بیع سلم) یا ادھار سے بیع کرو کہ قیمت مشتری پر قرض ہو تو تم اس کی دستاویز لکھ لو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی جاننے والا پرہیزگار منشی تمہارے درمیان بیٹھے تاکہ دونوں کی بات سن سکے اور سچی صاف واضح عبارت میں ایسی دستاویز لکھے جس میں حق کی مدت اور سارے معاملات کی پوری تفصیل ہو مثلاً لکھے کہ پانچ سو روپے جس کا نصف ڈھائی سو ہوتے ہیں۔ ایک ماہ کی معیاد پر لئے جس کی مدت فلاں تاریخ فلاں دن فلاں مہینہ فلاں سنہ سے شروع ہو کر فلاں تاریخ فلاں مہینہ فلاں دن پر ختم ہو گی۔ اقرار یہ ہے کہ مبیع فلاں جگہ دی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ' کاتب کو چاہیے کہ ضرور لکھ دیا کرے' کیونکہ رب نے اسے یہ ہنر دیا ہے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرے کہ لوگوں کے کام آئے۔ یا کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اسے رب نے سکھایا ویسا ہی لکھ دے۔ کچھ اپنی طرف سے کمی بیشی نہ کرے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حلال کمائی حاصل کرنا' اور مال کی حفاظت اور اسے بربادی سے بچانا بہت ضروری ہے کہ مال سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے' اسی لئے رب تعالیٰ نے اس کا بہت سختی سے حکم دیا اور اس کے متعلق بہت آیتیں نازل فرمائیں۔ امام قفال فرماتے ہیں کہ قرآن کے اکثر احکام مختصر عبارتوں میں ہیں مگر حفاظت مال کی یہ آیت سب سے بڑی آیت ہے۔ اس میں مکرر سہ کرر احکام بیان ہوئے۔ اولاً فرمایا فَاكْتُبُوْهُ لکھ لو پھر فرمایا وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ۔ کوئی اجنبی منشی تمہارا معاملہ لکھے پھر فرمایا۔ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ منشی لکھنے سے انکار نہ کرے۔ پھر فرمایا فَلْيَكْتُبْ ضرور لکھ دے۔ خیال تو کرو ایک حکم چار بار۔ پھر فرمایا وَلْيُمْلِلِ الخ املاء لکھوائے جس پر حق ہو پھر فرمایا وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ۔ املاء لکھوانے والا رب سے ڈرے۔ پھر فرمایا وَلَا يَبْخَسْ الخ حق میں کمی نہ کرے پھر فرمایا وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا الخ یعنی قرض لکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔ پھر فرمایا ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ الخ۔ (بقرہ: ۲۸۲) یہ بڑے انصاف کی بات ہے ایک جگہ ارشاد ہوا۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا (النساء: ۵) اپنے مال بے وقوفوں کو نہ دو۔ اللہ نے اسی مال میں تمہاری بقا رکھی ہے غرضکہ یہاں زکوٰۃ دے کر مال کم کرایا اور سود کی ممانعت سے حرام کمائی سے بچایا۔ وہاں حلال مال حاصل کرنے اور اس کی حفاظت کا سخت حکم بھی دیا۔ کاش موجودہ مسلمان ان تاکیدوں پر غور کریں' اور اپنے پاک مال تماشہ بازیوں اور شیطانی رسوم میں خرچ نہ کریں۔ مبارک ہے وہ مال جو حلال راستہ سے آئے' حلال راستہ میں خرچ ہو جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ ہو' رب تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کے بہت قاعدے مقرر فرمائے زیادہ خرچ کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ کھاؤ پیو مگر

اسراف نہ کرو۔ اسراف کرنے والے اللہ کو پسند نہیں اور بیجا خرچ کرنے والوں کو فرمایا کہ مبذرین یعنی ناجائز مقام پر خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان رب تعالیٰ کا نافرمان ہے۔ غرضکہ دیگر عبادات کی طرح صحیح خرچ بھی ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ:** رب نے جو فوائد و منافع حرام طریقوں سے حاصل کرنا حرام کئے ان کے لئے حلال ذریعہ بھی مقرر فرمادیئے (کبیر) دیکھو زنا حرام بیوی سے جماع حلال' سود حرام اور بیع سلم حلال شراب حرام' شہد حلال جس میں شراب سے بڑھ کر طاقت ہے اور نشہ بالکل نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ معاملہ کا کاتب معاملے والوں کے سوا کوئی تیسرا شخص ہو جیسا کہ کَاتِبٌ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ کاتب عاقدین کے درمیان بیٹھے تاکہ دونوں کی بات بخوبی سن سکے جیسا کہ بینکم سے معلوم ہوا۔ (روح البیان) بلکہ ایک کی غیر موجودگی میں دستاویز ہرگز نہ لکھے۔ (روح البیان) **پانچواں فائدہ:** بہتر یہ ہے کہ کاتب مسائل شرعیہ جاننے والا اور متقی پرہیز گار ہو۔ کبیر نے فرمایا کہ کاتب فقیہ ہونا چاہیے۔ جیسا کہ بالعدل کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** ضروری یہ ہے دستاویز کی عبارت نہایت صاف اور واضح ہو جس میں آئندہ جھگڑا نہ پڑ سکے۔ بعض لوگ صد کو چند اور چند کو صد بنا لیتے ہیں۔ اگر سو لکھنا ہو تو حروف میں لکھے اور یوں لکھے کہ سو روپیہ جس کا نصف پچاس روپیہ ہوتا ہے جیسا کہ بالعدل کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** ہر جھگڑے والا معاملہ لکھ لینا بہتر ہے۔ خواہ دین ہو یا نقد لہٰذا زمین وغیرہ کی بیع کا بیعنامہ لکھنا چاہیے اگرچہ نقد خریدی ہو بلکہ رجسٹری بھی کرا دینی چاہیے۔ **آٹھواں فائدہ:** جمہور علماء کے نزدیک یہ تحریر مستحب ہے نہ کہ واجب' مگر عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ واجب ہے۔ ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ تین شخصوں کی دعا قبول نہیں ہوتی ایک وہ جس کی عورت بدخلق ہو اور وہ طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ جو اپنا مال دیوانوں اور چھوٹے بچوں کے سپرد کر دے۔ تیسرا وہ جو بغیر لکھے اور گواہ بنائے قرض دے دے۔ یہ حدیث مرفوع بھی آئی ہے (احکام القرآن) **نواں فائدہ:** بہتر ہے کہ قرض بھی لکھ لے۔ اس آیت میں دین کی شرط میعاد کے لحاظ سے ہے۔ **دسواں فائدہ:** دین کی میعاد ایسی مقرر ہونی چاہیے جس میں جھگڑے کی گنجائش نہ رہے۔ یوں لکھے کہ اس ماہ رمضان کی پندرہ تاریخ جمعہ کے دن روپیہ ادا کروں گا۔ یوں نہ کہے کہ جب فصل کٹے گی تو دوں گا کیونکہ فصل کٹنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ کبھی جلدی کٹتی ہے اور کبھی دیر میں اور کہیں دیر میں کٹتی ہے اور کہیں جلدی۔ **گیارھواں فائدہ:** بیع سلم جائز اور قرآن سے ثابت ہے۔ بیع سلم یہ ہے کہ قیمت فی الحال دی جائے اور مال ادھار ہو۔ اس کی سات شرطیں ہیں۔ (۱) مال کی جنس مقرر ہو' گیہوں یا جو' (۲) مال کی قسم مقرر ہو مثلاً ذرا گیہوں یا فارم یا کپڑا ہے تو لٹھا فلاں نمبر کا یا گاڑھا۔ (۳) مال کی صفت مقرر ہو' مثلاً کھرے یا معمولی یا گیہوں شربتی اور رتوا۔ (۴) مال کی مقدار مقرر ہو مثلاً کہے کہ اس نرخ سے اتنے روپے کے کل اتنے خریدے (۵) اور وقت ادا مقرر ہو کہ فلاں مہینہ فلاں تاریخ میں مال لوں گا۔ (۶) ادا کی جگہ مقرر ہو کہ فلاں جگہ مال دیا جائے گا۔ قیمت فی الحال نقد دی جائے۔ (۷) اور اس کی مقدار بھی معلوم ہو۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ وہ مال ایسا ہو جو وقت عقد سے وقت ادا تک بازار میں مل سکے۔ اس لئے فصل سے پہلے آم کی بیع سلم ناجائز ہے۔ **مسئلہ:** بیع سلم میں خریدار کو رب السلم اور بیچنے والے کو رب المال یا مسلم الیہ اور قیمت کو راس المال اور مال کو مسلم فیہ کہتے ہیں۔ (احمدی وغیرہ) بیع کی چار صورتیں ہیں۔ نقد کی نقد سے' نقد کی ادھار سے' ادھار کی نقد سے' اور ادھار کی

ادھار سے۔ اول تین جائز ہیں اور چوتھی ناجائز (کبیر) کہ مال بھی ادھار ہو اور قیمت بھی (سٹہ) اسی لئے آیت میں بدین فرما دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یک طرف دین جائز ہے دو طرفہ ناجائز۔ **مسئلہ:** کاتب لکھائی کے لئے اجرت لے سکتا ہے لیکن مسئلہ بتانے کی اجرت لینا حرام کیونکہ لکھنا یا مستحب ہے یا فرض کفایہ (احکام القرآن) مگر مسئلہ بتانا فرض عین۔ **مسئلہ:** فرض عین اور حرام پر اجرت لینا حرام۔ باقی کاموں پر جائز۔ **مسئلہ:** جہاں اجرت لینا حرام ہے' وہاں دینا بھی حرام داڑھی مونڈنے' حرام تماشہ دکھانے' شراب پلانے وغیرہ کی اجرت لینا بھی حرام اور دینا بھی۔ **بارھواں فائدہ:** دستاویز کی تحریر اور معاملات کے مسائل سیکھنا فرض کفایہ ہیں۔ (احکام القرآن) کہ جس کو یہ کام پڑتے رہتے ہیں انہیں ان مسائل کا سیکھنا فرض عین ہے باقی مسلمانوں میں اگر ایک بھی سیکھ لے تو سب کا فرض ادا ہو جائے گا۔ دستاویز نویس دستاویز کے شرعی احکام ضرور سیکھیں اور معاملات و مقدمات والے ان احکام شرعیہ سے ضرور واقف ہوں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: تداینتم میں دین آ گیا تھا پھر بدین کیوں فرمایا؟ **جواب:** چند وجوہ سے۔ (۱) اس لئے کہ فاکتبوہ کی ضمیر اس کی طرف لوٹ سکے کیونکہ تداینتم میں دین مصدر آیا تھا۔ یعنی قرض دینا اور یہ دین مصدر نہیں بلکہ بمعنی قرض ہے۔ (۲) نیز تاکہ ہر چھوٹے بڑے قرض کو شامل ہو جائیں۔ (۳) اور اس لئے کہ معلوم ہو جائے کہ بیع میں قرض یک طرفہ چاہیے نہ کہ دو طرفہ (۴) اور تاکہ معلوم ہو جائے کہ تداینتم دین بمعنی قرض سے بنا ہے نہ کہ دین بمعنی بدلہ سے جیسے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ **دوسرا اعتراض:** تداینتم باب تفاعل ہے شرکت چاہتا ہے اس سے لازم آتا ہے کہ دو طرفہ دین کی بیع یعنی (سٹہ) جائز ہو حالانکہ فقہا اس سے منع فرماتے ہیں؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بمعنی تَعَامَلْتُمْ ہے یعنی جب تم ادھار کا معاملہ کرو اور ظاہر ہے کہ معاملہ قرض میں قرض خواہ اور مقروض دونوں شریک ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ باب تفاعل یا مفاعلۃ کے لئے شرکت لازم نہیں کہا جاتا ہے فَاقْطَعْتُ اللِّصَّ۔ میں نے چور کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت کی عبارت میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اولاً فرمایا گیا فاکتبوہ تم خود لکھو۔ اور پھر فرمایا گیا وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ کہ تمہارے درمیان کوئی منشی لکھے؟ **جواب:** یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ فاکتبوہ سے مراد ہے لکھ لو۔ خواہ اپنے آپ یا بذریعہ کسی کاتب کے وکیل کا فعل خود موکل کا ہوتا ہے۔ یا اس آیت میں دونوں کاموں کی اجازت دی۔ اپنے آپ لکھ لیں یا لکھوالیں۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ
اور چاہیئے کہ املا کرے وہ جو اوپر اس کے حق ہے اور چاہئے کہ ڈرے اللہ رب اپنے سے اور نہ کم کرے اس سے کچھ پس اگر
اور جس پر حق آتا ہے وہ لکھتا جائے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ رکھ نہ چھوڑے پھر
كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ
ہو وہ شخص کہ جس پر حق ہے بے وقوف یا کمزور یا نہ طاقت رکھتا ہو اس کی کہ املا بولے وہ

جس پر حق آتا ہے اگر بے عقل یا ناتوان ہو یہ لکھ نہ سکے تو اس کا

فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ

پس چاہئے کہ املا بولے ولی اس کا ساتھ انصاف کے اور گواہ بناؤ تم دو گواہ اپنے مردوں میں سے پس اگر

ولی انصاف سے لکھائے اور دو گواہ کر لو اپنے مردوں سے دو مرد

لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ

نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان میں سے کہ راضی ہو تم گواہوں میں سے

نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ایسے گواہ جن کو پسند کرو کہ کہیں ان میں

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

یہ کہ بھول جائے ایک ان میں سے پس یاد دلائے ان میں کی ایک دوسری کو

ایک عورت بھولے تو اس ایک کو دوسری یاد دلائے

تعلق

اس جملہ کا پچھلے جملہ سے چند طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلے جملہ میں قرض لکھنے کا ذکر تھا۔ اب مضمون لکھوانے کا ذکر ہے جس پر لکھنا موقوف ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں فرمایا گیا تھا کہ کاتب قرض خواہ اور مقروض کے علاوہ کوئی تیسرا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ کاتب اگرچہ تیسرا ہو مگر مضمون مقروض کی طرف سے لکھے کہ وہ ہی مقر ہے۔ **تیسرا تعلق:** رب تعالیٰ نے قرض کے معاملات میں چند احتیاطوں کا حکم دیا جن میں سے ایک کا ذکر پہلے ہو چکا یعنی لکھوانا دو احتیاطوں کا اب ذکر ہے۔ مضمون کا مقروض کی طرف سے ہونا اور اس تحریر پر گواہ بنا لینا تاکہ کسی قسم کے جھگڑے کا احتمال نہ رہے۔

تفسیر

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ۔ واؤ عاطفہ ہے۔ اور جملہ ولیکتب پر معطوف ہو کر شرط کی جزاء ہے۔ اس کا مصدر املال ہے بمعنی القاء علی الکاتب (منشی پر مضمون پیش کرنا) اہل حجاز املال کہتے ہیں اور بنی تمیم املاء قرآن کریم میں دونوں استعمال ہوئے۔ یہاں ولیملل فرمایا گیا۔ دوسری جگہ ہے فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (الفرقان: ۵) خیال رہے کہ املال کا مادہ ملل بمعنی نقل ہے اور املاء کا مادہ ملاءٌ بمعنی بھرنا اور دیر لگانا۔ اسی لئے دین کو ملت کہتے ہیں اور جماعت کو ملاءٌ اور تاخیر کو املاء کہا جاتا ہے۔ وَنُمْلِيْ لَهُمْ رنج کو ملال کہتے ہیں کہ اس سے قلب کی حالت بدل جاتی ہے۔ اَلَّذِيْ وَلْيُمْلِلْ کا فاعل ہے علیہ میں ہ ضمیر کا مرجع الذی ہے۔ اور حق سے مراد قرض وغیرہ ہے کہ اس سے مطالبہ کا استحقاق ہوتا ہے یعنی وثیقہ نویس کو مضمون وہ بتائے جس پر قرض وغیرہ ہے کیونکہ یہ تحریر ایک قسم کا اقرار ہے اور اقرار مدعیٰ علیہ کا معتبر ہوتا ہے نہ کہ مدعی کا۔ اس پر تو گواہ لانا

ضروری ہے۔ یعنی کاتب مقروض کی طرف سے لکھے گا کہ میں فلاں مال فلاں سے قرض لیتا ہوں۔ قرض خواہ کی طرف سے نہ لکھے گا کہ میں فلاں کو اتنا قرض دیتا ہوں۔ خیال رہے کہ مقروض کا مضمون ہونا ضروری ہے نہ کہ عین عبارت لہٰذا کاتب کو یہ جائز ہے کہ اگر مقروض بے ڈھنگی عبارت بولے یا کسی اور زبان میں کلام کرے تو اس کی اصلاح کر کے تحریر کرے (تفسیر احمدی) بشرطیکہ اس کا مقصود نہ بدلے۔ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ یہ واؤ بھی عاطفہ ہے اور یَتَّقِی۔ وقیٰ سے بنا بمعنی ڈرنا۔ رب کے دو نام ارشاد فرمائے گئے۔ اسم ذات جلالی یعنی اللہ اور اسم صفت جمالی یعنی رب تاکہ مقروض خوب ڈرے یعنی چاہیے کہ مضمون لکھاتے وقت مقروض رب کا خوف دل میں رکھے صرف دوسرے کو پھانسنے اور اسے قانونی شکنجہ میں کسنے کی کوشش نہ کرے ہر معاملہ کا یہی حکم ہے۔ نکاح۔ بیع۔ اجارہ۔ قرض۔ بیع سلم ان سب میں لکھنے والا اپنے بچاؤ کی کوشش کرے نہ کہ دوسرے کو پھانسنے کی اسے اپنا اسلامی بھائی تصور کر کے لکھت پڑھت کرے کہ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا یہ ولیتق پر عطف تفسیری ہے۔ يَبْخَسْ بخس سے بنا بمعنی کمی اور نقصان کھوٹے پیسوں کو اس لئے ثمن بخس کہتے ہیں کہ بازار میں ان کی قیمت کم ہوتی ہے۔ منہ کا مرجع وہ حق ہے جس کا املاء بولا جا رہا ہے۔ شیئاً کی تنوین تحقیر کی ہے یعنی مضمون لکھوانے والا مقروض اس قرض میں سے کچھ بھی کم نہ کرے نہ مقدار میں نہ قرض کی نوعیت میں اور نہ اس کی مدت میں چونکہ مقروض کے متعلق کمی کا ہی احتمال تھا نہ کہ زیادتی کا۔ اس لئے اسی سے روکا گیا۔ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ یہاں اگرچہ بجائے الذی کے ضمیر ہی کافی تھی لیکن زیادتی وضاحت کے لئے ظاہری لایا گیا۔ اس الذی سے وہ ہی لکھوانے والا مقروض مراد ہے۔ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ یہ تینوں کان کی خبر ہیں اور لا یستطیع یا تو غیر مستطیعین کے معنی میں ہو کر بتاویل مفرد ضعیفاً پر معطوف ہے۔ یا کسی مفرد محذوف کی صفت۔ خیال رہے کہ ان تینوں کو اوٗ سے معطوف کیا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معانی میں بہت فرق ہے۔ سفیہ سفہ یا سَفَاهَةٌ سے مشتق ہے بمعنی بے وقوف احمق بے عقل اس میں پورے دیوانے بھی داخل ہیں۔ اور مخبوط الحواس بھی (کبیر و معانی وغیرہ) ضعیف ضعف سے بنا بمعنی کمزوری۔ یہاں وہ کمزوری مراد ہے جو عمر کے لحاظ سے ہو۔ یعنی لڑکپن یا بڑھاپا جس کی وجہ سے وہ مضمون نہ لکھا سکے۔ لا یستطیع استطاعت سے بنا بمعنی طاقت رکھنا۔ یہاں کمزوری زبان گونگا پن زبان سے ناواقفیت مراد ہے یعنی اگر مقروض بے عقل یا کمزور بچہ اور بڈھا گونگا یا زبان سے ناواقف ہو۔ غرض اس میں کوئی ایسی وجہ ہو جس سے مضمون نہ لکھا سکے تو فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ۔ وَلِیٌّ بمعنی قریب ہوتا ہے اور بمعنی متولی و کارکن بھی یعنی وکیل اور مترجم وغیرہ یہاں بطریق عموم مشترک سارے معنی مراد ہیں۔ مجنوں و بچہ کے معاملات اس کا قریبی کرے گا۔ باپ بیٹا۔ قاضی یا سلطان اور زبان سے ناواقف اور گونگے وغیرہ کے معاملات اس کا کارکن۔ مختار یا وکیل انجام دے گا مگر بچے دیوانہ پاگل کا ولی اپنی زبان میں اشام لکھوائے گا کہ کسی اپنے فلاں عزیز کی طرف سے یہ عقد کر رہا ہوں اور اس کے حقوق میرے ذمہ ہیں مگر گونگے زبان سے ناواقف کا ولی اس کی زبان میں لکھوائے گا کہ بچے پاگل دیوانہ کا عقد غیر معتبر ہے اور گونگے کا عقد و اقرار معتبر۔ ہ کا مرجع مدیون ہے نہ کہ دین کیونکہ قرض خواہ مضمون نہیں لکھوا سکتا۔ یعنی ان سب صورتوں میں مقروض کا ولی یا والی یا کارکن اس کی طرف سے اشام لکھوائے گا۔ مگر عدل و انصاف کے ساتھ کہ نہ قرض خواہ کی رعایت کر کے زیادہ لکھوا دے نہ مقروض کی طرفداری میں کم چونکہ کارکن کے متعلق زیادتی اور کمی دونوں کا اندیشہ

تھا اس لئے یہاں عدل فرمایا گیا اور وہاں بخس عدل کے معنی ہیں۔ برابری۔ اسی لئے انصاف کو عدل' کچہری کو عدالت' منصف کو عادل اور اونٹ کے بوجھ کو عدل کہتے ہیں۔ خیال رہے کہ یہ عدل بمعنی انصاف ہے نہ کہ بمعنی عدالت' کیونکہ مسلمان کا ولی' متولی اور وکیل کافر بھی ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے اس سے ثابت کیا کہ مسلمان کا ولی مسلمان ہی ہو غلط ہے۔ (روح المعانی) وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ۔ دستاویز کی تحریر میں تین شخص ضروری ہیں۔ کاتب' مقر' یعنی لکھوانے والا' گواہ وشاہد۔ آیت کریمہ میں پہلے تو کاتب کا ذکر کیا گیا۔ پھر مقر کا اب گواہوں کا تذکرہ ہے چونکہ گواہ کی ضرورت ان دو مذکورا شخاص کے بعد ہے۔ نیز گواہ انہی کی کوشش کے لئے ہوتے ہیں اس لئے ان کا ذکر بھی بعد میں کیا گیا۔ یہ دوسری احتیاط ہے جس کا حکم دیا گیا اور اس میں قرض خواہ اور مقروض دونوں کو خطاب ہے استشهدوا باب استفعال بمعنی طلب سے ہے۔ الاستشهاد و طلب شاہد یا طلب شہادت کردن یہاں پہلا معنی مراد ہیں۔ یعنی گواہ ڈھونڈو' بعض لوگوں نے کہا کہ یہ باب افعال سے ہے۔ اور یہ اس مبالغہ کے لئے زائد یعنی وہ گواہ ڈھونڈو جو بار بار عدالت میں جاتے ہوں اور جن کی گواہی قاضی اسلام قبول کرتا ہو یعنی عادل اور متقی گواہ (روح المعانی) یہ حکم استحبابی ہے اور اگر وجوبی ہے تو منسوخ کیونکہ قرض پر گواہ بنانا واجب نہیں بہتر ہے (روح المعانی) شہید شہود سے بنا بمعنی حاضری چونکہ گواہ اکثر موقعہ واردات پر موجود ہوتا ہے اس لیے اسے شہید کہا جاتا ہے چونکہ تحریر میں بھی مقروض کے پھر جانے کا اندیشہ ہے کے اپنی اس تحریر سے ہی انکار کر دے۔ اسلئے اس پر دو گواہ بنالو۔ خواہ زبانی ہو خواہ ان کے نام بھی اشٹام میں لکھ دیئے جائیں مِنْ رِّجَالِكُمْ۔ یا تو من ابتدائیہ ہے اور یہ واستشهدوا کے متعلق یا تبعیضیہ ہے اور پوشیدہ کے متعلق شہیدین کی صفت' رجال جمع رجل کی ہے۔ بمعنی عاقل بالغ مرد۔ اس سے عورتیں' بچے' دیوانے خنثی مشکل سب نکل گئے۔ کم میں تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ اس اضافت سے کفار غلام فاسق وفاجر نکل گئے یعنی اپنے مسلمان متقی' عاقل مردوں میں سے دو گواہ بنالو۔ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ۔ ف تعقیبیہ ہے اور یکون کا اسم ضمیر ہے۔ جو گواہوں کی طرف لوٹتی ہے اور رجلین اس کی خبر' خیال رہے کہ لم یکونا، (یعنی نہ ہونے) کی دو صورتیں ہیں یا تو اس وقت دو مرد میسر ہی نہ ہوں۔ یا میسر ہوں تو مگر کسی مصلحت سے ان دونوں کو گواہ نہ بنایا جائے لہٰذا یہ نفی عموم ہے نہ کہ عموم نفی (روح المعانی) اس ترتیب ذکری سے اشارہ معلوم ہوا کہ بہتر تو یہی ہے کہ مرد ہی گواہ بنائے جاویں کہ انہیں کچہری میں حاضری حاکم کے سامنے گواہی دینا آسانی ہوگی نیز انہیں گواہی دینا عموماً آتی بھی ہے لیکن اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد دو عورتیں ہی سہی۔ اگر کسی معاملہ میں بہت سے مرد و عورتیں گواہ ہوں تو بوقت ضرورت مردوں کو ہی گواہی کے لئے پیش کرو۔ بلا ضرورت عورتوں کو گواہی کے لئے پیش کرنا مناسب نہیں۔ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَانِ۔ ف جزائیہ ہے اور اس کا مابعد یا تو مبتدا محذوف کی خبر ہے یا فعل محذوف کا فاعل یا یکین فعل محذوف کا اسم یعنی اگر دو گواہ مرد مجتمع نہ ہوں تو اس معاملہ میں ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن سکتی ہیں مگر یہاں بھی شرط یہ ہی ہے کہ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ من یا تو کسی پوشیدہ چیز کے متعلق ہے اور مرد و عورتوں کی صفت اور یا من تبعیضیہ یا بیانیہ ہے اور شہیدین کی صفت یا استشهدوا فعل محذوف کے متعلق ترضون کا مفعول یہ محذوف یعنی ترضونهم یہ لفظ رضیٌ سے بنا بمعنی راضی ہونا اور پسند کرنا۔ یہاں دینی اور پرہیز گاری کی پسندیدگی مراد ہے نہ کہ دنیوی یعنی ان لوگوں میں سے گواہ چنو جن کی راست بازی' دیانتداری' اور پرہیز گاری سے تم راضی ہو۔ ظاہر یہ

ہے کہ یہ خطاب بھی قرض خواہ اور مقروض دونوں کو ہے اور ممکن ہے کہ عام مسلمانوں کو ہو۔ یا حکام وقت کو اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا یہ جملہ دو عورتیں مقرر کرنے کی حکمت بیان فرما رہا ہے۔ اس کی دو قرء تیں ہیں۔ ایک اَنْ تَضِلَّ الف کے کسرہ سے۔ اس صورت میں ان شرطیہ ہے اور تضل شرط اور تذکر جزا۔ مگر عام قرءت میں ان تَضِلَّ الف کے فتح سے۔ اس صورت میں یہ فعل پوشیدہ کا مفعول لہٗ ہے۔ یعنی شُرِعَ ذٰلِکَ اِرَادَةَ اَنْ تَضِلَّ یا لِاَنْ تَضِلَّ۔ اور تَضِلَّ ضلال سے بنا بمعنی بھول جانا۔ بہک جانا۔ جاتا رہنا وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۔ (انعام: ۲۴) گمراہ کو اسی لئے ضال کہتے ہیں کہ وہ صحیح عقیدہ بھول گیا۔ اہل لغت فرماتے ہیں کہ ضلال کے لغوی معنی غائب ہونا ہیں۔ اسی لحاظ سے بھول چوک گمراہی وغیرہ کو ضلال کہا جاتا ہے۔ یہاں بمعنی بھولنا ہے کیونکہ آگے فَتُذَكِّرَ آ رہا ہے۔ ضلال بمعنی گمراہی کا مقابل ہدایت ہوتا ہے اور بمعنی جاتے رہنے کا مقابل وجدان ہوتا ہے خیال رہے کہ یہاں تَضِلَّ کا مفعول پوشیدہ ہے کیونکہ بھولنے میں بہت احتمال ہیں۔ اصل واقعہ ہی بھول جائے یا قرض کی مقدار یا اس کی مدت اس کے شرائط وغیرہ بھول جائے۔ غرض کچھ بھی بھولے تو فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى۔ یہاں تذکر تضل کے معنی بتا رہا ہے۔ پہلی قرءت پرف جزائیہ ہے اور دوسری پر عاطفہ۔ تذکر تذکیر سے بنا بمعنی یاد دلانا۔ یہاں اِحْدٰهُمَا سے یا تو وہ دوسری عورت مراد ہے جسے واقعہ یاد ہے اور اخریٰ سے بھولنے والی مراد۔ جیسے پہلے احدھما فرمایا گیا تھا اور اِحْدٰهُمَا تذکر کا فاعل ہے اور اخریٰ مفعول۔ یا اس اِحْدٰهُمَا سے وہ ہی بھولنے والی مراد ہے اور اخریٰ سے دوسری جسے گواہی یاد ہے۔ اب اِحْدٰهُمَا تذکر کا مفعول ہے اور اخریٰ اس کا فاعل چونکہ یہ جملہ عدد کی حکمت کے لئے ہے اس لئے ایسی عبارت ارشاد ہوئی ورنہ یوں بھی ہو سکتا تھا کہ فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا مگر اس عبارت میں عجیب صنعت ہے یعنی ایک مرد کے قائم مقام دو عورتیں اس لئے کی گئی ہیں کہ ان میں بھول چوک غالب ہے تو اگر ایک سے کوئی بھول بھی ہو جائے تو دوسری یاد دلا دے خیال رہے کہ اس جملہ میں عجیب لطف ہے کہ تضل ضلال سے بنا جس کے چند معنی ہیں اور تذکر ذکر سے بنا اس کے بھی چند معنی یاد کرنا' نصیحت کرنا' عزت دینا وغیرہ تَضِلَّ کی تفسیر تُذَكِّرَ سے اور تُذَكِّرَ کی تَضِلَّ سے ہو رہی ہے تَضِلَّ سے معلوم ہوا کہ تُذَكِّرَ سے یاد دلانا مراد ہے نہ کہ عزت دینا وغیرہ اور تُذَكِّرَ سے معلوم ہوا کہ تَضِلَّ سے بھولنا مراد ہے نہ کہ دیگر معانی۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! قرض کے معاملات لکھوانے میں تو آزادی ہے کہ خواہ مقروض خود لکھے یا اس کی طرف سے کوئی منشی مگر اس کے مضمون کی پابندی ہے۔ وہ یہ کہ وثیقہ میں مقروض کا مضمون لکھا جائے گا اور دستاویز اس کی طرف سے ہوگی اور قرض خواہ کے پاس رہے گی کیونکہ یہ ایک قسم کا اقرار نامہ ہے اور اقرار نامہ اسی کا معتبر ہے جس پر حق ہے۔ لہٰذا اس دستاویز کی املا مقروض بولے اور وہ اپنی زبان میں لکھوائے کہ میں فلاں ابن فلاں نے فلاں شخص سے فلاں شے اتنی قیمت پر اتنی مدت کے لئے ادھار لی وغیرہ وغیرہ اور مقروض کو چاہیے کہ دستاویز لکھوانے میں اپنے رب سے ڈرے۔ مدت یا مقدار دین یا شرائط میں اپنی آسانی کے لئے کچھ کمی نہ کر دے اگر مقروض بے عقل یا بچہ یا بڈھا یا زبان سے ناواقف یا گونگا ہے اور اس میں خود مضمون لکھانے کی قابلیت نہیں تو اس کی طرف سے اس کا قریبی یا اس کا کارکن مختار یا وکیل یا مترجم املا بول دے مگر وہ بھی عدل و انصاف سے

لکھوائے کہ نہ مقروض کی رعایت سے کچھ کم لکھوائے اور نہ قرض خواہ کی مروت سے کچھ زیادہ مگر چونکہ مقروض تحریر کا بھی انکار کر سکتا ہے اس لئے احتیاط یہ ہے کہ اس تحریر پر اپنے متقی مسلمانوں میں سے دو عاقل بالغ آزاد مردوں کو گواہ بنالو۔ اگر گواہ دو مرد نہ ہوں' تو ایک مرد دو عورتیں گواہ بنالو لیکن مردوں اور عورتوں میں سے گواہی کے لئے ایسوں کو چنو' جن کی دیانتداری و تقویٰ و پرہیزگاری سے تم راضی ہو اور بجائے ایک مرد کے دو عورتیں اس لئے رکھی گئی ہیں کہ عورتوں کے مزاج میں رطوبت زیادہ ہے جس سے ان میں بھول چوک غالب' اگر ان میں سے کوئی بھول جائے تو اسی کو دوسری یاد دلا دے جس سے تمہاری گواہی میں فرق نہ آئے چونکہ گواہی بڑی اہم چیز ہے جس پر سارے مقدمے اور حاکم کے فیصلہ' اور عدل و انصاف کا دارو مدار ہے اس لئے دوران مقدمہ میں مدعی مدعی علیہ کے وکلا کا سارا زور گواہوں پر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے رب تعالیٰ نے شہادت کے متعلق بہت سی تاکیدیں فرمائیں۔ افسوس ہے کہ فی زمانہ گواہوں کو بالکل کھیل سمجھ رکھا ہے۔

فوائد و مسائل: اس آیت کے فوائد و مسائل بے شمار ہیں مگر کچھ تھوڑے عرض کئے جاتے ہیں۔ **پہلا فائدہ:** سفیہ یعنی مخبوط الحواس کو تصرف سے مجبور نہیں کر سکتے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ۔ دیکھو شریعت میں سفیہ کو قرض لینے کی اجازت دی اور قرض لینا بھی تصرف ہے (احکام القرآن) مگر صاحبین رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ اس کو تصرف سے مجبور کیا جائے گا اور اسی پر فتویٰ ہے (شامی باب الحجر) دیکھو اس آیت میں سفیہ کے لئے ولی کی قید لگا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کے تصرف میں بچہ کی طرح ولی کی ضرورت ہے (از احکام القرآن) **دوسرا فائدہ:** مسلمان کے معاملات میں کافر کی گواہی معتبر نہیں۔ جیسا کہ مِنْ رِّجَالِکُمْ سے معلوم ہوا کیونکہ من تبعیضیہ ہے اور کم میں خطاب مسلمانوں سے یعنی گواہ تم مسلمان مردوں میں سے ہونا چاہیے۔ **تیسرا فائدہ:** مالی معاملات میں صرف عورتوں کی گواہی معتبر نہیں یا تو دو مرد گواہ ہوں' یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ اگر کوئی مرد نہ ہو تو خواہ عورتیں پچاس ہو جائیں تب بھی معتبر نہیں۔ جیسا کہ فرجلٌ وامرأتان سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** بچہ' دیوانہ اور دیگر مجور لوگوں کا ولی ان پر قرض کا اقرار کر سکتا ہے۔ اس لئے ولی کو اشٹام لکھانے کی اجازت دی گئی کیونکہ اشٹام بھی گویا اقرار نامہ ہی ہے اور جب ولی کا املاء بولنا معتبر تو اس کا اقرار بھی معتبر۔ **پانچواں فائدہ:** فاسق فاجر کی گواہی مقبول نہیں۔ جیسا کہ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ سے معلوم ہوا کیونکہ رضا سے دینی رضامندی مراد ہے۔ یہ حکم قبول گواہی کا ہے مگر فاسق کا گواہ بنانا معتبر ہے۔ لہٰذا جو عقود گواہی پر موقوف ہیں ان میں فاسق کی گواہی سے وہ منعقد ہو جائیں گے۔ مثلاً فاسق کی موجودگی میں جو نکاح کیا جائے وہ درست ہے کہ ان کی گواہی سے نکاح ہو جائے گا ہاں اگر آگے جا کر زوجین میں اختلاف پیدا ہو جائے تو ان فاسق کی گواہی سے حاکم کے نزدیک نکاح ثابت نہ ہوگا۔ نکاح کا انعقاد کچھ اور ہے اور ثبوت کچھ اور۔ **چھٹا فائدہ:** کمزور حافظہ والے کی گواہی کمزور ہے اسی لئے عورت میں دو کی قید لگائی محدثین کمزور حافظہ والے کی حدیث کو ضعیف کہہ دیتے ہیں۔ ان کی دلیل بھی یہ آیت ہو سکتی ہے (از تفسیر احمدی) کیونکہ نقل حدیث بھی گویا ایک قسم کی گواہی ہے۔ **ساتواں فائدہ:** بچوں کی گواہی معتبر نہیں' جیسا کہ رجال سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** گواہی میں لفظ شہادت بولنا چاہیے جیسا کہ فاستشھدوا سے معلوم ہوا (احمدی) **نواں فائدہ:** معاملات قرض کی گواہی میں ضروری ہے کہ گواہ موقعہ واردات پر موجود ہو۔ جیسا کہ شھیدین سے معلوم ہوا۔ **دسواں فائدہ:** مرد عورت سے افضل ہے۔ اس لئے محض مردوں کی گواہی معتبر اور رہی معاملات میں محض عورتوں کی گواہی غیر معتبر۔ بلکہ حدود

قصاص میں مردوں ہی کی گواہی کا اعتبار ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ عورتوں کی عقل بھی ناقص اور دین بھی۔ عقل تو اس لئے کہ ان دو کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے قائم مقام ہے۔ ان میں بھول چوک غالب ہے اور دین اس لئے کہ یہ نماز ہمیشہ نہیں پڑھ سکتیں۔ حیض و نفاس کی وجہ سے اس سے محروم ہیں۔ **مسئلہ:** گواہی تین قسم کی ہے۔ ایک وہ جہاں صرف مرد ہی گواہ بن سکتے ہیں جیسے حدود و قصاص۔ ایک وہ جہاں صرف عورتوں کی گواہی معتبر ہے۔ جیسے عورتوں کے وہ راز جن پر مرد اطلاع نہ پا سکے۔ مثلاً ولادت یا عورت کا باکرہ یا ثیبہ ہونا یا طلاق کی مدت کا پورا ہونا وغیرہ کہ ان صورتوں میں فقط عورت کی گواہی سے فیصلہ ہوگا ایک وہ کہ جہاں مرد و عورت دونوں کی گواہی معتبر جیسے مالی معاملات اس آیت میں اس تیسری قسم کی گواہی کا ذکر ہے۔ **مسئلہ:** دنیاوی خبر کافر کی بھی معتبر ہے۔ سلطان کا منادی وکیل مضارب قاصد کافر ہو سکتا ہے۔ دینی خبر ایک متقی مسلمان کی بھی معتبر اور گواہیوں میں کم از کم دو مسلمان چاہئیں (عالمگیری کتاب الکراہۃ) اور حدود میں چار مسلمان گواہوں کی ضرورت ہے۔ **مسئلہ:** کافر کی خبر معاملات کے ضمن میں دیانات میں بھی قبول۔ کافر نے خبر دی کہ یہ گوشت مسلمان کا ذبیحہ ہے۔ کھالو' نامقبول' کیونکہ حلال و حرام ہونا دینی خبر ہے لیکن اگر کسی مسلمان کا کافر نوکر ہمارے پاس گوشت لایا اور کہا کہ یہ میرے آقا نے بھیجا ہے تو مقبول۔ کیونکہ وہ بھیجنے کی خبر دے رہا ہے جو کہ دنیوی چیز ہے۔ جب یہ بات منظور ہوگئی تو اس کے ضمن میں گوشت کی حلت بھی آ گئی (عالمگیری) **مسئلہ:** ہر گواہی میں گواہ کا واقعہ دیکھنا شرط نہیں' نکاح' طلاق' اوقات' نسب' تبرکات وغیرہ میں محض شہرت یا علامت پر گواہی دی جا سکتی ہے۔ اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب جاء الحق اول دیکھو۔ **مسئلہ:** کفار کے معاملات میں کفار کی گواہی معتبر ہے۔ لہٰذا اگر مقروض کافر ہو تو کفار گواہ بن سکتے ہیں۔ **مسئلہ:** قبول گواہی کی دس شرطیں ہیں۔ (۱) گواہ کا آزاد ہونا (۲) مسلمان ہونا (۳) بالغ ہونا (۴) متقی ہونا (۵) واقعہ سے واقف ہونا۔ (۶) اس کی گواہی میں گواہ کا نفع نہ ہونا۔ (۷) اور اس سے دفع ضرر نہ ہونا۔ (۸) گواہ غلط گوئی اور بے مروتی میں مشہور نہ ہو۔ (۹) گواہ مشہود لہٗ کا بیٹا یا غلام نہ ہو (۱۰) گواہ مشہود علیہ کا دشمن نہ ہو (کبیر) **مسئلہ:** غلام کی گواہی معتبر نہیں۔ **مسئلہ:** متقی وہ مسلمان ہے جو گناہ کبیرہ نہ کرتا ہو اور گناہ صغیرہ پر جمتا نہ ہو' کیونکہ صغیرہ ہمیشہ کرنے سے گناہ کبیرہ بن جاتا ہے۔ داڑھی منڈانا۔ کبھی جھوٹ بول دینا۔ گناہ صغیرہ ہے مگر ہمیشگی سے کبیرہ۔ یہ تمام مسائل ترضون سے حاصل ہوئے۔ **مسئلہ:** خنثیٰ مشکل کی گواہی معتبر نہیں کیونکہ وہ نہ مرد ہے نہ عورت' اسی لئے اس کی میت کو کوئی غسل نہیں دے سکتا' تیمم کرایا جائے گا۔ یہ مِنْ رِّجَالِكُمْ سے حاصل ہوا۔ **مسئلہ:** ایک گواہ اور ایک قسم سے مدعی کے حق میں فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو اسی آیت میں ارشاد ہوا کہ اگر دو گواہ مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالو۔ یہ نہ فرمایا گیا کہ ایک ہی گواہ رکھ لو اور ایک قسم کھالینا' جس سے معلوم ہوا کہ دو مرد گواہ نہ ملنے کی صورت میں صرف یہ ہی حکم ہے کہ ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ نیز حدیث شریف میں ہے اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِىْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ مدعی کے ذمہ گواہ ہیں اور منکر پر قسم۔ اس تقسیم سے معلوم ہوا کہ مدعی کی قسم اور مدعی علیہ کے گواہ معتبر نہیں۔ وہ جو حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک گواہ اور ایک قسم سے مدعی کے حق میں فیصلہ کیا۔ یہ خبر واحد ہے جو خبر متواتر اور قرآنی آیات کے مقابلہ میں غیر معتبر ہے۔ **مسئلہ:** فیصلہ کا مدار گواہی پر ہے نہ کہ محض دستاویز پر۔ دستاویز تو صرف گواہوں کو واقعہ یاد دلانے کے لئے ہے۔ اگلے جملہ میں ارشاد ہو رہا ہے وَلَا يَأْبَ

الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا۔ یہ دستاویز کی تحریر اللہ کے نزدیک انصاف کی چیز ہے اور گواہی کو درست رکھنے والی ہے۔ **مسئلہ:** اگر گواہ کو دستاویز دیکھ کر بھی واقعہ یاد نہ آئے تو اس کی گواہی درست نہیں کیونکہ یہاں ارشاد ہوا کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری یاد دلا دے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ دستاویز کی تحریر دیکھ لے۔ معلوم ہوا کہ یاد دلانے کا صرف یہ ہی خاص طریقہ ہے۔ **مسئلہ:** قرض کی گواہی واقعہ دیکھ کر جائز ہے نہ کہ محض دستاویز کی تحریر سن کر ہاں اس صورت میں یہ گواہی دے سکتا ہے کہ ہمیں فلاں شخص نے اپنا اقرار نامہ سنایا تھا۔ **مسئلہ:** دستاویز میں گواہوں کے دستخط ضروری نہیں۔ ہاں بہتر ہیں تاکہ یاد رہے اور حاکم گواہوں کو کچہری میں حاضر کر سکے۔ **مسئلہ:** اولاد کی گواہی ماں باپ کے حق میں قبول نہیں۔ ان کے خلاف قبول ہے اور دشمن کی گواہی دشمن کے خلاف مردود اور موافق مقبول۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ متقی غلام کی گواہی قبول ہے کیونکہ آیت نے گواہ میں تین قیدیں لگائیں۔ مرد ہونا مسلمان کی جماعت سے ہونا۔ مِنْ رِّجَالِكُمْ اور متقی ہونا (مِمَّنْ تَرْضَوْنَ) جب اس غلام میں تینوں صفتیں موجود ہیں تو اس کی گواہی کیوں نامقبول ہے؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ رجال سے مراد آزاد مرد ہیں۔ یہ ہی مجاہد کا قول ہے (بیہقی و تفسیر درمنثور) دوسرا یہ کہ اس آیت میں گواہی کی ساری شرائط مذکور نہیں ہوئی۔ باقی شرائط احادیث سے ثابت ہیں۔ تیسرا یہ کہ اگلے جملہ میں ارشاد ہو رہا ہے۔ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا جب گواہ بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں، جس سے معلوم ہوا کہ گواہ وہ ہونا چاہیے جو خود مختار ہو بلانے پر آسکے۔ غلام مولیٰ کے قبضہ میں ہے۔ اسے مولیٰ کے بغیر اجازت حج اور جماعت نماز کے لئے جانا جائز نہیں تو ادائے شہادت کے لئے جانا کیونکر جائز ہوگا (از کبیر)

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر مسلمان کا ولی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں بالعدل کی قید ہے جیسے ذَوَیْ عَدْلٍ کی وجہ سے کافر مسلمان کا گواہ نہیں بن سکتا تو اس کا ولی کیسے بن سکتا ہے۔ **جواب:** ذوی عدل میں عدل بمعنی تقویٰ و پرہیزگاری ہے (عدالت) اور بِالْعَدْلِ میں بمعنی انصاف۔ اگر یہ بھی اسی معنی میں ہوتا تو یہاں بجائے ب کے ذوآ تا کیونکہ ولی کی صفت ہوتا حالانکہ یہاں املاء بولنے کی قید ہے۔ ابو طالب شرعاً ایمان سے مشرف نہ ہوئے مگر نبی ﷺ کے بچپن شریف سے حضور کے ولی یعنی قریبی تھے۔ رب فرماتا ہے۔ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ (الضحیٰ: ۶) **تیسرا اعتراض:** جب چھوٹے بچوں کی گواہی معتبر نہیں تو چاہیے کہ ان سے حدیث بھی نہ لی جائے حالانکہ محدثین کم عمر صحابہ کرام سے روایت لے لیتے ہیں۔ جب فسق حدیث لینے سے مانع ہے تو صغر مانع کیوں نہیں؟ **جواب:** نقل حدیث حقیقتاً دینی خبر ہے جس میں صرف تقویٰ شرط ہے اگر یہ محض گواہی ہوتی تو ناقلین حدیث کو لفظ اشہد بولنا پڑھتا، اور کم از کم دو کی ضرورت ہوتی۔ **چوتھا اعتراض:** تمہاری ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ پہلے اِحْدٰهُمَا سے بھولنے والی عورت مراد ہے اور دوسرے اِحْدٰهُمَا سے دوسری عورت جسے واقعہ یاد ہو حالانکہ علم اصول میں ہے کہ جب معرفہ مکرر ہو تو دونوں سے ایک ہی مراد ہوتا ہے اور جب نکرہ مکرر ہو تو ان سے مختلف مراد ہوتے ہیں تو یہ تفسیر کیونکر صحیح ہوئی؟ **جواب:** یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ رب فرماتا ہے۔ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ (زخرف: ۸۴) اس کا مطلب یہ نہیں کہ آسمان میں اور معبود ہے اور

زمین میں دوسرا۔ چونکہ ابھی آیت ختم نہیں ہوئی۔ اس لئے تفسیر صوفیانہ انشاء اللہ آخر میں ہوگی۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْئَمُوْٓا أَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا
اور نہ انکار کریں گواہ جب کبھی بلائے جائیں اور نہ سستی کرو تم اس سے کہ لکھ لو اسے چھوٹا
اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں اور اسے بھاری نہ جانو کہ دین چھوٹا ہو
أَوْ كَبِيْرًا إِلٰٓى أَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ
یا بڑا طرف میعاد اس کی کے یہ زیادہ انصاف والا ہے نزدیک اللہ کے اور زیادہ قائم رکھنے والا ہے واسطے گواہی کے
یا بڑا اس کی میعاد تک لکھت کر لو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اس میں گواہی خوب ٹھیک رہے گی
وَأَدْنٰٓى أَلَّا تَرْتَابُوْٓا إِلَّآ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا
اور زیادہ قریب ہے اس کے کہ نہ شک کرو مگر یہ کہ ہو خرید و فروخت موجودہ کہ گھماؤ تم اسے
اور یہ اس سے زیادہ قریب ہے کہ تمہیں شبہ نہ پڑے مگر یہ کہ سر دست کا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ
درمیان اپنے پس نہیں ہے اوپر تمہارے گناہ یہ کہ نہ لکھو تم اسے
سودا دست بدست ہو تو اس کے نہ لکھنے کا تم پر گناہ نہیں

تعلق

اس جملہ کا پچھلے جملہ سے چند طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلے جملہ میں گواہ بنانے کا حکم تھا۔ اب گواہوں کی گواہی دینے کا حکم اور گواہی چھپانے سے ممانعت ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں قرض کی دستاویز لکھنے کا حکم دیا گیا۔ اب اس حکم کو وسیع کیا جا رہا ہے کہ دستاویز بڑے قرض کے لئے خاص نہیں۔ چھوٹے بڑے ہر قرض پر لکھ لو۔ **تیسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں قرض کی تحریر اور اس پر گواہ کر لینے کا حکم تھا۔ اب اس کے فوائد ارشاد ہو رہے ہیں تاکہ لوگ شوق سے اس پر عمل کریں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلے جملہ میں یہ وہم ہو سکتا تھا کہ ادھار کی تجارت کی طرح نقد بیع بھی لکھ لینا چاہیے۔ اس جملہ میں یہ وہم دور کیا جا رہا ہے غرضکہ یہ جملہ چند طرح پچھلے جملہ کا تتمہ اور خاتمہ ہے۔

تفسیر

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا لایاب۔ اباءٌ سے بنا بمعنی باز رہنا' یا انکار کرنا یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں کیونکہ اس آیت کی دو تفسیریں ہیں۔ شُهَدَآءُ سے یا تو وہ لوگ مراد ہیں جو گواہ بن چکے ہیں اور اب گواہی دینے جا رہے ہیں یا وہ جنہیں گواہ بنایا جائے گا۔ إِذَا لَا يَأْبَ کا ظرف ہے اور مَا تنکیریہ۔ دُعُوْا سے یا تو گواہ بننے کے لئے موقعہ کی طرف بلانا مراد ہے یا

گواہ بن چکنے کے بعد گواہی دینے کے لئے عدالت میں بلانا مراد یعنی جو گواہ بن چکے ہوں۔ جب کبھی انہیں قاضی کی کچہری میں گواہی دینے کے لئے بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں یا جب کبھی مسلمان بھائی موقعہ واردات پر کسی کو گواہ بنانے کے لئے بلائے تو ان کو بلا وجہ اس سے باز نہ رہنا چاہیے اور ممکن ہے کہ بطریق عموم مشترک یہ دونوں معنی مراد ہوں یہ ہی عبداللہ ابن عباس اور حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔ (معانی و کبیر) پہلی صورت میں یہ نہی تحریمی ہے اور دوسری صورت میں تنزیہی (از کبیر) خیال رہے کہ شہداء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی گواہی شرعاً معتبر ہے۔ لہٰذا چھوٹے بچے' دیوانے' فساق وغیرہ وہ لوگ جن کی گواہی معتبر نہیں انہیں انکار کرنا منع بھی نہیں۔ خیال رہے کہ گواہی چند قسم کی ہے قصاص و حدود کی گواہی' حقوق کی گواہی' شرعی احکام کی گواہی' حدود و قصاص کی گواہی ہیں۔ گواہی دینے یا نہ دینے کا اختیار ہے۔ مگر حقوق کی گواہی میں مدعی کا دعویٰ دار اس کی طلب پر گواہی دینا لازم ہے جیسا کہ اِذَا دُعُوْا سے معلوم ہوا' مگر شرعی حقوق کی گواہی یہ مدعی کے دعویٰ کی شرط ہے نہ کہ طلب کی' گواہ کو خود بخود گواہی دینا لازم ہے۔ جیسے رمضان' شوال کے چاند' رضاعت وغیرہ کی گواہی خود حاکم کے سامنے پیش ہو کر دو۔ اگر کسی جگہ نکاح ہو رہا ہے یعنی خبر ملے کہ زوجین اخیافی بھائی بہن ہیں تو فوراً گواہی دے دو۔ اذا دعو کی قید حقوق عباد کے لئے ہے۔ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ۔ تَسْئَمُوا سَاٰمَةٌ سے بنا' بمعنی ملال' دل تنگی' کوتاہی' اکتانا' سستی وغیرہ زہیر کہتا ہے۔

سَئِمْتُ تَكَالِيْفَ الْحَيٰوةِ وَمَنْ يَّعِشْ ثَمَانِيْنَ حَوْلًا لَا اَبَاكَ يَسْئَمُ

یہاں سب معنی درست ہیں۔ اَنْ تَكْتُبُوْهُ' تَسْئَمُوا کا مفعول ہے۔ ہٗ کا مرجع قرض یا حق یا کتابت ہے۔ (دستاویز) ایک قرأت میں لَا يَسْئَمُوا اور اَنْ يَّكْتُبُوْهُ ی سے ہے۔ اس صورت میں اس سے قرض کا معاملہ کرنے والے مراد ہیں۔ یہ ممانعت بھی تنزیہی ہے صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا۔ یا تو یہ دونوں تَكْتُبُوْهُ کی ضمیر کے حال ہیں۔ اس صورت میں صغیر سے مراد تھوڑا اور کبیر سے مراد زیادہ قرض ہے یا کتاب سے حال ہے۔ تو صغیر سے مراد مجمل اور کبیر سے مراد مفصل ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ دونوں كَانَ محذوف کی خبر ہیں۔ صغیر کو کبیر پر اہتمام اور ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کے لئے مقدم کیا۔ اِلٰٓى اَجَلِهٖ۔ یہ بھی تَكْتُبُوْهُ کی ضمیر سے حال ہے اور مستقراً پوشیدہ کا متعلق یا الیٰ بمعنی مع ہے اور تَكْتُبُوْهُ کا متعلق یعنی قرض تھوڑا ہو۔ یا زیادہ اس کے لکھنے میں سستی نہ کرو بمع مدت کے لکھ لو۔ یا اس کی مدت تک لکھ ڈالو یا قرض کی تحریر میں کوتاہی نہ کرو۔ تھوڑی بہت مجمل و مفصل تحریر ضروری کر لو (معانی و مدارک) اب اس حکم کے تین فائدے بیان فرمائے جا رہے ہیں ایک یہ کہ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ یہ کتاب یا گواہی یا دونوں کی گواہی یا دونوں کی طرف اشارہ ہے مگر پہلا زیادہ قوی' چونکہ خطاب سارے مسلمانوں سے ہے اس لئے كُمْ جمع فرمایا گیا۔ اَقْسَطُ' قِسْطٌ سے بنا جس کے معنی عدل بھی ہے اور ظلم بھی اور حصہ بھی' رب فرماتا ہے۔ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (جن: ۱۵) بعض نے فرمایا کہ باب افعال میں آ کر بمعنی انصاف ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ اور مجرد میں بمعنی ظلم یہاں باب افعال کا تفضیل ہے بمعنی اعدل سیبویہ کا قول ہے کہ باب افعال کا تفضیل بروزن افعل آتا ہے (روح المعانی) بعض کا خیال ہے کہ اقسط بمعنی ذی قسط ہے۔ یعنی یہ تحریر اللہ کے نزدیک بہت ہی انصاف کی چیز ہے کہ اس سے ایک کا حق دوسرے کے پاس نہ جائے گا' دوسرے یہ کہ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ۔ قیام کا تفضیل ہے بمعنی درستی اور سیدھا پن۔ رب

فرماتا ہے۔ اِنَّ الْقُرْآنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ (الاسراء:۹) کھڑے ہونے کو بھی اسی لئے قیام کہتے ہیں کہ اس حالت میں سارے اعضاء سیدھے رہتے ہیں چونکہ تفعیل فعل تعجب کا مناسب ہے اور فعل تعجب میں بوجہ جامد وغیرہ متصرفہ ہونے کے واؤ الف سے نہیں بدلتا۔ لہٰذا تفضیل میں بھی نہیں بدلا۔ (روح المعانی) ورنہ اَقَامَ ہوتا لِلشَّهَادَةِ میں لام صلہ کا ہے یعنی یہ تحریر گواہی کو درست رکھنے والی ہے جس سے گواہ غلطی سے بچیں گے اور قاضی و مدعی کے علم میں رہیں گے۔ تیسرا یہ کہ وَاَدْنٰى اَلَّا تَرْتَابُوْا ادنیٰ دنوٌ سے بمعنی قرب اور ادنیٰ دناءت سے بمعنی حقیر ہوتا ہے۔ اَلَّا سے پہلے الیٰ یا لام یا من یا فی حرف جر پوشیدہ ہے۔ ترتابوا ریب بمعنی شک سے بنا' باب افتعال میں آ کر عموم کے معنی پیدا ہوئے' یعنی یہ تحریر اس سے زیادہ قریب ہے کہ تم قرض' اس کی مقدار' اس کی مدت وغیرہ میں کسی قسم کا شک وہم نہ کرو اور فریقین کا دل ایک دوسرے سے صاف رہے۔ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً یہ حکم کتابت سے مستثنیٰ منقطع ہے اور اِلَّا بمعنی لٰكِنْ یا استشہاد سے مستثنیٰ متصل' تجارت کے معنی ہیں۔ مال کی ہیر پھیر کرنا نفع کی نیت سے' یہ مصدر ہے۔ تجر یتجر فھو تَاجِرٌ کا باب ضَرَبَ اس کا مفعول مُتَجو باب افتعال سے ہے (کبیر) ظاہر یہ ہے کہ یہاں بمعنی مصدر ہے اور حاضرہ سے مراد قیمت اور سودے کی موجودگی ہے اور ممکن ہے کہ یہ بمعنی اسم مفعول ہو یعنی سودا' ایک قرأت میں تجارۃٌ پیش سے ہے اور حاضرۃٌ فتح سے ہے اور ایک قرأت میں دونوں کے پیش سے پہلی دو صورتوں میں تَكُوْنَ ناقصہ ہے اور اخیری صورت میں تامہ یعنی مگر یہ کہ تمہاری بیع نقد کی تجارت ہو یا اس صورت میں کہ متجر یعنی مال و قیمت موجود ہوں کوئی بھی ادھار نہ ہو یا یہ کہ نقدی تجارت واقع ہو۔ چونکہ یہاں وہم تھا کہ تجارت حاضرہ سے مراد موجودہ ایجاب و قبول ہوں' اسی کو دفع فرمانے کے لئے ارشاد ہوا۔ تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ تُدِيْرُوْنَ ادارة سے بنا' جس کا مادہ دوران ہے بمعنی گھومنا اس میں خطاب تاجر' خریدار دونوں کو ہے ھَا کا مرجع وہی تجارت بمعنی سودا ہے۔ بَيْنَكُمْ تُدِيْرُوْنَ کا ظرف یعنی ایسا نقدی سودا ہو۔ جس کو اے تاجر و اور خریدار و تم آپس میں لے دے کر گھما لو کہ قیمت پر تاجر اور مال پر خریدار قبضہ کر لے اور کسی کی طرف ادھار نہ رہے' خیال رہے کہ تُدِيْرُوْنَ تجارت کی دوسری صفت ہے یا حاضرۃٌ کی تفسیر فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ لَّا تَكْتُبُوْهَا۔ جناح کی لغوی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اَنْ لَّا سے پہلے فی پوشیدہ ہے ھَا کا مرجع تجارت ہے۔ یعنی اس صورت میں تم پر گناہ نہیں کہ اس تجارت کو نہ لکھو چونکہ ایسی بیع دن رات ہوتی ہے اور بوجہ ادھار نہ ہونے کے جھگڑے کا احتمال بھی نہیں ہے۔ اس لئے اس میں لکھنے کی پابندی نہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب بھی گواہ بننے یا کچہری میں گواہی دینے کے لئے گواہوں کو بلایا جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں کیونکہ یہ ضروری کام ہے اگر اس میں سستی کی گئی تو بہت خرابیاں پیدا ہوں گی۔ لوگوں کے حقوق مارے جائیں گے۔ دنیا کا نظام بگڑ جائے گا۔ وَلَا يَاْبَ میں اشارۃً فرمایا گیا کہ بلا وجہ گواہ حاضری سے انکار نہ کرے اگر کوئی دینی یا دنیاوی مجبوری ہے تو انکار کر سکتا ہے لہٰذا اداء شہادت کی تاریخ کے لئے حج نہ چھوڑے۔ اگر بیمار ہو تو معذرت کر سکتا ہے یا حاکم خود اس کے پاس آ کر گواہی لے اور اے مسلمانو تم قرض کے معاملات لکھنے میں سستی نہ کرو' قرض چھوٹا ہو یا بڑا' اس کی مقدار' نوعیت بلکہ اس کی مدت تک لکھ لو کیونکہ کبھی چھوٹا قرض بڑے جھگڑے کا باعث بن جاتا ہے تھوڑی بات بھی تحریر ضرور کر لو اس تحریر میں چند فائدے ہیں ایک یہ کہ یہ خدا

کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے کہ جس سے بندوں کے حقوق کی حفاظت ہے۔ جو حقوق اللہ سے سخت تر ہیں۔ دوسرا یہ کہ یہ تحریر گواہی ٹھیک رکھنے والی ہے کہ جس سے گواہوں کی گواہی دینے میں آسانی اور مدعی و حاکم کو گواہوں کے بلانے میں سہولت ہے۔ جس سے معاملہ بہت جلد طے ہو سکتا ہے۔ تیسرا یہ کہ اس تحریر سے معاملہ صاف رہے گا اور معاملہ والوں کے دل میں ایک دوسرے سے کدورت نہ پیدا ہو گی۔ نہ دینے والے کو نقصان کا اندیشہ اور نہ لینے والے کو ضرر کا خطرہ' لیکن جس صورت میں تمہاری تجارت نقد کی ہو کہ تم مال کو آپس میں وہاں ہی گھمالو' تاجر تو قیمت پر اور خریدار مال پر وہاں ہی قبضہ کر لے۔ کسی طرف سے ادھار نہ ہو تو نہ لکھنے میں تم پر کوئی حرج ہے کیونکہ ایسے معاملات دن رات ہوتے رہتے ہیں۔ ہر ایک کا لکھنا بہت دشوار ہے نیز جبکہ تاجر و خریدار دونوں نے اپنے حقوق پر قبضہ کر لیا تو جھگڑے کا اندیشہ نہ رہا اور یہ تحریر جھگڑا مٹانے ہی کے لئے تو تھی۔ جب یہ اندیشہ نہیں تو تحریر بھی کچھ ضروری نہیں۔

فائدے

اس جملہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** معاملات کی تحریر اور ان پر گواہ بنانا مستحب ہے نہ کہ واجب۔ اس لئے کہ اس سے جھگڑے فساد کا اٹھانا مقصود ہے اور دنیوی ضرر سے بچنا ملحوظ' اسی لئے اس کے نہ کرنے پر عذاب اخروی سے نہ ڈرایا گیا بلکہ اس کے دنیوی فوائد بیان فرما دیئے گئے۔ **دوسرا فائدہ:** ادائے گواہی کے لئے مدعی کی طلب ضروری ہے اگر وہ طلب نہ کرے تو گواہوں پر حاضری لازم نہیں' جیسا کہ اِذَا مَا دُعُوْا سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** گواہ کا سفر خرچ مدعی کے ذمہ ہے کیونکہ دور رہنے والے آدمی کو بلانے کی یہ ہی صورت ہے کہ اس کے آنے کا انتظام کر دیا جائے' یہ بھی اِذَا مَا دُعُوْا سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** جب مدعی گواہوں کی طلب کرے تو انہیں گواہی دینا فرض ہے۔ چھپانا جائز نہیں جیسا کہ لا یاب الشہداء سے معلوم ہوا (خزائن) **پانچواں فائدہ:** ہر چھوٹا بڑا مالی معاملہ جس سے جھگڑا پڑ سکے۔ اس کا لکھ لینا بہت بہتر ہے جیسا کہ وَلَا تَسْئَمُوْا سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** کپڑے کی بیع سلم جائز ہے کیونکہ یہاں صغیر و کبیر فرمایا اور وزنی چیزوں کو صغیر و کبیر نہیں کہا جاتا۔ بلکہ قلیل و کثیر کہا جاتا ہے (مدارک) **ساتواں فائدہ:** معاملات کی مختصر تحریر بھی کافی ہے جیسا کہ صغیراً اور کبیراً کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** قرضی معاملات کے سوا اور جن معاملات میں جھگڑے کا اندیشہ ہو۔ ان کی تحریر بھی بہتر ہے۔ دیکھو ڈاک خانہ' چھوٹا منی آرڈر بھی بغیر تحریر لئے نہیں دیتا۔ یہ حکم اِلَّا تَرْتَابُوْا سے حاصل ہوا۔ **نواں فائدہ:** نقد تجارتوں کا لکھنا چنداں ضروری نہیں۔ جیسا کہ اِلَّا تَكْتُبُوْهَا سے معلوم ہوا لیکن اگر اس میں بھی جھگڑے کا اندیشہ ہو تو تحریر ضرور چاہیے۔ جیسے زمین' مکانات' کھیت وغیرہ کی بیع' کہ اگرچہ نقد ہو مگر تحریر بہتر ہے۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ تجارت حاضرہ وہ ہے جس میں غیر باقی مال کی بیع ہو۔ جیسے ترکاری اور پھل وغیرہ۔ زمین و باغات چونکہ باقی رہنے والی چیزیں ہیں اس لئے وہ اس حکم سے خارج۔ **مسئلہ:** گواہ بننا اور چیز ہے اور گواہی دینا کچھ اور ان کے احکام بھی مختلف۔ جب گواہ بننے میں گواہ کا کچھ ضرر نہ ہو اور نہ بننے میں مسلمان بھائی کا نقصان ہوتا ہو تو ضرور گواہ بن جانا چاہیے مثلاً نکاح ہو رہا ہے کوئی گواہ نہیں ملتا۔ یا بلا وجہ گواہ بننے سے انکار کرتا ہے تو گنہگار ہے۔ یونہی اگر گواہ نہ بننے میں مسلمان بھائی کے حق مارے جانے کا اندیشہ ہے تو ضرور گواہ بن جانا چاہیے غرضکہ متعین شخص پر گواہ بننا

واجب ہے اور جب بہت سے لوگ مل سکتے ہیں تو اس پر واجب نہیں (از کبیر) **مسئلہ:** گواہی دینے کی چند صورتیں ہیں۔ زنا وغیرہ کی گواہی میں اختیار ہے۔ دے یا نہ دے بلکہ چھپانا مستحب۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو کوئی مسلمان کی پردہ پوشی کرے۔ رب تعالیٰ اس کی دنیا اور آخرت میں ستاری فرمائے گا مگر چوری میں مال لینے کی گواہی دے تا کہ مال والے کا حق نہ مارا جائے۔ یہ نہ کہے کہ چور سے لیا ہے تا کہ وہ ہاتھ کٹنے سے بچ جائے (خزائن العرفان) لہٰذا زنا وغیرہ کا چھپانا بہتر اور باقی گواہیاں دینا بہتر۔ **مسئلہ:** اگر گواہی چھپانے سے کسی کا دینی یا دنیوی حق مارا جاتا ہے تو چھپانا منع ہے طلاق وقرض کی گواہی ضروری ہے۔ **مسئلہ:** شرعی حقوق کی گواہی دعویٰ پر موقوف نہیں۔ گواہ پر ضروری ہے کہ بغیر دعویٰ اور بغیر کسی کے بلائے گواہی دے۔ چاند دیکھ لیا ہے فوراً گواہی دے۔ کسی شوہر کو طلاق دیتے سن لیا فوراً گواہی دے۔ **مسئلہ:** اگر کسی کے پاس گواہی ہے اور مدعی اس سے بے خبر ہے اور اس کا حق مارا جا رہا ہے تو گواہ پر لازم ہے کہ بلا طلب جا کر گواہی دے۔ لہٰذا اِذَا مَا دُعُوۡا کی قید وہاں ہے جہاں حقوق انسانی کی گواہی ہو۔ اور مدعی کے علم میں ہو یا بلانے سے عام بلانا مراد ہے۔ مدعی کا ہو یا شریعت کا۔ **مسئلہ:** اگر کسی کے معاملہ کے گواہ بہت سے ہیں تو گواہی دینا فرض کفایہ ہے اور دو ہی ہوں تو ان پر فرض عین۔ **مسئلہ:** نقد اور معمولی تجارت یا لین دین کا لکھ لینا بھی اچھا ہے۔ حتیٰ کہ امانت کا لین دین بھی تحریری ہو تو بہتر ہے۔ اس لئے یہاں لَا جُنَاحَ فرمایا گیا۔ یعنی اس نقد تجارت کے نہ لکھنے میں گستاخی نہیں۔ جن سے اشارۃً معلوم ہوا کہ لکھ لینے میں فائدہ بہت ہے۔ رہا یہ سوال کہ ادھار اور بڑی تجارت کو نہ لکھنے میں گناہ ہے یا نہیں اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ ہے اس صورت میں یہ آیت منسوخ ہے اور ہو سکتا ہے کہ گناہ نہیں حرج ہو تو اب بھی یہ حکم باقی ہے کہ بڑی تجارت ادھار والی کا نہ لکھنا خرابیوں کا باعث ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ۔ سے معلوم ہوا کہ ادھار تجارت کے نہ لکھنے میں گناہ ہے کیونکہ یہاں یہ فرمایا گیا کہ اگر تجارت نقد ہو تو نہ لکھنے میں گناہ نہیں جس سے لازم آیا کہ اگر ادھار ہو تو نہ لکھنا گناہ ہے۔ اور جس کا ترک گناہ ہو وہ واجب ہوتا ہے۔ پھر فقہاء یہ کیوں فرماتے ہیں کہ یہ تحریر واجب نہیں؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ معترض نے مفہوم مخالف لے کر اعتراض کیا جو صحیح نہیں۔ یہ تو معلوم ہوا کہ نقد تجارت نہ لکھنے میں گناہ نہیں۔ رہی یہ بات کہ ادھار تجارت نہ لکھنے میں گناہ ہے۔ اس سے خاموشی ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ تحریر و گواہی وغیرہ اولاً فرض تھیں پھر ان کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ تیسرا یہ کہ جُنَاحٌ بمعنی حرج۔ مضائقہ یا کج روی ہے۔ یعنی نقد تجارت کے نہ لکھنے میں خطرہ یا نقصان نہیں۔ رب فرماتا ہے۔ وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا۔ (انفال:۶۱) یہ تمام توجیہیں اس لئے کی گئیں کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام نے بارہا قرض کا لین دین کیا مگر ہر ایک کی تحریر نہ کی۔ اگر لکھنا واجب ہوتا تو اس پر پابندی ہوتی۔ **دوسرا اعتراض:** حَاضِرَةً کے بعد تُدِيۡرُوۡنَ کیوں فرمایا گیا؟ **جواب:** یہ حاضرۃً کی تفسیر ہے۔ تجارت حاضرہ کے معنی غیر موقوف تجارت بھی ہو سکتے تھے۔ تدیرون سے معلوم ہوا کہ اس سے نقدی تجارت مراد ہے۔ **تیسرا اعتراض:** فقہاء قرآن کریم کے بعض احکام کو وجوبی قرار دیتے ہیں اور بعض استحبابی۔ یہ کیوں؟ قرآن کے سارے احکام یکساں ہونے

چاہئیں۔ اس کا قرینہ کیا ہے؟ (عام جہلا) **جواب:** بیشک سارے احکام وجوبی نہیں ہوسکتے۔ رب فرماتا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (الکہف: ۲۹) جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کافر ہو جائے' یہاں ایمان وکفر دونوں کے لئے صیغہ امر ارشاد ہوا تو کیا ایمان لانا بھی واجب ہے اور کفر بھی واجب۔ قرآن کریم میں امر سولہ معنی میں استعمال ہوا۔ وجوب۔ استحباب۔ تخییر۔ تنبیہ وغیرہ وغیرہ اس کی پہچان فقہا کا کام ہے البتہ استحباب کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ جہاں امر کے بعد دنیوی فوائد بیان ہوں تو وہ استحبابی ہوگا جیسے یہاں ارشاد ہوا کہ لکھنے سے گواہی خوب ہو سکے گی۔ تمہیں کوئی شک نہ رہے گا۔ تمہارے معاملات ٹھیک رہیں گے۔ وغیرہ چونکہ ابھی آیت ختم نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس کی تفسیر صوفیانہ آئندہ بیان ہوگی۔ انشاء اللہ۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیۃ کریمہ میں اَقْسَطُ کے بعد عند اللہ کیوں ارشاد ہوا صرف اَقْسَطُ ہی کافی تھا؟ **جواب:** دو وجہ سے ایک یہ بعض چیزوں کو لوگ انصاف سمجھتے ہیں مگر اللہ کے نزدیک ظلم ہوتی ہے۔ بعض چیزیں اس کے برعکس کہ اللہ کے نزدیک عدل ہوتی ہیں لوگوں کے نزدیک ظلم۔ بعض چیزیں اللہ کے ہاں بھی ظلم اور لوگوں کے نزدیک بھی ظلم بعض چیزیں خالق ومخلوق کے نزدیک عدل ہیں۔ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ یہ تحریر وگواہی رب کے نزدیک انصاف ہے۔ مخلوق انصاف مانے یا نہ مانے۔ دوسرے یہ کہ صرف گواہ بنانا انصاف ہے مگر اس میں خطرہ ہے کہ عاقدین اور گواہوں کے انتقال کے بعد۔ پھر خطرہ فساد ہے لیکن تحریر ہو جانے کی صورت میں آئندہ بھی نسلوں میں جھگڑہ پیدا ہوگا۔ زمین۔ مکان کی خرید وفروخت میں بیسیوں اس کے بعد اولاد در اولاد جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو تحریر و رجسٹری سے طے ہوتے ہیں اگر صرف گواہوں پر ہوتے تو کبھی طے نہ ہوتے۔ اسی لئے آج حکومتیں دستاویزوں کی رجسٹریاں کراتی ہیں کہ کل کو جھگڑا نہ اٹھے۔ اسی لئے تحریر کو فرمایا گیا کہ اللہ کے نزدیک یہ ہی زیادہ انصاف کی چیز ہے۔

وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ
اور گواہ بنالو جب خرید وفروخت کرو اور نہ نقصان پہنچایا جاوے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر کرو تم پس تحقیق
اور جب خرید وفروخت کرو تو گواہ کرلو اور نہ کسی لکھنے والے کو ضرر دیا جائے نہ گواہ کو (یا دیکھنے والا ضرر دے نہ گواہ) اور جو تم ایسا کرو
فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾
وہ نافرمانی ہے ساتھ تمہارے اور ڈرو تم اللہ سے اور سکھاتا ہے تم کو اللہ اور اللہ ساتھ ہر چیز کے جاننے والا ہے
تو یہ تمہارا فسق ہوگا اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے

تعلق

اس جملہ کا پچھلے جملوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس آیت میں قرض کے لین دین کے لئے دو حکم دیے گئے' لکھنا' اور اس پر گواہ بنانا۔ پھر نقدی تجارت میں لکھنے کی معافی دی گئی۔ جس سے وہم ہوسکتا تھا کہ شاید اس میں گواہی کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ اب اس وہم کو دفع فرمایا جارہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں حکم تھا کہ گواہ بوقت طلب گواہی سے انکار نہ کریں۔ اب معاملہ والوں کو تاکید فرمائی جارہی ہے کہ تم بھی انہیں نقصان نہ پہنچانا تاکہ گواہ اور مدعی دونوں ایک

دوسرے کا لحاظ کریں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلے جملہ میں بہت سے احکام تفصیل وار بیان ہوئے اس جملہ میں بطور تتمہ ان سب کا اجمالی ذکر ہے۔

شان نزول

ابن جریر نے حضرت ربیع سے روایت کی کہ جب آیت وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ نازل ہوئی تو بعض اہل معاملہ کاتبوں کے پاس آ کر دستاویز لکھوانے کی فرمائش کرتے۔ وہ کہتا مجھے اس وقت کام ہے کسی اور کاتب سے لکھوالو تو یہ اسے پکڑ لیتے اور کہتے کہ تجھے دستاویز لکھنے کا خدا نے حکم دیا پھر انکار کیوں کرتا ہے۔ بغیر لکھوائے نہ چھوڑتے۔ جس سے کاتبوں کو بہت دشواری ہوگئی۔ تب جملہ وَلَا یُضَآرَّ الخ نازل ہوا (تفسیر درمنثور و روح المعانی)

تفسیر

وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ۔ اَشْهِدُوْا اشہاد سے بنا بمعنی گواہ بنانا۔ اس میں خریدار اور تاجر دونوں کو حکم ہے اور یہ امر بھی استحبابی ہے۔ اِذَا ظرفیہ ہے اور تَبَايَعْتُمْ بیع کا باب تفاعل ہے۔ بمعنی خرید و فروخت کرنا۔ اس بیع سے یا نقد تجارت مراد ہے یا ہر چھوٹی بڑی عام تجارت یعنی نقد تجارت کے لکھنے کی اگرچہ ضرورت نہیں مگر اے معاملہ والو گواہ اس پر بھی بنالیا کرو۔ وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیْدٌ۔ وَلَا یُضَآرَّ باب مفاعلہ کی نہی ہے۔ اس کا مادہ ضرر بمعنی نقصان و تکلیف ہے ممکن ہے کہ معروف ہو اور کَاتِبٌ اس کا فاعل' یا مجہول ہو' اور کَاتِبٌ نائب فاعل' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت لَا یُضَارِرَ ہے (دورے پہلی رے کا کسرہ) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی قرأت لَا یُضَارَرَ ہے (دورے اور پہلی رے کا بھی فتح) یعنی کاتب اور گواہ معاملہ والے کو تکلیف اور نقصان نہ پہنچائیں۔ یا اہل معاملہ کی طرف سے نہ کاتب کو نقصان پہنچایا جائے نہ گواہ کو پہلی قرأت کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ۔ اور ظاہر ہے کہ کاتب کی غلط تحریر اور گواہ کا گواہی چھپانا' یا بدلنا فسق ہے نہ کہ اہل معاملہ کا اسے مجبور کر کے لکھوانا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَمَنْ یَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ (بقرہ ۲۸۳) دوسری قرأت کی تائید اس کے شان نزول سے ہوتی ہے۔ نیز پہلے سارے کے سارے خطاب اہل معاملہ سے تھے۔ ایک قرأت لَا یُضَآرُّ (رے کے پیش سے) بھی ہے (نفی بمعنی نہی) یعنی کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا حسن کی قرأت وَلَا یُضَآرِّ (رے کے کسرہ سے) ہے (روح المعانی) وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ۔ لَا یُضَآرُّ کی پہلی قرأت کی بنا پر یہ کاتب اور گواہوں سے خطاب ہے اور دوسری قرأت کی صورت میں اہل معاملہ سے خطاب۔ تَفْعَلُوْا کا مفعول بہ ضمیر پوشیدہ ہے جس کا مرجع ضرور یا تمام ذکر کی ہوئی چیزیں ہیں۔ فَاِنَّهٗ میں ہٗ کا مرجع فعل ہے یعنی تَفْعَلُوْا کا مصدر۔ فسوق فسق سے بنا۔ جس کے لغوی معنی کی تحقیق ہم پہلے سیپارہ میں کر چکے۔ اس کے معنی ہیں اطاعت سے نکل جانا' اس کا مقابل ہے عدالت۔ بِكُمْ کا متعلق پوشیدہ ہے لازم یا متلبس اور وہ فسوق کی صفت ہے اور ممکن ہے کہ بِكُمْ کی ب بمعنی فی ہو۔ اور یہ فسوق کے متعلق ہو (روح المعانی) یعنی اے کاتبو اور گواہو' اگر تم اہل معاملہ کو ستاؤ گے تو یہ ستانا رب کی نافرمانی ہوگی جو تم پر لازم ہے کہ توبہ سے بھی معاف نہ ہوگی کیونکہ یہ حقوق العباد ہیں یا اے اہل معاملہ اگر تم کاتبوں یا گواہوں کو تنگ کرو گے یا ہمارے بتائے قوانین کی پابندی نہ کرو گے تو تمہاری یہ حرکت لازم فسق ہوگی یا یہ فسق تم میں ثابت ہو جائے گا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

یہ وقی سے بنا بمعنی ڈر و خوف اس میں کاتب و گواہ اہل معاملہ سب ہی سے خطاب ہے یعنی اے لوگو اللہ سے ڈرتے رہو۔ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ۔ یُعَلِّمُ کا مصدر تعلیم ہے۔ بمعنی آہستگی سے سکھانا' اس کا مفعول یہ پوشیدہ ہے یعنی اللہ تم کو دنیوی کاروبار کے قوانین بھی آہستگی سے سکھاتا ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ اللہ تمہاری دینی اور دنیاوی تمام مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اگرچہ نقد تجارت کا لکھنا چنداں ضروری نہیں لیکن اس پر بھی احتیاطاً گواہ بنالیا کرو کہ کبھی اس میں بھی جھگڑے پڑ جاتے ہیں اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ قوانین لوگوں کی آسانی کے لئے ہیں نہ کہ نقصان و تنگی کے لئے۔ لہٰذا قوانین کو آڑ بنا کر کاتبوں اور گواہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے کہ ان کے کاروبار روک کر تم اپنا کام کراؤ یا کاتب کو اجرت اور گواہ کو سفر خرچ دینے سے انکار کرو یا ان قوانین کی آڑ میں نہ تو کاتب اہل معاملہ کو نقصان پہنچائیں کہ کم و بیش لکھ دیں یا بہت زیادہ اجرت مانگیں یا مقدمہ کے وقت اپنی تحریر کا انکار کردیں۔ اور نہ گواہ نقصان پہنچائیں کہ نہ گواہی چھپائیں۔ نہ کچہری کی حاضری میں بلاوجہ انکار کریں اور نہ گواہی میں کمی بیشی کریں۔ اور اے کاتبو اور گواہو اگر تم ایسی حرکت کرو گے تو یہ تمہارا فسق لازم ہوگا جو توبہ سے بھی معاف نہیں ہوسکتا کیونکہ حقوق العباد حق والے کے بغیر معاف کئے نہیں جاتے۔ یا اے معاملے والو اگر تم قانون شکنی کرو گے' تو تمہارا یہ فعل لازم نافرمانی قرار دیا جائے گا اور اے گواہو کاتبو معاملہ والو اللہ سے ڈرو رب تم پر اتنا مہربان ہے کہ جیسے تمہیں دینی قوانین بتاتا ہے۔ ایسے ہی دنیاوی بھی۔ کیونکہ دین دنیا سے وابستہ ہے اور اس کے قوانین نہایت صحیح ہیں کیونکہ وہ بندوں سے حالات اور ان کے مناسب سارے کاموں کو جانتا ہے خیال رہے کہ بیع تین قسم کی ہے۔ بیع قولی' عملی اور دونوں کا مجموعہ۔ بیع قولی وہ ہے جو دو طرف کے ایجاب و قبول سے ہو اور بیع عملی وہ ہے جو صرف لین دین کے ہو منہ سے کچھ نہ کہا جائے جسے بیع تعاطی کہتے ہیں۔ مجموعہ وہ ہے کہ جس میں ایک طرف سے قولی اور دوسری طرف سے دینے کا عمل۔ بیع میں' قیمت پہلے دی جائے' چیز پر قبضہ بعد میں۔ تحریر ہو تو لکھت پڑھت پہلے ہونا چاہیے۔ لین دین بعد میں گواہی کی صورت میں ایجاب و قبول اور لین دین دونوں گواہوں کے سامنے ہوں تاکہ وہ عقد و قبض کے گواہ ہوں نہ کہ محض اقرار بیع کے اجارہ میں نفع پہلے حاصل کرو' کرایہ بعد میں دو۔ پہلے مہینہ بھر مکان میں رہ لو پھر کرایہ دو پہلے تانگہ پر سوار ہو کر منزل پر پہنچ جاؤ پھر کرایہ دو لیکن اگر عقد سے پہلے ہی اس کے عکس پر راضی ہو گئے ہوں تو اس کے برعکس کرنا بھی درست ہے۔ جیسے آج ریل کا کرایہ پہلے دیا جاتا ہے۔ سوار بعد میں ہوتے ہیں۔ یہ اس طے شدہ پروگرام کے مطابق ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ہر چھوٹی بڑی نقد اور ادھار بیع پر گواہ بنانے چاہئیں' کیونکہ سب میں جھگڑا پیدا ہوسکتا ہے۔ حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ اگر ساگ بھی خرید و تو گواہ بنالو (تفسیر درمنثور) یہ ہی ضروری نہیں کہ گواہوں کو جمع کر کے ان کے سامنے بیع کی جائے بلکہ سودے اور قیمت کے لین دین سب۔ کے سامنے ہونا ضروری ہیں۔ چھپ کرنہ ہو بارہا دیکھا گیا کہ ایک پیسہ کے لین دین میں جھگڑا پڑ جاتا ہے۔ خریدار کہتا ہے کہ میں نے پیسہ دے دیا۔ تاجر کہتا ہے نہیں دیا۔ **دوسرا فائدہ:** اسلام مکمل دین ہے جس میں دین دنیا کے سارے معاملات طے کردیئے گئے ہیں۔

مسلمان، دوسری قوموں کے محتاج نہیں بلکہ دیگر قومیں ان کی محتاج ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** اسلام نے اعلیٰ مساوات کا سبق دیا کہ نہ کاتب و گواہ معاملہ والوں کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں اور نہ یہ لوگ انہیں۔ **چوتھا فائدہ:** گواہی دینے پر اجرت لینا حرام ہے کیونکہ یہ اسلامی فرض ہے جیسا کہ لَا یُضَآرَّ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** گواہ کو سفر خرچ دینا مدعی کے ذمہ واجب ہے۔ جیسا کہ لَا یُضَآرَّ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** دستاویز لکھنے پر اجرت لینا جائز ہے بلکہ ضروری ہے کہ اجرت پہلے طے کر لی جائے یہ بھی لا یضار سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ **مسئلہ:** کتابت پر اجرت بھی لے سکتے ہیں اور ہدیہ بھی۔ گواہی پر اجرت لینا ناجائز۔ اگر مدعی اپنی خوشی سے کچھ ہدیہ دے تو جائز مگر خیال رہے کہ اس نیت سے گواہی نہ دی جائے۔ ایسے ہی عالم کو مسئلہ شرعی بتانے پر اجرت لینا حرام کہ یہ اس پر فرض تھا۔ مسئلہ بتانا دینی تبلیغ ہے مگر فتویٰ لکھنے پر خصوصاً جبکہ اس کا فتویٰ کچہری میں پیش ہو اور عالم کی گواہی وغیرہ کے لئے وہاں حاضری دینا پڑے جائز ہے۔ یہ بھی لَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ سے معلوم ہوا۔ یہ مسئلہ بتانے کی اجرت نہیں بلکہ لکھ کر دینے کی اجرت ہے۔ جیسے فتاویٰ کتابی شکل میں چھاپ کر فروخت کرنا، یا پریس والوں سے اپنے فتاویٰ کا حق تصنیف وصول کرنا جائز ہے کہ یہ مسئلہ بتانے کی اجرت نہیں بلکہ اور چیزوں کی اجرت ہے۔ جیسے قرآنی آیات سے دم درود کرنا، آیت لکھ کر تعویذ دینا کہ ان دونوں کی اجرت لینا جائز ہے کہ اس میں آیت کا فروخت کرنا نہیں بلکہ علاج کی اجرت ہے۔ صحابہ کرام نے سورۃ فاتحہ پڑھ کر سانپ کاٹے پر دم کیا اور تیس بکریاں اجرت لیں۔ **مسئلہ:** اگر گواہ اپنا کام چھوڑ کر تمام دن کچہری میں حاضر رہا تو یہ نقصان مدعی سے لے سکتا ہے۔ یہ گواہی کی اجرت نہیں بلکہ نقصان کی تلافی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

قرآن کی سب سے بڑی آیت یہ قرض کی آیت ہے اور سب سے چھوٹی آیت مُدْهَآمَّتٰنِ (الرحمٰن: ۶۴) ہے اور سب سے بڑی سورت سورۂ بقر ہے اور سب سے چھوٹی سورۂ کوثر ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ مالی معاملات اور خلق کے آپس میں تعلقات میں بہت احتیاط چاہیے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ مال کا تعلق جسم سے ہے اور جسم کا نفس سے اور نفس کا روح سے۔ مال کی خرابی جسم کو اور جسم کا فساد نفس کو اور نفس کا بگاڑ قلب کو خراب کرتا ہے کیونکہ غذا اور لباس وغیرہ یہ مال ہی تو ہیں۔ معاملات کی خرابی حسد، کینہ اور بغض کا ذریعہ ہے اور یہ چیزیں دین کو ایسے برباد کرتی ہیں جیسے آگ لکڑی کو۔ تعلقات تین قسم کے ہیں ایک اللہ کا بندوں سے۔ اس کا ظہور یہ ہے کہ وہ انہیں دینی اور دنیوی معاملات کی تعلیم فرماتا ہے تاکہ وہ دنیا کے ذریعہ دین برباد نہ کریں اور دوسرا تعلق بندوں کا اللہ سے۔ وہ یہ کہ بندے یقین رکھیں کہ جیسے مخلوق کے معاملات صاف رہنا ضروری ہیں ایسے ہی انسان کو چاہیے کہ اپنا معاملہ رب کے ساتھ صاف رکھے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ فقط مالی خرید و فروخت کی ہی تحریر و گواہی نہیں بلکہ رب نے مسلمانوں کی جان و مال جنت کے عوض خرید لی۔ ان سے عہد و پیمان لئے۔ یہ عہد نامہ جنتی یاقوت میں لکھا گیا۔ اس پر ملائکہ گواہ بنائے گئے اور وہ عہد نامہ سنگ اسود میں محفوظ رکھا گیا۔ (روح البیان) حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن سنگ اسود کی آنکھیں اور منہ ہوں گے۔ جس سے وہ لوگوں کی گواہی دے گا (حاکم) غرضکہ یہ لکھائی اور گواہی کا دستور رب تعالیٰ کے ہاں بھی ہے حالانکہ علیم و خبیر ہے اب بھی ہمارے سارے کاموں کی تحریر ہو رہی ہے۔ ان پر

فرشتے گواہ ہیں۔ قیامت میں اسی تحریر و گواہی پر فیصلہ ہوگا۔ اگر کوئی گواہی پر جرح کرے گا تو اس مجرم کے اعضاء سے گواہی دلوا دی جائے گی۔ تیسرا تعلق بندوں کا بندوں کے ساتھ ہے بندہ کو غور کرنا چاہیے کہ رب تعالیٰ ہماری خطاؤں اور گناہوں کے باوجود اپنے انعامات بند نہیں فرماتا۔ ہم کو بھی چاہیے کہ آپس کے تعلقات معمولی باتوں سے نہ توڑ دیں اور رب کے حقوق کا لحاظ رکھیں۔ اس لئے فرمایا گیا وَاتَّقُوا اللّٰہَ! یعنی ان تینوں تعلقات میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ تمہارے قول و فعل اور تمہارے دل کی باتوں اور رازوں کو جانتا ہے تم کو بقدر خلوص جزا دے گا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے قلب کی تختی کو برے اخلاق کے نقوش سے دھو ڈالیں۔ اور اس پر عالم سرو اخلاق کے نقوش قائم کریں اور سارے حالات میں رب سے معاملہ اچھا رکھیں تاکہ درجات پائیں۔ خیال رکھو کہ قلب آراستہ گھر کی طرح ہے اور گندے اخلاق اس پر گرد و غبار اور کوڑا ہیں جب تک کہ یہ گھر اس کوڑے سے صاف نہ کیا جائے۔ تب تک اس کا محبوب اس سے آڑ میں رہے گا (روح البیان) عبادات آسان ہیں مگر صفائی معاملات بہت مشکل۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبداللہ ابن سلام سے پوچھا کہ عالم کون ہے۔ فرمایا جس کا عمل مطابق علم کے ہو۔ پوچھا علماء کے سینہ سے علم نکالنے والی کون چیز ہے؟ جواب دیا طمع (دارمی و در منثور) حضرت جابر فرماتے ہیں اولاً خاموشی سیکھو پھر حلم (بردباری) پھر علم، پھر اس پر عمل کرو (بیہقی و تفسیر درمنثور) حضرت ضحاک فرماتے ہیں تین شخصوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ایک زانی جب تک زنا سے توبہ نہ کرے۔ دوسرا وہ شخص جو ادھار کی تجارت کرے اور نہ لکھے نہ گواہ بنائے اور خریدار اسکے قرض کا انکار کردے۔ رب فرماتا ہے کہ تو نے لکھ کر تجارت کیوں نہ کی۔ تیسرا وہ شخص جو کسی کا مال ظلماً کھائے جب تک کہ اسے واپس نہ کردے۔ (تفسیر درمنثور) اور تمام عبادات و معاملات کی اصل خوف الٰہی ہے جس سے انسان کے سارے کام درست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس آیت کو حکم تقویٰ پر ختم کیا گیا۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ

اور اگر تم ہو اوپر سفر کے اور نہ پاؤ تم لکھنے والا پس گروی ہے قبضہ کیا ہوا پس اگر امین جانے بعض تمہارا

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو گرو ہو قبضہ میں دیا ہوا اور اگر تم میں ایک کو دوسرے

بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

بعض کو پس چاہئے کہ ادا کرے جو امین سمجھا گیا امانت اس کی اور چاہئے کہ ڈرے اللہ رب اپنے سے اور نہ چھپاؤ تم گواہی کو

پر اطمینان ہو تو وہ جسے اس نے امین سمجھا تھا اپنی امانت ادا کردے اور اللہ سے ڈرے جو رب اس کا ہے اور گواہی نہ چھپاؤ

وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور جو کوئی چھپائے گا اسے پس تحقیق گنہگار ہے دل اس کا اور اللہ ساتھ اس کے جو کرتے ہو تم جاننے والا ہے

اور جو گواہی چھپائے گا تو اندر سے اس کا دل گنہگار ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: تجارتیں چار قسم کی ہیں۔(۱) نقد (۲) ادھار تحریر و گواہوں سے (۳) ادھار رہن سے (۴) ادھار اعتماد پر۔ جن میں سے دو تجارتوں کا ذکر پچھلی آیت میں ہو گیا۔ یعنی نقد اور ادھار مع تحریر و گواہ باقی دو کا اب تذکرہ ہے۔ ادھار گروی کا اور ادھار اعتماد کا۔ **دوسرا تعلق**: ادھار تجارت میں اعتماد کی چند صورتیں ہیں۔(۱) تحریر و گواہی (۲) رہن (۳) دلی اطمینان ایک کا پچھلی آیت میں کر دیا گیا۔ یعنی تحریر و گواہی۔ دو کا اب ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیت میں گواہوں کو ادائے شہادت کا حکم دیا گیا تھا اور گواہی چھپانے سے منع کیا گیا۔ گواہی بھی ایک قسم کی امانت ہے۔ اور گواہ امین۔ اسی مناسبت سے اب گرو رکھنے کے احکام ارشاد ہو رہے ہیں کیونکہ گروی چیز قرض خواہ کے پاس ایک لحاظ سے امانت ہی ہوتی ہے۔ **چوتھا تعلق**: پچھلی آیت میں حضر کی تجارت کا ذکر تھا۔ یعنی بیوپاری اور خریدار دونوں اسی جگہ کے رہنے والے ہوں جہاں تجارت ہوئی۔ اب پردیسیوں کی تجارت کا ذکر ہے۔ جہاں یہ دونوں یا ان میں سے ایک پردیسی ہو جس کا نہ کوئی جان پہچان والا ہو اور نہ انہیں تحریر و گواہی میسر ہو۔

تفسیر

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ۔ ظاہر یہ ہے کہ اس میں تاجر اور خریدار سب سے خطاب ہے اور ممکن ہے کہ ان دونوں میں سے ایک سے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سارے مسلمانوں سے خطاب ہو۔ یعنی اے تاجر یا اے خریدار وا ے بیع و شراء کرنے والو! یا اے مسلمانو اگر تم سفر پر ہو کیونکہ سفر تو ہر ایک کو پیش آ سکتا ہے۔ علٰی یا تو بمعنی فی ہے یا اپنے ہی معنی میں۔ سفر میں وہ مسافر کہلاتا ہے جو نماز قصر پڑھے خواہ راستہ طے کر رہا ہو یا کہیں عارضی طور پر ٹھہر جائے اور سفر پر وہ مسافر کہلاتا ہے جو کہیں ٹھہرا نہ ہو۔ لفظ سفر کی لغوی تحقیق ہم اس آیت کی تفسیر میں کر چکے فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ (بقرہ: ۱۸۴) یہاں اتنا عرض کئے دیتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں ظاہر ہونا اور کھلنا۔ اسی لئے کتاب کو سفر اور دفتر کو اسفار کہتے ہیں کہ اس سے مضامین ظاہر ہوتے ہیں۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (جمعہ: ۵) صبح کی روشنی کو اسفار اور عورت کے برقعہ اُتارنے کو سفر۔ پیغام لانے والے کو سفیر کہا جاتا ہے کہ وہ چھپی بات ظاہر کرتا ہے۔ جھاڑو کو سفر اور جھاڑ دینے والے کو اسفار کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے غبار جھڑ کر اصل زمین ظاہر ہوتی ہے۔ پردیس جانے کو سفر اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے مسافر پر لوگوں کے حالات ظاہر ہوتے ہیں یا یہ شخص گھر سے نکل کر جنگل میں جاتا ہے گویا اب تک چھت کے پردہ میں تھا اب کھل گیا۔ (از تفسیر کبیر) یعنی اے تاجر و اور خریدار و اگر تم دونوں یا تم میں سے ایک مسافر ہو وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا۔ یہ بھی خطاب ان سب ہی سے ہے یا قرض لینے والے سے۔ کیونکہ ضرورت کاتب وغیرہ کی اسی کو زیادہ ہے۔ کاتب نہ ملنے کی چند صورتیں ہیں یا تو لکھنے والا ہی نہ ملے اور ان میں سے کسی کو لکھنا آتا نہ ہو یا قلم دوات' کاغذ وغیرہ موجود نہ ہو۔ یعنی اور کوئی تم لکھنے والا نہ پاؤ جیسے رب فرماتا ہے۔ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا۔ (النساء: ۴۳) اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی پر تیمم کر لو۔ پانی نہ پانے کی تین صورتیں ہیں۔ پانی موجود نہ ہو' پانی کا کنواں ہو مگر ڈول رسی نہ ہو۔ پانی پر سانپ یا دشمن ہے۔ پانی موجود بھی ہے قبضہ بھی ہے مگر بیماری کی وجہ سے استعمال پر قدرت نہیں' ان تمام صورتوں میں تیمم جائز ہے۔ ایسے ہی کاتب نہ پانے کی تین صورتیں ہیں اور ہر صورت میں گروی کا حکم ہوگا۔ فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ۔ یہ یا تو پوشیدہ

خبر کا مبتدا ہے یا پوشیدہ مبتدا کی خبر یا پوشیدہ فعل کا نائب فاعل یعنی الشروع رِهٰنٌ یا فَلْيُوْخذْ رِهٰنٌ۔ یا فَعَلَيْكُمْ رِهٰنٌ۔ خیال رہے کہ رِهٰنٌ رِهْنٌ کی جمع ہے۔ رے کا فتح یا کسرہ اور رِهْن مصدر ہے بمعنی گروی رکھنا لیکن اصطلاح میں اس چیز کو رہن کہا جاتا ہے جو گروی رکھی جائے مصدر بمعنی اسم مفعول۔ اسی کی جمع رِهٰن بھی ہے جیسے ثمر کی ثمار اور کلب کی کلاب اور فعل کی فعال اور کبش کی کباش اور رُهُنٌ بھی جیسے سَقَفَ کی جمع سُقُف۔ اس کی قرأتیں بھی دو ہیں۔ رِهٰنٌ اور رُهُنٌ۔ خیال رہے کہ رہن کے لغوی معنی دو ہیں۔ مضبوطی اور ہمیشگی۔ اسی واسطے راہن بمعنی دائم و ثابت آتا ہے اور مرہون بمعنی مضبوط۔ شاعر کہتا ہے۔

يُرَاهِنُنِيْ فَيُرْهِنُنِيْ بَنِيْهِ وَاُرْهِنُهٗ بَنِيْ بِمَا اَقُوْلُ

ابوعلی نے کہا۔

فَالْخُبْزُ وَا للَّحْمُ لَهُنَّ رَاهِنٌ وَقَهْوَةٌ رَاوٍ قُهَا سَاكِبٌ

گروی چیز کو اسی لئے رہن کہتے ہیں کہ اس سے قرض کی پختگی ہوتی ہے اور وہ تا ادائے قرض قرض خواہ کے پاس ہمیشہ رہتی ہے۔ مقبوضۃٌ سے قرض خواہ کا قبضہ مراد ہے یعنی کاتب نہ ملنے کی صورت میں مقروض پر گروی رکھنا لازم ہے۔ جس پر قرض خواہ کا قبضہ ہو جائے۔ مگر یہ گروی صرف پختگی قرض کے لئے ہے۔ اسے بزنس یا نفع بخش کاروبار نہ سمجھنا چاہیے۔ جیسا کہ آج کل بعض مسلمانوں نے ہندوؤں بنیوں کی دیکھا دیکھی اسے نفع بخش تجارت سمجھ رکھا ہے یہ خالص سود ہے۔ اب بجائے رہن کے بیع وفا کرنا چاہیے تا کہ حرام سے بچا جائے۔ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا۔ اَمِنَ یا اَمْنٌ سے بنا یا امانۃٌ سے بنا۔ اَمِنَ بمعنی بے خوفی جس کا مقابل ہے خوف۔ امانت بمعنی امین جاننا۔ اعتماد کرنا' بھروسہ کرنا یا امانت دینا' امن کا اسم فاعل آمن اور امانت کا امین ہے۔ بَعْضُكُمْ سے قرض دینے والا مراد ہے اور بعضا سے قرض لینے والا یعنی اگر اہل معاملہ میں سے قرض خواہ مقروض سے بے خوف ہو اور اس کے انکار وغیرہ کا اندیشہ نہ کرے یا اسے امین جانے' اس بنا پر بغیر لکھے پڑھے۔ اور بغیر گواہ شہادت قرض دیدے۔ فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ۔ فَلْيُؤَدِّ تادیۃٌ سے بنا۔ جس کا اصل اَدَاءٌ ہے۔ خیال رہے کہ عین واجب کا دینا ادا کہلاتا ہے اور اس کے مثل کا دینا قضاء۔ یہاں ادا بمعنی قضا ہے کیونکہ قرض میں واجب کا مثل دیا جاتا ہے نہ کہ عین نیز چونکہ دَین ذمہ میں واجب ہوتا ہے اس لئے اس کے مثل کا دینا گویا عین ہی کا دینا ہے۔ اسی لئے یہاں ادا فرمایا گیا (از تفسیر احمدی) اَلَّذِىْ سے مقروض مراد ہے او تمن ایتمان سے بنا' جس کا مادہ امن یا امانت ہے۔ خیال رہے کہ امن اور ایتمان دونوں کے معنی امین جاننا ہیں۔ اسی لئے معتمد شخص کو مامون بھی کہتے ہیں اور مومن بھی رب فرماتا ہے۔ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ (یوسف: ۶۴) امانت سے مراد قرض ہے۔ اسے امانت فرما کر مقروض کو ادا کی رغبت دی گئی۔ خیال رہے کہ امانت مصدر ہے بمعنی امن قرض کو اسی لئے امانت فرمادیا گیا کہ دینے والے نے مقروض پر اعتماد کیا ہے بلکہ امانت کو بھی اسی واسطے امانت کہتے ہیں کہ وہ اطمینان اور بے خوفی کی بنا پر کسی کے پاس رکھی جاتی ہیں۔ امانتہٗ میں ہٗ مرجع یا قرض خواہ ہے یا مقروض یعنی چاہیے کہ مقروض اس قرض خواہ کا قرضہ وقت پر ضرور ادا کرے۔ جس نے اسے امین جان کر بغیر لکھت پڑھت کیے قرض دے دیا تا کہ اس کا اعتبار باقی رہے یا مقروض اپنا قرض جو اس کے ذمہ واجب الادا ہے صحیح وقت پر ادا کردے۔ قرض کی نسبت قرض خواہ کی طرف بھی ہو جاتی ہے۔ استحقاق کے لحاظ سے اور مقروض کی طرف بھی واجب فی الذمہ ہونے کی حیثیت سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ

قرض خواہ کا قرض اور یہ بھی کہ مقروض کا قرض وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ۔ یہ بھی مقروض سے خطاب ہے یعنی مقروض ادائے قرض میں اپنے رب سے ڈرے کہ بغیر ٹالے ادا کر دے۔ حقوق العباد چونکہ سخت تر ہیں۔ اس لئے یہاں رب کے نام دو فرمائے گئے اللہ اور رب وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ۔ یہ گواہوں کو خطاب ہے یا مقروضوں کو یا عام مسلمانوں کو' کتم کے لغوی معنی بہت دفعہ بیان ہو چکے۔ یعنی اے مسلمانو یا اے گواہو تم گواہی نہ چھپاؤ تا کہ مدعی کا حق برباد نہ ہو۔ یا اے مقروضو تم کچہری میں جا کر خود اپنے خلاف گواہی دے لو کہ قرض کا اقرار کر لو' گواہی چھپانے کی چند صورتیں ہیں۔ گواہی نہ دینا' یا خلاف دینا' یا حق سے کم کی گواہی دینا۔ یا میعاد قرض میں فرق کر کے گواہی دینا کہ تھوڑی میعاد کو زیادہ بتا دینا۔ اس میں سب سے منع کر دیا گیا۔ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ۔ انہٗ کی ضمیر یا تو من کی طرف لوٹتی ہے یا ضمیر شان ہے۔ اور اٰثِمٌ خبر اور قَلْبُهٗ مبتدا۔ اٰثِمٌ اثم سے بنا بمعنی گناہ یعنی جو گواہ یا مدعی علیہ گواہی چھپائے کہ گواہی نہ دے' یا غلط دے یا حق سے کم کی گواہی دے تو اس کا دل گنہگار' فاسق وفاجر ہے۔ خیال رہے کہ یہاں دل کو فاسق کہنے میں عجیب راز ہیں۔ ایک یہ کہ تمام گناہوں یعنی زنا' شراب خوری جھوٹ وغیرہ کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے۔ جھوٹ کا زبان سے زنا کا شرمگاہ سے' شراب کا حلق وغیرہ سے کہ اس سے یہ اعضاء گنہگار ہوتے ہیں مگر گواہی چھپانے کا تعلق دل سے ہے کہ اس سے دل گنہگار ہوتا ہے اور دل چونکہ ظاہری اعضاء سے اعلیٰ ہے۔ اس لئے اس کے گناہ بھی ظاہری گناہوں سے سخت تر۔ کفر و شرک دل سے ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہر فعل کو اسی عضو کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ جس سے وہ صادر ہو۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ میری آنکھوں نے دیکھا' فلاں بات میرے کانوں نے سنی' چونکہ گواہی چھپانے کی جگہ دل ہے اس لئے اسے دل کا گناہ قرار دیا گیا۔ تیسرا یہ کہ دل تمام جسم کا اصل ہے۔ اگر وہ بگڑا تو سارا جسم بگڑا۔ اور اگر وہ ٹھیک رہا تو سارا جسم ٹھیک رہا۔ اس لئے فرمایا گیا کہ گواہی چھپانے والے کا دل گنہگار ہوگا۔ جس سے اس کا سارا جسم پھنسے گا۔ چوتھا یہ کہ جھوٹا گواہ یہ نہ سمجھے کہ دیگر جھوٹوں کی طرح اس میں بھی فقط زبان گنہگار ہوئی نہیں بلکہ اس سے دل بھی گنہگار ہوگا۔ پانچواں یہ کہ عربی میں اصل عضووں کو سارا جسم مراد لیتے ہیں۔ یہاں بھی قلب بول کر قلب والا مراد چھٹا یہ کہ بعضے گناہ وہ ہیں جس سے دل میں سیاہی پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ بڑھتے بڑھتے سارے دل کو گھیر لیتے ہیں۔ یہاں فرمایا گیا کہ جھوٹی گواہی کا اثر دل پر پڑے گا کہ اس سے گواہ کا دل کالا ہوگا۔ ابن ابی عبلہ نے قَلْبَهٗ فتح سے پڑھا ہے یعنی وہ جھوٹا گواہ اپنے دل کو گنہگار کرنے والا ہے (تفسیر روح المعانی و بیان و مدارک وغیرہم) تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں اٰثِمٌ بمعنی مسخ ہے یعنی جھوٹے گواہ کا دل مسخ ہو جاتا ہے خدا کی پناہ۔ یہ بھی قرض حسن کی ایک قسم ہے کہ مقروض سے کسی قسم کی پختگی کر دے۔ نیز صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے قرض دے دیا جائے' دوسرا قانونی قرضوں میں تو حکومتیں ذمہ دار ہوتی ہیں۔ ایسے قرض کا اللہ تعالیٰ ذمہ دار ہے کہ اگر مقروض نے نہ دیا تو رب تعالیٰ اس کی سخت پکڑ فرمادے گا۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۔ مَا سے سارے نیک و بد اعمال مراد ہیں۔ اور تَعْمَلُوْنَ میں عام مسلمانوں سے خطاب یعنی اے مسلمانو اللہ تمہارے سارے نیک و بد اعمال کا جاننے والا ہے۔ ہر ایک کو عمل کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔

خلاصہ تفسیر

اے قرض کا معاملہ کرنے والو اگر تم دونوں یا تم میں سے کوئی ایک مسافر ہو جہاں اس کا کوئی جان پہچان والا نہ ہو۔ اور تمہیں

پردیس میں قرض کے لین دین کی حاجت پڑ جائے اور اتفاقاً کوئی لکھنے والا' یا قلم دوات یا کاغذ نہ پاؤ تو مقروض کو چاہیے کہ اپنی کوئی چیز قرض دینے والے کے پاس گروی رکھ دے۔ جس پر اس کا قبضہ کرا دے لیکن اگر قرض خواہ مقروض کو دیانتدار سمجھ کر اس پر بھروسہ کرے اور بغیر تحریر و گواہی اور بغیر گروی ویسے ہی قرض دے دے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ جیسے تمام ظاہری نیکیاں روزہ' نماز' حج' زکوٰۃ وغیرہ ظاہر جسم کا تقویٰ ہے مگر مقبول و محبوب بندوں کا ادب دل کا تقویٰ ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (بقرہ: ۱۵۸) صفا مروہ پہاڑ اللہ کے شعار سے ہیں۔ اور فرماتا ہے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (حج: ۳۲) کہ جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کا تقویٰ ہے۔ ایسے ہی دوسرے گناہ جسم کا فسق ہیں۔ مگر گواہی چھپانا دل کا فسق کہ یہ کبھی کفر بھی ہو جاتا ہے۔ جو علماء حضور انور کے فضائل و مناقب چھپاتے ہیں یا بیان کرنے سے کتراتے ہیں وہ دل کے فاسق ہیں۔ حضور کے مناقب نہ چھپیں گے یہ خود چھپ جائیں گے۔ گرد و غبار یا شامیانہ سے سورج نہیں چھپتا بلکہ یہ شخص اس کے فیض سے چھپ جاتا ہے تو مقروض کو چاہیے کہ وقت پر اس کا قرضہ ادا کر دے کیونکہ اس نے اس پر دو احسان کیئے۔ قرض اور وہ بھی بغیر تحریر و گواہی دیا۔ مقروض کو چاہیے کہ اس معاملہ میں اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے کہ نہ تو ادا میں دیر لگائے اور نہ قرض میں کچھ کمی کرے۔ قرض خواہ کی شرافت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ اے مسلمانو تم گواہی کبھی نہ چھپاؤ۔ کہ نہ تو گواہی دینے سے انکار کرو۔ نہ اسے بدلو اور نہ اپنے خلاف سچے اقرار سے بچو۔ جو گواہی چھپائے گا وہ یہ نہ سمجھے کہ اسکی صرف زبان گنہگار ہوگی نہیں بلکہ اس کا دل بھی گنہگار ہوگا اور دل تمام اعضاء سے افضل ہے لہٰذا اس کی نیکی باقی تمام نیکیوں سے افضل' اور اس کا گناہ باقی گناہوں سے بڑھ کر ہے دیکھو دل کی نیکی ایمان ہے اور اس کا گناہ کفر' جو تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ نیز گواہی چھپانے سے آپس میں کدورت اور بغض پیدا ہوگا۔ جس کا انجام جنگ و جدال اور خونریزی ہے اور ظاہر یہ ہے کہ بغض وغیرہ دل کی بیماریاں ہیں۔ غرضکہ گواہی چھپانا بلاواسطہ بھی دل کی بیماری ہے اور بہت سی دلی بیماریوں کا ذریعہ لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے اللہ تمہارے ہر ظاہر باطن' نیک و بد اعمال کا جاننے والا ہے ہر ایک کو بقدر عمل جزا و سزا دے گا اور ممکن ہے کہ وَاِنْ اَمِنَ سے امانت رکھنے کا ذکر ہو۔ یعنی اگر تم میں سے کوئی کسی کے پاس امانت رکھے تو امین کو چاہیے کہ امانت صحیح طور پر ادا کرے چونکہ گواہی بھی گویا امانت ہے اس لئے اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی بیان فرما دیا گیا۔ واللہ اعلم۔ کسی کے پاس رکھا یہ بھی امانت ہے۔ کسی کی کوئی چیز پڑی مل گئی' یہ بھی امانت ہے۔ فوت شدہ شخص کا مال' اس کی اولاد ہماری تحویل میں آ گئی یہ بھی امانت ہے کسی نے اپنا راز ہم سے کہہ دیا' یہ بھی امانت ہے اسکی رازداری چاہیے۔ بشرطیکہ وہ راز کسی ظلم کا نہ ہو۔ ورنہ ظاہر کر دے کسی کے یتیم بچے ہماری پرورش میں آ گئے' یہ بھی امانت ہے بلکہ بادشاہ رعایا کا امانتی ہے بہر حال امانت کی بہت صورتیں ہیں اور ان کے بہت احکام امانت داری بہت اہم چیز ہے اس میں بہت مشکلیں مگر جس پر اللہ تعالیٰ کرم کرے!

فائدے اور مسائل

اس آیت سے چند فائدے اور مسائل حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** شرط کی نفی سے حکم کی نفی لازم نہیں۔ دیکھو اس آیت میں گروی رکھنے کا حکم بشرط سفر دیا گیا۔ یعنی جب ان دونوں میں سے کوئی مسافر ہو' تو مقروض گروی رکھے' حالانکہ سب کا اتفاق ہے کہ وطن میں بھی گروی رکھنا جائز ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی جب وفات ہوئی تو آپ کی زرہ شریف ابوشحم یہودی کے

پاس کچھ غلہ کے عوض گروی تھی جسے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چھوڑایا (خازن) رب فرماتا ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (النساء:۱۰۱) دیکھو اس آیت میں قصر نماز کو خوف کفار سے مشروط کیا۔ حالانکہ بغیر خوف بھی سفر میں قصر کا حکم ہے۔ **دوسرا فائدہ:** گروی کے لئے کاتب نہ ملنے کی شرط نہیں۔ گواہ و کاتب ملتے ہوئے بھی گروی رکھنا جائز ہے جیسا کہ مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا۔ لہٰذا یہ دونوں شرطیں اتفاقی ہیں نہ کہ احترازی۔ **تیسرا فائدہ:** رہن میں مرہون چیز پر قرض خواہ کا قبضہ ضروری ہے کہ اس کے بغیر رہن مکمل نہ ہوگا جیسا کہ مقبوضۃ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** قرض کے لئے تحریر، گواہ، رہن وغیرہ تمام چیزیں مستحب ہیں نہ کہ واجب اور سارے امر استحبابی ہیں نہ کہ وجوبی۔ جیسا کہ فَاِنْ اَمِنَ سے معلوم ہوا کیونکہ اگر یہ چیزیں فرض ہوتیں تو ان کے بغیر قرض دینا جائز ہی نہ ہوتا۔ پھر فَاِنْ اَمِنَ کے کیا معنی؟ **نوٹ:** جن لوگوں نے ان اوامر کو وجوب کے لئے مانا۔ وہ فَاِنْ اَمِنَ سے ان سب کو منسوخ مانتے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ یہ احکام استحبابی ہیں اور آیت مدائنہ کا کوئی حکم منسوخ نہیں سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ پوری آیت مدائنہ محکم ہے (کبیر) **پانچواں فائدہ:** حقوق کی گواہی چھپانا حرام ہے خواہ حقوق شرعیہ ہوں یا بندوں کے حقوق۔ گواہی کی اقسام اور احکام پچھلی آیت میں ہم بیان کر چکے یہ مسئلہ لَا تَكْتُمُوْا سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** گواہی چھپانا گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ سے معلوم ہوا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اکبر الکبائر شرک ہے اور جھوٹی گواہی اور گواہی چھپانا (تفسیر مدارک واحمدی) **ساتواں فائدہ:** مال برباد کرنا حرام ہے جیسا کہ ان سارے احکام سے معلوم ہوا۔ لہٰذا جوا، شراب خوری، سینما وغیرہ سب حرام کہ اس میں مال کی بربادی ہے (احمدی) **آٹھواں فائدہ:** مسلمانوں میں اتفاق اور اتحاد رہنا بہت ضروری ہے اسی لئے مال کے لین دین پر اتنی قیدیں لگا دی گئیں تاکہ مسلمانوں میں اتفاق قائم رہے۔ **نواں فائدہ:** قرض پر گروی رکھا جا سکتا ہے۔ نہ کہ امانت یا عاریت پر اسلئے قرآن کریم نے دین کے ساتھ رہن کا ذکر کیا۔ **دسواں فائدہ:** بیع سلم میں مسلم فیہ کے عوض گروی رکھنا جائز ہے کیونکہ وہ بھی تاجر پر قرض ہے۔ (احمدی) **مسئلہ:** رہن صرف ذی قیمت مال رکھا جاتا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اپنی بیوی بچوں یا اپنے کو گروی نہیں رکھ سکتا کیونکہ یہ مال نہیں۔ اسی طرح کوئی مسلمان شراب یا سور گروی نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ یہ ذی قیمت مال نہیں۔ **مسئلہ:** صرف ایجاب وقبول سے رہن مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک کہ مرتہن یعنی قرض خواہ اس پر قبضہ نہ کر لے۔ خیال رہے کہ خرید و فروخت اور نکاح و اجارہ صرف ایجاب وقبول سے مکمل ہو جاتے ہیں مگر رہن و ہبہ بغیر قبضہ غیر مکمل۔ **مسئلہ:** مرہون چیز سے کوئی فریق فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ گروی دینے والا نہ لینے والا۔ **مسئلہ:** مرہون چیز کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہیں کیونکہ مالک کا اس پر قبضہ نہیں اور قرض خواہ کی اس پر ملکیت نہیں۔ ہاں جب مقروض اپنا رہن چھڑا لے تب اس پر گذشتہ سالوں یعنی زمانہ قرض کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مگر قرض وضع کر کے۔ **مسئلہ:** مرہون چیز قرض خواہ کے پاس بقدر قرض مضمون ہے اور اس سے زیادہ امانت۔ لہٰذا اگر مرہون کی قیمت قرض سے زائد تھی اور وہ قرض خواہ کے پاس ضائع ہو گئی تو قرض خواہ کا قرض گیا اور زیادتی کا ضمان نہیں اور اگر اس کی قیمت قرض کے برابر تھی تو بھی یہ ہی حکم ہے اور اگر قرض سے کم تھی تو بقدر قیمت قرض ختم ہوگیا اور باقی مقروض سے لے۔ **مسئلہ:** مرہون پر جو کچھ قرض خواہ خرچ کرے وہ خرچ بھی

قرض میں شمار ہوگا۔ مثلاً مرہون گھوڑے کو جو گھاس دانہ قرض خواہ نے دیا۔ اس کی قیمت مقروض سے لے گا۔ **مسئلہ:** مرہون کی آمدنی بھی قرض کے عوض گروی رہے گی۔ مثلاً کسی کے پاس بھینس گروی تھی تو اس کے گھی' دودھ کی قیمت اور اس کے بچے خرچ وضع کر کے قرض خواہ کے پاس گروی رہیں گے مقروض قرض ادا کر کے یہ سب کچھ چھڑالے۔ **مسئلہ:** پنجاب میں جو رہن کا رواج ہے کہ کسی کا کھیت اپنے پاس گروی رکھا اور اس کی آمدنی کھائی پھر پورا قرض لے کر واپس کیا۔ یہ حرام ہے۔ اس کے لئے بجائے رہن کے بیع وفا کرنا چاہیے' جس کا طریقہ ہم پہلے بیان کر چکے۔ **مسئلہ:** مالک بنانے کے چار طریقے ہیں۔ بیع' ہبہ' کرایہ' عاریت مال کے عوض مال کا مالک کرنا بیع ہے۔ بغیر عوض کچھ دے دینا ہبہ مال کے عوض نفع کا مالک کرنا' کرایہ اور بلا معاوضہ نفع کا مالک کرنا عاریت ہے۔ **مسئلہ:** ہبہ کی تین صورتیں ہیں۔ صدقہ' نذر' ہدیہ محض رضاء الٰہی کے لئے کسی کو کچھ دینا صدقہ ہے رضاء الٰہی کے لئے کسی کو کچھ دے کر خوش کرنا نذر جیسے ماں باپ یا پیر استاد کا نذرانہ آپس میں تعلقات بڑھانے کے لئے تحفۃً کچھ دینا ہدیہ' صدقہ اور نذر واپس لینا منع ہے۔ ہدیہ کا واپس لینا جائز ہے۔ اگرچہ بُرا۔ **مسئلہ:** سات صورتوں میں ہدیہ کی واپسی منع ہو جاتی ہے جس کا جمع ہے دَمْعُ خَزْقَۃْ **مسئلہ:** امانت ضائع ہونے میں امین پر تاوان نہیں۔ ہاں اگر امین عمداً ضائع کر دے تو تاوان ہے۔ خیال رہے کہ امانت صرف مال ہی کی نہیں ہوتی بلکہ راز و مشورہ کی بھی ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔ اَلْمُسْتَشَارُ مُؤتَمَنٌ۔ **مسئلہ:** اگر کوئی شخص کسی کو کچھ رقم اپنے کسی کام میں خرچ کرنے کو دے تو اس پر لازم ہے کہ دیانت داری اور خیر خواہی کے ساتھ اس کے کام پر خرچ کرے' اگر پوری رقم خرچ نہ کی تو خائن ہوا اور اگر رقم بے جا یا زیادہ صرف کر دی تو بھی خائن ہوا۔ **مسئلہ:** حضور ﷺ کو رب نے بہت صفات سے نوازا' ان صفات میں بڑی صفت امانت داری ہے۔ کفار مکہ بھی حضور ﷺ کو نبوت سے پہلے محمد ﷺ امین کہتے تھے۔ اب بھی حضور ﷺ کی روضہ کی جالی پر یہ مضمون ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلَ اللّٰہِ صَادِقُ الْوَعْدِ الْاَمِیْنِ۔ جبرائیل امین کا بھی لقب روح الامین ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امین ہونا بڑی خوبی ہے اور امانت بڑا وصف ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں مقبوضۃٌ رِھٰن کی صفت ہے اور علم اصول کا مسئلہ ہے کہ صفت اور شرط کے بدلنے سے حکم نہیں بدلتا۔ تو چاہیے کہ جیسے سفر رہن کے لئے شرط نہیں۔ ایسے ہی قبضہ بھی شرط نہ ہو بلکہ دیگر معاملات کی طرح صرف ایجاب وقبول سے رہن بھی کامل ہو جائے (امام مالک) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ رہن ایک قسم کا وثیقہ اور مضبوطی ہے اور بغیر قبضہ یہ پختگی حاصل نہیں ہو سکتی اور جس صفت کے بغیر مقصود بدل جائے وہ حکم کے لئے قید ہوتی ہے (احکام القرآن) دوسرا یہ کہ رہن کا حکم صرف اس آیت سے ہی لیا گیا اور آیت میں تو قبضہ کی قید ہے۔ لہٰذا اب بغیر قبضہ رہن کو جائز کرنا قرآنی مقید کو مطلق کرنا ہے اور یہ بلانص جائز نہیں۔ ہاں اگر دوسری نصف مطلق ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا۔ تیسرا یہ کہ رہن میں قبضہ کی قید ایسی ہے جیسا گواہوں میں مرد مسلمان ہونے اور عادل کی قید۔ کیونکہ یہ مسئلہ اسی پر تو معطوف ہے اور وہ قیدیں گواہوں کے لئے احترازی تھیں کہ کافر اور فقط عورتوں اور فاسقوں کی گواہی معتبر نہیں لہٰذا قبضہ کی قید بھی رہن میں ایسی ہونی چاہیے (احکام القرآن) اسی لئے امام اعظم فرماتے ہیں کہ مشاع (جو غیر معین) کا رہن جائز نہیں۔ خلاصہ یہ کہ قبضہ

سے رہن وثیقہ بنتا ہے اور بغیر قبضہ نہ وہ رہن ہے نہ وثیقہ۔ لہٰذا یہ صفت لازم ہے۔ **دوسرا اعتراض:** رہن کا تاوان کیوں واجب ہے۔ چاہیے کہ وہ بھی مثل امانت کے ہو؟ **جواب:** اس لئے کہ اس آیت میں رہن پر امانت کا عطف کیا گیا اور معطوف علیہ معطوف کا غیر ہوتا ہے۔ اگر اس کا تاوان نہ ہوتا تو یہ امانت بنتی۔ پھر امانت کا اس پر عطف کرنا کیا معنی (احکام القرآن) **تیسرا اعتراض:** تو پھر رہن قرض سے زیادہ میں کیوں امانت ہے؟ **جواب:** اس لئے کہ حدیث شریف میں ایسا ہی آیا ہے۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اَلرَّهْنُ بِمَا فِيهِ۔ حضرت عطا فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی کے پاس گھوڑا گروی رکھا۔ قرض خواہ کے پاس گھوڑا مر گیا۔ مقروض نے بارگاہ نبوی میں دعویٰ کر دیا۔ حضور علیہ السلام نے قرض خواہ سے فرمایا ذَهَبَ حَقُّكَ۔ دوسری روایت ہے۔ لَا شَيْئَ لَكَ (احکام القرآن) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہون کا بقدر قرض ضمان ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت میں اَمِنَ سے قرض بلاتحریر دینا مراد ہے نہ کہ امانت۔ پھر اس سے دلیل پکڑنا غلط؟ **جواب:** قرآن کی عبارت میں الفاظ کے عموم کا لحاظ ہوتا ہے اور ہم نے تفسیر میں عرض کر دیا کہ اَمِنَ یا امنٌ سے بنا یا امانۃ سے بلکہ ایسے قرض کو امانت اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ امانت کی طرح محض اعتماد پر دیا گیا۔ ورنہ حقیقتاً امانت وہ ہی ہے جو بطور ودیعت کسی کو دی جائے۔ **پانچواں اعتراض:** جب رہن کا حکم عام ہے تو اس آیت میں سفر کی قید کیوں لگائی گئی۔ **جواب:** اس لئے کہ گروی رکھنا سخت مجبوری کی حالت ہے۔ جب مقروض قرض خواہ کو کسی طرح مطمئن نہ کر سکے تو کچھ گروی رکھے۔ اور ایسی مجبوری اکثر سفر میں درپیش آتی ہے۔ وطن میں لوگ ضامن بن جاتے ہیں گواہی اور تحریر وغیرہ سے قرض خواہ کا اطمینان کرایا جا سکتا ہے اس لئے یہ قید لگا دی گئی۔

خیال رہے: کہ آج کل رہن آمدنی کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ اس لئے وطن میں بھی اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ شریعت میں رہن کی آمدنی قرض خواہ کے لئے حرام ہے۔ وہ صرف قرض کی پختگی کے لئے ہے تاکہ قرض خواہ اس کے ذریعہ ضرورت کے وقت قرض وصول کر سکے۔ اس لئے وطن میں اسکی ضرورت کم درپیش ہوتی تھی۔

تفسیر صوفیانہ

دین دار لوگوں کے دو گروہ ہیں۔ واقفین اور سائرین۔ واقف تو وہ لوگ ہیں جو صورت پر ٹھہر گئے۔ معنی کی طرف نہ جا سکے وہ تو مثل اس چوزہ (مرغ کا بچہ) کے ہیں جو انڈے میں قید ہو کہ ان کا رزق صرف عالم اجسام سے ہی ہے اور وہ اسی جیل میں قید اس پر کراماً کاتبین مقرر ہیں جو اس کے اعمال ظاہرہ برابر لکھتے رہتے ہیں یہ لوگ قالب سے قلب کی طرف، صورت سے سیرت کی طرف جسم سے روح کی طرف راہ نہ پا سکے۔ ان کے سارے اعمال معاملات ہوں یا عبادات اس عالم میں سے ہیں۔ سائرین وہ لوگ ہیں جو صورت پر نہ ٹھہرے۔ اور اس منزل پر قیام نہ کیا بلکہ اس عالم سے عالم معنی کی طرف سفر کر رہے ہیں۔ ان کی پھر دو قسمیں ہیں۔ سیار اور طیار، سیار وہ ہیں جو شریعت وعقل کے قدم سے طریقت کی راہ طے کر رہے ہیں اور طیار وہ ہیں جن کے پیروں میں شریعت کے گھنگھرو ہیں اور وہ عشق وہمت کے پروں سے فضائے حقیقت میں اڑ رہے ہیں۔ ان کے باطنی اعمال تحریر کے قابل نہیں ان کی کراماً کاتبین کو خبر بھی نہیں۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

بعض اولیاء اللہ فرماتے ہیں کہ میرے بائیں ہاتھ کے فرشتہ نے بیس سال سے کچھ نہ لکھا۔ بعض نے فرمایا کہ مجھ سے داہناں ہاتھ کے فرشتہ نے کہا کہ براہ مہربانی اپنے قلبی معاملات میں سے کچھ ظاہر کرو تا کہ میں نامۂ اعمال میں لکھ کر رب سے قرب حاصل کروں' ہم نے اس سے کہہ دیا کہ تمہارے واسطے ظاہری فرائض ہی کافی ہیں' لکھے جاؤ۔ سمن' وارنٹ' قید و بند' تو کیل کی ضرورت اس کے لئے ہے جو صاحبِ حق کا حق ادا نہ کرے۔ اور اس سے بھاگا پھرے مگر جو دن رات حق والے کے دروازہ پر پڑا ہے۔ نہ اسے پکڑوانے کی ضرورت ہے اور نہ اس کو وکیل کی حاجت۔ یہاں ان سیّارین سے خطاب ہو رہا ہے کہ اگر تم عالم ظاہر سے عالم باطن کی طرف سفر کرو اور اس راہ میں تم کراماً کاتبین وغیرہ کسی لکھنے والے کو نہ پاؤ کیونکہ وہ تو ظاہری اعمال لکھتے ہیں تو تم اپنے قلب کو رب کے پاس گروی رکھ دو جو پہلے ہی سے اس کے قبضہ میں ہے۔ اَلْقَلْبُ بَیْنَ اَصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ سیارہ کا تو یہ حال تھا مگر عاشق طیارہ وہ تو پہلے ہی سے اپنا قلب اور عقل کھو چکا اور سب کچھ رب کے حوالہ کر چکا۔ اس کا قلب ایسی امانت ہے جسے بجز پروردگار کوئی نہیں رکھتا (روح البیان) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جب مخلوق کی امانت کی اتنی احتیاط ہے تو خالق کی امانت کتنی بڑی احتیاط کی چیز ہے۔ ہماری جان' مال' اولاد وغیرہ سب رب کی امانتیں ہیں۔ جس میں خیانت کرنا بڑا جرم ہے۔ ان سے برے کام لینا' یہ ہی خیانت ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا۔ (الاسراء:۳۶) کان' آنکھ' دل سب کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور فرماتا ہے مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ (ق:۱۸) جو بات بھی انسان کرتا ہے اس کی تحریر و گواہی قائم ہوتی ہے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ یہ عضو رب کی امانت ہیں۔ جن میں امانت داری بہت ضروری ہے۔ فرماتا ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ۔ (احزاب:۷۲) اس امانت کو آسمان و زمین پہاڑ برداشت نہ کر سکے۔ انسان نے برداشت کر لی۔ وہ امانت کیا ہے یا تو احکام شرعیہ کی امانت ہے یا عشق الٰہی کی امانت' جو صرف انسان کے حصہ میں آئی' اگر امانت داری کرے تو ثواب کا مستحق ہے ورنہ عذاب کا اور صاحب حق کی گواہی چھپانا سخت گناہ۔ رب کی گواہی چھپانا کفر ہے۔ ساری مخلوق اس کی ذات و صفات' اس کے پیغمبروں اور اس کی کتابوں کی گواہ ہیں۔ جو یہ گواہی ادا نہیں کرتا' وہ مجرم ہے اور جو بصدق دل پڑھتا ہے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ وہ ہی کامیاب ہے۔ بشرطیکہ یہ گواہی صدق دل سے ہو۔ نہ کہ محض زبان سے۔ اس لئے فرمایا گیا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ۔ رب جانتا ہے کہ کس کی گواہی قابل قبول ہے اور کس کی قابل رد اور گواہیاں صرف ایک دو بار دی جاتی ہیں۔ یہ گواہی توحید و رسالت ہر وقت ہر حالت میں' مرتے جیتے نیز اور گواہیاں صرف حاکم کے سامنے دی جاتی ہیں یہ توحید و رسالت کی گواہی ہر جگہ حتیٰ کہ مؤذن نماز کا بلاوا پیچھے دیتا ہے۔ یہ گواہیاں پہلے ہر مومن کو چاہیے کہ تنہا جنگل میں ایک آدھ بار باآواز بلند کلمہ پڑھ دے تا کہ وہاں کے شجر و حجر اس کے ایمان کے گواہ بن جائیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے جو اس زندگی میں ہر جگہ ہر وقت ہر طرح توحید و رسالت کی گواہی دے گا۔ کل قیامت میں اللہ و رسول بلکہ فرشتے اس کے ایمان کی گواہی دیں گے۔ پھر توحید و رسالت کی گواہی صرف زبان سے نہ دے بلکہ زبان' جنان' ارکان' شکل' لباس' وضع قطع سب سے گواہی دے کہ وہ شکل بھی مسلمانوں کی سی بنائے لباس بھی مسلمانوں کا سا پہنے جو مسلمان لباس و شکل کفار کی سی رکھیں وہ

ایک قسم کی گواہی چھپاتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو مقبول گواہی پر زندہ رکھے اور اسی پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

وہ ہی موت ہے وہ ہی زندگی جو خدا نصیب کرے مجھے کہ مرے تو ان ہی کے نام پر جو جئے تو ان پہ نثار ہے

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

واسطے اللہ ہی کے ہے وہ جو بیچ آسمانوں اور جو بیچ زمین کے ہے اور اگر ظاہر کرو گے تم اس کو جو بیچ دلوں تمہارے کے ہے

اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے جی میں ہے

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا تمہارا ساتھ اس کے اللہ پس بخشے گا واسطے جسکے چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا

یا چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا تو جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

اور اللہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** سورہ بقرہ میں عقائد اور شرعی احکام کا ذکر ہوا۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، قصاص، جہاد، حیض، طلاق، عدت، مہر، تجارت، سود، قرض وغیرہ تفصیل وار بیان ہوئے۔ اب آخر سورت میں رب کی کمال قدرت و علم کا ذکر ہو رہا ہے تاکہ بندے خوف الٰہی سے ان سب پر عمل کریں۔ گویا اب تک قوانین کا ذکر تھا اور اب ان پر عمل کرانے کے لئے رب کی قاہر حکومت کا بیان ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ تمہارے اعمال کا جاننے والا ہے اب اس کی دلیل ارشاد ہو رہی ہے۔ یعنی اس لئے علیم ہے کہ سب کچھ اس کی ملک، اس کی خلق ہے اور خالق و مالک اپنی مخلوق مملوک کو جانتا ہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں قرض کے لکھنے اور اس پر گواہ بنانے کا ذکر تھا جس سے لوگوں کے مال کی حفاظت مقصود تھی۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ان احکام کے نفع تم ہی کو ہیں ہماری ملکیت سے تو کوئی چیز نکل سکتی ہی نہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ گواہی چھپانا دل کا گناہ ہے۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اس کے سوا اور گناہ بھی دل کا گناہ ہے جس کا حساب لیا جائے گا (کبیر و احمدی) **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ گواہی چھپانے سے دل گنہگار رہتا ہے۔ اب اس مسئلہ کی تحقیق فرمائی جا رہی ہے کہ دل کے برے افعال میں سے کونسا فعل گناہ ہے اور کونسا نہیں۔

تفسیر

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ [illegible] لِلّٰهِ [illegible] شدہ عبارت کے متعلق ہو کر خبر مقدم ہے۔

نیز ہمارے علم کی رسائی' ان آسمان وزمین تک ہی ہے جسے عالم اجسام کہتے ہیں۔ باقی تمام عالم ہمارے مشاہدے سے دور ہیں۔ اس لئے اس عالم کا ہی ذکر ہوا۔ ورنہ رب تعالیٰ کی ملکیت وخلقت' ان چیزوں میں منحصر نہیں۔ یعنی وہ تو رب العالمین ہے۔ اس نے صدہا عالم بنائے سب کو پال رہا ہے اور مَا مبتداء مؤخر۔ اس کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ مَا سے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں مراد ہیں چونکہ بے عقل چیزیں نوعیت میں زیادہ ہیں اور عقل والی کم۔ اس لئے یہاں مَا فرمایا گیا۔ اگرچہ آسمان بھی سات ہیں اور زمینیں بھی سات مگر چونکہ آسمانوں کی حقیقتیں مختلف ہیں۔ کوئی چاندی کا کوئی سونے کا وغیرہ اور ساری زمینوں کی حقیقت ایک مٹی ہے۔ نیز آسمانوں میں فاصلہ ہے اور سات زمینیں پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسری سے چمٹی ہوئی ہیں۔ اس لئے سَمٰوٰتِ جمع اور اَرْضِ واحد لایا گیا اور خَلَقَ لَکُمْ میں لام نفع کا ہے۔ یعنی ہر چیز اللہ کی ملک ہے' کسی اور کی نہیں' حقیقی مالک وہ ہے مگر رب نے ہر چیز بنائی ہے تمہارے نفع کے لئے وہ خود نفع اٹھانے سے پاک ہے۔ یعنی آسمان وزمین کی ساری چیزیں اللہ ہی کی ہیں کہ وہ ان کا مالک وخالق ہے جیسا چاہے تصرف کرے۔ اس کے مقابل کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں چیز میری ہے۔ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ یہ جملہ پچھلے جملہ پر متفرع ہے تُبْدُوْا بَدَاءٌ سے بنا جس کا مادہ ہے۔ بدءٌ بمعنی ظہور۔ شروع کرنے کو اسی لئے ابتدا کہتے ہیں کہ اس سے شئی ظہور میں آتی ہے۔ یہاں مَا سے مراد دل کی بری چیزیں ہیں جیسا کہ اگلے جملہ سے معلوم ہو رہا ہے۔ نفس کے چند معنی ہیں۔ سانس' ذات' دل' نفس امارہ یہاں دل یا نفس امارہ مراد ہے۔ دل میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز دل کی صفت بن جائے اور اصلی طور پر اس میں سما جائے' جیسا برے اخلاق' حسد' غرور' تکبر' ناشکری' گواہی چھپانا' اور برے کاموں کا ارادہ (روح المعانی) اس تفسیر کا خیال رہے۔ اس سے بہت اعتراضات خود بخود اٹھ جائیں گے کیونکہ برے خیالات اور اوہام فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ میں داخل ہی نہیں ہوئے کہ اس سے نفس موصوف نہیں ہوئی۔ لہٰذا یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں یعنی اگر تم اپنے دل کے عیوب نفس کی بری صفات لوگوں پر ظاہر کرو کہ علانیہ بری حرکتیں کرو یا خفیہ یا چھپ کر گناہ کرو یا علانیہ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔ یہ اِنْ تُبْدُوْا پر معطوف ہے۔ تُخْفُوْا کا مصدر اِخْفَاءٌ اور مادہ خفیٌّ ہے بمعنی چھپنا ظہور کا مقابل۔ خیال رہے کہ یہاں ظاہر کرنا یا چھپانا بندوں سے مراد ہے۔ ورنہ رب تعالیٰ پر ہر چیز ظاہر ہے۔ یعنی اگر تم اپنی بری عادتوں اور برے ارادوں اور برے اخلاق کو لوگوں پر ظاہر کرو یا ان سے چھپاؤ کہ خفیہ طور پر گناہ کرو چونکہ علانیہ گناہ خفیہ گناہ سے بدتر ہے کہ اعلان میں گناہ بھی ہے۔ بے شرمی بھی اور لوگوں کو اپنے خلاف قیامت میں گواہ بنانا بھی۔ خصوصاً بزرگوں کے سامنے گناہ کرنا اس لئے علانیہ گناہ کا ذکر پہلے ہوا خفیہ کا بعد میں بہر حال تم جو گناہ بھی کرو۔ رب قیامت میں تم سے حساب ضرور لے گا۔ حساب کے معنی اور اس کی تحقیق اور اقسام پہلے پارہ میں عرض کئے جا چکے۔ بِهٖ کا مرجع مَا ہے اور چونکہ قیامت کے دن فرشتوں کے سارے کام رب کے حکم سے ہوں گے۔ اس لئے ان کا فعل رب کا فعل ہے۔ اس لئے اگرچہ حساب ملائکہ لیں گے مگر وہ فعل حقیقتاً رب ہی کا ہوگا پھر حساب کا انجام یہ ہوگا کہ فَیَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ۔ یہ دونوں نئے جملے ہیں اسی لئے مضارع مرفوع ہے۔ یَغْفِرُ غَفَرَ سے اور یُعَذِّبُ عَذَبَ سے بنا' غَفَرَ بمعنی ڈھکنا اور عَذَبَ بمعنی روکنا اسی لئے چھلکے کو غفر کہتے ہیں کہ وہ مغز کو ڈھانپے ہوتا ہے اور میٹھے پانی کو ماءٌ عَذْبٌ کہ وہ پیاس کو روکتا ہے۔ اس کی مفصل تشریح پہلے پارہ میں ہو چکی بخشش کو مغفرت اور سزا کو عذاب کہا جاتا

ہے۔دونوں جگہ یشاءُ کا مفعول پوشیدہ ہے۔دونوں جگہ مَنْ سے مراد مجرم ہیں نہ کہ نیک کار بندے کہ معافی دینا سزا دینا جرم پر ہی ہوتا ہے۔یعنی رب تعالیٰ ہر ظاہر و پوشیدہ عیوب کا حساب لے گا۔پھر جس مجرم کو چاہے گا اپنے فضل سے بخشے گا اور جس کو چاہے گا اپنے عدل سے عذاب دے گا۔چونکہ عذاب پر مغفرت اور غضب پر رحمت غالب ہے اس لئے مغفرت کا ذکر پہلے کیا گیا۔وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔یہ جملہ گویا گزشتہ کی دلیل ہے۔یعنی رب تعالیٰ چونکہ سب کا حاکم ہے کسی کا محکوم نہیں سب اس کے محکوم و مخلوق ہیں۔وہ ہر چیز پر قادر ہے کسی کو اس پر قدرت نہیں۔لہٰذا بخشنے اور عذاب دینے میں اسے کوئی روک نہیں سکتا۔اس آیت کی پوری تحقیق اور شیئ کے لغوی و اصطلاحی معنی پہلے سیپارہ میں مسئلہ امکان کذب کے ماتحت ہو چکی۔

خلاصہ تفسیر

آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اللہ ہی کی ملک اس کی مخلوق ہیں۔ان میں کسی کی شرکت نہیں۔تم لوگ اپنے نفسانی عیوب میں سے جو ظاہر کرو اور جو چھپاؤ اس طرح کہ علانیہ ظاہر ظہور گناہ کروٗ یا خفیہ چھپ کر گناہ کر و یا دل کے خطرات اور ارادہ ظاہری ہو یا باطنی رب سب کا حساب لے گا۔بعد حساب مہربانی کرے کہ گناہ دکھا کر اقرار کرا کر معاف فرما دے۔یا اس پر پکڑ فرما دے۔حساب ضرور لے گا۔کیونکہ ہر چیز اس کے علم میں ہے۔تمہارے اظہار پر اس کا جاننا موقوف نہیں۔پھر حساب لے کر جس مجرم کو چاہے گا محض اپنے فضل و کرم سے بخش دے گا اور جس کو چاہے گا محض اپنے عدل و انصاف سے عذاب دے گا کیونکہ وہ شہنشاہ مختار ہے۔اسے کوئی روکنے والا نہیں۔رب تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔لہٰذا دل کے چھپے عیوب پر مطلع ہو کر حساب لینا اور کسی کو بخش دینا اور کسی کو سزا دینا تعجب نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔**پہلا فائدہ:** ہر چیز کا مالک حقیقی رب تعالیٰ ہے۔اس کے ماسوا کی ملکیت مجازی عطائی اور فانی ہے۔جیسا کہ لِلّٰہِ کے حصر سے معلوم ہوا۔دوسری جگہ ارشاد ہو۔وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (التوبہ:۴۱) اپنے جان و مال سے جہاد کرو۔اس میں جان و مال کو مسلمانوں کی چیز قرار دیا گیا۔یعنی حقیقی ملک رب تعالیٰ کی ہے اور مجازی ملک مخلوق کو بھی حاصل ہے۔اس قسم کے تمام حصروں کا یہ ہی حال ہے جیسے اللہ کافی گواہ ہے۔اللہ کافی وکیل ہے۔اللہ کافی حساب لینے والا ہے کہ اس کی یہ تمام صفات حقیقی ہیں اور دوسروں کی مجازی۔اسی طرح لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الکہف:۲۶) کہ زمین و آسمان کا غیب رب کا ہی ہے یعنی علم حقیقی رب کے ساتھ خاص ہے اور عطائی مجازی اس کے پیاروں کو بھی حاصل۔جو لوگ اس آیت کی آڑ میں انبیائے کرام کے علم غیب عطائی کا بھی انکار کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ سورۂ بقرہ کی آیت سے مخلوق کی ملکیت کا بھی انکار کریں نہ کسی کو گواہ مانیں نہ وکیل نہ بادشاہ دیکھو پھر کیا لطف آتا ہے۔غرض ہر چیز میں ذاتی اور عطائی کا فرق کرنا پڑے گا۔**دوسرا فائدہ:** رب تعالیٰ اولاد وغیرہ سے پاک ہے کیونکہ اپنی اولاد اور بیوی پر ملکیت نہیں ہوتی۔اگر معاذ اللہ رب کی کوئی اولاد یا بیوی ہوتی تو وہ تمام کا مالک نہ ہوتا۔لہٰذا اس آیت میں مشرکین کا بھی رد ہے جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔اور عیسائی یہودیوں کی بھی تردید ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔[illegible] سے معلوم ہوا۔لہٰذا اس میں معتزلہ اور

روافض کا رد ہے جو حساب کے منکر ہیں جب دنیا میں مالک اپنے غلاموں سے معمولی چیزوں کا حساب لیتے ہیں تو رب تعالیٰ اپنی اتنی نعمتوں کا حساب کیوں نہ لے۔ **چوتھا فائدہ:** گناہ کبیرہ کی مغفرت اور گناہ صغیرہ پر عذاب ہو سکتا ہے جیسا کہ لِمَنْ يَّشَآءُ کی تعمیم سے معلوم ہوا مگر خیال رہے کہ کبیرہ سے کفر کے سوا دیگر گناہ مراد ہیں۔ کفر کی مغفرت کبھی نہیں ہو سکتی۔ رب فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء: ۴۸) ایسے ہی مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ میں مَا سے مراد برے خیالات برے ارادے اور بری نیتیں ہیں اچھے اعمال اچھے اقوال اچھے ارادے اس میں داخل نہیں کیونکہ آگے مغفرت اور عذاب کا ذکر ہے۔ اچھے اعمال کی قبولیت ہوتی ہے نہ کہ مغفرت معافی اور اچھے اعمال پر ثواب ملتا ہے نہ کہ عذاب یوں ہی تُظْهِرَ اور تُخْفُوْهُ ہم گنہگار مسلمانوں سے خطاب ہے حضور محمد مصطفیٰ ﷺ ان جیسے خطابات میں داخل نہیں کہ وہ گناہوں سے پاک ہیں وہاں گناہ کی پہنچ بھی نہیں۔ **پانچواں فائدہ:** حساب و کتاب ہمارے اظہار پر موقوف نہیں بلکہ ہم جو کام چھپ کے کر لیتے ہیں اس کا بھی حساب ہے۔ جیسا کہ اَوْ تُخْفُوْهُ سے معلوم ہوا۔ مگر خیال رہے کہ حساب حشر دو قسم کا ہے۔ حساب یسیر یعنی پیشی پھر معافی اور حساب عسیر یعنی پوچھ گچھ کہ تم نے گناہ کیوں کیے حساب یسیر تو ہر خطرہ اور وسوسہ پر ہو سکتا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (الزلزلۃ: ۸) مگر حساب عسیر اور سزا گناہ کے ارادہ پر نہیں ہو سکتا' لہٰذا آیت واضح ہے۔ **چھٹا فائدہ:** بندے کے افعال بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ بندہ ان کا خالق نہیں کیونکہ وہ بھی زمین و آسمان کی چیزوں میں سے ہی ایک چیز ہے۔ **مسئلہ:** جیسا کہ ظاہری اعضاء سے دو طرح کے کام ہوتے ہیں۔ اختیاری اور غیر اختیاری۔ اختیاری جیسے زبان سے بالارادہ بولنا یا ارادۃً آنکھ سے کچھ دیکھنا یا ہاتھ ہلانا اور غیر ارادی جیسا بلا قصد منہ سے کچھ نکل جانا یا بلا ارادہ کسی عورت پر نظر پڑ جانا' یا ہاتھ کے رعشہ کی حرکت ان میں اختیاری کاموں پر عذاب و ثواب ہے۔ غیر اختیاری پر نہیں۔ ایسے ہی دل کے کام بھی بعض اختیاری ہیں اور بعض غیر اختیاری۔ اختیاری جیسے کفر کا عقیدہ اپنے کو بڑا سمجھنا' برے کاموں کا ارادہ اور غیر اختیاری جیسے برے وسوسے اور خطرات و خیالات ان میں بھی اختیاری فعل پر پکڑ ہے۔ غیر اختیاری پر نہیں۔ تُخْفُوْهُ سے یہ ہی مراد ہے۔ لہٰذا آیت منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے۔ دیکھو رب فرماتا ہے۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ (بقرہ: ۲۲۵) جس سے معلوم ہوا کہ دلی کسب کا اعتبار ہے نہ کہ فقط وہم کا نیز ارشاد فرمایا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ان آیتوں اور بہت سی احادیث سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ دل کے اختیاری فعل پر سزا اور جزا ہے۔

خیال رھے: کہ بعض صحابہ کرام جیسے حضرت علی و ابن عباس و ابن مسعود اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور بہت سے علماء نے اس تُخْفُوْهُ میں (وسوسوں اور دلی خطرات کو بھی داخل مانا ہے اور وہ حضرات اس آیت کو لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا سے منسوخ مانتے ہیں۔ دیکھو (تفسیر کبیر و روح المعانی و روح البیان) بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ ابن عمر سے روایت کی کہ یہ آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ سے منسوخ ہے۔ (روح المعانی) ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ہم سب بہت غمگین ہوئے کہ جب دلی خطرات کا بھی حساب ہے تو ہم میں سے کون عذاب سے بچ سکے گا۔ تب آیت لا یکلف اللہ نفسًا نازل ہوئی (درمنثور) تفسیر کبیر و خازن نے فرمایا کہ جب یہ آیت اُتری تو

حضرت ابو بکر و عمر، عبد الرحمٰن ابن عوف اور معاذ ابن جبل اور دیگر حضرات (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ یہ حکم طاقت سے زیادہ ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم بھی بنی اسرائیل کی طرح کہنا چاہتے ہو۔ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یوں کہو سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا۔ یعنی ہم نے سنا اور اطاعت کریں گے۔ صحابہ کرام نے یہ کہا مگر ان کی آوازیں خوف سے کانپتی تھیں۔ ایک سال کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا الخ غرضکہ اس آیت میں بہت اختلاف ہے ان دونوں قولوں کی مطابقت یوں ہو سکتی ہے کہ اگرچہ صحابہ کرام اس آیت کا صحیح مطلب جانتے تھے لیکن انتہائے خوف الٰہی کی وجہ سے ان کی نظر ظاہری عموم پر پہنچی۔ حضور ﷺ نے خود تفسیر نہ فرمائی بلکہ انہیں اطاعت کا حکم دیا۔ پھر رب نے خود یوں تفسیر فرمادی کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا الخ گویا وہ آیت اسی آیت کی تفسیر ہے۔ جس سے ایک وہم دور کیا جا رہا ہے نہ کہ ناسخ کبھی توضیع کو بھی مجازاً ناسخ کہہ دیا کرتے ہیں (روح المعانی) اس کی مثال یوں سمجھو کہ آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (التوبہ:۸۰) نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ مجھے رب نے اختیار دیا ہے۔ منافقین کے لئے دعائے مغفرت کروں یا نہ کروں۔ میں نے ایک جانب کو اختیار کر لیا۔ اس فرمانے کی وجہ غلبہ رحمت ہے نہ کہ مقصد کلام سے بے توجہی۔ **مسئلہ:** اس میں اختلاف ہے کہ خبر کا نسخ جائز ہے یا ناجائز۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس و علی و دیگر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے جائز فرمایا مگر جمہور کا قول یہ ہے کہ کسی خبر کا نسخ جائز نہیں۔ خواہ قدیمی چیزوں کی خبر ہو۔ جیسے رب کی ذات و صفات یا متغیر چیز کی جیسے ایمان زید وغیرہ (روح المعانی، خازن و کبیر وغیرہ) **مسئلہ:** جن خبروں سے حکم یا ممانعت سمجھی جاتی ہے وہ منسوخ ہو سکتی ہیں جیسے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ:۱۸۳) وغیرہ (روح المعانی) **مسئلہ:** حق یہ ہے کہ ارادہ گناہ پر گناہ کا عذاب نہ ہوگا بلکہ ارادہ گناہ کا۔ کوئی چوری کرنے نکلا مگر نہ کر سکا تو اس کے ہاتھ نہیں کٹ سکتے۔ ہاں اس ارادہ کا گنہگار ہوا نہ کہ چوری کا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں فرمایا گیا لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا خَلَقَ لَكُمْ الخ (بقرہ:۲۹) یعنی سب چیزیں تمہارے لئے پیدا کی گئیں۔ یہاں بھی لام ہے اور وہاں بھی ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** یہاں ملکیت کا لام ہے اور وہاں نفع کا۔ یعنی ہر چیز رب کی ملک ہے اور تمہارے نفع کے لئے۔ خدا تعالیٰ نفع حاصل کرنے سے پاک ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین کی چیزیں اللہ کی ہیں۔ بتاؤ خود آسمان و زمین بھی اللہ کے ہیں یا نہیں۔ کیا وہ کسی اور کے ہیں؟ (آریہ) **جواب:** قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز برتن سے جدا نہ ہو سکے۔ تو جو اس چیز کا مالک ہوگا وہ برتن کا بھی مالک ہوگا جو مکان کا مالک ہے وہ ہی اس کے کڑی، تختوں اور کواڑوں کا بھی مالک ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مکان میں منقولی سامان کسی اور کا ہو یہ آسمان و زمین کی چیزیں ان سے نکل سکتی ہی نہیں۔ لہٰذا جب رب ان کا مالک تو آسمان و زمین کا بھی مالک۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا بخشش کے مستحق کو نہ بخشنے اور غیر مستحق کو بخشنے پر قادر ہے کیونکہ فرمایا گیا لِمَنْ يَّشَآءُ اور یہ صریح ظلم ہے کیا مسلمانوں کا خدا ظالم ہے؟ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** یاد بخیر! پنڈت جی بہت دنوں میں بولے مگر ایسے بولے جیسے ہمیشہ بولا کرتے ہیں پنڈت جی اس سے پہلے

جرموں کا ذکر ہو چکا ہے انہی کی معافی اور سزا کا تذکرہ ہے۔ یعنی جس مجرم کو چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔ نیک کار کے عذاب کا کہاں ذکر ہے' بات یہ ہے کہ تین قسم کی حیثیتیں ہیں۔ ایک سب کا محکوم ہونا۔ جیسے رعایا بادشاہ سے لے کر چپڑاسی تک کی محکوم ہے۔ دوسرا بعض کا محکوم بعض کا حاکم ہونا' جیسے تھانیدار۔ تیسرا کل کا حاکم ہونا جیسے بادشاہ کہ وہ مختار مطلق ہے۔ اسے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں یہ ہی فرمایا جا رہا ہے کہ ہم کل کے حاکم ہیں مجرموں کو بخشنے اور سزا دینے میں پورا اختیار رکھتے ہیں۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر اچھے برے ارادہ وخیال کی بھی پکڑ اور حساب ہے۔ اور ہر نبی ولی کا بھی حساب ہے اور کافر کا کفر بھی قابل معافی ہے کیونکہ مَا اور تُخْفُوْا وغیرہ میں کوئی قید نہیں۔ **جواب:** یہاں مَا سے مراد برے خیالات ہیں اور تُبْدُوْا تُخْفُوْا میں ہم عام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ نبی ﷺ کو اس آیت سے کوئی نسبت نہیں۔ **چھٹا اعتراض:** جب انسان کو خدا نے ہی نیک و بد بنایا ہے تو اسے سزا و جزا نہ ہونا چاہیے اور جب خدا ہی کے حکم سے انسان نیکی اور بدی کرتا ہے تو پھر اس کی ذمہ داری خدا ہی پر ہے۔ مثلاً اگر جرنیل کے حکم سے کوئی سپاہی کسی کو مار ڈالے تو اس کا ذمہ دار جرنیل ہوگا نہ کہ سپاہی (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** اس کا جواب ہم پہلے اور دوسرے پارہ میں بہت دفعہ دے چکے۔ پنڈت جی کو ایک سوال دوہرانے کی بیماری ہے۔ پنڈت جی خیال رکھو کہ ہر انسان فطرت یعنی توحید پر پیدا ہوتا ہے وہاں سے کافر ہو کر کوئی نہیں آتا۔ پھر وہ نیک و بد اعمال کے ذریعہ اپنے کو سزا یا جزا کا مستحق بناتا ہے اور خدا نے برائی کا نہ تو کسی کو حکم دیا اور نہ وہ برائی سے راضی ہے۔ شاید تمہارے پرماتما نے پاپ کا حکم دیا ہوگا۔ اسلامی خدا نے گناہوں سے بچنے اور نیک بننے کا ہی حکم دیا۔ پھر جرنیل والی مثال کیونکر درست ہو سکتی ہے۔ جرنیل قتل کا حکم دے کر اس کا ذمہ دار بنا۔ رب تعالیٰ نے برائی کا حکم دیا اور نہ اس کی طرف کوئی برائی منسوب ہو سکے' برائی کا حکم دینے والا نفس یا شیطان ہے۔ **ساتواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ دلی خیالات کا بھی حساب ہوگا اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ رب نے میری امت کے دلی خطرات معاف کیے جب تک کہ وہ کلام نہ کرے یا اس کے مطابق عمل نہ کرے۔ اس آیت و حدیث میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ سے منسوخ ہے۔ جیسا کہ حضرت علی و ابن عباس و عائشہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول ہے دوسرا یہ کہ یہ آیت مجمل ہے جس کی تفسیر لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ (بقرہ:۲۸۶) ہے یعنی اس سے برے ارادے اور دل کے اختیاری افعال مراد ہیں نہ کہ غیر اختیاری خیالات اور حدیث شریف میں فقط خطرات مراد' ارادہ اور خطرہ میں فرق ہے۔ تیسرا یہ کہ اس حساب سے صرف پیشی مراد ہے جسے حساب یسیر بھی کہتے ہیں فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا (انشقاق:۸) یعنی قیامت میں برے خطرات بھی انسان پر پیش تو کر دیئے جائیں گے مگر ان پر پکڑ نہ ہوگی۔ چوتھا یہ کہ اس حساب سے دنیوی سزائیں مراد ہیں کہ یہاں کے غم اور تکالیف' ان برے خطرات کا کفارہ بن جاتے ہیں جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے۔ پانچواں یہ کہ اِنْ تُبْدُوْا سے مراد علانیہ گناہ کرنا ہیں اور تُخْفُوْا سے چھپ کر یعنی اگر تم علانیہ گناہ کرو تو بھی حساب ہوگا اور چھپ کر کرو تو بھی۔ چھٹا یہ کہ حساب سے مراد فقط خبر دینا اور اس کا اقرار کرانا ہے۔ **آٹھواں اعتراض:** یہ جوابات اصل اعتراض کو نہیں اٹھاتے' کیونکہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَفَا لِاُمَّتِیْ عَمَّا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسَهَا مَا لَمْ تَتَكَلَّمُوْا بِهٖ اَوْ يَعْمَلُوْا بِهٖ۔ (متفق علیہ) یعنی برائی کا ارادہ معاف

ہے جب تک کہ اس کے مطابق کلام یا عمل نہ کرے اور تمہارے جواب سے معلوم ہوا کہ قلب کے اختیاری فعل یعنی ارادہ گناہ پر پکڑ ہے۔ **جواب:** یہ حدیث احکام شرعیہ کے بارے میں ہے یعنی فقط ارادے سے طلاق یا عتق یا بیع یا صدقہ یا ہبہ نہ ہو گا۔ جب تک کہ اس کا قول یا اس پر عمل نہ ہو اور یہاں اخروی پکڑ کا ذکر ہے حدیث شریف میں ہے کہ جب دو مسلمان جنگ کے لئے نکلے اور ایک نے دوسرے کو قتل کیا تو قاتل مقتول دونوں جہنمی' قاتل تو قتل کی وجہ سے' اور مقتول ارادہ قتل سے کہ وہ بھی اسی ارادے سے آیا تھا مگر اسے موقعہ نہ ملا (از احکام القرآن) **نواں اعتراض:** خبر کا نسخ ناجائز ہونا چاہیے کیونکہ یہ جھوٹ یا لاعلمی سے ہوسکتا ہے پھر اتنے صحابہ کرام اس کے کیوں قائل ہو گئے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ نسخ خبر کے وہ حضرات بھی قائل نہیں ان کے کلام میں جو نسخ آیا وہ مجازاً بمعنی تفسیر ہے۔ (روح المعانی) دوسرا یہ کہ وہ حضرات واقعات کی حکایت کو قابل نسخ نہیں مانتے بلکہ صرف قوانین کی خبروں کو مثلاً یہ ممکن نہیں کہ رب تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی خبر دے کہ ایسا ہوا تھا اور پھر اسے منسوخ کر دے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ پہلے خبر دی جائے کہ ہم تمہارے دلی ارادوں کا بھی حساب لیں گے۔ پھر ارشاد فرمادے کہ اچھا اس کا معافی ہے۔ اس کا حساب نہ لیں گے۔ یہ کسی خبر کی تبدیلی نہیں بلکہ قانون کی تبدیلی ہے کہ اب تک یہ قانون تھا اور اب سے یہ دوسرا جاری ہوا۔ اور ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ وہ احکام جو بصورت خبر ہوں نسخ قبول کر لیتے ہیں۔ **دسواں اعتراض:** جس کو چاہا بخش دیا جس کو چاہا سزا دے دی۔ یہ تو لاقانونی ہے اور لاقانونی غلط بھی ہے۔ باعث فساد ملک بھی آج ایسے راج کو چوپٹ راج اور ایسے ملک کو اندھیر نگری کہا جاتا ہے۔ رب کے ہاں ایسی اندھا دھند نہیں ہوسکتی؟ **جواب:** دوسرے کے حقوق میں اس قسم کا طریقہ غلط ہے۔ شریعت میں قانونی مجرم کو معاف نہیں کیا جاسکتا مگر اپنے مجرم کو جسے چاہیں معاف کرنا' جسے چاہیں معاف نہ کرنا بالکل درست ہے۔ ہم اپنے مقروض کو جسے چاہیں معاف کر دیں جسے چاہیں معاف نہ کریں۔ اس سے وصول کر لیں ہم کو حق ہے بندے رب کے مقروض ہیں وہ مختار ہے جس کو چاہے اپنا قرض معاف کر دے جس کو چاہے سزا دے۔ ہاں حقوق العباد میں یہ نہ ہوگا۔ وہاں ظالم سے ضرور مظلوم کا بدلہ دیا جائے گا۔ یا خود مقروض سے معاف کرایا جائے گا۔ یہاں گناہوں کی معافی کا ذکر ہے نہ کہ حقوق العباد کی معافی کا ذکر۔

تفسیر صوفیانہ

انسان روح اور جسم کے مجموعہ کا نام ہے۔ روح عالم امر کی ایک چیز ہے اور جسم عالم خلق کا روح ملکوت میں سے ہے اور جسم ملک میں سے روح نورانی ہے اور جسم ظلمانی روح علوی ہے اور جسم سفلی' ان میں سے ہر ایک اپنے عالم کی طرف جانا چاہتی ہے۔ روح کا قصد قرب رب العالمین ہے اور نفس و جسم کا میلان حق سے دوری اور اسفل السافلین کی طرف حضور ﷺ کی تشریف آوری اس لئے ہے کہ لوگوں کو نفسانی ظلمتوں سے پاک کر کے قرب الٰہی کا مستحق بنائیں اور ان کی ظلمت نفس کو مٹا کر ان پر روح کے انوار ظاہر فرمائیں جس کے بارے میں ارشاد ہوا۔ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔ (بقرہ: ۲۵۷) مگر شیطان کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو روحانی انوار سے نکالے اور نفسانی ظلمتوں میں پھنسائے تاکہ انسان رب العالمین سے دور ہو کر اسفل السافلین میں پہنچے۔ اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اے انسانو اگر تم اپنی ظلمات نفس کو ظاہر کرو کہ شریعت کے مخالف اور طبیعت کے موافق رہو یا ان ظلمات کو چھپاؤ اور دبا دو کہ طبیعت کی مخالفت کرو اور شریعت کی موافقت رب تعالیٰ

سب کا حساب فرمائے گا کہ قابل انوار نفوس کو پاک فرمائے گا اور جو روحیں ظلمتوں میں پھنسی ہیں انہیں ملوث کرے گا تو جس کو چاہے گا بخشے گا کہ اس کے نفس کو روح کے انوار سے روح کو حق کے انوار سے منور فرمائے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا کہ اس کے نفس پر دوزخ کی آگ بھڑکائے گا اور اس کی روح کو اپنے فراق کی آگ میں جلائے گا۔ اللہ عالم امر اور عالم خلق کی ہر چیز پر ہر طرح قادر ہے کہ عالم امر پر لطف اور تاریک جسم پر قہر فرماتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کامیاب وہ انسان ہے جس کی روح اس کے نفس پر غالب ہو اور ناکام وہ ہے جس کا نفس روح پر غالب۔ اور اس غلبہ کا پتہ اس کے افعال واعمال اور میلان سے چلتا ہے۔ (روح البیان) صوفیاء فرماتے ہیں کہ سمٰوات یعنی آسمان حضرات انبیاء کرام ہیں کہ یہ حضرات آسمان کی طرح خلق کو فیض دیتے ہیں اور مومنین حضرات (زمین) ہیں کہ یہ حضرات ہمیشہ انبیاء کرام سے فیض لیتے رہتے ہیں کبھی ان سے مستغنی نہیں ہوتے۔ آیت کے پہلے جملہ میں ارشاد ہوا کہ نبوت کے آسمانوں میں جو کچھ فیوض ہیں وہ بھی رب ہی کی طرف سے ہیں اور قلوب مومنین ہیں جو اثر لینے کی مختلف تاثیریں ہیں یہ بھی رب کی طرف سے ہیں۔ جیسے یہ ظاہری زمین مختلف تاثیر رکھتی ہے۔ ایسے ہی انسانوں کے دل مختلف اثر رکھتے ہیں۔ نبوت کا فیض ایک ہے مگر صدیقین خاص عام مومنین کے دل مختلف ہیں۔ جس اختلاف کی وجہ سے مختلف اثرات کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ سب رب کی طرف سے ہے۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط
ایمان لائے پیغمبر ساتھ اس کے جو اتارا گیا طرف ان کے سے رب ان کے ساتھ اور ایمان والے
رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کے پاس سے اس پر اترا اور ایمان والے
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ قف لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ
ہر ایک ایمان لایا ساتھ اللہ اور فرشتوں اس کے اور کتابوں اسکی اور رسولوں اسکے نہیں فرق کرتے ہم درمیان کسی کے
سب نے مانا اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم اسکے کسی رسول پر ایمان لانے
رُّسُلِهٖ قف وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾
رسولوں میں سے اسکے اور کہا انہوں نے سنا ہم نے اور اطاعت کی ہم نے بخشش تیری اے رب ہمارے اور طرف تیری لوٹنا ہے
میں فرق نہیں کرتے اور عرض کی کہ ہم نے سنا اور مانا تیری معافی ہو اے رب ہمارے اور تیری ہی طرف پھرنا ہے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** سورہ بقرہ رب کے نام سے شروع ہوئی تھی۔ اب اس کے محبوب ﷺ کے نام پر ختم ہو رہی ہے تاکہ اس کے شروع میں قرآن اتارنے والے کا نام ہو اور آخیر میں ان کا نام جن پر اتارا گیا۔ یہ ہی حال کلمہ، نماز، دعاؤں کا ہے کہ ان کی ابتدا اللہ کے نام سے ہے اور انتہاء حضور ﷺ کے نام شریف پر بلکہ مسلمان کی زندگی کا بھی یہ ہی حال ہے کہ جب دنیا میں آئے تو اذان سنے اور جب یہاں سے جائے تو کلمہ پڑھتے ہوئے کہ

اخیری سانس لفظ رسول اللہ پر ختم ہو۔ **دوسرا تعلق:** جب سلطانی حکم رعایا کی طرف آتا ہے تو اس کے پہلے سلطان کا نام ہوتا ہے بعد میں احکام کا ذکر' اور آخر میں مہر عدالت' اور وزراء امراء کی تصدیق۔ سورۂ بقرہ میں بھی یہ ہی ہوا کہ پہلے رب کا نام آیا پھر اس کے احکام ارشاد ہوئے اب آخر میں عدالتِ مصطفیٰ ﷺ کی مہر اور خدام بارگاہ صحابہ کرام کی تصدیق۔ یعنی یہ احکام رب نے بھیجے اور مصطفیٰ ﷺ اور ان کے جان نثاروں نے تصدیق کی۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کے کمال علم وقدرت کا ذکر تھا جس سے اس کی ربوبیت کا ثبوت ہوا اب مسلمانوں کی اطاعت شعاری اور وفاداری کا تذکرہ ہے جس سے ان کی عبدیت کا ظہور ہو۔ یعنی ہم کامل رب اور مسلمان ہمارے کامل بندے ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کے جلال کا ذکر تھا کہ ہم تمہارے ہر ظاہر اور ہر چھپے ہوئے عیوب کا حساب لیں گے۔ اب مسلمانوں کی مدح بیان فرما کر جمال الٰہی کا اظہار ہے کہ جیسے دنیا میں ہم مسلمانوں کی تعریفیں فرماتے' اور ان کے عیوب چھپاتے ہیں ایسے ہی آخرت میں ہوگا کہ مسلمانوں کی نیکیاں سب دیکھیں گے اور عیبوں پر پردہ ڈال دیا جائے گا' جیسے ہمارا علم قدرت کامل ہے۔ ویسے ہمارے جود ورحمت بھی کامل (کبیر) **پانچواں تعلق:** سورۂ بقرہ کی ابتدا میں پرہیز گاروں کی تعریف کی گئی تھی کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز وزکوٰۃ ادا کرتے ہیں اب ان مومنین کا پتہ بتایا جارہا ہے کہ وہ امت مصطفیٰ ﷺ ہے جس کے عقائد اعمال اور دعا کی یہ نوعیت ہے۔ **چھٹا تعلق:** اب تک عبادات ومعاملات کے بہت سے احکام بیان ہوئے۔ اب ان کی حقانیت کا ثبوت دیا جارہا ہے کہ نبی ﷺ محض اپنے خیال سے یا سن سنا کر یہ احکام بیان نہیں فرماتے بلکہ انہیں دلائل ومشاہدہ سے یقین ہے کہ جبرائیل فرشتہ ہیں نہ کہ جن اور یہ جو کچھ کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی طرف سے کہتے ہیں نہ کہ اپنی طرف سے۔ اور مسلمانوں کو بذریعہ معجزات یقین ہے کہ یہ قرآن رب کا کلام ہے نہ کہ کسی انسان کا اور نبی وجبریل (علیہما السلام) کلام بدلنے سے معصوم ہیں۔ اور یہ کلام شیطانی اثرات سے بالکل محفوظ۔

شانِ نزول

تفسیر خازن ودر منثور وغیرہ نے عبداللہ ابن عباس وغیرہم سے روایت کی کہ جب وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ الخ (بقرہ: ۲۸۴) آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کی ایک جماعت نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا حبیب اللہ ہم نے تمام احکام کی اطاعت کی اور ہم وفادار رہیں گے' لیکن دل کے وسوسے اور خطرے قابو سے باہر نہیں ہیں اگر ان پر حساب ہوا تو نجات کی کیا راہ ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم بنی اسرائیل کی طرح کہنا چاہتے ہو سَمِعۡنَا وَ عَصَیۡنَا ہم نے سن تو لیا مگر مانیں گے نہیں۔ تب وہ حضرات معذرت کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری جس میں غلامان مصطفیٰ ﷺ کی صفائی بلکہ سفارش کی گئی کہ اے محبوب (علیہ السلام) ہم گواہی دیتے ہیں کہ یہ لوگ آپ کے خدام ہمارے مطیع اور سچے مسلمان ہیں مگر جمہور مفسرین نے اس جگہ خاموشی اختیار کی کیونکہ ان کے نزدیک آیت وَاِنۡ تُبۡدُوۡا منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے۔ ہم دونوں قولوں کی مطابقت پچھلی آیت میں کر چکے۔

تفسیر

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ۔ اٰمَنَ ایمان سے بنا' جس کا مادہ امن ہے۔ لغوی ایمان کے معنی تصدیق کرنا' پہچاننا اور

ایمان لانا ہیں۔ یہاں ماضی اپنے ہی معنی میں ہے اور ایمان کے تینوں معنی کا احتمال ہے۔ الرَّسُوْلُ میں الف لام عہدی ہے جس سے حضور ﷺ مراد ہیں۔ چونکہ آپ وصف رسالت میں ایسے مشہور ہیں کہ رسول بولنے سے آپ ہی کی طرف دھیان جاتا ہے اس لئے نام پاک نہ لیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور انور ﷺ کو لاکھوں صفات بخشے' مگر آپ کا وصف رسالت بہت مشہور ہے۔ حتیٰ کہ کلمہ طیبہ میں آپ ﷺ کو رسول اللہ فرمایا گیا کیونکہ رسول خالق ومخلوق کے درمیان برزخ کبریٰ ہیں تمام صفات اس پر ہی متفرع ہیں چونکہ حضور انور ﷺ کا ایمان تمام خلق کے ایمان سے اعلیٰ بھی ہے اور مقدم بھی۔ اس لئے پہلے حضور انور ﷺ کے ایمان کا ذکر ہوا۔ پھر دوسرں کے ایمان کا اعلیٰ تو اس لئے ہے کہ تمام کا ایمان بالغیب ہے اور حضور انور ﷺ کا ایمان شہودی کہ رب کو اور تمام غیوب کو ملاحظہ فرمایا' اور مقدم اس لئے ہے کہ سب خلق سے پہلے حضور ﷺ کا نور پیدا ہوا اور حضور ﷺ نے کروڑوں سال اس طرح رب کی عبادت کی کہ صرف حضور ﷺ عابد تھے اور رب معبود' بما میں ب صلہ کی ہے اور مَا سے سارا قرآن یا سورۂ بقرہ۔ یا اس کے احکام مراد ہیں۔ انزل انزال سے بنا ہے۔ بمعنی ایک دم اتارنا۔ یا تو یہاں تنزیل کے معنی میں ہے۔ کیونکہ قرآن کا نزول آہستگی سے ہوا' یا اپنے ہی معنی میں ہے کیونکہ ہر رمضان میں حضرت جبریل سارا قرآن حضور علیہ السلام کو سنایا کرتے تھے اور حضور سے سنا کرتے تھے۔ یعنی دور فرمایا کرتے تھے۔ قرآن کریم کا آہستگی سے نزول تو احکام نافذ کرنے کے لئے تھا۔ حضور ﷺ کی تلاوت کے لئے نزول کی اور شان تھی فرماتے ہیں کہ سورۂ بقرہ کی آخری آیات معراج میں زیر عرش ہم کو عطا ہوئیں۔ حالانکہ یہ آیات مدنیہ ہیں اور معراج ہجرت سے پہلے ہے اور ہوسکتا ہے کہ مَا سے قرآن وحدیث اور حضور ﷺ کے سارے کشف والہامات سب مراد ہوں (کبیر) چونکہ ان میں سے ہزاروں چیزیں حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص تھیں۔ جس کی دوسروں کو خبر بھی نہ تھی۔ جیسے متشابہات قرآنیہ کا علم اور بہت سے راز و نیاز کی باتیں جو حضور انور ﷺ پر ہی ظاہر ہوئیں' کسی کو ان کی ہوا بھی نہ لگی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى۔ (النجم: ۱۰) اور حضور ﷺ فرماتے ہیں جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو روتے زیادہ اور ہنستے کم۔ اس لئے خصوصیت سے آپ کا ذکر علیحدہ کیا گیا۔ مِنْ ابتدائیہ ہے چونکہ قرآن کریم مسلمانوں کی روحانی پرورش کا ذریعہ ہے اس لئے یہاں حق تعالیٰ کو رب کے نام سے یاد فرمایا گیا اور چونکہ مربوبیت کی حضور ﷺ پہلی فرد ہیں کہ آپ پر رحمتیں بلاواسطہ اور دوسروں پر بالواسطہ ہیں۔ اس لئے رب کو حضور ﷺ کی طرف نسبت کیا گیا۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ میں یا تو واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف رسول پر ہے اور یہاں جملہ ختم ہوگیا۔ یا یہ واؤ ابتدائیہ ہے اور وَالْمُؤْمِنُوْنَ مبتدا اور یہاں سے جملہ علیحدہ (روح المعانی وکبیر وغیرہ) خیال رہے کہ یہاں مومنین سے یا تو خاص وہ جماعت مراد ہے جو حاضر بارگاہ ہوتی تھی یا سارے مسلمان یعنی اس قرآن کریم کی حقانیت اللہ کے رسول اور ان مسلمانوں نے دلائل ومعجزات وغیرہ سے پہچان لی (کبیر) یا رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے ان تاری ہوئی چیزوں کی تصدیق فرمادی کہ یہ رب کی طرف سے ہیں (خازن) یا رسول اللہ ﷺ تو سارے اتارے ہوئے پر پہلے ہی سے ایمان مشاہدہ لاچکے ہیں اور مسلمان یہ کہتے ہیں۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ۔ الخ...... یا تو كُلٌّ مبتدا ہے اور یا مُؤْمِنُوْنَ کی تاکید اس کا مضاف الیہ ھم ضمیر پوشیدہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس کا مرجع صرف مومنین ہیں۔ (خازن) ممکن ہے کہ رسول اور مومنین دونوں ہوں (مدارک وغیرہ) اٰمَنَ كُلٌّ کی خبر ہے چونکہ كُلٌّ

لفظاً واحد تھا اس لئے اٰمن واحد لایا گیا۔ خیال رہے کہ اٰمَنَ کا فاعل نبی ﷺ بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ جیسا کہ دوسری تفسیر سے معلوم ہوا اس صورت میں نبی کی نسبت سے ایمان مشاہدہ مراد ہے اور مومنوں کی نسبت سنا ہوا ایمان جیسے اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ میں يُصَلُّوْنَ (احزاب:۵۶) کے معنی ملائکہ کے اعتبار سے اور ہیں۔ اللہ کے اعتبار سے کچھ اور۔ باللہ میں ب صلہ کی ہے اور ملائکہ سے سارے فرشتے اور کتب سے ساری آسمانی کتابیں اور رسول سے سارے پیغمبر مراد ہیں۔ یعنی سارے مسلمان یا نبی اور سب مسلمان اللہ اور اس کے سارے فرشتوں اور اس کی ساری کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاچکے۔ ان سب چیزوں پر اجمالی ایمان ہے کہ رب تعالیٰ کے جتنے رسول جتنی کتابیں آئیں اور اس نے جتنے فرشتے پیدا فرمائے سب پر ہمارا ایمان ہے فرشتوں کی ذات اور ان کی صفات پر ہم صدق دل سے ایمان لاتے ہیں کہ سب سے عمدہ مخلوق فرشتے ہیں۔ ان میں سے بعض مقربین ہیں جو صرف عبادتیں کرتے ہیں اور بعض مدبرات جو عالم کا انتظام کرتے ہیں۔ مدبرات امر مقربین سے افضل ہیں اور سب سے چار فرشتے افضل اور ان چار میں حضرت جبریل افضل کہ وہ خادم انبیاء حامل وحی ہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ یہ جملہ يَقُوْلُوْنَ فعل پوشیدہ کا مفعول بہ ہے۔ جو اٰمَنَ کے فاعل کا حال یا كُلٌّ کی دوسری خبر نُفَرِّقُ تفریق سے بنا جس کا مادہ فرقٌ ہے۔ یہ مساوات کے مقابل یہاں اس سے فرق نبوت یا فرق اعتقاد مراد ہے نہ کہ فرق مراتب اَحَدٍ بمعنی احاد ہے کیونکہ بَيْنَ کثرت چاہتا ہے نیز اَحَدٍ نکرہ ہے جو نفی کے تحت میں عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ خیال رہے کہ اَحَدٍ وہ ہے جس کے ساتھ دوسرا مذکور نہ ہو اور واحد وہ جس کا کوئی مثل نہ ہو اور وحید وہ جس کا کوئی مددگار نہ ہو (روح البیان) مِنْ رُّسُلِهٖ کا متعلق پوشیدہ ہے جو اَحَدٍ کا حال یا صفت ہے۔ یعنی مسلمان یہ کہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں کہ ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی رسول پر ایمان لانے یا نبوت میں فرق نہیں کرتے نبی کو یکساں ہی مانتے ہیں۔ اور سب پر ایمان لاتے ہیں چونکہ اہل کتاب نے فرشتوں کا انکار نہ کیا تھا سب کو مانتے تھے۔ انہوں نے بعض کتابوں اور بعض رسولوں کا انکار کیا تھا۔ جیسے یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اور انجیل شریف کا انکار کیا۔ اور یہود و نصاریٰ نے ہمارے حضور ﷺ اور قرآن کریم کا انکار کیا مگر انکار کتاب کی وجہ انکار رسول تھا۔ اگر وہ لوگ ان حضرات انبیاء (علیہم السلام) کو مان لیتے تو ضرور ان کی کتابوں کو بھی مان لیتے لہٰذا اس جگہ فرق نہ کرنے میں صرف رسولوں کا ذکر ہوا یہ نہ فرمایا گیا کہ کتابوں یا فرشتوں میں فرق نہیں کرتے بلکہ فرمایا گیا کہ ہم رسولوں میں فرق نہیں کرتے سب کو مانتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی طرح بعض کے اقراری اور بعض کے انکاری نہیں۔ جیسے قرآن کریم کی ایک آیت کا انکار کفر ہے۔ ایسے ہی ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے۔ نیز دین بدلتا ہے نبی کے بدلنے سے دین یہود و نصاریٰ اس لئے مختلف ہیں کہ ان کے نبی مختلف ہیں۔ عیسائیوں کے تمام فرقے عیسائی کہلاتے ہیں کہ انکے نبی ایک ہیں۔ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ یہ اٰمَنَ پر عطف ہے اور چونکہ كُلٌّ معناً جمع ہے۔ لہٰذا قَالُوْا جمع ہوا۔ اس کا فاعل وہ ہی مومنین ہیں یا تو قالوا بمعنی ماضی ہے یا بمعنی حال۔ سَمِعْنَا سے گوش وہوش سے سننا اور اس کی حقانیت پر یقین کرنا مراد ہے۔ اَطَعْنَا اطاعت سے بنا جس کا مادہ طوعٌ ہے۔ بمعنی خوشی بخوشی فرمانبرداری کرنے کو اطاعت کہا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ سَمِعْنَا کا مفعول بہ سارا قرآن وحدیث ہے اور اَطَعْنَا کا مفعول صرف احکامْ کیونکہ سمعنا میں قوت ایمانی کی طرف اشارہ ہے۔ اَطَعْنَا میں عمل کی طرف اور ایمان سب پر ہوتا ہے اور اطاعت صرف احکام

کی۔ یعنی مسلمان نبی کا فرمان سن کر عرض کرتے ہیں کہ ہم نے آپ کے سارے فرمان گوش ہوش سنے' اور ان کی حقانیت کا یقین کیا۔ اور آپ کے سارے احکام کی اطاعت کریں گے۔ روح البیان و درمنثور نے فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت جبرائیل نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے آپ اور آپ ﷺ کی امت کی بڑی تعریف فرمائی۔ لہٰذا آپ کچھ رب سے مانگئے تو حضور ﷺ نے دعا مانگی۔ جس کو رب نے ان الفاظ میں نقل فرمایا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ اس روایت کی بنا پر یہاں قَالَ محذوف ہوگا جس کا فاعل نبی ﷺ ہیں اور یہ جملہ مفعول بہ۔ یا رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو تعلیم دی۔ تو یہ قُوْلُوْا فعل پوشیدہ کا مفعول بہ ہے۔ غُفْرَانَ' سبحان کی طرح مصدر ہے یا تو اغفر فعل پوشیدہ کا مفعول مطلق ہے یا نسئل کا مفعول بہ۔ یہ ضَرَبَ یَضْرِبُ سے ہے۔ ک ضمیر غفران کا مضاف الیہ ہے جو حقیقت میں نسئل کا مفعول تھی' رَبَّنَا سے پہلے یا پوشیدہ ہے۔ وَاِلَیْکَ میں واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ ایک پوشیدہ عبارت کا معطوف ہے یعنی مِنْکَ الْمُبْدَءُ وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ اِلَیْکَ ایک پوشیدہ عبارت کے متعلق ہو کر خبر مقدم ہے اور مصیر مبتداء مؤخر۔ مصیر' صَارَ یصیر کا مصدر میمی ہے اس کا مادہ صیر ہے۔ بمعنی ہو جانا اور لوٹنا۔ یعنی وہ عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ چونکہ ہم تیری اطاعت کا عہد کرتے ہیں تو بھی اپنے کرم سے ہماری خطاؤں کو بخش دے۔ ہم تجھ سے تیری مغفرت مانگتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تجھ سے ہی سب کی ابتدا ہے اور تیری طرف سب کی انتہاء۔

خلاصہ تفسیر

جو کچھ رب کی طرف سے نبی ﷺ پر اترا' اس پر یہ نبی بھی ایمان لائے اور سارے مسلمان بھی۔ کہ یہ رب کا کلام ہے۔ اس میں کسی کی ملاوٹ نہیں۔ نہ جبرئیل نے رب سے حاصل کرنے میں کچھ شک وشبہ کیا' نہ ادا کرنے میں کمی بیشی اور نہ رسول اللہ ﷺ نے سننے میں خطا کی' نہ پہچاننے میں کوتاہی' سارے مسلمان اللہ کی ذات اور اس کے صفات اور اس کے ناموں پر ایمان لائے۔ انہوں نے اعتقاد رکھا' کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک و مثل نہیں۔ اسکے علم وقدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ نیز اس کے فرشتوں پر ایمان لائے کہ وہ سب موجود ہیں گناہوں سے پاک ہیں۔ نورانی جسم ہیں۔ رب اور انسان کے درمیان واسطہ ہیں۔ انہی کے ذریعہ پیغمبروں پر کتابیں آئیں۔ نیز اس کی ساری کتابوں پر ایمان لائے کہ یہ اللہ کی کتابیں ہیں۔ کہانت جادو اور شیطانی الہامات سے پاک ہیں۔ قرآن میں کوئی تحریف و تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس میں محکمات و متشابہات ہیں۔ نیز وہ سارے پیغمبروں پر ایمان لائے کہ وہ گناہوں سے معصوم ہیں۔ وحی الٰہی کے امین' ساری خلق سے افضل ہیں۔ اور ان میں سے بعض بعض سے اعلیٰ اور افضل۔ چونکہ رب کی طرف سے کتابیں فرشتے لائے' اور پیغمبروں پر لائے۔ اس لحاظ سے یہاں پہلے ان کا ذکر ہوا پھر فرشتوں کا پھر کتابوں کا' پھر رسولوں کا' مسلمان یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح انبیاء پر ایمان لانے یا ان کے نبی ماننے میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں۔ یا بعض کی نبوت اصلی مانیں اور بعض کی عارضی سب کو اصل نبوت میں برابر مانتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مولیٰ ہم نے تیرا سارا کلام عقیدت سے سنا' اور تجھ سے عہد کرتے ہیں کہ تیرے احکام کی اطاعت کریں گے۔ اے مولیٰ ہمیں بخش دے۔ تجھ سے ہی سب کی ابتدا ہے اور تیری طرف سب کا لوٹنا ہے خیال رہے کہ جیسے حضور ﷺ فرشتوں پر ایمان لائے۔ ایسے ہی سارے

فرشتے حضور انور ﷺ پر ایمان لائے' حضور انور ﷺ فرشتوں کے مومن بھی ہیں اور مومن بہ بھی۔ بلکہ فرشتے حضور ﷺ پر صرف ایمان نہ لائے بلکہ حضور ﷺ کے مطیع و فرمانبردار بھی ہیں اور حضور ﷺ کے دعا گو بھی۔ ہمیشہ حضور ﷺ پر درود پڑھتے ہیں اور حضور ﷺ کی امت کو دعائیں دیتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب:۵۶) اور قرآن کریم میں ہے هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (احزاب:۴۳) اور ارشاد ہے وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (مؤمن:۷) ایسے ہی کتابوں کی تصدیق حضور ﷺ نے کی اور کتابوں نے خصوصاً قرآن مجید نے حضور انور ﷺ کی تصدیق فرمائی تو آپ قرآن کریم کے مصدق بھی ہیں۔ مصدق بہ بھی۔ معجزہ ہونے کی حیثیت سے قرآن نے حضور ﷺ کو بتایا' اور کتاب اللہ ہونے کی حیثیت سے حضور ﷺ نے قرآن بتایا۔ لہٰذا دور نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** نبی ﷺ اور دیگر مومنین کے ایمان میں بہت فرق ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ کا الگ ذکر فرمایا گیا اور مسلمانوں کا الگ' اگر یہ فرق نہ ہوتا تو مومنین میں رسول بھی داخل ہو جاتے۔ لہٰذا کوئی مسلمان حضور ﷺ کو اپنا بھائی نہیں کہہ سکتا۔ اور آیت اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ (حجرات:۱۰) حضور ﷺ پر چسپاں نہیں کر سکتا۔ حق یہ ہے کہ نبی اور امتی میں لفظ ایمان کی شرکت ہے نہ کہ معنی ایمان کی۔ اللہ کا نام بھی مومن ہے مگر اسے بھائی نہیں کہا جا سکتا۔ ہم اس کی مکمل بحث پہلے سیپارہ میں کر چکے۔ حضور ﷺ کا ایمان شہودی و حضوری ہے کہ رب تعالیٰ اور جنت و دوزخ کا مشاہدہ اور اپنی نبوت کا علم حضوری ہمارا ایمان سنا ہوا۔ ہم محض مومن اور حضور ایمان' کیونکہ ان کے ماننے کا نام ہی تو ایمان ہے۔ ہم دنیا میں بے خبر آئے' ماں باپ و استاد کے ذریعہ سے علم حاصل کیا وہ وہاں سے باخبر آئے اور سب کو ایمان دیا۔ غرضکہ عبادات' معاملات' اعتقادات سب میں ہی فرق ہے۔ اس کی مکمل تحقیق ہماری کتاب جاء الحق اول دیکھو جب دریائے رحمت جوش میں ہو اسی وقت دعا مانگنا محبوب و بہتر ہے' دیکھو حضرت جبرائیل نے عرض کیا کہ حضور ﷺ اس وقت یہ دعاء مغفرت فرما دیں۔ لہٰذا مجلس ذکر اللہ میں بارش کے وقت شب قدر میں' ہمیشہ آخری شب میں دعا مانگنا۔ اس لئے بہتر ہے کہ اس وقت رحمت الٰہی کا جوش ہوتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** قرآن پاک اور انبیاء کرام کے الہامات یقینی ہیں' نہ اس میں وسوسہ نفس شامل ہونے کا خطرہ' نہ القاء شیطان کا احتمال۔ جیسا کہ مَا اُنْزِلَ کے مَا سے معلوم ہوا۔ اسی لئے حدیث سے نسخ قرآن جائز ہے' دیکھو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فقط خواب پر اپنے بے قصور فرزند اسمٰعیل کے ذبح کا ارادہ کر لیا۔ حالانکہ بے قصور کی جان لینا حرام ہے مگر ان کے خواب نے ان کے لئے اس حکم شرعی کو منسوخ کر دیا تھا۔ اس کی تحقیق ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ ﷺ میں دیکھو' تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ جو شخص کہے کہ ایک بار شیطان نے وحی میں ملا دیا تھا تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وہ قرآن پاک پر تہمت لگاتا ہے۔ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ۔ (حج:۵۲) کا مطلب ہی کچھ اور ہے۔ **تیسرا فائدہ:** صحابہ کرام خصوصاً خلفائے راشدین کا ایمان قطعی یقینی ہے جو ان کے ایمان میں شک کرے وہ خود بے ایمان ہے۔ دیکھو رب نے ان کے ایمان کو نبی کے ایمان کے ساتھ بیان کیا۔ جیسا کہ تفسیر اول سے معلوم ہوا' ان کے فضائل میں بے شمار آیتیں اتریں۔ اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن دیکھو اور ہماری کتاب امیر معاویہ پر ایک نظر

کا مطالعہ فرماؤ' یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کا ایمان صحابہ کرام کی طرح نہیں ہو سکتا کہ ان کے ایمان کی رب تعالیٰ گواہی دے چکا یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کو رب تعالیٰ نے حسن خاتمہ ایمان پر وفات نصیب فرمائی اگر وہ حضرات ایمان پر قائم رہنے والے نہ ہوتے تو رب تعالیٰ جو عالم الغیب ہے کبھی ان کے ایمان کا اس شاندار طریقہ سے اعلان نہ فرماتا ان کا مومن ہونا تو قرآن شریف سے ثابت ہو چکا۔ اب ان کے ایمان سے نکلنے کے لئے کوئی آیت ہی چاہیے وہ تو ہے نہیں۔ **چوتھا فائدہ:** قرآن پاک میں نہ تبدیلی ہوئی نہ تحریف' جو کوئی اس میں کمی یا زیادتی مانے' وہ کتبہ کا مومن نہیں۔ (کبیر) **پانچواں فائدہ:** سارے فرشتوں ساری کتابوں' اور سارے رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے ایک کا بھی انکار کرنا کفر ہے۔ جیسا کہ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** بہتر یہ ہے کہ انبیاء کیلئے تعداد مقرر نہ کرے کیونکہ اس کا یقین نہیں۔ یوں کہے کہ سارے پیغمبروں پر ہمارا ایمان ہے۔ **چھٹا فائدہ:** اگرچہ پیغمبر درجات میں مختلف ہیں کہ ان میں بعض بعض سے اعلیٰ مگر نفس نبوت اور ایمان میں سب برابر جو کوئی بعض کا انکار کرے۔ یا مولوی قاسم و مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح بعض کو اصلی نبی اور بعض کو عارضی نبی مانے وہ بے ایمان ہے۔ جیسا کہ لَا نُفَرِّقُ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** اللہ' فرشتوں' کتابوں' رسولوں' جنت' دوزخ' حشر' نشر سب پر ایمان لانا ضروری ہے اس لئے یہاں پہلے چار کا ذکر صراحتاً فرمایا اور جنت و دوزخ کا ذکر سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا میں حشر اور نشر کا ذکر وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ میں اشارتاً فرمایا گیا۔ **آٹھواں فائدہ:** دعا مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے رب کے صفات پھر اپنی وفاداری اور گنہگاری کا ذکر کر کے پھر طلب حاجت کرے۔ اسلئے یہاں غفران سے پہلے ایمان کا ذکر ہوا معلوم ہوا کہ وسیلۂ اعمال سے دعا جلد قبول ہوتی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر نبی اور مومنین میں فرق ہے تو ایک اٰمَنَ کے فاعل دونوں کیونکر ہو گئے۔ اگر کہا جائے کہ اس اٰمَنَ کے معنی ہی دو ہیں تو غلط ہے کیونکہ مشترک کے دو معنی مراد لینا ناجائز اگر ایمان میں فرق ہوتا تو رسول کے لئے اٰمَنَ الگ لایا جاتا' اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اور مومنین حقیقت ایمان میں ایک ہیں۔ لہٰذا نبی کو کیوں نہ بھائی کہا جائے (دیوبندی) **جواب:** ایک فعل کے دو فاعلوں کے لحاظ سے دو معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ۔ (نمل: ۸۷) قیامت میں ساری مخلوق بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوگی۔ حالانکہ ان میں سے بعض اڑ کر بعض چل کر اور بعض پیٹ کے بل گھسٹ کر آئیں گے مگر سب کی آمد کو ایک اَتَوْهُ سے بیان فرمایا۔ نیز فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔ (احزاب: ۵۶) اللہ اور فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ دیکھو اللہ کی صلوٰۃ رحمت ہے اور فرشتوں کی صلوٰۃ دعاء رحمت۔ مگر دونوں کو ایک ہی صیغہ يُصَلُّوْنَ سے بیان فرمادیا گیا۔ ایسے ہی یہاں سے اجتماع مشترک کا قاعدہ یہاں جاری نہیں ہوتا۔ اجتماع مشترک اور ہے عموم مشترک کچھ اور اجتماع مشترک ممنوع ہے۔ عموم مشترک جائز بلکہ بہت واقع ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے پیغمبر درجہ میں یکساں ہیں جیسا کہ لَا نُفَرِّقُ نے بتایا۔ حضور ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا۔ لَا تُفَضِّلُوْنِيْ عَلٰى يُوْنُسَ ابْنِ مَتّٰى۔ مجھے یونس علیہ السلام پر بھی بزرگی نہ دو۔ لہٰذا حضور ﷺ کو سید الانبیاء نہ کہنا چاہیے **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ انبیاء کرام میں نفس رسالت میں

فرق نہیں کہ کوئی اصلی نبی ہو کوئی عارضی۔ دیگر درجات میں فرق ہے۔ اسی لئے بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ فرمایا گیا نہ کہ بین درجات احدٍ۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ۔ دوسرا یہ کہ لا نفرق کا مطلب ہے۔ ہم اپنی طرف سے ان میں فرق نہیں کرتے جو رب نے فرق مراتب فرما دیا اسے مانتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے جس سے کسی پیغمبر کی توہین ہو جائے۔ یہ ہی حدیث کا مطلب ہے کہ مجھے یونس علیہ السلام پر ایسی بزرگی مت دو۔ جس سے ان کی توہین نہ ہو' ورنہ حضور ﷺ نے خود فرمایا اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ۔ چوتھا یہ کہ ہم ایمان میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں جیسے یہودی و عیسائی۔ **تیسرا اعتراض:** ملائکہ یعنی فرشتے بھی تو رسول ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ۔ (فاطر:۱) پھر فرشتوں کے بعد رُسُلًا ہی کا ذکر کیوں کیا؟ **جواب:** فرشتے لغوی معنی سے رسول ہیں یعنی محض قاصد و سفیر صرف پیغام پہنچانے والے وہ بھی حضرات انبیاء پر نہ کہ عام لوگوں پر اور حضرات انبیاء اصطلاحاً رسول ہیں یعنی پیغام الٰہی پہنچانے والے' سمجھانے والے' لوگوں سے عمل کرانے والے وہ بھی تمام لوگوں سے اس لئے انسان ان انسانی رسولوں کی امت ہوتے ہیں۔ فرشتوں کی امت نہیں ہوتے۔ کلمہ میں محمد رسول اللہ ہے۔ جبریل رسول اللہ نہیں۔ ہم پر حضور انور ﷺ کی اطاعت لازم ہے نہ کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی۔ قبر میں حضور ﷺ کی پہچان کرائی جاتی ہے۔ نہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی۔ رسول اصطلاحی کی تعریف یہ ہے کہ وہ انسان ہیں جنہیں اللہ نے تبلیغ احکام کے لئے بھیجا۔ پوسٹ مین اور ڈپٹی کمشنر میں بڑا فرق ہے۔

تفسیر صوفیانہ

ایمان کے معنی ہیں تصدیق کرنا' اور تصدیق کی تین صورتیں ہیں' دل سے' زبان سے اور عمل سے فقط زبان کی تصدیق بالکل بے کار جیسے منافقین کی تصدیق تھی اور صرف تصدیق بغیر عمل چنداں فائدہ مند نہیں۔ علمائے کرام فرماتے ہیں کہ تلاوت بے عمل ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ کے حکم نامہ کو روز پڑھ کر لیا کرے' مگر اس کے مطابق عمل نہ کرے' جیسے محض پڑھ لینے سے وہ شخص فرمانبردار نہیں ہو سکتا ایسے ہی محض تلاوت قرآن سے بغیر عمل جنت حاصل نہیں کر سکتا۔ رب نے فرمایا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ جنت عمل کی جزا ہے۔ تصدیق بالارکان کے بھی چند درجے ہیں۔ حضور سید عالم ﷺ کا ہر عمل قرآن پاک کی تصدیق تھا بلکہ یوں کہو کہ آپ کی زندگی پاک اس کی تفسیر ہے اور قرآن پاک پر عمل آپ کی عادت مبارک اس لئے اٰمَنَ کے بعد رسول کا ذکر علیحدہ ہوا' اور مومنین کا علیحدہ' کہ ان کا ہر فعل ایمان و تصدیق۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ استغفار ایمان کا نتیجہ اور بندگی کا اثر ہے۔ اسی لئے یہاں ایمان کے بعد غفران کا ذکر ہوا' بندہ کو چاہیے کہ اپنے کو ہر برائی کا اور رب کو ہر بھلائی کا اہل سمجھے لہٰذا خوبیوں کو رب کی طرف اور برائیوں کو اپنی طرف نسبت دے۔ اور یہ پڑھتا رہے اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ یہ ذکر دنیا و آخرت کے عذاب سے نجات دینے والا ہے۔ زاہد گناہ سے استغفار کرتا ہے اور عارف عبادت سے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے اوقات کو توبہ اور استغفار میں گھیرے رکھے۔ گناہ کے وقت استغفار' اطاعت کے وقت حمد' نعمت کے وقت شکر کرنا' مردوں کا کام ہے۔ اس توفیق کے چار اسباب ہیں۔ (۱) نور الٰہی' جو بلا واسطہ قلوب میں آئے (۲) علم وسیع جو عقل کامل کے ساتھ ہو (۳) [illegible] معاملات میں غور و خوض (۴) شیخ کامل کی صحبت۔ شیخ ابو مدین فرماتے ہیں کہ پیر کامل

وہ ہے جو تجھے اپنے اخلاق سے تہذیب سکھائے اور اپنے طریقوں سے ادب اور تیرے قلب کو اپنے نور سے چمکا دے' سامنے تیرا دل مطمئن کر دے' اور غائب ہو کر تیری حفاظت کرے' جب تک اس میں یہ بات نہ ہو' تب تک شیخ کامل نہیں۔ کسی نے خوب کہا۔

از ہستی خویش تا تو غافل نہ شوی — ہرگز بمراد خویش واصل نہ شوی

از بحر ظہور تا بساحل نہ شوی — در مذہب اہل عشق کامل نہ شوی

صوفیاء فرماتے ہیں کہ آداب دعا سے یہ ہے کہ پہلے حمد الٰہی کرے پھر نعت وصلوٰۃ مصطفیٰ ﷺ یعنی درود شریف پڑھے' پھر اپنے گناہوں سے استغفار کرے پھر اپنے نیک اعمال کے توسل سے دعا کرے دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے دعا سے پہلے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا فرما کر ایمان و اعمال کے ذکر کی تلقین فرمائی اور اگر کسی کے پاس خود اپنے نیک اعمال نہ ہوں وہ اپنے ماں باپ' استاذ' شیخ' بلکہ اہل بیت اطہار' بلکہ حضور نبی مختار ﷺ کے اعمال کے توسل سے دعا کرے' کہ خدایا غازیان بدر و حنین کا صدقہ کربلا والے شہیدوں کے طفیل حضور ﷺ کے تہجد والے سجدوں کے وسیلہ میری حاجات پوری کر انشاء اللہ حاجات پوری ہوں گی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا (الکہف: ۸۲) حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ شعر

شنیدم کہ در روز امید و بیم — بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم!

خیال رہے کہ سب کا رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہے مگر کوئی جوانی میں ہی خوشی سے اس کی طرف رجوع کرتا ہے کوئی بڑھاپے میں' جب دنیا کے کام کا بھی نہیں رہتا اور کوئی بعد موت مجبور ہو کر پہلا شخص بہت مبارک ہے۔ دوسرا غنیمت ہے۔ تیسرا مزدور ہے' جو خوشی سے حاکم کے ہاں حاضر ہو جائے۔ اسے وارنٹ سے نہیں پکڑوایا جاتا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط

نہیں تکلیف دیتا اللہ کسی جان کو مگر گنجائش بھر اس کی واسطے اس کے ہے وہ جو کمایا اور اوپر اسی کے ہے وہ جو حاصل کیا

اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر اس کا فائدہ ہے جو اچھا کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ

اے رب ہمارے نہ پکڑ فرما ہماری اگر بھول جائیں ہم یا خطا کریں ہم اے رب ہمارے اور نہ ڈال اوپر ہمارے

اے رب ہمارے ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں اے رب ہمارے اور ہم پر بھاری

اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج

بوجھ مثل اس کے کہ ڈالا تو نے اوپر ان کے جو تھے پہلے ہمارے

بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا تھا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کا ذکر کیا کہ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے رب کے احکام سنے بھی اطاعت بھی کریں گے۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم کیوں نہ اس کی اطاعت کریں۔ وہ ہمیں طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ جب اس کا یہ فضل ہے تو ہم پر اطاعت لازم۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کی اطاعت کا ذکر تھا۔ اب رب کے اس فضل کا ذکر ہے جو ان پر دنیا میں ہے۔ یعنی جب مسلمان ہماری اطاعت میں ایسے سرگرم ہیں تو ہم بھی ان پر فضل میں کمی کیوں کریں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کی زبانی اطاعت کا ذکر تھا۔ اب ان کی دلی نیک گمانی کا تذکرہ ہے۔ یعنی وہ زبان سے یوں کہتے ہیں اور دل میں رب کے متعلق یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ طاقت سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔

شان نزول

جب یہ آیت وَاِنْ تُبْدُوْا الخ نازل ہوئی تو صحابہ کرام کی ایک جماعت نے بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا حبیب اللہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ظاہری احکام پر ہم نے عمل کیا مگر دل کے خطرات قابو سے باہر ہیں۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جس نے اس آیت کی تفسیر کر دی۔ (تفسیر روح البیان و در منثور و خازن)

تفسیر

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ یہ عبارت یا نیا جملہ ہے اور رب کا فرمان یا اس کا تعلق سَمِعْنَا سے ہے اور قَالُوْا کا مفعول ہے۔ اس صورت میں یہ بھی مسلمانوں کا کلام ہے جو رب نے نقل فرمایا۔ خواہ اس قول سے زبانی قول مراد ہو یا قلبی عقیدہ (کبیر و خازن و روح المعانی وغیرہ) **یُکَلِّفُ** تکلیف سے بنا۔ جس کا مادہ کلف بمعنی مشقت ہے۔ اس سے کلف بھی ہے۔ یہاں کلف سے یا تو مجبوری مراد ہے اور نفسًا سے دنیا کی ہر چیز مراد۔ یا تکلیف سے وہ احکام مراد ہیں جو طاقت انسانی سے باہر ہوں اور نفسًا سے سارے مکلفین مقصود خواہ مسلمان ہوں یا دوسری امتیں یا تکلیف سے بھاری احکام مراد ہیں۔ اور نفسًا سے صرف مسلمان مقصود۔ خیال رہے کہ کلفت و مشقت والی چیز کسی کے ذمہ لازم کرنے کو تکلیف کہتے ہیں۔ اس کی یہ تین صورتیں ہیں، غرضکہ ہماری اصطلاح میں تکلیف دکھ، درد، مشقت کو کہتے ہیں مگر شریعت میں کسی کے ذمہ کچھ احکام لازم کر دینے کو تکلیف کہا جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو غیر مکلف کہتے ہیں اور عاقل و بالغ کو مکلف کہ بلوغ و عقل سے اس کے ذمہ کچھ احکام ہوں گے۔ بچپن میں کوئی حکم اس پر جاری نہ تھا۔ **وُسْعٌ** کے معنی ہیں گنجائش و فراخی۔ اسی لئے بڑے میدان کو وسیع کہا جاتا ہے۔ اس کا مقابل ضیق بھی ہے اور جہد بھی۔ (تنگی و مشقت) ضیق کے معنی ہیں۔ طاقت سے باہر ہونا اور جہد کے معنی ہیں مشکل ہونا اگرچہ طاقت کے اندر ہو۔ لہٰذا وسعت کے بھی دو معنے ہوئے۔ ممکن اور آسان یعنی وہ جو کیا جا سکے اور وہ جو بآسانی کیا جا سکے۔ وسعت کے یہ معانی کلفت کے لحاظ سے ہوں گے۔ یا تو نفسًا سے ہر جان مراد ہے انسان ہو یا غیر انسان یا ہر انسان مراد یا ہر مسلمان مراد۔ اس لئے اس آیت کی تین تفسیریں ہوں گی خیال رہے کہ وُسْعَهَا اندر محذوف کا مضاف الیہ ہے۔ مضاف کے پوشیدہ ہونے سے یہ منصوب رہ گیا۔ یعنی اللہ کسی چیز کو ناممکن کام پر مجبور نہیں کرتا۔ یا اللہ کسی مکلف کو وہ احکام نہیں دیتا جو اس

سے نہ ہو سکیں۔ یا اللہ کسی مسلمان پر کوئی مشکل چیز واجب نہیں فرماتا۔ صرف وہ حکم دیتا ہے جو آسانی سے ہو سکے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ یہ نیا جملہ ہے اور رب کا دوسرا قانون۔ لام نفع کا ہے اور ھا کا مرجع نفس ہے مَا سے مراد نیک اعمال ہیں۔ لَهَا خبر ہے اور مَا مبتدا۔ كَسَبَتْ مَا کا صلہ۔ وَعَلَيْهَا میں واو عاطفہ ہے اور علیٰ نقصان کے لئے مَا سے مراد بدعملیاں ہیں۔ اِكْتَسَبَ۔ باب افتعال کا ماضی ہے۔ اس کا مادہ کسبت ہے۔ بمعنی ظاہری عمل کرنا۔ اسی لئے کمائی کو کسب کہا جاتا ہے۔ کبھی دل کے فعل پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ۔ بعض علماء نے فرمایا کہ کسب اور اکتساب میں کوئی فرق نہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً۔ اور فرماتا ہے بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا بعض نے فرمایا کہ کسب عام ہے اور اکتساب خاص۔ اکتساب وہ فعل ہے جو انسان اپنے لئے کرے اور کسب ہر فعل خواہ اپنے لئے ہو یا غیر کے لئے بعض نے فرمایا کہ اکتساب بخوشی کرنا' اور کسب عام۔ بعض نے فرمایا کہ اکتساب اہتمام سے کام کرنا ہے اور کسب عام خواہ اہتمام سے ہو یا بغیر اہتمام چونکہ نفس گناہ تو خوشی اور اہتمام سے کرتا ہے اور نیکی مجبوراً۔ اس لئے نیکی کے لئے کسب اور گناہ کے لئے اکتساب فرمایا گیا۔ نیز نفس امارہ گناہ زیادہ کرتا ہے نیکیاں کم' اس لئے وہاں كَسَبَتْ اور یہاں اِكْتَسَبَ ارشاد ہوا۔ یعنی ہر نفس کی نیکیاں اس کے لئے ہیں اور ہر نفس کے گناہ اس پر پڑیں گے یا نیکی کا ثواب خود کرنے والے کو ملے گا وہ کبھی محروم نہیں ہو سکتا اور گناہ کا عذاب بھی کرنے والے پر ہی ہے۔ اس سے بچ نہیں سکتا۔ یا ہر نفس کو ہر اس نیکی کا ثواب ملے گا جسے وہ کرے۔ خواہ اہتمام و ارادے سے۔ خواہ بغیر اہتمام و ارادہ اور ہر اس گناہ کی سزا ملے گی جو وہ ارادۃً کرے اہتمام سے کرے یا بلا قصد اور گناہ سرزد ہو جانے پر پکڑ نہیں۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا۔ یا تو اس کا تعلق بھی سَمِعْنَا سے ہے اور یہ بھی قَالُوْا کا مفعول بہ اور مسلمانوں کا کلام یا قُوْلُوْا فعل محذوف کا مفعول ہے چونکہ یہ دعا ہے اس لئے رب کے نام سے شروع کی گئی کیونکہ دعا میں اللہ تعالیٰ کو پکارنا خصوصاً رَبَّنَا کہہ کر پکارنے کے بعد کرنا بہتر ہے۔ لَا تُؤَاخِذْنَا مؤاخذہ سے بنا۔ یہاں باب مفاعلہ شرکت کے لئے نہیں اس کے معنی یا پکڑنا ہیں یا عذاب دینا۔ نسیان کے دو معنی ہیں (۱) بھولنا اس کا مقابل ہے۔ ذکر یعنی یاد کرنا (۲) چھوڑنا' جس کا مقابل ہے۔ فعل یعنی کرنا رب تعالیٰ فرماتا ہے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (التوبہ: ۶۷) انہوں نے رب کو چھوڑ دیا۔ رب نے ان کو' شاعر کہتا ہے۔

وَلَمْ اَكُ عِنْدَ الْجُوْدِ لِلْجُوْدِ قَالِيًا وَلَا كُنْتُ يَوْمَ الرَّوْعِ لِلطَّعْنِ نَاسِيًا

یہاں ناسی بمعنی تارک ہے۔ (روح المعانی و کبیر) پھر بھولنے کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک اپنی کوتاہی سے بھولنا۔ جسے بھلا دینا کہا جاتا ہے۔ دوسرا اتفاقیہ بھول جانا' یہاں غالباً پہلا یا تیسرا معنے مراد ہیں۔ دیر لگانے کو بھی نسی کہہ دیتے ہیں۔ اس سے نسيئة ہے۔ بمعنی ادھار۔ اخطأنا خطاءٌ سے بنا جس کے معنی غلطی بھی ہیں۔ جس کا مقابل صواب ہے اور چوک جانا بھی' جس کا مقابل ہے عمداً بچ جانے رہ جانے کو بھی خطا کہہ دیتے ہیں۔ یہاں نسیان سے نیکی چھوڑ جانا مراد ہے۔ اور خطاء سے مراد دھوکے سے گناہ کر لینا فقہا کی اصطلاح میں نسیان یہ ہے کہ کام ارادہ سے کیا جائے اور مانع کا خیال نہ رہے۔ جیسے روزہ یاد نہ رہا۔ کچھ کھا لیا خطا یہ ہے کہ مانع تو یاد رہے مگر فعل بلا ارادہ ہو گیا۔ جیسے کلی کر رہا تھا کہ پانی حلق سے اتر گیا۔ خیال رہے کہ ارادۃً گناہ بھی ہماری جہالت و نسیان ہی سے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ۔ (النساء: ۱۷) لہٰذا اس

نسیان وخطا میں ارادۃً گناہ بھی داخل ہیں یعنی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں۔ یا اے مسلمانو تم یہ بھی دعا مانگو کہ اے مولیٰ اگر ہم کوئی نیکی بھول جائیں یا غلطی سے گناہ کر بیٹھیں تو ہماری پکڑ نہ فرما نہ تو دنیا میں پکڑ فرما کہ ہم اپنے گناہوں کی شامت سے آفات میں بتلا ہو جائیں یا نیک اعمال سے محروم ہو جائیں۔ نہ مرتے وقت پکڑ کہ خاتمہ خراب ہو جائے۔ نہ قبر میں پکڑ کہ امتحان میں فیل ہو جائیں۔ نہ آخرت میں پکڑ فرما کہ ہم عذاب میں پھنس جائیں۔ لَا تُؤَاخِذْنَا ان سب کو شامل ہے۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا۔ یہ جملہ لَا تُؤَاخِذْنَا پر معطوف ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ اظہار عاجزی کے لئے رَبَّنَا کی تکرار کی گئی۔ لَا تَحْمِلْ کا مادہ حمل ہے۔ بمعنی لادنا اور کسی پر ڈالنا۔ اِصْرًا کے لغوی معنی ذمہ۔ بوجھ اور شدت ہیں۔ عہد کو بھی اسی لئے اِصر کہتے ہیں کہ وہ بھی بوجھ ہوتا ہے۔ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ۔ (آل عمران: ۸۱) قید کو بھی اسی معنی سے اصر کہہ دیتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ ناقابل معافی گناہ اصر ہے۔ (روح المعانی) یعنی ہمارے مولیٰ ہم پر بوجھ نہ ڈال۔ كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ یہ جملہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ جو لا تَحْمِلْ کا مفعول مطلق ہے اور ہو سکتا ہے کہ اصر کی صفت ہو۔ قبل سے مراد پچھلی امتیں یہود و عیسائی ہیں ان پر تین قسم کے بوجھ تھے۔ احکام کے سزاؤں کے اور توبہ کے چنانچہ انہیں کبھی توبہ کے لئے خودکشی کرنی پڑتی تھی۔ ناپاک کپڑے اور گندی کھال کاٹنا پڑتی تھی۔ رات دن میں ان پر پچاس نمازیں فرض تھیں۔ مسجد کے سوا ان کی نماز کہیں نہ ہوتی تھی۔ ان پر چوتھائی مال زکوٰۃ واجب تھی۔ رات کے پوشیدہ گناہ صبح کو دروازہ پر لکھ دیئے جاتے تھے۔ (روح البیان و کبیر وغیرہ) رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی طفیل یہ تمام مصیبتیں دور فرمادیں۔ ارشاد فرماتا ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف: ۱۵۷) یعنی اے مولیٰ ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا ہم سے اگلی امتوں یہود و نصاریٰ پر ڈالا تھا۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ کام کی تکلیف نہیں دیتا۔ اس لئے کسی کو ناممکن چیزوں کا مکلف نہ کیا کیونکہ وہ طاقت سے باہر ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کو بھاری احکام بھی نہ دیئے۔ نماز زکوٰۃ روزہ وغیرہ میں ان کے لئے بے شمار سہولتیں کیں۔ ہر شخص کی نیکیاں اس کے لئے ہیں اور ہر شخص اپنے گناہوں کا ذمہ دار ہے۔ نہ کوئی کسی کی نیکی چھین کر اسے محروم کر سکے اور نہ کسی کے گناہ کا وبال دوسرے پر اس طرح پڑے کہ گنہگار صاف بچ جائے یا ہر شخص کو نیکی معمولی سی بھی مفید ہے اگرچہ اتفاقاً ہی ہو جائے مگر گناہ وہ ہی مضر ہے جو اہتمام سے ہو۔ کبیرہ ہو۔ جس پر اصرار و ضد کی جائے یا نیکی تو وہ بھی مفید ہے جو دوسرے کے لئے دوسرے کی طرف سے کرے مگر گناہ وہ ہی مضر ہوگا جو اپنے لئے کرے کیونکہ گناہ دوسرے کے لئے ہوتا ہی نہیں۔ اے مسلمانو تم ہم سے دعا یوں مانگا کرو کہ اے مولیٰ اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو ہماری پکڑ نہ فرما یا اور ہمیں عذاب نہ دے۔ اگر ہم نیکی کو بدی سمجھ کر چھوڑ بیٹھیں یا بدی کو بھلائی سمجھ کر کر بیٹھیں تو ہم پر ناراض نہ ہو اور اے مولیٰ ہم پر سخت احکام سزاؤں اور توبہ وغیرہ کے ایسے بوجھ نہ ڈال۔ جیسے ہم سے پچھلی امتوں پر ڈالے تھے۔ ہم گنہگار اور کمزور ہیں تو قوی اور قادر و ستار ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** خدا تعالیٰ ناممکن باتوں کی کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔ ہر چیز کو بقدر طاقت احکام دیئے جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ انسان ہی کے لئے خاص نہیں بلکہ عالم کی ہر چیز میں رب کا یہی دستور ہے۔ درختوں میں نہ نقل وحرکت کی طاقت ہے نہ روزی کمانے کی قوت۔ تو انہیں اسی جگہ غذا' پانی پہنچایا جاتا ہے۔ پرندوں وغیرہ میں نقل و حرکت کی طاقت تو ہے مگر وہ کمانے سے مجبور۔ تو ان کی غذا ان کے آشیانوں میں نہ پہنچی۔ ان کو تلاش غذا کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے مگر باہر جا کر بغیر کمائے روزی مل جاتی ہے۔ انسان بھی جب تک کمزور رہا۔ اس کی خدمت کے لئے ماں باپ مقرر کئے گئے۔ جیسی اس میں طاقت آتی گئی ویسی ہی اس کی ذمہ داری اور بوجھ بڑھتا گیا۔ **دوسرا فائدہ:** پچھلی قوموں پر دشوار احکام تھے مگر مسلمانوں کے لئے نہایت سہل وآسان احکام۔ **تیسرا فائدہ:** نیکی اگر بلا قصد بھی ہو جائے تب بھی اس کا ثواب ملتا ہے مگر بدی پر بلا ارادہ عذاب نہیں۔ اگر کسی کے چراغ سے کوئی قرآن پاک کی تلاوت کرے اور چراغ والے کو خبر بھی نہ ہو تب بھی انشاء اللہ اسے ثواب ملے گا لیکن اگر کسی کی روشنی میں کوئی گناہ کرے تو روشنی والے پر عذاب نہیں۔ دیکھو نیکی کے لئے کَسَبَتْ فرمایا گیا۔ جو عام ہے اور گناہ کے لئے اِکْتَسَبَتْ۔ جس سے بالا رادہ فعل مراد۔ **چوتھا فائدہ:** رب تعالیٰ مسلمانوں کو ہر طرح دینا چاہتا ہے اسی لئے انہیں مانگنے کا حکم دیتا ہے بلکہ مانگنا سکھاتا ہے بادشاہ کا کسی سے یہ کہنا کہ تم اپنی نوکری کے لئے ہمیں اس مضمون کی عرضی دو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ نوکر رکھنا منظور ہے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

لَوْ لَمْ تُرِدْ نَيْلَ مَا اَرْجُوْا وَاَطْلُبُهٗ　　　مِنْ فَيْضِ جُوْدِكَ مَا عَلَّمْتَنِيْ طَلَبًا

اے مولیٰ اگر تجھے دینا منظور نہ ہوتا' تو ہمیں مانگنا کیوں سکھاتا۔ اس تعلیم سے معلوم ہوا کہ دینا منظور ہے مگر ہم سے کہلوا کر۔ **پانچواں فائدہ:** کسی مسلمان کی نیکی دوسرا اس طرح نہیں چھین سکتا کہ کرنے والا کچھ نہ پائے اور نہ کسی کی برائی دوسرے پر اس طرح پڑ سکتی ہے کہ کرنے والا بچ جائے جیسا کہ لَهَا اور عليها کے حصر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** بھول چوک پر پکڑ ممکن ہے بلکہ پچھلی امتوں پر ہوتی بھی تھی۔ اسلئے تو ہمیں اس دعا کا حکم دیا گیا۔ ناممکنات اور واجبات کی دعا نہیں مانگی جاتی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میری امت سے بھول چوک کی سزا اٹھالی گئی رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ۔ معلوم ہوا کہ پچھلی امتوں پر اس کی پکڑ تھی۔ **مسئلہ:** آخرت میں بھول چوک پر پکڑ نہ ہوگی مگر احکام شرعیہ میں بعض جگہ بھول معاف ہے اور بعض جگہ نہیں روزہ میں بھول کر کھا لیا معاف ہے لیکن اگر نماز میں بھول کر بات کر لی تو نماز ہی جاتی رہی۔ اگر ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو حلال ہے اور اگر خطاءً کسی کا نقصان کر دیا تو تاوان واجب۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاءً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ۔ (النساء: ۹۲) دیکھو خطاءً قتل کر دینے پر بھی کفارہ اور دیت واجب فرمائی گئی۔ اگر کوئی بھول کر بے وضو نماز پڑھ لے تو نماز نہ ہوئی' غرضکہ یہ آیت اخروی عذاب کے متعلق ہے نہ کہ دنیوی احکام کے بارے میں۔ **مسئلہ:** بھول کی دو صورتیں ہیں۔ ایک اتفاقاً اور دوسرا اپنی کوتاہی سے پہلی کی پکڑ نہیں اور دوسری کی آخرت میں بھی پکڑ ہے اگر حافظ تلاوت قرآن چھوڑ دے۔ لہٰذا بھول جائے تو سخت گنہگار ہے لیکن اگر کوئی بیماری وغیرہ کی وجہ سے بھول گیا تو گنہگار نہیں۔ اس لئے آیت میں بھول چوک سے معافی مانگنے کا حکم دیا گیا کہ بعض

بھول چوک قابل پکڑ ہیں۔ لہٰذا آیت پر یہ سوال نہیں کہ جب بھول وخطا پر پکڑ قانوناً نہیں تو اس کی دعا کیوں مانگی واجب اور نا ممکن کی دعا کرنا منع ہے کیونکہ بعض بھول مواخذہ کے لائق بھی ہیں۔ **مسئلہ:** بعض علماء کرام نے فرمایا کہ بعض غلطیاں مثل زہر کے ہیں کہ اگر جان بوجھ کر کھائے تو بھی ہلاک اور بھول چوک سے کھا جائے تو بھی ایسے ہی طلاق' نکاح' بیع' اجارہ' ہبہ وغیرہ عقود کا یہ ہی حال ہے کہ عمداً کرے۔ یا بھول کر یا خطا سے بہر حال واقع ہو جائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے **ثلٰث جدُّھُنَّ جدٌّ وَھزلُھُنَّ جِدٌّ**۔ **مسئلہ:** شریعت یا بندوں کے حقوق بھول چوک سے معاف نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اگر قرض خواہ اور مقروض دونوں قرض بھول گئے یا کوئی مسلمان کچھ نمازیں بھول گیا تو اس سے نہ قرض معاف ہو نہ نمازیں۔ جب یاد آ جائے ادا کرے۔ **مسئلہ:** کَسَبَتْ اور اِکْتَسَبَتْ سے وہ اعمال مراد ہیں جو شرعاً معتبر ہوں کافر اور مرتد کی نیکیاں اور بچہ د دیوانہ کے گناہ معتبر نہیں۔ نہ کافر کو ثواب اور نہ بچہ کو گناہ۔ جیسے بے وضو کی نماز نماز نہیں۔ ایسے ہی کافر کی نیکی' نیکی ہی نہیں اور جیسے سوئے ہوئے آدمی کا گناہ' گناہ نہیں۔ ایسے ہی بچہ کی برائیاں گناہ نہیں۔ **ساتواں فائدہ:** غیر مجتہد پر تقلید واجب ہے کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی اور غیر مجتہد کو قرآن و حدیث سے مسائل نکالنے کی تکلیف دینا طاقت سے زیادہ تکلیف ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** خطا اجتہادی معاف ہے کیونکہ اس آیت میں خطا اور بھول کی معافی کی درخواست کی گئی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی اور حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن جھوٹی خوابیں گھڑنے والے کو حکم ہوگا کہ جو کے دانہ میں گرہ لگائے اور تصویریں بنانے والے کو حکم دیا جائے گا کہ اپنی کھینچی ہوئی تصویروں میں جان ڈالے یہ احکام طاقت سے زیادہ ہیں۔ تو اس آیت و حدیث میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** یہ حکم تکلیفی نہ ہوگا۔ اس سے فقط عذاب دینا مقصود ہے ہر حکم تکلیفی نہیں ہوتا۔ یہاں تکلیف کی نفی ہے اور حدیث شریف میں عذاب کا ذکر۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ناممکن کام کی تکلیف نہیں دی جاتی تو ابولہب' ابوجہل اور دیگروہ کفار جن کا کافر رہنا علم الٰہی میں آچکا۔ ان کا کفر واجب اور ایمان ناممکن ہو گیا کیونکہ ایک نقیض کے واجب ہونے سے دوسری نقیض ناممکن ہو جاتی ہے پھر انہیں ایمان کا مکلف کیوں کیا گیا؟ **جواب:** ان لوگوں کا ایمان بذات خود نا ممکن نہیں' جس پر وہ قادر نہ ہوں۔ رب تعالیٰ کے علم میں یہ بات آئی کہ یہ لوگ ایمان پر قادر ہوتے ہوئے بخوشی کافر رہیں گے۔ ایمان کے قریب نہ آئیں گے۔ جیسے ان کا کفر علم الٰہی میں آ گیا' ایسے ہی ان کا اختیار ارادہ اور خوشی بھی علم الٰہی میں آ چکی۔ کفر بالاختیار کی نقیض مطلق ایمان نہیں ہے۔ آیت کا مقصد تو یہ ہے کہ انسان کو ان باتوں کی تکلیف نہیں دی جاتی جو اس سے نہ ہو سکیں جیسے اجتماع نقیضین' یا ہوا میں اڑ جانے اور آگ میں جل جانے کے احکام۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کی نیکی اسی کو ملتی ہے نہ کہ دوسرے کو' تو چاہیے کہ کسی کو ثواب نہ بخشا جائے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خیرات تو میں کروں اور ثواب دوسرے کو مل جائے۔ دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (النجم: ۳۹) معلوم ہوا کہ اپنی ہی نیکی کام آسکتی ہے نہ کہ دوسرے کی (بعض نیچری) **جواب:** اس کے بہت جواب ہیں۔ جن کی تفصیل ہماری

کتاب جاءالحق اول میں دیکھو۔ ان میں سے چند یہاں عرض کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ بخشنے سے محض ثواب پہنچتا ہے نہ کہ اصل فعل۔ وہ تو کرنے والے ہی کیلئے رہتا ہے اس آیت کا یہ ہی مطلب ہے کہ نفس کا کمایا ہوا فعل اسی کے لئے رہے گا۔ دوسرا یہ کہ یہ آیت بدنی عبادتوں کے لئے ہے نہ کہ مالی۔ اسی لئے کَسَبَتْ فرمایا گیا۔ یعنی کوئی شخص کسی کی طرف سے نماز' روزہ ادا نہیں کرسکتا۔ یہ تو خود ہی کرنا پڑیں گے۔ خیال رہے کہ عبادات تین قسم کی ہوتی ہیں۔ عبادات بدنی' جیسے نماز روزہ' عبادات مالی جیسے زکوٰۃ' بدنی و مالی کا مجموعہ جیسے حج' بدنی عبادات میں نیابت نہیں ہوسکتی۔ مالی میں بہرحال ہوسکتی ہے۔ بدنی اور مالی کے مجموعہ میں بحالت مجبوری نیابت جائز اور بلاوجہ ناجائز' میری طرف سے نماز کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ اپنی زکوٰۃ میں مجھے اختیار ہے کہ خود دوں یا کسی سے دلوادوں۔ مگر حج بحالت مجبوری دوسرے سے کرایا جاسکتا ہے نہ کہ بلاضرورت اسی لئے حج بدل بڈھے یا میت کی طرف سے جائز ہے۔ چوتھا یہ کہ لَهَا میں لام ملکیت کا ہے یعنی ہر شخص اپنی ہی نیکیوں کا مالک ہے نہ کہ دوسرے کی کیا خبر دوسرا بخشے یا نہ بخشے اولاد کے بھروسہ پر خود نیکی سے غافل نہ رہو ؎

بعد مرنے کے تمہیں اپنا پرایا بھول جائے فاتحہ کو قبر پر پھر کوئی آئے یا نہ آئے

پانچواں یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی کرنے والا کبھی نیکی سے محروم نہیں ہوسکتا۔ اسے ضرور ملے گی۔ چنانچہ ثواب بخشنے سے بخشنے والا ثواب سے محروم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ اس نے جتنوں کو ثواب بخشا۔ اسے ان سب کے برابر ثواب ملتا ہے۔ دیکھو (در مختار) چھٹا یہ کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے۔ وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَان (طور:۲۱) یہ ہی عبداللہ ابن عباس کا قول ہے۔ دیکھو جمل و خازن زیر آیت لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (النجم:۳۹) اگر کسی کی نیکی دوسرے کے کام بالکل نہ آتی' تو مسلمانوں کے نابالغ بچے جنت میں کیوں جاتے اور انبیاء کرام کی نابالغ اولاد ان کے ساتھ جنت الفردوس میں کیوں رہتی۔ بتاؤ حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ کہاں ہوں گے۔ یقیناً جنت میں۔ حضور ﷺ کے ساتھ ہوں گے۔ انہیں یہ درجہ کیوں ملا؟ حضور ﷺ کی برکت سے غرضکہ اس آیت میں ہبہ کی نفی نہیں۔ ایصال ثواب کا ثبوت صدہا حدیث سے ہے۔ بچوں کے حج سے ماں باپ کو ثواب ہے۔ روزہ افطار کرانے والے کو روزہ کا ثواب۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیکی صرف نیکی کرنے والے کے لئے ہے اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دلوادی جائیں گی۔ اس آیت اور حدیث میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ دنیا میں خدائے پاک اعمال کی زیادتیاں فرماتا ہے۔ کسی نیکی کا ثواب پچیس گنا اور کسی کا پانچسو گنا کسی کا سات سو گنا کسی کا لاکھ گنا۔ قیامت کے دن مظلوم کو ان زیادتیوں میں سے دیا جائے گا نہ کہ اصلی نیکی۔ یہ زیادتیاں اسی لئے کی گئی تھیں۔ حکومت دیوالیہ کے لئے کچھ ضرور چھوڑ دیتی ہے مگر روزہ کی نہ زیادتی کسی کو ملے نہ اصل۔ اسی لئے فرمایا گیا۔ اَلصَّوْمُ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ۔ روزہ تو میرا ہے اور میں اس کی ضرور جزا دوں گا۔ غرضکہ آیت و حدیث میں کوئی مخالفت نہیں۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی ضرور ملتی ہے مگر دوسری جگہ ارشاد ہورہا ہے کہ نبی کی آواز پر اپنی آواز اونچی مت کرو۔ ورنہ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ (حجرات:۲) **جواب:** ہم نے فوائد میں عرض کردیا کہ یہاں کَسَبَ سے عمل معتبر مراد ہے ضبط شدہ نیکی کسب میں داخل نہیں۔ جیسا کہ اسی گناہ کا عذاب ہوگا جو بخشا نہ جائے تو ایسا ہی اس

نیکی کا ثواب ملے گا جو ضبط نہ ہو جائے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کا گناہ اسی پر پڑتا ہے مگر حدیث شریف میں ہے کہ گناہ کے موجد پر سارے گنہگاروں کا وبال ہے ہر قتل میں قابیل کا حصہ ہے کیونکہ وہ قتل کا موجد ہے۔ قرآن کریم بھی فرماتا ہے وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ۔ (عنکبوت: ۱۳) یعنی کافروں کے سردار اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے تبعین کا بھی ان میں مطابقت کیسے ہو؟ **جواب:** اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ صرف موجد ہی کو عذاب ہو اور باقی سب گنہگار بچ جائیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایجاد گناہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کا عذاب سب گنہگاروں کے برابر ہے یہ اپنے قصور یعنی ایجاد گناہ کا ہی عذاب پائے گا نہ کہ اوروں کے گناہ کا۔ ان کے گناہ ان پر رہیں گے۔ چوری کرنیوالا' کرانے والا' مال کا بھید بتانے والا' چوری کا مال رکھنے والا' اسے بیچنے والا' یہ سب جیل کے قابل ہیں مگر سب اپنے اپنے گناہوں سے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے گناہ کا عذاب خود کرنے والے پر ہی ہوگا نہ کہ دوسرے پر۔ **ساتواں اعتراض:** نیکی کے لئے کَسَبَتْ اور گناہ کے لئے اِكْتَسَبَتْ کیوں فرمایا گیا۔ دونوں صیغے یکساں کیوں نہ آئے؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ خوشی اور ارادہ سے کام کرنا اکتساب کہلاتا ہے اور کسب ہر فعل کو کہہ دیتے ہیں۔ قصداً ہو یا بلا قصد۔ لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ انسان سے جو بھی نیکی صادر ہو جائے اس کا ثواب ملے گا۔ ارادۃً ہو یا بلا ارادہ' خوشی سے ہو یا مجبوراً۔ بچوں نے پٹ کر نماز پڑھی۔ ثواب ملا۔ کسی کے کھیت سے جانور' انسان کچھ دانے کھا گئے اور مالک کو خبر بھی نہ ہوئی مگر مالک کو ثواب ملا۔ کسی کے دیوار کے سایہ میں کسی نیک بندہ نے آرام پالیا۔ مالک کو ثواب ملا۔ مگر بدی کا یہ حال نہیں بھول سے ہو جائے معاف' خطا سے ہو جائے معاف' جبراً ہو جائے معاف' اگر مجبوری میں کلمہ کفر منہ سے نکال بھی لو تو بھی پکڑ نہیں۔ روزہ دار کے منہ میں جبراً کوئی چیز ٹھونس دی گئی جس سے روزہ ٹوٹ گیا۔ روزہ دار پر نہ گناہ' نہ کفارہ صرف قضا کافی ہے۔ اسی کرم کے اظہار کے لئے وہاں کَسَبَتْ فرمایا' اور یہاں اِكْتَسَبَتْ۔ اس کی رحمت غضب پر غالب ہے۔ اس کا ہم گنہگاروں کو سہارا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا آخرت کا نمونہ ہے اور یہاں یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک منزل کے چند راستے ہوتے ہیں اور ہر راستہ طے کرنے کے مختلف اسباب' مکہ معظمہ کا راستہ سمندر بھی ہے' خشکی بھی اور ہوا بھی۔ پروانے اڑ کر وہاں جائیں۔ زور والے مختلف سواریوں میں جائیں۔ زور والے پیدل وہاں پہنچیں یعنی کوئی ہوائی جہاز سے جائے' کوئی کشتی سے جائے' کوئی اونٹ سے' کوئی موٹر سے' کوئی پیدل' مگر بے زر' بے پر' بے زور' بے سہارا پر نہ وہاں جانا واجب اور نہ اس پر حج فرض۔ اس کا حج یہ ہی ہے کہ تمنائے حج میں مرے یہ ہی اس منزل کا حال ہے۔ بارگاہ الٰہی کے مختلف راستے ہیں کسی راستہ کا نام شریعت ہے' کسی کا طریقت اور ہر راستہ کے طے کرنے کے مختلف اسباب ہیں۔ کوئی اطاعت کے قدم سے دوڑتا ہے کوئی ارادت کے بازوؤں سے اڑتا ہے۔ کوئی تقویٰ کے قدم سے چلتا ہے کوئی عشق کے پروں سے اڑتا ہے۔ غرضکہ جیسی جسے توفیق۔ ویسے ہی اس کا سفر انشاء اللہ یہ سب وہاں تک پہنچیں گے۔ ان مسافروں سے خطاب ہے کہ اے رھروانِ راہ محبت اپنی کوشش میں کمی نہ کرو۔ جس قابل ہو سفر کئے جاؤ اللہ کسی نفس کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ بے پر کو اڑنے کا حکم نہیں۔ اور بے زر پر کچھ زور نہیں۔ ہاں اتنا خیال رکھنا کہ اس راستہ میں تمہاری جیسی کوشش ہوگی ویسی ہی کامیابی' چونکہ یہ راستہ دشوار ہے اور منزل کٹھن۔ اس لئے یہ دعا مانگتے

ہوئے آ ؤ کہ اے مولیٰ کریم اگر کبھی ہم راستہ بھول جائیں یا شامت نفس سے کبھی اس راستہ سے بہک کر شیطانی گلی کوچوں میں چلے جائیں تو ہماری پکڑ نہ کر اور یہ بھی دعا مانگو کے مولیٰ اس راستے میں ہمیں ہلکا پھلکا رکھ۔ مسافر جتنا ہلکا' اتنا ہی اسے آرام۔ جتنا بھاری اتنی ہی مصیبت۔ اے اللہ تیری رحمت ہمارے گناہوں کے بوجھوں کو اٹھائے' ہمارا بوجھ ہم پر نہ ڈال ورنہ ہم کمزور تجھ تک کیسے پہنچیں گے۔ مولیٰ کریم کرم فرما۔ اس راستہ پر چلانا بھی تیرا ہی کرم ہے اور منزل مقصود تک پہنچانا بھی تیرے فضل پر موقوف۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ دنیا' ایک میلہ گاہ یا نمائش گاہ ہے جہاں مختلف قسم کے بازار' تاجر' دوکانیں ہیں۔ ہم لوگ ناسمجھ بچوں کی طرح ہیں جو یہ میلہ دیکھنے آئے۔ حضرات انبیاء کرام' مشائخ عظام ہمارے والی وارث ہیں جن کے دامن تھامنے کی برکت سے ہم انشاء اللہ بہک نہیں سکتے۔ اگر یہ دامن چھوٹ جائے تو ہم بھٹک کر نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں۔ ہم کو چاہیے کہ یہ میلہ ضرور دیکھیں۔ یہاں سے سودے ضرور خریدیں مگر ان مقبولوں کا دامن پکڑے رہیں تا کہ میلہ دیکھ کر بخیریت اپنے گھر پہنچ جائیں۔ اس آیت میں رب تعالیٰ نے یہ دعا تعلیم فرمائی کہ مولیٰ اگر ہم بھول چوک کر ان کے دامن چھوڑ بیٹھیں تو معافی دے۔ وہ حضرات ہمیں نہ چھوڑ دیں۔ گم شدہ بچہ کو والی وارث ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہمارے والی وارث ہمیں ڈھونڈ ھ لیں۔

دوسری تفسیر

اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی گنجائش سے زیادہ کمال حاصل کرنے کی تکلیف نہیں دیتا۔ ہر ایک کو بقدر استعداد تجلیات عطا فرماتا ہے۔ جتنا ظرف اتنی ہی عطا ہر نفس جو کچھ بھلائیاں و کمالات کمائے گا۔ وہ اس کے لئے نافع ہوں گی اور جو کچھ گناہ کرے گا کہ خالق کے سوا مخلوق پر توجہ کرے۔ وہ اسی کے لئے نقصان دہ ہوگا۔ اس کو چاہیے کہ یوں دعا مانگا کرے کہ اے اللہ اگر ہم ظلمت نفس میں پھنس کر تیرا عہد و پیمان بھول جائیں اور ایسے عمل سے خطا کر جائیں جو تیری بارگاہ کے لائق نہ ہو تو ہماری پکڑ نہ فرما۔ اور اے اللہ ہم پر صفات نفس اور افعال خبیثہ کا بوجھ نہ ڈال دے جیسا کہ ان لوگوں پر ڈالا گیا جو ظاہری حجاب میں پھنس کر باطنی صفات سے محروم ہو گئے۔ (روح المعانی)

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ
اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ کہ نہیں ہے واسطے ہمارے طاقت ساتھ اسکے اور معاف کر ہم سے
اے رب ہمارے اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار نہ ہو اور ہمیں معاف فرما دے
وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾
اور بخشش کر واسطے ہمارے اور رحم کر ہم پر تو والی ہے ہمارا پس مدد کر ہماری اوپر قوم کافروں کے
اور بخش دے اور ہم پر مہر کر تو ہمارا مولیٰ ہے تو کافروں پر ہمیں مدد دے

پچھلے جملوں میں چند دعائیں ہیں۔ اس میں بھی ایک دعا ہی ہے گویا یہ جملہ گذشتہ کا تتمہ ہے۔ ان جملوں میں دشوار احکام سے

بچانے کی دعا کی گئی تھی جن کی اگرچہ طاقت تو ہو مگر بدشواری ادا ہو سکیں۔ اس میں ان چیزوں سے پناہ مانگی گئی ہے جو طاقت سے باہر ہوں۔

تفسیر

رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ۔ رَبَّنَا کی تکرار رب کا کرم حاصل کرنے کے لئے ہے۔ واؤ عاطفہ ہے اور جملہ وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا پر معطوف۔ حمل اور تحمیل قریباً ایک ہی ہیں۔ البتہ حمل کے بعد علیٰ آتا ہے۔ اور اس کے بعد نہیں آتا۔ بعض نے کہا کہ حمل کے معنی ہیں۔ لادنا تحمیل اٹھوانا اور لدوانا۔ اگر کسی کے سر پر بھاری بوجھ رکھ دیا جائے تو اسے حمل کہا جائے گا اور اگر اٹھانے کا بھی اسی کو مکلف کیا جائے کہ تو خود اٹھا کر اپنے سر پر رکھ یہ تحمیل ہے۔ لہٰذا حمل سے تحمیل سخت تر۔ بعض نے فرمایا کہ ثقیل چیز کا لادنا حمل اور نا قابل برداشت کا لادنا تحمیل نا سے سزائیں مراد ہیں یا ناممکن احکام یا وہ اعمال جو جہنم کا ذریعہ ہوں۔ طَاقَةَ طوق سے بنا۔ بمعنی قوت یہ اطاعت کا ہم معنی ہے۔ جیسے جابت و اجابت یہاں حاصل مصدر ہے۔ لَنَا طَاقَةَ کا متعلق ہے۔ بہ کا مرجع مَا ہے۔ تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں مَا سے مراد نفس کے وسوسے یا محبت کا جوش ہے۔ تو تحمیل سے مراد پکڑ ہے۔ یا مَا سے مراد دشمنوں کے طعنے دوستوں کی جدائی یا صورتوں کا مسخ ہونا ہے۔ یعنی اے مولیٰ ہم پر ان احکام یا ان سزاؤں یا ان تکالیف کا بوجھ مت ڈال۔ جن کے اٹھانے کی ہمیں طاقت نہیں۔ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اُعْفُ عفو سے بنا، بمعنی مٹانا، معافی کو اسی لئے عفو کہتے ہیں کہ اس سے جرم مٹ جاتا ہے۔ اغفر غفر سے بنا بمعنی چھپانا۔ اسی لئے چھلکا کو غفر کہتے ہیں کہ وہ مغز کو چھپائے ہوتا ہے۔ اصطلاح میں بخشنے کو بھی مغفرت کہا جاتا ہے اور عیب چھپانے کو بھی۔ اِرْحَمْنَا رحمؔ سے بنا بمعنی رقت قلب، رب تعالیٰ کے لئے جب اس کا استعمال ہو تو بمعنی رحمت اور مہربانی ہوتا ہے کیونکہ وہ قلب سے پاک ہے۔ یعنی ہمارے گناہوں کو مٹا دے، ہمارے عیبوں کو چھپالے اور ہم پر رحمت فرما کہ تھوڑی اور کھوٹی نیکیاں قبول فرمالے۔ اَنْتَ مَوْلٰنَا۔ مَوْلٰی ولیٌّ کا مصدر میمی ہے۔ بمعنی اسم فاعل۔ اس کے معنی ہیں مددگار، مالک سید اور متولی۔ یہاں سب معنی بن سکتے ہیں، یعنی ہم تجھ سے یہ دعائیں اس لئے کرتے ہیں کہ تو ہمارا مالک ہے آقا ہے، والی ہے۔ فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔ ف یا جزائیہ ہے اور یہ جملہ شرط محذوف کی جزا یا ترتب کی ہے اور یہ جملہ اَنْتَ مَوْلٰنَا پر مرتب۔ نصر بمعنی مدد ہے۔ جب بغیر علیٰ آئے تو موافق مدد مراد ہوتی ہے۔ اور اگر علیٰ آئے تو مخالف۔ یہاں دوسرے معنی میں ہے۔ قوم بمعنی جماعت ہے۔ جس کی تحقیق پہلے کی جاچکی اور کافرین سے سارے دینی دشمن مراد ہیں۔ خواہ انسان ہوں یا شیاطین وغیرہ یعنی چونکہ تو ہمارا والی ہے۔ ہم تیرے بندے ہیں اور بندوں کی مدد کرنا والی کا کام ہے۔ لہٰذا تو ہماری کفار قوم کے مقابلہ میں مدد کر اور ان پر ہمیں غلبہ دے۔

خلاصہ تفسیر

اے ہمارے مولیٰ ہم پر ان احکام اور عذابوں اور ناممکن باتوں کا بوجھ مت ڈال جن کے برداشت کی ہم میں طاقت نہیں اور ہمارے گناہ اور آثار گناہ کو مٹا دے۔ ہمارے عیبوں کو چھپالے اور ہمیں رسوا مت کر۔ اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہمارا والی اور مددگار ہے۔ لہٰذا کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ خیال رہے کہ عفو اور مغفرت اور رحمت میں چند طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ گناہ

پر عذاب نہ دینا عفو ہے۔ اور اس کا چھپالینا کہ کسی کو خبر نہ ہوتا کہ کوئی طعنہ نہ دے۔ یہ مغفرت اور عطاء ثواب رحمت پھر رحمت دو قسم کی ہے۔ جسمانی اور روحانی۔ دوسرا یہ کہ افعال کی معافی عفو ہے اور اقوال کی معافی مغفرت اور میزان کا بھاری کرنا رحم۔ تیسرے یہ کہ سکرات موت سے بچانا عفو اور تاریکی قبر سے محفوظ رکھنا مغفرت اور قیامت کے خوف سے بچانا رحم۔ چوتھا یہ کہ گناہ صغائر معاف کرنا عفو کبائر معاف کرنا مغفرت اور تھوڑی و کھوٹی عبادت قبول فرما کر اس پر کامل ثواب دے دینا رحم۔ پانچواں یہ کہ عذاب آخرت سے بچانا عفو دنیوی عذاب مسخ وحنف وغرق وغیرہ سے بچانا مغفرت اور ہم والیوں کو اپنے کرم سے مالا مال کر دینا رحمت۔ چھٹا یہ کہ قیامت کے دن اپنے حقوق معاف فرما دینا عفو اور بندوں کے حقوق معاف کرا دینا مغفرت اور جب کسی کے اعمال حقدار لے جائیں تو پھر بغیر عمل جنت دینا رحم۔ ساتواں یہ کہ گناہ مٹانا عفو اور کسی کو خبر نہ کرنا مغفرت اور بجائے گناہ نیکیاں دے دینا رحم۔ جیسے فرمایا گیا۔ اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔ (الفرقان: ۷۰) لہٰذا ان الفاظ میں تکرار نہیں کسی نے کیا خوب کہا ۔

گنہگار پہ جب لطف آپ کا ہو گا کیا بغیر کیا بے کیا کیا ہو گا
نیاؤ نہ کین کین ٹھکرائی بن کینی لکھ دین برائی !!!

یعنی رب نے انصاف نہ کیا' بلکہ رحم خسروانہ فرمایا کہ ہماری کی ہوئی برائیاں تمام بے کی ہوئی بنا دیں اور بغیر کی ہوئی نیکیاں اپنے کرم سے کی ہوئی بنا دیں۔ خیال رہے کہ ان دعاؤں میں رَبَّنَا نہ لایا گیا کیونکہ گویا یہ گذشتہ دعاؤں کا نتیجہ ہیں یا گویا بندہ دعائیں کرتے کرتے رب سے اتنا قریب ہو گیا کہ اسے پکارنے کی حاجت نہ رہی کیونکہ زیادتی قرب کبھی ندا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

فائدے

اس جملہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** دعا جماعت کے ساتھ مانگنا چاہیے تا کہ جلد قبول ہو کیونکہ دعائیں مل کر بارگاہ الٰہی میں زیادہ قبول ہوتی ہیں۔ اگر کوئی اکیلے دعا مانگے جب سب کے لئے مانگے۔ دیکھو یہاں ہر دعا میں ضمیر جمع لائی گئی۔ **دوسرا فائدہ:** دعا میں بار بار رَبَّنَا کہنا بہتر ہے جیسا کہ اس جگہ رَبَّنَا کے تکرار سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** دینی حاجتیں دنیوی حاجتوں سے پہلے مانگے۔ دیکھو یہاں پہلے خطا و نسیان کی معافی مانگنے کی تعلیم دی گئی۔ **چوتھا فائدہ:** گذشتہ لوگوں کے عذاب سے عبرت پکڑنا ضروری ہے تا کہ ان کے حوالہ سے دعا مانگی جائے کہ خدایا ان کی طرح ہم پر یہ عذاب نہ بھیجنا۔ **پانچواں فائدہ:** پچھلے مقبولین و مردودین کے حالات جاننا بہت فائدہ مند ہیں تا کہ مقبولین کے سے عمل کرے۔ اور مردودین کے اعمال سے بچے۔ جیسا اس حوالہ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن انسانی کلام ہے نہ کہ خدا کا ورنہ خدا کسے رب کہتا ہے اور کس سے دعا مانگتا ہے۔ (آریہ) **جواب:** اس کا مکمل جواب ہم آیت اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں دے چکے۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ یا تو یہاں قُوْلُوْا پوشیدہ ہے یعنی اے مسلمانو اس طرح دعائیں مانگو رب تعالیٰ عبادات کی طرح بندوں کو مانگنا بھی

سکھاتا ہے۔ یایَقُوْلُوْنَ فعل پوشیدہ ہے یعنی ہمارے نیک بندے یوں دعا مانگتے ہیں۔ یا تعلیماً یوں ارشاد فرمایا گیا۔ جیسے استاد پڑھاتے وقت خود پڑھتا ہے تاکہ اسی طرح شاگرد بھی پڑھے۔ کہتا ہے۔ الف ب ت ث وغیرہ یا حاکم رعایا کی زبان میں کلام فرماتا ہے مثلاً نوکری کے فارم کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ میں وفادار رہوں گا۔ بخوشی ہر کام کروں گا۔ یہ مضمون اگرچہ حاکم نے لکھا مگر نوکروں کی زبان سے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں یہ نہ فرمایا گیا لَا تُکَلِّفْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا الخ بلکہ وَلَا تُحَمِّلْنَا فرمایا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ناممکن چیزوں کی تکلیف دینا جائز ہے کیونکہ ناممکنات طاقت سے باہر ہیں اور دعا ممکنات کی مانگی جاتی ہے نہ کہ واجبات اور ناممکنات کی۔ (بعض علماء) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ تحمیل بمعنی تکلیف ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں مَا سے مراد اخروی عذاب ہے۔ جو برداشت سے باہر۔ تیسرا یہ کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مولیٰ تو دشوار احکام کے تکلیف نہ دینے کے قانون کو منسوخ نہ فرما۔ چوتھا یہ کہ کسی چیز کی دعا مانگنا اسکے امکان کو نہیں چاہتا۔ قرآن پاک میں۔ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ۔ (انبیاء ۱۱۲) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ۔ (شعراء: ۸۷) حالانکہ نہ انبیاء کرام کی رسوائی ممکن اور نہ خدا پاک کا غلط فیصلہ فرما دینا ممکن۔ **تیسرا اعتراض:** جب اللہ تعالیٰ نے خبر دیدی کہ ہم کسی نفس کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے پھر اس دعا مانگنے سے کیا فائدہ مانگی وہ چیز جاتی ہے جس کے نہ ملنے کا اندیشہ ہو۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر سے معلوم ہو چکا کہ یہاں مَا سے مراد یا تو دنیاوی مصیبتیں ہیں یا آخرت کے عذاب یا نفس کے وسوسے وغیرہ یہ چیزیں تو طاقت سے زیادہ بھی ڈالی جاتی ہیں۔ بعض بیماریاں ایسی سخت آتی ہیں کہ انسان کی جان نکل جاتی ہے اور آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ میں شرعی احکام کی تکلیف مراد ہے کہ کسی شخص پر طاقت سے زیادہ احکام شرعیہ لازم نہیں کئے جاتے۔ لہٰذا وہ آیت بھی درست ہے اور یہ دعا بھی صحیح۔

تفسیر صوفیانہ

ابتدا کی طرف لوٹنے کا نام انتہا ہے۔ انسان مسافر ہے۔ جدھر سے چلا تھا۔ ادھر ہی جا رہا ہے۔ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَعَهٗ شَیْئٌ۔ رب تھا اور کچھ نہ تھا اس ذات کے تعین اول کا نام حقیقت محمدیہ ہوا۔ وہ ہی اصل وجود اور حقیقت ہر بود ہے۔ جس سے سارا عالم ظہور میں آیا۔ رب نے خاک کو دانہ' دانے کو آٹا' اور آٹے کو روٹی' روٹی کو خون' اور خون کو منی اور منی کو نطفہ اور نطفہ کو مضغہ' اور مضغہ کو علقہ' پھر اسے بے عقل و ہوش بچہ بنایا۔ پھر اس بیہوش کو عقل و ہوش دیا۔ یہ تمام مراتب بعد کے تھے۔ اب اسے اصل کی طرف یوں رجوع کیا کہ پہلے اسے ظاہری شریعت کا پابند کیا پھر ایمان کے بعد عرفان دیا۔ پھر صاحب کشف و الہام بنایا۔ پھر اسے خدمات و کرامات دیئے۔ پھر اسے مدارج طے کرنے کی توفیق دی۔ یہاں تک کہ وہ فنافی الرسول کے درجہ سے ہوتا ہوا فنافی اللہ تک پہنچا۔ یہ اس کی انتہاء تھی۔ کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ (انبیاء: ۱۰۴) اس سفر میں اسے کئی منزلوں میں ٹھہرنا پڑا۔ ہر منزل کے احکام جداگانہ تھے۔ جن میں سے دو مقام اہم تھے۔ ایک شریعت کی پابندی دوسرا طریقت۔ ان دو مقاموں کے لحاظ سے بندہ نے دعا مانگی۔ پہلے مقام میں ترک سختی کی دعا کی اور دوسرے مقام میں ناقابلِ برداشت احکام سے پناہ مانگی چونکہ شریعت طریقت سے پہلے ہے اس لئے لَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا کو وَلَا تُحَمِّلْنَا سے پہلے بیان کیا گیا۔ یعنی اے مولیٰ اس سفر میں منزل شریعت کی سختیوں سے بچا اور مقام طریقت میں ہم سے وہ اطاعت اور شکر اور معذرت طلب نہ کر جو تیری

بارگاہ کے لائق ہیں بلکہ وہ ہی ٹوٹی پھوٹی عبادات قبول فرمالے جو ہمارے لائق ہیں۔ اور ہم پر ہجران اور محرومی کے بوجھ نہ ڈال۔ ہمارے افعال وصفات کی کوتاہیوں کو معاف کر اپنے وصال کی لذت اور جمال کا مشاہدہ عطا فرما۔ ہمارے وجود کے گناہ کو معاف کر کیونکہ ہونا ہی تو اکبر الکبائر ہے۔ وجود بعد فنا عطا فرما کر رحم کر تو ہمارا اصل والی ہے۔ ہم تیرے آثار قدرت اور مظاہر صفات ہیں۔ ہمیں کافر قوم یعنی نفس امارہ اور اس کے صفات اور شیطانی لشکروں اور ہمارے وہموں پر ہمیں مدد دے۔ جو تیری راہ میں آڑ ہیں۔ ہماری قوت روحانیہ کو اس قوت جسمانیہ پر غالب فرما جو تیرے ماسوا کی طرف بلاتی ہے۔ (از کبیر و معانی) صوفیاء فرماتے ہیں کہ دعائیں چار قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن کی تعلیم رب نے دی اور ہم کو خود بتائیں۔ جیسے ان جیسی آیات کی دعائیں۔ دوسری وہ جو نبی ﷺ نے ارشاد فرمائیں۔ جو باب الدعوات کی احادیث میں مذکور ہیں۔ تیسری وہ جو رب تعالیٰ نے یا اس کے محبوب نے گذشتہ پیغمبروں کی دعائیں نقل فرمائیں کہ فلاں پیغمبر نے فلاں موقعہ پر یہ دعا مانگی۔ جیسے حضرت خلیل علیہ السلام اور ذبیح اللہ کے متعلق فرمایا کہ ان حضرات نے تعمیر کعبہ پر یہ دعا مانگی رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ ان تین قسم کی دعاؤں کو دعاء ماثورہ کہتے ہیں اور چوتھی وہ دعا جو بندہ خود اپنی تجویز و ارادے سے مانگے۔ ان تمام دعاؤں میں وہ دعائیں بہتر ہیں جو رب تعالیٰ نے تعلیم فرمائیں۔ پھر وہ جو حضور ﷺ نے ارشاد کیں پھر وہ جو دیگر انبیاء کرام سے منقول ہیں۔ سب سے اخیری وہ جو بندہ خود مانگے۔ بہر حال دعا ماثورہ غیر ماثورہ سے افضل ہے کہ ماثورہ یعنی منقول دعا میں الفاظ کی تاثیر بھی ہے۔ زبان کی تاثیر بھی۔ غیر ماثورہ میں صرف الفاظ کی تاثیر ہے۔ رب تعالیٰ نے سورۂ بقرہ دعائے ماثورہ کی تعلیم پر ختم فرمائی۔

فضائل و فوائد: ہم الٓمّٓ کے شروع میں سورۂ بقرہ کے بہت سے فضائل و فوائد عرض کر چکے ہیں۔ کچھ یہاں عرض کئے جاتے ہیں۔ (۱) سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں یعنی اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے اخیر تک حضور ﷺ کو معراج میں بلاواسطہ عطا ہوئیں اور حضور ﷺ نے لامکان میں پہنچ کر یہ ہی دعائیں مانگیں۔ (درمنثور و مشکوٰۃ باب المعراج) (۲) بیہقی نے حضرت نعمان ابن بشیر سے نقل کیا کہ رب تعالیٰ نے آسمانوں و زمین کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب خاص تحریر فرمائی۔ سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں اس کتاب کی ہیں۔ کذافی الترمذی والدارمی ونسائی و درمنثور (۳) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عقبہ ابن عامر سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ سورۂ بقرہ کی اخیری دو آیتیں پڑھا کرو۔ میرے رب نے خصوصیت کے ساتھ عرش کے نیچے سے مجھے عطا فرمائیں۔ مجھ سے پہلے کسی نبی کو یہ نہ ملیں (درمنثور) (۴) مسلم نے عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ جب حضور ﷺ معراج میں سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے۔ تو آپ کو تین چیزیں عطا فرمائیں۔ پانچ نمازیں۔ اور سورۂ بقرہ کی اخیری دو آیتیں اور ہر مومن کی بخشش (درمنثور) (۵) حاکم و بیہقی رحمۃ اللہ علیہم نے ابوذر سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ رب نے جن آیتوں پر سورۂ بقرہ ختم فرمائی۔ وہ عرش کا خزانہ ہیں۔ انہیں خود بھی سیکھو اور اپنے بیوی بچوں کو بھی سکھاؤ۔ یہ صلوٰۃ ہیں۔ یہ قرآن ہیں یہ دعائیں ہیں (۶) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بڑا بیوقوف وہ شخص ہے جو سوتے وقت سورۂ بقرہ کی اخیری آیتیں نہ پڑھے (دارمی) (۷) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی نماز عشاء کے بعد سورۂ بقرہ کی اخیری آیتیں پڑھے اسے تمام رات عبادات کا ثواب ملتا ہے۔ (ابن

عدی و در منثور) (۸) حضرت کعب فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو چار چیزیں وہ دی گئیں جو کسی پیغمبر کو نہ دی گئیں۔ بقرہ کے آخری رکوع کی تین آیتیں اور آیۃ الکرسی (ابوعبیدہ) (۹) ابوقلابہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی سخت مصیبت میں گرفتار ہو وہ دعائے کرب پڑھے۔ وہ یہ ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْعَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ سُبْحٰنَكَ يَا رَحْمٰنُ مَا شِئْتَ اَنْ تَكُوْنَ كَانَ وَ مَا لَمْ تَشَآءْ لَمْ يَكُنْ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اَعُوْذُ بِالَّذِيْ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ وَمَنْ فِيْهِنَّ اَنْ يَّقْعَنَ عَلَى الْاَرْضِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِنْ شَرِّ مَا بَرَاَ وَاَعُوْذُ بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّآمّٰتِ الَّتِيْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ مِّنْ شَرِّ السَّاعَةِ وَالْجَامَةِ وَمِنَ الشَّرِّ. كُلِّهٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ. پھر آیت الکرسی پڑھے۔ پھر سورۂ بقرہ کا اخیری رکوع پڑھے۔ انشاء اللہ نجات ملے گی (تہذیب الآثار)...... (۱۰) حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی سوتے وقت سورۂ بقرہ کی اخیری دو آیتیں پڑھ لیا کرے تو اسے رات بھر شیطان اور دیگر آفات سے پناہ ملے گی اور تمام رات کی عبادت کا ثواب ملے گا (مسلم و بخاری رحمۃ اللہ علیہما و خازن) (۱۱) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایک روز جبرئیل حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک اوپر سے سخت آواز سنی' حضرت جبرئیل نے عرض کیا یا رسول اللہ اس وقت آسمان کا وہ دروازہ کھلا جو آج تک کبھی نہ کھلا تھا۔ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ ایک فرشتہ حاضر ہوا' حضرت جبرئیل نے عرض کیا کہ حضور ﷺ یہ وہ فرشتہ ہے جو آج تک کبھی زمین پر نہ آیا۔ اس فرشتہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ کو ان دو نوروں کی مبارک باد دینے آیا ہوں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہ ملے۔ ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقرہ کی اخیری آیتیں۔ اس کے پڑھنے والے کی ہر تمنا پوری ہوگی۔ (مسلم وخازن) (۱۲) سورۂ بقرہ ختم کر کے آمین کہنا چاہیے' کیونکہ حضور ﷺ بھی فرماتے تھے اور فرشتے بھی آمین کہتے ہیں (کبیر) (۱۳) اگر دفن کے بعد قبر کے سرہانے سورۂ بقرہ کا پہلا رکوع مفلحون تک اور قبر کی پائنتی سورۂ بقرہ کا آخری رکوع پڑھا جائے تو میت کو قبر میں راحت حاصل ہوگی۔ (۱۴) جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں تین دن تک شیطان نہیں آتا (روح البیان) (۱۵) حضرت معاذ ابن جبل فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار شیطان کو قید کر لیا۔ وہ بولا اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں آپ کو بڑا عمدہ عمل بتاؤں۔ میں نے کہا بتا؟ وہ بولا کہ اگر کوئی انسان رات کو سورۂ بقرہ کی اخیری آیتیں پڑھ لیا کرے تو ہم میں سے کوئی اس گھر میں رات بھر نہیں جاسکتا۔ غرضکہ اس کے فضائل وفوائد بے شمار ہیں۔ فقیر کی یہ وصیت ہے کہ تہجد خواں حضرات اپنی تہجد میں یہ دو دعائیں پڑھا کریں۔ اول رکعت میں سورۂ بقرہ کا یہ آخری رکوع' دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران کا یہ رکوع اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ (آل عمران: ۹۰) اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران: ۱۹۴) تک معنی پر نظر و دھیان رکھیں انشاء اللہ بہت خشوع وخضوع میسر ہوگا اور قبول کی امید بھی ہے۔ بھاگے ہوئے مجرم کیلئے وارنٹ کی ضرورت ہوتی ہے جو مجرم خود ہی حاکم کے سامنے پیش ہو جائے اسے وارنٹ کی ضرورت نہیں۔ رب تعالیٰ حاضر ہو جانے والے مجرموں کو اپنے کرم سے معافی دے دیتا ہے۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ اسے راضی کرنے کی کوشش کرو اللہ تعالیٰ میرے ان الفاظ میں تاثیر دے۔ آخر میں بندہ گنہگار شرمسار اپنے آقا تاجدار مدنی ﷺ کا نعت خواں احمد یار خاں بارگاہِ پروردگار میں عرض کرتا ہے کہ مولیٰ تیرا ہی فضل وکرم تھا جو میں نے سورۂ بقرہ کی تفسیر ختم کی۔ اگر

میں نے کچھ غلطی کی ہو تو میری شامت نفس ہے اور اگر صحیح لکھا ہو تو میرے مولیٰ وہ تیری توفیق سے ہے۔ اے مولیٰ کریم اپنے محبوب ﷺ کے صدقہ اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور صحابہ بدر و حنین کے طفیل اسے قبول فرمالے۔ میری خطاؤں سے درگزر فرما۔ اس کی برکت سے میرے نامہء اعمال کی سیاہی دور فرما۔ اسے صدقہ جاریہ بنا۔ اور ہم سب کو نیک اعمال کی توفیق عطا فرما۔ اس قرآن کو ہمارے دلوں کا سرور ہماری آنکھوں کا نور اور ہماری قبر کا مونس اور حشر کا ساتھی بنا۔ اور اے مولیٰ باقی تفسیر پوری کرنے کی توفیق دے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا وَشَفِيْعِنَا وَحَبِيْبِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

احمد یار خاں نعیمی اشرفی اوجھانوی گجرات (پنجاب)
۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ھ ہجری روز ایمان افروز دوشنبہ مبارکہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَۃُ اٰلِ عِمۡرَانَ مَدَنِیَّۃٌ وَّ ہِیَ مِائَتَا اٰیَۃٍ وَّ عِشۡرُوۡنَ رُکُوۡعًا

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ

اللہ نہیں ہے کوئی معبود سوا اس کے زندہ قائم رکھنے والا اتارا او پر تمہارے اس کتاب کو

اللہ ہے جس کے سوا کسی کی پوجا نہیں آپ زندہ اوروں کو قائم رکھنے والا اس نے تم پر سچی کتاب اتاری

بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَ اَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَ الۡاِنۡجِیۡلَ ۙ﴿۳﴾

ساتھ حق کے سچا کرنے والا ان کو جو سامنے ہیں اس کے اور اتارا توارات وانجیل کو

اگلی کتابوں کی تصدیق فرمائی اور اس نے اس سے پہلے تورات اور انجیل اتاری

مِنۡ قَبۡلُ ہُدًی لِّلنَّاسِ وَ اَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ۬ؕ

پہلے سے ہدایت واسطے لوگوں کے اور اتار افرقان کو

لوگوں کی راہ دکھاتی اور فیصلہ اتارا

سورۃ کا تعلق

یہ سورۃ مدنی ہے۔ یعنی بعد ہجرت اُتری۔ اس میں دوسو آیتیں' تین ہزار چار سو اسی کلمے اور چودہ ہزار پانچ سو بیس حرف ہیں (خازن وخزائن) اس سورۃ کا نام توریت شریف میں طیبہ ہے۔ (معانی) حضور ﷺ نے اس کا اور بقرہ کا نام زہراوین رکھا یعنی چمکدار سورتیں (از مسلم ومعانی) نیز اس کا نام سورۂ امان' سورۂ کنز' سورۂ مغنیہ' سورۂ مجادلہ اور سورۂ استغفار بھی ہے۔ یہ نام اس کے مضامین کی مناسبت سے ہیں' چونکہ اس سورۃ میں حضرت عمران کے بیوی بچوں کے حالات کا بیان ہے اس لئے اس کا نام سورۂ آل عمران ہوا۔ حضرت عمران مریم کے والد' عیسیٰ علیہ السلام کے نانا ہیں۔ خیال رہے کہ قرآن کریم بڑی کتاب ہے۔ اگر اس کی تقسیم نہ ہوتی تو اس کی تلاوت بھی مشکل ہوتی اور اس کا سیکھنا بھی دشوار اس لئے رب تعالیٰ نے قرآن کریم کی کئی طرح تقسیم فرمائی۔ آیات سے' رکوع سے' منزلوں سے' سیپاروں سے۔ آیتوں سے تقسیم تو دوران تلاوت سانس لینے کے لئے ہے۔ رکوعوں سے تقسیم نماز میں تلاوت کے لئے ہے کہ اتنا پڑھ کر رکوع کرو۔ منزلوں سے تقسیم ان لوگوں کے لئے ہے جو ایک ہفتہ میں قرآن ختم کرنا چاہیں۔ اور پاروں سے تقسیم ان لوگوں کے لئے ہے جو مہینہ میں ختم کریں۔ رہا سورتوں سے تقسیم فرمایا یہ قرآن کی اصلی تقسیم ہے جو آسمان سے اسی طرح نازل ہوئی۔ اس کو سورۂ بقرہ سے چند طرح تعلق اور مناسبت ہے۔

(۱) سورۂ بقرہ کے بہت سے مجمل احکام کی اس سورۃ میں شرح ہے۔

(۲) سورۂ بقرہ میں دلائل تھے اور اس سورۃ میں کفار کے شبہات دور کئے گئے ہیں۔ اسی لئے اس میں بعض مضامین مکرر آئے ہیں۔ مثلاً قرآن کی حقانیت [illegible] گزشتہ کتابوں کی تصدیق کرنا وغیرہ

(۳) سورۂ بقرہ کو آدم علیہ السلام کے قصہ سے شروع کیا گیا تھا۔ جن کی نہ ماں تھی' نہ باپ' اور اس سورۃ کو عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے شروع کیا گیا جن کی والدہ تھیں۔ والد نہ تھا۔ چونکہ آدم علیہ السلام پہلے انسان تھے۔ اس لئے ان کا ذکر قرآن کی پہلی سورۃ میں آیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا ان کے بعد۔ اس لئے ان کا ذکر بعد کی سورۃ میں۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش عجیب و انوکھی تھی مگر آدم علیہ السلام کی پیدائش عجیب تر۔ لہٰذا عجیب تر کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔ نیز عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو محض اس لئے خدا کا بیٹا مانا کہ وہ بغیر باپ پیدا ہوئے۔ لہٰذا رب نے پہلے آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا۔ اب اس سورۃ میں عیسیٰ علیہ السلام کا تاکہ ان کی تردید میں آسانی ہو کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے ہو تو آدم علیہ السلام کو بھی مانو۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو آدم علیہ السلام کے قصہ پر قیاس کیا گیا ہے اور مقیس علیہ مقیس سے پہلے ہوتا ہے۔ لہٰذا سورۂ بقرہ پہلے آئی اور آل عمران اس کے بعد۔

(۴) سورۂ بقرہ کو متقین کے ذکر سے شروع کیا گیا اور پھر جہنم کے بارے میں فرمایا' اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (بقرہ: ۲۴) وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی۔ اور اس سورۃ کے آخر میں فرمایا گیا۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (آل عمران: ۱۳۳) جنت پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی۔ لہٰذا یہ سورتیں گویا یکساں ہیں۔

(۵) اس سورۃ کی انتہا سورۃ بقرہ کی ابتدا کے مناسب ہے کہ وہاں متقیوں کے بارے میں فرمایا گیا۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (بقرہ: ۵) اور اس کے اخیر میں ارشاد ہوا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران: ۲۰۰)

(۶) سورۂ بقرہ میں ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی گئی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (بقرہ: ۱۲۹) اس سورۃ میں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (آل عمران: ۱۶۴) غرضیکہ اس سورۃ کو سورۂ بقرہ سے مناسبت ہے۔

آیت کا تعلق: اس آیت کا سورۂ بقرہ کی آخری آیت سے چند طرح تعلق ہے۔

(۱) یہ کہ اس آیت میں بندہ کی مجبوری اور معذوری کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں رب تعالیٰ کی قدرت و عظمت کا ذکر ہے جس سے بندہ کی بندگی اور خدا کی ربوبیت کا پتہ لگتا ہے اور ان دونوں پر ہی ایمان کا مدار ہے کہ بندہ اپنے کو مجبور' معذور جانے' رب کو قادر مطلق سمجھے تب ہی تو اسی پر ایمان لائے گا۔ اسی کی اطاعت کرے گا۔

(۲) یہ کہ اس آیت میں مسلمانوں سے قوم کفار کے مقابلہ میں فتح کی دعا منگائی تھی۔ اب اس آیت میں اس فتح کا ذکر ہے جو رب تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو عیسائیوں کے مناظرہ میں عطا فرمائی لسانی جنگ' سنانی جنگ سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ سنانی جنگ تو کبھی کسی سے ہو جاتی ہے مگر لسانی جنگ یعنی مناظرہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ نیز مناظرہ میں کبھی لوگ راستہ پر آ جاتے ہیں مگر جنگ میں اکثر شکست کھا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس لئے رب تعالیٰ نے مناظرہ کا بڑے اہتمام سے ذکر فرمایا۔

(۳) یہ کہ یہ ساری سورۃ سورہ بقرہ کے اخیر جملہ سے خاص تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس میں کفار پر فتح مانگی گئی اور اس سورۃ کی بہت سی آیتوں میں کفار کے ساتھ مناظرہ اور جہاد کا ذکر ہے۔

شان نزول

ایک بار نجران کے عیسائیوں کی ایک جماعت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی جس میں ساٹھ سوار تھے اور چودہ ان کے سردار اور اس قوم کے تین بڑے پیشوا بھی ان میں تھے۔ ایک کا نام عبدالمسیح لقب عاقب تھا۔ یہ اپنی قوم کا سردار تھا۔ جس کی رائے کے بغیر عیسائی کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ دوسرے کا نام ایہم تھا' یہ اپنی قوم کا افسر مال تھا۔ جس کے ذمہ ساری قوم کی خورد ونوش اور رسد کا انتظام تھا۔ تیسرے کا نام ابو حارثہ ابن علقمہ تھا۔ جو نصاریٰ کے تمام علماء پادریوں کا بڑا پیشوا تھا۔ روم کے بادشاہ اس کے علم اور دینی عظمت کی وجہ سے ان کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے اور اس کے لئے جائیدادیں' زمینیں وقف کی تھیں اور کنیسے بنائے تھے۔ یہ ہی اس جماعت کا سردار اعظم تھا۔ جب یہ لوگ نجران سے چلے تو ابو حارثہ خچر پر سوار ہوا اور اس کا بھائی کرز ابن علقمہ اس کے ساتھ تھا۔ اچانک ابو حارثہ کا خچر پھسلا۔ کرز نے حضور (علیہ السلام) کا نام لے کر کہا کہ وہ ہلاک ہوں' کیونکہ اس زمانہ میں پھسلتے وقت دشمنوں کو بددعا دیا کرتے تھے۔ ابو حارثہ نے کہا خبردار وہ کیوں ہلاک ہوں تو ہلاک ہو۔ کرز نے کہا کیوں؟ ابو حارثہ نے کہا کہ وہ سچے نبی ہیں۔ یہ وہ ہی آخر الزمان پیغمبر ہیں جن کا اب تک انتظار تھا۔ کرز نے کہا تو تم ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ ابو حارثہ بولا کہ ہمارے بادشاہوں نے ہمیں بہت جائیداد دے رکھی ہے۔ اگر ان پر ایمان لے آئیں تو سب کچھ چھن جائے گا۔ یہ بات کرز کے دل میں بیٹھ گئی۔ آخر کار کچھ عرصہ بعد کرز اپنے پچیس ساتھیوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ خیر یہ لوگ سفر کر کے مدینہ منورہ پہنچے۔ جب مسجد نبوی میں حاضر ہوئے تو عصر کی نماز کا وقت تھا۔ یہ لوگ عمدہ اور قیمتی پوشاکیں پہن کر بڑے شان و شوکت سے حضور علیہ السلام سے مناظرہ کرنے آئے تھے۔ صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم نے آج تک ایسی شان وشکوہ والی جماعت نہ دیکھی تھی۔ انہیں مسجد نبوی میں اُتارا گیا۔ جب ان کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے وہاں ہی نماز شروع کر دی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا انہیں اپنی نماز پڑھ لینے دو۔ چنانچہ انہوں نے مشرق کی طرف نماز پڑھی (خازن وروح البیان وغیرہ) پھر حضور علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم ایمان لاؤ۔ وہ بولے ہم تو آپ سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم جھوٹے ہو۔ تمہیں اسلام لانے سے چند باتیں روکتی ہیں۔ تم عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانتے۔ خنزیر کھاتے ہو وغیرہ وغیرہ ان میں سے کوئی بولا کہ واقعی وہ خدا کے بیٹے تھے' ورنہ بتاؤ ان کے باپ کون ہیں؟ بعض نے کہا کہ وہ تیسرے خدا تھے' دیکھو قرآن شریف میں بھی خَلَقْنَا اَنْزَلْنَا۔ وغیرہ جمع کے صیغے فرمائے گئے اور جمع کم سے کم تین پر بولی جاتی ہے۔ اگر خدا ایک ہوتا تو ہر جگہ واحد کا صیغہ ہی ہوتا۔ بعض بولے کہ نہیں بلکہ ان میں خدائی اثر ایسے حلول کئے ہوئے ہے جیسے پھول میں رنگ و بو' کیونکہ ان سے خدائی کام ظاہر ہوئے۔ انہوں نے مردے زندہ کئے انہوں نے اندھوں اور کوڑھوں کو اچھا کیا۔ انہوں نے مٹی سے پرندے بنا کر ان میں روح پھونک دی۔ یہ کام وہ ہی کر سکتا ہے جس میں خدائی ہو۔ حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم تو جانتے ہو کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے۔ وہ بولے ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا رب حیی لا یموت ہے۔ اس کیلئے موت ناممکن اور عیسیٰ علیہ السلام پر موت آنے والی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ پھر فرمایا کہ رب بندوں کا حقیقی کارساز' محافظ اور روزی دینے والا ہے۔ وہ بولے ہاں حضور علیہ السلام نے فرمایا کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایسے ہیں۔ انہوں [illegible] پھر فرمایا کہ جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ پر آسمان و زمین کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ انہوں نے

اقرار کیا تو فرمایا کیا عیسیٰ علیہ السلام بھی بغیر تعلیم الٰہی کچھ جان سکتے ہیں۔ وہ بولے نہیں' حضور علیہ السلام نے فرمایا تم جانتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام حمل میں رہے۔ پیدا ہونے والے کی طرح پیدا ہوئے۔ بچوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ انسانی عوارضات بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اقرار کیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ پھر وہ الٰہ کیسے ہیں اس پر وہ سارے خاموش ہو گئے۔ تب سورۂ آل عمران کی کچھ اور (۸۰) اسی آیتیں نازل ہوئیں (کبیر و خازن و خزائن وغیرہ) اس مناظرے سے عاجز ہو کر پھر وہ مباہلہ پر آمادہ ہوئے۔ جس کا قصہ اس سورۃ میں آئے گا مگر پھر مباہلہ کی بھی ہمت نہ کی۔ وہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ سچے نبی ہیں اور نبی کی بددعا ہلاک کر دیتی ہے۔ (کبیر)

تفسیر

الٓمٓ اس کے متعلق سیپارہ میں بہت کچھ عرض کیا جا چکا۔ یہاں صرف یہ سمجھ لو کہ یا تو الف سے اللہ کی طرف اشارہ ہے اور لام سے لطیف کی طرف اور میم مجید کی جانب یعنی قرآن اللہ نے اتارا۔ جو رحم و کرم و بزرگی والا ہے۔ یا الف سے اشارہ اللہ کی طرف ہے۔ لام سے جبریل کی طرف اور میم سے محمد مصطفیٰ ﷺ کی طرف۔ یعنی یہ قرآن یا سورۃ اللہ نے اتارا' جبریل لائے اور محمد مصطفیٰ ﷺ پر اترا۔ بعض قرأتوں میں الف لام میم پر وقف ہے اور بعض میں اس کی میم کو زیر دے کر لام سے ملا دیا گیا ہے۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ اس جملہ کی پوری تفسیر آیۃ الکرسی میں ہو چکی۔ اللہ مبتدا ہے۔ اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اس کی خبر۔ اور اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ خبر دوم۔ الحی وہ ہے جسے کبھی موت نہ آ سکے۔ یعنی حی کامل صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اَلْحَیُّ میں لام عہدی ہے۔ اس کے ماسوا بھی اگرچہ حی ہیں مگر حی ناقص قابلِ موت لہٰذا الحی رب تعالیٰ ہی کی صفت ہے اور قیوم وہ جو خود بالذات قائم ہو اور دوسرے اس سے قائم ہوں۔ اور جو خلق کی دنیوی اخروی ساری حاجتوں کا انتظام فرمائے۔ قیوم حقیقی یعنی عالم کو قائم' باقی رکھنے والا صرف رب تعالیٰ ہے۔ اس کے بعض بندے قیامِ عالم کا ذریعہ ہیں حدیث شریف میں ہے کہ تارے' چاند' سورج آسمان کے بقا کا ذریعہ ہیں اور میرے صحابہ قیام زمین کا وسیلہ اسی لئے صوفیاء کی اصطلاح میں بعض بزرگوں کو قیوم اول' قیوم دوم کہا جاتا ہے۔ بعض اولیاء اللہ عالم کی حاجت روائی کا ذریعہ ہیں۔ حضور انور ﷺ چالیس ابدال کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کی برکت سے لوگوں پر بارشیں ہوں گی۔ جنگوں میں فتح و نصرت نصیب ہو گی۔ لہٰذا یہ حضرات مجازاً قیوم ہیں۔ ہم ان دو لفظوں کی نہایت نفیس تحقیق آیت الکرسی میں کر چکے ہیں۔ یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہی ہمیشہ زندہ رہنے والا' اور سب کو قائم رکھنے والا ہے چونکہ توحید کا عقیدہ بغیر حضور ﷺ کو ماننے معتبر نہیں۔ نیز رب تعالیٰ کی قیومت کا تقاضا تھا کہ بندوں کو بقاء کے ذریعے دیئے جائیں۔ چنانچہ بقاء اجسام کے لئے اس نے غذائیں و دوائیں و ہوائیں وغیرہ پیدا فرمائیں اور بقاء ارواح یا بقاء ایمان کے لئے۔ انبیاء مبعوث کئے۔ کتابیں اتریں۔ گویا کتب آسمانی کا نزول قیومیت باطنی کا ظہور ہیں۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ نَزَّلَ تنزیل سے بنا بمعنی آہستہ اُتارنا۔ اَلْكِتٰبِ میں الف لام عہدی ہے۔ جس سے قرآن پاک مراد۔ چونکہ یہ پہلے لوح محفوظ میں تھا اور اس کے مضامین پچھلے پیغمبروں کے صحیفوں میں لکھے ہوئے تھے اور آئندہ بھی اس کی کتابت ہوتی رہے گی۔ اس لئے اسے کتاب فرمایا۔ اگرچہ اس کا نزول پڑھ کر ہوا نہ کہ لکھ کر۔ کتاب فرمانے میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ کامل کتاب یہ ہی ہے' اس کے مقابلہ میں سب

ناقص۔ بالحق یا نَزَّلَ کے متعلق ہے یا متلبسًا پوشیدہ کے اور وہ کتاب کی صفت حق مقابل باطل کا ہے۔ جیسے صدق مقابل کذب کا۔ ہر واقعی حقیقت رکھنے والی چیز حق کہلاتی ہے۔ یعنی اس رب نے حق کے ساتھ آپ پر کتاب اتاری۔ جس میں باطل بالکل شامل نہ ہو سکا کہ بھیجنے والے رب نے حق بھیجا' لانے والے جبریل حق لائے' کوئی ملاوٹ نہ کی' لینے والے نبی کریم ﷺ نے حق لیا کہ زیر زبر تک بھول نہ سکے۔ یا رب نے آپ پر وہ کتاب اُتاری جو حق سے موصوف ہے اور ممکن ہے کہ حق بمعنی صدق ہو۔ یعنی قرآن میں پچھلوں کی سچی خبریں ہیں یا حق بمعنے فیصلہ کرنے والا کلام' یعنی یہ تو قول فیصل ہے نہ کہ ہزل یا حق بمعنی عدل و انصاف ہے۔ یا حق بمعنی استحقاق یا حق فاسد کا مقابل ہے۔ یعنی اس کلام میں تناقص اور تقابل نہیں۔ یا یہ کلام اس کا مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے (کبیر و معانی وغیرہ) مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ۔ مُصَدِّقًا یا تو علیک کی ضمیر مجرور کا حال ہے۔ یا کتاب کا یا بِالْحَقِّ کے متعلق کا جو کہ کتاب کا حال اول تھا۔ یہ لفظ تصدیق سے بنا بمعنی سچا کرنا اور سچا کہنا' یا سچا کہلوانا' قرآن کریم گذشتہ نبیوں' کتابوں وغیرہ کا تینوں طرح مصدق ہے۔ لِمَا مُصَدِّقًا کے متعلق ہے۔ مَا سے پچھلی آسمانی کتابیں مراد ہیں۔ چونکہ پہلے کچھ کتابیں آئی تھیں۔ کچھ صحیفے۔ کچھ انبیاء کرام کے معجزات۔ ان سب کو شامل کرنے کے لئے مَا ارشاد ہوا۔ قرآن کریم نے سب ہی کی تصدیق فرمائی۔ بَیْنَ ثبت فعل محذوف کا ظرف ہے جو مَا کا صلہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں سامنے' خواہ زمانہ کے لحاظ سے سامنے ہو' یا جگہ کے لحاظ سے' یہاں زمانہ کے لحاظ سے مراد ہے۔ یعنی یہ قرآن پچھلی کتابیں' صحیفے' انبیائے کرام کے معجزات کو سچا کرنے والا ہے یا سچا بتانے والا ہے۔ خیال رہے کہ جیسے مصدق میں احتمال ہے کہ علیک کے کاف خطاب سے حال ہو ایسے ہی بالحق میں بھی احتمال ہے کہ متلبسًا ثابتًا کے متعلق ہو' علیک کے کاف خطاب کا حال ہوگا۔ یعنی آپ پر کتاب اُتاری اس حال میں کہ آپ حق سے وابستہ و متصف ہیں اس طرح کہ آپ (ﷺ) کی ہر ادا حق ہے۔ آپ (ﷺ) سراپا حق ہیں۔ بلکہ آپ مطلقاً حق ہیں۔ ہمارے اعمال نفسانی' شیطانی' رحمانی ہر طرح کے ہوتے ہیں مگر آپ ﷺ وہ ہیں کہ آپ (ﷺ) کا سونا' جاگنا' دیکھنا' سننا' بولنا عین حق ہے۔ یعنی بے عیب ہے۔ چونکہ قرآن عین حق ہے اس لئے جس پر قرآن اُترا' وہ بھی عین حق ہونا چاہیے۔ نیز جو حضور ﷺ سے وابستہ ہو وہ حق جو آپ (ﷺ) سے علیحدہ ہو گیا' باطل ہو گیا۔ طلوع و غروب کے وقت نماز حق نہیں' باطل ہے کیونکہ حضور (ﷺ) نے اس سے منع فرما دیا۔ ایسے ہی جو عالم حضور ﷺ سے وابستہ ہے وہ حق ہے' جو وابستہ نہیں باطل ہے۔ جب قرآن کا کاغذ' سیاہی' قلم' لکھنے والا' چھونے والا پاک چاہیے' سب کا احترام ہے۔ ایسے ہی جس ذات کریم پر قرآن اترے وہ بھی پاک و حق چاہیے۔ ان کا احترام بھی لازم' وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ۔ یہ جملہ نزل پر معطوف ہے اور گویا بَیْنَ یَدَیْهِ کا بیان خصوصی ہے۔ چونکہ توریت و انجیل کی خصوصیت سے تصدیق فرمائی' اور انہی کتابوں کے ماننے والے عرب موجود تھے۔ اس لئے اس کو علیحدہ بیان فرمایا۔ اگرچہ زبور شریف اور تمام صحیفے برحق ہیں اور سب پر ہمارا ایمان ہے اور قرآن کریم و حضور ﷺ نے سب ہی کی تصدیق فرمائی مگر توریت کی تصدیق زبور کی تصدیق ہے۔ اور داؤد علیہ السلام کی امت عرب میں تھی نہیں اس لئے زبور کا ذکر ہوا' نہ کہ دوسرے صحیفوں کا اور چونکہ توریت و انجیل کا آنا یکبارگی ہوا تھا اور قرآن شریف کا نزول آہستگی سے تئیس سال میں۔ لہٰذا اس کے لئے نزل فرمایا گیا۔ اور ان کے لئے اَنْزَلَ حق یہ ہے کہ توریت زبان عبرانی کا لفظ ہے اور انجیل زبان سریانی کا۔ اس کے اس

لئے اس کا اشتقاق اور معنی بیان کرنا ضروری نہیں مگر بعض لوگوں نے فرمایا کہ یہ دونوں لفظ عربی ہیں اگر غیر زبان کے ہوتے' تو ان پر الف لام نہ آتا۔ الف لام آنا علامت عربیت کی ہے۔ اسی لئے المشکوٰۃ' الموسیٰ' العیسیٰ نہیں کہا جاتا۔ خواہ وضعاً عربی ہوں' یا ان زبانوں سے منقول ہو کر پھر ان میں اختلاف ہے کہ یہ لفظ کس سے مشتق۔ بعض نے کہا کہ توریت وریٰ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پتھر سے لوہا رگڑ کر آگ نکالنا' یعنی چمک اور نور۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ۔ (الواقعہ: ۷۱) چونکہ وہ کتاب نور تھی اس لئے اس کا نام توریت ہوا۔ بعض نے فرمایا کہ یہ وریٰ سے مشتق ہے بمعنی چھپانا یُوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَ رِیْشًا (اعراف: ۲۶) اس لئے جس کلام کی مراد ظاہر نہ ہو۔ اسے توریہ کہتے ہیں چونکہ تورات شریف میں اشارے۔ تلویحات' رموز بہت تھے۔ اس لئے اس کا نام توریت ہوا۔ خلیل وسیبویہ کے نزدیک تورۃ بروزن فوعلۃ ہے۔ جیسے صومعۃ اصل میں ووریۃ تھا۔ پہلا واؤ' ت سے بدلا۔ اور ی' الف سے تو توریت ہو گیا۔ لکھنے میں توریت آتا ہے اور پڑھنے میں کبھی تورات اور کبھی توریت فراء فرماتے ہیں کہ یہ بروزن تفعلۃ ہے۔ جیسے توصیۃ باب تفعیل کا مصدر تخفیفاً رے کے کسرہ کو فتح سے اور ی کو الف سے بدل دیا گیا۔ تورات ہو گیا۔ مگر خیال رہے کہ پہلی صورت میں واؤ کا ت سے بدلنا بھی تخفیف کے لئے ہے۔ جیسے تجاۃ تراث اور جیسے تخمہ اور تکلان' اور دوسری صورت میں کسرہ کو فتح سے بدلنا بھی تخفیف کے لئے ہے۔ جیسے قرصیۃ سے قرصات مگر فوعلۃ کے اوزان زیادہ ہیں۔ جیسے صومعۃ' موصلۃ' دوسرۃ مگر تفعلۃ کا وزن بہت کم ہے۔ لفظ انجیل اس میں چند قول ہیں۔ بعض نے کہا کہ اس کا مادہ نجل ہے۔ بمعنی اصل اسی لئے ماں باپ کو ناجلین کہتے ہیں۔ چونکہ وہ انجیل شریف اپنے دین کی اصل تھی لہٰذا اسے انجیل بروزن افعیل کہا گیا۔ بعض نے فرمایا کہ یہ نجل سے بنا بمعنی تازہ پانی' عرب والے کہتے ہیں۔ اِسْتَنْجَلَ الْوَادِیْ یعنی جنگل میں نیا کنواں ظاہر ہوا' چونکہ انجیل سے بھی حق ظاہر ہوا تھا۔ اس لئے اسے انجیل کہا گیا۔ بعض نے کہا کہ نجل سے مشتق ہے۔ بمعنی پانی کا وسیع چشمہ کہا جاتا ہے۔ عَیْنٌ نَّجْلَآءُ۔ چونکہ توریت کے احکام میں تنگی تھی اور انجیل کے احکام میں وسعت' اس لئے اسے انجیل کہا گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ تناجل سے بنا بمعنی جھگڑا کرنا۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ تناجل الناس چونکہ اس میں اختلاف بہت ہوا کہ ایک سے بارہ انجیلیں بن گئیں۔ اس لئے اسے انجیل کہا گیا۔ خیال رہے کہ شیر کے بچہ کو بھی اسی لئے نجل کہتے ہیں کہ وہ سب پر غالب رہتا ہے۔ بہر حال جن لوگوں نے انہیں لفظ عربی مانا انہوں نے اس کے اشتقاق میں یہ مشقتیں کیں اور جنہوں نے عجمی مانا انہیں اس کی ضرورت درپیش نہیں آئی۔ کبھی عجمی ناموں پر بھی الف لام آجاتا ہے۔ جیسے الاسکندریہ (از تفسیر کبیر و معانی) خیال رہے کہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت میں انجیل ہے الف کے فتح سے مِنْ قَبْلُ یہ اَنْزَلَ کے متعلق ہے اور قبل کا مضاف الیہ پوشیدہ۔ یا تو قبلک تھا یا قبلہ یعنی رب نے آپ (ﷺ) سے پہلے یا قرآن کے پہلے توریت وانجیل بھی نازل فرمائی تھی۔ ھُدًی لِّلنَّاسِ۔ ھُدًی مصدر ہے بمعنی ہادی اور توریت وانجیل کا حال چونکہ مصدر واحد تثنیہ جمع سب کے لئے بولا جاسکتا ہے۔ اس لئے یہ واحد ہی رہا اور ممکن ہے کہ الکتاب کا حال ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ھُدًی معنی مصدری میں ہو۔ اور اس سے پہلے ذوی پوشیدہ ہو اور ممکن ہے کہ اَنْزَلَ کا مفعول لہٗ ہو یعنی توریت وانجیل لوگوں کو نبی آخر الزمان کی طرف رہبری کرنے کیلئے اتاری گئی تھیں کہ لوگ ان کے ذریعہ نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں۔ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ۔ یہ نزل پر معطوف ہے۔ اور فرقان' سبحان' غفران کی طرح مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یعنی

حق و باطل میں فرق کرنے والا۔ یہاں یا تو اس سے قرآن شریف مراد ہے۔ اور اَنْزَلَ سے اس کا پہلا نزول مراد۔ جب لوح محفوظ سے بیت العزت کی طرف اتارا گیا چونکہ وہ ایکبارگی آیا تھا اس لئے اَنْزَلَ ارشاد ہوا یا فرقان سے آیات محکمات مراد ہیں جو قابل نسخ نہ ہوں۔ یا اس سے زبور شریف مراد ہے یا ساری آسمانی کتابیں گویا یہ تعمیم بعد تخصیص ہے۔ یا اس سے گذشتہ انبیائے کرام کے معجزات مراد ہیں۔ چونکہ معجزہ جادوگر اور نبی میں فرق کر دیتا ہے اسلئے اسے بھی فرقان کہا جاتا ہے۔ یعنی رب تعالیٰ نے ساری آسمانی کتابیں یا زبور شریف' یا انبیائے کرام کے معجزات یا قرآن مجید اتارا جو کہ حق و باطل میں فرق کرنے والے ہیں۔ (کبیر و روح المعانی وغیرہ)

خلاصہ تفسیر

اے لوگو اللہ وہ ذات ہے کہ جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ہی ہمیشہ زندہ ہے اور عالم کو قائم رکھنے والا۔ لہٰذا وہ اولاد وغیرہ سے پاک ہے۔ فانی چیز کیلئے اولاد کی ضرورت ہے تا کہ اسکی نسل باقی رہے۔ جب چاند' سورج' تارے جو عارضی طور پر قیامت تک باقی رکھے جائیں گے۔ ان کے اولاد نہیں تو وہ حیی لا یموت قدوس اولاد کا حاجت مند کیونکر ہو سکتا ہے۔ رب تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ اے محبوب ﷺ اس نے آپ پر ایسی عجیب و غریب کتاب اُتاری جو بالکل سچی ہے۔ حق ہے اور پچھلی ساری کتابوں کی تصدیق و تائید فرمانے والی ہے۔ اگر یہ نہ آتی تو وہ کتابیں سچی نہ ہو سکتی اور یہودیوں و عیسائیوں سے جب یہ سوال کیا جاتا کہ بتاؤ وہ نبی آخر الزمان کہاں ہیں جن کی تمہاری کتابوں نے پیشینگوئی کی تھی تو یہ کیا جواب دیتے۔ آپ کے اور اس کتاب کے آنے سے ان کتابوں کا بول بالا اور ان اہل کتاب کا منہ اجالا ہو گیا۔ نیز اس قرآن نے سارے جہان سے ان کتابوں کی تصدیق کرالی اور انہیں سچا کہلوالیا۔ ورنہ انہیں کون جانتا اور آپ ﷺ پر یہ کتاب نئی نہیں آئی۔ رب نے اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام پر توریت و انجیل بھی اُتاری تھی جو سارے لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف خصوصاً یہود و نصاریٰ کو آپ کی اور قرآن کی طرف ہدایت کرتی ہیں کہ ان کتابوں میں آپ ﷺ کا حلیہ شریف آپ کے اوصاف جمیلہ' بلکہ آپ کے صحابہ کرام کے صفات صاف صاف موجود ہیں۔ اور رب تعالیٰ نے ایسی چیزیں اتاری ہیں جو حق و باطل میں فرق کر دیں۔ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دکھائیں۔ پھر یہ کیوں بہکتے ہیں۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ نے قرآن کریم کے متعلق فرمایا۔ آپ پر اتاری چند وجھوں سے ایک یہ کہ قرآن کریم سید الکتاب ہے اور آپ ﷺ سید الانبیاء۔ اعلیٰ کتاب اعلیٰ رسول ﷺ پر ہی آنی چاہیے تھی۔ دوسرا یہ کہ آپ ﷺ پر ہی قرآن اترا ہے۔ اس اتارنے میں نہ تم کو غلطی ہوئی ہے نہ حضرت جبرئیل کو دھوکا۔ اس کتاب کیلئے پہلے ہی سے آپ (ﷺ) کا انتخاب ہو چکا تھا۔ تیسرا یہ کہ یہ کتاب آپ (ﷺ) پر آئی۔ آپ ﷺ کی زبان یعنی عربی میں آئی' آپ کی زمین یعنی مکہ مدینہ میں آئی۔ آپ ﷺ کے زمان یعنی خیر القرون میں اتری۔ چوتھا یہ کہ کتاب کے الفاظ تمہارے کان و زبان پر مضامین دماغ پر اور اسرار دل پر احکام تمہارے قالب پر اترے کہ تم نے یہ سب کچھ براہ راست رب سے سیکھا۔ کسی اور استاد کی شاگردی نہ کی۔ اس لئے عَلَیْکَ فرمایا عَلٰی اُذُنِکَ وغیرہ نہ فرمایا۔ لہٰذا یہ آیت حمد الٰہی بھی ہے۔ نعت مصطفیٰ بھی۔ حقیقت قرآن بھی۔ ہم لوگ الفاظ قرآن سیکھنے میاں جی کے پاس جاتے ہیں۔ قراءۃ سیکھنے قاری صاحب کے پاس' معانی و احکام سیکھنے عالم کے پاس' اسرار و رموز سیکھنے کیلئے شیخ وقت کے پاس جاتے ہیں مگر رب

تعالیٰ نے یہ تمام خود ہی اپنے حبیب کو سکھا دیئے یہ ہے نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ کا ظہور۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ۔ (القیامۃ:۱۸)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اس سورۃ کے نام ہی میں عیسائیوں کی تردید ہے کیونکہ اس کا نام ہے سورۂ آل عمران جس کے معنی ہوئے عمران کے گھر والے۔ یعنی بال بچے اور آل سے عمران کی بیوی حضرت حنا عمران کی بیٹی حضرت مریم اور عمران کے نواسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ اس سورۃ میں انہی کا قصہ بیان ہو رہا ہے اور جو کسی کی اولاد ہو وہ نہ خدا ہو سکتا ہے نہ خدا کی بیوی کہ یہ رشتے ہم جنسیت چاہتے ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** اس سورۃ کا نام روافض و خوارج کی بھی تردید ہے کیونکہ اس کا نام آل عمران اور آل سے مراد عمران کی بیوی بھی ہیں اور ان کی بیٹی اور نواسے بھی۔ معلوم ہوا کہ آل میں بیوی اور اولاد سب داخل ہوتے ہیں۔ درود پاک میں آتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ اس آل میں حضور ﷺ کی ساری اولاد ساری بیویاں داخل ہیں۔ روافض کہتے ہیں کہ بیبیاں آل نہیں وہ بھی اس سورۃ کے نام سے عبرت پکڑیں۔ خوارج کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اولاد پاک آل سے خارج ہے وہ بھی اس نام سے نصیحت حاصل کریں۔ **تیسرا فائدہ:** بے دینوں سے مناظرہ کرنا سنت نبوی بلکہ سنت انبیاء ہے۔ دیکھو اس سورۃ کا بڑا حصہ اس مناظرہ کے بارے میں اُترا جو حضور ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے کیا۔ **مسئلہ:** جو کہے کہ رب تعالیٰ نے قرآن کریم اتارنے میں غلطی کی اسے دھوکا ہو گیا۔ یا کہے کہ جناب جبریل علیہ السلام نے پہنچانے میں غلطی کی کہ قرآن آیا تھا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وہ بھول کر لے آئے حضور ﷺ پر یا کہے کہ حضور ﷺ نے پورا قرآن نہ پہنچایا' یا آپ ﷺ کچھ بھول گئے' یا آپ نے بوقت وفات قلم و دوات' کاغذ منگایا نہ دیا گیا جس سے بعض احکام بیان نہ ہو سکے۔ وہ مرتد بے دین ہے کہ نَزَّلَ عَلَیْکَ بِالْحَقِّ کا انکاری ہے۔ جب قرآن کریم کا نزول حق کے ساتھ ہوا' حق سے پہنچا' حق کے ساتھ حضور ﷺ نے سنا' اور پہنچایا تو یہ خامیاں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں۔ قرآن میں اگر تردد ہوا تو اسلام ہی ختم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** مناظرہ میں دلائل قوی دینے چاہئیں' نہ کہ گالیاں۔ دیکھو حضور ﷺ نے عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت پر کیسے قوی دلائل قائم فرمائے کہ سارے عیسائی حیران رہ گئے نہ وہاں مذاق تھا نہ دل لگی۔ اس زمانہ کے مناظر اس سے عبرت حاصل کریں۔ **پانچواں فائدہ:** اگر کفار کے ایمان کی امید ہو تو ان سے اخلاق کے برتاوے برتنا چاہئیں۔ دیکھو حضور ﷺ نے نجران کے ان عیسائیوں کو بطور مہمان اپنی مسجد شریف میں اتارا اور ان کے کلام پر کچھ ناراضی کا اظہار نہ فرمایا کہ کبھی سخت کلامی سے ضد پیدا ہو جاتی ہے اور جب ضد آئی' تلاش حق گئی۔ اس زمانہ کے عام مناظرے اسی وجہ سے ناکام رہتے ہیں کہ ان کی بنیاد ضد پر ہوتی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** ضرورتاً کفار کا مسجد میں آنا جائز ہے۔ دیکھو حضور ﷺ نے عیسائیوں کو مسجد میں داخل فرمایا۔ اب بھی فقہاء فرماتے ہیں کہ قاضی کو مسجد میں بیٹھنا چاہیے تاکہ ہر فریادی اس تک بے تکلف پہنچ سکے۔ اور ظاہر ہے کہ فریادیوں میں بعض کافر بھی ہوں گے۔ **ساتواں فائدہ:** عقیدہ توحید بغیر عقیدہ نبوت معتبر نہیں الا بعدم الاطلاع۔ دیکھو رب نے اپنے صفات کے ساتھ قرآن کریم توریت و انجیل وغیرہ کا ذکر بھی فرمایا۔ درحقیقت انبیائے کرام اور ان کی کتابیں رب کا صحیح

پتہ ہیں۔ بغیر پتہ خط اور اس کا سارا مضمون منزل مقصود تک نہیں پہنچتا۔ ایسے ہی بلا واسطہ انبیاء سارے عقائد بیکار ہوں گے۔

آٹھواں فائدہ: کبھی نام کام کا پتہ دیتے ہیں۔ دیکھو رب تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے اسماء سے عیسیٰ علیہ السلام کی بندگی ثابت فرمائی۔ **نواں فائدہ:** مناظرہ کے قانون قرآن شریف سے مستنبط ہیں۔ چنانچہ دلیل تخلف اس آیت سے مستنبط ہوسکتی ہے وہ اس طرح کہ کہا جائے کہ تم عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت میں جھگڑا کرتے ہو یا ان کی نبوت میں۔ اگر انہیں خدا مانتے ہو تو یہ غلط ہے۔ اللہ حیی وقیوم ہے اور عیسیٰ علیہ السلام میں یہ وصف نہیں۔ اور اگر ان کی نبوت ثابت کرنا چاہتے ہو تو ہمیں منظور ہے مگر جن دلائل سے ان کی نبوت ثابت کرتے ہو وہ سارے دلائل محمد مصطفیٰ ﷺ میں موجود ہیں۔ اگر ان پر انجیل آئی تھی تو ان پر قرآن اترا۔ اگر ان کے ہاتھ شریف پر چند معجزات ظاہر ہوئے تو حضور علیہ السلام کے دستِ اقدس پر صدہا معجزات ظاہر ہوئے۔ غرض جن وجوہ سے تم انہیں نبی مانتے ہو انہی سے انہیں بھی نبی مان لو۔ اس کی کیا وجہ کہ دلیل تو عام ہو اور دعویٰ خاص ہو جائے۔ اب ہماری اس تقریر کو آیت پر منطبق کرو کہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے انکار کے لئے الحیی القیوم فرمایا گیا اور ان کی نبوت کے ساتھ حضور ﷺ کی نبوت ثابت فرمانے کے لئے پہلے فرمایا گیا نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ پھر ارشاد ہوا۔ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ۔ یعنی چونکہ نزول کتاب آپ میں اور ان میں مشترک ہے تو ضروری ہے کہ نبوت بھی مشترک ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ عیسیٰ علیہ السلام نبی ہوں اور آپ نہ ہوں۔ بے شک وہ سچے نبی ہیں۔ روح اللہ ہیں مگر اے پیارے تم سید الانبیاء ہو اور حبیب اللہ ہو کیونکہ تم میں یہ خصوصیت ہے کہ تمہاری کتاب مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ساری کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ جب قرآن بڑی کتاب ہے تو قرآن والا بھی بڑا پیغمبر بڑی کتاب بڑے معلم پڑھاتے ہیں۔ **دسواں فائدہ:** اگر کسی بزرگ کے متعلق بعض لوگ حد سے بڑھ جائیں تو ان کی تردید کے لئے بزرگ کو گالیاں مت دو بلکہ حد سے بڑھنے والوں کو سمجھاؤ۔ دیکھو عیسیٰ علیہ السلام کو عیسائیوں نے خدا کا بیٹا مانا، مگر قرآن اور صاحب قرآن ﷺ نے ان کی توہین نہ کی بلکہ عیسائیوں کی تردید فرمائی۔ دیکھو اس آیت میں عیسائیوں کے مقابلہ میں فرمایا گیا کہ بے شک رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر توریت اور عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل اتاری۔ وہ حضرات بھی سچے ان کی کتابیں بھی سچی، مگر اے بے ایمانو تم جھوٹے کہ تم نے انہیں خدا کا بیٹا مان لیا۔ اسی لئے اگلی آیت میں کفار کی برائی فرمائی گئی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ الخ اس سے اسمٰعیل کی ذریت غیر مقلد اور دیو بندیوں کو عبرت پکڑنی چاہیے۔ ان بدنصیبوں نے مسلمانوں کی تردید کیلئے حضور ﷺ کو گالیاں دیں معاذ اللہ اور تقویۃ الایمان براہین قاطعہ وغیرہ جیسی گندی و ناپاک کتابیں لکھ ڈالیں۔

گیارھواں فائدہ: نزول قرآن شریف کا بھی ہوا اور توریت وانجیل کا بھی مگر ان کے نزولوں میں چند طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ نزول قرآن بڑھ کر ہے اور ان کتابوں کا نزول لکھا ہوا۔ اس لئے اسے قرآن کہتے ہیں۔ ان کتب کا نام قرآن نہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کتب کے نزول کے لئے جگہ مقرر تھی کہ موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر بلا کر توریت دی گئی۔ مگر نزول قرآن کے لئے کوئی جگہ مقرر نہیں۔ مکہ معظمہ کے کوچہ و بازاروں میں مدینہ پاک کے دشت و آبادی میں نزول ہوتا رہا۔ تیسرا یہ کہ توریت وانجیل کے نزول کے لئے وقت مقرر کہ فلاں مہینہ فلاں تاریخ میں توریت دی گئی مگر نزول قرآن کے لئے کوئی وقت مقرر نہ ہوا۔ دن رات حضور ﷺ کے ہر حال میں حتیٰ کہ بستر پر آرام فرماتے آیات قرآنیہ نازل ہوتی تھیں۔ اس لئے

قرآن کریم کے لئے نَزَّلَ اور توریت وانجیل کے لئے انزل ارشاد ہوا۔ نزول قرآن کی ان وسعتوں میں حضور انور کی محبوبیت کا بھی اظہار ہے کہ برابر رب ومحبوب میں سلسلہ رسل ورسائل باقی ہے اور امت مرحومہ پر کرم بھی کہ اس طرح احکام آنے میں انہیں تکلیف نہ ہوئی۔ اسرائیلی چونکہ سرکش قوم تھی اور سرکش قوم کے لئے قوانین بھی سخت ہوتے ہیں۔ اس لئے ان پر رب نے سختی فرمائی تمام احکام کا ایک دم آجانا بھی ایک سختی تھی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں قرآن پاک کی خصوصی صفت بیان فرمائی گئی۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کہ پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اس میں قرآن پاک کی ہی کیا خصوصیت ہے۔ ہر آسمانی کتاب نے اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کی۔ **جواب:** گزشتہ کلام کی تائید کو تصدیق کہتے ہیں اور آنے والی کلام کی تعریف کو بشارت۔ ساری آسمانی کتابیں اپنے سے پہلوں کی تصدیق کرتی تھیں اور آئندہ کی بشارت دیتی تھیں۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مصدق تو ہر کتاب کا ہے مگر مبشر کسی کا نہیں کیونکہ اس کے بعد نہ کوئی نیا نبی آئے گا اور نہ کوئی آسمانی کتاب مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ کے یہ معنی ہیں کہ ساری کتابوں کا مصدق کسی کا مبشر نہیں۔ یہ ہی ہمارے حضور ﷺ کی صفت ہے۔ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ۔ (آل عمران: ۸۱) **دوسرا اعتراض:** جب قرآن پاک نے پچھلی کتابوں کو منسوخ کر دیا تو ان کی تصدیق کہاں کی؟ **جواب:** یہ نسخ ہی ان کی تصدیق ہے۔ ان کتابوں نے خود خبر دی تھی کہ ہم قرآن سے منسوخ ہوں گے۔ اگر قرآن آکر انہیں منسوخ نہ کرتا تو انکی یہ خبر جھوٹی ہو جاتی۔ نیز نسخ تصدیق کے خلاف نہیں۔ قرآن نے یہ فرمایا کہ وہ ساری کتابیں سچی ہیں۔ آسمان سے آئیں۔ مگر ان کے احکام اب جاری نہیں جیسی بچہ کی عمر ویسی اس کی غذا جیسی دنیا کی عمر ویسے ان کے احکام۔ **تیسرا اعتراض:** قرآن کریم نے اپنی صفت فرمائی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ اور یہاں توریت وانجیل کے متعلق فرمایا هُدًى لِّلنَّاسِ تو کیا توریت وانجیل کی ہدایت قرآن کریم کی ہدایت سے زیادہ عام ہے؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں اَلنَّاسُ سے مراد اس زمانہ کے یہودی وعیسائی ہیں جیسے حضرت مریم کے لئے فرمایا گیا۔ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران: ۴۲) دوسرا یہ کہ ہدایت کے معنی راہ دکھانا بھی ہیں اور مقصود تک پہنچانا بھی۔ یہاں راہ دکھانا مراد ہے اور وہاں مقصود تک پہنچانا مراد تھا۔ یعنی توریت وانجیل سب کو خدا کا راستہ دکھاتی ہیں۔ خواہ ان پر توریت کے احکام لازم ہوں یا نہیں تیسرا یہ کہ یہاں ہدایت سے قرآن اور صاحب قرآن کی طرف ہدایت دینا مراد ہے۔ یعنی توریت وانجیل باآواز بلند پکار رہی ہیں کہ آؤ قرآن والے کو مان لو۔ چوتھا یہ کہ یہاں بھی هُدًى لِّلنَّاسِ قرآن کی صفت ہے یا نبی کریم ﷺ کی جیسا کہ تفسیر میں عرض کیا۔ **چوتھا اعتراض:** اسکی کیا وجہ ہے کہ رب نے اولاً فرمایا نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اور پھر فرمایا وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ حالانکہ انزال کے معنی ہیں ایک دم اتارنا اور تنزیل کے معنی ہیں آہستگی سے اتارنا یہ دونوں وصف قرآن میں کیونکر جمع ہو گئے؟ **جواب:** قرآن کے چند نزول ہیں۔ ایک تو لوح محفوظ سے پہلے آسمان کی طرف۔ دوسرا حضور علیہ السلام پر ہر ماہ رمضان میں۔ یہ دونوں نزول یک دم تھے۔ اور تیسرا حضور ﷺ پر نزول۔ بحسب ضرورت پہلے دو نزولوں کے لحاظ سے اَنْزَلَ فرمایا گیا اور تیسرے نزول کے لحاظ سے نَزَّلَ۔ **پانچواں**

اعتراض: اس آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے عیسائیوں کو مسجد نبوی شریف میں اپنی نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ اور آج کل مسلمان دیو بندیوں' قادیانیوں کو بھی اپنی مسجدوں میں اسلامی نماز نہیں پڑھنے دیتے' بلکہ بعض لوگ بد مذہب کے گھس جانے پر مسجد دھلواتے ہیں۔ ان کا یہ فعل اس حدیث کے خلاف ہے۔ **جواب:** وہ عیسائی اہل کتاب تھے۔ اور یہ لوگ مرتدین ہیں اور مرتد کے احکام اہل کتاب سے سخت تر ہیں۔ نیز ان کے ایمان کی امید تھی۔ اس لئے وہاں اخلاق کا برتاوا برتا گیا اور یہاں ان لوگوں کے فتنہ کا سخت اندیشہ ہے۔ وہ لوگ دل میں ایمان رکھ کر آئے تھے اور یہ لوگ مسجد پر قبضہ کرنے کی نیت سے آتے ہیں۔ جس کے مسجد میں آنے سے نمازیوں کو ایذا ہو۔ اس کو مسجد سے ضرور روکا جائے۔ گالیاں بکنے والا گدہ دہنی کا مریض' کچی پیاز یا لہسن کھانے والا۔ جس کے منہ میں بدبو ہو' جس کے جسم پر بدبو دار زخم ہو۔ ان سب کو مسجد سے روکا جاتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ ان کے آنے میں نمازیوں کو ایذا ہے تو جن بے دینوں کے آنے سے نمازیوں کو ایذا ہوان کو ضرور روکا جائے اگر اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرنا ہے تو اپنی مسجدوں میں مشرکین کو سنکھ بجانے اور پوجا پاٹ کی بھی اجازت دے دو۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا (التوبہ: ۲۸) یہ آیت فتح مکہ کے بعد کی ہے۔ اور یہ مناظرہ فتح مکہ سے پہلے کا۔ اس آیت نے حکم دیا کہ مشرکین کو خانہ کعبہ کا طواف نہ کرنے دو۔ ممکن ہے کہ یہ حدیث اس آیت سے منسوخ ہو۔ خیال رہے کہ مسجد حرام اور دیگر مساجد حکم مسجدیت میں یکساں ہیں اور طواف و دیگر نمازیں یکساں۔ جب کفار کو مسجد حرم شریف میں طواف کرنے کی اجازت نہیں تو دیگر مساجد میں نماز پڑھنے کی اجازت کیونکر ہوگی۔ نیز کسی روایت میں یہ نہیں آتا کہ ان عیسائیوں کو حضور علیہ السلام نے نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ بلکہ الفاظ یہ ہیں فَقَامُوا الصَّلٰوةَ فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَقَالَ دَعُوْهُمْ (خازن) وہ لوگ خود نماز کیلئے کھڑے ہوگئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو۔ واقعہ یہ ہوا کہ مسلمان نماز عصر میں مشغول ہوئے اور انہوں نے اپنی نماز شروع کر دی۔ بعد عصر مسلمانوں نے انہیں روکنا چاہا حضور ﷺ نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو۔ پڑھ لینے دو۔ اس سے اجازت ثابت نہیں ہوتی۔ بخاری میں ہے کہ ایک بدوی مسجد نبوی شریف میں پیشاب کرنے لگا صحابہ کرام نے روکنا چاہا' حضور ﷺ نے فرمایا دعواہ اسے چھوڑ دو۔ پیشاب کر لینے دو۔ اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ مسجدوں میں پیشاب کرنا جائز ہے۔ وہ ہی لفظ یہاں بھی ہے جو ان عیسائیوں کے لئے تھا۔ غرض اجازت ثابت نہیں ہوتی۔

تفسیر صوفیانہ

رشتے اور تعلقات دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ہم جنسیت چاہتے ہیں۔ جیسے باپ بیٹا یا بیوی شوہر یا بھائی برادر ہونا کہ یہ رشتے دو جنسوں میں قائم ہو سکتے ہی نہیں۔ کوئی جانور کسی انسان کا نہ باپ ہو سکے نہ بیٹا' نہ شوہر نہ بیوی' نہ بھائی' نہ بھتیجا۔ دوسرا وہ جس میں یہ شرط نہیں۔ جیسے مالک مملوک خالق و مخلوق وغیرہ جانور انسان کا مملوک ہوتا ہے اور انسان اس کا مالک۔ بے وقوف عیسائیوں نے بندہ کا رب کے ساتھ وہ رشتہ جوڑا جو ہم جنسیت چاہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو رب کا بیٹا اور حضرت مریم علیہا السلام کو اس کی بیوی قرار دیا۔ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ. فرما کر اسی جانب اشارہ کر دیا گیا کہ جو رشتہ دو مختلف قوموں میں قائم نہیں ہو سکتا وہ حی القیوم کے ساتھ کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ وہ خالق' یہ مخلوق' یہ عابد وہ معبود' یہ حادث وہ قدیم۔ پھر باپ بیٹا ہونا کیسا؟ ہاں

یوں کہو کہ وہ سب اللہ کے پیارے بندے اور اس کے رسول سچے ہیں۔ بندگی وہ رشتہ اور تعلق ہے جو مخلوق و خالق میں قائم ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حضور سید عالم ﷺ کا مخلوق سے ظاہری رشتہ لباس بشریت کا اثر تھا۔ ورنہ حقیقت محمدیہ کا نہ کوئی باپ ہے نہ بیٹا نہ بھائی نہ بھتیجا مغز کے احکام اور ہیں پوست کے کچھ اور (مثنوی شریف) اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کو کیا خوب ادا فرمایا۔

وہ شرف کہ قطع ہیں نسبتیں وہ کرم کہ سب سے قریب ہیں
کوئی کہہ دو یاس و امید سے وہ کہیں نہیں وہ کہاں نہیں ہیں

بعض اولیاء اللہ پر حالت وجدان طاری ہوتی ہے تو تمام عالم سے منہ موڑ لیتے ہیں۔

خیال رہے کہ انسان کا نفس گویا زمین ہے اور روح گویا آسمان انبیائے کرام رحمت کا بادل۔ آسمانی کتابیں گویا بارش۔ جیسے زمین پر آسمان کی مدد سے بارش کے ذریعہ پھل پھول پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے ہی نفس پر روح کے ذریعہ انبیائے کرام کی تعلیم کی برکت سے ایمان عرفان اور تقوئی پرہیز گاری کے باغ کھلتے ہیں۔ فرشتوں میں صرف آسمان یعنی روح ہے۔ زمین یعنی نفس نہیں۔ اسی لئے ان کے پاس اعمال کی کھیتی نہیں۔ اور ان کے اعمال پر جزا نہیں انسان کے پاس چونکہ نفس بھی ہے اسی لئے اس کے اعمال قابل جزا ہیں جیسا کہ ایک بارش سے زمین پر مختلف پھول کھلتے ہیں۔ ایسا ہی بارش قرآن سے زمینِ نفس پر رنگ برنگے مختلف پھل پھول پیدا ہوئے۔ صدیق' فاروق' عثمان غنی' حیدر کرار اولیاء و اقطاب ان کے نفوس میں قدرت نے جیسا تخم امانت رکھا تھا۔ قرآن کی بارش سے ویسے ہی ان پر باغ لگے۔ اور یہ بھی خیال رکھو کہ اخیری بارش پچھلی ساری بارشوں کا تتمہ ہوتی ہے اگر یہ نہ ہو تو وہ سب برباد۔ اب اس آیت کا مطلب سمجھو کہ رب تعالیٰ نے زمینِ نفس پر توریت و انجیل وغیرہ کی بارش بھیجی۔ پھر جب یہ کھیتی پکنے کے قریب آئی تو اس پر قرآن کی بارش برسائی جو مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ہے۔ یعنی گذشتہ کتابوں کی تکمیل اور تصدیق اسی بارش سے ہوئی جو یہودی یا عیسائی قرآن کی تعلیم سے الگ رہ کر صرف انجیل پر قناعت کئے رہا اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کسی کے کھیت کو اگلی بارشیں ملیں پچھلی نہ ملیں۔ جس سے کھیت جل کر تباہ ہو جائے۔ ہاں کچھ ترکاریاں اور کچی کھیتیاں بھی تھیں وہ بھی تھیں جو اسی زمانہ میں کٹ گئیں مگر اب بغیر اطاعت مصطفیٰ ﷺ کوئی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ یہاں رب تعالیٰ نے تنزیل قرآن۔ انزال توریت و انجیل' انزال فرقان کا ذکر بطور احسان بیان فرمایا۔ دنیا لیٹر بکس کی طرح ہے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ دوزخ میں جانے والے بھی یہاں ہی ہیں۔ جنت میں جانے والے بھی۔ پھر جیسے ڈاک چھانٹ کر ہر طرف کو بھیجی جاتی ہے۔ ایسے ہی رب تعالیٰ انسانوں کو چھانٹ کر جنت دوزخ میں بھیجے گا۔ اب جو چیز چھانٹ پیدا کرنے والی ہے۔ اسی کو فرقان کہا جاتا ہے۔ کتاب اللہ معجزات نبی۔ ان کے فرمان عالیہ سب فرقان ہیں۔ ان ہی سے جنت دوزخ کے لوگوں میں فرق ہوتا ہے جو انہیں مان گیا جنتی ہے جو انکاری ہے دوزخی ہے۔ صدیق زندیق ابو جہل وغیرہ ہیں۔ ان ہی چیزوں نے چھانٹ فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④

تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ساتھ آیتوں اللہ کے واسطے ان کے عذاب ہے سخت اور اللہ غالب بدلہ والا ہے

بیشک وہ جو اللہ کی آیتوں سے منکر ہوئے ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب بدلہ لینے والا ہے

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٥﴾ هُوَ الَّذِي

تحقیق اللہ نہیں چھپتی ہے اوپر اس کے کوئی چیز بیچ زمین کے اور نہ بیچ آسمانوں کے وہ وہ ہے جو

اللہ پر کچھ چھپا نہیں زمین میں نہ آسمان میں وہ ہی ہے کہ

يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦﴾

صورت بناتا ہے تمہاری بیچ رحموں کے جس طرح چاہتا ہے نہیں ہے کوئی معبود سوا اسکے غالب ہے حکمت والا

تمہاری تصویر بناتا ہے ماؤں کے پیٹ میں جیسی چاہے اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں عزت والا عظمت والا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں توحید الٰہی پر بے مثل دلائل قائم فرمائے گئے تھے اب اس کے نہ ماننے والوں پر عذاب کا ذکر ہے کیونکہ عاقل بات سے مانتے ہیں اور غافل جوتے سے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کے بے مثل ہونے اور عیسیٰ علیہ السلام کے بندہ ہونے کی نشانیاں بیان ہوئی تھیں کہ وہ اللہ حی قیوم ہے۔ انبیاء پر وحی اُتارنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات نہیں۔ پھر وہ رب کے بیٹے کیسے؟ جس پر مناظرہ کرنے والے عیسائی' خاموش تو ہو گئے مگر مانے نہیں۔ اب ان کی خاموشی اور نہ ماننے پر عتاب ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ زندہ ہے اور عالم کو قائم رکھنے والا' اور ان کی ضروریات پوری فرمانے والا ہے۔ اب اس کے حی و قیوم ہونے کو ثابت فرمایا جا رہا ہے کہ وہ کامل علم والا بھی ہے اور قدرت والا بھی۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے بندہ ہونے پر دلائل قائم فرمائے گئے تھے۔ اب عیسائیوں کے ان شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے جن کی بنا پر وہ انہیں خدا کا بیٹا مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام بچوں کے گھر میں کھائے اور رکھے ہوئے کھانے کی خبر دے دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ انہیں علم غیب تھا۔ اور وہ مٹی کے پرندے بنا کر ان میں جان ڈال دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان میں قدرت اور خلق بھی تھی۔ اور جس میں یہ صفتیں ہوں وہ رب ہے۔ اس آیت میں اسی شبہ کا جواب دیا جا رہا ہے کہ بے شک عیسیٰ علیہ السلام کو بعض غیوب کا بھی علم تھا اور کچھ قدرت بھی مگر اتنا علم و قدرت الوہیت کے لئے کافی نہیں۔ رب وہ جس پر کوئی چیز مخفی نہ ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام کی یہ صفت نہیں اور جو ماں کے رحم میں بچہ کی شکل بنائے وہ خدا اور جو بنے وہ بندہ۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شکل پاک تو بنائی گئی لہٰذا وہ بندہ ہیں خدا نہیں۔ **پانچواں تعلق:** یہ ساری آیتیں حضور ﷺ کی تائید میں آئیں۔ چونکہ آپ نے چند دلائل قائم فرمائے تھے۔ جیسا کہ شان نزول میں عرض کیا جا چکا۔ کچھ دلائل کی تائید پچھلی آیتوں میں کی جا چکی اور کچھ کی اب ہو رہی ہے۔

تفسیر

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ چونکہ اس آیت کے مضمون کے اہل کتاب منکر تھے۔ وہ تو اپنے کفریات کو عین ایمان

سمجھے ہوئے تھے۔ اس لئے رب نے اس آیۃ کو ان سے شروع فرمایا اِنَّ دَفعِ شک کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ الذین سے یا تو وہ عیسائی مراد ہیں جن سے مناظرہ ہوا تھا جیسا کہ پچھلے شانِ نزول سے ظاہر ہے یا سارے کفار جیسا کہ لفظ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے۔ کفر کے یا لغوی معنی مراد ہیں۔ یعنی انکار کرنا یا اصطلاحی معنیٰ ب صلہ کی ہے نہ کہ تعدیہ کی۔ آیات جمع آیت کی ہے۔ بمعنی نشانی۔ اس کی اضافت یا تو جنسی ہے اور اس سے گذشتہ کتابیں۔ یا انبیائے کرام کے معجزات یا قرآن پاک کی آیتیں یا ساری چیزیں مراد ہیں کیونکہ یہ سب رب کی نشانیاں ہیں۔ یا اضافت عہدی ہے اور اس سے توریت وانجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں جن میں نبی آخر الزماں کی بشارت دی گئی تھی۔ آیات کو ذات کی طرف نسبت کرنے میں ان کے کفر کا بیان ہے۔ یعنی یہ عیسائی یا وہ سارے کفار جنہوں نے رب کی ساری نشانیوں کا یا توریت وانجیل کی ان خاص آیتوں کا یا حضور ﷺ کے قائم کردہ دلائل کا انکار کیا۔ انکار آیات کی چند صورتیں ہیں یا تو الفاظ آیات کا ہی انکار کر دیا جائے یا مضمون آیات کا انکار ہو یا ان احکام کا انکار ہو جس پر امت کا اجماع ہو وہ لوگ ان تینوں قسم کا انکار کرتے تھے۔ بعض آیات انہوں نے بدل دی تھیں۔ بعض کی غلط تاویلیں کرتے تھے۔ حضور ﷺ کی نعت والی آیتوں کو حضور انور ﷺ پر چسپاں نہیں مانتے تھے۔ آج مسلمانوں کے اندر آخری دو انکاروں کی بیماری پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بھی اس سے عبرت پکڑیں ہمیشہ قرآنی آیات کا وہ ہی مطلب سمجھو جو چودہ سو برس سے آج تک عام مومنین سمجھتے آئے۔ خاتم النبیین کے معنی آخری نبی ہی ہیں۔ اَقِیمُو الصَّلٰوۃَ میں صلٰوۃ کے معنی نماز ہی ہیں۔ تو وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ۔ لَھُمْ خبر مقدم ہے اور عذاب مبتداء مؤخر اور یہ جملہ ان کی خبر عذاب کی تنوین عظمت کے لئے اور شدید کی تنوین شدت کے لئے ہے۔ اسی لحاظ سے حصر کیا گیا۔ معنی یہ ہوئے کہ خاص ایسے ہی کافروں کے لئے جو جان بوجھ کر آیات کا انکار کریں۔ بڑا ہی سخت عذاب ہے جس کی شدت سوا رب کے کوئی نہیں جان سکتا۔ رہے بے خبر کافران کے لئے عذاب تو ہے مگر اتنا سخت نہیں۔ (معانی وروح) غرضکہ سرداران کفر کا عذاب سخت ہے بے خبری میں کافر ہونے والوں کا عذاب ہلکا یا یہ حصر گنہگار مسلمانوں کے لحاظ سے ہے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ کفار ہی کو سخت عتاب ہوگا۔ رہے گنہگار مومن اگر انہیں عذاب ہوا تو ہلکا ہوگا کہ اس کا عذاب عارضی ہوگا۔ کافر کا دائمی اس کی پردہ پوشی ہوگی کہ کسی کو خبر نہ ہوگی کہ کوئی عذاب پا رہا ہے۔ کافر کی پردہ دری ہوگی۔ اسے غذائیں یعنی کفار کا پیشاب' پاخانہ' خون' پیپ کھانے کو نہ دیا جائے گا کہ اس کے منہ میں کبھی اللہ تعالیٰ ورسول ﷺ کا نام تو آتا تھا۔ کافر کو دیا جائے گا۔ مومن کو چاہیے کہ اپنا منہ زبانی گندی باتوں سے محفوظ رکھے کہ یہاں اللہ تعالیٰ ورسول اللہ ﷺ کا ذکر آتا ہے۔ رب تعالیٰ نے انسان کو ان کے پیٹ میں حیض کا خون منہ سے نہ پلایا بلکہ ناف سے پہنچایا۔ کہ اس کا منہ گندگی سے محفوظ رہے۔ تو ہم کو احتیاط لازم ہے۔ مومن کا منہ بہت ہی حرمت والا ہے۔ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَام۔ یہ مستقل جملہ ہے۔ پہلے جملہ کی تائید کرتا ہے۔ عَزِیْزٌ عزّ سے بنا بمعنی غلبہ تام۔ عزیز وہ غالب جو کسی سے مغلوب نہ ہو۔ انتقام نقمۃ کا اباب افتعال ہے اس کے معنی غلبہ' قبضہ' سزا اور تکلیف ہے۔ نَقْمَةٌ باب ضَرَبَ یَضْرِبُ سے ہے۔ قرآن فرماتا ہے وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّا اَنْ یُّؤْمِنُوْا الخ (البروج: ۸) اور فرماتا ہے وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا (اعراف: ۱۲۶) بدلہ کو انتقام اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں سزا دی جاتی ہے اگرچہ ذوانتقام اور منتقم کے معنی قریباً یکساں ہیں مگر ذوانتقام میں زیادہ مبالغہ ہے۔ صاحب سیف وہ ہی کہلائے گا جس سے اکثر قتل واقعہ ہو۔ نہ وہ کہ جس کے پاس

تلوار ہو۔ یعنی اللہ غالب ہے۔ اسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا اور دشمنوں سے سخت بدلہ لینے والا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ خبر عذاب شدید کی تحقیق کے لئے ہے یعنی رب تعالیٰ کا عذاب سخت بھی ہے اور بہت بڑا بھی کیونکہ وہ رب سب پر غالب ہے کوئی اسے مجرم کو سخت عذاب دینے سے روک نہیں سکتا اور جیسے وہ کرم کرنے والا ہے ایسے ہی بدلہ لینے والا بھی باغی کو یوں چھوڑ دینا بھی لاقانونی ہے بڑا حاکم ہی بڑی سزا دے سکتا ہے۔ معمولی حاکم پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا اور انتقام فرما کر یہ بتایا کہ رب بغیر جرم کے کسی کو سزا نہیں دیتا۔ بدلہ میں سزا دیتا ہے' مجرم کی سزا کا بدلہ دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ برزخ میں بھی حشر میں بھی آخرت میں کفار کے لئے دنیاوی مصیبتیں بھی عذاب ہیں مومن کے لئے رحمت۔ یہ جملہ گویا معترضہ تھا اب پھر اصل مضمون کی طرف رجوع ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡهِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ۔ یہ نیا جملہ ہے جس میں رب تعالیٰ کی وسعت علم کا ذکر ہے۔ چونکہ بعض لوگ اس کے علم یا وسعت علم کے منکر تھے۔ اس لئے اسے اِنَّ سے شروع فرمایا گیا۔ لَا یُخۡفٰی۔ خفاءٌ سے بنا۔ بمعنی پوشیدگی اور چھپنا۔ اس کا مقابل ظہور ہے۔ پوشیدگی کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو شے کا فی الحال موجود نہ ہونا۔ دوسرے پردہ میں ہونا۔ یہاں دونوں کی نفی ہے کہ خدا کے علم کے لئے نہ عدم مانع ہے نہ پردہ نہ کوئی اور آڑ۔ خیال رہے کہ لَا یُخۡفٰی یہاں دوام واستمرار کے لئے ہے۔ یعنی کبھی نہیں چھپتا۔ علیہ یُخۡفٰی کے متعلق ہے اور شَیۡءٌ اس کا فاعل۔ شیئٌ موجود کو بھی کہتے ہیں۔ ممکن کو بھی اور معلوم کو بھی مگر یہاں موجود یا ممکن مراد ہے کیونکہ غیر مخفی یعنی ظاہر ہونا۔ اس ہی کی شان ہے نہ کہ ناممکنات کی۔ رب کو معلوم تو ہر چیز ہے مگر غیر مخفی یعنی ظاہر۔ صرف موجودات یا ممکنات ہیں۔ فِی الۡاَرۡضِ ثابت پوشیدہ کے متعلق ہو کر شَیۡءٌ کی صفت ہے۔ لا تاکید کی نفی کے لئے دوبارہ لایا گیا اور فِی السَّمَآءِ بھی شیٔ کی صفت۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ یہ دونوں جار مجرور لَا یُخۡفٰی کے متعلق ہیں چونکہ انسان کو بمقابلہ آسمان کے زمین کا زیادہ علم ہے اس لئے یہاں زمین کا ذکر پہلے ہوا اور آسمان کا بعد میں اور چونکہ عالم اجسام کے دو ہی کنارے ہیں۔ زمین وآسمان۔ اس لئے اس سے مراد عالم اجسام کی ساری چیزیں ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ پر کوئی چھوٹی بڑی گزشتہ موجودہ اور آئندہ چیز بھی پوشیدہ نہیں۔ سب کچھ ظاہر ہے۔ اب اظہار قدرت کے لئے فرمایا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُكُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ كَیۡفَ یَشَآءُ۔ هُوَ سے ذات الٰہی مراد ہے اور الَّذِیۡ سے اس کی صفت۔ یُصَوِّرُ تصویر سے بنا جس کے معنی ہیں۔ صورت بخشنا۔ ظاہر چیز کو دیکھ کر جانا جاتا ہے اور اچھی چیز کو اس کے علامات وآثار سے بھی جانا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ کی ذات تمام غیبوں سے بڑھ کر غیب ہے۔ اس لئے اسے اس کی قدرت وصنعتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ هُوَ الَّذِیۡ فرما کر یہ بتایا کہ اگر تم اس نادیدہ کو جاننا پہچاننا چاہتے ہو تو خود اپنے کو دیکھو تم بذات خود اس کی معرفت کی کتاب ہو وَفِیۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (الذاریات:۲۱) صورت لغت میں صار یصور کا مصدر ہے بمعنی مائل ہونا اور مائل کرنا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَصُرۡهُنَّ اِلَیۡكَ (بقرہ:۲۶۰) صور کو اسی لئے صور کہتے ہیں کہ تمام مخلوق اس کی آواز پر اس کی طرف مائل ہوگی۔ وَنُفِخَ فِی الصُّوۡرِ (الکہف:۹۹) اور صیر ضرب یضرب سے بمعنی مائل کرنا اور منقلب ہونا ہے۔ اصطلاح میں صورت اس ہیئت کا نام ہے جو ترتیب اجزاء سے حاصل ہو یعنی شکل چونکہ یہ بھی اجزاء کے ایک دوسرے کی طرف میلان سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اسے صورت کہا جاتا ہے۔ ارحام جمع رحم کی ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں مہربانی اور رقت قلبی۔ اسی سے رحمت ہے عورت کی بچہ دانی کو اسی لئے رحم کہتے ہیں کہ وہ

رشتوں، قرابتوں اور محبتوں کی اصل ہے۔ فِی الْاَرْحَامِ یا تو یصور کا متعلق ہے یا کسی پوشیدہ عبارت کا متعلق ہو کر کہ کا حال ہے۔ اور کَیْفَ یَشَآءُ سے منصوب ہے اور یہاں عموم بینیت کے لئے بولا گیا۔ یَشَآءُ کا مفعول بہ پوشیدہ ہے۔ یعنی رب تعالیٰ وہ قدرت والا ہے کہ تمہیں تمہاری ماؤں کے شکم میں جیسی چاہتا ہے صورت بخشتا ہے لڑکا بنائے یا لڑکی، کامل یا ناقص، کالا یا گورا، یا جس طرح چاہے تمہیں بنادے۔ باپ کے نطفہ سے یا بغیر نطفہ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا یہ اس کا کمال ہے نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کیونکہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ ہی غالب حکمت والا ہے۔ یہ جملہ گذشتہ دلائل کا نتیجہ ہے پہلے مطلوب کے طریقہ پر ارشاد فرمایا گیا تھا۔ اب نتیجہ کے طور پر۔

خلاصہ تفسیر

اللہ کی وحدانیت اور اس کے ماسوا کی عبدیت پر بے شمار دلائل قائم ہو چکے۔ اب جو کوئی جان بوجھ کر ان نشانیوں کا انکار کرے اور عیسیٰ علیہ السلام یا کسی اور کو خدا کا شریک مانے، اس کے لئے سخت عذاب ہے۔ اللہ وہ غالب ہے کہ اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ جو چاہے کرے اور جو چاہے فیصلہ فرمائے۔ سخت بدلہ لینے والا ہے۔ اسے بدلہ سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اے بیوقوفو! عیسیٰ علیہ السلام یا کوئی دوسرا خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ رب کی شان تو یہ ہے کہ اس سے آسمان و زمین کی کوئی چھوٹی بڑی فی الحال یا آئندہ ہونے والی چیز کبھی پوشیدہ نہیں۔ یہ وسعت علمی اس کے ساتھ خاص ہے اگر اس نے اپنے فضل سے کسی کو کچھ علم غیب عطا فرما دیا تو اس سے وہ خدا نہ بن گیا۔ بلکہ بندہ ہی رہا۔ نیز وہ ایسی قدرت والا ہے کہ تمہیں تمہاری ماؤں کے تاریک رحموں میں جیسی چاہتا ہے صورت بخشتا ہے، کسی کو لڑکا بناتا ہے کسی کو لڑکی، کوئی کالا، کوئی گورا، کوئی خوبصورت، کوئی بدصورت، کوئی کامل، کوئی ناقص، نیز کوئی صفراوی، کوئی بلغمی، کوئی اندھا، کوئی انکھیارا، کوئی گونگا، کوئی نہایت تیز بولنے والا، کوئی بدنصیب، کوئی نصیبہ ور۔ غرضکہ تخم ایک زمین مگر پھل مختلف، یا یوں سمجھو کہ مادہ ایک سانچہ ایک مگر اس میں ڈھلنے والے بندے مختلف۔ دیگر چیزوں میں دیکھا گیا ہے کہ جیسا بیج ویسا ہی اس کا پھل۔ ویسی ہی لذت، ویسی ہی رنگ و بو، ویسے ہی خاصیت، مگر حضرت انسان قدرت الٰہی کا مظہر ہے کہ ایک ہی ماں کے چند بچے۔ ان میں سے کوئی کافر، کوئی ولی، کسی کا مزاج بلغمی، کسی کا صفراوی، کوئی گونگا، کوئی تیز زبان، کوئی پیدا ہوتے ہی مر گیا۔ کوئی سو سال جیا، کوئی کچا ہی گر گیا۔ ان کمالات قدرت کو دیکھ کر کہنا پڑے گا کہ بے شک خدا کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غالب بھی ہے اور حکمت والا بھی۔ جو چاہے جس طرح چاہے جب چاہے جیسے چاہے بنائے۔ جو رب نطفہ میں اتنے کرشمے دکھا سکتا ہے وہ بغیر نطفہ کے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پیدا فرما سکتا ہے۔ جب یہ سمجھ چکے تو سمجھ لو کہ رب کے سوا کوئی معبود نہیں، معبود وہ جو ان صفات سے موصوف ہو۔ وہ ہی سب پر غالب ہے اور حکمت والا ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت و راز سے خالی نہیں۔ اس کی غالبیت و حکمت اسی کی ہستی کی دلیل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ عَزَائِمِیْ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہو جانے سے پہچانا۔ **لطیفہ:** کسی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ موجد شطرنج کا کمال تو دیکھو کہ اس نے گز بھر کپڑے پر چونسٹھ خانے بنائے مگر جب کھیلو تب اس کی نئی چال ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خالق کا کمال تو دیکھو کہ اس نے بالشت بھر چہرہ میں پانچ سوراخ کئے۔ دو آنکھوں کے دو ناک کے ایک منہ کا۔ مگر [illegible] نقشہ کھینچ دیئے [illegible] نہیں ملتا۔ گویا آپ کا یہ کلام

كَيْفَ يَشَآءُ کی تفسیر ہے۔ مسلم و بخاری وغیرہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کا نطفہ چالیس روز تک رحم میں اسی رنگ پر رہتا ہے پھر چالیس دن تک جمے ہوئے خون کی شکل میں پھر چالیس دن پارہ گوشت کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر رب تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کی تمام کیفیت لکھ جاتا ہے کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی بدبخت ہے یا نصیبہ ور۔ اسے کیسا رزق ملے گا۔ کب مرے گا' کیسے کام کرے گا۔ یہ تمام کچھ ایک صحیفہ میں لکھ کر اس بچے کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ رب نے فرمایا۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (الاسراء: ۱۳) کوئی بدنصیب جنت کے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس میں اور جنت میں صرف ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اچانک اس پر تقدیر غالب آتی ہے اور وہ پلٹا کھا کر دوزخیوں کے سے عمل کرتا ہوا مرتا ہے اور جہنم میں جاتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے کہ دوزخیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس میں اور دوزخ میں ایک ہاتھ بھر کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اچانک اس کی تقدیر اس پر سبقت کرتی ہے اور اس کی زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے اور وہ جنتیوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے۔ اسی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے اور وہ داخلِ جنت ہوتا ہے (خزائن و خازن و روح وغیرہ) انسان کو چاہیے کہ رب تعالیٰ کی بے نیازی سے ڈرے اپنے ظاہری اعمال پر گھمنڈ نہ کرے اور یہ دعا کرتا رہے ؎

تو نے اسلام دیا تو نے جماعت میں لیا — تو کریم اب کوئی پھرتا ہے عطیہ تیرا

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بعض عطائی علم غیب دلیل الوہیت نہیں اور نہ اس کا انبیاء کے لئے ماننا شرک۔ دیکھو عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے علم غیب کو ان کے خدا ہونے کی دلیل بنایا۔ رب نے ان کے علم غیب کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کے اس استدلال کو غلط قرار دیا۔ دیوبندیوں کو اس سے عبرت پکڑنی چاہیے کہ وہ سنیوں کو اس بنا پر مشرک کہہ دیتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کو رب کی عطا سے سارے واقعات عالم کا علم غیب مانا۔ حالانکہ یہ علم علم خداوندی کے سمندر کا ایک قطرہ ہے۔ **دوسرا فائدہ:** تقدیر لکھنے والا فرشتہ علوم خمسہ جانتا ہے کہ کون نیک بخت ہے اور کون بدبخت کون کہاں مرے گا اور کب مرے گا کون کتنا کھائے گا اور کتنا پیئے گا کیونکہ یہ سب باتیں وہ ہی تو لکھ گیا ہے اور حضور ﷺ اس فرشتہ سے بڑھ کر عالم ہیں۔ اس لئے یہ پانچوں علم حضور علیہ السلام کو بھی حاصل ہوئے۔ **تیسرا فائدہ:** ہر ایک کی اگلی سوانح عمری اس کے گلے میں موجود ہے جیسا کہ ہماری بیان کردہ حدیث سے معلوم ہوا۔ لہٰذا اولیاء اللہ کی حقیقت بین آنکھوں سے کچھ چھپا ہوا نہیں۔ **چوتھا فائدہ:** عطائی قدرت خدا ہونے کی دلیل نہیں۔ دیکھو عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس لئے رب مانا تھا کہ وہ مٹی کے پرندوں میں جان ڈالتے تھے۔ رب تعالیٰ نے حضرت مسیح کی قدرت کا انکار نہیں فرمایا بلکہ اس استدلال کو غلط بتایا۔ اس سے بھی دیوبندی عبرت پکڑیں کہ وہ اولیاء اللہ اور انبیائے کرام میں عطائی قدرت ماننے کو شرک کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی قدرت قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب جاء الحق اول کا مطالعہ کرو۔ **پانچواں فائدہ:** خدا تعالیٰ ہر وقت ہر چیز کا عالم ہے جیسا کہ لَا يَخْفٰى کی وسعت سے معلوم ہوا جو اسے ایک آن کے لئے جاہل مانے وہ بے ایمان ہے۔ دیوبندیوں کے پیشوا اسمٰعیل صاحب دہلوی نے تقویۃ الایمان میں لکھا کہ جب چاہے [illegible] ... احمد صاحب کے شاگرد سید حسین علی پنجابی

نے اپنی کتاب بلغۃ الحیر ان میں لکھا کہ حق یہ ہی ہے کہ خدا تعالیٰ کو بندوں کے فعل کی ہر وقت خبر نہیں۔ جب وہ کر لیتے ہیں تب اسے خبر ہوتی ہے۔ یہ عقیدے صریحی بے دینی ہیں اور اس آیت کریمہ کے سخت خلاف۔ **چھٹا فائدہ:** چالیس کا عدد بڑا مبارک ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچہ پر ہر چالیس دن کے بعد تبدیلی ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ چالیس میں تبدیلی ہے۔ چالیس سال تک آدم علیہ السلام کا خمیر خشک کیا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن کا اعتکاف کرا کر توریت دی گئی۔ چالیس سال کی عمر میں اکثر پیغمبروں کو نبوت ملی۔ چالیس سال کی عمر میں عقل کامل ہوتی ہے۔ اسی لئے صوفیائے کرام چلے کرتے ہیں اور اسی لئے مسلمان بعد موت چالیس دن تک میت کی طرف سے برابر خیرات کرتے رہتے ہیں۔ پھر چالیسواں کرتے ہیں۔ اس کی پوری تحقیق پہلے سیپارہ کی تفسیر اور ہماری کتاب جاء الحق اول میں دیکھو۔ انوار ساطعہ نے ایک حدیث نقل کی کہ بزرگان دین کی ارواح چالیس دن تک اپنی قبر میں رہتی ہیں پھر اپنے اصلی ٹھکانے جہاں حشر تک رہنا ہے پہنچ جاتی ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کا مضمون مختصر عبارت میں بھی ادا ہو سکتا ہے کہ کہہ دیا جاتا کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اتنی دراز عبارت کیوں فرمائی گئی کہ اللہ پر زمین و آسمان کی چیزیں چھپی نہیں۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ **جواب:** اس سے تاکید مقصود ہے۔ جیسے بادشاہ کہہ دے کہ میں سب کا بادشاہ ہوں اور یہ کہے کہ ذرہ ذرہ پر میری حکومت ہے۔ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے مگر دوسری عبارت میں جو تاکید ہے وہ پہلی میں نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ پر وہ چیزیں چھپی ہوئی نہیں جو آسمان و زمین میں ہوں تو کیا دوسری چیزیں چھپی ہیں جو اب تک پیدا نہیں ہوئیں۔ یا پیدا تو ہوئیں مگر آسمان و زمین کے علاوہ اور عالم میں ان کا مقام ہے۔ خدا اسے بھی جانتا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں جانتا تو اس کے علم میں کمی ہے اور اگر جانتا ہے تو اس آیت کے خلاف۔ **جواب:** یہ عبارت بندوں کے لحاظ سے ہے کہ ان کے علوم انہی میں محدود ہیں۔ اسی سے انہیں رب کی وسعتِ علم کا پتہ لگ گیا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ رحمِ مادر میں خود بچوں کی صورتیں بناتا ہے اور حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ کام فرشتہ کے سپرد ہے۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** رب کے حکم سے فرشتہ رحم میں صورت بناتا ہے۔ لہٰذا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرشتہ نے صورت بنائی اور یہ بھی کہ رب نے۔ کیونکہ غلام کا فعل مالک کا فعل ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے ملک جیت لیا۔ حالانکہ لشکر نے جیتا ہے۔ اس میں اس جانب بھی اشارہ ہو گیا کہ جیسے اس فرشتہ کو خدا نہیں کہہ سکتے۔ جو رحم میں صورتیں بنا کر ان میں روح پھونکتا ہے۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام کو مٹی کے پرندوں میں پھونکنے اور مردوں کو زندہ کرنے' اور بیماریوں کو اچھا کرنے سے خدا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ دراصل خدا کے فعل ہیں۔ یہ حضرات اس کا مظہر۔ اسرافیل علیہ السلام صور پھونک کر سارے ہی مردوں کو زندہ کریں گے تو کیا وہ خدا ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام بھی خدا نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

جیسے ماں کے رحم میں نطفہ ہر چالیسویں دن رنگ بدلتا ہے' یہاں تک کہ شکل انسانی اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے ہی سچے مرید کا قلب گویا رحمِ مادر ہے اور شیخ کامل کی نگاہ گویا نطفہ شیخ مرید کے قلب پر اثر ڈال کر اس سے چلے کراتا ہے۔ جس سے مرید ہر چلہ میں

ترقی کرتا ہوا اسی بارگاہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے چلا تھا پھر اسے اس کے قلب میں روح خاص پھونکی جاتی ہے۔ جسے روح القدس کہہ سکتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (مؤمن: ۱۵) نیز فرماتا ہے کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (مجادلۃ: ۲۲) جب اس میں یہ روح پھکتی ہے تب یہ اپنے وقت کا آدم ہوتا ہے اور تمام ملائکہ کا گویا مسجود (روح البیان) جیسے ایک ہی رحم سے مختلف اولاد پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک ہی تعلیم سے مریدین کے مختلف حالات ہوتے ہیں۔ نگاہِ مصطفوی (ﷺ) ایک ہی تھا مگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے درجات مختلف۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ ہماری بندگی کی سب سے بڑی دلیل ہماری مجبوری و معذوری ہے۔ بندہ خود مختار ہو کر دعویٰ خدائی کر بیٹھتا ہے اور اپنی ناکامی و مجبوری دیکھ کر بندہ بنتا ہے۔ فرعون جب طوفان میں پھنسا تو بولا اٰمَنْتُ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ۔ (یونس ۹۰) ہم اگرچہ دوران زندگی میں کچھ مختار بھی ہیں مگر پیدائش و موت میں محض مجبور کہ جب چاہا' جیسا چاہا رب نے بنا دیا وہاں ہماری تدبیر کو دخل نہیں اور جب چاہا جس طرح چاہا بلا لیا کوئی تدبیر و علاج موت پر مفید نہیں ہوتا۔ انسان اپنی ابتدائی و انتہائی مجبوریوں پر نظر رکھے تو گناہ کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ
وہ اللہ وہ ہے جس نے اتارا اوپر آپ کے اس کتاب کو اس میں سے بعض آیتیں مضبوط کی ہوئی ہیں وہ اصل کتاب ہیں اور دوسری
وہ ہی ہے جس نے تم پر یہ کتاب اتاری اس کی کچھ آیتیں صاف معنی رکھتی ہیں وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری وہ
مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ
متشابہ والی پس لیکن وہ لوگ کہ بیچ دلوں ان کے کجی ہے پس پیچھے پڑتے ہیں وہ ان کے جو متشابہ رکھتی ہیں اس میں سے تلاش کرنے
ہیں جن کے معنی میں اشتباہ ہے وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں
الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ
والے فتنہ اور تلاش کرنے تاویل کو اس کی اور نہیں جانتا ہے تاویل اس کی کوئی سوا اللہ کے اور مضبوط لوگ ہیں بیچ علم کے
گمراہی چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے اور پختہ علم والے
یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾
کہتے ہیں کہ ایمان لائے ہم ساتھ اس کے سب پاس سے ہے رب ہمارے کے اور نہیں نصیحت پکڑتے مگر عقل والے
کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نصیحت نہیں مانتے مگر عقل والے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** مناظرہ کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ (۱) اپنے دلائل (۲)

معترض کے جوابات (۳) اس کے الزام کا دفعیہ پچھلی آیتوں میں اگلے دو پہلو ارشاد ہوئے۔ اب عیسائیوں کے الزام کا جواب دیا جارہا ہے کہ وہ کہہ سکتے تھے یا کہتے تھے کہ قرآن نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ فرمایا جس کے معنی یہ ہی ہوئے کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ اس کا اب جواب دیا جارہا ہے کہ اے عیسائیو! تم نے لفظ روح اور لفظ کلمہ سے الزام دیا۔ لفظ میں حقیقی معنی کا بھی احتمال ہوتا ہے اور مجاز کا بھی جہاں لفظ کے ظاہری معنی دلیل عقلی کے خلاف ہوں سمجھ لو کہ وہ متشابہات میں سے ہے۔ اس لئے اب فرمایا گیا کہ قرآن کی بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ۔ غرضکہ یہ آیتیں گذشتہ مناظرہ کا تتمہ ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر ہوا۔ کہ وہ ایک ہی پیٹ سے مختلف قسم کی اولاد پیدا فرماتا ہے۔ کوئی مومن‘ کوئی کافر‘ کوئی نرم دل‘ کوئی سخت دل‘ اس کی وجہ عقل میں نہیں آتی۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ جیسے دنیوی معاملات میں بعض تک عقل پہنچتی ہے اور بعض تک نہیں‘ اسی طرح کتاب اللہ میں بعض آیات وہ ہیں جو سمجھ میں آجائیں‘ اور بعض سمجھ سے بالاتر‘ ہر جگہ اپنا قیاس نہ دوڑاؤ۔ خلاصہ یہ ہے کہ عام احکام میں تقریباً ہر جگہ بعض باتیں سمجھ میں آتی ہیں بعض نہیں آتیں جسم کچھ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ ہڈی‘ گوشت وغیرہ سے بنا‘ مگر روح سمجھ میں نہیں آتی۔ جسم کا بننا عقل میں آتا ہے مگر کالا گورا‘ عالم جاہل سعید شقی ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتی۔ عقل حیران ہے کہ بچہ اتنے غلافوں میں سانس کیسے لیتا ہے۔ انڈے میں ہوا کدھر سے آتی ہے۔ ایسے ہی قرآن شریف کی بعض آیات سمجھ میں آتی ہیں‘ بعض نہیں آتیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی قیومیت کا ذکر تھا۔ اور وہ قیوم ہے جو عالم کی حاجت پوری کرے۔ حاجتیں دو قسم کی ہیں۔ جسمانی اور روحانی۔ جسمانی حاجت روائی کا ذکر پچھلی آیت میں فرمایا گیا کہ ہم انہیں جیسی چاہتے ہیں صورت بخشتے ہیں اور روحانی حاجت روائی کا ذکر اس آیت میں ہے کہ رب نے وہ کتاب اتاری جو علم و حکمت کا سرچشمہ ہے تا کہ لوگ اس سے اپنی علمی حاجت پوری کریں۔

شان نزول

اس کے نزول میں کئی روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ نجرانی عیسائیوں نے حضور ﷺ کے دلائل قاہرہ سن کر عرض کیا کہ تمہارے قرآن نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ اور روح منہ فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں وہ بولے بس ہمارا دعویٰ ثابت ہوگیا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری (روح المعانی و تفسیر درمنثور و ابن جریر) دوسرا یہ کہ ایک دفعہ یہود کے سردار ابو یاسر ابن اخطب اپنے یہودی ساتھیوں کے ہمراہ حضور ﷺ کی مجلس پاک پر گزرا۔ آپ شروع سورۂ بقرہ کی آیتیں تلاوت فرمارہے تھے۔ الٓمّٓ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ الخ ابو یاسر اپنے بھائی حیی ابن اخطب کے پاس پہنچا اور یہ آیت پڑھ کر اسے سنائی۔ یہی ایک جماعت کعب ابن اشرف وغیرہ کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا کہ ہم اس دین کی پیروی کیسے کریں جس کی عمر صرف اکہتر سال ہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا یہ کیسے۔ وہ بولا کہ آپ پر آیت آئی الٓمّٓ۔ الف کا عدد ایک لام کے تیس‘ میم کے چالیس۔ کل اکہتر ہوئے۔ آپ (ﷺ) کے دین کی کل یہ عمر ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا **الٓمّٓصٓ** وہ بولا اب تو معاملہ بڑھ گیا کہ ایک سو اکسٹھ ہوگئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا الٓمّٓرٰ وہ بولا اب تو بہت ترقی ہوگئی کہ دو سو اکہتر عدد بنے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس کو مانیں‘ کسے [illegible] کریں۔ تیسرا یہ کہ عیسائیوں نے کہا

تھا کہ رب فرماتا ہے۔ نَحْنُ خَلَقْنَا نَحْنُ قَدَّرْنَا۔ اور جمع کم سے کم تین کے لئے آتی ہے۔ معلوم ہوا خدا تین ہیں۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری (تفسیر احمدی و معانی وخازن و تاریخ بخاری و ابن جریر عن ابن عباس) مگر خیال رہے کہ ہم شروع آل عمران میں عرض کر چکے ہیں کہ نجرانی عیسائیوں کے مناظرہ پر ۸۰ سے زیادہ آیتیں اتریں۔ پھر ان آیات کا شان نزول کچھ اور ہونا مشکل ہے ممکن ہے کہ اسی مناظرہ کے وقت یہ واقعہ درپیش آیا ہو۔ ایک آیت کے چند شانِ نزول ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

تفسیر: هُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ۔ یہ نیا جملہ ہے۔ ھُوَ کا مرجع رب العالمین ہے۔ هُوَ الَّذِىْ کبھی تو اظہار قدرت کے لئے ہوتا ہے، کبھی اظہار کرم کے لئے، کبھی اظہار غضب کے لئے۔ ایک کاری گر کہتا ہے میں وہ با کمال ہوں کہ فلاں عمارت میری بنائی ہوئی ہے ایک مہربان باپ کہتا ہے میں وہ ہوں جس نے تجھ پر یہ کرم کیے۔ دشمن سے کہا جاتا ہے میں وہ ہوں جس نے اتنوں کو مارا اتنے ختم کیے یہاں هُوَ الَّذِىْ یا تو اظہار کرم کے لئے ہے۔ یا اظہار قدرت کے لئے یعنی رب وہ قدرت والا ہے یا وہ کرم و مہربانی والا ہے۔ اَنْزَلَ انزال سے بنا بمعنی ایک دم اتارنا یا تو اس سے وہ نزول قرآن مراد ہے جو حضور علیہ السلام پر ماہ رمضان میں ایک دم ہوتا تھا۔ یا یہ انزال بمعنی تنزیل ہے یا اس میں تجرید کر لی گئی اور مطلقاً اتارنا مراد ہوا۔ علیک میں حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ الکتاب سے پورا قرآن کریم مراد ہے۔ یعنی اے نبی علیہ السلام وہ اللہ وہ قدرت والا ہے۔ جس نے تم پر یہ قرآن کریم اتارا۔ خیال رہے کہ دنیا ظلمت کدہ ہے۔ حضور انور علیہ السلام اور قرآن کریم یہاں کا نور کاری گر کے تمام کمالات نور سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر نور نہ ہو تو آدمی چیزوں سے ٹھوکر کھا کر چیزیں بلکہ اپنا سر توڑ لیتا ہے۔ اس لئے کمرے کا سوئچ دروازے پر لگاتے ہیں کہ روشنی پہلے کریں اندر بعد میں داخل ہوں۔ ایسے ہی دنیا اندھیرا گھر ہے۔ قرآن یہاں کا نور نیز انسان اجنبی جگہ کے مقامات اپنے عقل وعلم سے معلوم نہیں کر سکتا۔ وہاں کے باشندے سے پوچھنا پڑے گا ایسے ہی عقل اس عالم کو معلوم کر سکتی؟ چیزیں ایجاد کر سکتی ہے مگر ایمان و تقویٰ نہیں بنا سکتی۔ اس لئے قرآن کا نزول رب کی رحمت ہے۔ تو فرمایا گیا هُوَ الَّذِىْ۔ اگرچہ قرآن شریف تمام لوگوں کے لئے آیا مگر حضور علیہ السلام پر آیا تا کہ لوگ آپ کے حاجت مند رہیں۔ گندم لوگوں کے لئے پیدا ہوتی ہے مگر زمین دار کے گھر ہوتی ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ دیکھو رب کی چینی ڈپو سے ملا کرتی ہے۔ قرآن کی ہر چیز حضور انور علیہ السلام کے مختلف اعضاء پر نازل ہوئی۔ الفاظ کان پر، معانی دماغ پر، اسرار دل پر اس لئے علیک فرمایا اور دوسری جگہ عَلٰى قَلْبِكَ (بقرہ: ۹۷) ارشاد ہوا۔ **مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ۔** یہ جملہ کتاب کی صفت ہے اور منهُ میں من تبعیضیہ ہے اس کا متعلق منقسمٌ یا قائمٌ ہے۔ آیاتٌ مبتدا موخر۔ محکماتٌ محکمة کی جمع جس کا مادہ حکم ہے حکم کے لغوی معنی منع کرنا' واپس کرنا ہیں۔ افسر کو اسی لئے حاکم کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے۔ پختہ کرنے کو احکام اور مضبوط کو محکم اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اکھیڑنے والے کا مقابلہ کرتا ہے۔ علم کو اسی لئے حکمت کہتے ہیں کہ وہ برائیوں سے روکتا ہے۔ اصطلاح میں محکم وہ عبادت ہے جس کے معنی ظاہر ہوں اور احتمالات اور شبہات سے محفوظ ہو۔ اس کے شرعی معنے آئندہ بیان کیے جائیں گے (معانی وکبیر) یہ آیت کی صفت ہے۔ یعنی قرآن کی بعض آیتیں محکم ہیں۔ جن کے معنی بالکل ظاہر اور احتمالات سے محفوظ ہیں۔ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ۔ یہ محکمات کی صفت ہے۔ ام کے لغوی معنے ہیں اصل جن کی طرف رجوع کیا جا[illegible] لیے ماں کو ام کہتے ہیں اور مکہ شریف کو ام القریٰ۔ یہ آیتیں چونکہ اصل قرآن ہیں کہ

انہی سے احکام نکالے جاتے ہیں اور متشابہات کو انہی کی طرف پھیرا جاتا ہے اور حرام و حلال میں ہر شخص انہیں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس لئے انہیں ام الکتاب کہا گیا۔ سوۂ فاتحہ کا نام بھی ام الکتاب ہے یہاں کتاب سے یا تو کل کتاب مراد ہے اور اضافت فی کی یعنی وہ اس قرآن میں اصل آیتیں ہیں۔ یا اس سے بعض کتاب مراد یعنی غیر محکم آیتیں۔ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ۔ اُخَرُ اُخْرٰی کی جمع ہے جو آخر اسم تفضیل کی تانیث ہے۔ یہاں آیات کی صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں بہت پیچھے رہنے والی۔ کبھی بمعنی غیر بھی بولا جاتا ہے یہاں یہ ہی معنی مراد ہیں۔ اسی لئے اس کا استعمال نہ الف لام سے ہوا نہ اضافت سے نہ من سے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ اُخَرُ منہ سے معدول ہے۔ متشابہات تشابہ سے بنا، جس کا مادہ شبہٌ ہے۔ جس کے معنی ہیں کیفیت میں کسی کی مثل ہونا۔ اسی لئے تصویر کو شبیہہ اور مثل ہونے کو مشابہت یا تشبیہہ کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں متشابہ وہ کہلاتا ہے جو کسی کے مشابہ اس طرح ہو جائے کہ اس میں فرق نہ ہو سکے۔ یعنی یکساں، رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا (بقرہ:۷۰)۔ اور فرماتا ہے وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (بقرہ:۲۵)۔ نیز فرماتا ہے۔ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (بقرہ:۱۱۸)۔ اہل عرب کہتے ہیں اِشْتَبَهَ عَلَیَّ اِمْرَاَتَانِ۔ یہاں وہ آیتیں مراد ہیں جن میں بہت سے معنی کا احتمال ہو اور کسی کو ترجیح نہ ہو۔ یا جس کے معنی سمجھ میں نہ آتے ہوں۔ یعنی محکمات کے علاوہ کچھ آیتیں ایسی ہیں جن کے معنی ظاہر نہیں۔ یا ان میں چند معنی کا احتمال ہے یا ان کی مراد رب کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔ یا اس کی حکمت رب جانے۔ متشابہ کے شرعی معنی انشاء اللہ آئندہ بیان ہوں گے یہاں تک تو آیات کی تقسیم کی گئی۔ اب لوگوں کے حالات سنو! فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ۔ اَمَّا تفصیل کے لئے ہے الَّذِيْنَ سے یا تو وہ نجرانی عیسائی مراد ہیں جو روح اللہ کے لفظ سے دھوکہ دیتے تھے۔ یا وہ مشرکین ہیں جنہوں نے الٓمّٓ سے غلط مطلب حاصل کیا۔ یا منافقین۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ابوامامہ نقل کیا کہ اس سے مراد خارجی لوگ ہیں اور ممکن ہے کہ اس سے سارے وہ بدمذہب مراد ہوں جو قرآن پاک کے غلط معنی کریں اور متشابہات کی غلط تاویلیں کریں۔ زیغ ضرب یضرب کا مصدر ہے۔ بمعنی جھک جانا۔ مائل ہو جانا۔ اس کا مقابل استقامات ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ۔ (الصف:۵) نیز فرماتا ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (النجم:۱۷) یعنی وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ٹیڑھا پن اور سیدھے راستہ سے میلان ہے۔ اگر تکلا ٹیڑھا ہو تو سوت نہیں کاتتا۔ اگر مشین کا کوئی پرزہ ٹیڑھا ہو تو ساری مشین کو بیکار کر دیتا ہے کہ پھر مشین کام نہیں کرتی۔ اگر پہیے کا دھرا ٹیڑھا ہو جائے تو تانگہ چل نہیں سکتا۔ سارا تانگہ بیکار ہوتا ہے۔ اگر راستہ ٹیڑھا ہو تو اسے اختیار کر کے کوئی سیدھے راستہ پر نہیں پہنچتا۔ ایسے ہی اگر عالم کا دل ٹیڑھا ہو تو اس کے عقیدے اعمال احوال سب غلط ہوتے ہیں۔ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ ٹیڑھے دل والا عالم قرآن سے گمراہی لیتا ہے اور لوگ اس سے گمراہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ارشاد ہوا وَاَمَّا الَّذِيْنَ ٹیڑھے دل والا عالم وہ ہوتا ہے جس کی زبان پر دین دل میں دنیا ہو۔ یا جس کے دل کا رخ مدینہ طیبہ سے ہٹا ہو۔ جیسے نمازی کا رخ اگر ٹیڑھا ہو تو نماز نہیں ہوتی۔ ایسے ہی اگر عالم کے دل کا رخ ٹیڑھا ہو تو ایمان درست نہیں ہوتا اور نہ اس کی تقریر درست ہو۔ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ۔ یہ الَّذِيْنَ کی خبر بمعنی جزا ہے۔ اتباع کا مادہ تبع ہے۔ بمعنی پیچھے اتباع پیچھے چلنے اور پیچھے پڑنے کو کہتے ہیں جیسے فَاتَّبِعُوْنِیْ اس کا فاعل الَّذِيْنَ ہے مَا سے متشابہ آیات مراد ہیں۔ مِنْهُ کا مرجع کتاب اللہ ہے۔ یعنی جن کے دلوں میں کجی ہے وہ آیات محکمہ کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے

پڑے رہتے ہیں۔ کبھی اس کے ظاہری معنی سے لوگوں کو بہکاتے ہیں۔ کبھی قرآن میں تعارض اور مقابلہ دکھاتے ہیں۔ کبھی اس کے ظاہری معنی سے اپنے غلط مسائل ثابت کرتے ہیں۔ غرضکہ وہ اسی میں مشغول رہتے ہیں۔ کیوں؟ اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ۔ یہ یَتَّبِعُوْنَ کا مفعول لہٗ ہے۔ اور اِبْتِغَاءِ کا مادہ بغیٌ ہے۔ بمعنی چاہنا' اور حد سے آگے بڑھنا۔ اسلامی سلطان کے مخالف کو باغی کہتے ہیں۔ یعنی حد اطاعت سے بڑھنے والا۔ قرآن فرماتا ہے وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (مائدہ: ۳۵) وسیلہ تلاش کرو۔ یہاں بمعنی تلاش ہے فتنہ کے لغوی معنی غلو اور حد سے آگے بڑھنا ہے کبھی بمعنی آزمائش اور امتحان بھی آتا ہے۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔ (تغابن: ۱۵) کبھی اصل سے ہٹا دینے کو بھی فتنہ کہہ دیتے ہیں۔ گمراہ کرنا اور بلائیں' مصیبتیں سب کو فتنہ کہا جاتا ہے۔ وَاِنْ كَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَكَ۔ (الاسراء: ۷۳) یہاں یا تو فتنہ سے بہکانا مراد ہے یا گمراہ کرنا' یا مسلمانوں میں اختلاف ڈالنا یا بلائیں برپا کرنا۔ یا ایک نیا دین قائم کرکے مسلمانوں میں کشت وخون کرانا یا شرک وکفر (مدارک وخازن وکبیر وغیرہ) دوسرا ابتغاء پہلے ابتغاء پر معطوف ہے اور یَتَّبِعُوْنَ کا مفعول لہٗ۔ تاویل اول سے بنا۔ بمعنی رجوع کرنا لوٹنا' اسی لئے ٹھکانے کو موئل کہا جاتا ہے۔ کبھی بیان اور تفسیر کو بھی تاویل کہہ دیتے ہیں جیسے ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (النساء: ۵۹) یا جیسے سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا۔ (الکہف: ۷۸) اصطلاح میں کسی لفظ کو ظاہری معنی سے پھیرنا تاویل کہلاتا ہے۔ یہاں وہ باطل اور جھوٹی تاویلیں مراد ہیں جو عقائد اسلامیہ کے خلاف ہوں اور مفسدین کی مرضی کے مطابق یعنی الفاظ کو توڑ موڑ کر اپنا مطلب نکالنا۔ یعنی ایسے بے دین لوگ محض گمراہی پھیلانے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرکے کشت وخون کرانے اور لوگوں کے بہکانے کے لئے نیز اپنے مطلب کے موافق قرآن بنانے کے لئے متشابہات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ محکم آیتوں اور روشن احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ۔ واوٗ حالیہ ہے اور یہ جملہ یَتَّبِعُوْنَ کے فاعل سے حال ہے یہاں تاویل سے صحیح معنی اور صحیح مقصود مراد ہے۔ اسی لئے وہاں فرمایا گیا تھا۔ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ اور یہاں ارشاد ہوا وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ۔ ھُوَ کا مرجع مَاتَشَابَهَ کا ما ہے یعنی متشابہ آیتوں کے صحیح معنی رب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خیال رہے کہ احناف کے نزدیک اِلَّا اللّٰهُ پر وقف ہے اور الرّٰسِخُوْنَ سے نیا جملہ شروع ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کے معنی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور پختہ علم والے بغیر تاویل کئے ان پر ایمان لاتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں وقف نہیں بلکہ الرّٰسِخُوْنَ لفظ اللہ پر معطوف ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل اللہ اور سچے علماء کے سوا کوئی نہیں جانتا (کبیر وخازن ومدارک وغیرہ) وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ۔ ہمارے نزدیک یہ واوٗ ابتدائیہ ہے اور رَاسِخُوْنَ مبتداء ہے۔ یَقُوْلُوْنَ خبر۔ امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک واوٗ عاطفہ ہے اور الرّٰسِخُوْنَ اللہ پر معطوف۔ اور یَقُوْلُوْنَ الرّٰسِخُوْنَ کا حال۔ مگر قول اول دلائل کے لحاظ سے قوی ہے۔ جیسا کہ ہم انشاء اللہ عرض کریں گے۔ راسخ رسوخ سے بنا بمعنی مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانا۔ رسوخ بمعنی ثبوت' اسی لئے راسخ وہ درخت کہلاتا ہے جس کی جڑ زمین میں بہت پھیلی ہو اور جڑ کی رگوں نے زمین کو مضبوط پکڑ لیا ہو۔ ایسا درخت بمقابلہ پودوں کے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ راسخ علماء کون ہیں۔ بعض نے فرمایا۔ عالم باعمل راسخ عالم ہے۔ بعض کا قول ہے کہ راسخ وہ ہے جس میں چار صفتیں ہوں۔ پرہیزگاری' انکسار' زہد اور مجاہدہ نفس (خازن وخزائن) بعض نے کہا کہ راسخ وہ جو اللہ کی ذات و

صفات کو یقین اور قرآنی آیات کو دلائل یقینیہ سے پہچانے (کبیر) بعض نے فرمایا کہ راسخ عالم وہ جس کے دل و دماغ اور زبان پر علم نے ایسا قبضہ کرلیا ہو۔ جیسے درخت کی جڑ نے زمین پر کہ زبان سے علمی تقریر کرے دماغ میں علم محفوظ رکھے اور دل میں معرفت ہو۔ بعض نے فرمایا کہ راسخ فی العلم وہ جس کا علم معرفت الٰہی کا ذریعہ ہو اور اسے علم کے ساتھ عشق بھی حاصل ہو۔ انہی کی شان میں ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر:۲۸)۔ ورنہ علم بغیر معرفت حجاب ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (جاثیہ:۲۳)۔ بعض نے فرمایا کہ جس دکان میں ترازو اور باٹ ہیں وہ دکان راسخ و مضبوط ہے اور جو ترازو سے خالی وہ کمزور۔ اسی طرح راسخ عالم وہ ہے جس کے پاس شریعت کا ترازو ہو کہ اپنے اور دوسرے کے کاموں کو اس پر تول کر عمل کرتا ہو۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں راسخ عالم ہوں۔ حضرت مجاہد نے فرمایا کہ میں ان عالموں میں سے ہوں جنہیں متشابہات کا علم ہے۔ (خزائن) تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں راسخین سے وہ علماء اہل کتاب مراد ہیں جو ایمان لے آئے تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ سارے علمائے کاملین مراد ہیں۔ اٰمَنَّا بِهٖ۔ يَقُوْلُوْنَ کا مفعول ہے اور ضمیر کا مرجع یا کتاب ہے یا مَا تَشَابَهَ کا یعنی مضبوط علم والے متشابہات کی تاویل کے پیچھے نہیں پڑتے۔ بلکہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم متشابہات پر ایمان رکھتے ہیں اس کے جو معنیٰ ہیں حق ہیں۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ یہ اٰمَنَّا کی تاکید ہے كُلٌّ کا مضاف الیہ پوشیدہ ہے اور مِنْ کا متعلق ثبت ہے۔ جو کل کی خبر ہے یعنی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سارا قرآن یا محکم متشابہ ساری آیتیں ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ یہ رب تعالیٰ کا مقولہ ہے نہ کہ علماء کا۔ یہ نیا جملہ ہے يَذَّكَّرُ باب تفعل کا مضارع ہے۔ جس کی ت ذال میں مدغم ہوگئی۔ اولو ذو کی جمع ہے۔ الباب لب کی جمع ہے بمعنی اصل اور مغز عقل کو بھی لب اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اصل انسانیت یعنی سوا عقل والوں کے اور کوئی قرآن سے نصیحت حاصل نہیں کرتا۔

خلاصہ تفسیر

وہ اللہ ایسی قدرت والا ہے جس نے آپ پر اے محبوب ﷺ یہ قرآن اُتارا۔ جس کی سب آیتیں یکساں نہیں بلکہ بعض آیتیں محکم ہیں۔ جن کے معانی بھی صاف ہیں۔ اور ان کی مراد بھی واضح۔ یہ قرآن میں اصل آیتیں ہیں جن کی طرف حلال و حرام اور احکام شرعیہ میں رجوع کیا جاتا ہے۔ یہ ہی شریعت کی اصل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ آیتیں متشابہ ہیں جن کے معنی واضح نہیں اور ان کا مقصود ظاہر نہیں۔ ان میں بہت اشتباہ ہے پھر لوگ بھی چند قسم کے ہیں جن کے دل میں کجی ہے اور جو سیدھے راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں وہ تو محض فتنہ پھیلانے' قرآن کو جھٹلانے اور آیات قرآنیہ میں تعارض دکھانے کی غرض سے نیز قرآن کو اپنی رائے کے مطابق بنانے کے لئے محکم آیتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ جیسے یہ نجران کے عیسائی اور دیگر گمراہ فرقے۔ حالانکہ ان متشابہات کے حقیقی معنی اور صحیح مقصود خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ جانے جسے اپنے کرم سے رب تعالیٰ نوازے اور علم متشابہات عطا فرمائے (خزائن وغیرہ) اور پختہ علم والے یعنی متقی پرہیزگار علماء متشابہات کے متعلق یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لے آئے۔ ان کے جو بھی معنی ہیں حق ہیں کیونکہ سارے محکمات و متشابہات ہمارے رب کی طرف سے ہیں۔ ہماری عقل میں آئیں یا نہ آئیں اور نصیحت نہیں پکڑتے مگر وہ جن کے پاس عقل کامل ہو غرضکہ اس کتاب [illegible] لئے ہدایت لیتے ہیں [illegible] نصیب گمراہی۔ خیال رہے کہ خودرو درخت جو ریگستان'

کوہستان، چھتوں پر عارضی طور پر خود جم جاتے ہیں۔ ان میں پھل پھول نہیں لگتے۔ کچھ سبزہ دکھا کر سوکھ جاتے ہیں مگر جو پودے کسی نے زمین نرم کر کے لگائے ہیں وہ پھول بھی دیتے اور پھل بھی۔ ایسے ہی خود رو عالم جو ترجمہ قرآن شریف دیکھ کر عالم بن جاتے ہیں۔ ان سے فیض نہیں ہوتا مگر جو کسی کامل کی نگاہ کرم سے محنتیں کرنے کے بعد عالم بنتے ہیں کہ علم کی جڑ ان کے دلوں میں قائم ہوتی ہے اور اس کی شاخیں ان کے تمام اعضاء میں پھیلی ہوتی ہیں کہ اس عالم کی زبان، ہاتھ پاؤں کو برے اعمال سے روک لیتی ہے وہ عالم راسخ فی العلم ہے کہ اس کے علم سے لوگ فیض پاتے رہتے ہیں جیسے زمین کو نرم کر کے بیج بوتے ہیں لوہے کو آگ میں نرم کر کے اوزار بناتے ہیں۔ مٹی کو پانی سے نرم کر کے اس کے برتن بناتے ہیں۔ ایسے ہی استاد کامل شاگرد کے دل کو نرم کرتے ہیں پھر اس میں علم کا تخم بوتے ہیں۔ تب انسان راسخ فی العلم بنتا ہے۔ عالم ہونا آسان ہے مگر راسخ فی العلم ہونا بہت مشکل ہے۔

محکم و متشابہ!

ان دونوں لفظوں کے لغوی معنی ہم تفسیر میں بتا چکے۔ اس میں گفتگو ہے کہ یہاں ان دونوں سے کیا مراد ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ محکم وہ عبارت ہے جس کی مراد پہچانی جا سکے۔ خواہ ظاہر ظہور یا کسی قدر تاویل سے اور متشابہ وہ جو کسی طرح سمجھ میں نہ آ سکے جیسے قیامت، دجال اور دابۃ الارض کے آنے کا وقت اور جیسا کہ سورتوں کے اول میں حروف مقطعات بعض علماء نے فرمایا کہ محکم وہ جس میں ایک ہی معنی کا احتمال ہو اور متشابہ وہ جس میں چند احتمالات ہوں بعض نے فرمایا کہ جو ناسخ ہے وہ محکم اور جو منسوخ ہے وہ متشابہ بعض کے نزدیک محکم وہ جو مقرر نہ ہو اور متشابہ وہ جس کے الفاظ مقرر ہوں۔ بعض کے خیال میں محکم وہ جس کی وجہ سمجھ میں آ سکے اور متشابہ وہ جس کی وجہ عقل سے باہر ہو۔ جیسا نماز کے اوقات اور رکعات کی تعداد اور ماہ رمضان میں روزہ کا ہونا نہ کہ شعبان میں کہ اس کی صحیح حکمت رب ہی کے علم میں ہے۔ بعض نے فرمایا کہ محکم وہ جس کا مدار دین میں ہو جیسے ایمان اور عبادات کے احکام۔ متشابہ وہ احکام جو صرف قرآن میں آئے۔ غرضکہ اس کے متعلق سترہ قول ہیں (تفسیر احمدی) سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جو احکام شریعتوں کے اختلاف سے بدل جائیں۔ وہ متشابہ اور جو نہ بدلیں وہ محکم۔ اہل اصول کے نزدیک محکم وہ ہے جس کے معنی بالکل ظاہر ہوں اور وہ ہی کلام سے مقصود ہوں۔ اس میں تاویل یا تخصیص کی گنجائش نہ ہو۔ نسخ یا تبدیل کا احتمال نہ ہو اور متشابہ وہ ہے جس کی مراد عقل میں نہ آ سکے۔ اور یہ بھی امید نہ ہو کہ رب تعالیٰ بیان فرمائے۔ خیال رہے کہ یہ اقوال اس طرح جمع ہو سکتے ہیں کہ متشابہات کی بہت قسمیں ہیں۔ ہر بزرگ نے ایک قسم کی تعریف فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ سب متشابہ کی اقسام ہیں۔

متشابہ کی قسمیں: متشابہ کی چند قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو صرف لفظاً متشابہ ہوں۔ دوسرا وہ جو صرف معناً۔ تیسرا وہ جو لفظاً بھی متشابہ ہوں اور معناً بھی۔ لفظاً متشابہ کی پھر چند قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو صرف معنی کے لحاظ سے متشابہ ہو۔ دوسرا وہ جو معنی کے عموم خصوص کے لحاظ سے ہوں۔ تیسرا وہ جو کیفیت کے لحاظ سے متشابہ ہوں چوتھا وہ جو شرائط کے لحاظ سے متشابہ ہوں (روح المعانی) پھر متشابہات کی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئیں جیسے الٓمٓ وغیرہ انہیں آیات مقطعات کہتے

ہیں۔ دوسرا وہ جن کے لغوی معنے سمجھ میں آتے ہوں مگر یہ خبر نہ ہو کہ یہاں رب کی کیا مراد ہے۔ اور ظاہری معنی محکم آیتوں کے خلاف ہوں۔ جیسے ید اللہ اور وجہ اللہ کہ ید اور وجہ کے لغوی معنی بالکل ظاہر ہیں مگر یہ خبر نہیں کہ آیت میں ان سے کیا مراد ہے۔ انہیں آیات صفات کہتے ہیں۔ مقطعات کل انتیس ہیں۔ الٓمٓصٓ اعراف میں' الٓمٓرٰ رعد میں' کٓھٰیٰعٓصٓ مریم میں۔ طٰسٓ نمل میں۔ صٓ۔ حٰمٓعٓسٓقٓ شوریٰ میں۔ نٓ۔ قٓ۔ طٰہٰ۔ یٰسٓ۔ طٰسٓمٓ۔ شعرا اور قصص میں الٓرٰ پانچ سورتوں میں۔ یونس' ہود' یوسف' ابراہیم' حجر۔ الٓمٓ چھ سورتوں میں۔ بقرہ' آل عمران' عنکبوت' روم' لقمان' سجدہ' حٰمٓ چھ سورتوں میں۔ مومن' سجدہ' زخرف' دخان' جاثیہ' احقاف۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کے لغوی معنٰی کی بھی ہم کو خبر نہیں لیکن آیات صفات یہ قرآن کریم میں بہت ہیں کچھ عرض کئے جاتے ہیں۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی (طٰہٰ:۵) وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ (طٰہٰ:۳۹) کُلُّ شَیْئٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (قصص:۸۸) یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ۔ (فتح:۱۰) وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌ بِیَمِیْنِهٖ (الزمر:۶۷) عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْبِ اللّٰهِ (الزمر:۵۶) یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ۔ (القلم:۴۲) وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (انعام:۱۸) وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔ (قٓ:۱۶) وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات:۲۱) وَکَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْئٍ مُّحِیْطًا۔ (النساء:۱۲۶) وَجَآءَ رَبُّکَ۔ (الفجر:۲۲) اَوْیَاْتِیَ رَبُّکَ اَوْیَاْتِیَ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ (انعام:۱۵۸) مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بقرہ:۱۶۵) فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ۔ (بقرہ:۱۱۵) وَهُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (الحدید:۴) وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ۔ (حجر:۲۹) سَنَفْرُغُ لَکُمْ اَیُّهَا الثَّقَلٰنِ (الرحمٰن:۳۱) اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور:۳۵) اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔ (القیامۃ:۲۳) یہ تمام متشابہات ہیں۔ (تفسیر احمدی) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ ساری نفسانی صفات جو رب کی طرف نسبت کی جائیں وہ متشابہات ہیں۔ جیسے رحمت' غضب' حیا' مکر اور استہزاء۔ جہاں کہیں یہ الفاظ رب کے لئے قرآن میں آئیں انہیں متشابہ محکم کی طرف لوٹاؤ (احمدی و کبیر) بلکہ شیخ عبدالحق نے مدارج النبوت چھٹے باب میں فرمایا کہ وہ آیات جن میں انبیائے کرام کے لئے صفات عمومی ثابت کئے جائیں۔ وہ متشابہات ہیں۔ جیسے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (الکہف ۱۱۰) اور وَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی۔ (طٰہٰ:۱۲۱) وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (محمد:۱۹) نیز تفسیر احمدی نے زیر آیت لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔ (بقرہ:۱۲۴) فرمایا کہ تمام وہ آیتیں جن سے انبیاء کرام کا گنہگار ہونا معلوم ہوتا ہو ان سب کی تاویل واجب ہے۔ جیسے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا۔ (یوسف:۲۴) یا فَتَکُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (بقرہ:۳۵) یا وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔ (الضحیٰ:۷) وغیرہ گویا ان کا مطلب بھی یہ ہی ہے کہ یہ آیتیں متشابہات ہیں۔

نوٹ ہماری اس تحقیق سے تمام بدمذہبوں خصوصاً دیوبندیوں کو عبرت پکڑنی چاہیے کہ وہ بارہا اپنے مذہب کی حمایت کے لئے متشابہ آیات سے دلیل پکڑتے ہیں۔

متشابہات کا علم

ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ اس آیت میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ الا اللہ پر وقف کرتے ہیں۔ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہاں وقف نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک متشابہات کا علم رب کے سوا کسی کو نہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے

نزدیک علمائے کاملین کو بھی ہے۔ اس مسئلہ کے عرض کرنے سے پیشتر تین باتیں سمجھ لو۔ ایک یہ کہ یہ اختلاف علماء کے متعلق ہے ورنہ یہ سب مانتے ہیں کہ حضور ﷺ کو سارے متشابہات کا علم ملا۔ اس کے نہ حنفی منکر ہیں نہ شافعی نور الانوار شریف میں ملا احمد جیون نے بحث متشابہ میں فرمایا کہ یہ اختلاف امت کے بارے میں ہے۔ حضور ﷺ کو سارے متشابہات کا علم ہے۔ ورنہ ان کا نازل فرمانا بے فائدہ ہوگا۔ اسی نور الانوار اور تفسیر روح المعانی میں اسی جگہ ہے کہ متشابہات اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ کے درمیان اسرار ہیں جنہیں اغیار نہیں جانتے۔ دوسرا یہ کہ یہ اختلاف دلائل نقلی و عقلی کے ذریعے جاننے میں ہے۔ ورنہ صاحب کشف اور اولیاء کاملین کو بذریعہ الہام متشابہات کا علم ہوتا ہے (روح المعانی) سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ متشابہات کو میں جانتا ہوں (روح المعانی و خازن و خزائن وغیرہم) اور بہت اولیاء اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے متشابہات کے علم کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ علی خواص فرماتے ہیں کہ مجھے سورۂ فاتحہ کے دو لاکھ چالیس ہزار نو سو نوے علوم ملے۔ کشف میں فرمایا کہ قٓ، صٓ، حٰمٓ وغیرہ کا علم ہم کو ایسا ہے جیسے دوسروں کو اولیات کا علم۔ علی خواص نے فرمایا کہ ہم اسی کو عالم کہتے ہیں۔ جو ہر لفظ کو جانے (روح المعانی) تیسرا یہ کہ یہ اختلاف اصولی متشابہات یعنی مقطعات و آیات صفات میں ہے۔ ورنہ وقت قیامت اور ملائکہ زبانیہ کی تعداد وغیرہ متشابہات کا علم علمائے کرام کے لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی نہیں مانتے اور تعداد رکعات کی مصلحت اور اوقات نمازی کی حکمت جاننے کا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی انکار نہیں کرتے بلکہ اختلاف اس میں ہے کہ الٓمٓرٰ الٓمٓ۔ وغیرہ مقطعات قرآنیہ اور آیات صفات وغیرہ کا علم علماء کرام کو ہے یا نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہے۔ کیونکہ دیگر آیات کو محکم اسی لئے کہتے ہیں کہ متشابہات کو ان کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ اور ان کے معانی محکمات کے مطابق کئے جاتے ہیں۔ اگر متشابہات کا علم کسی کو نہ ہوتا تو ان آیات کو محکمات کیونکر کہا جاتا نیز حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے عبداللہ ابن عباس کے لئے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ۔ اے اللہ انہیں دین کا فقیہ بنا۔ اور متشابہات کی تاویل سکھا۔ اگر تاویل رب کے ساتھ خاص ہوتی تو اس دعا کے کیا معنی۔ نیز عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ متشابہات کی تاویل میں جانتا ہوں۔ نیز رب تعالیٰ نے یہاں فرمایا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّا اُولُوا الْاَلْبَابِ۔ ان متشابہات سے نصیحت حاصل نہیں کرتے مگر عقلمند اگر متشابہات سمجھ سے بالاتر ہیں تو اس سے نصیحت پکڑنے کے کیا معنی۔ نیز اگر متشابہات تک بندوں کے علم کی رسائی نہیں تو ان کے نازل کرنے اور قرآن میں باقی رکھنے سے کیا فائدہ۔ قرآن تو لوگوں کی ہدایت کے لئے آیا ہے۔ اس کی ہر آیت ہدایت ہے وغیرہ مگر

احناف فرماتے ھیں: کہ ان متشابہات کا علم رب تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ چند وجوں سے۔ اولاً یہ کہ عام صحابہ کرام اور تابعین کا یہ ہی مذہب ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ قرآن کی تفسیر کے چار درجے ہیں ایک وہ جو سب کے علم میں ہونی چاہیے۔ جیسا حرام و حلال کے مسائل۔ دوسرا وہ جس کا علم صرف اہل عرب کو ہے۔ جیسا عربی زبان کے راز۔ تیسرا وہ جسے صرف علماء ہی جانتے ہیں۔ چوتھا وہ جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دوسرے یہ کہ اس آیت کی دیگر قرأتیں اسی مسئلہ کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس کی قرأت ہے۔ وَيَقُوْلُ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔ نیز ابی بن کعب کی قرأت ہے۔ وَيَقُوْلُ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کی قرأت یوں ہے۔ وَاِنْ تَاْوِيْلَهٗ اِلَّا

عِنْدَ اللّٰهِ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ۔ ان قرأتوں میں آپ کے معنی بن سکتے ہی نہیں۔ تیسرا یہ کہ مختلف احادیث میں بھی آیا ہے کہ متشابہات کا علم صرف اللہ کو ہے۔ چنانچہ طبرانی میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی امت پر تین چیزوں کا خوف کرتا ہوں۔ (۱) زیادتی مال جو باعث حسد ہو۔ (۲) جنگ وجدال۔ (۳) متشابہات کی تاویل۔ حالانکہ اس کی تاویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ نیز ابن مردویہ نے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ قرآن کی جن آیتوں کو تم سمجھ سکو ان پر عمل کرو اور متشابہات پر ایمان لے آؤ۔ نیز حاکم نے بروایت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قرآن پاک سات چیزوں کو لے کر اترا۔ ممانعت، حکم، حلال، حرام، محکم، متشابہ اور مثالیں۔ لہٰذا تم حلال کو حلال جانو، حرام کو حرام سمجھو، احکام پر عمل کرو۔ ممانعت سے بچو، مثالوں سے عبرت پکڑو۔ محکم پر عمل کرو۔ اور متشابہات پر ایمان لے آؤ اور کہہ دو اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ نیز ابن جریر نے عبداللہ ابن عباس سے مرفوعاً نقل کیا کہ متشابہ کو خدا کے سواء کوئی نہیں جانتا۔ جو اس کے علم کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے۔ (روح المعانی) چوتھا یہ کہ ائمہ کرام کا بھی یہی مذہب ہے۔ چنانچہ کسی نے امام مالک سے پوچھا کہ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ (اعراف: ۵۴) کے کیا معنی؟ آپ نے فرمایا کہ اِسْتَوٰی کے معنی معلوم ہیں۔ اس کی کیفیت مجہول۔ اس پر ایمان لانا واجب اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت (کبیر) پانچواں یہ کہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے بدمذہبوں کی برائی یوں فرمائی کہ وہ متشابہات کی تاویل کے پیچھے پڑتے ہیں اور علمائے کرام کی تعریف یوں کی کہ وہ کہہ دیتے ہیں اٰمَنَّا بِهٖ۔ اگر انہیں بھی اس کا علم ہوتا تو یہاں تاویل کا مقابلہ ایمان سے نہ ہوتا بلکہ یوں کہا جاتا کہ گمراہ غلط تاویلیں کرتے ہیں۔ علماء صحیح (کبیر) چھٹا یہ کہ اِلَّا اللّٰهُ پر وقف نہ کرنے میں اور الرَّاسِخُوْنَ کو اللہ پر معطوف ماننے میں۔ یَقُوْلُوْنَ سے پہلے کچھ عبارت پوشیدہ ماننی پڑے گی۔ اور رَاسِخُوْنَ کو مبتدا مان لینے میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور پوشیدہ ماننے سے نہ ماننا بہتر (کبیر) ساتویں یہ کہ اگر یَقُوْلُوْنَ کو حال مانتے ہو تو چاہیے کہ یہ رَاسِخُوْنَ اور اللہ دونوں کا حال ہو کیونکہ وہ معطوف اور معطوف علیہ ہیں تو معنی یہ ہوئے کہ اللہ اور علماء دونوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور یہ معنی بالکل فاسد ہیں اور یہ بالکل خلاف ظاہر ہے کہ صرف رَاسِخُوْنَ کا حال ہو۔ (کبیر) غرضکہ ترجیح اسی کو ہے کہ علماء کو متشابہات کا علم نہیں۔

فیصلہ: ان دونوں اماموں کے قول میں مطابقت یوں کی جاسکتی ہے کہ احناف کہتے ہیں کہ متشابہات کا قطعی علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ شوافع کہتے ہیں کہ ظنی علم علماء کو بھی ہے۔ لہٰذا ان میں کوئی قوی اختلاف نہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ احناف کہتے ہیں کہ سارے متشابہات کا علم رب کے سوا کسی کو نہیں۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بعض متشابہات کا علم علماء کو بھی ہے۔ لہٰذا ان میں کوئی اختلاف نہیں۔

خیال رہے کہ احناف الٓمّٓ وغیرہ کی تاویلیں پہلے نہیں کرتے تھے مگر جب علماء متاخرین نے بدمذہبوں کا فساد اور بے دینوں کے الحاد کا زور دیکھا تو انہوں نے مذہب شافعی پر عمل کرتے ہوئے ان متشابہات کی کچھ تاویلیں کیں تاکہ لوگ بے دینوں کی تاویلات سے بچیں مثلاً کہا کہ الٓمّٓ میں الف سے اللہ اور لام سے جبریل اور میم سے محمد ﷺ مراد ہیں وغیرہ۔

متشابہات کی حکمتیں

متشابہات کو نازل فرمانے اور انہیں اور قرآن میں باقی رکھنے کی چند حکمتیں ہیں۔(۱) حکومت کی طرف سے حکام کے پاس صریحی احکام کے ساتھ کچھ رموز اور اشارے بھی آتے ہیں۔ جسے چٹھی رسان اور ڈاکخانہ کے ملازمین بھی نہیں سمجھ سکتے صرف حاکم جانتا ہے یا وہ افسر ایسے ہی قرآن کریم میں رب تعالیٰ کی طرف سے حضور علیہ السلام پر صاف احکام کے ساتھ کچھ راز و نیاز بھی آئے۔ جنہیں حضرت جبرائیل امین بھی نہ سمجھ سکے۔ انہی کا نام متشابہات ہے۔ (۲) متشابہات میں علماء کا امتحان ہے۔ جہلا کو حکم دیا گیا کہ علم سیکھو علماء کو حکم دیا گیا کہ ان باتوں کو نہ سیکھو اور نہ ان میں غور کرو ہر ایک کا امتحان اس کے تقاضائے طبیعت کے خلاف سے ہوتا ہے۔ (۳) متشابہات کے ذریعہ سے بندہ اپنی بندگی کا اقرار کرتا ہے کہ عالم ہر جگہ اپنی عقل کا گھوڑا دوڑاتا ہے مگر یہاں پہنچ کر کہنا پڑتا ہے کہ رب جانے۔ ان کا کیا مطلب' اور اپنے قصور کا اقرار علامت بندگی ہے۔ (۴) متشابہات کے ذریعہ خدائی کتاب اور انسانی کتاب میں فرق ہوتا ہے کہ انسانی کتاب وہ جسے ہر کوئی اول سے آخر تک سمجھ لے اور خدائی کتاب وہ جہاں ہر ایک اپنے عجز کا اقرار کرے۔ اسی لئے قرآن سے پہلے دیگر آسمانی کتابوں میں بھی متشابہات تھے۔ انہی متشابہات میں پھنس کر عیسائی گمراہ ہو گئے۔ چنانچہ انجیل شریف میں عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا' نہ آپ خدا تھے۔ نہ خدا کے بیٹے۔ بلکہ متی رسول ہیں۔ خود ہمارے حضور ﷺ کی نبوت کو خدا کی بادشاہت کہا گیا۔ بلکہ حضور ﷺ کو خدا کہا گیا۔ دیکھو متی رسول ۲۱۔ ۳۳۔ ۴۰۔ جہاں انگورستان کے مالک کے بیٹے کی مثال دی ہے۔ زبور شریف میں سارے جہان کو خدا کا بیٹا کہا گیا۔ چنانچہ زبور ۸۲۔۶ میں ہے کہ میں نے تو کہا تم اللہ ہو۔ اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔ غرضکہ تمام کتاب آسمانی میں متشابہات موجود ہیں۔ (۵) متشابہات کا انسانی علم سے بالاتر ہونا ذریعہ ہدایت ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قرآن کریم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور بعض متشابہ مگر ایک جگہ سارے قرآن کو محکم کہا کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ھود: ۱) اور دوسری جگہ سارے قرآن کو متشابہ فرمایا گیا۔ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا۔ (الزمر: ۲۳) جس سے معلوم ہوا کہ سارا قرآن متشابہ ہے۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟

جواب: وہاں محکم سے مراد فساد معنٰی اور لفظی خرابیوں سے محفوظ ہے۔ یعنی سارے قرآن کے معنے اور الفاظ فساد سے خالی ہیں اور وہاں متشابہ سے مراد سارے قرآن کا یکساں ہونا ہے یعنی سارا قرآن فصاحت و بلاغت میں یکساں ہے۔ شعراء کے کلام کی طرح بعض اعلیٰ بعض ادنیٰ نہیں اور یہاں محکم سے مراد ہے ظاہر المعنی اور متشابہ سے مجہول المعنی۔ لہٰذا آیتوں میں تعارض نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اِلَّا اللّٰهُ پر وقف کرنے سے معلوم ہوا کہ متشابہات کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں اور تم نے کہا کہ حضور ﷺ بلکہ اولیاء اللہ کو بھی ہے۔ تمہارا یہ کلام اس آیت کے خلاف ہے (بعض جہلاء دیوبند) **جواب:** ہم علم متشابہات کے مسئلہ میں عرض کر چکے کہ اماموں کا یہ اختلاف علم بالدلائل میں ہے۔ اس علم میں کسی کا اختلاف نہیں جو بذریعہ کشف یا الہام ہو۔ رب تعالیٰ حضور علیہ السلام کے فعل کو اپنا فعل قرار دیتا ہے کیونکہ حضور (علیہ السلام) فنافی اللہ ہیں۔ فرماتا

ہے۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (بقرہ:۹)۔ وہ اللہ یعنی رسول اللہ کو دھوکا دیتے ہیں۔ فرماتا ہے۔ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ۔ (الفتح:۱۰) حضور علیہ السلام کی بیعت رب تعالیٰ کی بیعت۔ حضور علیہ السلام کا دست شریف رب تعالیٰ کا دستِ قدرت۔ حضور علیہ السلام کے کنکر پھینکنا رب تعالیٰ کا پھینکنا۔ ایسے ہی یہاں ہے کہ اللہ والوں کا جاننا رب کا ہی جاننا ہے۔ کہ وہ بلاواسطہ عقل رب تعالیٰ کی عطا سے ہے۔ لہٰذا ان سب کا علم اِلَّا اللہ میں داخل ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ (رحمٰن:۱۔۲) رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا اور ظاہر ہے کہ رب نے حضور علیہ السلام کو سارا ہی قرآن سکھایا۔ سارے قرآن میں متشابہات بھی ہیں۔ اگر رب نے ان کا علم حضور انور علیہ السلام کو نہ دیا ہوتا تو علم القرآن کیونکر درست ہوتا۔ **تیسرا اعتراض:** رب تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ۔ (الاسراء:۹) قرآن کریم سیدھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی ہر آیت ہدایت ہے تو اگر بعض آیتیں ایسی بھی ہوں جن کے معنی کی کسی کو خبر نہ ہو۔ وہ ہدایت کیسے کرے گی۔ ان کے نازل فرمانے اور قرآن میں رکھنے سے کیا فائدہ؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن پاک ہر طرح ہدایت ہے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اگر اس کی ہدایت سمجھنے پر موقوف ہوتی تو صرف اہل عرب تک خاص رہتی۔ عجمی لوگ جو اس کے معنی نہیں سمجھتے' وہ اس سے ہدایت نہ پاتے' دوسرا یہ کہ قرآن کریم چند طرح ہدایت ہے۔ جو آیتیں سمجھ میں آ جائیں۔ ان کا مضمون بھی ہدایت' اور جو عقل سے بالاتر ہیں۔ ان کی عبارت ہدایت ہے' بلکہ ان کا سمجھ میں نہ آنا بتاتا ہے کہ یہ اس کا کلام ہے۔ جس کا علم' قدرت' ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ تیسرا یہ کہ رب نے یہ ہی تو فرمایا ہے کہ قرآن سیدھے راستہ کی ہدایت کرتا ہے اور متشابہات کے متعلق سیدھا راستہ یہ ہی ہے کہ ان میں غور نہ کیا جائے۔ ان کے پیچھے پڑنا ٹیڑھا راستہ ہے۔ **چوتھا اعتراض:** رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۔ (القمر:۱۷) ہم نے سارے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔ اگر اس کی بعض آیتیں سمجھ میں نہ آ سکیں تو سارا قرآن آسان کہاں رہا (چکڑالوی) **جواب:** سارا قرآن ذکر کے لئے آسان ہے نہ کہ سمجھنے کو ذکر سے یا تو یاد کرنا مراد ہے۔ یا نصیحت پکڑنا اور واقعی متشابہات کا یاد کرنا بھی آسان کہ بچے رٹ لیتے ہیں۔ دوسری آسمانی کتابوں میں یہ وصف نہ تھا۔ اور متشابہات سے نصیحت حاصل کرنا کہ یہ خدائی کلام ہے یہ بھی آسان۔ اس کی سمجھ ہر ایک کو ناممکن ہے۔

تفسیر صوفیانہ

انسانی اور قدرتی چیز میں فرق یہ ہی ہے کہ انسانی چیز کا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ نیز اس کی حقیقت تک انسان پہنچ سکتا ہے اور قدرتی چیز کا نہ تو مقابلہ ممکن اور نہ اس کی تہ تک پہنچنا آسان غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں کچھ ظہور ہے اور کچھ خفا۔ خود اپنے پر غور کرلو کہ ہمارے پاس دو چیزیں ہیں۔ ایک جسم' دوسرا روح' جسم کے متعلق ہمیں کچھ تھوڑی خبر ہے کہ یہ چار عناصر سے بنا۔ کسی میں سودا غالب کسی پر صفرا۔ مگر روح کی کچھ خبر نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔ کاہے سے بنی۔ ظاہر چیزیں گویا محکمات ہیں اور یہ پوشیدہ چیزیں گویا متشابہات۔ اسی قاعدہ سے قرآن کریم کی کچھ آیتیں کسی قدر ظاہر ہیں جنہیں محکمات کہا جاتا ہے اور بعض بالکل عقل سے دور یہ متشابہ ہیں۔ جیسے دنیا کی چیزوں میں جب عقل تھکتی ہے تو کہتی ہے کہ اللہ جانے یہ کیا ہے اور اس کی یہ مجبوری ہی نشانِ بندگی ہے ایسے ہی [illegible] عقل [illegible] ہی جانے۔ اگر یہ مجبوری نہ

ہوتی تو شاید یہ عقل خدائی دعویٰ کر بیٹھتی۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ محکم ومتشابہ کا قصہ ہر جگہ ہی موجود ہے۔ دیکھو ذات کے دو لحاظ ہیں۔ ایک وجہ مطلق۔ دوسرا وجہ اضافی۔ وجہ مطلق وہ حیثیت ہے جو خلق کی فنا کے بعد بھی باقی ہے۔ جس میں کثرت کا بالکل احتمال نہیں۔ اور وجہ اضافی مخلوق کے ساتھ تعلقات ہیں۔ بلکہ مخلوق میں سے ہر چیز اسی کا مظہر ہے۔ وجہ مطلق کو سوا عارفین کے کوئی نہیں پہچانتا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ؎

وَمَا الْوَجْهُ اِلَّا وَاحِدًا غَيْرَ اِنَّهٗ اَذَ اَنْتَ اَعْدَتِ الْمَرَايَا تَعَدُّدَا

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک آئینہ خانہ ہے۔ جس میں رنگ برنگے شیشے ہیں' جن کے درمیان صاحب خانہ جلوہ گر ہے۔ صاحب خانہ ایک مگر اس کے نقشے جو آئینہ میں کھچ رہے ہیں' بے شمار۔ وہ صاحب خانہ مطلق ہے اور یہ تصویریں وجہ اضافی۔ صاحب خانہ گویا متشابہ اور یہ آئینہ کے نقوش محکمات' اس متشابہ کو وہ صاحب اسرار جانے جس کی رسائی درونِ سرا یعنی گھر کے اندر ہو اور باہر کے دوست انہی محکمات کو اختیار کریں اور جو تصویر ان کے مذہب کے مناسب ہو اسے اختیار کریں' جو باہر رہ کر گھر والے کو دیکھنے کا دعویٰ کرے وہ ہی گمراہ ہے۔ اسی کے متعلق فرمایا گیا۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ۔ یعنی وہ پردے والے لوگ جو حق تک نہ پہنچے۔ وہ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں۔ محض فتنہ کے لئے۔ اس کے پیچھے پڑنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کا حجاب اور بڑھتا جاتا ہے مگر واقف کار لوگ پکار کر کہتے ہیں۔ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ یہ تمام عکس اسی ذات کے ہیں۔ ان کے نزدیک کل وہ ایک ہی ہے۔ جس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ نصیحت وہ ہی پکڑ سکتے ہیں جن کے دل نور ہدایت سے منور ہوں اور جو خواہشات نفسانیہ کے چھلکے سے صاف ہوں۔ (از ابن عربی) صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جیسے کھجور' آم وغیرہ کے باغ لگاتا ایک آدمی ہے۔ مگر برسوں تک لوگ اس کے پھل کھاتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی راسخ فی العلم علماء کرام قبروں میں سو جاتے ہیں اور ان کے علوم سے لوگ پشت در پشت فیض پاتے رہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب مشکوٰۃ اور دوسرے وہ علماء دین جن کی تصانیف سے لوگ تا قیامت فائدے اٹھاتے رہیں گے۔ یہ ان راسخین فی العلم میں سے ہیں جن کی یہاں تعریف ہے۔ **ھدایت:** اللہ کے مقبول بندے مظہر ذات الٰہی ہیں۔ ان کے کلام میں بھی کچھ محکمات ہوتے ہیں۔ کچھ متشابہات' چنانچہ بعض احادیث متشابہ ہیں۔ ایسے ہی صوفیائے کرام کے کچھ اقوال مثل متشابہات ہیں۔ منصور نے انا الحق کہا' بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے سبحانی ما اعظم شانی فرمایا۔ یہ سب متشابہات ہی ہیں کہ ان کے ظاہر پر احکام شرعی جاری نہیں ہو سکتے۔ شامی نے باب المرتدین میں فرمایا کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے وہ کلمات جو بظاہر خلاف شرع معلوم ہوں قرآنی متشابہات کے مثل ہیں۔ اسی لئے خود محی الدین نے فرمایا کہ ہم ایسی قوم ہیں کہ ہماری کتابیں نا اہل کو دیکھنا حرام ہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب لکھی تنبیهه الغبی بتبرية ابن عربی۔ اس میں فرمایا کہ میرے نزدیک فیصلہ یہ ہے کہ ابن عربی ولی کامل ہیں مگر ان کی کتابیں دیکھنا حرام (شامی) لہٰذا وہ اولیاء کاملین جن کی ولایت پر امت کا اتفاق ہو چکا۔ ان کے اس قسم کے اقوال کے ظاہری معنی نہ کئے جائیں گے۔ اور کہا جائے گا رب ہی جانے ان کی کیا مراد ہے؟ **لطیفہ:** محمد علی لاہوری نے اپنی پوری تفسیر بیان القرآن میں اس جگہ لکھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا دعویٰ نبوت یا دعویٰ خدائی مثل متشابہات کے ہے۔ نہ انہیں نبی کہو اور نہ انہیں برا جانو۔ ۔۔۔ دیکھی اس زمانہ کے دیوبندیوں نے یہ ہی راہ اختیار کر لی

کہ مولوی اسمٰعیل دہلوی رشید احمد گنگوہی وغیرہما کی کفریہ عبارات کی جب کوئی توجیہ نہ کرسکے تو کہنے لگے کہ یہ متشابہات ہیں۔ اس کے معنی خدا ہی جانے۔ یا وہ جانیں اس لئے ہم متشابہات کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں کہ

متشابہ ہونے کی تین علامتیں ھیں: (۱) ایک یہ کہ بولنے والا وہ شخص ہو جس کی ولایت پر سارے مسلمانوں کا اتفاق ہو۔ ورنہ پھر تو ابلیس بھی کہہ سکتا تھا کہ میرا کلام متشابہ ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ اس عبارت کو عقیدہ نہ بنایا گیا ہو۔ نہ بولنے والے نے اس کی تبلیغ کی ہو نہ اس کے ماننے والوں نے۔ منصور نے انا الحق جوش میں کہہ دیا۔ نہ اس کی طرف کسی کو دعوت دی اور نہ کسی نے اس کی تبلیغ کی ہو۔ (۳) تیسرا یہ کہ اس کلام میں کسی نبی کی توہین نہ ہو۔ توہین نبی مثل متشابہ نہیں بن سکتی۔ یہاں یہ کچھ بھی نہیں۔ تقویۃ الایمان کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسے عقائد میں پیش کیا جاتا ہے۔ مرزا جی نے عمر بھر دعویٰ نبوت پر مناظرے مباہلے کئے۔ پھر یہ متشابہ کیسا۔ ان سب کے باوجود ان میں سے بعض اولیاء کو علماء نے قتل کرا دیا۔ جیسے حضرت منصور اور انہوں نے شریعت کے سامنے اپنی گردن رکھ دی تاکہ ان کی اس بے اختیاری عبارت سے دین میں فتنہ واقع نہ ہو۔ کسی ولی نے بارگاہ نبوی ﷺ میں گستاخی کرنے کی جرأت نہیں کی جوش میں اَنَا اللّٰہ تو کہہ گئے۔ مگر اَنَا محمد ﷺ کسی نے نہ کہا۔ کیونکہ دربار الٰہی بارگاہ ناز ہے اور آستانہ مصطفیٰ ﷺ مقام نیاز یہاں اونچی آواز سے بولنے پر نیکیاں برباد ہوتی ہیں۔ یہ تقریر بہت خیال میں رکھنی چاہیے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے محبوب ﷺ قبول فرمائیں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَ نُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ

اے رب ہمارے نہ ٹیڑھا کر دلوں کو ہمارے پیچھے اسکے کہ ہدایت دی تو نے ہم کو اور دے تو واسطے ہمارے پاس سے اپنی رحمت

اے رب ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا کر

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۸﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ

تحقیق تو بہت دینے والا ہے اے رب ہمارے تحقیق تو جمع فرمانے والا ہے لوگوں کو واسطے اس دن کے کہ نہیں ہے

بیشک تو ہے دینے والا اے رب ہمارے بیشک تو سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن کے لئے جس میں

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۹﴾ ع

بیشک بیچ اس کے تحقیق اللہ نہیں خلاف کرتا وعدہ

کوئی شبہ نہیں بے شک اللہ کا وعدہ نہیں بدلتا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ربانی علماء کے ایمان کا ذکر تھا کہ وہ متشابہات پر بغیر غور کئے ایمان لے آتے ہیں۔ اب ان کے خوف اور خشیت الٰہی کا ذکر ہے کہ وہ باوجود کمال ایمان کے پھر بھی

اپنے پر اعتماد نہیں کرتے' ہم سے دعا کرتے رہتے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے کامل علماء کی ایک صفت بیان کی' یعنی بلا توقف ایمان لے آنا۔ اب ان کی دوسری صفت کا بیان ہے۔ یعنی اپنے ہدایت پر رہنے کی دعا کرنا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دو جماعتوں کا ذکر ہوا' گمراہ اور ہدایت یافتہ۔ اب رب کی طرف سے دعا کی تعلیم ہے کہ اے مسلمانو! ہم سے یہ دعا کرو کہ کہ ہمیں گمراہوں میں سے نہ کر' ہدایت پر قائم رکھ۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں انسان کی کمزوری اور مخلوق کی معذوری کا ذکر تھا کہ ان کے دماغ متشابہات تک نہیں پہنچتے۔ اب اس کی دوسری مجبوری کا ذکر ہے کہ بغیر ہمارے کرم ہدایت پر قائم نہیں رہ سکتا۔

تفسیر

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا۔ یہ جملہ یا تو رب تعالیٰ کا مقولہ ہے یا ان علمائے کرام کا۔ پہلی صورت میں یہاں قُوْلُوْا پوشیدہ ہے۔ رب تعالیٰ کو پکارنا اپنی بے کسی بے بسی کے اظہار کے لئے ہے۔ اور رب تعالیٰ کی رحمت وقدرت کے اقرار کے لئے نہ کہ غافل کو بیدار کرنے کے لئے تین چیزیں وہ ہیں جن سے دریائے رحمت جوش میں آتا ہے۔ دل کی بے قراری' زاری' اور آنکھوں کا پانی' یہ پانی کشت ایمان کے لئے ایسا ہے جیسے سوکھی کھیتی کے لئے بارش کا پانی۔ لَا تُزِغْ زَیْغ سے بنا۔ باب افعال کا نہی ہے' جس کے معنی ہیں ٹیڑھا کرنا۔ چونکہ یہاں ہدایت کے مقابلہ میں ہے اس لئے اس سے گمراہ کرنا مراد ہے۔ یعنی اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو گمراہ نہ کر دے۔ خیال رہے کہ گمراہی اور ہدایت کا محل دل ہے۔ اس لئے اسی کا ذکر فرمایا گیا اور ہدایت تین قسم کی ہے۔ ایمان کی ہدایت' عبادات کی ہدایت' معاملات کی ہدایت' ان تینوں ہدایتوں کے لاکھوں افراد ہیں۔ ایسے ہی زیغ کی تین قسمیں ہیں۔ ایمان میں زیغ' عبادات میں زیغ' معاملات میں زیغ' اور ہر قسم کے زیغ لاکھوں افراد لَا تُزِغْ میں ہر زیغ وکجی سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ہدایت فرما کر یہ بتایا کہ ہدایت صرف تیرے کرم سے ملتی ہے۔ اس میں اپنے کمال کو دخل نہیں۔ اور یہ ہدایت ہی رب تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے جو کسی کو ملتی ہے۔ بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔ بعد لَا تُزِغْ کا ظرف ہے اور ہدایت سے راہ دکھانا مراد ہے نہ کہ مقصود پہنچانا کیونکہ مقصود پر پہنچ کر بہکنا ناممکن ہے یا تو ہدایت سے مراد متشابہات پر ایمان لانا ہے تو زیغ سے مراد ہوگا ان کے پیچھے پڑنا اور اگر ہدایت سے مراد ایمان ہے تو زیغ سے مراد کفر ہوگا اور اگر اس سے مراد عام رہبری ہے تو زیغ سے مراد عام گمراہی ہوگی۔ یعنی اے مولا ہمیں ہدایت دے دے۔ گمراہ نہ کر' چونکہ طہارت نور سے پہلے ہے اس لئے دل کی طہارت کی دعا کے بعد اب نور کی دعا ہے۔ کہ وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً۔ یہ لَا تُزِغْ پر معطوف ہے۔ هَبْ هِبَةٌ کا امر ہے جس کے معنی ہیں بلا معاوضہ عطیہ۔ لَنَا اور مِنْ لَّدُنْ دونوں ھب کے متعلق ہیں اور ممکن ہے کہ مِنْ لَّدُنْ کائنۃ کے متعلق ہو کر رحمۃ کا حال ہو۔ مِنْ ابتدائیہ ہے۔ لَدُنْ کبھی عند کے معنی میں آتا ہے اور کبھی زمانی یا مکانی غایۃ کی ابتدا ہوتا ہے۔ یہ ہمیشہ مضاف ہوگا۔ کبھی مفرد کی طرف' اور کبھی جملہ اسمیہ یا فعلیہ کی طرف۔ بعض لغات میں یہ مبنی ہے مشابہت حرف کی وجہ سے اور بعض میں معرب اکثر من کے ساتھ ہی آتا ہے۔ (روح المعانی) ہر رحمت بمعنی احسان اور انعام ہے۔ اس کی تنوین تعظیمی ہے۔ اس سے مراد یا توفیق ہے' یا دین پر قائم رہنا' یا ہدایت پر اور یا متشابہات پر ایمان لانا ہے۔ مگر بہتر یہ ہے کہ ساری رحمتیں مراد ہوں کیونکہ رحمت کی بہت سی قسمیں ہیں قلب میں نور ایمانی کا آنا۔ اعضا میں نور اطاعت کا

چمکنا۔ دنیا میں رزق کی وسعت' امن' تندرستی' علم' موت کے وقت آسانی' قبر کی روشنی' منکر نکیر کے امتحان میں آسانی' قیامت کے دن گناہوں کی معافی' نیکی کا پلہ بھاری ہونا' عذاب الٰہی سے بچنا' یہ سب ہی رحمت ہیں' اور سب مراد بڑے دربار میں چھوٹی چیز کیوں مانگو' یعنی اے مولیٰ بغیر کسی احسان اور بغیر مخلوق کے واسطہ کے' ہمیں اپنی طرف سے ہر قسم کی بڑی رحمت عطا فرما۔ خیال رہے کہ مال کے عوض مال دینا تجارت یا بیع ہے۔ کام کے عوض دینا مزدوری و اجرت ہے اور بغیر معاوضہ کچھ دینا ہبہ ہے۔ اگر رب تعالیٰ کی رضا کے لئے عطا ہے تو صدقہ ہے ورنہ ہدیہ' بیع و مزدوری میں حساب سے دینا ہوتا ہے۔ مگر ہبہ میں بے حساب عطا هَبْ فرما کر عرض کیا کہ ہماری قابلیت نہ دیکھ اپنا کرم دیکھ۔ حساب سے نہ دے بے حساب دے۔ لَنَا کا لام نفع کا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ چیز دے جو تیرے علم میں ہمارے لئے خیر ہے۔ ہم تو کبھی نادانی سے بری چیزیں مانگ لیتے ہیں یا جمع فرما کر عرض کیا کہ بے منت مخلوق۔ ہم کو رحمت دے مخلوق کے واسطے والی رحمت میں دوسرے کا احسان بھی ہوتا ہے اور وہ رحمت فانی بھی ہوتی ہے۔ رحمت میں تمام رحمتیں شامل ہیں۔ لہٰذا یہ دعا بہت جامع ہے چونکہ بڑی رحمتیں مانگی تھیں' لہٰذا عرض کیا کہ اے مولیٰ یہ انعامات میرے لحاظ سے بہت بڑے ہیں مگر تیرے کرم کے مقابلہ میں حقیر ہیں کیونکہ اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ۔

اَنْتَ یا تو مبتدا ہے اور اپنی خبر وَهَّاب سے مل کر اَنَّ کی خبر۔ اور یا ضمیر فعل ہے۔ یا اسم اَنَّ کی تاکید۔ وَهَّابٌ هِبَةٌ کا مبالغہ ہے۔ یعنی بہت دینے والا۔ یعنی اے مولیٰ تو بہت ہی دینے والا ہے۔ تیرا کرم' تیری بخشش ہمارے خیال' قیاس' وہم سے بالاتر ہے۔ جو تیرے سوا ہے وہ تیری سخا ہے۔ تیرا احسان ہے' تیرا کرم ہے۔ اے قدیم الاحسان مجھ مسکین کو اپنے دروازہ سے مایوس نہ پھیر اور میری حقیر دعا کو رد نہ کر۔ مجھے اپنے فضل سے اپنی رحمت کا اہل بنا۔ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ وَ یَا اَکْرَمَ الْاَکْرَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔ چونکہ اس دعا میں دینی اور دنیوی تمام حاجتیں مانگی گئی تھیں۔ لہٰذا اب دینی حاجتوں کو مقدم رکھنے کے لئے عرض کیا جا رہا ہے۔ رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ۔ یہاں بھی یا قُوْلُوْا پوشیدہ ہے۔ یا یَقُوْلُوْنَ اور یا تو رب کا اپنا مقولہ ہے۔ یا ان علماء کا۔ جامع کے معنی جمع فرمانے والا' یہاں قیامت کا اجتماع مراد ہے۔ جیسا کہ لِیَوْمٍ سے معلوم ہو رہا ہے کیونکہ اس دن ایسا بڑا مجمع ہو گا جس کی مثال دنیا میں کبھی قائم نہ ہوئی۔ کہ از آدم تا روز قیامت کے سارے انسان ایک میدان میں بیک وقت جمع ہوں گے۔ دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا' نیز دنیا میں مجمع بہت دیر میں جمع ہوتا ہے مگر قیامت میں آناً فاناً ہو گا۔ اَلنَّاسِ سے سارے لوگ مراد ہیں۔ مکلف ہوں یا غیر مکلف' مومن ہوں یا کفار' اگرچہ وہاں ساری مخلوق جمع کی جائے گی مگر چونکہ انسان سب سے افضل ہے اس لئے اسی کا ذکر کیا گیا۔ لِیَوْمٍ کا لام یا بمعنی فی ہے یا بمعنی الیٰ۔ یا تعلیلیہ ہی ہے مگر یہاں جزا پوشیدہ یعنی لجزاء یوم۔ یَوْمٌ سے یا دن مراد ہے کیونکہ اس وقت آفتاب طلوع ہو گا اور یا وقت لَا رَیْبَ فِیْهِ یا تو یوم کی صفت ہے یا جامع الناس کی تاکید۔ ریب کے معنی ہم شروع سورہ بقرہ میں عرض کر چکے۔ فِیْهِ کی ضمیر یا یوم کی طرف لوٹتی ہے یا جمع کی طرف۔ یعنی اے پروردگار ہمیں یقین ہے کہ تو قیامت کے دن تمام لوگوں کو سزا و جزا کے لئے ایک جگہ ایک ہی وقت میں جمع فرمائے گا۔ لہٰذا ہمیں اس دن کی رحمتیں عطا فرما۔ اور یہ دعا اپنی اظہار بندگی کے لئے ہے اور اس لئے کہ ہمیں اپنے ایمان پر اعتماد نہیں۔ اس لئے نہیں کہ تجھ پر بے اعتباری ہے کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ... دعا مانگنے کی۔ نیز یا تو یہ رب کا

مقولہ ہے یا علمائے راسخین کا کلام اور ان کی دعا کا تتمہ مخلف اخلاف سے بنا جس کا مادہ خلف ہے بمعنی خلاف کرنا اور پورا نہ
کرنا۔ میعاد وعد کا مصدر میمی ہے۔ دراصل موعاد تھا واؤ ی سے بدل گیا۔ خیال رہے کہ وعدہ کے معنی ہیں خیر کا امیدوار بنانا۔
اور وعید کے معنی ہیں بلا سے ڈرانا۔ یہ میعاد بمعنی وعدہ ہے نہ کہ بمعنی وعید یعنی اللہ اپنے وعدہ کے خلاف کبھی نہیں کرتا کیونکہ وعدہ
خلافی جھوٹ ہے اور جھوٹ عیب اور جو عیب دار ہو وہ اللہ نہیں۔

خلاصہ تفسیر

علمائے ربانی سارے قرآن پر ایمان لا کر اور متشابہات کو بغیر بحث و مناظرہ کے مان کر ہم سے عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ
جب تو نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ہدایت دے دی اور اپنا راستہ دکھا دیا تو اب ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں ہدایت
کے بعد گمراہ نہ کر کیونکہ کریم فقیر کو دے کر اس سے واپس نہیں لیا کرتے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں اپنی خاص بڑی بڑی
رحمتوں سے نواز کہ ہمارے دل میں اپنی معرفت کا نور دے۔ ہمارے اعضاء سے اپنے دین کی خدمت لے۔ ہمیں دنیا میں
رزق و امن اور تندرستی دے۔ سکرات موت کو آسان کر' سوالات قبر میں سہولت فرما' ہماری قبروں کو روشن کر' قیامت کے دن
ہمارے عیبوں کو چھپا لے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے۔ میزان میں نیکیوں کا پلہ بھاری فرما دے۔ صراط پر آسانی فرما۔
خیر کی توفیق دے۔ اے مولیٰ تو بڑا دینے والا اور بڑا رحیم و کریم ہے۔ اگرچہ یہ عطائیں ہمارے لحاظ سے بہت بڑی ہیں مگر
تیرے نزدیک کچھ نہیں۔ اے مولیٰ ہمیں یقین ہے کہ تو قیامت کے دن سب کو ایک جگہ ایک وقت میں جمع فرمائے گا۔ اس دن
ہماری عیب پوشی فرمانا۔ اس مجمع میں ہماری رسوائی نہ ہو تو نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایمان دیا۔ ہدایت دی اور تو نے
مومنوں کے لئے رحمت کا وعدہ فرمایا اور تو اپنے سارے وعدے پورے فرمانے والا ہے۔ تیرے وعدوں میں خلاف کا احتمال
بھی نہیں۔ یہ دعائیں صرف اس لئے ہیں کہ ہمیں اپنے پر اعتماد نہیں کہ تیری رحمت کے اہل رہیں گے یا نہ رہیں گے تو ہی
قابلیت عطا فرمانے والا ہے اور تو ہی اس پر قائم رکھنے والا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بندہ کی ہدایت اور گمراہی رب کی طرف سے ہے۔ دونوں کا
خالق پروردگار عالم ہی ہے جیسا کہ لَا تُزِغْ اور هَدَيْتَنَا سے معلوم ہوا۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ انسان کے دل میں کفر کی طرف
جھک جانے کی بھی قابلیت ہے اور ایمان کی جانب میلان کی بھی طاقت' میلانِ کفر کو خذلان' ازاغۃ' صد اور ختم' طبع' رین' قسوۃ'
وقر اور کنان کہتے ہیں۔ یہ سارے الفاظ قرآن کریم میں وارد ہوئے اور ایمان کی طرف مائل ہونے کی توفیق' رشاد' ہدایت'
تسدید تثبیت اور عصمت وغیرہ کہتے ہیں۔ یہ سب الفاظ قرآن کریم میں آئے اور ان کے مختلف درجے ہیں۔ **دوسرا
فائدہ:** دعا کے آداب دعا میں سے یہ ہے کہ اس سے پہلے بھی حمد الٰہی ہو اس کے بعد بھی بیچ میں دعا ہو کہ حمد و درود میں گھری
ہوئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ دیکھو پہلے عرض کیا رَبَّنَا اور بعد میں کہا اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ **تیسرا فائدہ:** رب تعالیٰ کی ایسی حمد
کرے جو اپنی دعا کے [illegible] عرض کیا [illegible] لَنَا تو آخر میں کہا اَنْتَ الْوَهَّابُ۔ اگر دعا میں کہا ہے اِغْفِرْلَنَا
تو آخر میں کہے اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفَّارُ اگر کہا ہے استر عیوبنا۔ ہمارے عیب چھپا لے تو آخر میں کہے اِنَّكَ اَنْتَ

السَّتّار۔ **چوتھا فائدہ:** معصومین کا گمراہ ہونا ناممکن ہے اور جن کے دل پر کفر کی مہر لگ چکی۔ ان کا ہدایت پانا محال۔ باقی ہر شخص کے لئے دونوں باتیں ممکن بڑا متقی کافر ہو سکتا ہے اور بڑا کافر پرہیز گار' جس کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔ ہمارا دل اس ہلکے پتہ کی طرح ہے جو جنگل میں تیز ہواؤں میں گھرا ہو۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہر دل خدا کے قبضہ میں ہے۔ چاہے سیدھا رکھے اور چاہے ٹیڑھا کر دے۔ حکیم ترمذی نے بروایت عتبہ ابن عبداللہ نقل کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایمان اس قمیص کی طرح ہے جسے تو کبھی پہن لے کبھی اتار دے۔ ابن سعد نے روایت کی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے تھے۔ اے اللہ مجھے زنا سے بچا' مجھے چوری سے بچا' مجھے کفر سے بچا' کسی نے کہا کہ اے صحابی رسول اللہ (ﷺ) کیا تم اتنا خوف کرتے ہو۔ تو تین بار فرمایا اٰمَنْتُ بِحَرْفِ الْقُلُوْبِ. میں اس پر ایمان لایا جو دلوں کو پھیرنے والا ہے۔ ابو ایوب انصاری فرماتے ہیں کہ انسان پر بہت سے وقت آتے ہیں کبھی اس کے دل میں رائی برابر کفر نہیں ہوتا اور کبھی اس کے دل میں رائی برابر ایمان نہیں رہتا۔ (روح المعانی) اس لئے یہ دعا مانگنے کا حکم دیا گیا۔ **پانچواں فائدہ:** رب تعالیٰ سے جامع دعائیں مانگو۔ جس کے الفاظ تھوڑے ہوں' معانی زیادہ۔ جیسا کہ رحمۃً سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** وعدہ خلافی کرنا' جھوٹ بولنا الوہیت کے خلاف ہے۔ روح المعانی و تفسیر روح البیان اور تفسیر مدارک نے فرمایا کہ الوہیت وعدہ خلافی کے منافی ہے جو خدا میں جھوٹ کا امکان مانے وہ گویا اس میں الوہیت نہ رہنے کا امکان مانتا ہے۔ تفسیر مدارک نے فرمایا کہ جیسے کہا جاتا ہے کہ سخی وہ جو بخل نہ کرے' ایسے ہی یہاں کہا گیا کہ اللہ وہ جو وعدہ خلافی نہ کرے۔ دیو بندیوں کے قلم نے خدا کو بھی نہ چھوڑا' انہوں نے اس میں جھوٹ کا امکان مانا۔ نبی کو بے علم کہا اور خدا کو جھوٹا۔ معاذ اللہ۔ **نوٹ:** خلف وعید یعنی گناہ بخش دینے کو جھوٹ نہیں کہتے بلکہ کرم' بخشش اور احسان کہا جاتا ہے۔ انشاء اللہ اس کی بحث اعتراضات و جوابات میں آئے گی۔ **ساتواں فائدہ:** ایمان اور نیک اعمال کے وسیلہ سے دعا کرنا بہت بہتر ہے۔ دیکھو اس دعا کے ساتھ یہ بھی عرض کیا گیا۔ رَبَّنَا اِنَّکَ جَامِعُ النَّاسِ الخ۔ یعنی اے مولیٰ ہم بے دین نہیں ہیں۔ قیامت کے اور سارے ایمانیات کے معتقد ہیں۔ تیری رحمت کے تیرے فضل کے حق دار ہیں باغی نہیں ہیں۔ اطاعت شعار ہیں۔ **آٹھواں فائدہ:** دعا میں ایسے الفاظ بہتر ہیں جن کی برکت سے دریا رحمت جوش میں آئے جیسا کہ بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا. سے معلوم ہوا۔ یعنی تو نے اپنے کرم سے ہمیں ہدایت دے دی اور تو کریم ہے۔ دے کر لینا کریموں کا دستور نہیں۔ **نواں فائدہ:** مسلمان کو چاہیے کہ اپنے کو گنہگار جانے۔ اپنی خطا کا اقرار کرے مگر اپنے کو کافر' گمراہ بے دین نہ تو سمجھے اور نہ کہے۔ ہم گنہگار ہیں۔ ہمارے عمل برے مگر الحمد للہ ہمارا عقیدہ نہایت صحیح اور دین نہایت اعلیٰ۔ یہ بھی بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا سے معلوم ہوا جس میں اپنے ہدایت پر ہونے کا اظہار ہے۔ **دسواں فائدہ:** اپنی ہدایت اور ایمان کو حق تعالیٰ کا عطیہ سمجھے نہ کہ اپنی کوشش کا نتیجہ جب رحمت الٰہی دستگیری نہیں کرتی تو بڑے بڑے عقلمند بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی هَدَيْتَنَا سے معلوم ہوا کہ ہدایت کو رب تعالیٰ کی طرف نسبت کیا نہ کہ اپنی طرف۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ساری نعمتیں اور رحمتیں رب کی طرف سے ہیں پھر مِنْ لَّدُنْكَ. کیوں کہا کہ اپنی طرف سے

رحمت دے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ رب تعالیٰ کی بعض نعمتیں مخلوق کے وسیلہ سے ملتی ہیں، جنہیں مخلوق کی طرف بھی نسبت کر سکتے ہیں کہہ سکتے ہیں کہ ماں نے دودھ دیا۔ باپ نے کپڑا دیا۔ حاکم نے فیصلہ دیا۔ مالک نے تنخواہ دی اور بعض نعمتیں بلا واسطہ ملتی ہیں جیسے خیر کی توفیق نور ایمانی وغیرہ یہاں وہ رحمتیں مانگی ہیں جو بلا واسطہ ملیں۔ دوسری نعمتیں تبعاً۔ دوسرے یہ کہ بڑے دروازہ سے بڑی بھیک ملتی ہے۔ اس لئے مِنْ لَّدُنْکَ فرمایا۔ یعنی اپنے پاس سے رحمت دے جو تیرے کرم اور فضل کے لائق ہوں تیسرے یہ کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اپنا محتاج رکھ۔ کسی بندہ کا احسان مند نہ بنا۔ اگر کسی بندہ کا واسطہ بھی ہو تو اس کا احسان نہ ہو۔ **دوسرا اعتراض:** تم لوگ مانتے ہو کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن گنہگاروں کے گناہ معاف کر دے گا۔ بدکاروں کو بخشے گا اور قرآن میں خبر تھی کہ بدکاروں کی سزا جہنم ہے لہٰذا بدکاروں کو سزا نہ دینا بھی تو جھوٹ ہوا۔ جب خدا وعید کے خلاف کر سکتا ہے تو وعدہ کے بھی خلاف کر سکتا ہے جب وہ اس پر قادر ہے کہ بے نمازی کو جنت دے تو اس پر بھی قادر ہے کہ متقی کو جہنم میں بھیج دے۔ **نوٹ:** یہ اعتراض اس زمانہ کے دیوبندی کرتے ہیں مگر دراصل انہوں نے معتزلہ سے سیکھا ہے۔ معتزلہ کے نزدیک خلف وعید بھی ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک بھی آریوں کی طرح گناہوں کی معافی نہیں ہو سکتی۔ (کبیر) **جواب:** اس کے بہت جواب ہم پہلے سیپارہ میں مسئلہ امکان کذب کے ساتھ دے چکے۔ یہاں چند جواب عرض کرتے ہیں ایک یہ کہ ساری وعیدیں مشروط ہیں مگر وعدے مشروط نہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء: ۴۸) کفر کے سوا رب جو گناہ چاہے گا معاف کر دے گا۔ یعنی اگر گناہوں کی معافی نہ ہو تو سزا ملے گی۔ ورنہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ خلاف وعدہ کرنا جھوٹ ہے اور عیب اور خلف وعید کرم اور وصف ہے۔ لہٰذا یہ جائز ہے وہ ناجائز، شاعر کہتا ہے ۔

اِذَا وَعَدْتُّ سِرَّاءً اَنْجَزْ وَعْدَهٗ　　وَاِنْ اَوْعَدَ الضَّرَّاءَ فَالْعَفْوُ مَانِعُهٗ

دیکھو یہاں معافی کی صفت میں شمار کیا۔ دوسرا شاعر کہتا ہے ۔

وَاِنِّیْ وَاِنْ اَوْعَدْتُّهٗ اَوْعَدْتُّهٗ　　مُکَذِّبُ اِیْعَادِیْ وَمُنْجِزُ مَوْعِدِیْ

تیسرا یہ کہ وعید خدا کا حق ہے اور وعدہ خدا پر بندہ کا حق ہے۔ اپنا حق نہ لینا کرم اور دوسرے کا حق نہ دینا ظلم، خدا ظلم سے پاک ہے اور کریم ہے۔ چوتھا یہ کہ وعیدیں خبر نہیں بلکہ انشاء ہیں اور انشاء میں جھوٹ سچ کا احتمال نہیں ہوتا (کبیر و معانی) **تیسرا اعتراض:** یہ عجیب بات ہے کہ وعدہ کی وجہ سے رب کے ہاتھ بندہ جائیں کہ وہ نیک کار کو عذاب دینے پر قادر نہ رہے۔ امتناع کذب میں تو رب تعالیٰ کو مجبور ماننا ہے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وعدہ کر لینے کی وجہ سے رب کی قدرت ہی سلب ہو گئی وہ یہ نہیں کر سکتا کہ اس کو عذاب دے۔ **جواب:** آپ نے برعکس کہا یوں کہو کہ جس کو رب تعالیٰ عذاب دینا چاہے اس کے جنتی ہونے کی خبر نہیں دے سکتا۔ یعنی وہ اس پر قادر نہیں کہ دینا تو ہو عذاب مگر کہہ دے کہ ہم تم کو جنت دیں گے کہ ایسی گپ ہانکنا عیب قدرت نہیں۔ **چوتھا اعتراض:** حدیث شریف میں ہے کہ حضور ﷺ جنگ بدر کے بعد چاہ بدر کے کنارہ پر کھڑے ہوئے جہاں ابوجہل وغیرہ کی نعشیں پڑی تھیں اور فرمایا کیا تم نے رب کا وعدہ سچا پایا۔ دیکھو حضور ﷺ نے وعید کو وعدہ فرمایا۔ نیز قرآن پا[ک] ... جنتی جہنمیو[ں] ... کہیں گے قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا

وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا۔ (اعراف: ۴۴) اے دوزخیوں! ہم نے اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا۔ کیا تم نے بھی اپنے رب کے وعدہ کو سچا پایا۔ دیکھو یہاں وعدہ اور وعید دونوں کو وعدہ کہا گیا۔ معلوم ہوا کہ دونوں کا یکساں حال ہے۔ (معتزلہ و دیوبندی)
نوٹ: دیوبندی معتزلہ کے بالکل مقابل ہیں کہ انہوں نے وعید کی مخالفت بھی ناممکن مانی اور انہوں نے وعدہ کی مخالفت بھی جائز مانی۔ ان میں افراط تھی۔ ان میں تفریط مذہب اہلسنت درمیانی ہے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اس وعید کو وعدہ کہنا استہزاءً ہے۔ جیسے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ (آل عمران: ۲۱) جیسے ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ۔ (الدخان: ۴۹) دوسرا یہ کہ یہ وعید لازم ہونے میں وعدہ کی طرح ہے کیونکہ کفار کا عذاب یقینی ہے ان کی بخشش ناممکن۔ یہ سارا اختلاف گنہگار مسلمانوں کی بخشش کے بارے میں ہے۔

تفسیر صوفیانہ

خالق پر نظر ہونا ہدایت ہے۔ اور اس سے ہٹ کر مخلوق پر توجہ کرنا زیغ یعنی کجی نیز رب کی بارگاہ میں جانا صراط مستقیم ہے اور ادھر سے ہٹ کر دنیا طلبی میں پھنسنا زیغ عرض کیا گیا۔ کہ مولیٰ ہم عالم ارواح میں تیری بارگاہ میں تھے، تجھ ہی کو جانتے تھے۔ ماسوا سے بے خبر تھے۔ تیرا ہی دروازہ دیکھا تھا اور دروازوں کو جانتے بھی نہ تھے۔ جب اس عالم میں آئے اور وہ طائر روح اس جسم کے پنجرے میں قید کیا گیا تو پہلے ہی ہمارے کان میں اذان کی آواز پہنچی، اے مولیٰ جب تو نے ہمیں، عالم ارواح میں اپنا دربار دکھا دیا اور عالم اجسام میں مسلمان بنا کر سیدھے راستہ پر ڈال دیا۔ تو اب اس دنیا میں پھنسا کر نفس و شیطان کو ہم پر غالب کر کے یہاں کی لذتوں سے خبر دے کر ہمارے دل اس راستہ سے ٹیڑھے مت کر۔ یہ کائنات ہمارے حجاب نہ بنے بلکہ تیرے جمال کے آئینے ہو جائیں کہ ہر چیز میں تجھ ہی کو دیکھیں۔ اے مولیٰ ہم تاریکی ہیں۔ تو نور، ہم شبنم ہیں۔ تیرا کرم آفتاب، ہم تیمم ہیں اور تیرے انعام آب رحمت ہم مشت خاک ہیں اور تیرا فضل نسیم۔ اے مولیٰ ہمیں اپنی خاص رحمت عطا فرما کہ ہماری صفات کو اپنی صفات سے محو فرما دے۔ ہماری ظلمتوں کو اپنے نور سے ہٹا دے۔ ہمارے غبار کو اپنی رحمت کے جھونکے سے اڑا دے۔ مولینا فرماتے ہیں ۔

يَا خَفِيَّ الذَّاتِ مَحْسُوْسَ الْعَطَا　　اَنْتَ كَالْمَاءِ وَ نَحْنُ كَالرَّحٰى
اَنْتَ كَالرِّيْحِ وَنَحْنُ كَالْغُبَارِ　　يَخْتَفِيُ الرِّيْحُ وَغَبْرَاهُ جِهَارٌ

اعلیٰ حضرت قدس سرہ العزیز نے فرمایا۔

آب آمدوہ کہے اور میں تیمم برخاست　　مشت خاک اپنی ہو اور نور کا اہلا تیرا

تو بڑا دینے والا ہے، تو ہی دیتا ہے اور تو ہی لینے کی قابلیت بھی عطا فرماتا ہے۔ اے مولیٰ ہمیں خبر ہے کہ ایک دن وہ آئے گا جب پردہ اٹھے گا۔ آفتاب حقیقت کا نور ظلمتِ مجاز کو کافور کر دے گا۔ اس دن سب حسب مراتب اپنے اپنے مقام پر جمع ہوں گے اور یہ کثرت وحدت پر پہنچے گی۔ تیرا وعدہ سچا ہے۔ اس میں خلاف کا احتمال نہیں۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ دنیا کے دنوں کا آنا بھی مشکوک ہے اور ہمارا پانا بھی مشکوک کیا خبر اس سال سردی کا موسم آئے گا یا نہیں ممکن ہے قیامت ہی آ جائے اور اگر آیا بھی تو کیا خبر ہم پائیں گے یا نہیں ممکن ہے۔ ہم پہلے ہی مرجائیں مگر قیامت کا آنا بھی یقینی اور ہمارا اسے پانا بھی ضروری۔ جس کے

متعلق فرمایا لَا رَیْبَ فِیْهِ مگر افسوس ہے کہ ہم کو ان مشکوک دنوں کی فکر بھی ہے اور ان کی تیاری بھی۔ بارش سے پہلے مکان بناتے ہیں۔ سردی آنے سے پہلے اس کے لباس بناتے ہیں مگر اس یقینی دن کی نہ فکر نہ تیاری۔ اگر ہم اس دن کی فکر و تیاری کریں تو رب تعالیٰ ان فکروں سے آزاد کردے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْــٴًـاؕ
تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہرگز نہ دفع کرے گی ان سے مال ان کے اور نہ اولاد ان کی طرف اللہ کے کسی چیز کو
بے شک وہ جو کافر ہوئے ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ سے انہیں کچھ نہ بچا سکیں گے
وَاُولٰٓىٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِۙ ﴿۱۰﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْؕ
اور یہ لوگ وہ ایندھن ہیں آگ کے مثل طریقہ اہل فرعون کے اور ان کے جو پہلے سے تھے ان کے
اور وہ ہی دوزخ کے ایندھن ہیں جیسے فرعون والوں اور ان سے اگلوں کا طریقہ
كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْؕ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾
جھٹلایا انہوں نے نشانیوں کو ہماری پس پکڑا ان کو اللہ نے بوجہ گناہوں ان کے اور اللہ سخت عذاب والا ہے
انہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں تو اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑا اور اللہ کا عذاب سخت ہے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** قرآن کریم کا دستور ہے کہ ایمان کے ساتھ کفر کا' مسلمانوں کے ساتھ کفار کا' نور کے ساتھ تاریکی کا ذکر فرماتا ہے تاکہ انسان مومنوں کی صفتیں حاصل کرے اور کفار کے عیوب سے بچے۔ چنانچہ اب تک مسلمانوں خصوصاً علماء کے اوصاف بیان فرمائے گئے۔ اب کفار کے عیوب کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مسلمانوں کی دعا' ان کی عاجزی وزاری کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ اب کفار کی سخت دلی اور رب تعالیٰ سے بے پرواہی کا ذکر ہے کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی اولاد و مال تو کیا خود اپنے پر بھی اعتماد نہیں کہ وہ نیکیاں کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں اور رب تعالیٰ سے دعائے استقامت مانگتے ہیں۔ اب کفار کا ذکر ہے کہ وہ اس کے برخلاف اپنے مال اور اولاد پر بھروسہ کر کے رب سے بے پرواہ رہتے ہیں مسلمانوں کا وہ خوف ہی ان کی مقبولیت کا ذریعہ ہے اور کفار کی یہ بے خوفی ان کی مردودیت کا سبب۔

تفسیر

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے سارے کفار مراد ہیں۔ خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین مگر بعض نے کہا کہ اس سے فقط وہ نجرانی عیسائی مراد ہیں جو اپنی آمدنی بند ہو جانے کے خوف سے اسلام قبول نہ کرتے تھے۔ (معانی) عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس سے مرا[illegible] کافروں کے لئے ہے۔ کفر کی صدہا

قسمیں ہیں۔ كَفَرُوْا میں ہر قسم کے کافر مراد ہیں جو چیزیں حضور ﷺ رب تعالیٰ کی طرف سے لائے ان سب کا ماننا ایمان ہے۔ اور ان میں سے ایک کا انکار کفر۔ كَفَرُوْا سے مراد ہے کہ کفر پر مرگئے انہیں کی یہ سزا ہے جو زندگی بھر کافر رہے مرتے وقت مومن ہو گئے۔ ایمان پر خاتمہ ہوا۔ وہ تمام رحمتوں کے مستحق ہیں جیسا کہ فرعون کے جادوگروں کا حال ہوا۔ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔ تُغْنِيَ غنا سے بنا' بمعنی کفایت اور بے پرواہی اور دفع کرنا۔ جب اس کے بعد عن آتا ہے تو اکثر دفع کرنے کے معنی دیتا ہے۔ جیسے مَا اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ۔ اور بغیر عن کے کبھی بمعنی کفایت ہوتا ہے اور کبھی بمعنی بے پرواہی۔ جیسے اِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (بقرہ: ۲۶۷) اور اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ (التوبہ: ۷۴) اموال مال کی جمع ہے اس سے سارے جمع کئے ہوئے مال مراد ہیں۔ خواہ مرنے پر خرچ کئے ہوں خواہ اولاد کے لئے چھوڑے ہوں۔ پھر خواہ اللہ کے راہ میں خرچ کئے ہو۔ یا اپنے کھانے پینے میں' یا اپنے کاروبار میں۔ خواہ خود کمائے ہوں یا کسی کے مال میراث سے حاصل کئے ہوں چونکہ مال بہت سی قسم کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے اموال جمع فرمایا۔ اولاد ولد کی جمع۔ ولد بیٹی' بیٹا دونوں کو کہتے ہیں مگر یہاں بیٹے مراد ہیں کیونکہ مصیبت میں بیٹے ہی کام آتے ہیں نہ کہ بیٹیاں۔ نیز چونکہ انسان مصیبت میں پہلے مال خرچ کرتا ہے پھر اولاد۔ اسی لئے یہاں پہلے مال کا ذکر ہوا۔ اور بعد میں اولاد کا۔ مِنَ اللّٰهِ میں یا تو مِنْ کے بعد عذاب پوشیدہ ہے اور یہ لَنْ تُغْنِيَ کے متعلق اور مِنْ ابتدائیہ اور شَيْئًا لَنْ تُغْنِيَ کا مفعول مطلق یعنی شیئا من الاغناء اور ممکن ہے کہ شیئا مفعول بہ ہو۔ اور مِنَ اللّٰهِ اس کا حال مقدم اور من تبعیضیہ (روح المعانی) تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں مِنْ بمعنی عند ہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ من بمعنی بدلہ ہے اور اللہ سے پہلے رحمت یا اطاعت پوشیدہ (معانی) یعنی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم وغیرہ کا انکار کیا۔ ان کے مال اور ان کی اولاد خدا کی طرف سے آئے ہوئے عذاب کو ان سے ہرگز دفعہ نہ کر سکیں گے یا ان کے مال واولاد رحمت الٰہی کے عوض نہ بنیں گے اور اتنا ہی نہیں بلکہ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ وقود کی تحقیق ہم پہلے سپارہ میں وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (بقرہ: ۲۴) کے ماتحت کر چکے۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اس لفظ کی دو قرأتیں ہیں۔ وَقُوْدُ واؤ کے زبر سے اور وُقُوْدُ واؤ کے پیش سے یہ مصدر بھی آتا ہے اور بمعنی ایندھن بھی۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں بمعنی ایندھن ہے اور ممکن ہے کہ بمعنی مصدر ہو اور اس کے پہلے اہل پوشیدہ ہو۔ یہ هُمْ کی خبر ہے یا اُولٰٓئِكَ کی اور هم ضمیر فصل۔ خیال رہے کہ عذاب دو قسم کا ہے۔ ایک نفع بخش چیزوں کا بیکار ہو جانا اور دوسرا تکلیف دہ چیزوں کا جمع ہو جانا اس لئے ان کے لئے رب نے دونوں عذاب جمع فرمادیئے پہلے کا ذکر لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ میں ہوا اور دوسرے کا ذکر اُولٰٓئِكَ الخ سے ہو رہا ہے' یعنی ان کو اسباب خیر کام نہ آئیں گے اور وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے جیسے آگ لکڑی کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ ایسے ہی ان کے رگ رگ میں جہنم کی آگ بھڑک جائے گی۔ نیز دوسری چیزیں آگ میں پکنے گلنے کو رکھی جاتی ہیں کہ پک کر گل کر نکال لی جاتی ہیں مگر ایندھن آگ میں جلنے کو جاتا ہے کہ وہاں سے نکالا نہیں جاتا۔ وہاں ہی جل کر راکھ ہو جاتا ہے روٹی پک کر سونا گل کر آگ سے نکال لیا جاتا ہے مگر کوئلہ وہاں ہی رہتا ہے۔ ایسے ہی مومن دوزخ سے نکال لئے جائیں گے۔ کافر وہاں ہی رہیں گے۔ اس لئے انہیں وَقُوْد فرمایا۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ یہ عبارت ثابت پوشیدہ کے متعلق ہو کر دأبهم کی خبر ہے۔ دَاْب کے چند معنے ہیں۔ کوشش کرنا' دور لگانا' تھک جانا' عادت' شان' دائمی حالت رب فرماتا ہے

سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا (یوسف:۴۷) بمعنی حالت دائمی اہل عرب کہتے ہیں۔ ھٰذَا دَاْبُ فُلَانٍ۔ یہ فلانے کی عادت ہوگئی۔ یہ نصر ینصر سے ہے۔ داب یدوب دوبًا ودابًا۔ یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں اور ہر معنے کا الگ لطف ہے۔ (کبیر) آل اصل میں اہل تھا۔ بمعنی والا جیسے اہل علم' علم والا' اہل مال' مال والا اصطلاح میں بال بچوں گھر میں رہنے والوں اور متبعین کو آل کہا جاتا ہے یہاں آخری معنی مراد ہیں۔ یعنی فرعون کے پیرو کار کیونکہ فرعون لا ولد تھا اور اس کی بیوی حضرت آسیہ مومنہ تھیں ان پر عذاب کیوں آتا۔ اس کے سپاہی اور اس کے ساتھی اس عذاب میں مبتلا ہوئے۔ لفظ فرعون کی نہایت نفیس تحقیق اور اس کی مکمل تاریخ ہم پہلے سیپارہ میں کر چکے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ میں واؤ عاطفہ ہے اور اَلَّذِیْنَ آل پر معطوف۔ مِنْ ثبتوا فعل مقدر کا متعلق ہے اور قَبْلِهِمْ کا مرجع آل کیونکہ وہ بڑی جماعت تھی۔ اور اس سے فرعون سے پہلے دیگر امتوں کے کفار مراد ہیں۔ اور ہوسکتا ہے کہ هُمْ کا مرجع کفار عرب ہوں جن کا ذکر اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا میں ہو چکا اب اس کے معانی سنو۔ (۱) ان کفار عرب کی حالت اور سرکشی فرعونیوں اور اس سے پہلے والے کفار کی سرکشی کی طرح ہے۔ (۲) کفار عرب کی عادت فرعونیوں کی سی ہے۔ (۳) کفار عرب کا جہنم کا ایندھن بننا اور ان کا مال واولاد کام نہ آنا۔ فرعونیوں کی طرح ہے کہ جب وہ ڈوبا تو اسے کچھ کام نہ آیا (۴) کفار عرب کا جہنم میں ہمیشہ رہنا فرعون کی طرح ہے (۵) کفار عرب کی اسلام کے مقابلہ میں کوشش فرعونیوں کی کوشش کی طرح ہے۔ جیسے ان کی کوشش موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں بے کار رہی تھی۔ ایسے ہی ان کی مشقتیں آپ کے مقابلہ میں بے کار رہیں گے۔ (۶) ان کی اخروی مصیبت فرعونیوں کی مصیبت کی طرح ہے۔ جیسے فرعونیوں پر قیامت تک عذاب پیش ہو رہا ہے۔ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا۔ (مومن:۴۶) اور قیامت میں وہ سخت عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (مومن:۴۶) ایسے ہی ان کا حال ہوگا۔ خیال رہے کہ ان سب معنی میں آل فرعون داب کا فاعل تھی۔ اور ہوسکتا ہے کہ داب کا مفعول ہو اور اس کا فاعل یعنی لفظ اللہ پوشیدہ ہو کہ کداب اللہ آل فرعون اور یہ اضافت مصدر کی مفعول کی طرف ہو۔ یعنی اللہ کا معاملہ اہل عرب کے ساتھ ایسا ہی ہوگا جیسا اس کا معاملہ فرعونیوں سے ہوا (تفسیر کبیر و معانی وغیرہ) خلاصہ یہ ہے کہ کفار عرب مشبہ ہیں اور آل فرعون مشبہ بہ وجہ شبہ میں بہت سے احتمالات ہیں۔ ہر احتمال کے ماتحت بہت سے فوائد ہیں۔ اس لئے یہ آیہ کریمہ بہت جامع آیت ہے۔ خیال رہے کہ کاف۔ کَما مثل وغیرہ تشبیہ کے لئے آتے ہیں اور قریب المعنی ہیں اور مِنْ قَبْلِهِمْ سے یا تو فرعون سے پہلے کفار مراد ہیں جیسے قوم نوح وثمود ولوط وغیرہ اور یا قریش سے پہلے کفار عیسائی وغیرہ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ یہ داب کا بیان ہے۔ جھٹلانا دل سے بھی ہوتا ہے زبان سے بھی اور عمل سے بھی نہ ماننا دلی تکذیب ہے۔ زبان سے انکار قولی تکذیب ہے۔ عمل تعلیم کے خلاف کرنا عملی تکذیب ہے' یہاں ہر قسم کی تکذیب مراد ہے کہ وہ لوگ ہر طرح جھٹلاتے تھے۔ آج ہم لوگ دلی وزبانی تکذیب تو نہیں کرتے مگر عملی تکذیب میں گرفتار ہیں اور آیات سے یا تو آسمانی کتابوں کی آیتیں مراد ہیں یا پچھلے نبیوں کے معجزے یعنی ان سب نے ہماری آیتوں کو یا ہمارے بھیجے ہوئے معجزات کو جھٹلایا مگر آخری دو معنی زیادہ قوی ہیں کیونکہ فرعونیوں کے پاس کسی آسمانی کتاب کی آیات نہیں آئیں توریت اس کی ہلاکت کے بعد آئی باقی توریت' انجیل' زبور تو بہت بعد کی کتابیں ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آیات سے مراد انبیاء کرام کی ذوات ہوں کہ وہ حضرات مجسم آیات الہیہ ہیں۔ تو اس کا انجام یہ ہوا۔ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ۔ یہ جملہ اللہ کے معاملہ کی تفسیر ہے۔ اخذ کے

معنی پکڑنا ہیں مگر یہاں عذاب دینا مراد ہے۔ ھُمْ کا مرجع فرعونی اور سارے کفار ہیں۔ ب سببیہ ہے اور ذنوب ذنب سے بنا۔ بمعنی تابع اور پیچھے لگنے والا۔ اس لئے دم کو ذنب کہتے ہیں۔ گناہ کو بھی اس لئے ذنب کہتے ہیں کہ وہ اپنے کرنے والے کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ (معانی وروح) تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اصطلاح میں ہر اس فعل کو ذنب کہتے ہیں جس کا نتیجہ ناگوار ہو۔ لسان العرب میں ہے۔ الذنب' الاثم والجرم والمعصیۃ' کہ ذنب اثم اور جرم اور معصیت سب کو کہتے ہیں۔ جو ثواب سے روکے وہ اثم ہے اور جو رب سے تعلق قطع کر دے وہ جرم۔ جرم' قطع اور معصیت نافرمانی کو کہتے ہیں خواہ جان بوجھ کر ہو یا بھول چوک سے معلوم ہوا کہ لفظ ذنب زبان عرب میں بہت وسیع ہے۔ کبھی اس کام کو ذنب کہہ دیتے ہیں جو حقیقت میں گناہ نہ ہوگا مگر اس کا انجام ناگوار ہو اور غلطی کو بھی ذنب کہہ دیا جاتا ہے۔ اس کا بہتر ترجمہ قصور ہے۔ بڑے گناہ کو بھی ذنب کہہ دیتے ہیں اور چھوٹی سی غلطی کو بھی یہاں بڑے بڑے گناہ جیسے کفر بت پرستی' انبیائے کرام کا قتل' ان کی مخالفتیں سب مراد ہیں کیونکہ انہوں نے یہ سارے گناہ کئے تھے۔ اس لئے یہاں جمع ارشاد ہوا۔ یعنی ان سب کو اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور کیوں نہ پکڑتا۔ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ اللہ سخت عذاب والا ہے۔ عقاب عقب سے بنا۔ بمعنی پیچھے' اسی لئے ایڑی کو عقب کہتے ہیں کہ وہ پیچھے ہوتی ہے ہم عتاب عذاب اور عقاب کا فرق پہلے سیپارہ میں بیان کر چکے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ کفار اپنے مال' اولاد کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ کفر کی وجہ سے جو ہم پر عذاب آئے گا اسے ہم دنیوی مصیبتوں کی طرح اپنے مال' اولاد کے ذریعہ ٹال دیں گے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے۔ کفار پر جب کفر کی وجہ سے عذاب الہی آئے گا تو ان کے مال اولاد سب بے کار ثابت ہوں گے۔ وہ اللہ کی بھیجی مصیبت کو دفع نہیں کر سکیں گے اور یہ لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ جیسے ایندھن کی رگ وریشہ میں آگ سرایت کر جاتی ہے۔ ایسے ہی ان کے رگ وریشہ میں جہنم کی آگ بھڑکے گی۔ اسلام کے مقابلہ میں ان کی ناکام کوشش ایسی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعونیوں کی کوشش تھی یا ان پر کفر کا وبال ایسا آئے گا جیسے فرعونیوں اور ان سے پہلے والے کافروں پر آیا کہ وہ ان سے بڑھ کر مالدار اور صاحب اولاد تھے مگر جب عذاب آیا تو کوئی چیز ان کے کام نہ آئی۔ انہوں نے ہماری آیتوں' نشانیوں' انبیاء کے معجزات کو جھٹلایا' ان کو ایذائیں پہنچائیں۔ پہلے تو رب نے انہیں مہلت دی۔ پھر جب ان کا پیالہ گناہوں سے بھر گیا تو سارے گناہوں کے عوض رب نے اچانک انہیں پکڑ لیا۔ اللہ سخت عذاب والا ہے۔ اس کے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ایسے ہی ان کا حال ہوگا۔ جب جرم یکساں ہے تو عذاب کیوں نہ یکساں ہو۔ خیال رہے کہ رب کی پکڑ جلد نہیں ہوتی۔ بہت مہلت ملتی ہے کہ بندہ سنبھل جائے مگر جب بندہ رب کے حلم سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے تب پکڑا جاتا ہے۔ فرعون دعویٰ خدائی کرتا رہا' بچے ذبح کرتا رہا مگر سر میں درد بھی نہ ہوا جب پیالہ بھر گیا تو پکڑ لیا۔ آیا ایسے ہی کفار عرب رب کی ڈھیل سے دھوکہ نہ کھائیں بلکہ جلد سنبھل جائیں ورنہ مارے جائیں گے۔ اللہ کی چکی دیر میں پیستی ہے مگر بہت باریک پیستی ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے [illegible] پہلا فائدہ [illegible] آخرت میں [illegible] مال [illegible] کا کام نہ آنا اور ان کے ذریعہ عذاب الہی

دفعہ نہ ہونا کفار کیلئے ہے۔ انشاء اللہ مسلمانوں کا مال بھی کام آئیگا اور اولاد بھی اور انکے ذریعہ عذاب الٰہی دفع بھی ہوگا۔ جیسا اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے معلوم ہوا۔ مسلمانوں کے صدقے آخرت میں کارآمد ہیں' اولاد کی نیکیوں سے ماں باپ کی نجات ہے۔ یہ آیت اس حدیث کی شرح ہے کہ حضور انور ﷺ نے فرمایا اے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا میں تم سے عذاب الٰہی دفع نہیں کر سکتا۔ اس آیۃ نے بتایا کہ وہاں مقصد یہ ہے کہ اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا تو عذاب دفع نہیں کر سکتے۔ ورنہ حضور انور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری شفاعت بڑے گناہ کبیرہ والے امتی کو پہنچے گی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ امتی کی مدد فرمائیں اور اپنی بیٹی کے کام نہ آئیں۔ **دوسرا فائدہ:** کفار کو ان کے سارے گناہوں کا عذاب دیا جائے گا۔ کسی گناہ کی معافی نہ ہوگی اور نیکیاں ساری برباد ہوں گی جیسا کہ بِذُنُوْبِهِمْ سے معلوم ہوا۔ مسلمانوں کی نیکیاں ساری محفوظ۔ گناہ یا تو بالکل معاف یا کچھ معاف' کفار کی نیکیاں ساری برباد اور گناہ سب محفوظ۔ **تیسرا فائدہ:** متبعین اور پیرو کار کو آل کہہ سکتے ہیں۔ اگر چہ وہ اس کا رشتہ دار نہ ہو۔ دیکھو فرعون کے سپاہیوں کو آل فرعون کہا گیا۔ نافرمان اور باغی آل کہلانے کا مستحق نہیں۔ اگر چہ رشتہ دار ہو کنعان نوح علیہ السلام کا بیٹا تھا مگر چونکہ کافر تھا۔ اس لئے فرمایا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ (ھود:۴۶) اس معنی سے حضور علیہ السلام کی ساری امت حضور کی آل ہے۔ اور شیعہ' دیوبندی' مرزائی وغیرہ حضور ﷺ کی آل نہیں اگر چہ وہ اپنے کو سید ہی کہتے ہوں۔ **چوتھا فائدہ:** انبیائے کرام کی مخالفت پر عذاب الٰہی آتا ہے۔ دیکھو فرعون نے دعویٰ خدائی کیا۔ اس پر عذاب نہ آیا۔ جب تک کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ نہ کیا۔ فرمایا گیا كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ۔ ف سے معلوم ہوا کہ آیات الٰہی کی تکذیب یعنی انبیائے کرام کی مخالفت سبب عذاب بنی۔ **پانچواں فائدہ:** کفار کا آپس میں نکاح درست ہے اور اس نکاح کی اولاد حلال ہے نہ کہ حرامی دیکھو یہاں ارشاد ہوا۔ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ۔ ان کافروں کی اولاد اگر ان کے نکاح صحیح نہ ہوتے تو یہ بچے حرامی ہونے کی وجہ سے ان کی اولاد نہ کہلاتے۔ **چھٹا فائدہ:** پچھلے کافروں کے حالات ان کے بربادی کے واقعات معلوم کرنا بھی ضروری ہیں تاکہ عبرت حاصل ہو۔ دیکھو قرآن کریم نے عبرت کے لئے آل فرعون اور پچھلے کفار کا حوالہ دیا۔ **ساتواں فائدہ:** سارے کافر اس لحاظ سے برابر ہیں کہ ان کے مال' اولاد کام نہ آئیں گے۔ خواہ رب کے منکر ہوں یا اس کی صفت کے یا پیغمبر کے یا کسی اور ایمانی عقیدہ کے۔ جیسا کہ کَفَرُوْا کے عموم اور آل فرعون اور پچھلے کافروں کے حوالہ دینے سے معلوم ہوا۔ دیکھو کفار مکہ دعویٰ خدائی نہ کرتے تھے مگر انہیں فرعون کا عذاب یاد دلایا گیا جو مدعی الوہیت تھا۔ **آٹھواں فائدہ:** کافر پر احکام شرعیہ لازم ہیں۔ یعنی وہ ایمان لا کر نماز پڑھے' روزے رکھے' اگر نہ کرے گا تو اسے کفر کے ساتھ اس پر بھی سزا دی جائے گی۔ یہاں فرمایا گیا۔ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ۔ کسی گناہ کی تخصیص نہ فرمائی گئی۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ جنتی دوزخی کفار سے پوچھیں گے۔ مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ۔ (مدثر:۴۲) تمہیں جہنم میں کون چیز لائی۔ وہ عرض کریں گے۔ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (مدثر:۴۶) ہم نماز نہ پڑھتے تھے۔ ہم زکوٰۃ نہ دیتے تھے۔ ہم اسلام کا مذاق اڑاتے اور قیامت کو جھٹلاتے تھے۔ انہوں نے کفر کے ساتھ بدعملی کو بھی سبب عذاب بتایا مگر یہ آخرت کے اعتبار سے ہے۔ دنیا میں نہیں۔ اسی لئے کافر کو زمانہ کفر کی نمازیں قضا نہ کرنی پڑیں گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں ہے کہ صرف کفار ہی جہنم کا ایندھن ہیں۔ اور وہ ہی جہنم میں جائیں گے جیسا کہ ھم کے حصر سے معلوم ہوا' حالانکہ حدیث شریف سے ثابت ہے کہ گنہگار مسلمان بھی کچھ دن جہنم میں رہیں گے۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ جہنم صرف کفار کی خاطر بنی ہے۔ مسلمانوں کا جانا ان کی طفیل ہے کہ جو مسلمان کافروں جیسے کام کریں' یا مسلمانوں کے مقابل ان سے الفت و محبت رکھیں۔ وہ ان ہی کے ساتھ دوزخ میں جائیں۔ لہٰذا جہنم کے ایندھن وہ ہی ہوئے۔ جیسے لکڑی کے ساتھ کا کیڑا بھی آگ میں پہنچ جائے۔ وہ آگ کا ایندھن نہیں۔ یہاں ایندھن ہونے کا حصر ہے نہ کہ جانے کا۔ دوسرا یہ کہ آگ میں جانا دو طرح ہے۔ لوہار کی بھٹی میں لوہا بھی جاتا ہے اور کوئلہ بھی رکھا جاتا ہے مگر کوئلہ اس کا ایندھن ہے اور لوہا کچھ دیر کے لئے صاف ہونے گیا ہے۔ پھر نکال لیا جائے گا۔ یونہی کفار وہاں کے ایندھن ہیں اور مسلمان گناہوں کا میل اتارنے جائیں گے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے کفار آگ ہی میں جائیں گے تو دوزخ کے ٹھنڈے طبقوں میں کون جائے گا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں کفروا سے وہ خاص کفار مراد ہیں جن کے بارے میں یہ آیت آئی کہ یہ کفار آگ میں جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ نار سے مراد دوزخ ہیں جز بول کر کل مراد لیا گیا۔ تیسرا یہ کہ دوزخ کی ٹھنڈک بھی آگ کی وجہ سے ہوگی جو طبقے آگ سے قریب ہیں وہ گرم اور جو دور ہیں وہ ٹھنڈے۔ جیسے دنیا کی سردی گرمی سورج کی وجہ سے ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار سے عذاب دفع نہ ہوگا۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ابو طالب کا عذاب ہلکا ہے۔ حضور انور ﷺ کی خدمت کے باعث اور ابولہب کا عذاب سوموار کو ہلکا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی ولادت کی خوشی کے باعث (بخاری شریف) تو اس آیت اور ان احادیث میں موافقت کیونکر ہو؟ **جواب:** ان احادیث میں عذاب ہلکے ہونے کا ذکر ہے اور اس آیۃ میں عذاب دفع ہونے کی نفی ہے۔ تخفیف عذاب اور ہے اور دفع عذاب کچھ اور۔ تخفیف کا ثبوت ہے' دفع کی نفی لہٰذا آیت و حدیث میں تعارض نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

مسلمان کے مال و اولاد قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں اور اس کے لئے باعث ثواب۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بیوی بچوں کو پالنا عبادت ہے۔ حتیٰ کہ بیوی کے منہ میں لقمہ دینا عبادت اس سے صحبت کرنا ثواب' کیونکہ مسلمان کو ان سے دلی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ ان کی خدمت اس لئے کرتا ہے کہ رب تعالیٰ کا حکم ہے۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں اس لئے کہ جمال الٰہی کا آئینہ ہیں لیکن کفار ان کی اولاد و مال ان کے لئے سبب حجاب ہیں۔ اور رب سے دوری کا ذریعہ' کیونکہ اسے ان چیزوں سے دلی تعلق ہے اور یہ ہی اس کے حقیقی محبوب' لہٰذا یہ چیزیں اسے عذاب سے بچاتیں۔ تو کیا اور عذاب بڑھائیں گی۔ دیکھو فرعون اور فرعونیوں کا سارا مال و اسباب ذریعہ عذاب بنا۔ (ابن عربی) اس کی مثال یوں سمجھو کہ پریس میں ایک پلیٹ پر قرآن ہے اور دوسری پلیٹ پر باغیانہ مضمون' قرآن والی پلیٹ سے جو کاغذ چھپے گا وہ قرآن بنے گا۔ خواہ ہلکا ہو یا وزنی اور دوسری پلیٹ سے جو کچھ چھپے گا وہ باغیانہ کتاب ہوگی۔ اس کاغذ کا بلا وضو چھونا ناجائز' اور ناپاکی کی حالت میں پڑھنا حرام۔ نیز اس کا ہر جگہ ادب و احترام مگر اس کاغذ

کا چھپانا جرم رکھنا بغاوت شائع کرنا باعث سزا۔ قرآن میں فرعون کا نام آ جائے' یا ہامان کا' یا ابولہب کا آ جائے یا شیطان کا وہ قابل تعظیم ہے کہ اس کے پڑھنے پر ثواب اور اس کو بلا وضو چھونا گناہ کہ اگرچہ وہ لوگ خبیث تھے مگر یہ الفاظ تو جزو قرآن ہیں۔ ان پر قرآن کے احکام جاری مگر باغیانہ کتاب میں بادشاہ کا نام آ جائے۔ یا وزیر کا' فقیر کا آ جائے یا امیر کا کچھ معظم نہیں۔ حکومت سب کو جلوا دے گی۔ یہ ہی حال کفار اور ان کے مال کا ہے۔ کفار باغیانہ مضمون کی پلیٹ ہیں۔ جو چیز ان سے قرب حقیقی رکھے وہ خدا کا عذاب ہے۔ مسلمان رحمت الٰہی کے پلیٹ ہیں جو چیز ان کے پاس آئے وہ رحمت۔ غور تو کرو کہ قیامت میں چاند' سورج' تارے' کفار کے بت سب ہی جہنم میں جائیں گے۔ بولو ان بے چاروں نے کونسا گناہ کیا تھا مگر کفار نے ان سے تعلق رکھا۔ ان کا بیڑا غرق کیا۔ اصحاب کہف کا کتا' صالح علیہ السلام کی اونٹنی وغیرہ جنت میں جائیں گے۔ بتاؤ انہوں نے کون سی نیکی کی تھی' صرف یہ کہ وہ نیکوں کے پاس رہے تھے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ بے دین مولوی کے علم کی مثال ایسی ہے جیسے سامری کا بچھڑا' سامری نے فرعونیوں کے سونے سے بچھڑا بنایا اور اس کے منہ میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے گھوڑے کی ٹاپ کے نیچے کی خاک ڈالی جو نہایت طیب و طاہر تھی۔ اس خاک کے اثر سے اس میں آواز پیدا ہوئی۔ اس آواز نے ہزاروں اسرائیلیوں کو گمراہ کر دیا۔ اگر یہ خاک کسی اللہ والے کے منہ میں جاتی تو نہ معلوم کیا تاثیر دکھاتی۔ خاک تو اشرف تھی مگر وہ سونا خبیث کا تھا۔ ایسے ہی بے دین عالم کا حال ہے کہ اس کا قلب گویا فرعونی ہوتا ہے اس کا علم گویا وہ جبریلی خاک۔ اس علم کے ذریعہ وہ جو بولتا ہے اس سے ہزاروں گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کا علم' اس کی عبادات' اس کے رکوع' سجدے' اس کی قرآن خوانی' اس کا مال و اسباب' سب جہنم کے ایندھن ہیں۔ فرعون کے ساتھ اس کا گھوڑا' اس کا لباس' اور باقی ساز و سامان سب ہی ڈوبا۔ اللہ علم کے ساتھ ایمان بھی عطا فرمائے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

فرما دو واسطے ان کے جنہوں نے کفر کیا عنقریب مغلوب ہو گے تم اور جمع کیے جاؤ گے طرف دوزخ کی اور برا ہے وہ بستر

فرما دو کافروں سے کوئی دم جاتا ہے کہ مغلوب ہو گے اور دوزخ کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ بہت ہی برا بچھونا

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى

بیشک ہے واسطے تمہارے نشانی بیچ دو جماعتوں کے جن میں ایک جماعت جنگ کرتی ہے بیچ راستے اللہ کے اور دوسری

بیشک تمہارے لئے نشانی تھی دو گروہوں میں جو آپس میں بھڑ پڑے ایک جتھا اللہ کی راہ میں لڑتا اور دوسرا

كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

کافرہ ہے دیکھتے ہیں وہ ان کو دو مثل اپنا دیکھنا آنکھ کا اور اللہ قوت دیتا ہے ساتھ مدد اپنی کے جس کو چاہتا ہے

کافر کہ انہیں آنکھوں دیکھا اپنے سے دونا سمجھیں اور اللہ اپنی مدد سے زور دیتا ہے جسے چاہتا ہے

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

تحقیق بیچ اس کے البتہ عبرت ہے واسطے آنکھوں والوں کے
بیشک اس میں عقلمندوں کے لئے ضرور دیکھ کر سیکھنا ہے

تعلق

اس آیت کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیات میں پہلے تو رب نے قانون ارشاد فرمایا کہ کفار کے مال و اولاد عذاب الٰہی کو ان سے رفع نہیں کر سکتے۔ پھر اس کی ایک مثال گذشتہ واقعہ سے دی کہ فرعون و فرعونی بڑے مال و منال کے مالک تھے مگر عذاب آنے پر نہ بچ سکے۔ اب اس قانون کی دوسری مثال آئندہ پیش آنے والے واقعہ سے دی جا رہی ہے کہ تم بھی عنقریب مٹ جاؤ گے۔ تمہاری اولاد مال اس آنے والے عذاب کو دفع نہ کر سکیں گے۔ چنانچہ بنی قریظہ قتل کئے گئے اور بنی نضیر جلاوطن۔ ان کے اموال و اولاد بیکار ہی رہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ کفار کا مال و اولاد عذاب الٰہی کو دفع نہیں کر سکتا۔ جس کی ایک دلیل فرعونیوں کی غرقابی کا قصہ سن کر بیان ہوئی۔ اب اسی دعویٰ کی دوسری دلیل ارشاد ہو رہی ہے۔ تم جنگ بدر کو یاد کر لو۔ اس میں کیا ہوا تھا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں جو دعویٰ کیا گیا کہ کفار کا مال و اولاد عذاب دفع نہیں کر سکتا۔ اس کی ایک شہادت کو مشہور قصہ یعنی غرق فرعون سے دی گئی اور دوسری عینی شہادت دی جا رہی ہے۔ یعنی جنگ بدر کے واقعہ سے چونکہ سمعی گواہی سے عینی گواہی اعلیٰ ہوتی ہے۔ اس لئے اب اعلیٰ کی طرف رجوع ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں اجمالاً ایک کلیہ قاعدہ ارشاد ہوا کہ کفار کا مال و اولاد بے کار ہے' جس میں کفار عرب بھی داخل تھے۔ اب اس قاعدہ کی ایک فرد اور اس اجمال کی تفصیل ارشاد ہو رہی ہے کہ چونکہ کفار کا مال و اولاد عذاب خداوندی کو دور نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تم بھی ہوشیار ہو جاؤ۔ عنقریب ہلاک ہو جاؤ گے اور اس کا ثبوت جنگ بدر ہے۔

شان نزول

(۱) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضور سید عالم ﷺ جنگ بدر سے کفار کو شکست فاش دے کر مدینہ طیبہ واپس ہوئے تو حضور علیہ السلام نے مدینہ کے یہودیوں کو جمع کر کے فرمایا۔ کہ اللہ سے ڈرو ایسی مصیبت سے پہلے اسلام لے آؤ۔ جیسی بدر میں قریش پر نازل ہوئی تم جانتے ہو کہ میں سچا نبی ہوں۔ تم نے اپنی کتابوں میں میرے اوصاف دیکھے ہیں۔ وہ بولے کہ قریش تو فن جنگ سے ناواقف تھے۔ اگر کبھی ہم سے مقابلہ ہوا تو معلوم ہو جائے گا کہ لڑنے والے ایسے ہوتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جس میں خبر دی کہ وہ بھی عنقریب مغلوب ہوں گے۔ رب تعالیٰ نے یہ وعدہ سچا کر دکھایا کہ حضور علیہ السلام نے ایک دن میں چھ سو یہودی قتل فرمائے۔ یعنی بنی قریظہ اور زیادہ کو گرفتار فرمایا اور خیبر والوں پر جزیہ مقرر کیا۔ (خزائن العرفان)

(۲) انہی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ بھی روایت ہے کہ جب حضور سید عالم ﷺ نے جنگ بدر میں کفار مکہ کو شکست فاش دی تو یہود آپس میں بولے کہ وہ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ یہ وہ ہی ہیں جن کی خبر ہماری توریت میں دی گئی۔ ان کی پیروی کر لینی چاہیے تو ان میں سے بعض نے کہا کہ ابھی جلدی نہ کرو۔ یہ فتح و شکست اتفاقیہ ہے۔ دوسری جنگ اور دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے' جب جنگ [illegible] میں مسلمانوں کو بظاہر شکست ہوئی تو یہود بغلیں بجانے لگے اور یہاں تک دلیر ہو گئے کہ

جو معاہدہ حضور علیہ السلام سے کیا تھا وہ بھی توڑ دیا۔ اور ان کا سردار کعب بن اشرف ۶۰ ہمراہیوں کو لے کر کفار مکہ کے پاس پہنچا۔ اور ان سے کہا کہ تم باہر سے مسلمانوں پر حملہ کرو۔ ہم بیچ مدینہ سے ان پر حملہ کر دیں۔ ان کو ایسے پیس دو جیسے چکی میں دانہ۔ کفار مکہ بولے کہ تم اور مسلمان دونوں اہل کتاب ہو۔ اگر تم ان سے مل گئے تو ہم کیا کریں گے۔ کعب بولا کہ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ کفار نے کہا کہ اچھا ہمارے لات و منات کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھالو تو ہمیں اعتبار آ جائے۔ کعب نے ایسا ہی کیا اور کہا کہ ہم تم آپس میں پھر لڑیں یا نہ لڑیں ابھی تو اسلام کی مصیبت ہم تم دونوں پر ہے۔ آ ؤمل کر اسے پہلے مٹالیں۔ سچ ہے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کفر ایک ہی دین ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں پیشنگوئی کی گئی کہ یہ سارے کفار مل کر تم سے مقابلہ کریں گے۔ مگر مغلوب ہوں گے (خازن)

تفسیر

قُلْ لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ۔ قُلْ میں حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ اس قل فرمانے میں دو حکمتیں ہیں۔ ایک حضور انور ﷺ کی سیف زبانی دکھانی ہے کہ جو ان کے منہ سے نکلتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے کیونکہ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی تب تمام ہی حالات مسلمانوں کے خلاف تھے۔ کفار کے حق میں تھے مسلمان مغلوب الحال تھے۔ یہود بڑے خوشحال مگر جو حضور ﷺ نے کہا وہ ہی ہوا۔ دوسرا حضور انور ﷺ کا علم دکھانا تھا کہ آپ ﷺ کا سینہ علوم کا گنجینہ ہے مگر بتانے کی اجازت نہیں۔ ان میں سے آپ یہ دو یا تین لوگوں کو بتا دیں۔ کَفَرُوْا سے یا تو سارے کفار مراد ہیں یا یہود۔ اگر یہود مدینہ یعنی بنی نضیر و بنی قریظہ مراد ہیں تب تو آیت بالکل ظاہر ہے کہ آیت کے نزول کے بعد ان میں سے کوئی ایمان نہ لایا۔ سب ہی دوزخ میں گئے اور اگر سارے کفار عرب سے خطاب ہے تو مغلوبیت میں ہی سب مراد مگر دوزخی ہونے میں صرف وہ مراد ہوں گے جو کفر پر مرنے والے تھے۔ جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا۔ ستغلبون کی دو قرأتیں ہیں۔ ی اور ت سے (معانی و کبیر) جب مضارع پر سین آتا ہے تو قریب مستقبل کے معنی ہوتے ہیں۔ یعنی تم عنقریب دنیا میں بہت جلد اسلام اور مسلمانوں سے مغلوب ہو گے کہ بنی قریظہ مقتول ہوں گے اور بنی نضیر نکالے جائیں گے۔ تُحْشَرُوْنَ حشر سے بنا جس کے معنی ہیں اپنی جائے فرار سے مصیبت کی طرف نکالنا۔ جمع کرنا وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (التکویر:۵) یا جیسے وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَۃً (ص:۱۹) مگر الیٰ سے معلوم ہوا کہ یہاں نکالنے کے معنی مراد ہیں کیونکہ یہ انتہا کو چاہتا ہے۔ یعنی اے محبوب ﷺ یہود یا سارے کفار سے فرما دو کہ عنقریب تم سب مسلمانوں کے مقابلہ میں مغلوب ہو جاؤ گے اور آخرت میں دوزخ کی طرف ایسے ہانکے جاؤ گے جیسے جانور۔ اس مختصر سے الفاظ میں دونوں جہان کی خبر ہے۔ مغلوبیت اس جہاں کی خبر ہے جہنمی ہونا اس کی جزاء اس تُحْشَرُوْنَ میں ان کفار کا کفر پر رہنا۔ کفر پر مرنا۔ قبر میں فیل ہونا۔ قیامت میں روسیاہ ہونا۔ پھر دوزخ میں جانا۔ سب اس میں ہی داخل ہے تو اس آیت میں ہر جگہ کی خبر ہے۔ تُحْشَرُوْنَ کے معنی ہیں۔ مرتے وقت دوزخ کی طرف ہانکے جاؤ گے کہ قبر میں دوزخ کا عذاب ہو گا یا بعد قیامت فرشتے دوزخ کی طرف ہی ہانک لے جائیں گے۔ وَبِئْسَ الْمِھَادُ۔ بِئْسَ بأساء سے بنا بمعنی تکلیف اور شدت رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ بَئِیْسٍ۔ (اعراف:۱۶۵) یعنی عذاب شدید مِھَادُ وعہد سے بنا بمعنی ابتدائی حالت۔ اسی لئے تقریر کے شروع کو تمہید کہتے

ہیں۔اور بچے کے گہوارے کو مہاد کیونکہ بچہ ابتدائی حالت میں وہاں آرام کرتا ہے۔اصطلاح میں مِهَادُ ہر بستر کو کہا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ۔ (الذاریات: ۴۸) یعنی وہ دوزخ بڑا برا بستر ہے۔ جوان کے لئے تجویز کیا گیا۔اس کلام میں ادھر اشارہ ہے کہ جیسے گہوارہ بچے کو ہر طرف سے گھیرے ہوتا ہے۔ایسے ہی ان کو دوزخ ہر طرف سے گھیرے گی۔اور قلب وقالب پر چھا جائے گی۔قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا۔ یہ جملہ یا تو پہلے کلام کا تتمہ ہے اور اسی قُلْ کا مفعول اور اس میں یہود سے خطاب ہے۔یا یہ نیا جملہ ہے۔رب تعالیٰ کا مقولہ چونکہ اس زمانہ کے کفار بھی اور آئندہ کے کفار بھی فتح بدر کو اتفاقی واقعہ سمجھتے تھے نہ کہ قدرت الٰہی کا نمونہ جانتے تھے۔اسی لئے قَدْ ارشاد ہوا۔جس مضمون کے انکاری موجود ہوں یا ہونے والے ہوں وہاں قَدْ یا اِنَّ وغیرہ سے تاکید کی جاتی ہے۔لَكُمْ میں یا یہود سے خطاب ہے یا سارے کفار سے یا مسلمانوں سے یا غازیان بدر سے اگر کفار سے خطاب ہے تو آیت سے مراد ہے نشان عذاب اور اگر مسلمانوں سے خطاب ہے تو آیت سے مراد ہے نشانِ رحمت یا نشان قدرت۔ كَانَ کے معنی تھا بھی ہو سکتے ہیں اور ہے بھی اٰيَةٌ بمعنی نشانی' اس کی تنوین تعظیمی ہے۔فِئَتَيْنِ فِئَةٌ کا تثنیہ ہے۔فِئَة کے معنی واپس ہونا اور لوٹنا ہیں۔حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (حجرات: ۹) اسی لئے مال غنیمت اور سایہ کو فَيْءٌ کہا جاتا ہے۔اصطلاح میں ہر جماعت خصوصاً لشکر کو فِئَة بولتے ہیں۔ کیونکہ ان میں ہر ایک دوسروں کی طرف مدد کے لئے لوٹتا ہے۔اس سے جنگ بدر کے دو لشکر مراد ہیں ایک مسلمانوں کا جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔دوسرا کفار کا جس کی تعداد نو سو پچاس تھی۔آخر میں ایک ہزار ہو گئی تھی۔اَلْتَقَتَا لقاء کا باب افتعال ہے۔ بمعنی آپس میں ایک دوسرے سے ملنا۔یہاں بدر کے دن جنگ کے لئے ملنا مراد ہے۔یعنی اے کفار جنگ بدر کے دو لشکر جو میدان بدر میں ہی جنگ کے لئے اکٹھے ہوئے۔وہ قدرت کی بڑی نشانی ہے۔یا اے مسلمانوں جنگ بدر کے یہ دو لشکر نمونہ قدرت الٰہیہ ہیں جس سے معلوم ہوا ہے کہ رب تمہیں غالب رکھے گا اور انہیں مغلوب۔فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ جملہ پہلے جملہ کی تفصیل ہے اور فئۃ احدہا محذوف کی خبر۔سبیل اللہ سے یا تو اللہ کا دین مراد ہے۔یا اللہ کی اطاعت یعنی ان دونوں لشکروں میں سے ایک جماعت اللہ کی راہ میں جہاد کرتی تھی۔وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ۔ یہ پورا جملہ ہے۔پہلے پر معطوف۔اگرچہ مقابلہ کا تقاضا یہ تھا کہ فرمایا جاتا کہ دوسری جماعت شیطانی راہ میں لڑتی تھی مگر اس مضمون کو نہایت نفیس اور لطیف اشارے سے بیان فرمایا کہ دوسری جماعت کافرہ تھی۔وہ راہ الٰہی میں کیا لڑتی۔خیال رہے کہ اُخْرٰى فِئَةٌ پوشیدہ کی صفت ہے اور كَافِرَةٌ کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی دوسری جماعت اللہ ورسول ﷺ کی منکر تھی۔يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ۔ یہ جملہ یا مستقل نیا جملہ ہے یا اُخْرٰى كَافِرَةٌ کی صفت۔يَرَوْنَ کا فاعل جماعت کفار ہے۔اور هُمْ کا مرجع جماعت مسلمین مِثْلَيْ مثل کا تثنیہ ہے بمعنی دو مثل یعنی دوگنا یا تگنا رَاْيَ الْعَيْنِ يَرَوْنَ کا مفعول مطلق ہے۔خیال رہے کہ رای اور رویت تو آنکھ سے دیکھنے کو کہا جاتا ہے۔اور رؤیا خواب کو اور يَرَوْنَ دونوں مصدروں سے بن جاتا ہے۔یرون میں چونکہ احتمال تھا کہ شاید خواب مراد ہو۔اس لئے رَاْيَ الْعَيْنِ فرمایا گیا اور زیادہ وضاحت کے لئے اس کو عین کی طرف مضاف کر دیا۔یعنی مسلمان تھے تو تھوڑے مگر کفار انہیں اپنی آنکھوں سے اپنے سے دوگنا یا تگنا محسوس کرتے تھے۔بعض مفسرین نے فرمایا کہ یرون کا فاعل لشکر اسلام ہے اور هُمْ سے مراد کفار یعنی مسلمان کفار کو اپنے سے دوگنا محسوس کرتے تھے حالانکہ وہ ان سے تگنے سے بھی زیادہ تھے۔یا شروع جنگ

میں مسلمانوں نے کفار کو زیادہ محسوس کیا۔ اور کفار نے مسلمانوں کو تھوڑا جانا تا کہ مسلمانوں کے صبر کی آزمائش ہو اور کفار جنگ کی ہمت کریں مگر جنگ چھڑ جانے پر مسلمانوں کو کفار تھوڑے دکھائی دینے لگے۔ اور کفار کو مسلمان زیادہ۔ لہٰذا یہ دونوں تفسیریں درست ہیں۔ یہ واقعہ یا تو حضور علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ یا کفار کو وہ فرشتے نظر آنے لگے تھے جو مسلمانوں کی مدد کے لئے آئے تھے۔ اسی لئے ارشاد ہوا۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ یہ نیا جملہ ہے۔ يُؤَيِّدُ تائید سے بنا جس کا مادہ اید بمعنی قوت ہے۔ یعنی اللہ جسے چاہے اپنی مدد و فتح سے قوت دے۔ خواہ اس کے پاس فتح کا سامان ہو یا نہ ہو۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ۔ ذٰلِكَ سے یا تو سارے واقعہ کی طرف اشارہ ہے یا اس دیکھنے کی طرف یا فتح بدر کی طرف۔ عِبْرَةً عبور سے ہے۔ بروزن فعلۃ جیسے جلسۃ وجلوس ورکبۃ ورکوب۔ اس کے لغوی معنی گذر جانا ہے۔ اسی لئے راستہ طے کرنے کو عبور کہا جاتا ہے چونکہ عبرت ونصیحت سے انسان جہالت سے علم کی طرف آ جاتا ہے۔ اس لئے اسے عبرت کہتے ہیں۔ اَبْصَارِ جمع بصر کی ہے مگر یہاں بمعنی بصیرت یا عقل ہے۔ یعنی اس جنگ بدر کے واقعہ میں عقلمندوں یا بصیرت والوں کے لئے بڑی عبرت ہے کہ اسے دیکھ کر آئندہ کے لئے نصیحت پکڑیں۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ جو کفار اسلام مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں یا اس کی تباہی کے منتظر ہیں ان سے علانیہ فرما دو کہ تم سارے اکٹھے ہو جاؤ' اپنی طاقت جمع کر لو مگر تمہاری قسمت میں دونوں جہان کی رسوائی ہے۔ وہ اس طرح کہ دنیا میں تو کوئی دم جاتا ہے۔ جو تم اسلام کے مقابلہ میں مغلوب ہو جاؤ گے اور آخرت میں تم سب دوزخ کی طرف جانوروں کی طرح ہانک دیئے جاؤ گے اور دوزخ تو بڑا ابرا بستر ہے جہاں آرام کی کوئی صورت نہیں اور مصیبت کے سارے اسباب جمع ہیں مسلمانوں کی کمی اور ان کی بے سامانی کو مت دیکھو۔ یہ تھوڑی جماعت ہیں' تمام دنیا پر چھا جائے گی۔ اگر تمہیں اس کا ثبوت چاہیے تو جنگ بدر والا واقعہ یاد کر لو وہ اس کی قدرت کی کھلی نشانی ہے۔ اس دن میدان بدر میں دو لشکر اکٹھے ہوئے تھے ایک مسلمانوں کا جو راہ الٰہی میں سربکف ہو کر آ گیا تھا۔ اور دوسرا کافروں کو جو اپنی نفسانی خواہشوں پر جنگ کر رہا تھا۔ مسلمان حقیقت میں تھوڑے اور بے سامان تھے۔ کفار کے تہائی تھے مگر رب کی شان تو دیکھو کہ وہ کافروں کو اپنے سے دوگنے تگنے نظر آئے اور یہ تھوڑے ان بہت پر چھا گئے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی مدد ان کے شامل حال تھی۔ رب تعالیٰ جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ اگر غور کرو تو جنگ بدر میں عقل والوں کے لئے بڑی ہی عبرت ہے۔ وہ اس سے آئندہ کا پتہ لگا لیں اور آئندہ اسلام کے مقابلہ کی ہمت نہ کریں۔ خیال رہے کہ جنگ بدر کو چند وجہوں سے نشانِ قدرت قرار دیا گیا۔ ایک یہ کہ اس جنگ کی پیشگوئی پچھلی آسمانی کتابوں میں بھی ہے۔ چنانچہ یسعیاہ نبی کی کتاب ۲۱۔ ۲۱۳ سے آبلہ تک کہ وہاں ارشاد فرمایا گیا۔ عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے ددانیوں کے قافلو۔ پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو۔ روٹی کو لئے ہوئے بھاگنے والوں کے ملنے کو نکلو کیونکہ وہ تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ اور تیر اندازوں کے جو باقی [illegible] بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔ دیکھو اس

عبارت میں ہجرت اور جنگ بدر کی صاف پیش گوئی ہے۔ حضور علیہ السلام صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کچھ روٹیاں لے کر ہی روانہ ہوئے تھے اور تلواروں میں سے نکلے تھے۔ اور پہاڑ کے غار میں قیام بھی فرمایا تھا اور ایک سال کے بعد ہی جنگ بدر کا واقعہ پیش آیا جس میں ابوجہل وغیرہ سرداران قریش مارے گئے۔ قیدار ان کتابوں میں اسمٰعیل علیہ السلام کا نام تھا۔ دوسرا یہ کہ جنگ بدر میں مسلمان بہت کمزور تھے۔ اور کافر نہایت قوی۔ تیسرا یہ کہ مسلمان مدینہ منورہ سے جنگ کے ارادہ سے نکلے بھی نہ تھے۔ کفار اسی ارادہ سے آئے تھے۔ چوتھا یہ کہ مسلمانوں کے پاس سامان جنگ بھی برائے نام ہی تھا۔ کفار کے پاس بیشمار۔ پانچواں یہ کہ ان مسلمانوں کی یہ پہلی جنگ تھی۔ اور کفار جنگ میں بڑے ماہر تھے۔ چھٹا یہ کہ حضور علیہ السلام نے جنگ سے پہلے زمین پر خط کھینچ کر فرمادیا تھا کہ یہاں فلاں کافر مرے گا اور یہاں فلاں اور ایسا ہی ہوا۔ ساتواں وہ جو خود قرآن نے بیان فرمایا کہ مسلمان تھوڑے تھے مگر کفار کو اپنے سے دگنے نظر آئے۔ آٹھواں یہ کہ اس جنگ میں مسلمانوں کی مدد کے لئے پانچ ہزار فرشتے آسمان سے اُترے۔ نواں یہ کہ اس جنگ میں ابوجہل کو مسلمانوں کے دوکم سن بچوں نے قتل کیا۔ ان وجوہ سے جنگ بدر کو نشان قدرت فرمایا گیا ورنہ جنگیں تو اور بھی بہت سی ہوئیں (کبیر) یہ بھی خیال رہے کہ رب تعالیٰ نے یہاں غازیان بدر کے متعلق فرمایا۔ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۔ کہ یہ جماعت اللہ کی راہ میں جہاد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد کرنے والا مومن ہو، کفار کی کوئی نیکی اللہ کی راہ میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں وہ جو رب تعالیٰ کے ہاں قبول ہو اور جس پر ثواب ملے۔ قبول وثواب کی شرط ایمان ہے۔ دوسرا یہ کہ جہاد اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ ہو۔ اس ایک جملہ میں رب تعالیٰ نے غازیان بدر کے ایمان تقویٰ اخلاص سب کی گواہی دے دی۔ پھر دوسری جماعت کے متعلق فرمایا۔ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ۔ دوسری فوج کافر تھی۔ یعنی پہلی فوج خالص مومن تھی۔ اگر وہ فوج بھی منافقین یا کفار کی ہوتی تو وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ کے کیا معنی تھے۔ اب جوان صحابہ پر کفر یا نفاق یا ریا کا الزام لگائے وہ اس آیت کا منکر ہے۔ بدر اور حدیبیہ میں کوئی منافق یا کافر شریک نہ ہوا۔ پھر مومنوں کو فیہ فرمایا۔ معلوم ہوا کہ صحابہ چار پانچ نہ تھے بلکہ فوج در فوج تھے جنہیں فئۃ کہا گیا۔

جنگ بدر

حضور سید عالم علیہ السلام نے کل انیس جہاد فرمائے۔ نو میں بنفس نفیس شرکت فرمائی۔ پہلا غزوہ عشیر۔ دوسرا غزوہ ابواہ۔ تیسرا غزوہ بواط۔ چوتھا غزوہ بدر مگران میں سے نو میں باقاعدہ جنگ ہوئی تھی۔ باقی میں معمولی جھڑپیں یا صلح وغیرہ۔ وہ نو یہ ہیں۔ بدر، احد، احزاب، بنی قریظہ، بنی مصطلق، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف (بخاری وحاشیہ بخاری) جن لوگوں نے فرمایا کہ سب سے پہلا غزوہ جنگ بدر ہے۔ ان کا یہ ہی مطلب ہے کہ باقاعدہ غزوہ جس میں جنگ واقع ہوئی ہو وہ یہ ہی ہے۔ یہ جنگ ماہ رمضان ۲ھ جمعہ کے دن ہوئی۔ بارھویں رمضان اتوار کے دن حضور علیہ السلام صحابہ کرام کو لے کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ اور سترھویں رمضان جمعہ کے دن جنگ واقع ہوئی۔ اور انیس رمضان اتوار کے دن اس سے فراغت حاصل ہوئی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ان تمام جہادوں میں کل ایک ہزار آٹھ کفار مارے گئے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہوا کہ جب مسلمان مدینہ منورہ میں امن سے بیٹھے تو کفار مکہ کو بہت ناگوار گزرا کہ یہ جماعت ہمارے پنجہ ظلم سے کیوں نکل گئی۔ اس کے لئے وہ طرح طرح کی تدبیریں

کرنے لگے چنانچہ انہوں نے ابوسفیان کو تجارتی مال لے کر ایک قافلہ کے ساتھ شام کی طرف روانہ کیا۔ اور طے یہ ہوا کہ اس کا سارا نفع ہتھیاروں اور سامان جنگ پر خرچ کیا جائے گا تا کہ مسلمانوں کو پیس کر رکھ دیا جائے۔ خدا کی شان کہ ابوسفیان کو اس تجارت میں بہت نفع ہاتھ آیا۔ جب وہ وہاں سے لوٹے تو مدینہ منورہ راستہ میں پڑتا تھا۔ حضور ﷺ کو اس سارے واقعہ کی خبر مل چکی تھی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ چل کر اس قافلہ کو روک لو اور اس کا مال چھین لو کیونکہ یہ تیاری جنگ کے لئے ہے۔ چنانچہ کل تین سو تیرہ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین حضور ﷺ کے ساتھ اس ارادہ سے نکلے۔ جن میں ستتر (۷۷) مہاجرین تھے۔ اور دو سو چھتیس انصار۔ مہاجرین کے علمبردار علی مرتضٰی تھے اور انصار کے حضرت سعد ابن عبادہ ان کے ساتھ دو گھوڑے، ستر اونٹ اور چھ زرہ اور آٹھ تلواریں تھیں اور اس چھوٹے سے قافلہ کے سپہ سالار اعظم خود حضور سید عالم ﷺ تھے۔

تھے انکے پاس دو گھوڑے چھ زرہیں آٹھ شمشیریں　　　پلٹنے آئے تھے وہ لوگ دنیا بھر کی تقدیریں
یہ لشکر ساری دنیا میں انوکھا اور نرالا تھا　　　کہ اس لشکر کا افسر ایک کالی کملی والا تھا!
یہ وہ تھے جن سے حق کا بولا بالا ہونے والا تھا　　　یہ وہ تھے جن سے دنیا میں اجالا ہونے والا تھا

اس جنگ میں آٹھ حضرات عذر کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ تین مہاجر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی بیوی رقیہ بنت رسول ﷺ بیمار تھیں۔ حضور ﷺ کے حکم سے ان کی تیمارداری کے واسطے رک گئے اور طلحہ اور سعید ابن زید جن کو حضور ﷺ نے قافلہ مشرکین کی تلاش کے لئے بھیجا تھا اور پانچ انصاری ان تمام کا غنیمت میں حصہ مقرر کیا گیا۔ سواری کی کمی کی وجہ سے ایک اونٹ پر باری باری سے چند صاحب سوار ہوتے تھے چنانچہ حضرت علی مرتضٰی اور زید ابن حارثہ حضور علیہ السلام کے ساتھ سواری میں شریک تھے۔ جب حضور ﷺ کے پیدل چلنے کی باری آئی تو یہ حضرات عرض کرتے کہ حضور ﷺ سوار رہیں۔ ہم آپ ﷺ کے عوض پیدل چلیں گے۔ حضور ﷺ فرماتے کہ نہ میں تم سے زیادہ کمزور ہوں اور نہ ثواب سے مستغنی۔ ادھر ابوسفیان کو علامات سے پتہ لگ گیا کہ مسلمان ہمارے قافلہ کو روکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے ضمضم ابن عمرو غفاری کو ابوجہل کے پاس مکہ کی طرف دوڑایا کہ ہماری مدد کے لئے جلد آؤ۔ ہم پر مسلمانوں کا حملہ ہونے والا ہے۔ اس نے اپنی قمیص پھاڑی۔ اپنے اونٹ کی ناک کاٹی یہ اس زمانہ میں انتہائی خوف کی علامت ہوا کرتی تھی، اور چیخا الغوث الغوث یعنی مدد کے لئے چلو۔ مسلمانوں سے تمہارے قافلہ کو خطرہ ہے۔ ابوجہل یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے سارے مکہ میں اعلان کر دیا کہ کوئی شخص مکہ میں نہ رہے۔ سب جنگ کے لئے چلیں۔ ابولہب نے تو اپنے بجائے خاص ابن ہشام کو بھیج دیا۔ امیہ ابن خلف حضرت بلال کا پہلا مالک چھپتا پھرتا تھا۔ اس کی بیوی کریمہ بنت عمر نے کہا کہ تو بڑا بہادر تھا۔ آج تجھے کیا ہو گیا۔ جو نہتے مسلمانوں کے مقابلہ سے گھبراتا ہے۔ وہ بولا کہ میرے دوست سعد ابن معاذ نے خبر دی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ امیہ ہمارے ہاتھ سے مارا جائے گا اور محمد ﷺ کی بات جھوٹ نہیں ہوتی۔ (بخاری) میں نہ جاؤں گا۔ (حضور علیہ السلام کے علم غیب کا کفار کو بھی یقین تھا) مگر ابوجہل نے نہ چھوڑا۔ اسے بھی ساتھ لے لیا۔ غرضکہ کفار نو سو پچاس (۹۵۰) کی تعداد میں وہاں سے نکلے۔ ان کا سردار عتبہ ابن ربیعہ تھا اور ان کے پاس سو گھوڑے، سات سو اونٹ اور بے شمار زرہ

اور ہتھیار تھے۔ اس کے علاوہ شراب کے مٹکے‘ گانے والی عورتیں۔ عیش و طرب کا سامان بکثرت تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم مسلمانوں کو شکست دے کر کچھ دن وہاں مزے اڑا کر جشن کر کے لوٹیں گے۔ ادھر ابوسفیان نے مدینہ منورہ کا راستہ چھوڑ کر سمندر کے کنارے کا راستہ اختیار کیا اور صحیح سلامت قافلہ کو مکہ پہنچا دیا اور ابوجہل کو کہلا بھیجا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں۔ تمہارا قافلہ بخیریت مکہ پہنچ گیا۔ مغرور ابوجہل نہ مانا۔ اور ابوسفیان کو کہلا بھیجا کہ مرد جس کام کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ بغیر انجام دیئے واپس نہیں لوٹتے۔ ابوسفیان تم بھی معہ قافلہ ہم سے آملو۔ مسلمانوں نے ہمارے مقابلے کی ہمت ہی کیوں کی۔ ان کو ہمیشہ کی نیند سلا دو۔ غرضکہ پچاس آدمی یہ بھی لشکر کفار سے مل گئے۔ جن مؤرخین نے کفار کی تعداد ساڑھے نوسو (۹۵۰) بیان کی ہے۔ وہ مکہ سے نکلتے وقت کی تعداد ہے اور جن حضرات نے ایک ہزار بیان کی۔ وہ بوقت جنگ کی تعداد ہے‘ غرضکہ کفار اب ایک ہزار ہو گئے۔ ادھر مسلمانوں کو سارے حالات کا پتہ لگا۔ ان میں سے بعض لوگ اس لئے پریشان ہو گئے کہ کیا سمجھ کر آئے تھے۔ اور کیا پیش آ گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے ان جان نثاروں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے اور انصار سے فرمایا کہ اگر اس وقت جنگ ہو گئی تو تم میرا ساتھ دو گے۔ حضرت سعد ابن معاذ جوش میں اٹھے اور عرض کیا کہ حضور ﷺ خود غور فرمالیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے ؎

تعالیٰ اللہ یہ شیوہ ہی نہیں ہے باوفاؤں کا　　پیا ہے دودھ ہم لوگوں نے غیرتمند ماؤں کا
نبی ﷺ کا حکم ہو تو پھاند جائیں ہم سمندر میں　　جہاں کو محو کر دیں نعرۂ اللہ اکبر میں
قریش مکہ تو کیا چیز ہیں دیووں سے لڑ جائیں　　سنانِ نیزہ بن کر سینۂ باطل میں گڑ جائیں

حضرت مقداد نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ ہم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نہیں ہیں جو اپنے پیغمبر سے کہہ دیں کہ آپ اپنے رب کو لے کر کفار سے جنگ کریں۔ ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔ حضور ﷺ نے ان کے حق میں دعائے خیر کی۔ اور وہاں سے کوچ کر کے میدان بدر میں اس کنارہ پر قیام کیا۔ جو مدینہ منورہ سے قریب ہے اور کفار مکہ اس کے مقابل کنارہ پر ٹھہر گئے۔ خیال رہے کہ مقام بدر مدینہ منورہ سے جانب مکہ معظمہ تین منزل فاصلہ پر ہے۔ اسے بدر اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے پاس ایک گاؤں ہے۔ جسے بدر ابن مخلد ابن نضر ابن کنانہ نے آباد کیا تھا اور اس جگہ بدر ابن حارث نے ایک کنواں کھدوایا تھا جس کنوئیں کا نام چاہ بدر اور گاؤں کا نام قریہ بدر مشہور ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ بدر کے معنیٰ ہیں چودھویں رات کا چاند‘ چونکہ اس کنوئیں کی مَنْ پورے چاند کی طرح بالکل گول ہے۔ اور اس کے صاف و شفاف پانی میں چاند کا عکس پڑتا تھا۔ اس لئے اسے بدر کہتے ہیں۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم) خدا کی شان مسلمانوں کا کنارہ ریگستان تھا۔ جس میں چلنا مشکل اور پانی بہت کم تھا اور کفار کا کنارہ خالص زمین تھا۔ انہوں نے وہاں کنواں بھی کھود لیا۔ مسلمانوں کو بہت دشواری پیش آئی۔ رب نے رحمت کی بارش برسائی۔ جس سے ریت جم کر اچھی زمین بن گئی۔ اور کفار کی طرف زمین پھسلنی شروع ہو گئی۔ مسلمانوں نے اپنے مشکیزے بھر لئے قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم الخ (انفال: ۱۱) میدان بدر کی یہ جمعہ کی رات بھی عجیب رات تھی جبکہ بدر کے ایک کنارے پر ایمان تھا اور دوسری طرف طغیان‘ ایک طرف شیطانی لشکر تھا اور دوسری طرف رحمانی۔ اس طرف سجدہ و سجود تھا۔ ادھر کھیل کود [illegible] الٰہی میں محو‘ کفار شراب کے نشہ میں چور‘ غرض

سعادت وشقاوت کا ایسا اجتماع آسمان نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ ایک طرف سید الانبیاء ﷺ اور ان کے جان نثار نمازیں پڑھ رہیں۔ دوسری طرف کفار کا سردار ابو جہل اور اس کے یار گا بجار ہے ہیں۔ ادھر خوشی منائی جارہی ہے۔ ادھر سید الانبیاء ﷺ زمین پر خط کھینچ کر ہر ایک کے مرنے کی جگہ بتا رہے تھے۔ غرض جمعہ کا سویرا نمودار ہوا۔ دونوں طرف سے صف آرائی ہوئی۔ اس طرف ابو جہل وعتبہ اپنی صف بندی کر رہے تھے۔ ادھر خود جناب سرور کائنات ﷺ صحابہ کرام کی صفیں درست فرمارہے تھے۔ مبارک ہاتھ میں ایک تیچی تھی۔ جس سے صحابہ کو اشارہ کر کے سیدھا کرتے تھے۔ حضرت سواد ابن غربہ جان بوجھ کر صف سے کچھ آگے کھڑے ہوگئے۔ حضور ﷺ نے ان کے سینہ پر تیچی لگا کر فرمایا۔ اے سواد سیدھے ہو جاؤ۔ سواد نے عرض کیا یا حبیب اللہ آپ ﷺ کی بارگاہ عدل وانصاف کا دربار ہے۔ مجھ کو بلا قصور کیوں مار پڑی۔ میں اس کا بدلہ چاہتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے تیچی سواد کو دے کر اپنا سینہ کھول دیا۔ اور فرمایا مجھ سے بدلہ لے لے۔ سواد تیچی پھینک کر جسم اطہر سے لپٹ گئے اور سینہ پاک کو چومنے لگے۔ فرمایا سواد یہ کیا۔ عرض کیا یارسول اللہ یہ میرا آخری وقت ہے۔ سب سے پہلے میں ہی شہید ہوں گا۔ میں نے چاہا کہ اخیری وقت اپنا بدن حضور علیہ السلام کے بدن مبارک سے قریب کر دوں۔ اور اس بہانہ سے سینہ فیض گنجینہ کے بوسے لے لوں (مدارج) اس زمانہ میں جنگ کا دستور یہ تھا کہ پہلے شخصی لڑائی ہوتی تھی جسے مبارزت کہتے ہیں۔ پھر گھسان کا رن پڑتا تھا۔ اسی قاعدہ کے موافق لشکر کفار سے ربیعہ کے دو بیٹے عتبہ، شیبہ، اور عتبہ کا بیٹا ولید سامنے آئے اور اپنا مقابل مسلمانوں سے مانگا۔ مسلمانوں میں سے حضرت عوف اور معاذ ابن حارث اور عبداللہ ابن رواحہ نکلے۔ کفار بولے کہ ہم تمہیں نہیں جانتے۔ مہاجرین میں سے کسی کو بھیجو جو ہمارے قرابت دار ہیں۔ چنانچہ اب اس طرف سے عبیدہ ابن حارث اور حضرت حمزہ اور علی مرتضیٰ نکلے۔ حضرت عبیدہ جن کی عمر اسی (۸۰) سال سے زیادہ تھی۔ عتبہ کے مقابلہ میں آئے اور حمزہ شیبہ کے مقابلے میں اور علی مرتضیٰ ولید کے مقابل کھڑے ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولید کو اور حمزہ نے شیبہ کو قتل کر دیا مگر حضرت عبیدہ اور عتبہ نے ایک دوسرے پر وار کیا۔ حضرت عبیدہ زخمی ہوئے اور کچھ دیر بعد وفات پاگئے۔ اور اسی مقام پر وادی صفراء میں دفن ہوئے۔ ادھر حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کے آس پاس انصار کے دو بچے حضرت معوذ ابن عفرا اور معاذ ابن عمرو نے عبدالرحمٰن ابن عوف سے پوچھا کہ ابو جہل کہاں ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تم کیا کرو گے۔ انہوں نے جواب دیا۔

قسم کھائی ہے دونوں نے کریں گے قتل ناری کو ۔ سنا ہے گالیاں دیتا ہے وہ محبوب باری کو

اتفاقاً ابو جہل بھی سامنے ہی اپنے لشکر میں ٹہل رہا تھا۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ وہ ہے۔ یہ دونوں بچے اس پر ایسے جھپٹے جیسے چڑیا پر باز اس کے لشکر میں پہنچ کر معوذ نے گرایا۔ اور معاذ نے قتل کر دیا۔ قتل تو کر دیا مگر کفار نے انہیں ایسا گھیر لیا جیسے چاند کو ہالہ۔ یہ دونوں ان کے وار کو بچاتے اور حملہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے تھے۔ ابو جہل کے بیٹے عکرمہ نے معاذ کے کندھے پر ایک وار کیا جس سے ہاتھ جسم سے جدا ہو گیا مگر کچھ کھال جڑی رہی۔ انہوں نے فوراً تلوار بائیں ہاتھ میں پکڑی اور عکرمہ کے پیچھے بھاگے۔ ان کا یہ کٹا ہوا ہاتھ پاؤں میں الجھتا تھا۔ پاؤں میں دبا کر اس کو توڑ دیا۔ اتنے میں عکرمہ ان کی نگاہ سے غائب ہو گیا۔ پھر یہ اپنا کٹا ہوا ہاتھ لے کر حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے اس ہاتھ کو کندھے پر رکھ کر اپنا لعاب دہن شریف لگا دیا۔ جس سے وہ ہاتھ بالکل درست ہو گیا اور آپ خلافت عثمانی تک زندہ رہے۔ اور ہاتھ نہایت قوی رہا۔ مدارج النبوت میں

فرمایا کہ معوذ اس دن شہید ہو گئے۔ مگر بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور ابو جہل کے سامان کا مطالبہ کیا۔ خیال رہے کہ جنگ بدر میں جو کفار آئے تھے ان میں بہت سے مسلمانوں کے قرابت دار تھے۔ اور ہر صحابی کے ہاتھ سے اس کا قریبی مارا گیا۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہ نے اپنے والد جراح کو اور حضرت مصعب ابن عمیر نے اپنے بھائی عبداللہ ابن عمیر کو اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ماموں عاص ابن ہشام ابن مغیرہ کو اور حضرت علی وحمزہ نے اپنے قرابت داروں یعنی ربیعہ کے بیٹوں کو قتل کیا۔ انہی کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ (مجادلہ: ۲۲) الخ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے عبدالرحمٰن اور حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس اور حضور علیہ السلام کے داماد حضرت ابو العاص بھی اس جنگ میں کفار کی طرف سے آئے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عبدالرحمٰن کو جنگ کے لئے بلایا۔ فرمایا کہ تو شیطان کا ساتھی ہے۔ میں رسول اللہ ﷺ کا غلام۔ آ باپ بیٹے کے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ حضور علیہ السلام نے روک دیا۔ فرمایا کہ ابو بکر بس۔ اس کی اجازت نہیں۔ حضور علیہ السلام جانتے تھے کہ یہ سب لوگ آخر میں ایک دن صحابی بننے والے ہیں۔ انہی کے لئے فرمایا گیا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (مجادلہ: ۲۲) غرض جنگ کیا تھی قدرت الٰہی کا نمونہ تھا۔ اسی جنگ میں چودہ صحابی شہید ہوئے۔ چھ مہاجر اور آٹھ انصار اور ستر کافر مارے گئے۔ اور ستر گرفتار ہوئے اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے شاندار فتح پائی۔ جنگ کے بعد حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما ابو جہل کی لاش پر پہنچے دیکھا کہ وہ سسک رہا ہے۔ آپ اس کے سینۂ ناپاک پر بیٹھے۔ اس کی داڑھی پکڑ کر بولے کہ ابو جہل تو ہی ہے وہ بولا کہ آج تم نے عرب کے سردار کو مار لیا۔ کاش مجھے کوئی بڑا آدمی مارتا' افسوس یہ ہے کہ مجھے دیہاتیوں کے دو لڑکوں نے مارا۔ چنانچہ عبداللہ ابن مسعود نے اس کا مغرور سر تن سے جدا کیا۔ خیال رہے کہ اس جنگ میں کفار کے چوبیس بڑے بڑے سردار مارے گئے جن میں ابو جہل اور امیہ بن خلف' حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پہلا مالک بھی تھا۔ ان کی لاشیں چاہ بدر کے جھیرے میں ڈالی گئیں۔ جن سے بدبو نکلتی تھی۔ حضور سید عالم ﷺ نے فتح بدر کے بعد تین دن وہاں قیام فرمایا۔ واپسی کے وقت ان خبثاء کی لاشوں پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ اے فلاں فلاں کیا تم نے رب کے وعدہ کو سچا پا لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ بے جان جسموں سے کلام فرماتے ہیں۔ فرمایا اے عمر تم ان سے زیادہ نہیں سنتے (بخاری) اس جنگ میں کفار کا وہ سارا سامان مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ گویا وہ سب کچھ انہی کیلئے لائے تھے۔ پھر حضور ﷺ نے صحابہ کرام (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) سے ان قیدی کفار کے بارے میں مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا حبیب اللہ یہ کفر کے سردار ہیں میری رائے یہ ہے کہ ہم میں سے ہر مسلمان اپنے قرابت دار کافر کو قتل کرے۔ چنانچہ آپ ﷺ عباس اور ابو العاص کو قتل کریں ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو قتل کریں۔ اپنے بھائی کو میں قتل کروں۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ انہیں مال لے کر چھوڑ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ آئندہ ایمان لے آئیں اور خدمت اسلام انجام دیں۔ نبی کریم ﷺ نے صدیق اکبر کی رائے کو اختیار کیا مگر بعد میں قرآن کریم نے فاروق اعظم کی رائے کو ترجیح دی۔ چنانچہ ان سب کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس فدیہ میں بہت پر لطف واقعہ یہ در پیش آیا۔ کہ جب حضرت

عباس سے فدیہ طلب کیا گیا تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ کیا آپ ﷺ کو یہ گوارا ہوگا کہ آپ ﷺ کے چچا کو چھڑانے کے لئے مکہ میں چندہ جمع کیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم جنگ کے لئے چلے تھے تو آپ نے میری چچی یعنی اپنی بیوی کو چار سو دینار چھپ کر دیئے تھے اور کہا تھا کہ اگر میں لوٹ آیا تو لے لوں گا اور اگر جنگ میں مارا گیا تو اس سے بچوں کو پالنا۔ ان سے فدیہ ادا کرو۔ حضرت عباس خاموش ہوئے اور فدیہ ادا کیا۔ حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب جو ابوالعاص کی اس وقت بیوی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہار اور کچھ زیور جو حضور علیہ السلام نے انہیں جہیز میں دیا تھا۔ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور عرض کیا کہ یہ آپ ﷺ کے قیدی یعنی میرے شوہر کا فدیہ ہے قبول فرمایا جائے۔ اور میرے شوہر کی جان بخشی کی جائے اس سامان کو دیکھ کر خود نبی ﷺ پر رقت طاری ہوئی اور صحابہ کرام زار زار رونے لگے کیونکہ یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا زیور تھا۔ اور طے یہ ہوا کہ یہ زیور واپس کر دیا جائے اور ابوالعاص کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا جائے۔ جب ابوالعاص چھوٹ کر چلے تو انہیں حکم دیا گیا کہ حضرت زینب کو یہاں پہنچا دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اور بعد میں خود وہ بلکہ حضرت عباس حضرت عبدالرحمٰن وغیرہ سب مسلمان اور صحابی ہوئے۔ (رضی اللہ عنہم) اس لئے فرمایا گیا کہ جنگ بدر شان قدرت ہے۔

فائدے

اس آیت اور اس واقعہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو علم غیب عطا فرمایا۔ دیکھو نبی ﷺ نے بدر سے پہلے اس کے واقعات کی خبر دی۔ **دوسرا فائدہ:** کون کہاں مرے گا یہ ان پانچ علوم میں سے ہے۔ جس کا دیوبندی سخت انکار کرتے ہیں مگر اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا علم بھی حضور ﷺ کو عطا فرمایا۔ دیکھو حضور ﷺ نے خطوط کھینچ کر فرما دیا کہ فلاں کافر یہاں مرے گا۔ **تیسرا فائدہ:** کفار مکہ جو حضور علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے۔ آپ ﷺ کے علم غیب کے قائل تھے۔ دیکھو امیہ ابن خلف کو جب یہ خبر پہنچی کہ حضور ﷺ نے میرے مارے جانے کی خبر دی ہے تو اس نے یہ نہ کہا کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں بلکہ اسے یہ ہی کہتے بنی کہ ان کی بات کبھی جھوٹی نہیں ہوتی جیسا کہ بخاری کی روایت سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** جنگ بدر بڑی مقبول جنگ ہوئی۔ اس میں شرکت کرنے والے صحابہ کرام یقیناً جنتی ہیں بلکہ جو فرشتے امداد کے لئے اس جنگ میں آئے تھے وہ دوسرے فرشتوں سے افضل ہیں۔ جو کوئی خلفاء راشدین کو برا کہے وہ سخت جاہل ہے کیونکہ وہ حضرات اس میں شریک تھے۔ **پانچواں فائدہ:** ہار جیت کمی اور زیادتی سے نہیں ہوتی۔ بلکہ محض اللہ کے فضل سے۔ دیکھو جنگ بدر میں مسلمان تھوڑے اور بے سروسامان تھے۔ اور کفار زیادہ اور سامان والے مگر جیتے مسلمان۔ اس سے ان موجودہ مسلمانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے جو اپنی تعداد بڑھانے کے لئے بے دینوں کو اپنی انجمنوں اور تحریکوں میں شامل کرتے ہیں۔ وہ ہی اسلامی تحریک اور انجمن کامیاب ہوگی جس میں خالص سنی مسلمان شامل ہوں۔ عطر کو پیشاب میں ملا کر نہ بڑھاؤ۔ ورنہ اصل عطر بھی جاتا رہے گا۔ **چھٹا فائدہ:** غازیان بدر مخلص اور مجاہدین فی سبیل اللہ پکے مومن تھے۔ ان میں کوئی کافر یا منافق نہ تھا نہ آئندہ ہونے والا تھا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے انکے جہاد کو تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فرمایا اور تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ جب ہی ہوگا جب صحابہ مومن بھی ہوں مخلص بھی۔ اب جو انکے ایمان یا

اخلاص میں شک کرے وہ اس آیت کا منکر ہے بلکہ ان دونوں لشکروں کو فِئَةٌ اس لئے فرمایا کہ مومن کا لشکر تو اللہ تعالیٰ و رسول اللہ علیہ السلام کی طرف رجوع کرنے والا تھا اور کفار کا لشکر ہر حالت میں شیاطین یا اپنے سرداروں کی طرف لوٹتا تھا رجوع الی اللہ مومن کا انتہائی کمال ہے انہیں فِئَةٌ کہنے میں بھی انکے ایمان واخلاص کی طرف اشارہ ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کو کفار تھوڑے دکھائی دیئے مگر دوسری آیت میں فرمایا گیا۔ وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ۔ (انفال: ۴۴) یعنی اے مسلمانو ان کی نگاہوں میں تھوڑا کر دیا ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ جنگ کی ابتداء میں کافروں کو مسلمان تھوڑے نظر آئے تاکہ وہ جنگ کی ہمت کریں اور جنگ چھڑنے کے بعد زیادہ معلوم ہوئے تاکہ مرعوب ہو جائیں۔ یہ دو آیتیں دو وقت کے لحاظ سے ہیں۔

دوسرا اعتراض: يَرَوْنَهُمْ۔ کے بعد رَأْيَ الْعَيْنِ۔ کیوں فرمایا گیا۔ آنکھ ہی سے دیکھا جاتا ہے نہ کہ کان سے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ يَرَوْنَهُمْ میں دو احتمال تھے کہ رویت سے بنا ہو یا رؤیا سے (بمعنی خواب) رَأْيَ الْعَيْنِ سے معلوم ہوا کہ انہوں نے محض خواب خیال سے دگنا نہ دیکھا بلکہ ظاہر ظہور آنکھوں سے۔ **تیسرا اعتراض:** جو چیز موجود نہ ہو اسے دکھا دینا نظر بندی اور دھوکہ ہے جادوگر یہ ہی کرتا ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھوں پر اثر ڈال کر کچھ کا کچھ دکھا دیتا ہے۔ رب تعالیٰ کے لئے یہ فعل نہ ممکن ہے۔ (آریہ) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک وہ جو تفسیر کبیر نے دیا۔ کہ کفار وحشت کی وجہ سے اندازہ میں غلطی کر گئے اور تھوڑی کو بہت سمجھ گئے۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا۔ يَرَوْنَ یعنی کفار دیکھتے تھے۔ یہ نہ فرمایا گیا کہ ہم نے دکھایا مگر میرے نزدیک یہ جواب کمزور ہے کیونکہ دوسری جگہ وَيُقَلِّلُكُمْ اور وَيُرِيكُمُوهُمْ (انفال: ۴۴) بھی ارشاد ہوا۔ یعنی رب تعالیٰ نے انہیں ایسا دکھایا' نیز اس وقت کفار پر گھبراہٹ کہاں تھی۔ وہ تو بڑے خوش تھے اور مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر ہلاک کرنے کی نیت سے کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرا یہ کہ چونکہ بدر میں ملائکہ بھی مسلمانوں کے لشکر میں داخل ہو گئے تھے وہ انہیں بشکل انسانی نظر آئے۔ تیسرا یہ کہ یہ دھوکہ نہ تھا بلکہ حضور علیہ السلام کا معجزہ تھا اور رب تعالیٰ کی قدرت اس میں ان کی نظر بندی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کی جماعت کا پھیلا دینا تھا۔ **چوتھا اعتراض:** ایک فرشتہ زمین کا طبقہ لوٹ سکتا ہے۔ قوم لوط و عاد و ثمود کو ایک ہی فرشتہ نے ہلاک کیا تھا' یہاں اتنے فرشتے کیوں آئے اور پھر ستر ہی کافر کیوں مرے؟ **جواب:** اس کا مفصل جواب انشاء اللہ اس آیت کی تفسیر میں آئے گا۔ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ (آل عمران: ۱۲۵) یہاں اتنا سمجھ لو کہ جنگ بدر میں فرشتے کفار کو عذاب دینے نہ آئے تھے بلکہ مسلمانوں کی عزت افزائی اور حضور علیہ السلام کی خدمت گزاری کے لئے۔ ورنہ رب تعالیٰ فرما چکا۔ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ۔ (انفال: ۳۳)

پانچواں اعتراض: حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ بدر کی شرکت سے محروم رہے اور جنگ احد میں حضور علیہ السلام کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور بیعت رضوان کے موقعہ پر بھی غائب رہے پھر تم ان کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہو؟ معلوم ہوا کہ وہ مومن نہ تھے ورنہ ان موقعوں پر مسلمانوں کے ساتھ رہتے۔ (رافضی) **جواب:** حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ بدر میں بھی اور بیعت الرضوان میں بھی [illegible] اسی لئے حضور علیہ السلام نے بدر کی غنیمت میں انہیں

حصہ دیا اور بیعت رضوان کے موقعہ پر اپنے بائیں ہاتھ کو عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر فرمایا کہ میں ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں۔ شرکت تو ان کی رضا کا نام ہے۔ اگر وہ میدان جنگ میں آنے سے راضی ہیں تو آنا ثواب اور اگر وہ گھر پر رہنے سے راضی ہیں تو گھر میں بیٹھنا عبادت۔ خندق کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عصر کی نماز قضا کی اور سب نے ادا، مگر خدا کی قسم ان کی یہ قضاء ادا سے افضل تھی کیونکہ خدمت سرکار کی وجہ سے تھی۔ ہجرت میں صدیق اکبر کو ساتھ لیا۔ علی مرتضیٰ کو وہیں چھوڑا مگر یقیناً صدیق بھی ساتھ رہے اور علی مرتضیٰ بھی۔ کیونکہ وہ حضور علیہ السلام ہی کے فرمان سے وہاں رکے تھے۔ جنگ احد کا جواب انشاء اللہ انہیں آیتوں کی تفسیر میں آئے گا۔ جہاں اس کا واقعہ ہے یہاں اتنا سمجھ لو کہ رب نے ان کی معافی کا اعلان فرمادیا۔ جب رب تعالیٰ معاف کرے تو ان پر اعتراض کرنے والا کون؟

تفسیر صوفیانہ

کفر ازل سے مغلوب ہے۔ اور کئی طرح مغلوب ایمان ازل سے غالب ہے اور چند طرح غالب دیکھو کفر اولاً بدبختی، پھر ہوا و ہوس سے پھر نفس سے، پھر شیطان سے، پھر دنیوی لذات سے مغلوب ہے۔ نفس اسے اسفل السافلین تک پہنچا دیتا ہے اور کافر کے لئے دو قسم کی آگ ہے ایک اللہ کی آگ۔ دوسری دوزخ کی۔ اللہ کی آگ تو حجاب ہے جس کا اثر قلب پر پڑتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (ہمزہ: ۷) دوزخ کی آگ وہ شہوت کی غفلت اور مخالفت شریعت کی آگ ہے۔ جس سے کھال جلتی ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا۔ (النساء:۵۶) نور قلب کا لشکر ہے اور تاریکی نفس کا۔ جب نور ظلمت کو مٹاتا ہے تو اس پر یہ آیت صادق آتی ہے۔ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا۔ (نمل: ۳۴) دل کی تمام برائیوں کو دور کرتا ہے کہ وہ ربانی فیوض کے قابل ہو جائے۔ بدن انسان گویا میدان بدر ہے۔ انوار الٰہی گویا اسلامی لشکر جو بظاہر کمزور معلوم ہوتا ہے اور ظلمات نفس لشکر کفار۔ اگرچہ یہ زیادہ معلوم ہو لیکن آخر مغلوب۔ اور جب ان کا مقابلہ ہوتا ہے تو لشکر نور تائید الٰہی سے قوت پاتا ہے۔ اللہ جس کی چاہے مدد کرے۔ اس جنگ میں اور اس غلبہ میں ان لوگوں کے لئے عبرت ہے جنہیں حقیقت تک باریابی حاصل ہے اور جن کی آنکھوں میں ایقان کا سرمہ ہے۔ (ابن عربی و روح البیان)

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِیْنَ وَ الْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ
زینت دی گئی واسطے لوگوں کے محبت خواہشات کی عورتوں اور لڑکوں سے اور ڈھیروں چنے ہوؤں
لوگوں کے لئے آراستہ کی گئی ان خواہشوں کی محبت عورتیں اور بیٹے اور تلے اوپر
مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ
سے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور چوپائے اور کھیتی باڑی
سونے چاندی کے ڈھیر اور نشان کیے ہوئے گھوڑے اور چوپائے اور

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿١٤﴾

یہ سامان ہے زندگی دنیاوی کا اور اللہ نزدیک اس کے اچھا ٹھکانا ہے

کھیتی یہ جیتی دنیا کی پونجی ہے۔ اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ایک جنگ کا ذکر تھا۔ اب جنگ کے سبب کا ذکر ہے کہ محبت دنیا ذریعۂ قتال ہے اگر سب لوگ خدا پرست ہو جائیں تو جنگ کی ضرورت نہ پڑے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مال و اولاد کے بے کار ہونے کا ذکر تھا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اس بے کار چیز سے انسان ایسی محبت کرتا ہے کہ آخرت کو بھول جاتا ہے کیونکہ اس کی حقیقت سے غافل ہے۔ **تیسرا تعلق:** سورۂ آل عمران کے شروع میں عرض کیا گیا کہ ابو حارثہ نے حضور ﷺ کے سچے ہونے کا اقرار کیا اور ایمان لانے سے معذرت یہ کی کہ مجھے اپنے مال چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ پھر واقعات سنا کر بتایا گیا کہ جس مال کی محبت میں انسان ایمان کھو بیٹھتا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ مصیبت کو دفع نہیں کر سکتا۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ انسان اس باطل چیز پر ہی فریفتہ ہے۔ غرضکہ دنیوی سامان کی بے کاری ثابت کی جا رہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ جب نبی ﷺ نے جنگ بدر کے بعد یہود مدینہ کو دعوت اسلام دی اور آنے والی مصیبتوں سے ڈرایا تو انہوں نے اپنے مال و سامان و اسباب کے بھروسہ پر کہا کہ جب ہم سے لڑو گے تو بتا دیں گے۔ اس آیت میں ان کے اس خیال کی تردید کی جا رہی ہے۔

تفسیر

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ. یہ نیا کلام ہے۔ زُيِّنَ تزیین سے بنا جس کا مادہ زین ہے بمعنی ظاہری ٹیپ ٹاپ۔ اصطلاح میں ہر ظاہری زیبائش کو بھی زینت کہتے ہیں اور بھلا معلوم ہونے کو بھی یہاں اگر زین کے معنی یہ کئے جائیں کہ لوگوں کے دلوں میں ان چیزوں کی محبت پیدا کی گئی تو اس کا فاعل رب تعالیٰ ہے کیونکہ ہر چیز کا خالق وہ ہی ہے اور اگر اس سے خواہشات پر بھڑکانا اور بری چیزوں کو بھلا دکھانا مراد ہے تو اس کا فاعل شیطان ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ (النمل: ۴) اس میں زینت کو رب کی طرف نسبت دی۔ دوسری جگہ فرماتا ہے۔ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ (النمل: ۲۴) یہاں زینت کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا۔ فرق وہ ہی ہے جو ہم نے عرض کیا کہ امتحان کے لئے دل میں دنیا کی محبت پیدا کرنا رب تعالیٰ کا کام اور شہوتوں کا بھڑکانا شیطان کا فعل۔ یہ بھی خیال رہے کہ زینت دو قسم کی ہوتی ہے۔ قدرتی اور بناوٹی قدرتی زینت باقی ہے اور بناوٹی زینت عارضی پوڈر کا رنگ پانی سے ڈھل جاتا ہے مگر چہرے کا قدرتی رنگ صابن سے بھی نہیں چھوٹتا پھر جیسے دنیاوی چیزوں میں قدرت نے رنگ' بُو' لذت رکھی ہے ایسی ہی دینی کاموں میں رنگت بھی ہے خوشبو بھی' اور ذائقہ بھی۔ نماز روزہ زکوٰۃ وغیرہ میں مہک و ذائقہ وغیرہ سب کچھ ہے پھر جیسے دنیاوی رنگ آنکھ سے' بو ناک سے لذت زبان سے محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے ہی دینی رنگ و بو کے لئے رب تعالیٰ نے ایمان و روح میں قوت دی ہے۔ جس سے روح ان چیزوں کو

محسوس کرتی ہے۔ شہادت کی لذت حضرت حسین سے پوچھو پھر جیسے بعض بیماریوں سے آنکھ ناک زبان درست احساس نہیں کرتے۔ یوں ہی بعض روحانی بیماریاں ان لذتوں کو محسوس نہیں ہونے دیتیں۔ یہاں اگر زُیِّنَ کا فاعل شیطان ہو تو اس سے دھوکہ کی نیت مراد ہے۔ جیسے کالے کو پاوڈر لگا کر گورا بنا دیا جائے۔ لِلنَّاسِ سے یا تو وہ یہودی مراد ہیں یا مشرکین یا سارے لوگ اور یہ ہی صحیح ہے حُبُّ الشَّهَوٰتِ میں اضافت لام کی ہے۔ حبّ بمعنی مصدری ہے۔ یعنی محبت کرنا۔ شہوات جمع شہوت کی ہے۔ بمعنی نفسانی خواہش اور نفس کا اشتیاق۔ شہوت دو قسم کی ہے سچی اور جھوٹی۔ سچی شہوت وہ جس کے بغیر بدن کا نقصان ہو۔ اور جھوٹی شہوت وہ جو ایسی نہ ہو۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ بعض چیزیں جسم کو مفید ہیں اور بعض روح کو پہلی چیزیں شہوات نفسانیہ ہیں اور دوسری شہوات روحانیہ۔ خیال رہے کہ یہاں شہوت بمعنی اسم مفعول ہے۔ بمعنی مشتہات اور نفس کے مرادات یعنی رب کی طرف سے لوگوں کے دل میں دنیوی اور نفسانی چیزوں کی محبت پیدا کی گئی یا شیطان نے دنیوی مرادوں کی محبت کو دلوں میں جما دیا اور شہوتوں پر بھڑکا دیا۔ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ۔ یا تو مِنْ بیانیہ ہے اور یہ عبارت شہوات کا بیان ہے۔ یا یہ شہوات کا حال ہے اور جار مجرور کائنۃ کے متعلق۔ نساء جمع ہے جس کا واحد کوئی نہیں۔ جیسے قوم اور ہر رہط بعض نے کہا کہ یہ امرء ۃ کی جمع بغیر لفظ کے ہے چونکہ دنیا میں سب سے بڑھ کر محبت عورت سے ہوتی ہے نیز مرد کے جنت سے آنے کا سبب بھی عورت ہی ہوئی۔ اور عورت کی پیدائش مرد کے جسم سے ہوئی۔ نیز پہلے قتل کی بنا عورت ہی ہوئی۔ اس لئے پہلے اس کا ذکر کیا گیا۔ بَنِيْنَ ابن کی جمع ہے یا تو اس سے بیٹے بیٹیاں ساری اولاد مراد ہے یا صرف بیٹے کیونکہ عام انسان خصوصاً اہل عرب لڑکوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے بیٹوں ہی کا ذکر کیا گیا اور چونکہ اولاد کی محبت عورت کے بعد ہے۔ اس لئے اس کا ذکر نساء کے بعد ہوا۔ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ۔ قَنَاطِيْرِ قنطار کی جمع ہے یا تو بروزن فعلال ہے یا فعنال۔ پہلی صورت میں اس کا نون اصلی ہے اور دوسری میں زائدہ۔ لغت میں ہر مضبوط چیز کو قنطر کہتے ہیں۔ اسی لئے مضبوط پل اور مضبوط عمارت اور مضبوط بات کو بھی قنطر کہا جاتا ہے۔ اہل عرب بولتے ہیں۔ قَنْطَرْتُ الشَّيْئَ۔ یہاں بہت مال مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ سولہ سو (۱۶۰۰) دینار کسی کے خیال میں بارہ ہزار دینار (۱۲۰۰۰) کوئی کہتا ہے ستر ہزار دینار (۷۰۰۰۰) کوئی اسی ہزار دینار (۸۰۰۰۰) مگر صحیح یہ ہے کہ قنطار کی کوئی حد نہیں۔ ہر زیادہ مال قنطار کہلائے گا۔ (کبیر و معانی وغیرہ) بعض نے کہا کہ قِنطارٌ قنطرۃ سے بنا بمعنی پل۔ چونکہ مال کے ذریعہ انسان آسانی سے زندگی کا زمانہ عبور کر لیتا ہے۔ جیسے پل کے ذریعہ دریا کو۔ اس لئے اسے قنطار کہتے ہیں۔ مُقَنْطَرَةِ قنطرۃ کا اسم مفعول ہے۔ معنی مضبوط کرنا، جمع کرنا، پل باندھنا، ڈھیر لگانا، ایک دوسرے پر چلنا۔ یہاں سب معنی بن سکتے ہیں کیونکہ سب کا مطلب قریباً ایک ہی ہے۔ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ قناطیر کا بیان ہے یا اس کا حال۔ ذَهَب اور فضہ کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے۔ یہاں اتنا عرض کرتے ہیں کہ ذَهَب مؤنث ہے کہا جاتا ہے۔ الذهب الحمراء۔ اس کی تصغیر ذھیبۃ آتی ہے۔ اس کی جمع اذھاب بھی ہے۔ ذھوب بھی اور ذھبان بھی۔ بعض کے نزدیک یہ خود ذھبۃ کی جمع ہے اور ذھاب سے مشتق بمعنی جانا، کیونکہ یہ ملک سے جا کر فائدہ دیتا ہے نہ کہ قبضہ میں رہ کر۔ اس لئے ذھب کہلاتا ہے۔ فضۃ کی جمع فضض ہے اور یہ الفضاض سے مشتق ہوا۔ بمعنی بکھرنا چونکہ چاندی بہت دیر جیب میں جمع نہیں رہتی بلکہ بازار میں جاتے ہی متفرق ہو جاتی ہے۔ اس لئے فضہ کہتے ہیں۔ (روح المعانی) وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ۔ یہ قناطیر پر

عطف ہے۔ خَیلٌ جمع ہے جس کا واحد کوئی نہیں۔ بعض نے کہا کہ اس کا واحد خائل ہے۔ جیسے طائر سے طیر یہ خیلاء سے مشتق ہے۔ بمعنی تیزی اور اکڑ۔ اسی لئے گمان کو خیال کہتے ہیں کہ وہ تیز ہے اور اکڑ کر چلنے کو اختیال کہا جاتا ہے۔ چونکہ گھوڑے میں تیزی بھی ہے اور اکڑ بھی۔ اس لئے اسے خیل کہتے ہیں۔ تفسیر خازن نے فرمایا کہ جب گھوڑے پر کوئی سوار ہوتا ہے تو اس کے دل میں فخر اور تکبر پیدا ہوتا ہے۔ مُسَوَّمَۃٌ یاسومٌ سے بنا بمعنی چرنا یاسمۃٌ اور سیماءٌ سے بمعنی نشانی۔ اسی لئے چرنے والے جانور کو سائمہ کہتے ہیں۔ اور نشانی کو سیما سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ (فتح: ۲۹)۔ بعض نے کہا کہ سمۃٌ بمعنی حسن سے بنا' رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ (نمل: ۱۰) (معانی و کبیر) یعنی جنگل میں چرنے والے گھوڑے یا حسین گھوڑے یا نشان لگائے ہوئے گھوڑے خواہ نشانی علامات کیلئے ہو یا عمدگی کی بنا پر۔ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔ اَنْعَامٌ نَعَمٌ کی جمع ہے۔ یہ نعومۃ سے مشتق ہے بمعنی نرمی و عمدگی اصطلاح میں اونٹ' گائے' اور بکری پر بولا جاتا ہے مگر اونٹ پر خصوصیت سے حَرْثٌ مصدر ہے۔ بمعنی بونا' مگر یہاں بمعنی مفعول ہے۔ ہر کھیتی کو خواہ وہ دانہ کی ہو یا ساگ پات کی' یا پھلوں کی حرث کہا جاتا ہے اس کی پوری تحقیق ہم پہلے سیپارہ میں زیر آیت یُهْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ (بقرہ: ۲۰۵) کر چکے۔ حرث اور زرع کا فرق وہیں بتایا گیا۔ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ ذٰلِکَ سے ان ساتوں مذکورہ چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ متاع یہ تمتع کا مصدر ہے۔ یہاں بمعنی اسم مفعول ہے۔ حیٰوۃٌ اور دُنیا کی تحقیق پہلے ہو چکی یعنی یہ تمام چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہیں کہ کچھ دن کام دیں گی پھر نہیں۔ دنیا میں زندگی اچھی ہے مگر دنیا کی زندگی بری۔ جب دل میں دنیا آ جائے تو وہ دنیا کی زندگی بن جاتی ہے۔ یہ ہی زندگی ہلاکت ہے۔ اسی کے متعلق ارشاد ہوا اموات غیر احیاء اور دنیا میں زندگی والے بعد موت بھی نہیں مرتے۔ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ (بقرہ: ۱۵۴) وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ حسن بمعنی حسن ہے اور اس میں صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے۔ مآب آبَ یَؤُبُ کا اسم ظرف ہے۔ اس کا مصدر اوب بمعنی رجوع ہے۔ یہ اصل میں ماوبٌ تھا تعلیل سے مَاٰبٌ ہو گیا۔ یعنی اللہ کے نزدیک اچھی لوٹنے کی جگہ جنت ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ فانی دنیا میں پھنس کر اس سے غافل نہ ہو جائے۔

خلاصہ تفسیر

دنیا فانی مقام عبرت ہے' عالم باقی کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے پریشان خواب مگر اس چشم حقیقت بین پر دنیوی لذتوں اور اس کے سامان پر محبتوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ انسان عورتوں اولاد اور سونے چاندی کے ڈھیروں اور اچھے گھوڑوں اور گائے بیل' اونٹ اور کھیتی باڑی کی محبت میں ایسا پھنسا ہے کہ اسے آخرت کے سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ وہ عالم آخرت پر دنیا کو ترجیح دے رہا ہے۔ اور چند روزہ عیش کے لئے کفر' بے دینی' گناہوں میں مبتلا ہے اور عالم باقی کی خوبیوں سے بے خبر۔ انسان کو دنیوی سامان خصوصاً روپیہ پیسہ مال' دولت اندھا کر دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب میں دولت کا مالک ہو گیا تو دنیا کا مالک ہو گیا کیونکہ اس سے ہر چیز خرید سکتا ہوں۔ اس نشہ میں وہ خدا اور رسول سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر خیال رہے کہ یہ چیزیں صرف زندگی کا تھوڑا سامان ہیں نہ انسان کو ہمیشہ یہاں ٹھہرنا ہے نہ اس کے لئے یہ چیزیں ہمیشہ کارآمد۔ خدا کے پاس اس سے زیادہ عمدہ اور لذیذ روحانی اور جسمانی نعمتیں موجود ہیں۔ ادھر رغبت کرنی چاہیے۔ اگرچہ انسان کے علاوہ

جنات، جانور وغیرہ میں بھی محبت کا مادہ ہے مگر چند وجہ سے خاص انسان کا ذکر فرمایا کہ انسانوں کو ان کی نعمتوں کی زینت دی گئی۔ ایک یہ کہ ان مذکورہ سات چیزوں سے محبت صرف انسان کو ہے۔ جانوروں کو محبت صرف کھانے اور اولاد سے ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان کی محبت ان چیزوں سے دائمی ہے۔ دوسروں کی محبت عارضی۔ جانور کچھ روز بعد بچے کو بھول جاتے ہیں۔ انسان اولاد سے مرتے دم بلکہ بعد مرے تک محبت کرتا ہے۔ تیسرا یہ کہ انسان ان کی محبت میں گرفتار ہو کر رب کی نافرمانی کر لیتا ہے۔ رب تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ دوسری مخلوق میں یہ عیب نہیں۔ چوتھا یہ کہ چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس لئے اس میں پابندیاں بہت زیادہ ہیں۔ عشق و احکام اس کے ذمہ ہیں۔ اسے دوسروں سے محبت کر کے ان سے بے پرواہ ہو جانا زیادہ خطرناک ہے۔ ان وجوہ سے خصوصیت سے یہاں انسان کا ذکر ہوا فرمایا زُيِّنَ لِلنَّاسِ۔

خیال رہے کہ انسان اس ناسمجھ بچے کی طرح ہے جو ہر کھلونے پر فریفتہ ہو جاتا ہے جب ماں کے پیٹ میں تھا تو اسی کو اپنا حقیقی قیام گاہ سمجھا کہ وہاں سے آنا چاہتا ہی نہ تھا۔ جب باہر آیا تو اس کو یاد کر کے رورو کر غل مچایا۔ یہاں آ کر اپنا مقام سمجھ گیا اور اس پر ایسا عاشق ہو گیا کہ یہاں سے جانا چاہتا ہی نہیں۔ خیال رہے کہ یہ دنیا اس عالم کے مقابل میں ایسی ہی تنگ و تاریک اور تکلیف دہ ہے جیسے اس دنیا کے مقابلہ میں ماں کا پیٹ جیسے ماں کے پیٹ میں ہمیشہ قیام نہ تھا۔ ایسے ہی یہاں بھی ہمیشہ قیام نہ ہوگا۔ اس لئے۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ! کہہ کر وہاں کا شوق دلایا۔

مجرب عمل: اگر زوجین میں نا اتفاقی ہو تو طالب یہ آیت سات بار سات عدد سفید الائچی پر دم کر کے اول و آخر درود شریف تین تین بار پڑھ کر مطلوب کو کھلائے تو انشاء اللہ ان میں محبت پیدا ہو جائے گی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اپنی بیوی و ماں اور اولاد کی جائز محبت منع نہیں کیونکہ یہ رب کی طرف سے ہے۔ جیسے کہ زُيِّنَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ یہ ہی محبت دنیا کے بقاء کا ذریعہ ہے کہ بیبیوں اور اولاد کی محبت سے نسل قائم ہے۔ اور مال کی محبت سے گھر اور بازار اور بستیاں آباد۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے قلب میں دنیا کی دو چیزوں سے محبت ڈالی گئی۔ خوشبو اور عورتیں، یعنی یہ محبت رب کی طرف سے جائز ہے۔ **دوسرا فائدہ:** ترک دنیا بیوی بچوں سے بے خبر رہنا شرعاً ناپسندیدہ ہے کیونکہ یہ حکمت خلق کے خلاف ہے۔ یہ بھی زُيِّنَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** دنیا کی بے جا محبت جو آخرت سے غافل کر دے۔ سخت بری ہے اور اس کا سبب شیطان ہے۔ جیسا کہ زُيِّنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ شیطان نے ناجائز محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کی۔ تمام گناہوں کی جڑ محبت دنیا ہے۔ **چوتھا فائدہ:** مال جمع کرنا برا نہیں جبکہ اس کا ذریعہ اور مقصد برا نہ ہو۔ جیسا کہ اَلْقَنَاطِيْرُ الْمُقَنْطَرَةِ سے معلوم ہوا۔ مال دین کی ڈھال اور دنیوی آبرو کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے مال کا برباد کرنا شرعاً جائز ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (انعام: ۱۴۱) اور فرماتا ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔ (الاسراء: ۲۸) **پانچواں فائدہ:** دنیا کی ظاہری ٹیپ ٹاپ حق پرستوں اور شہوت پرستوں کے درمیان باعث فرق ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الکہف: ۷) جو دنیا میں رہ کر رب تعالیٰ کی عبادت کرے وہ مرد کامل ہے (خزائن) **چھٹا**

فائدہ: چونکہ دنیا فانی ہے اس لئے اس کی ہر چیز فانی۔ اور چونکہ آخرت باقی ہے اس لئے اس کی ہر چیز باقی۔ کمزور بنیاد کی دیوار کمزور ہے اور مضبوط بنیاد کی دیوار مضبوط۔ انسان کو چاہیے کہ متاع دنیا کو آخرت کا توشہ بنالے اور ایسے کام میں خرچ کرے جس میں اس کی عاقبت درست ہو۔ جیسا کہ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مردوں کے دل میں عورتوں کی اور باپ کے دل میں بیٹوں کی محبت دی گئی۔ حالانکہ یہ محبت دوطرفہ ہوتی ہے۔ شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے ایسے ہی باپ کو اولاد سے۔ اولاد کو باپ سے۔ پھر یہاں یک طرفہ محبت کا کیوں ذکر فرمایا گیا؟ **جواب:** یہ درست ہے مگر مرد میں محبت کا غلبہ ہے اور عورت میں محبوبیت کا۔ ایسے ہی باپ میں محبت غالب ہے۔ اولاد میں محبوبیت۔ جیسا کہ جانور انسان کے خدمتگار ہیں۔ اور انسان ان کا مخدوم مگر انسان بھی ان کی خدمتیں کرتا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** یہاں یہ کیوں فرمایا گیا۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ یا تو زُيِّنَ الشَّهَوَاتِ کہہ دیا جاتا۔ یا حُبِّبَ الشَّهَوٰتِ۔ اس چھوٹی عبارت میں بھی مقصد حاصل ہو جاتا؟ **جواب:** اس سے مبالغہ مقصود ہے۔ اولاً تو محبوب چیزوں کو شہوت فرمایا گیا یعنی سراپا محبت' پھر ان کی محبت کو زین کا مفعول قرار دیا گیا۔ یعنی یہ دنیا کی پیاری چیزیں گویا سراپا شہوات ہیں۔ وہ خود تو کیا ان کی محبت بھی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گویا وہ انتہائی درجہ کے محبوب ہیں۔ جیسے فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ (بقرہ: ۲۳) **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں سونے چاندی کی قید کیوں لگائی گئی۔ انسان کو تو غلہ کا ڈھیر بھی پیارا معلوم ہوتا ہے' بلکہ سونا چاندی بہت جلد قبضہ سے نکل جاتا ہے اور زمین وغیرہ ہمیشہ اپنے پاس ہی رہتی ہے ان کی محبت سونے چاندی سے بڑھ کر ہے۔ **جواب:** قدرت نے چاندی سونے کو تمام چیزوں کی قیمت قرار دیا۔ ان کا مالک گویا ہر چیز کا مالک ہے وہ سمجھتا ہے جو چاہوں گا خرید لوں گا۔ لہٰذا اس سے زیادہ محبت ہے اور سونا چاندی ہی تمام مالوں کی اصل ہے۔ نیز سونے چاندی کی ملکیت سے انسان کو قدرت حاصل ہوتی ہے۔ اور قدرت کمال ہے اور کمال محبوب بالذات۔ لہٰذا یہ دونوں مال بھی ہیں اور کمال بھی ان دو وجہ سے پیاری ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑوں سے محبت کرنا بھی برا ہے حالانکہ دوسری جگہ قرآن کریم گھوڑوں کی قسم کھا رہا ہے۔ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا۔ (العادیات: ۱) اور حضور انور ﷺ فرماتے کہ گھوڑے کی پیشانی کے بالوں سے خیر و بھلائی وابستہ ہے۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** گھوڑے تین قسم کے ہیں۔ جہاد کے گھوڑے' کاروبار کے گھوڑے۔ جیسا تانگہ وغیرہ کے گھوڑے' فخر و ریا کے گھوڑے۔ پہلے گھوڑوں کی تعریف ہے اور تیسرے گھوڑوں کی یہاں برائی ہے دیکھو حدیث شریف میں کھیتی باڑی کی تعریف بھی آتی ہے کہ ارشاد ہوا غلہ دبانے والا لعنتی ہے اور غلہ اگانے والا' لانے والا مرزوق ہے اور برائی بھی وارد ہے کہ فرمایا جس گھر میں کھیتی باڑی کے آلات ہوں گے وہاں ذلت و خواری ہوگی۔ جس کھیتی سے غفلت ترک جہاد ہو وہ ذلت کا سامان ہے اور جس سے بندوں پر رزق کی فراوانی ہو وہ رحمت ہے۔

تفسیر صوفیانہ

فرشتوں میں عقل ہے' شہوت نہیں۔ اور جانوروں میں شہوت ہے عقل نہیں مگر انسان میں عقل بھی ہے اور شہوت بھی۔ جس کی

عقل شہوت پر غالب ہو وہ فرشتوں سے بڑھ کر ہے اور جس کی شہوت عقل کو ڈھک لے وہ جانور سے بدتر (روح البیان) عقل کا تعلق روح سے ہے اور شہوت کا نفس سے۔ زُيِّنَ لِلنَّاسِ میں اس نفسانی شہوت کا ذکر ہے۔ اور واللہ عندہ میں عقل کا تذکرہ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ انسان عالم علوی اور سفلی سے مرکب ہے۔ دنیا میں آ کر اس کا نور بصیرت نفسانی پردوں اور بدنی حجابوں میں ڈھک گیا اور یہاں کی لذتوں کے پانی سے اس کی تیزی ٹھنڈی پڑ گئی۔ اور شہوت حیوانیہ کی ہواؤں نے اسے اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ اب وہ اس پردیس میں اپنے وطن سے دور حق سے مجبور ہے جس کو یہاں کی مصیبتوں اور تکالیف کی ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں۔ اس کے کان میں شیطان اور نفس کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جو اسے ہلاکت کی طرف بلا رہی ہیں۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے عالم عقل کی روشنی بھی ہے جو اسے کامیابی کی طرف رہبری کر رہا ہے جو کوئی اس نور پر توجہ نہ کرے اور ان بہکانے والی آوازوں کے پیچھے چل دے وہ اس جگہ پہنچتا ہے جہاں نفس خوش ہوتا ہے۔ آنکھوں کو لذت آتی ہے اور اس باغ کو نفس اپنا گھر سمجھتا ہے اس کا نام حُبُّ الشَّهَوَاتِ ہے۔ اور جو کوئی ان آوازوں پر کان نہیں دھرتا بلکہ اس شعاعِ نوری کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ آخر کار ایسے باغ میں پہنچتا ہے جس کے لئے کبھی خزاں نہیں اور ایسے آستانہ پر اس کا سر پہنچ جاتا ہے جہاں سے اسے کوئی اٹھا نہیں سکتا۔ یہ ہی اس کا مطلب ہے کہ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ (ابن عربی) سیڑھی کے ذریعہ اوپر سے نیچے بھی اتر سکتے ہیں اور نیچے سے اوپر بھی جا سکتے ہیں۔ دنیا اور اس کی چیزیں ایک زینہ ہیں۔ بے وقوف ان میں پھنس کر نیچے گرتا ہے اور عقل مند انہی کے ذریعہ رب تعالیٰ تک پہنچتا ہے جس نے ان چیزوں کو اپنی زندگی کا مقصود سمجھ لیا وہ اس کے ذریع نیچے اتر آیا۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ۔ (التین: ۵) اور جو ان میں رہ کر حق کو نہ بھولا اور ان کی خدمت کو اتباع سنت اور خدارسی کے لئے کیا۔ وہ اسی سیڑھی کے ذریعہ اوپر پہنچ گیا۔ زین للناس میں اترنے والوں کا ذکر ہے۔ اور وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ میں چڑھنے والوں کا۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ عشق و محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اور فطرت بدلنا ناممکن ہے۔ جس کے نتائج مرے مرے نکلتے ہیں۔ ہاں فطرت کی اصلاح کرنی چاہیے۔ آنکھ کو دیکھنے سے نہ روکو' کان کو سننے سے بند نہ کرو بلکہ ان کی اصلاح کرو کہ انہیں محرمات سے بچالو۔ یوں ہی عشق و محبت انسان کی فطرت ہے۔ اس سے وہ باز نہیں آ سکتا۔ اس کی بھی اصلاح کرو کہ دنیاوی ناجائز محبتوں سے اسے چھوڑا لو اور آخرت کی محبت اس میں بسا لو۔ یہ محبت ضرور کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ و رسول ﷺ سے ہی کرے۔ جب اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ سے محبت ہوئی تو زن و فرزند مال دولت سب کی محبتیں عین بن جائیں گی۔ اس وجہ سے ارشاد ہوا۔ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ

فرماؤ کیا خبر دوں میں تمہیں بہتر کی اس سے واسطے ان لوگوں کے جو ڈریں نزدیک رب ان کے باغات ہیں کہ بہتی ہیں

تم فرماؤ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتا دوں پرہیزگاروں کے لئے ان کے رب کے پاس جنتیں ہیں

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ

نیچے سے ان کے نہریں ہمیشہ رہنے والے ان میں اور بیویاں ہیں پاک اور رضامندی طرف سے اللہ کے

جن کے نیچے نہریں رواں ہمیشہ ان میں رہیں گے اور ستھری بیویاں اور اللہ کی خوشنودی

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

اور اللہ دیکھنے والا ہے بندوں کو

اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اجمالاً فرمایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ اب اس کی تفصیل فرمائی جارہی ہے کہ وہ ٹھکانا جنت اور وہاں کی نعمتیں ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے مگر اس کا ذکر نہ ہوا تھا کہ کس کے لئے۔ اب اس کا ذکر بھی ہو رہا ہے کہ ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ خاص پرہیزگاروں کے لئے ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دنیوی نعمتوں کا آخرت سے مقابلہ کیا گیا تھا کہ وہ رذیل ہیں۔ اور آخرت عزیز۔ اب اس کے دلائل ارشاد ہو رہے ہیں کہ دنیا دوست' دشمن' سب کے لئے ہے مگر آخرت صرف پرہیزگاروں کے لئے۔ دنیا کو فنا ہے' آخرت کو بقا۔ دنیا میں پھنسنا ناراضی رب کا ذریعہ' اور جنت میں رب سب سے راضی' گویا وہ دعویٰ تھا یہ دلائل۔

تفسیر

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ۔ قُلْ میں حضور ﷺ سے خطاب ہے۔ چونکہ اعمال عصاء موسوی کی طرح مفید ہیں اور حضور انور ﷺ کا توسل دست موسوی کی طرح ہے۔ عصاء موسوی دست موسوی میں اثر دکھاتا تھا۔ اس ہاتھ کے بغیر عصا بیکار ہوتا تھا۔ ایسے ہی حضور ﷺ کے توسل کے بغیر اعمال بیکار ہیں۔ اس لئے قُلْ فرمایا گیا کہ مضمون ہمارا ہو محبوب زبان و توسل تمہارا ہو۔ اَؤُنَبِّئُكُمْ کا پہلا ہمزہ استفہام تقریری کا ہے۔ انبئ نباءٌ سے بنا بمعنی خبر۔ اصطلاح میں عظیم الشان خبر یا غیب کی خبر پر اکثر بولا جاتا ہے۔ دیگر پر کم۔ اسی لئے ہر قاصد کو مخبر کہہ سکتے ہیں۔ نبی نہیں کہہ سکتے۔ لہٰذا نبی وہ جو غیب کی خبریں لائے۔ جو حضور انور ﷺ کے علوم غیبیہ کا انکار کرتا ہے۔ وہ در پردہ آپ (ﷺ) کی نبوت کا انکار کرتا ہے۔ كُمْ میں سارے لوگوں سے خصوصاً کفار سے خطاب ہے کیونکہ حضور انور ﷺ سارے عالم کے نبی ہیں تو آپ (ﷺ) کے فرمان سارے عالم کے لئے ہیں۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ۔ (سباء: ۲۸) لہٰذا حضور ﷺ کا فرمان سارے جہاں کے لوگوں کے لئے ہے۔ بِخَيْرٍ کا ب یا تعدیہ کا ہے۔ یا صلہ کا۔ اور یہ انبئ کے متعلق۔ خیر معنی اسم تفضیل ہے۔ مِنْ سے مستعمل۔ ذٰلِكُمْ میں عورتوں' اولاد سونے چاندی کے ڈھیر اور اچھے گھوڑے وغیرہ سب کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اے نبی ﷺ آپ ان سب لوگوں سے یا غافلین سے فرمائیں کہ کیا میں تمہیں اس چیز کی خبر دوں جو اس دنیوی سارے سامان سے بہتر ہے یا یہ چیزیں وہ ہیں جو گذشتہ مذکورہ چیزوں میں شامل ہو جائیں تو انہیں خیر کر دیں۔ یہ وہ چورن ہے جو ہر غذا کو ہضم کر دیتا ہے۔ خیال رہے کہ بتانا ہی منظور تھا مگر یہ سوال شوق دلانے کے لئے ہے کیونکہ پوچھ کر جو شئی بتائی جائے اس کو سننے والا شوق سے سنتا ہے۔ نیز

خیال رہے کہ چونکہ دنیا کی ساری راحتیں تکلیف سے مخلوط ہیں اور فانی۔ آخرت کی نعمتیں خالص نعمتیں ہیں اور باقی اس لئے وہ اس سے بہتر ہیں۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ نیا جملہ ہے بخیر کا بیان۔ لِلَّذِيْنَ خبر مقدم جَنّٰتٌ مبتدا اور عِنْدَ رَبِّهِمْ جنت کا ظرف یا حال۔ لِلَّذِيْنَ میں اگر لام ملکیت کا ہے تو تقویٰ سے مراد پرہیز گاری' نیک کاری ہے۔ یعنی واجبات کا ادا کرنا اور گناہوں سے بچنا' کیونکہ جنت اصل ملک پرہیز گاروں کی ہے اور اگر اس کا متعلق ثابت ہے تو تقویٰ سے مراد شرک وکفر سے بچنا ہے کہ آخر کار سارے ہی مسلمان جنت میں جائیں گے۔ گنہگار ہوں یا پرہیز گار۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ قرآن کے عرف میں تقویٰ بمعنی ایمان عام مستعمل ہے۔ رب فرماتا ہے۔ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى۔ (الفتح:۲۶) عِنْدَ سے قرب مکانی مراد نہیں بلکہ قرب ربی' کیونکہ رب تعالیٰ جگہ سے پاک ہے۔ جَنّٰتٌ جمع جنت کی ہے بمعنی گھنا باغ۔ جس کی زمین کھلی نہ ہو۔ چونکہ ایک ایک جنتی کو کئی کئی باغ ملیں گے۔ اس لئے جمع ارشاد ہوا۔ یعنی پرہیز گاروں یا مسلمانوں کے لئے ان کے رب کے پاس خوبصورت باغ ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ فرما کر یہ بتایا کہ جنت دنیا میں ہی نہ ملے گی بلکہ رب تعالیٰ کے پاس پہنچ کر ملے گی۔ دنیا کام کی جگہ ہے۔ آخرت حصول انجام کی۔ فصل بوتے ہی دانہ نہیں ملتا۔ باغ لگاتے ہی پھل نہیں کھائے جاتے۔ بھینس کی کٹی پیدا ہوتے ہی دودھ نہیں دیتی۔ بچہ اسکول میں پہنچتے ہی بی اے نہیں ہو جاتا۔ ان چیزوں کے انجام بہت بعد میں دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایمان ونماز وغیرہ اختیار کرتے ہی جنت نہیں مل جاتی۔ جنت' روضہ' بستان' حدیقہ' حائط' ان سب کے معنی باغ ہیں مگر جنت خصوصی باغ ہے۔ ہر باغ کو جنت نہیں کہا جاتا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ عِنْدَ رَبِّهِمْ اتقوا کا ظرف ہے اور اس سے منافقین کو نکالنا مقصود ہے یعنی جو رب کے نزدیک متقی ہیں ان کے لئے جنتیں ہیں۔ منافق لوگوں کی نگاہ میں تو پرہیز گار ہے مگر رب تعالیٰ کے نزدیک کافر۔ لہٰذا وہ اس سے خارج ہے۔ (کبیر) اللہ کے نزدیک متقی یا تو وہ جو فقط جسم کا ہی متقی نہ ہو' بلکہ دل کا بھی متقی نیک اعمال جسم کا تقویٰ ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم دل کا تقویٰ رب فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (حج:۳۲) عمل اور ہے ادب کچھ اور' عمل والا عند الناس متقی ہے اور ادب والا عند اللہ متقی یا عند اللہ متقی وہ ہے جس کا خاتمہ تقویٰ وطہارت پر ہو۔ ہم حال کو دیکھتے ہیں۔ رب کے یہاں مال یعنی انجام دیکھا جاتا ہے۔ یا رب تعالیٰ کے ہاں متقی وہ ہے جس کا نام متقیوں کی فہرست میں آ چکا ہے۔ یا رب تعالیٰ کے ہاں متقی وہ ہے جو اخلاص والا ہو۔ نفاق والا متقی اگرچہ مخلوق اسے متقی کہے مگر خالق کے ہاں متقی نہیں۔ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔ یہ جملہ جنت کا حال یا صفت ہے۔ تَجْرِيْ جریٌ سے بنا بمعنی بہنا۔ تحتھا کا مرجع جَنّٰتٌ ہیں۔ انہار نہر کی جمع ہے جس کی تحقیق ہم پہلے پارہ میں کر چکے ہیں۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ جو دریا سے کاٹ کر سیدھی نکالی جائے جس میں کچھ کجی ٹیڑھا پن نہ ہو وہ نہر کہلاتی ہے۔ بہنا پانی کی صفت ہے۔ یہاں نہر کی صفت قرار دینا مجازاً ہے۔ چونکہ جنت میں دودھ' شہد پانی اور شراب طہور کی مختلف نہریں ہوں گی۔ اس لئے جمع ارشاد ہوا۔ یعنی جنتیں ایسی ہیں کہ ان کے نیچے ہمیشہ نہریں بہتی ہیں۔ ان کے خشک ہو جانے کا کبھی احتمال نہیں۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔ یہ اَلَّذِيْنَ کا حال ہے۔ خَالِدِيْنَ خلود سے بنا بمعنی ہیشگی اور دراز مدت۔ یہاں ہیشگی مراد ہے۔ یعنی متقی ان جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے' کبھی نہ نکلیں گے۔ یا ان باغوں میں سدا بہار رہے گی۔ کبھی خزاں نہ آئے گی۔ یا ان باغوں کے پھل دائمی ہوں گے۔ فصل یا موسم کے پابند نہ ہوں گے۔ غرضکہ خلود میں بڑی وسعت ہے۔ اس سے جنت اور جنتی لوگ

دونوں کا ہمیشہ رہنا ثابت ہوا کہ سب چیزیں اگرچہ ازلی نہیں مگر ابدی ہوں گی۔ چونکہ بیوی کے بغیر کوئی راحت کامل نہیں ہوتی مرد کو وحشت رہتی ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ۔ یہ جنت پر معطوف ہے۔ اَزْوَاجٌ زوج کی جمع ہے بمعنی جوڑا' بیوی کو بھی زوج کہتے ہیں اور شوہر کو بھی مگر یہاں بیبیاں مراد ہیں کیونکہ پہلے مردوں کا ذکر ہوا اور مرد کے لئے بیوی ہی ہوتی ہے۔ مُطَهَّرَةٌ ازواج کی صفت ہے۔ یہ بہت جامع لفظ ہے۔ یعنی وہ بیبیاں ظاہری عیوب سے بھی پاک ہیں۔ جیسے حیض' نفاس' پیشاب' پاخانہ' تھوک' رینٹ' میل کچیل وغیرہ اور باطنی عیبوں سے بھی دور جیسے حسد' بغض' غصہ' بد خلقی' بدصورتی۔ اور شوہر کے سوا غیر پر نظر کرنا۔ خیال رہے کہ ازواج سے مراد یا تو بہت سی بیویاں ہیں کہ ادنیٰ جنتی کو ۷۰ بیویاں عطا ہوں گی اور اس کو سو مردوں کی طاقت ملے گی۔ یا چند قسم کی بیویاں مراد اپنی دنیا کی بیوی۔ دوسرا کفار کی مومن بیبیاں اور حوریں مطہرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں منی کا خروج بھی نہ ہوگا کہ یہ بھی گندگی ہے بلکہ صرف ہوا خارج ہوگی۔ جس کی لذت منی سے زیادہ ہو گی۔ جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ ان سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ ہے کہ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ واؤ عاطفہ ہے اور رِضْوَانٌ جنت پر معطوف۔ یہ لفظ رضا سے بنا۔ بڑی رضا کو رضوان کہا جاتا ہے چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ کی ہے اس لئے قرآن کریم میں رضائے الٰہی کو رضوان کہتے ہیں۔ خیال رہے کہ رضوان رے کے کسرہ سے بھی ہے۔ جیسے جرمان اور قربان اور رے کے پیش سے بھی جیسے طغیان' رجحان اور کفران۔ یہ باب ضرب کا مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے رضیف رضا و رضوانا۔ یہاں اس کی تنوین تعظیم کی ہے اور مِنَ اللّٰهِ رضوان کی صفت یعنی جنتیوں کے لئے ان تمام نعمتوں کے ساتھ رب کی بڑی رضامندی بھی ہے۔ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِالْعِبَادِ۔ یہ نیا جملہ ہے۔ گذشتہ کی دلیل۔ بصیر بمعنی علیم یا خبیر ہے۔ عباد سے خاص متقی مراد ہیں یا عام لوگ یعنی اللہ تعالیٰ متقی بندوں کے سارے حالات سے خبردار ہے۔ لہٰذا ہر ایک کو بقدر تقویٰ جزا دے گا۔ یا اللہ تعالیٰ سارے بندوں کے سارے معاملات جاننے والا ہے۔ لہٰذا مجرموں کو سزا اور اطاعت کرنے والوں کو جزا عطا فرمائے گا۔ سزا اس کا عدل ہے اور جزا اس کا فضل۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ ان غافلوں سے جو فانی دنیا کی ٹیپ ٹاپ میں پھنس کر آخرت سے غافل ہو گئے ہیں' فرما دو کہ کیا میں تمہیں ایسی چیز کی خبر دوں جو ان تمام سے اعلیٰ و افضل ہے کہ دنیا کی ہر نعمت مصیبت سے شامل ہے اور اس کے باوجود فانی' وہ خالص ہے اور باقی۔ یہاں کی مشغولیت رب کی ناراضی کا باعث اور وہ رب کی رضامندی کا ذریعہ۔ جو لوگ ایمان و تقویٰ اختیار کریں گے۔ انہیں رب کے پاس ایسے گھنے باغ ملیں گے جن میں ساری نعمتیں جمع ہوں گی۔ ان کے نیچے دودھ' شہد' شرابًا طہورًا اور خالص پانی کی نہریں بہتی ہوں گی۔ نہ وہ باغ کبھی سوکھیں۔ نہ ان میں خزاں آئے پھر کمال یہ کہ وہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے کہ نہ مریں نہ انہیں کوئی نکالے اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں وہ بیبیاں عطا فرمائی جائیں گی جو ہر ظاہری اور باطنی عیب سے پاک ہیں۔ نہ انہیں کبھی حیض و نفاس آئے' نہ پیشاب پاخانہ کی حاجت پڑے۔ نہ وہ حسد کریں۔ نہ کسی سے کینہ رکھیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی بڑی اور دائمی رضامندی ان کے لئے ہوگی کہ وہ کبھی ناراض نہ ہوگا۔ یہ وہ نعمت ہے جس کے مقابل کوئی نعمت نہیں۔ اللہ تعالیٰ بند[illegible] باطنی [illegible] عمل جزا دے گا۔ حدیث شریف

میں ہے کہ رب تعالیٰ جنتیوں سے فرمائے گا کہ اے جنتیو! کیا تم راضی ہو گئے۔ وہ عرض کریں گے۔ اے مولیٰ کیوں نہ راضی ہوں۔ تو نے ہمیں وہ دیا جو کسی مخلوق کو نہ دیا' فرمائے گا کہ کیا میں تمہیں وہ نعمت دوں جو ان سے بڑھ کر ہو۔ عرض کریں گے۔ اے مولیٰ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ فرمائے گا کہ میں تم سے راضی ہوں۔ کبھی ناراض نہ ہوں گا (مسلم و بخاری) اور ظاہر ہے کہ بندہ کے لئے رضائے الٰہی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ اسی طرف اشارہ ہے۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرِضْوَاعَنْهُ۔ خیال رہے کہ جنت میں باغات ہیں' کھیت نہیں کیونکہ کھیت سے باغ کی زینت زیادہ ہے کہ باغ میں سبزہ بھی ہوتا ہے اور سایہ بھی۔ کھیت میں صرف سبزہ ہے سایہ نہیں۔ نیز کھیت کی کاشت ہر سال ہوتی ہے۔ باغ ایک بار بو کر ہمیشہ پھل حاصل کیا جاتا ہے۔ وہاں ہر سال کاشت نہیں بلکہ ایک بار کاشت ہو چکی۔ اب فصل ہمیشہ کھاتے جاؤ۔ نیز کھیت میں دانہ ہوتا ہے۔ باغ میں پھل دانہ بقاءِ زندگی کے لئے ہے۔ پھل لذت کے لئے وہاں لذت کے لئے کھانا ہے زندگی کے لئے نہیں۔ ان وجوہ سے وہاں باغ ہیں کھیت نہیں۔ نیز ان باغوں میں انہار ہیں جار یعنی دریا نہیں۔ اور نہ وہاں پانی کی بارشیں ہیں۔ دنیا کے باغ و کھیت اوپر کے بارشی پانی اور نیچے سے نہریں یا کنوئیں کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر وہاں صرف نیچے کا پانی تو ہے اوپر کا بارشی پانی نہیں' کیونکہ وہاں جنت کی سبزی پانی سے نہیں یہ نہریں زینت اور جنتیوں کے استعمال کے لئے ہوں گی۔ نہ کہ جنت کے سبزہ کے لئے۔ ورنہ پھر شہد' دودھ' شراب طہور کی نہریں کیوں ہوتیں۔ اس لئے وہاں بارش نہیں کہ وہاں کی سبزی بحکم الٰہی ہے نہ کہ پانی سے نیز وہاں نہر ہے' بحر نہیں کہ بحر میں سیلاب آ جاتے ہیں۔ نہر میں نہیں آتے۔ نیز بحر میں حسن نہیں نہر میں حسن ہے۔ بحر کا پانی قبضہ میں نہیں ہے۔ نیز نہر گھروں میں پہنچ جاتی ہے' بحر نہیں پہنچتی۔ ان وجوہ سے وہاں بارش ہے' نہ دریا صرف نہریں ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** آخرت بہر حال دنیا سے بہتر ہے۔ جیسا کہ خیرا سے معلوم ہوا۔ حدیث شریف میں ہے کہ جنت میں کمان رکھنے کی جگہ ساری دنیا اور یہاں کی ساری نعمتوں سے بہتر ہے۔ **دوسرا فائدہ:** انسان کا غیر انسان سے نکاح جائز ہے جبکہ وہ شکل انسانی میں ہو۔ دیکھو حوریں جو انسان نہیں انسانی شکل میں ہیں۔ وہ انسانوں کی بیبیاں قرار دی گئیں۔ فرمایا گیا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ۔ **تیسرا فائدہ:** حوریں ان لوگوں کے نامزد پہلے ہی سے ہو چکی ہیں جن کا ایمان پر خاتمہ ہونے والا ہے اور وہ اب بھی ان کی بیبیاں ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ۔ ایک جگہ یوں فرمایا وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ۔ (الدخان: ۵۴) حدیث شریف میں ہے کہ جب کسی جنتی کی بیوی اس سے لڑتی ہے تو جنت سے اس کی بیوی حور پکار کر کہتی ہے کمبخت اس سے مت لڑ۔ یہ تیرے پاس چند دن مہمان ہے۔ پھر ہمارے پاس آنے والا ہے۔ **چوتھا فائدہ:** دنیوی عورتیں جب جنت میں پہنچیں گی تو وہ بھی حیض و نفاس' بغض و کینہ وغیرہ سے پاک کر دی جائیں گی۔ جیسا کہ اَزْوَاجٌ کے اطلاق سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** جنت حاصل کرنے کے لئے ایمان اور عمل دونوں کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اتقوا سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** اخروی زندگی کے لئے نہ غذا کی ضرورت ہے نہ پانی کی یہ سب چیزیں اس دنیا کے لئے ضروری ہیں۔ جنتی حوروں کا کھانا پینا کہیں ثابت نہیں۔ حضور ﷺ نے اتنا بڑا سفر معراج طے کیا [illegible] علیہ السلام بھی چوتھے آسمان پر بغیر غذا

اور پانی کے زندگی گزار لیں تو کیا مشکل ہے۔ مرزائیوں کو اس سے عبرت پکڑنی چاہیے۔ **مسئلہ:** عورت جنت میں اپنے آخری شوہر کے ساتھ رہے گی۔ اس لئے پیغمبر کی بیوی سے کوئی نکاح نہیں کر سکتا۔ کنواری لڑکی کا کسی جنتی کے ساتھ نکاح کر دیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت مریم ہمارے حضور علیہ السلام کے نکاح میں آئیں گی مگر وہاں یہ عورتیں حوروں سے بھی زیادہ حسین جمیل اور پاک صاف ہوں گی کیونکہ دنیاوی عورتوں میں نیک اعمال کا حسن بھی ہوگا۔ جس سے حوریں خالی ہوں گی۔ خیال رہے کہ اگر زوجین میں سے ایک اعلیٰ درجہ کا مستحق دوسرا ادنیٰ درجہ کا ادنیٰ کو اعلیٰ کر کے ہمراہ کیا جائے گا نہ کہ اعلیٰ کو ادنیٰ کر کے حضور ﷺ کے ساتھ حضرت مریم و آسیہ و عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن ہوں گی۔ نہ کہ حضور انور ﷺ ان کے درجہ میں رہ کر ان کے ہمراہ ہوں گے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنت میں جنتیوں کے دل بہلانے کے لئے عورتیں بھی ہیں تو یہ بہشت ہوا یا رنڈی خانہ اور وہاں کا خدا خدا ہے یا عورتوں کا شائق؟ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** نہ معلوم پنڈت جی کے دماغ میں مغز ہے یا کوڑا جو ہمیشہ بے ڈھنگی ہی بات کرتے ہیں۔ پنڈت جی رنڈی خانہ وہ ہوتا ہے جہاں حرام کاری ہوتی ہو مگر جہاں شرفاء اپنی بیبیوں کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کریں۔ وہ رنڈی خانہ نہیں کہلاتا۔ اگر تمہارے گھر میں تمہارے بیٹے پوتے شادی شدہ آباد ہیں۔ ہر ایک اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو شاید تم اپنے گھر کو رنڈی خانہ ہی کہتے ہو گے۔ یہاں فرمایا گیا ہے **وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ**۔ جنتیوں کے لئے ان کی بیویاں ہوں گی پاک وصاف ازواج سے ان کی بیبیاں ہونا معلوم ہوا۔ اور مطہرۃ سے معلوم ہوا کہ زنا وغیرہ ہر عیب سے پاک ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا گیا۔ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ۔ (الرحمٰن:۵۶) کہ وہ اپنے شوہروں کے سوا کسی پر نظر بھی نہیں اٹھاتیں ان تک کوئی انسان و جن پہنچا ہی نہیں۔ ایسے پاک ستھرے گھر کو رنڈی خانہ کہنا پنڈت جی ہی کے لئے لائق ہے۔ گندگی کا کیڑا گلاب کے پھول سے گھن کرتا ہے۔ پنڈت جی نیوگ کے عادی اُن کے دھرم میں ایک عورت کا ایک وقت میں گیارہ خاوندوں کے پاس رہنا عبادت۔ وہ ایسے مقدس جگہ کو رنڈی خانہ نہ کہیں تو کیا کہیں۔ ہم علی گڑھی خاں سے کیا کہیں اللہ انہیں سمجھ عطا فرمائے۔ **دوسرا اعتراض:** یہ حوریں دنیا سے بلائی گئی ہیں۔ یا جنت ہی میں پیدا ہو کر وہاں رہتی ہیں۔ اگر دنیا سے بلائی گئی ہیں تو مردوں کو کیوں نہ بلایا۔ اور اگر وہاں ہی پیدا ہوئیں تو قیامت تک ان کا کیسے گزارا ہوگا۔ ان کے لئے کون سے مرد ہیں؟ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** حوریں جنت ہی میں پیدا کی گئیں۔ اور جیسے انہیں کھانے پینے کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی وہ مرد کی حاجت سے پاک ہیں۔ وہ تو جنتیوں کے آرام کے لئے بنائی گئیں۔ دنیا میں بھی عورت پر کئی حال آتے ہیں۔ بچپن میں اسے مرد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر جوانی میں بھی کبھی مرد کے لائق ہوتی ہے کبھی نہیں۔ پھر بڑھاپے میں مرد سے بالکل بے پرواہ۔ جب یہاں یہ کیفیت ہے تو وہ تو جنت ہے وہاں کے حالات عقل سے وراء ہیں۔ **تیسرا اعتراض:** جب خدا نے جنت میں ہمیشہ رہنے والی عورتیں بنائیں تو ہمیشہ رہنے والے مرد کیوں نہ بنائے۔ عورتوں کو رکھنا اور مردوں کو نہ رکھنا بے انصافی ہے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** وہ عورتیں وہاں جزاء اعمال کے لئے نہیں رہتیں بلکہ وہ خود اعمال کی جزاء ہیں۔

عورت مرد کے لئے ذریعہ عیش ہے نہ کہ مردعورتوں کے لئے۔ یہ طرفداری نہیں بلکہ نیک کاروں کے لئے سامان عیش جمع فرمانا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور وہاں کی نعمتیں پیدا ہو چکی ہیں مگر حدیث معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ہم کو پیغام بھیجا کہ جنت کی زمین خالی ہے اور زرخیز ہے۔ اعمال کرو تا کہ اس زمین میں باغ لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہاں کوئی سبزہ نہیں؟ **جواب:** اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جنت کی بعض زمین سفید بھی ہے جس میں اعمال سے باغ لگیں گے۔ لہٰذا یہ حدیث بھی درست ہے اور آیات قرآنیہ بھی ٹھیک ہیں۔ آدم علیہ السلام جنت میں رہے۔ حضور انور ﷺ نے وہاں کی سیر فرمائی۔ اب بھی حضرت ادریس علیہ السلام وہاں موجود ہیں۔ بی بی مریم کو بہشتی پھل دیئے گئے اگر جنت میں کچھ نہیں تو یہ تمام کاروبار کیسے ہو رہا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جو لوگ اغیار کو دیکھنے سے بچتے ہیں ان کے چند جنتیں ہیں۔ جنت یقینی' جنت مکاشفہ' جنت مشاہدہ' جنت رضا' اور وہ جنت جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی' نہ کان نے سنی' اور نہ کسی کے وہم وگمان میں آئی۔ اس جنت کے نیچے تجلیات کی نہریں بہتی ہیں۔ جو غیبی چشموں سے نکلی ہیں۔ وہ لوگ اس میں بقا فنا کی لذتیں پائیں گے۔ ان کے لئے ازواج یعنی ارواح مقدسہ کے جوڑے ہوں گے۔ جو نفسانی عیوب سے پاک ہوں گے اور صفات الٰہیہ کے خیموں میں رہنے والی۔ اس کے سوا رب تعالیٰ کی ایسی رضا مندی ہے جو اندازے سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی روحوں کے انقلاب کو دیکھتا ہے کہ کبھی وہ عالم ملکوت میں ہیں اور کبھی عالم جبروت میں۔ کبھی عالم انوار میں کبھی عالم شوق میں۔ کبھی رنج وغم میں مبتلا (روح المعانی) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جنات جسمانی جنتوں کی طرف اشارہ ہے اور رضوان جنت روحانی کی طرف۔ جنت میں سب سے اعلیٰ مقام روحانیت ہے۔ جہاں بندہ کی روح پر انوار الٰہی کی تجلی ہوتی ہے اور بندہ دریائے معرفت میں غرق ہو جاتا ہے۔ ان مقامات میں پہلے بندہ اللہ سے راضی ہوتا ہے اور پھر اللہ بندہ سے۔ پہلے بندہ مولیٰ کا طالب ہوتا ہے اور پھر اس کا مطلوب اور محبوب۔ اس کی طرف اس میں اشارہ ہے۔ راضیۃ مرضیۃ (روح البیان) تفسیر ابن عربی میں فرمایا کہ جو خدا کے لئے دنیا کی ہر چیز چھوڑیں تو ان کے لئے آخرت کی ہر چیز ہے۔ افعال کی جنت جنت ہیں اور روحانیات وہاں کے ازواج اور رضوان جنت صفات غرض وہ رب کا ہے تو سب اس کا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا
وہ لوگ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے تحقیق ہم ایمان لائے پس بخشدے واسطے ہمارے گناہ ہمارے اور بچا ہم کو
جو کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے تو ہمارے گناہ معاف کر
عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ
عذاب سے آگ کے صبر کرنے والے اور سچ بولنے والے اور اطاعت کرنے والے اور خرچ کرنے والے
اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے صبر والے اور سچے اور ادب والے اور راہ خدا میں خرچ کرنے والے

وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

اور دعائے مغفرت کرنے والے صبح کے وقت

اور پچھلے پہر معافی مانگنے والے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں جنت کے مستحقین کا ذکر تھا کہ پرہیز گار اس کے حقدار ہیں۔ اب ان کے وجہ استحقاق کا بیان ہے کہ چونکہ ان کی باتیں ان کے اعمال سب نیک ہیں۔ لہٰذا وہ اس کے حقدار ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ جنت پرہیز گاروں کے لئے ہے۔ اب پرہیز گاروں کی تفصیل ہے کہ جن میں یہ صفتیں موجود ہوں وہ گروہ ابرار میں سے ہے اور رب کا پسندیدہ۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ اپنے خاص بندوں کو نظر عنایت سے دیکھتا ہے۔ اب ان خاص بندوں کی تفصیل فرمائی جا رہی ہے کہ وہ وہ ہیں جو کہتے یہ ہیں اور کرتے یہ ہیں۔

تفسیر

اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَا اٰمَنَّا۔ یا تو یہ مستقل جملہ ہے۔ اور اَلَّذِیْنَ ھُمْ مبتدا پوشیدہ کی خبر یا پچھلے اَلَّذِیْنَ کا بیان۔ اور حالت جری میں یا امداح فعل پوشیدہ کا مفعول بہ۔ اٰمَنَّا ایمان سے بنا بمعنی تصدیق اس کا متعلق پوشیدہ ہے۔ یعنی اٰمَنَّا بِکَ وَبِنَبِیِّکَ وَبِکَلَامِکَ۔ یعنی پرہیز گار وہ ہیں یا جنت ان پرہیز گاروں کے لئے ہے۔ یا ہم تعریف کرتے ہیں ان لوگوں کی جو یہ عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ ہم تجھ پر تیرے نبی پر اور تیری کتابوں پر ایمان لے آئے۔ اور ان سب کو سچ جانا۔ خیال رہے کہ دعاء مغفرت سے پہلے اپنے ایمان کا ذکر کرنا یا تو اظہار وفاداری کے لئے یا شکریہ کے لئے کہ تیری مہربانی ہے کہ ہم ایمان لے آئے ورنہ اگر تو کرم نہ کرتا تو ہم کسی طرح بھی ایمان کے لائق نہ تھے۔ یا توسل کے لئے ہے کہ خدایا اس ایمان کے طفیل ہمارے گناہ بخش دے۔ اپنے اعمال کے توسل سے دعائیں کرنا بھی سنت ہے۔ جیسا کہ حدیث غار سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیلی جب غار میں دفن ہو گئے تھے تو انہوں نے اپنے اعمال کے وسیلہ سے دعائیں مانگی تھیں۔ اور نجات پائی تھی۔

فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا۔ ف جزائیہ ہے۔ اور اس کی شرط محذوف یا ترتیب کی۔ اور اٰمَنَّا پر یہ کلام مرتب ہے۔ اِغْفِرْ غفرٌ سے بنا بمعنی چھپانا اور درگذر کرنا۔ لَنَا میں لام نفع کا ہے۔ ذُنُوْبٌ ذَنْبٌ کی جمع ہے۔ بمعنی لازمی چیز چونکہ گناہ بھی انسان کو چمٹ جاتا ہے اس لئے ذنب کہتے ہیں۔ یہاں وہ گناہ مراد ہیں جن کا تعلق رب تعالیٰ سے ہے۔ یعنی اے مولیٰ! چونکہ ہم ایمان لے آئے لہٰذا ہمارے گناہ کو چھپالے یا معاف کر دے۔ فاغفر کی ف سے معلوم ہوا کہ ایمان کے وسیلہ سے یہ دعا مانگی گئی ہے یعنی چونکہ ہم ایمان لا چکے ہیں۔ تیرے وفادار ہیں۔ غدار نہیں۔ لہٰذا ہمارے گناہ بخش دے۔ یہ دعا گنہگاری سے کرتے ہیں۔ یعنی مذنبین بھی اور محفوظین بھی کرتے ہیں۔ معصومین بھی ہم مذنبین تو گناہ کر کے معافی مانگتے ہیں' وہ حضرات گناہ نہیں کرتے اور معافی چاہتے اور معصومین نیکیاں کر کے معافی مانگتے ہیں کہ خدایا ہماری نیکی تیری بارگاہ کے لائق نہیں۔ اس کوتاہی کو بخش دے

غرضکہ دعا ایک ہے مگر اس کے مقصد تین۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ یہ اِغْفِرْ پر معطوف ہے۔ قِ وقیٌ یا وقایۃٌ کا امر ہے یعنی بچانا۔ نَارُ سے مراد دوزخ ہے۔ خواہ ٹھنڈا طبقہ ہو یا گرم (عذاب) اس لئے عرض کیا گیا کہ عذاب ہی سے بچنا منظور ہے۔ ورنہ سارے مسلمان دوزخ پر سے گزریں گے۔ اور جہنمیوں کو نکالنے کے لئے وہاں جائیں گے بھی مگر عذاب نہ پائیں گے۔ یعنی اے مولیٰ ہمارے گناہ معاف کر کے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ اَلصَّابِرِیْنَ وَالصَّادِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ۔ یہ الفاظ بھی یا جری حالت میں ہیں۔ پہلے اَلَّذِیْنَ کی صفت یا نصبی حالت میں امدح فعل کا مفعول۔ اَلصَّابِرِیْنَ صبر سے بنا بمعنی روکنا۔ اس کی تحقیق ہم دوسرے سیپارہ کے شروع میں کر چکے ہیں کہ اگر صبر اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں قوموں سے عذاب روکنا اس لئے رب تعالیٰ کا نام ہے۔ صَبُوْرٌ یا صَبَّارٌ حدیث شریف میں ہے کہ بڑا صابر رب تعالیٰ ہے۔ اور اگر بندے کی صفت ہو تو نفس کو گناہ وغیرہ سے روکنا مراد ہوتا ہے۔ صبر میں مخلوق شرط نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا۔ یہاں نفس کو گھبراہٹ سے روکنے والے مراد ہیں۔ عبادت پر صبر گناہوں سے صبر' تکلیف پر صبر' جہاد پر صبر' سب ہی اس میں داخل ہیں۔ اَلصَّادِقِیْنَ' صدق سے بنا' بمعنی سچائی۔ اس کی بھی تین صورتیں ہیں۔ کلام کا سچ' یعنی جھوٹ سے بچنا۔ کام میں سچ' یعنی ہر کام پورا کرنا۔ کوئی ادھورا نہ چھوڑنا۔ نیت میں صدق' کہ جو کام ہو اللہ کے لئے ہو۔ یہ لفظ بہت گنجائش رکھتا ہے۔ وعدہ پورا کرنا۔ زبان صحیح رکھنا' خبر سچی دینا۔ ظاہر اور پوشیدہ رب تعالیٰ سے ڈرنا سب ہی اس میں داخل ہیں۔ امام قتادہ کا یہ ہی قول ہے۔ قَانِتِیْنَ' قنوت سے بنا' بمعنی اطاعت اس میں جانی' مالی' بدنی ہر طرح کی اطاعت داخل ہے۔ گویا اس کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو شریعت کے سپرد کر دینا جہاں وہ گرم کرے گرم ہو جائیں۔ جہاں نرم کرے نرم پڑ جائیں۔ یہ ہی ابن جبیر کا قول ہے۔ امام زجاج فرماتے ہیں کہ اس سے اطاعت وعبادت پر ہمیشگی کرنا مراد ہے۔ (کبیر وروح المعانی) بعض نے فرمایا کہ اس سے اداء واجبات مقصود۔ قنوط۔ ط سے بمعنی یاس و ناامیدی ہے۔ اور قنوت۔ ت سے بمعنی فرمانبرداری۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر:۵۳) اور فرماتا ہے وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ (بقرہ:۲۳۸) اطاعت وقنوت قریبا ہم معنی ہیں مگر قنوت اطاعت سے بڑھ کر ہے کہ قنوت کی حقیقت ہے۔ اپنے کو رب کے کنٹرول میں دے دینا۔ ملک' گھر' انجن' بس جب ہی مفید ہے جبکہ کنٹرول میں رہیں۔ بندہ وہ ہی اچھا ہے جو اپنے محبوب کے کنٹرول میں ہو۔ کنٹرول سے نکل کر انجن ہزاروں کی جان برباد کر دیتا ہے۔ ہم کنٹرول سے نکل کر ایمان برباد کر لیتے ہیں۔ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ۔ یہ قَانِتِیْنَ پر معطوف ہے۔ اور اس کی طرح یا منصوب ہے یا مجرور۔ مُنْفِقِیْنَ۔ انفاق سے بنا۔ اس کی تحقیق ہم شروع پارہ الٓمّٓ میں کر چکے۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اس کے معنی ہیں خرچ کرنا۔ اگرچہ جان خرچ کرنا بھی انفاق ہے مگر اکثر مال خرچ کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی صورتیں۔ اور اس جگہ سب مراد۔ اپنے پر خرچ' بال بچوں پر خرچ' صلہ رحمی' زکوٰۃ' جہاد' تمام نیکیوں پر خرچ کرنا اس میں داخل ہے۔ مستغفرین۔ استغفار سے بنا۔ جس کا مادہ غفر ہے بمعنی مٹانا یا چھپانا' استغفار مغفرت مانگنا۔ اسحار سحر کی جمع ہے بمعنی پوشیدگی' جادو اور سینہ کو اسی لئے سحر کہتے ہیں کہ وہ چھپے ہوتے ہیں۔ صبح صادق کو بھی سحر کہنے کی یہ ہی وجہ ہے کہ اس وقت کی روشنی رات کی تاریکی میں چھپی ہوتی ہے۔ بعض نے کہا کہ اس سے نماز تہجد پڑھنے والے مراد ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جو فجر کی نماز میں شامل ہوں۔ بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ

مراد ہیں جو صبح اٹھ کر استغفار پڑھیں چونکہ اس وقت دنیوی شور کم ہوتا ہے۔ نیز دل کو سکون ہوتا ہے۔ رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت توبہ اور استغفار دعا وغیرہ زیادہ بہتر ہے۔ یعنی متقی وہ ہیں جو صابر بھی ہوں۔ صادق بھی ہوں' عبادت گزار بھی ہوں۔ اور راہ الٰہی میں خرچ کرنے والے بھی۔ اور نماز تہجد پڑھنے والے۔ یا فجر جماعت سے ادا کرنے والے' یا صبح اٹھ کر توبہ و استغفار کرنے والے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ جنت کے حقدار پرہیزگار ہیں اور پرہیزگار وہ لوگ ہیں جن میں یہ آٹھ صفتیں موجود ہوں۔ ایک یہ کہ وہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی وفاداری کا اظہار کریں اور عرض کریں کہ اے مولیٰ ہم بے ایمان نہیں' باغی نہیں' بلکہ تجھ کو تیرے رسولوں کو' تیری کتابوں کو' تیرے احکام کو سچا جانتے ہیں اور ہم مومن ہیں پھر صرف ایمان پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ اپنے کو گنہگار سمجھ کر عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ ہم خطار کار ہیں تو غفار' ہم گنہگار ہیں۔ تو ستار' ہمارے سارے چھوٹے بڑے' اگلے پچھلے' ظاہر پوشیدہ گناہ معاف کردے۔ تیسرا یہ کہ وہ خدا کی جباری قہاری سے ڈرتے بھی ہیں۔ اپنی نیکیوں پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس لئے عرض کرتے ہیں کہ مولیٰ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ اسی طرح کہ قبر میں آگ ہمارے پاس نہ آئے اور بعد حشر ہم آگ میں سزا کے لئے نہ جائیں بلکہ دنیا میں رب کی نعمتیں' صحت' دولت' عزت' اولاد ہمارے لئے نور ہوں۔ نار نہ ہوں۔ جو نعمت رب سے غافل کردے وہ نار ہے کہ یار سے فراق کا باعث ہے۔ اور جو نعمت رب سے ملادے وہ نور ہے۔ بلکہ عبادت' ریاضت' علم بھی یا نار ہے یا نور۔ اسی ایک کلمے میں ان تمام قسم کی آگ کے عذاب سے پناہ مانگی ہے۔ بہت جامع دعا ہے۔ شیطان کا علم و عبادت نار تھیں۔ ابوجہل و قارون کی دولت نار فرعون کی سلطنت نار بنی کہ ان چیزوں نے انہیں نار میں داخل کیا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (جاثیہ: ۲۳) چوتھے یہ کہ وہ مصیبتوں اور عبادت کی مشقتوں' اور جہاد کی دشواریوں پر بھی صبر کرتے ہیں اور اپنے نفس کو گناہوں سے روکتے ہیں۔ پانچویں یہ کہ وہ قول کے سچے ہیں۔ خبر دیتے ہیں تو سچی' وعدہ کرتے ہیں تو سچا' اپنے فعل کے سچے ہیں کہ جو نیک کام شروع کرتے ہیں اسے بغیر پورا کئے نہیں چھوڑتے' نیت کے بھی سچے ہیں کہ ہر نیکی اللہ کے لئے کرتے ہیں اور جس کام کا ارادہ کرلیتے ہیں اسے کر کے چھوڑتے ہیں۔ چھٹے یہ کہ وہ اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے ہیں کہ ہمیشہ ہر قسم کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں۔ نمازیں پڑھیں تو ہمیشہ روزہ رکھیں تو پابندی سے' زکوٰۃ دیں تو پورے حساب سے۔ ساتویں یہ کہ وہ بخیل و کنجوس نہیں۔ جائز کاموں میں اور نیکیوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ بندوں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ آٹھویں یہ کہ جب سب لوگ سوتے ہیں اور نیند کا اچھا وقت ہوتا ہے تب یہ لوگ اپنے نرم و گرم بستر چھوڑ کر مصلے پر آجاتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ استغفار کرتے ہیں۔ یہ ہی سچے متقی ہیں اور جنت کے حقدار۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** نیک اعمال کی برکت سے دعا کرنی چاہیے۔ دیکھو یہاں متقیوں کی یہ پہچان بتائی گئی کہ وہ دعا کے وقت اپنے ایمان کا ذکر کرتے ہیں اور اسی کے طفیل دعا مانگتے ہیں۔ **دوسرا فائدہ:**

بعض نیکیاں چھپا کر کرنی چاہئیں اور بعض ظاہر۔ اپنے ایمان کو ظاہر کرنا بہت ضروری ہے۔ اپنی صورت' سیرت' لباس' وضع قطع سے ایمان ظاہر کرو۔ دیکھو یہاں اظہار ایمان کو متقیوں کا نشان قرار دیا گیا۔ تہجد چھپ کر پڑھو مگر پنجگانہ نماز اور جمعہ و عیدین ظاہر کر کے جماعت سے پڑھو' نوافل گھر میں پڑھو مگر تحیۃ المسجد' نماز اشراق' نماز سفر مسجد میں ادا کرو۔ **تیسرا فائدہ:** اپنے کو گنہگار سمجھنا اور ہمیشہ رب سے مغفرت مانگنا پرہیزگاری کی علامت ہے۔ جیسا کہ فَاغْفِرْ لَنَا سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** نیکی پر پابندی کرنی چاہیے اگرچہ تھوڑی ہی ہو۔ کبھی بہت نیکی کرنا' کبھی بالکل نہ کرنا برا ہے جیسا کہ قَانِتِيْنَ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** ضروری ہے کہ اپنی زبان' دل' نیت سب سچی رکھے جیسا کہ صَادِقِيْنَ کے عموم سے معلوم ہوا۔ ہم سیپارہ میں عرض کر چکے ہیں کہ چند مقامات میں جھوٹ پر پکڑ نہیں۔ ایک خطرہ جان کے وقت کفر بک دینے میں۔ دوسرا مسلمانوں میں صلح کرانے میں۔ تیسرا اپنی بیوی کو راضی کرنے میں وغیرہ وغیرہ۔ **چھٹا فائدہ:** نماز تہجد بہت بہتر عبادت ہے۔ اس سے چہرہ پر نور' دل میں سرور' قلب کو راحت' ایمان کو قوت' اور نفس کو تر و تازگی حاصل ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں اس کے بڑے فضائل آئے۔ یہ اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** بعض اوقات اور بعض جگہ میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ دیکھو صبح صادق کے وقت استغفار کرنا' دعا مانگنا بہت بہتر ہے۔ جیسا کہ اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ:** تمام نیکیوں کی جڑ نیت خیر ہے۔ اگر چلنا' پھرنا' سونا' جاگنا' تجارت کرنا' بچوں کو پالنا نیت خیر سے ہو تو عبادت ہے۔ اور بری نیت (ریا وغیرہ) سے نماز بھی عبادت نہیں۔

توبہ و استغفار

توبہ و استغفار کرنا بڑی عبادت ہے۔ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس کے بڑے فضائل آئے ہیں۔ ہم اولاً اس کے فضائل اور پھر اس کے مسائل عرض کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ قبول فرمائے اور عمل کی توفیق بخشے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ (انفال:۳۳)

(۱) مشکوٰۃ باب الاستغفار میں بروایت بخاری ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ میں روزانہ ستر بار سے زیادہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ ہم روزانہ سو بار استغفار کرتے ہیں۔ اے لوگو تم بھی استغفار کرو۔

(۲) مسلم بخاری و مشکوٰۃ میں ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کیا۔ پھر ایک عالم سے پوچھا کہ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ اسے بھی قتل کر کے سو پورے کر دیئے۔ پھر دل میں شرمندگی پیدا ہوئی۔ ایک اور عالم کے پاس مسئلہ پوچھنے کے لئے چلا۔ راستہ میں موت آ گئی تو اس نے اپنا سینہ اس عالم کے گاؤں کی طرف کر دیا اور مر گیا۔ رحمت و عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا ہوا کہ اس کی روح کون لے جائے حکم الٰہی آیا کہ جہاں سے آ رہا تھا۔ وہ اس کے گناہ کا گاؤں تھا۔ اور نیکی کرنے جا رہا تھا۔ زمین ناپو۔ جو گاؤں قریب ہو اس کا اعتبار کرو۔ یعنی اگر عالم کا گاؤں قریب ہے تو رحمت کے فرشتے لے جائیں۔ اور اگر وہ بستی قریب ہو تو عذاب والے فرشتے اٹھائیں۔ ناپا گیا تو یہ بالکل بیچ میں تھا۔ رب تعالیٰ نے اس گناہ کی بستی کو پیچھے ہٹایا اور عالم کی بستی کو آگے بڑھایا۔ اور فرمایا اب ناپو۔ اب اس کی لاش عالم کی بستی سے ایک بالشت

زیادہ قریب تھی۔ اس کی بخشش کر دی۔
(۳) مسلم شریف اور مشکوٰۃ میں ہے کہ رب تعالیٰ بندہ کی توبہ سے بہت خوش ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص جنگل میں ہو اور اس کے توشہ کا اونٹ گم جائے اور یہ زندگی سے مایوس ہو کر مرنے کے لئے لیٹ جائے۔ پھر اچانک اس کا اونٹ معہ توشہ کے آ جائے۔ جتنی خوشی اس شخص کو ہو سکتی ہے۔ اس سے زیادہ خوشی رب تعالیٰ کو بندہ کی توبہ سے ہوتی ہے۔
(۴) مسلم بخاری اور مشکوٰۃ میں ہے کہ بندہ گناہ کر کے رو کر عرض کرتا ہے کہ رَبِّ اَذْنَبْتُ فَاغْفِرْهُ. تو رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو سزا و جزا پر قادر ہے۔ جاؤ میں نے بخش دیا۔ بندہ پھر گناہ کر بیٹھتا ہے۔ اور پھر توبہ کرتا ہے پھر اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔
(۵) ترمذی شریف میں ہے کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے بندے اگر تیرے گناہ بادل تک پہنچ جائیں پھر تو استغفار کرے تو میں بخش دوں گا۔ اور کوئی پرواہ نہ کروں گا۔ اور اے بندے اگر تو میرے پاس زمین بھر کے گناہ لائے گا۔ بشرطیکہ شرک و کفر سے بچا رہے تو میں تجھے زمین بھر کر مغفرت دوں گا۔
(۶) ابو داؤد ابن ماجہ میں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو انسان ہمیشہ استغفار پڑھتا رہے تو رب تعالیٰ اسے ہر تنگی سے نجات اور ہر غم سے خلاصی دے گا اور اس جگہ سے رزق دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو گا۔
(۷) احمد ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے کہ گناہ مومن کے دل میں کالا داغ پیدا کرتا ہے اور اس کے لئے توبہ و استغفار ایسی ہے جیسے زنگ آلود لوہے کے لئے صیقل۔
(۸) نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مبارک ہے وہ شخص جس کے نامۂ اعمال میں زیادہ توبہ و استغفار پائی جائے۔
(۹) بخاری شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا' مومن اپنے گناہوں کو مثل پہاڑ کے سمجھتا ہے کہ گویا وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہے اور وہ اس پر گرا جا رہا ہے اور فاسق اپنے گناہوں کو مکھی کی طرح سمجھتا ہے کہ بالکل پرواہ نہیں کرتا۔
(۱۰) بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ماجہ نے روایت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے گناہ کئے ہی نہ تھے۔
(۱۱) تمام درود و وظائف کی تاثیریں اور فوائد احادیث یا مشائخ کے اقوال سے ثابت ہیں۔ صرف استغفار ہی وہ عمل و وظیفہ ہے جس کے فوائد قرآن کریم نے بیان فرمائے کہ نوح علیہ السلام کا وہ فرمان نقل فرمایا جو انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا اَسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا الخ (نوح ۱۱) غرضکہ استغفار قرآنی عمل اور قرآنی وظیفہ ہے۔
(۱۲) انسان اس وقت کسی سے معافی مانگتا ہے جب اپنی بے کسی' بے بسی' دوسرے کی قوت و قدرت کا معتقد ہو۔ اس طرح بندہ جب ہی رب تعالیٰ سے معافی مانگے گا۔ جب اپنے کو بے بس گنہگار جانے۔ رب تعالیٰ کو قوت و قدرت والا مانے' یہ عقیدہ ہی عبدیت کی دلیل ہے اور کریم معافی مانگنے والے کو نہیں پکڑتے گرے کو کوئی نہیں گراتا۔ بلکہ گرے کو اٹھاتے ہیں۔ رب تعالیٰ

بھی معافی مانگنے والوں کو پکڑتا نہیں بلکہ معافی دیتا ہے۔ وہاں بہانے نہ بناؤ عجز وانکسار لے کر حاضر ہو۔ شعر ؎

عجز کار انبیاء و اولیاء است عاجزی محبوب درگاہ خدا است

توبہ واستغفار کے مسائل

توبہ واستغفار کی حقیقت یہ ہے کہ گنہگار گذشتہ گناہ پر دل میں شرمندہ ہو اور آئندہ بچنے کا عہد کرے۔ شرح سنہ اور مشکوٰۃ باب الاستغفار میں ہے کہ اَلنَّدَمُ تَوْبَۃٌ شرمندہ ہونا بھی توبہ ہے۔ اس کی شرح مرقاۃ میں فرمایا کہ توبہ کے تین رکن ہیں۔ گذشتہ پر شرمندگی۔ آئندہ بچنے سے عہد اور گذشتہ کوتاہیوں کا بقدر طاقت بدلا کر دینا۔

مسئلہ: توبہ بقدر گناہ چاہیے یعنی چھپے گناہ کی چھپی توبہ۔ اور ظاہر گناہ کی ظاہر توبہ۔ **مسئلہ:** توبہ کی تین صورتیں ہیں۔ حقوق شریعت سے توبہ، حقوق العباد سے توبہ اور حقوق اللہ سے توبہ۔ حقوق شریعت کی توبہ میں ضروری ہے کہ وہ حقوق ادا کر دیئے جائیں۔ نمازیں رہ گئی ہیں تو قضا کرے۔ روزے رہ گئے ہوں تو پورے کرے۔ داڑھی منڈاتا ہے تو توبہ کرے اور آئندہ نہ منڈانے کا عہد کرے۔ ایسے ہی بندوں کے حقوق ادا کرکے پھر توبہ کرے۔ غیبت کی ہے تو معافی چاہے۔ مقروض ہے تو قرض ادا کرے۔

نوٹ: توبہ کے باقی مسائل انشاء اللہ اس آیت کی تفسیر میں آئیں گے۔ اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ الخ (النساء:۱۷)

مسئلہ: توبہ واستغفار کا بہتر وقت صبح صادق ہے۔ ابن جریر نے عبداللہ ابن عمر سے روایت کی کہ وہ رات کو نماز پڑھتے رہتے تھے۔ پھر اپنے غلام سے پوچھتے کہ اے نافع کیا صبح صادق ہوگئی ہے وہ عرض کرتے نہیں۔ تو پھر نماز میں مشغول ہو جاتے جب وہ عرض کرتے کہ ہاں صبح ہوگئی ہے تو بیٹھ کر استغفار پڑھتے (روح المعانی وکبیر) **مسئلہ:** جو کوئی سنت فجر اپنے گھر پڑھے اور اس کے بعد ستر بار یہ پڑھ لیا کرے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔ اول وآخر درود شریف تین تین بار وہ انشاء اللہ متقین اور استغفار کرنے والوں کے زمرہ میں ہوگا۔ (ابن مردویہ وروح المعانی) اور تجربہ یہ ہے کہ اس سے گھر میں اتفاق اور مصیبتوں سے نجات اور رزق میں برکت رہتی ہے۔ **مسئلہ:** توبہ واستغفار کے لئے صبح صادق کا وقت نہایت مناسب ہے۔

(۱) ابن جریر اور احمد نے نقل کیا کہ داؤد علیہ السلام نے حضرت جبرائیل سے پوچھا کہ اے جبرائیل رات کا کون سا حصہ افضل ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ اے نبی اللہ! یہ تو مجھے خبر نہیں۔ ہاں میں دیکھتا ہوں کہ صبح کے وقت عرش الٰہی ہلتا ہے (روح المعانی)

(۲) نیز حدیث پاک میں ہے کہ رب تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں پہلے آسمان کی طرف توجہ کرم کرکے فرماتا ہے کہ کون دعا مانگتا ہے کہ قبول کروں، کون مجھ سے مانگتا ہے کہ میں اسے دوں۔ مجھ سے کون مغفرت مانگتا ہے کہ اسے بخش دوں۔ صبح تک یہ ہی ندائیں رہتی ہیں۔ (روح المعانی) حضرت لقمان نے اپنے فرزند سے فرمایا کہ اے بیٹے مرغ سے بدتر نہ ہو جانا کہ وہ صبح ہی ذکر الٰہی کرے اور تم اس وقت سوتے رہو (خزائن العرفان) بلکہ صبح کو سونے والا کتے سے بدتر ہے کہ کتا تمام رات مالک کا پہرا دے کر پھر صبح کو سوتا ہے اور یہ شخص رات گناہوں میں گزار کر عبادت کے وقت غافل ہو جاتا ہے ۔

حیف تو سوتا ہو اور مسجد میں ہوتی ہو اذاں　　مرغ و ماہی سب انھیں یادِ خدا کے واسطے
گفتم ایں شرط آدمیت نیست　　مرغ تسبیح خواں و من خاموش

کتے کے سوا کوئی جانور صبح کے وقت نہیں سوتا۔

(۴) مجاہد نے فرمایا کہ یعقوب علیہ السلام کے فرزندوں نے اپنے والد سے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب دیا سَاَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ۔ (یوسف:۹۸) ابھی نہیں پھر دعا کروں گا۔ آپ کا یہی منشا تھا کہ صبح صادق کے وقت دعا کی جائے تاکہ جلدی قبول ہو (روح البیان)

(۵) آزمایا گیا ہے کہ جس گھر کے صبح تڑکے اٹھ بیٹھنے کے عادی ہوں اور گھر کا دروازہ کھول دیتے ہوں تو اس گھر میں برکت رہتی ہے۔ غرضکہ توبہ و استغفار کے لئے وقت سحر نہایت موزوں ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا بالاسحار۔

کون سی استغفار افضل ھے: استغفار کے بہت سے الفاظ حدیث شریف میں آئے ہیں۔ مشہور یہ ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ اگر سنت فجر کے بعد اول و آخر تین تین بار درود شریف پڑھ کر درمیان میں ستر (۷۰) بار استغفار پڑھ لی جائے بہت فائدہ مند ہے۔ فقیر کا عمل یہ ہے کہ سنت فجر کے بعد اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اور بِسْمِ اللّٰهِ پڑھ کر اولاً درود شریف پھر بعد یہ آیت پڑھتا ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا۔ (النساء:۶۴) اس کے بعد بارگاہ نبوی کی طرف توجہ کر کے یہ عرض کرتا ہے۔ فَجِئْتُ عَلٰى بَابِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَاصِيًا وَّمُجْرِمًا وَعَلٰى نَفْسِىْ ظَالِمًا وَّ جِئْتُ عَلٰى بَابِكَ يَا حَبِيْبَ اللّٰهِ مُسْتَغْفِرًا وَّ جِئْتُ عَلٰى بَابِكَ يَا شَفِيْعَ الْمُذْنِبِيْنَ مُسْتَشْفِعًا پھر یہ آیت تلاوت کرتا ہے۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ (الضحیٰ:۱۰) پھر بارگاہ رسالت میں یوں عرض کرتا ہے۔ اَنَا سَائِلٌ عَلٰى بَابِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَسْئَلُكَ الشَّفَاعَةَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَسْئَلُكَ مُرَافَقَتَكَ فِى الْجَنَّةِ يَا حَبِيْبَ اللّٰهِ اَسْئَلُكَ الشَّفَاعَةَ يَا شَفِيْعَ الْمُذْنِبِيْنَ اور پھر استغفار ستر بار پڑھتا ہے۔ خدا کے فضل سے اس کا بہت فائدہ پاتا ہے۔ بخاری شریف میں بروایت شداد ابن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ سید الاستغفار یہ ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِىْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا سْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّمَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَىَّ وَاَبُوْءُ بِذَنْبِىْ فَاغْفِرْلِىْ ذُنُوْبِىْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔ جو دن میں پڑھ لے اور شام سے پہلے مر جائے تو وہ جنتی ہے۔ اور جو کوئی رات میں پڑھے اور صبح سے پہلے مر جائے وہ جنتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت قسم کے استغفار روایتوں میں آئے ہیں جس قدر ہم نے نقل کر دیئے کافی ہیں مگر اخلاص اور دل کا حاضر ہونا شرط ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: رب تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ پھر اٰمَنَّا کہہ کر اسے اپنے ایمان کی کیوں خبر دی جا رہی ہے۔ کیا وہ ہمارے ایمان سے بے خبر ہے؟ **جواب:** اس میں تین فائدے ہیں۔ اول اپنا استحقاق مغفرت عرض کرنا کہ ہم باغی نہیں بلکہ تیرے مخلص بندے ہیں۔ ہمارے گناہ معاف کر۔ دوسرے اس کا استغفار عرض کرنا کہ چونکہ تجھ پر ایمان لا چکے۔ تیرے سوا کسی

دروازہ کو نہ دیکھا' نہ جانا۔ ہمارا تو ہی ہے۔ لہٰذا گناہ معاف کر۔ تیسرا یہ کہ اپنی مصیبتوں کا اس میں اظہار ہے اور دنیا سے بے نیازی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ چونکہ دنیا مومن کے لئے جیل ہے اور کافر کے لئے جنت۔ لہٰذا ہم دنیا کی تکالیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آخرت کی نجات مانگتے ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس دعا کو لفظ رَبَّنَا سے کیوں شروع کیا گیا۔ خدا کے نام تو اور بہت سے ہیں۔ ان سے کیوں نہ پکارا؟ **جواب** رحمت الٰہی کو جوش میں لانے کے لئے کہ چونکہ تو ہمارا پالنے والا ہے اور ہم تیرے در کے پلے ہوئے۔ اور پروردہ غلام ہر مصیبت میں اپنے مربی کو پکارتا ہے۔ اسی غرض سے ہم بھی گناہ کی مصیبت میں پھنسے ہیں۔ تجھے پکارتے ہیں۔ رَبَّنَا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ متقی وہ ہو سکتا ہے کہ جس میں صبر' سچائی' اطاعت' خیرات اور دعائے مغفرت کے اوصاف جمع ہوں۔ تو جو انبیاء علیہم السلام عیش میں رہے اور انہیں صبر کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام یا حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ متقی ہوئے یا نہیں۔ نیز وہ غریب مسلمان جن میں خیرات کی طاقت نہیں۔ وہ متقی ہیں یا نہیں۔ نیز انبیائے کرام گناہوں سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گناہوں کی مغفرت مانگتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں مانگتے۔ تو متقی نہ ہوئے اور اگر مانگتے ہیں تو یہ جھوٹ ہے کہ وہ اپنے کو گنہگار کہتے ہیں حالانکہ وہ گناہوں سے پاک ہیں۔ **لطیفہ:** کسی بزرگ کا بیٹا بہت جھوٹ بولتا تھا۔ ایک بار اس بزرگ نے اسے نصیحت کی کہ بیٹا جھوٹ مت بولا کر۔ بڑا گناہ ہے۔ اس نے کہا حضرت میں نے جھوٹ بولنا آپ سے سیکھا۔ پوچھا کہ میں نے کونسا جھوٹ بولا۔ وہ بولا بتائیے۔ آپ ولی اللہ ہیں یا نہیں۔ بزرگ نے فرمایا۔ اے بیٹا! میں بڑا گنہگار بندہ ہوں۔ مجھے ولایت سے کیا تعلق۔ بیٹا بولا۔ قسم خدا کی آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ اللہ کے پیارے اور ولی کامل ہیں اور تمام دنیا آپ کو ولی کہتی ہے۔ **جواب:** ان تینوں سوالوں کا مکمل جواب انشاء اللہ تفسیر صوفیانہ سے معلوم ہو جائے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ صبر ہر ناپسندیدہ چیز میں ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کے لئے دنیا کی زندگی اور فراق بار گراں ہے۔ اسے برداشت کرنا ان کا صبر ہے۔ نیز خرچ مال پر موقوف نہیں۔ نفس اور وقت' عزت و آبرو ہر چیز راہ الٰہی میں خرچ ہو سکتی ہے۔ تیسرے اعتراض کا جواب اس شعر سے معلوم کر لو۔

زاہداں از گناہ توبہ کنند　　　عارفاں از عبادت استغفار

ہر ایک کا ذنب اس کے درجہ کے لائق ہے۔ اور اسی لحاظ سے وہ اپنے کو خطا کار کہتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

تقویٰ کے چند درجے ہیں۔ شرک و کفر سے بچنا تقویٰ عوام ہے' حرام چیزوں سے بچنا تقویٰ مومنین۔ شبہ کی چیزوں سے بچنا تقویٰ کاملین ہے اور ماسوا اللہ سے بچنا تقویٰ عارفین ہے جیسا تقویٰ ویسی اس کے لئے جنت' عارفین اور عوام کے الفاظ تو یکساں ہیں مگر معانی میں زمین و آسمان کا فرق اسکے معنی عارفین کے حق میں یوں ہو سکتے ہیں کہ ماسوا اللہ سے بچنے والے متقی یوں عرض کرتے ہیں کہ اے مولیٰ ہم تجھے تیرے افعال و صفات کی تجلیات میں دیکھ کر تجھ پر شہودی ایمان لا چکے۔ لہٰذا تو ہمارے وجودی گناہوں کو بخش دے۔ تیرے ہوتے ہمارا ہونا بھی گناہ ہے۔ اصل عبادت تجھ میں فنا ہے۔ اس میں ہم سے کوتاہی ہوئی۔ ہمیں معاف کر اور ہمیں محرومی اور حجاب اور حجاب کی آگ کے عذاب سے بچالے۔ یہ متقی مجاہدات' ریاضات اور

مخالفتِ نفس پر صبر کرتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ اللہ کے بارے میں اللہ کے لئے یا اللہ پر یا اللہ سے صبر کرتے ہیں۔

حکایت: ایک دیوانہ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کے پاس آ کر بولا کہ بتایئے کونسا صبر افضل ہے۔ آپ نے فرمایا اَلصَّبْرُ فِی اللّٰہِ۔ وہ بولا نہیں آپ نے فرمایا اَلصَّبْرُ لِلّٰہِ وہ بولا نہیں آپ نے فرمایا اَلصَّبْرُ مَعَ اللّٰہِ۔ وہ بولا نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر تو کہہ۔ وہ بولا اَلصَّبْرُ عَنِ اللّٰہِ۔ حضرت شبلی یہ سن کر چیخیں مار کرا تنا روئے قریب تھا کہ جان نکل جائے (تفسیر کبیر) حقیقی محبوب رب ہے۔ اس سے مجوب رہ کر بے قرار نہ ہونا صبر ہے۔ اور صوفیاء کے نزدیک بڑا صابر وہ ہے۔ نیز راہِ محبت طے کرنے کی حالت میں بندے پر کبھی قبض وارد ہوتا ہے۔ کبھی بسط صابر وہ ہے جو قبض میں گھبرا کر یہ سفر چھوڑ نہ دے۔ اور بسط میں فخر و ناز نہ کرے۔ کبھی نماز و دیگر عبادات میں ایسی لذت آتی ہے کہ سبحان اللہ اور کبھی کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ وہ بسط تھا یہ قبض۔ لطف نہ آنے کی صورت میں نماز وغیرہ سے دل تنگ نہ ہو جائے۔ اور چھوڑ نہ بیٹھے۔ کسی نے ایک بزرگ سے نماز میں دل نہ لگنے کا شکایت کی۔ بولا کہ نماز پڑھ تو لیتا ہوں مگر لطف خاک نہیں آتا' دل نہیں لگتا بزرگ نے فرمایا تم بڑے خوش نصیب ہو کہ خالص اللہ کے لئے عبادت کرتے کیونکہ جس نماز میں مزہ آئے اور وہ نماز پڑھے' وہ مزے کے لئے پڑھتا ہے مگر جسے مزہ نہ آئے اور پڑھے وہ اللہ کے لئے ہی پڑھتا ہے بلکہ اگر اتفاقاً کبھی نماز قضا ہو جائے یا جماعت جاتی رہے۔ اس پر سخت رنج ہو پھر اس رنج پر صبر کرے یہ بھی صبر کی ایک صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بار حضور انور ﷺ اور صحابہ کرام کی نمازِ فجر قضا کرا دی۔ اس قضاء میں یہ حکمت تھی کہ ان حضرات کو اس پر ملال ہو اور اس کا ثواب ملے۔ اور ملال پر صبر کریں تو صبر کا بھی ثواب اور تا قیامت لوگوں کو قضا کے احکام معلوم ہوں اور وہ متقی محبت اور ارادہ میں سچے ہیں۔ اور راہ محبت میں وہ اللہ کے مطیع ہیں۔ اور جو اللہ کی راہ میں اپنے مال' اپنے افعال' اپنے صفات' اپنے نفوس' اپنی ذات غرضکہ اپنا سب کچھ خرچ کر ڈالتے ہیں اور جب مطلع انوار سے نوری تجلیاں ظاہر ہوتی ہیں اور قیامت کبریٰ کے دن کا سویرا ہوتا ہے تو وہ اپنے تعینات کے گناہ سے معافی چاہتے ہیں۔ یہ اس میدان کے سچے متقی ہیں۔ بعض صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ صابر وہ جو طلب پر قائم رہے۔ تعب سے نہ گھبرائے۔ ہر راحت وطرب کو چھوڑ دے۔ بلویٰ پر صبر کرے۔ شکویٰ سے دور رہے۔ دنیا و عقبیٰ پر نظر نہ کرے۔ یہاں تک کہ مولیٰ کو پالے۔ صادق وہ جو طلب میں صادق ہو۔ پھر وارد ہو۔ پھر صادق ہو۔ پھر شاہد ہو۔ پھر شاہد پھر صادق ہو۔ پس رب کا واجد ہو۔ پھر صادق ہو۔ پس اپنا ناقد ہو۔ ان کا حال اولاً قصد پھر بروز پھر شہود پھر وجود پھر خمود رہے۔ رب تعالیٰ اس قال کو بھی حال بنا دے۔ (تفسیر ابن عربی و روح المعانی)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ

گواہی دی اللہ نے کہ تحقیق شان یہ ہے کہ نہیں کوئی معبود سوا اس کے اور فرشتوں اور صاحبان علم نے قائم ہے ساتھ انصاف کے

اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۟

نہیں ہے کوئی معبود [illegible] حکمت والا تحقیق دین نزدیک اللہ کے اسلام ہے

اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں عزت والا حکمت والا بیشک اللہ کے یہاں اسلام ہی دین ہے

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ

اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے جو دیئے گئے کتاب مگر پیچھے سے اس کے کہ آیا ان کے پاس علم

اور پھوٹ میں نہ پڑے کتابی مگر بعد اس کے کہ انہیں علم آ چکا

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

حسد سے درمیان اپنے اور جو کوئی انکار کرے آیتوں کا اللہ کی پس تحقیق اللہ جلد حساب لینے والا ہے

اپنے دلوں کی جلن سے اور جو اللہ کی آیتوں کا منکر ہے تو بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے

تعلق

اس آیت کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں متقین کے اوصاف اور تقویٰ کے ارکان بیان کئے گئے۔ اب تقویٰ کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ پرہیز گار اس لئے رب سے ڈرتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ایمان کا ذکر تھا۔ اب دلائل ایمان بیان ہو رہے ہیں کہ رب تعالیٰ کی وحدانیت پر خود پروردگار اور اس کی مخلوق گواہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ بغیر تقویٰ جنت نہیں مل سکتی۔ اب اس کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ رب تعالیٰ کے ہاں انصاف ہے ظلم نہیں اور اس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ جس کے ہاں اس کے فیصلہ کی اپیل کی جا سکے۔ لہٰذا تقویٰ ہی جنت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں متقیوں کی صفات میں ایمان کا ذکر ہوا تھا۔ اب ایمان کے رکن اعلیٰ یعنی رب کی ذات و صفات کا ذکر ہے گویا ایمان کا ایمانی ذکر پہلے ہوا تھا۔ اب اس کی قدرے تفصیل ہو رہی ہے۔

شان نزول

شام کے علمائے یہود میں سے دو عالم حضور سید دو عالم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ جب انہوں نے مدینہ منورہ کو دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ نبی آخر الزمان (ﷺ) کے شہر کی یہ ہی صفت ہے جو اس شہر میں پائی جاتی ہے۔ جب آستانہ اقدس پر حاضر ہوئے تو انہوں نے حضور علیہ السلام کی شکل مبارک اور اخلاق کریمانہ کو توریت کے مطابق دیکھ کر حضور علیہ السلام کو پہچان لیا۔ اور عرض کیا کہ آپ محمد ہیں (ﷺ) حضور علیہ السلام نے فرمایا ہاں۔ پھر فرمایا کیا آپ احمد ہیں۔ فرمایا ہاں (ﷺ) عرض کرنے لگے۔ ہم ایک سوال پیش کرتے ہیں۔ اگر آپ نے اس کا ٹھیک جواب دے دیا۔ تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ فرمایئے کہ کتاب اللہ میں سب سے بڑی گواہی کونسی ہے؟ اس پر آیت کریمہ شَهِدَ اللّٰهُ الخ نازل ہوئی۔ جسے سن کر وہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ (خزائن العرفان روح البیان و روح المعانی وغیرہ)۔ غرضکہ یہ لوگ کہیں سے آئے تھے۔ اور کہیں جا رہے تھے۔ راستہ میں ایمان و عرفان بھی مل گیا۔ اور صحابیت بھی میسر ہو گئی۔ شعر

خدا کے دین کا ... سے ... کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے

رب کی بے نیازی ہے کہ مدینہ میں رہنے والے یہود منافقین کو ایمان نہ ملا اور مدینہ پر سے گزرنے والوں کو بہت کچھ مل گیا۔ شعر

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب از روم! ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ العجبیست !!!

ایک روایت یہ ہے کہ یہود اور عیسائیوں نے اسلام کا نام چھوڑ کر اپنے دین کا نام یہودیت اور نصرانیت رکھ لیا۔ یہودیوں نے اپنے خاندان کے عیسائیوں نے اپنے ملک کے نام پر دین کے نام رکھے۔ یہودان کے جد کا نام تھا۔ ناصرہ عیسائیوں کے وطن کا نام۔ جیسے آریہ آج ایران کے نام پر پارسی فارس ملک کے نام پر منسوب ہے۔ ہندو بمعنی چور وڈاکوان کے اعمال تھے۔ ان کے نام پر نام ہوا۔ اسلام کے جیسے کام پیارے ہیں۔ ویسے ہی نام پیارا۔ جن میں نسبت۔ ملک وغیرہ کی بو تک نہیں۔ اسلامی سنہ ہجری میں بھی ہجرت کی یادگار ہے۔ جو ایک عبادت ہے اسلامی سلام و اذان بھی تمام دینوں کے سلام اعلان اور عبادت سے افضل۔ غرضیکہ یہود نے اپنے دین کے نام بدلے۔ اور حضور علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا۔ تب آیت کریمہ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ۔ نازل ہوئی (خزائن و روح المعانی) ایک روایت یہ ہے کہ یہود نے کہا ہمارا دین افضل ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ ہمارا دین اعلیٰ۔ ان دونوں کے دعوے کو باطل کرنے کے لئے اِنَّ الدِّیۡنَ الخ اور وَمَا اخۡتَلَفَ الَّذِیۡنَ الخ نازل ہوئی۔ (روح المعانی) حضرت سعید ابن جبیر سے روایت ہے کہ کعبہ معظمہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ جب مدینہ منورہ میں یہ آیت اتری۔ تب کعبہ کے اندر وہ سارے بت سجدہ میں گر گئے۔ (خزائن العرفان)

تفسیر

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالۡمَلٰۤئِكَةُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ۔ شَهِدَ شہود اور شہادت کا فعل ماضی ہے یہاں شہادت سے بنا۔ بمعنی گواہی۔ گواہی کی چند صورتیں ہوتی ہیں۔ (۱) کسی نے حاکم کی کچہری میں دعویٰ کیا۔ حاکم نے ثبوت مانگا۔ اس نے گواہ پیش کردیے۔ جنہوں نے مدعی کی تصدیق کی۔ اس گواہی کے لئے دعویٰ کچہری وغیرہ ضروری ہے۔

(۲) آپ نے ماہ رمضان کا چاند دیکھا۔ عالم سے یا لوگوں سے کہا کہ کل روزہ ہے۔ یعنی چاند دیکھ لیا ہے۔ اس گواہی کے لئے نہ دعویٰ ضروری ہے اور نہ کچہری لازم۔ صرف دینی مسئلہ شائع کرنے کے لئے گواہی دی۔

(۳) مسجد کی عمارت اور وہاں کا سامان تمام گھروں اور گرجوں مندر وغیرہ سے ممتاز ہے تاکہ عمارت کی وضع قطع سامان گواہی دے کہ یہ نہ کسی کا مکان ہے نہ مندر وغیرہ۔ محراب و ممبر چٹائیاں اور مصلے اس کی مسجدیت کی گواہ ہیں۔ یونیورسٹی کی سند۔ حاکم کی وردی۔ بلکہ محکمہ اور حکومت کی طرف سے گواہ ہیں۔ غرضیکہ جیسا گواہ ویسی گواہی یہاں گواہی کا فاعل تین ذاتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور فرشتہ اور علماء یا ان تینوں کی شہادت ایک معنی کی ہے۔ یعنی سچی خبر کہ رب تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی قرآن کریم میں خبر دی اور فرشتوں نے بطریق شہودی اور علماء نے دلائل یقینیہ دیکھ کر توحید کا اقرار کیا یا بمعنی بیان یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید ظاہر کی اور فرشتوں نے انبیائے کرام کو اس کی خبر دی۔ اور علماء نے دلائل دیکھ کر مخلوق سے اس کا بیان کیا۔ یا اللہ کی گواہی اور ہے مگر فرشتوں اور علماء کی گواہی کچھ اور۔ رب تعالیٰ کی گواہی دلائل قدرت کو پیدا فرمانا ہے۔ اور مخلوق کی گواہی ان دلائل کو دیکھ کر اقرار کرنا ہے۔ اِنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وہ بات ہے جس کی گواہی دی گئی۔ اور ملائکہ لفظ اللہ پر معطوف ہے اور علم والوں سے یا تو انبیائے کرام مراد ہیں یا مہاجرین یا انصار یا اہل کتاب کے علماء کہ جو حضور ﷺ کو دیکھ کر ایمان لے آئے یا سارے

علمائے دین چونکہ فرشتوں کا علم بدیہی ہے۔ نیز فرشتہ رب تعالیٰ اور انسان کے درمیان واسطہ ہیں۔ نیز فرشتوں میں کوئی مشرک یا منکر رب نہیں۔ نیز یہ حکم ان کی بقاو زندگی کا ذریعہ ہے۔ کہ ہم لوگ ہوا سے سانس لیتے ہیں۔ اور ان کی ہوا کلمہ ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں کیونکہ جہاں وہ ہیں وہاں ہوا کہاں۔ اس لئے علماء سے پہلے ان کا ذکر کیا گیا۔ چونکہ حضور ﷺ کو مانے بغیر گواہی توحید بیکار ہے۔ اس لئے ان علماء اہل کتاب کا ذکر کیا ہوا ہے جو یہاں حضور پر ایمان لے آئے تھے یا چونکہ علماء اسلام کی گواہی توحید تمام مسلمانوں کی گواہی کا ذریعہ ہے کہ یہاں ہی سے اسلام کے عقائد و اعمال قائم ہیں۔ اس لئے صرف علماء کی گواہی کا ذکر ہوا علماء اگرچہ بُرے ہوں مگر دین ان سے قائم ہے۔ شیر خوار بچے کی زندگی ماں کی چھاتیوں کا دودھ ہے اگرچہ وہ میلی کچیلی ہو۔ یوں ہی علماء کے سینے مسلمانوں کی روحانی زندگی کے بقا کا ذریعہ ہیں۔ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ۔ قَآئِمًا قیام سے بنا بمعنی کھڑا ہونا۔ سیدھا ہونا قائم کرنا اور جاری کرنا۔ یہاں اخیری دو معنے بن سکتے ہیں۔ یہ ترکیب میں الا ھو کی ضمیر ھو سے حال ہے یا الہ کی صفت۔ اور صفت موصوف میں فاصلہ جائز ہے یا لفظ اللہ کا حال ہے یا اُولُوا الْعِلْمِ کا حال۔ ممکن ہے کہ امدح پوشیدہ فعل کا مفعول بہ ہو۔ (کبیر و معانی وغیرہ) بِالْقِسْطِ کی ب یا تعدیہ کی ہے یا صلہ کی یعنی قسط کو قائم کرنے والا یا قسط سے قائم ہو کر قسط کے لغوی معنی ہیں حصہ۔ اس کی جمع ہے اقساط۔ اصطلاح میں انصاف کو قسط کہتے ہیں۔ کیونکہ انصاف کے ذریعہ ہر ایک کو اس کا حصہ پہنچ جاتا ہے مگر لطف یہ ہے کہ قاسط بمعنی ظالم آتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔ (الجن: ۱۵) اور مقسط بمعنی منصف و عادل ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ مگر قسط کبھی بمعنی ظلم نہیں آتا۔ یہاں اگر یہ رب کی صفت ہو تو اس سے دینی اور دنیوی انصاف مراد ہے۔ یعنی رب تعالیٰ دینی دنیوی معاملات میں انصاف فرمانے والا ہے کہ ہر ایک کو اس کے لائق اعضائے حسن، غنی، فقیری، بیماری، تندرستی، عمر وغیرہ۔ اسی طرح ہر ایک کو علم، جہالت، ہدایت، گمراہی عطا فرماتا ہے، جو جسے دیا عین انصاف سے دیا نہ کہ ظلم سے۔ ایسے ہی آخرت میں انصاف قائم فرمائے گا۔ کسی پر ظلم نہ کرے گا۔ یہاں قسط ظلم کا صلہ ہے نہ کہ رحم و فضل کا۔ اللہ ظلم نہیں کرے گا فضل کرے گا۔ اور اگر علماء کی صفت ہو تو قسط سے مراد عدل بمعنی عدالت ہے۔ یعنی وہ اہل علم بھی توحید کے گواہ ہیں۔ جو عادل یعنی متقی پرہیزگار ہیں۔ خیال رہے کہ چند معطوفوں میں سے ایک کا بھی حال آ سکتا ہے۔ جیسے وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً۔ (انبیاء: ۷۲) یہاں نافلہ یعقوب کا حال ہے۔ ایسے ہی قائما اولو العلم کا حال بن سکتا ہے۔ (معانی) یعنی ظالم عالم اگرچہ توحید کی گواہی نہ دیں توریت و انجیل کو بدل دیں مگر منصف عالم گواہ ہیں۔ عوام کی گواہی توحید زبان سے ہے علماء کی گواہی قلم سے۔ شہدا کی گواہی اپنے خون سے۔ چونکہ قلم کی گواہی قیامت تک باقی رہتی ہے۔ اور اس سے ہزار ہا کو ایمان ملتا رہتا ہے۔ اس لئے رب تعالیٰ نے علماء کی گواہی کا خصوصیت سے یہاں بھی ذکر فرمایا۔ اور اپنے محبوب کی نبوت میں بھی فرمایا اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ (شعراء: ۱۹۷)۔ وہ مشائخ فخر کرتے ہیں جن کے مرید علماء ہوں علم سے مراد علم دین ہے کہ دیگر علوم کیونکہ علم کی عظمت معلوم کی عظمت سے ہوتی ہے۔ علم دین کا معلوم ذات و صفات الٰہیہ ہیں۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ یہ عبارت یا تو پہلے لَاۤ اِلٰهَ الخ کی تکرار ہے کہ وہ دعویٰ تھا۔ اور یہ نتیجہ۔ یا وہ رب کا فرمان تھا اور یہ فرشتوں اور اہل علم کا عزیز سے کمال قدرت اور حکیم سے کمال علم کی طرف اشارہ ہے یہی دو صفتیں ربوبیت کے لئے نہایت ضروری ہیں

چونکہ قدرت سے موصوف ہونا اتصاف علم سے مقدم ہے اس لئے پہلے عزیز فرمایا گیا پھر حکیم چونکہ اب تک پرہیزگاروں کی تعریف اوران کے فضائل ارشاد ہوئے تھے۔شاید کوئی کہتا کہ جنت کے لئے نیک اعمال کی ضرورت ہے۔کسی دین میں رہ کر کرلئے جائیں۔اس وہم کو دفع کرنے کے لئے ارشاد ہوا۔اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔بعض قرأتوں میں اَنَّ الف کے فتح سے ہے۔شَهِدَ کا مفعول یعنی اللہ فرشتوں اور علماء نے توحید کی بھی گواہی دی۔اور حقانیت اسلام کی بھی۔مگر عام قرأت میں اِنَّ الف کے کسرہ سے ہے نیا جملہ دین کے متعلق ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکے۔یہاں اتنا سمجھ لو کہ اس کے لغوی معنی بدلہ ہیں۔کہا جاتا ہے کہ کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ تو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا' پھر اطاعت اور تصدیق عقائد اور شریعت کو دین کہا جانے لگا۔عِنْدَ اللّٰهِ ایک پوشیدہ لفظ کا ظرف ہے المعتبر یا الصحیح یا المحبوب یا الثابت یا المرضی یعنی ایسا دین جو اللہ کے نزدیک معتبر و پسندیدہ ہو۔وہ صرف اسلام ہے۔اسلام کے لغوی معنی تین ہیں:۔(۱) اطاعت میں داخل ہونا۔سلم بمعنی اطاعت (۲) سلامتی میں داخل ہونا سلم بمعنی سلامتی (۳) عبادت میں اخلاص کرنا۔سلم بمعنی خلوص کہا جاتا ہے۔سلم الشیئی لفلان۔یہ چیز فلانے کی ہوگئی۔اصطلاح شریعت میں اسلام بمعنی ایمان ہے اسی لئے یہاں دین کو اسلام کہا گیا۔ ایک جگہ ارشاد ہوا۔وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ۔(آل عمران:۸۵) جہاں کہیں اسلام ایمان کا مقابل استعمال ہوا وہاں لغوی معنی میں ہے۔یعنی اطاعت جیسے۔قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔(حجرات:۱۴)(کبیر) خیال رہے کہ ہر اصولی مذہب کو دین کہا جاسکتا ہے۔خواہ سچا ہو یا جھوٹا مگر اسلام سچے دین کو کہا جائے گا۔یہ بھی خیال رہے کہ اصول عقائد کو دین کہا جاتا ہے اور فروعی مسائل کو مذہب۔لہٰذا ہم میں اور شافعیوں میں دینی اختلاف نہیں۔مذہبی اختلاف ہے مگر ہم میں اور عیسائی یہودیوں میں دینی اختلاف ہے' اس لئے یہاں دین ارشاد ہوا نہ کہ مذہب۔وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔یہ وجہ گمراہی کا بیان ہے اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے یا یہودی مراد ہیں یا عیسائی یا یہ دونوں۔تفسیر کبیر وغیرہ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت ستر آدمیوں کو چن کر انہیں توریت سپرد کی اور ان سے تبلیغ دین کا عہد لیا۔یوشع علیہ السلام کو ان کا امیر مقرر کیا۔تین پشت تک یہ سب لوگ ہدایت پر قائم رہے۔پھر ان کی اولاد نے دنیوی طمع سے دین کو بگاڑ دیا۔اس طرف اس آیت میں اشارہ ہے یہاں اختلاف سے مراد یا تو ان کے آپس کا دینی اختلاف ہے جو انہوں نے پیدا کر رکھا تھا۔یا حضور علیہ السلام کی نبوت کی مخالفت۔وہ کہتے تھے کہ نبوت کے مستحق ہم ہی ہیں نہ کہ قریش اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ۔یہ پچھلی عبارت کا مستثنیٰ مفرغ ہے اور اس عبارت سے مقصود ان کی سخت برائی بیان کرنا ہے کہ لوگ نادانی میں ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوئے بلکہ جان بوجھ کر خیال رہے کہ ما مصدریہ ہے اور علم سے مراد آسمانی کتابوں کا علم ہے یا حضور علیہ السلام کی نبوت کا علم۔یعنی ان لوگوں نے آسمانی کتابوں کو جان کر آپس میں اختلاف کیا۔یا حضور علیہ السلام کی اپنی کتابوں کی بیان کی ہوئی علامات سے پہچان کر ان کی مخالفت کی۔کیوں بَغْیًا ۢ بَیْنَهُمْ۔بَغْیًا اِخْتَلَفَ کا مفعول لہٗ ہے۔اس سے پہلے لام چھپا ہوا ہے۔اس کے لغوی معنی تلاش اور طلب ہیں لیکن حسد کو بھی اسی لئے بغی کہہ دیتے ہیں کہ اس میں حاسد محسود کی برائی تلاش کرتا ہے۔بَیْنَهُمْ ثابتًا کا ظرف ہو کر بَغْیًا کی صفت ہے یعنی ان لوگوں نے جان بوجھ کر صرف حسد سے اختلاف کیا۔ حسد کا اختلاف خلاف ہے جو سخت برا ہے اور تحقیق کا اختلاف [illegible] اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جس سے مسئلہ کی

تحقیق ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کی امت کے اماموں کا اختلاف تحقیق کا تھا نہ کہ حسد کا جس سے دین واضح ہو گیا۔ حسد کے اختلاف میں نہ علم مفید ہوتا ہے نہ کتاب اللہ نہ عقل دیکھو وہ اسرائیلی اولاد انبیاء تھے عالم تھے۔ حضور ﷺ کی صحبت میں رہتے تھے مدینہ پاک کی زمین میں مگر ایک حسد کی وجہ سے اصل ایمان سے بھی محروم رہے۔ شیطان کو حسد نے ہی مارا اس لئے ارشاد ہوا بَغْیًا بَیْنَهُمْ۔ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ۔ یہ حاسدوں کو تنبیہ ہے کفر بمعنی انکار ہے۔ اور آیات سے مراد یا توریت ہے یا انجیل یا توریت و انجیل کی وہ آیتیں جو حضور علیہ السلام کی نعت شریف میں تھیں۔ یا قرآن شریف یا حقانیت اسلام کے سارے دلائل۔ اسی طرح مَنْ سے یا یہود یا عیسائی یا وہ دونوں یا وہ سارے بے دین مراد ہیں۔ یعنی جو کوئی اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۔ یہ جملہ مَنْ یَّكْفُرْ کا جواب نہیں بلکہ جواب کی دلیل ہے۔ اسے قائم مقام جواب قرار دیا گیا۔ یعنی جو کوئی رب کی آیتوں کا انکار کرے۔ اللہ اسے سخت عذاب دے گا۔ کیونکہ وہ جلد حساب لینے والا ہے۔ خیال رہے کہ سریع یا تو بمعنی قریب ہے یا بمعنی سرعت والا۔ یعنی اللہ عنقریب حساب لینے والا ہے۔ یا وہ ساری مخلوق کا اتنا بڑا حساب آناً فاناً لے گا۔

خلاصہ تفسیر

اللہ کی وحدانیت پر خود رب نے گواہی دی کہ آسمانی کتابوں میں اس کا اعلان فرمایا۔ نیز عالم کے ذرہ ذرہ میں اس کے دلائل قائم فرما دیئے۔ تمام چیزیں کتابوں سے پڑھی جاتی ہیں مگر توحید وہ مضمون ہے جس کے لئے کسی خاص کتاب کی ضرورت نہیں۔ عالم کا ہر ذرہ اس مضمون کی کتاب ہے۔ امام رازی کے سامنے ایک بڑھیا نے اپنے چرخہ سے رب کی ہستی بھی ثابت کی۔ اور اس کی توحید کے لئے اس کا چرخہ توحید کی کتاب بن گیا۔ اور سارے فرشتوں نے بھی اس کی گواہی دی کہ وہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کی یہ عبادت توحید کی گواہی ہے اور وہ انبیائے کرام سے عرض بھی کرتے ہیں کہ اللہ ایک ہے۔ نیز عام علماء جو عدل و انصاف کے ساتھ قائم اور متقی و پرہیز گار ہیں وہ بھی توحید الٰہی کے گواہ کہ خود اسے مانتے اور لوگوں سے منواتے ہیں۔ غرض ہر نیک بندہ یہ ہی پکار رہا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ عقل کہتی ہے کہ مطاع بہت سے ہو سکتے ہیں مگر معبود ایک ہی چاہیے۔ کیونکہ ادنیٰ چیزیں لاکھوں ہو سکتی ہیں مگر سب سے اعلیٰ جس پر چیزوں کا مدار ہو ایک ہی چاہیے۔ درخت میں شاخیں پتے بہت ہیں مگر جڑ ایک ہمارے جسم میں پانی و دیگر اعضاء بہت مگر دل ایک ہی ہے۔ آسمان پر تارے بہت مگر سورج ایک' ملک میں رعایا بہت مگر بادشاہ ایک۔ تو چاہیے کہ مطاع بہت ہوں۔ مگر معبود ایک۔ وہ ہی سب پر غالب ہے کہ سب اس کے مقابل عاجز اور وہ ہی حکمت والا ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔ چونکہ اس آیت شَهِدَ اللّٰهُ میں صرف توحید کا ذکر تھا اور عقیدہ توحید بغیر رسالت کے مانے ہوئے نجات کے لئے کافی نہیں اسلام کے سوا بہت سے دینوں میں توحید مانی جاتی ہے۔ نیز پہلی آیت میں حمد الٰہی کا ذکر ہوا تھا۔ حمد الٰہی بغیر نعت مصطفوی کے مکمل نہیں۔ نیز صرف اصلاح عقیدے پر کفایت نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اعمال صالحہ کی بھی کوشش ضروری اس لئے توحید کے بعد اسلام کی حقانیت کا ذکر ہوا۔ جس میں توحید و رسالت اعمال وغیرہ سب کچھ آ جاتا ہے اور فرمایا گیا۔ اے مسلمانو صرف توحید مان لینے سے کوئی پرہیز گار نہیں بن سکتا۔ خیال ... اللہ ... اس کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر کے

کوئی متقی نہیں بن سکتا۔ خواہ کتنی ہی نیکی کرے گا اسلام کی حقانیت اور نبی ﷺ کی سچائی کو سارے اہل کتاب بھی جانتے ہیں۔ ان کی یہ مخالفت نادانی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر ہے۔ صرف حسد کی وجہ سے وہ اسلام کی حقانیت کے منکر ہیں۔ انہیں جلن یہ ہے کہ نبوت بنی اسمٰعیل کو کیوں مل گئی۔ اس کے ٹھیکیدار صرف بنی اسرائیل ہیں' یا اہل کتاب کا دین ایک ہی تھا۔ یعنی اسلام انہوں نے حسد کی وجہ سے جان بوجھ کر آپس میں اختلاف کیا اور صدہا فرقے بن گئے۔ ہر شخص خیال رکھے کہ جو کوئی اللہ کی کتابوں۔ اللہ کی آیتوں' اللہ کے دلائل قدرت کا انکار کرے گا وہ جلد سزا پائے گا۔ یہ نہ سمجھے کہ ابھی قیامت بہت دور ہے اور وہاں حساب میں بہت دیر لگے گی۔ اتنا بڑا حساب صدیوں میں ہوگا۔ نہ معلوم میری باری کب آئے۔ ابھی تو آرام کرلیں پھر دیکھا جائے گا۔ اللہ عنقریب اور جھٹ پٹ حساب لینے والا ہے۔ خیال رہے کہ جیسے توحید الٰہی عالم کے ہر ذرہ ذرہ سے ظاہر ہے۔ ایسے ہی حضور ﷺ کی نبوت ذرہ ذرہ سے عیاں ہے اگر انسان میں کچھ بھی عقل و ہوش ہے تو وہ ہر چیز سے حضور کی نبوت ثابت کرسکتا ہے' اتنے دشمنوں میں گھر کر حضور انور ﷺ کا سلامت رہ جانا ہی آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔ جس کا دشمن سارا ملک ہو۔ بادشاہت میں اسے قتل کردینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ نیز حضور کی محبوبیت آپ کا عام چرچہ حضور کی حقانیت کی دلیل ہے۔ نیز قرآن کا بقا حضور ﷺ کی حقانیت کی دلیل ہے کہ توریت و انجیل عبرانی زبان میں آئیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ وید کتاب الٰہی ہے جو سنسکرت میں آیا۔ پارسیوں کے ہاں یہ کتاب الٰہی ہے لیکن رب نے ان تینوں زبانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ زندان کے بولنے والا دنیا میں کوئی نہیں مگر قرآن کی زبان عربی تمام جہان میں بلکہ خود مصر میں جہاں عبرانی زبان بولی جاتی تھی۔ باقی رکھی گئی یہ وہ زبانیں ہیں جن سے ہر ہوش والا حضور کی حقانیت ماننے پر مجبور ہے۔ غرضیکہ رب کی توحید حضور کی نبوت ایسے مضامین ہیں جو کسی کتاب سے نہیں سیکھے جاتے۔ عالم کی ہر چیز ان کی کتاب ہے۔

فضیلت: شَهِدَ اللّٰهُ سے الحکیم تک آیت کے بڑے فضائل ہیں۔ چنانچہ دیلمی نے ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ جب سورۂ فاتحہ اور آیت الکرسی اور یہ آیت شَهِدَ اللّٰهُ الخ اور آیت قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ...... بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران: ۲۶۔۲۷) تک نازل ہوئیں۔ تو یہ عرش الٰہی سے لپٹ گئیں۔ اور عرض کیا کہ اے مولا تو ہمیں ایسی قوم پر اتار رہا ہے جو تیری نافرمانی کرے گی۔ رب تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی عزت کی قسم اپنے جلال کی قسم اپنے درجہ کی قسم جو بندہ ہر فرضی نماز کے بعد تمہیں پڑھ لیا کرے گا۔ میں اس کے سارے گناہ بخش دوں گا۔ اور اسے جنت الفردوس میں رکھوں گا۔ اور روزانہ اس پر ستر بار نظر رحمت کروں گا اور اس کی ستر حاجتیں پوری کروں گا۔

(۲) ابن عدی' طبرانی' بیہقی' خطیب اور ابن نجار نے حضرت غالب قطان سے روایت کی۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک بار کوفے گیا۔ حضرت اعمش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب ہی ٹھہرا۔ میں نے دیکھا کہ ایک رات وہ تہجد کیلئے اٹھے تو انہوں نے یہ ہی آیت پڑھی اور بار بار فرمایا کہ جس کی رب نے گواہی دی۔ اس کی میں بھی گواہی دیتا ہوں۔ اے اللہ یہ میری گواہی تیرے پاس امانت ہے! میں نے پوچھا۔ جناب آپ یہ کیوں فرما رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ مجھے ابو وائل ابن عبد اللہ نے خبر دی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جب اس آیت کا پڑھنے والا قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوگا تو رب تعالیٰ فرمائے گا کہ میرے پاس ایک بندہ کا عہد ہے اور میں عہد ضرور پورا کروں گا۔ میرے اس بندہ کو جنت میں لے جاؤ۔ (روح المعانی)

(۳) ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جب مدینہ منورہ میں یہ آیت اُتری تو خانہ کعبہ کے تین سو ساٹھ (۳۶۰) بتوں نے کعبہ کی طرف سجدہ کیا۔

(۴) جو کوئی سوتے وقت یہ آیت کریمہ پڑھ لیا کرے۔ تو رب تعالیٰ اس پر ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتوں کو مقرر فرماتا ہے جو قیامت تک اسکے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ (مدارک)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** علمائے کرام بڑے درجہ والے ہیں۔ کہ رب تعالیٰ نے ان کا ذکر اپنے اور ملائکہ کے ساتھ کیا۔ اور اپنی توحید پر ان کو گواہ بنایا۔ اور بڑے مدعی کا گواہ بننا بھی فخر کی بات ہے۔ **دوسرا فائدہ:** غیر مسلم کی کوئی نیکی قبول نہیں۔ کافر کی نیکیاں ایسی ہیں جیسے بے وضو شخص کی نماز۔ جیسا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ الخ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** دلائل و حالات کی گواہی معتبر ہے۔ جیسے شَهِدَ اللّٰهُ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ لہٰذا بعض جگہ علامات کی گواہی سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ **چوتھا فائدہ:** رب تعالیٰ کا ہر کام عین عدل ہے کوئی ظلم نہیں' جیسا قَآئِمًا بِالْقِسْطِ سے معلوم ہوا کہ جسکو دیا عدل و کرم سے دیا۔ **پانچواں فائدہ:** کوئی فرشتہ بے دین نہیں' انسان ہزار ہا بے دین ہیں' جیسا کہ قائمًا بالقسط کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** کبھی حسد سے دین جاتا رہتا ہے۔ جیسے بَغْيًا بَيْنَهُمْ سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** اسلام اور ایمان ایک ہی چیز ہے کیونکہ یہاں دین پر لفظ اسلام بولا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ دین عقائد کا نام ہے نہ کہ محض اعمال کا۔ **آٹھواں فائدہ:** ہر سچا دین اسلام کہلاتا ہے۔ لہٰذا یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقت میں اسلام کہلاتے تھے۔ اب جب منسوخ ہو گئے تو ان کا یہ نام بھی جاتا رہا۔ اب صرف دین محمدی کا نام اسلام ہے۔

حقانیت اسلام

دنیا کی ہر قوم اپنے دین کو حق جانتی ہے اور دوسرے ادیان کو باطل۔ مگر سچ یہ ہے کہ دین اسلام ہی حق ہے۔ اس کے سوا تمام دین باطل۔ اس کے عقلی و نقلی دونوں دلائل موجود ہیں۔ چونکہ آج کل اسلام کے بعض دعویداروں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہر دین میں رہ کر انسان تقویٰ اختیار کر لیتا ہے۔ جیسے ابوالکلام آزاد وغیرہ۔ اس لئے ہم پہلے حقانیت اسلام پر نقلی دلائل عرض کرتے ہیں۔ پھر عقلی رب تعالیٰ قبول فرمائے۔ اور اپنے بندوں کو راہِ راست پر چلنے کی توفیق دے۔

حقانیت اسلام کے نقلی دلائل: (۱) اگر ایک محبوب کے چند عاشق ہوں اور ہر ایک کا دعویٰ یہ ہو کہ محبوب مجھ سے ہی راضی رہے تو اس کے فیصلہ کی بہتر صورت یہ ہی ہے کہ خود محبوب سے پوچھ لیا جائے کہ تو کس سے راضی ہے۔ اس کے بیان کے بعد کسی کو جھگڑنے کا حق نہیں۔ صرف رب تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے دین اختیار کیا جاتا ہے ہر دین والا یہ ہی سمجھے ہوئے ہے کہ رب تعالیٰ مجھ سے راضی ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ رب تعالیٰ سے پوچھ لیا جائے کہ تو کس سے خوش ہے؟ رب تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا کہ تم جھگڑتے کیوں ہو تم نے ہم کو راضی کرنے کے لئے دین اختیار کیا۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ

ہمارا پیارا دین صرف اسلام ہے۔
(۲) ابن جریر نے حضرت قتادہ سے روایت کی کہ اسلام اللہ کا دین ہے۔ جس کے لئے انبیائے کرام بھیجے گئے اور اسی کی طرف اولیاء اللہ نے رہبری کی۔ اس کے سوا کوئی دین مقبول نہیں۔ اور بغیر اسلام کوئی نیکی قبول نہیں۔
(۳) علی ابن ابراہیم نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ اسلام تسلیم ہے اور تسلیم یقین اور یقین تصدیق اور تصدیق اقرار اور اقرار ادا اور ادا عمل۔ پھر فرمایا کہ مومن نے اپنا دین رب سے لیا نہ کہ اپنی رائے سے۔ مومن وہ ہے جو اپنے ایمان کو عمل میں دیکھے۔ کافر کا کفر اس کے انکار سے پہچانا جاتا ہے۔ اے لوگو اسلام کو مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ مسلمان کا گناہ کافر کی نیکی ہے۔ بہتر ہے کیونکہ یہ گناہ بخشش کے قابل ہے اور کافر کی نیکی مردود۔ (روح المعانی)
(۴) ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ توریت کا نسخہ لئے ہوئے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور سنانے لگے۔ حضور علیہ السلام کے چہرۂ انور پر غضب کے آثار نمودار ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عمر فاروق کو اس سے آگاہ کیا۔ فاروق اعظم نے یہ حال دیکھ کر حضور علیہ السلام سے معافی چاہی۔ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قسم رب کی اگر آج موسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی اطاعت کرو تو گمراہ ہو جاؤ گے۔ اور اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے اور میری نبوت پاتے تو میری پیروی کرتے۔ (دارمی ومشکوٰۃ باب الاعتصام)
(۵) اسی مشکوٰۃ میں بحوالہ احمد و بیہقی ہے کہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بارگاہِ نبوی میں عرض کیا کہ حضور (ﷺ) ہمیں یہود کی بعض باتیں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیا انہیں ہم لکھ لیا کریں۔ فرمایا کیا تمہیں یہود اور نصاریٰ کی طرح اپنے قرآن پر اعتماد نہیں۔ میں تمہارے پاس صاف اور روشن دین لے کر آیا۔ اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں ہماری اطاعت کرنی پڑتی۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ گذشتہ آسمانی دین اب قابل عمل نہیں اور نہ ان میں ہدایت ہے چہ جائیکہ شیطانی ادیان۔ زمین پر بہت سے کلمے پڑھے گئے۔ ہر دین والے نبی کا کلمہ علیحدہ تھا مگر بعد موت اور قیامت میں ساری امتیں تو کیا ان کے نبی بھی محمدی کلمہ پڑھیں گے۔
(۷) حساب قبر میں صرف ہمارے رسول کا نام ہی پوچھا جاتا ہے اور اسلام ہی کا سوال ہوتا ہے۔ حضور سے پہلے حساب قبر تھا ہی نہیں۔ یہ قانون حضور کے زمانہ سے بنا۔
(۸) معراج میں سارے رسولوں نے اسلامی و محمدی نماز ہی پڑھی۔ حالانکہ ان کی نمازیں اور تھیں۔
عقلی دلائل: ایک بار چندوسی ضلع مراد آباد میں مذہب کانفرنس ہوئی۔ جس میں عیسائی، آریہ، ہندو اور مسلمانوں کی طرف سے میں مدعو تھا۔ ہر ایک نے اپنے مذہب کے اصول بیان کئے۔ عیسائیوں نے کہا کہ ہمارے مذہب کی اصل محبت ہے۔ شانتی۔ ہندو بولے ہمارے مذہب کی بنیاد ہمہ اوست پر ہے۔ کہ ہر چیز میں رب کا جمال دیکھے۔ ہم نے کہا کہ اسلام کے بنیادی اصول۔ توحید رسالت آسمانی کتاب ہے جسم میں دل ایک۔ ملک میں بادشاہ ایک۔ آسمان میں سورج ایک۔ تو چاہیے کہ خلق کا خالق بھی ایک ہو پھر مخلوق اور خالق کے درمیان ایسے واسطہ کی ضرورت ہے جو رب سے فیض لے سکے ہم کو

دے سکے پھر ہم میں سے ہو ہم سے کہہ سکے اس واسطے کا نام نبی ہے۔ آگ پانی اور خاک نبی نہیں ہو سکتے کہ ہم سے بول چال نہیں کر سکتے۔ کتاب اللہ کی پہچان یہ ہے کہ بندہ سے اس کی مثل نہ بن سکے۔ انسانی صنعت اور ربانی صنعت میں یہ ہی فرق ہے۔ قرآن کریم میں یہ صنعت موجود ہے کہ اس کی مثل کسی سے نہ بن سکی۔ یہ تقریر اس جلسہ میں پسند کی گئی۔ مسافر پردیس میں ایسا ہوٹل تلاش کرتا ہے جس میں رہنے سہنے غذا ہوا پانی پاخانہ غسل خانہ وغیرہ کا اچھا انتظام ہو اور خرچ تھوڑا۔ انسان دنیا میں پردیسی ہے۔ اسے ایسا دین چاہیے جس کے احکام آسان ہوں اور اس میں زندگی کا پورا انتظام ہو۔ اور ثواب زیادہ۔ یہ خوبیاں اسلام کے سوا کسی دین میں نہیں۔ اسلام نے ماں کے پیٹ میں آنے کے وقت سے قبر میں جانے تک پورا انتظام کیا۔ زندگی کے ہر شعبہ کو سنبھالا' بچے کو دودھ پلانا' دودھ چھڑانا' پرورش کرنا' تعلیم' روزگار' شادی بیاہ' خوشی غمی کے سارے احکام تفصیل وار بیان کر دیئے۔ غریب و امیر' سلطان وزیر' تارک الدنیا اور عیال دار سب کے لئے قانون بنا دیئے۔ دوسرے مذہبوں میں یہ بات نہیں۔ مسلمانوں کو قانون و آئین بنانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے قوانین اسلام نے پہلے ہی بنا دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کے احکام نہایت آسان۔ جن پر ہر شخص بے تکلف عمل کر سکے۔ ہندوؤں' عیسائیوں کے ہاں ترک دنیا اعلیٰ عبادت ہے۔ اسلام نے اس سے روکا۔ نیز ہندوؤں کے ہاں اپنے کو تکلیف دینا۔ سادھو یا راہب بن کر زندگی گزارنا کمال ہے۔ اسلام میں یہ بات عیب۔ ہر ایک کا حق پورا کرنا ضروری ہے۔ ہندوؤں میں زکوٰۃ سولہواں حصہ واجب۔ یہودیوں پر چوتھائی حصہ۔ اسلام میں چالیسواں حصہ' اس میں بھی بہت سہولتیں دی گئیں۔ دوسری قوموں میں سوا عبادت خانوں کے اور کہیں عبادت جائز نہیں۔ مسلمانوں کے لئے ساری زمین مسجد ہے۔ یہود کے نزدیک ناپاک کپڑا جلانا اور گندے جسم کا کاٹ ڈالنا ضروری ہے۔ اسلام میں پانی مطہر مانا گیا۔ بلکہ بتیس (۳۲) طریقوں سے پاکی حاصل کی جا سکتی ہے۔ غرضکہ اس میں بہت سہولتیں ہیں اور بہت ثواب۔

(۲) کسی چیز کے فائدہ مند ہونے پر تین قسم کے دلائل دیئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا کرنے والا بڑی ہستی کا مالک ہو۔ دوسرا یہ کہ اس کے نافع ہونے کا بارہا تجربہ ہو چکا ہو۔ تیسرا یہ کہ اس کو چھوڑنے والا نقصان میں رہے۔ چوتھا یہ کہ اس دین کی کتاب نہایت مکمل۔ محفوظ و اعلیٰ ہے کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ بڑا عمدہ ہے۔ حکیم اجمل خاں کا ہے یا اس لئے کہ اس سے لاکھوں بیمار اچھے ہوئے۔ یا اس لئے کہ جن لوگوں نے اس سے غفلت کی انہوں نے نقصان اٹھایا۔ اسی قاعدہ سے اسلام کی حقانیت معلوم کر لو کہ اسلام حضور ﷺ کا دین ہے اور وہ تو تمام جہان سے اعلیٰ ہیں۔ لہٰذا اسلام تمام مذہبوں سے بڑھ کر ہے۔ یا اس لئے کہ اسلام کی برکت سے عرب کے وہ لوگ جو اپنی انسانیت کو کھو کر دنیا کی نگاہوں میں ذلیل ہو چکے تھے وہ انسان تو کیا انسان گر ہو گئے۔ جانوروں کے چرانے والے دنیا بھر کے استاد بن گئے۔ ڈکیتی اور قزاقی کرنے والے اسلام کی بدولت عالم کے نگہبان بن گئے۔ یا اس لئے کہ ہم اسلامی احکام سے بے پرواہ ہو کر ذلیل و خوار ہو گئے۔ یا اس لئے کہ اسلام کے سارے قوانین تمام ادیان کے قوانین سے اعلیٰ ہیں۔ اس پر کچھ روشنی ڈالتا ہوں۔

اسلامی کتاب یعنی قرآن کریم محفوظ کتاب ہے۔ تمام دینوں کی کتب غیر محفوظ ہیں۔ وید' انجیل' توریت نے کہیں دعویٰ نہ کیا کہ صرف اس دین میں نجات ہے باقی میں نہیں۔ صرف قرآن نے اسلام کے متعلق یہ اعلان فرمایا۔ نیز وید یا موجودہ توریت و

انجیل نے کہیں نہیں کہا کہ ہم خدائی کتاب ہیں۔ صرف قرآن نے فرمایا کہ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (الحاقہ: ۴۳) عیسائیوں سے انجیل مانگو تو پوچھتے ہیں۔ کس کی انجیل لوقا متی کی یا حمنا رسول کی۔ یا یوحنا کی یا مرقس کی۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ خدا کی انجیل معلوم ہوا کہ یہ انجیلیں خدا کی نہیں بلکہ لوقا۔ مرقس۔ وغیرہ انسانوں کی ہیں۔ نیز انجیلیں عام تھیں۔ جن میں چار ہیں۔ باقی غائب۔ جیسے انجیل برناس وغیرہ پھر ان انجیلوں کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص نے عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زندگی لکھے۔ خدائی کتاب والی کوئی بات نہیں' نہ احکام نہ قوانین' پھر اصل توریت و انجیل جو زبان عبرانی میں تھی وہ کہاں خود عبرانی زبان ہی دنیا سے غائب ہوگئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم: حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے بے مثل صفات ہیں جو کسی مذہب کے پیشوا میں نہیں پائے جاتے۔

(۱) جیسی مکمل تاریخ حضور علیہ السلام کی لکھی گئی۔ ایسی دنیا میں کسی کی نہ لکھی گئی۔ زندگی کا ہر واقعہ تاریخ میں آیا۔ اس احتیاط کے ساتھ آیا کہ باقاعدہ اس کیلئے اسنادیں بنیں۔ جو راوی کی اسناد میں آ گیا۔ اسکی بھی تاریخ لکھ دی گئی۔ مسلمان کے سوا کوئی دین والا اپنے پیشوا کی مکمل اور مستند سوانح عمری بیان نہیں کرسکتا۔ ہندوؤں کو تو یہ بھی یقین نہیں کہ جن پر وید آیا انسان بھی تھے یا نہیں۔ عیسائیوں کو یقین نہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے وفات پائی بھی یا نہیں۔ اور اگر پائی تو کیسے اسی طرح ہر مذہب کا حال ہے۔

(۲) پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر سے قدم مبارک تک ایسا مکمل حلیہ شریف لکھا گیا کہ کسی کا نہ لکھا جا سکا۔ یہاں تک روایت میں آ گیا کہ جسم پاک میں کل بیس بال سفید ہوئے۔ چودہ سر مبارک میں۔ چار داڑھی مبارک میں' دو ریش بچی میں۔ نیز ازواج نے اندرونی زندگی شریف اور صحابہ کرام نے بیرونی زندگی شریف اسی طرح پیش کردی کہ سارے مشاغل دنیا کو معلوم ہوگئے۔ کہ کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ شک و شبہ نہ رہے؟

لطیفہ: مجنوں لیلیٰ کا عاشق تھا۔ فرہاد شیریں کا اور نہ معلوم کون کون کس کس کا عاشق ہوا مگر کسی نے اپنے معشوق کی سوانح عمری نہ لکھی۔ نیز بادشاہوں نے اپنے حالات زندگی لکھوانے کا انتظام نہ کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہماری معشوقوں میں ہزاروں خامیاں ہیں اور ہم میں لاکھوں عیب۔ اپنے کو دنیا پر پیش کرنا اپنے عیب کھولنا ہے مگر صحابہ کرام کو یقین تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہان کے محبوب ہیں۔ ان کی ذات عیبوں سے دور' جوان کے حالات سُنے گا۔ وہ ان پر فدا ہی ہوگا۔ اگر کوئی اعتراض کرے گا تو اپنی حماقت سے۔ اس لئے بے کھٹک زندگی کے حالات نقل کردیئے۔

تیسری صفت: یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی ایسی اصلاح کی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ موسیٰ علیہ السلام کو صرف مصر میں فرعون کی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا تو عرض کیا کہ مولیٰ میرا سینہ کھول دے۔ میری زبان میں طاقت گویائی دے۔ میرے بھائی کو میرا وزیر اور قوت بازو بنا۔ ان کی تمام دعائیں قبول فرمائی گئیں۔ پھر بھی انہوں نے عرض کیا۔ رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی۔ (طٰہٰ: ۴۵) خدایا ہمیں خوف ہے کہ وہ ہم پر ظلم و سرکشی کرے گا تو جواب دیا گیا۔ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰی۔ (طٰہٰ: ۴۶) تم ڈرو نہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ غرضیکہ ہر طرح تسلی و تشفی فرمائی گئی مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے جہان کی ہدایت کے لئے بھیجا۔ ابو جہل اور ابولہب جیسے فرعونوں کے مقابلہ میں قائم کیا لیکن دنیوی ظاہری سہارا کوئی نہیں عطا فرمایا گیا۔ جس سیپ سے یہ دریتیم ظاہر ہوا اس مبارک شکم سے کوئی بھائی ہی نہ عطا فرمایا۔ ولادت پاک سے

پہلے سر پر یتیمی کا سہرا باندھا گیا۔ بچپن شریف میں ہی ماں کی گود بھی نہ رہی۔ جو قرابت دار باقی بچے وہ خون کے پیاسے۔ سارے عالم کی سرداری' مگر دنیوی ساز وسامان ندارد۔

چوتھی صفت: پیغمبر خدا ﷺ نے تیئس سال کی تھوڑی سی مدت میں دنیا کی ہوا بدل دی' بے دینوں کو دیندار۔ بت پرستوں کو خدا پرست اور نہ معلوم کسے کیا کیا بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہاڑ توڑ دینا آسان' دریا کا رخ بدل دینا سہل مگر بگڑی قوم کو بنا دینا دشوار۔ نوح علیہ السلام کی ایک ہزار سال تبلیغ میں کل ستر آدمی ایمان لائے۔ اور ان کے بعد بہت جلد دین بدل گیا۔ مگر حضور ﷺ کی تیئس سالہ تبلیغ میں بے شمار مسلمان ہوئے۔ اور قیامت تک دین باقی رہا۔ غرضکہ۔

بسیار خوباں دیدہ ام' لیکن تو چیزے دیگری !

اگر ہندو کہیں کہ رامچند رنے قوت بازو سے بھاری کمان کے دو ٹکڑے کر ڈالے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی انگلی میں وہ طاقت تھی کہ اشارے سے پورے چاند کو توڑ کر دو کمانیں بنا دیا۔ اگر عیسائی کہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کیے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبر (ﷺ) نے سوکھی لکڑیوں اور کنکروں کو جان بخش کر ان سے کلمہ پڑھوا لیا۔ اگر یہودی کہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی مار کر پتھر سے پانی کے چشمے بہا دیئے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی انگلیوں سے پانی کے فوارے ابال دیئے۔ یہ بطور نمونہ چند باتیں پیش کی گئیں۔

اسلامی قانون: اسلامی توانین ایسے ٹھوس اور مکمل اور نا قابل تبدیلی ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ کفار طعنہ کیا کرتے تھے کہ ایک مرد کو چند عورتوں کی کیوں اجازت دی گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عورتوں کی پیداوار زیادہ ہے اور مردوں کی موت بہت کہ لڑائیوں وغیرہ میں مرد ہی مارے جاتے ہیں تو اس کی حکمت سمجھے۔ اسلام نے چور کے ہاتھ کٹنے کا حکم دیا۔ دیگر مذاہب نے چور کو قید کرایا مگر بعد میں پتہ لگا کہ ہاتھ کٹنے سے ہی چوری بند ہو سکتی ہے۔ قید وغیرہ سے چوری بڑھے گی کہ چور جیل میں روٹی کھائے گا۔ اسلام نے جرمانہ لینے کی ممانعت کی۔ کفار نے اس کی اجازت دی۔ بعد میں پتہ لگا کہ جرمانے سے جرم بڑھیں گے۔ گھٹیں گے نہیں کہ مالداروں کو جرم پر دلیری ہو گی اور حکومت کو اس سے نفع' حکومت خود جرم چاہے گی تا کہ آمدنی ہو۔ اسلام نے ذبح حیوانات کی اجازت دی۔ ہندوؤں نے اس سے منع کیا مگر پتہ یہ لگا کہ اگر جانور ذبح نہ کیے جائیں تو انسانوں کی زندگی ناممکن ہو جائے کیونکہ ساری پیداوار وہ ہی کھا جائیں گے اور زمین انہی سے بھر جائے گی۔ اسلام نے جہاد کا حکم دیا۔ کفار نے اس سے منع کیا مگر پتہ لگا کہ بغیر جہاد کوئی قوم دنیا میں عزت پا سکتی ہی نہیں۔ امن و عزت وانتظام جہاد کی بدولت ہے۔ اسلام نے شراب' جوئے سود کو حرام کیا۔ بعض کفار نے ان چیزوں کی اجازت دی مگر تجربہ نے بتایا کہ یہ چیزیں جھگڑے' فساد' بدامنی کی جڑ ہیں۔ سود کی بدولت دن رات تاجروں کے دیوالے ہوتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کے لئے اس تفسیر کا پہلا پارہ اور ہماری کتاب اسلامی زندگی دیکھو۔

پہلا فائدہ: قرآنی آیات درجہ وفضیلت میں یکساں نہیں۔ اگر چہ ہر آیت اللہ کا کلام ہے مگر درجہ ورتبہ مختلف جن آیات میں کفار یا ابلیس یا دوزخ کا ذکر ہے وہاں ذکر وذاکر تو اعلیٰ ہے مگر مذکورہ خبریں خبیث ہیں اور جن آیات میں حضرات انبیاء یا سید الانبیاء یا رب تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر ہے وہاں ذکر وذاکر بھی اعلیٰ اور مذکور بھی اعلیٰ لہٰذا یہ آیات پچھلی آیات سے

پہلے سر پر یتیمی کا سہرا باندھا گیا۔ بچپن شریف میں ہی ماں کی گود بھی نہ رہی۔ جو قرابت دار باقی بچے وہ خون کے پیاسے۔ سارے عالم کی سرداری' مگر دنیوی ساز وسامان ندارد۔

چوتھی صفت: پیغمبر خدا ﷺ نے تیئس سال کی تھوڑی سی مدت میں دنیا کی ہوا بدل دی' بے دینوں کو دیندار۔ بت پرستوں کو خدا پرست اور نہ معلوم کسے کیا کیا بنا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہاڑ توڑ دینا آسان' دریا کا رخ بدل دینا سہل مگر بگڑی قوم کو بنا دینا دشوار۔ نوح علیہ السلام کی ایک ہزار سال تبلیغ میں کل ستر آدمی ایمان لائے۔ اور ان کے بعد بہت جلد دین بدل گیا۔ مگر حضور ﷺ کی تیئس سالہ تبلیغ میں بے شمار مسلمان ہوئے۔ اور قیامت تک دین باقی رہا۔ غرضکہ۔

بسیار خوباں دیدہ ام' لیکن تو چیزے دیگری !

اگر ہندو کہیں کہ رامچند رنے قوت بازو سے بھاری کمان کے دو ٹکڑے کر ڈالے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی انگلی میں وہ طاقت تھی کہ اشارے سے پورے چاند کو توڑ کر دو کمانیں بنا دیا۔ اگر عیسائی کہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مردے زندہ کیے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ہمارے پیغمبر (ﷺ) نے سوکھی لکڑیوں اور کنکروں کو جان بخش کر ان سے کلمہ پڑھوا لیا۔ اگر یہودی کہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی مار کر پتھر سے پانی کے چشمے بہا دیئے تو مسلمان کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی انگلیوں سے پانی کے فوارے ابال دیئے۔ یہ بطور نمونہ چند باتیں پیش کی گئیں۔

اسلامی قانون: اسلامی قوانین ایسے ٹھوس اور مکمل اور ناقابل تبدیلی ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی۔ کفار طعنہ کیا کرتے تھے کہ ایک مرد کو چند عورتوں کی کیوں اجازت دی گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ عورتوں کی پیداوار زیادہ ہے اور مردوں کی موت بہت کہ لڑائیوں وغیرہ میں مرد ہی مارے جاتے ہیں تو اس کی حکمت سمجھے۔ اسلام نے چور کے ہاتھ کٹنے کا حکم دیا۔ دیگر مذاہب نے چور کو قید کرایا مگر بعد میں پتہ لگا کہ ہاتھ کٹنے سے ہی چوری بند ہو سکتی ہے۔ قید وغیرہ سے چوری بڑھے گی کہ چور جیل میں روٹی کھائے گا۔ اسلام نے جرمانہ لینے کی ممانعت کی۔ کفار نے اس کی اجازت دی۔ بعد میں پتہ لگا کہ جرمانے سے جرم بڑھیں گے۔ گھٹیں گے نہیں کہ مالداروں کو جرم پر دلیری ہوگی اور حکومت کو اس سے نفع' حکومت خود جرم چاہے گی تاکہ آمدنی ہو۔ اسلام نے ذبح حیوانات کی اجازت دی۔ ہندوؤں نے اس سے منع کیا مگر پتہ یہ لگا کہ اگر جانور ذبح نہ کئے جائیں تو انسانوں کی زندگی ناممکن ہو جائے کیونکہ ساری پیداوار وہ ہی کھا جائیں گے اور زمین انہی سے بھر جائے گی۔ اسلام نے جہاد کا حکم دیا۔ کفار نے اس سے منع کیا مگر پتہ لگا کہ بغیر جہاد کوئی قوم دنیا میں عزت پا سکتی ہی نہیں۔ امن وعزت وانتظام جہاد کی بدولت ہے۔ اسلام نے شراب' جوئے سود کو حرام کیا۔ بعض کفار نے ان چیزوں کی اجازت دی مگر تجربہ نے بتایا کہ یہ چیزیں جھگڑے' فساد' بدامنی کی جڑ ہیں۔ سود کی بدولت دن رات تاجروں کے دیوالے ہوتے ہیں۔ اس کی مزید تفصیل کے لئے اس تفسیر کا پہلا پارہ اور ہماری کتاب اسلامی زندگی دیکھو۔

پہلا فائدہ: قرآنی آیات درجہ وفضیلت میں یکساں نہیں۔ اگرچہ ہر آیت اللہ کا کلام ہے مگر درجہ ورتبہ مختلف جن آیات میں کفار یا ابلیس یا دوزخ کا ذکر ہے وہاں ذکر وذاکر تو اعلیٰ ہے مگر مذکورہ خبریں خبیث ہیں اور جن آیات میں حضرات انبیاء یا سید الانبیاء یا رب تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر ہے وہاں ذکر وذاکر بھی اعلیٰ اور مذکور بھی اعلیٰ لہٰذا یہ آیات پچھلی آیات سے

افضل ہیں۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اور آیۃ الکرسی دیگر سورتوں آیتوں سے افضل ہیں۔ فوائد و تاثیریں بھی بے شمار دیکھو شَهِدَ اللّٰهُ. آیت کو تمام آیات سے افضل فرمادیا گیا۔ خود کعبہ اگرچہ قبلہ ہے مگر رکن اسود و رکن یمانی وملتزم دوسرے حصہ سے افضل ہیں۔ جب کعبہ کی دیواریں قرآن کی آیتیں یکساں نہیں تو انسان کیسے یکساں ہو سکتے ہیں۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (بقرہ: ۲۵۳) **دوسرا فائدہ:** گذشتہ کتب میں جیسے حضور انور ﷺ وصحابہ کے نام واوصاف تفصیل وار مذکور تھے۔ ایسے ہی مدینہ منورہ کے علامات وفضائل مذکور تھے جیسا کہ اس آیت کے شان نزول سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** توحید الٰہی کی گواہی دینا سنت الٰہیہ بھی ہے سنت ملائکہ بھی ہے اور سنت علماء بھی۔ **چوتھا فائدہ:** بارگاہ الٰہی میں علماء دین کا بڑا درجہ ہے کہ رب نے اپنے اور فرشتوں کے ساتھ اہل علم کا بھی ذکر فرمایا اور انہیں گواہ توحید قرار دیا۔ **پانچواں فائدہ:** عالم بعض تو عدل والے ہیں بعض ظالم' عدل والے عالم بہترین بندے ہیں ظالم بدترین جیسا کہ قَآئِمًا بالقسط کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ جس علم کے ساتھ عشق ومعرفت بھی شامل وہ علم نعمت ہے جو معرفت وعشق سے خالی ہے وہ عذاب و حجاب العلم حجاب الاکبر اسی علم کو کہا گیا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ (جاثیہ: ۲۳)

اعتراضات

پہلا اعتراض: کیا اللہ مسلمانوں کا ہی ہے۔ دوسرں کا نہیں؟ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی اس آیت میں کہاں ہے کہ خدا مسلمانوں کے سوا کسی کا رب نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ رب کو صرف اسلام پیارا ہے۔ مسلمانوں کے سوا کوئی اس کا دوست نہیں۔ اور واقعی سب کو اطاعت شعار غلام ہی پیارا ہوتا ہے۔ نہ کہ نافرمان۔ **دوسرا اعتراض:** اگر خدا کو اسلام ہی پسند ہے تو کیا اسلام سے پہلے کوئی دین پسند نہ تھا۔ سب برے لوگ تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کلام اللہ نہیں (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حکم اسلام آجانے کے بعد ہے۔ یعنی اسلام کے ہوتے ہوئے کوئی دین خدا کو پیارا نہیں۔ پچھلے پیغمبروں کے دین اپنے اپنے وقت میں ہدایت تھے اب صرف اسلام ہی ہدایت ہے۔ رات میں چراغوں کی ضرورت تھی۔ سورج نکلنے پر سب گل کر دیئے گئے۔ دوسرا یہ کہ یہاں اسلام سے ہر آسمانی دین مراد ہے۔ یعنی ہمیشہ رب تعالیٰ کو اسلام ہی پسند رہا۔ پیغمبروں کے دین اپنے اپنے وقت میں اسلام ہی تھے۔ اب انہیں اسلام نہیں کہا جا سکتا۔ **تیسرا اعتراض:** اسلام میں بہت سے فرقے ہیں۔ حنفی' شافعی' مالکی وغیرہ ایسے ہی نیچری' قادیانی' اور اہل سنت وغیرہ ان میں کون پیارا ہے کون نہیں؟ **جواب:** حنفی' شافعی مختلف دین نہیں کہ عقائد سب کے ایک ہیں۔ فروعی مسائل میں اختلاف ہے یہ سب ایک اسٹیشن کے چند راستے ہیں۔ اس کے سوا جس نے اسلامی عقیدوں کا انکار کیا وہ مسلمان ہی نہیں۔ اگرچہ اپنے کو مسلمان کہتا ہو۔ نیچری' قادیانی' وغیرہ اسلام سے خارج ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ توحید کا گواہ ہے اور گواہی کسی حاکم کے سامنے دی جاتی ہے۔ بتاؤ رب کا حاکم کون ہے؟ (آریہ) **جواب:** ہم تفسیر میں بتا چکے ہیں کہ یہاں یا تو گواہی بمعنی اظہار اور خبر ہے یا شہادت سے مراد دلائل قائم کرنا ہیں۔ نیز یہ بھی غلط ہے کہ گواہی حاکم کے سامنے ہی ہو۔ یا اس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ نے علماء اور ملائکہ کو توحید کی معرفت دے کر گواہی کے قابل کر دیا۔ لہٰذا حقیقی شاہد وہی ہے (کبیر) باقی ... توفیق سے گواہ ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

یہ آیت بہت ہی پرلطف ہے۔ رب ہی مدعی وہ ہی سب کا مدعی وہ ہی دعویٰ وہ ہی شاہد وہ ہی حاکم۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

عالم اجمال میں نہ کوئی شاہد تھا نہ مشہود ماسوا اللہ کوئی موجود اس مقام پر خود ذات نے ذات پر ذات کی ذات کے سامنے گواہی دی۔ جس کے لئے فرمایا گیا۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ پھر مقام تفصیل میں جب سایہ کی طرح سب موجود ہوئے تو اصل نے ظلم کے ساتھ اپنی واحدانیت پر گواہی دی بلکہ سایہ نے اپنے سایہ والے کا پتہ دیا جس کے متعلق فرمایا گیا۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ۔ الخ خیال رہے کہ رب تعالیٰ مقسط ہے۔ یعنی عدل فرمانے والا۔ اس طرح کہ ساری کثرتیں اس واحد کا ظل ہیں۔ ان اظلال میں ہر ظل کو اس کی تعداد کے بقدر اپنا جود اپنا کمال اور اپنی تجلی سے حصہ دیا۔ جتنا جس کا ظرف (برتن) اتنی ہی رب کی عطا (ابن عربی) سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ نے ارواح کو جسم سے چار ہزار سال پہلے رزق ارواح سے چار ہزار سال پہلے پیدا کیا رب تعالیٰ کی یہ گواہی اس وقت کی ہے جب نہ زمین تھی نہ آسمان' نہ خشکی' نہ تری' پھر مخلوق نے پیدا ہو کر سیکھ کر گواہی دی۔ خیال رہے کہ مخلوق کی گواہی دو قسم کی ہے۔ اختیاری و غیر اختیاری۔ اختیاری گواہی سارے فرشتوں نے اور بعض انسانوں نے دی مگر غیر اختیاری گواہی سب نے دی۔ بت پرست و کافر کا رونگٹا بھی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے۔ کافر کا دل و زبان مشرک ہے مگر اس کی ہر حالت توحید کی گواہ۔ اعضاء بدن کی اطاعت عبادت ہے۔ اور دل کی اطاعت عجز و نیاز۔ یہ ہی اس کا اسلام ہے اور یہ ہی عنداللہ مقبول' اور ساری ظاہری عبادات کا مغز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سارا دین قلب کا غیر اللہ سے خالی ہونا اور نافرمانی کے عیب سے پاک و صاف ہونا۔ نیز وہ ہی علم نفع بخش ہے۔ جو معرفت کے ساتھ ہو۔ جس علم کے ساتھ نفسانی عیوب شامل ہوں۔ وہ وبال ہے۔ اہل کتاب کا علم اسی لئے اختلاف و فساد کا سبب بنا کہ ان کے نفس کی انانیت فنا نہ ہوئی تھی جس تختی پر اگلے نقوش باقی ہوں اور صاف نہ ہو اس پر دوسرے نقوش خرابی کا سبب ہیں۔ ایسے ہی جس دل پر حسد' بغض' عداوت کے عیوب موجود ہوں اس میں علم اور بھی خرابی کا ذریعہ ہوتا ہے علم اللہ کی نشانی ہے۔ جو اس کے بعد رب کو نہ پہچانے وہ سخت مجرم ہے۔

کلمہ توحید کی تین عبارتیں ہیں۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ۔ رب بندے کے پاس حاضر ہے مگر بندہ کبھی غائب ہوتا ہے کبھی حاضر' غیوبیت دوری کا کلمہ ہے۔ لا الہ الا ھو حضور ﷺ کا کلمہ ہے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ مگر مقام فنا میں پہنچ کر اس کلمہ کی عبارت یوں ہو جاتی ہے۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا اس وقت بندہ انا میں فنا ہو کر انا کہتا ہے وہاں زبان بندے کی ہوتی ہے کلام رب تعالیٰ کا جیسے ریڈیو کی آواز نکلتی پیٹی سے ہے مگر ہوتی ہے بولنے والے کی یہ ہی وہاں ہوتا ہے۔ شعر

چوں روا باشد انا اللہ از درخت — کے روانہ بود کہ گوید نیک بخت

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ

پس اگر حجت بازی کریں وہ تم سے تو کہہ دو کہ تابع کیا میں نے ذات اپنی کو واسطے اللہ کے اور اس نے جس نے پیروی کی میری اور

پھر اے محبوب اگر وہ تم سے حجت کریں تو فرما دو میں اپنا منہ اللہ کے حضور جھکائے ہوں اور جو میرے پیرو ہوئے اور

أُوتُوا الْكِتٰبَ وَالْأُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ

کہہ دو واسطے ان کے جو دیئے گئے کتاب اور بے پڑھوں سے کیا اسلام لائے تم پس اگر اسلام لائیں وہ پس بیشک ہدایت پا گئے

کتابیوں اور ان پڑھوں سے فرما دو کیا تم نے گردن رکھی پس اگر وہ گردن رکھیں جب تو راہ پا گئے

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

اور اگر منہ پھیریں پس اس کے سوا نہیں کہ اوپر تمہارے پہنچانا ہے اور اللہ دیکھنے والا ہے بندوں کو

اور اگر منہ پھیریں تو تم پر تو یہ ہی حکم پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھ رہا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر تھا۔ اب نبی کریم ﷺ کو وہ کلام سکھایا جا رہا ہے جو ضدیوں کے مقابل کرنا چاہیے۔ یعنی اظہار ایمان اور ضدی سے بے توجہی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں حقانیت اسلام کا دعویٰ کیا گیا۔ اور مخالفین کی وجہ مخالفت بیان فرمائی گئی۔ اب حکم دیا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ آپ اس حقانیت کا عملی ثبوت دے دیں اور بتا دیں کہ اسلام اطاعت اور فرمانبرداری سکھاتا ہے۔ جس پر ہم اور ہمارے غلام عامل ہیں۔ **تیسرا تعلق** پچھلی آیتوں میں اسلام کی حقانیت کا ذکر تھا کہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں صرف اسلام مقبول دین ہے۔ اب مسلمان ہونے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان وہ ہے جو حضور انور ﷺ کی اتباع کرے۔ اس اتباع کے بغیر دعوئی اسلام غلط ہے۔ حضور انور ﷺ اور مسلمان ہونے کا معیار و کسوٹی ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں دلائل اور گواہیوں سے مسئلہ توحید ثابت کیا گیا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ جس توحید پر سب کا اتفاق ہے۔ وہ ہی ہمارا دین ہے۔ جن چیزوں میں تم خود متفق نہیں۔ جیسے الوہیت عیسیٰ علیہ السلام اور بت پرستی وغیرہ۔ اس کا ثبوت تمہارے ذمہ ہے نہ کہ ہمارے ذمے۔ گویا شَهِدَ اللّٰهُ الخ سے توحید کا اجماعی مسئلہ ہونا ثابت کیا گیا۔ اور وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ الخ سے بتایا گیا کہ تمہارے مسائل اتفاقی نہیں۔ اختلافی ہیں۔ اب ان دو باتوں کا نتیجہ بیان ہو رہا ہے کہ ہمارا دعویٰ ثابت ہو چکا کہ تم اپنا دعویٰ ثابت کرو۔

نوٹ: تفسیر خازن نے فرمایا کہ جب یہود اور نصاریٰ نے آیت۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ (آل عمران:۱۹) سنی تو بارگاہ نبوی میں عرض کیا کہ اے محمد (ﷺ) ہمارا دین بھی اسلام ہی ہے اسی پر ہم ہیں۔ یہودیت اور نصرانیت نسب کے نام ہیں نہ کہ دین کے لہٰذا ہمارا آپس میں نسبی اختلاف ہے۔ نہ کہ دینی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

فَاِنْ حَاجُّوْكَ۔ حَاجُّوْ [illegible] مِیں محاجۃ کج بحثی کو کہتے ہیں۔ جہاں

حق و باطل کی تحقیق مقصود نہ ہو صرف اپنے مقابل کو خاموش کرنا اپنی بات اونچی کرنا مقصود ہو مناظرہ بہترین عبادت ہے اور محاجہ بدترین فساد خصوصاً حق کے مقابلہ میں۔ اس کا فاعل یا اہل کتاب ہیں یا صرف نجران کے عیسائی یا سارے کفار اور ک میں حضور ﷺ سے خطاب ہے۔ چونکہ محاجہ مناظرہ میں فسادی وہ ہوتا ہے جو باطل پر ہو حق پرست فسادی نہیں۔ اگر پولیس اور ڈاکوؤں میں مقابلہ ہو جائے تو ڈاکو فسادی ہیں نہ کہ پولیس اسلئے یہاں حَاجُّوْکَ کا فاعل اُن کفار کو قرار دیا گیا نہ کہ حضور ﷺ کو نہ مسلمانوں کو۔ اس کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی اے محبوب اگر کفار آپ ﷺ سے حقانیت اسلام میں کج بحثی کریں تو فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ اَسْلَمْتُ اسلام سے بنا بمعنی اخلاص اطاعت و فرمانبرداری' سر بسجود ہونا اپنے کو دوسرے کے سپرد کر دینا' یہاں تمام معانی بن سکتے ہیں۔ وجہ چہرے کو بھی کہتے ہیں۔ ذات کو بھی توجہ کو بھی عمل کو بھی (کبیر) یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ ذات مراد لی جائے' کہ اس میں قلب قالب سب آ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ بندے نے اپنے کو رب کے سپرد کر دیا کہ میرے خیالات ارادے' حرکات' سکنات سب رب کے زیر فرمان ہیں۔ وَمَنِ اتَّبَعَنِ کا واؤ یا تو عاطفہ ہے۔ اور یہ جملہ اَسْلَمْتُ کے فاعل پر معطوف' فاصلہ ہونے کی وجہ سے ضمیر پر اس کا عطف جائز ہوا۔ یا واؤ بمعنی مع ہے۔ اور یہ جملہ مفعول معہٗ ابو عمر اور نافع کے نزدیک اِتَّبَعَنِیْ کے ساتھ ہے۔ اور باقی قاریوں کے نزدیک اِتَّبَعَنِ حذف ی سے کلام عرب میں بہت دفعہ ی گر جاتی ہے۔ اعشیٰ کہتا ہے ؎

فَهَلْ یَمْنَعَنِی ارْتِیَادِی الْبِلَادَ وَمِنْ حَذَرِ الْمَوْتِ اَنْ یَّاْتِیَنْ

یعنی تو آپ فرما دو کہ میں نے اپنی ذات کو یا اپنے عمل کو یا اپنے چہرہ کو یا اپنی توجہ کو اللہ کے لئے خالص کر لیا۔ اس کا مطیع بنا لیا۔ اور میرے پیروکاروں نے بھی اپنی ذاتوں کو خالص کیا۔ اس عبارت سے یا ترک مناظرہ مقصود ہے۔ یا کفار کو اچھے طریقہ سے دعوت اسلام دینا۔ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ۔ یہ جملہ پچھلے جملہ شرطیہ فان حَاجُّوْکَ الخ پر معطوف ہے۔ اور اوتوا الکتاب سے سارے اہل کتاب مراد یہودی ہوں یا عیسائی' عالم ہوں یا جاہل' اور اُمِّیّٖنَ سے سارے مشرکین مراد۔ ان دو لفظوں میں سارے غیر مسلم فرقے آ گئے۔ اگرچہ یہاں وَقُلْ لَّهُمْ بھی کافی ہو جاتا مگر عموم کے لئے صراحتاً ان سب کا ذکر کیا گیا۔ خیال رہے کہ امیین امی کی جمع ہے۔ اور امی اُم سے بنا ای نسبتی ہے۔ یعنی حال والا' بے پڑھے کو اس لئے امی کہتے ہیں کہ جیسے وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ ویسا ہی رہا۔ چونکہ عرب کے عام اہل کتاب پڑھے لکھے تھے اور مشرکین بے علم۔ اس لئے انہیں تو اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہا گیا۔ اور انہیں امی۔ ہم امی کی نہایت نفیس تحقیق پہلے کر چکے ہیں۔ حضور ﷺ کے امی ہونے کے معنی ہیں۔ پیدائشی عالم۔ ءَ اَسْلَمْتُمْ۔ یہاں بھی اسلام بمعنی اطاعت ہے اور پہلا ہمزہ استفہامیہ اور اس کا معطوف پوشیدہ۔ اصل عبارت یوں ہے۔ ءَ اَسْلَمْتُمْ اَوْ دُمْتُمْ عَلٰی كُفْرِكُمْ۔ یعنی اے نبی ﷺ آپ ہر خاص و عام پڑھے بے پڑھے چھوٹے بڑے سے فرما دو کہ تم بھی میری اتباع میں اسلام قبول کرتے ہو یا نہیں۔ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ یہ رب کا فرمان ہے' خیال رہے کہ اسلام عین ہدایت ہے۔ لہٰذا یا تو اِهْتَدَوْا سے مراد گمراہی سے نکلنا ہے یا اپنے کو نفع پہنچانا۔ (روح المعانی) اور ہو سکتا ہے کہ اِهْتَدَوْا سے مراد جنت کا راستہ پا لینا ہو۔ یعنی اگر کفار آپ ﷺ کا یہ فرمان سن کر ایمان لے آئیں تو وہ گمراہی سے نکل گئے۔ یا انہوں نے اپنی جانوں کو نفع پہنچا لیا۔ انہوں نے جنت کا راستہ پا لیا۔ تفسیر خازن میں ہے کہ جب

اہل کتاب نے یہ آیت سنی تو بولے ہم اسلام لے آئے' تو حضور علیہ السلام نے یہود سے پوچھا کیا تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے ہو۔ وہ بولے معاذ اللہ عیسیٰ بھی رسول ہو سکتے ہیں اور عیسائیوں سے پوچھا کہ کیا تم عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول مانتے ہو۔ وہ بولے معاذ اللہ بھلا عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے ہو سکتے ہیں۔ تب یہ آیت آئی۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ۔ تَوَلَّوْا کا مادہ ولی بمعنی پیٹھ پھیرنا ہے۔ اس کا فاعل اہل کتاب ہیں یا سارے کفار۔ ف جزائیہ ہے اور اس کا مابعد جزا نہیں بلکہ دلیل جزا ہے اور اس کا قائم مقام انما حصر کے لئے ہے۔ اور اس سے حصر اضافی مراد ہے۔ اور حصر ہدایۃ کے مقابل ہے۔ یعنی آپ ﷺ تبلیغ کے ذمہ دار ہیں نہ کہ ہدایۃ دینے کے اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ﷺ صرف تبلیغ کرنے والے ہیں نہ شفیع المذنبین نہ رحمۃ اللعالمین جیسے قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف:۱۱۰) میں بشریت میں حصر الوہیت کے لحاظ سے ہے نہ کہ دوسرے صفات کے لحاظ سے ورنہ حضور ﷺ نبی' رسول' مصطفیٰ' نور' شفیع' ہادی وغیرہ سب کچھ ہیں۔ بلاغ کے معنی ہیں انتہا کو پہنچا دینا۔ یہاں تبلیغ احکام مراد ہے۔ یعنی اے نبی ﷺ اگر یہ اسلام سے منہ پھیریں اور آپ (ﷺ) کی بات نہ مانیں تو آپ ﷺ کو کوئی نقصان نہیں کیونکہ آپ کے ذمے صرف تبلیغ ہے نہ کہ ہدایت' ہدایت ہمارا کام ہے۔ اس توجیہ پر یہ آیت محکم ہے' منسوخ نہیں۔ اور اگر اس کا مطلب یہ ہو کہ آپ کے ذمہ صرف زبانی تبلیغ ہے نہ کہ جہاد اور قتال تو یہ آیت آیت جہاد سے منسوخ ہے۔ (خازن و روح المعانی) وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ۔ یہ پچھلے کلام کا خاتمہ ہے۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ اور عباد سے سارے مومن و کافر بندے مراد ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ سب کو دیکھنے والا ہے۔ مومنوں کو ثواب اور کافروں کو عذاب دے گا۔

خلاصہ تفسیر

جب دلائل سے ثابت کر دیا کہ سچا دین اسلام ہی ہے۔ رب تعالیٰ کی توحید اور اسلام کی حقانیت پر سب کا اتفاق بھی ہے اور جو اختلاف لوگوں نے پیدا کئے وہ محض ضد اور تعصب سے ہیں اگر اس پر بھی ناانصاف لوگ حجت بازی اور کج بحثی کئے جائیں تو آپ ان کی ساری بیہودہ گفتگو اور کل شبہات کے جواب اس عمدہ طریقہ سے دے دو کہ منصف مزاج کو سوا ماننے کے کچھ بن نہ پڑے کہ فرما دو اے کتابیو اور غیر کتابیو میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اپنی ذات اپنے اعمال' اپنی ہر چیز کو خالص اللہ کے لئے کر دیا۔ بولو تم بھی ہمارے ساتھ اس فرمانبرداری میں شریک ہوتے ہو یا نہیں۔ اور اپنے کو خدا کے لئے سمجھتے ہو یا نہیں۔ اگر وہ یہ سن کر اسلام لے آئیں اور آپ ﷺ کی پیروی کرنے لگیں تو وہ بھی گمراہی سے نکل کر راہ جنت پا گئے اور اگر اس فیصلہ کن کلام سے بھی منہ موڑیں اور کج بحثی کریں تو اے محبوب ﷺ آپ کا کوئی نقصان نہیں۔ آپ کیوں غم کرتے ہیں۔ آپ پر صرف تبلیغ واجب ہے نہ کہ کسی کو ہدایت دینا۔ اللہ تعالیٰ سب بندوں کو دیکھتا ہے۔ مومن کو ثواب اور کافر کو عذاب خود دے گا۔ خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بھی کفار کے مقابل یہ ہی فرمایا تھا۔ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ۔ الخ (انعام:۷۹) حضور علیہ السلام کو بھی حکم ہو رہا ہے کہ آپ یہ فرما دو۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل [illegible] فائدہ [illegible] لوگ جن کو وعظ و نصیحت نفع نہ دے ان سے

مناظرہ نہ کرنا اور علیحدہ ہو جانا بہتر ہے۔ جیسا کہ اسلمت وَجْهِيَ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** دین کی تبلیغ عمدہ طریقہ اور خوش خلقی سے چاہیے نہ کہ تندخوئی اور کج خلقی سے جیسا کہ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل:۱۲۵) (روح المعانی) **تیسرا فائدہ:** تبلیغ قولی کے ساتھ فعلی بھی ضروری ہے۔ یعنی کفار کے سامنے مسلمان ایسے عمدہ عمل پیش کریں جس سے وہ اسلام کے گرویدہ ہو جائیں۔ گویا ہماری صداقت دیانت داری خوش خلقی دین اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ ہو۔ جیسا کہ اَسْلَمْتُ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** اپنا عقیدہ اور ایمان سب پر ظاہر کرنا چاہیے۔ یہ چھپانے کی چیز نہیں۔ دیکھو رب نے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا کہ اپنے اور اپنے غلاموں کے اسلام و اطاعتِ خداوندی کا اعلان فرما دو۔ مستحب نیکیاں چھپانا بہتر ہے مگر فرائض وعقائد ظاہر کرنا افضل۔ تاکہ لوگ اس کی پیروی کریں۔ اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جن کے نزدیک تقیہ اصل دین ہے اور اپنے مذہب و ملت کو چھپانا اصول ایمان اگر تقیہ بہترین عبادت ہوتا تو حضور انور ﷺ۔ صحابہ کرام کفار کے ہاتھ کیوں ایذا پاتے' اپنے کو چھپا لیتے' آرام کرتے۔ نیز حضرت حسین یزید کے ہاتھوں کیوں اتنی مصیبت جھیلتے تقیہ کر کے یزید کی بیعت کر لیتے بجائے مصیبت کے انعام واکرام حاصل کرتے۔ **پانچواں فائدہ:** صحابہ کرام اور اہل بیت کا ایمان یقینی ہے کہ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ سے ان کے ایمان واخلاص اطاعت کا اعلان کرایا۔ گویا حضور ﷺ کو ان کے ایمان پر اعتماد تھا کہ اپنے ساتھ ان کا بھی ذکر کیا اور ایک ہی اَسْلَمْتُ کا فاعل ان کو بھی قرار دیا گیا۔ یہاں تو بتایا گیا کہ صحابہ کرام حضور انور ﷺ کے سچے تبع ہیں کہ ارشاد ہوا وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ (بقرہ: ۱۳۷) جو بھی تمہارا ایمان لائے گا' ہدایت پائے گا۔ اس آیت میں حضرات صحابہ کو ایمان وہدایت کا معیار قرار دیا گیا کہ مومن وہ جس کا ایمان صحابہ کرام کا سا ہو۔ نیز اِتَّبَعَنِیْ میں اشارۃً فرمایا گیا کہ اسلام وایمان حضور ﷺ کی اتباع میں منحصر ہے کہ آپ کی اتباع کے بغیر نہ اسلام ہے نہ ایمان۔ **چھٹا فائدہ:** حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ساری مخلوق کے نبی ہیں اور سب پر آپ ﷺ کی اطاعت واجب دیکھو ارشاد ہوا۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ۔ جس میں دنیا بھر کے سارے کفار سے خطاب ہے۔ خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا دوسرے اور خطاب کا عموم تب ہی درست ہے جب کہ حضور علیہ السلام سب کے پیغمبر ہوں۔ حدیث شریف میں ہے۔ بُعِثْتُ اِلَى الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ میں ہر سیاہ وسرخ کی طرف بھیجا گیا۔ جیسے چراغ' لالٹین' بجلی وغیرہ کی روشنیاں زمان ومکان سے محدود ہیں مگر سورج کی روشنی نہ جگہ سے محدود ہے نہ وقت سے یوں ہی دوسرے نبیوں کا نور ہدایت وقت جگہ سے محدود تھا۔ حضور انور ﷺ کا نور ہدایت نہ جگہ کا پابند ہے نہ وقت کا ہمیشہ آپ کا وقت ہے' ہر جگہ آپ کی سلطنت' آپ کی نبوت اصل مقصود ہے۔ دوسرے حضور ﷺ کے طفیل' حضور کا دین دائمی جنتری ہے جو ہمیشہ کام دے۔ دوسرے دین وقت خاص کی جنتریاں تھے۔ جو بعد میں بیکار ہو گئے۔ **ساتواں فائدہ:** ہدایت حضور ﷺ کی اطاعت میں منحصر ہے۔ آپ ﷺ کی غلامی کئے بغیر کوئی رب تک پہنچ سکتا ہی نہیں۔ جیسا وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ سے معلوم ہوا۔ نیز فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ نے بھی یہ ہی بتایا کہ اگر یہ لوگ آپ کی اتباع کر کے مسلمان ہو جائیں تو ہدایت پائیں گے۔ **آٹھواں فائدہ:** تبلیغ [illegible] ضروری ہے خواہ لوگ قبول کریں یا نہ کریں۔ لوگوں کے عناد کی وجہ سے تبلیغ نہیں

چھوڑی جاسکتی۔ دیکھو ارشاد فرمایا گیا کہ اگر یہ لوگ آپ سے منہ موڑیں تب بھی آپ پر تبلیغ واجب ہے۔ آپ ملول نہ ہوں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اور امتی سب یکساں خدا کے فرمانبردار ہیں ایمان و اسلام میں کوئی فرق نہیں۔ دیکھو ایک اَسْلَمْتُ کے دو فاعل بیان ہوئے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور سارے مسلمان۔ لہٰذا رب کی بندگی میں سب یکساں ہیں۔ پھر ان کی اتنی تعظیم و توقیر کیوں کی جاتی ہے۔ (بعض بے دین) **جواب:** اس آیت سے ہی معلوم ہوا کہ پیغمبر و امتی کا ایمان یکساں نہیں۔ حضور ﷺ کے لئے ارشاد ہوا۔ اسلمت اور امت کیلئے فرمایا گیا۔ وَمَنِ اتَّبَعَنِ جس سے پتہ لگا کہ حضور ﷺ براہ راست رب کے مطیع ہیں اور امتی حضور ﷺ کی اتباع سے گویا آپ کا کلمہ نماز و روزہ وغیرہ تمام عبادات تعلیم کے لئے ہیں بظاہر کام یکساں ہیں مگر مقصد میں بڑا فرق۔ شاگرد کے سامنے خود استاد پڑھتا ہے ساتھ ہی بچہ بھی مگر استاد کا پڑھنا درحقیقت پڑھانا ہے۔ اور بچہ کا پڑھنا سیکھنا۔ حضور انور ﷺ کے ایمان و اسلام اور ہمارے ایمان و اسلام میں چند طرح فرق ہے۔ حضور انور ﷺ کا ایمان و اسلام آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے کا ہمارا یہ ایمان دنیا میں آنے کے بعد۔ حضور انور ﷺ نے یہاں آ کر ہم سب کو ایمان و اسلام دیا۔ سب نے حضور ﷺ سے ایمان لیا۔ دیکھو ہمارے بچے اپنے ماحول کے تابع ہوتے ہیں اگر اچھے ماحول میں ان کی پرورش ہو تو اچھے ہو جاتے ہیں۔ اگر برے ماحول میں پرورش ہو تو برے بن جاتے ہیں مگر ماحول حضور ﷺ کے تابع رہا کہ حضور انور ﷺ کا ماحول خراب بلکہ بہت خراب تھا مگر حضور انور ﷺ اچھے ہوئے بلکہ ماحول کو اچھا کر لیا۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ تو دینے آئے ہیں لینے نہ آئے۔ لہٰذا حضور ﷺ کا اسلمت فرمانا ہماری تعلیم کے لئے ہے کہ ہم حضور سے سن کر اسلمت کو کہا کریں۔ اس طرح حضور انور ﷺ نے جو دعائیں مانگیں؛ جن میں گناہوں کی معافی مانگی ہے یا گناہوں کا اقرار کیا ہے وہ سب کچھ ہم کو سکھانے کے لئے ہے تاکہ حضور ﷺ سے سیکھ کر ہم وہ دعائیں مانگا کریں۔ ورنہ حضور انور ﷺ کو گناہوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ حضور انور ﷺ تو ایسے معصوم ہیں کہ جس پر نگاہ کرم فرمادیں وہ گناہوں سے محفوظ ہو جائے فرماتے ہیں کہ جس راستہ سے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گذرتے ہیں۔ وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** فَاِنْ تَوَلَّوْا سے معلوم ہوا کہ تبلیغ انکار پر موقوف ہے۔ اگر لوگ ہدایت قبول نہ کریں تب تو تبلیغ کی جائے ورنہ نہیں کیونکہ جزا شرط پر موقوف ہوتی ہے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ **فانما علیک البلاغ** اس شرط کی جزا نہیں بلکہ دلیل جزا ہے یعنی اگر یہ ہدایت سے منہ پھیریں تو آپ غمگین نہ ہوں کیونکہ آپ (ﷺ) پر صرف تبلیغ ہے نہ کہ ہدایت دوسرا یہ کہ بلاغ سے مراد تبلیغ اسلام ہے۔ اور واقعی تبلیغ اسلام یا تو بے خبر لوگوں کو ہوتی ہے یا منکروں کو مطیعوں کو تبلیغ احکام ہوگی نہ کہ تبلیغ اسلام کہ اسلام تو وہ قبول کر چکے۔ تیسرا یہ کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ منہ موڑیں جب بھی آپ تبلیغ کئے جائیں۔ ان کی سرکشی سے آپ تبلیغ بند نہ کریں۔ **تیسرا اعتراض:** کفار کا کفر تو بالکل ظاہر تھا پھر ان سے ءَاَسْلَمْتُمْ کہنے کے کیا معنی۔ وہ بات پوچھی جاتی ہے جو ظاہر نہ ہو؟ **جواب:** یہاں سوال مقصود نہیں بلکہ یہ دعوت اسلام کا ایک عمدہ طریقہ ہے جب کسی سے کچھ منوانا ہو تو پوچھتے ہیں۔ کہ بولو کیا مان لو گے۔ یعنی مان جاؤ یہی یہاں ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اطاعت وعبادت کی اصل عشق ہے۔ عشق سے ہر مشکل حل ہوتی ہے اور عشق رہبر کامل ہے۔ عاشق طریقہ نیاز مندی خود بخود سیکھ جاتا ہے۔ جب دل میں عشق ہوگا تو ہر ظاہری عضو سے محبوب کی اطاعت صادر ہوگی۔ یہ ہی اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِیَ کے معنی ہیں۔ نیز روح کا مقام قلب اور نفس کا مقام پیشانی ہے۔ نفس امارہ سرکش ہے جس نے پیشانی جھکا دی۔ اس نے اپنے کو دوسرے کے سپرد کر دیا۔ اسی لئے جانور پیشانی جھکا کر اظہار اطاعت کرتے ہیں اور مقابلہ کے وقت سر اونچا رکھتے ہیں۔ لہٰذا سر خم کرنا، پیشانی زمین پر رکھ دینا، کسی کے سامنے منہ جھکانا یہ اصل اطاعت ہے۔ اسلمت وجہی کے یہ ہی معنی ہیں۔ نیز عام انسان میں بہیمیت غالب ہے اور انبیائے کرام میں ملکی طاقت زیادہ انسان کی بہیمیت نبی کی ملکیت سے ہی دبتی ہے۔ بہیمیت میں سرکشی ہے۔ ملکیت میں اطاعت۔ لہٰذا ہر شخص کو نبی کی اطاعت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی بہیمیت اسے تباہ کر دے گی۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ اور اسی لئے کفار سے فرمایا گیا کہ بولو کیا تم بھی میرے پیروکاروں کی طرح میری اتباع کر کے ایمان لاتے ہو اگر میری اطاعت سے منہ موڑو گے تو تمہارا نفس تمہیں ہلاک کر دے گا۔ نفس بکری ہے۔ شیطان گویا خونخوار درندہ۔ شریعت رسی ہے، طریقت گویا میخ اور پیغمبر علیہ السلام گویا رکھوالے اور اسلام حفاظتی حصار کی مضبوط دیوار جس سے درندہ گلے میں نہ آسکے گا۔ علماء وصوفیاء گویا مالک گلہ کے نوکر چاکر جو گلہ کی حفاظت پر مامور ہیں۔ اگر نفس کے گلے میں شریعت کی رسی ہو اور وہ طریقت پر قائم رہے، اسلام کے حصار میں رہے، علماء صوفیاء کی حفاظت میں رہے، ان کی شاگردی و بیعت کرے تو ایمان درندہ نفس امارہ۔ شیطان کے برے ساتھیوں سے محفوظ رہے گا۔ جانور کی حفاظت کے لئے یہ چار چیزیں ضروری ہیں۔ حصار، رسی، میخ، مالک کی نگرانی اور رکھوالے کو اس کی غذا و حفاظت کی فکر رہے گی اگر سرکشی کرے گا تو رکھوالے کو اس کی فکر بھی نہ ہوگی۔ جس سے وہ یقیناً ہلاک ہو جائے گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌ بِالۡعِبَادِ۔ اللہ تعالیٰ پابند شریعت اور بے قید بندوں کو دیکھتا ہے، بے قیدوں کو سزا اور پابندوں کو نجات دے گا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقۡتُلُوۡنَ
تحقیق وہ جو انکار کرتے ہیں ساتھ نشانیوں اللہ کی اور قتل کرتے ہیں نبیوں کو بغیر حق کے اور قتل کرتے ہیں
جو اللہ کی آیتوں سے منکر ہوتے ہیں اور پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں ناحق شہید کرتے ہیں اور
الَّذِيۡنَ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ
ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں ساتھ انصاف کے لوگوں میں سے پس خوشخبری دو انہیں عذاب دردناک کی یہ لوگ
انصاف کا حکم کرنے والوں کو قتل کرتے ہیں انہیں خوشخبری دردناک عذاب کی یہ وہ
الَّذِيۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِيۡنَ ﴿۲۲﴾
وہ لوگ ہیں کہ ضبط ہوئے اعمال ان کے بیچ دنیا و آخرت کے اور نہیں ہے واسطے ان کے کوئی مددگار

لوگ ہیں جن کے اعمال اکارت گئے دنیا اور آخرت میں اور ان کا کوئی مددگار نہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں احکام الٰہی سے منہ موڑنے والے ضدی کفار کا ذکر تھا۔ اب ان کے تین عیوب مع سزا کے بیان ہو رہے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضور سید عالم ﷺ کی ایک طرح تسلی فرمائی گئی تھی کہ ان کی گمراہی کا آپ (ﷺ) پر کوئی اثر نہیں۔ آپ ﷺ پر صرف تبلیغ واجب ہے۔ اب دوسری طرح تسلی دی جا رہی ہے کہ اے نبی ﷺ یہ کفار تو ایسے ضدی ہیں کہ انہوں نے پچھلے پیغمبروں کو قتل بھی کر دیا۔ آپ (ﷺ) کی مخالفت ان سے کیا بعید ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ آپ (ﷺ) پر بہر حال تبلیغ واجب ہے۔ کفار مانیں یا نہ مانیں۔ اب تبلیغی باتیں بتائی جا رہی ہیں کہ آپ (ﷺ) ان کے کفریات اور اس کی سزائیں ان تک پہنچا دو۔ یہ قبول کریں یا نہ کریں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ کفار آپ ﷺ کی بات مانیں یا نہ مانیں آپ ﷺ پر تبلیغ لازم ہے۔ اب گذشتہ انبیاء کرام و علماء دین کے حالات سنائے جا رہے ہیں کہ وہ حضرات کفار کے ہاتھوں شہید ہو گئے مگر تبلیغ نہ چھوڑی۔ آخر دم تک تبلیغ کرتے رہے۔ آپ (ﷺ) بھی ہر حال میں تبلیغ کریں۔

تفسیر

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ. ظاہر یہ ہے کہ الذین سے عیسائی اور یہودی مراد ہیں۔ جیسا کہ اگلے مضمون سے پتہ چلتا ہے۔ يَكْفُرُوْنَ کفر سے بنا بمعنی انکار کرنا اور چھپانا۔ یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ اٰيَاتِ اللّٰهِ سے یا توریت و انجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں جو حضور علیہ السلام کی نعت میں تھیں اور ان یہود نے ان آیات کو چھپایا' ان کا انکار کیا کہ یہ آیات ہماری کتب میں ہیں ہی نہیں یا ان کی تاویلیں کیں کہ ان سے مراد یہ نہیں ہیں کوئی اور ہے یا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معجزات یا قرآنی آیات وغیرہ۔ خیال رہے کہ تمام کتب آسمانیہ میں رب تعالیٰ کو وہ آیات بہت پیاری ہیں جن میں اس کے محبوبوں کے مناقب و فضائل ہیں۔ ان آیات کا انکار سخت عذاب کا باعث ہے۔ رب تعالیٰ کو وہ زبان وہ قلم وہ کتاب پیاری ہے۔ جس میں اس کے پیارے کا پیارا ذکر ہو فرماتا ہے۔ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ. (القلم:۱) قلم سے نعت لکھنے والے قلم مراد مَا يَسْطُرُوْنَ. سے وہ ہی کتاب مراد ہے جن میں حضور ﷺ کے اوصاف و مناقب ہیں بلکہ اسے مکہ معظمہ و مدینہ پاک کی زمین پیاری کہ وہاں محبوب کے قدم پڑتے ہیں فرماتا ہے۔ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ. (التین:۳) اور فرماتا ہے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (البلد:۲) ان آیات کے انکار کی تین صورتیں ہیں۔ ان کا صراحتاً انکار۔ ان کے معانی کا انکار' ان کی غلط تاویلیں۔ یا ان کا چھپانا ان کا کبھی ذکر نہ کرنا۔ اور ممکن ہے کہ اَلَّذِيْنَ سے سارے کفار مراد ہوں۔ اور اٰيَاتِ اللّٰهِ سے ساری آیتیں مقصود۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔ یا انہیں چھپاتے ہیں۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ. یہ جملہ يَكْفُرُوْنَ پر معطوف ہے۔ اَلَّذِيْنَ کا صلہ۔ اس سے وہ اہل کتاب مراد ہیں جو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔ قتل سے مراد قتل کرنا یا ارادہ قتل ہے۔ اَلنَّبِيّٖنَ سے وہ پچھلے پیغمبر مراد ہیں جو یہود کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اگرچہ یہ فعل موجودہ اہل کتاب کے باپ دادوں کا تھا مگر چونکہ یہ اس پر راضی تھے۔ اس لئے یہ فعل ان کی طرف منسوب کیا گیا اور ممکن ہے کہ نبیین سے مراد حضور

ﷺ ہوں۔ چونکہ ایک پیغمبر کا قتل سب کا قتل ہے۔ اس لئے جمع فرمایا گیا۔ حق باطل کا مقابل ہے۔ ہر قسم کے حق کی نفی کے لئے نکرہ اشارہ ہوا یعنی کفر کے ساتھ گذشتہ پیغمبروں کو بھی ناحق قتل کرتے ہیں یعنی ان کے قتل سے راضی ہیں۔ یا حضور ﷺ کو شہید کرنا چاہتے ہیں مگر موقعہ نہیں پاتے (معانی وکبیر وغیرہ) وَ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ۔ یہ کفار کا تیسرا عیب ہے اور یقتلون پر معطوف' اس کا فاعل وہ ہی کفار ہیں اور اَلَّذِيْنَ سے مراد مومنین ہیں نہ کہ انبیاء کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا۔ يَاْمُرُوْنَ امرٌ سے بنا بمعنی حکم یا مشورہ۔ اس کا فاعل اَلَّذِيْنَ ہے۔ قسط کی لفظی تحقیق ہم پہلے کر چکے اس کے معنی ہیں انصاف۔ یہاں قتل انبیاء سے باز آنا اور ان کی اطاعت کرنا مراد ہے۔ مِنَ النَّاسِ اَلَّذِيْنَ کا بیان' یعنی یہ اہل کتاب انبیاء کرام کو شہید کرنے پر ہی باز نہ رہے بلکہ جو مسلمان انہیں اس حرکت سے روکے اور اچھی بات کا حکم دے۔ اس کو بھی قتل کر ڈالتے ہیں۔ یا یہ کہ موجودہ اہل کتاب جنگوں میں مسلمانوں کو شہید کرتے ہیں یا یہ کہو کہ یہود مدینہ صحابہ کرام کو قتل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس صورت میں قسط سے مراد ایمان اور احکام شرعیہ ہوں گے۔ یہاں تک ان کے عیوب کا ذکر تھا۔ اب جزاء کا ذکر ہے۔ فرمایا جا رہا ہے۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ یہ جملہ انّ کی خبر ہے چونکہ اَلَّذِيْنَ میں شرط کے معنی تھے۔ اس لئے یہاں ف جزائیہ لائی گئی۔ اِنَّ ف کو جب منع کرتا ہے جب جملے کے معنی بدل دے۔ چونکہ یہاں اِنَّ نے پچھلے جملے کے معنی بالکل نہ بدلے۔ لہٰذا خبر پر ف آ گئی (روح المعانی) بَشِّرْ بشارت سے بنا بمعنی خوشخبری ڈرانے کو بشارت کہنا ان کی اہانت کے لئے ہے۔ هُمْ سے مراد وہ ہی کفار ہیں۔ عذاب کے معنی بارہا بیان ہو چکے۔ اَلِيْمٍ الم سے بنا بمعنی رنج وغم۔ یہاں بمعنی مولم ہے یعنی تکلیف دہ دردناک یعنی اے نبی ﷺ آپ ایسے مجرموں کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔ اگرچہ دوزخی مسلمانوں کو بھی وہاں تکلیف تو ہو گی مگر کفار کو دوزخ میں تین تکلیفیں ہوں گی۔ جس سے مسلمان محفوظ ہوں گے۔ دوزخ میں آپس کے لعن طعن' مار پیٹ کفار میں ہوں گے۔ مومنوں میں نہ ہوں گے۔ مومن گنہگار کے عذاب کی کسی کو خبر نہ ہو گی۔ دوسرا یہ کہ مومن کو دوزخ سے نکل جانے کی امید ہو گی۔ اپیل' سفارش وغیرہ کی ہر وقت آس لگی ہو گی۔ کفار کو یہ آس نہ ہو گی۔ یاس ہو گی یہ یاس سخت تکلیف کا باعث ہو گی۔ تیسرا مومن کے دل و دماغ اعضاء باطنی اور سجدے کے ساتھ اعضاء کو آگ نہ جلائے گی۔ یہ محفوظ رہیں گے مگر کافر کے دل و دماغ کو بھی آگ جلا دے گی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ۔ (الہمزہ ۷) ان وجوہ سے ارشاد ہوا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ کافر کا عذاب عذاب بھی ہے الیم بھی۔ ایک سزا تو یہ ہوئی' دوسری سزا یہ ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (آل عمران: ۲۲) بعض کے نزدیک یہ جملہ اِنَّ کی خبر ہے اور فَبَشِّرْهُمْ الخ جملہ معترضہ تھا کیونکہ اِنَّ کے نزدیک ان کی خبر میں ف آ سکتی ہی نہیں۔ یہ ایسے ہے جیسے کوئی کہے زیدٌ فَافْهَمْ رجل عالمٌ شاعر کہتا ہے ۔

فَاعْلَمْ فَعِلْمَ الْمَرْءِ يَنْفَعُهٗ　　اِنْ سَوْفَ يَاْتِىْ كُلُّ مَا قَدَرْ

لیکن عام علماء کے نزدیک یہ نیا جملہ ہے۔ اُولٰٓئِكَ مبتدا اور اَلَّذِيْنَ خبر۔ اُولٰٓئِكَ سے وہ کفار مراد ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا۔ حَبِطَتْ' حبوط سے بنا بمعنی ضبطی یا بربادی۔ اس کی تحقیق پہلے کی جا چکی ہے۔ اعمال سے یا تو ان کی وہ نیکیاں مراد ہیں جو ارتداد سے پہلے کی تھیں ... جو ایمان پر موقوف نہ ہوں۔ جیسے صدقہ اور صلہ رحمی وغیرہ فِى الدُّنْيَا

حَبِطَتْ کے متعلق ہے۔خیال رہے دنیا سے مراد یہ زندگی ہے اور آخرت سے مراد قبر حشر دونوں۔نیکیوں کا فائدہ دنیا میں ذکر خیر‘لوگوں کی محبت دلوں میں میلان پیدا ہونا۔ایمان پر خاتمہ نصیب ہونا ہے۔آخرت میں قبر کی کامیابی‘حشر میں نجات‘پل صراط پر خیریت سے گذرنا وغیرہ ہے۔کفار اپنی نیکیوں کے ان فائدوں سے محروم ہیں۔بعض بدکار کلمہ گویوں پر بھی یہ عذاب ہے آج یزید کی کوئی نیکی بیان نہیں ہوتی۔اور دنیا میں بربادی اعمال یہ ہے کہ لوگ ان پر لعنت کریں۔برا کہیں۔مسلمان انہیں قتل اور قید کریں۔اور آخرت کی بربادی وہاں ثواب نہ ملنا ہے۔یعنی ان کفار کی نیکیاں دنیا اور آخرت میں برباد ہو چکیں۔اور تیسری سزا یہ کہ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ۔ واوٗ عاطفہ ہے اور یہ جملہ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ پر معطوف ُهُمْ کا مرجع وہ ہی مذکور کفار ہیں۔مِنْ تنکیر یہ ہے اور نَاصِرِیْنَ کا جمع لانا محض وزن کے لئے ہے کہ پہلی آیت الیم پر ختم ہوئی تھی۔یہ ناصرین پر ختم ہوئی اس سے معنی جمع مقصود نہیں کیونکہ کفار کا مددگار ایک بھی نہ ہوگا۔اور ممکن ہے کہ جمع مدد کے اقسام کے لحاظ سے ہو یعنی مددگار بہت سے قسم کے ہوتے ہیں۔جن سے مختلف امدادیں پہنچتی ہیں۔ان کے لئے کسی قسم کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔(روح المعانی وغیرہ) انسان کی تین زندگیاں ہیں۔دنیاوی‘برزخی‘اخروی کفار کے ظاہری مددگار دنیا میں تو ہیں مگر برزخ و آخرت میں کوئی مددگار نہیں کہ انہیں نہ کوئی مرتے وقت تلقین کرے نہ برزخ میں ثواب پہنچائے‘نہ دعا کرے نہ آخرت میں کوئی شفاعت کرے۔ مسلمانوں کے لئے یہ سب کچھ ہے نیز دنیا میں کفار کو دنیاوی مدد تو مل جاتی ہے مگر روحانی اخروی مدد نہیں ملتی۔انہیں ایمان عرفان تقویٰ کسی سے نہیں ملتا۔مسلمانوں کو یہ سب کچھ ملتا ہے۔ان دو وجہوں سے ارشاد ہوا کہ کفار کا مددگار کوئی نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ جن کفار میں یہ تین عیوب ہیں۔آپ (ﷺ) ان کی مخالفت سے کیوں غمگین ہوتے ہیں۔ان کی عادت مخالفت ہے جو اللہ کی آیتوں یعنی قرآن شریف یا آپ (ﷺ) کے معجزات یا توریت وانجیل کی آیات نعت کا انکار کریں یا چھپائیں اور بے قصور‘بے خطا ناحق پیغمبروں کو قتل کریں۔یا آپ (ﷺ) کو قتل کرنے کی کوشش کریں پھر جو مسلمان اس ظلم سے روکے اور انبیاء کی اطاعت کا مشورہ دے۔اسے بھی قتل کر ڈالیں۔ایسوں کو سخت دردناک عذاب کی خبر دے دو۔عذاب ان کے سامنے ہے صرف موت کی دیر ہے۔ان کی ساری نیکیاں دنیا میں بھی برباد ہو گئیں اور آخرت میں بھی ان کے کفر نے سب نیکیوں کو چھپا لیا کوئی ان لوگوں کے صدقات وخیرات کا ذکر بھی نہیں کرتا سب لعنت ہی کرتے ہیں۔اور مسلمان بھی تاک میں ہیں جب موقعہ ملے گا انہیں قتل کریں گے یا قید‘ان کی وہ نیکیاں ان کے خون کو محفوظ نہیں کر سکتیں نیز آخرت میں بھی برباد کہ یہ ثواب تو کیا پاتے‘سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے۔اور جب ان پر دنیا یا آخرت میں عذاب آئے گا تو کوئی بھی ان کی جانی‘مالی‘بدنی امداد نہ کر سکے گا یہ بالکل بے یار ومددگار رہ جائیں گے مگر یہ اندھے ہیں انہیں کچھ سوجھتا نہیں۔خیال رہے کہ گناہ مٹانے کو معافی یا مغفرت کہا جاتا ہے اور نیکیاں مٹانے کو ضبط۔ضبط یا ضلال ارشاد ہوتا ہے۔یہاں ضبط فرما کر بتایا کہ ان بد نصیبوں کے گناہ تو قائم رہیں گے مگر نیکیاں ضبط ہوں گی۔ابن جریر وابن ابی حاتم نے ابوعبیدہ ابن جراح سے روایت کی کہ میں نے پوچھا یا حبیب اللہ قیامت میں سخت تر عذاب کسے ہوگا۔فرمایا اسے جو پیغمبر کو قتل کرے اور اسے جو نصیحت کرنے والے یعنی اچھی بات بتانے والے اور برائی سے روکنے والے کو قتل کرے۔پھر یہ ہی آیت تلاوت کی۔پھر فرمایا کہ اے ابوعبیدہ بنی اسرائیل

نے ایک دن صبح کے وقت تینتالیس پیغمبروں کو قتل کیا۔ جس پر ایک سو ستر مسلمانوں نے انہیں اس سے منع کیا اور توبہ وغیرہ کا حکم دیا تو ان سب کو بھی اسی دن شام کو قتل کر دیا۔ اس آیت میں انہی کا ذکر ہے۔ (خازن ومعانی وغیرہ)

نوٹ: بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین سزائیں تین عیوب کی ہیں کفر کی سزا عذاب قتل انبیاء کی سزا ضبطی اعمال اور قتل مومنین کی سزا مددگاروں کا نہ ہونا مگر یہ صحیح نہیں حق یہ ہے کہ یہ سب سزائیں کفر کی ہیں اور یہ جرم بھی کفر ہی کے اقسام ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** انکار نبی گناہوں کی جڑ ہے۔ دیکھو اس آیت میں کفر آیات یعنی انکار نبوت کے بعد سارے گناہوں کا ذکر ہوا۔ جس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ جڑ کفر ہے اور سب جرم اس کی شاخیں۔

دوسرا فائدہ: عالم دین نائب رسول ہیں۔ ان کی توہین نبی کی توہین ہے۔ دیکھو قتلِ انبیاء کے ساتھ قتلِ علماء کا ذکر کیا گیا۔ اور دونوں پر یکساں عذاب مرتب کیا' دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے انبیاء' فرشتوں' علماء کو اپنی توحید کا گواہ قرار دیا کہ فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ۔ (آل عمران:۱۸) تیسرے مقام پر رب تعالیٰ نے حضور ﷺ کی نبوت کی دلیل یہ دی کہ اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ۔ (شعراء:۱۹۷) انہیں اسرائیل کے علما جانتے پہچانتے ہیں۔ ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا بڑا درجہ ہے۔ **تیسرا فائدہ:** خوف قتل پر بھی تبلیغ کی جائے۔ اگر مبلغ عالم قتل ہوا تو ثواب پائے گا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان علماء کی تعریف فرمائی جو ان خونخوار یہود کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ جنہوں نے ان انبیاء کو قتل کیا تھا۔ ان علماء کو ضرور اس وقت اپنی جان کا خطرہ تھا مگر اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وعظ ونصیحت سے باز نہ رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے سچی بات کہنا بڑا جہاد ہے۔ دوسری روایت ہے کہ سید الشہداء حمزہ ابن عبدالمطلب ہیں۔ اور وہ شخص جو ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہہ کر مارا جائے۔ عمرو ابن عبیدہ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑی نیکی تبلیغ پر قتل ہونا ہے۔ (احکام القرآن) شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا۔

ہر چہ میدانی از نصیحت و پند گرچہ دانی کہ نشنوند بگو

چوتھا فائدہ: مرتد کی نیکیاں باطل ہو جاتی ہیں جیسا کہ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پہلے مومن تھے پھر عداوت انبیاء سے کافر ہوئے جس سے زمانہ ایمان کی نیکیاں برباد ہو گئیں۔

مسئلہ: مرتد کی نیکیاں تو باطل ہو جاتی ہیں مگر گناہ باقی رہتے ہیں۔ اس لئے جو کوئی مرتد ہو کر مسلمان ہو تو اسے زمانہ اسلام کی نماز' روزہ قضا کرنے ہوں گے کیونکہ قضائے نماز گناہ ہے اور گناہ ارتداد سے معاف نہیں ہوتا (درمختار باب المرتد)

مسئلہ: جو کوئی حج کے بعد مرتد ہو جائے اور پھر ایمان لائے تو اسے حج دوبارہ کرنا ہو گا مگر پڑھی ہوئی نمازیں نہ لوٹائے گا (درمختار) **مسئلہ:** اس میں اختلاف ہے کہ توبہ کے بعد مرتد کی نیکیاں لوٹ آتی ہیں یا نہیں۔ حق یہ ہے کہ گذشتہ ثواب تو نہیں لوٹتا مگر اصل عمل لوٹ آتے ہیں اور آئندہ وہ ثواب کا باعث بنتے ہیں۔ جیسے جو درخت جل کر ہرا بھرا ہو تو اس کے گذشتہ پھل نہیں لوٹتے مگر چونکہ جڑ باقی تھی' لہٰذا آئندہ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ (شامی)

پانچواں فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام کی جناب میں بے ادبی کفر ہے دیکھو قتل انبیاء کو جو توہین

ہے کفر قرار دیا گیا۔ **چھٹا فائدہ:** کفر سے راضی ہونا بھی کفر ہے۔ دیکھو موجودہ اہل کتاب انبیائے کرام کے قاتل نہ تھے بلکہ ان کے باپ دادے قاتل تھے مگر چونکہ یہ اس سے راضی تھے لہٰذا انہیں بھی قاتل کہا گیا۔ ایک گناہ اپنے میں کئی شخصوں کو لپیٹ کر لیتا ہے کرنے والا کرانے والا' گناہ میں مدد دینے والا' گناہ سے راضی وخوش ہونے والا' سب ہی گنہگار ہیں۔ چوری کا مال رکھنے والا بھی جیل میں جاتا ہے ایسے ہی ایک نیکی اپنے میں کئی شخصوں کو سمیٹ لیتی ہے۔ نیکی کرنے والا' نیکی میں مدد دینے والا' اس سے راضی ہونے والا' سب ہی ثواب کے مستحق ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** گناہ میں ارادہ قتل' قتل کی طرح ہے جیسا کہ یَقۡتُلُوۡنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ موجودہ یہود نے حضور علیہ السلام کے شہید کرنے کا ارادہ کیا جس میں وہ ناکام رہے مگر انہیں قاتل قرار دیا گیا۔ **آٹھواں فائدہ:** ایک نبی کا انکار سارے پیغمبروں کا انکار ہے۔ جیسا کہ اَلنَّبِیّٖنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ اس سے مراد نبی علیہ السلام ہیں۔ **نواں فائدہ:** انشاء اللہ مسلمانوں کے لئے قبر وحشر میں مددگار ہوں گے۔ چھوٹے بچوں' اولیاء اللہ' انبیائے کرام کی مدد ضرور پہنچے گی کیونکہ مددگار نہ ہونا کفار کے لئے خاص ہے اور یہ ان کے کفر کی سزا ہے۔ جیسا کہ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ۔ سے معلوم ہوا۔ جو انبیائے کرام کی مدد کا انکار کرتا ہے وہ درپردہ اپنے کفر کا اقراری ہے۔ **دسواں فائدہ:** مسلمانوں کو خدا کے فضل سے نیکیوں کا فائدہ دنیا میں بھی پہنچتا ہے اور آخرت میں بھی کیونکہ دنیا وآخرت میں اعمال ضبط ہونا' کفار کا عذاب ہے۔ مسلمان اس سے محفوظ۔ خیال رہے کہ دنیوی ثواب بندگانِ خدا کا راضی ہونا ہے۔ **گیارھواں فائدہ:** جو عالم حضور علیہ السلام کے فضائل ومناقب کی آیات پر کبھی وعظ نہ کرے' صرف اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ (فصلت:٦) ہی لوگوں کو سنائے اور حضور علیہ السلام کی نعت والی آیتوں میں یا تاویل کرے یا ان کی اہمیت گھٹائے وہ ان ہی یہودیوں کی طرح ہے جو آیات نعت کو چھپاتے تھے۔ وہ بھی اس آیت میں داخل ہے۔ ذات وصفات ونعت ومناقب کی آیات دوسری آیات سے افضل ہیں۔ ان کی تاثیر بھی اعلیٰ پنجگانہ نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھنے والا مرتے ہی جنت نہیں جائے گا۔ سوتے وقت آیت الکرسی پڑھنے والے کا گھر بلکہ محلہ ناگہانی آفات سے محفوظ رہتا ہے۔ سورۂ تبت میں یہ تاثیریں نہیں کہ سورۂ تبت میں ابولہب کا فر کا ذکر ہے۔ آیۃ الکرسی میں رب تعالیٰ کی ذات وصفات کا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں یہ کیوں فرمایا گیا کہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں۔ قتل پیغمبر ناحق ہی ہو گا حق تو ہو سکتا ہی نہیں۔ **جواب:** اس کے چند جواب سورۂ بقرہ میں بیان ہو چکے اس جگہ صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ اس سے گناہ کی بدتری دکھانا منظور ہے۔ یعنی انہوں نے وہ جرم کیا جس کے حق ہونے کا احتمال ہی نہیں۔ نیز یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے دھوکے سے قتل نہ کیا بلکہ اپنے کو ظالم جانتے ہوئے قتل کیا۔ **دوسرا اعتراض:** یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے سارے پیغمبروں کو قتل کیا حالانکہ انہوں نے نہ کُل کو قتل کیا نہ اکثر کو نہ نصف کو بلکہ چند کو؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ النبیین میں الف لام عہدی ہے نہ کہ استغراقی۔ دوسرا یہ کہ بعض پیغمبروں کا قتل کل کے قتل کی طرح ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا۔ ان کافروں کے عمل ضبط ہو گئے۔ عمل سے گناہ مراد ہیں۔ یا نیکیاں اگر گناہ مراد ہیں' پھر تو وہ بڑے مزے میں رہے کہ سارے گناہ معاف ہوئے اور اگر نیکیاں مراد ہیں تو ان کے پاس

نیکیاں تھیں کہاں کافر کا کوئی فعل نیکی ہی نہیں پھر ضبطی کس کی ہوئی۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا کہ یا تو یہ مرتدین تھے۔ ان کے زمانہء ایمان کی نیکیاں برباد ہوئیں۔ یا نیکیوں سے وہ عمل مراد ہیں جن میں ایمان شرط نہیں۔ جیسے صلہ رحمی' سچ بولنا' عدل وانصاف وغیرہ۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ضبطی اعمال ہر کافر کے لئے نہیں بلکہ اس کے لئے ہے جو کفر کے ساتھ قتل انبیاء وعلماء بھی کرے کیونکہ یہاں تین جرموں کے بعد اس کا ذکر ہوا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ کفر کی سزا ہے اور کفر کی بہت سی نوعیتیں ہیں۔ انکار آیات کفر' قتل انبیاء کفر' قتل علما کفر' اور امر مشترک کی یہ سزا۔ دوسرا یہ کہ بیشک دنیا اور آخرت میں عمل کی بربادی انہی کے ساتھ خاص ہے۔ دوسرے کافر اپنے اعمال کا بدلہ دنیا میں کچھ نہ کچھ پا لیتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ آخرت میں اعمال کی بالکل بربادی توہین والے کافر کے لئے خاص ہے۔ ورنہ انبیاء سے محبت رکھنے والے کفار اپنی نیکیوں کا کچھ نتیجہ پالیں گے کہ ان کا عذاب ہلکا ہو جائے گا۔ جیسے ابوطالب' ابولہب' حاتم طائی وغیرہ۔ چوتھا یہ کہ اُولٰٓئِکَ سے اشارہ ہر ایک کی طرف ہے نہ کہ مجموعہ کی جانب' یعنی یہ کافر یہ قاتل انبیاء' قاتل علماء سب کے اعمال ضبط۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض انبیاء کرام یہود کے ہاتھوں شہید ہوئے مگر دوسری جگہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا۔ (مؤمن:۵۱) ہم اپنے رسولوں کی مدد کریں گے تو رب نے ان رسولوں کی مدد کیوں نہ کی جو شہید ہوئے؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں' ایک یہ کہ نصرت الٰہی کا وعدہ جہاد کے لئے ہے کہ جہاد میں کوئی نبی کسی کافر کے ہاتھ شہید نہ ہوگا اور واقعی کوئی نبی جہاد میں شہید نہ ہوا۔ دوسرا یہ کہ شہادت یا موت مدد کے خلاف نہیں۔ جس مقصد کے لئے نبی تشریف لاتے ہیں اس میں کامیابی رب تعالیٰ کی مدد سے ہوتی ہے۔ اگر نبی شہید بھی ہو جائیں مگر دین کو مکمل کر جائیں تو وہ غالب ہیں کربلا میں امام حسین رضی اللہ عنہ جیتے یزید پلید ہارا کہ اس کا مقصد جنگ حاصل نہ ہوا۔

تفسیر صوفیانہ

عدل وانصاف توحید وایمان کا سایہ ہے۔ جس کا ایمان ناقص اس سے انصاف ناممکن۔ نیز کفار یار سے پردہ میں ہیں۔ اپنے بڑوں کی پیروی اور رسم ورواج کی پابندی ان کا حجاب ہے۔ حضرات انبیاء اس حجاب کے پھاڑنے والے تھے۔ چونکہ ان کا حجاب مضبوط اور ظلمت کفر گہری تھی۔ اس لئے ان تک نورِ نبوت نہ پہنچا۔ جس سے انہوں نے انبیائے کرام وعلماء کو قتل کر دیا۔ نیز روح کا مشغلہ شوق وعشق ہے اور اس کی حرکت پستی سے بلندی کی طرف ہے۔ نفس کا مشغلہ نافرمانی اور مشغولیت دنیا ہے۔ اور اس کی حرکت پستی کی جانب انبیائے کرام روح کی امداد کرنے اور نفس کو دبانے کے لئے تشریف لائے مگر ان کفار کے نفوس ان کی روحانیت پر غالب آئے۔ جس سے انہوں نے اپنے خیر خواہوں کو قتل کیا۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ نفس امارہ گویا کافر ہے۔ اور اس کے گناہ گویا تلوار' قلب خیر خواہ واعظ ہے۔ اور روح اور فرشتہ گویا ہادی پیغمبر' نفس کافر نے روح کی مخالفت کر کے اس کو ایسا دبایا کہ اس کی حکومت جسم سے جاتی رہی۔ یہ گویا قتل پیغمبر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفس نے کبھی جو جائز کام کر لئے تھے۔ ان کا بھی فائدہ جاتا رہا اور نفس ورب کے درمیان واسطۂ روح وقلب اٹھ گیا۔ جو ذریعہ فیض تھا۔ جس سے نفس رب سے بالکل بے تعلق ہو گیا۔ خیال رہے کہ روح وقلب ظلِ الٰہی ہیں اور ظل کا انکار اصل کا انکار ہے' نیز قلب اور روح آئینہ جمال الٰہی ہیں جس کے ذریعہ وہ نورلم یزل نفس تک پہنچا ہے۔ ان شیشوں کو توڑنا اس نور سے محروم رہنا ہے۔ اور روح

قلب کے بغیر نیکیاں بھی گناہ ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اللہ تعالیٰ ان آئینوں کو زیادہ جلا بخشے (از ابن عربی) صوفیاء فرماتے ہیں کہ کافر کے لئے دنیاوی زندگی بھی عذاب الیم ہے۔ موت بھی قبر بھی آخرت بھی دنیا میں اسے قناعت نہیں ملتی۔ ہوس کی وجہ سے یہاں کی نعمتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ نیز اللہ کی نعمتیں کھاتا ہے مگر غفلت کے ساتھ لہٰذا اس کا کھانا پینا وغیرہ سب عذاب مرتے وقت وہ چھوٹنے والی دنیا کو دیکھ کر روتا پیٹتا ہے۔ مومن آنے والی نعمتوں راحتوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ کافر کی قبر دوزخ کی بھٹی مومن کی قبر جنت کی کیاری۔ آخرت میں مومن جنتی اور کافر مصیبت میں۔ ان وجوہ سے کافر کو ہر جگہ عذاب الیم ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ جیسے جسمانی غذا کا ایک تو عام نفع ہے یعنی بقاء زندگی اور ایک خصوصی فائدے دودھ کا اور فائدہ ہے دہی کا کچھ اور گندم دال کا نفع اور ہے۔ جو یا گوشت کا اثر کچھ اور ایسے ہی غذا روحانی یعنی اعمال صالحہ کا ایک تو عمومی فائدہ ہے۔ کمال ایمان اور کچھ خصوصی فائدے جیسے زکوٰۃ سے مال میں برکت نماز سے چہرے کا نور عبادت سے لوگوں کے دل میں کشش مخلوق میں عزت اعمال کی عزت مال و دولت کی عزت سے زیادہ ہے۔ کفار کے اعمال دنیا میں بربادی یہ ہے کہ انہیں اعمال کے یہ خصوصی فائدے حاصل نہیں ہوتے۔ آخرت میں بربادی یہ ہے کہ ان کفار کو اعمال کی وجہ سے رضاء الٰہی مغفرت وغیرہ نصیب نہیں ہوتی۔ محبوبوں کے گناہ بھلا دیئے جاتے ہیں۔ نیکیاں مشہور کر دی جاتی ہیں بلکہ گناہ ہو جانے پر ان کی حمایت کی جاتی ہے۔ جیسے غازیان احد کی حمایت کی گئی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ

کیا نہ دیکھا تم نے طرف ان کے جو دیئے گئے حصہ کتاب سے بلائے جاتے ہیں طرف کتاب

کیا تم نے انہیں نہ دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ ملا کتاب اللہ کی طرف بلائے جاتے ہیں

اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

اللہ کے تاکہ فیصلہ کرے وہ درمیان ان کے پھر منہ پھیرتا ہے ایک گروہ ان میں سے حالانکہ وہ اعتراض کرنے والے ہیں

کہ وہ ان کا فیصلہ کرے پھر ان میں کا ایک گروہ اس سے روگرداں ہو کر پھر جاتا ہے یہ جرأت انہیں اس لئے ہوئی

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ

یہ اس لئے ہے کہ تحقیق انہوں نے کہا کہ ہرگز نہ پہنچے گی ہمیں آگ مگر دن گنے ہوئے اور دھوکہ میں ڈال دیا

کہ وہ کہتے ہیں کہ ہرگز ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دنوں اور ان کے دین میں انہیں

فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ

ان کو بیچ دین ان کے اس نے جو وہ گھڑتے تھے پس کیا ہوگا جب جمع کریں گے ہم ان کو وقت اس دن کے کہ نہیں ہے شک بیچ

فریب دیا اس جھوٹ نے جو باندھتے تھے تو کیسی ہوگی جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اس دن کے لئے جس میں شک نہیں

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۵﴾

اس کے اور پورا دیا جائے گا ہر نفس وہ جو کمایا اس نے اور وہ نہ ظلم کئے جائیں گے

اور ہر جان کو اس کی کمائی پوری بھر دی جاوے گی اور ان پر ظلم نہ ہوگا

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے عناد کی ایک نوعیت بیان کی کہ وہ انبیائے کرام کے دشمن ہیں۔ اب دوسری طرح ان کا عناد ثابت کیا جا رہا ہے کہ وہ درحقیقت اپنی کتابوں کے بھی معتقد نہیں۔ اور نہ ان کے احکام پر سر جھکاتے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضور ﷺ کو ایک طرح تسلی دی گئی کہ ان کفار کی مخالفت پر آپ غمگین نہ ہوں۔ آپ کی تو زبانی مخالفت ہی کرتے ہیں۔ پچھلے پیغمبروں کو تو انہوں نے شہید بھی کر دیا۔ اب دوسری طرح حضور علیہ السلام کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ان کا عناد اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ یہ لوگ جن کتابوں کے معتقد بنتے ہیں۔ درحقیقت انہیں بھی نہیں مانتے۔ ہمیشہ ان کی مخالفت ہی کرتے ہیں۔ جب یہ اپنی مسلّم کتابوں کے معتقد نہیں تو اگر آپ کے معتقد نہ ہوں تو کیا تعجب ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے بدترین جرموں کا ذکر کیا گیا۔ اب اس کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم کچھ بھی کر لیں۔ ہمیں بہت معمولی عذاب ہوگا۔ اس لئے ایسے جرموں کی ہمت کرتے ہیں۔ **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیت میں یہود کے وہ تاریخی جرم مذکور تھے جو حضور انور ﷺ کے زمانہ میں دیکھے نہ گئے۔ صرف سنے گئے تھے۔ یعنی قتل انبیاء و قتل علماء وغیرہ اب ان کے موجودہ جرم کا تذکرہ ہے۔ جو اب زمانہ نبوی میں بھی دیکھا جا رہا ہے یعنی انکار توریت اور اپنے کو بہرحال جنتی ماننا خواہ کتنے ہی جرم کریں۔

شان نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ایک بار حضور سید عالم ﷺ بیت المدراس (یہود کا مدرسہ) میں تشریف لے گئے۔ اور یہود کو دعوتِ اسلام دی۔ ان میں سے نعیم ابن عمرو اور حارث ابن زید نے کہا کہ اے محمد (ﷺ) آپ کس دین پر ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ دین ابراہیمی پر۔ وہ بولے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔ آپ نے یہودیت کیوں اختیار نہ کی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا توریت لاؤ۔ ابھی ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ اس پر تیار نہ ہوئے اور منکر ہو گئے۔ تب یہ آیت کریمہ اتری۔ نیز انہی عبداللہ ابن عباس اور امام کلبی سے روایت ہے کہ خیبر کے یہود میں سے کسی مالدار یہودی نے ایک یہودن سے زنا کیا۔ توریت میں زنا کی سزا رجم تھی (پتھر مار مار کر ہلاک کر دینا) لیکن چونکہ یہ دونوں مجرم خاندانی اور مالدار تھے۔ اس لئے یہود کو ان کا سنگسار کرنا گوارا نہ ہوا۔ اس مقدمہ کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں اس لئے لائے کہ شاید آپ سنگساری کا حکم نہ دیں۔ غالباً انہوں نے قرآن شریف کی یہ آیت سن لی ہوگی کہ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (النور: ۲) زانی و زانیہ کو سو کوڑے مار دو اور انہیں یہ پتہ نہ لگا ہوگا کہ یہ حکم کنوارے زانی کا ہے۔ شادی شدہ کے لئے اسلام میں بھی رجم ہے۔ اس لئے حضور انور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا

کہ مجرم سزائے موت سے بچ جائیں مگر حضور علیہ السلام نے ان دونوں کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اس پر یہودی طیش میں آگئے اور بولے کہ زنا کی سزا یہ نہیں ہے۔ آپ (ﷺ) نے ظلم کیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اچھا اس کا فیصلہ توریت پر رکھو۔ وہ بولے ہاں یہ انصاف کی بات ہے۔ توریت منگائی گئی۔ عبداللہ ابن صوریہ فدکی جو یہود کا بڑا عالم تھا۔ وہ توریت پڑھنے لگا۔ اور رجم کی آیت پر ہاتھ رکھ لیا اور اس عبارت کو چھوڑ کر آگے پیچھے کی عبارتیں پڑھ دیں۔ حضرت عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو یہود کے بڑے عالم تھے اور اب صحابی رسول اللہ تھے۔ ان کا ہاتھ ہٹا کر وہ آیت پڑھ دی۔ جس میں سنگساری کا حکم تھا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ابن صوریہ اس آیت کو چھپا گیا۔ جس پر یہودی ذلیل ہوئے اور دونوں زانی مرد و عورت حضور علیہ السلام کے حکم سے سنگسار کر دیئے گئے۔ جس پر یہود سخت ناراض ہوئے۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ خیال رہے کہ عبداللہ ابن سلام کا پہلا نام حصین تھا۔ حضور علیہ السلام نے عبداللہ رکھا۔ یہ توریت کے بڑے عالم تھے۔ ۴۰ھ میں وفات پائی (حقانی) (خزائن العرفان و کبیر و خازن وغیرہ)

تفسیر

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ۔ یہ ہمزہ استفہامیہ ہے اور سوال تعجب کا۔ اس سے نبی ﷺ کو یا سارے مسلمانوں کو تعجب دلانا منظور ہے۔ تَرَ۔ رویۃ سے بنا رویۃ آنکھ سے دیکھنے کو بھی کہتے ہیں۔ اور دل سے دیکھنے کو بھی اس دل کی رویۃ سے رائے بنا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں کیا آپ نے دیکھا نہیں یا کیا آپ نے غور نہیں کیا یہ دیکھنا اور غور کرنا بھی عبادت ہے۔ تَرَ کا فاعل یا صرف نبی ﷺ ہیں یا ہر قرآن پڑھنے والا اور رویت سے آنکھ کا دیکھنا مراد ہے۔ اَلَّذِیْنَ سے سارے اہل کتاب مراد ہیں۔ یا ان کے علماء کہ سارے اہل کتاب کو کتاب اللہ پر ایمان ملا اور علماء اہل کتاب کو کتاب اللہ کا علم ملا۔ کسی کو کتاب کا نور ملا۔ کسی کو کتاب کے اسرار سے حصہ ملا۔ یا بعض اہل کتاب اور یہ ہی صحیح ہے کیونکہ قرآن کریم نے بعض اہل کتاب کی تعریف بھی کی ہے۔ مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ یَّتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰهِ الخ (آل عمران: ۱۱۳) نَصِیْبٌ نصبٌ سے بنا بمعنی رکھنا۔ اسی لئے گڑے ہوئے بت کو نصب کہتے ہیں۔ اصطلاح میں مقرر حصہ کو نصیب کہتے ہیں کہ وہ بھی باقی سے الگ رکھا جاتا ہے۔ مِنَ الْکِتٰبِ میں مِنَ یا تبعیضیہ ہے یا بیانیہ (معانی) کتاب سے مراد یا توریت ہے یا لوح محفوظ (معانی) چونکہ توریت لوح محفوظ کا ایک حصہ تھی۔ لہٰذا توریت کا دینا لوح محفوظ کا گویا ایک حصہ ہی دینا ہے۔ یا اہل کتاب کے پاس توریت و انجیل پوری باقی نہ رہی تھی۔ بہت ضائع ہو چکی تھی۔ جو باقی تھا وہ اصل کتاب کا ایک حصہ تھا۔ یا کلام الٰہی کی اصل حقیقت سمجھنا بہت دشوار ہے۔ عام لوگوں کی فہم ظاہری معنی تک پہنچتی ہے اور ظاہری معنی کتاب کا ایک حصہ ہیں۔ جیسے کوئی شخص سمندر کا پورا پانی وہاں کے سارے موتی وغیرہ نہیں لے سکتا۔ سورج کی پوری روشنی پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ ہر شخص بقدر برتن ہی اس سے فیض لے گا۔ یوں ہی کوئی شخص پوری کتاب اللہ نہیں معلوم کر سکتا۔ کسی کو اس کے الفاظ کسی کو معانی کسی کو احکام کسی کو اسرار ملے مگر جسے جو کچھ ملا کتاب کا حصہ ہی ملا۔ نہ کہ کل کتاب۔ کل کتاب تو حضرت جبریل کو بھی نہ دی۔ ہاں حضور انور ﷺ کو کل قرآن ملا رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ (الرحمٰن: ۱۔۲) اور فرماتا ہے۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ۔ (القیامۃ: ۱۷) ان وجوہ سے نصیبًا فرمایا گیا۔ یعنی اے نبی ﷺ کیا آپ نے ان اہل کتاب کو نہ دیکھا کہ جنہیں کتاب کا

ایک حصہ دیا گیا۔ باقی فنا ہو چکا۔ یا ان کی نظر کتاب اللہ یا توریت وانجیل کے ظاہری معنی تک ہے۔ اُوْتُوْا فرما کر یہ بتایا گیا کہ علم کتاب محض اپنی کوشش سے نہیں ملتا یہ تو عطیہ ربانی ہے جس پر وہ کرم کر دے بڑے بڑے ذہین یہاں فیل ہو جاتے ہیں اور معمولی حیثیت کے لوگ اس سمندر میں غوطے لگا کر موتی نکال لیتے ہیں۔ اکثر علماء غربا اور مساکین ہی ہوئے ہیں۔ یُدْعَوْنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰهِ۔ یا تو یہ نیا جملہ ہے جو جائے تعجب کو بیان کرتا ہے۔ اور یا اَلَّذِیْنَ کا حال۔ اس کتاب اللہ سے یا قرآن کریم مراد ہے جو کہ تبدیل تحریف سے محفوظ اور فیصلہ کن کلام ہے یا توریت شریف ہی مراد ہے۔ ان کی نافرمانی ظاہر کرنے کے لئے ضمیر نہ لائی گئی بلکہ دوبارہ ذکر کیا گیا۔ یعنی وہ اہل کتاب قرآن یا توریت کے فیصلہ کی طرف بلائے جاتے ہیں۔ بلانے والے حضور ﷺ ہیں یا ان کے نائبین علماء کرام اِنَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی دعوت پر نہ حاضر ہونا سخت جرم ہے۔ لِیَحْکُمَ بَیْنَهُمْ۔ یہ یَدْعَوْنَ کے متعلق ہے۔ یَحْکُمُ حکم سے بنا بمعنی فیصلہ۔ جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو چکا۔ خیال رہے کہ چونکہ حق سے ہٹنے والے یہود ہی تھے۔ اس لئے بَیْنَهُمْ فرمایا گیا۔ نہ کہ بینکم وَبَیْنَهُمْ۔ اور ممکن ہے کہ خود یہود میں اختلاف پڑ گیا ہو۔ اس لئے بَیْنَهُمْ فرمادیا گیا۔ یَحْکُمُ کا فاعل کتاب اللہ ہے۔ یا نبی کریم ﷺ جو کہ یدعون سے معلوم ہو چکے تھے۔ بعض قراٰتوں میں لِیَحْکُمَ بصیغہ مجہول بھی ہے۔ (کبیر) ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ۔ ثُمَّ ترتیب اور مہلت کے لئے آتا ہے۔ یہاں ترتیب درجہ کی مراد ہے نہ کہ زمانی کیونکہ وہ فوراً ہی توریت سے منہ موڑ گئے تھے۔ یَتَوَلّٰی کے معنی بارہا بیان ہو چکے کہ یہ تولیٌ سے بنا بمعنی منہ موڑنا اور پیٹھ پھیرنا۔ فَرِیْقٌ فرقۃ سے بنا بمعنی گروہ۔ اس سے مراد یا تو اہل کتاب کے روساء ہیں یا ان کے علماء چونکہ منہ موڑنے میں پیش قدمی ان کے سرداروں نے کی تھی۔ پھر ان کی دیکھا دیکھی سب نے کی اس لئے انہی کو اس فعل کا فاعل بنایا گیا۔ یعنی پھر جان بوجھ کر اہل کتاب کا ایک گروہ توریت کے حکم سے منہ پھیر جاتا ہے۔ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ واوٗ حالیہ اور یہ جملہ فریقٌ سے حال ہے یا مِنْهُمْ کی ضمیر سے هُمْ کا مرجع یا سارے اہل کتاب ہیں یا وہ ہی فریق علماء مُعْرِضُوْنَ سے ان کا دائمی منہ پھیرنا مراد ہے یا یَتَوَلّٰی سے منہ پھیرنا مراد تھا۔ اور مُعْرِضُوْنَ سے دلی ناراضگی مقصود یا تولی ایک گروہ نے کی تھی اور اعراض ان سب نے (روح المعانی) یا تولی اس خاص حکم سے تھی اور اعراض سارے احکام سے یعنی وہ اس حکم سے منہ پھیرتے ہیں۔ حالانکہ وہ دل سے بھی ناراض ہیں۔ یا اب اس حکم سے منہ موڑتے ہیں۔ حالانکہ وہ سارے احکام سے ہی پھرے ہوئے ہیں۔ یا بظاہر ان میں ایک گروہ اس حکم سے منہ موڑتا ہے مگر درپردہ وہ سب ہی پھرے ہوئے ہیں یا منہ پھیرنا ان کی عادت ہو چکی ہے مگر سب سے بہتر وہ معنی ہیں جو اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے کئے کہ تَوَلّٰی سے پھر جانا اور مُعْرِضُوْنَ۔ سے روگرداں ہونا مراد لیا۔ اس بنا پر علماء فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کی طرف پیٹھ نہ کرو کہ یہ بھی اعراض ہے۔ تلاوت قرآن کے وقت ہمہ تن گوش بن کر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ قاری سامنے ہو تو سب ادھر متوجہ ہوں تاکہ تولی و اعراض دونوں سے الگ رہے۔ اہل کتاب سے بچے۔ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا۔ یہ نیا جملہ ہے۔ ذٰلِکَ سے تولی اور اعراض کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ یہود کے مذکورہ اعمال وعقائد بہت گندے اور اسلامیت کیا انسانیت سے بھی دور تھے۔ اس لئے ذٰلِکَ بعید اشارہ ہوا۔ ذالک بعید کے اشارہ کے لئے آتا ہے۔ بعید زمانا ہو یا مکاناً یا اشارۃً چونکہ یہ بدعقیدگی یہود کے گذشتہ گناہوں کا باعث تھی۔ اس لئے ب سببیہ ارشاد ہوئی بِاَنَّهُمْ۔ بِاَنَّ حاصل کا متعلق ہے۔ اور هُمْ کا مرجع سارے اہل کتاب

ہیں۔قول سے مراد دلی اعتقاد ہے یا زبانی بات۔یعنی ان کے علماء کے غلط وعظ یا یہود کا آپس میں یہ کہنا یا مسلمانوں سے یہ کہنا یا یہ سمجھنا اور عقیدہ رکھنا۔ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ. اس جملہ کی نہایت نفیس تفسیر سورۂ بقرہ میں گذر گئی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ تَمَسَّ مَسٌّ سے بنا بمعنی چھونا اور پہنچنا اور اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ سے تھوڑی مدت مراد ہے یعنی گنتی کے دن ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارے بزرگوں نے چالیس دن بچھڑا پوجا تھا۔اتنی ہی مدت ہم جہنم میں رہیں گے۔ پھر نہیں رہ سکتے خواہ کچھ بھی کریں یعنی ان کو یہ جرات اور کتاب اللہ سے منہ موڑنے کی ہمت اس لئے ہوئی کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیں تھوڑی مدت ہی عذاب ہو سکتا ہے پھر نہیں وَغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ. یہ جملہ قَالُوْا پر معطوف ہے۔غرٌّ غرور سے بنا بمعنی دھوکہ دینا یا جھوٹی طمع هُمْ کا مرجع وہ ہی اہل کتاب ہیں۔دین سے مراد ان کا جھوٹا عقیدہ ہے۔جس کو وہ دین سمجھے بیٹھے تھے۔مَا سے ان کے گھڑے ہوئے خیالات مراد ہیں۔يَفْتَرُوْنَ فریٌ سے بنا بمعنی کاٹنا مفردات میں ہے کہ اصلاح کے لئے کاٹنے کو فریٌ کہتے ہیں۔اور فساد کے لئے کاٹنے کو افتراءٌ اور فری ف کے کسرہ سے بمعنی جھوٹ آتا ہے۔اسی سے افتراء بمعنی اخلاق ہے۔ جھوٹ گھڑنا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔خیال رہے فِىْ دِيْنِهِمْ یا تو غَرَّ کے متعلق ہے یا يَفْتَرُوْنَ کے یعنی ان کے گھڑے ہوئے عقیدوں اور جھوٹے خیالات نے انہیں دھوکے میں ڈال دیا۔جس کو وہ دین سمجھے بیٹھے ہیں کہ عیسائی کفار مسیح کے معتقد ہو بیٹھے۔اور یہودی شفاعت بزرگان کے اعتماد پر کفر کر بیٹھے (معاذ) جن عیوب کو مٹانے کے لئے حضرات انبیاء کرام تشریف لائے تھے۔وہ ہی عیوب ان کے دین بن گئے۔اور جو چیزیں اصول دین تھیں۔انہیں بھول گئے۔افسوس آج ہمارا بھی یہ ہی حال ہے۔نمازیں چھوڑ دیں' گانا بجانا دین بن گیا۔فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ. یہ نیا جملہ ہے اور كَيْفَ تَكُوْنُ یا يَصْنَعُوْنَ پوشیدہ کا حال ہے اور ممکن ہے کہ پوشیدہ مبتدا کی خبر ہو یعنی كَيْفَ حَالُهُمْ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ یہ اسی پوشیدہ فعل کا ظرف ہے۔ كَيْفَ میں اشارہ فرمایا گیا کہ جو دنیا میں مطمئن رہے۔انہیں قیامت کے دن بہت صدمہ ہوگا کہ ان کا حساب ان کی توقع کے خلاف ہوگا اور جو مومن یہاں خطرہ میں رہے قیامت میں ان کی خوشی بے حساب ہوگی کہ خطرہ ٹل گیا چھٹی مل گئی اور جمع سے مراد قیامت کے دن کا اجتماع ہے۔اس اجتماع میں جس کی نیک نامی ہوگی وہ بہت ہی سرخرو ہوگا اور بدنام بہت ہی ذلیل ہوگا۔ نیز یہ لوگ اپنے ان انبیاء کے پاس حاضر ہوں گے جن کی اولاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔اعمال سے بے نیاز ہو گئے تھے۔وہ حضرات انہیں منہ بھی نہ لگائیں گے۔نیز جنہوں نے انہیں گمراہ کیا تھا' وہ سرداران کفر بھی اس مجمع میں ہوں گے وہ لوگ ان کے کچھ کام نہ آئیں گے۔اس سے ان کی مایوسی بہت زیادہ ہوگی۔لِيَوْمٍ میں لام بمعنی فی ہے یا لام تعلیلیہ ہے۔جزا پوشیدہ اور یوم سے مراد وقت ہے۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ یہ یوم کی صفت ہے۔یعنی یہ اس وقت کیا کریں گے۔یا ان کا کیا حال ہوگا۔جب ہم ان کو جزا و سزا کے لئے اس دن جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں کیونکہ جب ہر ایک اپنے منیم سے حساب لیتا ہے تو رب تعالیٰ اپنے بندوں سے حساب کیوں نہ لے گا۔اس نے ہم کو بے شمار نعمتیں عبث نہ دیں۔وہ خود فرماتا ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (مومنون:115)۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ. واؤ عاطفہ ہے۔اور یہ جملہ جَمَعْنٰهُمْ پر معطوف۔وفیت توفیۃ سے بنا جس کا مادہ وفاءٌ ہے بمعنی پورا دینا۔کل نفس سے ہر عاقل بالغ انسان مراد ہے کیونکہ جانوروں اور نابالغ بچوں کے اعمال پر جزا و سزا نہیں۔مَا سے مراد ہر نیک و بد عمل

ہے اور اس سے پہلے جزا پوشیدہ ہے۔ یعنی جَزَا مَا کَسَبَتْ۔ کَسَبَتْ سے اختیاری اعمال مراد ہیں کیونکہ مجبوری اعمال پر سزا و جزا نہیں۔ یعنی ہر قابل عمل انسان کو اس کے اختیاری افعال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وُفِّیَتْ کا بیان یہ ہے کہ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ هُمْ کا مرجع كُلُّ نَفْسٍ ہے کیونکہ وہ معنًا جمع ہے اور ظلم سے مراد نقصان ہے۔ (معانی) یعنی ان کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ کہ نہ ان کی نیکیوں کا ثواب کم کیا جائے اور نہ گناہوں کا عذاب زیادہ بڑھایا جائے۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ آپ اہل کتاب کی مخالفت پر غمگین نہ ہوں۔ یہ تو اپنے پیغمبروں کے بھی نہ ہوئے کہ انہیں شہید کرڈالا۔ وہ تو پچھلا واقعہ تھا۔ اب ان کی موجودہ حالت یہ ہے جو آپ دیکھ ہی چکے کہ جب یہ اپنی جانی پہچانی مانی ہوئی کتاب یعنی توریت کی طرف بلائے جاتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کا فیصلہ مان لو تو اس سے منہ پھیر جاتے اور انکار کردیتے ہیں۔ جس کتاب کے ماننے کا دعویٰ ہے جب اس کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے تو اگر قرآن و صاحب قرآن جس کے وہ ماننے کے مدعی نہیں اس کی مخالفت کریں تو کیا بعید ہے۔ اس بے دینی اور بے باکی کا سبب یہ ہے کہ ان کے پیروں مرشدوں نے کچھ ڈھکوسلے ان کے دل میں بٹھا دیئے کہ یہود چونکہ نسل ابراہیمی سے ہیں اس لئے انہیں چند روز ہی عذاب ہوگا۔ جتنے دن ان کے باپ دادوں نے بچھڑا پوجا تھا پھر ان کی رہائی یقینی ہے۔ خواہ وہ دنیا میں کچھ بھی کریں۔ یا یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام عیسائیوں کے گناہوں کے عوض سولی کھا گئے۔ ان کی صلیب ان کے گناہوں کا کفارہ ہو چکی۔ اب یہ جو چاہیں کریں انہیں کوئی عذاب نہیں۔ ان ڈھکوسلوں کو انہوں نے دین سمجھا ہے اور انہیں پر یہ مغرور ہیں۔ خیال تو کرو کہ اس وقت کیسی ہوگی جب ہم ان سب کو قیامت کے دن سزا و جزا کے لئے جمع کریں گے۔ جس میں کوئی شک نہیں اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی پوری سزا و جزا دی جائے گی۔ تب ان کو اپنے خیالاتِ خام کی حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ ہم کچھ سمجھتے تھے اور ہوا کچھ اور اس دن کسی پر ظلم نہ ہوگا کہ نہ کسی کی نیکیاں ضائع جائیں اور نہ برائیاں بڑھائی جائیں۔ بعض روایات میں ہے کہ قیامت کے دن سارے کفار سے پہلے یہود کا جھنڈا بلند کیا جائے گا اور انہیں سر محشر رسوا کر کے جہنم میں بھیجا جائے گا۔ (خازن و روح) نیز عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود کا عقیدہ یہ تھا کہ جہنم کے دونوں کناروں میں چالیس سال کا فاصلہ ہے اور اخیری کنارہ پر درخت خاردار ہے جسے زقوم کہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہم زقوم کے پہنچنے تک عذاب پائیں گے۔ وہاں پہنچ کر جہنم ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا ان کے عقیدہ میں دوزخ اور وہاں کا عذاب دائمی نہیں۔ اس آیت میں اسی عقیدہ کا بیان اور اسی کی تردید ہے۔ (روح البیان)

خیال رهے کہ دوزخ کی تپش دنیا میں بھی آ رہی ہے۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ دوپہری کی گرمی دوزخ کی بھڑک سے ہے۔ لہٰذا ظہر ٹھنڈی کر کے پڑھو مگر یہ گرمی رحمت ہے جس میں دنیا کا نظام قائم ہے۔ آخرت میں دوزخ کے عذاب کی چار نوعیتیں ہوں گی۔ قبر کافر میں دوزخ کا اثر گرمی بدبو وغیرہ آئے گی۔ بعینہ آگ نہ آئے گی۔ بعد حشر بعض دوزخ سے دور رہیں گے۔ صرف ایک چنگاری ان کے تلوے میں ہوگی۔ جس سے دماغ کھولتا ہوگا۔ بعض آگ میں داخل ہوں گے۔ بعض کے اندر آگ داخل ہوگی۔ پہلا عذاب سب سے ہلکا ہے۔ اس کو مس نار کہا جاتا ہے۔ آخری عذاب بہت سخت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ۔ (الہمزۃ: ۷) یہود کہتے تھے کہ ہمیں ہلکا عذاب یعنی مس نار بھی نہ ہوگا مگر صرف چند روز پھر یہ مس نار

بھی نہ رہے گا۔ عیسائی ان سے بھی آگے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم کچھ بھی کریں ہم کو ایک منٹ کے لئے بھی عذاب نہ ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سولی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو چکی۔ جب ان کی بے خوفی کا یہ حال ہے تو اب وہ گناہوں سے کیوں بچیں۔ نیک اعمال کیوں کریں۔ دینی نظام تو خوف وامید سے قائم ہے۔ جب خوف ہی ختم ہو گیا تو دین سے انہیں کیا تعلق ہے؟

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** دین کو اپنی رائے کے مطابق کرنے کی کوشش طریقہ یہود ہے کہ وہ توریت کے سخت احکام سے پھر جاتے تھے۔ اس سے وہ مسلمان عبرت پکڑیں جو خواہش کے مطابق فتویٰ چاہتے ہیں اور ان علماء کے دشمن ہو جاتے ہیں جو ان کی رائے کے خلاف حق مسائل بیان کریں۔ اسلام کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اپنے کو اسلام کے سانچے میں ڈھالو۔ اب تو مسلمان اسلام میں اپنی رائے کے مطابق کتر چھانٹ کر رہے ہیں۔ اسلامی پردہ' سود' پوتے کی میراث وغیرہ سب کو رائے کے مطابق بنانا چاہتے ہیں۔ یہ وہ ہی یہودیانہ حرکت ہے۔ بیمار حکیم کے تابع' بیٹا باپ کے تابع' رعایا بادشاہ کے تابع ہے تو چاہیے کہ مسلمان جناب مصطفیٰ ﷺ کے تابع ہوں۔ **دوسرا فائدہ:** مومن کی عبادت برباد نہ ہوگی اور نہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے' جیسا کہ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** رحمت رب پر امید ایمان کا رکن ہے اور اس سے امن کفر اہل کتاب کو امن نے گناہوں پر دلیر کر دیا۔ **چوتھا فائدہ:** شریعت کے فیصلہ پر راضی ہونا علامت ایمان ہے اور اس سے ناراضی کفر اور طریقہ یہود جیسا کہ ثُمَّ يَتَوَلّٰى الخ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہود کو حضور علیہ السلام کی نبوت کا یقین تھا۔ اسی لئے وہ بعض دفعہ اپنے دینی معاملہ میں حضور سے فیصلہ چاہتے تھے۔ اگرچہ عناداً مخالفت بھی کرتے تھے۔ **چھٹا فائدہ:** عالم کا گناہ جاہل کے گناہ سے سخت تر ہے جیسا کہ اُوْتُوْا نَصِيْبًا کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** علم دین اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ یہ بھی اُوْتُوْا نَصِيْبًا سے ہی معلوم ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (بقرہ: ۲۶۹) **آٹھواں فائدہ:** علم بے عمل بیکار ہے۔ بلکہ مضر ہے۔ **نواں فائدہ:** شکر بقدر نعمت چاہیے۔ عالم کو چاہیے کہ شکر زیادہ کرے۔ **دسواں فائدہ:** نیکی کا ثواب بخش دینے سے خود عامل کا ثواب کم نہیں ہو جاتا' اسے پورا بلکہ زیادہ ملتا ہے۔ جیسا کہ وفیت سے معلوم ہوا۔ علم' چراغ کی روشنی' سمندر کا پانی اور اعمال کا ثواب خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ ثواب بخشنے والے کو اس کا اجر پورا پورا ملے گا۔ نیک عمل کا بھی اور ثواب بخشنے کا بھی۔ **گیارھواں فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ زبان عبرانی اور توریت شریف کو جانتے تھے۔ ورنہ آپ علماء یہود سے توریت سے فیصلہ کرنے کو نہ فرماتے ایسی جرأت سے وہ ہی کلام کر سکتا ہے۔ جسے کتاب پر پورا عبور ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اس وقت توریت کا ترجمہ عربی میں نہیں ہوا تھا۔ عبرانی ہی میں تھی۔ معلوم ہوا کہ سارے علوم حاصل کر کے دنیا میں تشریف لائے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اسلام میں رجم کے لئے شرط یہ ہے کہ زانی وزانیہ محصن ہوں۔ یعنی مومن اور شادی شدہ۔ یہود کافر ہیں انہیں حضور انور ﷺ نے رجم کیوں [illegible] **جواب:** ان کا رجم حکم اسلامی

سے نہ تھا‘ نہ ان پر اسلامی احکام جاری ہیں۔ چنانچہ حضور انور ﷺ نے کبھی مشرکین عرب کو زنا کی وجہ سے رجم نہ کیا بلکہ خود ان کی کتاب کا حکم ان پر جاری فرمایا۔ وہ بھی اس لئے کہ انہوں نے حضور انور ﷺ کو اپنا حکم و حاکم مان لیا تھا۔ اب بھی اسلامی حاکم کفار پر ان کے مذہبی احکام ان پر جاری فرماوے گا۔ اگر ان کا مقدمہ اس کے پاس آئے۔ چنانچہ کفار کے میراث کے احکام ان کے مذہب کے مطابق ان پر جاری ہوں گے نہ کہ اسلام کے مطابق۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبیوں کی شفاعت اور باپ دادوں کی بزرگی پر ناز کرنا طریقہ یہود ہے کہ وہ اس شفاعت پر بھروسہ کئے ہوئے تھے۔ وہ مسلمان جو شفاعت انبیاء کے معتقد ہیں طریقہ یہود پر ہیں (بعض دیوبندی) **جواب:** شفاعت انبیاء پر ناز کرنا تقاضائے ایمان ہے۔ ہاں شفاعت پر اعتماد کر کے گناہوں پر دلیر ہو جانا اور ایمان کی پرواہ نہ کرنا طریقہ یہود ہے۔ اسی کا یہاں ذکر ہے۔ ہم شفاعت کی مکمل بحث پہلے سیپارے اور آیت الکرسی کی تفسیر میں کر چکے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جہنم سے گنہگار کبھی نہ نکلیں گے اور جہنم سے رہائی کا اعتقاد عقیدہ یہود ہے۔ (معتزلہ) **جواب:** گنہگار مومن جہنم سے ضرور رہائی پائے گا۔ اس پر آیات اور احادیث گواہ ہیں۔ کفار کے لئے رہائی ماننا اور محض نسب پر اعتماد کرنا طریقہ یہود ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ چونکہ ہم ابراہیمی ہیں لہٰذا خواہ انبیاء کو قتل کریں یا کتاب اللہ کا انکار‘ دین بدلیں‘ کتابوں میں تحریف کریں‘ کچھ کریں۔ جہنم ہمارے لئے دائمی نہیں۔ الحمد للہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں۔ کافر کے لئے نسب کوئی چیز نہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ معافی اور بخشش کوئی چیز نہیں۔ کیونکہ فرمایا گیا۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ۔ اس آیت سے آریہ دھرم کی تائید ہوتی ہے۔ پھر مسلمانوں نے بخشش کا عقیدہ کہاں سے نکالا۔ اگر گناہ معاف ہوئے تو پورا بدلا نہ ملا۔ اور آیت فرما رہی ہے پورا بدلہ ملے گا۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ آیت نفی ظلم کے لئے ہے۔ اسی لئے اخیر میں فرمایا گیا۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ ہوگا کہ اس کی نیکی کم کر دی جائے۔ یا گناہ بڑھا دیئے جائیں۔ گناہ کی معافی اور نیکیاں بڑھانا اس کے خلاف نہیں۔ اگر بادشاہ ملازموں کو تنخواہ سے زیادہ عطا فرمادے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ میں کسی کا حق نہیں مارتا۔ پورا دیتا ہوں۔ یہ اردو کا بھی محاورہ ہے۔ جو دوست وعدہ سے زیادہ کام کرنے اسے وفادار بھی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہاں تین لفظ قابل غور ہیں۔ وُفِّيَتْ اور كُلُّ نَفْسٍ اور مَا كَسَبَتْ۔ ظاہر ہے کہ كُلُّ نَفْسٍ سے بچے‘ دیوانے‘ مجبور لوگ علیحدہ ہیں۔ ایسے ہی مَا كَسَبَتْ سے غیر اختیاری کام اور بچوں و دیوانوں کے کام خارج۔ ایسے ہی وُفِّيَتْ سے بخشش علیحدہ۔ تیسرا یہ کہ یہ آیت عقیدہ یہود کی تردید میں ہے۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہمیں کفر کے باوجود پوری سزا نہ ملے گی اور بلا نیکی کئے ثواب مل جائے گا۔ ان کی تردید میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ بغیر کئے ثواب کیسا اور کفر کا بدلہ کیوں نہ دیا جائے ضرور دیا جائے گا لہٰذا یہ وُفِّيَتْ نقصان کے مقابلہ میں ہے کہ کافروں کی سزا میں کمی نہ کی جائے گی۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نفس کو اپنے ہی اعمال کا بدلہ ملے گا پھر ثواب بخشنے کے کیا معنی؟ (آریہ) **جواب:** اس کا مکمل جواب لَهَا مَا كَسَبَتْ کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا۔ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کسی کی نیکی ضائع نہ ہوگی۔ پوری ملے گی۔ دوسرے کو نیکی کے ثواب کا یہاں انکار نہیں۔ **چھٹا اعتراض** جَمَعْنٰهُمْ [illegible] قیامت جمع ہونے کا وقت ہے یعنی ظرف

(بعض بے دین) **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ یہاں جزایا حساب پوشیدہ ہے۔یعنی قیامت کی سزا و جزا کے لئے جمع کئے جائیں گے۔اگر کوئی کہے جَمَعُوْا الْيَوْمَ الْخَمِيْسَ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جمعرات کے کام کے لئے جمع کئے گئے۔

تفسیر صوفیانہ

عقل مند وہ ہے جو اللہ سے امید نہ توڑے اگر چہ اس کے گناہ سمندر کے جھاگ برابر ہوں۔ممکن ہے کہ اس کی کوئی نیکی رب نے قبول کر لی ہو۔حدیث شریف میں ہے کہ بعض بڑے گنہگار محض اس بنا پر بخش دیئے جائیں گے کہ وہ رحمت الٰہی کے امیدوار تھے۔نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ صدق دل سے کلمہ پڑھنے والے کو انشاء اللہ موت وقبر کی وحشت اور قیامت کی گھبراہٹ نہ ہوگی۔وہ قبروں سے خاک جھاڑتے یوں کہتے اٹھیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحُزْنَ۔(روح البیان) نیز علامت ایمان یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی نیک کار ہو مگر رب سے بے خوف نہ رہے۔نہ معلوم کس گناہ پر اس کی پکڑ ہو جائے۔بدنصیب وہ ہے جو دنیوی اعمال پر دھوکہ کھا جائے۔کاملین نیکیوں کے باوجود خاتمہ سے ڈرتے تھے۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے منہاج العابدین میں فرمایا کہ توبہ کے تین مقدمات ہیں۔اپنے گناہ کو انتہائی برا جاننا۔رب تعالیٰ کی انتہائی سزا کو یاد کرنا اپنے کو ضعیف اور بے کس سمجھنا'اے انسان جب تجھ میں گرم دھوپ اور سپاہی کے چپت اور بچھو کے ڈنگ کی برداشت نہیں تو دوزخ کی گرمی اور فرشتوں کے ہتھوڑوں اور ان بچھوؤں کے ڈنگ کی برداشت کیسے ہوگی۔جن کے ڈنگ مثل کھجور کے ہیں۔یہود اپنے باپ دادوں کی نیکی پر پھول گئے مگر اللہ والے اپنی نیکیوں پر بھی اعتماد نہیں کرتے۔شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ؎

مرا مے بباید چو طفلاں گریست	ز شرم گناہاں ز طفلاں نہ زیست
نکو گفت لقماں کہ نازیستن	بہ از سالہا بر خطا زیستن
ہم از بامداداں در کلبہ بست	بہ از سود و سرمایہ دادن ز دست

گناہوں کی زندگی سے موت بہتر اور بدکاری کے ساتھ جاگنے سے سونا اچھا۔جس دکان کے سودے میں نقصان وہ بند ہی بہتر ہے۔قیامت میں اعمال کی پوچھ گچھ ہے نہ کہ نسبت کی۔یہ آیت کریمہ بہت عبرت کی ہے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جیسے تمام اعضاء ظاہری کے بعض اعمال عبادت ہیں' بعض اعمال گناہ ایسے ہی دل و دماغ کے۔بعض تفکر وغور عبادات ہیں۔بعض غور و تفکر گناہ۔بعض کفر اللہ کی نعمتیں حضور انور ﷺ کی عظمتیں' اپنے گناہ' کفار کی حماقتیں سوچنا عبادات ہیں۔حضور انور ﷺ کا چہرہ مبارک ایمان کے ساتھ دیکھنا کعبہ معظمہ' قرآن کریم' ماں باپ استاد دین کو عظمت سے دیکھنا عبادت ہے۔ایسے ہی کفار کو حقارت سے دیکھنا عبادت۔دیکھو رب تعالیٰ نے یہاں فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ الخ حدیث شریف میں ہے کہ دین میں اپنے سے اونچے کو دیکھو دنیا میں اپنے سے نیچے میں غور کرو۔یہ غور بھی عبادت ہے۔بروں کے برے اعمال کو حقارت سے دیکھنا۔اچھوں کے اچھے کام عظمت سے دیکھنا ثواب ہے۔اِلَی الَّذِیْنَ سے اشارہ اسی جانب ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ
کہو کہ اللہ مالک ملک کے دیتا ہے تو ملک جس کو چاہتا ہے اور چھینتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے
یوں عرض کر اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے
مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِكَ الْخَیْرُ ط
اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بیچ ہاتھ تیرے بھلائی ہے
اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے
اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِی
تحقیق تو اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے داخل کرتا ہے تو رات کو بیچ دن کے اور داخل کرتا ہے تو دن کو بیچ
بیشک تو سب کر سکتا ہے تو دن کا حصہ رات میں ڈالے اور رات کا حصہ دن میں ڈالے
الَّیْلِ٘ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ٘
رات کے اور نکالتا ہے زندہ کو مردے سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے
اور مردے سے زندہ نکالے اور زندہ سے مردہ نکالے
وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾
اور رزق دیتا ہے تو جسے چاہے بے حساب
اور جسے چاہے بے گنتی دے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کی سرکشی اور ان کے عناد کا ذکر تھا۔ اب مسلمانوں کو خدا کی حمد و ثناء کی تعلیم دی جارہی ہے تاکہ ان کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا پتہ لگے۔ چونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ اس لئے سرکشی کے بعد اطاعت کا ذکر مناسب تھا۔ **دوسرا تعلق:** یہود کی نگاہ دنیا اور اس کے اسباب پر تھی۔ اس لئے وہ صحابہ کرام کو ان کی مفلسی کی وجہ سے نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ اور اپنی بڑائی پر نگاہ کرتے ہوئے کتاب اللہ کے احکام کی پرواہ بھی نہ کرتے تھے۔ جیسا کہ گزشتہ آیت سے معلوم ہوا۔ اس آیت میں اس کی تردید کی جا رہی ہے کہ اے محبوب ان لوگوں کو آپ ﷺ پڑھ کر سنا دو تاکہ انہیں اپنی کمزوری اور رب تعالیٰ کی قدرت کا پتہ لگے، جس سے وہ اطاعت پر راغب ہوں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ یہود جنت کو اپنی میراث اور اپنے کو نبوت کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے اسی لئے وہ کہتے تھے ہم کچھ بھی کریں ہمیں عذاب عارضی اور معمولی ہوگا۔ اس آیت میں اشارۃً ان کے اس

خیال کی نہایت نفیس تردید کی جارہی ہے کہ جیسے دنیوی سلطنت کسی قوم کی میراث نہیں۔ رب جس خاندان سے چاہے سلطنت نکال لے اور جسے چاہے بخش دے۔ دیکھو یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے سلطنت یہود کو ملی پھر ان کے بدعملوں کی وجہ سے یہود سے منتقل ہو کر قبطیوں میں پہنچ گئی حتیٰ کہ فرعون نے انہیں بہت ذلیل کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے پھر سلطنت انہی یہود کو عطا ہوئی مگر بعد میں بخت نصر وغیرہ سلاطین جو بہت ظالم و جابر تھے۔ ان پر مسلط کئے گئے' غرض سلطنت قوموں میں منتقل ہوتی رہی۔ ایسے ہی اخروی نعمت یعنی نبوت وغیرہ کسی خاندان کی ملکیت نہیں۔ رب جسے چاہے اس نعمت سے نوازے۔ چنانچہ اب تک بنی اسرائیل میں نبوت رہی۔ اب بنی اسمٰعیل میں پہنچی کہ یہ خاندان عرصہ سے نبوت سے خالی تھا۔ ہزاروں تارے تم میں کھلائے ایک سورج ان میں چمکا دیا نیز جیسے دنیا میں اچھوں سے برے اور بروں سے اچھے پیدا ہوتے ہیں۔ برے اپنے باپ دادوں کی خوبی سے نفع حاصل نہیں کر سکتے۔ ایسے ہی نبیوں کی اولاد کافر اور کفار کی اولاد ولی ہو سکتی ہے مگر اولیاء پر اپنے باپ دادوں کے کفر کا وبال نہ ہوگا۔ اور کفار کو باپ دادوں کی نبوت سے فائدہ حاصل نہیں تو تم کیوں مغرور ہو۔

شان نزول

حضور سید عالم ﷺ نے غزوۂ احزاب کے موقعہ پر جسے غزوہ خندق بھی کہتے ہیں۔ صحابہ کرام کو خندق کھودنے کا حکم دیا اور ہر دس صحابہ پر چالیس گز زمین تقسیم فرمائی جسے وہ کھودیں۔ عمرو ابن عوف فرماتے ہیں کہ میں اور سلمان فارسی اور حذیفہ ابن یمان اور نعمان اور چھ انصاری ایک جگہ کھدائی کر رہے تھے کہ اچانک زمین میں ایک سخت پتھر نمودار ہوا جس نے ہماری کدال بیکار کر دی اور نہ ٹوٹا۔ حضرت سلمان فارسی نے حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر یہ واقعہ عرض کیا کہ ایک پتھر نمودار ہو گیا ہے وہ نہیں ٹوٹتا۔ حضور علیہ السلام نے کدال خود لی اور سلمان کے ساتھ خندق میں اترے اور اس پتھر پر چوٹ جو ماری تو اس سے سفید روشنی نمودار ہوئی' جیسے اندھیرے گھر میں چراغ۔ سب نے تکبیر کہی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اس وقت حیرہ کے محل دکھائے گئے۔ پھر دوسری چوٹ پر پھر چمک پیدا ہوئی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے شام کی زمین دکھائی گئی' تیسری چوٹ پر پھر روشنی ظاہر ہوئی اور پتھر ٹوٹ گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے صنعاء کے محل ظاہر ہوئے۔ اور جبریل نے خبر دی کہ میری امت کی سلطنت ان سب پر ہوگی۔ مسلمانوں نے خوش ہو کر الحمدللہ پڑھی جس پر منافقین ہنسنے لگے اور بولے کہ مسلمان مدینہ میں بیٹھے ہوئے حیرہ اور کسریٰ کے ملکوں کی خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان میں باہر نکل کر کفار سے لڑنے کی طاقت نہیں چھپنے کے لئے خندق کھود رہے ہیں اور حیرہ و صنعاء جیسے مضبوط ملکوں کی امید باندھ رہے ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی (کبیر و معانی) بعض روایات میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فتح مکہ کے دن صحابہ کرام کو ملک فارس و روم کے فتح کی خوشخبری سنائی۔ جس پر منافقین نے طعن کیا کہ محمد (ﷺ) مکہ مدینہ پر قناعت نہیں کرتے' فارس و روم کے طمع میں ہیں۔ کہاں یہ اور کہاں وہ ملک بڑے زبردست اور نہایت محفوظ ہیں اس پر یہ آیت کریمہ اتری (خازن و خزائن) بعض روایات میں ہے کہ یہ یہود کہتے تھے کہ ہم ان کی اطاعت نہ کریں گے۔ جنہوں نے نبوت کو بنی اسرائیل سے منتقل کر کے بنی اسمٰعیل میں پہنچا دیا۔ تب یہ آیت کریمہ اتری (خازن)۔

تفسیر

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ۔ قل [illegible] حضور [illegible] السلام [illegible] خطاب [illegible] ہے [illegible] کا [illegible] اللہ تعالیٰ ہے یا مسلمان یعنی

اے محبوب رب تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کرو تا کہ الفاظ ہمارے ہوں زبان تمہاری۔ زبان وکلام کی تاثیریں جمع ہو جائیں تو اثر زیادہ ہو۔ یا مسلمانوں کو یہ دعا سکھا دو انہیں اس دعا کی اجازت دے دو تا کہ تمہاری اجازت سے دعائی تاثیر زیادہ ہو۔ یا مضطر دعا مانگے یا مضطر و بیقرار سے۔ دعا منگوائے یا مضطر کی اجازت سے دعا کرے تا کہ اضطرار شامل ہو کر دعا کو قبولیت سے قریب کر دے۔ اسی صورت میں قُلْ سے اجازت شیخ کا ثبوت ہوا کہ وظیفے دعا میں کسی کی اجازت سے استعمال کرو تلوار اپنی ہو میان دوسرے کی۔ یا ہر مسلمان کو اَللّٰهُمَّ اصل میں یا اللہ تھا یا حذف کر کے اس کے عوض آخر میں میم مشدد لگا دی گئی۔ یہ اللہ کی خصوصیت ہے۔ زیدمّ یا عمرمّ نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ہی بغیر اَیُّهَا کے یا کا آنا اور اس کے ہمزہ کا قطعی ہونا اور ت قسم کا آنا اور حرف ندا کے عوض ہمزہ استفہام آ جانا اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ (روح المعانی) بعض نے کہا کہ اَللّٰهُمَّ کی اصل یا اللہ ام بخیر ہے۔ یعنی اے اللہ ہماری بھلائی کا ارادہ فرما۔ چونکہ اس کا استعمال زیادہ تھا اس لئے یا اور ام کے ہمزہ دونوں دور کر دیئے گئے۔ اَللّٰهُمَّ ہو گیا۔ جیسے هَلُمَّ کی اصل میں هَلْ اور ام تھا (کبیر و معانی) بعض علماء فرماتے ہیں کہ اَللّٰهُمَّ کی میم میں تمام ان اسماء الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے جن کے اول میں میم ہے جیسے ملک' مالک' منان' مقتدر' مجید' معید' مقیت وغیرہ جس نے اَللّٰهُمَّ کہہ کر دعا مانگی۔ اس نے گویا ان تمام ناموں کے وسیلہ سے دعا مانگی جن کے اول میم ہے۔ اس لئے اکثر دعاؤں میں اَللّٰهُمَّ آتا ہے۔ نیز اللہ اسم ذات ہے' باقی اسماء صفاتیہ ہیں۔ اس ذات کو پکار کر دعا کرنا افضل ہے۔ بعض کے خیال میں اللہ اسم اعظم ہے۔ لہٰذا اس کے توسل سے دعا انشاء اللہ ضرور قبول ہوگی۔ **مالک الملک** یہ ترکیب میں یا دوسرا منادا ہے یا اَللّٰهُمَّ کی صفت (کبیر و معانی) ہم مالک اور ملک کا نفیس فرق مالک یوم الدین کی تفسیر میں کر چکے۔ ملک بمعنی قدرت ہے اور مالک بمعنی قادر' مالک الملک کے معنی ہوئے قدرت دینے پر قادر' اصطلاح میں کسی پر مضبوط قبضہ رکھنے کو ملک کہا جاتا ہے۔ ملک میم کے کسرہ سے بمنزلہ جنس ہے۔ ہر مُلک مِلک ہے مگر ہر مِلک مُلک نہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ ملک وملکوت جب خدا کی طرف نسبت دیئے جائیں تو ان کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ مالک الملک سے مراد ہے۔ ہر ملکیت کا مالک کہ وجود عدم' موت' زندگی' عذاب وثواب سب اسی کے قبضہ میں ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ تفسیر خازن نے فرمایا کہ اس کے معنی ہیں۔ مالک الملک بادشاہوں کا مالک اور ان کا وارث' اصطلاح میں بڑے علاقے کا نام ملک ہے۔ شہر' ضلع' صوبہ۔ علاقہ ملک ان سب میں ملک بڑا ہے' اللہ کے ملک بہت ہیں۔ ملک اجسام' ملک انوار' ملک امکان' ملک لہٰذا رب تعالیٰ ان سب ملکوں کا مالک ہے۔ ملک اجسام سب سے چھوٹا ملک ہے۔ تمام آسمان وزمین جنت کے مقابلہ میں سات کوڑیاں ہیں' میدان میں الملک میں الف لام جنسی ہے جو سب ملکوں کو شامل ہے۔ رب سارے ملکوں کا حقیقی مالک ہے...... **تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ**۔ یہ نیا جملہ ہے جو مالک الملک کی وسعت کو بیان کر رہا ہے اور ممکن ہے کہ اَللّٰهُمَّ کا حال ہو۔ یا انت مبتدا کی خبر۔ خیال رہے کہ اس ملک سے پہلا ملک مراد ہے کیونکہ جب معرفہ کے بعد معرفہ آئے تو دوسرے سے پہلا مراد ہوتا ہے یعنی جس ملک کا تو مالک ہے وہ ہی دوسرے کو دے سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک اس ملک سے مراد نبوت و رسالت و باطنی سلطنت ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا۔ (النساء: ۵۴) ہم نے آل ابراہیم کو بڑا ملک یعنی نبوت عطا فرمائی۔ چونکہ نبی کی [illegible] فقط ظاہر پر اس لئے نبوت کو ملک فرمایا گیا۔

چونکہ منافقین یا اہل کتاب حضور علیہ السلام کی نبوت پر اس لئے معترض تھے کہ آپ ﷺ بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ آئی۔ بعض کے نزدیک ملک سے سلطنت مراد ہے۔ یعنی زمین پر حکومت' اور مال و عزت' کھیتی باڑی اور سامان کی زیادتی۔ اور لوگوں پر ہیبت بعض کے نزدیک ملک سے ساری ملکیتیں مراد ہیں۔ لہٰذا اس میں ملکیت نبوت' اور سلطنت' علم' عقل' تندرستی' اچھے اخلاق' قدرت' محبت' ملکیت اموال سب داخل ہے (کبیر) مَنْ تُوْتِی کا دوسرا مفعول ہے اور تَشَآءُ مَنْ کا صلہ' مالک الملک کے بعد عطاء مالک کا ذکر اس لئے فرمایا کہ کامل مالک وہ ہی ہوتا ہے جو دوسرے کو دے بھی جو خود مالک یا قابض تو ہو مگر دوسرے کو دے نہ سکے تو وہ ناقص مالک ہے۔ جیسے آج پاکستان میں مہاجر الاٹ شدہ مکانات کے مالک تو ہیں مگر فروخت یا ہبہ نہیں کر سکتے کیونکہ پورے مالک نہیں۔ رب کی پوری ملکیت کا ثبوت اس کی تملیک سے ہوگا۔ اگر وہ بندوں کو ملک کا مالک نہ کر سکے تو خود پورا مالک نہیں جو بعطاء الٰہی انبیاء و اولیاء کو کسی چیز کا مالک نہیں مانتے وہ در پردہ رب کو پورا مالک یعنی مالک کر دینے پر قادر نہیں مانتے۔ ان حضرات کی ملکیت رب تعالیٰ کی کامل ملکیت کی دلیل ہے۔ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ۔ یہ جملہ توحق پر معطوف ہے اور جو اس کا حال تھا وہ اس کا ہے۔ یہ پچھلے دونوں ملک ایک ہی معنی میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مولیٰ تو ملک دینے کے بعد بھی اس ملک کا مالک رہتا ہے۔ غلام کی ملکیت مولیٰ کی ملکیت ہے۔ بندے کی ملک رب کی ملک ہے لہٰذا تو ملک دے کر واپس بھی لے سکتا ہے کہ ہر چیز تیری ہی ملک جو ہوئی۔ یا محض اہتمام کے لئے ضمیر نہ لائی گئی۔ دونوں جگہ تشاء کا مفعول پوشیدہ ہے۔ وہاں ایتاءہٗ مفعول تھا اور یہاں نزعہ یعنی اے اللہ ہر ملک کا حقیقی مالک تو ہے جسے چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے' خیال رہے کہ تنزع نزع سے بنا جس کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لینا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ (اعراف: ۴۳)۔ مِنْ غِلٍّ اسی سے تنازع اور منازعت ہے بمعنی جھگڑا اور ایک دوسرے کو کھینچنا۔ اس عبارت سے یا تو سلطنت سے محروم کر دینا مراد ہے یا دے کر چھین لینا۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔ تُعِزُّ عَزٌ سے بنا بمعنی غلبہ اور شرف اور تُذِلُّ ذلٌ سے بنا بمعنی مغلوبیت اور حقارت عزت سے یا دینی عزت مراد ہے جیسے ایمان تقویٰ پرہیز گاری اور آخرت میں ثواب یا دنیوی جیسے زیادتی مال اور مخلوق کے دل میں ہیبت' مگر بہتر یہ ہے کہ اس سے ساری عزتیں مراد لی جائیں۔ ایسے ہی تُذِلُّ سے اس کا مقابل مراد ہے۔ یعنی دنیوی ذلت جیسے مجبوری مقہوری دنیا کی لعنت اور طعنہ یا اخروی ذلت جیسے کفر برے اخلاق اور آخرت کا عذاب اور بہتر یہ ہے کہ ساری ذلتیں مراد ہوں۔ یعنی تو جسے چاہے دین و دنیا میں عزت دے اور جسے چاہے دونوں جہان میں ذلیل کر دے۔ بِیَدِکَ الْخَیْرُ۔ یہ نیا جملہ ہے۔ بِیَدِکَ خبر ہے اور خَیْرُ مبتدا ہے ید سے مراد قدرت ہے یا قبضہ' خیر میں الف لام جنسی یا استغراقی ہے یہ مقابل شر کا ہے بمعنی بھلائی اس میں دنیا اور آخرت کی ساری بھلائیاں داخل ہیں بِیَدِکَ کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ یعنی دین و دنیا کی ساری بھلائیاں اور خوبیاں تیرے ہی قبضہ میں ہیں۔ ہدایت' ایمان' عرفان' نبوت' سلطنت' مال و دولت کا صرف تو ہی حقیقی مالک ہے تیرے سوا کوئی نہیں۔ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ۔ یہ تمام مضامین کا تتمہ ہے۔ شیئی میں ہر ممکن چیز داخل ہے۔ اگرچہ رب تعالیٰ ہر خیر و شر کا مالک ہے مگر ادب کے لئے خیر کا صراحتاً ذکر فرمایا اور شر کو شیئی کے ضمن میں بیان کر دیا۔ یا یوں کہو کہ چونکہ اس آیت کا نزول نبوت و سلطنت کے متعلق ہوا تھا اور یہ چیزیں خیر ہیں نہ کہ

شر۔ اس لئے خیر کا ذکر صراحتاً کیا اور شر کا ضمناً تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ۔ تُوْلِجُ ایلاج سے بنا جس کا مادہ ولج یا ولوج ہے۔ بمعنی تنگ جگہ میں داخل ہونا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ۔ (اعراف: ۴۰) چونکہ رات دن ضدین اور ایک دوسرے کے پورے مقابل ہیں۔ اس لئے یہاں ولوج فرمایا گیا۔ یا تو لیل سے مراد رات اور نہار سے دن مراد ہے اور ان کے داخل کرنے سے مراد رات دن کا گھٹنا بڑھنا ہے کہ گرمیوں میں دن پندرہ گھنٹے کا ہوتا ہے اور رات نو گھنٹے کی اور سردی میں اس کے برعکس یا رات دن کا آگے پیچھے آنا مراد ہے۔ یا لیل سے مراد تاریکی اور نہار سے مراد روشنی ہے کہ شام کے وقت روشنی پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ اور صبح کے وقت تاریکی پر روشنی غالب آتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ رات کی جگہ میں دن کو داخل کرتا ہے اور دن کی جگہ میں رات کو کہ ایک ہی زمین پر کبھی رات کا راج ہوتا ہے کبھی دن کا' چونکہ رات پہلے ہوتی ہے اس لئے رات کا ذکر پہلے فرمایا' دن کا بعد میں۔ خیال رہے کہ زمین کا دن رات اور ہے جسم کا دن رات کچھ اور' دل کا دن رات کچھ اور قوموں کا رات و دن کچھ اور' بیماری' تندرستی' زندگی و موت' جسم کی رات دن ہیں غفلت و بیداری کفر و ایمان فسق و اطاعت دل کے رات و دن ہیں زوال و کمال قوموں کے رات و دن ہیں کہ ایک قوم پر کبھی زوال ہے' کبھی ترقی۔ ایک زمین پر کبھی کفار کا راج ہے' کبھی مسلمانوں کا' کفر کا راج رات ہے مسلمانوں کا راج دن' لہٰذا ہر شخص ہر قوم کو کمال کا زمانہ غنیمت جاننا چاہیے کہ اس کے لئے بقا نہیں۔ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ یہ جملہ تُوْلِجُ پر معطوف ہے۔ اور حَيٌّ حیات سے مشتق ہے اور مَيِّتٌ موت سے بعض نے کہا کہ مَيِّت اور مَيْت ایک ہی معنی میں ہے۔ جیسے ھین یا لین اور لین بعض کے نزدیک میت وہ جس پر موت آ چکی ہو۔ اور میت وہ جو قابل موت ہو ابھی مرا نہ ہو۔ یہاں حی سے جاندار اور میت سے بے جان مراد ہے چونکہ حیات اور موت کی بہت قسمیں ہیں۔ اس لئے اس آیت میں بہت وسعت ہے۔ یعنی تو زندہ کو مردے سے مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔ زندہ انسان کو بے جان نطفے سے' بے جان نطفے کو جاندار انسان سے یونہی جاندار چوزے کو بے جان انڈے سے' بے جان انڈے کو جاندار مرغ سے' یونہی سبز گھاس کو خشک دانہ سے اور خشک دانہ کو سبز گھاس سے۔ ہرے بھرے درخت کو خشک بیج سے' خشک بیج کو ہرے بھرے درخت سے۔ ایسے ہی مومن کو کافر سے' کافر کو مومن سے' ایسے ہی ذکی کو غبی سے' غبی کو ذکی سے پیدا فرماتا ہے۔ شقی سے ولی اور ولی سے شقی نکالتا ہے۔ بلکہ ایک ہی شخص کبھی مومن ہوتا ہے' کبھی کافر' کبھی بدنصیب' کبھی خوش نصیب' کبھی خوبصورت' کبھی بدصورت' بلکہ ایک شخص کی بعض اولاد کافر بعض مومن۔ خلاصہ یہ ہے کہ جسم کی زندگی و موت اور ہے دل کی اور روح کی زندگی و موت کچھ اور سبزہ اور زمین کی زندگی موت کچھ اور ہی ہے۔ پھر جسم کے اعضاء کی زندگی و موت علیحدہ ہے۔ آنکھ کی زندگی نور نظر اس کی موت اندھا پن' کان کی زندگی سننا اس کی موت بہرہ پن' جان کی زندگی ایمان' دل کی زندگی عرفان' یہ تمام موت و زندگیاں قبضۂ رحمٰن میں ہیں جسے چاہے جب چاہے زندگی بخشے جب چاہے موت دے دے۔ یہ آیت کریمہ بہت جامع ہے۔ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ اس آیت کی تفسیر پہلے ہو چکی' یہاں اتنا سمجھ لو کہ رزق کے معنی ہیں حصہ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (واقعہ: ۸۲) اب رب تعالیٰ کی نعمت کے حصہ کو رزق کہا جاتا ہے۔ رزق تین قسم کا ہے۔ رزق جسمانی' رزق ولی' رزق روحانی' رزق جسمانی بہت قسم کا ہے۔ آنکھ' ناک' کان وغیرہ ہر عضو کا رزق علیحدہ ہے۔ دل کا رزق عشق و محبت ایمان و

عرفان وغیرہ ہے پھر رزق دو قسم کا ہے رزق عام اور رزق خاص دیکھو دھوپ ہوا زمین اور آسمان کا سایہ رزق عام ہے اور دولت' قوت' سلطنت رزق خاص۔ ایمان تمام مومنوں کے لئے رزق عام ہے۔ عرفان وقرب الٰہی رزق خاص۔ یہاں رزق خاص کا ذکر ہے کہ اللہ جسے چاہے جب چاہے دے۔ اس فرق مراتب میں حکمت وقدرت الٰہی کا ظہور ہے۔ جب آسمان میں سورج' چاند ستارے روشنی میں مختلف ہیں تو زمین میں بھی مومن کافر' عاقل غافل مختلف چاہئیں۔ یا حساب کے معنی ہیں گمان یا تنگی یا محاسبہ اور بِغَیْرِ حِسَابٍ مِنْ کا ظرف ہے۔ یَاتَشَآءُ کے فاعل کا حال یعنی جسے چاہتا ہے اسے بہت یا بلا حساب وکتاب دیتا ہے یا ایسی جگہ سے دیتا ہے جہاں اسے گمان بھی نہ ہو۔ یا جسے چاہتا ہے بغیر استحقاق دیتا ہے۔ ابو العباس مقری فرماتے ہیں کہ قرآن میں حساب تین معنی میں استعمال ہوا۔ بمعنی مشقت جیسے یہاں اور بمعنی گنتی جیسے اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (الزمر: ۱۰) اور بمعنی مطالبہ جیسے فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تو جسے چاہے بغیر مشقت دے۔

خلاصہ تفسیر

اہل کتاب کے عیوب میں سے دو عیب یہ بھی تھے کہ وہ دنیا اور اس کے اسباب پر مغرور تھے کہ مسلمانوں کو انکی غربت کی وجہ سے حقارت سے دیکھتے تھے۔ نیز اپنے اسرائیلی خاندان پر بڑا فخر کرتے تھے اور سمجھے بیٹھے تھے کہ نبی آخر الزمان ہمارے ہی خاندان سے ہوں گے۔ اول کی تردید کیلئے فرمایا گیا کہ اے نبی ﷺ تم انہیں سنانے کیلئے ہم سے یوں عرض کرو کہ اے اللہ اے ملک کے حقیقی بادشاہ' سلطنت' عزت کسی کی موروثی چیز نہیں جسے تو چاہے سلطنت بخشے' اور جس سے چاہے جب چاہے جس طرح چاہے چھین لے۔ آج مسلمان بے دست وپا ہیں اور کفار طاقت والے لیکن مولیٰ اگر تو چاہے تو اس بے یار ومددگار جماعت کو تخت وتاج کا مالک بنادے اور کفار جن کے پاس ظاہری ساز وسامان بہت ہے انہیں حقیر کردے۔ دوسرے گمان کو باطل کرنے کیلئے فرمایا گیا کہ اے مولیٰ جسے چاہے تو عزت دے۔ سلطنت اور نبوت کی نعمتوں سے نوازے' اور جسے چاہے تو ذلیل کرے کہ اس قوم سے نبوت' سلطنت منتقل فرمادے۔ دنیا اور آخرت کی ساری خیر تیرے قبضے میں ہے۔ اس میں کسی کا اجارہ نہیں۔ تو جو چاہے کرے' کوئی تیرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ نیز تیری قدرت کا ظہور دن ورات میں ہورہا ہے کہ رات کو دن میں داخل فرمادیتا ہے اور دن کو رات میں کہ سردی میں رات جو بڑھ جاتی ہے وہ اس قدر وقت کو اپنے اندر لے لیتی ہے جو گرمیوں میں دن تھا۔ اسی طرح گرمیوں میں دن جو بڑا ہوتا ہے تو وہ وقت کا اس قدر حصہ اپنے میں لے لیتا ہے جو سردیوں میں رات تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ وقت پر کبھی رات راج کرتی ہے کبھی دن نہ رات کا ٹھیکہ ہے نہ دن کا ایسے ہی زمین پر کبھی کفار حکومت کرتے ہیں کبھی مسلمان' یہ کسی کے پاس ٹھہرنے والی چیز نہیں۔ یونہی تو جاندار کو بے جان سے پیدا فرماتا ہے کہ بسا اوقات مرنے کے بعد جانداروں سے زندہ بچے پیدا ہوجاتے ہیں۔ مٹی' منی' انڈا جو بے جان چیزیں ہیں۔ ان سے جاندار چیزیں پیدا فرماتا ہے اور زندہ سے بے جان کو پیدا کرتا ہے کہ زندہ ماں کے پیٹ سے مردہ بچہ۔ اور مرغی سے بے جان انڈا اور جاندار سے بے جان منی تو تیرے نزدیک کیا مشکل ہے کہ زندہ خاندانوں اور انبیاء کی اولاد سے نالائق کفار پیدا فرمادے۔ جو مردوں سے بدتر ہیں اور کافر خاندانوں اور جاہل لوگوں سے جو گویا مردے ہیں ایسے روشن سورج پیدا فرمادے جن کی روشنی

ہمیشہ رہے۔ جیسا کہ عرب خصوصاً قریش خاص کر بنی ہاشم ایسا چمکتا دمکتا سچا سورج پیدا فرمایا جس نے فرش و عرش کو چمکا دیا۔ اور بنی اسرائیل کے زندہ خاندان سے جس میں صدہا انبیاء تشریف لائے وہ یہود و نصاریٰ پیدا فرمائے جن میں زندگی کا کوئی اثر نہیں۔ یہ سب تیرے قبضہ قدرت میں ہیں۔ دنیا کی ٹیپ ٹاپ سب بے اصل و بے حقیقت ہے۔ اور اے مولیٰ تیرے دین پر بھی کسی کا قبضہ نہیں۔ جسے چاہے بے مشقت اتنا دے جو اس کے حساب میں نہ آسکے اور گمان سے بالاتر ہو۔ اور جسے چاہے مشقت کے باوجود کافی روزی ہاتھ نہ آئے' یا تو جسے چاہے وہ مال دے جس کا قیامت میں حساب نہیں۔ فرمایا نبی ﷺ نے کہ میری امت میں ستر ہزار انسان بغیر حساب جنتی ہیں۔ حضرت عکاشہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ دعا فرمادیں کہ میں ان میں سے ہوں۔ فرمایا تم ان میں سے ہو دوسرا آدمی بولا' حضور ﷺ دعا کریں میں بھی ان میں سے ہوں فرمایا۔ حضرت عکاشہ تم پر سبقت لے گئے گویا تم ان میں سے نہیں ہو یہ ہے اس آیت کی تفسیر۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جیسی دعا مانگنی ہو رب کو اسی نام سے پکارنا چاہیے۔ رزق مانگنے کے لئے اسے رزاق کہو۔ شفا مانگنے کے وقت شافی الامراض کہہ کر پکارو۔ بندوں کی حاجتیں بہت ہیں۔ اس لئے رب کے نام بھی بہت چونکہ یہاں ملک کی دعا کرائی گئی تھی' اس لئے رب کو مالک الملک کہہ کر پکارا۔ دنیا کا بھی طریقہ ہے کہ جب فقیر کسی دروازہ پر بھیک مانگنے جاتا ہے تو گھر والے کو سخی داتا کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ سخاوت چاہنے کے لئے آیا ہے اور جب جرنیل کسی فوج کو جنگ کی ترغیب دیتا ہے تو کہتا ہے اے میرے بہادرو۔ **دوسرا فائدہ:** رب کی حمد و ثنا بھی در پردہ دعا ہے۔ دیکھو یہاں ملک مانگنا مقصود تھا مگر صاف نہ کہا گیا بلکہ اس کی یوں تعریف کردی کہ تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ خیال رہے کہ قرآن کریم میں دعا کے چار طریقوں کی تعلیم ہے۔ صراحتہً مانگنا' صرف اپنی حاجات کا ذکر کرنا مانگنے کے الفاظ نہ ہوں۔ رب تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنا۔ اس کے محبوب پر درود پڑھنا۔ یہ چاروں طریقہ فطرت کے مطابق ہیں۔ غنی کے دروازے پر جب صدا دیتے ہیں تو کبھی صاف صاف لفظوں سے مانگتے ہیں۔ کبھی اپنا فقر و فاقہ بیان کرتے ہیں۔ بھوکا ہوں' مسافر ہوں' کبھی مالک کی تعریفیں کرتے ہیں۔ آپ سخی ہیں' داتا ہیں' کبھی مالک کے بچوں کو دعائیں دیتے۔ خانہ آباد دولت زیادہ' بال بچے شاد۔ یہ ہی طریقے رب تعالیٰ سے دعا مانگنے کے ہیں۔ جن کی روایات موجود ہیں۔ یہاں تیسرا طریقہ ارشاد ہوا ہے کہ رب سے ملک' عزت' خیر سب کچھ مانگا مگر طلب کا صیغہ نہیں آیا صرف رب کی مہر اس طرح کی کہ مانگ خود بخود آگئی مطلب یہ ہے کہ ہم کو ملک دے کفار سے چھین لے ہم کو عزت کفار کو خواری دے۔ ہمیں خیر کثیر بخش دے۔ **تیسرا فائدہ:** حضرات انبیاء و اولیاء بعطاء الٰہی رب کے ملکوں کے مالک ہیں۔ رب کے دیئے ہوئے اختیارات سے عالم میں نصرت کرتے ہیں۔ جیسا کہ تُؤْتِی الْمُلْکَ سے معلوم ہوا اگر رب نے انہیں ملک نہ دیئے تو وہ پورا مالک نہ رہا۔ رب مالک بھی ہے مالک گر بھی۔ **چوتھا فائدہ:** سلطنت اور دنیوی تمام نعمتیں کسی شخص کے لئے لازم نہیں۔ رب جب چاہے چھین لے ان پر بھروسہ نہ چاہیے مگر نبوت شخص کے لئے لازم ہوتی ہے۔ قوم کے لئے نہیں' کوئی نبی کبھی معزول نہیں ہوسکتا اسے قرب الٰہی ہمیشہ رہے گا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ زمانہ کسی خاندان میں نبی آئیں اور پھر دوسرے خاندان میں۔ جیسے بنی اسرائیل

سے منتقل ہو کر بنی اسمٰعیل میں نبوت آئی۔

خیال رہے کہ بیشک سلطنت خدا کے اختیار میں ہے مگر اس میں رعایا کے عمل کو بھی دخل ہے۔ بدکار قوم پر ظالم بادشاہ مقرر کیا جاتا ہے اور نیک کار پر عادل بعض روایات میں ہے کَمَا تَکُوْنُوْنَ یُوَلّٰی عَلَیْکُمْ۔ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تم پر حاکم آئیں گے۔ ایک بار موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولیٰ تیری رضا اور ناراضی کی علامت کیا ہے۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ عادل اور رحم دل بادشاہ میری رضا کی علامت ہے اور ظالم و جابر سلطان میرے غضب کی پہچان۔ (روح البیان)

حکایت: کسی نے حجاج ابن یوسف سے کہا کہ تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح انصاف کیوں نہیں کرتا تو نے ان کی خلافت دیکھی ہے اس کو اپنے لئے نمونہ بنا۔ اس نے کیا نفیس جواب دیا۔ تَبَذَّرُوْا تَعَمَّرَ لَکُمْ۔ تم ابوذر غفاری جیسے زاہد پرہیزگار بن جاؤ۔ میں عمر جیسا عادل بن جاؤں گا لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ حکام کے ظلم کے وقت توبہ و استغفار کریں۔ نیز خیال رہے کہ بادشاہ کے عدل و ظلم کا اثر ہر چیز پر پڑتا ہے۔ خصوصاً دودھ کھیتی باڑی درخت پھل اور لوگوں کے معاملات پر۔ چنانچہ ظالم کے ملک میں دودھ کم ہوگا۔ کھیتی کی برکت اڑ جائے گی۔ درختوں کے پھل گھٹ جائیں گے تاجروں کے معاملات خراب ہوں گے اور عادل کے ملک میں اس کا برعکس۔

حکایت: جب عمر بن عبدالعزیز بادشاہ ہوئے تو انہیں حضرت طاؤس نے لکھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری سلطنت اچھی رہے تو کام اچھوں کے سپرد کرو۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا۔

پندم اگر بشنوی اے بادشاہ　　　در ہمہ دفتر بہ ازیں پند نیست

جز بخردمند مفرما عمل!　　　گرچہ عمل کارِ خردمند نیست

حدیث شریف میں ہے کہ میری امت پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب ان کے حاکم ظالم ہوں گے اور علماء لالچی اور عابد ریاکار تاجر سودخوار عورتیں دنیوی زینت میں گرفتار (روح البیان) **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ اپنی ملک اپنا ملک اپنے بندوں کو دینے پر قادر ہے بلکہ عطاء فرماتا ہے۔ جیسا کہ تُؤْتِی الْمُلْکَ سے معلوم ہوا۔ دیکھو ملک زمین ظاہری بادشاہ کو اس نے عطا فرمایا ہے۔ ایسے ہی ملک غیب انبیاء اولیاء کو عطا فرمایا ہے جو شخص حضرات انبیاء و اولیاء کو کسی چیز کا مالک نہ مانے وہ اس آیت کا انکاری ہے۔ **چھٹا فائدہ:** اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ملک عطا فرمانے سے بھی وہ رب مالک رہتا ہے۔ اس کی ملکیت میں کوئی فرق نہیں آتا جیسے مولیٰ اپنے غلام کو کچھ دے تو مولیٰ مالک رہتا ہے۔ جیسا کہ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ۔ سے معلوم ہوا۔ لہٰذا بندوں کی عارضی ملک سے رب تعالیٰ کی حقیقی ملکیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر ملک سے مراد نبوت ہو تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جسے چاہے تو نبوت دے اور جس سے چاہے چھین لے تو کیا نبوت بھی دے کر چھین سکتی ہے کیا ممکن ہے کہ کوئی نبی اس عہدہ سے معزول کر دیا جائے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ اس صورت میں من سے مراد نسب اور خاندان ہوگا یعنی جس خاندان میں جب تک چاہے نبوت رکھے اور جب چاہے اس سے منتقل کر کے دوسرے خاندان میں بھیج دے۔ اور یہ یہود کے اس خیال کی تردید ہے کہ نبوت

ہمارے خاندان میں رہنی چاہیے کہ پہلے سے اسی خاندان میں تھی۔ دوسرا یہ کہ چھیننے سے مراد محروم رکھنا ہے۔ یعنی جسے چاہے نبوت دے۔ جسے چاہے محروم رکھے۔ جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (بقرہ: ۲۵۷) اللہ مسلمانوں کو تاریکی سے روشنی میں لاتا ہے۔ مسلمان تاریکی میں تھے ہی کہاں۔ مطلب یہ ہی ہے کہ انہیں اندھیرے سے محفوظ رکھتا ہے۔ (کبیر) **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ مردہ کو زندہ سے اور زندہ کو مردہ سے پیدا فرماتا ہے۔ اس میں تسلسل یا دور لازم آتا ہے۔ ہر بے جان کا ہر جاندار سے نکلنا ناممکن ہے۔ (بعض سر پھرے منطقی) **جواب:** اس کے معنی یہ نہیں کہ ہر بے جان جاندار ہے اور ہر جاندار بے جان سے پیدا ہو بلکہ خدا کی قدرت کا اظہار ہے یعنی وہ ایسا قادر ہے کہ کبھی ایک ضد کو دوسری ضد سے پیدا فرماتا ہے۔ **تیسرا اعتراض:** بھلا زندہ سے مردہ اور مردہ سے زندہ کبھی نکل سکتا ہے اور کیا قانونِ قدرت میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی ایسا دن رات ہوتا ہے۔ بے جان منی سے لاکھوں زندہ اور بولتے ہوئے پنڈت بن گئے اور ہزاروں پنڈتوں سے بے شمار بے جان نطفے نکل چکے۔ پنڈت جی تم بھی بے جان نطفہ سے ہو پھر صدہا پاپیوں سے پوتر پیدا ہوتے ہیں اور پوتروں سے پاپی۔ اس کا دن رات مشاہدہ ہو رہا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** آیت میں یہ فرمایا گیا کہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رات دن کو بیک وقت جمع فرماتا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ دن رات کے گھٹنے بڑھنے پر یہ دخول صادق نہیں آتا۔ دخول جب ہوگا کہ رات رہے کہ دن آ جائے۔ **جواب:** دن اور رات وقت کے اوصاف ہیں جن کا اجتماع ناممکن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ ایک ہی وقت کو کبھی رات بنا دیتا ہے کبھی دن، یعنی دن رات دشمنی کے باوجود ایسی سخاوت کرتے ہیں کہ کبھی رات اپنا کچھ حصہ دن کو بخش دیتی ہے اور کبھی دن رات کو۔ اور یہ تبدیلی عبرت کے لئے ہے۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا بِیَدِکَ الْخَیْرُ۔ تیرے قبضہ میں صرف خیر ہے تو کیا شر اسکے قبضہ میں نہیں، ایمان مفصل میں پڑھا جاتا ہے۔ وَالْقَدْرِ خَیْرِهٖ وَ شَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی۔ اس آیت اور عقیدہ میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ آیت میں ادب کا لحاظ ہے اور عقیدہ میں واقعہ کا ذکر، یعنی درحقیقت ہر چیز اللہ کے قبضہ میں ہے مگر ادب یہ ہے کہ اس کی طرف خیر کی نسبت کرو۔ دوسرا یہ کہ چونکہ یہ دعا کا موقعہ ہے اور اس سے خیر مانگنا مقصود ہے۔ لہٰذا شر کا ذکر نہ ہوا۔ تیسرا یہ کہ ہر شر میں خیر ہوتی ہے۔ مصیبت شر ہے مگر باعث ثواب۔ لہٰذا یہ خیر بھی ہے۔ صورتاً شر اور حکمت کے لحاظ سے خیر۔

تفسیر صوفیانہ

اے اللہ تو ملک جسم، ملک روح، ملک امکان، مالک انوار کا دائمی مالک ہے۔ تیرے سوا ان پر کسی کا مستقل قبضہ نہیں۔ ہاں جب تو چاہتا ہے کسی کو ظاہری قبضہ و ملک دے دیتا ہے۔ یہ قبضہ و ملک کی تبدیلیاں محض ظاہری و مجازی ہیں۔ جسے چاہتا ہے اپنے تجلیات دکھا کر عزت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے عزت کا لباس اتار کر ذلیل کر دیتا ہے جو کچھ تیری طرف سے ہے سب خیر ہے تو ہر بات پر قادر ہے۔ سب چیزیں تیرے صفات کی مظہر ہیں۔ کسی پر عزت و کبریائی کا ظہور فرما کر اسے عزیز فرماتا ہے اور کسی پر صفت قہر کی جلوہ گری فرما کر اسے ذلیل کرتا ہے کسی پر صفت غنا کی تجلی فرما کر اسے مالدار بنا دیتا ہے۔ کسی پر صفت اغنا کا

ظہور فرما کر اسے بظاہر فقیر اور ولی غنی بناتا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے رب تعالیٰ نے ملک اجسام بادشاہوں میں تقسیم فرما دیئے ہیں۔ کسی کو چھوٹا ملک دیا کسی کو بڑا حتیٰ کہ چار بادشاہوں کو سارے جہاں ساری زمین کا ملک دیا۔ حضرت سلیمان۔ ذوالقرنین' بخت نصر' نمرود' ایسے ہی رب نے اپنے نبیوں ولیوں کو عالم ارواح' عالم امکان' عالم امر وغیرہ تقسیم فرما دیئے کہ حضرت سلیمان کے بارے میں فرمایا۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ. (ص:۳۶) اور حضرت داؤد کے بارے میں فرماتا ہے۔ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ۔ (سباء:۱۰) اور ہمارے حضور ﷺ کو فرمایا إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ۔ (الکوثر:۱) ہم نے آپ ﷺ کو عالم کثرت بخشا کوثر کثیر کا مبالغہ ہے۔ دنیا قلیل ہے اور حضور ﷺ کو جو دیا وہ کثیر نہیں اکثر نہیں بلکہ کوثر یعنی بہت ہی زیادہ ہے۔ اگر کوثر سے حوض کوثر ہی مراد ہو تو وہ بھی تمام زمین سے زیادہ قیمتی ہے۔ جس کے کوزے آسمانوں کے تاروں کے برابر ہیں اور پانی موتیوں کی بجری پر ہے اس بجری کا ایک موتی روئے زمین سے زیادہ قیمتی ہے۔ اگر محض تالاب کا نام کوثر ہوتا تو رب تعالیٰ اتنے اہتمام سے اس کی عطا کا ذکر نہ فرماتا۔ آج ہم پاکستانی' دریا جہلم' چناب' کے مالک ہیں۔ بھارت والے گنگا' جمنا وغیرہ پانیوں کے مالک ہیں۔ کوثر کیا چیز ہے کہ رب نے ان دریاؤں کی عطا کا اس اہتمام سے ذکر نہ فرمایا۔ کوثر کو عطا کا ذکر کیا۔ معلوم ہوا کوثر سے مراد خیر کثیر یا عالم کثرت ہے۔ جس میں حوض کوثر بھی داخل ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ دیکھو بخاری شریف حضور ﷺ ساری ملک الٰہی کے مالک ہیں۔ حضور غوث پاک فرماتے ہیں۔ بِلَادُ اللهِ مُلْكِي تَحْتَ حُكْمِي۔ یہ اس آیت۔ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ کی تفسیر ہے۔

نوٹ: اسمائے الٰہیہ کا وظیفہ ان کا فیضان لینے کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ صفت غنا کے ظہور کے لئے وظیفہ یا غنی پڑھو وغیرہ۔ اے مولیٰ تو ہی کبھی نفس کی تاریکی کو قلب کے نور میں داخل فرماتا ہے جس سے قلب تاریک ہو جاتا ہے اور کبھی قلب کا نور نفس کی تاریکی میں داخل فرماتا ہے۔ جس سے نفس چمک جاتا ہے۔ فاسقین ہمیشہ رات میں رہتے ہیں اور عارفین ہمیشہ دن میں۔ ان کی زمین کا آسمان ہی کچھ اور ہے۔ اور ان کا دن و رات کچھ دوسرا۔ زندہ قلب کو مردہ نفس سے اور مردہ قلب کو زندہ نفس سے نکالتا ہے۔ ایسے ہی حیات علم و معرفت کو موت جہالت سے اور موت جہالت کو حیاتِ علم سے نکالتا ہے دیکھو بلعم ابن باعورا حیات علم سے موتِ جہل کی طرف منتقل ہوا۔ اور بلال حبشی و عکرمہ ابن ابو جہل جہالت سے علم میں آئے۔ خدا کی شان باپ جہالت کا باوا اور بیٹا علم کا سردار۔ اور جسے چاہتا ہے وہ ظاہری اور باطنی نعمتیں دیتا ہے۔ جن کا آخرت میں حساب نہ ہو۔ خیال رہے کہ ولی کا ہر حال وقف ہے اور وقف حساب سے پاک۔ خیال رہے کہ عوام کے دن رات اور ہیں' صوفیاء کے دن رات کچھ اور۔ ایسے ہی جسم کا دن رات کچھ اور ہے اور روح کا کچھ اور' عوام کے دن رات کو ایام ولوج کہتے ہیں۔ جس کا یہاں ذکر ہے۔ اور صوفیاء کے دن رات کو ایام سلخ۔ نسلخ منه النهار۔ عوام کا دن رات' آسمانی سورج کے طلوع و غروب سے ہے اور صوفیاء کا دن رات شمس نبوت کے ظہور اور خفاء سے۔ عوام دن میں کام کاج کرتے ہیں۔ رات میں آرام مگر صوفیاء دن میں جلوت اور رات میں خلوت کا مزہ لوٹتے ہیں۔ جسم دن میں غذا حاصل کرتے ہیں مگر عقل معرفت حاصل کرتی ہے۔ اور بصیرت مشاہدہ اور روح اسرار۔ دن رات بھی ایک چیز ہیں اور ہر چیز کا ایک ظاہر ہے۔ ایک باطن' ایک غیب' ایک شہادت' ایک روح ایک جسم' ایک ملک' ایک ملکوت' ایک لطیف' ایک کثیف' نہار ظاہر اور لیل باطن' نہار شہادت ہے اور لیل غیب۔ خیال رہے

کہ دن رات کا معنوی نکاح ہوا جس سے اشیاء پیدا ہوئیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ۔ (اعراف: ۵۴)
جو چیز دن میں پیدا ہو اس کے لئے دن ماں ہے اور رات باپ اور رات کے اعمال کے لئے رات ماں ہے اور دن باپ۔ اسی پر عالم کا مدار ہے۔ ہر سلطنت و ملک کا دن رات، تاریخ، مہینہ سنہ جداگانہ ہے۔ ایسے ہی رب تعالیٰ کا دن رات مخلوق کے دن رات سے جداگانہ ہے۔ اس کی پوری تحقیق آگے ہوگی۔

مجرب عمل: جس شخص پر بہت قرض ہو گیا ہو اور اس کے ادا کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو۔ اس کو چاہیے کہ نماز وتر کے بعد دو رکعت نفل کھڑے ہو کر پڑھا کرے۔ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد یہ آیتیں قُلِ اللّٰھُمَّ سے بغیر حساب تک پانچ بار پڑھا کرے۔ انشاء اللہ اس کا قرض بہت جلد ادا ہو جائے گا۔ یہ عمل نہایت مجرب ہے۔ خود میں نے اس کا تجربہ کیا۔ نیز اگر کوئی ہمیشہ وتر کے بعد دو نفل کھڑے ہو کر پڑھ لیا کرے جس میں سورۂ فاتحہ کے بعد ایک ایک بار یہ آیتیں پڑھ لیا کرے تو اس پر کبھی قرض نہ ہوگا۔

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ج

نہ بنائیں ایمان والے کافروں کو دوست سوا مسلمانوں کے

مسلمان کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں مسلمانوں کے سوا

وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىةً ط

اور جو کوئی کرے گا یہ پس نہیں ہے وہ اللہ سے بیچ کسی چیز کے مگر یہ کہ ڈرو تم ان سے ڈرنا

اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے کچھ علاقہ نہ رہا مگر یہ کہ تم ان سے کچھ ڈرو اور اللہ تمہیں

وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَهٗ ط وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ

اور ڈراتا ہے تم کو اللہ ذات سے اپنی اور طرف اللہ کے لوٹنا ہے فرما دو اگر چھپاؤ تم وہ جو بیچ

اپنے غضب سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف پھرنا ہے تم فرما دو کہ اگر تم اپنے جی کی بات

صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰہُ ط وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ

سینوں تمہارے کے ہے یا ظاہر کرو اس کو جانے گا اللہ اس کو اور جانتا ہے جو بیچ آسمانوں کے ہے

چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ کو سب معلوم ہے اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

وَمَا فِی الْاَرْضِ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾

اور وہ جو بیچ زمین کے ہے اور اللہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے

اور جو کچھ زمین میں ہے اور ہر چیز پر اللہ کا قابو ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں سے رب تعالیٰ کی قدرت کا زبانی اقرار کرایا گیا تھا۔ اب عملی اقرار کا حکم دیا جا رہا ہے کہ جب رب تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے تو تم اپنے ہر معاملہ کو اسی کے سپرد کرو۔ اس کے دشمنوں کو مددگار نہ بناؤ تا کہ تمہارا عمل تمہارے اس عقیدے کا ثبوت ہو۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو عقیدہ کی تعلیم دی گئی کہ رب کے ساتھ یہ عقیدہ رکھو۔ اب انہیں درستی معاملات کا سبق دیا جا رہا ہے تا کہ عقیدہ کے ساتھ معاملات بھی درست ہوں کہ اسی پر نجات کا مدار ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی تعظیم کا حکم دیا گیا اور تعظیم کی دو شرطیں ہیں۔ اللہ کے دوستوں کی تعظیم کرنا اور اس کے دشمنوں کی حقارت۔ گویا پچھلی آیت میں تعظیم کا ذکر تھا۔ اب شرط تعظیم کا۔

شانِ نزول

حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ نے جنگ احزاب کے دن حضور سید عالم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میرے ساتھ پانچ سو یہودی ہیں جو میرے حلیف ہیں اگر حکم ہو تو دشمن کے مقابلہ میں ان سے مدد حاصل کر لی جائے۔ تب یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خازن وخزائن) بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت حضرت حاطب ابن ابی بلتعہ کے بارے میں آئی۔ جو کبھی کفار مکہ سے محبت ظاہر کیا کرتے تھے۔ اس سے ان کو منع کیا گیا۔ (کبیر و معانی) بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت عبداللہ ابن ابی منافق اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں آئی۔ جو یہود اور مشرکین سے محبت رکھتے تھے اور انہیں مسلمانوں کی خفیہ خبریں پہنچاتے تھے۔ (تفسیر خازن وکبیر) اس صورت میں مومنوں سے زبانی اور ظاہری ایمان مراد ہوگا۔ ہمیشہ سے مسلمان دو قسم کے رہے ہیں قومی مسلمان اور مذہبی مسلمان۔ منافقین قومی مسلمان تھے۔ مخلصین مذہبی مسلمان یوں ہی اسلام کے تہتر فرقوں میں بہتر فرقے قومی مسلمان ہیں اور ایک فرقہ مذہبی مسلمان۔ قرآن کریم میں اکثر الذین امنوا۔ سے مذہبی مسلمانوں سے خطاب ہوتا ہے مگر کبھی قومی مسلمانوں سے بھی خطاب ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا۔ اے قومی مومنوں مذہبی مومن بن جاؤ۔

تفسیر

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ ...... **لَا یَتَّخِذِ۔** اتخاذ سے بنا جس کا مادہ اخذ ہے بمعنی اختیار کرنا اور بنانا۔ پہلی صورت میں ایک مفعول کو چاہتا ہے دوسری میں دو کو یہاں دونوں معنے درست ہیں۔ اگر بمعنی اختیار ہو تو اولیاء کٰفِرِیْنَ کا حال ہوگا۔ اور اگر پکڑنا یا بنانا مراد ہو تو یتخذ کا مفعول دوم۔ مُؤْمِنُوْنَ سے سارے مسلمان مراد ہیں اور کَافِرِیْنَ سے سارے کافر مراد خواہ کافر اصلی ہوں یا مرتد' اہل کتاب ہوں یا مشرکین۔ اَوْلِیَآءَ ولی کی جمع ہے۔ جسکی اصل ولاء ہے بمعنی قرب یا مدد یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی مسلمان کافروں کو دوست یا مددگار نہ بنائیں۔ اور ان کے پچھلے تعلقات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے موجودہ کفر کا اعتبار کریں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ولی یا بمعنی مددگار ہے یا بمعنی دوست کفار کو مددگار بنانا' مومنوں کے مقابلہ میں کہ ان کی مدد سے مسلمانوں کو تباہ کیا جائے۔ حرام [illegible] عذر لینا ممنوع ضرورتاً جائز۔ یہاں پہلی قسم کی مدد مراد

اور دوستی بھی تین قسم کی ہے۔ معاملات کی دوستی جیسے بر و قسط کہتے ہیں جائز ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ الخ۔ (الممتحنہ: ۸) نبی علیہ السلام نے کفار سے لین دین کے معاملات کئے ہیں بوقت وفات آپ کی زرہ یہودی کے پاس گروی تھی۔ کفار سے محبت حرام ہے۔ کفر سے محبت کفر ہے۔ یہاں آخری دو محبتیں مراد ہیں۔ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ یہ فاعل کا حال ہے اور متجاوزین کے متعلق۔ بعض نے کہا کہ اولیاء کی صفت ہے۔ بعض کے نزدیک یہ اتخاذ کے متعلق ہے۔ (روح المعانی) دُوْنِ کے معنی کوتاہ یا پیچھے رہنے والا ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ ذلو کا مقلوب ہے۔ اب بمعنی غیر اور سوا استعمال ہوتا ہے مگر ہر سوا کو دون نہیں کہتے۔ ہر سواء کو اِلاّ کہا جاتا ہے۔ اجنبی کو غیر اور مقابل کو دون بولتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِھِمُ امْرَاَتَیْنِ۔ (قصص: ۲۳) اس لئے کلمہ طیبہ میں الا اللہ کہا جاتا ہے۔ دون اللہ نہیں کہا جاتا۔ یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر یا ان سے پیچھے رہتے ہوئے یا ان کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے یا مسلمانوں کے سواء کافروں کو دوست نہ بناؤ۔ اگر دون بمعنی مقابل ہے تو معنی ظاہر ہیں کہ مسلمانوں کے مقابل کفار کو دوست نہ بناؤ کہ ان کی مدد لے کر مسلمانوں کو تباہ کرو اور اگر بمعنی سواء ہے تو یہ قید اتفاقی ہے نہ کہ احترازی جیسا کہ انشاء اللہ سوال جواب میں معلوم ہوگا۔ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِیْ شَیْءٍ...... ذٰلِکَ سے اتخاذ کی طرف اشارہ ہے جو یتخذ کا مصدر ہے۔ مِنَ اللّٰہِ میں ولایت یا محبت پوشیدہ ہے یعنی من ولایۃ اللہ یا من محبت اللہ۔ یہ لفظ شیئٌ کا حال مقدم ہے۔ یا شیئ کی تنوین حقارت کی ہے۔ اور فِیْ شَیْءٍ لیس کی خبر۔ اصل عبارت یوں تھی فَلَیْسَ فِیْ شَیْءٍ مِنْ وَلَایَۃِ اللّٰہِ۔ یعنی جو کفار سے محبت کرے گا یا انہیں اپنا مددگار بنائے گا وہ اللہ کی دوستی کے کسی درجہ میں نہیں۔ یعنی اسے رب سے محبت کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ دشمن سے دوستی بھی دشمنی ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر ولایت کفار سے مراد کفر سے دوستی ہو تو یہاں شئی سے اسلام ہوگا یعنی جو کفار کے کفر سے دوستی رکھے گا وہ اللہ کے ہاں اسلام میں بالکل شمار نہ ہوگا۔ ان ہی کی طرح کافر ہوگیا اور اگر محبت کفار مراد ہے تو شئی سے مراد رحمت ہوگی یعنی جو کفار سے محبت کرے گا وہ اللہ کی رحمت میں بالکل نہ ہوگا۔ نہ دنیا میں نہ برزخ میں نہ آخرت میں۔ دنیا کی رحمت سے روحانی رحمت مراد ہے کیونکہ دنیا میں جسمانی نعمت تو دوست و دشمن سب کو مل جاتی ہے یعنی جو کفار کو دوست بنائے گا وہ دنیا میں روحانی نعمتوں ایمان، عرفان وغیرہ سے دور رہے گا۔ برزخ میں کامیابی امتحان اور آخرت میں مغفرت و غفران سے محروم ہوگا۔ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰۃً۔ یہ لَا یَتَّخِذْ کے حالات سے استثناء ہے یا اس کے پوشیدہ مفعول لہٗ سے۔ اِنْ سے پہلے حال یا اجل پوشیدہ یعنی حال اَنْ تَتَّقُوْا یا لِاَجْلِ اَنْ تَتَّقُوْا۔ تتقوا کا مصدر اتقاء ہے۔ مادہ وقی یا وقایۃ بمعنی بچنا یا ڈرنا یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ مِنْھُمْ کا مرجع کفار ہیں۔ اور یہ پوشیدہ کے متعلق ہو کر تقۃ کا حال مقدم ہے۔ اصل عبارت یوں تھی۔ اِلَّآ حَالَ اَنْ تَتَّقُوْا تُقٰۃً ثَابِتَۃً مِنْ جِھَتِھِمْ تُقٰۃً اصل میں وَقِیَۃً تھا واؤ ت سے بدلا گیا۔ جیسے وجاۃ سے تجاۃ اور ی ماقبل کے فتح کی وجہ سے الف ہوگئی۔ یہ بروزن فعلۃ ہے جیسے تخمۃ اور تُؤَدَۃٌ یہ باب افتعال کا مصدر غیر قیاسی ہے۔ (روح المعانی) یا تو بمعنی مصدری ہے۔ تَتَّقُوْا کا مفعول مطلق یا حاصل بالمصدر اور تَتَّقُوْا کا مفعول بہ یعنی کفار کو کبھی کسی حال میں کسی غرض کے لئے دوست نہ بناؤ مگر اس صورت میں جب تم اس سے ڈرو یا تمہیں ان سے کوئی خوف ہو تب منہ سے ظاہری نرمی مدارات کرسکتے ہو۔ جیسے اولیاء کی تین تفسیریں تھیں۔ کفار کو مددگار نہ بناؤ۔ ان سے قومی دوستی نہ کرو۔ ان سے دینی دوستی نہ کرو۔ ایسے ہی اِلَّآ اَنْ

تَتَّقُوْا۔ الخ کی تین تفسیریں ہیں۔ایک یہ کہ کفار کو مددگار نہ بناؤ مگر جب کہ تمہیں ان سے اندیشہ ہو تو بعض کفار کے مقابلہ میں بعض دوسرے کفار سے مدد لے لو جیسے آج امریکہ و روس دو بلاک ہیں۔تمام ملکوں کو ان میں سے ایک سے مدد لینی پڑتی ہے۔ دوسرا یہ کہ قوم کفار کو دوست نہ بناؤ مگر یہ کہ ان سے خطرہ ہو تو ان سے ظاہری دوستی کر سکتے ہو۔دل میں ان کی طرف میلان نہ ہو۔تیسرا یہ کہ کفار سے مذہبی دوستی نہ کرو۔ان کے مذہب سے الفت نہ کرو مگر جبکہ ان سے تمہیں خطرہ ہو تو منہ سے کفر نکال دو۔ اس تیسری تفسیر میں ایک شرط یہ ہے کہ دل میں ایمان رہے۔دوسری شرط یہ ہے کہ بقدر ضرورت کفر بکا جائے۔موقعہ پاتے ہی وہاں سے نکل جائے مگر خبردار پھر بھی ان سے دلی محبت نہ کرنا' کیونکہ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ...... یہ مستقل جملہ ہے۔تحذیر بمعنی سخت ڈرانا نفس سے پہلے عذاب یا عتاب پوشیدہ ہے۔(معانی) یا خود یہ ہی مفعول ہے اور نفس بمعنی ذات یعنی اللہ تم کو اپنے عذاب سے یا اپنے سے ڈراتا ہے بعض کے نزدیک نفسہٗ کی ضمیر اتخاذ کی طرف لوٹتی ہے اور نفس بمعنی بعینہٖ (تفسیر کبیر) یعنی رب تم کو بعینہٖ دوست بنانے سے ڈراتا ہے۔وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۔ اس کی تحقیق بارہا ہو چکی۔مصیر یا مصدر میمی ہے۔یا اسم ظرف یعنی سب کا لوٹنا یا سب کا ٹھکانا اللہ ہی کی طرف ہے یا تو مرتے وقت رب کی طرف رجوع ہے کہ اس وقت ہی سب دنیا والے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔جان نکلتے ہوئے سب دیکھتے ہیں کچھ نہیں کر سکتے۔یا قبر میں دفن کے بعد سب کا رجوع رب کی طرف ہے یا قیامت میں کہ ان جگہوں میں کوئی عزیز قریب کام نہ دے گا۔چونکہ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا۔ سے شبہ ہو سکتا تھا کہ بحالت خوف کفار سے دلی محبت بھی جائز ہے۔اس وہم کو دفع کرنے کے لئے ارشاد ہوا۔قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ۔ تُخْفُوْا اخفاء سے بنا بمعنی چھپانا۔مَا سے مراد کفار کی محبت ہے یا سارے اعمال صدور جمع صدر کی ہے بمعنی سینہ مگر یہاں سینے کی چیز یعنی دل مراد ہے۔خیال رہے کہ صدر اعلیٰ اور ظاہری مقام کو بھی کہتے ہیں اور لوٹنے کو بھی' سینہ کو صدر اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ جسم کا اعلیٰ مقام ہے کہ اس میں دل ہے۔نیز اسی کے ذریعہ انسان گھومتا ہے۔اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ۔ یہ تُخْفُوْا پر معطوف اور شرط ہے يَعْلَمْ اس کی جزا یعنی جو کچھ تمہارے دلوں میں محبت کفار وغیرہ ہے تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو اس کی خبر رب تعالیٰ کو بہر حال ہوگی۔اور کیوں نہ ہو اس کی تو شان یہ ہے کہ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ۔ وہ آسمانوں اور زمین کی ساری کھلی چھپی چیزیں جانتا ہے اور تمہارا دل اور اس کے خطرات بھی انہیں میں سے ہیں۔لہٰذا انہیں بھی جانتا ہے۔اور کمال علم کے ساتھ اس کی قدرت بھی کامل ہے۔وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ...... لہٰذا اس کے غضب سے ڈر کر اس کی نافرمانی پر جرأت نہ کرو۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو جب تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ مالک حقیقی ہے۔عزت و ذلت اسی کے اختیار میں ہے امیری' غریبی' اسی کی طرف سے ہے تو کوئی مسلمان کسی کافر کو اپنا مددگار اور ولی' دوست نہ بنائے۔جب رب تمہارے لئے کافی ہے تو تم کسی کی خوشامد کیوں کرتے ہو۔جو مسلمان کفار سے دوستی یا محبت کرے گا تو اسے اللہ سے محبت کا کوئی علاقہ نہ رہے گا کیونکہ اپنے دشمن کا دوست اپنا دشمن ہے کفار خدا کے دشمن اور تم کفار کے دوست۔تو تم خدا کے دوست کہاں رہے۔ہاں اگر کبھی تمہیں کفار سے سخت خطرہ ہو تو تم ان سے محبت کا دنیوی ظاہری برتاوا برت سکتے ہو کہ ان سے جنگ نہ کرو۔ان سے خندہ پیشانی سے مل لو۔

بوقت ضرورت ان سے سلام وکلام مصافحہ وغیرہ کرلو (روح المعانی) مگر خبردار دل میں ان سے محبت نہ رکھنا۔ رب تعالیٰ تمہیں اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔ سمجھ لو کہ سب کو رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ کوئی اس کی پکڑ سے باہر نہیں' چونکہ سب رب کی طرف سے ہی آئے ہیں کہ پہلے رب کے سوا تمہارا کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی تمہیں جانتا پہچانتا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (الدھر:۱) ایسے ہی پھر تمہارا حال ہونے والا ہے کہ رب کے سوا کوئی تمہارا نہ ہوگا۔ اس لئے رجوع یعنی لوٹنا فرمایا گیا۔ لوٹنا کہتے ہیں پہلی حالت پر پہنچ جانا۔ اگر تم اپنی دلی باتیں چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ خدا سب جانتا ہے کیونکہ وہ تو آسمان و زمین کی ہر چیز پر خبردار ہے۔ اس سے تمہارے دلی حالات کیونکر چھپ سکتے ہیں پھر وہ اس علم کے ساتھ ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا تمہیں جزا و سزا دینا اس کے نزدیک کوئی مشکل نہیں۔

خیال رہے کہ سینہ کو صدر اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں جسم کا صدر یعنی دل رہتا ہے۔ صدر کے معنی ہیں اشرف مقام۔ سینہ تمام جسم میں اشرف اس لئے ہے کہ یہ اشرف عضو کا مقام ہے کہ مکہ معظمہ' مدینہ منورہ اس لئے شریف کہلائے کہ اس میں اشرف الخلق کا تعلق ہے اگرچہ رب تعالیٰ ہر چیز جانتا ہے مگر خصوصیت سے سینہ کی باتوں کا اس لئے ذکر فرمایا کہ اس میں دل ہے اور دل کاشانہ یار ہے۔ اگر دل ٹھیک ہوگیا تو سب جسم ٹھیک ہے اور اگر دل خراب ہوگیا تو سارا جسم خراب ہے۔ سارا قالب اور کاموں میں لگادو مگر دل یار کے کام میں لگادو۔ چونکہ اس آیت میں اشارۃً دل کی صفائی کا ذکر تھا۔ اس لئے یہ آیت قُلْ سے شروع فرمائی گئی تاکہ مضمون کی اہمیت کا پتہ لگے۔ نیز ان کا ذکر خصوصیت سے علیحدہ کیا گیا۔ اگرچہ یہ سینہ والی چیزیں بھی مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں داخل ہیں۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ دل کی باتیں' آسمان و زمین کی چیزیں حقیقی طور پر خود جانتا ہے مگر اس نے بعض بندوں کو اس صفت کا مظہر بنایا جن کو دلوں کی باتوں' آسمان و زمین کی چیزوں پر اطلاع بخشی۔ نیز کبھی دل کی جہالت چہرے سے عیاں ہو جاتی ہے۔ دل کا غم' غصہ' خوشی وغیرہ کا پتہ چہرہ دے دیتا ہے۔ قیامت میں کفر و ایمان' فسق و تقویٰ چہرے سے عیاں ہوگا۔ ہر شخص چہرے سے پہچانا جائے گا۔ یہ علوم رب تعالیٰ کے علم کے خلاف نہیں۔ چشم تو بنیندہ مافی الصدور۔

نوٹ: اس آیت سے تین اہم مسئلے ظاہر ہوئے۔ کفار سے محبت کی ممانعت۔ ان سے مدد حاصل کرنے کی ممانعت' تقیہ کا حکم۔ ہم ان تینوں مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ رب تعالیٰ قبول فرمائے۔

کفار سے محبت کرنے کا حکم

کفار سے محبت سخت منع ہے۔ اس کی ممانعت میں بہت آیتیں اور بیشمار حدیثیں وارد ہوئیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَآءَ۔ (مائدہ:۵۱) یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ نیز فرماتا ہے لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ۔ (الممتحنہ:۱) میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ نیز فرماتا ہے۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ۔ (مجادلہ:۲۲) یعنی اے محبوب آپ مسلمانوں کو ایسا نہ پائیں گے کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کے مخالفوں سے دوستی رکھیں۔ اگرچہ وہ ان کے باپ دادا ہی ہوں۔ احادیث میں بھی اس کی سخت ممانعت آئی مگر خیال رہے کہ تعلقات کی چند قسمیں ہیں۔ اور ان کے جداگانہ احکام۔ (۱) دوستی (۲) محبت (۳) میلان طبع

(۴) بر وقسط (۵) قرابت داری (۶) ادائے حقوق (۷) دنیوی معاملات (۸) میل جول یعنی نشست و برخاست' ان سب کے مختلف احکام ہیں۔ دنیوی معاملات یعنی تجارتی لین دین وغیرہ کفار سے جائز ہے۔ ادائے حقوق جائز۔ کافر ماں باپ کا حق مادری و پدری ادا کیا جائے گا۔ بر وقسط یعنی دنیوی معاملات میں خوش اسلوبی کفار کے احسان کا احسان سے بدلہ یہ بھی جائز ہے۔ محبت کی تین صورتیں ہیں۔ کافر کے کفر سے محبت اور اس سے راضی ہونا۔ یہ کفر ہے۔ کفار سے محبت کہ کفر کو تو برا جانے مگر اہل اسلام کے مقابلہ میں کفار کی مدد کرے۔ خواہ قرابت داری یا دنیوی لالچ یا کسی اور وجہ سے یہ سخت حرام ہے' بلکہ اس کا انجام کفر ہے۔ تیسرا کافر قرابتدار سے غیر اختیاری طبیعت کا میلان کافر بیٹے سے محبت پسری وغیرہ مگر اس محبت پر اتنی قدرت رکھے کہ جب اسلام وکفر کا مقابلہ آپڑے تو بیٹے کا لحاظ نہ کرے یہ جائز ہے منع نہیں۔ میل جول اس کی بھی دو نوعیتیں ہیں۔ ضروری اور غیر ضروری۔ غیر ضروری حرام ہے اور ضرورتاً جائز۔ کسی کا افسر کافر ہے یا ایک محکمہ میں مسلمان اور کفار مل کر کام کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی ہوگا اور ان سے میل جول بھی رکھنا پڑے گا یہ منع نہیں کہ ضرورتیں ناجائز کو جائز کر دیتی ہیں۔ محبت کا میل جول بہر حال حرام ہے۔ ان آیات میں کفار کی غیر ضروری میل جول اور دوستی سے منع کیا گیا ہے۔ اس تفصیل کے بعد آیات اور احادیث میں پوری واقفیت ہوگئی۔

کفار سے مدد لینا

کفار سے مدد لینے کی چند صورتیں ہیں۔ اس کو اپنا راز دار بنانا حرام ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ۔ (آل عمران: ۱۱۸) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک عیسائی کو اپنا محرر مقرر کیا تھا۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو الگ کرا دیا۔ عیسائی اور یہودی عورتوں سے نکاح جائز ہے مگر اسے اپنا راز دار بنانا حرام' اسی طرح کفار کو حکومت میں دخل دینا ناجائز ہے۔ اس کے علاوہ ان سے اور کسی قسم کی مدد لینا جائز ہے۔ کفار کو اسلامی لشکروں میں بھرتی کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ کفار سے جنگ ہو نہ کہ باغیوں سے باغیوں کے مقابلہ میں کفار کو فوج میں نہ لو (روح المعانی) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ جنگ بدر کے لئے روانہ ہوئے تو ایک مشرک پہلوان لشکر کے ساتھ ہو لیا۔ جس سے صحابہ کرام خوش ہوئے کہ یہ ہماری مدد کرے گا مگر حضور علیہ السلام نے فرمایا لوٹ جا ہم مشرک سے امداد نہیں لیتے۔ یہ منسوخ ہے کیونکہ نبی ﷺ نے یہود بنی قینقاع سے جنگ میں مدد لی اور انہیں غنیمت میں سے کچھ مال بھی عطا فرمایا۔ نیز غزوہ بنی ہوازن میں صفوان ابن امیہ سے مدد لی۔ بعض نے فرمایا ہے کہ بلاوجہ مشرک سے امداد نہ لی جائے اور ضرورتاً جائز۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت بلاضرورت کی ہے۔ باقی ضرورت کی (روح المعانی) نیز کفار کو نوکر خادم رکھنا جائز ہے۔ کفار کے باقی احکام فتاویٰ عالمگیری وغیرہ میں دیکھنے چاہئیں۔ یہ بہت وسیع باب ہے۔

تقیہ

تقیہ کے لفظی معنی ہیں بچانا یا اپنی جان مال آبرو کو دشمن سے بچانا' چونکہ دشمن دو قسم کے ہیں دینی اور دنیوی۔ اس لئے تقیہ کی بھی دو

قسمیں ہیں۔ اور ان کے الگ الگ احکام' دینی تقیہ کا حکم یہ ہے کہ اگر مسلمان کفار میں ایسا پھنسے کہ وہاں اپنا دین ظاہر نہ کرسکے یا کبھی کفر بکنے پر مجبور ہو جائے تو جان چھڑانے کے لئے اس وقت اس پر عمل کرے مگر پھر وہاں سے ایسی جگہ ہجرت کر جائے جہاں دینی آزادی ہو۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔ (النحل: ۱۰۶) اسی لئے انبیاء کرام نے کفرستان سے ہجرتیں کیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔ (النساء: ۹۷) ہاں بچے اور عورتیں' جو ہجرت پر قادر نہ ہوں ان کے اور احکام ہیں پھر بھی اگر کوئی کلمہ کفر نہ نکالے اور جان دیدے تو شہید ہوگا۔ (احکام القرآن وروح المعانی) چنانچہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابہ کرام کو پکڑ کر ان میں سے ایک سے پوچھا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں (ﷺ) انہوں نے کہا ہاں' پھر بولا کہ تم گواہ ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ انہوں نے فرمایا ہاں اس نے چھوڑ دیا۔ دوسرے سے پوچھا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں انہوں نے فرمایا ہاں پھر کہا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ میں بہرہ ہوں تین بار یہ ہی سوال و جواب ہوئے۔ آخر انہیں شہید کر دیا گیا۔ جب یہ واقعہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ پہلے نے رخصت کو اختیار کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور دوسرا اصدق ویقین پر گیا اسے مبارک ہو (احکام القرآن ومعانی وکبیر وغیرہ) غرضکہ بلاوجہ اپنا دین چھپانا یا جہاں دین ظاہر نہ کرسکیں وہاں رہنا حرام ہے۔ دوسرا تقیہ یعنی دنیوی معاملات میں کفار سے مدارات کرنا یہ ضرورتاً جائز بلا ضرورت منع۔ کفار سے خندہ پیشانی سے ملنا۔ ان سے مصافحہ کرنا۔ انہیں ہدیئے تحفے دینا۔ ان سب کا یہ ہی حکم ہے خیال رہے کہ تبلیغ دین بھی ایک ضرورت ہے جو کفار مائل باسلام ہوں۔ ان کے ساتھ معاملات ضرور کئے جائیں۔ شروع اسلام میں تو ایسے کافروں کو زکوٰۃ دینا بھی جائز تھی۔ اس دنیوی تقیہ کا اس آیت میں ذکر ہے۔ دینی تقیہ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ آیت کی روش سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس نے بوقت خوف کفار کو ولی' یعنی ظاہری دوست بنانے کا حکم دیا نہ کہ کفر کا۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ تقیہ کا حکم شروع اسلام میں تھا کہ مسلمان کمزور تھے۔ اب نہیں رہا۔ ان کے قول پر اب کسی قسم کا تقیہ جائز نہیں مگر عوف نے امام حسن سے روایت کی کہ تقیہ قیامت تک جائز ہے کیونکہ جان کو بقدر طاقت نقصان سے بچانا ضروری ہے۔ (تفسیر کبیر ومعانی وخازن) حضرت سعید نے فرمایا کہ تقیہ بحالت جنگ جائز ہے نہ کہ بحالت امن (خازن) تقیہ کا وہ ہی مطلب ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا۔ خیال رہے کہ کفر چھپانا ایمان ظاہر کرنا منافقت ہے اور ایمان چھپانا زبان سے کچھ ظاہر نہ کرنا ستر ہے اور ایمان چھپانا کفر ظاہر کرنا تقیہ ہے۔ منافقت تو بہرحال سخت جرم ہے۔ اس کی سزا اصلی کفر سے زیادہ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵) اور ستر ضرورتاً جائز ہے بلاضرورت منع۔ اپنے ایمان کا اعلان صورت' سیرت' قول وفعل سے کرنا چاہیے۔ تقیہ دھوکے کے لئے جرم ہے ضرورت خطرۂ جان کے وقت درست ہے۔

صوفیاء کا تقیہ: صوفیائے کرام کے نزدیک اسرار الہیہ کا اغیار سے چھپانا تصوف کا تقیہ ہے اور یہ اہم واجبات میں سے ہے اسی لئے یہ حضرات اسرار ایسی عبارت میں بیان کر جاتے ہیں جو عام کی سمجھ سے باہر ہو۔ بعض ظاہرین علماء ان کی ظاہری عبارت پر فتویٰ کفر دے دیتے ہیں۔ حضرت محی الدین ابن عربی بایزید بسطامی کی پیچیدہ عبارتیں اسی تقیہ کی مثالیں ہیں۔ اسی لئے فقہائے کرام صوفیاء کے علم کو علم باطن کہتے ہیں یعنی عام سے چھپا ہوا۔ حضرت امام شعرانی نے اپنی کتاب در

منثورہ فی بیان علوم مشہورہ میں فرمایا کہ بندہ میں جس قدر ادب زیادہ اسی قدر اس کا کلام باریک (روح المعانی)

روافض کا تقیہ: روافض کے نزدیک تقیہ کی نوعیت ہی اور ہے اور اس کے احکام کچھ اور۔ ان کے ہاں ضرورتاً اور بلا ضرورت ہر قسم کا تقیہ دینی اور دنیوی جائز ہی نہیں بلکہ عبادت ہے اور سنی کو دھوکہ دینا ثواب ان کے یہاں مشہور روایت ہے کہ جس نے دھوکہ کی غرض سے سنی کے پیچھے نماز پڑھ لی گویا اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔ جھوٹ بولنا' اپنا دین بدلنا' حتیٰ کہ اپنی بیٹی کفار کے نکاح میں دے دینا سب تقیہ ہی کی قسمیں ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت مولیٰ علی کا تینوں خلفاء کے ہاتھ پر بیعت کرنا' ان کے پیچھے نمازیں پڑھنا' اور منبر پر ان کی تعریفیں کرنا' بلکہ اپنی بیٹی ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر فاروق سے کر دینا سب تقیہ تھا۔ ان اللہ کے بندوں نے یہ غور نہ کیا کہ تقیہ کا مادہ وقی ہے بمعنی بچانا یا بچنا۔ بچانا بچنا مصیبت کے موقعہ پر ہی ہوتا ہے نہ کہ ہر وقت ان کا تقیہ اپنے معنی کے بھی خلاف ہے تقیہ اس طرح جائز ہے جیسے بحالت اضطرار مردار کھانا جائز اور جو ہر وقت مردار خوری جائز کہے وہ پورا احمق ہے۔ ایسے ہی تقیہ صرف ضرورت کے وقت درست ہے نہ کہ ہر حال میں۔ کفر بکنا گویا روحانی مردار ہے جو صرف ضرورتاً درست۔ ان کی دلیل یہ ہی آیت ہے اور بیہقی ابن ابی الدنیا اور طبرانی ابن عدی و ابن عساکر وغیرہ کی احادیث۔ چنانچہ ابن عساکر میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ مَنْ عَاشَ مُدَارِيًا مَاتَ شَهِيدًا۔ جو تقیہ کرتا مراوہ شہید مرا۔ نیز بخاری میں ہے کہ حضرت ابو درداء فرماتے ہیں کہ ہم بعض لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے ہیں حالانکہ ہمارے دل ان پر لعنت کرتے ہیں۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضری کی اجازت چاہی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ برا آدمی ہے پھر اسے بلا لیا اور اس سے نرم کلام فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ نے اولاً تو اسے برا فرمایا اور پھر اسکے سامنے نرم کلام فرمایا۔ جواب دیا کہ اے عائشہ بدتر شخص وہ ہے کہ جس کے فتنہ سے بچنے کیلئے لوگ اسے چھوڑیں وغیرہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی وفتنہ انگیز۔ یہ روافض کے انتہائی دلائل ہیں مگر یہ سب محض مکڑی کا جالا ہیں۔ اگر تقیہ کی یہ حقیقت ہوتی تو انبیائے کرام خصوصاً سید الانبیاء ﷺ کو کفار کے ہاتھوں تکلیف برداشت کرنے اور ہجرت کی ضرورت پیش نہ آتی اور کربلا کا ایسا دردناک واقعہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نہ گزرتا۔ یہ سب حضرات تقیہ کر لیا کرتے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَاۤ اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ (مائدہ:۶۷) اے نبی ﷺ رب کی طرف سے اترے ہوئے احکام سب کو خوب پہنچاؤ۔ نیز فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ يَخْشَوْنَهٗ وَ لَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ۔ (احزاب:۳۹) جو لوگ اللہ کے احکام لوگوں تک خوب پہنچاتے ہیں اور صرف خدا سے ڈرتے ہیں اسکے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ ان آیتوں میں مخلوق تک احکام الٰہی پہنچانے اور ان سے نہ ڈرنے کا حکم دیا گیا نہ کہ تقیہ کا۔ اس قسم کی آیتیں اور احادیث شمار سے باہر ہیں مگر شیعہ مذہب کی بنا پر تقیہ درست ہو سکتا ہی نہیں۔ اسلئے کہ تقیہ میں خوف کی شرط ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا۔ اور خوف دو قسم کا ہے جان کا اور آبرو کا۔ اہل بیت کو جان کا خوف ہو سکتا ہی نہیں کیونکہ ان کے نزدیک امام کی موت خود اپنے قبضہ میں ہوتی ہے۔ جیسا کہ کلینی نے کافی میں لکھا' بلکہ اس کیلئے ایک باب باندھا۔ نیز امام کو ان کے نزدیک سارے غیوب کا علم ہوتا ہے۔ اپنی موت' موت کی نوعیت' اس کا وقت سب اس پر روشن ہے۔ اب جان کے خطرہ کے کیا معنی۔ اور سیدنا مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کو تینوں خلفاء سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رہا آبرو کا خطرہ وہ بھی ان کیلئے کوئی نہیں کیونکہ۔ راندی شارح نہج البلاغت نے سلمان فارسی سے

حکایت: کی کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ کے کسی باغ میں ملے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ فرمایا اے عمر مجھے خبر ملی ہے کہ تم میرے ساتھیوں کو برا کہتے ہو۔ یہ کہہ کر آپ نے کمان زمین پر ڈال دی۔ وہ کمان بڑا اژدہا بن کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نگلنے کو دوڑا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ اے علی خدا کے لئے مجھے بچالو۔ اب میں تمہاری مخالفت کبھی نہ کروں گا۔ جب بہت خوشامد کی تب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے پکڑا پھر وہ کمان بن گئی۔ سلمان فارسی کہتے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اس کا بہت خوف طاری ہوگیا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کے اے سلمان اس کمان کا خوف عمر کو مرتے وقت تک رہے گا۔ اس روایت کی بنا پر جناب امیر کو عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے خوف کے کیا معنیٰ؟ اور اگر خوف ہوتا بھی تو تبلیغ دین میں مشقت وایذا اٹھانا اور اس پر صبر کرنا طریقہ انبیاء ہے۔ اہل بیت عظام کو اس کی اقتداء چاہیے تھی۔ نیز جناب مولیٰ علی کا چھ ماہ تک حضرت صدیق کی بیعت نہ کرنا پھر کر لینا۔ اس تقیہ کی جڑ کاٹ دیتا ہے اگر تقیہ ہی کرنا تھا تو آپ پہلے دن بیعت کر لیتے۔

غرضکہ روافض کا تقیہ جھوٹ، منافقت، اور دغابازی کا مجموعہ ہے۔ معاذ اللہ۔ پہلا تقیہ ابلیس نے کیا کہ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ۔ (اعراف:۲۱) قسم کھا کر بولا کہ اے آدم وحوا میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ نیز واقعہ کربلا میں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقیہ نہ کیا بلکہ عبداللہ ابن زیاد نے کیا کہ وہ امام حسین کے لباس میں کوفہ آیا۔ قرآن کریم اور انبیائے کرام اور اہل بیت اطہار اس سے بالکل پاک وصاف ہیں۔ یہاں اور ان احادیث میں مدارات وغیرہ کے وہ ہی معنی ہیں جو ہم نے عرض کئے کہ سخت مجبوری کی حالت میں خطرہ جان کے وقت کفار سے ظاہری رواداری برت لینا، بلکہ اشد ضرورت پر منہ سے کفر نکال لینا۔ بشرطیکہ دل میں ایمان رہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ۔ (نحل ۱۰۶) ضروریات عبادات نہیں بن جائیں بلکہ ضرورت پوری کرنے کو ان کی اجازت ہو جاتی ہے۔ ضرورت پر شرعی تقیہ کا جواز ایسا ہی ہے جیسے جان پر بن جانے کے وقت مردار یا حرام جانور کی حلت

چوں علی شیر ست وحق را شیر نر — ظلم نتوان کرد بر شیر اے پسر

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی کرنا منع ہے، جیسا کہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ نے بتایا تو چاہیے کہ مسلمانوں کے ساتھ کفار سے دوستی جائز ہو اس طرح کہ کفار سے بھی دوستی رکھے اور مسلمانوں سے بھی؟

جواب: اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ قید اتفاقی ہے نہ کہ احترازی جن کے حق میں یہ آیت آئی۔ ان کا عمل یا ارادہ ایسا ہی تھا اس لئے یہ قید لگا دی گئی۔ جیسے قرآن کریم فرماتا ہے۔ لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۔ (آل عمران: ۱۳۰) کہ تم دگنا تگنا سود نہ کھاؤ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوایا ڈیوڑھا کھا لیا کرو، دوسرا یہ کہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ کافرین کی صفت ہے یعنی وہ کفار جو مسلمانوں کے ہر طرح غیر ہیں تم ان سے دوستی مت رکھو۔ تیسرا یہ کہ دوسری آیتوں میں

یہ قید نہیں ہے وہاں مطلقاً ممانعت ہے۔ وہ آیتیں اس کا بیان ہیں۔ چوتھا یہ کہ دُوْنَ بمعنی مقابل یا علیحدگی ہو یعنی مسلمانوں کے مقابلہ میں کافروں کو دوست نہ بناؤ کہ کفار کی مدد لے کر مسلمانوں کو تباہ کرو۔ دُوْنَ بمعنی مقابل علیحدہ ہی آتا ہے۔ تب تو یہ آیت بالکل واضح ہے۔ **دوسرا اعتراض:** بھلا مسلمانوں کے خدا کی طرفداری تو دیکھو کہ جو دین اسلام میں نہ ہوں' انہیں کافر کہہ دیا۔ غیر مذہب کے نیک کاروں میں سے بھی رفاقت نہ رکھنا اور بڑے مسلمانوں سے رفاقت کی تعلیم دینا خدا کے لائق نہیں۔ قرآن کا خدا اور مسلمان تعصب سے پر ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی نے اس میں دو اعتراض کئے۔ ایک غیر مسلموں کو کافر کہنا دوسرا کفار سے الگ رہنے کا حکم کہ یہ تعصب ہے۔ پنڈت جی کیا کافر کوئی گالی ہے۔ کافر کے معنی ہیں منکر اور چھپانے والا۔ کفر بمعنی انکار آتا ہے مولانا خسرو صاحب فرماتے ہیں۔ کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست۔ یعنی میں عشق کا چھپانے والا ہوں مجھے اظہار کی ضرورت نہیں۔ پنڈت جی کیا تم قرآن اور اسلامی قوانین کے منکر نہیں ہو اگر ہو تو اس لفظ سے چڑتے کیوں ہو اگر تمہیں یہ لفظ برا لگتا ہے تو اسلام کو مان لو۔ تمہیں کافر کوئی نہ کہے گا۔ تم نے کافر کا اتنا برا منایا۔ اپنی گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم نے اپنے غیر مذہبوں کو کیا کیا خطاب دیئے ہیں۔ مسلمانوں کو کہتے ہو ملکش یعنی گندے کسی کا نام رکھا اچھوت یعنی گھنونے آریہ بنانے کو کہتے ہو۔ شدھی کرنا یعنی پاک کرنا' دیگر قوموں کو کتوں سے بھی زیادہ گندا جانتے ہو کسی کو دام مارگی کہتے ہو۔ یعنی مکار۔ دغا باز' ذرا اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش کا دوسرا حصہ اور گیارھواں باب پڑھو۔ نیز مسلمانوں پر تعصب کا الزام غلط ہے۔ تعصب کے معنی ہیں قومی پچھ۔ یہ لفظ عصبہ سے بنا بمعنی برادری و کنبہ۔ جس قدر مسلمان فراخ دل واقعہ ہوا ہے۔ کوئی قوم ایسی نہیں۔ مسلمان ملک، قوم، قبیلہ کے قیدوں سے آزاد ہے۔ ہر ملک اور قوم کا مسلمان اس کا بھائی ہے۔ نہ کسی انسان کو گندہ سمجھتا ہے نہ کسی سے بلاوجہ لڑتا ہے۔ مسلمان نے صدہا سال ہندوستان میں تم کو پالا۔ اب بھی تمہاری تجارتیں وغیرہ مسلمانوں کے دم سے چل رہی ہیں مگر تمہارے تعصب کا یہ حال ہے کہ مسلمان کی صورت و نام سے بیزار ہو۔ رہا کفار سے الگ رہنے کا حکم یہ بالکل صحیح ہے دولت مند کو چاہیے کہ چور سے الگ رہے۔ کفر اڑ کر لگنے والی بیماری ہے۔ تندرستوں کو اس سے دور رہنا بہتر ہے۔ کفر کا زہر سانپ کے زہر سے بدتر ہے۔

تفسیر صوفیانہ

حقیقی محبت و ولایت اپنے ہم جنس سے ہو سکتی ہے۔ غیر جنس سے محبت ذاتی نہیں بلکہ مصنوعی ہے۔ جس کا ترجمہ ریا کاری یا نفاق ہے۔ چونکہ کفار مسلمانوں کے ہم جنس نہیں' ان میں روحانی اختلاف ہے۔ لہٰذا ان سے محبت مصنوعی ہوگی۔ اور چونکہ اسلام ریا کاری اور نفاق کی جڑ کاٹتا ہے۔ اس لئے اس نے اس محبت سے منع کیا جو کوئی ایسا کرے گا وہ خدا کے نور سے دور رہے گا' کیونکہ کفر غبار اور تاریکی ہے۔ اس کا نور سے اجتماع کیسا مگر چونکہ مسلمان دو قسم کے ہیں ایک ضعیف الیقین دوسرا کامل الیقین۔ کامل الیقین مومنین کی نگاہ اس آیت پر رہتی ہے۔ وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ۔ (انعام: ۱۷) وہ کسی سے خوف نہیں کرتے۔ اس لئے وہ اس استثنا کے تحت میں آتے ہی نہیں۔ تمام دنیا ان سے ڈرتی ہے مگر وہ کس سے ڈریں مگر ضعیف الیقین لوگ جن پر ظاہری خوف طاری ہو جاتا ہے انہیں ظاہری تعلق کی اجازت دی گئی۔ اس لئے آگے فرمایا گیا۔ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ کہ اللہ تمہیں اپنی توحید عیانی کی طرف بلاتا ہے تاکہ تمہیں وہاں پہنچ کر غیر کا بالکل خوف نہ رہے۔

صرف رب تعالیٰ کا خوف ہو۔ چونکہ سب کا انجام اس توحید پر ہی ہوگا۔ لہٰذا تم اس سے خوف کرو (ابن عربی)

دوسری تفسیر

روح اور اس کے معاملات مومنین ہیں۔ نفس اور اس کے معاملات کفار۔ روح کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تو نفس اور اس کے نظرات کو اپنا دوست نہ سمجھ۔ یہ اگر بظاہر کبھی تیری دوستی کا دم بھرے مگر حقیقت میں یہ تیرا سخت دشمن ہے۔ اگر تو نے ان سے محبت کی تو یار سے آڑ میں رہے گی۔ ہاں جب کبھی اس کی بربادی کا اندیشہ ہو تو اس کی ظاہری پرورش کرتا کہ وہ فنا نہ ہو جائے بلکہ تیرا خادم بن کر تیری امداد کرے اور تیری سواری کا کام دے۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ محبت چار قسم کی ہے۔ جسمانی' نفسانی' شیطانی' رحمانی۔ اولاد وغیرہ سے محبت جسمانی ہے خونی رشتہ کی وجہ سے۔ مال و دولت سے محبت نفسانی ہے۔ کفار و کفر سے محبت شیطانی ہے۔ اللہ کے پیاروں سے محبت رحمانی ہے۔ پہلی دو محبتیں فانی ہیں کہ نفس کو فنا ہے تو اس کی محبت کو بھی فنا ہے۔ تیسری یعنی شیطانی محبت عداوت میں تبدیل ہو جائے گی۔ چوتھی یعنی رحمانی محبت کو بقاء ہے۔ رحمٰن باقی ہے تو رحمانی محبتیں بھی باقی ہیں۔ دنیا میں حضور انور ﷺ کو دیکھنے والے کفار ابو جہل وغیرہ قبر میں حضور انور ﷺ کو نہ پہچان سکے مگر نہ دیکھنے والے مسلمان پہچان لیتے ہیں' یہ ہی محبت رحمانی کا نتیجہ۔ جیسے صاف آئینہ ذرا میں دھندلا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی آئینہ دل گناہ اور محبت کفار سے دھندلا ہو جاتا ہے۔ اگر آئینہ دل ان گرد و غبار سے صاف رہے تو اس میں سارا عالم بلکہ خالق عالم بھی ہے۔ جیسے صاف شیشہ میں گھر اور گھر کا ساز و سامان...... بلکہ گھر والا نظر آتا ہے۔ شعر۔

الٰہی رنج و غم کافور کر دے یہ سینہ نور سے معمور کر دے
نبی کی کالی زلفوں کا تصدق سیاہی میرے دل کی دور کر دے

صوفیاء کے نزدیک چیزیں تین قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو زبان میں بھی ہیں دل میں بھی۔ جیسے اللہ کا ذکر یار کا چرچہ' بعض چیزیں وہ ہیں جو صرف دل میں آئیں زبان پر نہ آئیں۔ جیسے اسرار الٰہی کہ دل کے خزانے میں رہیں۔ زبان کے دروازے پر نہ آنے پائیں۔ شعر۔

بر دہانش قفل در دل رازہا
بند لبہا دل پر از آوازہا

بعض چیزیں وہ ہیں جو زبان پر رہیں دل میں نہ اتریں۔ جیسے دنیاوی باتیں وغیرہ جیسے بستی میں لوگوں کے مکان بھی ہوتے ہیں۔ اللہ کا گھر یعنی مسجد بھی۔ مسجد تمام گناہوں سے پاک و صاف رکھی جاتی ہے۔ ایسے ہی جسم مومن ایک بستی ہے جس کے تمام اعضاء سے دنیاوی کام کیے جائیں' مگر دل وہ مسجد ہے جس میں رب کے سوا کچھ نہ رہنا چاہیے۔ مشائخ کی بیعت اس لئے کرتے ہیں کہ دل کی صفائی میسر ہو۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ

جس دن پائے گا ہر نفس وہ جو کیا اس نے بھلائی سے موجود اور وہ جو کیا اس نے
جس دن ہر جان نے جو بھلا کیا حاضر پائے گی اور جو برا کام کیا
مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ
برائی سے تمنا کرے گا کہ کاش درمیان اس کے اور درمیان اس کے فاصلہ ہوتا دور کا اور ڈراتا ہے تم کو
امید کرے گی کاش مجھ میں اور اس میں دور کا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمہیں
اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾
اللہ ذات سے اپنی اور اللہ مہربان ہے ساتھ بندوں کے
اپنے عذاب سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو کفار و کفر سے الگ رہنے کا حکم دیا تھا۔ اب اس کی سزا بیان فرمائی جارہی ہے کہ تم دنیا میں ان کے ساتھ رہے تو آخرت میں بھی ان ہی کے ساتھ اٹھو گے اور وہاں ان کی ہمراہی بہت تکلیف دہ ہوگی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں کفار سے دلی محبت کی ممانعت کی گئی تھی اور ظاہری برتاؤ کی اجازت دی گئی۔ گویا ناجائز اور جائز فعل کا ذکر تھا۔ اب رغبت اور خوف کی آیت ارشاد فرمائی گئی۔ گویا یہ گزشتہ مضامین کا تتمہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم کو اللہ اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔ اب عذاب کے دن کا ذکر فرمایا جارہا ہے اور عذاب کی تفصیل ارشاد ہورہی ہے کہ وہ قیامت کا دن ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و علم کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں بندوں کی مجبوری ان کے عجز و نیاز کا ذکر ہے۔ خوف و عجز کا ظہور قیامت میں ہوگا۔ عبدیت کا اقرار رب کی قدرت اپنی عجز و نیاز معلوم کرکے ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک رکن ایمان کا ذکر پہلے ہوا۔ دوسرے رکن کا ذکر اب ہورہا ہے۔

تفسیر

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ. یوم یا تو مصیر کا ظرف ہے یا یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ کا یا قدیر کا یا تَوَدُّ کا یا اُذْكُرْ فعل پوشیدہ کا۔ اذکر میں خطاب یا نبی کریم ﷺ سے ہے یا ہر قرآن پڑھنے والے سے یعنی اے محبوب آپ ہمارے بندوں کو وہ دن یاد دلا دو اور آپ ﷺ کے جانشین علماء تا قیامت مسلمانوں کو یاد دلاتے رہیں۔ جو عالم یہ دن یاد نہ دلائے اس نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی۔ اے مسلمان وہ دن یاد کرتا رہ۔ یا وہ دن یاد رکھ۔ اسی لئے اس کے معنی سات آٹھ ہو سکتے ہیں۔ تَجِدُ وجدان سے بنا بمعنی پانا۔ كُلُّ نَفْسٍ سے ہر مکلف کی ذات مراد ہے۔ یعنی عاقل بالغ انسان اور جنات' کیونکہ جانوروں اور بچوں' پاگلوں کا نہ حساب کتاب ہے نہ انہیں سزا و جزا۔ مَا سے مراد سارے تکلیفی احکام ہیں۔ غیر اختیاری افعال

اس سے خارج ہیں جیسے رعشہ کی حرکت یا سانس وغیرہ کیونکہ ان پر سزا و جزا نہیں۔ عَمِلَتْ سے سارے قلبی و ظاہری اعضاء کے کام مراد ہیں۔ اس لئے کہ دلی ارادوں پر بھی سزا جزا ہے۔ یعنی تمہیں خدا کی طرف اس دن لوٹنا پڑے گا یا خدا اس دن سے تمہیں ڈراتا ہے۔ یا ہر نفس اس دن آرزو کرے گا۔ یا اللہ کی قدرت اس دن ظاہر ہوگی یا اس دن کو یاد رکھو جس دن ہر جان اپنے سارے اعمال پائے گی۔ اس دن سے مراد یا تو موت کا دن ہے کہ مرتے وقت ہی مرنے والے کو اپنے اعمال یاد آجاتے ہیں یا قبر میں جانے کا دن' یا قیامت کا دن تیسرا معنی زیادہ قوی ہے کہ اصل سزا اور جزا کا دن وہ ہی ہے۔ خیال رہے کہ بعض کے نزدیک یہاں ما سے پہلے جزا یا کتاب پوشیدہ ہے۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنا نامۂ اعمال یا اعمال کی سزا جزا ہر نفس پائے گا۔ رب تعالیٰ فرمائے گا اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ (الاسراء: ۱۴) اپنی کتاب خود پڑھ لے آج تو ہی اپنا کافی محاسب ہے یا خود اعمال کو مختلف شکلوں میں موجود دیکھے گا۔ نیک اعمال کی اچھی شکلیں' برے اعمال کی شکلیں بری۔ سانپ' بچھو وغیرہ' بلکہ نیک و بد اعمال کا اثر خود عامل کے شکل و صورت پر نمودار ہوگا۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (آل عمران: ۱۰۶)۔ مگر بہتر یہ ہے کہ کچھ پوشیدہ نہ کیا جائے۔ اور آیت کا یہ ہی مطلب لیا جائے کہ بعینہ اپنے اعمال کو پائے گا۔ جیسا کہ ہم انشاء اللہ آئندہ عرض کریں گے۔ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ۔ مِنْ بیانیہ ہے۔ مَا کا بیان خبر سے ہر جائز کام یا نیکی مراد ہے اگرچہ معمولی ہی ہو۔ مُحْضَرًا یحضر کا دوسرا مفعول ہے۔ اس کے معنی ہیں حاضر کیا ہوا' یعنی فرشتے یا رب تعالیٰ اسے حاضر فرمائے گا۔ خواہ نامۂ اعمال کے ذریعہ یا بلاواسطہ مُحْضَرًا کے بعد عِنْدَهَا پوشیدہ ہے اور وَمَا عَمِلَتْ پہلے مَا پر معطوف ہے۔ تَجِدُ کا مفعول مِنْ سُوْٓءٍ کا بیان ہے۔ اصل عبارت یوں تھی۔ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ مُّحْضَرًا۔ چونکہ بھلائی مقصود بالذات ہے اور گناہ مقصود تبعاً نیز نیکی رحمت رب کی مظہر ہے اور گناہ قہر کا مظہر نیز رحمت قہر پر غالب ہے۔ اس لئے خیر کا ذکر پہلے کیا اور گناہ کا بعد میں۔ نیز چونکہ اگلے مضمون کا تعلق صرف گناہوں سے ہے۔ اس لئے یہاں علیحدہ مَا عَمِلَتْ فرمایا گیا۔ ورنہ پہلا ہی فعل کافی تھا۔ یعنی جو کچھ بھلائی یا برائی کی ہے۔ اسے اپنے پاس حاضر پائے گا۔ پھر یہ حال ہوگا کہ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا..... تَوَدُّ وُدٌّ سے بنا بمعنی چاہنا اور خواہش کرنا۔ اس کا فاعل گنہگار نفس ہے نہ کہ ہر نفس کیونکہ یہ تمنا گنہگار ہی کریں گے۔ لَوْ اَنَّ الخ تَوَدُّ کا مفعول ہے۔ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗ ان کی خبر اور اَمَدًا بَعِيْدًا اس کا اسم۔ بَيْنَهَا کا مرجع نفس اور بَيْنَهٗ کا مرجع یا دن ہے یا اس کے برے اعمال۔ اَمَدًا بمعنی فاصلہ آتا ہے۔ بعید بمعنی دراز امد اور ابد میں یہ فرق ہے کہ ابد غیر محدود وقت کو کہا جاتا ہے۔ اور امد وہ مدت ہے جس کی حد ہو مگر معلوم نہ ہو۔ بعض کے نزدیک یہاں امد سے مراد عمر بھر کا فاصلہ ہے۔ بعض کے نزدیک مشرق و مغرب کی دوری۔ جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ۔ (زخرف: ۳۸) گویا وہ آیت اس جملہ کی تفسیر ہے۔ یعنی اس دن گنہگار نفس آرزو کرے گا کہ کاش مجھ میں اور اس قیامت میں یا مجھ میں اور میرے نامۂ اعمال یا سزا اعمال میں بہت فاصلہ ہوتا۔ یعنی یہ چیزیں میرے پاس نہ ہوتیں۔ قبر کے امتحان میں پاس ہوتے ہی بندہ قیامت قائم ہونے کی تمنا کرتا ہے کہ جلد قیامت قائم ہو۔ اور میری کامیابی پر لوگ مطلع ہوں۔ اور وہاں فیل ہو جانے والا تمنا کرتا ہے کہ قیامت کبھی نہ آئے تاکہ میرا حال کسی پر ظاہر نہ ہو۔ قیامت کے دن میں یہ دونوں تمنائیں بھی موجود ہوں گی اور دونوں قسم کے لوگ

بھی حاضر ہوں گے۔ نیز آج جیسے ہم سانپ شیر سے گھبراتے ہیں۔ ایسے ہی مجرم کل قیامت میں اپنے گناہوں سے گھبرائیں گے کہ بدعملیاں ان جانوروں بلکہ بعض ان سے بھی زیادہ ڈراؤنی شکل میں ہوں گی۔ مجرم ان سے بھاگے گا مگر وہ اعمال اس سے چمٹیں گے، چھوڑیں گے نہیں۔ اور ممکن ہے کہ اس تمنا کا تعلق دنیا سے ہو۔ یعنی وہ تمنا کرے گا کہ کاش میں گناہوں سے بہت دور رہا ہوتا۔ ان کے قریب بھی نہ گیا ہوتا۔ اس کی تفسیر وہ آیت کریمہ ہے۔ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا. (فرقان:۲۸) ہائے کاش کہ میں نے پہچانا ہوتا اس وقت کا پچھتانا بے کار ہے۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ...... اس کی مکمل تفسیر پچھلی آیت میں ہو چکی۔ پہلے یہ جملہ محبت کفار سے بچانے کے لئے ارشاد ہوا تھا۔ اور اب آخرت کی رغبت دینے اور برائیوں سے بچانے کے لئے ارشاد فرمایا گیا۔ یعنی اللہ تم کو اپنی ذات یا اپنی صفت قہاریت یا اپنے عذاب سے ڈراتا ہے۔ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ رءوف رافتہ سے بنا بمعنی انتہائی محبت وکرم۔ العباد سے یا سارے بندے مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ دنیا میں سب پر مہربان ہے۔ اسی لئے انہیں عذاب سے ڈرایا اور نیک اعمال کا موقعہ دیا۔ اور اپنے قہر وعذاب کی انہیں خبر دی۔ جیسے مہربان باپ اپنی محبوب اولاد کو تکلیف دہ چیزوں سے خبردار کر دے۔ اور یا عباد سے نیک بندے مراد ہیں۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ قرآن میں عباد نیک بندوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا۔ (الفرقان:۶۳) اور فرماتا ہے عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ. (الدھر:۶) فرماتا ہے۔ قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا۔ الخ (الزمر:۵۳) تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آخرت میں اللہ خاص ان بندوں پر مہربان ہوگا جو حق عبودیت ادا کر کے حاضر ہوں۔ غرضکہ اس آیت کریمہ میں نشتر بھی ہے مرہم بھی۔ رب تعالیٰ کی جباریت وقہاریت کا خیال کر کے ڈرو اور اس کی رحمت پر دھیان کر کے امید رکھو۔ اس خوف وامید ہی کی بنیادوں پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے لوگو اس قیامت کے دن پر ہر وقت دھیان رکھو۔ جس دن ہر شخص اپنے بھلے برے سارے کام اپنے سامنے موجود پائے گا کہ اس کی نیکیاں اچھی شکل میں اس کے ساتھ ہوں گی اور برائیاں بری صورت میں نظر آئیں گی (حدیث شریف) دنیا میں بعض برائیاں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور بعض بھلائیاں بری مگر وہاں چیز اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوگی کہ بے زکوٰتی مال گنجے سانپ کی شکل میں اور روزے نماز حسین صورتوں میں نظر آئیں گے۔ تب ہر بدکار آرزو کرے گا کہ کاش میں قیامت میں حاضر نہ ہوتا اور اس دن سے دور رہتا۔ یا کاش یہ ڈراؤنی صورتیں مجھ سے دور ہٹ جاتیں۔ یا کاش میں دنیا میں گناہوں سے دور بھاگا ہوتا مگر اس وقت کا پچھتانا کچھ کام نہ دے گا۔ ابھی موقعہ ہے کچھ خیر کما لو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بار بار اپنے قہر وغضب سے ڈراتا ہے اور وہ بندوں پر نہایت ہی مہربان ہے۔ اسی لئے وہ نیکیوں کی رغبت اور گناہوں سے خوف دیتا ہے ورنہ کسی کی نیکی سے اسے کچھ فائدہ نہیں اور کسی کی برائی سے اس کا کچھ نقصان نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے پہلا فائدہ: قیامت کے دن ہر شخص پر اس کے سارے اعمال ضرور پیش ہوں

گے۔ اگرچہ پھر بعض کی بخشش ہو جائے۔ پانا اور چیز ہے اور سزا و جزا ملنا اور۔ **دوسرا فائدہ:** بعض کے خیال میں صرف وہ ہی عمل پیش ہوں گے جن پر سزا جزا ملنے والی ہو۔ معاف شدہ گناہ کا وہاں ذکر بھی نہ ہوگا۔ بلکہ مسلمان کے بعض بخشے ہوئے گناہ نیکی کی شکل میں نمودار ہوں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ۔ (الفرقان: ۷۰) خلاصہ اختلاف یہ ہوا کہ بعض کے نزدیک دکھا کر معافی ہوگی اور بعض کے نزدیک پہلے ہی۔ لہٰذا آیات مغفرت اور اس آیت میں کوئی مخالفت نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** قیامت میں ہر شخص کی نظری طاقت بڑھی ہوئی ہوگی کہ اپنے اعمال و عقائد کو جو کئے تھے وہ دیکھ لے گا۔ **چوتھا فائدہ:** قیامت کا دن پردہ اٹھنے کا دن ہوگا کہ ہر چیز اپنی اصلی حالت میں نظر آئے گی۔ مسلمانوں کو اپنے کافر قرابت داروں سے سخت نفرت ہوگی کیونکہ وہ نہایت بدشکل اور بدصورت نمودار ہوں گے۔ **پانچواں فائدہ:** آیات عذاب بھی خدا کی رحمت ہیں کہ ان کے ذریعہ دل میں خوف پیدا ہوتا ہے جو عبادات کی اصل ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے اعمال ہر شخص پر پیش ہوں گے اور دوسری آیتوں سے پتہ لگتا ہے کہ بعضے گناہ مٹا بھی دیئے جائیں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (ہود: ۱۱۴)۔ اور بعض نیکیاں ضبط کی جاتی ہیں۔ فرماتا ہے۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (مائدہ: ۵۳) ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ مَا عَمِلَتْ سے باقی اعمال مراد ہیں نہ کہ برباد شدہ۔ دوسرا یہ کہ یہاں پیشی کا ذکر ہے اور ان آیتوں میں سزا جزا کا یعنی ہر عمل ہر شخص کو دکھایا ضرور جائے گا۔ خواہ اسے جزا ملے یا نہ ملے۔ مثلاً بعض گنہگاروں سے کہا جائے گا کہ کیا تم نے یہ گناہ کئے تھے۔ عرض کریں گے۔ ہاں مولیٰ قصور ہوا۔ یہ ہوئی پیشی۔ پھر ارشاد ہوگا' جاؤ معاف کر دیا۔ یہ ہوئی مغفرت لہٰذا آیتوں میں کوئی مخالفت نہیں۔ اس کی تفسیر وہ آیت ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (الزلزال: ۸) اعمال کا دکھانا مراد ہے۔ ان پر سزا جزا دینا کچھ اور دکھلانا سب کے لئے سزا جزا بعض کے لئے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نفس کے ہر عمل پیش ہوں گے تو کیا کافروں کے صدقات و خیرات بھی انہیں دکھائے جائیں گے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا کوئی عمل نیکی ہی نہیں کیونکہ نیکی کی شرط ایمان ہے جس کے بغیر ساری نیکیاں بے کار لہٰذا انہیں جو بھی دکھایا جائے گا وہ بدی ہی ہوگی دوسرا یہ کہ ہاں ضرور دکھائی جائے گی مگر یہ کہہ کر اگر تم ایمان کے ساتھ یہ کام کرتے جزا پاتے مگر چونکہ بغیر ایمان تم نے یہ نیکیاں کیں۔ لہٰذا برباد گئیں۔ غرضکہ کفار کے لئے اپنی نیکیاں دیکھنا باعث ملال ہوگا اور مغفور گنہگار کے لئے گناہ دیکھنا باعث خوشی۔ حدیث شریف میں ہے کہ پاس شدہ مومن کو قبر میں پہلے اس کا دوزخ والا ٹھکانا دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر آج تو پاس نہ ہوتا تو تیرا ٹھکانہ یہ تھا۔ اللہ نے تجھ پر کرم فرمایا کہ تو پاس ہو گیا۔ اب تیرا ٹھکانہ یہ ہے۔ پھر جنتی جگہ دکھاتے ہیں تاکہ اس کی خوشی دوبالا ہو جائے۔ قبر میں فیل ہو جانے والے سے معاملہ برعکس ہوتا ہے کہ پہلے اسے جنتی ٹھکانہ دکھاتے ہیں کہ اگر تو پاس ہو جاتا تو تیرا ٹھکانہ یہ ہوتا۔ اب چونکہ تو فیل ہو گیا۔ دیکھ اب تیرا ٹھکانہ یہ ہے تاکہ اسے غم پر غم ہوں۔ ایسے ہی قیامت میں مومنوں کو ان کے گناہ دکھا کر معافی دی جائے گی اور کفار کو ان کے نیک اعمال دکھا کر ضبطی کا اعلان ہوگا تاکہ مومن کو خوشی پر خوشی ہو۔ کافر کو غم پر غم۔ یہاں تک کہ حدیث

شریف میں آتا ہے کہ جب بعض مغفور گنہگاروں کو بعوض گناہ نیکیاں عطا ہوں گی تو وہ باقی گناہ تلاش کریں گے کیونکہ وہ دیکھیں گے کہ یہاں تو خطا پر عطا ہو رہی ہے۔

دیکھا جب شافع محشر کو طرف داروں میں ۔۔۔ بے گناہ کہنے لگے ہم ہیں گنہگاروں میں

غرضکہ بخشا ہوا گناہ نامقبول نیکی سے افضل ہے۔

تیسرا اعتراض: اعمال عرض ہیں جن کا بقا نہیں پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ غیر باقی عرض بلا جوہر نظر آ جائیں یہ بات عقل میں نہیں آتی؟ **جواب:** اس عالم کے احکام یہاں سے جداگانہ ہیں۔ وہاں اعمال کو صورت دی جائے گی۔ اور یہ رب کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں۔ دنیا میں بھی اگلے واقعات جسمانی صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ بادشاہ مصر نے قحط سالی کو خشک بالیوں اور دبلی گایوں کی شکل میں اور ارزانی کو تر بالوں اور موٹی گایوں کی شکل میں دیکھا تھا۔ اب بھی سفیدی اور نورانیت کامیابی کی علامت ہے اور سیاہی و ظلمت ناکامی کی۔ جو کوئی دعائے استخارہ پڑھ کر سوئے اور کسی کام کے متعلق کامیابی یا ناکامی معلوم کرنا چاہے تو خواب میں نور کامیابی کی علامت ہے اور گدلا پانی ناکامی کی۔ جو رب سر کے میل کو جوں کی شکل اور چارپائی کے میل کو کھٹمل کی شکل بخش سکتا ہے برے بھلے اعمال کو صورت دے کر ان میں جان بھی ڈال سکتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

انسان جو کچھ کر سکتا ہے اس کے اعمال کا اثر اس کے نفس میں نقش ہو جاتا ہے اور بار بار کرنے پر وہ مضبوط ملکہ بن جاتا ہے۔ گویا نفس انسانی زمین کا لوح محفوظ یا آئینہ حقیقت نما ہے مگر چونکہ دنیا میں نفس وہمی خیالی چیزوں میں مشغول ہوتا ہے۔ اس لئے ان نقوش پر اس کی نظر نہیں پہنچتی۔ مرنے کے بعد چونکہ یہ کوئی مشغلہ نہ رہے گا۔ تب اسے وہ تمام نقوش و ہیئتیں نظر آئیں گی۔ بھلائیوں پر تو خوش ہوگا اور برائیوں پر سخت غمگین۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ۔ (مجادلہ:۶) تب گناہوں سے دور رہنے کی تمنا کرے گا۔ اسی کا یہاں ذکر ہے۔ مولینا فرماتے ہیں

ہر خیالے کو کند در دل وطن ۔۔۔ روز محشر صورتے خواہد شدن

سیرتے کاں در وجودت غالب است ۔۔۔ ہم بر آں تصویر حشرت واجب است

عاقل کو چاہیے کہ اپنے نفس کو برے اخلاق سے پاک وصاف رکھے اور روزانہ کے عمل پر غور بھی کر لیا کرے۔ ایک دن حضور علیہ السلام نے اپنے صحابہ کرام سے فرمایا کہ اے لوگو اپنی نیکیوں کی زیادتی اور گناہوں کی کمی پر فخر نہ کرو اور کسی کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کرو۔ جب تک کہ اس کے خاتمہ کا حال معلوم نہ ہو کیونکہ خاتمہ کا ہی اعتبار ہے۔ (ابن عربی وروح البیان)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ

فرماؤ کہ اگر ہو تم محبت کرتے اللہ سے پس پیروی کرو میری محبوب بنائے گا تم کو اللہ اور بخش دے گا واسطے تمہارے

اے محبوب تم فرما دو کہ لوگو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا

ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ

گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے فرمادو کہ اطاعت کرو اللہ اور پیغمبر کی
اور تمہارے گناہ بخشدے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے تم فرمادو کہ حکم مانو اللہ اور رسول کا
فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲
پس اگر منہ پھیریں وہ پس تحقیق اللہ نہیں پسند کرتا کافروں کو
پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ کو خوش نہیں آتے کافر

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں مسلمانوں کو کفار سے علیحدگی کا حکم دیا گیا اور ان سے محبت کی ممانعت کی گئی۔ اب محبوب ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ گویا پہلے پرہیز کا ذکر تھا اب علاج کا یا پہلے نہ کرنے والے کام بتائے گئے۔ اب کرنے والی چیز کا کام ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار کی محبت سے منع کیا گیا تھا۔ اب وہ بہترین چیز بتائی جا رہی ہے جس سے محبت کفار خود بخود دل سے نکل جائے۔ یعنی اطاعت مصطفیٰ ﷺ کیونکہ جب تک محبوب سے حجاب ہے تب تک غیر پر نظر ہے۔ جن آنکھوں نے قدم پاک مصطفیٰ ﷺ دیکھ لیا پھر کسی اور کو کیا دیکھیں۔ جس دل میں محبت خدا اور رسول ہو اس میں دوسری محبتوں کی جگہ ہی نہیں۔

تیرے قدموں میں جو ہیں غیر کا منہ کیا دیکھیں کون آنکھوں میں جچے دیکھ کے تلوا تیرا

گویا پہلے بڑی سخت چیز کا حکم دیا گیا کہ کفار سے محبت توڑ دو۔ ان سے رشتے قرابتیں کاٹ دو۔ یہ کام ہر شخص کے لئے آسان نہ تھا۔ اب وہ چیز بتائی جس سے یہ سب کچھ آسان ہو جائے۔ یعنی عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کیونکہ عشق ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ڈرا دھمکا کر دعوت ایمان دی گئی تھی۔ اب محبوبیت کا لالچ دے کر ان سب کو ایمان کی طرف بلایا جا رہا ہے کہ اگر تم اس رسول کی اطاعت کرو گے تو خدا تمہیں پیارا بنالے گا۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں رب کے غضب و قہر کا ذکر تھا۔ اب اس کی رحمت خاصہ کا تذکرہ ہے کہ کوئی سختی سے مانتا ہے اور کوئی نرمی سے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رؤف یعنی بہت مہربان ہے۔ اب ان بندوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جن پر اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ یعنی رحمت دینے والے رب کا ذکر پہلے ہوا اور رحمت لینے والے بندوں کا ذکر اب ہے۔ جو رحمت لینے کے لائق ہوں۔ یعنی حضور ﷺ کے مطیع و متبع۔ **چھٹا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ قیامت میں سب کے اعمال سامنے آجائیں گے۔ اب ارشاد ہے کہ اگر پردہ پوشی چاہتے ہو تو محبوب کی اتباع و پیروی کرو اس کی برکت سے تمہارے عیوب پر دنیا و آخرت میں دوسرے لوگ اطلاع نہ پائیں گے۔

شان نزول

ایک دفعہ نبی کریم ﷺ جماعت قریش پر گذرے جنہوں نے بت گاڑے ہوئے تھے اور انہیں آراستہ کر رہے تھے۔ اور ان کے سامنے سجدہ میں گرتے تھے تو فرمایا کہ اے گروہ قریش تم نے اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی مخالفت کی

قریش نے کہا کہ ہم ان بتوں کو اللہ کی محبت میں پوجتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اس سے قریب کر دیں۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر خازن و خزائن و کبیر وغیرہ)

(۲) حضور علیہ السلام نے کعب ابن اشرف یہودی اور اس کے تابعین کو دعوت ایمان دی وہ بولے کہ ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ ہمیں تمہاری پیروی کی کیا ضرورت۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (روح البیان)

(۳) نجران کے عیسائی الوہیت مسیح کے مسئلہ میں دلائل سے عاجز ہو گئے تو بولے کہ ہم عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفتیں اللہ کی محبت کے لئے ثابت کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ ہمیں وہ نصیب ہو تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر کبیر) اخیر روایتیں زیادہ قوی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ یہ سورہ مدنی ہے ہجرت کے بعد نبی علیہ السلام فتح مکہ سے پہلے تبلیغ کے لئے بیت اللہ شریف تشریف لے ہی نہیں گئے اور نہ وہاں کفار قریش سے اس گفتگو کا موقعہ ملا۔ صلح حدیبیہ میں حضور انور علیہ السلام مکہ معظمہ کی حدود میں تشریف لے گئے اندر نہ گئے۔ عمرہ قضا میں اگرچہ اندرون شہر داخلہ ہوا مگر اس دن کفار سے یہ گفتگو نہ ہوئی' یہ داخلہ عارضی تھا۔

تفسیر

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ۔ قُلْ میں حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ اور کُنْتُمْ میں یا مشرکین یا یہود یا عیسائیوں یا سارے انسانوں سے خطاب ہے۔ خیال رہے کہ قُلْ فرمانے میں صد ہا راز ہیں۔ کبھی قُلْ وہاں ارشاد ہوتا ہے جہاں وہ بات صرف حضور ہی کہہ سکتے ہوں۔ دوسروں کو کہنے کا حق نہ ہو۔ جیسے قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ (فصلت:۶) صرف حضور علیہ السلام ہی اپنے کو بشر فرما سکتے ہیں۔ ہم بشر کہہ کر پکاریں تو مجرم ہیں۔ جیسے انبیاء کرام نے اپنے کو ظالم یا ضال فرمایا اگر ہم انہیں یہ کہیں تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ اور کبھی دوسروں کے کہلوانے کے لئے بھی قل ارشاد ہوتا ہے۔ جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ یعنی لوگوں سے آپ کہو کہ اللہ ایک ہے۔ پھر لوگ آپ سے سن کر کہیں کہ اللہ ایک ہے۔ تو وہ مومن ہوں گے خود بخود توحید مان لینے کا نام ایمان نہیں توحید تو ابلیس بھی مانتا ہے۔ یہاں قُلْ پہلی قسم کا ہے کیونکہ حضور کے سوا کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میری ہی بات پر اتباع کرو۔ صرف مطابق شرع چیزوں میں اوروں کی اتباع ہو سکتی ہے مگر حضور علیہ السلام کے ہر عمل حکم کی اتباع ضروری ہے اگرچہ وہ حکم قرآن کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے ابو خزیمہ کی گواہی دو کے برابر فرما دی۔ نیز خدا تک پہنچنا صرف حضور علیہ السلام کی اتباع سے ہو گا۔ دوسرے کی اتباع خدا تک نہیں پہنچا سکتی۔ تُحِبُّوْنَ حبّ سے بنا بمعنی پسند کرنا اور نفس کا کسی اعلیٰ شیئی کی طرف مائل ہونا۔ حب دراصل قلب کے سیاہ دانہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ محبت کا تعلق قلب کے اس دانہ سے ہے۔ اس لئے اسے حبّ کہا جاتا ہے۔ تحبون سے یا محبت کرنا ہی مراد ہے یا ارادۂ محبت' لفظ اللہ کو مفعول بنا کر یہ بتایا کہ اگر تم خدا کے چاہنے والے اور اس کے طالب بننا اور اس کو اپنا محبوب کرنا چاہتے ہو تو فَاتَّبِعُوْنِیْ۔ یہ اتباع سے بنا جس کا مادہ تبع ہے بمعنی پیچھے۔ اتباع پیچھے چلنا۔ یعنی نہ تم میرے بھیا بن کر برابر ہونے کی جرأت کرو نہ باوا کہ آگے بڑھو بلکہ غلام بن کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اصطلاح میں کامل اطاعت اور خالص پیروی کو اتباع کہا جاتا ہے جس میں فنا کا ظہور ہو۔ اطاعت کے معنی ہیں فرمان پر عمل اتباع کے معنی ہیں کہ کسی کی اداؤں کی نقل کہ جو کچھ اسے کرتے دیکھا خود کرنے لگے وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے اتباع ناقص بھی ہوتی ہے کامل بھی۔ حضور علیہ السلام نے چار قسم کے کام کئے فرائض' واجبات' مستحبات' عادات۔ ان عادات کو سنن زوائد

کہتے ہیں۔ صرف فرائض اور واجبات میں اتباع ناقص اتباع ہے۔ ان چاروں اعمال شریف کی اتباع کامل اتباع ہے۔ جس قدر اتباع کامل ہوگی اسی قدر رب تعالیٰ کی محبوبیت اعلیٰ۔ غرضکہ اِتَّبِعُوْنِیْ اور یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ میں بڑی وسعت ہے۔ اگر تم نے ایک یہ کام کر لیا تو تمہیں دو عظیم الشان انعام ملیں گے۔ ایک یہ کہ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ الخ اس کم میں بھی وہ ہی احتمالات ہیں جو کُنْتُمْ میں تھے کہ اس میں کسی خاص جماعت سے خطاب ہو یا عام سے یعنی اب تک تو تم خدا کے طالب بننا چاہتے تھے۔ لیکن پھر اس کا برعکس ہوگا کہ رب تمہیں اپنا مطلوب محبوب کر لے گا اور دوسرا انعام یہ کہ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ يَغْفِرْ اور ذُنُوْبَ کی لغوی تحقیقات بار ہا ہو چکی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ ذُنُوْبَ سے سارے حق اللہ اور تمام چھوٹے بڑے گناہ مراد ہیں اور کم میں سب سے خطاب۔ لَكُمْ میں لام نفع کا ہے یا ملکیت کا یعنی اسکے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اگلے پچھلے چھوٹے بڑے کھلے چھپے گناہ معاف کر دے گا۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ۔ اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے مگر اسکی ان صفتوں کے مظہر غلامان مصطفیٰ علیہ السلام ہیں۔ دشمنانِ رسول پر صفت قہر کا ظہور ہوا کرے گا۔ اگر تم سے پوری اتباع نہ ہو سکے تو قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ۔ الخ بعض روایتوں میں ہے کہ جب پچھلی آیت اتری تو عبداللہ ابن ابی سلول منافقوں کا سردار بولا کہ دیکھو محمد مصطفیٰ علیہ السلام نے اپنی فرمانبرداری کو رب تعالیٰ کی اطاعت کی طرح بنا دیا۔ اور ہمیں اپنے ساتھ ایسی محبت کا حکم دیا جیسے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام سے کرتے ہیں۔ تب یہ آیت آئی (خازن) اور یہود بولے کہ محمد علیہ السلام خدا بننا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو خدا بنا لیں۔ جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو رب بنا لیا۔ تب یہ آیت اتری (مدارک) قُلْ میں بھی حضور علیہ السلام سے خطاب ہے اور اَطِيْعُوا میں سب لوگوں سے اللہ اور رسول دونوں کے لئے ایک ہی اَطِيْعُوا ارشاد ہوا کیونکہ رب تعالیٰ کی اطاعت نبی علیہ السلام کے ضمن میں ہے مگر چونکہ ان دونوں کی نوعیتوں میں فرق ہے کہ رب تعالیٰ کی اطاعت صرف احکام میں ہوگی۔ نہ کہ افعال میں۔ اور حضور علیہ السلام کی اطاعت ساری چیزوں میں۔ اس لئے بعض جگہ اَطِيْعُوا مکرر لایا گیا کہ فرمایا گیا۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ خیال رہے کہ اطاعت صرف احکام میں فرمانبرداری کرنے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس کا درجہ اتباع کے بعد ہے۔ اس لئے اس کا ذکر اتباع کے بعد ہوا (روح البیان) اور اتباع کے ساتھ محبوبیت کا ذکر ہوا۔ اور اطاعت کے لئے فرمایا گیا فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ تَوَلَّوْا کی لغوی تحقیق بار ہا ہو چکی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہ جمع مذکر غائب ماضی بھی ہو سکتا ہے اور جمع حاضر مضارع بھی پہلی صورت میں یہ رب کا فرمان ہوگا اور دوسری صورت میں نبی علیہ السلام کا یعنی اگر وہ لوگ اطاعت سے منہ موڑیں یا آپ فرما دو کہ اگر تم نے اطاعت سے منہ موڑا تو کافر ہو جاؤ گے اور خدا کے دشمن کیونکہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی علیہ السلام آپ ان لوگوں سے فرما دو جو آپ کے بغیر وسیلہ ہماری محبت کا دم بھرتے ہیں یا جو اپنے کو رب کا پیارا جان کر آپ سے بے نیاز ہونا چاہتے ہیں یا جو آپ کی اطاعت کے سوا دوسرے اسباب سے خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان سب کو اعلان عام کر دو کہ اے عیسائیو، یہودیو، ہندو، سند ھیو، عابد اور بت پرستو! اگر تم خدا سے محبت کرنا چاہتے ہو تو نہ مجھ سے مقابلہ کرو، نہ میری برابری کا دم بھرو۔ نہ مجھ سے آگے آگے چلو بلکہ غلام بن کر میرے پیچھے چلے آؤ۔ اپنے اقوال، افعال، اعمال، غرض

زندگی کے ہر شعبہ کو میری مثل بنادو اور مجھ میں فنا ہو جاؤ تو اب تم رب کے طالب بنا چاہتے ہو۔ پھر معاملہ برعکس ہو گا کہ رب تمہیں اپنا محبوب بنالے گا اور تم جو چاہو گے وہ کرے گا۔ اور پھر تمہیں یہ خطاب آئے گا۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

کیونکہ میں رب کا محبوب ہوں اور محبوب کے غلام بھی محبوب ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی تمہارے سارے گناہ معاف فرما دے گا کیونکہ اللہ بڑا غفار اور ارحم الراحمین ہے تم اپنے کو اس کی مغفرت اور رحمت کا اہل بناؤ۔ پھر لطف دیکھو اور یہ بھی اعلان کر دو کہ اے لوگو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اور فرائض و واجبات میں ان کی پیروی لازم جانو۔ اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو وہ کافر ہیں۔ اور اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا خواہ کچھ بھی کریں۔ رب کے دشمن ہی رہیں گے۔

خیال رہے: کہ یہ آیت بہت پر لطف ہے اس لئے کہ اطاعت تین قسم کی ہوتی ہے۔ اطاعت محبت کی جیسے والدین کی فرمانبرداری۔ اطاعت ڈر کی جیسے حاکم کا حکم ماننا۔ اطاعت لالچ کی جیسے نوکر کا اپنے آقا کی فرمانبرداری کرنا' حضور علیہ السلام سے صرف محبت کی اطاعت چاہیے۔ خوف و لالچ کی اطاعت تو منافقین بھی کرتے تھے۔ اسی لئے آیت کو محبت سے شروع فرمایا کہ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ تَخَافُوْنَ اللّٰهَ یَاتَطْمَعُوْنَ۔ نہ فرمایا۔ لالچ یا خوف کی اتباع عارضی ہوتی ہے کہ جب تک لالچ یا خوف ہے' اتباع ہے۔ یہ دونوں قسم اطاعت و اتباع بھی ختم مگر محبت کی اتباع دائمی' حضور ﷺ سے محبت کی اتباع چاہیے جس کے لئے زوال نہیں۔ دیکھو آج حضور ﷺ کی اتباع ہو رہی ہے' حالانکہ نہ کوئی دھمکی ہے نہ لالچ' انکم ٹیکس وصول کرنے کے لئے محکمے بنائے جاتے ہیں' جن پر لاکھوں روپیہ خرچ ہوتے ہیں پھر بھی بمشکل وصول ہوتا ہے مگر زکوٰۃ و قربانی و حج بغیر کسی محکمہ کے برابر ادا ہو رہے ہیں اور پھر محبت کی بھی تین قسمیں ہیں۔ محبت مع عظمت جیسے اپنے استاد یا والدین سے محبت اور محبت معہ برابری جیسے اپنے بھائی' بہن یا بیوی سے محبت اور محبت مع حقارت جیسے اپنے چھوٹے بچے سے محبت کہ اگرچہ اسے پیارا جانتے ہیں مگر اپنا چھوٹا سمجھتے ہوئے حضور ﷺ سے محبت انتہائی عظمت کے ساتھ چاہیے۔ اسی لئے محبت کے ساتھ اتباع اور اطاعت کا ذکر ہوا۔ غرضکہ اس کا پہلا جز یعنی تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ دوسرے جز فَاتَّبِعُوْنِیْ کی شرح کر رہا ہے اور دوسرا جز پہلے کی۔ نیز خیال رہے کہ محبت کے تین درجے ہیں۔ زبانی' جنانی یعنی دلی اور روحانی و ایمانی۔ حضور علیہ السلام سے محض زبانی محبت کافی نہیں۔ بلکہ روحانی دلی اور ایمانی چاہیے چنانچہ فرمایا کہ تم میں اس وقت تک کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کی اولاد ماں باپ بلکہ اس کی جان سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔ تفسیر روح البیان نے بحوالہ بخاری عبداللہ ابن ہشام سے روایت کی کہ ایک بار عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ آپ مجھے میری جان کے سوا باقی تمام چیزوں سے پیارے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اسے میں جان سے زیادہ عزیز نہ ہوں۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ رب کی قسم اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔ فرمایا الآن یا عمر اے عمر اب تمہارا ایمان کامل ہوا۔ نیز **خیال رہے** کہ کوئی کتنا ہی بڑا عابد ہو اور اس کے دل میں حضور علیہ السلام کی عظمت نہ ہو' وہ شیطان کی طرح رب سے دور ہے۔ وہ ہی ڈبے منزل مقصود تک پہنچتے ہیں جو انجن کے پیچھے لگ جائیں گے۔ آگے رہنے والے ڈبے سنٹ ہو کر وہاں ہی رہ جاتے ہیں۔ فَاتَّبِعُوْنِیْ میں یہ ہی

بتایا گیا۔ اتباع تبع سے بنا بمعنی پیچھے چلنا۔ اس طرح کہ اگلے کے قدم پر قدم رکھنا کہ راستہ کے غار و خار وغیرہ کا اگلا ذمہ دار ہوگا۔ یہ پچھلا تو صرف اس کے قدم پر قدم رکھے جیسے ریل کے ڈبے انجن کی اتباع کرتے ہیں کہ لائن کی صفائی سگنل وغیرہ انجن والے دیکھیں ڈبہ اور ڈبہ والے صرف انجن کے پیچھے پیچھے دوڑیں۔ یہاں اِتَّبِعُوْنِیْ فرما کر اس جانب اشارہ ہے کیا کہ میرے محبوب کی پیروی عقل کے ماتحت نہ کرو بلکہ عشق کے ماتحت کرو۔ عشق اندھا ہو کر محبوب کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ سب کی باتیں سوچ سمجھ کر مانو، حضور ﷺ کی باتیں حضور کا فعل ہے۔ بغیر سوچے سمجھے کرو جیسے بچہ ماں باپ کی نقل بے سوچے سمجھے کرتا ہے۔ یا بیمار طبیب کا نسخہ بے سوچے سمجھے لیتا ہے۔ اس اتباع پر مدار ایمان ہے یہاں چھوڑنا کمال ہے ع

عقل قربان کن بہ پیش مصطفیٰ

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضور سید عالم ﷺ حق تعالیٰ کے محبوب اعلیٰ ہیں کہ جب ان کے غلام رب کے محبوب ہیں تو جن کی بدولت غلاموں کو یہ شرف ملا۔ ان کی محبوبیت کا کیا پوچھنا۔ نیز حق تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو ان کی اطاعت کے ساتھ ملایا۔ **دوسرا فائدہ:** جو حضور ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرے اور ان کی سنت کا مخالف ہو وہ بشہادت قرآن جھوٹا ہے جیسا کہ فَاتَّبِعُوْنِیْ سے معلوم ہوا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

تَعْصِی الرَّسُوْلَ وَاَنْتَ تَظْهَرُ حُبَّهٗ　　هٰذَا لَعُمْرِیْ فِی الْفِعَالِ بَدِیْعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهٗ　　اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ یُّحِبُّ مُطِیْعٌ

عشق کا قانون اور محبت کا قاعدہ یہ ہے کہ عاشق کو محبوب کی ہر شئے پیاری ہو۔ اس کی سیرت، اس کی صورت بلکہ اس کے غلاموں، اس کے وطن اس کے ملک، اس کا محلہ اور در و دیوار بلکہ سگانِ کوء عزیز ہوں۔ مجنون عامری نے کیا خوب کہا۔

اَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی　　اُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارَ وَ ذَاالْجِدَارَا
وَ مَاحُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ　　وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّیَارَا

یعنی میں لیلیٰ کے دیار پر پہنچ کر وہاں کے در و دیوار چومتا ہوں۔ مجھے ان دیواروں سے محبت نہیں بلکہ اس سے محبت ہے جس کے وطن کی یہ دیواریں ہیں۔

تیسرا فائدہ: اتباع اور اطاعت میں بڑا فرق ہے۔ اتباع خاص ہے اور اطاعت عام۔ اس لئے اتباع کے ساتھ محبوبیت کا ذکر کیا اور اطاعت کے ساتھ سزا کا کہ اگر اس سے بھی روگردانی کرو گے تو کافر ہو جاؤ گے۔ اطاعت رب تعالیٰ، نبی، سلطان، شیخ، ماں باپ، استاد سب کی ہو سکتی ہے مگر اتباع صرف حضور انور ﷺ کی ہوگی۔ اتباع رب تعالیٰ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اتباع کا معنی ہے کسی کی دیکھا دیکھی عمل کرنا۔ رب تعالیٰ روزانہ صدہا کو موت دیتا ہے۔ ہم ایک کو بھی ماردیں تو قتل کئے جائیں، غرضکہ اتباع رب تعالیٰ کی بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اِتَّبِعُوْا کے ساتھ صرف حضور ﷺ کا ذکر ہوا اور اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ رسول اولو الامر سب ہی کا ذکر ہوا۔ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ (النساء: ۵۹) یہ فرق بہت خیال میں رہے۔ **چوتھا فائدہ:** محبت تین قسم کی ہے طبعی، عقلی، احسانی۔ حضور علیہ السلام سے محبت طبعی چاہیے۔

فقط عقلی اور احسانی کافی نہیں۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوا۔ جس میں فرمایا گیا کہ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ حضور علیہ السلام سے بمقابلہ اولاد ماں باپ بلکہ اپنی جان سے زیادہ محبت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اولاد اور جان سے طبعی محبت ہوتی ہے۔ نہ کہ محض عقلی۔ **پانچواں فائدہ:** حضور کی محبت اور اطاعت پر شرک و کفر کا فتویٰ لگانا طریقہ یہود و منافقین ہے۔ جیسا کہ ہم دوسری آیت اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ۔ کے شانِ نزول بحوالہ تفسیر خازن و مدارک بیان کر چکے کہ جب حضور علیہ السلام نے اپنی اتباع کا حکم دیا تو منافقین اور یہود نے کہا کہ حضور ہم سے نصاریٰ جیسی محبت کراتے ہیں اور انہیں خدا بننے کا شوق ہے۔ اس لئے اپنی اتباع کو رب کی محبوبیت کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ اس واقعہ سے دیوبندیوں کو عبرت پکڑنی چاہیے۔ وہ حضور علیہ السلام کی محبت پر شرک و کفر کے فتویٰ لگاتے رہتے ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** صرف حضور علیہ السلام کی محبت اور اطاعت خدا رسی کا ذریعہ ہے۔ حضور ﷺ کو چھوڑ کر کوئی عمل کسی کی اطاعت رب تک نہیں پہنچا سکتی۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو انہیں ہماری اتباع کرنی پڑتی۔ عالم دین یا شیخ یا ولی اپنے متبعین کو حضور ﷺ تک پہنچا سکتے ہیں۔ رب تعالیٰ تک پہنچانا صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے۔ جو پیر وعدہ کرے کہ میں خدا تک پہنچا سکتا ہوں وہ جھوٹا ہے۔ لاہور کا تانگہ سواری کو کراچی نہیں پہنچا سکتا۔ وہ صرف اسٹیشن تک پہنچا سکے گا۔ کراچی پہنچانا ایکسپریس کا کام ہے۔ **ساتواں فائدہ:** اطاعت مصطفیٰ ﷺ سے دنیا میں ایمان اور آخرت میں جنان ہاتھ آتے ہیں مگر اتباع مصطفیٰ علیہ السلام سے دنیا میں عرفان ایقان اور محبوبیت یزدان اور آخرت میں لقائے رحمان نصیب ہوتے ہیں۔ حضور سرکار بغداد محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے خداداد اختیارات اور شانِ محبوبیت بتا کر فرماتے ہیں ۔

وَکُلُّ وَلِیٍّ لَہٗ قَدَمٌ وَاِنِّیۡ　　　عَلٰی قَدَمِ النَّبِیۡ بَدۡرِ الۡکَمَالِ

یعنی مجھے یہ تمام بہاریں غلامی سرکار کی وجہ سے حاصل ہوئیں۔

آٹھواں فائدہ: سارا جہان حضور ﷺ کا امتی ہے اور سب جن و انس فرشتے جانور شجر و حجر پر حضور ﷺ کی اطاعت واجب و لازم ہے کیونکہ قُلۡ کے ساتھ یہ نہ فرمایا کہ کس سے فرما دو۔ مطلب یہ ہوا کہ میری ساری مخلوق سے فرما دو۔ اس لئے اونٹوں بکریوں نے حضور کی اطاعت کی ہاں ہر مخلوق اپنی حیثیت کے لائق حضور ﷺ کی اطاعت کرے گی۔ جیسے ہر انسان اپنی حیثیت کے لائق حضور ﷺ کی اطاعت کرتا ہے۔ کہ امیر آدمی نماز روزہ زکوٰۃ سب کچھ ادا کرتا ہے۔ غریب صرف نمازیں۔ فرمائے میں لطیف اشارہ یہ ہے کہ فرما دو آپ ﷺ کا فرمان عالی لوگوں تک پہنچانا ہمارا کام ساری مخلوق تک ہم پہنچا دیں گے۔ حضرت خلیل کی آواز حج سارے انسانوں تک ہم نے پہنچائی۔ خیال رہے کہ اگرچہ رسول دنیا میں بہت تشریف لائے مگر قرآن کریم میں جہاں اطاعت کے ساتھ رسول کا ذکر ہو گا وہاں ہمارے رسول مراد ہوں گے۔ کہ ایمان سب رسولوں پر ہے مگر اطاعت صرف حضور ﷺ کی ہے۔ حضور ﷺ اللہ کے بھی رسول ہیں یعنی اس کے پیغام پہنچانے والے اور ہمارے بھی رسول ہیں۔ یعنی ہماری التجائیں دعائیں رب تک پہنچانے والے قرآن پر عمل اللہ کی اطاعت ہے۔ حدیث پر عمل رسول کی اطاعت فرائض کی پابندی اللہ کی اطاعت ہے سنن کی پابندی رسول کی اطاعت یا یوں کہو کہ حضور ﷺ کی

اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے۔ وَالرَّسُوْلَ میں واؤ عطف تفسیری کا ہے۔ فرائض وسنن غذا و پانی کی طرح ہیں کہ فرائض روحانی غذائیں، سنتیں رحمت کا پانی منکرین حدیث اس آیت پر عمل نہیں کر سکتے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہ عجب تماشا ہے کہ جو کوئی محمد ﷺ صاحب کی طرف ہو جائے تو خدا بھی اس کی طرف ہو جائے اور وہ دوسروں کو ستانے کے لئے جو گناہ کرے وہ معاف ہو جائیں۔ بھلا ایسی باتیں سچے خدا کی ہو سکتی ہیں۔ (ستیارتھ پرکاش)

جواب: پنڈت جی اس پر اعتراض کیا ہے۔ خدا ہمیشہ حق کی طرف ہے اور نبی ﷺ حق پر ہیں۔ جو ان کی غلامی کرے گا وہ حق پر ہو گا۔ لہٰذا خدا اس کی طرف ہو گا یہ تو عین انصاف ہے اور تم نے ستانے کے معنی کہاں سے نکالے۔ آیت میں ارشاد ہوا کہ نبی ﷺ کی پیروی سے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ بندوں کے حقوق کا ذکر تو نہیں ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ قاتل مقروض وغیرہ مسلمان ہو جائیں تو ان کا قتل و قرض معاف ہو جاتا ہے۔ حقوق بہر حال ادا کرنے پڑیں گے۔ ہاں اسلام کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں کیونکہ اسلام وہ سمندر ہے جو ہر گندگی کو دور کر دیتا ہے۔ یہ آریہ دھرم نہیں ہے کہ جس سے کوئی فائدہ نہ ہو۔ **دوسرا اعتراض:** اگر حضور ﷺ سے طبعی محبت ایمان کا مدار ہے تو چاہیے کہ کوئی مسلمان نہ ہو کیونکہ ہر ایک کو اپنی اولاد اور جان و مال سے قدرتی طور پر میلان طبع زیادہ ہوتا ہے۔ اولاد کی خاطر انسان گناہ بھی کر لیتا ہے۔ لہٰذا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہی ہونا چاہیے کہ حضور ﷺ سے عقلی محبت زیادہ ہو یعنی مومن کی عقل تقاضا کرے کہ حضور ﷺ سے محبت ہونی چاہیے۔ (دیو بندی) **جواب:** یہاں صرف محبت عقلی مراد نہیں بلکہ محبت طبعی ہی مراد ہے جیسا کہ اولاد اور ماں باپ کے مقابلہ سے معلوم ہوا اور الحمد للہ ہر سنی مسلمان کو حضور ﷺ سے محبت طبعی ہوتی ہے۔ سنیوں کی جاہل عورتیں کافر اولاد کو منہ نہیں لگاتیں۔ گناہ غفلت کا نتیجہ ہے نہ کہ محبت ہونے کا۔ بے وقوف بیمار بد پرہیزی کر کے بیماری بڑھا لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے اپنی جان سے محبت نہیں محبت تو ہے مگر غفلت سے یہ حرکت کر بیٹھا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں ارشاد ہوا۔ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ رب تمہارے سارے گناہ معاف کر دے گا اور ذنوب میں حقوق بھی داخل ہیں تو چاہیے کہ نو مسلم کے پچھلے قرض اور خون بھی معاف ہو جائیں۔ **جواب:** حق العبد کہتے ہی اسے ہیں جو بغیر بندہ کے معاف کئے معاف نہ ہو۔ اور حق اللہ وہ ہے جس میں بندہ کی معافی کی ضرورت نہ پڑے۔ ہر حق عبد میں اللہ کا بھی حق ہے جو بندہ کا حق مارتا ہے وہ رب کا قانون توڑتا ہے۔ اسلام کی برکت سے حق اللہ معاف ہو جائے گا مگر بندہ کا حق ادا کرنا ہو گا۔ ہم اس کی پوری تحقیق دوسرے سیپارہ کی تفسیر میں حج کے بیان کے بعد کر چکے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** حضور ﷺ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں اور منزل مقصود پر پہنچ کر وسیلہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اپنا اسٹیشن آ جانے پر ریل چھوڑ دی جاتی ہے تو چاہیے کہ جو کوئی خدا تک پہنچ جائے وہ حضور ﷺ کو چھوڑ دے؟ **جواب:** محض وسیلہ چھوٹ جاتا ہے مگر جس وسیلہ سے مقصود وابستہ ہے وہ کبھی نہیں چھوٹتا۔ گیس بجلی وروشنی کا وسیلہ ہے مگر روشنی حاصل کرنے کے بعد انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ورنہ پھر اندھیرا ہے۔ حضور ﷺ دوسری قسم کا وسیلہ ہیں۔ اس لئے ہر ولی غوث کلمہ میں حضور ﷺ کا نام ضرور لے گا۔ نماز میں حضور ﷺ کو سلام ضرور ... سے تعلق دنیا میں بھی ضروری ہے اور آخرت میں بھی۔

تفسیر صوفیانہ

حضور سید عالم ﷺ محبوبیت کے مرکز ہیں اور مرکز کا فیض دائرہ کے ہر نکتہ پر پہنچتا ہے۔ آپ کی اطاعت اور اتباع آپ سے ظاہری و باطنی مناسبت کا ذریعہ ہے۔ حضور ﷺ کی اتباع سے مناسبت باطنی' مناسبت قلبی' مناسبت روحی' مناسبت سری پیدا ہوتی ہے۔ اسی مناسبت کی وجہ سے تابعدار کو محبوبیت کا کچھ حصہ مل جاتا ہے اور اس قطب محبوبیت سے محبوبیت کے انوار اس کو بھی منور کر دیتے ہیں۔ جتنی اتباع قوی اتنی مناسبت زیادہ اور جتنی مناسبت زیادہ اتنی نورانیت غالب اور جتنی نورانیت غالب اتنی محبوبیت ظاہر۔ حضور ﷺ کی مخالفت حضور ﷺ سے دوری پیدا کرتی ہے جو مجوری کا ذریعہ ہے۔ دائرہ جس قدر مرکز سے قریب اسی قدر اس کا جھکاؤ زیادہ۔ جب اتباع کی برکت سے محبوبیت مل گئی اور یہ غلام آقا کا مظہر ہو گیا تو ان کے صفات اس میں نمودار ہونے لگے۔ جیسے کوئلہ سے آگ اور ان سے تو فرمایا گیا ہے۔ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ (الفتح: ۲) لہٰذا اس تابعدار غلام سے بھی فرمایا کہ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ۔ اللہ تعالیٰ غفور ہے وہ فنافی الرسول کے ذاتی اور صفاتی گناہوں کو مٹاتا ہے اور رحیم ہے کہ اسے حقانی صفات عطا فرماتا ہے چونکہ یہ اتباع و فنا بہت مشکل اور نادر چیز ہے اس لئے آسان چیز کی طرف بھی دعوت دی گئی جس کا نام ہے مقام ارادات اور فرمایا قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ یعنی اگر تم محبت کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تو ارادات سے محروم نہ رہو۔ اگر محبین نہیں بن سکتے تو مطیعین و مریدین تو بن جاؤ۔ اگر لوگ اس سے بھی روگردانی کریں تو وہ محجوب ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ محجوب کو دوست نہیں رکھتا۔

حکایت: سلطان محمود غازی نے شیخ ربانی ابوالحسن خرقانی سے پوچھا کہ بایزید بسطامی کی کیا شان ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ وہ شیخ کامل ہیں' جو ان کی زیارت کرلے جنتی ہو جائے۔ سلطان نے عرض کیا کہ ابوجہل نے حضور ﷺ کو رات دن دیکھا اور جنتی نہ ہوا۔ بایزید کا دیکھنے والا جنتی کیونکر ہو سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ رب کی قسم ابوجہل نے محمد رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہی نہیں۔ اس نے محمد ﷺ بن عبداللہ کو دیکھا۔ اگر وہ محمد رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا تو جہنمی نہ رہتا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَتَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ۔ (اعراف: ۱۹۸) آنکھ سے دیکھنا نظر ہے۔ اور دل سے دیکھنا بصیرت۔ (روح البیان واز ابن عربی)

صوفیاء فرماتے ہیں کہ دنیا میں دوزخ کے راستے صدہا ہیں۔ جنت کی ایک ہی پگڈنڈی ہے۔ پگڈنڈی ایسی مختصر ہوتی ہے کہ پیچھے والا آگے والے کے برابر ہو کر آگے نکل سکتا ہی نہیں۔ بڑی کوشش کرتا ہے کہ آگے والے کے نقش قدم پر قدم رکھے۔ راستہ کے غار خار آگے والا جانے یوں ہی ہمارا فرض کہ حضور ﷺ کے نقش قدم پر قدم رکھنا ہے۔ راستہ کے ذمہ دار حضور ﷺ ہیں۔ اسلئے حکم ہوا فَاتَّبِعُوْنِیْ میری اتباع کرو۔ برابر آ کر آگے نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ ریل کے ڈبے انجن کے برابر آ کر آگے نہیں نکل سکتے۔ انہیں پیچھے ہی رہنا ہے۔ لہٰذا فَاتَّبِعُوْنِیْ بالکل درست ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی

تحقیق اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور اولاد ابراہیم اور اولاد عمران کو سارے جہانوں کے

بیشک اللہ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم کی آل اور عمران کی آل کو سارے جہان سے

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّیَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۴﴾

نسل کو بعض ان کے بعض سے ہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

یہ ایک نسل ہے ایک دوسرے سے اور اللہ سنتا جانتا ہے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں کفار سے الگ رہنے اور حضور ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ سارے انسان ایک اللہ کی مخلوق' ایک دادا کی اولاد' ایک زمین پر بسنے والے ایک آسمان کے نیچے رہنے والے اور شکل وشباہت میں یکساں ہیں۔ پھر اس فرق کے کیا معنی کہ کفار سے ملو تو بے دین ہو جاؤ۔ اور پیغمبر سے نہ ملو تو بے دین ہو جاؤ۔ اس آیت میں اس وہم کو دفع فرمایا جا رہا ہے کہ یہ دنیا اس درخت کی طرح ہے۔ جس میں شاخیں' پتے' کانٹے' پھل پھول سب کچھ ہیں۔ اور یہ سب ایک ہی تخم سے ایک ہی جڑ پر قائم ایک ہی زمین میں ہیں۔ ایک ہی ہوا' پانی سے پرورش پاتے ہیں مگر کانٹوں سے پرہیز کیا جاتا ہے اور پھول سے محبت کفار اس درخت کے کانٹے ہیں اور انبیائے کرام پھول۔ آؤ تمہیں دکھاتے ہیں کہ اس گلدستہ میں کیسے کیسے پھول ہیں۔ اس لئے گذشتہ انبیائے کرام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ یہ بیماری کہ ہم اور نبی یکساں ہیں' بڑی پرانی ہے۔ اس بیماری میں گذشتہ امتوں کے کفار گرفتار تھے بلکہ ان کے کفر کی وجہ یہ ہی تھی کہ انہوں نے اپنے میں اور نبی میں فرق نہ کیا۔ وہ نہ سمجھے کہ سانپ اور بھینس اگرچہ اللہ کی مخلوق ہے۔ اس کی روزی کھاتے پیتے ہیں مگر سانپ کے پاس زہر ہے۔ بھینس کے پاس دودھ اس لئے آپ سانپ کو مارتے ہیں اور بھینس کی خدمت کرتے ہیں۔ ایسے ہی کفار کے پاس کفر کا زہر ہے۔ اور حضرات انبیاء' اولیاء وعلماء کے پاس ایمان کا دودھ معرفت الٰہی کا مکھن ہے یہ منافقانہ بیماری آج بھی لوگوں میں موجود ہے کہ سب کو بصارت سے دیکھتے ہیں۔ بصیرت سے نہیں دیکھتے۔ بصارت کہتی ہے کہ گھر کی ساری عورتیں یکساں ہیں۔ شکل وشباہت برابر' مگر بصیرت کہتی ہے کہ اپنی ماں اور بیوی کچھ اور بیٹی کچھ اور۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ محبت اتباع رسول کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس میں اشارتاً نبی کی شان کا اظہار ہوا۔ اب صراحتاً انبیائے کرام کی شان بیان فرمائی جا رہی۔ گویا یہ آیت پچھلے اجمال کی تفصیل ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ حضور ﷺ کی اطاعت کے بغیر ایمان نہیں مل سکتا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ حکم نیا نہیں ہے بلکہ ہر زمانہ میں پیغمبر رہے۔ اور ہر وقت کے لوگوں کو ان کی اتباع کا حکم دیا گیا۔

شانِ نزول

یہود نے کہا تھا کہ ہم حضرات ابراہیم واسحٰق ویعقوب علیہم السلام کی اولاد ہیں اور ان کے دین پر ان کے رد میں یہ آیت کریمہ اتری جس میں ارشاد ہوا کہ وہ تمام خدا کے پیارے تھے تم مشرک تم انکے دین پر کیسے ہو سکتے ہو۔ (خازن وخزائن ومعانی وغیرہ)

(۲) چونکہ عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا [illegible] ان کے رد میں یہ آیت آئی۔ جس میں عیسیٰ علیہ السلام کا شجرۂ

نسب بیان ہوا تاکہ معلوم ہو کہ ان کا نسب تو انسانوں سے ہے نہ کہ خدا سے۔
الحمد للہ محفل میلاد شریف کی برکت سے حضور انور ﷺ کے ہزارہا معجزات دیکھ کر بھی کسی مسلمان نے حضور انور ﷺ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہ کہا۔ میلاد میں دن رات سنتے رہتے ہیں کہ حضور انور ﷺ فلاں تاریخ کو پیدا ہوئے۔ فلاں فلاں دائی کا دودھ پیا اور ظاہر ہے کہ جو پیدا ہو پرورش پائے' دودھ پئے وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں بلکہ بندہ ہے یہ میلاد شرک توڑ ہے۔

تفسیر

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَ نُوْحًا۔ جس مضمون کا کوئی مخالف موجود ہو یا آئندہ پیدا ہونے والا ہو۔ اسے اِنَّ وغیرہ تاکید سے شروع کیا جاتا ہے چونکہ اس آیت میں پیغمبروں کے فضائل ارشاد ہوئے۔ جس کے بہت سے اہل کتاب منکر تھے۔ اس لئے ان سے شروع کیا گیا۔ اِصْطَفٰا صفو سے بنا بمعنی چھانٹنا' چننا۔ چھنے ہوئے پانی کو اسی لئے صفا کہا جاتا ہے کہ وہ میل وغیرہ سے چھانٹ لیا گیا۔ یہاں دیگر انسانوں سے افضل فرمانا مراد ہے۔ شریعت میں اصطفاء خاص قرب کا نام ہے جو خلت و محبت سے عام تر ہے۔ ہر نبی برگزیدہ ہے مگر سب کا لقب مصطفیٰ یا حبیب اللہ یا خلیل نہیں۔ رب تعالیٰ کے چناؤ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اصطفاء عام جو نبی کا نبوت کے لئے چناء ہوا کہ انہیں بے عیب پیدا کیا گیا۔ رب نے اپنی صفات و خصوصی علم انہیں بخشے۔ گندا برتن دودھ کے قابل نہیں۔ گندا دل نبوت کے قابل نہیں' دوسرا اصطفاء خاص جو گروہ انبیاء میں سے بعض کو بعض خصوصی صفات بخشے گئے۔ کوئی کلیم اللہ بنائے گئے کوئی روح اللہ یہاں اصطفاء خاص مراد ہے اس لئے صرف چار نبیوں کا ذکر ہوا۔ آدم کے لفظی معنی اور آپ کے تاریخی واقعات پہلے سیپارہ میں بیان ہو چکے۔ آدم علیہ السلام کا برگزیدہ ہونا۔ اس طرح ہے کہ انہیں رب نے اپنے خاص دستِ قدرت سے پیدا فرمایا۔ انہیں نسل انسانی کا مورث اعلیٰ بنایا۔ وسیع علم عطا فرمایا۔ فرشتوں کا مسجود بنایا۔ جنت الفردوس میں ٹھہرایا وغیرہ۔ چونکہ سب سے پہلے پیغمبر علیہ السلام آپ ہی ہیں اس لئے سب سے پہلے ذکر آپ کا ہی ہوا۔ نوح علیہ السلام کی برگزیدگی کے یہ معنی کہ آپ آدم علیہ السلام کے بعد پہلے وہ نبی ہیں جنہوں نے کفار کو تبلیغ کی۔ سب سے پہلے آپ ہی کی قوم پر عذاب الٰہی آیا۔ آپ کا لقب آدم اصغر اور والد دوم ہے کیونکہ سارے انسان آپ کی نسل سے ہیں کہ سوا آپ پر ایمان لانے والوں کے سب لوگ غرق کر دیئے گئے تھے مگر نسل صرف آپ کی اولاد ہوئی۔ باقی مومنین کی نسل نہ چلی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ۔ آپ ہی نے شریعت آدم علیہ السلام کے بہت سے احکام منسوخ فرمائے۔ جیسے بہن سے نکاح وغیرہ۔ نوح نوحہ سے بنا بمعنی رونا اور گریہ زاری کرنا۔ چونکہ آپ خوف الٰہی میں بہت روتے تھے اس لئے آپ کا لقب پاک نوح ہوا۔ آپ کا نام شریف یشکر ہے' لقب نوح۔ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین ہزار سال پہلے گذرے ہیں مگر چونکہ سنہ عیسوی سے پرانا سنہ ہمیں کوئی نہیں ملتا۔ اس لئے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگ سکتا۔ وَاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ۔ یہ نوحًا پر معطوف ہے اور اصطفیٰ کا مفعول چونکہ حضرت ابراہیم و عمران کی اولاد میں مقدس ہستیاں بے شمار ہوئیں۔ یہاں تک کہ ابراہیم علیہ السلام کو ابوالانبیاء یعنی پیغمبروں کا باپ کہا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں آل فرمایا گیا۔ بعض نے فرمایا کہ یہ آل زائدہ ہے یا بمعنی نفس (معانی) بعض کے نزدیک آل ابراہیم سے مراد حضرت اسمٰعیل و اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد ہیں علیہم السلام۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ آل ابراہیم ہر وہ مومن ہے جو ان کے دین پر

ہو۔ بعض کے نزدیک آل ابراہیم حضور سید عالم ﷺ ہیں۔ کیونکہ حضور تمام ذریت ابراہیمی میں فرد اعلیٰ ہیں۔ وَاٰلَ عِمْرٰنَ کا یہ آل ابراہیم پر معطوف ہے۔ اور اصطفیٰ کا مفعول عمران دو ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ و ہارون کے والد ماجد جن کا نسب نامہ یہ ہے۔ عمران ابن یصھر ابن فاھث ابن لاوی ابن یعقوب ابن اسحٰق ابن ابراہیم علیہم السلام۔ دوسرے عمران ابن ماثان حضرت مریم کے والد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا ہیں۔ جن کا نسب شریف یہ ہے عمران ابن ماثان ابن عادر ابن ابی ھود ابن رب بابل ابن سالیان ابن یوحنا ابن اوشا ابن اوموز ابن میشک ابن خارقا ابن یوثام ابن غرزیا ابن یوزان ابن ساقط ابن ایشا ابن راحیم ابن سلیمان ابن داؤد ابن ایشا ابن عویل ابن سلمون ابن یاعر ابن مشون ابن عمیاد ابن دام ابن حضروم ابن فارض ابن یہودا ابن یعقوب ابن اسحٰق ابن ابراہیم علیہم السلام (روح البیان) ان دونوں عمرانوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو برس کا فاصلہ ہے۔ (کبیر و خزائن) یہاں یا تو پہلے عمران مراد ہیں یعنی موسیٰ علیہ السلام کے والد یا دوسرے عمران یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے نانا اور یہ ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ آگے حضرت مریم و عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ ہی آ رہا ہے۔ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ یہ اصطفیٰ کے متعلق ہے عالمین کی تفسیر سورۃ فاتحہ میں گذر چکی۔ چونکہ عالم بہت تھے۔ فرشتے' جن' انسان' پھر عالم بر' عالم بحر' عالم ارض' عالم سماء' عالم اجسام' عالم ارواح' عالم امکان' عالم امر' عالم انوار وغیرہ۔ اس لئے عالمین جمع فرمایا گیا۔ اگر آل ابراہیم میں حضور ﷺ داخل ہوں تو یہاں علی العالمین میں کسی قید کی ضرورت نہیں۔ بے شک آل ابراہیم قیامت تک ساری مخلوق سے افضل ہے اور اگر اس میں حضور ﷺ داخل نہ ہوں تو العالمین سے اس زمانہ کے اہل جہاں مراد ہیں جیسے یہود سے کہا گیا وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِیْنَ۔ (بقرہ: ۴۷) اب حضور سید عالم ﷺ اور آپ کی امت سب سے افضل ہے۔ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ یہ دونوں آل سے بدل ہے۔ ذریۃ ذرٌّ سے بنا بمعنی پھیلنا اور بکھرنا اس لئے چھوٹی چیونٹی کو ذر اور ریتے کے ذرات کو ذرہ کہا جاتا ہے نسل اور اولاد کو بھی اسی لئے ذریت کہتے ہیں کہ وہ عالم میں پھیلتی ہیں۔ یا اس لئے کہ وہ آدم علیہ السلام کی پشت سے چیونٹیوں کی شکل میں نکالی گئی تھیں۔ بعض کا خیال رہے کہ یہ ذرء بمعنی خلق سے بنا (خازن) بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ یہ جملہ ذریت کا صفت اور نسبی حالت میں ہے یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ سارے پیغمبر اصل توحید میں ایک ہی ہیں۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ یہ نیا جملہ ہے۔ سمیع کا مفعول بندوں کے اقوال ہیں۔ اور علیم کا مفعول ان کے احوال و افعال یعنی اللہ تمام بندوں کی باتیں سننے والا اور ان کے کام اور حالات جاننے والا ہے۔ ہر شخص کو اس کی لیاقت کے مطابق درجات عطا فرماتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے لوگو سارے انسان یکساں نہیں۔ ان میں سے بعض مثل پھول کے ہیں۔ جن کی صحبت مہکا دیتی ہے۔ بعض کانٹوں کی طرح جن کے پاس بیٹھنا باعثِ ایذا ہے۔ یہ فرق نیا نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے حضرت آدم' نوح' ابراہیم علیہم السلام کی مومن آل اور حضرت عمران کی اولاد کو تمام جہان سے چھانٹ کر چن کر اپنا مقرب بنا لیا کہ آدم علیہ السلام کو انسانوں کا جد امجد فرشتوں کا مسجود بنایا۔ جنت میں ٹھہرایا۔ سارے علم انہیں عطا فرمائے۔ نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کا خطاب دیا۔ زمین پر انہی کی اولاد پھیلائی۔ انکے دشمن کفار کو ہلاک کیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اولوالعزم پیغمبر پیدا فرمائے۔ اے

نبوت اور ولایت سے بھر دیا۔ ہر دین میں آپ کا ذکر خیر رکھا۔ کعبہ معظمہ' مقام ابراہیم' مکہ معظمہ' منیٰ' عرفات' قربانی' عقیقہ' تکبیر تشریق' صفا و مروہ پہاڑ بلکہ تمام ارکان حج آپ کی یادگار رہے۔ درود ابراہیمی میں آپکا نام قائم رکھا۔ آپ کی سنتیں اسلام میں قائم فرمائیں۔ غرضکہ بے شمار خصوصیات آپ کو بخشیں۔ عمران کی پاک بیٹی کو وہ فرزند ارجمند عطا فرمایا جس کا لقب کلمۃ اللہ یا روح اللہ ہے۔ وہ کنواری پاک ماں کا ستھرا بیٹا بنی اسرائیل کا خاتم النبیین' سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ کا بشارت دینے والا۔ گویا طلوع آفتاب کی خبر دیتا ہوا تارا ان سب کو سارے جہان پر خواہ فرشی ہوں یا عرشی' انسان ہوں یا جنات یا فرشتے سب پر بزرگی دی۔ یہ حضرات آپس میں ایک دوسرے کی اولاد ہیں کہ عمران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور حضرت ابراہیم نوح علیہ السلام کی اور نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ اللہ سارے بندوں کی باتیں سنتا ہے اور سب کی نیت حالت استعداد جانتا اور بقدر قابلیت ان کو درجے عطا فرماتا ہے۔

خیال رہے: کہ مخلوق دو قسم کی ہے۔ مکلف اور غیر مکلف۔ مکلف غیر مکلف سے اعلیٰ ہیں۔ مکلف کی پھر چار قسمیں ہیں۔ انسان' فرشتے' جن اور شیاطین' انسان کی پیدائش خاک سے' فرشتوں کی پیدائش ہوا سے یا نور سے یا یوں کہو کہ ان کا جسم ہوائی اور روح نوری۔ ان کا اصلی مقام آسمان ہے۔ شیاطین کی پیدائش آگ سے۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔ (اعراف: ۱۲) اس پر سب متفق ہیں کہ انسان جن اور شیاطین سے افضل ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ فرشتوں سے افضل ہے یا نہیں۔ بعض کے نزدیک فرشتے انسانوں سے افضل ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ انسان فرشتوں سے بہتر۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (الاسراء: ۷۰)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** نبی غیر نبی سے مطلقاً افضل ہیں۔ کوئی ولی غوث یا قطب نبی کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ جیسا کہ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ سے معلوم ہوا۔ (احمدی) **دوسرا فائدہ:** انسان فرشتوں سے افضل ہیں۔ یہ بھی العالمین سے ہی معلوم ہوا کہ فرشتے العالمین میں داخل ہیں۔ یعنی آدمیت ملکیت سے افضل ہے۔ اگرچہ کفار کفر کی وجہ سے فرشتے تو کیا جانور سے بھی بدتر ہیں۔ اور رسل ملائکہ رسالت کی وجہ سے عام مسلمانوں سے افضل (احمدی) **مسئلہ:** انسانوں کے پیغمبر ملائکہ کے پیغمبروں سے افضل ہیں اور پیغمبر ملائکہ عام انسانوں سے افضل اور عام بشر عام فرشتوں سے افضل۔ یوں سمجھو کہ جنس بشر جنس ملائکہ سے افضل ہے۔ اسی لئے فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا نہ کہ انسان نے فرشتوں کو (احمدی) **تیسرا فائدہ:** بیٹی کی اولاد آل میں داخل ہے۔ دیکھو عیسیٰ علیہ السلام کو عمران کی آل کہا گیا۔ حالانکہ وہ ان کے نواسے ہیں۔ لہٰذا سادات کرام حضور علیہ السلام کی آل ہیں۔ **چوتھا فائدہ:** سارے پیغمبر اللہ کے برگزیدہ اور مقبول ہیں رب کسی سے ناراض نہیں وہ سب حضرات فسق و فجور سے پاک ہیں۔ جیسے کہ اصْطَفٰى سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** انبیائے کرام جسمانی اور روحانی لحاظ سے سب سے افضل ہیں۔ ان کی قوت نظری' سننے کی طاقت' سونگھنے کی طاقت تمام سے قوی تر ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے ساری زمین سمیٹ کر دکھا دی گئی اور میں نماز میں پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔ قرآن نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کو آسمان و زمین کا ملکوت دکھایا گیا۔ حضرت سلیمان نے تین میل

سے چیونٹی کی آواز سنی۔ یعقوب علیہ السلام نے قمیص یوسفی کی خوشبو مصر سے پائی۔ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو آگ نہ جلاسکی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور علیہ السلام نے علم کے ہزار باب سکھائے۔ اور میں نے ہر باب سے ہزار باب علم کے نکالے۔ جب ولی کا یہ حال ہے تو نبی کا علم کتنا ہوگا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خادم آصف ابن برخیہ ایک آن میں یمن سے بلقیس کا تخت شام میں لے آئے۔ جسے قرآن کریم نے نقل فرمایا۔ یہ جسمانی فوقیت تھی۔ ان کی روحانی اور عقلی فوقیت کو رب ہی جانے۔ اتنا سمجھ لو کہ نبی کی عقل تمام جہان کی عقلوں سے بڑھ کر اور حضور علیہ السلام کی عقل تمام پیغمبروں کی عقلوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا۔ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰی الخ (تفسیر کبیر)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ سے افضل ہیں کیونکہ آل عمران کو العالمین سے افضل فرمایا گیا۔ اور عالمین میں حضور بھی داخل ہیں۔ (عیسائی) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اس آیت میں آل ابراہیم بھی ہے۔ جس میں حضور ﷺ داخل ہیں۔ دوسرا یہ کہ عالمین سے اس زمانہ کے جہان والے مراد ہیں۔

لطیفہ: ایک عیسائی نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے کہا

کسے بگفت کہ عیسیٰ ز مصطفیٰ اعلیٰ است   کہ او بزیر زمین دفن وآں باوج سما است

یعنی عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر ہیں۔ اور تمہارے پیغمبر زمین میں دفن لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام افضل ہوئے۔ آپ نے فوراً جواب دیا

بگفتمش کہ نہ ایں حجت قوی باشد   حباب بر سرِ آب و گہرتہِ دریا ست!

یعنی یہ دلیل قوی نہیں۔ دیکھو حباب پانی کے اوپر ہے اور موتی پانی کے نیچے۔ مگر موتی بلبلہ سے افضل اور قیمتی ہے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت میں حضرت آدم و نوح اور دیگر تمام پیغمبروں کے لئے اصطفیٰ فرمایا گیا تو چاہیے کہ سارے نبیوں کو مصطفیٰ کہا جاسکے حالانکہ صرف حضور کو مصطفیٰ کہا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** بعض الفاظ بعض ہستیوں کے لئے خاص ہوجاتے ہیں اگرچہ ان کے معنی ہر جگہ درست ہوں مگر ان کا استعمال ہر جگہ درست نہیں ہوتا۔ انہی میں سے لفظ مصطفیٰ بھی ہے۔ رسول کے معنی قاصد ہیں مگر انبیاء کے سوا کسی پر نہیں بولا جاتا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىٕكَتُهٗ (احزاب: ۴۳) جس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ سب پر رحمتیں نازل فرماتا ہے مگر حضور علیہ السلام کے سوا کسی کو ﷺ نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ہی السلام علیکم ہر مسلمان کو کہا جاتا ہے مگر علیہ السلام غیر نبی کو کہنا منع۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ آل ابراہیم کو تمام جہانوں سے افضل کیا مگر اولاد ابراہیمی میں بڑے بڑے کفار مشرکین ہوئے۔ نیز متبعین ابراہیم یعنی مسلمانوں میں بڑے بڑے گنہگار رہیں۔ پھر یہ تمام عالمین سے کیوں افضل ہوئے۔

جواب: کچھ افراد کے خراب ہونے سے قوم و جماعت خراب نہیں ہوجاتی۔ چونکہ اس قوم میں اعلیٰ ہستیاں تھیں کہ خود ہی ان کی وجہ سے قوم اشرف ہوگئی۔ نیز نسبت کی عظمت انہی کی وجہ سے کی جاتی رہی۔ بیت اللہ میں بت رہے۔ صفا و مروہ پر بت رہے مگر چونکہ انکی نسبت قوی تھی لہٰذا انکی عظمت میں فرق نہ آیا بتوں سے بھرے ہوئے کعبہ کی طرف حضور انور ﷺ نے

نمازیں پڑھیں۔ اس بتوں والے کعبہ کا طواف کیا جب نسبت ابراہیمی سے کعبہ اور کوہ صفا مروہ کی حرمت میں فرق نہ آیا تو بعض افراد کی خرابی سے قوم ابراہیمی کی عظمت میں فرق کیسے آ سکتا ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ۔ (التین: ۳) تجھے اس امانت والے شہر کی قسم حالانکہ اس مکہ معظمہ میں اس قسم کے وقت ابوجہل' ابولہب امیہ ابن خلف بھی تھے مگر حضور انور ﷺ کی نسبت نے اسے شرف جو بخشا وہ ان خبیثوں کی وجہ سے ٹل نہیں سکتا۔ **چوتھا اعتراض:** فرشتے گناہ سے پاک ہیں۔ اور انسان گناہ میں گرفتار۔ تو چاہیے کہ فرشتے انسان سے افضل ہوں۔ **جواب:** فرشتوں میں گناہوں کی طاقت ہی نہیں۔ کیونکہ وہ شہوت وغصہ سے پاک ہیں۔ ان کا گناہوں سے بچ رہنا کوئی کمال نہیں اور عبادت ان کی غذا ہے مگر انسان میں شہوت وغصہ بھی ہے اور وہ دنیا میں گرفتار بھی۔ اب اس کا گناہ سے بچنا کمال ہے۔ اگر انسان میں گنہگار ہیں تو ان میں ابرار واغیار بھی ہیں اگر انسان میں فساق وفجار ہیں تو ان میں احمد ومختار بھی ہیں۔ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔

پانچواں اعتراض: مصطفیٰ اور خلیل وحبیب میں کیا فرق ہے؟ **جواب:** مصطفیٰ' مجتبےٰ اور مجتبیٰ ہم معنی ہیں۔ لغۃ ہر برگزیدہ مصطفیٰ ہے مگر اصطلاح میں مصطفیٰ بمعنی محبوب ہیں۔ خلیل وہ جو رب کی مانے۔ حبیب وہ کہ رب اس کی مانے۔

تفسیر صوفیانہ

اصطفےٰ محبت اور خلت سے عام ہے۔ اس میں سارے انبیاء داخل ہیں۔ اس سے خاص خلت ہے۔ اور اس سے خاص محبت اسی لئے حضور ﷺ سید الانبیاء ہیں کہ آپ حبیب اللہ ہیں۔ سارے پیغمبر دین میں بعض بعض سے ہیں' اور توحید ومعرفت میں ایک دوسرے کے تابع۔ ولایت اور ولادت دو قسم کی ہے۔ ایک صوری دوسری معنوی۔ ولایت صوری کا تعلق بدن سے ہے اور معنوی کا روح سے۔ مرید اپنے شیخ کی اولاد ہے اور شاگرد دینی استاد کی اولاد کہا جاتا ہے۔ کہ باپ تین ہیں۔ ایک جننے والا۔ دوسرا پرورش کرنے والا اور تیسرا علم سکھانے والا۔ جیسے بدن ماں کے رحم میں باپ کے نطفہ سے بنتا ہے۔ ایسے ہی وجود قلب نفس کے رحم میں شیخ کی نظر کرم سے بنتا ہے۔ اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص دوبارہ نہ جنا جائے وہ کامل نہیں۔ ایک بار باپ سے دوسری بار شیخ سے' خیال رہے کہ ولادت معنوی اکثر ولادت صوری کے تابع ہوتی ہے کیونکہ روح کی صفائی اور کدورت کا تعلق جسم کی صفائی اور کدورت سے بھی ہے۔ اور ہر روح کا مزاج جداگانہ ہے۔ اسی کے مطابق وہ فیض حاصل کرتی ہے' جیسے جسم میں مختلف خاندان ہیں۔ ایسے ہی روح کی مختلف قسمیں ہیں۔ ہر قسم کو اپنی جنس سے مناسبت ہے۔ اگرچہ رشتہ میں کتنی ہی دور ہو۔ امام مہدی اخیر زمانہ میں جلوہ گر ہوں گے مگر چونکہ ظاہری باطنی طور پر حضور کی نسل سے ہوں گے لہٰذا حضور ﷺ کی صفات سے متصف بھی ہوں گے۔ یہ مطلب ہے۔ ذُرِّیَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ۔ کا (روح البیان وابن عربی)

صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے دینی عزتیں ایمان' تقویٰ وغیرہ سے میسر ہوتی ہیں اور دنیاوی عزتیں مال' اسباب سلطنت وغیرہ سے نصیب ہوتی ہیں۔ ایسے ہی بڑوں کی اولاد اور بڑوں کا ماں باپ بننے سے بھی دینی ودنیاوی عزتیں ملتی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو یہ فخر ہے کہ وہ اتنے انبیاء کرام کے خصوصاً حضور سید الانبیاء کے والد ہیں اور ان انبیاء کو یہ فخر کہ وہ حضرات جناب خلیل کی اولاد ہیں۔ عمران نبی نہیں مگر اللہ نے ان کی اتنی عزت افزائی کی کہ ان کا نام جماعت انبیاء میں لیا اور ان کے نام کی ایک سورۃ آل عمران مقرر کی اور ان کی بیٹی کے نام کی سورۃ' سورۂ مریم مقرر فرمائی۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ والد انبیاء ہیں۔ خادمان

بیت المقدس کے سردار ہیں۔ مادر زاد ولیہ حضرت مریم کے والد ہیں۔ اور کلمۃ اللہ عیسیٰ علیہ السلام کے نانا ہیں۔ نسبت کی یہ بہاریں ہیں۔ رب تعالیٰ نسبت قوی رکھے۔ بزرگوں سے بیعت اسی نسبت کے لئے کی جاتی ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ

جبکہ کہا بیوی نے عمران کی کہ اے رب میرے تحقیق میں نے نذر مانی واسطے تیرے وہ جو بیچ پیٹ میرے کے ہے

کیا ہوا جب عمران کی بیوی نے عرض کی اے میرے رب تیرے لئے منت مانتی ہوں جو میرے پیٹ میں ہے کہ خالص تیری

مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ

آزاد پس قبول کر مجھ سے تحقیق تو سننے والا جاننے والا ہے پس جبکہ جنا اس کو تو عرض کیا اے رب میرے

ہی خدمت میں رہے تو تو مجھ سے قبول کرلے بیشک تو ہی ہے سنتا جانتا پھر جب اسے جنا بولی اے رب میرے

اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ

تحقیق میں نے جنا اس کو لڑکی اور اللہ بہت جانتا ہے اس کو جو جنا اور نہیں ہے لڑکا مثل اس لڑکی کے اور تحقیق میں نے

یہ تو میں نے لڑکی جنی اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ وہ جنی اور وہ لڑکا جو اس نے مانگا اس لڑکی سا نہیں اور میں نے

وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

نام رکھا اس کا مریم اور تحقیق میں پناہ میں دیتی ہوں اس کو تیری اور اولاد اس کی کو شیطان راندے ہوئے سے

اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں راندے ہوئے شیطان سے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں انبیائے کرام کی برگزیدگی کا اجمالی ذکر تھا اب آل عمران کی بزرگی کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ رب نے آل عمران کو بھی چن لیا۔ اور آل عمران عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں اور ان کی والدہ ماجدہ اور نانی صاحبہ بھی ان کے چناؤ کی مختلف نوعیتیں تھیں کسی کو نبوت سے چنا اور کسی کو ولایت سے۔ اب ان کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ رب تعالیٰ نے ان حضرات کو چن لیا۔ جس سے پتہ نہ لگا تھا کہ کیسے چنا اور کب چنا۔ اس آیت میں چننے کی نوعیت کا ذکر ہے کہ یہ حضرات پیدائش سے پہلے ہی چنے ہوئے تھے۔

تفسیر

اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرَانَ۔ اِذْ یا تو زائدہ ہے یا اذکر فعل پوشیدہ کا ظرف یا اِصْطَفٰی کا یا سمیع علیم کا ظرف ہے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی بھی چند ہوں گے۔ اگر اذکر کا ظرف ہو تو اذکر کے معنی ہیں یاد کرو یا یاد رکھو یا یاد کراؤ۔ اگر یاد کرو معنی ہوں تو

مقصد یہ ہے کہ آپ کو یہ گزشتہ واقعات معلوم تو ہیں ان پر دھیان فرماؤ۔ یا وہ ہی چیز دلائی جاتی ہے جو پہلے معلوم ہوا گر معنی ہوں کہ یاد دلاؤ تو مطلب یہ ہوگا کہ اپنی امت کو یہ واقعات یاد دلاؤ تا کہ انہیں یہ واقعات یاد رہیں۔ اور ان کے عقائد و اعمال درست رہیں کیونکہ بزرگوں کے واقعات لوگوں کو اچھی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے جگہ جگہ اس قسم کے تاریخی واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ ایک سورۃ کا نام قصص ہے اور اگر اصطفیٰ کا ظرف ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے مریم و عیسیٰ علیہ السلام کو اس لئے چنا کہ عمران کی بیوی نے یہ دعا کی تھی ولایت تین قسم کی ہوتی ہے۔ وھبی' کسبی' عطائی۔ حضرت مریم کی ولایت وھبی ہے کہ آپ مادرزاد ولیہ ہیں۔ خاندان اعلیٰ' ماں شاندار پھر آپ کیوں نہ شاندار ہوں۔ اور اگر سمیع کا ظرف ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہر وقت ہی سمیع و علیم ہیں مگر ان بزرگوں' مقبولوں کی باتیں بہت سی سنتے ہیں کہ یہ ہمارے ہیں۔ تو ان کی باتیں بھی ہم کو محبوب ہیں۔ امرأۃ عمران سے حضرت عمران کی بیوی مراد ہیں جو حضرت مریم کی والدہ عیسیٰ علیہ السلام کی نانی صاحبہ ہیں۔ ان کا اسم شریف حضرت حنہ بنت فاقوزا ہے۔ ان کی دوسری بہن حضرت ایشاع بنت فاقوزا زکریا علیہ السلام کی بیوی تھیں اور حضرت یحییٰ کی والدہ گویا یہ سارا گھرانہ ہی پاک تھا۔ قرآن پاک نے سواء حضرت مریم کے کسی عورت کا نام نہ لیا۔ کنایۃً فرما دیتا ہے۔ وہ ہی معاملہ یہاں ہوا۔ یعنی رب نے آل عمران کو جب چنا تھا۔ یا اس وقت کو یاد کرو جب عمران کی بیوی حنہ نے یہ عرض کیا۔ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا۔ رَبِّ اصل میں یا ربی تھی۔ ندا کا یا اور ی متکلم پوشیدہ کر دی گئی۔ نَذَرْتُ نذر سے بنا اس کے لغوی معنی کی نہایت نفیس تحقیق پہلے سیپارہ میں گذر چکی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اس کے معنی ہیں غیر لازم چیز کو اپنے پر لازم کر لینا ظاہر یہ ہے کہ یہ صیغہ انشاء نذر ہے۔ جیسے بعث اور اشتریت کیونکہ حنہ نے قرار حمل کے بعد یہ نذر مانی تھی۔ عام مفسرین کا یہ ہی قول ہے۔ یعنی میں نذر مانتی ہوں مگر روح المعانی نے فرمایا کہ یہ گذشتہ نذر کی حکایت ہے کیونکہ قرار حمل سے پہلے نذر مان چکی تھی۔ حمل کے بعد اندیشہ ہوا کہ کہیں لڑکی نہ ہو اور بیت المقدس میں لڑکے وقف کیئے جاتے تھے نہ کہ لڑکیاں۔ تب عرض کیا کہ مولیٰ میری نذر کی لاج تیرے ہاتھ ہے۔ میں اپنے اس حمل کی نذر پہلے ہی مان چکی ہوں۔ مَا سے مراد لڑکا ہے چونکہ بچے ناسمجھ ہوتے ہیں۔ اس لئے مَن نہ فرمایا مَا فرمایا نیز کبھی ایک حمل سے چند بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ابنی نہ کہا بلکہ مَا فِیْ بَطْنِیْ کہا یعنی جو کچھ میرے پیٹ میں ہے۔ ایک یا دو بچے' مُحَرَّرًا مَا کا حال ہے۔ یہ تحریر سے بنا' بمعنی خالص کرنا' درست کرنا' کتاب لکھنے کو تحریر اسی واسطے سے کہتے ہیں کہ اسے بیکار چیزوں سے خالص کیا جاتا ہے جو مٹی ریتے اور پتھر سے صاف ہو اسے طین حر کہتے ہیں۔ آزاد کرنے کو بھی اسی لئے تحریر کہا جاتا ہے کہ غلام مولیٰ کے حق سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ یہاں بمعنی خالص ہی ہے یعنی اے مولیٰ میں نذر مانتی ہوں کہ جو اب بچہ میرے پیٹ میں ہے۔ اسے میں بیت المقدس کی خدمت کے لئے آزاد کر دوں گی کہ اس سے دنیوی کام کاج کچھ نہ لوں گی۔ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ بیت المقدس کی خدمت کے لئے لڑکے وقف کیئے جاتے تھے کہ وہ بلوغ تک وہاں کی خدمت کرتے۔ بالغ ہو کر انہیں اختیار ملتا کہ خواہ اسی کام میں مشغول رہیں یا دنیوی کاروبار کریں لیکن اگر وہ یہاں قیام اختیار کر لیتے تو پھر انہیں دنیوی کاروبار کا اختیار نہ رہتا تھا۔ یہ بچے اپنے ماں باپ کی خدمت گھر کے کام کاج سے بالکل دور رکھے جاتے تھے چونکہ بنی اسرائیل میں نہ مال غنیمت آتا تھا نہ قیدی۔ اس لئے اس وقف کا رواج تھا کوئی نبی ایسا نہ گذرا جسکی نسل میں بیت المقدس کی

خدمت کے لئے محرر نہ ہوں (تفسیر کبیر) فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ۔ یہ بظاہر دعاء قبول ہے اور در پردہ دعاء فرزند کیونکہ لڑکیاں بیت المقدس میں نہ رکھی جاتی تھیں کہ وہ حیض ونفاس کی وجہ سے فرائض خدمت انجام نہ دے سکتی تھیں۔ اس لئے عرض کیا کہ تو مجھے فرزند دے تا کہ میری نذر پوری ہو اور تو قبول فرمائے۔ بعض نے فرمایا کہ تَقَبَّلْ کے معنی راضی ہو کر قبول کرنا ہیں۔ یہ مقابلہ کا ہم معنی ہے کیونکہ اس کے عوض جزا ملتی ہے۔ بعض کے نزدیک تَقَبَّلْ کے معنی بہ تکلف قبول کرنا ہیں کہ وہ چیز قابل قبول نہ ہو مگر کرم سے قبول کر لی جائے۔ یعنی اے مولیٰ یہ حقیر نذر اگرچہ قابل قبول نہیں مگر تو کرم سے قبول فرمالے۔ عمل سے پہلے اس کی قبولیت کی دعا کر سکتے ہیں۔ نیک فال کے لئے متشابہ ہے کہ عمل کی بھی توفیق دے اور قبول بھی کرے اس واقعہ کے بیان میں ہم لوگوں کو تعلیم ہے کہ اپنے بچوں کا انتظام ان کی پیدائش سے پہلے ہی کرو۔ صالح لڑکی سے نکاح کرو' ماں باپ زمانہ حمل میں اللہ کی یاد' عبادات دعائیں زیادہ کریں۔ بوقت ولادت اللہ کا ذکر کریں۔ پرورش دینی ماحول میں ہو۔ جس چیز کی ابتدا اچھی ہو اس کی انتہا بھی اچھی ہوتی ہے۔ بچہ کی دکان زندگی ناچ گانے میراثیوں کی بکواس پر نہ کھولو۔ اللہ کے ذکر پر کھولو۔ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔ تو ہی میری دعا کا سننے والا اور میری نیت کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا میری یہ دعا اور عاجزی قبول فرما اور فرزند عطا فرما۔ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا۔ وضع کے معنی ہیں رکھنا یہاں مراد ہے جننا کیونکہ جن کر بچہ زمین پر رکھا جاتا ہے۔ اس کا فاعل عمران کی بیوی ہیں۔ ھَا کا مرجع مَا ہے۔ چونکہ رب کے علم میں وہ لڑکی تھی۔ اس لئے ضمیر مؤنث ارشاد ہوئی۔ یا ہر شخص میں نفس وروح ہے جو مؤنث ہے۔ یعنی پس جب انہوں نے اس لڑکی کو یا اس نفس کو جنا تو قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی۔ یہاں بھی وَضَعْتُهَا میں ھا کا مؤنث ہونا نفس اور روح کے لحاظ سے ہے۔ اور انثیٰ ھا کا بدل ہے۔ یا حال اس سے مقصود رب کو خبر دینا نہیں بلکہ فقط اظہار غم ہے کہ نذر کا پورا ہونا بظاہر ناممکن ہو گیا۔ آپ کا یہ غم بے صبری یا ناشکری کا نہ تھا۔ بلکہ ایک نعمت یا ایک عبادت سے محرومی کا تھا کہ بیٹا ہوتا تو خدمتِ بیت المقدس کرتا مجھے دائمی ثواب پہنچتا۔ لڑکی نہ یہ کام کر سکے گی نہ مجھے اجر ملے گا۔ بے صبری کا غم برا ہے محرومی کا غم وحسرت عبادت۔ ایک فقیر اپنے مالدار نہ ہونے پر اس لئے غم کرتا ہے کہ اگر میں مالدار ہوتا تو دوسروں کی طرح میں سینما دیکھتا' شراب پیتا تو یہ مجرم ہے۔ اگر اس لئے غم کرتا ہے کہ میں مالدار ہوتا تو کوٹھیاں' موٹر تیار کرتا نہ مجرم ہے نہ ثواب کا مستحق۔ اگر اس لئے غم کرتا ہے کہ میرے پاس پیسہ ہوتا تو میں بھی زکوٰۃ دیتا' حج کرتا' وغیرہ یہ غم عبادت ہے۔ اور یہ فقیر ان عبادات کا ثواب پائے گا۔ آپ کا یہ غم اس تیسری قسم کا تھا۔ یعنی عرض کیا کہ مولیٰ یہ کیا ہوا میں نے تو لڑکی جنی۔ اب اپنی نذر کیسے پوری کروں۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ۔ ہماری قرأت وضعت ت کے سکون سے ہے اور یہ رب کا فرمان ہے حضور سے خطاب اور اس سے مقصود اس لڑکی کی تعظیم ہے۔ یعنی اے محبوب حنہ کو کیا خبر تھی کہ یہ صاحبزادی کس درجے کی ہے۔ یہ تو رب ہی جانتا ہے کہ کیسی بیٹی ہے۔ بعض قرأتوں میں وضعتُ ت کے پیش سے ہے۔ حنہ کا کلام گویا حنہ نے کہا کہ رب میری مجبوری اور معذوری کو خوب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میرے لڑکی پیدا ہوئی میں نذر کیسے پوری کروں۔ ایک قرأت میں وضعتِ ت کے کسرہ سے ہے۔ رب کا کلام جو حنہ سے ارشاد ہوا یعنی رب نے فرمایا کہ اے حنہ مت گھبراؤ تمہاری مجبوری کو رب جانتا ہے۔ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی۔ یہ بھی تو رب کا کلام ہے۔ جملہ معترضہ اور اَلذَّکَرُ اور اَلْاُنْثٰی میں الف لام عہدی ہے۔ ذکر سے ان کا مانگا ہوا لڑکا مراد ہے۔ اور انثیٰ یعنی یہ ہوئی بچی یعنی ان کا مانگا ہوا بیٹا درجے اور مرتبے میں اس

بیٹی کی طرح نہیں جوان کو دی گئی۔ یہ بیٹی بڑی عظیم الشان ہے اس صورت میں اس لڑکی کو لڑکوں پر فضیلت دینا منظور ہے اور یا یہ حنہ کا کلام ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ بیٹا بیٹی کی طرح نہیں کہ بیٹا بیت المقدس کی خدمت کر سکتا ہے بیٹی نہیں کر سکتی (روح المعانی و کبیر) اور ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے نفس کو تسلی دی ہو اور دل کو سمجھایا ہو کہ اے دل یہ بیٹی بیٹے سے اچھی ہے۔ جو رب کا عطیہ ہے۔ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ۔ اس کلام کے چند مقصود ہیں' ایک حضرت مریم کی یتیمی کا اظہار کیونکہ عمران ان کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ لہٰذا عرض کیا مولیٰ نام رکھنا باپ کا حق ہے مگر چونکہ یتیمہ ہے اس لئے یہ کام میں ہی کرتی ہوں۔ اسی لئے فرمایا اِنِّیْ' یعنی میں نے نام رکھا نہ باپ نے۔ دوسرا رب سے طلب رحمت یعنی اے اللہ یہ بچی یتیمہ ہے اس پر رحم فرما۔ تیسرا اپنے ارادہ کی پختگی کا اظہار یعنی اے مولیٰ اگر یہ بیت المقدس کی خدمت کے قابل نہیں تو وہاں رہ کر عبادت تو کر سکتی ہے میں اس سے خدمت نہ سہی وہاں عبادت ہی کراؤں گی۔ اس لئے اس کا نام مریم رکھتی ہوں۔ یعنی عابدہ اور خادمہ۔ خیال رہے کہ لفظ مریم میں تین قول ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ عربی لفظ ہے۔ بروزن مفعل مصدر میمی بمعنی اسم مفعول۔ بعض نے کہا کہ یہ ماریہ کا معرب ہے بمعنی لڑکی یا خادمہ بعض کے نزدیک یہ لفظ عبرانی ہے بمعنی عابدہ اور یہ ہی صحیح تر ہے (روح المعانی) چونکہ ان کی والدہ کی نیت انہیں بیت المقدس میں رکھنے کی تھی اس لئے ان کا نام بھی مریم بمعنی عابدہ رکھا تا کہ نام کام کے مطابق ہو۔ وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ یہ جملہ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا پر معطوف ہے۔ اُعِیْذُ عوذ سے بنا بمعنی پناہ میں دینا یا پناہ میں آنا۔ جس کی پناہ میں آنا منظور ہو اس پر ب آتی ہے اور جس سے پناہ پکڑی جائے اس پر من اس کی پوری تحقیق اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کی تفسیر میں گزر چکی اسی سے ہے۔ تعویذ یعنی رب سے پناہ حاصل کرنے کا ذریعہ ذریت سے پہلے بِکَ فرمایا گیا تا کہ پتہ لگے کہ دعا میں اصل مقصود یہ ہیں اور اولاد تابع اور ذریت فرما کر حضرت مریم کیلئے عمر و اولاد کی بھی دعا کر لی کیونکہ اولاد بعد بلوغ ہوتی ہے۔ شیطان اور رجیم کی پوری تحقیق پہلے سیپارہ میں دیکھو یعنی اے مولیٰ میں اس مریم اور اس کی اولاد کو مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں تو ان سب کو شیطان سے بچانا اور ان سب کو نیک صالح بنانا۔ رب تعالیٰ نے یہاں پہلی آیت میں تو حضرت مریم کے حمل شریف میں رہنے کے حالات بیان فرمائے۔ دوسری آیت میں آپ کی پیدائش کے حالات۔ اگلی تیسری آیت میں آپ کی پرورش کے واقعات کا ذکر آ رہا ہے۔ غرضکہ بی بی مریم کا پورا میلاد شریف ارشاد ہوا۔ ہم بھی میلاد شریف میں یہ ہی حالات اپنے آقا کے بیان کرتے ہیں۔ بزرگوں کا میلاد پڑھنا سنت الٰہیہ ہے۔ خیال رہے کہ آپ نے یہ دعا یا جناب مریم کی ولادت کے وقت ہی مانگی یا جب مانگی جب کہ مریم کو خدام بیت المقدس کے حوالہ کیا۔ یعنی وداع کے وقت دعائے ماثورہ ہوئی ہم کو بھی چاہیے کہ بچوں کی پیدائش اور لڑکی کی رخصتی کے وقت یہ دعا پڑھ دیا کریں۔ انشاء اللہ لڑکی سسرال میں عافیت سے رہے گی اور اولاد بھی صالح ہوگی۔ اپنی دعاؤں سے دعائے ماثورہ بہتر ہوتی ہے۔ حضرت حنہ کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ رب نے بی بی مریم کو ہر قسم کی گندگی ظاہری و باطنی سے پاک رکھا۔ فرماتا ہے وطھرک اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی خطا بھی سرزد نہ ہوئی۔ اس لئے قیامت میں طلب شفاعت کے موقعہ پر دیگر انبیاء کرام اپنی خطاء کا ذکر کر کے شفاعت سے معذوری ظاہر کریں گے مگر جناب مسیح اپنی کسی خطاء کا ذکر نہ فرمائیں گے کہ بے خطاء ہیں۔ قریب قیامت آپ نکاح کریں گے' اولاد ہوگی' ان کو بھی یہ دعا پہنچے گی۔ اور آپ کی تمام اولاد نیک و صالح ہوگی۔ غرضکہ ماں کی دعا' اور ماں

بھی حضرت حنہ جیسی بہت پرتاثیر ہوتی ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ وہ وقت بھی یاد کرو اور انہیں سناؤ جبکہ عمران کی بیوی حنہ نے حاملہ ہو کر بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ اے مولیٰ چونکہ تو نے مجھے ناامیدی کے بعد اولاد کی امید دکھائی اس لئے نذر مانتی ہوں کہ جو کچھ میرے پیٹ میں اولاد ہے وہ بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف ہے نہ میں اس سے اپنی خدمت لوں نہ گھر کے کام کاج۔ اے مولیٰ یہ میرا حقیر ہدیہ اپنے فضل وکرم سے قبول فرمالے۔ تو میرے کلام کا سننے والا اور میری نیت واخلاص کا جاننے والا ہے۔ وہ لڑکے کی امید پر بہت خوش وخرم تھیں۔ جب وقت ولادت آیا اور حضرت مریم پیدا ہوئیں تو حیران رہ گئیں اور عرض کرنے لگیں کہ اے مولیٰ یہ کیا ہوا۔ میرے تو لڑکی پیدا ہوگئی۔ اب میں اپنی نذر کیسے پوری کروں۔ اے محبوب حنہ کیا جانیں کہ لڑکی کیسی ہے یہ تو رب ہی جانتا ہے کہ وہ لڑکی کس درجہ کی ہے۔ لڑکا اس لڑکی کی طرح ہوسکتا ہی نہیں۔ انہوں نے یہ بھی عرض کیا کہ اے مولیٰ چونکہ ان کے باپ تو پہلے ہی وفات پا گئے ہیں اس لئے میں ہی ان کا نام مریم رکھتی ہوں بمعنی عابدہ اور میری نیت یہ ہے کہ یہ بیت المقدس میں رہ کر تیری عبادت کرے تاکہ بقدر طاقت میری منت پوری ہو۔ اے مولیٰ چونکہ میں انہیں اپنے سے الگ بیت المقدس میں رکھوں گی اس لئے میں اس کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کہ تو شیطان سے بچا اور اسے صالح پرہیزگار رہنا۔

خیال رہے کہ بیٹے کی دعا خواہش کرنا سنت انبیاء بھی ہے سنت اولیاء بھی۔ حضرت ابراہیم وزکریا علیہما السلام نے فرزند کی دعا کی۔ بی بی حنہ نے جو لیتھیں بیٹے کی دعا کی مگر یہ تمام دعائیں دنیاوی اغراض کے لئے نہ تھیں صرف دین کے لئے تھیں کہ خدا ہمیں بیٹا دے وہ دین کی خدمتیں کرے ہم کو ثواب ملے جیسے دوسرے کاموں میں اخلاص ہو تو برکت ہوتی ہے۔ ریا ہو تو بے برکتی۔ ایسے ہی طلب اولاد اگر دین کے لئے ہو تو اولاد برکت والی ہے اگر دنیا کے لئے ہے تو نہ عذاب نہ ثواب اگر بری نیت کے لئے ہو تو نقصان دہ۔ حضرت مریم کی یہ عظمتیں بی بی حنہ کے اخلاص کی برکت سے تھیں۔ ماں باپ کا اخلاص اولاد کے کام آتا ہے۔

اصل واقعہ

فاقوذا کی دو بیٹیاں تھیں۔ حنہ اور ایشاع۔ حنہ عمران کے نکاح میں آئیں اور ایشاع حضرت زکریا بن اذن علیہ السلام کے نکاح میں۔ یہ دونوں بہنیں لاولد تھیں۔ یہاں تک کہ انہیں بڑھاپا آگیا۔ اور اولاد سے مایوسی ہوگئی۔ ایک دن حضرت حنہ نے ایک چڑیا کو دیکھا کہ وہ اپنے بچے کو دانہ کھلا رہی ہے آپ کے دل میں اولاد کا شوق پیدا ہوا اور دعا کی کہ مولیٰ یہ چڑیا بچے سے اپنا دل بہلا رہی ہے۔ مجھے بھی ایک فرزند دے۔ جو میرے دل بہلانے کا ذریعہ ہو۔ یا تو اسی وقت وقف کی منت مان لی یا حمل کے بعد غرض کہ یہ دعا مانگنا تھی کہ انہیں حیض جاری ہوا۔ حیض سے فارغ ہوتے ہی حاملہ ہوگئیں۔ اور عمران سے کہنے لگیں کہ میں نے یہ منت مانی ہے۔ عمران نے کہا تم نے یہ کیا کیا۔ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو کیا کرو گی۔ تب بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ اے مولیٰ میں منت مان چکی ہوں کہ جو کچھ میرے شکم میں ہے وہ بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ اس سے نہ خدمت لوں گی نہ گھر کا کام کاج۔ اس زمانہ میں اس وقف کا رواج تھا کہ لوگ اپنی اولاد کو بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کردیتے

تھے۔ اور وہ بچے وہاں ہی رہتے سہتے تھے اور وہاں کی خدمت کرتے تھے۔ جیسے آج کل روضۂ مطہرہ اور کعبہ معظمہ میں خدام رہتے ہیں۔ جنہیں اغوات کہا جاتا ہے۔ اس قاعدہ سے آپ نے یہ منت مانی اور خوش تھیں کہ جب میری دعا پر رب نے مجھے یہ امید دکھائی ہے تو بیٹا ہی پیدا ہوگا کیونکہ میں نے بیٹا ہی مانگا تھا۔ اسی اثناء میں حضرت عمران وفات پا گئے۔ جب وقت ولادت آیا اور حضرت مریم پیدا ہوئی تو حنہ کو خلاف امید لڑکی پیدا ہونے اور اپنی نذر پورا نہ کرسکنے پر بہت افسوس ہوا تب وہ دعا مانگی جو اس آیت میں مذکور ہے۔ بقیہ قصہ اگلی آیتوں میں آرہا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کچھ لوگوں کا اپنے آپ کو دین کے لئے خالص کردینا ضروری ہے۔ اگر سب لوگ دنیا میں مشغول ہو جائیں تو دین کیسے قائم رہے۔ کاش مسلمان اس سے عبرت پکڑیں اور اپنی بعض اولاد کو خدمت دین کے لئے وقف کردیں۔ جنہیں بچپن سے اس کے لئے تیار کریں، مگر افسوس کہ اب مسلمان کی نظر روٹی پر رہ گئی اور وہ سمجھ بیٹھے کہ انگریزی میں روٹیاں اچھی ملتی ہیں۔ گویا ان کے عقیدہ میں انگریز رازق ہیں مگر یاد رکھو کہ تمہاری عزت دین سے ہے اور دین کی بقا علماء اور صالحین سے اگر اپنی بقا چاہتے ہو تو اپنی جماعت میں ایسے لوگ زیادہ بناؤ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ **فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ۔** (التوبہ:۱۲۲) **دوسرا فائدہ:** اسلام میں بھی ایسی نذر صحیح ہے کہ کوئی شخص اپنے بچے کو دین کے لئے وقف کرنے کی منت مانے اور اس سے کوئی دنیوی کام نہ لے کیونکہ یہ عبادت ہے اور ہر عبادت میں نذر درست (احکام القرآن) بعض مفسرین کا اس کی ممانعت فرمانا بلا دلیل ہے۔ بغیر انکار گذشتہ امتوں کا واقعہ منقول ہونا جواز کی دلیل ہے قرآن کریم نے اس کی ممانعت نہ کی۔ پھر بلا دلیل کیوں منع کیا جائے۔ **تیسرا فائدہ:** نذر شرعی کا پورا کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جیسا کہ لَکَ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** نذر کا تعلق آئندہ زمانہ سے ہوتا ہے جیسا کہ مَا فِيْ بَطْنِيْ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** نامعلوم چیز کی نذر جائز ہے۔ یہ بھی مَا فِيْ بَطْنِيْ سے معلوم ہوا۔ حنہ کی نذر کے وقت خبر نہ تھی کی لڑکی ہوگی یا لڑکا مگر نذر مان لی۔ خیال رہے کہ نذر شرعی جس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس میں تین شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس کام کی نذر مانی جائے وہ عادت نہ ہو۔ عبادت ہو۔ دوسرا یہ کہ وہ عبادت کہیں نہ کہیں واجب ہو ہر جگہ نفل نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ اللہ کے نام کی ہو۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط نہ ہوگی۔ تو وہ نذر شرعی نہیں۔ نذر لغوی ہے اس زمانہ کے لحاظ سے یہ نذر شرعی تھی کہ بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف اولاد اس زمانہ میں عبادت دین واجبہ تھی۔ نذر لغوی بھی پوری کرنا چاہیے اگرچہ واجب نہیں۔ ایک صحابی نے بیت المقدس میں چراغ جلانے کی منت مانی تھی۔ ایک لونڈی نے حضور کے آگے دف بجانے کی نذر مانی تھی۔ یہ دونوں لغوی نذریں تھیں حضور ﷺ نے ان کے پورا کرنے کی اجازت دی۔ **چھٹا فائدہ:** اولاد کی پرورش، تعلیم، تربیت وغیرہ میں ماں کا بھی حق ہے اگر یہ نہ ہوتا تو حنہ کو اس نذر کا اختیار بھی نہ ہوتا۔ **ساتواں فائدہ:** ماں کو اپنی اولاد کے نام رکھنے کا حق ہے اگر باپ نہ رکھے تو۔ حضرت حنہ نے دختر کا نام مریم رکھا۔ اور رب نے بھی انہیں اسی نام سے یاد کیا۔ یہ تمام مسائل احکام القرآن سے لئے گئے۔ **آٹھواں فائدہ:** [illegible] کار بننا جائز ہے جیسا کہ اس

آیت کے مضمون سے معلوم ہوا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قبر انور کی منتظمہ تھیں اور اس وقت سے اب تک روضۂ رسول اللہ ﷺ پر خدام رہتے ہیں۔ جس حدیث میں قبر پر بیٹھنے کی ممانعت آئی۔ اس سے قبر پر چڑھ کر بیٹھنا مراد ہے نہ کہ وہاں کا مجاور بننا۔ **نواں فائدہ:** بزرگانِ دین کے قصے سننا' پڑھنا' یاد کرنا باعث برکت ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے حنہ کا پورا قصہ قرآن شریف میں بیان فرمایا کہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ **دسواں فائدہ:** مرد عورت سے افضل ہے مگر بعض عورتیں مردوں سے بڑھ کر جیسا کہ لَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى۔ سے معلوم ہوا۔ **گیارھواں فائدہ:** اولاد کے نام اچھے رکھنے چاہئیں کہ اکثر نام کا اثر کام پر پڑتا ہے' جیسا کہ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ لڑکی لڑکے سے افضل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا گیا اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء: ۳۴) اور ایک مقام پر فرمایا گیا وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: ۲۲۸) ان میں مطابقت کیونکر ہو؟
جواب: نوعِ مرد نوعِ عورت سے افضل ہے لیکن بعض عورتیں بعض مردوں سے افضل ہیں یعنی مردیت عوریت سے بڑھ کر نبوت سلطنت قضاء امامت مردوں کے لئے خاص ہیں۔ اگرچہ عورتوں کے بعض افراد مردوں سے بڑھ جائیں۔ اس آیت میں افراد کا ذکر ہے ان آیتوں میں نوعیت کا۔

حکایت: ایک جگہ روح البیان نے فرمایا کہ کسی نے حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سامنے مردوں کی بڑائی بیان کی۔ آپ نے فرمایا کہ عورتوں کو برا نہ جانو۔ عورتیں انبیاء و اولیاء کی کان ہیں۔ بعض نبی بغیر باپ پیدا ہو گئے مگر کوئی پیغمبر بغیر ماں صرف باپ سے پیدا نہیں ہوا۔ اعلیٰ چیز کا سانچہ بھی اعلیٰ ہوتا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت حنہ کو لڑکی پیدا ہونے کا رنج ہوا اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی پر رنج کرنا طریقہ کفار ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (نحل: ۵۸)۔ پھر حضرت حنہ سے یہ فعل کیوں واقع ہوا؟ **جواب:** لڑکی سے نفرت اور صرف لڑکے سے محبت کرنا واقعی برا ہے۔ یہاں یہ نہ ہوا انہیں رنج اس کا تھا کہ اب میری نذر کیسی پوری ہوگی۔ نیز چونکہ بیٹے کی امید تھی اور خلاف امید لڑکی ہوئی۔ اس پر قدرے ملال ہوا۔ نیز لڑکوں سے غیر اختیاری محبت سب کو ہوتی ہے مگر لڑکی سے نفرت یا لڑکے کو اس پر ترجیح دینا یا اس کی پیدائش پر ناشکری کے الفاظ بولنا برا ہے۔
تیسرا اعتراض: کیا اسلام میں اولاد کا ایسا وقف صحیح ہے؟ **جواب:** ہاں صحیح ہے مگر کچھ فرق کے ساتھ۔ وقف شرعی مملوک مال کا ہی جائز ہے۔ اولاد کا وقف لغوی درست ہے۔ یعنی دین کے لئے روک دینا۔ **چوتھا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کے ماموں تھے کیونکہ وہ حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی تھے مگر حدیث معراج میں ہے کہ یحییٰ و عیسیٰ سے ملاقات کی جو آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** حدیث میں مجازاً اس طرح فرمایا گیا یعنی حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام میں خالہ کا رشتہ ہے۔ بعض نے کہا کہ حضرت ایشاع حنہ کی اخیافی بہن ہیں۔ اور حضرت مریم کی علاتی بہن کہ عمران نے پہلے حنہ کی ماں سے نکاح کیا۔ جس سے ایشاع پیدا ہوئیں۔ پھر حنہ سے اس دین میں ربیبہ سے نکاح جائز تھا لہٰذا یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کے ماموں بھی ہوئے اور خالہ زاد بھائی بھی مگر

پہلا جواب قوی ہے۔ (تفسیر روح المعانی) **پانچواں اعتراض:** بی بی حنہ نے حضرت مریم کی دعا میں صرف شیطان کا ذکر کیوں فرمایا۔ انسان کے دشمن تو لاکھوں ہیں ان کا ذکر کیوں نہ کیا؟ **جواب:** دو وجہ سے ایک یہ کہ دشمن چار قسم کے ہیں۔ دشمن جان‘ جیسے قاتل موذی انسان و سانپ وغیرہ دشمن مال جیسے چور ڈاکو وغیرہ۔ دشمن آبرو جیسے حاسد لوگ۔ دشمن ایمان جیسے نفس امارہ و برے ساتھی و شیاطین۔ ان تمام دشمنوں میں دشمن ایمان سخت تر ہے۔ وہ شیطان ہے۔ آپ نے اس سخت خطرناک دشمن ہی سے پناہ مانگی۔ دوسرا یہ کہ جانی دشمن دیکھنے میں آتے ہیں۔ انہیں مار بھی سکتے ہیں۔ مقابلہ بھی کر سکتے ہیں مگر شیطان وہ موذی و خطرناک دشمن ہے جو نہ دیکھنے میں آئے نہ ہم سے مار کھائے۔ نہ بادشاہ کی جیل و پھانسی اس پر چل سکے بجز رب کے کرم کے اور کوئی ذریعہ اس سے بچنے کا نہیں۔ اس لئے خصوصیت سے اس سے پناہ مانگی۔ **چھٹا اعتراض** دشمن ایمان بھی بہت ہی ہیں۔ شیطان‘ نفس امارہ‘ برے ساتھی وغیرہ پھر صرف شیطان کا ذکر کیوں ہوا۔ **جواب** شیطان ان سب کا گرو ہے۔ اگر انسان اس سے بچ گیا سب سے بچ گیا۔ نفس وغیرہ کو یہ ہی بہکاتا ہے اگر نفس اس کے شر سے محفوظ ہو جائے تو بجائے امارہ کے مطمئنہ بن جاتا ہے پھر وہ نفس اچھے مشورے دیتا ہے۔

تفسیر صوفیانه

جیسے غذا کا اثر اولاد پر پڑتا ہے۔ ایسے ہی نیتوں کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔ جس کی غذا حلال طیب ہو۔ اور نفس نورانی۔ نیت سچی و حقانی ہو۔ تو انشاء اللہ اس کی اولاد نیک صالح بلکہ ولی ہوگی۔ اور جس کی غذا حرام‘ نفس ظلمانی اور خبیثہ‘ نیت فاسدہ ہو اس کی اولاد فاسق‘ خبیث بلکہ کافر ہوگی۔ کیونکہ نطفہ غذا سے پیدا ہوتا ہے اور نفس سے پرورش پاتا ہے۔ اس لیے اس کا اثر قبول کرتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا اَلْوَلَدُ سِرٌّ اَبِیْهِ۔ اولاد باپ کا راز ہے حضرت مریم کا صدق اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ درجہ عمران کی نیک نیتی اور حضرت حنہ کے سچے ارادے کا نتیجہ تھیں۔ (ابن عربی و روح البیان) ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خبیثوں کے گھر طیب اولاد اور طیب کے گھر خبیث اولاد ہو جاتی ہے مگر بہت کم نیت کا اثر صرف اولاد پر ہی نہیں پڑتا۔ بلکہ مال اعمال کاروبار سب پر پڑتا ہے۔ نیک نیتی سے مال میں برکت اور عمل کی قبولیت ہے۔ بدنیت کا نہ عمل قبول نہ مال مبارک۔ چاہیے کہ عمل سے پہلے نیت کی جائے تا کہ سارے اعمال درست ہوں۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ؕ
پس قبول کیا اس کو رب نے ان کے ساتھ قبول اچھے کے اور بڑھایا اسے بڑھانا اچھا اور نگہبان بنایا اس کا زکریا کو
تو اسے اس کے رب نے اچھی طرح قبول کیا اور اسے اچھا پروان چڑھایا اور اسے زکریا کی نگہبانی میں دیا
كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰى
جب داخل ہوتے اوپر اس کے زکریا محراب میں تو پاتے نزدیک اس کے رزق کہا انہوں نے اے مریم کہاں سے
جب زکریا اس کے پاس اس کی نماز پڑھنے کی جگہ جاتے اس کے پاس نیا رزق پاتے کہا اے مریم یہ تیرے

لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

ہے واسطے تمہارے یہ وہ بولیں وہ پاس سے اللہ کے ہے تحقیق اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب

پاس کہاں سے آیا بولیں وہ اللہ کے پاس سے ہے بیشک اللہ جسے چاہے بے گنتی دے

تعلق

اس آیت کریمہ کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت حنہ کی دعا کا ذکر تھا۔ اب اس کی قبولیت کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت حنہ کی بزرگی ان کے اخلاص اور ان کی نذر کا تذکرہ تھا۔ اب ان کی صاحبزادی حضرت مریم کی عظمت' شان اور مقبولیت بارگاہ اور منظوریٔ نذر کا تذکرہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت پاک کی تمہید تھی۔ اب ولادت یحییٰ کی تمہید ہے علیہ السلام۔

تفسیر

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ یہاں باب تفعل زیادتی اور مبالغہ کے لئے ہے ھا کا مرجع حضرت مریم ہیں۔ اور دوسرے ھا کا مرجع یا مریم ہیں یا حنہ چونکہ قبول اور تقبل ہم معنی ہیں۔ اس لئے بجائے فتقبل کے بِقَبُوْلٍ فرمایا گیا۔ نیز چونکہ تَقَبُّل میں تکلفاً قبول کرنے کا احتمال تھا۔ اس کو دفع کرنے کے لئے بِقَبُوْلٍ فرمایا گیا۔ سیبویہ نے کہا کہ پانچ مصدر بروزن فعول آتے ہیں۔ قبول' طہور' وضو اور قعود اور ولوع قبول حسن میں چند احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ باوجودیکہ لڑکی خدمت بیت المقدس کے قابل نہیں۔ مگر حضرت حنہ کے اخلاص کی بناء پر مریم کو قبول فرمالیا۔ دوسرے یہ کہ حضرت مریم اور ان کے فرزند عیسیٰ علیہ السلام کو پاکدامن اور شیطان سے محفوظ رکھا۔ تیسرے یہ کہ انہیں گندے اخلاق اور بری باتوں سے بچایا۔ چوتھے یہ کہ حضرت مریم نے کسی کا دودھ نہ پیا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بچپن میں کلام کیا (تفسیر کبیر و معانی وغیرہ) یعنی رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو راضی ہو کر اچھی طرح قبول فرمالیا اور حنہ کی ساری دعائیں منظور کیں۔ کہ مریم کو اول ولادت سے خاتمہ زندگی تک شیطان سے محفوظ رکھا۔ یہاں رب تعالیٰ نے فَتَقَبَّلَ فرما کر بتایا کہ ہم نے حنہ کی ساری دعائیں من وعن اسی طرح قبول فرمائیں۔ جس طرح انہوں نے دعائیں مانگیں۔ کوئی دعا رد نہ فرمائی۔ ھا فرما کر بتایا کہ ان کی دعا کی وجہ سے اپنا قانون بدل دیا۔ کہ بیت المقدس کی خدمتگاروں میں لڑکی کا ہونا۔ اس زمانہ کے قانون کے خلاف تھا۔ جیسا کہ آج اسلام میں عورت کا امام نماز بننا۔ بزرگوں کی دعا سے قانون بدل دیئے جاتے ہیں۔ قبول حسن فرما کر بتایا کہ ان بی بی حنہ کی دعا سے زیادہ مریم کو نعمتیں دی گئیں۔ انہوں نے صرف یہ دعا مانگی تھی کہ مریم شیطان کے شر سے محفوظ رہیں۔ ہم نے بھی یہ قبول فرمائی اور کئی دن مریم کو جنتی ہونے' میوے دینا نبی کی پرورش میں رہنا زیادہ اچھی طرح پروان چڑھانا بھی بخشا۔ جو ان کی دعا کے سواء ہے پھر عیسیٰ روح اللہ کی ماں بننا اور آپ کے ہاتھ سے کرامات کا ظاہر ہونا۔ قرآن شریف میں آپ کا ذکر ہونا' تاقیامت آپ کا ذکر خیر دنیا میں رہنا یہ سب چیزیں ان کی دعا کے سوا ہیں۔ وَاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا اَنْۢبَتَ نَبَات سے بنا۔ لغت میں نبات پھیلنے والی گھاس کو کہتے ہیں۔ جس کا تنا نہ ہو۔ پھر استعمال میں ہر بڑھنے والی شے پر بولنے لگے۔ سبزی ہو یا درخت حیوان ہو یا انسان' انبات

بمعنی اگانا' بڑھانا' نباتاً یا تو انبت کا مفعول مطلق ہے۔ یا انبت پوشیدہ فعل کا اور اصل عبارت یوں ہے۔ وانبتھا فنبت ھی نباتا حسنا۔ یعنی پرورش کرنا مراد ہے۔ جس سے مراد دینی خوبی بھی ہے اور دنیوی بھی۔ چنانچہ حضرت مریم ایک دن میں اتنی بڑھتی تھیں جیسے دوسرے بچے ایک سال میں۔ نیز وہ شروع سے ہی عابدہ' زاہدہ اور رب کی فرمانبردار ہوئیں۔ یعنی رب تعالیٰ نے مریم کو اچھی طرح پالا پرورش کیا اور پروان چڑھایا۔ ایسی پرورش ماں باپ سے ممکن نہ تھی۔ وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا یہ اَنۡبَتَ پر معطوف ہے۔ اور کَفَّلَ تکفیل سے بنا جس کا مادہ کفل ہے بمعنی حصہ ضمانت اور ذمہ داری کو کفالہ اور ضامن یا ذمہ دار کو کفیل اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں دوسرے کے بوجھ کا کچھ حصہ اپنے پر رکھا جاتا ہے۔ پرورش کرنے والے مربی کو کافل کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے اَنَا وَ كَافِلُ الۡيَتِيۡمِ كَهَاتَيۡنِ یا تو کَفَّلَ بمعنی تکفل ہے۔ اور زکریا اس کا فاعل یا کفل اپنے ہی معنی میں ہے اور اس کا فاعل رب تعالیٰ اور ھا مفعول اول اور زکریا مفعول دوم۔ زکریا عجمہ اور علمیت کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ بعض نے کہا کہ تانیث بالالف کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ اس میں تین لغتیں ہیں۔ زکر بغیر یا کے زکری بغیر الف کے اور زکریا ی اور الف کے ساتھ۔ آپ کا نسب شریف یہ ہے۔ زکریا ابن اذن ابن مسلم ابن صدون۔ صدون حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ ابن داؤد ابن ایشا ابن حویل ابن سلمون ابن یاعر ابن مھون ابن عمیاداب ابن دام ابن حضروم ابن فارض ابن یہودا ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام (روح البیان) یعنی رب تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو جو مریم کے خالو تھے۔ حضرت مریم کی نگہبانی کا ذمہ دار بنایا۔ بعض نے کہا کہ حضرت زکریا کی ذمہ داری دودھ چھوڑنے کے بعد شروع ہوئی کیونکہ اس کا ذکر اَنۡبَتَهَا کے بعد ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت مریم کی پرورش پہلے ہوئی۔ اور زکریا علیہ السلام کی نگہبانی دودھ چھوٹنے کے بعد مگر صحیح یہ ہے کہ شروع سے ہی حضرت مریم زکریا کی پرورش میں آئیں اور آپ نے ماں کا دودھ بالکل نہ پیا۔ احادیث اس کی گواہ ہیں۔ اور واؤ ترتیب نہیں چاہتا۔ (روح المعانی وکبیر وغیرہ) رب تعالیٰ نے بی بی مریم کی یہاں چند فضیلتیں بیان فرمائیں۔ ان کا اعلیٰ خاندان سے ہونا۔ حضرت عمران وحنہ کا چشم وچراغ ہونا۔ رب کا انہیں قبول فرمالینا اور اچھی طرح انہیں پروان چڑھانا۔ حضرت زکریا کی پرورش میں رکھنا' ان کی پرورش محرم مقام یعنی خاص بیت المقدس کے بالا خانہ میں ہونا۔ جو لڑکی خود بھی اعلیٰ ہو' خاندان بھی اعلیٰ' تربیت دینے والے بھی کامل' پرورش کی جگہ بھی افضل ہو۔ غور کرلو وہ بچی کس شان کی مالک ہوگی۔ نبی کی ایک آن کی صحبت' جانوروں' لکڑیوں' پتھروں کو متبرک کردیتی ہے۔ اصحاب کہف کا کتا' کعبہ کا غلاف' قرآن شریف کا جزدان' مدینہ منورہ کے کنکر' پتھر عظمت والے ہیں۔ تو جناب مریم ایسی جگہ اور ایسی تربیت میں کیسی شان والی ہوں گی۔ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ۔ كُلَّمَا عموم وقت کے لئے ہے۔ مِحۡرَاب حرب بمعنی جنگ سے بنا۔ بروزن مفعال صیغہ مبالغہ کا ہے۔ جیسے معطان عبادت کے مقام کو محراب کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں نفس اور شیطان سے بذریعہ عبادت جنگ کی جاتی ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ اسم آلہ بمعنی ظرف مکان ہے۔ کیونکہ یہ شیطان سے جنگ کی جگہ ہے۔ شاعر کہتا ہے

جَمَعَ الشُّجَاعَةَ وَالۡخُشُوۡعَ لِرَبِّهٖ مَا اَحۡسَنَ الۡمِحۡرَابَ فِي الۡمِحۡرَابِ

(روح المعانی)

خیال رہے کہ مفعال ظرف زمان کے لئے بھی آتا ہے۔ اور ظرف مکان کے لئے بھی جیسے میلاد اور معراج یہاں مراد بالا خانہ ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ۔ عمر ابن ربیعہ کہتا ہے

رَبَّةُ مِحْرَابٍ اِذَا جِئْتُهَا لَمْ اُدْنُ فِيْ اِرْتَقِيَا سُلَّمَا

چنانچہ روایت میں ہے کہ زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے لئے ایک بالا خانہ بنایا تھا جس کے سات دروازے تھے۔ وہاں ان کو رکھا یا اس سے بیت المقدس کی کوئی اعلیٰ جگہ مراد ہے۔ یا مسجد ہی مراد ہے۔ اس زبان میں ساری مسجد کو محراب کہتے تھے جیسے اب مسجد کے غربی دیوار کے درمیانی حصہ کو محراب کہا جاتا ہے۔ جہاں کمان نما طاق بنا ہوتا ہے۔ جیسے آج بیت اللہ مسجد حرام پورے مکہ معظمہ حدود مکہ کو حرم کہتے ہیں۔ بلکہ مسجد نبوی شریف حدود مدینہ کو بھی حرم کہا جاتا ہے۔ یعنی حرمت والی جگہ ایسے ہی لفظ محراب بہت معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ یہاں بیت المقدس کا بالا خانہ وہاں کا کوئی خاص مقام مراد ہے جو حضرت مریم کی پرورش کے لئے منتخب ہوا تھا۔ یعنی جب زکریا علیہ السلام حضرت مریم کے پاس ان کے بالا خانے یا مسجد میں جاتے تو وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا رزق اگرچہ رب کے ہر عطیہ کو کہا جاتا ہے۔ مگر جب مطلق بولا جائے تو اس سے کھانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے مَا اُرِيْدُ مِنْ رِّزْقٍ (الذاریات: ۵۷) یا جیسے وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ (الذاریات: ۲۲) ابن جریر نے حضرت ربیع سے روایت کی کہ یہاں رزق سے مراد بے موسم پھل ہیں۔ یعنی سردی کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل سردی میں۔ رِزْقًا کی تنوین تعظیمی ہے۔ یعنی عظیم الشان رزق سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ یہ جنت کے پھل ہوتے تھے۔ (روح المعانی) یعنی حضرت زکریا مریم کے پاس عظیم الشان پھل پاتے تھے۔ خیال رہے کہ جنت میں دانے نہیں پھل ہیں۔ دانے غذا کے لئے کھائے جاتے ہیں۔ پھل لذت کے لئے۔ وہاں غذا کی کوئی ضرورت نہیں حضرت آدم کے لئے آزمائش کے طور پر عارضی گندم وہاں تھی۔ نیز جنت کے پھل بعض حضرات نے جنت میں جا کر کھائے ہیں۔ بعض نے زمین پر رہ کر حضرت مریم وخبیب نے زمین پر رہ کر کھائے۔ نیز جنت کے پھل پانی وغیرہ تو کھائے بھی گئے۔ اور کھائے بھی جائیں گے۔ مگر وہاں کی حوروں کا استعمال قیامت کے بعد ہوگا۔ ورنہ حضرت حوا کی پیدائش کی ضرورت نہ ہوتی۔ نیز وہاں کے پھل کھانے سے ختم نہیں ہوتے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَّ اُكُلُهَا دَآئِمٌ۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر ہم جنت کے پھل آج توڑ لیتے تو تم قیامت تک کھاتے دیکھو ہوا دھوپ استعمال سے کم نہیں ہوتے۔ حضرت مریم وہ پھل کھا بھی لیتی تھیں اور واپس بھی ہو جاتے تھے۔ کھانے سے ختم نہ ہوتے تھے۔ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا۔ یہ نیا جملہ ہے۔ جو گذشتہ مضمون کو واضح کر رہا ہے۔ اَنّٰى کی نفیس تحقیق ہم دوسرے سپارہ میں کر چکے کہ اس کے معنی یا من این ہوتے ہیں۔ یا کیف یا صرف این اور من پوشیدہ چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

تَمَنّٰى بِوَادِي الرِّمْثِ زَيْنَبُ ضَلَّةً فَكَيْفَ وَمَنْ اَنّٰى بِذِي الرِّمْثِ تَطْرُقُ

یہاں اَنّٰى بمعنی این ہے۔ دوسرا شاعر کہتا ہے

اَنّٰى وَمَنْ اَيْنَ اٰبَكَ الطَّرَبُ مَنْ حَيْثُ لَا صَبْوَةٌ وَلَا رِيَبُ

یہاں اَنّٰى بمعنی کیف ہے۔ آیت میں دونوں معنی درست ہیں۔ یعنی تو فرماتے کہ اے مریم تمہارے پاس یہ کہاں سے آئے آج کل اس کا موسم نہیں [illegible] تم [illegible] تمہیں [illegible] کا یہ سوال نہ تو بے خبری سے تھا نہ تعجب یا

حیرت ہے کہ آپ تو جانتے تھے کہ یہ جنتی پھل ہیں۔ یہ سوال آپ کی فہم و سمجھ آزمانے کے لئے تھا رب نے بھی یہ واقعہ قرآن کریم میں اس لئے نقل فرمائے کہ مسلمانوں کو ولی کی کرامات وفہم وادراک کا پتہ لگے۔ ان کے عقائد درست ہوں۔ ان دونوں باتوں کا جواب یہ دیتیں۔ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ کا مرجع رزق ہے۔ اور مِنْ عِنْدِ کا متعلق جآء ہے۔ اور اس سے مراد بغیر وسلیہ انسان آنا ہے۔ یعنی آپ تعجب نہ کریں یہ جنت کا رزق ہے۔ رب کے پاس سے بلا واسطہ انسان آیا۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت مریم کا یہ کلام بچپن شریف کا ہے۔ اور کیا جامع الکلام ہے جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ اللہ کی ذات کو جانتی ہیں۔ اس کے صفات کو بھی وہ رازق ہے۔ اس کی قدرت کو بھی کہ وہ جنت کے پھل دنیا میں بھیج سکتا ہے۔ جنت کو بھی جانتی ہیں۔ وہاں کے پھل بھی پہچانتی ہیں۔ بلکہ لانے والے فرشتہ کو بھی پہچانتی ہیں۔ کہ یہ فرشتہ ہے جنت سے پھل لایا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ یا تو یہ حضرت مریم کا کلام ہے۔ حساب کے چند معنی ہیں۔ گمان' اندازہ' محاسبۂ دنیا میں یا آخرت میں یہاں سب معنی درست ہیں۔ یعنی رب جسے چاہے۔ ایسی جگہ سے روزی دے جہاں اس کا گمان بھی نہ ہو' کھیت نوکری مزدوری گمان والے دروازے ہیں مگر جنت کے پھل بے گمان جگہ سے آتے ہیں۔ یا جسے چاہے بے اندازہ روزی دے اور اس کا دنیا وآخرت میں حساب نہ لے۔ میرے اس رزق میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں۔ قانون میں حساب ہے محبت میں حساب نہیں ہوٹل کا کھانا قانون وحساب سے ملتا ہے۔ مگر دوستوں کے گھر دعوت میں بغیر حساب ملتا ہے۔ دنیا عوام کے لئے دوکان ہے خواص کے لئے محبوب کا گھر عوام کو حساب سے مل رہا ہے۔ خواص کو بلا حساب میرے پاس بھی یہ رزق ایسی جگہ سے آرہا ہے جو انسان کی عقل وگمان سے باہر ہے۔ یا یہ کلام رب تعالیٰ کا ہے۔ اور حساب بمعنی گنتی یا حساب آخرت یعنی رب جسے چاہے بے گنتی یا بلا حساب دے۔

خلاصہ تفسیر

حضرت حنہ کی دعا کا یہ نتیجہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے ان کی صاحبزادی کو باوجود لڑکی ہونے کے برضا اچھی طرح قبول فرمالیا کہ انہیں سارے وہ اوصاف بخشے جن کی حضرت حنہ کو آرزو تھی۔ اور حضرت مریم کو دینی ودنیوی لحاظ سے عمدہ طرح پالا اور پروان چڑھایا کہ انہیں بلا تربیت اور بلا تعلیم اچھے اخلاق' شوق عبادت' پاکدامنی بخشی اور اول سے آخرت تک شیطان سے محفوظ رکھا۔ اور اپنے زمانہ کی ساری عورتوں سے انہیں اجمل واکمل کیا اور ان کی پرورش کا ذمہ دار اور نگہبان ان کے خالو حضرت زکریا نے ان کی کرامت یہ دیکھی کہ وہ جب کبھی حضرت مریم کے پاس مسجد کے اس حصہ میں جاتے جو حضرت مریم کا قیام گاہ تھا جو باوجود مقفل ہونے کے ان کے پاس غیبی بے موسم پھل پاتے ایک دن انہوں نے مریم کی عقل ودانائی آزمانے کے لئے ان سے پوچھا کہ اے مریم تمہارے پاس یہ پھل کہاں سے آتے ہیں۔ جب بازار میں نہیں ملتے۔ تمہیں کہاں سے مل جاتے ہیں۔ اور تم تک کیسے پہنچ جاتے ہیں حالانکہ تمہارے پاس صرف میں ہی آتا ہوں۔ اور تم قفل میں رہتی ہو۔ تو انہوں نے اس عمر شریف میں کیا نفیس جواب دیا۔ کہ یہ بلا وسیلہ انسان میرے پاس رب کے پاس سے آتے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے بغیر وہم وگمان عطا فرماتا ہے۔ یا بے گنتی اور بے حساب دیتا ہے۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت مریم بلکہ تمام گذشتہ انبیاء اولیاء پر احسان ہے۔ کہ حضور ﷺ نے ان سب کے دامن سے لوگوں کی تہمتوں کے داغ دھوڈالے اور ان کے نام دنیا میں چمکا دیئے۔ ورنہ

یہود نے حضرت مریم کو بہتان لگا دیئے تھے۔ اسلام کی وسعت قلبی ہے کہ عیسائی یہودی اسلام کو برا کہیں۔ بانی اسلام کو گالیاں دیں۔ مگر اسلام نے ان کے مانے ہوئے بزرگوں کی گواہیاں دیں۔ ہمیشہ مدعی اپنے گواہ کی تعریف کرتا ہے کہ مقدمہ اس کی گواہی پر جیتنا ہے۔ ہمارے حضور ﷺ سب نبیوں کے گواہ برحق ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ وہ اپنے اس گواہ اعظم محمد رسول اللہ ﷺ کے مخالف ہیں۔ اگر حضور سچے نہیں تو ان کے دینوں نبیوں' کتابوں کی حقانیت کیسے ثابت ہوگی۔ انہیں چاہیے کہ اپنے نبیوں کی حقانیت کے لئے حضور ﷺ کو برحق مانیں۔

واقعہ

حضرت حنہ نے مریم کے پیدا ہوتے ہی انہیں ایک کپڑے میں لپیٹا اور بیت المقدس میں لے گئیں جہاں چار ہزار خدام رہتے تھے۔ (روح البیان) اور ان کے سردار ستائیس یا ستر تھے۔ جن کے امیر حضرت زکریا علیہ السلام تھے۔ (خزائن) چونکہ حضرت عمران بنی اسرائیل کے امام تھے۔ اس لئے ان ستر میں سے ہر ایک نے حضرت مریم کے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ ان کی خدمت کا شرف مجھے حاصل ہو۔ زکریا علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کا زیادہ مستحق میں ہوں۔ کیونکہ ان کی خالہ میرے نکاح میں ہیں۔ وہ احبار بولے کہ اگر قرابت داری کی بنا پر یہ ملتا تو ان کی والدہ کو ملتا۔ اب فیصلہ یہ ہے کہ قرعہ ڈالا جائے جس کے نام پر قرعہ نکلے وہ انہیں حاصل کرے۔ یہ سب حضرات نہر اردن کی طرف قلم لے کر چلے جس سے وحی لکھتے تھے اور طے یہ ہوا کہ جس کا قلم پانی میں نہ ڈوبے نہ بہ جائے وہ حضرت مریم کو لے اور جس کا قلم ڈوب جائے یا بہہ جائے وہ ان کا مستحق نہیں چنانچہ ایسا کیا گیا۔ سب کے قلم ڈوب گئے یا بہ گئے۔ مگر زکریا علیہ السلام کا قلم پانی میں ٹھہرا رہا۔ لہٰذا حضرت مریم کی پرورش انہیں کے سپرد ہوئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ تین بار قرعہ ڈالا گیا۔ اور ہر دفع ایسا ہی ہوا۔ اسے قرآن کریم نے یہاں فرمایا وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا۔ دوسری جگہ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ (آل عمران: ۴۴) حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم کے لئے بیت المقدس میں ایک بالا خانہ بنایا جس کا دروازہ بیچ بیت المقدس کے تھا۔ جہاں زینہ کے ذریعہ پہنچ سکتے تھے۔ سوا زکریا علیہ السلام کے وہاں کوئی نہ جاتا تھا۔ صحیح روایت میں ہے کہ حضرت مریم نے کسی عورت کا دودھ نہ پیا اور بچپن میں نہایت فصیح و بلیغ کلام فرمایا اور آپ کی پرورش کی یہ کیفیت تھی کہ آپ ایک دن میں اتنا بڑھتی تھیں جتنا دوسرے بچے ایک سال میں۔ اور آپ کو جنتی پھل ملا کرتے تھے۔ جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے اسی لئے رب نے فرمایا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَاۤ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء: ۹۱) ہم نے مریم اور ان کے فرزند کو سارے جہاں کے لئے اپنی قدرت کا نشان بنایا۔

لطیفہ: کل گیارہ بچوں نے گہوارے میں کلام کیا (۱) محمد رسول اللہ ﷺ (۲) حضرت یحییٰ (۳) حضرت ابراہیم (۴) حضرت عیسیٰ (۵) حضرت مریم علیہم السلام (۶) جریج کی گواہی دینے والا بچہ (۷) یوسف علیہ السلام کا گواہ (۸) کھائی والوں کا بچہ (۹) اس لونڈی کا بچہ جسے زمانہ اسرائیل میں زنا کی تہمت لگائی گئی (۱۰) حضرت آسیہ (فرعون کی بیوی) کی خادمہ کا وہ بچہ جسے کھولتے ہوئے تیل میں جلایا گیا۔ (۱۱) یہود کا وہ بچہ جو اپنے ماں باپ کو لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اور حضور ﷺ کو صلوٰۃ وسلام عرض کیا۔ مولینا فرماتے ہیں۔

گفت کودک سلم اللہ علیک یا رسول اللہ قد جئنا الیک

ان تمام کو شیخ جلال الدین سیوطی نے ان اشعار میں جمع فرمایا

تَكَلَّمَ فِي الْمَهْدِ النَّبِيُّ مُحَمَّدٌ وَيَحْيٰى وَ عِيْسٰى وَالْخَلِيْلُ وَ مَرْيَمُ

وَجَرِي جَرِيْجٍ ثُمَّ شَاهِدُ يُوْسُفَ وَطِفْلٌ لِذِي الْاُخْدُ وَ دِيْرُوِيْهِ مُسْلِمُ

طِفْلٌ عَلَيْهِ مَرَّبَا لِاَمَةِ الَّتِيْ يُقَالُ لَهَا تَزْنِيْ وَلَا تَتَكَلَّمُ

وَمَا شَطَّةَ فِيْ عَهْدِ فِرْعَوْنَ طِفْلُهَا وَفِيْ زَمَنِ الْهَادِي الْمُبَارَكِ يَخْتَمُ

لہٰذا اس آیت میں حضرت مریم کی دو کرامتیں بیان ہوئیں۔ جنت کے پھل کھانا' اور بچپن میں کلام کرنا اور کلام بھی ایسا عارفانہ کہ سبحان اللہ حضور غوث الثقلین رضی اللہ عنہ نے شیر خوارگی میں رمضان کے روزے رکھے لوگ نہیں مانتے مگر یہ کرامت یہاں سے ماخوذ ہو سکتی ہے۔ کہ مقبول لوگ بچپن میں عارف کامل ولی ہوتے ہیں ان سے اس قسم کے کام و کلام ظاہر ہوتے ہیں۔

حکایت: ابو یعلی نے حضرت جابر سے روایت کی کہ ایک بار نبی ﷺ کے دولت خانہ میں کئی دن کھانا نہ پکا۔ جب غلبہ بھوک ہوا تو اپنے ازواج کے گھروں میں تشریف لے گئے مگر کسی کے پاس کچھ نہ پایا۔ پھر حضرت خاتون جنت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ اور پوچھا کہ گھر میں کچھ کھانے کو ہے۔ عرض کیا نہیں یا رسول اللہ۔ وہاں سے حضور ﷺ واپس ہی ہوئے تھے کہ کسی ہمسایہ نے حضرت خاتون جنت کی خدمت میں دو روٹیاں اور کچھ گوشت بھیجا۔ خاتون جنت نے سوچا کہ اگرچہ ہم سب حاجت مند ہیں۔ مگر میں یہ کھانا حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کروں گی۔ اس خیال سے وہ کھانا ایک برتن میں رکھ دیا۔ اور حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کو حضور کی خدمت میں بلانے کے لئے بھیجا حضور تشریف لائے حضرت خاتون جنت نے وہ کھانا پیش کیا کھولا تو برتن کھانے سے بھرا پایا۔ آپ حیران رہ گئیں۔ حضور ﷺ نے پوچھا۔ فاطمہ یہ کہاں سے آیا۔ عرض کیا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ حضور علیہ السلام نے تبسم فرمایا اور فرمایا کہ الحمد للہ فاطمہ مریم کے مثل ہے وہ بھی غیبی کھانا پا کر یہی کہا کرتی تھیں۔ پھر وہ کھانا سب گھر والوں نے کھایا اور محلہ میں تقسیم کیا گیا۔ (روح البیان و معانی)

فائدے

اس آیت کریمہ سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کرامات اولیاء حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مقبولوں کے ہاتھ پر عجائبات ظاہر فرماتا ہے۔ حضرت مریم سے جو ولیہ تھیں۔ بہت عجائبات ظاہر ہوئے۔ کرامات کا انکار در حقیقت آیات قرآنی اور صدہا احادیث کا انکار ہے۔ (تفسیر کبیر وغیرہ) قرآن کریم نے مختلف جگہ کرامات اولیاء بیان فرمائیں یہاں بی بی مریم کی کرامات کا ذکر ہوا۔ دوسری جگہ آصف برخیا کا آن کی آن میں پلک جھپکنے سے پہلے یمن میں ملکہ بلقیس کا تخت شام میں لا کر حاضر کر دینا۔ ایک جگہ اصحاب کہف کا صدہا سال سونا اور مٹی سے ان کا جسم خراب نہ ہونا بیان فرمایا۔ ایک جگہ حضرت مریم کے ہاتھ لگنے سے خشک کھجور کا تر ہونا فوراً رسیدہ پھل لگ جانا بیان فرمایا جو کھا کر آپ پر ولادت عیسیٰ علیہ السلام آسان ہوئی۔ ایک جگہ حضرت مریم کا بغیر خاوند حاملہ ہونا اور فرشتے سے کلام کرنا بیان فرمایا یہ تمام کرامات اولیاء اللہ ہے۔ معلوم ہوا کہ کرامات

اولیاء حالات اصفیاء بیان کرنا۔ اولیاء اللہ کے مناقب پڑھنا سنت الٰہیہ ہے۔ ہم لوگ گیارھویں شریف میں اولیاء اللہ کے فضائل وکرامات ہی بیان کرتے ہیں۔ کرامات وارھاصات کبھی پیدائش سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں۔ کبھی وفات کے بعد۔ آج بھی اصحاب کہف برابر سو رہے ہیں یہ ان کی کرامت ہے۔ **دوسرا فائدہ:** بعض حضرات مادرزاد ولی ہوتے ہیں۔ ولایت عبادت پر موقوف نہیں۔ دیکھو حضرت مریم صغرسنی میں ولی تھیں۔ اور یہ کرامات اسی عمر شریف میں آپ سے ظاہر ہوئیں۔ **تیسرا فائدہ:** ولایت نبوت کا سایہ ہے کبھی اس کا ظہور شروع سے ہوتا ہے کبھی کچھ عرصہ بعد جیسے بعض انبیائے کرام کی نبوت کا ظہور چالیس سال کی عمر شریف میں ہوا اور بعض کا پیدائش سے ہی جیسے حضرت عیسیٰ ویحییٰ علیہما السلام۔ ولایت تین قسم کی ہے۔ وہبی، عطائی، کسبی حضرت مریم کی ولایت وہبی یعنی خالص عطیہ پروردگار ہے۔ بلا واسطہ انسان۔ **چوتھا فائدہ:** نیک کام میں حرص جائز ہے جیسا کہ حضرت زکریا اور بیت المقدس کے دیگر احبار نے حضرت مریم کو حاصل کرنے میں کی۔ **پانچواں فائدہ:** خالہ کو پرورش کا حق ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے مریم پر اپنا حق پرورش اسی سے ثابت کیا۔ کہ ان کی خالہ میرے نکاح میں ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** مسجد میں رہنا سہنا بوقت ضرورت جائز ہے۔ حضرت مریم کی بیت المقدس میں پرورش کی گئی۔ جیسا کہ **كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ** سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** بزرگوں کی اولاد کی خدمت کرنا نیک بختی کی علامت ہے۔ ہمیشہ سے اس پر عمل رہا۔ بیت المقدس کے خدام نے حضرت مریم کی خدمت کو اسی لئے سعادت سمجھا کہ وہ حضرت عمران کی دختر تھیں۔ اسی لئے سادات کرام کی عزت وحرمت ان کی خدمت باعث ثواب ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** قرعہ کے ذریعہ فیصلہ کرنا سنت انبیاء ہے۔ نہر اردن میں قلم ڈالنا قرعہ ہی تو ہے۔ اس سے بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ اگر مسلمان بجائے الیکشن کرانے کے قرعہ ڈال لیا کریں جس کے نام پر قرعہ نکلے وہ ہی ممبری کے لئے کھڑا ہوا کرے۔ باقی بیٹھ جایا کریں تو بڑی مصیبت دور جائے۔ **نوٹ:** خیال رہے کہ قرعہ کی مختلف صورتیں ہیں۔ سب سے آسان یہ ہے کہ لوگوں کے نام علیحدہ پرچیوں پر لکھ کر ان کی گولیاں بنا دی جائیں۔ اور کسی ناواقف شخص سے اٹھوالی جائے جس کے نام کی گولی اٹھے وہ ہی مستحق سمجھا جائے۔ **نواں فائدہ:** دعا میں اخلاص کو بڑا دخل ہے۔ حضرت حنہ کے اخلاص نے نہ ہونے والی بات بھی کر دی۔ کہ ان کی بیٹی کی نذر قبول ہوئی۔ اور حضرت مریم وعیسیٰ علیہما السلام کو رب نے شیطان سے محفوظ رکھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ شیطان ہر بچہ کو پیدائش کے وقت اپنی انگلی سے چوکیں مارتا ہے۔ جس سے وہ بچہ روتا ہے۔ مگر حضرت مریم اور ان کے فرزند عیسیٰ علیہ السلام اس سے محفوظ رہے (خیال رہے کہ متکلم مستثنیٰ ہوتا ہے حضور علیہ السلام بھی اس سے محفوظ تھے) (کبیر ومعانی وغیرہ) **دسواں فائدہ:** اولیاء کو علم لدنی ملتا ہے۔ حضرت مریم رب کی ذات وصفات اور جنت ودوزخ سے پیدائشی باخبر تھیں۔ اسی لئے آپ نے زکریا علیہ السلام کو ایسا نفیس جواب دیا۔ **گیارھواں فائدہ:** بزرگوں کی دعا سے رب تعالیٰ اپنے قانون بدل دیتا ہے۔ دیکھو رب نے حضرت حنہ کی دعا سے اس زمانہ کا شرعی قانون بدل دیا۔ حضور ﷺ کی خواہش سے بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا قانون تبدیل کر دیا۔ حضرت ابراہیم وزکریا علیہما السلام کی دعا سے بانجھ وبوڑھی عورتوں کو اولاد بخشی یہ بھی قانون ولادت کے خلاف ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے آسمان سے روٹی ومچھلی کا دستر خوان آیا۔ حالانکہ آسمان سے پانی آنے کا قانون ہے۔ وہاں سے روٹی آنے

کا قانون نہیں۔ حضرت خزقیل و عزیر علیہ السلام کی دعا سے مرے ہوؤں کو زندہ فرمایا صدیوں بعد حالانکہ قیامت سے پہلے مردہ زندہ ہونا خلاف قانون ہے۔ معلوم ہوا کہ نگاہ مردمومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ **بارھواں فائدہ:** آج صحابہ کرام واہل بیت اطہار کو برا کہنے والا ان یہودیوں کی طرح ہے۔ جو حضرت مریم کو مذکورہ بالا فضائل کے ہوتے ہوئے برا کہتے تھے۔ حالانکہ وہ تربیت یافتہ نبی پرورش یافتہ بیت المقدس تھیں۔ ایسے ہی حضور انور ﷺ کے تمام صحابہ صحبت یافتہ رسول ہیں۔ اور آپ کی ازواج واولاد تربیت یافتہ رسول اللہ ﷺ اور پرورش یافتہ حرمین شریفین ہیں۔ رب تعالیٰ نے بی بی کریم کے یہ فضائل یہود کی تردید میں بیان فرمائے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں رزقا سے مراد علم ہے۔ نہ کہ ظاہری پھل وغیرہ (مرزائی) **جواب:** رزق ظاہری کا انکار تفسیر بالرائے ہے جو حرام ہے مطلق رزق سے کھانا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۳) یا نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (الاسراء: ۳۱) نیز اس کے بارے میں احادیث صحیحہ کثرت سے وارد ہیں۔ عبداللہ ابن عباس ودیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی تفسیر پھل سے کی۔ حضرت مجاہد نے اس کی تفسیر علم کی مگر وہ بھی ظاہری رزق سے منکر نہ ہوئے۔ گویا رب تعالیٰ نے مریم کو رزق باطنی یعنی علم اور رزق ظاہر میوے عطا فرمائے۔ **دوسرا اعتراض:** حدیث پاک میں ہے کہ مسجد سے بچوں اور پاگلوں کو دور رکھو۔ نیز بچوں سے مسجد پلید ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر حضرت مریم کو بچپن سے بیت المقدس میں کیوں رکھا گیا۔ اور بیت المقدس کے طہارت کی کیا صورت کی گئی۔ (عام بے دین) **جواب:** یہ بھی حضرت مریم کی کرامت تھی کہ بچپن شریف سے مسجد میں قیام فرمایا۔ مگر مسجد کا فرش وغیرہ خراب نہ ہوا۔ وقت مقررہ پر رفع حاجات ہوتی رہی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادت پاک خانہ کعبہ میں ہوئی۔ مگر آپ کی کرامت سے فرش کعبہ پلید نہ ہوا۔ حضور ﷺ نے اونٹنی پر طواف کعبہ کیا۔ مگر اونٹ نے حرم شریف میں نہ پیشاب کیا نہ مینگنیں۔ یوں ہی حضور ﷺ نے کندھے پر امام حسین اور امامہ بنت ابو العاص کو لے کر نماز پڑھی۔ ان دونوں بچوں نے بھی اس حالت میں پیشاب پاخانہ نہ کیا۔ **تیسرا اعتراض:** حضرت حنہ نے مریم کی پیدائش کے بعد ان کے لئے حفاظت شیطان کی دعا فرمائی۔ اور روایت میں آتا ہے۔ کہ حضرت مریم کو بوقت ولادت شیطان نہ چھوسکا تو کیا دعا کا اثر دعا سے پہلے ظاہر ہو گیا۔ (مرزائی) **جواب:** بوقت پیدائش حضرت مریم کا شیطان سے محفوظ رہنا فضل رب تھا۔ اور آئندہ بقیہ زندگی میں محفوظ رہنا۔ نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شیطان سے امن میں رہنا یہ حضرت حنہ کی دعا سے ہوا تھا۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ تارک الدنیا ہونا۔ راہب بن کر عبادت خانوں میں بیٹھنا سنت سلف ہے۔ پھر مسلمان اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ دیکھو حضرت مریم راہب بنا کر بیت المقدس میں رکھی گئیں (عیسائی) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حکم پچھلے ادیان میں تھا۔ اسلام میں منسوخ ہو گیا۔ ان پر بھی رب نے پابندی نہ لگائی تھی۔ مگر انہوں نے خود یہ پابندیاں لگالیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (حدید: ۲۷) دوسرا یہ کہ حضرت حنہ نے مریم کو صرف وہاں عبادت کرنے کے لئے رکھا نہ کہ تارک الدنیا ہونے کے لئے۔ چنانچہ ان کی اولاد کے لئے بھی دعا فرمائی۔ تارک الدنیا کے اولاد کیسی؟

تفسیر صوفیانہ

روح اول ظہور میں گویا آدم ہے۔ اور اپنے دوسرے ظہور میں گویا نوح۔ دل گویا ابراہیم ہے جسے نمرود نفس نے شہوتوں کی گوپھن سے فتنوں کی آگ میں ڈالا۔ اور روحانی قوتیں گویا آل ابراہیم ہیں۔ عقل گویا عمران ہے جو جسم کے بیت المقدس میں امام ہے۔ اور اس جسم کے اعضا آل عمران جن میں سے بعض بعض کی ذریت ہیں کیونکہ سب کی جائے ورود ایک ہی ہے اس عمران عقل کی زوجہ نے کہا کہ مولیٰ میں اپنی اندرونی چیز کو شہوات نفسانی سے آزاد کردوں گی۔ اور اسے تیری عبادت میں ما سوئی اللہ سے بچاؤں گی۔ رب تعالیٰ نے اس کی یہ نذر قبول فرمائی۔ اور اسے مخلوق کی نگاہوں سے بچایا کہ اس کو سوائے زکریا کے کوئی نہ پاسکا۔ اور پھر اسے قدرتی پانی سے سینچ کر خوب ہرا بھرا کیا جس میں نبوت ولایت کے پھل لگے اور پھر زکریا یعنی شیخ طریقت کو اس کا مربی بنایا۔ جب کبھی وہ شیخ اس کے پاس محراب سینہ میں جاتا ہے۔ تو وہاں رزق روحانی یعنی علم وحکمت معرفت و حقیقت کے پھل پاتا ہے۔ تو شیخ پوچھتا ہے کہ اے مریم نفس مطمئنہ تیرے پاس یہ پاک وصاف رزق کہاں سے آیا۔ وہ عرض کرتی ہے۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ. اللہ کے پاس سے کیونکہ رزق جسمانی بندوں کے ذریعے ملتا ہے۔ مگر رزق روحانی رب کا خاص عطیہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت مجاہد سے نقل کیا کہ یہاں رزق سے مراد علم وحکمت ہے۔ (روح المعانی)

دوسری تفسیر

عقل گویا عمران ہے۔ اور نفس مطمئنہ عمران کی زوجہ۔ نفس مطمئنہ نے نذر مانی کہ مولیٰ جو کچھ میرے شکم میں ہے یعنی قلب میں اسے مخلوق کی اطاعت سے آزاد رکھوں گی۔ مگر جب لڑکی جنی یعنی نفس مطیعہ تو رب کی بارگاہ میں عرض کیا۔ کہ مولی یہ تو لڑکی ہوئی مگر رب جانتا ہے۔ کہ یہ لڑکی یعنی اطاعت شعار نفس عجیب وغریب شی ہے۔ اس سے عجیب آثار نمودار ہوں گے۔ یہ حامل اسرار الٰہیہ ہوگی۔ اس نفس مطعیہ کا نام مریم یعنی عابدہ رکھا گیا۔ عرض کیا کہ مولیٰ میں اسے شیطان یعنی شہوات نفسانیہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ یہ شہوات ہی نفس کو باغ قدس سے محروم رکھتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے اسے قبول کیا۔ اور اس پر نورانی بارشیں برسائیں۔ اور اسے اچھی طرح پرورش فرمایا کہ اسے دنیاوی جھگڑوں سے محفوظ رکھ کر اپنے قرب خاص کے بیت المقدس میں جگہ بخشی اور زکریا یعنی استعداد کامل کو اس کا ذمہ دار بنایا۔ جب یہ زکریا نفس کے پاس مسجد قلب میں جاتا۔ تو اس کے پاس روحانی غذا عالم الملکوت والی پاتا تو پوچھتا کہ یہ رزق معنوی تیرے پاس کہاں سے آیا۔ وہ عرض کرتی۔ رب کے پاس سے۔ اس رزق علم کو نہ فکر نے پیدا کیا نہ اس کا موجد انسان ہے بلکہ خاص ربانی رزق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا علم بقدر قابلیت واستعداد بغیر حساب عطا فرماتا ہے۔ کیونکہ وہ جواد ووہاب ہے (روح المعانی)

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ حسن ذاتی کے ساتھ حسن خارجی بھی جمع ہوجائے تو نور پر نور ہوجاتا ہے۔ حضرت مریم خود نبوت کے خاندان سے تھیں۔ رب کی مقبول جنتی میوے کھانے والی مگر جب حضرت زکریا کی پرورش اور بیت المقدس میں رہائش بھی میسر ہوگئی تو آپ کا کمال لازوال بفضل رب ذوالجلال اور بھی اعلیٰ واکمل ہوگیا۔ پھر بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ بننے کے شرف نے ان کی عزت وعظمت کو اور چار چاند لگادیئے۔ اس لئے ان کے متعلق رب تعالیٰ نے فرمایا وَاصْطَفٰكِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران ۴۲) اے مریم اللہ نے تم کو جہاں بھر کی عورتوں میں منتخب فرمایا اور چن لیا آج بھی جسے

ذاتی کمال کے ساتھ بیرونی کمال بھی مل جائے وہ بہت خوش نصیب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کی صحبت کی برکت سے کلیم اللہ ہونے کے لائق ہوگئے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ
اس جگہ دعا کی زکریا نے رب اپنے سے عرض کیا اے رب میرے دے واسطے میرے پاس سے اپنے
یہاں پکارا زکریا نے اپنے رب کو بولا اے رب میرے مجھے اپنے پاس سے دے
ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ
اولاد پاک تحقیق تو سننے والا ہے دعا کا پس پکارا ان کو فرشتوں نے
ستھری اولاد بیشک تو ہی ہے دعا سننے والا تو فرشتوں نے اسے آواز دی اور
هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا
حالانکہ وہ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے بیچ محراب کے تحقیق اللہ خوشخبری دیتا ہے آپکو ساتھ یحییٰ کے تصدیق کرنیوالے
وہ اپنی نماز کی جگہ نماز پڑھ رہا تھا بیشک اللہ آپ کو مژدہ دیتا ہے یحییٰ کا جو اللہ کی طرف سے ایک کلمہ کی
بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾
کلمہ کی طرف سے اللہ کے اور سردار اور عورتوں سے بچنے والے اور نبی نیکوں میں سے
تصدیق کرے گا اور سردار اور ہمیشہ کے لئے عورتوں سے بچنے والا اور نبی ہمارے خاصوں میں سے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت مریم کی کرامت کا ذکر تھا۔ یعنی بے موسم پھل ملنا۔ اب حضرت زکریا کے ایک معجزہ کا ذکر ہے۔ یعنی بے موسم اولاد ملنا۔ اولاد بھی ایک قسم کا پھل ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ولادت مریم کا عجیب واقعہ ذکر کیا گیا۔ اب یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا انوکھا قصہ بیان ہو رہا ہے۔ گویا ایک عجیب بات کے ساتھ دوسری ہی عجیب چیز کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں پیدائش حضرت مسیح کی تمہید تھی۔ اب ولادت یحییٰ علیہ السلام کا قصہ ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام بادشاہ ہیں یحییٰ علیہ السلام ان کے وزیر۔ چونکہ وزیر بادشاہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ یحییٰ علیہ السلام بھی ساری عمر عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہے۔ اس لئے ان کا قصہ بھی ساتھ ہی بیان کیا گیا۔

تفسیر

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ هُنَالِكَ ظرف مکان ہے۔ لام بعد کے لئے ہے۔ اور کاف خطاب کا۔ اس پورے لفظ کے معنی

ہوتے ہیں۔ اس جگہ چونکہ یہ اپنے عامل دعا کے پہلے آیا لہٰذا حصر کے معنی حاصل ہوئے۔ یعنی اس ہی جگہ۔ کبھی مجازاً زمانہ اور وقت کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ (اس ہی وقت) خیال رہے کہ عِنْدَ اور حِیْنَ وقت کے لئے آتے ہیں۔ اور ھُنَالِکَ حقیقتاً جگہ کے لئے اور مجازاً وقت کے لئے رب تعالیٰ فرماتا ہے فَغُلِبُوْا ھُنَالِکَ (اعراف: ۱۱۹) اور فرماتا ہے۔ ھُنَالِکَ الْوِلَایَةُ لِلّٰهِ (کہف: ۴۴) پہلا ھُنَالِکَ جگہ کے لئے ہے اور دوسرا وقت کے لئے ہے۔ یہاں حقیقی معنی مراد ہیں۔ اس سے مراد حضرت مریم کی قیام گاہ ہے۔ جہاں زکریا علیہ السلام نے ان سے گفتگو فرمائی تھی۔ دعا دعاءٌ سے پہلے بمعنی پکارنا یا دعا کرنا۔ یعنی اس جگہ جہاں حضرت مریم سے ان کی یہ گفتگو ہوئی۔ زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعا کی یا پکارا۔ اور ہوسکتا ہے کہ مجازی معنی مراد ہوں۔ یعنی جواب سنتے ہی اُسی وقت یہ دعا کی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دونوں معنی مراد ہوں۔ بطریق عموم مجاز یعنی حضرت زکریا نے اسی وقت اُسی جگہ یہ دعا کی حصر سے معلوم ہوا۔ کہ آپ نے مسجد کے منبر یا مسجد امام یا کسی اور گوشہ میں یہ دعا نہ کی بلکہ اس حصہ میں دعا کی جو بی بی مریم کا قیام گاہ تھا کہ یہاں مریم کے قیام کے سبب دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ آج حجاج روضہ رسول اللہ کے پاس مواجہ شریف میں کھڑے ہو کر زیادہ دعائیں مانگتے ہیں بعض مسجدوں میں بزرگوں کے مزارات یا ان کی عبادت گاہیں ہوتی ہیں۔ وہاں زیادہ دعائیں مانگی جاتی ہے۔ ان سب اعمال کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے۔ اور حضرت زکریا کا عمل ہے۔ قَالَ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً یہ دعا کی شرح ہے۔ ھب ھبۃ سے بنا بمعنی بلا معاوضہ بطور احسان دینا یہاں بغیر ظاہری اسباب دنیا مراد ہے۔ لِیْ اور مِنْ لَّدُنْ دونوں ھَبْ کے متعلق ہیں۔ لَدُنْ بمعنی عند آتا ہے چونکہ انہوں نے بے وقت بڑھاپے میں اولاد مانگی تھی اس لئے مِنْ لَّدُنْکَ عرض کیا۔ نیز طیب طاہر ستھری اولاد مانگی تھی۔ جس میں عقیدہ عمل عبادت کسی چیز میں نقص نہ ہو۔ اس لئے مِنْ لَّدُنْکَ عرض کیا۔ یعنی ایسا صاف ستھرا بیٹا دے جو تیرا عطیہ تحفہ کہلائے مستحق ہو جسے دیکھ کر تو یاد آ جایا کرے۔ ورنہ ہر چیز رب ہی کی طرف سے ہے۔ ذریۃ بمعنی نسل آتا ہے۔ اس کی لغوی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یہ واحد جمع مذکر مؤنث سب ہی پر بولا جاتا ہے۔ (روح المعانی) یہاں بمعنی ایک فرزند ہے کیونکہ زکریا علیہ السلام کے صرف یحییٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور ان کی نسل نہ چلی۔ جیسا کہ حصوراً سے معلوم ہوگا چونکہ ذریۃ لفظ میں مؤنث ہے۔ اس لئے اس کی صفت مؤنث لائی گئی۔ کیونکہ کبھی اسم جنس میں لفظ کا لحاظ ہو جاتا ہے۔ ہاں علم میں معنی کا لحاظ ہوتا ہے۔ نہ کہ لفظ کا۔ لہٰذا جاءَ ت طلحۃ نہیں کہہ سکتے (روح المعانی و کبیر) طَیِّبَةً سے مراد پاک ہے۔ یا متقی پرہیزگار یا صالح و دیندار جس کے اخلاق اور اعمال عیوب سے پاک و صاف ہوں۔ یعنی اے اللہ مجھے اپنی قدرت سے بغیر عادی واسطہ کے ایک مبارک نیک صالح فرزند عطا فرما اس میں اپنی نیت کا اظہار ہے۔ کہ مولیٰ میں یہ بچہ کسی دنیاوی مقصد کے لئے نہیں مانگتا۔ صرف خدمت دین اور توشہ آخرت کے لئے مانگتا ہوں۔ اس لئے مالدار یا بادشاہ یا جائیداروالا بیٹا نہیں مانگتا۔ بلکہ طیب وستھرا مانگتا ہوں۔ اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ۔ یہ جملہ دعا کا خاتمہ ہے اور سمیع سے مراد قبول فرمانے والا ہے۔ رب تعالیٰ سنتا سب کی ہے۔ مگر کسی کی مردودیت و غضب کے ساتھ کسی کی لاپرواہی سے کسی کی توجہ کرم و قبولیت سے۔ الدُّعَآءِ میں الف لام عہدی ہے۔ یعنی اس قسم کی دعائیں سنتا ہے جو شرائط ارکان اخلاص و اضطراب دل کے ساتھ ہو نماز کی طرح دعا کے بھی ارکان و شرائط جگہ و وقت ہیں جو دعا ان سب کی جامع ہو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ اس جملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی

پیروی ہے۔ کہ انہوں نے فرمایا تھا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ (ابراہیم: ۳۹) چونکہ بزرگوں کے الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے۔ اس لئے آپ نے یہ کلمات بھی عرض کر دیئے یعنی اے اللہ تو دعا قبول فرمانے والا ہے۔ تیرے در سے میں ناامید کیوں پھروں۔ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ پچھلی آیت میں زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر تھا۔ اب قبول دعا کا تذکرہ ہے۔ اس دعا کے وقت حضرت مریم بالکل نوعمر تھیں۔ اور حضرت یحیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے صرف چھ ماہ پیشتر ہے۔ یہ خوشخبری آپ کو دعا کے بعد فوراً دی گئی۔ مگر اس کا ظہور عرصہ بعد ہوا۔ اس ندا میں حضرت زکریا علیہ السلام کی عظمت کا اظہار ہے۔ ملائکہ سے مراد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں جمع تعظیماً ہے۔ یا چونکہ ان کے ساتھ اکثر فرشتوں کی جماعت رہتی ہے۔ یا وہ فرشتوں کے سردار ہیں۔ اس لئے ایک کا کام سب کی طرف نسبت کر دیا گیا۔ بعض قرأتوں میں فَنَادَاهُ الْمَلَائِكَةُ ہے عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں۔ کہ ملائکہ کو مذکر بولو۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰی (النجم: ۲۷) مگر عام قرأت میں فنادته ہے۔ اور یہ تانیث ملائکہ کی جمعیت کی وجہ سے ہے۔ یعنی پس زکریا علیہ السلام کو فرشتوں نے آواز دی وَهُوَ قَآئِمٌ یُّصَلِّیْ فِی الْمِحْرَابِ عام مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ واؤ حالیہ ہے۔ اور یہ جملہ نادته کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔ ھو کا مرجع زکریا علیہ السلام ہیں۔ یُصَلِّیْ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین میں نماز تھی۔ اور ظاہر یہ ہے کہ ان کی نماز بھی اسلامی نماز کی طرح اعمال اور اقوال کا مجموعہ تھی۔ بعض نے فرمایا کہ ان کی نماز میں صرف قیام تھا۔ بعض نے کہا کہ اس سے مراد فقط دعا ہے۔ مگر پہلی تفسیر نہایت قوی ہے۔ کہ آپ نماز میں مشغول تھے اور حالت قیام میں تھے کہ یہ آواز آئی۔ محراب کی لغوی تحقیق پہلے ہو چکی۔ یہاں یا تو مسجد مراد ہے۔ یا امام کے کھڑے ہونے کی جگہ۔ یا حضرت مریم کا حجرہ یہ ہی قوی ہے آپ نماز حضرت مریم کے قیام گاہ میں پڑھتے تھے کہ ولیہ کے قرب سے نماز قبولیت سے قریب تر ہو۔ اب بھی بزرگوں کے مزارات کے پاس مسجدیں بنائی جاتی ہیں کہ مسجد ان مقبول بندوں کے قرب سے اعلیٰ و افضل ہو۔ اصحاب کہف کے غار پر مسجد بنائی گئی لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیْهِمْ مَّسْجِدًا (کہف: ۲۱) مسجد نبوی شریف میں نماز کیوں افضل ہے۔ اس لئے کہ وہاں حضور ﷺ سے قرب میسر ہے۔ ان سب کی اصل یہ آیت ہے۔ کہ آپ دعا مانگ کر خود حضرت مریم کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ یعنی فرشتوں نے انہیں اس حال میں آواز دی جب وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی یہ اس ندا کا بیان ہے۔ یُبَشِّرُ ا بشارت سے ہے بمعنی خوشخبری۔ چونکہ خوشخبری کا اثر بشرہ یعنی چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انسان کو ہنسی آ جاتی ہے۔ اس لئے اسے بشارت کہتے ہیں۔ بیحیی کی ب یا صلہ کی ہے۔ یا استعانت کی۔ یہ لفظ یا تو عجمی ہے۔ اور بوجہ عجمی اور علم ہونے کے غیر منصرف ہے۔ یا عربی ہے۔ اور وزن فعل و علمیت کی وجہ سے غیر منصرف۔ اس صورت میں یہ حیات سے بنے گا۔ بمعنی زندگی چونکہ ان کے ذریعہ ان کی بانجھ ماں کو زندگی یعنی شفا دی گئی۔ یا چونکہ رب تعالیٰ نے شروع ہی سے ان کے قلب کو ایمان کے ذریعہ زندگی بخشی۔ یا چونکہ رب تعالیٰ کے علم میں ان کی شہادت تھی۔ اور شہید زندہ ہیں۔ یا چونکہ انہوں نے علم و حکمت کے ذریعہ ایک مخلوق کو روحانی حیات بخشی۔ یا چونکہ یہ پیدائشی نبی تھے۔ اور نبوت ایک قسم کی زندگی ہے۔ اس لئے انہیں یحیٰ کہا جاتا ہے۔ آپ کا اسم شریف پچھلے صحیفوں میں حیا تھا اور انجیل شریف میں یوحنا اور لقب معمدانی اور قرآن شریف میں یحیٰ (روح المعانی) یعنی رب تعالیٰ

تمہیں یحییٰ علیہ السلام کے یا ان کے ذریعہ خوشخبری دیتا ہے کہ تمہارے ہاں ایک فرزند ہوگا۔ جس کا نام ہم نے یحییٰ رکھ دیا ہے۔ خیال رہے کہ ہمارے بچوں کے نام ان کے ماں باپ رکھتے ہیں۔ وہ بھی پیدائش کے ساتویں دن مگر ہمارے حضور انور ﷺ اور حضرت یحییٰ کا نام خود رب تعالیٰ نے رکھا۔ وہ بھی ولادت سے بہت پہلے۔ نیز ہمارے بچوں کے نام کبھی کام کے خلاف بھی ہوتے ہیں۔ تمام نام صحیح نہیں ہوتے۔ غلط بھی ہوتے ہیں۔ کالے آدمی کا نام یوسف خان بزدل کا نام شیر بہادر جاہل کا نام محمد فاضل بہرے کا نام سمیع اللہ خان اندھے کا نام نور اللہ خان رکھ دیا جاتا ہے۔ مگر رب تعالیٰ کے رکھے ہوئے نام بالکل صحیح اور کام کے مطابق ہوتے ہیں۔ دیکھو رب نے حضور انور ﷺ کا نام محمد رکھا یعنی بہت سراہا ہوا تعریف کیا ہوا۔ آج بھی اس نام کی بہار دیکھی جا رہی ہے۔ کہ ہر جگہ ہر وقت ہر زبان میں حضور ﷺ کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ رب نے ان کا نام یحییٰ رکھا۔ یعنی زندگی بخشنے والے یا زندہ جاوید رہنے والے یہ نام ان پر بہت ہی سجا اب تک وہ زندہ ہیں اور تا قیامت زندگی بخشیں گے۔ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ مُصَدِّقًا یحییٰ کا حال ہے۔ کلمہ بات کو کہتے چونکہ عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد لفظ کُنْ سے پیدا ہوئے۔ اس لئے آپ کا لقب کلمۃ اللہ ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران:۵۹) من اللہ کلمہ کی صفت ہے۔ اور کائنۃٌ پوشیدہ کا متعلق اگرچہ دیگر لوگوں نے بھی عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی مگر چونکہ یحییٰ علیہ السلام نے بچپن شریف بلکہ حمل شریف ہی سے تصدیق فرمائی۔ اس لئے مُصَدِّقًا فرمایا گیا۔ یعنی تصدیق کرنیوالے۔ کلمۃ اللہ عیسیٰ علیہ السلام کی۔ بعض لوگوں نے کلمۃ اللہ کے معنی انجیل شریف کئے ہیں۔ مگر یہ نہایت ضعیف سی بات ہے۔ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا سَیِّد سود یا سواد سے بنا۔ سود بمعنی جماعت اور سواد بمعنی سیاہی بلکہ بڑی جماعت کو بھی سواد اسی واسطے کہتے ہیں۔ کہ اس سے میدان سیاہ ہو جاتا ہے۔ سید وہ ہے جو سواد یعنی بڑی جماعت کا متولی و سردار ہو یا تو اس سے مراد کریم ہے یا حلیم یا متقی یا شریف یا فقیہہ عالم یا رب کے فرمان پر راضی یا سردار بعض اہل لغت نے اس کے معنی ہمت والا اور مالک بھی کئے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ (یوسف:۲۵) یہاں سَیِّد کے معنی مالک یا خاوند ہیں۔ کہ عزیز مصر زلیخا کا خاوند تھا۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں۔ کہ سید وہ جو کسی پر حسد نہ کرے۔ اور ابو اسحاق نے فرمایا کہ سید وہ جو علم اور تقویٰ میں اپنی قوم سے افضل ہو۔ اب اصلاح میں ہر دینی یا دنیوی فوقیت رکھنے والے کو سید کہتے ہیں۔ (روح المعانی) چونکہ یحییٰ علیہ السلام میں یہ ساری صفتیں تھیں۔ اس لئے انہیں سید فرمایا گیا۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ آپ نے کبھی کوئی خطا نہ کی (روح البیان) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ آپ نے کبھی کسی پر غصہ نہ کیا۔ اس لئے رب نے آپ کو سیّد فرمایا۔ حصور حصر سے بنا بمعنی روکنا۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اصطلاح میں حصور وہ ہے جو قدرت کے باوجود محض زہد و تقویٰ سے عورتوں کے پاس نہ جائے۔ نامرد حصور نہیں۔ کیونکہ یہ عیب ہے۔ نہ کہ خوبی (عام تفاسیر) خیال رہے کہ عنین خصی مجبوب اور حصور یہ چار لفظ ہیں۔ جن کے مختلف معنی ہیں عنین وہ جس کے اعضائے تناسل سب درست ہوں مگر کمزوری کی وجہ سے قابل جماع نہ ہو۔ خصی وہ جس کے خصیے نہ ہوں۔ اور مجبوب وہ جس کے خصیے تو ہوں مگر ذکر کٹا ہو۔ لیکن حصور وہ ہے جس کے پاس اعضاء اور طاقت سب کچھ ہو محض زہد کی بنا پر عورتوں سے الگ رہے۔ اور اپنے نفس کو شہوت سے دور رکھے۔ جن لوگوں نے اس کے معنی نامرد ثابت کئے سخت غلطی کی۔ کیونکہ انبیائے کرام اس مرض سے پاک ہوئے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ حصور وہ

جو اپنے آپ کو ساری نفسانی خواہشات سے روکے حضور علیہ السلام نے فرمایا میں اسلئے پیدا نہیں کیا گیا کہ تمہیں دنیا سے روکوں یہ معنی ہیں حصور کے (معانی و کبیر وغیرہ) روح البیان نے فرمایا کہ یحییٰ علیہ السلام نے نکاح کیا تھا۔ واللہ اعلم وَنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ اوصاف خصوصی کے بعد اب ان کی صفت عامہ کا ذکر ہے۔ یعنی آپ انبیائے کرام کی جماعت سے اور معصوم ہوں گے۔ یا خاندانی پیغمبر ہوں گے۔ اس طرح کہ آپ خود نبی۔ آپ کی والدہ کے خالو نبی۔ آپ کے بھانجے یحییٰ علیہ السلام نبی مقبول الدعا۔ خود والدہ کامل ولیہ نانی صاحبہ اللہ کی ولیہ نانا نہایت ہی مقبول خدا ولی بنی اسرائیل کے سردار۔ خاندانی شرافت اور صالحین میں سے ہونا بھی رب تعالیٰ کی رحمت ہے۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق فرمایا کریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم ہمارے حضور علیہ السلام کے آباؤ اجداد ماں دائی وغیرہ تمام ہی صالحین سے ہیں۔ اس کی پوری بحث پہلے پارے میں گذرگئی۔ اگرچہ نبوت میں بھی صلاح وتقویٰ داخل تھا۔ مگر یہاں اس صلاح سے نبوت کے علاوہ دیگر خوبیاں مراد ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے نبی ہونے کے باوجود دعا کی تھی۔ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ (النمل:۱۹)

خلاصہ تفسیر

جب زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کی یہ کرامت دیکھی کہ ان کے پاس بے موسم جنتی پھل آتے ہیں۔ اور حضرت مریم کا وہ دل خوش کن جواب سنا تو قدرتی طور پر آپ کے دل میں فرزند کا شوق پیدا ہوا۔ اور خیال فرمایا کہ جو مریم کو بے موسم میوے دینے پر قادر ہے۔ اور جو خدمت بیت المقدس کے لئے بجائے لڑکے کے لڑکی اور بجائے جوان کے بچی کو قبول فرمالیتا ہے۔ اور جو حضرت مریم کو لڑکپن میں بولنے کی طاقت دیتا ہے۔ اور جو بغیر گمان رزق دینے پر قادر ہے۔ وہ مجھ بوڑھے کو میری بانجھ بیوی سے اولاد بخشنے پر بھی قادر ہے۔ چنانچہ اسی وقت اور اسی جگہ جہاں حضرت مریم سے یہ گفتگو ہوئی تھی انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی یہ دعا محرم کی ستائیس تاریخ کو ہوئی۔ (روح المعانی) عرض کیا کہ اے مولیٰ مجھے اس بڑھاپے میں خاص اپنی طرف سے ایک پاک وستھرا بیٹا عطا فرما۔ تو دعاؤں کو قبول فرمانے والا ہے جب تو نے حنہ کی دعا قبول کی۔ تو میری دعا کو بھی ضرور قبول فرمائے گا۔ آپ بہت بڑے عالم تھے۔ اور بارگاہِ الٰہی میں قربانیاں آپ ہی پیش فرمایا کرتے تھے۔ مسجد شریف میں آپ کے بغیر اجازت کوئی داخل نہ ہوسکتا تھا۔ آپ ایک دن مسجد میں نماز میں مشغول تھے۔ اور باہر لوگ اجازت کے منتظر تھے۔ دروازہ بند تھا کہ اچانک آپ نے ایک سفید پوش نوجوان دیکھا۔ وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے۔ انہوں نے آپ کو اس حال میں خوشخبری دی۔ کہ اے زکریا تمہاری دعا قبول ہوئی۔ رب تعالیٰ تمہیں ایک صالح متقی بیٹا عطا فرمائے گا جس کا نام یحییٰ ہے۔ وہ بہت سی خوبیوں کا مالک ہوگا (۱) وہ کلمۃ اللہ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی پرزور تصدیق کرے گا۔ اس طرح کہ انہیں سچا کہے گا۔ یا سچا کرے گا۔ یا سچا کہلوائے گا سچا کرے گا اس طرح ان کے متعلق عیسیٰ علیہ السلام جو پیش گوئیاں فرمائیں گے ویسے ہی آپ پر ان کا ظہور ہوگا۔ آپ کی ذات آپ کے صفات آپ کے احوال جناب مسیح کو سچا کر دکھائے گی۔ یا بچپن شریف ہی سے انہیں سچا کہیں گے۔ یا لوگوں میں ان کے دین کی تبلیغ کرکے لوگوں کو دین مسیحی میں داخل کریں گے۔ چونکہ حضرت مسیح کی پیدائش حضرت جبرائیل کے کلمہ کن سے ہوئی۔ یا آپ ایک کلمہ کہہ کر لوگوں کو شفا مردوں کو زندہ کردیتے تھے۔ یا آپ کے منہ سے جو

بات نکلتی تھی حق ہوتی تھی اور جیسا آپ کہتے تھے ویسا ہی ہوتا تھا۔ گویا آپ کی گفتگو کلمۃ اللہ ہوتی تھی۔ اس لئے آپ کا لقب کلمۃ اللہ ہوا۔ (۲) مومنوں کا سردار ہوگا۔ (۳) ہمیشہ عورتوں سے پرہیز کرے گا کہ زہد وتقویٰ اور یادِ الٰہی میں مشغول ہو کر عورتوں کی طرف توجہ نہ کرے گا نبی ہوگا اور رب تعالیٰ کے خاص نیکوں میں سے ہوگا۔ خیال رہے کہ اس وقت زکریا علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ اور بیوی صاحبہ کی عمر اٹھانوے سال یہ بھی خیال رہے کہ اس بشارت اور اس کے ظہور میں تقریباً تیرہ یا انیس سال کا فاصلہ ہے۔ کیونکہ یہ دعا اور بشارت حضرت مریم کے لڑکپن میں ہوئی۔ اور یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت حضرت مریم کی عمر شریف تیرہ سال یا ۲۰ سال تھی۔ (روح المعانی وخزائن وغیرہ) تفسیر خازن وخزائن میں ہے کہ ایک دن حضرت ایشاع یحییٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت مریم سے کہا۔ کہ میں حاملہ ہوں انہوں نے کہا میں بھی۔ ایشاع بولیں کہ اے مریم جب میں تمہارے پاس آتی ہوں تو میرے پیٹ کا بچہ تمہارے پیٹ کے بچے کو سجدہ کرتا ہے یہ مُصَدِّقًا کے معنی ہیں خیال رہے کہ یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے سے چھ ماہ پیشتر شہید کئے گئے۔ اور میر دوس یہودی نے آپ کو شہید کیا (تفسیر روح المعانی وکبیر وخازن وغیرہ)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** وہ دعائیں بہت جلد قبول ہوتی ہیں جو بزرگوں سے منقول ہوں۔ کیونکہ ان الفاظ میں تاثیر ہوتی ہے۔ زکریا علیہ السلام نے ان الفاظ سے دعا مانگی۔ جو ابراہیم علیہ السلام سے منقول تھے۔ **دوسرا فائدہ:** اولیاء اللہ کے قرب میں دعا جلد قبول ہوتی ہے جیسا کہ هُنَالِكَ سے معلوم ہوا۔ کیونکہ زکریا علیہ السلام نے اللہ کی ولیہ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب مجھے کوئی حاجت پیش آتی ہے تو میں فلسطین سے چل کر امام ابوحنیفہ کی قبر پر بغداد شریف آتا ہوں اور دو رکعت پڑھ کر ان کی قبر شریف کے پاس دعا مانگتا ہوں تو میری حاجت بہت جلدی پوری ہوتی ہے۔ (مقدمہ شامی فضائل ابوحنیفہ) بلکہ شامی میں اسی جگہ ہے۔ کہ امام شافعی امام ابوحنیفہ کے مزار پر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) جب حاضری دیتے ہیں تو نماز میں نہ بسم اللہ جہر سے پڑھتے تھے نہ قنوت نازلہ محض امام صاحب کے ادب کی وجہ سے۔ **تیسرا فائدہ:** نزول رحمت کے وقت دعا مانگنا سنت انبیاء ہے۔ دیکھو حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم کے پاس بے موسم پھل دیکھ کر دعا کی۔ حدیث شریف میں ہے کہ بارش کے وقت دعا مانگو کہ یہ نزول رحمت کا وقت ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اکیلے آدمی کو محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ جیسا کہ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ سے معلوم ہوا۔ حدیث شریف میں جو ممانعت ہے وہ جب ہے کہ اکیلا امام محراب میں ہو اور قوم باہر۔ **پانچواں فائدہ:** مسجدوں میں محراب بنانا جائز ہے۔ بلکہ سنت انبیاء کہ زکریا علیہ السلام کے زمانہ میں بیت المقدس میں محراب تھی۔ جیسا کہ فِي الْمِحْرَابِ کی تیسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** انبیاء کرام کی نعت بیان کرنا سنت الٰہیہ ہے۔ رب تعالیٰ نے اس آیت میں یحییٰ علیہ السلام کی پانچ صفتیں بیان کیں۔ مصدق، سید، حصور، نبی اور مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ **ساتواں فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ فقط کلمہ کن سے پیدا ہوئے جیسا کہ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ سے معلوم ہوا۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ سوال وجواب میں کی جائے گی۔ **آٹھواں فائدہ:** نماز میں فرشتوں کی بات

سننا' اوران سے کلام کرنا' یارب سے عرض معروض کرنا نماز کو فاسد نہیں کرتا' جس کلام سے نماز فاسد ہوتی ہے۔ وہ لوگوں سے کلام ہے۔ دیکھو زکریا علیہ السلام کو ملائکہ نے بحالت نماز ہی پکارا۔ اور آپ نے نماز ہی میں جواب دیا جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔ بلکہ حاشیہ بخاری سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور ﷺ سے کلام کرنا بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ التحیات میں پڑھا جاتا ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ حالانکہ کسی کو سلام کرنا بھی مفسد نماز ہے۔ **نواں فائدہ:** غیر خدا کو سید کہہ سکتے ہیں۔ سید وہ جس کی اطاعت واجب ہو۔ رب تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو سید فرمایا۔ حضور ﷺ نے سعد ابن معاذ کو انصار کا سید اور عمر ابن جموح کو بنی سلمہ کا سید اور امام حسن کو سب کا سید فرمایا۔ رضی اللہ عنہم۔ ہاں بے دینوں اور منافقوں کو سید کہنا منع ہے۔ جس حدیث میں اس کی ممانعت ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں لَا تَقُوْلُوْا لِلْمُنَافِقِ سَیِّدًا منافق کو سید نہ کہو (احکام القرآن) لہٰذا روافض' دیوبندی' قادیانی' سید تو کیا مسلمان ہی نہیں۔ **دسواں فائدہ:** نبی کی تصدیق ان کی دین کی تبلیغ رب کی اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ جسے یہ خدمت ملے وہ بہت ہی خوش نصیب ہے۔ دیکھو رب نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پہلی صفت بیان فرمائی۔ مُصَدِّقًا الخ جب کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے کا یہ درجہ ہے۔ تو حبیب اللہ کی تصدیق کرنے کی شان جو ہوگی وہ ہمارے خیال سے وراء ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے۔ **گیارھواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ اپنے بعض مقبول بندوں کو علم غیب خصوصاً علوم خمسہ بخشتا ہے۔ دیکھو ماں کے پیٹ میں کیا ہے۔ اور اس کے بچے کے حالات کیا ہوں گے۔ کس حال میں جئے گا۔ کس حال میں مرے گا۔ یہ تمام چیزیں علوم خمسہ سے ہیں۔ مگر تعلیم الٰہی یہ سب باتیں فرشتوں کی معرفت زکریا علیہ السلام کو بھی معلوم ہوئیں جب حضرت ایشاع حاملہ تھیں تو زکریا علیہ السلام کو پتہ تھا کہ اس حمل میں لڑکا ہے یہ بھی پتہ تھا کہ یہ لڑکا ان صفات کا جامع ہوگا ایمان پر قائم رہے گا بلکہ ایمان بخش ہوگا یہ تمام چیزیں علوم خمسہ سے ہیں۔ ہمارے حضور نے حضرت حسین کے صالح وشہید ہونے کی خبر پہلے سے دی۔ بدر میں جنگ سے ایک دن پہلے بتا دیا کہ کل یہاں فلاں کافر مارا جائے گا۔ اور یہاں فلاں یہ ہیں مقبولوں کے علوم خمسہ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نوافل میں مشغولیت نکاح سے افضل ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کی تعریف میں حصوراً فرمایا۔ اور حصور وہ ہی ہے جس میں نکاح کی قدرت ہو مگر مشغولیت عبادت کی وجہ سے نکاح نہ کرے۔ پھر حنفی نکاح کو نوافل سے افضل کیوں کہتے ہیں؟ (شافعی) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ حکم اس شریعت میں تھا۔ ہماری شریعت میں نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ یحییٰ علیہ السلام حضور ﷺ سے افضل ہوں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے نکاح کئے۔ حالانکہ حضور ﷺ افضل الانبیاء ہیں۔ تو حضور ﷺ کا ہر فعل دیگر انبیائے کرام کے ہر فعل سے افضل ہوگا۔ لہٰذا نکاح کرنا نہ کرنے سے افضل۔ دوسرا یہ کہ ترک نکاح اس زمانہ میں بھی حکم شرعی نہ تھا۔ یحییٰ علیہ السلام نے بذات خود ادھر رغبت نہ فرمائی رب تعالیٰ فرماتا ہے وَرَهْبَانِیَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ (حدید: ۲۷) ترک دنیا اہل کتاب نے خود ایجاد کیا ہم نے ان پر لازم نہ کیا۔ تیسرا یہ کہ تفسیر خازن وروح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ یحییٰ علیہ السلام نے نکاح تو کیا مگر

نکاح کے لوازمات میں زیادہ مشغول نہ ہوئے۔ نکاح اور چیز ہے اور اس میں مشغولیت دوسری چیز۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی آسمان سے واپس تشریف لا کر نکاح کریں گے۔ اور صاحب اولاد ہوں گے۔ حصور کے معنی ہیں نفس کو شہوت سے روکنے والا۔

دوسرا اعتراض: کیا حضرت مریم کے پاس پھل دیکھ کر زکریا علیہ السلام کو خدا کی قدرت کا علم ہوا اس سے پہلے نہ تھا۔ اگر تھا تو ھُنَالِکَ کے کیا معنی؟ (مرزائی) **جواب:** پہلے علم تو تھا اولاد کا شوق نہ تھا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر قدرتی طور پر دل میں شوق ہوا۔ نیز یہ وقت رحمت الٰہی کا تھا۔ اور رحمت کے وقت دعا مانگنا بہتر۔ **تیسرا اعتراض:** کلمة من اللہ کے معنی کتاب اللہ یعنی انجیل شریف ہے۔ نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ کے نہیں۔ وہ یوسف نجار کے بیٹے ہیں۔ جن کا نکاح حضرت مریم سے ہوا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ (کہف: ۵) نیز فرماتا ہے اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا (مومنون: ۱۰۰) بھلا انسان بھی کلمہ ہو سکتا ہے؟ (قادیانی) **جواب:** یہ تفسیر قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کے بالکل خلاف ہے۔ رب تعالیٰ نے کتاب اللہ کو کہیں کلمہ نہیں فرمایا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو بارہا کلمہ فرمایا ہے۔ سنو فرماتا ہے اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (النساء: ۱۷۱) نیز فرماتا ہے وَبِكَلِمَةٍ مِّنْهُ (آل عمران: ۴۵) نیز فرماتا ہے۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (آل عمران: ۵۹) چونکہ ان کی پیدائش کلمہ کن سے ہوئی نہ کہ نطفہ سے لہٰذا ان کا لقب کلمۃ اللہ ہوا۔ اگر وہ کسی مرد کے بیٹے ہوتے تو انہیں عیسیٰ ابن مریم نہ کہا جاتا کیونکہ اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے نہ کہ ماں کی طرف رب تعالیٰ فرماتا ہے اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ (احزاب: ۵) تم انہیں ان کے باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارو۔ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد ہوتے تو رب تعالیٰ انہیں عیسیٰ ابن مریم فرما کر نہ پکارتا۔ رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں صرف مریم کا نام لیا۔ ان کے سوا کسی عورت کا نام قرآن میں آیا ہی نہیں۔ لہٰذا كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ کے معنی عیسیٰ روح اللہ ہی ہیں۔ بھلا حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار کے ساتھ کہاں ثابت ہے۔ اور نکاح پڑھانے کوئی مرزائی جی گئے تھے؟ قرآن کریم نے حضرت مسیح کے بغیر باپ پیدا ہونے کا واقعہ پورے ایک رکوع میں بیان فرمایا جس کا واقعہ سورۂ مریم میں آئے گا۔ انشاء اللہ **چوتھا اعتراض:** حدیث شریف میں ہے کہ مسجد میں محراب بنانا منع ہے۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ محراب ان بدعتوں میں سے ہے جو پہلے زمانہ میں نہ تھی۔ ابو موسیٰ جہنی نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں خیر رہے گی جب تک کہ مسجدوں میں عیسائیوں کی طرح محرابیں نہ بنائی جائیں۔ عبداللہ ابن جعد فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کے نزدیک محراب علامت قیامت میں سے ہے۔ عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ محرابوں سے بچو اس بارے میں امام سیوطی نے ایک مستقل رسالہ لکھا پھر اس آیت میں اور ان احادیث میں مطابقت کیونکر ہو۔ (روح المعانی) **جواب:** نفس محراب منع نہیں بلکہ رنگین اور نقشین محراب بہتر نہیں جس سے نماز میں دھیان بٹے۔ یا صرف امام کا محراب میں کھڑا ہونا منع ہے۔ اسی لئے ان احادیث میں عیسائیوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جیسے عیسائیوں کا صرف امام محراب میں کھڑا ہوتا ہے اور محراب صرف امام ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے بچو۔ ایک روایت میں اِتَّقُوْا هٰذَا الْمَذَابِحَ (روح المعانی) ان محرابوں سے بچو اس کا یہی مطلب ہے کہ محراب میں اکیلے نہ کھڑے ہو۔ زمانہ

اول میں اس کا نہ ہونا ممانعت کی دلیل نہیں۔ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہ مینار تھے نہ گنبد' نہ پختہ مسجد شریف' صرف کھجور کی لکڑیوں کی دیواریں اور شاخوں کی چھت تھی۔ بلکہ سیدنا انس فرماتے ہیں کہ ہمیں محرابوں میں نماز سے منع کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا محرابیں تھیں۔ مگر وہاں تنہا امام کا کھڑا ہونا منع تھا نیز علامات قیامت ہونا ممانعت کی دلیل نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسجد کی زینت زیادتی مال علامات قیامت میں سے ہے۔ حالانکہ نہ مسجد کی زینت منع ہے۔ نہ زیادتی مال۔ **پانچواں اعتراض:** رب تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کی آخری فضیلت بیان فرمائی مِنَ الصّٰلِحِيْنَ کہ وہ نیکوں میں سے ہوں گے۔ یہ صفت تو عام مسلمانوں میں موجود ہے۔ اسے اتنی اہمیت سے بیان کیوں فرمایا؟ **جواب:** یہاں صالحین سے مراد عمومی صالحیت نہیں جو ہر مومن' متقی کو حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ جیسا صالح ویسی ہی صالحیت۔ یہاں صالحین کے یہ معنی ہیں کہ وہ ہمیشہ نیکیاں ہی کریں گے ان سے کوئی گناہ یا خطا عمر بھر سرزد نہ ہوگا۔ ان کی ہر ادا اصلاح ہے۔ یا وہ کوئی خطا نہیں کر سکیں گے۔ یعنی خطاؤں سے محفوظ یا معصوم یا وہ ان تمام مذکورہ صفات کے لائق ہیں۔ رب نے جو انہیں دیا ہے۔ ان کی لیاقت و قابلیت کی بنا پر دیا یا وہ خود بھی نبی ہیں۔ اور ان کا خاندان بھی صالحین کا ہے کہ ان کے دادکے نانکے انبیاء و اولیاء ہیں خاندان نبوت سے ہونا بھی رب کا کرم ہے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ غیر خدا کو سید کہہ سکتے ہیں۔ مگر حدیث میں اس کی ممانعت ہے۔ روایت میں ہے کہ وفد بنی عامر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کیا انت سیدنا آپ ہمارے سید ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اَلسَّيِّدُ هُوَ اللّٰهُ تَكَلَّمُوْا بِكَلَامِكُمْ وَلَا يَسْتَحْوِيَنَّكُمْ شَيْطٰن یعنی سید تو اللہ ہے۔ تم اپنا مقصد بتاؤ کیوں آئے ہو تمہیں شیطان ہلاک نہ کر دے۔ اس آیت اور حدیث میں مطابقت کیونکر ہو۔ نیز بعض روایتوں سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ کو اپنی تعریف ناپسند تھی۔ لہٰذا نعت خوانی حضور ﷺ کی ناراضی کا ذریعہ ہے۔ (بعض بے دین) **جواب:** ہم نے فوائد میں عرض کیا کہ رب نے یحییٰ علیہ السلام کو سید فرمایا۔ ہمیں نعت خوانی کا حکم دیا فرمایا وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (فتح:۹) حضرت حسان حضور ﷺ کے نعت خوان تھے۔ اس نعت خوانی کی ممانعت ہے۔ جو بتکلف ہو۔ دل سے نہ ہو۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں اِنَّ اَبْغَضَكُمْ اِلَيَّ الثَّرْثَارُوْنَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ الْمُتَفَيْهِقُوْنَ ان سب میں تکلف معتبر ہے۔ یعنی جب دل میں حضور ﷺ کی محبت نہ ہو تو فقط زبان سے منہ بھر کر بات کرنا اور تعریفیں کرنا باعث غضب الٰہی ہے۔ کہ یہ منافقوں کا طریقہ تھا وہاں اخلاص دیکھا جاتا ہے۔ (احکام القرآن)

تفسیر صوفیانہ

قوت بدنی گویا عمران کی بیوی ہے۔ اور روح گویا عمران۔ نفس مطمئنہ گویا مریم ہے۔ دماغ اس کا محراب فکر گویا زکریا ہے۔ جب قوت بدنی نے نفس مطمئنہ کو بیت المقدس قلب کے لئے وقف کرنا چاہا تو زکریا فکر اس کی پرورش کا متکفل ہوا۔ جب بھی یہ فکر کا زکریا مریم نفس مطمئنہ کے پاس محراب دماغ میں جاتا۔ تو اس کے پاس علوم الہامات اور کشف کا غیبی رزق پاتا تو اس سے پوچھتا ہے کہ اے مریم نفس مطمئنہ تیرے پاس یہ جنتی پھل کہاں سے آئے۔ جواب پاتا کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اسی وقت زکریا فکر نے رب تعالیٰ سے عقل فعال کا یحییٰ مانگا۔ جو طبعی میل کچیل سے پاک و صاف ہو۔ اللہ نے اس زکریا کی دعا قبول کی۔ اور اسے ملائکہ یعنی قویٰ روحانیہ نے آواز دی جبکہ یہ زکریا محراب دماغ میں رب سے مناجات کر رہا تھا کہ اے زکریا

تمہیں رب تعالیٰ یحییٰ یعنی عقل فعال کی خوشخبری دیتا ہے۔ جو عیسیٰ (قوت قلبی) کی تصدیق کرے گا۔ اور ان پر ایمان لائے گا یہ قلب گویا کلمتہ اللہ ہے۔ کیونکہ وہ جسمانی آلائش سے پاک ہے۔ اور وہ یحییٰ تمام قوموں کا سردار ہوگا۔ اور حصور یعنی طبیعت جسمانی کی مباشرت' اور بدنی گندگیوں سے اپنے کو دور رکھے گا۔ اور نبی یعنی معرفت الہیہ اور حقیقت کلیہ اخلاق جمیلہ۔ اور اچھی تدابیر کی خبر دے گا اور صالحین یعنی قرب الٰہی کی صلاحیت رکھنے والوں میں سے ہوگا (ابن عربی) گویا فکر نفس مطمئنہ کو دیکھ کر رب سے عقل مانگتی ہے۔ یہ دعا اس کی قبول ہوتی ہے۔ اور رب تعالیٰ کی طرف یہ عطیہ ملتا ہے۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مقبول بندوں کی دعا سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ انہونی بات ہو جاتی ہے۔ دیکھو بانجھ عورت جو ناقابل اولاد ہو اور بالکل بڈھے مرد سے جو بالکل قابل اولاد نہ رہے۔ بچہ پیدا ہونا انہونی بات ہے مگر ایک مقبول کی دعا سے یہ دونوں ناممکن باتیں ممکن نہیں بلکہ واقع ہو گئیں۔ بعض لوگ جو بزرگوں سے اولاد مانگتے ہیں ان کا مطلب یہ ہی ہوتا ہے کہ ان کی دعا سے رب تعالیٰ اولاد دے دیتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ نبی ولی کچھ نہیں دیتے۔ وہ سب کچھ دیتے ہیں باذن پروردگار رب فرماتا ہے اَغْنَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (التوبۃ: ۷۴) حضرت ربیعہ ابن کعب اسلمی نے حضور سے جنت مانگی اور پالی۔ اولاد جنت سے بڑھ کر نہیں لہٰذا ان سے اولاد مانگی جا سکتی ہے۔ حضرت جبرائیل نے بی بی مریم سے کہا تھا کہ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم: ۱۹) میں تمہیں ستھرا بیٹا دوں گا نیز فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی دعا سے ملا ہوا بچہ بہت نیک و صالح ہوتا ہے۔ اس میں دعا کرنے والے کا اثر ہوتا ہے۔ دیکھو بی بی حنہ ولیہ کی دعا سے کلمتہ اللہ جیسا فرزند پیدا ہوا۔ زکریا علیہ السلام کی دعا سے یحییٰ علیہ السلام جیسا فرزند پیدا ہوا۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے اسماعیل جیسا نور نظر پیدا ہوا۔ یہ عظمتیں دعا کرنے والوں کی برکتوں سے حاصل ہوئیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ
کہا اے رب میرے کیسے ہوگا واسطے میرے لڑکا حالانکہ بیشک پہنچ گیا مجھ کو بڑھاپا اور بیوی میری
بولا اے میرے رب میرے لڑکا کہاں سے ہوگا مجھے تو پہنچ گیا بڑھاپا اور میری عورت
عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ۝۴۰ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ
بانجھ ہے فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے عرض کیا اے رب میرے بنا واسطے میرے
بانجھ فرمایا اللہ یوں ہی کرتا ہے جو چاہتا ہے عرض کی اے میرے رب میرے لئے کوئی نشانی کر دے
اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ
نشانی فرمایا نشانی تمہاری یہ ہے کہ نہ کلام کرو گے تم لوگوں سے تین دن مگر اشارے سے اور یاد کرو
فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ تین دن تو لوگوں سے بات نہ کرے مگر اشارے سے اور اپنے

رَّبَّكَ كَثِيرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

رب اپنے کو بہت اور تسبیح کرو شام اور صبح کو

رب کی بہت یاد کر اور کچھ دن رہے اور تڑکے اس کی پاکی بول

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے تعلق چند طرح سے ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یحییٰ علیہ السلام کی بشارت دی گئی تھی اور اب ولادتِ یحییٰ کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر تھا اب ان کے تعجب کا تذکرہ ہے۔ کہ انہوں نے خود ہی دعا مانگی اور قبولیت دعا کی خبر سن کر خود ہی تعجب فرمایا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر تھا۔ اب طریقہ ولادت کا تذکرہ ہے۔ کہ زکریا علیہ السلام کو نہ دوسرے نکاح کی ضرورت پڑے گی نہ ان کی جوانی واپس کی جائے گی اسی طرح اللہ فرزند دے گا۔

تفسیر

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ یہ نیا جملہ جو بشارت کے جواب میں رب سے عرض کیا گیا۔ رب سے مراد پروردگار ہے اگرچہ بشارت فرشتوں نے دی تھی۔ مگر چونکہ رب کے حکم سے تھی اس لئے رب کو پکارا گیا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ رب سے مراد ملائکہ ہیں۔ کیونکہ وہ انسان کی روحانی تربیت کرتے ہیں۔ اور ایک طرح کے مربی ہیں۔ اور غیر خدا کو رب کہا جا سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ ظاہر یہ کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے عین نماز کے قیام کی حالت میں ہی فرشتوں سے مخاطب ہو کر بارگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا۔ سلام پھیرنے کا انتظار نہ فرمایا۔ ورنہ یہاں ثُمَّ قَالَ ارشاد ہوتا۔ کیونکہ فرشتوں کا گذشتہ کلام تو قیام کی حالت میں تھا۔ اور آپ رکوع سجدہ دوسری رکعت پھر سلام کے بعد یہ عرض کرتے اس لئے ثم ضرور ارشاد ہوتا۔ چونکہ آپ جانتے تھے کہ فرشتوں کا واسطہ میری عزت افزائی کے لئے ہے ورنہ رب تعالیٰ براہِ راست مجھے یہ فرما بھی سکتا ہے اور بلا توسط میری سنتا بھی ہے۔ فرشتوں کے وسیلہ کا محتاج نہیں اس لئے کلام فرشتوں سے کیا۔ خطاب رب تعالیٰ سے۔ خیال رہے کہ نمازی ہر جگہ ہی مدینہ منورہ میں اور دوسری جگہ التحیات میں سلام یکساں ہی کرتا ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ جس سے معلوم ہوا کہ حضور انور ﷺ دور نزدیک ہر جگہ سے امت کا سلام سنتے ہیں۔ ہاں قانون یہ ہے کہ دور والوں کا سلام فرشتہ بھی پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ رب کی بارگاہ میں ملائکہ اعمال پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ رب تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔ یہاں رب کے خطاب سے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ والے خطاب کا پتہ لگالو۔ اگر فرشتوں کی معرفت سلام کہلوانا ہوتا تو خطاب فرشتو سے ہوتا کہ اے فرشتو میرا سلام حضور ﷺ سے کہہ دینا۔ (تفسیر کبیر) اَنّٰى حرف استفہام ہے۔ بمعنی من این بھی آتا ہے۔ اور بمعنی کیف بھی چونکہ پیدائش فرزند نہایت عجیب چیز ہے۔ اس لئے بطور تعجب آپ نے یہ سوال فرمایا۔ اس سے قدرت الٰہی کا انکار منظور نہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ رب سے ہم کلامی کے شوق میں یہ کلام کیا۔ کہ جتنا سلسلہ سوال کا دراز ہوگا۔ اتنا ہی رب سے ہم کلامی کا موقع زیادہ ملے گا۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سوال سے مقصود کیفیت

ولادت کا پوچھنا ہے۔ اور یہ ہی قول قوی تر ہے۔ یعنی عرض کیا کہ اے میرے رب فرزند کہاں سے ہوگا۔ اس بانجھ اور بوڑھی بیوی سے یا مجھے دوسرا نکاح کرنا ہوگا۔ یا اے رب میرے فرزند کیسے ہوگا۔ میری جوانی واپس کی جائے گی۔ اور میری بیوی کا حال بدلا جائے گا۔ یا اسی طرح اس معنی پر قَالَ كَذٰلِكَ کا جواب نہایت چسپاں ہے۔ (کبیر روح المعانی) بعض لوگوں نے اور ضعیف وجوہ بھی بیان کئے ہیں جن کا ذکر بے فائدہ ہے۔ مثلاً کسی نے کہا کہ آپ کو شیطان نے عرض کیا کہ یہ بشارت فرشتہ کی آواز نہ تھی۔ بلکہ شیطانی آواز تھی۔ آپ نے دلی اطمینان کے لئے یہ سوال فرمایا مگر یہ غلط ہے پیغمبر پر فرشتے اور شیطان کی آواز مشتبہ نہیں ہوسکتی۔ خیال رہے کہ نا سمجھ بچے کو صبی کہتے ہیں۔ سمجھدار کو غلام قریب بلوغ کو مراھق' بالغ کو شاب ادھیڑ کو کہول اور بڈھے کو شیخ۔ غلام کہنے میں ادھر اشارہ ہے کہ وہ فرزند صاحب عمر ہوگا۔ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ یہ دوسرا سوال ہے اور بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ ترکیب قلوب ہے۔ اصل عبارت یوں تھی وَقَدْ بَلَغْتُ الْكِبَر (خازن) بعض نے فرمایا کہ اس سے بڑھاپے اور ضعف کا غلبہ بیان کرنا مقصود ہے۔ خیال رہے کہ یہ واؤ حالیہ ہے۔ اور جملہ ضمیر متکلم سے حال۔ کبر بمعنی بڑائی ہے۔ بڑائی قد وقامت سے بھی ہوتی ہے۔ اور درجہ عزت سے بھی۔ اور زمانہ عمر کے لحاظ سے بھی۔ یہاں اخیری معنی مراد ہیں۔ یعنی بڑھاپا آپ کی عمر اس وقت ایک سو بیس سال تھی۔ اور بیوی صاحبہ کی عمر اٹھانوے سال بعض مفسرین نے فرمایا کہ آپ کی عمر ننانوے سال تھی۔ بعض کے نزدیک بانوے سال۔ بعض کے نزدیک پچاسی سال بعض کے نزدیک پچھتر سال۔ بعض نے کہا ستر بعض نے کہا ساٹھ مگر پہلا قول زیادہ قوی ہے۔ (روح المعانی) عَاقِرٌ عقر سے بنا بمعنی اصل اور جڑ اسی لئے کہا جاتا ہے عَقَرْتُ النَّخْلَ۔ میں نے کھجور کو جڑ سے اکھیڑ ڈالا۔ ذبح کرنے اور پاؤں کاٹنے کو بھی عقر کہتے ہیں۔ یعنی اصل فناہ کر دینا۔ کہا جاتا ہے۔ عقرت العبیر میں نے اونٹ ذبح کر دیا رب تعالیٰ فرماتا ہے فَعَقَرُوْهَا (الشمس: ۱۴) اور فرماتا ہے فتعاطی فَعَقَرَ (قمر: ۲۹)۔ بانجھ عورت کو اسی لئے عاقرہ کہتے ہیں کہ وہ نطفے کی اصل کو برباد کر دیتی ہے۔ روح المعانی نے فرمایا کہ عقر بمعنی کاٹنا ہے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ رمل عاقر اس زمین کو کہتے ہیں جس میں پیداوار نہ ہوسکے یعنی اے رب مجھے بڑھاپا پہنچ گیا اور میری بیوی بڑھاپے کے ساتھ بانجھ بھی ہے پھر بیٹا کیونکر ہوگا قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ یہ ان کے سوال کا جواب ہے قَالَ کا فاعل رب تعالیٰ ہے۔ یا فرشتے كَذٰلِكَ یا تو یکون پوشیدہ کے متعلق ہے اور اللّٰہ یَفْعَلُ نیا جملہ ہے۔ یا یہ پورا ایک جملہ ہے۔ یعنی اے زکریا یہ عطائے فرزند بلا فرق ایسے ہی ہوگی۔ نہ تم جوان کئے جاؤ گے۔ اور نہ تمہیں دوسرا نکاح کرنا ہوگا۔ کیونکہ اللہ جو چاہے کرے یا اے زکریا اللہ اسی طرح جو چاہے کرتا ہے۔ تم تعجب مت کرو۔ چونکہ زکریا علیہ السلام چاہتے تھے کہ استقرار حمل سے ہی عبادت اور شکر میں مشغول ہو جاؤں۔ اور حمل کی علامت حیض کا بند ہونا ہے۔ حضرت ایشاع کو بڑھاپے کی وجہ سے حیض آتا ہی نہ تھا۔ اور اگر آتا بھی ہوتا تب بھی حمل کا پتہ کچھ عرصہ بعد چلتا۔ اس لئے آپ نے بیوی صاحبہ کے حمل کی علامت رب سے پوچھی کہ عرض کیا قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً اے مولیٰ میرے لئے اس حمل کی کوئی نشانی مقرر فرمادے۔ کہ میں وہ نشانی پاکر شروع حمل سے ہی شکر میں مشغول ہو جاؤں۔ دیگر علامات کے ظہور تک مجھے انتظار نہ کرنا پڑے۔ خیال رہے کہ اجعل جعل سے مشتق ہے۔ اور جعل متعدی بیک مفعول بھی ہوتا ہے۔ اور بدو مفعول بھی۔ پہلی صورت میں آیۃ مفعول ہے۔ اور لی اس کا حال۔ اور دوسری صورت میں آیۃ مفعول اوّل ہے۔ اور لی مفعول دوم۔ قَالَ اٰيَتُكَ

اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا یہ ان کی دعا کا جواب ہے۔ قال کا فاعل رب تعالیٰ ہے۔ یا فرشتہ اٰیتک سے مراد آیۃ لک ہے اَلَّا تُكَلِّمَ سے مراد یا کلام نہ کرنا ہے۔ یا نہ کر سکنا۔ یا کلام کی رب کی طرف سے ممانعت اور کلام سے دنیوی کلام مراد ہے۔ جیسا کہ لِلنَّاسِ سے معلوم ہوا۔ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ سے مراد تین دن مع رات ہیں۔ کیونکہ سورۂ مریم میں فرمایا گیا ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا (مریم:۱۰) ہماری قرأت میں رے کے فتح اور میم کے سکون سے ہے۔ بمعنی حرکت یا اشارہ کرنا۔ خواہ آنکھوں سے ہو یا ہاتھ سے یا سر کی جنبش سے۔ یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں۔ عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ ہاتھ سے اشارہ کو رمز کہتے ہیں۔ اور سر کے اشارہ کو وحی۔ حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ رمز سے مراد ہونٹوں کا ہلانا ہے۔ (تفسیر روح المعانی وغیرہ) یحیٰی ابن وثاب کی قرأت میں اِلَّا رَمُزًا رے اور میم کے ضمہ سے ہے جمع رموز کی جیسے رسول سے رسل۔ بعض قرأتوں میں اِلَّا رَمَزًا رے اور میم کے فتح سے۔ رامز کی جمع جیسے خادم کی جمع خدم۔ اس صورت میں یہ تکلم کے فاعل سے حال ہوگا۔ یعنی رب نے فرمایا کہ اے زکریا تمہاری بیوی کے حاملہ ہونے کی علامت تمہارے واسطے مقرر کی گئی۔ کہ تم لوگوں سے تین دن خود بخود اشارہ کے سوا کلام نہ کرو گے۔ جو کچھ کہنا ہوگا اشارے سے کہو گے یا تین دن تک تم بحکم الٰہی بولنے کا روزہ رکھو گے۔ اور شرعاً تمہیں کلام جائز نہ ہوگا۔ جیسے پچھلے ادیان میں ہوتا تھا۔ یا تم تین دن تک لوگوں سے تو کلام ہی نہ کر سکو گے۔ تمہاری زبان میں بولنے کی طاقت ہی نہ رہے گی۔ یہ ہی قوی تر ہے۔ یعنی آپ کو اس زمانہ میں گنگ کی بیماری نہ ہوگی۔ حضرات انبیاء کرام اس بیماری سے محفوظ ہیں۔ نیز اگر گنگ کی بیماری ہوتی تو آپ ذکر اللہ کیسے کرتے۔ بلکہ قدرتی طور پر آپ کی زبان میں لوگوں سے کلام دنیاوی کرنے کی قوت نہ ہوگی۔ رب سے عرض معروض بخوبی کر لو گے۔ اب بھی بعض لوگ آپس میں خوب گفتگو کر لیتے ہیں مگر اسٹیج پر بطریقہ تقریر بول نہیں سکتے۔ بعض لوگ دنیا کی ساری باتیں کر لیتے ہیں مگر نماز یا کلمہ ادا نہیں کر سکتے۔ ایک ہی عالم ایک وقت میں شاندار تقریر کرتا ہے دوسرے وقت کچھ بول نہیں سکتا۔ یہ واردات آتے رہتے ہیں۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم بھی اسی زمانہ کے متعلق ہے اور ممکن ہے کہ اس وقت کے متعلق ہو یعنی اس خاموشی کے زمانہ میں رب کا ذکر کرنا آج ہی سے اس کا خوب ذکر کرو۔ یسبح کا مصدر تسبیح ہے اس سے مراد یا نماز ہے جیسے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ (الروم:۱۷) یا سبحان اللہ کہنا مقصود۔ عشی۔ سورج ڈھلنے سے صبح کے وقت تک کو کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا (نازعات:۴۶) اور عشاء نماز مغرب سے عشاء کے وقت تک کو بولا جاتا ہے۔ یعنی رات کا شروع حصہ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ (یوسف:۱۶) یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی مغرب بعد اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ عشی سورج ڈھلنے سے غروب کا نام ہے شاعر کہتا ہے۔

فَلَا الظِّلَّ مَنْ بَرْدَ الضُّحٰى اَسْتَطِيْعَهٗ   وَلَا الْفِيءُ هُنَّ بِرْدَ الْعَشِيِّ تَذُوْقُ

(کبیر و معانی وغیرہ)

ابکار بکرہ سے بنا۔ بمعنی شروع کنواری لڑکی کو باکرہ اور شروع پھل کو باکورہ کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں فجر سے چاشت تک کا وقت بکرہ کہلاتا ہے۔ یہاں ابکار سے پہلے وقت پوشیدہ ہے۔ یعنی وقت الابکار کیونکہ ابکار مصدر ہے۔ بغیر مضاف پوشیدہ

ہوئے اس کا عطف عشی پر صحیح نہیں۔ یعنی صبح شام رب کی تسبیح پڑھو۔ اور اس کی پاکی بولو۔

خلاصہ تفسیر

زکریا علیہ السلام نے جب فرزند کی بشارت سنی تو عرض کیا کہ اے مولیٰ میرے فرزند کیونکر ہوگا۔ میں تو ایک سو بیس سال کا بوڑھا ہوں اور میری بیوی اٹھانوے سال کی بڑھی ہونے کے علاوہ بانجھ بھی ہیں۔ آیا ہماری حالتوں میں تبدیلی کی جائے گی۔ یا ہم دونوں اسی طرح رہیں گے اور فرزند ہو جائے گا۔ جواب ملا کہ اے زکریا تمہارے اولاد ایسے ہی ہوگی۔ نہ تمہاری جوانی لوٹے گی اور نہ تمہیں دوسرے نکاح کی ضرورت پیش آئے گی اور نہ تمہاری بیوی میں تبدیلی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ ہر طرح قادر ہے تب عرض کیا کہ اے میرے مولیٰ میری خواہش یہ ہے کہ میرے لئے میری بیوی کے حاملہ ہونے پر کوئی نشانی مقرر کر دی جائے۔ تاکہ میں شروع حمل سے ہی تیرے ذکر میں مشغول ہو جاؤں اور مجھے ظہور حمل تک انتظار نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ میری بیوی کو تو حیض آتا ہی نہیں۔ تاکہ اس کی بندش حمل کی علامت ہو۔ تب رب نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے لئے علامت یہ ہے کہ تم زوجہ کے حاملہ ہوتے ہی تین دن تک لوگوں سے کلام نہ کر سکو گے۔ بجز اشاروں کے اور بات پر تمہیں قدرت نہ ہوگی۔ اور اپنے رب کا ذکر خوب کرنا اور صبح و شام تسبیح و تحلیل میں مشغول رہنا۔ خیال رہے کہ چونکہ یحییٰ علیہ السلام بڑے پائے کے عابد و زاہد اور تارک الدنیا اور لوگوں سے بے تعلق تھے۔ اسی لئے ان کے آنے کی علامت بھی رب کی عبادت اور دنیا سے بے تعلقی قرار دی گئی۔ اور انسان کی قوتیں رب کے قبضہ میں ہیں جب چاہے معطل کر دے۔ جب چاہے واپس فرما دے۔ بعض لوگوں کو شب کوری ہوتی ہے۔ کہ ان کی آنکھ رات میں نہیں دیکھ سکتی چمگادڑ کی آنکھ رات کو خوب دیکھتی ہے دن میں کام نہیں کرتی۔ آنکھ ایک ہے مگر ایک وقت کام کی ہے دوسرے وقت بیکار بعض لوگوں کی نگاہ قریب کو دیکھ لیتی ہے دور کے لئے بے کار بعض کی نگاہ اس کے برعکس لوگ موٹی چیز کو دیکھ لیتے ہیں باریک چیز انہیں نظر نہیں آتی۔ پتہ لگا کہ ہماری قوتیں رب کے اختیار میں ہیں۔ ایسے ہی ہو سکتا ہے کہ زکریا علیہ السلام کی زبان شریف تسبیح و تبلیغ میں مشغول رہے۔ مگر کلام نہ کر سکے اس پر تفصیلی گفتگو سوال و جواب میں کی جائے گی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** فرزند کی خواہش سنت انبیاء ہے۔ خصوصاً جب خدمت دین کی نیت سے ہو۔ قرآن کریم نے زکریا علیہ السلام کا یہ قول نقل فرمایا۔ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ (انبیاء:۸۹) نیز فرمایا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا (مریم:۶) نیک بیٹا ماں باپ کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔ کہ زندگی اور قبر و حشر میں کام آتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** انبیائے کرام بارگاہِ الٰہی میں بڑی عزت والے ہیں۔ کہ ان کے آنے سے پہلے ان کی آمد کی خبر دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کو خبر دے دی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی خبر پہلے ہی سے دنیا میں پھیل چکی تھی۔ ایسے ہی یحییٰ علیہ السلام کی خبر اس کی علامتیں وغیرہ پہلے ہی سے ظاہر کر دی گئیں۔ ہمارے نبی ﷺ کی شہرت تمام جہان میں پہلے ہی سے ہو چکی تھی۔ تیسرا فائدہ: نعمت کی تشریف آوری خدا کی رحمت ہے اس کا شکریہ ادا کرنا سنتِ انبیاء۔ دیکھو یحییٰ علیہ السلام کی

آمد پر خوشی میں زکریا علیہ السلام نے شکر کیا۔ اور انہیں رب نے بھی حکم دیا۔ کہ تم میرا ذکر کرو۔ اور صبح شام تسبیح پڑھو۔ لہٰذا اب بھی ولادت پاک کی یادگار میں بدنی یا مالی عبادت کرنا ذکر اللہ کی مجلس قائم کرنا۔ یعنی محفل میلاد شریف جائز بلکہ سنت سے ثابت ہے۔

چوتھا فائدہ: زکریا علیہ السلام کی یہ خاموشی چند طرح معجزہ ہے۔ اولاً یہ کہ آپ تسبیح اور ذکر پر قادر ہے اور لوگوں سے کلام نہ کر سکے دوسرا یہ کہ سارے اعضاء خصوصاً زبان شریف صحیح سلامت رہی اور پھر بات کرنے پر قدرت نہ رہی۔ تیسرا یہ کہ آپ کو پہلے ہی سے خبر دی گئی کہ تمہاری بیوی کے حاملہ ہونے کی یہ علامت ہے۔ پھر ایسا ہی ہوا۔ یہ تمام ایک معجزہ نہیں بلکہ معجزات ہیں۔ یہ فائدہ۔ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ کی اخیری تفسیر سے حاصل ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** اوراد اور وظیفوں میں لوگوں سے کلام نہ کرنا سنتِ انبیاء ہے۔ یہ فائدہ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ کی پہلی تفسیر سے حاصل ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** صبح اور شام تسبیح پڑھنا سنتِ انبیاء ہے۔ نیز چونکہ ان وقتوں میں عالم کی حالت تبدیل ہوتی ہے۔ کہ دن جاتا ہے اور رات آتی ہے۔ یا رات جاتی ہے دن آتا ہے۔ اس تبدیلی پر تبدیل کرنے والے پروردگار کا ذکر کرنا بہتر ہے۔ ہمارے سلسلہ قادریہ میں صبح و شام تسبیح فاطمہ پڑھی جاتی ہے اس کی اصل یہ آیت کریمہ ہے۔ **ساتواں فائدہ:** ذکر قلبی کے ساتھ ذکر زبانی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ میں بظاہر ذکر زبانی مراد ہے۔ اگر صرف ذکر قلبی مراد ہوتا تو لوگوں سے کلام نہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ **آٹھواں فائدہ:** دنیوی کام میں جلدی کرنا منع مگر اخروی نعمت میں جلدی ثواب زکریا علیہ السلام نے پیدائش فرزند بہت جلدی چاہی۔ اس لئے اس کی نشانی مانگی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ (آل عمران: ۱۳۳)

اعتراضات

پہلا اعتراض: زکریا علیہ السلام نے فرزند کی بشارت پا کر تعجب کیوں کیا۔ اور کیوں فرمایا اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ کیا انہیں قدرت رب میں شک تھا۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو وہ جو تفسیر میں گذر گیا۔ کہ یہ کلام تعجب کے لئے ہے ہی نہیں۔ بلکہ پیدائش کی نوعیت پوچھنے کے لئے ہے۔ کہ مولیٰ فرزند کہاں سے اور کس طرح ہوگا اسی بیوی سے یا دوسری بیوی سے اور مجھے جوانی دی جائے گی یا ایسے ہی۔ جس کا جواب ملا کہ كَذٰلِكَ۔ یعنی ایسے ہی ہوگا۔ دوسرا یہ کہ کلام تعجب کے لئے ہی ہے مگر تعجب شک سے نہیں بلکہ حیرت سے ہے۔ جیسے بادشاہ کسی فقیر کو لاکھ روپیہ دے دے۔ تو فقیر عرض کرے کہ حضور تم نے مجھے اتنی رقم کیسے دے دی یعنی میں تو اس لائق نہ تھا۔ تم نے کیسے کرم فرمایا۔ یہ حیرت بادشاہ کی سخاوت پر نہیں بلکہ اپنے ضعف پر ہے (تفسیر کبیر و روح المعانی وغیرہ) **دوسرا اعتراض:** زکریا علیہ السلام نے اس پر رب سے نشانی کیوں مانگی۔ کیا انہیں رب کے وعدہ پر اعتماد نہ تھا۔ (بعض بے دین) **جواب:** اس کا نہایت نفیس جواب تفسیر میں گذر چکا ہے۔ کہ نشان مانگنا ادائے شکر کے لئے ہے۔ گویا عرض کیا کہ اے مولیٰ میری آرزو یہ ہے کہ قرار حمل ہوتے ہی تیرے شکر میں مشغول ہو جاؤں چونکہ میری بیوی ایشاع کو حیض نہیں آتا۔ اس لئے مجھے اس کا پتہ کیونکر چلے گا۔ تو اور کوئی علامت مقرر فرما دے۔ اور شکر اچھی چیز ہے بعض لوگوں نے کہا کہ اس سے خوشی میں جلدی منظور تھی۔ اور کمال شوق کا اظہار۔ **تیسرا اعتراض:** حمل شریف کی علامت زبان بندی اور ذکر الٰہی کیوں مقرر کی گئی۔ علامت تو کچھ اور بھی ہو سکتی تھی؟ **جواب:** اس کے چند جواب [illegible] تھا۔ کہ اے زکریا تم نے زبانی

بشارت پاکر تعجب اور اپنے بڑھاپے کا ذکر کیوں کیا۔ تمہاری زبان ہی بند کر دی جائے گی (خازن و کبیرہ وغیرہ) مگر یہ جواب صحیح نہیں۔ کیونکہ بشارت فرزند پر تعجب اور اپنے بڑھاپے کا ذکر تو ابراہیم علیہ السلام نے بھی کیا تھا کہ فرمایا تھا۔ اَبَشَّرْ تُمُوْنِیْ عَلٰی اَنْ مَّسَّنِیَ الْکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ (حجر: ۵۴) حضرت سارہ نے بھی یہ ہی عرض کیا تھا۔ ءَ اَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّھٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا (ھود: ۷۲) اگر اس پر عتاب ہوتا تو ان پر بھی ہونا چاہیے تھا۔ دوسرا یہ کہ آپ کا علامت مانگنا ادائے شکر اور عبادت کے لیے تھا۔ اس نشانی سے ان کے ارادہ کی تائید فرمائی گئی کہ چونکہ آپ ہمارا ذکر چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم صرف ذکر میں مشغول رکھنے کے لئے۔ دوسری گفتگو سے آپ کی زبان ہی بند کر دیں گے۔ اگر عتاب کے لئے زبان بند ہوتی تو زبان شریف بالکل بند ہو جاتی۔ تیسرا یہ کہ جیسی نعمت ویسا اس کا نشان۔ سورج کی بشارت صبح صادق کے نور سے دی جاتی ہے۔ کہ سورج نور ہے۔ تو نور ہی اس کا مبشر ہے۔ بارش کی بشارت بادل سے دی جاتی ہے۔ رات کی آمد افق کی سیاہی سے بتلائی جاتی ہے۔ غرض کہ ہر شے کا نشان اس کے مطابق ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جلالی پیغمبر تھے۔ تو ان کی آمد پر قتل وغیرہ نشانی ظاہر ہوئی۔ ہمارے نبی ﷺ رحمت عالم ہیں۔ اس لئے ان کی آمد پر بارش اور خدا کی دوسری نعمتوں کا نزول ہوا۔ یحیٰی علیہ السلام تارک الدنیا، رب کے ذاکر، خوف الٰہی میں ہمیشہ رونے والے تھے کہ آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو رہتے تھے۔ اور کبھی ٹھٹھا مار کر نہ ہنسے اور آپ دنیا کے پانچ رونے والوں میں سے ایک ہیں۔ لہٰذا آپ کی علامت بھی ایسی ہی مقرر ہوئی۔ چوتھا یہ کہ آپ کی زبان بندی ہوئی ہی نہ تھی۔ خود اپنی خوشی سے کلام نہ فرمایا۔ پانچواں یہ کہ آپ نے کلام کا روزہ رکھا تھا۔ جیسا کہ ہم نے تفسیر میں عرض کر دیا۔ خیال رہے کہ حضرت آدم کی آمد کی دھوم صرف فرشتوں میں ڈالی گئی۔ حضرت ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کی آمد کی خبریں صرف ایک ملک میں دی گئیں۔ جناب یحیٰی علیہ السلام کی تشریف آوری کا چرچہ صرف ایک خاندان میں کیا گیا۔ مگر حضور ﷺ کی ولادت پاک کی دھوم تمام جہانوں میں مچا دی گئیں کہ پہلے تمام جہان میں تین سال تک بارش نہ ہوئی۔ حمل شریف کی شب تمام جگہ خوب بارشیں ہوئیں۔ برکتیں نازل ہوئیں صعوہ خشک ہوا۔ ایران کی ایک ہزار سال کی روشن آگ بجھ گئی۔ قصر کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ فقیر نے یہ محل بغداد کے پاس مسلمان پاک میں دیکھا ہے۔ غرضیکہ عالم میں کوئی چپہ نہ رہا۔ جہاں حضور ﷺ کی بشارت نہ پہنچی ہو۔ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ عالمین کو آپ کی اطلاع دے دی گئی۔

تفسیر صوفیانہ

پہلے عرض کیا جا چکا کہ صوفیائے کرام کے نزدیک فکر صحیح گویا زکریا ہے اور عقل صحیح گویا یحیٰی۔ وہ بطریق اشارہ اس کی تفسیریوں کرتے ہیں کہ زکریائے فکر نے عقل کی بشارت پاکر بارگاہ الٰہی میں ذکر کیا کہ میں اپنی تمام منازل طے کر کے اخیری منزل تک پہنچ چکی اور میری بیوی یعنی روح نفسانی نور سے خالی۔ اور دنیا میں پھنسی ہوئی گویا بانجھ ہے۔ ہم دونوں سے عقل کا یحیٰی کیونکر پیدا ہوگا۔ اور اس نور محض کے حصول کی علامت کیا ہوگی۔ تو خطاب زبانی ہوا۔ کہ اے فکر اس نور کے ظہور کی پہچان یہ ہے کہ تو اپنے عمر کے تین دن جن میں ہر دن دس سال کا گویا دس سال کی عمر سے چالیس سال کی عمر تک بدنی قوتوں کے ساتھ مشغولیت اور ان کی فضول لذتوں سے دور رہے گی۔ ہاں ان کے ساتھ مخفی اشارہ کیا کرے گی۔ اور ان سب اعضاء کو ان کی خاص تسبیح پڑھنے کا حکم کرے گی اور تو [illegible] اپنی تسبیح [illegible] گی (ابن عربی) خلاصہ یہ کہ جسے رب کی طرف

سے عقل کامل ملنے والی ہوتی ہے۔اسے عبادت کا ذوق وشوق قدرتی طور پر ہوتا ہے۔

دوسری تفسیر

جب زکریا فکر نے یحییٰ عقل کی بشارت سنی تو عرض کیا مولیٰ میں ضعیف اور میری بیوی یعنی نفس حیوانی بانجھ ہے۔ یہ نفس ایسا پاک بچہ کیونکر جن سکتی ہے ناگن ہمیشہ سانپ جنتی ہے۔اے مولیٰ یہ نفیس فرزند اس خسیس نفس سے کیسے پیدا ہوگا۔رب تعالیٰ نے فرمایا ایسے ہی رب تعالیٰ اپنے عجائب قدرت ان لوگوں کو دکھاتا ہے۔جو عادت کی قید میں پھنسے ہیں۔فکر نے عرض کیا کہ اے مولیٰ مجھے اس کے نشان بتا۔تاکہ میں تیرا شکر کروں۔فرمایا نشان تیرا یہ ہے کہ تو مباح لذتوں سے بھی تین دن مانوس نہ ہو گا۔فنائے فعلی اور فنائے صفات اور فنائے ذات کے دن۔ ہاں اِلَّا رَمْزًا۔ بقدر ضرورت اور اپنے اس رب کا خوب ذکر جس نے تجھے یہاں تک پہنچایا۔اور رب کی صبح شام یعنی صحو اور محو کے وقتوں میں تسبیح کر۔خیال رہے کہ صوفیاء پر دو وقت آتے ہیں۔ ایک فنافی اللہ کا جسے حضرات محو کہتے ہیں۔ یہ گویا صوفیاء کی شام ہے۔اور دوسرا ابقا باللہ کا جسے ان کے ہاں صحو کہا جاتا ہے۔ یہ صوفیاء کی صبح ہے۔صوفی اس صبح شام میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے۔اس صبح اور شام کا سورج ہی دوسرا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ لَا اِلٰهَ شام ہے۔اور اِلَّا اللهُ سویرا (روح المعانی) ایسے ہی صوفی کے فنا کے تین درجے ہیں فناء فعل یہ اس کی ابتدائی منزل ہے۔جب بندے کے ہر کام رب کے اشارہ پر ہوتے ہیں دوسرا فناء صفات جب بندہ صفات الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے۔تیسرا فناء ذات جہاں پہنچ کر اس کا ورد یہ ہوا ہے۔ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللهُ بلکہ اس وقت میں کلیم' کلام' متکلم' خود ذات واحد ہی ہوتی ہے۔اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔کہ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ
اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم تحقیق اللہ نے چن لیا تم کو اور پاک کر دیا تم کو اور چن لیا
اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بے شک اللہ نے تجھے چن لیا اور خوب ستھرا کیا اور آج سارے
عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ
تم کو اوپر عورتوں جہانوں کے اے مریم اطاعت کرو تم واسطے رب اپنے کے اور سجدہ کرو
جہان کی عورتوں سے تجھے پسند کیا اے مریم اپنے رب کے حضور ادب سے کھڑی ہو اور اس کے لئے سجدہ کر
وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ
اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے یہ خبروں سے ہے غیب کی وحی کرتے ہیں ہم اس کی
اور رکوع والوں کے ساتھ رکوع کر یہ غیب کی خبریں ہیں کہ ہم خفیہ طور پر
اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ

طرف آپ کے اور نہ تھے آپ نزدیک ان کے جب ڈالتے تھے وہ قلم اپنے کہ کون ان میں سے کفیل ہے
تمہیں بتاتے ہیں اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ اپنی قلموں سے قرعہ ڈالتے تھے کہ مریم کس کی پرورش میں رہیں
مَرْيَمَ ۖ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾
مریم کا اور نہ تھے تم پاس ان کے جب وہ جھگڑتے تھے
اور تم ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑتے تھے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** ان آیتوں میں آل عمران کی برتری اور ان کے چناؤ کا ذکر تھا۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر اس کی تاکید کے لئے حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام کا قصہ آ گیا۔ اب پھر آل عمران کا باقی قصہ بیان ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** زکریا علیہ السلام کے قصے سے پہلے عمران کی بیوی حنہ کی برگزیدگی کا ذکر تھا اب اُن کی بیٹی حضرت مریم کی بہتری اور افضلیت کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** کچھ پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آل عمران کو دنیا والوں پر بزرگی دی۔ اس کی ایک دلیل حنہ کا قصہ بیان ہوا۔ اب دوسری دلیل حضرت مریم کے قصہ سے بیان ہو رہی ہے۔ گویا یہ سارا کلام یا اس کا اجمال کی تفصیل ہے۔ یا اس دعویٰ کی دلیل۔

تفسیر

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یہ جملہ یا تو پچھلے اِذْ پر معطوف ہے۔ یا نیا جملہ ہے اور اُذْكُرْ فعل پوشیدہ کا ظرف۔ ملائکہ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ سورۂ مریم میں فرمایا گیا۔ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَیْهَا رُوْحَنَا (مریم: ۱۷) یا ان کی عظمت کے لئے ملائکہ جمع ارشاد ہوا یا اس لئے کہ وہ فرشتوں کی جماعت کے سردار ہیں۔ اور سردار کا کلام گویا جماعت ہی کا کام ہوتا ہے۔ جیسے يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ:۔ یہاں بھی ملائکہ سے حضرت جبریل مراد ہیں (کبیر و معانی وغیرہ) اور ممکن ہے کہ حضرت مریم کے پاس فرشتوں کی جماعت آئی ہو۔ اور سب نے ہی یہ کلام کیا ہو۔ مگر سورۂ مریم میں ان سے ایک کے کلام کا ذکر ہو (مدارک) يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ یہ فرشتوں کا کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ گفتگو حضرت مریم سے سامنے ہو کر کی گئی۔ مگر چونکہ یہ کلام تبلیغی وحی نہ تھا۔ اس لئے حضرت مریم کی نبوت اس سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ نبوت مردوں سے خاص ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ (النحل: ۴۳) فرشتوں کی یہ گفتگو یا حضرت مریم کی کرامت ہے۔ یا عیسیٰ علیہ السلام کا ارہاص کیونکہ ھاس اس سے بنا۔ دیوار کا نچلا حصہ۔ اصطلاح میں اس عجیب چیز کو ارہاص کہتے ہیں۔ جو دعویٰ نبوت سے پہلے ظاہر ہو خواہ وہ نبی کی ولادت سے پہلے یا ولادت کے بعد۔ ظہور نبوت سے پہلے۔ جیسے حضور ﷺ پر بچپن شریف میں بادل کا سایہ کر دینا۔ پتھروں کا سلام کرنا آپ پر سایہ کرنے کے لئے درختوں کا جھک جانا۔ یا جیسے ولادت پاک سے پہلے اصحاب فیل کا قصہ اور ولادت شریف کے وقت نور کا ظاہر ہونا۔ پرندوں چرندوں کا ایک دوسرے کو خوشخبری دینا۔ یا سیدنا عبداللہ کا ولادت پاک ﷺ سے پہلے معجزات کا دیکھنا کہ آپ جب کعبہ معظمہ میں جاتے تو وہاں کے سارے

بت اوندھے گر جاتے تھے۔ آپ پر بھی بعض اوقات ابر سایا کرتا تھا۔ آپ کو قتل کرنے کے لئے کچھ یہود آئے تو غیبی لوگ نمودار ہوئے۔ جنہوں نے ان یہود کو قتل کیا۔ نیز حضرت آمنہ کے زمانہ حمل شریف میں ہر ماہ کسی نہ کسی نبی کی خواب میں زیارت کی۔ خاص ولادت کے وقت حوران بہشتی اور حضرات انبیاء کرام کی والدہ خصوصاً حضرت مریم کا آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہونا...... دروازے پر فرشتوں کا حاضر ہونا۔ نیز حضرت حلیمہ دائی کے گھر آپ کے ہاتھ پر ہزار ہا عجائب کا ظہور یہ سب ہمارے حضور ﷺ کے ارھاصات ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ کلام بطریق الہام تھا۔ جیسے وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى (القصص: ۷) مگر تفسیر اوّل صحیح ہے۔ کہ اس کی تائید سورۂ مریم سے ہوتی ہے۔ اصطفٰی کی لفظی تحقیق پہلے ہو چکی۔ اس جگہ اس سے وہ چناؤ مراد ہے۔ جو عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہوا۔ مثلاً یہ کہ باوجود لڑکی ہونے کے انہیں بیت المقدس کی خدمت کے لئے قبول کرلیا گیا۔ رب تعالیٰ نے خود ان کی پرورش فرمائی کہ انہیں جنتی رزق بھیجے اور بچپن شریف میں بولنے کی طاقت بخشی۔ ہر گناہ سے محفوظ رکھا۔ اور ان کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر فرمائیں۔ طَهَّرَكِ تطہیر سے بنا بمعنی خوب پاک و صاف کرنا۔ یہاں جسمانی، قلبی، روحانی پاکی اور صفائی مراد ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے انہیں حیض و نفاس سے پاک فرمایا۔ تاکہ بیت المقدس کی خدمت کرسکیں۔ نیز کفر، گناہ، کج خلقی وغیرہ باطنی عیوب سے بھی پاک فرمایا اور یہود کی تہمت سے بری فرمایا چنانچہ آپ کو نہ کبھی حیض آیا نہ نفاس (خازن و معانی و کبیر وغیرہ عام تفاسیر) وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ اس دوسرے اصطفٰی سے پہلے یا پہلے اصطفٰے کی تاکید ہے یا حضرت مریم کا بعد بلوغ دوسرا چناؤ مراد ہے۔ جیسے انہیں بغیر شوہر بیٹا دینا۔ ان کو اور ان کے فرزند کو دنیا کے لئے نشان قدرت بنانا۔ فرزند کا پیدا ہوتے ہی اپنی والدہ ماجدہ کے فضائل بیان کرنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت مریم کا چناؤ دو قسم کا ہوا وھبی جو بچپن میں ہو گیا۔ بغیر کسی عمل کے اور چناؤ کسبی جو تقویٰ و طہارت کے ذریعہ بعد جوانی ہوا۔ اصطفٰی وھبی کا ذکر پہلے اصطفاک میں تھا۔ اور اصطفاء کسبی کا یہاں دوسری جگہ لہٰذا آیت میں تکرار نہیں۔ اَلْعَالَمِيْنَ سے اس زمانہ کے لوگ مراد ہیں جیسے بنی اسرائیل سے فرمایا گیا فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِيْنَ (بقرہ: ۱۲۲) (عام تفاسیر) اور اگر اس برگزیدگی سے بغیر شوہر بیٹا دینا مراد ہے۔ تو عالمین سے ساری عورتیں مراد غرضیکہ فضیلت جزوی تو حضرت مریم کو تمام ہی عورتوں پر حاصل ہے۔ بلا استثناء اور فضیلت کلی اس زمانہ کی عورتوں پر حاصل ہے۔ جزوی خصوصیات ہر نبی ہر ولی کو حاصل ہوتی ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (بقرہ: ۲۵۳) کوئی بی بی بغیر خاوند بیٹے کی والدہ نہ بنی، کوئی بی بی روح اللہ کی ماں نہ ہوئی۔ یعنی اے محبوب ﷺ وہ واقعہ بھی یاد کرو جب فرشتوں نے حضرت مریم سے کہا تھا کہ اے مریم تمہیں اللہ تعالیٰ نے پہلے بھی برگزیدہ کیا تھا۔ اور تمہیں پاک و صاف فرمایا اور دوبارہ سارے جہان کی عورتوں پر تمہیں فوقیت دی۔ لہٰذا اس کے شکریہ میں يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ اُقنتی قنوت سے بنا۔ خیال رہے کہ عربی میں قنوط ط سے بمعنی یاس و ناامیدی ہے۔ اور قنوت 'ت' سے اس کے بہت معنی ہیں۔ خاموشی وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (بقرہ: ۲۳۸) اطاعت، نماز، قیام، اخلاص وغیرہ یہاں اس کے سارے معنی بن سکتے ہیں اللہ کی رضا کے لئے دنیا والوں سے خاموشی اختیار کرو۔ رب کے لئے قیام، نماز ادا کرو۔ رب کی عبادت کرو، اخلاص پیدا کرو، نماز پڑھو غرضیکہ اس ایک حکم میں بہت سے احکام دیئے گئے۔ صوفیاء کے ہاں اس کے معنی ہیں دل ٹھیک کرو۔ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ اگر پہلے قنوت سے قیام مراد

ہے۔تو یہ جملہ اس کا تتمہ ہے۔ کہ ان تینوں چیزوں میں نماز کے ارکان کا ذکر فرمایا گیا اور اس مجموعہ سے نماز مراد ہوئی۔ اور اگر قنوت سے ہر عبادت مراد تھی۔ تو یہ جملہ اس کی تفصیل ہے یا عام کے بعد خاص کا ذکر۔ سجدہ کو رکوع پر مقدم کرنا یا تو اس لئے ہے کہ واؤ میں ترتیب نہیں مطلب یہ ہوا کہ تم رکوع سجدہ دونوں کام کرلو۔ یا اس لئے کہ سجدہ رکوع سے افضل ہے۔ یا اس لئے کہ اس شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھا۔ مگر یہ قول کچھ ضعیف سا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں سجدہ سے پوری نماز مراد ہے۔ چونکہ سجدہ سارے ارکان سے افضل ہے۔ اس لئے اس جزء سے کل مراد لیا گیا۔ جیسا کہ مقامات نماز کو مسجد کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں پوری نماز پڑھی جاتی ہے۔ مع الراکعین فرما کر یہ بتایا کہ نماز جماعت کے ساتھ چاہیے۔ مگر یہاں ہمراہی مکانی نہیں بلکہ فعلی ہے۔ کیونکہ عورت مرد کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتی۔ خیال رہے کہ یہ کلام یا انہی فرشتوں کا ہے۔ یا رب تعالیٰ کا یعنی اے مریم اپنے رب تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع سجدہ کرو۔ (نماز پڑھو) چونکہ امام کے ساتھ رکوع میں مل جانے سے رکعت ملتی ہے۔ اس لئے رکوع میں شرکت بیان کی۔ یہ نہ کہا وَاسْجُدِیْ مَعَ السّٰجِدِیْنَ:۔ ذٰلِکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ اب تک تو گذشتہ پیغمبروں کا ذکر فرمایا اب اس کی وجہ بیان فرمائی جارہی ہے کہ اے محبوب یہ تمام تذکرے صرف قصہ کہانی کے طور پر بیان نہیں ہوئے۔ بلکہ ان سے مقصود تمہاری نبوت ثابت فرمانا ہے۔ تا کہ یہ علوم غیبیہ تمہاری نبوت کی دلیل ہوں۔ یہاں مذکورہ حضرات ہیں مقصود تم اور تمہاری صفات ہیں۔ ذالک سے حضرت مریم اور ان کی والدہ کے سارے واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ اَنْۢبَآءُ نباءٌ سے بنا ہے بمعنی مطلق خبر یا عجیب خبر غیب مشاہدہ کا مقابل ہے۔ یعنی یہ سارا قصہ غیب کی عجیب خبروں میں سے ہے۔ چونکہ حضور ﷺ نے نہ علماء کی صحبت پائی تھی نہ تاریخی کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ اور نہ آپ اس جسم کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ اس لئے اسے غیب فرمایا گیا۔ ورنہ تواریخ کے ذریعہ واقعات کا معلوم ہو جانا علم غیب نہیں۔ علم الغیب اور علم بالغیب کا فرق شروع تفسیر میں بیان ہو چکا۔ ہمیں قیامت کا علم یہ علم بالغیب ہے۔ نبی کو علم الغیب نُوْحِیْهِ اِلَیْکَ یہ اَنْۢبَآءُ الغیب کی صفت ہے۔ نُوْحِیْ وحی سے بنا بمعنی خفیہ اطلاع قرآن کریم میں وحی چند معنی میں استعمال ہوئی۔ (۱) رسالت کی وحی جیسے نُوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ (نحل: ۴۳) (۲) الہام جیسے وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی (قصص: ۷) (۳) بات دل میں ڈالنا جیسے بِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَهَا (الزلزال: ۵) (۴) اشارہ جیسے فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا (مریم: ۱۱) الخ زکریا علیہ السلام نے انہیں اشارہ کیا۔ (۵) قدرتی ہدایت جیسے وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ (النحل: ۶۸) (روح البیان) یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں۔ جس کی ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اور یہ وحی آپ کے نبوت کی دلیل ہے۔ وحی، الہام، القاء، وسوسہ کا فرق پہلے بتایا جاچکا ہے۔ وَمَا کُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ یہ مستقل جملہ ہے۔ اور نوحیہ کی تفصیل لدیھم کا مرجع بیت المقدس کے وہ علماء ہیں جنہوں نے حضرت مریم کو حاصل کرنے کی خواہش کی۔ اقلام قلم کی جمع ہے۔ بمعنی آہستگی سے کاٹنا۔ اسی لئے کٹے ہوئے ناخن کو قلامت الظفر کہتے ہیں۔ اردو میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس سے مراد یا عام قلم ہیں یا توریت شریف لکھنے کے قلم جو لکھتے لکھتے چھوٹے ہو گئے تھے اور قابل تحریر نہ رہے تھے مگر ادبا محفوظ رکھے گئے۔ کیونکہ ان سے توریت لکھی گئی تھی۔ یہ چھ تھے (کبیر و معانی) بعض نے کہا کہ اس سے فال نکالنے کے تیر مراد ہیں۔ جس سے اس زمانہ میں قرعہ ڈالا جاتا تھا۔ یُلْقُوْنَ سے مراد دریا میں ڈالنا ہے۔ جس کی تفصیل

ابھی کچھ پہلے وَ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا (آل عمران ۳۷) کی تفسیر میں بیان ہو چکی کہ انہوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ جس کا قلم پانی کے رخ کے خلاف بہے یا تر جائے وہ مریم کا کفیل ہے وہ مریم کا کفیل بنے وغیرہ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ یہ کلام اوّل کا تتمہ ہے یہاں ینظرون فعل پوشیدہ ہے۔ یکفل کے تفصیلی معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ یعنی اے محبوب ﷺ آپ ان احبار کے پاس نہ تھے۔ جب وہ مریم کے لئے اپنے قلم دریا میں ڈالتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ معلوم کریں کہ مریم کا کفیل کون بنے وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ یہ پچھلے جملہ کی تاکید ہے۔ اور اِذْ كُنْتَ کا ظرف ہے۔ يَخْتَصِمُوْنَ اختصام سے بنا بمعنی ایک دوسرے سے جھگڑنا یعنی جب وہ حضرت مریم کے متعلق آپ میں جھگڑ رہے تھے۔ تب آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ نے نہ تاریخی کتابیں پڑھیں نہ تاریخ دان لوگوں سے تعلق رکھا۔ پھر آپ کا ایسے تفصیلی واقعات بیان فرمانا یقیناً آپ کی نبوت کی قوی دلیل ہے۔ خیال رہے کہ ان بزرگوں کا یہ جھگڑنا نہ تو دنیاوی چیز کے لئے تھا نہ فساد کے طریقہ پر تھا۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش کرنا کہ جناب مریم کی خدمت میرے سپرد ہو۔ اس پر بحث مباحثہ کرنا مراد ہے۔ یہ جھگڑا بھی اچھا ہے۔

خلاصہ تفسیر

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی تین فضیلتیں بیان فرمائیں اور انہیں چار حکم دیئے۔ بچپن کا چناؤ' پاکی' جوانی کا چناؤ اور احکام دیئے قنوت' سجدہ' رکوع' جماعت کی پابندی اور اس میں دو حکمتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تا قیامت لوگ یہ جان لیں کہ بندہ اس زندگی میں کسی درجہ پر پہنچ کر عبادات سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ حضرت مریم دو دفعہ چناؤ' طہارت کے بعد بھی نماز روزہ سجدہ رکوع کی پابند رہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ حضرات اپنے اتنے فضائل سننے کے بعد اور زیادہ رب کی عبادات و ریاضات کرتے ہیں۔ شیخی میں پھول کر رب کو نہیں بھول جاتے۔ حضرت عثمان سے فرمادیا گیا کہ جو چاہو کرو تم بخش دیئے گئے۔ مگر اس اجازت و بشارت کو سن کر ان کی عبادات و ریاضات اور زیادہ ہو گئیں۔ ان سے کہا گیا جو چاہو کرو جیسے پرندہ کے پر کاٹ کر کہا جائے جا اڑتا پھر وہ کیسے اڑے اور کس سے اڑے پر تو کٹ گئے۔ اے محبوب ﷺ وہ وقت بھی یاد کرو' یا انہیں یاد دلاؤ جب فرشتوں کے سردار حضرت جبرائیل علیہ السلام نے مریم سے کہا تھا۔ کہ اے مریم حق تعالیٰ نے تمہیں بچپن میں ہی چن لیا تھا۔ کہ تمہیں باوجود لڑکی ہونے کے خدمت بیت المقدس کے لئے قبول کر لیا۔ اور تمہاری پرورش خود فرمائی۔ زکریا علیہ السلام کو تمہارا کفیل بنایا تم سے بچپن میں باتیں کرائیں۔ اور اس کے ساتھ ہی تمہیں جسمانی' قلبی اور روحانی گندگیوں سے پاک کیا۔ کہ تمہیں حیض و نفاس سے دور رکھا۔ بد خلقی' گناہ اور کفر سے بچایا۔ تمہارے قلب کو منور کیا۔ اور اس کے بعد جب تم جوان ہوئیں تو تمہیں اس زمانہ کی ساری عورتوں سے دیگر خصوصیات کے ساتھ چھانٹا' کہ بغیر شوہر تمہیں بیٹا بخشا اور یہود کی تہمت کو تم سے دور کیا۔ تمہیں اور تمہارے فرزند کو اپنی قدرت کا نشان بنایا۔ اے مریم اس شکریہ میں تم اپنے رب کی اطاعت کرو۔ اور نمازیوں کے ساتھ رکوع سجدہ میں مشغول رہو۔ روایات میں ہے کہ اس حکم کے بعد حضرت مریم اتنا لمبا قیام فرماتی تھیں کہ آپ کے قدم مبارک پر ورم آ جاتا۔ اور پھٹ کر خون جاری ہو جاتا تھا (خازن و خزائن وغیرہ) خیال رہے کہ حضرت مریم کو یہ احکام سنانا یا محبوب ﷺ سے فرمانا یَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ (احزاب: ۱) یا یہ فرمانا يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ

(مائدہ: ٦٧) یا فرمایا یَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا (النساء: ۱۳۶) ان تمام میں مراد ہوتا ہے۔ ایسے ہی یہ کام کئے جاؤ یا اور زیادہ کئے جاؤ۔ کیونکہ یہ حضرات پہلے ہی عابد عارف عبادات میں مجاہد ہوتے ہیں عابد کو عبادت کا حکم دینا تحصیل حاصل ہے۔ لہٰذا ان کا وہ ہی منشاء ہے جو عرض کیا گیا۔ اے محبوب یہ مریم وحنہ زکریا و یحییٰ علیہم السلام کے واقعات ان غیبی خبروں میں سے ہیں۔ جو ہم نے بذریعہ وحی آپ کو بتائیں۔ ورنہ آپ نے نہ کتب تواریخ کا مطالعہ فرمایا نہ آپ کو مؤرخین کے ساتھ رہنے کا کبھی اتفاق ہوا۔ اور نہ آپ بایں جسم شریف وہاں موجود تھے۔ جب بیت المقدس کے خدام حضرت مریم کو حاصل کرنے اور ان کی پرورش کی عزت پانے کے لئے آپس میں جھگڑتے تھے اور جھگڑا مٹانے کے لئے انہوں نے یہ قرعہ ڈالا کہ توریت لکھنے کے چھ قلم ہیں ایک دریا میں ڈالے اور طے یہ کیا کہ جس کا قلم تر جائے یا بہاؤ کے خلاف بہنے لگے وہ ہی حضرت مریم کا کفیل بنے۔ اس قرعہ میں زکریا علیہ السلام کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اور وہ ہی آپ کے متکفل بنے۔ ان تمام واقعات کا تفصیل وار بیان فرمانا آپ کی نبوت کی کھلی دلیل ہے۔

خیال رکھو کہ جیسے دنیاوی حکومتیں پبلک مین اور سرکاری آدمیوں میں فرق کے لئے اپنے محکموں کو وردی' پیٹی' ٹوپی وغیرہ دیتی ہے۔ جن سے وہ دوسروں سے ممتاز ہیں۔ ایسے ہی رب تعالیٰ عام لوگوں اور سرکاری حضرات یعنی انبیاء کرام اور اولیاء عظام میں فرق کے لئے انہیں معجزات و کرامات دیتا ہے۔ یہ معجزات و کرامات گویا ان کی نبوت وولایت کی علامات ہوتے ہیں۔ یہ معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں علم غیبیہ اور تصرف غیبیہ ان کے خداداد اختیارات۔ مکی زندگی شریف میں تو حضور انور ﷺ نے اختیارات کے معجزات زیادہ دکھائے۔ اور مدنی زندگی میں معجزات علم غیب دکھائے گئے۔ کہ مکہ معظمہ میں عام طور پر لوگ بے علم تھے۔ اور مدینہ منورہ میں یہود و نصاریٰ کے پوپ پادری بکثرت تھے۔ تاکہ یہ لوگ حضور انور ﷺ کی غیبی خبریں اور گذشتہ کے بتائے واقعات اپنی کتب کے موافق پائیں۔ اور آپ پر ایمان لائیں اور اس لئے ارشاد ہوا ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ

حضرت مریم و فاطمہ و عائشہ و خدیجہ رضی اللہ عنہن

اس میں اختلاف ہے کہ ان بیویوں میں افضل کون ہے۔ بعض نے فرمایا کہ حضرت مریم سب سے افضل ہیں۔ بلکہ بعض کے نزدیک وہ نبی ہیں۔ (۱) کیونکہ اس میں آیت میں ارشاد ہوا کہ مریم تمام جہان کی عورتوں سے افضل ہیں۔ اور عالم مطلق سے فقط رائے سے اس کو خاص نہیں کر سکتے۔ (۲) نیز ابن جریر نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ اے فاطمہ تم مریم کے سوا باقی تمام جنتی بیویوں کی سردار ہو (۳) ابن عساکر نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنتی بیویوں کی سردار مریم پھر فاطمہ پھر خدیجہ پھر آسیہ پھر فرعون کی بیوی ہیں (۴) ابن ابی شیبہ نے ابن کہول سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اونٹ پر سوار ہونے والی عورتوں میں سب سے افضل قریش کی عورتیں ہیں۔ جو اپنے بچوں پر مہربان اور شوہر کی خیر خواہ ہیں۔ اور اگر ہمیں تحقیق ہوتی کہ مریم بنت عمران اونٹ پر سوار ہوئیں ہیں۔ تو ہم ان پر کسی کو بزرگی نہ دیتے۔ (۵) حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں۔ اور ان بیویوں کو نبی کی والدہ ہونے کا شرف حاصل نہیں (۶) حضرت مریم نے بچپن شریف میں کلام فرمایا ان بیویوں کو یہ شرف حاصل نہیں۔ (۷) حضرت مریم کی پرورش

رب تعالیٰ نے فرمائی۔ ان کی پرورش ان کے والدین نے کی (۸) حضرت مریم کے پاس جنتی میوے آئے۔ ان کے پاس نہ آئے۔ (۹) حضرت مریم حیض ونفاس سے پاک رہیں ان بیویوں میں یہ خصوصیت نہیں۔ ان وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم ان سب سے افضل ہیں۔ اور بعض نے فرمایا کہ حضرت فاطمۃ الزہرا عائشہ صدیقہ اور خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہن حضرت مریم بلکہ اولین و آخرین تمام عورتوں سے افضل ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (احزاب: ۳۲)۔ اے نبی آخر الزمان (ﷺ) کی عورتو تم کسی عورت کی مثل نہیں۔ سب سے افضل ہو۔ نیز رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (احزاب: ۳۳) اے محبوب ﷺ کے گھر والو رب تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم میں سے ہر قسم کی گندگی دور فرمائے۔ اور تمہیں ظاہر و باطن ہر طرح خوب پاک فرمادے۔ حضرت مریم عمران کی نور نظر مگر حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہ سید الانس والجان کی لخت جگر علی مرتضیٰ کی زوجہ مطہرہ سید الشہداء کی والدہ محترمہ۔ یہ اوصاف حضرت مریم میں نہیں۔ رب تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ایسا ہی ہے جیسا بنی اسرائیل سے فرمایا گیا تھا وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ اور جیسے اس زمانہ میں بنی اسرائیل دوسری قوموں سے افضل تھے۔ ایسے ہی اس وقت کی ساری بیویوں سے حضرت مریم بڑھ چڑھ کر تھیں۔ جیسا کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے۔ اگر حضرت مریم کو جنتی پھل ملے تو حضور علیہ السلام کے غلاموں کو جنتی پانی پلایا گیا۔ اور وہاں کی نعمتیں کھلائی گئیں۔ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک پیالہ پانی سے چودہ سو پیاسے سیر ہوئے۔ ایک گلاس دودھ سے ستر صحابہ کرام سیر ہو گئے۔ حضرت جابر کے گھر چار سیر جو سے سارے لشکر والوں بلکہ تمام مدینہ والوں کا پیٹ بھر گیا۔ یہ پانی' دودھ' گوشت' آٹا وغیرہ کہاں سے آرہا تھا۔ حضور ﷺ نے ان کا کنکشن جنت سے فرمادیا تھا۔ وہاں کی یہ نعمتیں تھیں اگر حضرت مریم کو زکریا علیہ السلام نے پرورش فرمایا۔ تو حضرت فاطمہ زہراء مصطفیٰ ﷺ کی گود میں پلیں اور پروان چڑھیں اگر حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہیں تو فاطمہ زہراء حضور ﷺ کی بیٹی اور عزت مصطفیٰ ﷺ کی اصل اصول یہ سارا باغ انہی کا ہے۔ اگر حضرت مریم سے ملائکہ نے کلام کیا تو عائشہ صدیقہ کو جبریل علیہ السلام نے سلام کیا۔ غرضیکہ کل عظمت ان بیویوں کو حاصل ہے۔ ہاں مریم جزوی طور پر افضل ہیں۔ مقاتل نے روایت کی کہ چار بیبیاں جہاں کی عورتوں کی سردار ہیں۔ (۱) مریم بن عمران (۲) آسیہ بن مزاحم (فرعون کی بیوی) (۳) خدیجہ بنت خویلد اور (۴) فاطمہ بنت محمد ﷺ۔ اور ان میں افضل فاطمہ زہراء ہیں نیز ابن جریر نے عمار بن سعد سے روایت کی۔ کہ مجھ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جیسے مریم ساری عورتوں سے افضل تھیں۔ ایسے ہی خدیجہ میری امت کی ساری عورتوں سے افضل ہیں۔ نیز حضور علیہ السلام نے فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور اپنی اولاد۔ یہ دونوں جدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر آجائیں۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز! از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
نور چشم رحمتِ العالمین آں امام الاولین و آخرین
بانوئے آں تاجدار ھَلْ اَتٰی مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
مادر آں مرکز پرکار عشق مادر آں قافلہ سالار عشق

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست پاس فرمانِ جنابِ مصطفیٰ ست
ورنہ گرد تربتش گردیدمے سجدہ ہا برخاکِ دے پاشیدمے

ہم نے عرض کیا ہے۔

نبی کی لاڈلی بانو ولی کی، ماں شہیدوں کی یہاں جلوہ نبوت کا ولایت کا شہادت کا

(۵) حضرت مریم کو تہمت لگی تو حضرت عیسیٰ کو بچپن میں گویائی بخش کر ان کی عظمت کی گواہی دلوادی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو تہمت لگی تو بھی ایک شیر خوار بچے ہی کے ذریعے ان کی پاک دامنی ظاہر فرمادی گئی۔ مگر جب محبوبہ محبوب عائشہ صدیقہ کو تہمت لگی تو ہوسکتا تھا کہ وہاں بھی کسی شیر خوار بچے سے یا لکڑی پتھر درخت وغیرہ کو گویائی بخش کر دلوادی جاتی مگر ایسا نہ کیا بلکہ رب تعالیٰ نے خود آپ کی پاکدامنی عصمت جنتی ہونے کی گواہی اس طرح دی کہ سورۂ نور میں اٹھارہ آیتیں اتاریں جن میں آپ کی پاکدامنی کا ذکر فرمایا اور تہمت لگانے والوں بلکہ دل میں شبہ کرنے والوں' بلکہ خاموش رہنے والوں یعنی تردید نہ کرنے والوں پر سخت عتاب فرمایا۔ یہ فرق کیوں ہے اسی فرق کے مراتب کو ظاہر کرنے کے لئے کہ اس سے حضرت عائشہ صدیقہ کی بی بی مریم سے افضلیت مطلقہ ثابت ہو کہ ان کا گواہ شیر خوار بچہ اور صدیقہ کا گواہ خود رب العالمین۔

حضرت عائشہ صدیقہ و فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہما

اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں حضرات میں کون افضل ہے۔ بعض کے نزدیک حضرت فاطمہ زہرہ عائشہ صدیقہ سے افضل۔ اس لئے کہ (۱) مصطفیٰ ﷺ کی لخت جگر ہیں۔ آپ کی شرافت ذاتی واصلی ہے۔ اور سب کی عارضی (۲) چونکہ حضور ﷺ ہر موجود کے سردار اور فاطمہ زہرہ حضور صلی اللہ علیہ سلم کا جز لہٰذا جو کل کا حال وہ جزو کا (۳) حضرت فاطمہ جنتی بیویوں کی سردار ہیں جن میں حضرت عائشہ صدیقہ بھی داخل ہیں۔ (۴) حضرت فاطمہ زہرہ ہمشکل محبوب ﷺ ہیں۔ چنانچہ آپ کی رفتار' گفتار' شکل و شباہت بالکل حضور ﷺ کی مثل تھیں۔ (۵) وہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا حیض ونفاس سے پاک تھیں۔ (مدارج النبوت) (۶) فاطمہ زہرا جنت کی کلی ہیں۔ اسی لئے آپ کا لقب شریف زہرہ ہے۔ بمعنی کلی۔ آپ کو فاطمہ اور بتول بھی اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آپ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے تعلق ہیں۔ فاطمہ فطم سے بنا ہے۔ بمعنی چھوٹنا جس بچے کا دودھ چھوٹ جائے اسے فطیم کہتی ہیں۔ بتول بتل سے بنا بمعنی الگ ہونا وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا (مزمل: ۸) (۷) مبسوط کتاب الکراہیۃ باب المس میں ہے۔ کہ حضور ﷺ فاطمہ زہرہ کو سونگھا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ مجھے ان سے جنت کی خوشبو آتی ہے۔ ہم نے عرض کیا ہے

بتول و فاطمہ زہرہ لقب اس واسطے پایا کہ دنیا میں رہیں اور دیں پتہ جنت کی نکہت کا

(۸) فاطمہ زہرہ نسل مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ عائشہ صدیقہ میں یہ وصف نہیں۔ مگر بعض کے نزدیک حضرت عائشہ صدیقہ فاطمہ زہرہ سے افضل ہیں۔ چند وجوہ سے (۱) رب نے فرمایا یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (احزاب: ۳۲) اے نبی کی

بیو یوتم کسی عورت کی طرح نہیں۔ اور کسی میں فاطمہ زہرہ بھی داخل ہیں۔ (۲) عائشہ صدیقہ ماں ہیں اور فاطمہ زہرہ بیٹی۔ اور یقیناً ماں بیٹی سے افضل ہے (۳) جنت میں فاطمہ زہرہ حضرت علی کے ساتھ ہوں گی مگر عائشہ صدیقہ حضور ﷺ کے ساتھ اور اس جگہ سے یہ جگہ افضل ہے۔ (۴) عائشہ صدیقہ شیطان کے اثر سے پاک کیونکہ نبی کی بیوی ہیں (۵) عائشہ صدیقہ تمام مسلمانوں کی ماں ہیں کسی کے نکاح میں نہیں آسکتیں فاطمہ زہرہ کے لئے یہ حکم نہیں (۶) عائشہ صدیقہ بڑی عالمہ وفقیہہ ہیں حضور ﷺ نے فرمایا کہ دو تہائی دین عائشہ سے لو۔ آپ صحابہ کرام کے علمی اختلاف کا فیصلہ فرماتی تھیں اور اہل علم دوسروں سے افضل ہوتے ہیں۔ (۷) عائشہ صدیقہ کو جبریل امین سلام کرتے تھے۔ (۸) عائشہ صدیقہ کے بستر میں حضور ﷺ پر وحی آتی تھی ہم نے ان کی شان میں عرض کیا ہے۔

ان کے بستر میں وحی آئے رسول اللہ پر! اور سلام خادمانہ بھی کریں روح الامیں

(۹) عائشہ صدیقہ کا لقب محبوبہ محبوب رب العالمین تھا۔ (۱۰) عائشہ صدیقہ کے سینے پاک پر حضور ﷺ کی وفات ہوئی۔ اور ان کی گود شریف حضور ﷺ کی آخری آرامگاہ بنی (۱۱) عائشہ صدیقہ کا حجرہ انور ﷺ کی آخری قیامگاہ قرار پایا کہ یہیں آپ کی قبر انور ہے اور یہ قیامت تک کے لئے جن وانس وملائکہ کا زیارت گاہ بن گیا۔ ہم نے عرض کیا ہے

جن کا پہلو ہو نبی کی آخری آرام گاہ جن کے حجرے میں قیامت تک نبی ہوں جاگزیں

(۱۲) جب لوگوں نے عائشہ صدیقہ کو تہمت لگائی تو سورۂ نور کی اٹھارہ آیتوں نے آپ کی نورانیت و برّیت کو بیان فرمایا جو مسلمان قرآن مجید پڑھے گا ان کی عصمت کی گواہی دے گا اعلیٰحضرت نے فرمایا

وہ جو ہے سورۂ نور جن کی گواہ ان کی پر نور صورت پہ لاکھوں سلام

(۱۳) آپ صدیقہ باپ صدیق شوہر نبیوں کے سردار میکہ بھی اعلیٰ، سسرال بھی بالا (۱۴) خود ام المومنین اور والدا میر المومنین شوہر خاتم النبین ﷺ۔

ہمارا فیصلہ: اس اختلاف کا فیصلہ ہم یوں کرتے ہیں۔ کہ اس مسئلہ میں ہر قسم کے دلائل ملتے ہیں لہٰذا یا تو خاموشی اختیار کرو یا یوں کہو کہ بعض لحاظ سے عائشہ صدیقہ افضل ہیں اور بعض لحاظ سے فاطمہ زہرہ ایک لخت جگر نور نظر ہیں۔ دوسری محبوبہ، شامی باب الکفو میں یہ ہی فیصلہ فرمایا یہ دونوں ہماری آقا ہیں قیامت میں کسی کی نعلین پاک ہاتھ آجائے ہم فقیروں کا بیڑہ پار ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کوئی بندہ کسی رتبہ پر پہنچ کر رب کی عبادت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ دیکھو حضرت مریم کو باوجود ان کی اتنی عظمت کے اطاعت الٰہی اور رکوع سجدہ کا حکم دیا گیا۔ **دوسرا فائدہ:** جن پر اللہ کی نعمتیں زیادہ ہوں انہیں رب کی عبادت بھی زیادہ کرنی چاہیے دیکھو حضرت مریم کو عہدے بڑے بڑے بخشے گئے تو انہیں زیادہ عبادات کا بھی حکم دیا گیا مگر آج ہمارا یہ حال ہے کہ غریب ہوں تو نمازیں پڑھے امیر ہو کر نماز بھی چھوڑ دیتے ہیں چاہیے تو یہ کہ غریب پانچ نمازیں پڑھیں تو امیر سات نمازیں پڑھیں۔ کہ ان پر اللہ کا فضل زیادہ ہے۔ **تیسرا فائدہ:** دینی یا دنیاوی پیشواؤں کو چاہیے کہ اپنی زندگی زیادہ احتیاط سے گذاریں ... دیکھ کر ان کے ماتحت بھی نیک

بنیں۔ گھر کا بڑا محلہ کا بڑا شہر کا بڑا بادشاہ امیر اگر نمازی پرہیز گار ہوں تو ان کے ماتحت لوگ پرہیز گار ہو جاتے ہیں۔ دیکھو حضرت مریم کو رب نے خلق کی پیشوائی دی تو انہیں عبادات کی زیادہ تاکید بھی فرمائی۔ تاکہ مریم کے نقش قدم پر چلنے والے ان کے سے اعمال کریں۔ دیکھا گیا ہے کہ بے نمازی پیر کے مرید نمازی نہیں ہوتے جن کا پیر گھر میں نماز پڑھنے کا عادی ہو وہ لوگ بھی مسجد میں نہیں آتے کیوں! پیر کی اتباع کے لئے اس لئے حضور ﷺ نے آخر وقت تک نماز با جماعت مسجد میں ادا کی۔ **چوتھا فائدہ:** غیر نبی سے فرشتے کلام کر سکتے ہیں خواہ ظاہر طور پر یا باطنی طور پر جسے الہام کہتے ہیں جیسا وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ سے معلوم ہوا۔ مگر تبلیغی وحی نبیوں کے ساتھ خاص ہے۔ **پانچواں فائدہ:** بعض عورتیں بعض مردوں سے افضل ہیں اگرچہ مرد ہونے کی صفت عورت ہونے کی صفت سے افضل ہے جیسا کہ وَاصْطَفٰكِ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** حضرت مریم حیض و نفاس وغیرہ گندگی سے پاک تھیں جیسا کہ طَهَّرَكِ کی تفسیر میں عرض کیا گیا۔ **ساتواں فائدہ:** واؤ ترتیب نہیں چاہتا۔ جیسا وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ سے معلوم ہوا کہ سجدہ رکوع کے بعد ہوتا ہے مگر بیان میں پہلے آیا ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** بعض امتی کے لئے کچھ احکام خصوصی بھی ہوتے ہیں دیکھو حضرت مریم نبی نہ تھیں امتی تھیں مگر انہیں خصوصیت سے فرمایا گیا اقْنُتِيْ۔ **مسئلہ:** مرد کا انتہائی کمال نبوت ہے۔ عورت کا انتہائی کمال صدیقیت کسی ولی سے پوچھا گیا کہ کل ابدال کتنے ہیں جواب دیا گیا کہ چالیس نفس پوچھا گیا کہ آپ نے چالیس مرد کیوں نہ کہا نفس کیوں فرمایا جواب دیا کہ ان میں کچھ عورتیں بھی ہیں۔ (تفسیر روح البیان) **نواں فائدہ:** نماز با جماعت پڑھنا چاہیے جیسا کہ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ سے معلوم ہوا۔ **دسواں فائدہ:** امام کے ساتھ رکوع میں جانے سے رکعت ملتی ہے نہ کہ سجدہ میں ملنے سے کیونکہ یہاں وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ فرمایا وَاسْجُدِيْ مَعَ السّٰجِدِيْنَ نہ کہا گیا۔ **گیارھواں فائدہ:** عورتیں مردوں کی نماز میں شرکت کر سکتی ہیں دیکھو وَارْكَعِيْ صیغہ مونث کا ہے۔ اور مَعَ الرّٰكِعِيْنَ مذکر۔ **بارھواں فائدہ:** صرف عورتوں کی جماعت منع ہے۔ اس طرح کہ عورت ہی امام ہو۔ اور عورتیں ہی مقتدی کیونکہ یہاں مَعَ الرّٰكِعِيْنَ فرمایا گیا۔ نہ کہ مَعَ الرّٰكِعَاتِ **مسئلہ:** نماز میں عورت امام نہیں ہو سکتی۔ نہ مردوں کی نہ عورتوں کی نہ دونوں کی بلکہ مرد امام ہوگا۔ عورت مقتدی اس لئے حضرت مریم کو علیحدہ عورتوں کی جماعت قائم فرمانے کا حکم نہ دیا گیا۔ بلکہ ارشاد ہوا کہ جو مرد راکعین ہیں۔ ان ہی کے ساتھ تم بھی رکوع سجدہ کر لیا کرو علیحدہ اپنی عورتوں کی جماعت نہ کرنا۔ اس لئے حضور انور ﷺ کی ازواج پاک نے کبھی عورتوں کی جماعت نہ کی۔ اور وہ یہاں عورتوں کی امام نہ بنیں۔ بلکہ ہمیشہ مردوں کی جماعت میں شریک ہوئیں۔ **تیرھواں فائدہ:** رب تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو علم غیب عطا فرمایا اور اسی کو ان کی نبوت کی دلیل بنایا جیسا کہ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ سے معلوم ہوا۔ نبوت کا منصب صرف یہ نہیں ہے کہ نبی مولویوں کی طرح فقط شرعی مسئلے بتائیں۔ بلکہ غیب کی خبریں رکھنا۔ اور دینا ان کے لئے ضروری ہے۔ **چودھواں فائدہ:** قرعہ ڈالنا اور اس کے ذریعہ فیصلہ کرنا سنت انبیاء ہے۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں کہ جس قوم نے قرعہ سے فیصلہ کیا۔ اس نے اپنا معاملہ رب تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ رب تعالیٰ حق دار کو حق پہنچائے گا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (الصافات: ۱۴۱) (روح البیان) [illegible] ڈالا گیا۔ وہ مریم بنت عمران ہیں۔

(روح المعانی) **پندرھواں فائدہ:** جس قلم سے کلام الٰہی لکھا جائے۔ اس کی عزت وحرمت چاہیے۔ جیسا کہ ہم نے اَقْلَامَھُمْ (آل عمران ۴۴) کی تفسیر میں بیان کیا کہ بعض کے نزدیک یہ توریت لکھنے کے قلم تھے جو گھس گھس کر چھوٹے رہ گئے تھے اور محفوظ تھے۔ **مسئلہ:** جس قلم سے دینی علوم لکھے جائیں۔ نہ ان کا برادہ گندی جگہ ڈالا جائے۔ اور نہ بے کار شدہ قلم کی بے ادبی کی جائے۔ سنا گیا ہے کہ ایک مصنف نے وصیت کی تھی کہ میرے غسل جنازہ کے لئے میری استعمال شدہ قلموں سے پانی گرم کیا جائے۔ شاید رب تعالیٰ اس کی برکت سے میرے گناہ معاف کردے۔ بلکہ احتیاط یہ ہے کہ ایسے قلم قرآن پاک کے گلے ہوئے اوراق کی طرح دفن کردیئے جائیں۔ **مسئلہ:** حضرات انبیاء چار قسم کے ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کا نہ تو نام قرآن شریف میں آیا ہے۔ نہ حالات جیسے حضرت دانیال۔ بعض حضرات وہ ہیں جن کا نام تو قرآن شریف میں نہیں۔ مگر حالات ہیں جیسے حضرت حزقیل عزیر علیہ السلام بعض وہ حضرات ہیں جن کے نام بھی قرآن شریف میں ہیں۔ حالات بھی جیسے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام یہاں انباء الغیب سے مراد یہی آخری قسم ہے تاکہ پتہ لگے کہ دنیا میں جو بھی چمکا حضور کے چمکانے سے چمکا جسے جتنا چمکایا وہ اتنا ہی چمک گیا۔ نیز چونکہ حضرت مریم کے متعلق عیسائیوں نے بہت افراط کی کہ انہیں خدا کی بیوی کہہ دیا۔ اور یہود نے تفریط کی کہ ان کنواری بتول کو عیب لگا دیا۔ اس لئے رب نے ان کے سچے سچے واقعات بیان فرما دیئے۔ تاکہ یہ افراط وتفریط ختم ہو جائے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب خدا اور اس کے فرشتے آج کسی سے باتیں نہیں کرتے تو پہلے کیسے کرتے ہوں گے اگر کہو کہ پرانے زمانہ کے آدمی بے گناہ تھے۔ اب نہیں تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ جب عیسائیوں اور مسلمانوں کا مذہب جاری ہوا۔ اس وقت وحشی اور مجہول آدمی زیادہ تھے۔ اب لوگ سمجھدار زیادہ ہیں۔" (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی آج بھی نیک بندوں سے خدا اور اس کے فرشتے کلام کرتے ہیں۔ الہام سچی خوابیں دل میں نیک بات کا پڑ جانا یہ سب رب تعالیٰ کے ہی کلام ہیں۔ نہ اس وقت رب سب سے کلام کرتا تھا اور نہ اب مگر اس وقت تک چونکہ دین کی کھیتی کچی تھی۔ اس لئے بعض انسان پیغمبر بھی ہوتے تھے جن پر وحی آتی تھی۔ اور بعض لوگوں سے فرشتے ملاقات بھی کرتے تھے۔ اب جبکہ یہ کھیتی پک گئی۔ لہٰذا ظاہر وحی کی کوئی ضرورت نہ رہی۔ اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ جیسا کہ کھیت پک چکنے کے بعد بارش نہ ہونی چاہیے۔ ایسا ہی اس کھیتی کے پک جانے کے بعد نئی وحی کی ضرورت نہیں پنڈت جی تم نے یہ بھی خوب کہا کہ پہلے وحشی زیادہ تھے۔ اور اب سمجھدار زیادہ ہیں۔ آریہ بھی مانتے ہیں۔ کہ پہلے دنیا میں علم 'گیان' بھگتی زیادہ تھی۔ اب پاپ بہت ہے۔ اس لئے اس زمانہ کو کلجگ کہا جاتا ہے۔ اگر پچھلے زمانہ سے یہ زمانہ اچھا ہے تو چاہیئے تھا کہ وید اس زمانے میں آتا۔ پہلے روحانیت کا زور تھا۔ اور اب مادہ پرستی کا شور ہے چونکہ تمہارا دھرم مادہ پرستی پر قائم ہے۔ اس لئے تم اس زمانہ کو ترقی کا زمانہ کہہ سکتے ہو۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو جماعت نماز میں مردوں کے ساتھ کھڑا ہونا جائز ہے۔ مگر فقہا اسے سخت منع فرماتے ہیں۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مرد یا عورت کی نماز ٹوٹ جائے گی۔ یہاں فرمایا گیا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** مَعَ الرّٰكِعِيْنَ میں فعل کی ہمراہی مراد ہے۔ نہ کہ جگہ کی یعنی اے مریم تم نماز جماعت

کے ساتھ پڑھو۔ اس طرح کے اپنے حجرے سے امام کی اقتدا کر لو۔ جیسے آج کل عورتیں مسجدوں میں الگ جگہ کھڑے ہو کر باجماعت نماز پڑھتی ہیں۔ کہ وہ جماعت میں ساتھ ہوتی ہیں مگر جگہ میں علیحدہ۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ ہر جگہ حاضر و ناضر نہیں۔ رب فرماتا ہے وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ یعنی آپ ان کے پاس نہ تھے (دیو بندی)

جواب: حاضر و ناظر کی مکمل بحث اور اس سوال کا تفصیلی جواب ہماری کتاب جاء الحق اوّل میں دیکھو یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہاں جسمانی حاضری کی نفی ہے۔ یعنی آپ بایں جسم وہاں موجود نہ تھے۔ اور پھر اس واقعہ سے باخبر ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ نبی ہیں حضور ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے یہ معنی ہیں۔ کہ حضور ﷺ کے سامنے سارا عالم ایسا ہے جیسا کہ ہاتھ کی ہتھیلی۔ اور آپ کا حاضر و ناظر ہونا ایسا ہے جیسے سورج کا ایک وقت میں ہر جگہ ہونا۔ کہ سورج ہے تو ایک ہی مقام پر مگر اس کی تجلی ہر جگہ ہے۔ یا جیسے ملک الموت کا ہر جگہ تصرف کر سکنا کہ وہ ایک ہیں۔ مگر ایک وقت میں ہر جگہ لوگوں کی جان قبض کر سکتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

روحانی قوتیں گویا فرشتے ہیں اور نفس مطمئنہ گویا مریم اور نفوس امارہ دیگر عورتیں گویا آیت میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ روحانی قوتوں نے نفس مطمئنہ کو پکارا کہ اے مریم نفس تجھے اللہ نے برگزیدہ کیا۔ کیونکہ تو شہوات سے بچی ہوئی ہے۔ اور تجھے گندے اخلاق اور بری صفتوں سے پاک صاف کیا۔ اور تجھے جہان کی عورتوں یعنی نفوس امارہ اور خواہشات شہوانیہ اور برے افعال پر چن لیا۔ لہٰذا اے مریم نفس تو اپنے رب کی اطاعت و عبادات میں مشغول رہ۔ اور اپنی ذلت و عاجزی احتیاج انکساف ظاہر کر کے سجدہ کر اور خشوع و خضوع کے مقامات میں اللہ کے مقبول بندوں کے ساتھ رکوع کر یعنی جھکی رہو اے نبی روح یہ تیرے وجود کے غیبی حالات ہیں جن کی تجھے ہم نے خبر دی تو روحانی اور نفسانی قوتوں کے پاس اس وقت موجود نہ تھی۔ جبکہ وہ اس مریم نفس کے حاصل کرنے میں کوشش کر رہے تھے کہ نفس امارہ اس کا شکار کر کے اسے اپنے جیسا بنانا چاہتا تھا اور قوت روحانیہ اسے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ یہ اختلاف دریائے سینہ پر ہوا۔ جو روحانی قوت اور نفسانی شہوت کا محل ہے۔ چونکہ تیرا مقام ان سے بلند و بالا ہے۔ اس لئے وہاں موجود نہ تھی۔ ہماری اطلاع سے تو مطلع ہوئی رب تعالیٰ نے فضل و کرم فرمایا۔ کہ اس مریم (نفس مطمئنہ) کو زکریائے روحانیت کے سپرد کیا۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ درد دل تو دل کی عبادت ہے اور یہ نماز روزے وغیرہ جسم کی عبادات در دِل ان عبادات کی شرط قبول ہے۔ بے دردے کی عبادات بارگاہ الٰہی تک نہیں پہنچتی۔ اس لئے رب نے اقنتی پہلے فرمایا اور سجدے و رکوع کا حکم بعد میں دیا۔ ان کے مشرب میں درد دل اصل قنوت ہے۔ نیز صوفیاء فرماتے ہیں کہ نماز وغیرہ تمام عبادات میں صرف رب کو راضی کرنے کی نیت چاہیے جنت حاصل کرنے یا دوزخ سے بچنے کی بھی نیت نہ کرے عبادات اللہ کے لئے ہیں نہ کہ دوزخ یا جنت کے لئے اس لئے ارشاد ہوا کہ لِرَبِّکَ اے مریم قنوت وغیرہ جو کچھ بھی کرو۔ اپنے رب کے لئے کرو نہ کہ جنت وغیرہ کے لئے شعر

مروت نہ باشد کہ مردِ خدا بخواہند غیر از خدا از خدا

نیز حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں جو گذشتہ نبیوں کے واقعات مذکور ہوئے ان سے مقصود حضور انور ﷺ کی نبوت کا ثبوت دینا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی خاطر ہے لہٰذا یہ آیات حضور ﷺ کی نعت ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا ذٰلِکَ مِنْ

اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ الخ لہٰذا نزول آیات رضاء قصص کا مقصود حضور ﷺ ہیں۔ آج بھی اگر ہماری عبادات کا مقصود رضائے الٰہی اور اطاعت مصطفوی ہو تو بہت اچھا جب حضور ﷺ قرآن کے مقصود ہیں تو ہمارے اعمال کے مقصود بھی ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا شعر

مجھے کام کیا تھا رکوع سے مجھے کیا غرض تھی سجود سے　　کسی نقش پا کی تلاش تھی جو جھکا رہا میں نماز میں

اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرۡيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنۡهُ ۖ اسۡمُهُ

جب کہ کہا فرشتوں نے اے مریم تحقیق اللہ خوشخبری دیتا ہے تمہیں ساتھ کلمہ کے طرف سے اپنی کہ نام ان کا

اور یاد کرو جب فرشتوں نے مریم سے کہا اے مریم اللہ تجھے بشارت دیتا ہے اپنے پاس سے ایک کلمہ کی جس کا نام ہے

الۡمَسِيۡحُ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ وَجِيۡهًا فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ﴿۴۵﴾

مسیح عیسیٰ ہے بیٹا مریم کا عزت والے بیچ دنیا اور آخرت کے اور قریب کیے ہوؤں میں سے

مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا رودار ہوگا دنیا اور آخرت میں اور قرب والا

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الۡمَهۡدِ وَكَهۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۴۶﴾

اور کلام کریں گے لوگوں سے بیچ گہوارے کے اور ادھیڑ ہو کر اور ہوں گے وہ نیک کاروں میں سے

اور لوگوں سے بات کرے گا پالنے میں اور پکی عمر میں اور خاصوں میں ہوگا

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت مریم کی برگزیدگی کا اجمالی ذکر تھا۔ اب اس کی تفصیل ہے یعنی رب نے مریم کو اس طرح برگزیدہ کیا کہ انہیں عیسیٰ علیہ السلام جیسا پاک ستھرا بیٹا بخشا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیات میں حضرت مریم کے ذاتی فضائل کا ذکر تھا۔ جنت کا رزق پانا۔ حیض و نفاس سے پاک ہونا۔ اب ان کی خارجی شرافت کا ذکر ہے۔ یعنی کلمۃ اللہ عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہونا۔ **تیسرا تعلق:** اب تک حضرت مریم کی پیدائش اور ان کے فضائل کا ذکر تھا۔ جو ولادت عیسیٰ کی تمہید ہیں۔ اب خود عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا ذکر ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں حضرت مریم کی چند خصوصیات کا ذکر ہوا۔ اب ان کی ایک خاص خوبی کا ذکر ہے۔ یعنی بغیر شوہر فرزند کی ماں بننا۔ گویا یہ بھی فضائل مریم کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے عظمت ذاتی بھی ہوتی ہے عارضی و بیرونی بھی پھر بیرونی عظمت کبھی ماں باپ کے ذریعہ اولاد کو حاصل ہوتی ہے کبھی اولاد کے ذریعے ماں باپ کو اگر کسی کو ذاتی و عارضی دونوں عظمتیں حاصل ہوں۔ تو پھر نور علی نور ہے۔ حضرت مریم کو رب نے تین قسم کی عظمتیں بخشیں ماں باپ کے ذریعہ کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت عمران وحنہ کی بیٹی ہیں۔ ذاتی عظمت کہ آپ کو رب نے تمام جہان کی عورتوں پر چن کر پاک فرما دیا وغیرہ۔ تیسری عظمت یہ کہ کلمۃ اللہ کی والدہ ہیں دو عظمتوں کا ذکر پچھلی آیات میں ہوا اور تیسری عظمت کا ذکر قرآن کی

اس آیت میں ہے۔

تفسیر

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ مستقل ہے اور اِذْ قَالَتْ اذکر فعل پوشیدہ کا ظرف کیونکہ فرشتوں کا یہ کلام پچھلے کلام سے بہت عرصہ بعد ہوا۔ وہ کلام حضرت مریم کے بچپن شریف میں تھا۔ اور یہ کلام ان کے حاملہ ہونے کے وقت (روح المعانی و کبیر وغیرہ) اسی لئے اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے یہاں یاد کرو پوشیدہ نکالا۔ بعض کے خیال میں یہ اِذْ پہلے اِذْ قَالَتْ کا ظرف ہے۔ اور یہ دونوں کلام فرشتوں نے ایک ہی وقت میں کئے۔ یعنی حضرت مریم کے بچپن شریف میں۔ بعض نے فرمایا کہ یہ اِذْ يُلْقُوْنَ کا بدل ہے۔ اور اس کا عامل مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ ہے۔ یعنی آپ اس وقت بھی بایں جسم وہاں موجود نہ تھے۔ جب فرشتے بی بی مریم سے کہہ رہے تھے کہ فرشتوں اور مریم کی گفتگو ایسی غیبی چیز ہے جو مورخین کو بھی نہیں معلوم ہو سکتیں۔ یہ خبریں آپ کی نبوت کی قوی دلیل ہیں۔ ان اعتبارات سے اس آیت کے تین معنی ہوں گے۔ مگر پہلا معنی زیادہ قوی۔ ظاہر یہ ہے کہ قالت سے ظاہر ظہور گفتگو مراد ہے۔ جیسے پہلے قالت میں عرض کیا جا چکا۔ ملائکہ سے جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ یعنی اس وقت کو بھی یاد کرو۔ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے ظاہر ظہور مریم سے یہ کہا تھا يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ یہ جملہ قَالَتْ کا مقولہ ہے۔ يُبَشِّرُ بشارت سے بنا جس کے معنی بارہا بیان ہو چکے۔ ب صلہ کی ہے۔ اور کلمة سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ آپ کو کلمۃ اللہ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ کی پیدائش بغیر باپ لفظ کن سے ہوئی (کلمہ بمعنی لفظ) جیسے سخی کو سراپا جود کہہ دیتے ہیں۔ یا اس لئے کہ آپ کا چرچا پچھلی کتابوں میں بہت تھا (کلمہ بمعنی متکلم فیہ و مذکور) چنانچہ توریت شریف کی بیسویں فصل پانچویں دفتر میں ہے۔ کہ اللہ نے سینا سے توجہ کی اور ساعیر سے تجلی ڈالی۔ اور فاران سے ظاہر ہوا۔ سینا کوہ طور اور ساعیر بیت المقدس کا پہاڑ جہاں عیسیٰ علیہ السلام عبادت کرتے تھے اور فاران مکہ مکرمہ کا پہاڑ جہاں حضور ﷺ نے عبادت فرمائی۔ یا اسلئے کہ آپ ہدایت دین میں مثل کلمہ کے ہیں جیسے کلمہ کی برکت سے کافر مومن ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی آپ کی برکت سے بے دین دیندار بن جاتے تھے۔ یا اس لئے کہ آپ دم فرما کر بیماروں کو اچھا کرتے تھے گویا آپ کی بات میں بیماروں کی شفا تھی۔ مِنْهُ کا مِنْ تبعیضیہ نہیں ہے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ جزو کل سے پاک ہے۔ بلکہ ابتدائیہ ہے۔ اور ثابت کا متعلق ہو کر کلمہ کی صفت ہ کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی اے مریم تمہیں اللہ ایسے فرزند کی خوشخبری دیتا ہے جو رب کی طرف سے کلمہ ہے۔ اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اسم بعض کے نزدیک وسم سے بنا بمعنی نشانی و پہچان۔ لغت میں ہر نشانی کو اسم کہتے ہیں۔ مگر اصطلاح میں صرف نام کو۔ یہاں یا تو لغوی معنی میں ہے کیونکہ یہ تینوں عیسیٰ علیہ السلام کے نام نہیں۔ بلکہ مسیح آپ کا لقب ہے۔ عیسیٰ نام اور ابن مریم کنیت۔ یعنی ان کی پہچان اور نشانی یہ ہے کہ وہ مسیح ہیں۔ عیسیٰ ہیں اور ابن مریم ہیں۔ اس صورت میں کہ تینوں لفظ اسمہ کی خبریں ہیں۔ یا اسم اصطلاحی معنی میں ہے بمعنی نام اور اس کی خبر عیسیٰ ہے۔ ابن مریم صفت اور مسیح وضاحت کے واسطے لایا گیا۔ جیسے کوئی کہے کہ میرا نام خان بہادر عبداللہ خاں حنفی قادری ہے۔ تو خان بہادر اور حنفی قادری نام نہیں اسمہ کی ضمیر کلمہ کی طرف لوٹتی ہے۔ چونکہ کلمہ سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور وہ مذکر لہٰذا ضمیر مذکر لائی گئی مسیح آپ کا لقب ہے۔ جو نبوت کے بعد ملا۔ جیسے صدیق و فاروق بعض کے نزدیک یہ لفظ عبرانی سے معرب ہے۔ اصل میں مشیح تھا بمعنی

مبارک یا سچا یا بادشاہ۔ بعض نے فرمایا کہ یہ لفظ عربی ہے۔ مسح سے بنا ہے۔ بمعنی چھونا سفر کرنا یا دور کرنا یا یکساں ہونا چونکہ آپ بیماروں کو چھو کر شفا دیتے تھے یا چونکہ آپ نے کہیں گھر نہ بنایا! ہمیشہ سفر میں رہے جہاں رات آ گئی گذار دی۔ یا چونکہ آپ کو پیدائش کے وقت جبرائیل علیہ السلام نے چھوا یا چونکہ جب رب تعالیٰ نے پشت آدم پر مسح فرما کر ان کی ذریت کو نکالا تو ہر ایک کو اپنے مقام پر واپس کیا سوا عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ ویسے ہی رہے۔ یا چونکہ آپ کے قدم میں گڑھا نہ تھا۔ یکساں تھا یا چونکہ آپ صاف ستھرے اور روغن سے مالش کئے ہوئے پیدا ہوئے۔ اس لئے آپ کا لقب مسیح ہوا لہٰذا مسیح یا مسوح کے معنی میں ہے۔ یا ماسح کے۔ ابن مریم فرما کر تین قوموں کی تردید فرما دی۔ یہود کی جو آپ کی والدہ کو تہمت لگاتے تھے۔ عیسائیوں کی جو آپ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ تیسرے قادیانیوں کی جو کہتے ہیں کہ حضرت مریم کا نکاح یوسف نجار سے ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام ان سے پیدا ہوئے۔ اس ایک لفظ ابن مریم میں ان تینوں کا نہایت بلیغ رد ہو گیا کہ اگر ان کا کوئی باپ ہوتا تو انہیں اس باپ کا بیٹا کہا جاتا نہ کہ مریم ماں کا بیٹا۔ عقلاً' نقلاً' قانوناً' عرفاً بیٹے کو باپ کی طرف نسبت کیا جاتا ہے نہ کہ ماں کی طرف اور اگر وہ خدا کے بیٹے ہوتے۔ تو ابن مریم نہ کہلاتے بلکہ ہم انہیں ابن اللہ کہتے نیز خدا کا بیٹا خدا ہوتا ہے اور خدا کسی کا بیٹا نہیں اس پر تغیر و تبدل نہیں آتے۔ وہ حوادث زمانہ کا شکار نہیں ہوتا۔ جب حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام پر یہ واردات آتی ہیں۔ تو نہ وہ اللہ نہ ابن اللہ بلکہ ابن مریم ہیں۔ (روح المعانی و کبیر) خیال رہے کہ دجال کو بھی مسیح کہا جاتا ہے۔ مگر اس معنی سے کہ اس کی ایک آنکھ مسوح یعنی صاف ہے۔ یعنی کانا ہے۔ یا اس لئے کہ وہ چالیس دن میں تمام دنیا کی سیر کرے گا۔ غرض آپ اور معنی میں مسیح ہیں اور دجال دوسرے معنی میں ہیں۔ عیسیٰ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ بھی معرب ہے۔ عبرانی میں ایشوع تھا جیسے موسیٰ کہ بعض کے نزدیک موشا یا میشا تھا اور بعض کے نزدیک یہ بھی عربی ہے۔ عیس سے مشتق ہے۔ بمعنی سرخی و سفیدی۔ چونکہ آپ کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ اسی لئے آپ کا نام عیسیٰ ہوا۔ یعنی اے مریم اللہ تمہیں کلمۃ اللہ کی بشارت دیتا ہے۔ جن کا لقب مسیح' نام پاک عیسیٰ اور کنیت ابن مریم ہو گی۔ چار نام بیان فرمانے کے بعد اب ان کی چار صفتیں بیان ہو رہی ہیں۔ پہلی یہ کہ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یہ عبارت عیسیٰ یا کَلِمَتُهٗ کا حال ہے اور وَجِيهًا یا تو وجہ بمعنی چہرہ سے بنا چونکہ آپ نہایت ہی خوبصورت تھے کہ بہت سے لوگ آپ کا چہرۂ انور دیکھ کر ایمان لے آئے۔ اس لئے وجیہ یعنی حسین و جمیل اور ہیبت والا آپ کی صفت ہوئی۔ یا یہ وجاہت سے بنا۔ بمعنی عزت' قدر اور شرف' رب تعالیٰ فرماتا ہے وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيهًا یعنی آپ دنیا میں بھی عزت والے ہیں۔ اور آخرت میں بھی دنیا میں اس طرح کہ (۱) آپ کی پیدائش سب سے نرالی ہے کہ اگرچہ حضرت آدم و حوا بھی بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔ لیکن پیدائش آدم علیہ السلام میں مٹی اور پانی تو تھے۔ اور حضرت حوا کی پیدائش میں آدم علیہ السلام کی پسلی تو تھی عیسیٰ علیہ السلام میں کوئی مادی شے داخل نہ ہوئی صرف کن سے پیدا ہوئے۔ اس لئے کلمۃ اللہ آپ ہی کا لقب ہوا نہ کہ آدم علیہ السلام کا (۲) نیز عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے خاتم الانبیاء اور امت مصطفیٰ ﷺ کے خاتم الاولیاء ہیں۔ نیز آپ ہی امت مصطفیٰ ﷺ کے بڑے مجتہد ہوں گے۔ (۳) نیز آپ گنبد خضراء میں حضور ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ اور حضور ﷺ کے ساتھ ہی اٹھیں گے۔ (۴) نیز دیگر پیغمبروں کی ہجرت زمین پر ہوئی مگر عیسیٰ علیہ السلام کی آسمان پر (۵) نیز آپ انسان ہو کر مثل فرشتوں کے زندگی گزار رہے ہیں کہ انہی کی طرح عبادت آپ کی غذا ہے۔

(۶) نیز موسیٰ علیہ السلام نے امت مصطفیٰ ﷺ ہونے کی تمنا کی تھی جو پوری نہ ہو سکی عیسیٰ علیہ السلام کو یہ فخر حاصل ہوا (۷) نیز آپ دنیا میں مقبول الدعا ہوئے۔ اور آپ کے ہاتھ پر مردے زندہ اور بیمار شفایاب ہوئے۔ ان وجوہ سے آپ دنیا میں عزت والے ہیں۔ آخرت میں بھی آپ کی خصوصی عزت کئی طرح ظاہر ہوگی۔ دیگر انبیائے کرام نہ شفاعت فرمائیں گے نہ شفیع المذنبین کا صحیح پتہ دیں گے۔ اِذْهَبُوْا اِلٰى غَيْرِیْ کہیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں جن سے شفیع المذنبین کا صحیح پتہ لگے گا (۲) نیز قیامت کے دن طلب شفاعت کے وقت پیغمبر اپنی کوئی خطا یاد فرمائیں گے ہم سے فلاں خطا ہوئی تھی ہم شفاعت کیسے کریں سوا عیسیٰ علیہ السلام کے کہ یہ اپنی کوئی خطا نہ بیان فرمائیں گے اسی لئے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام سے کوئی خطا سرزد نہ ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کے متعلق فرمایا گیا وَجِيْهًا فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ یا وجیہ وہ ہے جس کی بات مانی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان کی شان یہ ہے کہ دنیا میں بھی رب تعالیٰ ان کی ہر بات مانے گا۔ اور آخرت میں بھی اور کیوں نہ مانے کہ وہ رب کی ہر بات مانتے ہیں۔ حضور انور ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت میں بعض وہ ہوں گے جو پراگندہ بال و پریشان حال ہوں گے مگر لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ اگر رب تعالیٰ پر قسم کھالیں تو رب ان کی قسم پوری فرما دے۔ جب ولی کی بات اس قدر مانی جاتی ہے۔ تو آپ تو کلمۃ اللہ اور روح اللہ نبیوں میں بہت شاندار نبی ہیں۔ دوسرا وصف یہ کہ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ یہ وجیہا پر معطوف ہے۔ اور کائناً پوشیدہ کا متعلق۔ مقرب تقریب سے بنا جس کا مادہ قرب ہے۔ بعد کا مقابل اس سے یا قرب درجہ مراد ہے یا قرب مکانی، پہلی صورت میں معنی یہ ہوئے کہ وہ اللہ سے قرب رکھنے والوں یعنی انبیاء میں سے ہوں گے۔ دوسری صورت میں یہ معنی ہوئے کہ وہ مقربین یعنی فرشتوں میں سے ہوں گے۔ کہ ان کے ساتھ رہیں گے ان کی سی عبادت کریں گے اور بغیر ظاہری غذا چوتھے آسمان پر زندہ رہیں گے (کبیر و معانی وغیرہ) چوتھی صفت یہ کہ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا صحیح یہ ہے کہ واؤ عاطفہ ہے نہ کہ حالیہ اور جملہ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ پر معطوف ہے۔ (کبیر) یکلم کلام سے بنا بمعنی بات۔ الناس اس لئے فرمایا گیا کہ آپ نے لوگوں سے گفتگو پیدا ہونے کے بعد کی۔ ورنہ والدہ کے شکم میں ہی توریت شریف پڑھتے تھے۔ جسے حضرت مریم سنتی تھیں (خازن و روح البیان از مجاہد) سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پیدائش کے بعد عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے صرف ایک بار کلام کیا پھر اپنی عمر پر پہنچ کر بولے (خازن و روح المعانی) مگر ابن اخشید نے کہا کہ آپ بچپن میں ہمیشہ ہی کلام فرماتے رہے (روح المعانی) مہد کے معنی ہیں شروع و ابتدا اسی لئے شروع کلام کو تمہید کہا جاتا ہے اصطلاح میں بچے کے جھولے اور گہوارے کو مہد کہتے ہیں کیونکہ بچہ وہیں رہتا ہے پھر کچھ دن بعد گہوارے میں لٹایا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی پیدائش کے کچھ دیر بعد لوگوں سے کلام کیا کہ جنگل میں پیدا ہوئے ماں آپ کو لے کر شہر آئیں شہر کے دروازے پر ہی لوگوں نے گھیر لیا جن سے آپ نے نہایت فصیح و بلیغ کلام کیا۔ ابھی گہوارے میں جھولنے کی عمر ہی نہ ہوئی تھی ہاں پھر بعد میں جو کلام ہوئے وہ گہوارے میں تھے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ مہد کے ایسے معنی کئے جائیں جو گود اور گہوارہ دونوں کو شامل ہوں کہل کے لغوی معنی بڑھاپے اور جوانی کی درمیانی حالت ہے۔ جس کی ابتدا چالیس سال سے ہے اور بڑھاپے کی ابتدا پچپن سال سے۔ چونکہ آپ جوانی یعنی تینتیس سال کی عمر میں اٹھائے گئے اور واپس آکر چالیس سال اور زندہ رہیں گے آپ کی کل عمر شریف تہتر برس ہوگی۔ اس لئے کہول ہو کر بولنا آپ کے حق میں

معجزہ ہے۔ کہ آسمان سے واپس آکر کلام شریف فرمائیں گے۔ ورنہ کہولت میں عام طور پر لوگ بولا ہی کرتے ہیں (کبیر)
خیال رہے کہ آپ آسمان پر قریباً دو اڑھائی ہزار سال قیام فرما رہنے کے بعد جب آئیں گے تب اسی عمر کے ہوں گے جس عمر میں آسمان پر تشریف لے گئے تھے ایک دن کا بھی فرق نہ ہوگا کیونکہ آسمان کا قیام عمر نہیں بڑھاتا۔ نیز آپ نے بچپن میں تو بنی اسرائیل سے کلام فرمایا اور بڑھاپے میں امت مصطفیٰ علیہ السلام سے کلام کریں گے۔ بچپن میں دنیا کا اور رنگ تھا۔ بڑھاپے میں اور رنگ ہوگا نیز بچپن میں کلام آسمان پر جانے سے پہلے تھا مگر بڑھاپے کا کلام آسمان سے آکر ہوگا۔ ان وجوہ سے یہ بڑھاپے کا کلام بھی معجزہ نہیں' بلکہ چند معجزات کا مجموعہ ہے۔

لطیفہ: تفسیر روح المعانی نے عمر انسانی کے حسب ذیل نام گنائے ہیں کہ بچہ جب تک رحم میں رہے جنین ہے جب پیدا ہو تو ولید جب تک دودھ پیئے رضیع جب دودھ چھڑا دیا جائے تو فطیم جب کچھ چلنے پھرنے لگے تو وہ دارج اور جب اس کے دودھ کے دانت نکل آئیں تو خماسی جب دودھ کے دانت اکھڑنے لگیں تو مثغور جب دوسرے دانت نکل آئیں تو مثغر جب دس سال کا ہو جائے۔ تو مترعرع جب قریب بلوغ ہو تو یافع یا مراھق اور جب بالغ ہو جائے تو حزور مگر ان سب صورتوں میں ان کا نام غلام ہوگا۔ جب مونچھ چمکے تو فتا یا شارخ جب داڑھی پوری نکل آئے تو مجتمع پھر تیس سے چالیس سال تک شاب پھر چالیس سے ساٹھ تک کہل ساٹھ کے بعد جب بال سیاہ اور سفید مخلوط ہوں تو شاخ پھر کبر پھر ھرم پھر دلف پھر خرف (دیوانہ بڈھا) پھر میت یہ مرد کے نام تھے عورت کے نام حسب ذیل ہیں بچی طفلہ پھر ولید پھر کاعب پھر ناہد جب بالغہ ہو تو معصر پھر عانس پھر خود (یہ جوانی اور بڑھاپے کی درمیانی حالت ہے پھر مسلف پھر شہلہ' پھر شہربہ پھر حزبون جب کہ بڑھاپے میں ناقص العقل ہو جائے پھر قلعم اور لطلط جب دانت گر جائیں (روح المعانی) چوتھی صفت یہ کہ وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ صالح صلح سے بنا بمعنی نیکی اور تقویٰ خیال رہے کہ مطیع وہ بھی کہلا سکتا ہے۔ جو بتکلف یا مجبوراً فرمانبرداری کرے مگر صالح وہ ہی ہے جس سے اطاعت بے تکلف صادر ہو یعنی عیسیٰ علیہ السلام اس جماعت سے ہوں گے۔ جو بلا تکلف رب کی اطاعت کرے۔ یا صالحین صلاحۃ سے بنا۔ بمعنی قابلیت یعنی وہ بڑی قابلیتوں کے مالک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرات انبیاء کو ہر قسم کی قابلیتیں عطا فرماتا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے تمام علاقہ مصر میں اعلیٰ درجہ کی کاشت کرائی پھر غلہ کو سنبھالا پھر تمام دنیا کو رزق تقسیم فرمایا۔ قاسم رزق اللہ رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام آپ آسمان سے آکر مجاہد' غازی' اسلام کے مجتہد' مبلغ اعلیٰ درجہ کے بادشاہ سب کچھ ہی ہوں گے۔ حالانکہ اس سے پہلے آپ صرف تارک الدنیا تھے یہ ہے ان کی صلاحیت۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب علیہ السلام وہ وقت بھی یاد کرو یا انہیں یاد دلاؤ۔ جب فرشتوں کے سردار جبرائیل علیہ السلام نے حضرت مریم سے ان کے بالغ ہونے کے بعد کہا تھا کہ اے مریم تمہیں اللہ ایسے فرزند کی خوشخبری دیتا ہے جو بغیر باپ رب کی طرف سے کلمہ کن پیدا ہوں گے ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ چھو کر بیماروں کو تندرست اور مردوں کو زندہ کریں گے اور ساری عمر سیر و سیاحت میں گذاریں گے اس لئے ان کا لقب مسیح ہوگا اور نام پاک عیسیٰ اور چونکہ وہ بغیر باپ پیدا ہوں گے اس لئے ان کی کنیت ابن مریم ہوگی اور ان کی صفت یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں بڑی عزت والے شان والے رعب دبدبے والے ہیں۔ اور رب تعالیٰ سے خاص

قرب رکھنے والوں سے ہوں گے۔ یا انسان ہو کر ملائکہ مقربین میں سے ہوں گے۔ کہ کچھ زمانہ انہی کی طرح زندگی گذاریں گے اور انہی کی سی عبادت کریں گے اور ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں سے گھوارے اور پختہ عمر میں یکساں فصیح و بلیغ وحکیمانہ کلام فرمائیں گے۔ دوسرے بچوں کی طرح نہ ہوں گے کہ پہلے بے معنی لفظ بولیں پھر عمدہ یا ان کا بچپن میں کلام کرنا بھی معجزہ ہو گا۔ اور بڑھاپے میں بولنا بھی معجزہ کہ آسمان سے اتر کر کلام فرمائیں گے۔ ان سب کے باوجود وہ خاص نیک کاروں میں سے ہوں گے۔ کہ نہ کبھی خطا کریں گے اور نہ انہیں نیکیاں کرنے میں کچھ تکلف ہوگا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد پیدا ہوئے جیسا کہ كَلِمَةٍ مِّنْهُ اور ابن مریم سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** حضرات انبیائے کرام اللہ کے نزدیک بڑے عزت و جاہت والے بندے ہیں جو انہیں رب تعالیٰ کی بارگاہ میں ذلیل جانے وہ خود ذلیل و کمین ہے۔ دیکھو یہاں رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دنیا اور آخرت میں وجیہہ فرمایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے لئے فرمایا وَكَانَ عِندَ اللَّهِ وَجِيهًا (احزاب:۶۹) ہمارے حضور ﷺ کے لئے فرمایا وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ (منافقون:۸) جو دیو بندی اور وہابی اسمٰعیل دہلوی کی پیروی میں حضرات انبیاء کرام کو ذلیل کہیں بے دین ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر تشریف لے گئے اور وہاں فرشتوں کے ساتھ ان کی سی زندگی گزار رہے ہیں جیسا کہ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آسمان سے تشریف لائیں گے۔ اور لوگوں کو ہدایت دیں گے جیسا کہ **وکھلاً** سے معلوم ہوا۔ کیونکہ بڑھاپے میں کلام کرنا جب ہی معجزہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی خصوصیت ہو ورنہ ہر بڈھا باتیں کرتا ہے۔ **پانچواں فائدہ:** انبیائے کرام کی نعت گوئی سنت الٰہیہ ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی نعت ارشاد فرمائی۔ بعض نیکیاں صرف انسان کرتے ہیں جیسے جہاد میں شہید و زخمی ہونا حج کی مشقتیں جھیلنا کہ یہ نیکیاں نہ ملائکہ کر سکتے ہیں نہ جنات' بعض نیکیاں صرف فرشتے کرتے ہیں۔ جیسے ہمیشہ عبادت میں رہنا وغیرہ۔ بعض نیکیاں وہ ہیں جو جن و انس و فرشتے سب کرتے ہیں جیسے نماز اور رب تعالیٰ کی اطاعت مگر ایسا کوئی کام نہیں جو خدا تعالیٰ بھی کرے اور جن و انس و فرشتے بھی سوا۔ نعت انبیائے کرام اور مناقب اولیاء اللہ کے کہ یہ کام خالق و مخلوق میں مشترک ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ فرماتا ہے إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب:۵۶) رب نے کسی حکم میں اپنا اور اپنے فرشتوں کا ذکر نہ کیا سوا درود شریف کے تو جو حضور کی نعت اولیاء کے مناقب بیان کرتا ہے وہ سنت الٰہیہ سنت ملائکہ سنت انبیاء سب پر عمل کرتا ہے اور انبیائے کرام کے کمالات کا سب سے پہلے انکار کرنے والا ابلیس ہے۔ آج جو ان کے کمالات کا انکار کرے انہیں اپنے جیسا ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اس سنت ابلیسی پر کار بند ہے۔ **چھٹا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام نہ خدا ہیں' نہ خدا کے بیٹے نہ خدائی شان کے مالک' کیونکہ ابن مریم ہونا گھوارے میں جھولنا۔ پھر عمر کے انقلابات آنا' بڈھا ہونا سب بندگی کی علامات ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام ضرور آسمان سے اتریں گے۔ کیونکہ آپ کہولت سے پہلے تینتیس سال کی عمر میں آسمان پر گئے۔ اگر آپ اب آسمان سے نہ آئیں تو کھلا کے معنی نہیں درست ہوتے۔ **آٹھواں فائدہ:** کبھی اسلام کو شرافت ماں کی طرف سے بھی ملتی ہے۔ اور کبھی ماں

باپ کو اولاد سے دیکھو ابن مریم ہونا' عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہونا۔ حضرت مریم کی شرافت' سادات کرام کو ماں یعنی فاطمہ زہرہ سے بزرگی ملی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب آدم علیہ السلام بھی بغیر باپ پیدا ہوئے۔ تو ان کا لقب کلمۃ اللہ کیوں نہ ہوا۔ **جواب:** اس لئے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش مٹی اور پانی وغیرہ واسطوں سے ہے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش فقط کن سے بلا واسطہ نہ مٹی نہ پانی نہ نطفہ سے۔ **دوسرا اعتراض:** بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ کے معنی اپنے کلام کے ذریعے بشارت دینا ہے۔ ب استعانت کی ہے آپ کلمۃ اللہ نہیں۔ اس لئے ب داخل فرمائی گئی (مرزائی) **جواب:** اس صورت میں یہ عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت کیسے بنا۔ خوشخبری کلام کے ذریعے سے ہوتی ہے نیز دوسری جگہ ارشاد ہوا وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰى مَرْيَمَ (النساء: ۱۷۱) یہاں نہ ب ہے نہ ت۔ **تیسرا اعتراض:** يُكَلِّمُ کے ساتھ ناس کی کیوں قید لگائی۔ کلام تو لوگوں سے ہی ہوتا ہے۔ **جواب:** اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے کلام بعد پیدائش کیا۔ اور مطلق کلام تو والدہ کے شکم میں بھی کیا جیسا کہ ہم تفسیر میں بحوالہ بتا چکے۔ **چوتھا اعتراض:** تمام صفتوں کے بعد مِنَ الصّٰلِحِيْنَ کیوں ارشاد فرمایا گیا؟ **جواب:** اس لئے کہ صلاح وتقویٰ تمام صفتوں سے افضل ہے۔ استقامت کرامت سے بڑھ کر ہے۔ **پانچواں اعتراض:** وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقرب فرشتوں کے زمرہ میں ہوں گے حالانکہ انسانیت ملکیت سے افضل ہے۔ یہ تو آپ کی توہین ہوئی۔ **جواب:** واقعی ملک۔ یعنی فرشتہ سے انسان افضل ہے۔ مگر جس انسان میں ملکی صفات ہوں۔ وہ تمام انسان اور فرشتوں سے افضل ہے۔ کہ صورتا انسان ہے۔ اور سیرتا فرشتہ اگر انسان ہوا میں اڑے پانی پر چلے تو یہ اس کا کمال ہے۔ ورنہ بہت سے حیوانات تیرتے بھی ہیں اور اڑتے بھی ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ قوائے روحانیہ نے مریم نفس سے کہا کہ اے مریم اللہ تیری طرف توجہ کرم فرما کر تجھے ایک ایسے کلمے کی خوشخبری دیتا ہے۔ جو وجودات کے حروف کا جامع ہے۔ یعنی دل جو تمام عالموں کو گھیرے ہوئے ہے رب تعالیٰ کی طرف سے تجھے دیا گیا اس کا نام مسیح ہے کیونکہ وہ تجھے مس کر کے نورانی کرے گا۔ وہ دنیا میں عزت والا ہے کیونکہ معاش کی تدبیر سوچتا ہے۔ اور قوت ظاہری کے انسان اور قویٰ باطنی کے جنات۔ اس کے مطیع وفرمانبردار ہیں۔ نیز وہ جزئیات کا حاصل کرنے والا ہے اور یہاں رہ کر غلطی اور کج روی سے محفوظ ہے۔ اور چونکہ وہ معانی کلیہ اور قدسی علوم کا حامل ہے سعادت کی تدبیر سوچنے والا ہے۔ اور حق کا مطیع وفرمانبردار۔ لہٰذا روحانی آسمان کے ملکوت اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس لئے وہ آخرت میں بھی عزت والا ہے۔ اور چونکہ وہ دنیا میں تجلی گاہ افعال الٰہی ہے اور آخرت میں بھی تجلی گاہ اسمائے الٰہی۔ اس لئے وہ مقربین میں سے ہے۔ نیز چونکہ وہ تجلی ذات کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ صالحین میں سے ہے۔ حدیث قدسی ہے۔ کہ نہ میں آسمان میں سماؤں نہ زمین میں سماؤں۔ ہاں بندہ مومن کے دل میں میری گنجائش ہے۔ اور وہ دل گہوارہ بدن میں رہ کر بھی لوگوں سے کلام ہدایت کرے گا۔ جبکہ اسے سلوک کی غذاؤں کے ذریعے ملک یا ملکوت تک پہنچایا جائے گا۔ اور شیخ روح کے

طور پر پہنچ کر بڑھاپے میں بھی کلام کرے گا۔ اس میں مقام معرفت تک پہنچنے کی صلاحیت ہے۔ تجھے مبارک ہو کہ تو ایسے پاک قلب کی حاملہ ہونے والی ہے (روح المعانی وابن عربی)

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ
وہ بولیں اے رب میرے کہاں سے ہوگا واسطے میرے فرزند حالانکہ نہ چھوا مجھے بشر نے فرمایا
بولی اے میرے رب میرے بچہ کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ نہ لگایا فرمایا
اللّٰهُ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ
اسی طرح اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے جب فیصلہ کرتا ہے کسی چیز کا تو اس کے سوا نہیں کہ کہتا ہے واسطے
اللہ یوں ہی پیدا کرتا ہے جو چاہے جب کسی کام کا حکم فرمائے تو اس سے یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے
فَيَكُوۡنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِيۡلَ ﴿۴۸﴾
اس کے ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے اور سکھائے گا انہیں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل
اور اللہ اسے سکھائے گا کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل
وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۙ
اور رسول ہوں گے وہ طرف بنی اسرائیل کے
اور رسول ہوگا بنی اسرائیل کی طرف

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں اس بشارت کا ذکر تھا۔ جو حضرت مریم کو ملائکہ کے ذریعے دی گئی۔ اب حضرت مریم کے تعجب یا خوشی کا ذکر ہے۔ جو انہیں بشارت سے حاصل ہوئی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت مسیح کی ولادت کا ذکر تھا۔ اب کیفیت ولادت کا تذکرہ ہے۔ کہ ان کی پیدائش کنواری مریم سے بلا واسطہ شوہر ہوگی۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسیح علیہ السلام کے ظاہری صفات کا ذکر تھا اب ان کے باطنی یعنی علم و حکمت و رسالت کا تذکرہ ہے۔ یہاں خیال رہے کہ حضور ﷺ کی ولادت شریف کے اس قسم کے بلکہ اس سے اعلیٰ قسم کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام کی ولادت پر قسم قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ تمام احادیث و تاریخی واقعات قابل قبول ہیں۔ کہ حدیث ضعیف عمل امت قبول علماء اور تائید قرآن سے قوی ہو جاتے ہیں۔ دیکھو حدیث اَنَا نُوۡرٌ مِّنۡ نُّوۡرِ اللّٰهِ اگرچہ ضعیف بھی ہوگی مگر اس کی تائید ان آیات سے ہو رہی ہے قَدۡ جَآءَكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ نُوۡرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيۡنٌ (مائدہ: ۱۵) اور سِرَاجًا مُّنِيۡرًا (احزاب: ۴۶) لہٰذا وہ حدیث قبول ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے ان

ارحاصات اور حضرت مریم کے کرامات کا ذکر فرمایا جو ولادت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ظاہر ہوئے۔ حضور ﷺ کا میلاد خواں حضرت آمنہ و حضرت حلیمہ کے گھر کے ارحاصات ہی بیان کرتا ہے۔

تفسیر

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِیْ وَلَدٌ یہ مستقل جملہ ہے قَالَتْ کا فاعل حضرت مریم ہیں۔ رب سے مراد یا رب تعالیٰ ہے کیونکہ حقیقی کلام ادھر ہی سے تھا یا حضرت جبرائیل کیونکہ بظاہر وہ ہی بول رہے تھے چونکہ حضرت مریم کی پرورش میں جبریل علیہ السلام کو بڑا دخل تھا۔ اس لئے انہیں رب کہا گیا۔ اَنّٰی یا بمعنی کیف ہے۔ یا من این یہ سوال تعجب کے لئے ہے یا طریقہ ولادت پوچھنے کے لئے اس سے انکار مقصود نہیں۔ جو مریم رب کا غیبی رزق کھاتی رہی ہوں اور جنہوں نے زکریا علیہ السلام سے کہا ہو هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وہ اس کا انکار کیسے کر سکتی تھیں۔ وہ تو قدرت خدا کا تماشا دیکھ چکی تھیں۔ یعنی حضرت مریم نے عرض کیا کہ اے مولیٰ میرے فرزند کیسے ہوگا نکاح کے بغیر یا بلا نکاح یا کہاں سے ہوگا کس سے نکاح ہوگا۔ (روح المعانی) وَلَمْ يَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ لی کی ضمیر سے حال یَمْسَسْ مس سے بنا۔ بمعنی چھونا یا مجازاً جماع مراد ہے۔ بَشَرٌ بشرہ سے بنا بمعنی ظہور۔ انسان کو بشر اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی کھال ظاہر ہے۔ پروں یا بالوں سے ڈھکی ہوئی نہیں۔ یا بشر مباشرت سے بنا۔ چونکہ رب تعالیٰ نے ابو البشر آدم علیہ السلام کی پیدائش کی مباشرت خود فرمائی۔ کہ انہیں اپنے ہاتھ سے بنایا۔ اس لئے اس کا نام بشر ہوا (معانی و بیان) مگر یہاں بشر سے مرد مراد ہے۔ یعنی میرے فرزند کیونکر ہوگا مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا۔ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ یہ ان کے تعجب کا جواب ہے قَالَ کا فاعل یا فرشتہ ہے جس کا کلام رب نے نقل فرمایا یا خود رب تعالیٰ بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت مریم کو یہ آواز بلا واسطہ فرشتہ آئی۔ مگر صحیح یہ ہے کہ بواسطہ فرشتہ تھی۔ كَذٰلِكِ یا تو یکون فعل پوشیدہ کے متعلق ہے اور اللّٰه يَخْلُقُ سے نیا جملہ اور كذالک کی دلیل یا یہ ایک ہی جملہ ہے۔ اور كَذٰلِكِ يَخْلُقُ کے متعلق یہ خلق سے بنا۔ بمعنی معدوم کو موجود اور نیست کو ہست کرنا۔ اور مَا سے مراد ہر چیز ہے۔ جاندار ہو یا بے جان۔ یعنی تمہارے ہاں فرزند یوں ہی بغیر نکاح ہوگا۔ کیونکہ اللہ جسے چاہے جیسے چاہے پیدا کرے یا اے مریم اللہ جسے چاہتا ہے ایسے ہی بغیر اسباب کے پیدا کرتا ہے۔ خیال رہے کہ یہاں يَخْلُقُ کے معنی یا تو ہیں پیدا کر سکتا ہے کہ وہ اس پر قادر ہے۔ کہ بغیر اختلاط مرد و زن بچہ پیدا فرما دے۔ یا معنی ہیں پیدا کرتا ہے یعنی بغیر نر مادہ کے اختلاط کے دن رات مخلوق کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ کہ سر کی پہلی جوں چارپائی کا پہلا کھٹمل موسم برسات کا پہلا مینڈک اور پہلا پروانہ بغیر نر و مادہ کے ہی پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ قادر و کریم تمہیں بھی بغیر شوہر بچہ دینے پر قادر ہے۔ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یہ جملہ پچھلے جملہ کی دلیل ہے قَضٰی قَضَاءٌ سے بنا بمعنی مضبوطی اصطلاح میں فیصلہ اور یقینی ارادے کو بھی قضا کہتے ہیں۔ قضا کے آٹھ معنی پارہ الم میں بیان ہو چکے۔ امر اامور کا واحد ہے بمعنی چیز یا کام اس میں جوہر و عرض سب داخل ہیں فَاِنَّمَا کی ف جزائیہ ہے۔ اور یہ جملہ قَضٰی کی جزا کن کہنے سے فقط تعلق ارادہ کی مثال دینا مقصود ہے۔ اور فَيَكُوْنُ سے اس چیز کا فوراً بلا تاخیر ہو جانا مراد۔ نہ حقیقی قول مراد ہے اور لفظ کن مقصود کیونکہ کاف اور نون بھی تو ایک مخلوق ہے۔ نیز اگر ہر چیز کن سے پیدا ہوتی تو کن کس سے پیدا ہوتا۔ نیز کن خطاب ہے۔ جب سننے والا موجود ہی نہیں تو خطاب کس سے یعنی جب کسی چیز کی پیدائش کا فیصلہ فرمالیتا ہے تو اپنے ارادے کو اس کے متعلق فرماتا ہے۔ اور ارادہ فرماتے ہی فوراً وہ شی ہو جاتی ہے۔

نہ مادے کی ضرورت نہ کسی آلہ اور اسباب کی حاجت نہ محنت و جانفشانی کی ضرورت اور ممکن ہے کہ کُن کہنے سے کلام نفسی مراد ہو۔ جو ان ممکنات سے متعلق ہو جو علم الٰہی میں موجود ہیں (روح المعانی) مگر پہلی توجیہ زیادہ صحیح ہے یعنی رب تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ جب کسی بندے کے پیدا کرنے کا فیصلہ یا حکم فرماتا ہے تو اس معلوم سے کن فرماتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِيْلَ یہ یا تو نیا جملہ ہے۔ یا يُبَشِّرُكِ یا يَخْلُقُ پر معطوف۔ ہماری قرأت يُعَلِّمُ ہی سے ہے۔ دیگر قرأتوں میں نُعَلِّمُ نون سے ہے يُعَلِّمُ تعلیم سے بنا بمعنی سکھانا۔ یہاں بلاواسطہ مراد علم فقہ یا علم حلال و حرام یا سارے علوم دینیہ یا سارے عقلی و نقلی علوم ہیں۔ اس صورت میں توریت و انجیل کا ذکر بلا تکلف درست ہوا (روح المعانی و کبیر) روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کتابت کے دس حصے کیے۔ نو حصے عیسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائے۔ اور ایک حصہ میں ساری دنیا۔ (روح المعانی) چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام بہت خوش خط تھے۔ اور ممکن ہے کہ کتاب سے مراد زبور ہو یا مطلقاً آسمانی کتابیں۔ اور علم کتاب سے الفاظ کا علم مراد ہے اور حکمت سے اس کے اسرار و رموز اس صورت میں توریت انجیل کتاب کا بیان ہے۔ یا خاص بعد عام اور ہو سکتا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن شریف ہو۔ اور حکمت سے مراد حدیث پاک۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے واپس آکر امت مصطفیٰ ﷺ کے بڑے مجتہد ہوں گے اور قرآن و حدیث کے بڑے ماہر حالانکہ کسی سے نہ پڑھیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے دو حصے ہوں گے پہلا حصہ آسمان پر جانے سے پہلے اور دوسرا حصہ آسمان سے آنے کے بعد پہلے حصہ میں وہ توریت و انجیل کے بڑے ماہر ہوں گے۔ دوسرے حصے میں چونکہ توریت و انجیل کا چراغ گل ہو چکا ہو گا قرآن و حدیث مصطفوی کا سورج چمک رہا ہو گا اس لئے وہ قرآن و حدیث کے بڑے عالم ہوں گے کہ زمین پر جا کر نہ حنفی ہوں گے نہ شافعی نہ مالکی وغیرہ خود مجتہد اعظم ہوں گے نیز نہ قادری ہوں گے نہ چشتی نقشبندی بلکہ خود بانی سلسلہ ہوں گے۔ یہ تمام علوم انہیں رب ہی سکھائے گا کسی معلم روحانی یا جسمانی سے نہ سیکھیں گے۔ چونکہ قرآن و حدیث توریت و انجیل سے افضل ہیں۔ اس لئے رب تعالیٰ نے افضل کا ذکر پہلے کیا۔ اگرچہ ترتیب میں قرآن و حدیث کی تعلیم بعد میں ہے اور توریت و انجیل کی تعلیم پہلے وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ یہ واؤ بھی عاطفہ ہے۔ اور جملہ يُعَلِّمُهٗ پر معطوف ہے۔ اور رَسُوْلًا یکون فعل پوشیدہ کی خبر اور ممکن ہے نبعثہ کا حال ہو۔ بنی اسرائیل فرمانے میں یہود کا رد ہے کہ عام یہود ان کی نبوت کے منکر تھے۔ اور ان میں فرقہ عنانیہ ان کی نبوت کا معتقد تو تھا مگر ایک خاص قبیلہ کی طرف۔ اس میں اختلاف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت کب ملی۔ بعض نے فرمایا کہ آپ مادر زاد نبی تھے۔ کیونکہ آپ نے پیدا ہوتے ہی فرمایا وَاٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا (مریم: ۳۰) بعض کے نزدیک تین سال کی عمر میں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ بالغ ہو کر آپ پر وحی آئی۔ بعض نے فرمایا کہ آپ کو نبوت تیس سال کی عمر میں ملی۔ اور تین سال تین مہینے تین دن تبلیغ فرما کر آسمان پر تشریف لے گئے۔ یہ یہی قول زیادہ مشہور ہے۔ (روح المعانی)

لطیفہ: انسان میں پہلے نبی آدم علیہ السلام اور آخری نبی حضور ﷺ ہیں۔ اور بنی اسرائیل میں پہلے نبی یوسف علیہ السلام اور آخری نبی عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

خلاصہ تفسیر

حضرت مریم نے جب فرزند کی بشارت اور ان کے اوصاف سنے تو ازراہ تعجب بالنوعیت دریافت کرنے کے لئے بولیں کہ اے

مولیٰ میرے بچہ کیونکر ہوگا۔ مجھے تو مردنے ہاتھ بھی نہ لگایا یا اے مولیٰ ابھی تو مجھے مرد نے چھوا نہیں فرزند کہاں سے ہوگا۔ ایسے ہی یا نکاح سے اگر نکاح سے تو نکاح کس سے ہوگا۔ جواب ملا کہ اے مریم تمہارے فرزند ایسے ہی بغیر نکاح اور بغیر شوہر ہوگا اللہ تعالیٰ جسے چاہے یا جیسے چاہے پیدا کرے۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کی پیدائش کا ارادہ فرمالیتا ہے تو نہ مادہ کی ضرورت نہ اسباب اور اوزار کی حاجت نہ مشقت ومحنت کی ضرورت بس صرف کن فرمادیتا ہے کہ ہو جاتی ہے اس نے تمہیں بے موسم پھل دیئے مٹی کے ڈیلوں سے چوہے گلے سڑے بالوں سے سانپ گلے ہوئے باقلہ سے مکھی۔ سر کے میل سے جوں چارپائی کے میل سے کھٹل بارش سے صدہا کیڑے مکوڑے پیدا فرمادیتا ہے نہ وہاں نطفہ ہے نہ نر مادہ کا اختلاط تو کیا اس چیز پر قادر نہیں کہ تمہیں بغیر شوہر فرزند بخشے اے مریم اور تعجب کی بات سنو رب تعالیٰ تمہارے فرزند کو بغیر استاد علم تحریر علم اسرار عطا فرمائے گا اور توریت وانجیل کا انہیں پورا عالم کرے گا یا ان کی آخری زندگی میں اعلیٰ کتاب یعنی قرآن وحدیث کا علم انہیں دے گا اور اول زندگی میں توریت وانجیل کا انہیں ماہر کرے گا اس کے سواوہ سارے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر ہوں گے خیال رہے کہ حضرت مریم کی فرشتوں سے یہ گفتگو تیرہ سال کی عمر میں ہوئی۔ اس گفتگو کے بعد حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان کے گریبان میں پھونک ماری آپ فوراً حاملہ ہوگئیں۔ مگر بدنامی کے خوف سے اس حمل کو چھپایا۔ سب سے پہلے یوسف نجار کو جوان کا ماموں زاد بھائی تھا اور بیت المقدس کی خدمت کرتا تھا۔ پتہ چلا وہ آپ کے تقویٰ اور زہد کا بڑا معتقد تھا۔ یہ معلوم کر کے حیران رہ گیا حمل کو دیکھ کر اس کے دماغ میں برے خیالات آتے تھے مگر آپ کے تقویٰ کو دیکھ کر وہ تہمت لگانے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ ایک دن حضرت مریم سے بولا کہ اے مریم بغیر تخم کھیتی ہو سکتی ہے آپ نے فرمایا ہاں پہلی کھیتی بغیر تخم ہی ہوئی تھی۔ پھر بولا کیا بغیر بارش درخت اگ سکتے ہیں آپ نے فرمایا ہاں پھر بولا کیا بغیر نطفہ بچہ بن سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں پہلا انسان بغیر نطفہ کے پیدا ہوا حوا بغیر نطفہ بنیں۔ اے یوسف میں تیرا مطلب سمجھ گئی تو اس پر حیرت نہ کر یہ عطیہ پروردگار ہے اور جس نے مجھے یہ حمل دیا ہے وہ ہی میری عزت رکھے گا یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ آپ کو درد زہ شروع ہو گیا اور غیبی آواز آئی کہ اے مریم یہاں سے نکل چلو۔ چنانچہ آپ جنگل میں ایک کھجور کے نیچے پہنچیں۔ وہاں عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ فقیر نے اس جگہ اور کھجور کے مقام کی بیت اللحم میں زیارت کی ہے۔ انشاء اللہ اس کا پورا واقعہ سورہ مریم میں تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ پیدا ہوئے۔ اور حضرت مریم کا کسی سے نکاح نہ ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے نہ اس کے بعد۔ کیونکہ انہوں نے یہ ہی تو سوال کیا تھا کہ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ میرے فرزند کیسے پیدا ہوگا۔ اسی طرح یا نکاح سے۔ جس کا جواب دیا گیا کَذٰلِکَ اسی طرح نیز اگر حضرت مریم یوسف نجار کے نکاح میں آتیں اور ان سے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے تو رب تعالیٰ ان کی ولادت پاک کا واقعہ اس شدومد سے بیان نہ فرماتا اور ان کے متعلق فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (انبیاء:۹۱) وغیرہ نہ فرماتا نیز انہیں ابن مریم نہ فرماتا ابن یوسف فرمایا جاتا۔ **دوسرا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام کو علم کتاب دیا گیا۔ جیسا کہ الکتاب کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا کہ آپ اعلیٰ درجے کی خوشنویس تھے۔ **تیسرا فائدہ:** ہمارے حضور ﷺ کو بھی کتابت کا علم دیا گیا۔ کیونکہ حضور کمالات انبیاء کے

جامع ہیں۔ اور رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (انعام:۹۰) اور خط و کتابت کمالات انبیاء میں سے ہے۔ کہ عیسیٰ و ادریس علیہما السلام اس کے ماہر تھے۔ اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ اسی تفسیر میں بھی انشاء اللہ اس آیت کے ماتحت آئے گی وَلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت:۴۸) چنانچہ حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقعہ پر صلح نامہ کی ابتدا میں محمد رسول اللہ کاٹ کر محمد ابن عبداللہ خود لکھا تھا۔ کفار مکہ بضد تھے کہ آپ اپنا نام شریف یوں لکھیں آپ نے ہی لکھا۔ خر پوتی شریف میں حضرت امیر معاویہ کی روایت سے بیان فرمایا کہ حضور انور ﷺ نے مجھے قلم پکڑنا دوات رکھنا بسم اللہ کی سین دراز کر کے لکھنا سکھایا تا کہ میں وحی لکھا کروں۔ **چوتھا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام کو علم لدنی عطا ہوا کہ بغیر استاد سے پڑھے آسمانی کتابوں کے پورے واقف تھے۔ جیسا کہ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ سے معلوم ہوا۔ اور علم کسبی خواہ کتنا ہی ہو علم لدنی کا مقابلہ نہیں کر سکتا بجلی و گیس خواہ کتنی ہی پاور کے ہوں سورج و چاند کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ بجلی کا نور کسبی ہے۔ اور سورج چاند کا نور لدنی نیز بڑے استاد کے شاگرد بھی بڑے ہوتے ہیں تو یقیناً رب تعالیٰ کے شاگرد و حضرات انبیاء کرام تمام خلق سے بڑے عالم ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام قرآن شریف و حدیث شریف سے واقف ہو کر آسمان سے تشریف لائیں گے۔ کیونکہ بغیر کسی سے پڑھے اسلام کے بڑے مجتہد ہوں گے۔ اور اجتہاد قرآن و حدیث کے علم کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ فائدہ الکتاب کی تیسری تفسیر سے حاصل ہوا۔ اور علم کتاب تمام علوم سے اعلیٰ ہے علم ابدان سے علم ادیان اعلیٰ کہ علم ابدان کا تعلق جسم سے ہے اور علم ادیان کا تعلق روح دل سے۔ چونکہ جسم سے روح اعلیٰ ہے۔ لہٰذا علم ادیان اعلیٰ اور تمام علوم ادیان میں علم کتاب اعلیٰ کہ کتاب خود اعلیٰ چیز ہے۔ تو اس کا علم بھی اعلیٰ ہے۔ **چھٹا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے نبی ہیں۔ جیسا کہ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ سے معلوم ہوا۔ لہٰذا حضور انور ﷺ کے والدین عیسائی نہ تھے۔ کیونکہ وہ بنی اسمٰعیل ہیں۔ اس کی تحقیق پہلے سیپارہ میں ہو چکی۔ سارے عالم کا نبی ہونا ہمارے حضور ﷺ کی خصوصیت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان:۱) کسی عیسائی کو حق نہیں کہ ہم لوگوں کو عیسائی ہونے کی دعوت دے کیونکہ ہم لوگ بنی اسرائیل نہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کے نبی ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** اب جب بھی عیسیٰ علیہ السلام زمین پر آئیں گے تو نبی نہ ہوں گے بلکہ اسلام کے مجتہد مجدد ولی ہوں گے خیال رہے کہ تمام نبیوں کی نبوتیں وقت اور قوم سے محدود تھیں مگر حضور ﷺ کی نبوت کسی چیز سے محدود نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب مسلمان خدا کے سوا دوسروں کی پہلے سے ہستی نہیں مانتے تو کن سے کہا گیا اور کس نے سنا اور کون ہو گیا اس کا جواب مسلمان سات جنم میں بھی نہیں دے سکتے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** اس اعتراض کا نہایت نفیس جواب پہلے سیپارہ میں اسی آیت کی تفسیر میں گزر گیا۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ یہ عبارت قدرت الٰہی کے اظہار کے لئے ہے۔ یعنی وہ آریوں کے پرمیشور کی طرح کسی کو بنانے میں روح مادہ کا حاجتمند نہیں۔ بلکہ غنی بے نیاز ہے صرف اس طرف توجہ اور ارادہ کر دیتا ہے کہ وہ چیز ہو جاتی ہے وہ روح و مادہ کا بھی خالق ہے اور کن کا بھی۔ یہ لفظ عربی میں مستقل اختیار کے لئے بولا جاتا ہے کاف و نون فرمانا مراد نہیں رب کو اس سے کلام کی نفسی ادنیٰ جم لفظ سے بے نیاز ہے اور جو چیزیں علم الٰہی میں موجود تھیں ان

سے خطاب بلاتشبیہ یوں سمجھو کہ مکان بنانے سے پہلے اس کا نقشہ ہمارے ذہن میں ہوتا ہے۔ پھر کاغذ پر کھینچا جاتا ہے۔ پھر اس طرح مکان بنایا جاتا ہے تو ہمارا خیالی نقشہ اور کاغذی نقشہ خارجی تعمیر سے پہلے ہمارے خیال میں ہے۔ جب اس کی تعمیر کرانا چاہتے ہیں تو اینٹ' گارا چونا' اور معمار وغیرہ کی حاجت درپیش ہوتی ہے مگر رب تعالیٰ کے نزدیک یہ نہیں اسے تمام عالم کا علم تھا پھر لوح محفوظ میں عالم اور سارے واقعات کا نقشہ تیار کیا گیا۔ پھر جب بنانا چاہا تو جس وقت جس معلوم سے کن فرمایا وہ وجود میں آ گیا نہ اسے معمار کی حاجت پڑی نہ اسباب کی۔ پنڈت جی ایسے واہیات سوالات کے جوابات مسلمانوں کے لونڈے دیا کرتے ہیں ان پر کیا پھولتے ہو۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ ہر چیز کُنْ سے پیدا فرماتا ہے مادہ روح وغیرہ کی حاجت نہیں رکھتا مگر دوسری آیت میں فرماتا ہے خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ الخ (فاطر:۱۱) کہ تم کو مٹی سے پھر نطفہ وغیرہ سے پیدا کیا۔ معلوم ہوا کہ مادہ سے بناتا ہے ایک جگہ فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (الدھر:۲) ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا پھر اسے سمیع و بصیر بنایا جس سے معلوم ہوا کہ انسان کی پیدائش ماں باپ کے نطفہ سے ہوتی ہے۔ کہ باپ کے نطفہ سے ہڈی اور ماں کے نطفے سے گوشت پوست پیدا ہوتا ہے ان میں مطابقت کیونکر ہو (آریہ) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ رب کی عادت اور ہے اور قدرت کچھ اور اس آیت میں قدرت کا ذکر ہے اور اس میں عادت کا۔ یعنی وہ تمہاری پیدائش میں مٹی وغیرہ کا محتاج نہیں ہر طرح بنا سکتا ہے۔ مگر اس کا قانون یہ ہے کہ انسان کو مٹی سے' جن کو آگ سے پیدا فرماتا ہے دوسرا یہ کہ مرکبات چار عناصر سے بنے۔ اور عناصر کن سے لہٰذا سب کی انتہا کن پر ہے۔ اور سب کن سے بنے۔ جیسے آدمی منی سے اور منی غذا سے اور غذا گھاس پھوس سے اور وہ مٹی سے۔ تو کہا جاتا ہے کہ آدمی مٹی سے بنایا وہ خاک کا پتلہ ہے کیونکہ انتہا خاک پر ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ وہ کُنْ سے پیدا فرماتا ہے دوسری آیت میں ارشاد ہوا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ (اعراف: ۵۴) چھ دن میں عالم بنایا گیا۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو۔ (آریہ) **جواب:** یہاں طریقہ پیدائش کا ذکر ہے۔ اور وہاں مدت پیدائش یعنی چھ دن میں عالم پیدا کیا گیا مگر کن سے آج کن سے پہلا آسمان کل کن سے دوسرا آسمان وغیرہ۔ **چوتھا اعتراض:** عیسیٰ علیہ السلام بغیر والد کے پیدا نہیں ہوئے بلکہ مریم یوسف نجار کے نکاح میں آئیں آپ ان کے بیٹے ہیں کیونکہ قرآن کریم نے انسان کا قانون یہ بتایا اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ (الدھر:۲) کہ وہ نطفہ سے ہے اور فرماتا ہے ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (سجدہ:۸) اور قانون قدرت کی مخالفت ناممکن ہے۔ نیز رب تعالیٰ فرماتا ہے اَلَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (تحریم:۱۲) مریم جس نے اپنی شرمگاہ محصن کر لی اور عربی میں محصن شادی شدہ کو کہتے ہیں۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ محصن زانی کو رجم کرو یعنی شادی شدہ کو نیز متی رسول انجیل آیت ۲۵ و ۲۴ میں ہے کہ پس یوسف اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا اور اس کو نہ جانا جب تک وہ بیٹا نہ جنی دیکھو اس میں مریم کو یوسف کی بیوی کہا گیا۔ غرضیکہ قرآن و انجیل سے ان کا انسان کی اولاد ہونا معلوم ہوتا ہے (مرزائی) **نوٹ:** یہ مرزائیوں کا انتہائی اعتراض ہے اور جس عمدگی سے ہم نے بیان کر دیا۔ انشاء اللہ ان سے بھی اس طرح بیان نہ ہو سکے گا۔ **جواب:** قرآن کریم نے عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ ہونے کی بے شمار گواہیاں دیں (۱) انہیں آدم علیہ السلام سے مشابہت دی۔ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ (آل

عمران: ۵۹) (۲) انہیں عیسیٰ ابن مریم کہا گیا حالانکہ قرآن کریم نے سوا مریم کے کسی عورت کا نام نہ لیا۔ اگر وہ کسی مرد کے فرزند ہوتے تو اس کی طرف ہی نسبت کی جاتی۔ (۳) یہود نے حضرت مریم کو تہمت زنا لگائی تو عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں قوت گویائی دے کر ان سے ماں کی عصمت بیان کرائی۔ اگر مریم شادی شدہ تھیں تو یہود تہمت کیوں لگاتے اور اس تہمت کے لئے اتنا بڑا واقعہ کیوں ہوتا۔ صرف یوسف کہہ دیتے کہ یہ میرا بچہ ہے (۴) عیسیٰ علیہ السلام کا لقب روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہوا کیونکہ وہ کلمہ کن سے پیدا ہوئے (۵) قرآن کریم نے ان کی ماں کا یہ قول بار بار نقل فرمایا وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ مجھے مرد نے چھوا بھی نہیں اگر نکاح ہو چکا تھا تو اس کہنے کے کیا معنی۔ (۶) حضرت مریم جنگل میں جا کر وضع حمل سے فارغ ہوئیں اگر یوسف کی بیوی ہوتیں تو اس قدر مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی وغیرہ وغیرہ رہے تمہارے اعتراضات وہ لغو ہیں کہ معجزہ تو کہتے ہی اسے ہیں جو قانون قدرت کے خلاف ہو اور عجیب ہو۔ پتھروں کا کلام کرنا۔ انگلیوں سے پانی بہنا وغیرہ عصا موسیٰ کا سانپ بن جانا خلاف عادت الٰہیہ ہی تو ہیں دیکھو آدم علیہ السلام اس قانون کے خلاف ہی پیدا ہوئے۔ رہا احصنت فرمانا جناب احصنت احصان سے بنا بمعنی حفاظت اسی سے حصن بمعنی قلعہ ہے اور حصین بمعنی مضبوط ہر پاک دامن پر یہ لفظ بولا جاتا ہے شادی شدہ کو بھی حصن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ پاک دامن ہو جاتا ہے پوری آیت یوں ہے وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (انبیاء: ۹۱) وہ مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی (یعنی پاک دامن رہیں) پس ہم نے ان میں اپنی روح پھونکی۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں تو چاہیے کہ یہ عبارت ہر حلالی انسان پر صادق آ جاتی۔ حضرت مریم کی خصوصیت نہ ہوتی۔ انجیل محرف کتاب ہے اس حوالے سے پیش کرنا حماقت ہی ہے نیز عیسائیوں کا بھی یہ عقیدہ ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ ہوئی۔ بعد میں مریم کا یوسف نجار سے نکاح ہوا۔

لطیفہ: مرزائیوں کو ان تمام تحریفوں کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ان کے ولایتی نبی اور بناسپتی رسول مرزا قادیانی کو مثیل مسیح بننے کا شوق ہوا۔ مگر ان میں عیسیٰ علیہ السلام کے صفات ندارد تھے اس لئے انہوں نے اس جناب کی صفات کا انکار شروع کر دیا اگر مرزا جی مثیل مسیح ہوتے یا مسیح موعود ہوتے تو عیسیٰ علیہ السلام کی صفات ان میں ہوتیں عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ پیدا ہوئے عیسیٰ علیہ السلام نے لڑکپن میں کلام کیا آپ مردوں کو زندہ پیدائشی اندھوں کو بینا کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے گھروں میں چھپ کر کھانے والوں کو ان کے کھائے ہوئے بچائے ہوئے کھانوں کی خبر دے دیتے تھے بتاؤ مرزا جی میں یہ کونسی صفت ہے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں دوبارہ آ کر دجال کو قتل کریں گے۔ دمشق میں آسمان سے اتریں گے شرک وکفر کو دنیا سے مٹائیں گے تمام عالم میں اسلام پھیلائیں گے بتاؤ مرزا جی میں یہ کونسا وصف ہے۔ مرزا اور مرزائیوں کے پاس سوا باتوں کے اور کیا تھا اور کیا ہے۔ مثل ہونا کام سے ہوتا ہے نہ کہ محض کلام سے اگلی آیتوں میں انشاء اللہ ان کی تحریفوں کی اور بھی پرزور تردید کی جائے گی۔ افسوس ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کیلئے قانون کا بہانہ کرتے ہیں مگر آدم وحوا علیہما السلام کو بلا چون وچرا بغیر ماں باپ پیدا مانتے ہیں۔ دن رات جانور بغیر ماں باپ پیدا ہوتے رہتے ہیں حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ مِنَ الْمَاءِ (انبیاء: ۳۰) ہم نے ہر زندہ کو پانی سے بنایا وہاں پانی کا نام بھی نہیں سمندل کیڑا آگ میں پیدا ہو کر آگ ہی میں رہتا ہے وہاں پانی نہیں۔ پانچواں اعتراض: عیسیٰ علیہ السلام کے چار بھائی تھے یوسف، شمعون، یہودا

یعقوب اور تین بہنیں تھیں (انجیل متی رسول) اور بھائی بہن یا حقیقی ہوتے ہیں یا سوتیلے یا ماں شریکے جیسے بھی ہوں حضرت مریم کا یوسف کے ساتھ نکاح ثابت ہوا انجیل وتواریخ کی کتب اس پر شاہد ہیں۔ (مرزائی) **جواب:** یہ بالکل بے اصل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کا کہیں ثبوت نہیں خلاف قرآن وتواریخ کا اعتبار ہے نہ انجیل کا اور درست بھی ہوں تو تب بھی ہم جنس پیشہ برادری والے اور قرابت داروں کو بھائی ہی کہہ دیا کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں یحییٰ علیہ السلام کو عیسیٰ علیہ السلام کا خالہ زاد بھائی فرمایا گیا حالانکہ وہ آپ کے ماموں تھے حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی۔ رب تعالیٰ نے حضرت مریم کو اخت ہارون فرمایا حالانکہ حنہ کے کوئی بیٹا پیدا ہی نہ ہوا۔ صرف مریم ہی پیدا ہوئیں جو توجیہ اس اخت ہارون وغیرہ میں کی جائیگی وہ ہی یہاں کرنا ضروری ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جب مریم نفس نے عیسیٰ قلب کی بشارت سنی تو تعجب سے عرض کیا کہ مولیٰ مجھے ابھی بشیر یعنی شیخ کامل کی نظر نے مس بھی نہیں کیا۔ مجھ سے ایسا صاف ستھرا فرزند کیونکر ہوگا جو قلب بغیر مرشد یہ سفر طے کرے وہ گمراہ ہو جاتا ہے جو درخت پھل نہیں دیتا پھر یہ خود رو قلب کیسے کامیاب ہوگا جواب ملا کہ اے نفس اسی طرح جسے رب تعالیٰ چاہے جذب وکشف کے ذریعہ اپنے تک پہنچائے سلوک میں رہبر کی ضرورت ہے۔ مگر جذب سب سے بے نیاز۔ کیونکہ سالک مرید ہے۔ اور مجذوب مراد۔ اکثر محبوبین اور بعض محبین کا یہ ہی حال ہوا۔ رب تعالیٰ اس عیسیٰ قلب کو تعلیم ربانی سے علوم معقولہ کی کتاب اور احکام مشروعہ اور ظاہری توریت وباطنی انجیل سکھائے گا۔ اور وہ قلب یعقوب روح کی اولاد یعنی روحانین کی طرف رب تعالیٰ کا قاصد ہوگا۔ کہ ان سب کی اصلاح کرے گا۔

خلاصہ: یہ کہ قلب عارف کی مختلف نوعیات ہیں سالک مرید ہے وہ بغیر رہبر اس راہ کو طے نہیں کر سکتا مگر مجذوب مراد کہ عشق اس کا رہبر ہے جیسا کہ بعض لوگ دنیاوی نعمتیں بغیر واسطہ پا لیتے ہیں۔ ایسے ہی بعض خوش نصیب اخروی نعمتیں بے حاجت مرشد حاصل کر لیتے ہیں (ابن عربی وروح المعانی) کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے

رُبَّ شَخْصٍ تَقُوْدَهُ الْاَقْدَارُ   لِلْمَعَالِيْ وَمَا لِذَالِکَ اِخْتِيَارُ

غَافِلٍ وَالسَّعَادَةُ اِقْتَضَتْهُ   وَهُوَ مِنْهُ مُسْتَوْحِشٌ نَفَارُ

کیمیا گر بمرد ز غصہ و رنج   ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جانے اور بلائے جانے میں بڑا فرق ہے پھر اپنے پہنچنے اور ادھر سے کشش ہونے میں بڑا فرق ہے سواری واسباب سفر جانے کے لئے ضروری ہیں کشش کی صورت میں ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں انسان اوپر جاتا ہے سیڑھی وغیرہ سے مگر نیچے گرتا ہے۔ بغیر سیڑھی کے کہ یہ حرکت زمین کی کشش سے ہے۔ لوہا مقناطیس کی طرف بغیر سواری ہی کے دوڑا جاتا ہے۔ کیونکہ مقناطیس کی کشش ہے جب دنیاوی مادوں کی کشش کا یہ عالم ہے تو ربانی کشش کا کیا پوچھنا ہے۔

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ

تحقیق میں بیشک لایا تمہارے پاس نشانی طرف سے رب تمہارے کے تحقیق میں بناتا ہوں واسطے تمہارے
یہ فرماتا ہوا کہ میں تمہارے پاس ایک نشانی لایا ہوں تمہارے رب کی طرف سے کہ میں تمہارے لئے مٹی سے
كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
گارے سے مثل صورت پرندہ کی پس پھونکتا ہوں بیچ اس کے پس ہو جاتا ہے وہ پرندہ ساتھ حکم
پرندہ سی صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ فوراً پرندہ ہو جاتی ہے اللہ کے حکم سے
وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ
اللہ کے اور اچھا کرتا ہوں پیدائشی اندھے اور کوڑھے کو اور زندہ کرتا ہوں مردہ کو ساتھ حکم اللہ کے اور
اور میں شفا دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور سفید داغ والے کو اور میں مردے جلاتا ہوں اللہ کے حکم سے اور
اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
خبر دیتا ہوں میں تم کو اس کی جو کھاتے ہو تم اور جو جمع کرتے ہو تم بیچ گھروں اپنے کے تحقیق بیچ اس کے
تمہیں بتاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کر رکھتے ہو بے شک ان باتوں میں تمہارے لئے
لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ﴿۴۹﴾
البتہ نشانی ہے واسطے تمہارے اگر ہو تم ایمان والے
بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسٰی علیہ السلام کی پیغمبری کا ذکر تھا۔ اب ان کے پیغام کا ذکر ہے۔ کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو پہلا پیغام کیا دیا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسٰی علیہ السلام کی رسالت کا ذکر تھا۔ اب ان کے معجزات بتائے جا رہے ہیں جو نبوت کی دلیل ہیں۔ گویا پہلے دعویٰ تھا اب دلیل کا ذکر ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسٰی علیہ السلام کے تقرب اور ان کے مقبول بارگاہ ہونے کا ذکر تھا۔ اب ان کے خصوصی اختیارات کا ذکر ہے۔ جو انہیں رب تعالیٰ کی طرف سے ملے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے عیسٰی علیہ السلام کے علم کتاب وحکمت وغیرہ کا ذکر فرمایا تھا اب فرمایا جا رہا ہے کہ لوگو تم یہ نہ سمجھنا کہ مولویوں کی طرح انہیں صرف شرعی مسئلے ہی معلوم تھے نہیں بلکہ انہیں قدرتیں اور غیبی علوم بھی بخشے گئے جن کے باعث وہ تمام انسانوں سے ممتاز شان کے مالک تھے غرضیکہ آپ کے دینی علوم ومعرفت کا ذکر پچھلی آیت میں تھا۔ اور آپ کی قدرتوں عطائی علم غیب کا ذکر اس آیت میں ہے۔

تفسیر

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ درحقیقت یہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت بلکہ معجزہ ہی ہے۔ آپ فرمارہے ہیں کہ تم سب دنیا میں پیدا ہوئے ہو مگر میں پیدا بھی ہوا ہوں اور تمہارے پاس بھی آیا ہوں تمہاری پیدائش خود اپنے لئے ہے اور میری تشریف آوری تمہارے نفع کے لئے۔ تم دنیا میں آنے سے پہلے کچھ نہ تھے۔ میں سب کچھ تھا میرا یہاں آنا ایسا ہے جیسے حاکم تبدیل ہو کر کہیں آتا ہے۔ یہ جملہ یا رسول کا مفعول ہے۔ کیونکہ اس کے معنی تھے پیغام پہنچانے والا تو مطلب یہ ہوا کہ یہ پیغام لے کر بھیجا کہ میں بناتا ہوں الخ یا ناطقاً پوشیدہ کا مفعول اور و۔ رسول کی صفت یا رسول کا بدل پوشیدہ مبتدا کی خبر ہے غرضیکہ یا منصوب ہے یا مرفوع۔ اس میں تو علماء کا اختلاف تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت کب ملی بچپن میں ماں کی گود میں یا ہوش سنبھال کر یا جوانی میں مگر اس پر سب متفق ہیں کہ آپ کا یہ اعلان جوانی میں ہے کیونکہ یہ اعلان تبلیغی ہے اور بہت دفعہ تبلیغ عطائے نبوت کے عرصہ بعد شروع ہوتی ہے۔ دیکھو ہمارے رسول ﷺ کو عطاء نبوت تو اس وقت ہوئی جبکہ سورۂ علق کی پہلی آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ نازل ہوئی۔ مگر آپ نے تبلیغ جب شروع کی جبکہ یہ آیت کریمہ اتری وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (شعراء: ۲۱۴) اس کے درمیان کئی روز کا فاصلہ ہے۔ چونکہ اس حکم کے منکر بہت تھے۔ اس لیے آپ نے یہ کلام ان سے شروع فرمایا جئتکم میں ان بنی اسرائیل سے خطاب ہے جو اس وقت وہاں حاضر تھے آیت بمعنی نشانی ہے۔ اگرچہ یہاں چار معجزات کا ذکر ہے۔ مگر چونکہ ان سب کا منشاء ایک ہی تھا۔ یعنی آپ کی نبوت کا ثبوت۔ اس لئے ان سب کو آیت فرمایا گیا یعنی ایک نشانی اس کی تنوین تعظیمی ہے۔ بعض قراتوں میں بآیات بھی ہے۔ مِنْ رَّبِّكُمْ یا جئت کے متعلق ہے۔ یا ثابت پوشیدہ کے اور وہ آیت کی صفت دونوں صورتوں میں من ابتدائیہ ہے۔ چونکہ نبی کا بھیجنا حق تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی روحانی پرورش ہے۔ اس لئے رب فرمایا یعنی حق تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے بھیجے گا کہ اے اسرائیلیو! میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی نشانی لے کر آیا ہوں یا میں تمہارے رب کی طرف تمہارے پاس نشانی لایا ہوں وہ یہ کہ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْئَةِ الطَّیْرِ یہ کلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی تبلیغ ہے جس میں آپ نے توحید، قیامت، جنت، دوزخ، فرشتوں، حساب کتاب کی تبلیغ نہیں فرمائی کیونکہ اعتقادات میں نبی کی معرفت سب پر مقدم ہے۔ نبی کے آئینہ میں توحید کا جمال دیکھنا ضروری ہے۔ آئینہ پہلے سامنے آتا ہے جمال بعد میں جس نے نبی کو مان لیا اس نے سب کچھ مان لیا۔ دیکھو جب لوگوں نے آپ کی والدہ ماجدہ پر تہمت لگائی تو آپ نے بجائے اپنی ماں کی پاکدامنی بیان کرنے کے اپنے فضائل بیان کرنے شروع کر دیئے۔ کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ مقصد یہ تھا کہ میری عظمت پہچانو اور میری ماں کی پاکدامنی و عظمت تمہیں خود معلوم ہو جائے گی کہ ایسا موتی کیسی شاندار سیپ میں رکھنے کے لائق غرضکہ سارے اعتقادات جمع کے اعداد ہیں اور نبوت جمع کا حاصل کہ اس میں سارے اعداد جمع موجود ہیں یہ جملہ یا تو انی قد جئتکم کا بدل ہے یا آیت کا یا پوشیدہ مبتدا کی خبر۔ اَخْلُقُ خلق سے بنا خلق کے چند معنی ہیں ہستی بخشنا خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ اندازہ لگانا جیسے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (مومنون: ۱۴) گھڑنا اور بنانا جیسے وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (عنکبوت: ۱۷) تم جھوٹ گھڑتے ہو یا جیسے اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص: ۷) جھوٹے کو اسی لئے خالق کہتے ہیں کہ وہ کلام کو گھڑتا اور بناتا ہے برابر کرنا کہا جاتا ہے خَلَقَ النَّعْلَ بِالنَّعْلِ جوتے کو

جوتے کے برابر کر دیا اسی لئے برابر حصہ کو خلاق کہتے ہیں۔ مَالَهُ فِي الْأٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (بقرہ: ۱۰۲) لائق اور مستحق کو خلیق کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے فلاں خلیق بکذا۔ فلاں اس کام کے لائق ہے چکنے پتھر کو صخرۃ خلقاً غرضکہ اس کے بہت سے معنی ہیں شاعر کہتا ہے

وَلَانْتَ تَفْرِیْ مَا خَلَقْتُ وَبَعْضُ الْقَوْمِ یَخْلُقُ ثُمَّ لَا یَفْرِیْ

دوسرا کہتا ہے

وَلَا یُعْطِیْ بِاَیْدِی الْخَلِقِیْنَ وَلَا اَیْدِی الْخَوَالِقِ اِلَّا جَیِّدًا لِاٰدِمٖ

یہاں بمعنی بنانا یا گھڑنا ہے (تفسیر کبیر و معانی) لکم میں لام نفع کا ہے۔ من الطین اخلق کے متعلق ہے کھیئۃ کا کاف اسمیہ ہے۔ اخلق کا مفعول بہ یا حرف ہے۔ تشبیہ کے لئے ثابت کے متعلق ہو کر صورتاً پوشیدہ کی صفت ہیئت باب تفعیل کا اسم مصدر ہے۔ بمعنی اسم مفعول اس کے لفظی معنی ہیں تیاری اس سے تھیئو ہے کہا جاتا ہے تَهَیَّأَ لاکل کھانے کی تیاری کی رب تعالیٰ فرماتا ہے وَهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا (الکھف: ۱۰) نیز فرماتا ہے وَیُهَیِّئْ لَكُمْ مِنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا (کہف: ۱۶) مگر اصطلاح میں بمعنی مشکل صورت آتا ہے۔ یہاں یہ ہی مراد ہے طیر طائیر کی جمع ہے۔ بمعنی اڑنے والا اس کا مصدر طیران ہے۔ اس کی جمع طیور ہے قرآن کریم میں عمل اور تقدیر کو طائر کہا گیا فرماتا ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ (اسراء: ۱۳) نیز ہر حرکت کرنے والی چیز کو بھی طائر کہہ دیتے ہیں حدیث شریف میں خواب کے بارے میں کہا گیا وَهِیَ عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ یہاں طیر حقیقی معنی میں ہے بمعنی چڑیا اور اس سے جنس مراد۔ جو اسے بلا وجہ مجازی معنی میں لے وہ گمراہ ہے کہ ایک پیغمبر کے معجزہ کا منکر ہے۔ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ انفخ نفخ سے بنا بمعنی پھونکنا ہر پھونکنے کو نفخ کہا جاتا ہے۔ خواہ منہ سے پھونکتا ہو یا کسی آلہ سے یا روح پھونکنا جیسے وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (صٓ: ۷۲) اور جیسے وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ (یٰسین: ۵۱) بگل میں پھونکا گیا اور جیسے قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا (کہف: ۹۶) یہاں دھونکنی سے آگ پھونکنا مراد ہے۔ شیطان کے دم کرنے کو بھی نفخ کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ نَفْخِهٖ فیه کا مرجع ھیئت ہے۔ یا کاف اسمیہ اُذن سے مراد ارادہ یا رب تعالیٰ کا حکم ہے۔ یعنی اے لوگو میں تمہیں سمجھانے کے لئے تمہارے سامنے گارے سے چڑیا کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے سچ مچ پرندہ بن جاتا ہے جسے تم اڑتے ہوئے دیکھتے ہو بظاہر یہ ایک معجزہ ہے۔ مگر در حقیقت بہت سے معجزوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ پرندے میں پر، چونچ، پنجے، کھال، خون، گوشت، دل، کلیجی، پھیپھڑا غرضیکہ ان گنت چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک مٹی سے ان سب چیزوں کا بن جانا اس میں روح پڑ جانا بہت سے معجزات ہوئے۔ جیسے ہمارے نبی کریم ﷺ کی برکت سے حضرت طلحہ و جابر کے گھر گوشت و آٹے میں ایسی برکت ہوئی چار سیر آٹے کی روٹیاں اور تھوڑا گوشت تقریباً دو ہزار آدمیوں نے کھالیا اور ویسا ہی رہا۔ شوربے میں نمک، مرچ، گھی، مصالحے پھر جلنے والی لکڑی پکانے والی کے ہاتھ میں طاقت یہ سب چیزیں ہی عالم غیب سے آ گئیں۔ پھر یہاں طیر سے مراد جنس پرندہ ہے۔ جس پرندہ کی فرمائش کرو مجھ سے بنوالو۔ ایک ہی مٹی ابھی چمگادڑ ابھی اس مٹی کا بقیہ کوا، چیل، کبوتر بنا سکتا ہوں۔ میرا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ یہ جملہ اخلق پر معطوف ہے۔ اُبرئ ابرا سے بنا جس کا مادہ برآء

ہے بمعنی دور کرنا اس سے براءۃ ہے بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (التوبہ:۱) شفاء کو براءت اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں مرض دور ہو جاتا ہے۔ یہاں بمعنی شفا اور تندرستی ہے اَكْمَهَ كمهٌ سے بنا ہے۔ اس کے چند معنی ہیں المسوح العين کہ جس کی آنکھ کی جگہ چری ہوئی نہ ہو۔ اس امت میں ایسا آدمی سوا قتادہ بن دعامہ سدوسی مفسر کے کوئی نہ گذرا۔ (۲) رتوندوالا یعنی جسے رات میں نہ سوجھے۔ مادرزاد اندھا۔ عطا نے پہلے معنے مراد لئے۔ مجاہد نے دوسرے عبداللہ ابن عباس نے تیسرے رضی اللہ تعالیٰ عنہ ممسوح العین کو شفا دینے میں بہت سے معجزے ہیں۔ بغیر اپریشن شگاف دے دینا' پلک پوٹے' سفیدہ' پتلی' تل' مجمع النور بنا دینا آنکھ کے سات پردے پیدا فرما دینا پھر آنکھ میں نور پیدا کر دینا۔ یہ سب معجزات ہی ہیں غرضیکہ مٹی سے پرندہ بنانے کی طرح یہ بھی بہت سے معجزات کا مجموعہ ہے۔ اَبْرَصَ بَرَصٌ سے بنا بمعنی سفید دھبہ یہ بھی کوڑھ کی ایک قسم ہے یہاں ابرص سے وہ مراد ہے جس کے سوئی چبھونے سے خون نہ نکلے چونکہ طبیبوں کے نزدیک یہ دونوں بیماریاں لاعلاج ہیں اسی لئے آپ نے ان کا ذکر فرمایا ورنہ آپ بیماریوں کو بھی شفا بخشتے تھے۔ (روح المعانی) یعنی میں پیدائشی اندھے' اور داغی کوڑھی کو ایک دم میں شفا دیتا ہوں تیسرا یہ کہ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ یہ جملہ اُبْرِئُ پر معطوف ہے۔ اور اُحْيِ اَحْيَاءٌ سے بنا۔ بمعنی حیات بخشنا زندہ کرنا' مَوْتٰى میت کی جمع ہے خلاف قیاس بِاِذْنِ اللّٰهِ اُحْيِ کے متعلق ہے یعنی میں اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں اس معجزہ میں عالم اجسام و عالم امر پر قبضہ کا ثبوت ہوتا ہے۔ کیونکہ روح جسم میں رہ کر بھی کسی کے قبضے میں نہیں ہوتی۔ نہ بادشاہ کے نہ وزیر کے نہ امیر کے تو جسم سے نکلتے۔ عالم امر میں پہنچنے کے بعد کسی کے قبضہ میں کیسے آسکتی ہے یوں ہی اجزا جسم جب مٹی بن کر اس کے ذرے بحر و بر مشرق و مغرب میں بکھر گئے وہ کسی کے حکم سے جمع نہیں ہو سکتے مگر میرا تصرف یہ ہے کہ ایک قم باذن اللہ فرماتا ہوں تو تمام بکھرے ہوئے ذرے میری اطاعت کر کے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اس عالم میں میری حکومت ہوئی۔ اور ادھر عالم امر سے وہ گئی ہوئی روح لوٹ کر جسم میں داخل ہو جاتی ہے یہ عالم امر میں میری حکومت ہے۔ چنانچہ آپ نے چار مردے زندہ کئے جس کا ذکر انشاء اللہ خلاصۂ تفسیر میں آئے گا چوتھا یہ کہ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ۔ یہ جملہ اُحْيِ الْمَوْتٰى پر معطوف ہے اور اُنَبِّئُ نباءٌ سے بنا عظیم الشان خبر مَا موصولہ ہے اور اس سے مراد عام کھانے ہیں۔ غذا ہوں یا میوے۔ تَدَّخِرُوْنَ ذخر سے بنا باب افتعال کا مضارع ہے اصل میں تَذْتَخِرُوْنَ تھا ت اور ذال کو دال سے بدل کر ادغام کیا گیا۔ اس کا مصدر اذخار ہے۔ بمعنی ذخیرہ کرنا' ڈھیر لگانا اور جمع کرنا یعنی میں تمہیں خبر دیتا ہوں ان تمام کھانوں کی جو تم سے پوشیدہ اپنے گھروں میں کھاتے ہو۔ اور جو اپنے بچوں کے لئے بچا کر رکھتے ہو۔ جس سے پتہ لگے کہ مجھے رب تعالیٰ نے علم غیب بھی دیا۔ اگر تَاْكُلُوْنَ اور تَدَّخِرُوْنَ بمعنی حال ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ میری نگاہ کے لئے دور نزدیک کھلی چھپی پس پردہ چیزیں یکساں ہیں تم کسی دور سے دور مقام پر ہو رات کی اندھیریوں میں کوٹھڑیوں کے اندر کچھ کھاؤ بچاؤ مجھے سب کی خبر ہے میری سب پر نظر ہے جیسے جنت کی حور کو دنیا کی کوٹھڑی کی زوجین کی لڑائی کی خبر ہے۔ یا ہمارے حضور ﷺ نے حضرت عباس کی کوٹھڑی والے درہم دیکھ لئے جو انہوں نے بدر جاتے وقت اپنی زوجہ کو دیئے تھے۔ اور اگر بمعنی مستقبل ہو تو مطلب یہ ہے کہ ہر دانہ کو جانتا ہوں اس کے کھانے والے اور وقت کھانے کو جانتا ہوں اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ یہ مستقل جملہ ہے اور ذٰلِكَ سے چاروں مذکورہ معجزوں کی طرف اشارہ ہے۔ آیت سے مراد جنس نشانی

ہے۔یعنی ان میرے معجزات میں تمہارے لئے میری نبوت پر کھلی ہوئی نشانی ہے۔اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ یہ علیحدہ جملہ ہے۔اس کی جزاء پوشیدہ ہے۔مومنین سے مراد ایمان کی توفیق والے ہیں یا ایمان کو قبول کرنے والے۔پہلی صورت میں اٰمَنُوْا پوشیدہ ہے اور دوسری صورت میں اِطْمَئِنُّوْا یعنی اگر تمہیں رب نے ایمان کی توفیق دی ہے تو مجھ پر ایمان لے آؤ یا اگر تم ایمان لا چکے ہو تو ان معجزات کو دیکھ کر اور زیادہ مطمئن ہو جاؤ۔

خلاصہ تفسیر

اے مریم تمہارے فرزند عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرئیل کے رسول ہوں گے اور انہیں یہ تبلیغ کریں گے کہ اے اسرائیلیو میں سچا نبی ہوں رب کی طرف سے میری صداقت پر کھلی نشانی میرے پاس موجود ہے۔وہ یہ کہ میں تمہارے سامنے گارے سے چڑیا کی شکل بناتا ہوں علیحدگی یا اکیلے میں نہیں بناتا تاکہ تمہیں کچھ شک وشبہ ہو یا یہ تمام تمہارے نفع کے لئے ہے تاکہ تم کو اس معجزے کے ذریعہ ایمان میسر ہو محض کھیل تماشہ کے لئے نہیں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ پرندہ بن جاتی ہے یہ معجزہ میری نبوت کی دلیل ہے یہ دیکھ کر تم مجھے خدا نہ کہنا کیونکہ یہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم سے ہے نیز مجھے رب تعالیٰ نے یہ معجزہ دیا کہ میں مادر زاد اندھے اور کوڑھوں کو پھونک مار کر شفا بخشتا ہوں جن کے علاج سے طبیب عاجز ہیں اور اس کے علاوہ مردے کو دم کر کے باذن اللہ زندہ کرتا ہوں جو کہ طبیبوں کے نزدیک ناممکن بات ہے میری قدرت کی تو یہ کیفیت ہے اور میرے علم کا یہ حال ہے کہ جو کچھ تم میری غیر موجودگی میں اپنی کوٹھڑیوں میں بیٹھ کر کھاتے اور بچاتے ہو اس کی میں تمہیں خبر دے سکتا ہوں کہ تم نے اتنا کھایا اور اتنا بچایا۔ان معجزات میں میری حقانیت کی کھلی ہوئی نشانی ہے اگر توفیق ہو تو مجھ پر ایمان لے آؤ خیال رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے یہ مراتب شکریہ کے طور پر بیان فرمائے نہ کہ فخر و تکبر کے لئے تاکہ لوگ آپ کے ان مراتب کو مان کر مومن عارف بنیں نبی کے مراتب جاننے ہی کا نام تو ایمان ہے لہٰذا آپ کا یہ فرمان عالی شکر بھی ہے اور تبلیغ بھی نیز آپ نے اس وقت اپنے عمومی صفات بیان نہ کئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں بندہ مجبور ہوں مجھے تو دیوار کے پیچھے کی بھی خبر نہیں بلکہ خصوصی صفات بیان فرمائے کیونکہ انبیاء کرام کے عمومی اوصاف بشریت وغیرہ ماننے کا نام ایمان نہیں یہ صفات تو شیطان و ابوجہل بھی مانتا تھا ایمان اس کا نام ہے کہ حضرات انبیاء کے خصوصی صفات مانے جائیں اس لئے کلمہ طیبہ میں محمد رسول اللہ ﷺ پڑھا جاتا ہے محمد بشر مثلاً نہیں کہا جاتا۔

واقعات: روایات میں ان واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ نے یہ دعوے کئے تو لوگوں کے کہا کہ اچھا ہمیں مٹی سے چمگادڑ بنا کے دکھاؤ اس انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ چمگادڑ میں چند خصوصیتیں ہیں۔جو دوسرے پرندوں میں نہیں ہوتیں (۱) اس میں ہڈی نہیں ہوتی صرف گوشت اور خون ہے (۲) اس کے پر نہیں ہوتے یہ گوشت سے اڑتی ہے (۳) یہ انڈے نہیں دیتی بلکہ بچے دیتی ہے حالانکہ چڑیاں انڈے ہی دیا کرتی ہیں (۴) اس کی چھاتی پر پستان ہوتے ہیں جس سے اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے (۵) اس کی چونچ نہیں بلکہ منہ ہوتا ہے (۶) اس کے منہ میں دانت بھی ہوتے ہیں جس سے وہ چباتی ہے اور ہنستی بھی ہے (۷) اسے حیض بھی آتا ہے (۸) یہ دن کی روشنی میں نہیں دیکھ سکتی (۹) بلکہ رات کے اندھیرے میں بھی اس کی آنکھیں بے کار ہوتی ہیں صرف طلوع سے ایک گھنٹہ پہلے اور غروب کے ایک گھنٹہ بعد تک دیکھ سکتی ہے (روح المعانی و خازن و خزائن

وغیرہ) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے صرف چمگادڑ ہی بنایا۔ حضرت وھب فرماتے ہیں کہ آپ کے بنائے ہوئے چمگادڑ لوگوں کے سامنے اڑتے رہتے تھے اور ان کی نگاہ سے غائب ہوتے ہی مر کے گر جاتے تھے بعض نے فرمایا کہ آپ نے کئی قسم کے جانور بنائے (روح المعانی وغیرہ) مگر حق یہ ہے کہ وہ جانور زندہ رہتے تھے کیونکہ آپ نعوذ باللہ نہ تو جادوگروں کی طرح نظر بندی کرتے تھے کہ وہ چیز مٹی ہی رہتی تھی مگر لوگوں کو پرندہ معلوم ہوتی تھی جیسے بازی گر مٹی کو روپیہ بنا کر دکھاتا ہے مگر وہ ہوتی مٹی ہی ہے اور نہ عارضی طور پر اسے پرندہ بناتے تھے بلکہ واقعی وہ پرندہ بن جاتی تھی کھاتی پیتی تھی زندہ رہتی تھی کیونکہ رب فرما رہا ہے فَيَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ کہ وہ مٹی پرندہ ہو جاتی ہے جب بعینہ وہ پرندہ ہو جاتی ہے تو پرندے کے تمام صفات بھی اس میں پیدا ہو جاتے ہیں جیسے عصا موسوی جب سانپ بن جاتا تھا تو اس میں سانپ کے تمام صفات بھی پائے جاتے۔ تھے حتیٰ کہ وہ کھاتا پیتا بھی تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ (اعراف: ۱۱۷) بغیر قرآنی ثبوت کے یہ قیدیں نہیں لگائی جاسکتیں طَيْرًا سے معلوم ہوا کہ آپ مٹی سے ہر قسم کا پرندہ بناتے'' اور اس میں روح ٹٹولنے پر قادر تھے کیونکہ طیرا نکرہ ہے اور بغیر کسی قید کے بیان ہوا ہے۔ حضرت وھب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے پاس ایک ایک دن میں پچاس پچاس ہزار مریض جمع ہو جاتے تھے جنہیں آپ دم کر کے اچھا کر دیتے تھے جو چل سکتا تھا وہ خود حاضر ہو جاتا تھا اور جس میں چلنے کی طاقت نہ ہوتی اس کے پاس حضرت خود تشریف لے جاتے تھے اور ایمان لانے کی شرط پر انہیں اچھا کرتے تھے (خزائن و معانی وغیرہ) عیسیٰ علیہ السلام نے چار مردے زندہ کئے (۱) عاذر جو آپ کا دوست تھا (۲) ایک بڑھیا کا بیٹا تھا (۳) محرر چونگی کی بیٹی (۴) حضرت سام نوح علیہ السلام کے بیٹے جو ۴۶۰۰ برس پہلے وفات پا چکے تھے۔ حضرت سام کے سوا باقی تین بہت روز تک زندہ رہے۔ ان کی اولاد بھی ہوئی ان کے واقعات یہ ہیں کہ عاذر آپ کا دوست تھا جب وہ بیمار ہوا تو اس کی بہن نے آپ کو خبر بھیجی کہ تمہارے دوست قریب موت کے ہیں مگر وہ آپ سے تین دن کی مسافت پر تھا جب آپ تین دن کے بعد وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اسے مرے ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ آپ نے ان کی بہن سے فرمایا کہ ہمیں اس کی قبر پر لے چل وہ لے گئی آپ نے رب تعالیٰ سے دعا کی کہ خدا کے حکم اور آپ کے فرمانے سے زندہ ہو کر ایک مدت تک جیتا رہا۔ اور اس کے اولاد بھی ہوئی بڑھیا کے بیٹے کا یہ واقعہ ہے کہ اس کا جنازہ جا رہا تھا بڑھیا بے قرار ہو کر رو رہی تھی آپ کو رحم آیا اور رب تعالیٰ سے دعا کی وہ اپنے تختہ پر ہی اٹھ کر بیٹھ گیا اور اٹھانے والوں کی گردنوں سے اترا عرصہ تک زندہ رہا صاحب اولاد ہوا۔ محرر چونگی کی لڑکی کا واقعہ یہ ہے کہ یہ محرر حاکم کی طرف سے لوگوں سے ٹیکس لیا کرتا تھا اس کی بیٹی مر گئی ایک دن بعد آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ زندہ ہوئی۔ عرصہ تک زندہ رہی اور صاحب اولاد ہوئی۔ سام بن نوح علیہ السلام کا واقعہ یہ ہوا کہ بعض لوگوں نے شبہ کیا کہ شاید یہ مردے جو زندہ کئے گئے مرے نہ ہوں گے بلکہ انہیں سکتا ہو گیا ہو گا اس پر آپ ایک بہت پرانی قبر پر تشریف لے گئے رب تعالیٰ نے آپ کی دعا سے حضرت سام کو زندہ کیا۔ حالانکہ انہیں وفات پائے ہوئے چار ہزار چھ سو سال ہو چکے تھے جب آپ نے ان کے لئے دعا کی تو انہوں نے اپنی قبر میں سنا کہ کوئی کہنے والا کہتا ہے کہ اجب روح اللہ یعنی روح اللہ عیسیٰ علیہ السلام کا حکم مانو۔ یہ سنتے ہی وہ خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور سمجھے کہ قیامت آگئی اس دہشت سے ان کا آدھا سر سفید ہو گیا۔ حالانکہ نوح علیہ السلام کے زمانے میں لوگ بڈھے نہیں ہوا کرتے

تھے (روح المعانی) اٹھ کر پوچھنے لگے کہ کیا قیامت آ گئی عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ نہیں بلکہ میں نے تمہیں اسم اعظم سے زندہ کیا۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ مجھے پھر واپس بھیج دیا جائے اور اب سکرات کی شدت نہ ہو چنانچہ اسی وقت ان کا انتقال ہوگیا۔ (روح المعانی وخازن وخزائن) نیز آپ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ تم نے کل کیا کھایا ہے اور آج کیا کھاؤ گے اور اگلے وقت کے لئے تم نے کیا کھانا تیار کر رکھا ہے کیونکہ آپ کی نگاہ نزدیک دور کھلی چھپی اندھیرے اجالے پس پردہ وغیرہ تمام کو دیکھتی تھی۔ کوئی چیز آپ کے لئے حجاب نہ تھی اس واقعہ میں آپ کے چند معجزے ظاہر ہوتے ہیں نزدیک دور سے آپ کی آنکھ کا دیکھنا بیک وقت سب پر نظر کہ کون کیا کھا رہا ہے اور بچا رہا ہے پس پردہ اور اندھیرے میں نگاہ کا کام کرنا۔ دل کے ارادوں پر مطلع ہونا چنانچہ آپ کے پاس بچے بہت جمع رہتے۔ آپ انہیں بتاتے کہ تمہارے گھر فلاں چیز تیار ہوئی ہے اور تمہارے گھر والوں نے تمہارے لئے فلاں فلاں چیز اٹھا رکھی ہے۔ بچے گھر جاتے تو رو کر گھر والوں سے وہ چیز مانگتے وہ پوچھتے کہ تمہیں کس نے بتایا بچے کہتے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آخر ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ اگر ہمارے بچے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہے تو بگڑ جائیں گے اور ان پر ایمان لے آئیں گے چنانچہ ان سب نے ان بچوں کو ایک گھر میں بند کر دیا عیسیٰ علیہ السلام نے جب محسوس کیا کہ بچے نہ آئے تو آپ ان کی تلاش میں یہاں پہنچے اور لوگوں سے پوچھا کہ بچے کہاں گئے۔ تو لوگوں نے کہا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔ آپ نے فرمایا پھر اس گھر میں کون ہے انہوں نے کہا کہ اس میں ہمارے سور ہیں فرمایا اچھا سب سور ہو گئے۔ چنانچہ وہ سب سور بن گئے۔ (خزائن و روح المعانی ابن عساکر عن عبداللہ ابن عمرو ابن عاص) مگر عبدالرزاق نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ مسخ کا واقعہ خوان اترانے کے بعد ہوا جس کا قصہ سورۂ مائدہ میں آ رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دونوں دفعہ ہوا ہو نیز یا تو آپ یہی دونوں خبریں دیا کرتے تھے یا غیب کی ساری خبریں سناتے تھے مگر خصوصیت سے ان ہی دو کا ذکر کیا گیا کیونکہ انسان کو اکثر کھانے کا خیال رہتا ہے (روح المعانی)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حضرات انبیاء کرام باذن پروردگار دافع البلاء دافع وباء ہوتے ہیں دیکھو پیدائشی اندھا ہونا۔ یوں ہی کوڑھی ہونا عظیم بلا اور وباء ہے مگر عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں اسے دفع کرتا ہوں لہٰذا ان محبوبوں کو دَافِعُ الْبَلَاءِ وَالْوَبَاءِ وَالْقَحْطِ وَالْمَرَضِ وَالْاَلَمِ کہنا بالکل درست ہے۔ جب بارش کے قطرے دافع قحط ہوتے ہیں بعض جڑی بوٹیاں دافع جریان دافع بخار ہوتی ہیں ایک شربت کا نام فریاد رس ہے ایک دوا کا نام شافی ہے تو کیا حضرات انبیاء کرام کی برکات و فیوض ان جڑی بوٹیوں سے بھی کم ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ میری یہ قمیص لے جاؤ اسے میرے والد کی نابینا آنکھوں کی شفاء کے لئے ان کے چہرے پر ڈال دو ان کی آنکھیں اچھی ہو جائیں گی یہ ہے دَافِعُ الْبَلَاءِ وَالْوَبَاءِ کی جلوہ گری۔ **دوسرا فائدہ:** نبی کی شان پہچاننا ایمانیات میں سب سے مقدم ہے دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے لوگوں کو اپنی پہچان کرائی کہ مجھ میں یہ صفات ہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں کیونکہ جس نے نبی کو مانا اسے ان کے سارے فرمان ماننے پڑیں گے۔ ہمارے نبی ﷺ نے بھی سب سے پہلے لوگوں کو اپنی پہچان کروائی۔ کہ بتاؤ مجھے کیا سمجھتے ہو سب نے عرض کیا کہ ہم آپ کو سچا اور امین جانتے ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** انبیائے کرام رب تعالیٰ کے

بعض کاموں کو اپنی طرف نسبت دے سکتے ہیں کیونکہ وہ اس کے مظہر ہیں۔ دیکھو بیماروں کو شفا دینا۔ مردوں کو زندہ کرنا رب کا کام ہے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں شفا دیتا ہوں میں زندہ کرتا ہوں حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم سے کہا تھا لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا (مریم:۱۹) میں تمہیں ستھرا بیٹا دوں گا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ سب کو عزت دیتے ہیں اولاد دیتے ہیں جائز ہے کہ دینے والا رب تعالیٰ ہے مگر تقسیم فرمانے والے حضور ﷺ۔ کام کو قاسم کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اکثر معجزات انبیائے کرام کے قبضہ میں ہوتے ہیں کہ جب چاہیں دکھائیں جیسے موسیٰ علیہ السلام کے قبضے میں لاٹھی کو سانپ بنانا اور عیسیٰ علیہ السلام کے قبضہ میں بیماروں کو شفا دینا وغیرہ اور ہمارے حضور ﷺ کے قبضہ میں بہت سے معجزات۔ **پانچواں فائدہ:** اصل کا اثر فرع میں ہوتا ہے۔ دیکھو عیسیٰ علیہ السلام چونکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی پھونک سے پیدا ہوئے۔ اور حضرت جبرائیل علیہ السلام محض روح ہیں۔ اور ان کا لقب روح الامین ہے۔ ان کے گھوڑے کی سم کی خاک نے سامری کے بچھڑے کو زندہ کر دیا۔ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کی سانس میں بھی یہ ہی تاثیر ہوئی۔ (تفسیر کبیر) **چھٹا فائدہ:** انبیائے کرام کو معجزات زمانہ کے مطابق بھی عطا ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا زور تھا۔ تو انہیں عصاء اور ید بیضاء دیا گیا جس سے جادو شکست کھائے عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا زور تھا۔ آپ جالینوس کے ہم زمانہ تھے انہیں معجزہ اس قسم کا دیا گیا جس سے طب عاجز ہو جائے۔ ہمارے حضور ﷺ کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا شور تھا۔ لہٰذا آپ کو خصوصی معجزہ قرآن کریم دیا گیا۔ جس سے سارے فصحاء و بلغاء نے مات کھائی۔ اگر مرزا غلام احمد قادیانی نبی ہوتا تو اسے اس زمانہ کے مطابق معجزات دیئے جاتے۔ اب سائنس کا زور ہے اور ایجادات کا شور اس کا معجزہ اس قسم کا چاہیے تھا۔ **ساتواں فائدہ:** پیغمبروں کو علوم غیب دیئے جاتے ہیں دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے کھانے پینے کو جانتا ہوں یہ علم غیب تھا۔ **آٹھواں فائدہ:** دم درود جھاڑ پھونک کے ذریعے فیض دینا سنت ہے دیکھو عیسیٰ علیہ السلام دم کر کے مردے زندہ کرتے تھے حضرت جبریل علیہ السلام نے بی بی مریم کو بذریعہ دم کے ہی فرزند بخشا۔ اب بھی حضرات اولیاء اللہ بیماروں پر دم فرماتے ہیں حضرت اسرافیل صور میں پھونک کر ہی قیامت قائم کریں گے مردے جلائیں گے۔ **نواں فائدہ:** بزرگوں کی دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ عمریں بڑھ جاتی ہیں گئی ہوئی عمریں دوبارہ مل جاتی ہیں مشکلیں حل ہو جاتی ہیں نصیب کھل جاتے ہیں دیکھو عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اندھوں کوڑھوں کی مصیبتیں ٹل جاتی تھیں اور جو لوگ اپنی عمریں پوری کر کے مر چکے تھے انہیں دوبارہ نئی عمریں دے دی جاتی تھیں۔ **دسواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کو عالم اجسام اور عالم امکان بلکہ عالم امر کی حکومت دیتا ہے ان کے احکام باذن پروردگار ہر جگہ چلتے ہیں دیکھو عیسیٰ علیہ السلام کا حکم اس عالم میں بھی چلتا ہے کہ آپ کے فرمان پر مردے کے ذرے جمع ہو جاتے تھے اور عالم امر پر بھی کہ آپ کے حکم پر گئی روح لوٹ آتی تھی۔

عملیات: عیسیٰ علیہ السلام اس طرح مردہ زندہ فرماتے تھے کہ اولاً دو رکعت نماز پڑھتے پہلی رکعت میں سورۂ ملک دوسری میں سورۂ تنزیل السجدہ پڑھتے پھر خدا کی حمد و ثناء کے بعد عرض کرتے۔ یا قدیم' یا خفی' یا دائم' یا فرد' یا وتر' یا احد' یا صمد' یا حی' یا قیوم (روح المعانی عن بیہقی وقال لیس بقوی) اور اس میں دعا سے جذاموں کو اچھا فرماتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ اِلٰہُ مَنْ فِی

السَّمَآءِ وَاِلٰهُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا اِلٰهَ فِیْهِمَا غَیْرُکَ وَاَنْتَ جَبَّارُ مَنْ فِی السَّمَآءِ وَجَبَّارُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا جَبَّارَ فِیْهِمَا غَیْرُکَ وَاَنْتَ مَلِکُ مَنْ فِی السَّمَآءِ وَمَلِکُ مَنْ فِی الْاَرْضِ لَا مَلِکَ فِیْهِمَا غَیْرُکَ قُدْرَتُکَ فِی الْاَرْضِ کَقُدْرَتِکَ فِی السَّمَآءِ وَسُلْطٰنُکَ فِی الْاَرْضِ کَسُلْطٰنِکَ فِی السَّمَآءِ اَسْئَلُکَ بِاسْمِکَ الْکَرِیْمِ وَجْهِکَ الْمُنِیْرِ وَمُلْکِکَ الْقَدِیْمِ اِنَّ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وھب فرماتے ہیں کہ اگر یہ دعا مجنون اور پریشان حال پر پڑھ کر دم کی جائے اور اس کا تعویذ بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے نیز اسے گھول کر پلایا جائے تو انشاء اللہ بہت فائدہ ہوگا اگر کسی کو سانپ کاٹے اور وہ بغیر کچھ بولے ہوئے زخم پر ہاتھ رکھ کر یہ کہے یا محمد میرے سانپ نے کاٹا (ﷺ) تین دفعہ یہ عمل کرے اور ہر بار تین تین دفعہ یہ پڑھے انشاء اللہ تعالیٰ سانپ کا اثر نہ ہوگا نہایت مجرب ہے سبحان اللہ حضور ﷺ کے نام شریف میں نفخ مسیح کی تاثیر ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

چوں نام ایں است نام آور چہ باشد　　گرامی تر بود از ہر چہ باشد

جو کوئی آم کے موسم میں آم کے بور کو اپنے ہاتھ پر مل لے جس پر اس کی پہلی نگاہ پڑے تو سال بھر تک اس کے ہاتھ میں یہ تاثیر رہے گی کہ بچھو کے کاٹے پر یہ ہاتھ لگا دے تو آرام ہو جائے مگر شرط یہ ہے کہ پہلا دیکھا ہوا بور ملے جب آم کے بور میں یہ تاثیر ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کے سانس کی تاثیر کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے۔ خیال رہے کہ اس زندہ کرنے یا بیماروں کو شفا دینے کی یہ صورت نہ تھی کہ آپ صرف دعا کرتے تھے اور رب تعالیٰ زندگی یا شفا بخش دیتا تھا۔ بلکہ باذن پروردگار دعا کے ساتھ اپنا تصرف بھی کرتے تھے مردہ کو زندہ ہو جانے' بیمار کو اچھا ہو جانے کا حکم بھی دیتے تھے ورنہ اگر صرف دعا سے اللہ تعالیٰ زندگی یا شفا دیتا تو آپ احی اور اُبرِئُ متکلم کے صیغے نہ فرماتے کہ میں یہ کرتا ہوں اگر میری دعا سے بارش آ جائے تو میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے بارش برسائی ہے نیز اور انبیاء کرام کی دعا سے مردے زندہ ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ستر اسرائیلی زندہ ہوئے۔ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ (بقرہ:۵۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے چار پرندے حضرت عزیر علیہ السلام کی دعا سے ان کا گدھا حضرت حزقیل کی دعا سے داوردان والے ستر اسی ہزار مردے ہمارے حضور ﷺ کی دعا سے آپ کے والدین زندہ ہوئے انہوں نے نہ فرمایا کہ ہم مردے زندہ کرتے ہیں غرضیکہ ماننا پڑے گا کہ آپ اپنے اختیار خداداد سے یہ کام کرتے تھے۔

اعتراضات وجوابات

نوٹ: ان تمام معجزات کا مرزائیوں نے انکار کیا اور اس آیت میں یہودیانہ تحریفات کیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے گھریلو نبی اور خود ساختہ مثیل مسیح مرزا غلام احمد قادیانی میں کوئی کمال نہ تھا لہٰذا انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے ان تمام کمالات کا انکار کر دیا۔ ہم ان کے اعتراضات مع جوابات عرض کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ قبول فرمائے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: پیدا کرنا خدا کی صفت ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ (الرعد:۱۶) نیز فرماتا ہے

خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ (انعام:۱۰۱) نیز فرماتا ہے رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ (طٰہٰ:۵۰) ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ خالق صرف رب تعالیٰ ہی ہے۔ غیر خدا میں یہ صفت ماننا شرک ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ (الرعد:۱۶) نیز بتوں کے بارے میں فرماتا ہے لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ (النحل:۲۰) نیز فرماتا ہے اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ (النحل:۱۷) لہٰذا اگر عیسیٰ علیہ السلام مٹی میں پھونک کر پرندہ بناتے ہوں تو انہیں خدا ماننا پڑے گا مشرکین بتوں کو خالق مان کر مشرک ہوئے۔ اور مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو خالق مان کر مرتد۔ اس آیت کے معنی صرف یہ ہیں کہ میں تمہارے دلوں کو نور ایمانی سے منور کر دیتا ہوں جس سے وہ پرندہ بن کر راہ الٰہی طے کرتا ہے نہ کہ کوئی مٹی کا کھلونا حدیث شریف میں شہداء کے متعلق ہے۔ کہ شہیدوں کی روح سبز چڑیوں کے پیٹ میں رہ کر جنت کی سیر کرتی ہیں۔ اس کا بھی یہ ہی مطلب ہے (بیان القرآن مصنفہ محمد علی لاہوری) **جواب:** ہم نے تفسیر میں عرض کیا کہ خلق بمعنی پیدا کرنا ہستی بخشنا خدا کی صفت ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام یہ نہ کرتے تھے مگر خلق بمعنی بنانا' گھڑنا' صورت دینا' انسان کے لئے بھی بولا جا سکتا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا (عنکبوت:۱۷) اور فرماتا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (مومنون:۱۴) یہاں خالقین کو جمع فرمانا اسی لئے ہے کہ یہ خلق بمعنی پیدا کرنا نہیں ورنہ صریح شرک ہوگا بلکہ خدا بمعنی بنانا یا اندازہ لگانا ہے جیسے ان آیات میں وَتَخْلُقُوْنَ اور خٰلِقِیْنَ میں خلق بمعنی پیدا فرمانا نہیں ایسے ہی یہاں اخلق اسی معنی میں ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کھیئة الطیر هیئة یعنی شکل فرمانے سے پتہ لگا کہ یہ خلق بمعنی پیدائش نہیں بلکہ بمعنی صورت گری ہے۔ پیدائش اصل شئی کی ہوتی ہے نہ کہ صرف ہیئت کی ماں کے پیٹ میں فرشتہ ہی نطفے کو انسانی شکل دیتا ہے۔ ان پرندوں کو رب تعالیٰ ہی زندگی بخشتا تھا مگر عیسیٰ علیہ السلام کی برکت سے روحانی زندگی بخشنا عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں سارے پیغمبر بلکہ علماء و اولیاء یہ کرتے ہیں پھر عیسیٰ علیہ السلام کی مدح کے موقع پر خصوصیت سے اس کا ذکر کیوں ہوا۔ دوسرے پیغمبروں کے لئے کیوں نہیں ہوا۔ ماں کے پیٹ میں بچہ کو فرشتہ زندگی دیتا ہے۔ قیامت کے دن سب صور کی آواز سے زندہ ہوں گے۔ جب نفخ صور میں یہ تاثیر ہو سکتی ہے۔ تو نفخ مسیح کی تاثیر کا کیوں انکار کراتے ہو تمہاری یہ تحریف ان روایات کے خلاف ہے۔ جو ہم تفسیر میں عرض کر چکے لہٰذا یہ تحریف ہے بعض جانوروں کی پھونک سے انسان مر جاتا ہے جیسے سانپ' جب جانور کی سانس میں موت کی تاثیر ہے تو اگر نبی اللہ کی سانس میں زندگی کی تاثیر ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ **دوسرا اعتراض:** مر کر دنیا میں لوٹنا قانون قدرت کے خلاف ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ شہید شہادت کے بعد دنیا میں آنے کی تمنا کرتے ہیں مگر ان کی یہ تمنا پوری نہیں کی جاتی کیونکہ قانون قدرت کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی مردوں کو زندہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر وہ مردے اپنی عمر پوری کر کے مرے تھے تو انہیں دوبارہ عمر کیسے ملی۔ اور اگر ان کی عمر باقی تھی تو پہلے موت کیوں آ گئی۔ رب فرماتا ہے وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ (انبیاء:۹۵) جو بستی ہلاک ہو چکی پھر لوٹ کر نہیں آ سکتی نیز رب تعالیٰ فرماتا ہے قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا (مومنون:۱۰۰) یعنی کفار بعد موت تمنا کریں گے کہ ہمیں دنیا میں پھر لوٹایا جائے تا کہ ہم نیک اعمال کر لیں مگر ایسا نہیں ہو سکتا ان آیتوں نے مر کر جینے کا راستہ ہی بند کر دیا لہٰذا یہاں احی الموت کا مطلب یہ ہے کہ میں مردہ دلوں یعنی جہلا کو علم سے زندہ کرتا ہوں یعنی انہیں علم دیتا ہوں۔

رب تعالیٰ نے خشک زمین کہ میت اور بارش سے تر ہو جانے کو زندگی فرمایا ہے ایسے ہی یہاں ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا (انعام: ۱۲۲) نیز فرماتا ہے۔ وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (فاطر: ۲۲) ان آیتوں میں حیات سے مراد علم ہے۔ اور موت سے جہالت وہ ہی یہاں مراد ہے۔ (بیان القرآن محمد علی لاہوری)

جواب: اس کا بھی وہ جواب ہے جو پہلے گذر گیا۔ کہ یہ حیات ہر پیغمبر بلکہ اولیاء وعلماء بخشتے ہیں پھر اس کا ذکر خصوصیت سے عیسیٰ علیہ السلام کے لئے کیوں فرمایا گیا دیگر پیغمبروں کے لئے یہ معجزہ کیوں نہ ثابت ہوا۔ نیز معجزہ کہتے ہی اس کو ہیں۔ جو خلاف عادت الٰہیہ ہو عادی کام دن رات ہر شخص کرتا رہتا ہے تمہاری پیش کردہ آیتوں میں اس قانون کا ذکر ہے کہ ہلاک شدہ بستیوں کو زندہ کرنا ہمارا قانون نہیں رہی خصوصیات وہ اس کے علاوہ ہیں ملاحظہ ہوں۔ قرآن کریم نے حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ یوں بیان فرمایا کہ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ (بقرہ: ۲۵۹) اللہ نے انہیں سو سال مردہ رکھ کر پھر زندہ کیا پھر فرمایا وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا (بقرہ: ۲۵۹) اے عزیر اپنے مردے گدھے کی خشک ہڈیوں کو دیکھ کہ ہم انہیں کس طرح جمع کر کے گوشت پہناتے ہیں۔ حضرت حزقیل کی قوم کا واقعہ یوں بیان فرمایا فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (بقرہ: ۲۴۳) یعنی رب تعالیٰ نے داوردان والوں کو اولاً موت دے دی۔ پھر ان سب کو زندہ فرمایا نیز قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ تم نے ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت سے منہ موڑا تو فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ (بقرہ: ۵۶) یعنی تمہیں دیکھتے ہوئے کڑک نے پکڑ لیا پھر تمہیں ہم نے مرے بعد زندہ کیا غرض مردے زندہ کرنے کے بے شمار واقعات قرآن کریم نے بیان فرمائے۔ حدیث پاک میں آتا ہے کہ قریب قیامت دجال لوگوں کو مار کر زندہ کرے گا۔ اگر ان سب آیتوں میں مجازی معنی مراد لئے جائیں تو پھر قرآن ایک تماشا بن جائے اور کسی آیت پر اعتماد نہ رہے نعوذ باللہ صلوٰۃ سے مراد رات کو سونا مراد لے لو زکوٰۃ سے کھیت کا شاروزہ سے باتیں کرنا لیجئے جناب روزہ نماز زکوٰۃ سب ختم۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ جب وہ اپنی عمر ختم کر کے مرے تھے تو انہیں دوبارہ زندگی کیونکر مل گئی۔ یہ اعتراض تم نے آریوں سے سیکھا ہے۔ جس کے جواب ہم بارہا دے چکے ہیں جو رب تعالیٰ انہیں ایک دفعہ عمر دینے پر قادر ہے وہ دوبارہ بھی دے سکتا ہے۔ جب ہم اپنے بجھے ہوئے چراغ میں دوبارہ تیل و بتی ڈال کر اسے روشن کر سکتے ہیں تو رب تعالیٰ بھی ان چراغوں میں دوبارہ عمر کا روغن ڈال کر روشن فرما سکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ میثاق کے دن آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ مولیٰ داؤد علیہ السلام کی عمر کتنی ہے۔ فرمایا ساٹھ سال عرض کیا میری عمر میں سے انہیں چالیس سال اور عطا فرما۔ ان کی یہ گذارش منظور ہوئی۔ دیکھو مشکوٰۃ شریف باب الایمان بالقدر بروایت ترمذی) خیال رہے کہ تقدیر چند قسم کی ہے۔ جن میں سے بعض کی تبدیلی ہو سکتی ہے بعض کی نہیں۔ انشاء اللہ اس کی تحقیق اس آیت میں کی جائے يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ (الرعد: ۳۹)

تیسرا اعتراض: باذن اللہ فرمانے سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ کام کرنے کا مطلقاً اختیار نہ تھا۔ جب رب تعالیٰ چاہتا تھا تو آپ کے ہاتھ پر معجزات ظاہر فرما دیتا تھا۔ معجزات نبی کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ محض بندہ مجبور اور بے اختیار ہوتے ہیں (بعض وہابی) **جواب:** یہ غلط ہے اگر وہ حضرات محض بے اختیار ہوتے تو اخلق انفخ ابرئ احیی متکلم کے صیغے ارشاد نہ ہوتے کہ میں بناتا ہوں، میں زندہ کرتا ہوں۔ میں شفا دیتا ہوں۔ بلکہ یوں

ارشاد ہوتا۔ کہ رب تعالیٰ زندہ کرتا ہے۔ شفاء دیتا ہے۔ یہ متکلم کے صیغے ان کا اختیار بتا رہے ہیں۔ رہا باذن اللہ فرمانا۔ یہ بالکل برحق ہے۔ ہم بولتے سنتے دیکھتے چلتے پھرتے ہیں۔ اللہ کے حکم واذن سے۔ اگر اس کا ارادہ نہ ہوتو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان کاموں میں بالکل بے اختیار ہیں۔ یہ فرمانا باذن اللہ اس لئے ہے کہ لوگ آپ کو رب یا رب کا بیٹا نہ مان لیں۔ اس لئے ارشاد ہوا باذن اللہ! ہمارے حضور ﷺ نے مرگی والے کو فرمایا۔ اخرج عدو اللّٰہ فانی رسول اللّٰہ! اللہ کے دشمن نکل میں رسول اللہ ہوں فوراً اسے قے ہوئی جس میں ایک کیڑا نکلا اور شفا ہوگئی۔ یہ ہیں ان کے خداداد اختیارات ان کے حکم سے ہوائیں چلتی ہیں رب فرماتا ہے:۔ وَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے ہوا چلتی تھی۔ **چوتھا اعتراض**: اندھے اور کوڑھوں کو اچھا کرنا عیسیٰ علیہ السلام کی شان کے خلاف ہے۔ وہ نبوت کرنے آئے تھے۔ نہ کہ طبابت لہٰذا یہاں اکمہ سے دل کے اندھے مراد ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (حج: ۴۶) ایسے ہی ابرص یعنی کوڑھی سے وہ بدی مراد ہے جو بظاہر بھلی معلوم ہو اور حضرت مسیح یہ فرما رہے ہیں کہ میں دل کے اندھوں اور بدکاری کے کوڑھیوں کو ایمان وتقویٰ کا راستہ بتا کر انہیں اچھا کرسکتا ہوں (بیان القرآن لاہوری)۔ **جواب**: جی ہاں جب رائے سے تفسیر ٹھہری تو جو چاہو معنے کرلو۔ کوئی قید ہی نہیں۔ بتاؤ تو یہ کس نے معنی کئے ہیں۔ بے شک نبوت میں احکام کی تبلیغ ہے۔ مگر نبوت منوانے کے لئے معجزات کی ضرورت اور معجزہ میں عاجز کرنا شرط ہے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ایسا معجزہ دکھایا جائے جس سے اس کام کے ماہر عاجز رہ جائیں۔ تاکہ یہ خداداد اختیار نبوت کی دلیل ہو۔ چونکہ آپ کے زمانہ میں طب کا بہت زور تھا تو طبیبوں کو عاجز کرنے کے لئے یہ معجزات عطا فرمائے گئے۔ جس کی صدہا روایتیں ملتی ہیں۔ **پانچواں اعتراض**: اگر یہاں اخلق سے مراد ہے پرندے کا فوٹو بنانا تو یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان کے خلاف ہے۔ فوٹو یا مجسمہ بنانا حرام ہے۔ آپ حرام کام کیسے کرسکتے ہیں۔ **جواب**: فوٹو ومجسمہ بنانا اسلام میں حرام ہے ان کے دین کے احکام جداگانہ تھے۔ ان کے دین میں یہ حلال تھے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ (سباء: ۱۳) وہ جنات حضرت سلیمان کے لئے عمارات ومجسمہ تصویریں بناتے تھے۔ چنانچہ بیت المقدس میں وہ فوٹو ومجسمہ عرصے تک موجود رہے۔ عہد فاروقی میں فلسطین فتح ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی وہ مجسمے وہاں سے علیحدہ نہ کروائے کہ وہ حضرت سلیمان کے زمانے کے تھے۔ نیز فوٹو بنانا ہمارے ہاں بھی اس لئے حرام ہے کہ ہم اس میں جان نہیں ڈال سکتے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ فوٹو گروں سے قیامت میں فرمایا جائے گا کہ ان خود ساختہ فوٹوؤں میں جان ڈالو جب جناب مسیح ان میں جان ڈالتے تھے تو آپ کے لئے کیوں حرام ہوئے۔ آج فرشتہ ماں کے پیٹ میں دن رات مجسمہ بنا کر ان میں جان ڈالتا ہے کیا اس فرشتہ پر بھی فتویٰ لگاؤ گے۔ **چھٹا اعتراض**: اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ الخ کے یہ معنی نہیں کہ میں تمہیں کھائے ہوئے اور بچائے ہوئے کھانے کی خبر دیتا ہوں بلکہ مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں کھانے اور نہ کھانے کی چیز بتاتا ہوں کہ کون سے کھانے کھاؤ اور کون سے نہ کھاؤ۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نبی تھے نہ کہ نجومی پنڈت (معاذ اللہ) انہیں احکام بتانے چاہئیں نہ کہ یہ باتیں (مرزائی) **نوٹ**: یہ اعتراض مرزائیوں نے دیوبندیوں سے سیکھا کہ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کی نفی کے لئے ایسی ہی واہیات باتیں کرتے

ہیں۔ **جواب:** جناب اس میں اپنے علم غیب کا اظہار ہے۔ نبی کے معنی ہیں خبر دینے والا کہاں کی آخرت کی جس کو جہاں کی خبر نہ ہوا سے وہاں کی خبر کیا ہوگی ابو جہل نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا تھا

گر رسولی چیست دردستم نہاں تو خبرداری ز راز آسماں

آپ کا مقصد یہ ہی تھا کہ جب میری آنکھ سے یہاں کی باتیں پوشیدہ نہیں تو میں سچا نبی ہوں اور اس ملک کی سچی خبر دے رہا ہوں قادیانی جی! یہ سچے مسیح کے سچے معجزات ہیں جھوٹے مسیح کے واقعات نہیں جو محمدی بیگم کے آسمانی نکاح کی خبر بھی دے اور حاصل کرنے کی کوشش کرے اور ناکام رہے۔ **پانچواں اعتراض:** چھپی باتیں کبھی نجومی بھی بتادیتے ہیں کیا انہیں بھی علم غیب ہوتا ہے؟ **جواب:** علم غیب وہ ہے جو بلا دلائل اور بلا مقدمات حاصل ہو۔ کاہن رمال یا تو شیطانی اطلاع سے یا علم جعفر کے حساب سے معلوم کر کے بتاتے ہیں ایسے آج کل آلہ کے ذریعہ حمل کا حال معلوم کر لیتے ہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی پھر بھی نجومی اور رمال اکثر غلطی کرتے ہیں انبیائے کرام کا علم آسمانی وحی سے ہوتا ہے نہ کہ حساب وغیرہ سے اور ہمیشہ صحیح (تفسیر خازن)

تفسیر صوفیانہ

مسیح روح نے کفار نفسانیات سے کہا کہ میں تمہارے پاس عالم غیب سے کھلی نشانیاں لایا ہوں۔ وہ یہ کہ ناقصین کے نفوس کے گارے اور تزکیہ اور حکمت عملی کے ذریعہ مثل پرندہ بناتا ہوں پھر اس میں حیات حقیقی اور علم الٰہی کی پھونک مارتا ہوں جس سے اس میں امید وخوف کے دو بازو پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ پرندہ یعنی نفس زندہ ہو کر فضائے جلال و جمال میں اڑتا ہوا بارگاہ الٰہی کے باغ تک باذن الٰہی پہنچ جاتا ہے۔ نیز میں ان اندھوں کو جو اغیار میں پھنس کر انوار کے دیکھنے سے محروم ہیں اور ان کوڑھیوں کو جو فاسد عقیدوں اور کمینی بیماریوں میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان کا فطری رنگ بگڑ گیا شفا بخشتا ہوں کہ اندھوں کے حجاب کو پھاڑ کر بارگاہ رب ارباب دکھاتا ہوں اور ان بدعملوں کی بدعملی دور کر کے انہیں ایمان فطری کی طرف متوجہ کرتا ہوں نیز میں جہالت کے مردوں کو بحکم الٰہی علم حقیقت کی حیات سے زندگی بخشتا ہوں اور اے نفسانی جماعت میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ تم کون کون سے گناہ شہوات ولذات کھاتے یعنی استعمال کرتے ہو۔ اور کون کون سی امیدیں اپنی نیتوں کے گھروں میں چھپا کر رکھتے ہو مجھ پر سب روشن ہے میرے ان معجزات میں اے نفس تیرے لئے کھلی دلیل ہے۔ اگر تو میری مخالفت چھوڑ دے اور میری اطاعت کرے تو کامیاب ہو جائے (از ابن عربی وروح المعانی) خیال رہے کہ یہ صوفیانہ ارشادات ہیں نہ کہ قادیانی بکواس۔ ان حضرات نے عیسیٰ سے مراد قلب لیا ہے نہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام۔

صوفیائے کرام اس آیت کے ظاہر کے متعلق فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کھانے اور بچانے کا ذکر مثالاً فرمایا ورنہ آپ ہر شخص کے حال سے ہر گھر کے کام سے باخبر تھے جو کھانا اور بچانا دیکھ سکتا ہے بشریت کے سلسلے میں ان سے پردہ ہے نورانیت سے پردہ نہیں فرشتے بلکہ رب تعالیٰ ہم کو ہر طرح دیکھتے ہیں ان سے حجاب نہیں اور فرماتے ہیں کہ جناب مسیح نے انبئکم میں دو باتیں فرمائیں ایک یہ کہ میں ان معلومات میں حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھنے کا حاجت مند نہیں۔ کہ ان سے پوچھ کر بتاؤں دوسرا یہ کہ میرے یہ علوم غیبیہ تو وہ ہیں جن کی خبر تم کو دے سکتا ہوں باقی علوم اسرار جو بتانے کے لائق نہیں وہ تو سمندر ہیں حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا تھا مجھے حضور علیہ السلام سے دو علم ملے ہیں۔ ایک علم تو میں نے تم میں پھیلا دیا۔ دوسرا علم

بیان کروں تو میں قتل کر دیا جاؤں لَاٰیَۃً لَّکُمْ میں چند باتیں ہیں ایک یہ کہ میرے معجزات حصولی و استدلالی نبوت یا رب کی توحید کی دلیلیں ہیں تو جو میرے خداداد اختیارات وعلم غیب کا انکار کرے تو وہ نہ تو میری نبوت کو مانتا ہے نہ رب کی توحید کو۔ دوسرا یہ کہ یہ معجزات تمہارے لئے ہیں نہ کہ میرے لئے میرا علم تو حضوری و کشفی ہے تمہارا ایمان حصولی و استدلالی قرآن ہمارے لئے ہدایت ہے نہ کہ حضور کے لئے تیسرا یہ کہ معجزات مومنوں کو مفید ہیں۔ کافروں کو نہیں ظاہر چیز بصارت سے معلوم ہوتی ہے باطنی بصیرت سے بصارت سرے سے تیز ہوتی ہے بصیرت قوت ایمان سے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ

اور تصدیق کرنے والا واسطے اسکے جو درمیان ہاتھوں میرے کے ہے توریت سے تاکہ حلال کروں واسطے تمہارے بعض وہ جو

میں تصدیق کرتا آیا ہوں اپنے سے پہلی کتاب توریت کی اور اس لئے کہ حلال کردوں تمہارے لئے کچھ وہ چیزیں جو تم پر

حُرِّمَ عَلَیْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۵۰

حرام کیا گیا اوپر تمہارے اور لایا میں تمہارے پاس نشانی طرف سے رب تمہارے کے پس ڈرو اللہ سے اور اطاعت کرو میری

حرام تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لایا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میرا حکم مانو

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝۵۱

تحقیق اللہ رب ہے میرا اور رب ہے تمہارا پس پوجو اس کو یہ راستہ ہے سیدھا

بے شک میرا تمہارا سب کا رب اللہ ہے تو اسی کو پوجو یہ ہے سیدھا راستہ

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے دلائل کا ذکر تھا اب ان کی تبلیغ کے احکام کا ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی نبوت کا ثبوت دے کر قوم کو پیغام دیا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے ظاہری معجزات کا ذکر تھا مردوں کو زندہ کرنا' بیماروں کو شفا دینا وغیرہ اب ان کے باطنی معجزات کا ذکر ہے۔ یعنی بغیر پڑھے توریت سے واقف ہونا اور اس کی تصدیق کرنا' اور بغیر دنیوی قانون سیکھے ہوئے ربانی قانون ظاہر کرنا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی ظاہری شفا بخشنے اور جسمانی بیماریوں کو دور کرنے کا ذکر تھا اب ان کی باطنی شفا بخشنے اور روحانی حیات دینے کا ذکر ہے۔ تاکہ معلوم ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام قلب و قالب' روح و بدن کے طبیب ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تکوینی قوانین میں خداداد اختیارات کا ذکر تھا کہ میں اندھوں کوڑھوں کو اچھا' مردوں کو زندہ کر سکتا ہوں اب آپ کے تشریعی اختیارات کا ذکر ہے کہ میں محرمات کو حلال کر سکتا ہوں۔ تکوینی اختیارات کے بعد تشریعی اختیارات کا ذکر ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علوم غیبیہ کا ذکر تھا جن کا تعلق دنیا سے ہے اب آپ کے ان علوم غیبیہ کا ذکر ہے جن کا تعلق گذشتہ زمانہ سے ہے۔

یعنی تحریف شدہ توریت کو جاننا پہچاننا۔

تفسیر

مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰةِ یا تو یہ مضمون رَسُوْلًا پر معطوف ہے اور يُعَلِّمُهٗ کا حال یا جِئْتُكُمْ پوشیدہ فعل کی ضمیر کا حال ہے۔ مُصَدِّق تصدیق سے بنا' بمعنی سچا کرنا اور سچا کہلوانا' سچا منوانا' سچا ماننا یہاں سارے معنی درست ہیں کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کو سچا کہا بھی اور آپ کی تشریف آوری توریت کی وہ آیتیں سچی ہوگئیں جن میں آپ کی بشارت تھی۔ نیز آپ نے لوگوں سے توریت بنوائی اسے سچا کہلوایا مقصد یہ ہے کہ اے یہودیو میں تم پر احسان کرنے آیا ہوں کہ میرے ذریعہ تمہاری کتاب کی تصدیق ہوئی۔ لِمَا کا لام صلہ کا ہے۔ بَيْنَ يَدَيَّ کے لفظی معنی ہیں ہاتھوں کے درمیان۔ یہاں مراد سامنے ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ زمانی لحاظ سے سامنا ہونا مراد ہے یعنی پہلے اور ممکن ہے کہ مکانی لحاظ سے سامنے ہونا مراد ہو بمعنی پاس و نزدیک یعنی تمہاری تحریف کردہ توریت جو تقریباً اصلی رنگ میں دنیا سے غائب ہو چکی۔ وہ میرے سامنے ہے میں اسے دیکھ رہا ہوں آپ نے فرمایا کہ اے اسرائیلیو میں تو اپنے سے پہلی یا اپنے پاس والی توریت کی تصدیق کرنے آیا ہوں نہ کہ جھٹلانے۔ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یہ جملہ پہلے جملہ پر معطوف ہے اور لِاُحِلَّ جئت فعل پوشیدہ کا متعلق۔ اُحِلَّ احلال سے بنا بمعنی حلال و جائز کرنا بعض سے معلوم ہوا کہ سارے محرمات حلال نہ ہوں گے بلکہ بعض حرم علیکم سے یا تو توریت کی بعض حرام کردہ چیزیں مراد ہیں جو بنی اسرائیل پر سزا کے طور پر حرام کردی گئی تھیں جیسے اونٹ کا گوشت' مچھلی آنتوں کی چربی اس صورت میں انجیل شریف' توریت کے احکام کی ناسخ ہے یا حرم سے مراد وہ چیزیں ہیں جو علمائے یہود نے اپنی طرف سے لوگوں پر حرام کرکے توریت کی طرف انہیں منسوب کردیا تھا (کبیر و روح المعانی وغیرہ) اس صورت میں انجیل توریت کی ناسخ نہیں اس میں صرف مثالیں' اور نصیحتیں ہیں۔ عیسائیوں پر توریت ہی کے احکام جاری تھے مگر ان کے پادریوں نے ہفتے کا دن چھوڑ کر اتوار اختیار کیا۔ بیت المقدس سے منہ موڑ کر مشرق یا مغرب کو اپنا قبلہ بنالیا۔ ختنہ چھوڑ دیا سور کھانے لگے وغیرہ مگر تفسیر اول قوی ہے روح المعانی نے اس جگہ فرمایا کہ یہ حرکتیں پادری پطرس نے کیں یعنی نیز میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض وہ چیزیں حلال کردوں جو تم پر توریت میں یا یہودی رہبروں کی طرف سے حرام کردی گئی تھیں۔ خیال رہے کہ جیسے یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھتے تھے ایسے ہی اپنے پوپ پادریوں کو حرام حلال کا مالک سمجھتے تھے۔ اپنے گناہوں کی معافی بھی پوپ پادریوں سے ہی مانگتے تھے' اس لئے پادریوں نے بہت سی حلال چیزیں ان پر حرام کردی تھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہ حلال کیں۔ یعنی دین کی خرابیوں کو دور فرمایا پہلے زمانوں میں حضرات انبیاء کرام ہی دینی خرابیوں کو دور کرتے تھے اب اسلام میں یہ کام حضرات علماء ربانین اور مجددین کے سپرد ہوا کہ قرآن وحدیث واحکام شریعہ کتر بھی کتر بیونت کرنے والے پیدا ہوتے رہے مگر علماء ربانین نے دین کو محفوظ رکھا حضور انور ﷺ نے خبر دی تھی کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہوں گے اللہ ہر سو برس پر مجدد بھیجے گا۔ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ یہاں یا تو آیت سے پچھلے مذکورہ معجزات مراد ہیں اور یہ کلام اسی کی نقل ہے یا اس آیت سے آپ کے باطنی معجزات مراد یعنی بغیر کسی کے پڑھے عالم ہونا توریت کا حافظ و ماہر ہونا وغیرہ یعنی میں اپنی نبوت اور انجیل کی حقانیت پر تمہارے پاس نشانی بھی لایا ہوں۔

لہٰذا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ رب سے ڈرو اور ہر طرح میری اطاعت کرو کہ میری اطاعت کے بغیر تقویٰ کامل نہیں ہو سکتا۔ پھر فرمایا اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ چونکہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو خبر تھی کہ مجھے بعض لوگ خدا کا بیٹا کہنے لگیں گے اس لئے آپ نے یہ کلام اِنَّ تاکیدی سے شروع فرمایا۔ نیز چونکہ عمومی ربوبیت تو ہر بندے کے لئے ہے۔ مگر رب کی خصوصی ربوبیت۔ نبوت' ولایت' خاص خاص بندوں کے لئے' اس لئے ربی الگ فرمایا اور ربکم الگ جیسے جسمانیات میں دھوپ ہوا تو سب کو ملتی ہے۔ مگر سلطنت' دولت وغیرہ خصوصی نعمتیں کسی کسی کو ایسے ہی روحانی ربوبیت کا حال ہے یعنی اللہ میرا بھی پالنے والا اور تمہارا بھی لہٰذا تم نہ تو مجھے خدا کہو' نہ خدا کا بیٹا' اور نہ اپنے جیسا بشر بلکہ اللہ کا بندہ کہو۔ اور اس کا رسول هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ هٰذَا سے پچھلے سارے احکامات کی طرف اشارہ ہے۔ صراط اور مستقیم کی مکمل تفسیر سورۂ فاتحہ میں گذر چکی یعنی رب سے ڈرنا' میری اطاعت کرنا' مجھے اس کا بندہ' رسول جاننا یہ ہی وہ سیدھا راستہ ہے جو رب تک پہنچائے گا اسی راستہ کی سارے پیغمبروں نے ہدایت کی۔

خلاصہ تفسیر

عیسیٰ علیہ السلام نے ظاہری معجزات دکھاتے ہوئے اور اپنی نبوت کا ثبوت دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ اے اسرائیلیو تم ڈرو نہیں میں اپنے سے پہلی کتاب توریت کو جھٹلانے نہیں بلکہ اسے سچا کرنے کے لئے آیا ہوں اگر میں نہ آتا تو میری پیشگوئی کی آیتیں جو توریت شریف میں ہیں کیونکر سچی ہوتیں نیز میرا آنا تمہارے واسطے روحانی نعمت ہے کہ تمہاری بدکرداریوں کی وجہ سے تم پر جو سختی کی گئی تھی۔ اسے اٹھا دوں گا اور جو طیب طاہر چیزیں تم پر حرام کر دی گئی تھیں ان کو حلال کر دوں گا۔ خیال رہے کہ چیزوں کی حرمت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خود چیز ہی بڑی ہو یہ حرمت تو اللہ کی رحمت ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷) وہ نبی آخر الزماں لوگوں پر خبیث و گندی چیزیں حرام فرمائیں گے۔ دوسرا یہ کہ چیز تو اچھی ہو مگر قوم سرکش ہو۔ اسے سزا دینے کے لئے ان پر پابندی لگانے کے لئے حرام کر دی گئیں جیسے حکومتیں سرکش لوگوں پر کرفیو لگا کر انہیں گھروں میں قید کر دیتی ہیں سڑک پر نکلنا جرم نہیں تھا۔ مگر ان کی سرکشی سے جرم قرار دیا گیا۔ یہود پر حلال چیزوں کی تحریم دوسری وجہ سے تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تشریف لا کر اٹھا دیں یہ حرمت عذاب تھی۔ اس کا اٹھانا رحمت۔ میں اپنے اس دعوے پر دلائل اور نشان بھی لایا ہوں کہ بغیر کسی سے پڑھے توریت شریف کا حافظ و ماہر ہوں اور بچپن میں میں نے کلام کیا جس سے میری نبوت بخوبی ثابت ہو گئی۔ لہٰذا تم میری مخالفت نہ کرو۔ بلکہ اطاعت کرو اور خدا سے ڈرو۔ پھر یہ بھی یاد رکھو کہ میں نہ خدا ہوں نہ اس کا بیٹا بلکہ تمہاری طرح اس کا مربوب بندہ ہوں۔ وہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی لہٰذا تم اس کی عبادت کرو نہ کہ میری' یہ ہی عقائد و اعمال رب تک پہنچانے والا سیدھا راستہ ہیں۔ جس کی سارے پیغمبروں نے تبلیغ کی۔ اور میں بھی اسی کی تبلیغ کرتا ہوں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کوئی پیغمبر کسی آسمانی کتاب کو جھٹلاتے نہیں اس کی تصدیق ہی کرتے ہیں جیسا کہ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ سے معلوم ہوا دوسری بات ہے کہ اس کے کچھ احکام ضرورت زمانہ کے لحاظ

سے منسوخ کردیں۔ **دوسرا فائدہ:** پیغمبروں کو کسی قدر شرعی احکام کا اختیار ہوتا ہے دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وَلِاُ حِلَّ لَکُمْ میں حلال کردوں معلوم ہوا کہ حلال وحرام کرنے کا انہیں اختیار ہے۔ ایک دفعہ ہمارے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حج کرو۔ کسی نے پوچھا کہ کیا ہر سال۔ فرمایا کہ اگر ہم ابھی ہاں کہہ دیتے تو ہر سال ہی حج فرض ہو جاتا نہیں عمر میں ایک بار۔ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی ہاں اور ناں میں تاثیر ہے۔ نیز ایک صحابی نے روزہ میں اپنی بیوی سے جماع کرلیا بارگاہ نبوت میں حاضر ہوکر اپنے اس قصور کی بابت عرض کیا۔ فرمایا غلام آزاد کردو عرض کیا نہیں کرسکتا۔ اور کھانا دینے اور ساٹھ روزے رکھنے سے بھی مجبوری ظاہر کی۔ حضور علیہ السلام نے انہیں ایک ٹوکری کھجور دے کر فرمایا اس سے اپنا کفارہ ادا کرو۔ عرض کیا حضور علیہ السلام مدینہ میں سب سے بڑا مسکین تو میں ہی ہوں۔ فرمایا خود ہی کھالو یہ حضور علیہ السلام کا اختیار تھا کہ خود خطا کار کو اس کا کفارہ کھلا دیا۔ اس کی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں اس مسئلہ کے لئے ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ علیہ السلام کا مطالعہ کرو۔ **تیسرا فائدہ:** پیغمبر کی اطاعت کے بغیر تقویٰ حاصل نہیں ہوسکتا جیسا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** پیغمبر اپنی نبوت کے ساتھ اپنی بندگی کا بھی اعلان فرماتے ہیں تاکہ کوئی معجزات دیکھ کر انہیں خدا نہ کہہ دے۔ اسی لئے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ربی وربکم۔ **پانچواں فائدہ:** قرآن کا نسخ حدیث سے جائز ہے دیکھو عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ بعض وہ چیزیں جو توریت میں تم پر حرام کردی گئی تھیں انہیں میں حلال کردوں توریت کتاب اللہ تھی۔ اور اس کے بعض احکام کو منسوخ فرمانے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ دیکھو والدین اور قرابت داروں کے لئے وصیت قرآن کریم سے ثابت ہے اَلْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (بقرۃ:۱۸۰) مگر اسے حدیث نے منسوخ فرمایا کہ لَا وَصِیَّةَ لِلْوَارِثِ اور غیر وارث کے لئے بھی تہائی سے زیادہ کی وصیت حدیث شریف نے ہی منسوخ فرمائی۔ **چھٹا فائدہ:** سیدھا راستہ وہی ہے جس پر اللہ کے نیک بندے چلے ہوں اور منزل سے لوٹنے والے اس کے سیدھا ہونے کی خبریں دیں جو مذہب 'دین' نبی یا ولی سے خالی ہو۔ وہ سیدھا نہیں۔ شرک مجوسیت وغیرہ نبوت سے خالی ہیں۔ لہٰذا ٹیڑھے راستے ہیں دیو بندیت' قادیانیت' نیچریت' رفض و وہابیت اولیاء اللہ سے خالی لہٰذا یہ بھی ٹیڑھے راستے ہیں۔ مذہب اہل سنت ہی سیدھا راستہ ہے کہ اس کو علماء اولیاء کی سرپرستی حاصل ہے۔ شاہی سڑک عام گزرگاہ ہوتی ہے۔ کہ اس پر پل اور سرکاری چوکیاں ہوتی ہیں۔ اجمیر شریف اور بغداد شریف اس کی سرکاری چوکیاں ہیں سورۂ فاتحہ میں صراط مستقیم کی پہچان یہ بتائی گئی صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ اس کی مکمل تحقیق اس ہی جگہ دیکھو۔ **ساتواں فائدہ:** انجیل شریف توریت کی ناسخ ہے جیسا کہ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں اجتماع ضدین معلوم ہو رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مُصَدِّقًا بھی فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ وہ توریت کو منسوخ نہ کریں گے صرف تصدیق کریں گے اور وَلِاُحِلَّ بھی فرمایا جس سے پتہ لگا کہ آپ نے توریت کو منسوخ کیا۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب تفسیر میں گزر گئے۔ کہ نسخ تصدیق کے خلاف نہیں۔ اور اس کی تحقیق بارہا ہو چکی۔ یا حُرِّمَ سے علمائے یہود کی حرام کی ہوئی چیزیں مراد ہیں۔ یعنی جن چیزوں کو تمہارے علماء نے حرام

کردیا ان کی حلت ظاہر کروں گا۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں زبور کا ذکر کیوں نہیں ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تو توریت و زبور دونوں ہی کی تصدیق فرمائی؟ **جواب:** یا اس لئے کہ توریت کی تصدیق زبور کی تصدیق ہے۔ کہ توریت اصل ہے اور زبور اس کی شرح یا فرع یا اس لئے کہ اس وقت خطاب توریت ماننے والے یہودیوں ہی سے تھا۔ **تیسرا اعتراض:** وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ الخ دوبارہ کیوں فرمایا گیا اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا تھا؟ **جواب:** یا تو یہ کلام اسی پہلے کلام کی تاکید ہے۔ اہتمام کے لئے یا اس آیت سے ظاہری معجزات مراد تھے اور اس سے باطنی معجزات علم حکمت وغیرہ مراد جیسا کہ ہم پہلے تفسیر میں عرض کر چکے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت کی پہلی تفسیر سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بعض توریت کی حرام کردہ چیزیں حلال کیں تو وہ چیزیں اچھی تھیں یا بری۔ اگر اچھی تھیں تو توریت میں حرام کیوں کی گئیں تھیں۔ اور اگر بری تھیں تو آپ نے حلال کیوں کر دی۔ **جواب:** وہ چیزیں اچھی تھیں جیسے مچھلی یا جانوروں کی چربی وغیرہ مگر رب تعالیٰ نے یہود کی سرکشی کی وجہ سے سزاء حرام کردی تھیں تاکہ ان پر سختی پڑ جائے۔ جیسے حکومتیں کرفیو لگا کر لوگوں پر سختی کر دیتی ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برکت سے وہ سختی دور کر دی گئی۔ **پانچواں اعتراض:** اگر رب تعالیٰ کے احکام نبی منسوخ کر دیں تو نبی رب سے زیادہ قوی ہوئے اس کے احکام کو توڑ دیا قرآن کا نسخ حدیث سے ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ **جواب:** نسخ میں نہ توڑ پھوڑ ہوتی ہے نہ گذشتہ کو جھٹلانا بلکہ نسخ مخلوق کے لئے تبدیلی حکم ہے۔ اور خالق کے ہاں ختم یعنی گذشتہ حکم کو انتہاء پر پہنچا دینا نبی کا حکم کتاب منسوخ فرمانا درحقیقت رب تعالیٰ ہی کا کام ہے جیسے رب کے حکم سے بخار آیا' دوا سے اتر گیا یہ بخار کا نسخ دوا نے بحکم پروردگار ہی بخار اتارا ہے مگر دوا کا واسطہ درمیان میں ضرور ہے۔ ایسے ہی پیغمبروں کا درمیان میں واسطہ ہوتا ہے۔ درحقیقت رب ہی منسوخ فرماتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

عیسیٰ قلب نے نفسانی بنی اسرائیل سے کہا کہ میں علم ظاہر یعنی توریت کی تصدیق کرنے والا ہوں کیونکہ وہ بھی رب تعالیٰ کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ اور اے نفس جو باطنی انوار تجھ پر تیرے گناہوں کی وجہ سے حرام ہو گئے تھے اور وہ باطنی علوم کہ جس سے تو یکسر محروم ہو چکا ہے۔ اس کے بعض حصہ کو تیری استعداد کے مطابق تجھ پر کھولوں گا۔ میں اپنی اس قدرت پر رب تعالیٰ کی طرف سے دلیل لے کر آیا ہوں کہ میرے اس وصف کی کسی نبی نے مخالفت نہ کی۔ لہٰذا اے نفسانی خواہشات تم میری مخالفت میں رب تعالیٰ سے ڈرو چونکہ میں حق پر ہوں لہٰذا مجھ سے جھگڑا کرنا گویا رب تعالیٰ سے جنگ ہے۔ اللہ میرا اور تمہارا رب ہے تمہیں میرے ذریعہ کمال تک پہنچائے گا لہٰذا تم اس کی بارگاہ میں ذلت اور انکسار ظاہر کر کے اور اس کے دروازہ پر ٹھہر کر اس کی عبادت کرو اور میری دعوت توحید میں اطاعت کرو۔ یہ وہ سیدھا راستہ ہے جو تمہیں تمہارے رب تک پہنچائے گا (ابن عربی و روح المعانی) نفس میں دو طاقتیں ہیں۔ نظری اور عملی۔ ان دونوں کو کامل کرنا نفس کا کمال ہے۔ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ میں قوت نظری کی طرف اشارہ ہے۔ اور فَاعْبُدُوْهُ میں کمال قوت عملی کی طرف۔ جو ان دو کمالوں کو جمع کر لے گا۔ وہ سیدھے راستے پر چل سکتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک علم و عمل استقامت کے مقدمات ہیں کسی نے جنید بغدادی سے پوچھا کہ ہم رب تک کیسے پہنچیں فرمایا توبہ کرتے رہو رب سے ڈرتے رہو۔ اس کی رحمت کے امیدوار رہو۔ ہر حال میں ذکر اللہ کرو نفس کو ہمیشہ

ذلیل رکھو کہ موت کو قریب اور اپنی امیدوں کو دور جانو۔ پوچھا گیا کہ بندہ میں یہ صفتیں کیونکر پیدا ہوں فرمایا قلب مفرد سے جس میں توحید مجرد ہو۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ استقامت ہی بہت دشوار چیز ہے۔ یہ محض فضل رب سے واصل ہوتی ہے۔ سچے بندے کی یہ پہچان ہے کہ ہمیشہ اطاعت میں مشغول رہے۔ رب تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ دیکھے۔ نہ جنت کو نہ دوزخ کو جس کا عقیدہ عمل غرض سے خالی ہو گیا۔ اسے استقامت حاصل ہو گئی۔ اس کے لئے ازلی قابلیت اور شیخ کامل کی تربیت ضروری ہے۔ اچھوں کی نگاہ اور صحبت پتھر کو جوہر اور قطرہ کو گوہر کر دیتی ہے۔ مولینا فرماتے ہیں۔

سالہا باید کہ اندر آفتاب لعل یابد رنگ و رخشانی و تاب

اسی لئے یہاں فَاتَّقُوا اللّٰهَ کے ساتھ وَاَطِیْعُوْنِ فرمایا گیا (روح البیان) مگر یہ اوصاف ایک دم حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے لئے مدت درکار ہے۔ نہ قطرہ ایک دم موتی بن جاتا ہے۔ نہ پتھر ایک دم لعل صوفیاء فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آخر میں فرمانا فَاتَّقُوا اللّٰهَ اس تمام گفتگو شریف کا مقصد بیان کرنے کے لئے ہے۔ یعنی میں نے اپنے فضائل بڑائی شیخی کے لئے بیان نہ کئے۔ بلکہ اس لئے تاکہ تم رب سے ڈرو' ایمان لاؤ۔ رب سے ڈرو محرمات سے بچو رب سے ڈرو متشابہات سے بچو' غافل کرنے والی دنیا سے بچو' تقویٰ کے چاروں درجے ایک فَاتَّقُوا اللّٰهَ میں بیان کر دیئے۔ اپنی اطاعت کا ذکر فرما کر یہ بتایا کہ تم تقویٰ کے کسی درجہ پر پہنچ کر میری اطاعت سے بے نیاز نہیں ہو سکتے' کوئی شخص گیس کی روشنی حاصل کر کے گیس سے بے نیاز نہیں۔ اطاعت رب کی بھی ضروری ہے مگر جب کہ اس کے احکام نبی کی معرفت ہم کو ملے۔ اور اطاعت حاکم ماں باپ' عالم' شیخ کی بھی ضروری ہے۔ مگر جب ان کے حکم خلاف شرع نہ ہوں۔ نبی کی اطاعت ہر حال لازم ہے۔ اگرچہ وہ کسی کو کسی قسم کا حکم دیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دوسرے نکاح سے روک دیا حضرت خزیمہ کی گواہی دو کے برابر فرما دی سب کی اطاعت ضروری ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ
پس جب محسوس کیا عیسیٰ نے طرف سے ان کے کفر کو تو فرمایا کون ہیں مددگار میرے طرف اللہ کے کہا
پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر پایا بولا کون میرے مددگار ہوتے ہیں اللہ کی طرف
الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾
ساتھیوں نے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے ایمان لائے ہم ساتھ اللہ کے اور گواہ رہیے اس کے کہ ہم مسلمان ہیں
حواریوں نے کہا ہم دین خدا کے مددگار ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ ہو جائیں کہ ہم مسلمان ہیں
رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۳﴾
اے رب ہمارے ایمان لائے ہم ساتھ اس کے جو اتارا تو نے اور پیروی کی ہم نے اس رسول کی پس لکھ تو ہم کو ساتھ گواہوں کے
اے رب ہمارے ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے اتارا اور رسولوں کے تابع ہوئے تو ہمیں حق پر گواہی دینے والوں میں لکھ لے

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

اور فریب کیا انہوں نے اور خفیہ تدبیر کی اللہ نے اور اللہ تدبیر کرنے والوں میں بہتر ہے

کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر چھپی تدبیر کرنے والا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کے معجزات کا ذکر فرمایا گیا اب ان کی قوم کے اس معاملہ کا ذکر ہے جو انہوں نے آپ کے ساتھ کیا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا میں آنے کا ذکر تھا جو کہ رحمت الٰہی ہے۔ اب اس کی قوم کی ناقدری کا ذکر ہے۔ کہ انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی۔ جو ان کے لئے سراپا رحمت تھی اس ذکر سے مقصود حضور نبی کریم ﷺ کو تسلی دینی ہے۔ کہ اگر آپ کے زمانے کے ناقدرے کفار آپ کی تبلیغ کا اثر نہیں لیتے تو آپ مغموم نہ ہوں یہ ناقدری تو ہوتی چلی آئی ہے۔ دیکھئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا کچھ نہ فرمایا مگر قوم نے الٹا اثر لیا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام نے زمین پر آنے کا ذکر کیا۔ اب زمین سے آسمان کی طرف جانے کی تمہید ہے۔ آپ کا یہاں آنا بھی معجزہ تھا۔ اور یہاں رہنا بھی معجزہ اور یہاں سے جانا بھی معجزہ۔ ان کے دو معجزات کے بعد اب تیسرے کا ذکر ہے۔

تفسیر

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ یہ نیا جملہ ہے اور ف فصیحہ۔ اس سے پہلے ایک دراز عبارت پوشیدہ ہے یعنی عیسیٰ علیہ السلام ان میں تشریف بھی لے آئے ان سے یہ گفتگو بھی فرمائی۔ پھر جب ان سے کفر کا احساس کیا الخ اَحَسَّ احساس سے بنا جس کا مادہ حس ہے۔ اس کی جمع حواس آتی ہے۔ احساس کے معنی ہیں حواس سے معلوم کر لینا۔ یعنی آنکھ یا ناک یا کان یا چھونے سے معلوم کرنا۔ مگر کبھی علم یقین کو بھی احساس کہہ دیتے ہیں ممکن ہے کہ یہاں یہ ہی مراد ہو کیونکہ کفر و ایمان احساسی چیزیں نہیں اور ہو سکتا ہے کہ اَحَسَّ ظاہری معنی میں ہو۔ اور کفر سے علامات کفر یا کفر پر ضد مراد ہو مگر قوی تر یہ ہے کہ اَحَسَّ بالکل ظاہری معنی میں ہو اگر چہ کفر و ایمان محبت و بغض محسوس چیزیں نہیں مگر نگاہ نبوت ان تمام چیزوں کو دیکھ لیتی ہے جیسے ہم خواب و خیال میں ان عوارض کو شکلوں میں دیکھ لیتے ہیں اور قیامت میں تو ہر شخص اپنے اعمال کو مختلف شکلوں میں دیکھے گا۔ یہ ہی اعمال تو لے بھی جائیں گے منھم کا مرجع وہ منکر یہودی ہیں۔ جنہوں نے آپ کی مخالفت پر کمر باندھی یا منافق لوگ جو بظاہر آپ کے ساتھ تھے اور در حقیقت یہودیوں کے ساتھی یا مرتدین جو پہلے مخلص مومن تھے۔ اور پھر روپیہ کی لالچ میں ایمان سے پھر گئے جس کا ذکر انشاء اللہ خلاصۂ تفسیر میں آئے گا۔ کفر سے یا ان کا ظاہر کفر مراد ہے۔ یا علامات کفر یا منافقت یا ارتداد یا آپ کے قتل کا ارادہ لہٰذا اس جملہ کے پانچ چھ معنی ہو سکتے ہیں مگر ظاہر یہ ہے کہ کفر سے مراد ارادہ قتل ہے یا تدبیر قتل نبی کے قتل کا ارادہ بھی کفر ہے اگر چہ آپ کو قتل کرنے کا بیڑا اططیانوس نے اٹھایا تھا مگر چونکہ دوسرے یہود نے اس کی مدد کی۔ مشورے دیئے۔ انعام کا لالچ دیا اس لئے ان سب کا ذکر ہوا کہ گناہ کرنا' کرانا' رغبت دینا' بلکہ گناہ سے راضی ہونا۔ سب ہی گناہ ہے۔ بہر حال منھم

فرمانا بالکل حق ہے یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان یہود سے علامات کفر دیکھ لیں یا ان کا کفر یقین سے معلوم فرمالیا تو قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ یہ کلام یا تو ہر مومن سے فرمایا جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ کَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ (الصف: ۱۴) یا اپنے خاص دوستوں اور حواریوں سے جیسا کو سورۂ صف میں فرمایا گیا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ الخ مَنْ استفہامیہ ہے۔ اور انصار نصیر کی جمع ہے۔ جیسے شریف کی جمع اشراف۔ بعض نے فرمایا کہ جمع نصر کی ہے الی یا تو اپنے معنی میں ہے اور یہ جار مجرور پوشیدہ سے متعلق ہو کر انصار کی ی کا حال ہے۔ جو کہ در حقیقت انصار کا مفعول ہے اصل عبارت یوں ہے مَنْ اَنْصَارِیْ مُلْتَجِئًا اور ذَاھِبًا اِلَی اللّٰہِ یعنی میں جب رب کی طرف جانے لگوں تو اس وقت میرا مددگار کون ہوگا۔ جو یہودیوں سے بچائے بعض نے فرمایا کہ یہ الی بمعنی مع ہے۔ یعنی رب کے ساتھ میری مدد کون کرے گا۔ بعض کے خیال میں الی بمعنی فی ہے یعنی اللہ کی راہ میں یا خدا کے واسطے میرا مددگار کون ہے۔ کہ جس کی نیت رضاء الٰہی ہو نہ کہ دنیا حاصل کرنا (کبیر و روح المعانی وغیرہ) قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ یہ اس جملہ کا جواب ہے۔ حواریون حواری کی جمع ہے بمعنی خالص دوست۔ اسی واسطے خالص آٹے کو دقیق حواری کہتے ہیں۔ اور خالص رنگ والی عورتوں کو نساء حواریات، بعض نے فرمایا حوار ایک شہر کا نام تھا چونکہ یہ لوگ وہاں کے رہنے والے تھے اس لئے ان کا لقب حواری ہوا۔ ی نسبتی ہے۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ حور سے بنا بمعنی لوٹنا رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّہٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (انشقاق: ۱۴) اسی لئے مشورہ کو تحاور کہتے ہیں کہ اس میں ایک دوسرے کی طرف کلام لوٹایا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاللّٰہُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا (مجادلہ ۱) چونکہ خالص دوست کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ اس لئے اسے حواری کہا جاتا ہے۔ بعض کے خیال میں حواری حور بمعنی سفیدی سے بنا۔ جس کی آنکھ کی سفیدی خوب تیز ہو۔ اسے حورہ کہتے ہی۔ اسی لئے جنت کی عورتوں کا نام حور ہے۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے یہ ساتھی یا تو دھوبی تھے کہ لوگوں کے کپڑے سفید کیا کرتے تھے یا خود سفید کپڑے پہنتے تھے۔ یا ان کے چہرے سفید تھے یا ان کے دل منور تھے اور اخلاق پاکیزہ اس لئے انہیں حواری کہا گیا قتادہ اور مقاتل وغیرہ نے یہ ہی فرمایا یہ کل بارہ حضرات تھے جن میں یعقوب، شمعون اور یوحنا بھی داخل ہیں۔ رہی یہ تحقیق یہ کون لوگ تھے انشاء اللہ اس کا ذکر خلاصہ تفسیر میں آئے گا بعض نے کہا کہ یہ انتیس آدمی تھے مگر پہلی بات صحیح ہے انصار اللہ میں یا دین پوشیدہ ہے یا کچھ پوشیدہ ہے عیسیٰ علیہ السلام کے خالص دوستوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے دین کے یا اللہ کے نبی کے یا اللہ کے مددگار ہیں۔ امنا باللہ یہ نیا جملہ ہے گویا پہلے جملہ کی دلیل ہے۔ اس جملہ کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہم کو ایمان جیسی دولت آپ کے ذریعے سے ملی تو اس کا تو شکریہ ضرور ادا کریں گے کہ آپ پر پروانہ وار فدا ہو جائیں گے دوسرا یہ کہ ہم نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے اس کے ثبوت کے لئے ہم آپ پر قربان ہوں گے جڑ کی دلیل شاخیں ہوتی ہیں ایمان کی دلیل اعمال۔ اور سب سے بڑا عمل نبی پر صدقے ہو جانا ہے۔ قیامت میں وضو کی چمک، سجدہ گاہ کی نورانیت دلیل ایمان ہوگی۔ بہر حال آمنا باللہ یا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ کی دلیل ہے۔ یا اس کا عکس اس میں مسلمانوں کو تعلیم ہے کہ اپنے ایمان کا ثبوت دنیا میں قائم کریں۔ اور بوقت ضرورت دین پر نثار ہو جایا کریں۔ ایمان باللہ کے معنی بارہا ہو چکے یعنی ہم اللہ پر ایمان لے آئے۔ اور مومن کی شان ہے کہ وہ اللہ کے دین کی مدد کرے۔ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ کا جاننا ماننا اور ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کچھ

اور اللہ کو جاننا ماننا ذریعہ نجات نہیں اللہ کو جاننا ماننا تو شیطان بھی ہے۔ اور بہت سے کفار بھی مگر وہ سب ہیں دوزخی اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس کی ذات و صفات کو بھی ماننا چاہیے اس کے رسولوں' کتابوں' فرشتوں' جنت' دوزخ' قیامت وغیرہ تمام ایمانیات کو مانا جائے لہٰذا اٰمَنَّا فرمانے میں ان تمام کے ماننے کا ذکر ہو گیا وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ یہ جملہ اٰمَنَّا پر معطوف ہے۔ یا تو وہ بھی جملہ انشائیہ تھا یا جملہ انشائیہ کا خبریہ پر عطف جائز ہے۔ واشهد میں عیسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہے مسلمون یا لغوی معنی میں ہے یعنی اطاعت کرنے والے اور پیروکار۔ یا اصلاحی معنی میں کہ ان کا دین بھی اسلام تھا۔ (خازن وغیرہ) یعنی اے عیسیٰ علیہ السلام آپ اس پر گواہ رہیں کہ ہم آپ کے مطیع یا مسلمان ہیں۔ خیال رہے کہ دنیا میں تو ہم رسول کے گواہ ہیں۔ مگر آخرت میں رسول ہمارے ایمان و اسلام کے گواہ ہوں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ: ۱۴۳) قیامت میں مومن کے ایمان کے گواہ بہت ہوں گے کاتب اعمال فرشتے' جہاں مومن نماز پڑھتا تھا۔ وہ جگہ' جہاں تک مومن کی آذان کی آواز پہنچتی تھی وہاں تک کے کنکر پتھر ذرے قطرے سب ایمان کے گواہ پھر نبی کی گواہی سب سے اعلیٰ گواہی ہوگی۔ رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ یہ بھی حواریوں کا کلام ہے اور رب سے عرض و معروض۔ اگلی دعا کی تمہید کے لئے اپنی وفاداری کا اظہار ہے۔ مَا اَنْزَلْتَ سے یا انجیل شریف مراد ہے یا اس سے پچھلی ساری کتابیں یا اگلی پچھلی ساری آسمانی کتابیں اور صحیفے یا ساری کتابیں اور انبیائے کرام کے معجزات' اِتَّبَعْنَا' اتباع سے بنا۔ جس سے مراد تھا عقائد و اعمال میں پیروی کرنا ہے اَلرَّسُوْلُ میں الف لام عہدی ہے۔ اور اس سے عیسیٰ علیہ السلام مراد یعنی اے مولیٰ ہم انجیل شریف یا تیری ساری کتابوں پر ایمان لا چکے یا ایمان لاتے ہیں۔ اور اس رسول یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی ہر طرح پیروی کرتے ہیں۔ لہٰذا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ۔ امنا اور واتبعنا تمہید دعا تھی۔ یہ جملہ اصل دعا ہے چونکہ ان حواریوں کو اب اپنی موت کا گمان غالب ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے یہ دعا کی تھی اور چونکہ اس وقت وہ حضرات اپنی زندگی سے قریباً مایوس تھے اس لئے آخرت کے متعلق ہی دعا مانگی۔ نیز آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے اعلیٰ نعمت اچھوں کا ساتھ ہے۔ اس لئے اس کی التجا کی اگر وہ نعمت نصیب ہوگئی تو سب کچھ مل گیا۔ اس میں ہم لوگوں کو دعا کی تعلیم ہے۔ اُكْتُبْ كتابة سے بنا بمعنی لکھنا اور ثابت کرنا' اور داخل کرنا' لفظ کتابت قرآن پاک میں بہت معنی میں استعمال ہوا۔ اگر اس سے لکھنا مراد ہے تو نا سے اسماء مراد ہوں گے۔ اور اس سے نیکیوں کی کتاب میں نام لکھنا مراد ہوگا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ (مطففین: ۱۸) اور اگر کتابت سے ثابت کرنا اور داخل کرنا مراد ہو۔ تو اس تکلف کی ضرورت نہیں شاهدین شاهد کی جمع ہے۔ بمعنی گواہ اور حاضر اس سے مراد محمد ﷺ اور ان کی امت ہے۔ کیونکہ قیامت میں مسلمان نبیوں کے گواہ ہوں گے۔ اور حضور ﷺ مسلمانوں کے وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا حضرت عکرمہ اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ہی قول ہے۔ (خازن و کبیر و روح المعانی و بیان وغیرہ) خیال رہے کہ امت مصطفیٰ ﷺ آخرت میں تو نبیوں کی گواہ ہے اور دنیا میں مسلمانوں کی بھی گواہ اور دوسری چیزوں کی بھی گواہ چنانچہ جس شخص کو عام مسلمان جنتی کہیں وہ واقعی جنتی ہے۔ اور جسے عام مسلمان دوزخی کہیں وہ دوزخی ہے۔ حضور فرماتے ہیں اَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ ایسے ہی جس چیز کو عام مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ حضور فرماتے ہیں مَا رَاٰهُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ چونکہ مسلمانوں کے یہ فضائل حواریوں

سے عیسیٰ علیہ السلام نے کہے تھے اس لئے انہوں نے یہ دعا کی۔ ابو صالح نے کہا کہ شاہدین سے مراد انبیائے کرام ہیں۔ کیونکہ ہر نبی اپنی امت کا یا امت پر گواہ ہے۔ مقاتل نے فرمایا کہ اس سے سچے لوگ مراد ہیں۔ زجاج نے فرمایا کہ اس سے تمام انبیاء کی مومن امتیں مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے فرشتے مراد ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ الخ (آل عمران: ۱۸) بعض کا خیال ہے کہ شاہدین سے مراد شہود جمال میں مستغرق ہونے والے ہیں۔ جنہیں مشاہدہ جمال کی وجہ سے مشقتیں اور تکالیف محسوس ہی نہ ہوں گے۔ مگر پہلا قول نہایت صحیح ہے یعنی اے مولیٰ چونکہ ہم تیرے رسول کے ہر طرح پیروکار بن چکے ہیں لہٰذا ہمارے نام گواہوں کے رجسٹر میں انہی کے ساتھ درج فرما ہمیں حق پر گواہی دینے والوں کے زمرے میں داخل کر یا ہمیں آخرت میں انبیائے کرام کی ہمراہی و معیت نصیب فرما کہ اگر ان کی ہمراہی نصیب ہوگئی۔ تو سب کچھ مل گیا اور ہم ہر آفت سے بچ گئے شعر

میں مجرم ہوں آقا مجھے ساتھ لے لو — کہ رستہ میں ہیں جا بجا تھانہ والے

گر محمد کا ساتھ ہو جائے — پھر تو سمجھے نجات ہو جائے

برات کی دھوم دھام اگرچہ دولہا کے دم قدم سے ہوتی ہے۔ مگر دولہا کے طفیل اس کے ساتھی بھی کھانے وغیرہ سے نوازے جاتے ہیں۔ اور دولہا کے دائمی خدمت گار کھانے کے علاوہ انعامات بھی پاتے ہیں۔ یا ہمیں مشاہدہ کرنے والوں میں سے بنا کہ بوقت موت و قتل جنت وغیرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں جس سے نہ ہمیں قتل کا احساس ہو نہ شدت نزع کا جیسے حضرت آسیہ کو چومیخا کرتے وقت جنت دکھائی گئی۔ شاہد محبوب کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ اگر یہ معنی ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں اپنے محبوبوں کے ساتھ رکھ اکیلا نہ رکھ۔ کیونکہ شیطان اکیلے کو جلدی شکار کرتا ہے۔ نہ مردودوں کے ساتھ رکھ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ (آل عمران ۵۴) مکر کے لغوی معنی پوشیدگی ہیں اس لئے اندھیرے کو مکر کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ مکر الیل رات کا اندھیرا (کبیر) اصطلاح میں خفیہ تدبیر کو مکر کہنے لگے جس کی دوسرے کو خبر نہ ہونے دی جائے یہ دو قسم کا ہے اچھا اور برا فساد کی تدبیر بری ہے۔ اور فسادیوں کو پکڑنے کی خفیہ تدبیر اچھی ڈاکوؤں نے ڈکیتی کی چھپی تدبیریں کیں وہ ملزم ہیں۔ پولیس نے انہیں گرفتار کرنے کی خفیہ تدبیر کی۔ یہ نہایت اچھا۔ اس لئے عربی میں بھی بری تدبیر کو مکر السَّیِّئُ کہتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: ۴۳) اچھی تدبیر کو مکر خیر جیسے وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (آل عمران: ۵۴) بعض نے فرمایا کہ مکر کے لغوی معنی اجتماع و مضبوطی اور پختگی ہیں۔ اسی لئے حسین عورت کو امرۃ ممکورۃ کہتے ہیں۔ یعنی جس میں اسباب حسن جمع ہوں لہٰذا مضبوط فساد بھی مکر ہے۔ اور مضبوط پکڑ بھی مکر بعض نے کہا کہ مکر کے معنی خفیہ فساد ہی ہیں۔ مگر کبھی جرم کے بدلے کو بھی جرم کا نام دے دیتے ہیں۔ جیسے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ (شوریٰ: ۴۰) غرض ان دو مکروں میں بڑا فرق ہے۔ اسی لئے یہ صیغہ دو جگہ استعمال فرمایا۔ یہاں پہلے مکروا کا فاعل وہ یہود ہیں۔ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی سازش کی یعنی ان یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کی بڑی مضبوط خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ نے انہیں بچانے کی اہم اور خفیہ تدبیر فرمائی۔ کہ انہیں زندہ آسمان پر بلا لیا۔ اور انہی کے ایک آدمی کو قتل کرا دیا۔ اس کا واقعہ انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں آئے گا مگر خیال رہے کہ مکر مخالف تدبیر کو کہتے ہیں اور وہ مخالف ہی سے چھپائی جاتی ہے جس کے حق میں ہو اس پر ظاہر کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی اسی تدبیر پر مطلع

فرمادیا جیسا کہ آگے ارشاد ہورہا ہے۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى آیت کے معنی یہ ہوئے کہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف خفیہ تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے یہود کے خلاف خفیہ تدبیر کی۔ چونکہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کا بدلہ ان کے دشمنوں سے خود لیتا ہے اس لئے یہ ارشاد نہ ہوا کہ یہود کے جواب میں عیسیٰ علیہ السلام نے خفیہ تدبیر کی۔ بلکہ فرمایا کہ رب نے تدبیر کی۔ مقبولوں کا دشمن رب کا دشمن ہے۔ اور ان کا دوست رب کا دوست وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ط یہاں خیر سے مراد یا مضبوط ہے یا بہتر یعنی اللہ تمام تدبیر کرنے والوں میں بہتر اور اچھی تدبیر والا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ جب عیسیٰ علیہ السلام نے یہ حکیمانہ کلام اور اپنے معجزات اس قوم کے سامنے پیش کئے تو انہوں نے بجائے اطاعت کے ان کے قتل کی تدبیر کی۔ لہٰذا جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے اس ارادہ اور پختہ کفر کو علامات سے محسوس فرمایا تو اپنے متبعین سے خطاب کیا کہ فی سبیل اللہ میرا مددگار کون ہے۔ ان کے خاص دوستوں نے کہا کہ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ اے عیسیٰ علیہ السلام ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔ اس مدد پر نہ کوئی دنیوی اجرت مانگتے ہیں نہ کوئی اور چیز صرف خواہش یہ ہے کہ آپ قیامت کے دن ہماری اطاعت اور فرمانبرداری اور مسلمان ہونے کی گواہی دیں۔ پھر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر عرض کرنے لگے کہ اے مولیٰ ہم تیری تمام اتاری ہوئی کتابوں اور معجزات پر ایمان لائے۔ اور سچے دل سے ظاہر و باطن میں تیرے اس رسول کے پیروکار بنے۔ لہٰذا تو ہمیں نبی آخرالزمان کے زمرے میں داخل فرمالے جو قیامت میں انبیائے کرام کے گواہ ہوں گے یا ہمارا نام ان کے رجسٹر میں درج فرما۔ اے محبوب ﷺ کفار نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی خفیہ تدبیریں بہت کچھ کیں اور رب تعالیٰ نے انہیں بچانے کی ایسی پختہ اور قوی تدبیر فرمائی جس سے یہود بے خبر رہے اور اللہ تعالیٰ تمام تدبیر کرنے والوں میں بہتر اور قوی تدبیر فرمانے والا ہے۔ کہ اس نے خفیہ طور پر عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر بلالیا اور جو قتل کے ارادہ سے آپ کے پاس آیا تھا اسے عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل کر کے تختہ دار پر لٹکوادیا۔ یہود اب تک حیران ہیں کہ اگر ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی تو ہمارا آدمی کہاں گیا اور اگر اپنے آدمی کو سولی دی تو عیسیٰ علیہ السلام کہاں گئے۔ یقیناً ہماری تدبیر ان کی تدبیر سے قوی ہے اور ہم اعلیٰ تدبیر فرمانے والے ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے کا واقعہ

عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر تشریف لے جانے کے واقعہ میں مفسرین کا قدرے اختلاف ہے ہم ان میں سے قوی روایت تفسیر خازن و روح المعانی و بیان وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو تبلیغ فرمائی تو انہوں نے آپ کے مقابلہ سے عاجز آکر آپ کی شان میں بکواس کرنا' آپ کی والدہ ماجدہ کو تہمت لگانا اور آپ کو ایذا دینا شروع کردی۔ ایک دن آپ شہر میں گشت لگا رہے تھے کہ شہر کے لوگوں نے آپ کو بہت پریشان کیا۔ تب آپ نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ اے مولیٰ اب صبر کا پیالہ بھر چکا۔ ان سب کو سور بنادے آپ کے منہ سے یہ نکلنا تھا کہ وہ سب سور ہی ہو گئے۔ لوگوں پر اس واقعہ سے ہیبت طاری ہوگئی۔ کسی نے بادشاہ وقت یہود کو خبر دی

کہ عیسیٰ علیہ السلام ایسے مقبول الدعا ہیں کہ انہوں نے اتنی جماعت کو سور بنا دیا۔ تو بھی ان کا مخالف ہے اپنی خیر منا۔ کبھی ان کی بددعا سے تیرا بھی یہ ہی حال ہونا ہے۔ اس نے کہا کیا کیا جائے۔ ایسے مقبول بارگاہ کے مقابلہ میں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ وہ بولا کہ انہیں کسی حیلہ سے شہید کر دیا جائے۔ تاکہ ان کی بددعا کا اندیشہ جاتا رہے چنانچہ ایک شخص ططیانوس کو اس کام کے لئے منتخب کیا گیا ططیانوس ایک منافق آدمی تھا جو بظاہر عیسیٰ علیہ السلام کی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اور در پردہ وہ یہود سے ملا ہوا تھا جب یہ واقعہ ہونے والا تھا تب ہی عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرما دیا تھا کہ آج صبح سے پہلے ایک شخص مجھے چند درم کے عوض فروخت کر دے گا ہمیشہ ہی سے پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی رہتے ہیں اور مخلصین کے ساتھ منفقین بھی رہتے ہیں۔ حضور ﷺ کے پاس بھی ایسے ہی مار آستین سانپ دوست نما دشمن تھے۔ وہ حضرات ان منافقوں کو پہچانتے ہیں۔ مگر چشم پوشی سے کام لیتے ہیں۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان سے معلوم ہو رہا ہے۔ چنانچہ ططیانوس کو یہود کی طرف سے تیس درم یعنی ساڑھے سات روپے دینے کا وعدہ کیا گیا اس شرط پر کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو اچانک شہید کر دے۔ یا کرا دے چنانچہ ططیانوس جماعت یہود کو اپنے ساتھ لے کر اندھیری رات میں آپ کے قیام گاہ پر گیا۔ ان سب کو اس گھر کے آس پاس کھڑا کر کے خود اندر داخل ہوا کیا دیکھتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اچانک کھڑکی کے ذریعہ اس حجرہ میں سے نکل کر آسمان پر تشریف لے گئے۔ یہ حیران رہ گیا۔ باہر کے یہودی یہ سمجھے کہ شاید ططیانوس عیسیٰ علیہ السلام سے جنگ کر رہا ہے۔ اس لئے واپسی میں دیر ہوئی۔ رب تعالیٰ نے ططیانوس کو عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا۔ اب یہ باہر آیا اس کے نکلتے ہی ان یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے شبہ میں اسے پکڑ لیا۔ یہ لاکھ چیخا چلایا کہ میں تمہارا ساتھی ہوں حضرت مسیح کو قتل کرنے گیا تھا مگر کسی نے ایک نہ سنی بولے کہ اے عیسیٰ تو نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا اب ہمیں دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر اسے سولی پر چڑھا دیا آج تک عیسائی اس وہم میں مبتلا ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر سولی دے دی گئی۔ اور پھر انہیں دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر پہنچایا گیا۔ اس لئے سارے عیسائی صلیب کو پوجتے ہیں اور اس سولی کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ططیانوس کو سولی دی گئی۔ نہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو۔ فقیر نے اس سولی گاہ اور تمام مقامات کی بیت المقدس میں زیارت کی۔ حضرت مریم کو خبر پہنچی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی۔ آپ ایک عورت کے ساتھ صلیب پر پہنچیں اور اس لٹکی ہوئی لاش کے سامنے بیٹھ کر زار زار رونے لگیں کئی روز تک برابر یہاں آتی تھیں اور روتی تھیں۔ ساتویں روز عیسیٰ علیہ السلام کو حکم الٰہی ہوا کہ جاؤ اپنی ماں کو تسکین دو۔ لہٰذا آپ ایک پہاڑ پر رات کے وقت اترے سارا پہاڑ نور سے منور ہو گیا۔ اپنی والدہ اور حواریوں کو بلایا آپ کی والدہ آپ سے لپٹ کر رونے لگیں۔ اور بولیں اے عیسیٰ تم کہاں۔ فرمایا والدہ محترمہ میں بخیریت ہوں جس کو سولی دی گئی ہے وہ اور شخص ہے۔ تم صبر کرو اپنے حواریوں کو تبلیغ احکام کی ہدایت فرمائی اور سب کے لئے علاقے مقرر کئے۔ کہ فلاں فلاں علاقے میں دین کی خدمت انجام دو یہ سارا کام تقسیم کر کے آپ پھر اوپر چلنے لگے۔ حضرت مریم نے کہا کہ کہاں جاتے ہو۔ فرمایا رب تعالیٰ کے پاس۔ بولیں کب ملو گے۔ فرمایا تم سے قیامت کے دن اور پھر نگاہوں سے غائب ہو گئے۔

نوٹ: حضرت مریم تیرہ سال کی عمر میں حاملہ ہوئیں۔ اور بیت المقدس میں بیت اللحم کے علاقہ میں ایک جنگل میں درخت کے کھجور کے نیچے جو پہلے خشک تھا آپ کے ہاتھ لگنے سے سر سبز اور پھل والا ہو گیا عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش

سکندر کے فتح بابل کے پینسٹھ سال بعد ہوئی۔ اور تیس سال کی عمر میں آپ پر وحی آئی۔ اور تینتیس سال کی عمر شریف میں رمضان کی ستائیسویں رات یعنی شب قدر میں آپ آسمان پر تشریف لے گئے۔ آپ کی والدہ ماجدہ آپ کے بعد چھ سال زندہ رہیں۔ اس حساب سے حضرت مریم کی عمر شریف باون سال ہوئی (تفسیر خازن) فقیر نے اس جگہ کی زیارت کی ہے اب آپ قرب قیامت تشریف لائیں گے۔ دنیا میں چالیس سال قیام فرما کر وفات پائیں گے۔ اس حساب سے عیسیٰ علیہ السلام کی عمر شریف کل تہتر سال ہوگی۔ مدینہ منورہ میں حضور علیہ السلام کے برابر روضہ مطہرہ میں دفن ہوں گے۔ اسی لئے روضہ پاک میں چار قبروں کی جگہ تھی تین بن چکیں اب چوتھی قبر شریف آپ کی ہوگی۔ اور قیامت کے روز یہ چار حضرات ایک ساتھ اٹھیں گے۔ دو نبی اور صدیق و فاروق (حدیث شریف) انشاء اللہ اس کا پورا واقعہ چھٹے سیپارہ سورہ نساء میں آئے گا۔

حواری

اس لفظ کی مکمل تحقیق تفسیر میں ہو چکی۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ لوگ کون اور کتنے تھے بعض نے فرمایا کہ بارہ تھے۔ بعض کے نزدیک انتیس مگر پہلی روایت صحیح ہے۔ ان بارہ حواریوں کے نام لوقا اور مرقس انجیل میں یہ بتائے ہیں (۱) شمعون (پطرس) (۲) اندریاس، (۳) یعقوب بن زبدی، (۴) یوحنا، (۵) فلپس، (۶) برتلمائی، (۷) توما، (۸) متی، (۹) یعقوب ابن حلفی، (۱۰) تدی، (۱۱) شمعون قنانی، (۱۲) یہودا اسکریوتی۔ بعض نے فرمایا کہ یہ لوگ مچھیرے تھے (مچھلی کے شکاری) ایک دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان پر گذرے یہ مچھلی کے شکار میں مشغول تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم میری پیروی کرو تو تم آدمیوں کا شکار کرنے لگو۔ وہ بولے آپ کون ہیں فرمایا عیسیٰ ابن مریم اللہ کا بندہ اور اس کا رسول انہوں نے آپ سے معجزہ طلب کیا۔ اتفاقاً شمعون کے ہاتھ اس دن کوئی شکار نہ آیا آپ نے اسے جال پھینکنے کا حکم دیا آپ کی دعا سے اتنی مچھلیاں پھنس گئیں کہ دو کشتیاں بھر گئیں۔ یہ بارہ کے بارہ سب کچھ چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو لئے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ لوگ رنگریز تھے۔ ان کے ایمان لانے کا واقعہ یوں ہوا کہ حضرت مریم نے عیسیٰ علیہ السلام کو ایک رنگریز کے پاس یہ ہنر سیکھنے کے لئے بھیجا۔ سکھانے والے نے آپ کو اپنے سے بڑھ کر ماہر پایا۔ ایک دن وہ کسی کام کے لئے چلا۔ تو آپ سے کہہ گیا کہ دوکان میں لوگوں کے کپڑے پڑے ہوئے ہیں جو رنگنے کے لئے آئے ہیں۔ ان پر میں نے مختلف نشانیاں لگا دی ہیں جس پر جس رنگ کی نشانی ہو ویسا ہی اسے رنگ دینا اور دیکھو یہ برتنوں میں رنگ گھلے ہوئے رکھے ہیں آپ نے وہ سب کپڑے ایک ہی برتن میں ڈال دیئے جب وہ لوٹ کر آیا تو بولا کہ کپڑے کیا کئے۔ آپ نے فرمایا اس ماٹ میں ہیں وہ بولا سب فرمایا ہاں اس نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا کہ اب میں کپڑے والوں سے جرمانہ کہاں سے بھروں گا۔ تم نے سب کپڑے یکساں رنگ دیئے۔ فرمایا جا اللہ کا نام لے کر نکال۔ وہ گیا جب گیا تو ہر کپڑے کا رنگ مختلف تھا۔ آپ نے فرمایا یہ تو کپڑے ہیں مجھے تو رب نے انسانوں کو رنگنے کی قدرت بخشی ہے یہ دیکھ کر وہ اور اس کے ساتھی ایمان لے آئے۔ اور یہ لوگ آپ کے حواری بنے۔ قفال فرماتے ہیں کہ ان روایات میں مطابقت یوں ہے کہ حواری ایک ہی قسم کے لوگ نہ تھے بلکہ ان میں کوئی دھوبی تھا کوئی رنگریز تھا اور کوئی مچھیرا اور کوئی بادشاہ جیسے ہمارے حضور ﷺ کے صحابہ کرام (روح المعانی و خازن وغیرہ) شعر:۔

لگایا تھا مالی نے ایک باغ ایسا نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

بعض علماء فرماتے ہیں کہ کل قیامت میں ان حواریوں کا حشر امت مصطفیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہوگا کیونکہ انہوں نے دعا مانگی تھی فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ خداوندا ہمیں امت مصطفیٰ علیہ السلام کے ساتھ لکھ دے۔ جو کہ نبیوں کے گواہ ہیں۔ جیسا کہ بعض کلمہ گو مسلمانوں کا حشر عیسائیوں اور یہودیوں کے ساتھ ہوگا۔ جنہیں دنیا میں ان سے محبت ہے۔ قیامت میں ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے دنیا میں محبت کرتا رہا ہے۔ حواری تو پھر انسان ہیں اصحاب کہف کا کتا انسانی شکل میں اصحاب کہف کے ساتھ جنت میں جائے گا۔ کیوں؟ اسی لئے کہ وہ اگرچہ کتا ہے مگر رب کے پیاروں سے محبت کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اچھوں کی صحبت نصیب کرے۔

حواریوں کی تبلیغ: محمد ابن اسحاق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر تشریف لے جانے کے بعد یہود نے حواریوں کو بہت ستایا اور انہیں بہت دکھ دیئے۔ یہ خبر کسی طرح بادشاہ روم داؤد ابن نوزہ کو پہنچی کہ شام میں ایک بزرگ پیدا ہوئے تھے۔ جنہوں نے دعویٰ نبوت فرمایا انہیں تو یہود نے سولی دے دیا۔ اور اب ان کے جانشین یہود کے ہاتھوں سخت مصیبت میں ہے۔ اس نے شاہ یہود سے سفارش کر کے ان حضرات کو اپنے ملک روم میں بلایا اور ان میں سے عیسیٰ علیہ السلام کے حالات سن کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر بنی اسرائیل پر حملہ کر کے ان کا قتل عام کیا۔ اس وجہ سے روم میں نصرانیت خوب پھیلی۔ پھر چالیس سال کے بعد شاہ طیطوس داؤد کا جانشین ہوا۔ اور اس نے بیت المقدس پر حملہ کر کے وہاں کے تمام یہود کو غارت کیا۔ شہر کو بالکل ویران کر دیا۔ کچھ یہود طیطوس کے ہاتھوں مارے گئے۔ اور کچھ جان بچا کر بھاگ گئے جن میں سے دو قبیلے بنی قریظہ اور بنی نضیر حجاز میں آباد ہوگئے۔ جو مسلمانوں کے ہاتھوں مدینہ منورہ سے کچھ نکالے گئے کچھ مارے گئے (تفسیر کبیر و روح المعانی وغیرہ) مکر اللہ کے یہ معنی ہوئے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** غیر اللہ سے مدد مانگنا جائز بلکہ سنت انبیاء ہے۔ بلکہ سنت الٰہیہ ہے۔ کہ رب نے فرمایا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (محمد: ۷) یہ استمداد اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے خلاف نہیں دیکھو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ حضرت سکندر ذوالقرنین نے فرمایا تھا وَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ (کہف: ۹۵) بلکہ عیسائیوں کو نصاریٰ اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ صحابہ کرام کی ایک جماعت کا نام انصار ہے کیونکہ انہوں نے دین کی مدد کی تھی۔ **دوسرا فائدہ:** مقبولان خدا کی خدمت رب کی اطاعت ہے۔ کہ حواریوں نے اپنے آپ کو اسی لئے انصار اللہ کہا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار تھے۔ **تیسرا فائدہ:** دنیا میں تو امتی نبی کی گواہی دیتے ہیں۔ مگر قیامت میں نبی انشاء اللہ امت کے ایمان کی گواہی دیں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرۃ: ۱۴۳) ہم کو چاہیے کہ ہم حضور علیہ السلام اور مقبولان بارگاہ الٰہی کو اپنے ایمان کا گواہ بنالیں زائرین مدینہ سلام الوداع میں الوداعیہ کلمات کے ساتھ یہ بھی عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ علیہ السلام حضور گواہ رہیں کہ میں آپ کا امتی ہوں پڑھتا ہوں لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ان کلمات کی اصل یہ آیت کریمہ ہے۔ دیکھو حواریوں

نے عرض کیا کہ آپ ہمارے اسلام کے گواہ بن جائیں۔ **چوتھا فائدہ:** اسلام اور ایمان ایک ہے کیونکہ حواریوں نے ایمان لاکر اپنے کو مسلم کہا (خزائن وعرفان) **پانچواں فائدہ:** پچھلے پیغمبروں کا دین اسلام تھا نہ کہ یہودیت ونصرانیت جیسا کہ مُسْلِمُوْنَ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ (خزائن العرفان) **چھٹا فائدہ:** کبھی کام کی جزا کو اصل کام کا نام دے دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مَکَرَ اللّٰهُ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** اصل لغت میں مکر کے معنی برے نہیں تھے۔ مگر اب دھوکے اور فریب کو مکر کہنے لگے اور اردو میں تو یہ لفظ بہت ہی برا ہے۔ لہٰذا اب نہ تو عربی میں مکر کو رب کی طرف نسبت کر سکتے ہیں۔ نہ اردو میں اختلاف زمانہ اور وجہ بدل جانے سے احکام بدل جاتے ہیں (خزائن العرفان) قرآن پاک میں یہ لفظ جہاں ہیں اللہ کے لئے آیا ہے اس کے معنی خفیہ تدبیر کئے جائیں۔ **ساتواں فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام نہ تو سولی پر شہید ہوئے اور نہ تختہ دار سے چھٹکارا پاکر کشمیر وغیرہ میں چھپے پھرے۔ جیسا کہ فی زمانہ مرزائیوں کا عقیدہ ہے۔ وہ یہ سمجھے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کشمیر میں تشریف لاکر نہایت گمنامی کی حالت میں وفات پائی۔ کیونکہ پھر مکر اللہ کے کوئی معنی نہیں بلکہ اس صورت میں یہودیوں کا مدعیٰ پورا ہوگیا کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی دانست میں ذلیل کر کے سولی بھی دے دی۔ اور ان سے اپنے ملک کو خالی بھی کرلیا۔ انشاء اللہ اس کی پوری تحقیق اگلی آیت میں آئے گی۔ **آٹھواں فائدہ:** حضرات انبیاء کی مدد کرنا تقاضاء ایمان ہے۔ دیکھو حواریوں نے نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فرما کر اٰمَنَّا بِاللّٰهِ کہا۔ ان کی خدمت سے منہ موڑنا کفر کی علامت ہے۔ استاد شیخ کی خدمت کی اصل یہ آیت ہے۔ **نواں فائدہ:** موقعہ سے فائدہ اٹھانا خوش نصیبوں کا طریقہ ہے۔ ہر تجارت کا کوئی سیزن ہوتا ہے تجارت آخرت کا بھی سیزن مقرر ہے۔ دیکھو ان حواریوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ **دسواں فائدہ:** ایسے موقعہ پر خادم مخدوم سے کچھ مانگ لے۔ دیکھو ان حواریوں نے اپنی خدمت کا وعدہ کرتے ہوئے عرض کیا وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ حضرت ربیعہ نے ایک موقعہ پر عرض کیا تھا کہ یارسول اللہ میں جنت میں آپ کے ساتھ رہنا مانگتا ہوں۔ حضرت سراقہ ابن مالک نے ہجرت کے غار میں حضور سے اپنے لئے امان مانگ لی۔ موسیٰ علیہ السلام کی بڑھیا نے ایک خدمت کے عوض اپنے لئے جنت مانگ لی۔ غرضیکہ ایسے موقعہ پر مانگنے سے نہ چوکے۔ **گیارھواں فائدہ:** تقیہ کرنا ہمیشہ سے ایمان کے خلاف رہا' دیکھو ان حواریوں نے اپنے ایمان کا اعلان فرمایا اور عیسیٰ علیہ السلام نے ایسے نازک وخطرناک موقعہ پر اپنا انتظام تو کیا مگر تقیہ کر کے اپنا دین نہ چھپایا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں جہاد نہ تھا۔ پھر آپ کو حواریوں سے مدد لینے کی کیا ضرورت تھی کہ آپ نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ؟ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا۔ کہ اس سے یہود کے مقابلہ میں آپ کی مدد کرنا اور ان کے شر سے بچانا مراد ہے۔ یا اس راز کو چھپانا مقصود۔ بعض لوگوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے خطاب کیا کہ تم میں سے کوئی میری جگہ شہید ہونا منظور کرے اس کو میرا ہمشکل کر دیا جائے اور وہ سولی کھائے۔ میں آسمان پر چلا جاؤں گا۔ ان سب نے منظور کرلیا مگر یہودا نے سولی کھائی۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔ کیونکہ ہم پہلے عرض کر چکے کہ سولی کھانے والا ططیانوس منافق تھا (روح المعانی وغیرہ) **دوسرا اعتراض:** کفر ایک باطنی چیز ہے جس کا احساس

ناممکن۔ پھر فَلَمَّا اَحَسَّ کیوں فرمایا گیا؟ **جواب:** اس کے جوابات تفسیر میں گذر چکے۔ کہ یا تو احساس بمعنی یقین ہے اور یا کفر سے علامات کفر مراد ہیں۔ اور یا نگاہ انبیاء کرام غیر محسوس چیزوں کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ جیسے ہمارے خواب و خیال۔

تیسرا اعتراض: جو دھوکا کھاتا ہے یا مکر و فریب کرتا ہے وہ نیک آدمی ہی نہیں کہلایا جا سکتا چہ جائیکہ اسے خدا کہا جائے۔ بھلا خدا بھی کہیں فریب کر سکتا ہے (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** پنڈت جی عجیب دماغ آدمی ہیں۔ اردو کا لفظ لے کر عربی قرآن پاک پر اعتراض کر رہے ہیں۔ عربی میں مکر کے معنی وہ ہیں جو ہم نے تفسیر میں بتائے اردو میں فریب کو مکر کہتے ہیں اور قرآن اردو میں نہیں عربی میں ہے۔ انگریزی میں بک (Book) کے معنی ہیں کتاب۔ اردو میں اس کے معنی ہیں گھونسا (مکا) اگر کسی انگریزی کتاب میں لکھا ہوا۔ کہ سپاہی نے بادشاہ کو بک دیا۔ تو اس کے معنی یہ نہیں کہ گھونسا مار دیا۔ فارسی میں مہتر کے معنی ہیں سردار۔ اردو میں بھنگی کو مہتر کہتے ہیں۔ اگر کسی فارسی کتاب میں بادشاہ کو مہتر لکھا ہو تو شاید آپ جیسے عقلمند اس کے معنی بھنگی کریں گے۔ سنسکرت میں سور سورج کو بھی کہتے ہیں اور بہادر کو بھی مگر اردو میں سور کو کہتے ہیں اب شاید پنڈت جی اس شعر کے معنی کہ

بڑن کو دکھ بہت ہے اور چھوٹن سے دکھ دور تارے سب نیارے رہیں گہن چاند اور سُور

یہ کریں گے کہ چاند اور سورج کو گہن لگتا ہے یہ اعتراض زبان سے نادانی پر مبنی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جب عیسیٰ قلب نے قویٰ نفسانیہ کے کفر یعنی محجوبیت اور انکار اور مخالف ربانی کا یقین کر لیا تو قویٰ روحانیہ سے خطاب کر کے کہا کہ میں اب نفسانی شیاطین سے منہ موڑ کر رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ اس کام میں میری کون مدد کرے گا۔ قویٰ روحانیہ کے حواری جو قلب مومن کے خالص دوست ہیں کہنے لگے کہ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور نور روح سے منور اور دلائل عقلیہ پختہ ہو چکے ہیں۔ اے عیسیٰ قلب تو گواہ رہ کہ ہم تیرے مددگار ہیں۔ اے مولیٰ ہم تیرے اتارے ہوئے علم توحید اور فیض نور پر ایمان لا چکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان لوگوں میں شامل فرما جو تیری بارگاہ میں حاضر' تیرے حکم کے منتظر اور تیری واحدانیت کے گواہ ہیں۔ پھر وہم اور خیالات نے قلب کو دھوکا دینے اور اسے مختلف شبہات میں پھنسانے کی بہت تدبیر کی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے دلائل عقلیہ اور ان میں براہین یقینیہ سے قلب کی مدد کی۔ جو اس کے خیالات و شکوک کو دور کریں۔ اور عیسیٰ قلب کو آسمان روح کی طرف پہنچا دیا۔ اور نفس کو قلب کا ہم رنگ بنا کر ان شبہات پر چھوڑ دیا۔ کہ وہ ان میں گرفتار رہے۔ اللہ کی تدبیر نہایت غالب ہے (ابن عربی) خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی تدبیر سے صوفی بہت ڈرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بندہ کا ہر وقت نافرمانی کرنا' اور رب تعالیٰ کا ہمیشہ کرم فرمانا یہ بھی غضب الٰہی کی نشانی ہے۔ اس انعام پر خوش نہ ہونا چاہیے۔ اس نے خود خبر دی کہ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (اعراف: ۱۸۲) حضرت سہل فرماتے ہیں کہ مکر اللہ کے معنی ہیں انہیں نعمتوں سے امداد دی' اور شکر کی توفیق نہ دی۔ جب وہ نعمتوں میں پھنس کر نعمت والے کو بھول گئے۔ تو فوراً پکڑ لئے گئے۔ ابو العباس نے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ان کی خطاؤں پر ہم نے عطائیں کیں۔ اور استغفار کی طرف ان کا دھیان نہ گیا۔ اس لئے وہ رب تعالیٰ [illegible] کے [illegible] اہمال نہیں یعنی دیر ہے اندھیر نہیں۔ امام احمد بن حنبل نے

اپنے ساتھیوں کو وصیت فرمائی کہ عدل سے ڈر کر فضل میں ترقی کرو۔ اور رب تعالیٰ کے مکر سے بے خوف نہ ہوؤ۔ یہاں کی آسائش سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ اپنے باپ آدم علیہ السلام کا واقعہ یاد رکھو۔ کہ وہ جنت جیسی محفوظ جگہ میں رہ کر مصیبت میں پھنس گئے۔ صوفیاء کرام کے نزدیک زیادتی نہ ہونا نقصان ہے۔ (روح البیان)

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جو بندہ فنافی اللہ ہو جاتا ہے۔ اس کے حواس میں ربانی طاقتیں آجاتی ہیں۔ وہ رب کی قوت سے دیکھتا' سنتا' چھوتا' بولتا اور چلتا ہے۔ جیسے بجلی کی فٹنگ میں پاور کام کرتا ہے ایسے ہی جس کا کنکشن رب تعالیٰ سے ہو جائے وہ ربانی طاقتوں سے کام کرتا ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں بیٹھے ہوئے مصر سے پیراہن یوسفی کی خوشبو پالی۔ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ (یوسف: ۹۴) حضرت سلیمان علیہ السلام نے تین میل دور سے چیونٹی کی بولی سن لی اور سمجھ لی فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا (النمل: ۱۹) حالانکہ سائنس دان کہتے ہیں کہ چیونٹی کی آواز سننا طاقت بشری سے باہر ہے۔ حضرت آصف برخیا پل بھر میں فلسطین سے یمن پہنچ کر تخت بلقیس لے آئے۔ اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ (النمل: ۴۰) ہمارے حضور ﷺ نے مدینہ منورہ سے بحالت نماز ہاتھ بڑھایا تو جنت کا خوشہ پکڑ لیا۔ یہ ہے ان بزرگوں کی قوت سامعہ ناطقہ لامسہ وغیرہ۔ جب آج سائنس نے ٹیلی فون کے ذریعہ قوت سامعہ دوربین کے ذریعہ قوت باصرہ ریڈیو کے ذریعہ قوت ناطقہ کو اتنا تیز کر دیا ہے۔ تو خدائی سائنس کا کیا پوچھنا۔ غرضیکہ ان حضرات کی یہ قوت نہایت قوی' پھر جیسے ظاہر کھانوں پھلوں میں مختلف خوشبوئیں بدبوئیں ہیں۔ ایسے ہی ایمان و کفر' نیکوں اور بدکاروں میں مختلف خوشبوئیں بدبوئیں ہیں جسے اللہ والے محسوس کر لیتے ہیں۔ جب یہ سمجھ لیا تو یہ بھی سمجھ لو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی خداداد سونگھنے کی قوت سے ان یہود کے کفر کی بدبو سونگھ لی جو آپ کے قتل کے درپے تھے۔ یہ معنی ہیں فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ کے نیز صوفیاء فرماتے ہیں کہ خوف ایذا کا بھی ہوتا ہے۔ یہ خوف نفرت پیدا کر دیتا ہے جیسے سانپ کے خوف اور خوف اطاعت کا بھی ہوتا ہے جیسے حاکم سے خوف حضرات انبیاء اولیاء کو مخلوق سے خوف ایذاء ہوتا ہے۔ دیکھو عیسیٰ علیہ السلام کو ان یہود سے خوف ہوا تو اپنا مددگار ڈھونڈا۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے خوف ہوا تو اپنے بھائی ہارون کی نبوت کی درخواست کی۔ مگر انہیں خوف اطاعت بجز پروردگار کسی کا نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ آیت لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ کے خلاف نہیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰۤى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ

جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ تحقیق میں پورا کرنے والا ہوں تمکو اور اٹھانیوالا ہوں تمہیں طرف اپنے اور پاک کرنیوالا ہوں تمکو

اور یاد کرو جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤ نگا اور تجھے اپنی طرف اٹھاؤ نگا اور تجھے

مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ

ان سے جنہوں نے کفر کیا اور کرنے والا ہوں ان کو جنہوں نے پیروی کی تمہارے اوپر ان کے

کافروں سے پاک کرونگا اور تیرے پیروں کو

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ
جنہوں نے کفر کیا دن قیامت تک پھر طرف میرے لوٹنا ہے تمہارا
قیامت تک تیرے منکروں پر غلبہ دوں گا پھر تم سب میری طرف پلٹ کر آؤ گے
فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾
پس فیصلہ کرونگا میں درمیان تمہارے بیچ اس کے کہ تھے تم اس میں اختلاف کرتے
تو میں تم میں فیصلہ فرماؤں گا جس بات میں جھگڑتے ہو

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی خفیہ تدبیر کا اجمالی ذکر ہے۔ اب اس تدبیر کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے کیا تدبیر فرمائی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بچانے کی خفیہ تدبیر فرمائی جس میں شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید اس تدبیر کی عیسیٰ علیہ السلام کو بھی پہلے سے خبر نہ دی گئی ہو۔ اب اس شبہ کو دور کیا جا رہا ہے۔ کہ نہیں انہیں تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ یہ راز صرف یہود سے چھپایا گیا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ فضائل بیان فرمائے گئے۔ اب بھی ان کے بقیہ فضائل ہی ارشاد ہو رہے ہیں۔ کہ رب تعالیٰ نے انہیں خاص طور پر بغیر موت آسمان پر اٹھایا۔ **چوتھا تعلق:** ہم پہلے عرض کر چکے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا دنیا میں آنا بھی معجزہ ہے۔ یہاں رہنا بھی معجزہ اور ان کا یہاں سے تشریف لے جانا بھی معجزہ۔ پچھلی آیتوں میں ان کے یہاں آنے اور رہنے کا ذکر کیا گیا تھا اب ان کے یہاں سے تشریف لے جانے کا ذکر ہے۔ گویا دو قسم کے معجزات کے بعد اب ان کے تیسرے معجزے کا بیان ہے۔

تفسیر

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ یہ اذ یا مکر اللہ کا ظرف ہے یا پوشیدہ فعل وقع ذالک کا یا اذکر کا۔ پہلی صورت میں یہ جملہ مکر کا ظرف ہے اور اخیری دو صورتوں میں نیا جملہ ہے یعنی یہ تدبیر اللہ نے جب فرمائی تھی جب عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا یا یہ واقعہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے یہ فرمایا اے محبوب ﷺ وہ وقت بھی یاد کرو جب رب تعالیٰ نے فرمایا (روح المعانی وغیرہ) اور ہوسکتا ہے کہ اذ تعلیلیہ ہو۔ اور یہ جملہ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ کی دلیل ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمام تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس نے ایسے نازک موقعہ پر اس طرح بچا لیا اس صورت میں پتہ لگا کہ حضرات انبیاء کرام اور ان کے واقعات۔ رب تعالیٰ کی ذات و صفات کے دلائل ہیں۔ اور دعویٰ توحید کے گواہ ہمیشہ دوست کا سارا زور دلائل و گواہ پر ہی ہوتا ہے مدعی کے دوست گواہوں کے حامی ہوتے ہیں۔ اور مخالف دھڑے والے گواہوں پر چوٹ کرتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات کے منکر رب کے حزب مخالف ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ خبر عیسیٰ علیہ السلام کو جب دی گئی جب انہیں یہود سے خطرہ قتل ہو چکا تھا جس کا ذکر فَلَمَّاۤ اَحَسَّ الخ میں ہوا۔ یٰعِیْسٰی سے اخیر تک قال کا مقولہ ہے۔ حق

یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے جناب مسیح کو اپنی اس مدد کی خبر پہلے ہی دے دی تھی۔ مگر اس خبر کے باوجود آپ نے اپنے حواریوں سے مدد طلب کی حضرات انبیائے کرام کا امداد طلب فرمانا یا کبھی بظاہر پریشان ہونا یا اپنے بچاؤ کی تدبیریں کرنا یا سامان جنگ منع کرنا بے خبری کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ وہ سب کچھ جان کر سب کچھ کرتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام جانتے تھے کہ مجھے بخیریت آسمان پر اٹھالیا جائے گا۔ رب نے انہیں پہلے ہی خبر دے دی تھی۔ مگر پھر بھی حواریوں کو امداد کے لئے پکارا۔ نبی کریم ﷺ نے خود ہی بدر میں مارے جانے والے کفار کے نام بتائے۔ بلکہ ان کے جائے قتل پر نشان لگا دیئے۔ اور یہ بھی بتایا کہ کفار مکہ کا لایا ہوا سارا جنگی سامان کل مسلمانوں کو غنیمت میں ملے گا۔ اس کے باوجود رو رو کے مسلمانوں کی فتح کی دعائیں بھی مانگ رہے ہیں۔ اور جنگی تدبیریں بھی فرما رہے ہیں۔ اور احتیاطیں بھی یہ تمام کام امت کی تعلیم کے لئے ہیں عائشہ صدیقہ کو تہمت لگی۔ حضور ﷺ جانتے ہیں کہ وہ پاک دامن ہیں مگر پھر بھی وہ تحقیقات کر رہے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی قیامت میں تحقیقات کر کے فیصلہ فرمائے گا۔ متوفی کا مادہ وفاء ہے۔ بمعنی پورا کرنا' رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (النجم: ۳۷) اور فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ (النساء ۱۷۳) اسی سے استیفاء۔ توفیہ اور توفی بنا۔ بمعنی پورا دینا۔ یا پورا لینا۔ موت کو وفات اسی لئے کہتے ہیں کہ اس سے عمر پوری ہو جاتی ہے۔ اصطلاح میں اکثر موت اور نیند پر بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ قرآن کریم میں تینوں معنی میں استعمال ہوا۔ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى (النجم: ۳۷) یہاں وفات سے حقیقی معنی مراد ہیں۔ پورا کرنا۔ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ (انعام ۶۰) یہاں بمعنی نیند ہے وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا (بقرہ: ۲۳۴) میں بمعنی موت جیسا قرینہ ویسے معنی مراد ہوتے ہیں۔ یہاں تینوں بن سکتے ہیں۔ یعنی اے عیسیٰ میں تمہیں پورا پورا مع جسم اور روح لینے والا ہوں اس طرح کہ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ اپنی طرف مع جسم سے اٹھانے والا ہوں اس صورت میں رافعک عطف تفسیری ہے۔ یا اے عیسیٰ میں تمہیں پوری پوری عمر دوں گا یہ تمہیں قتل نہیں کر سکتے اور ابھی تمہیں اپنی طرف اٹھاؤں گا۔ اس صورت میں واؤ عاطفہ ہے اے عیسیٰ تمہیں موت میں دونگا بلا واسطہ قتل اور ابھی تمہیں اپنی طرف اٹھاؤں گا۔ ان دونوں صورتوں میں واؤ عاطفہ ہے۔ اگر یہ عبارت خلاف ترتیب آپ کی موت اٹھانے کے بعد ہوگی۔ جیسے وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ (آل عمران: ۴۳) جیسے خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۲۱) یا جیسے وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (الزمر: ۶۵) یا جیسے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ (الملک: ۲) یا جیسے نَمُوْتُ وَنَحْيَا (مومنون: ۳۷) یا خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى (طٰہٰ: ۴) ان سب آیتوں میں عبارت واقعی ترتیب کے خلاف ہے۔ یا اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے عیسیٰ میں تمہیں سلانے والا اور پھر اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ اس صورت میں یہ واؤ عاطفہ ہے۔ اور عبارت ترتیب کے مطابق کیونکہ آپ کو سلا کر اٹھایا گیا۔ تاکہ آپ کو اتنے دراز سفر میں وحشت نہ ہو۔ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ یہ عبارت بظاہر مُتَوَفِّيْكَ پر معطوف ہے۔ رافع رفع سے بنا جس کے معنی ہیں اٹھانا اور بلند کرنا۔ یہ بلندی مکانی کے لئے بھی آتا ہے۔ اور بلندی مراتب کے لئے بھی اگر اس کا مفعول کوئی جسم ہوگا تو اس سے مکانی بلندی مراد ہوگی جیسے وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ (یوسف: ۱۰۰) یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر اٹھالیا یا جیسے وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (بقرہ: ۶۳) ہم نے بنی اسرائیل پر طور اٹھالیا۔ حدیث معراج میں ہے کہ ثُمَّ رُفِعْتُ اِلَى السِّدْرَةِ الْمُنْتَهٰى پھر میں اٹھایا گیا سدرۃ المنتہیٰ کی طرف چونکہ ان عبارتوں میں رفع کا مفعول

زمینی جسم ہے۔ اس لئے ان میں مکانی بلندی مراد ہے۔ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ (بقرۃ:۱۲۷) میں بھی دیواریں اٹھانا ہی مراد ہے اگرچہ اٹھانے کی نوعیت کچھ اور ہے اور اگر رفع کا مفعول جسم نہیں کوئی اور چیز ہو تو وہاں روحانی بلندی مراد ہوتی ہے۔ جیسے وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ (بقرۃ ۲۵۳) یا وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ (الانشراح:۴) یا جیسے اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ (النور:۳۶) ان میں رفع کا مفعول ذکر یا نام یا درجے ہیں۔ اور یہ جسم نہیں لہٰذا یہاں بلندی روحانی مراد ہے۔ چونکہ اس آیت میں وَرَافِعُکَ فرمایا گیا جس سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں۔ جو جسم ہیں اس لئے یہاں مکانی بلندی مراد ہوگی نہ کہ درجات کی۔ نیز اگر یہاں بلندی درجات مراد ہوتی تو وہ شہادت سے نصیب ہوتی ہے۔ نہ کہ اپنی طبعی موت سے تو یہ جز مُتَوَفِّیْکَ کے موافق نہ ہوتا۔ پھر تو یوں فرمایا جاتا کہ ہم تمہیں یہود کے ہاتھوں میں شہید کرا دیں گے۔ اور شہادت کے ذریعہ تمہارے درجات بلند کریں گے۔ اِلَیَّ رَافِعُکَ کے متعلق ہے۔ اور الیٰ انتہائے غایت کے لئے۔ یہاں الی سے آسمان کی طرف اٹھانا مراد ہے۔ اگرچہ ہر جگہ خدا کی ہے مگر چونکہ آسمان خصوصیت سے تجلی گاہ الٰہی ہے۔ کہ نہ وہاں کسی کی ظاہری سلطنت ہے۔ نہ وہاں کفر، شرک، گناہ۔ اس لئے اس طرف اٹھانے کو رب تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھانا قرار دیا۔ فرماتا ہے ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ (ملک:۱۶) یا فرماتا ہے اِرْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ (فجر:۲۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شام کی طرف جاتے وقت فرمایا۔ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (الصّٰفّٰت: ۹۹) دیکھو ابراہیم علیہ السلام جا تو رہے علاقہ موصل سے شام کی طرف مگر فرماتے ہیں کہ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں کیوں؟ اس لئے کہ مجھے سرزمین شام میں عبادت الٰہی کی آزادی ہوگی۔ آج بھی خانہ کعبہ یا مدینہ منورہ کی طرف جانے والا کہتا ہے کہ میں رب کے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ حالانکہ ساری زمین اور سارے مکانات اللہ تعالیٰ کی ہی ملک میں ہیں ایسے ہی یہاں فرمایا گیا وَرَافِعُکَ اِلَیَّ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ اس سے مراد ہے۔ رَافِعُکَ اِلَیَّ مَحَلَّ کَرَامَتِیْ نیز تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ وفات ایک جنس ہے۔ جس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بعض موت سے ہوتی ہیں۔ اور بعض آسمان پر اٹھانے سے۔ رَافِعُکَ اِلَیَّ نے وفات کو مقرر کر دیا کہ وہ موت نہ ہوگی۔ بلکہ اٹھانے سے ہوگی۔ لہٰذا آیت میں تکرار نہیں ہے۔ وَمُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (آل عمران:۵۵) یہ لفظ تطہیر سے بنا جس کا مادہ طہر ہے بمعنی پاکی اور صفائی خباثت سے دور کرنا تطہیر روحانی ہے' نجاست سے دور کرنا پاکی جسمانی' لیکن خبیثوں سے نجات دینا۔ اور ان سے الگ کر دینا ذاتی پاکی۔ یہاں تیسرے معنی مراد ہیں کیونکہ یہاں خبیثوں کا ذکر ہے۔ نہ کہ خباثتوں کا یعنی میں تمہیں کافروں سے نکال لوں گا۔ کہ آسمان پر بلاؤں گا یا ان سے نجات دوں گا۔ یہ تمہیں قتل نہ کر سکیں گے۔ (خازن و مدارک وغیرہ) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یہاں بجائے تخلیص کے تطہیر فرمانے میں عیسیٰ علیہ السلام کی انتہائی عظمت شان ہے۔ اور اس سے کفار میں اور عیسیٰ علیہ السلام میں مکانی فاصلہ کر دینا مراد ہے۔ کہ کفار زمین پر رہ جائیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر بلا لئے جائیں۔ ایک جگہ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ (المدثر:۴) اپنے کپڑے پاک رکھو۔ یہاں نجاستوں سے پاکی مراد ہے۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا (احزاب:۳۳) یعنی اے اہل بیت رسول اللہ چاہتا ہے کہ تم سے گندگیاں دور کرے اور تمہیں خوب پاک کر دے [illegible] گندگی سے تو پہلے ہی پاک ہوتے ہیں۔ اس

لئے یہاں یہ پاکی مراد نہیں ہوسکتی خیال رہے کہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو کفار سے نجات پہلے تو اس طرح دی کہ کفار زمین پر رہے۔ اور آپ کو آسمان پر اٹھالیا اور قرب قیامت اس طرح نجات دے گا کہ جب آپ زمین پر آئیں گے تو زمین سے کفار ختم کردیئے جائیں گے۔ کہ یا تو وہ ایمان لے آئیں گے یا قتل کردیئے جائیں گے اور آپ کے زمانہ میں روئے زمین پر کوئی کافر نہ رہے گا۔ یہ جملہ دونوں قسم کی پاکیوں کو شامل ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یہ عبارت مُطَهِّرُکَ پر معطوف ہے۔ اور جاعل متعدی بیک مفعول ہے۔ یا تو متبعین سے عیسیٰ علیہ السلام کے حواری مراد ہیں۔ اور کفروا سے یہودی اور فوقیت سے مطلق غلبہ مراد خواہ دینی ہو یا دنیوی۔ خیال رہے کہ یہاں اتبعوا سے مراد عیسیٰ السلام کے اقوال اور بعض اعمال کی اتباع ہے کیونکہ ان کے سارے اعمال کی اتباع ناممکن ہے۔ ان سرکار نے نہ شادی کی نہ بچوں کی پرورش نہ مکان بنایا۔ نہ حکمرانی کی۔ مگر حواریوں نے یہ سارے کام کئے۔ سارے احکام و فرمان کی مکمل اتباع صرف حضور ﷺ کی ہی ہوسکتی ہے۔ یا اِتَّبَعُوْا سے قیامت تک کے مومنین مراد ہیں۔ اور کَفَرُوْا سے آپ کے منکر اور فوق سے غلبہ دلائل یا غلبہ تلوار مراد۔ یہ ہی حسن اور ابن جریر وغیرہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ کیونکہ ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام بلکہ سارے نبیوں کے فرمانوں کا متبع ہے۔ کہ سب نے حضور ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ یا متبعین سے عیسائی مراد ہیں۔ اور کفار سے یہودی یعنی آپ کے مدعیان محبت کو آپ کے منکروں پر غلبہ دوں گا۔ خواہ تلوار سے خواہ حکومت دے کر خواہ اسی طرح آپ کا دین یہودیت کا ناسخ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ہر جگہ عیسائی یہودیوں پر غالب ہیں (روح المعانی وغیرہ) اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ یہ جار مجرور اور فاعل کے متعلق ہے۔ یا ثابت پوشیدہ کے اور قیامت کا دن مومنین کے دنیوی غلبہ کی انتہا ہے نہ کہ کفار کی مغلوبیت کی یا یہ کلام ہمیشگی بتانے کے لئے ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں قیامت تک یہاں ہی رہوں گا یعنی ہمیشہ رہوں گا۔ یعنی اے عیسیٰ علیہ السلام آپ کی اتباع کرنے والوں کو آپ نے منکرین پر قیامت تک یا ہمیشہ غلبہ دوں گا۔ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ ثم تاخیر کے لئے ہے اور مرجع مصدر میمی ہے۔ بمعنی لوٹنا' کم میں عیسیٰ علیہ السلام اور کفار سے خطاب ہے۔ مگر تغلیباً سب کو کم فرما دیا گیا۔ اِلَیَّ کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ یعنی پھر قیامت کے بعد اے مسلمانوں اور کافرو تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے۔ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ یہ ف عاطفہ اور اَحْکُمُ کا تعلق مَرْجِعُکُمْ سے ہے۔ حکم بمعنی قضا اور فیصلہ یعنی اس رجوع کے بعد فوراً ہی میں تم مسلمانوں اور کفار کے درمیان فیصلہ فرماؤں گا۔ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ مَا سے مراد یا تو ساری دینی چیزیں ہیں۔ یا عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات اور فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ فرماؤں گا۔ جس میں اے مسلمانوں اور کفارو تم دنیا میں اختلاف کرتے تھے۔ اس طرح کہ مومنوں کو جنت میں اور کافروں کو جہنم میں بھیجوں گا۔ ورنہ کلامی فیصلہ تو آسمانی کتابوں سے بھی ہو چکا۔

خلاصه تفسیر

اے محبوب ﷺ وہ وقت بھی یاد کرو جب عیسیٰ علیہ السلام کو دشمن یہودیوں کی طرف سے سخت خطرہ محسوس ہوا۔ تو ہم نے فوراً ان پر وحی بھیجی۔ کہ اے عیسیٰ آپ بالکل خوف نہ کریں۔ ہم آپ کو آپ کی پوری عمر تک پہنچا کر خود وفات دیں گے ان کی کیا طاقت جو آپ کا بال بیکا کرسکیں۔ اور ہم آپ کو اپنی طرف یعنی آسمان پر بلالیں گے۔ جہاں یہود کیا کسی کی حکومت نہیں۔ اور

جہاں نہ کوئی آپ کی مخالفت کرے گا نہ کوئی مقابلہ۔ آپ ہماری حفظ و امن میں ہوں گے اور ہم آپ کو ان کفار سے نجات دیں گے۔ اور ان سے دور کریں گے یہ زمین پر رہیں گے اور آپ آسمان پر اور یہ کرم آپ کی ذات کے لئے خاص نہ ہوگا بلکہ آپ کی پیروی کرنے والوں کو آپ کے منکروں پر قیامت تک دینی حیثیت سے فوقیت اور غلبہ دیں گے کہ ان کا دین انکے دلائل یہود پر غالب رہیں گے یا اس طرح کہ آپ کے خدمت گار حواریوں کو تا قیامت آپ کے دشمن یہودیوں پر عزت و عظمت دیں گے۔ کہ ان کے چرچے ہمیشہ بھلائی کے ساتھ ہوتے رہیں گے۔ اور آپ کے دشمنوں پر دنیا لعنت کرتی رہے گی پھر اے مسلمانو اور کافرو تم سب کا ہماری ہی طرف لوٹنا ہے۔ پھر ہم تمہارے درمیان ہر اس دینی چیز میں فیصلہ کر دیں گے۔ جس میں تم دنیا میں جھگڑتے ہو۔ کہ مومن کو جنت میں اور کافر کو جہنم میں بھیجیں گے۔ اگر چہ دنیا میں بھی انبیائے کرام کے ذریعہ قولی فیصلہ تو کر دیا گیا ہے مگر وہاں عملی فیصلہ ہوگا جس سے جھوٹوں کو اپنے جھوٹ کا اقرار کرنا ہوگا۔

خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تین خوشخبریاں دیں۔ انہیں آسمان پر بلا کر فرشتوں کے ساتھ رکھنا کیونکہ اچھی صحبت اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ دوسرے کافروں کی صحبت سے انہیں بچالینا۔ کیونکہ بروں کی صحبت سے علیحدگی بھی اللہ کی نعمت ہے۔ اس سے صوفیائے کرام کا مسئلہ صحبت حل ہو جاتا ہے۔ کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کا فرشتوں کے ساتھ رہنا اتنی بڑی نعمت ہے تو حضرات صحابہ کرام کا حضور انور ﷺ کے ساتھ رہنا اور حضرت صدیق و فاروق کا حضور ﷺ کے ساتھ دفن ہونا یقیناً اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اس لئے کوئی شخص صحابہ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ تیسرا حضرت مسیح کے متبعین کا کفار پر غالب رہنا کیونکہ غلاموں پر کرم آقا پر کرم ہوتا ہے۔ نوکروں کی تکلیف سے آقا کو تکلیف۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ (التوبۃ: ۱۲۸)

حیات عیسیٰ علیہ السلام

عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہود کا عقیدہ تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں سولی دے دی اور جان نکل جانے پر انہیں دفن بھی کر دیا اگر چہ وہ اس شبہ میں گرفتار ہیں کہ ہمارا طیطیانوس کہاں گیا۔ عیسائی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ واقعی عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر سولی دے دی گئی اور آپ کی وہاں جان بھی نکل گئی مگر پھر رب نے آپ کو دوبارہ زندگی بخشی اور آسمان پر اٹھا لیا۔ اسی لئے وہ صلیب کو پوجتے ہیں اور اس سولی کو سارے عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ سمجھتے ہیں کفارہ کا مسئلہ سولی پر ہی مبنی ہے۔ مگر مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نہ آپ کو سولی دی گئی اور نہ آپ کی وفات واقع ہوئی۔ بلکہ آپ کو اسی طرح مع جسم شریف زندہ اٹھا لیا گیا چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اٹھایا جانا قطعی، یقینی، اجماعی مسئلہ ہے۔ اس پر ساری امت مصطفیٰ ﷺ کا اتفاق ہے۔ البتہ وہب نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تین ساعت کے لئے موت دی پھر انہیں زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لیا۔ بہر حال وہب بھی عیسیٰ علیہ السلام کے اس وقت زندہ ہونے اور آسمان پر زندہ اٹھنے کے قائل ہیں غرضیکہ اس مسئلہ میں آج تک کسی کو اختلاف نہیں ہوا۔ اب چودھویں صدی میں مرزائیوں نے نبوت مرزا کے شوق میں اس مسئلہ یقینی قطعی کا انکار کیا۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے تختہ دار پر لٹکایا۔ اور انہیں بہت ذلیل بھی کیا۔ مگر رب تعالیٰ نے ان کی جان صلیب پر نہ نکلنے دی بلکہ یہود انہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے آپ غشی کی حالت سے بیدار ہو کر نصیبین وہاں سے افغانستان ہوتے ہوئے کوہ نعمان میں پہنچے اور وہاں

سے پنجاب کی طرف آئے اور یہاں سے کشمیر میں گئے۔ آخر سری نگر میں ایک سو پچیس سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ اور وہاں ہی محلہ خانیار کے پاس آپ کا مزار ہے۔ دیکھو تبلیغ رسالت جلد آٹھ صفحہ ساٹھ نیز تحفہ گولڑویہ صفحہ بیس اور نیز دیکھو ایام الصلح تیسری طبع صفحہ ایک سو سولہ مصنفات مرزا غلام احمد قادیانی۔ مرزا جی نے اس واقعہ کے ثبوت میں نہ کوئی آیت پیش کی نہ حدیث نہ تاریخی حوالہ۔ لہٰذا اس کی بات قابل اعتبار نہیں۔ ہم نہایت منصفانہ تحققات کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ قبول فرمائے۔ اس مضمون کی دو بحثیں کریں گے پہلی بحث میں اپنے دلائل۔ دوسری بحث میں مرزائیوں کے اعتراضات مع جوابات۔

پہلی بحث حیات مسیح کا ثبوت

عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا آیاتِ قرآنیہ اور احادیث صحیحہ اقوال صحابہ کرام وجمیع مفسرین ومحدثین سے ثابت ہے۔ آیات قرآنیہ ملاحظہ ہوں (۱) وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ (آل عمران ۵۴) اس آیت کی تفسیر امام رازی، جلال الدین سیوطی، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی خازن ومدارک وغیرہ سب نے یہی کی ہے کہ یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کی خفیہ تدبیر کی۔ مگر رب تعالیٰ نے انہیں خفیہ طریقے سے بچایا۔ کہ انہیں آسمان پر زندہ اٹھالیا۔ اور جو آپ کو پکڑوانے آیا تھا۔ اسے عیسیٰ علیہ السلام کی شکل دے کر سولی چڑھوا دیا۔ (۲) اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اس کی تفسیر بھی امام رازی، امام سیوطی ودیگر عام مفسرین نے یہ ہی کی ہے کہ اے عیسیٰ ہم تمہیں پورا لینے والے ہیں۔ اس طرح کہ تمہیں آسمان پر اٹھالیں گے۔ (۳) مَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (النساء: ۱۵۷) الی قولہ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ (النساء: ۱۵۸) اس میں قرآن کریم نے عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور ان کے سولی پر چڑھائے جانے کا صاف صاف انکار کیا۔ اور ان کے اس جسم کے ساتھ اٹھائے جانے کا اقرار جیسا کہ بل رفعہ اللہ سے معلوم ہوا۔ امام رازی اور دیگر مفسرین نے اس کی یہ ہی تفسیر کی (۴) وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (النساء: ۱۵۹) عام محدثین ومفسرین اور صحابہ کرام نے اس آیت کا ترجمہ یہ ہی فرمایا کہ سارے اہل کتاب عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئیں گے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن کفار پر گواہ ہوں گے۔ بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی یہ ہی تفسیر نقل کی۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ ابھی عیسیٰ علیہ السلام نے وفات نہیں پائی۔ کیونکہ ابھی سارے اہل کتاب ان پر ایمان نہ لائے۔ لاکھوں یہودی ان کے خلاف ہیں۔ موتہ کی ضمیر کا اہل کتاب کی طرف لوٹا لینا اور یہ معنی کرنا کہ ہر اہل کتاب اپنی موت سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتا ہے۔ ضعیف ہے کیونکہ موت کے وقت کا ایمان معتبر نہیں۔ (۵) وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا (زخرف: ۶۱) صحابہ کرام اور عام محدثین ومفسرین نے اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ عیسیٰ علیہ السلام کا اترنا قیامت کی پہچان اور نشانی ہے۔ اس میں شک نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ دوبارہ زمین پر آئیں گے۔ اور آپ کا یہ آنا علامت قیامت ہوگی۔ چنانچہ تفسیر درمنثور نے حضرت عبداللہ ابن عباس وابو ہریرہ ومجاہد وحسن رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کی کہ اِنَّهٗ اَىْ خُرُوْجَ عِيْسٰى قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ نیز تفسیر ابن کثیر نے حضرت مجاہد وابو ہریرہ وابن عباس ابو العالیہ ابی مالک عکرمہ حسن

قتادہ ضحاک رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ ہی تفسیر نقل کی۔ اور فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زمین پر آنے کی احادیث متواتر ہیں۔ نیز تفسیر کبیر وغیرہ نے اس آیت کے یہ ہی معنی کیے (٦) تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (مائدہ: ۱۱۰) اے عیسیٰ علیہ السلام آپ گہوارے اور بڑھاپے میں لوگوں سے کلام کریں گے قرآن کریم نے عیسیٰ علیہ السلام کا بڑھاپے میں کلام کرنا بطور معجزہ بیان فرمایا۔ یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ عجیب بات ہو۔ اور وہ یہ ہی ہے کہ آپ آسمان سے اتریں اور کلام فرمائیں چنانچہ امام جلال الدین سیوطی اور امام زہری وغیرہم نے اس سے یہ نتیجہ نکالا۔

احادیث: عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ تشریف لانے کے متعلق بے شمار احادیث وارد ہیں۔ چنانچہ (۱) مسلم، بخاری، مشکوٰۃ شریف نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا قسم خدا کی عیسیٰ ابن مریم حاکم، عادل ہوکر تم میں اتریں گے۔ صلیب کو توڑیں، خنزیر کو فنا کریں گے۔ جزیہ کا حکم ساقط کریں گے۔ اور اس زمانہ میں ایک سجدہ دنیا بھر سے افضل ہوگا۔ اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو پڑھ لو۔ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ (النساء: ۱۵۹)

(۲) نیز مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ عیسیٰ ابن مریم حاکم، عادل ہوکر تم میں تشریف لائیں گے ان کے زمانہ میں اونٹ بے کار ہوجائیں گے۔ حسد و بغض دلوں سے نکل جائیں گے۔ مال کی اتنی کثرت ہوگی کہ کوئی زکوٰۃ نہ لے گا۔

(۳) انہی مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر جنگ کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام تم میں آجائیں۔

(۴) ابن جوزی نے کتاب الوفا میں عبداللہ ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ عیسیٰ علیہ السلام زمین پر اتریں گے۔ نکاح کریں گے۔ صاحب اولاد ہوں گے۔ یہاں پینتالیس سال تک قیام فرمائیں گے۔ پس میرے ساتھ میرے مقبرے میں دفن ہوں گے۔ قیامت کے دن ہم اور عیسیٰ علیہ السلام ایک ہی مقبرہ سے اٹھیں گے۔ (مشکوٰۃ شریف باب علامات القیامۃ)

لطیفہ: مرزا غلام احمد قادیانی کہتے ہیں کہ ان احادیث میں عیسیٰ ابن مریم سے میں مراد ہوں مگر خیال رہے کہ نہ مرزا جی کا نام عیسیٰ ہے نہ ان کی ماں کا نام مریم۔ بلکہ ان کا نام غلام احمد اور ماں کا نام چراغ بی بی ہے۔ اور نہ مرزا جی مدینہ پاک میں مرے۔ نہ ان کے زمانہ میں مال کی کثرت ہوئی۔ خود چندوں پر گذارہ کیا اب بھی ان کی اولاد قبریں بیچ کر پیٹ پال رہی ہے۔ نہ اونٹ بیکار ہوئے۔ نہ معلوم کہ وہ ان احادیث کے مصداق کیسے بن گئے۔

(۵) ابو داؤد و احمد نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام آکر دعوت اسلام فرمائیں گے ان کے زمانہ پاک میں اسلام کے سوا تمام دین مٹ جائے گا اور شیر اونٹ کے ساتھ اور چیتا گائے کے ساتھ اور بھیڑیا بکری کے ساتھ چریں گے۔ اور بچے سانپ کے ساتھ کھیلیں گے اور وہ انہیں نقصان نہ دے گا۔

(۶) بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور تمہارے امام تمہیں میں سے ہوں گے۔ یعنی امام مہدی۔

(۷) ابن عساکر نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ عیسیٰ ابن مریم آسمان سے اتریں گے۔ امام ہادی حاکم،

عادل ہوں گے۔

(۸) احمد نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ کیا مجھے آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ کے برابر دفن ہو جاؤں فرمایا یہ کیونکر ممکن ہے۔ وہاں صرف میری اور ابوبکر و عمر و عیسیٰ ابن مریم کی جگہ ہے۔ (مسند احمد جلد سات از توضیح المرام)

(۹) ابن ماجہ نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور انور ﷺ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر دجال بھاگے گا۔ اور اس کے ساتھ ستر ہزار یہودی ہوں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام اسے باب لد کے پاس پائیں گے۔ اور قتل کریں گے۔

(۱۰) مسلم نے نواس ابن سمعال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دمشق میں سفید مینارے کے پاس اپنے ہاتھ فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے اتریں گے۔ ان کے سر سے پانی کے قطرے ٹپکیں گے۔ تا حد نظر ان کی سانس جائے گی۔ اور ان کی سانس سے کافر مریں گے۔ باب لد کے پاس دجال کو قتل کریں گے۔ اس قسم کی صد ہا حدیثیں پیش کی جا سکتی ہیں صرف اتنے پر ہی کفایت ہے۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام کا ثبوت آئمہ امت اسلامیہ سے: تمام صحابہ کرام آئمہ انام کا اس پر اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور قرب قیامت تشریف لائیں گے۔ ہم امام احمد بن حنبل کی حدیث پیش کر چکے۔ نیز انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کی بیسیوں حدیثیں جمع فرمائی ہیں۔ دیکھو مسند احمد' امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں کہ دجال کا نکلنا' یاجوج ماجوج کا خروج' آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا' عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا' اور ساری علامات قیامت حق ہیں۔ عتبیہ میں ہے کہ امام مالک نے فرمایا اس حال میں لوگ کھڑے ہوئے نماز کی تکبیر سن رہے ہوں گے۔ کہ بادل چھائے گا۔ اور اچانک عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے۔ علامہ زرقانی مالکی اپنی کتاب قسطلانی شرح مواہب میں فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اتر کر ہمارے نبی کی شریعت پر فیصلہ فرمائیں گے وہ اگرچہ امت محمدیہ کے خلاف ہوں گے لیکن ساتھ ہی نبی بھی ہوں گے۔ کیونکہ نسخ سے نبوت زائل نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس مسئلہ میں بالکل مخالفت نہ فرمائی۔ اور ان کے تمام متبعین جلال الدین سیوطی امام رازی وغیرہم نے عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری تسلیم کی۔ اسی طرح امام بخاری' امام مسلم' ترمذی' ابوداؤد وغیرہ محدثین نیز امام غزالی' امام رازی' امام جوزی' حضور غوث پاک وغیرہم تمام آئمہ کا یہ ہی عقیدہ تھا۔ چنانچہ حضور غوث پاک غنیۃ الطالبین جلد دوم میں فرماتے ہیں کہ نواں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا غرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ بہت دراز مضمون ہے۔

عقلی دلائل: عقل کا بھی تقاضا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لئے گئے ہوں۔ اور اخیر زمانہ میں تشریف لائیں۔

(۱) موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ ہے۔ آپ کو طور کی معراج عطا ہوئی۔ ہمارے حضور ﷺ کا لقب کلمات اللہ ہے (مدارج النبوت) حضور ﷺ کو عرش کی معراج دی گئی۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا لقب بھی کلمۃ اللہ ہے ضروری تھا کہ آپ کو بھی کسی قسم کی معراج ملے۔ لہٰذا آپ کو چوتھے آسمان کی معراج ملی۔ گویا کلیم میں عروج ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّیِّبُ (فاطر ۱۰) رب تعالیٰ کی طرف پاک کلمے اور اچھی باتیں چڑھتی ہیں۔ جو مقبول اور قابل قبول کلام رب تعالیٰ کی

بارگاہ میں پیش ہو۔ اسے بھی یہاں کلم فرمایا گیا۔

(۲) یثاق کے دن گروہ انبیاء سے عہد لیا گیا تھا کہ جب تم نبی آخر الزمان کا زمانہ پاؤ تو ان پر ایمان لانا اور ان کے دین کی مدد کرنا ضروری تھا کہ اس جماعت میں کوئی پیغمبر وہ بھی ہوتا جو اس عہد پر عمل کرتا۔ اس کے لئے عیسیٰ علیہ السلام منتخب کئے گئے۔ تاکہ یہ عہد فقط قولی نہ رہ جائے۔

(۳) پچھلے آسمانی دینوں کو یہ فخر حاصل تھا کہ انبیائے کرام ان کی حمایت کرتے تھے۔ دین موسوی کی حمایت کے لئے ہارون و دیگر انبیاء بھیجے گئے۔ ضروری تھا کہ دین محمدی کو بھی یہ فخر حاصل ہو کہ اس کی حمایت کوئی نبی کرے۔ مگر چونکہ حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں کہ آپ کے بعد نیا نبی نہیں آ سکتا۔ اس لئے عیسیٰ علیہ السلام منتخب ہوئے۔

(۴) حضرت جبریل کی گھوڑی کی ٹاپ کی خاک نے سونے کے بچھڑے میں آواز پیدا کر دی۔ تو جب حضرت جبریل علیہ السلام کی سانس سے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان میں اگر بچپن میں طاقت گویائی ہو اور آسمان سے اتر کے بھی اس گویائی سے کام لیں تو کیا بعید ہے۔

دوسری بحث حیات مسیح پر سوال و جواب

اس مسئلہ میں قادیانیوں کے بے شمار اعتراضات ہیں ہم ان کے چوٹی کے اعتراضات نقل کر کے جوابات دیتے ہیں۔ **پہلا اعتراض:** رب تعالیٰ فرماتا ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران: ۱۴۴) حضور ﷺ سے پہلے سارے رسول وفات پا چکے۔ اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کی تخصیص نہیں۔ سارے انبیاء کے بارے میں خَلَتْ فرمایا گیا معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی وفات یافتہ ہیں؟ **جواب:** خَلَتْ خلو یا خلا سے بنا۔ جس کے معنی موت نہیں۔ بلکہ خالی ہونا۔ اور گذر جانا۔ اسی لئے فضائے آسمانی کو خلا کہتے ہیں۔ اور پاخانہ کو بیت الخلاء کہتے ہیں۔ تنہائی کو خلوت۔ اہل عرب کہتے ہیں خَلَتِ الدَّارُ مِنَ الْاَنِیْسِ دوست سے شہر خالی ہو گئے اور مادہ کے معنی ہر مشتق میں ضرور رہتے ہیں لہٰذا اس آیت کے معنی یہ ہی ہیں۔ کہ ان سے پہلے نبی گذر گئے۔ خواہ وفات پا کر یا آسمان پر جا کر اسی لئے یہاں ماتت نہ فرمایا گیا۔ شاید مرزا جی کے ہاں بیت الخلاء پھانسی گھر کو کہتے ہوں گے۔ جلالین شریف میں خلت کے معنی کئے مَضَتْ کہا جاتا ہے۔ کہ ریل گزر گئی۔ قافلہ گزر گیا۔ دن گزر گیا۔ آفتاب کنارے سے گذر گیا۔ یہ سب چیزیں کسی جگہ سے گذر جاتی ہیں۔ فنا نہیں ہو جاتیں۔ ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام اس طرح گذر گئے۔ کہ فنا نہ ہوئے۔ یہاں سے سب گئے پھر یہ بھی کہا جاتا کہ گذشتہ تو میں گذر گئیں یعنی فنا ہو گئیں غرضیکہ گذرنے کی کئی نوعیتیں ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام اور نوعیت سے گذر گئے۔ اور دوسرے انبیاء کرام دوسری نوعیت سے قد خلت دونوں کو شامل ہے۔ **دوسرا اعتراض:** رب تعالیٰ بتوں کے بارے میں فرماتا ہے۔ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ (النحل: ۲۱) کہ وہ مردے ہیں۔ زندہ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معبود مانا۔ اس قاعدے سے وہ بھی اس آیت میں داخل ہوئے۔ ان کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوا؟ **جواب:** اس آیت کا عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بے جان بتوں کے بارے میں آئی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تو بڑی شان ہے رب تعالیٰ شہداء کے لئے فرماتا ہے۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ

یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ:۱۵۴) شہداء کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو اس آیت میں داخل مانا جائے تو آیتوں میں تعارض ہوگا۔ **تیسرا اعتراض:** حدیث شریف میں ہے کہ اگر موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام آج زندہ ہوتے تو انہیں ہماری پیروی کرنی پڑتی۔ جس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی موسیٰ علیہ السلام کی طرح وفات پاچکے۔ **جواب:** اس حدیث میں زندگی سے مراد زمین کی ظاہری زندگی ہے۔ جس پر شرعی احکام عائد ہوتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اس طرح زندہ ہیں جس پر شرعی احکام جاری نہیں ہوتے۔ نہ روزہ نہ نماز وغیرہ۔ **چوتھا اعتراض:** یٰعِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ...... اس آیت میں رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دو چیزوں کی خبر دی۔ توفی اور رفع۔ توفی کے معنی ہیں موت اور رفع کے معنی ہیں بلندی مراتب۔ چونکہ توفی پہلے ہے اور رفع بعد میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی وفات پہلے ہوگئی اور بلندی مراتب بعد میں۔ **جواب:** اس کا نہایت مکمل جواب ابھی تفسیر میں گذر چکا۔ **پانچواں اعتراض:** امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ رَافِعُکَ اِلَیَّ میں رفع سے مراد درجہ اور منزلت کی بلندی ہے۔ نہ کہ مکان اور جہت کی۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ آسمان پر جانے کے مخالف ہیں۔ **جواب:** سبحان اللہ کیسا کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ امام رازی نے اس جگہ بار بار اعلان فرمایا ہے کہ اَکْرَمَہٗ بِاَنْ رَّفَعَہٗ اِلَی السَّمَآءِ خدا نے ان کو آسمان پر اٹھالیا۔ اس عبارت کا مطلب صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بلندی صرف مکانی نہیں۔ بلکہ درجہ کی بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تمہاری صورتیں نہیں دیکھتا نیتیں دیکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی صورت بھگوان داس کی سی بنالو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری صرف صورتوں کو نہیں دیکھتا نیتوں کو بھی دیکھتا ہے۔ **چھٹا اعتراض:** امام مالک کا یہی عقیدہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے۔ دیکھو مجمع البحار میں ہے قَالَ مَالِکٌ مَاتَ **جواب:** یہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ پڑھے اور وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی (النساء:۴۳) چھوڑ دے مجمع البحار کی پوری عبارت یہ ہے۔ قَالَ مَالِکٌ مَاتَ لَعَلَّهٗ اَرَادَ رَفْعَهٗ اِلَی السَّمَآءِ وَیَجِیْ اٰخِرُ الزَّمَانِ لِتَوَاتُرِ خَبْرُ النُّزُوْلِ امام مالک نے فرمایا مات یہاں موت کے معنی آسمان پر جانا ہیں۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آسمان سے اترنا حدیث متواتر سے ثابت ہے۔ **لطیفہ:** مرزاجی نے موت کے معنی نیند بھی کیے ہیں۔ چنانچہ ازالہ اوہام طبع پنجم صفحہ ۲۶۳ میں ہے مَاتَ کے معنی لغت میں نوم بھی ہیں۔ دیکھو قاموس۔ نیز اسی ازالہ میں ہے۔ کہ ماتت کے حقیقی معنی صرف مارنا اور موت دینا نہیں۔ بلکہ سلانا اور بے ہوش کرنا بھی ہیں۔ نیز اسی ازالہ میں ہے۔ لغت میں موت بمعنی نوم اور غشی بھی آتا ہے۔ تعجب ہے کہ مرزائی امام مالک کے اس قول میں مات کا معنی مرنا کیسے کرتے ہیں۔ **ساتواں اعتراض:** اگر عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر ہوں تو لازم آتا ہے کہ درجہ میں حضور ﷺ سے بڑھ جائیں کہ حضور زمین پر ہیں؟ **جواب:** صدر جہاں بیٹھے صدر ہی ہے۔ اونچے نیچے ہونے پر درجہ کا مدار نہیں۔ ورنہ تارے چاند سورج اور ملائکہ آسمان پر ہیں۔ کیا حضور ﷺ سے بڑھ کر ہیں۔ موتی پانی میں نیچے ہوتا ہے اور بلبلہ اوپر کیا بلبلہ افضل ہے۔ **آٹھواں اعتراض:** اگر عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں تو وہاں ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہے اور پیشاب پاخانہ کہاں جاتے ہیں؟ **جواب:** جب آپ اپنی ماں کے پیٹ میں تھے تو وہاں باورچی خانہ کہاں تھا اور سنڈاس کس جگہ بنا تھا۔ جو رب آپ کو ماں کے پیٹ میں بغیر باورچی خانہ اور پاخانہ نو ماہ زندہ رکھ

سکتا ہے۔ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر بغیر ان ضرورتوں کے زندہ رکھ سکتا ہے۔ اب ان کی زندگی فرشتوں کی سی ہے۔ دجال کی آمد پر مسلمان ذکر الٰہی سے زندگی گزاریں گے۔ بعض اولیاء اللہ نے برسوں غذا نہ کھائی۔ ذکر خدا سے زندہ رہے ایسے ہی عیسیٰ علیہ السلام ذکر اللہ سے زندہ ہیں۔ جناب سب مرزا غلام احمد کی طرح شک وغیرہ سے زندگی نہیں گذارتے کچھ اللہ والے بھی ہوتے ہیں حق بات یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام بلکہ بعض خاص اولیاء اللہ نورانی بشر ہوتے ہیں۔ ظہور بشریت کے وقت وہ کھاتے پیتے بھی ہیں۔ اور دنیا سے تعلقات بھی قائم رکھتے ہیں مگر جب نورانیت کا ظہور ہوتا ہے تو انہیں کھانے پینے کی مطلقاً ضرورت نہیں رہتی۔ عیسیٰ علیہ السلام زمین پر بشری حیثیت سے رہے اس لئے انہیں کھانے پینے سانس لینے وغیرہ بشری عوارضات کی ضرورت رہی۔ آسمان پر نورانیت کے ساتھ ہیں وہاں وہ نہ ہوا کے محتاج' نہ کھانے کے' نہ پینے کے۔ حضور ﷺ کبھی تو دو دو وقت کھانا نہ کھانے پر پیٹ پر پتھر باندھ لیتے تھے۔ اور کبھی روزہ وصال کے موقع پر مسلسل نہ کھاتے نہ پیتے اور کچھ احساس نہ ہوتا۔ وہ بشریت کا ظہور تھا۔ یہ نورانیت کی جلوہ گری ہے۔ حضرت زید ابن ثابت کو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ ابرانی زبان سیکھو تاکہ دوسرے بادشاہوں کے خطوط کا ترجمہ مجھے سناؤ۔ یہ بشریت کا ظہور ہے۔ پھر جانوروں کی بولی سمجھ رہے ہیں۔ پتھروں کی فریاد سن رہے ہیں لکڑیوں کی آہ وزاری پر توجہ فرما رہے ہیں۔ پتھروں کے کلام کا جواب دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ انسان تو کیا لکڑیوں پتھر کی بولی بھی جانتے ہیں یہ نورانیت کا ظہور ہے۔ بلکہ یہ تبدیلی حالات تو فرشتوں اور دیگر مخلوقات کی بھی ہوتی رہتی ہے۔ دیکھو ہاروت ماروت نورانی فرشتے ہیں جو نہ کھائیں نہ پئیں مگر جب شکل بشری میں بھیجے گئے تو کھانے پینے بھی لگے اور عورتوں سے اختلاط کے قابل بھی ہو گئے۔ حضرت جبریل علیہ السلام جب شکل انسانی میں آتے تو کپڑے بھی پہنتے ان کے بال سیاہ ہوتے تھے اور سواری بھی کرتے تھے یہ بشریت کا ظہور تھا۔ ورنہ فرشتوں کو لباس کی کیا ضرورت اور ان کے بال کالے کیسے۔ عصائے موسوی لکڑی کا تھا مگر جب سانپ بن جاتا تو کھاتا پیتا بھی تھا اور سانس لے کر پھنکاریں بھی مارتا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ (اعراف: ۱۱۷) جب حالات کی تبدیلی کا یہ عالم ہے تو عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر رہ کر نہ کھائیں نہ پئیں تو کیا اعتراض ہے؟ **نواں اعتراض:** اگر عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ میں تشریف لائیں تو اس وقت نبی ہوں گے یا نہیں؟ نبی نہ رہنا خلاف عقل ہے۔ اور نبی نہ ہونے کی صورت میں احکام کس کے جاری ہوں گے۔ حضور ﷺ کے یا عیسیٰ علیہ السلام کے؟ **جواب:** نبی کو رب تعالیٰ سے بھی تعلق ہے۔ اور مخلوق سے بھی۔ ربانی تعلق کبھی نہیں ٹوٹتا۔ ان کو ہمیشہ عظمت و وقار حاصل رہتا ہے۔ مگر نسخ کے بعد ان کا تعلق مخلوق سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح کہ ان کے احکام جاری نہیں رہتے۔ یہ ہی حال عیسیٰ علیہ السلام کا ہو گا اگر کوئی جج کسی عدالت میں گواہ بن کر پیش ہو تو وہ اپنے وقت اور اپنی جگہ میں جج ہے۔ مگر اس عدالت میں اس کی ججی کا ظہور نہیں۔ اس کی حیثیت گواہ کی سی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام عدالت مصطفیٰ ﷺ میں اسی حیثیت سے تشریف لائیں گے۔ کہ اللہ کے نزدیک نبی ہوں گے مگر مخلوق پر حضور ﷺ کے احکام جاری کریں گے۔ **دسواں اعتراض:** کسی شخص کا دوسرے کے ہم شکل ہو جانا غیر ممکن ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ طظیانوس عیسیٰ علیہ السلام کی ہمشکل ہو کر پھانسی پا جائے؟ **جواب:** شکلیں بدلنا اور کسی کا دوسرے کی ہمشکل ہو جانا ممکن ہی نہیں واقع ہے۔ گورے آدمی بیماری سے کالے ہو جاتے ہیں۔ کالے گورے بن جاتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا عصا سانپ

بن جاتا تھا۔ دنیا میں بہت لوگ آپس میں ہمشکل ہوئے ہیں۔ ہاں حضور ﷺ کی یہ خصوصیت ہے کہ کوئی آپ کا ہمشکل نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ شیطان بھی خواب میں حضور ﷺ کی شکل بن کر نہیں آ سکتا۔ حضرت جبریل علیہ السلام صحابہ کرام کی ہمشکل بن کر آتے تھے۔ جنات مختلف جانوروں کی شکل بن سکتے ہیں۔ حضور ﷺ نے بہت لوگوں کی شکلیں بدل دیں۔ دیکھو مثنوی شریف وغیرہ۔ **گیارھواں اعتراض:** اس سے معلوم ہوا کہ عیسائی حق پر ہیں۔ اور مسلمان کافر۔ کیونکہ رب تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے متبعین کو قیامت تک کفار پر غالب رکھوں گا اور اب بھی ہر جگہ عیسائی ہی غالب ہیں کیونکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں۔ (عیسائی) **جواب:** عیسیٰ علیہ السلام کے سچے پیروکار صرف مسلمان ہی ہیں۔ کیونکہ وہ حضور ﷺ کے فرمانبردار ہیں۔ اور حضور ﷺ کی فرمانبرداری سارے پیغمبروں کی اطاعت ہے۔ کیونکہ سارے نبیوں نے خصوصاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سب کو نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے کا حکم دیا ہے اب حضور کی اتباع ان سب کی اتباع ہے۔ اگر باپ اپنے بیٹوں کو وصیت کر جائے کہ میرے بعد فلاں شخص کا کہنا ماننا کرنا۔ تو یقینی بات ہے کہ بیٹے کا ان فلان کا کہنا ماننا باپ کی وصیت پر ہی عمل ہے۔ جس سے باپ کی روح خوش ہوگی۔ حضور ﷺ کی اتباع میں سارے نبیوں کا فیضان ہے۔ جس کے پاس سو ہیں اس کے پاس ساری اکائیاں اور دہائیاں ہیں۔ سارے انبیاء جمع کے عدد ہیں اور نبی کریم ﷺ حاصل جمع۔ جیسے رب تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (آل عمران: ۶۸) اور یہاں فوقیت سے دینی غلبہ مراد ہے نہ کہ دنیوی سلطنت کیونکہ اس سے پہلے سینکڑوں برس مسلمانوں کی بادشاہت رہی اور اب بھی خدا کے فضل سے مسلمانوں کی بہت سی سلطنتیں ہیں۔ تو کیا کہا جاسکتا ہے کہ پہلے سارے مسلمان سچے تھے اب عیسائی یا ہندوستان میں عیسائی سچے ہیں۔ اور افغانستان میں مسلمان۔ نیز ہندوستان میں چوہڑے چمار بھی عیسائی ہیں۔ ان کی ذلت کا یہ حال ہے کہ سر پر پاخانہ کا ٹوکرا کپڑے جوتے پھٹے ہوئے۔ امریکہ اور سکاٹ لینڈ کی خیرات پر ان کا گذارا۔ انگریز عیسائیوں کے ساتھ نہ اٹھ بیٹھ سکیں نہ ان کے ساتھ گرجے میں عبادت کرسکیں نہ ان کے قبرستان میں دفن ہوسکیں تو کیا انگریز عیسائی حق پر ہیں۔ اور دیسی عیسائی کافر۔ ماننا پڑے گا کہ فوقیت سے دینی فوقیت مراد ہے۔ اور وہ ہمیشہ مسلمانوں کو ہی حاصل ہے۔ حج مسلمانوں ہی کے کعبہ میں ہوتا ہے نہ کہ بیت المقدس کا۔ دھوم دھام سے تلاوت قرآن پاک کی ہوتی ہے نہ کہ توریت وانجیل کی۔ بیت المقدس میں ہزاروں پیغمبر آرام فرما ہیں اور مدینہ پاک میں صرف سید الانبیاء ﷺ مگر جو دھوم دھام مدینہ پاک کی ہے وہ بیت المقدس کی نہیں۔ معلوم ہوا کہ شہنشاہ یہاں رہتے ہیں اور حکام وہاں۔ اس کی صدہا مثالیں مل سکتی ہیں۔ ہندوستان میں ہندو دھرم دیسی ہے کہ یہیں پیدا ہوا اور عیسائیت واسلام پردیسی وہ دونوں پرانے اسلام نیا ہے۔ مگر اس نے ان تمام دینوں کو دبا لیا یہاں قرآن پاک کی اشاعت زیادہ۔ مسجدیں بے شمار۔ اذانیں تعداد سے باہر۔ غرض جس پر مصطفیٰ ﷺ نے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چیز جگمگا گئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ دینی فوقیت ہمیشہ مسلمانوں کو ہی حاصل ہے اور حاصل رہے گی۔ قومی فوقیت تو وہ اکثر مسلمانوں کو حاصل رہی۔ اب اگر مسلمان قومی لحاظ سے گر جائیں تو اس میں ان کا اپنا قصور ہے بلکہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی مسلمانوں کی دنیا میں کم و بیش بیس سلطنتیں ہیں۔ اتنی سلطنتیں کسی قوم کی نہیں۔ ۱۹۵۴ء میں براستہ خشکی حج کو گیا۔ تو گجرات سے لے کر مکہ معظمہ تک ایک

انچ زمین کسی کافر کی نہیں آئی۔ سارا سفر اسلامی سلطنتوں میں ہی گذرا۔ چنانچہ پاکستان سے نکل کر ایران میں داخل ہوئے۔ ایران سے عراق' عراق سے کویت' کویت سے نجد میں وہاں سے حجاز مقدس میں اور یہ سب ممالک اسلامی ہیں۔ اگر آج بھی اسلامی سلطنتیں سر جوڑ لیں تو دنیا میں بڑی طاقت بن جائیں۔ افسوس کہ ان کے نصیب میں اتفاق نہیں تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان کبھی بھی کفار سے نہ مرے آپس کی نا اتفاقی کا شکار ہوئے ہمیشہ اپنوں ہی نے اپنوں کو کچلا۔ **بارھواں اعتراض:** حضور علیہ السلام کو معراج میں کچھ دیر عرش پر بلا کر واپس بھیج دیا گیا مگر عیسیٰ علیہ السلام کو صدیوں تک چوتھے آسمان پر رکھا گیا۔ معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ سے افضل ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ سے جو قرب انہیں حاصل ہے۔ حضور علیہ السلام کو حاصل نہیں (عیسائی) **جواب:** اس کے بہت جواب ہیں۔ نہایت آسان جواب اس مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ کسی بادشاہ نے کسی افسر کو امن قائم کرنے کے لئے کہیں بھیجا۔ مگر اس سے رعایا نہ دبی۔ باغیوں نے افسر کو قتل کرنا چاہا سلطان نے فوراً اس افسر کو اپنے پاس بلا لیا تاکہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کے بعد دوسرا افسر بھیجا گیا جس نے تمام باغیوں اور سرکشوں کو اپنا تابعدار کر لیا بادشاہ نے حکم دیا کہ چونکہ تم سے نظام سلطنت خوب قائم ہوا لہٰذا تم وہاں ہی رہو۔ اور حکومت کئے جاؤ پھر کبھی اس افسر کو مہمان بنا کر اپنے ہاں بلایا اس کا جلوس نکالا' خلعت اور تمغے عنایت فرمائے یقیناً اس افسر کا یہاں رہنا پہلے افسر کے بادشاہ کے پاس رہنے سے افضل ہے۔ حضرت مسیح کا آسمان پر جا کر پھر عہد مصطفیٰ میں حضور ﷺ کی امن میں زمین پر تشریف لانا اور حضور ﷺ کا عرشی مہمان بن کر جانا اور کونین میں دھوم دھام کا ہونا۔ پھر سرکشوں کی سرکوبی کے لئے دنیا میں تشریف لانا اور فرش پر جلوہ گر ہونا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ حضور علیہ السلام زمین پر اسی واسطے رکھے گئے کہ حضور علیہ السلام سے یہاں کا انتظام قائم ہے۔ مرکز دائرہ میں ہی رہنا چاہئے کیونکہ اس کے ہٹنے سے سارا دائرہ بگڑ جائے گا۔

تفسیر صوفیانہ

رب تعالیٰ نے عیسیٰ قلب سے فرمایا کہ اے عیسیٰ تجھے نفس و نفسیات سے نکال کر آسمان روح کی طرف پہنچانے والا ہوں جہاں میرا انتہائی قرب ہوگا۔ اور تجھے خبیث قوتوں اور نفسانی خواہشوں صحبتوں کی پلیدی سے نکالنے والا ہوں۔ اور تیرے متبعین روحانی طاقتوں کو ان نفسانی کفار پر بڑی قیامت یعنی مقام وحدت کے پہنچنے تک غالب رکھوں گا پھر تم سب کا رجوع میری طرف ہوگا۔ اور وہاں تمہارا حقیقی فیصلہ جذب اور عنایت سے پہلے جو تم میں اختلاف تھا اس کا فیصلہ یوں ہوگا کہ ہر ایک کو اسی کے لائق ٹھکانا دیا جائے گا۔ (ابن عربی)

دوسری تفسیر

معرفت الٰہی گویا آسمان سے ہے اور نفس اور نفسانیات گویا زمین ہے شیاطین یہاں کے کفار۔ سالک کو چاہئے کہ ماسوی اللہ سے بچتا ہوا مقام معرفت اللہ تک پہنچے تب اس کا حال فرشتوں کا سا ہوگا۔ کہ اس سے شہوتیں' غضب' برے اخلاق سب دور ہو جائیں گے تختی قلب کو نقش غیر سے صاف کرو تاکہ تمہیں مثل عیسیٰ علیہ السلام وصال کی بلندی ہو۔

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک نحوی کشتی میں بیٹھا۔ اور کشتی بان سے بولا کیا تجھے نحو آتی ہے اس نے کہا نہیں۔ کہنے لگا کہ تیری آدھی عمر برباد ہوئی۔ کچھ دور جا کر کشتی بھنور میں پھنس گئی کشتی بان نے نحوی سے کہا کہ بولو کیا تمہیں پھنسی کشتی

نکالنی بھی آتی ہے نحوی نے کہا نہیں کشتی بان نے کہا کہ لو تمہاری ساری عمر برباد۔ مولانا فرماتے ہیں

محو مے باید نہ نحو ایں جا بداں　　گر تو محوی بے خطر در آب رواں

آب دریا مردہ را بر سر نہد　　ور بود زندہ ز دریا کے رہد

چوں بمردی تو ز اوصاف بشر　　بحر اسرارت نہد بر فرق سر

دریائے معرفت میں نحو لے کر نہ آ محو یعنی فنا لے کر آ۔ زندہ کو دریا نیچے لے جاتا ہے اور مردے کو اپنے اوپر اگر تم اوصاف بشریت سے مردے ہو کر اپنے کو دریا کے حوالے کر دو گے تو کامیاب رہو گے اہل اللہ باقی مشاغل اور دنیوی تفکرات سے آزاد ہو کر انوار کے بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ اڑتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ولادت دو قسم کی ہے۔ اختیاری اور غیر اختیاری۔ غیر اختیاری وہ ہے۔ جس میں ہمارے کسب کو دخل نہ تھا جو بذریعہ والدین ہوئی۔ اختیاری وہ جس میں ہمارے کسب کو دخل ہے۔ اور جو شیخ کامل کی نگاہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنے بیمار نفوس کا شیخ کامل کے مشورہ سے دوائے تقویٰ سے علاج کرو۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ مرکز کی چیز فنا نہیں۔ اور جو مرکز سے ہٹ جائے اسے بقا نہیں گھڑے کا پانی ختم ہو جاتا ہے مگر نلکے کا پانی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ کیوں! اس لئے کہ گھڑے کا پانی مرکز سے الگ ہے۔ اور نلکا مرکز سے وابستہ ہے آفتاب کے نور کو زوال نہیں ایسے ہی حضرات انبیاء کرام عزت کے مرکز ہیں جو ان سے وابستہ ہوا وہ ہمیشہ کی عزت پا گیا ان سے الگ رہ کر اگرچہ حکومت دولت وغیرہ کی وجہ سے عارضی عزت مل جاتی ہے مگر اس عزت کو فنا ہے۔ دیکھو رب نے فرمایا اے عیسیٰ (علیہ السلام) تمہارے متبعین کو تا قیامت نہ مٹنے والی عزت دوں گا کیونکہ تم مرکز عزت ہو۔ تمہارے دامن سے وابستہ کبھی بھی ذلیل نہیں ہوتے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام سے متبعین کا یہ حال ہے تو جنہیں خدا حضور ﷺ کی اتباع نصیب کرے ان کی عزت کا کیا پوچھنا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَ لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون: ۸) فرماتے ہیں کہ ایک نبی کا منکر سارے نبیوں فرشتوں کا بلکہ خدا کا منکر ہے۔ رب تعالیٰ نے یہود کو یہاں اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مطلق فرمایا یعنی یہ یہود میری ذات و صفات' فرشتے' کتابوں' سبھی کے منکر ہیں۔ یہی حال اولیاء اللہ کا ہے۔ ایک کا مقبول سب کا مقبول۔ ایک کا مردود سب کا مردود۔ وہی جال شکار کو پھانس سکتا ہے۔ جس کے سارے پھندے درست ہوں ایک پھندہ کھلا جال بیکار رہوا۔ معرفت الٰہی اور تقویٰ طہارت کا شکار وہی کر سکتا ہے جس کے عقائد کے سارے پھندے درست ہوں نیز صوفیاء فرماتے ہیں کہ وہی نیک عمل قبول ہے جو نبی کی اتباع میں ہو اسی لئے یہاں اتبعوک فرمایا۔ چنانچہ مسلمان کے ایک پیسہ کی خیرات کا ثواب جو ہے وہ مشرک و کافر کے ایک لاکھ روپیہ کی خیرات کا ثواب نہیں۔ کیونکہ مسلمان نبی کی اتباع ہی میں سب کچھ کرتا ہے اور مشرک و کافر اتباع سے آزاد رہ کر۔ اعمال ڈھانچہ ہیں اتباع پاور اعمال قالب ہیں اتباع روح شیطان کے سارے اعمال نیک سجدہ بجود اسی لئے بیکار ہوئے۔ کہ اس میں اتباع نبوی نہ تھی۔ جو حضرات ایمان لاتے ہی شہید ہو گئے۔ وہ مقبول ہیں اگرچہ انہیں عمل کا وقت نہ ملا۔ کہ وہاں اتباع موجود تھی۔ مگر وہ منافقین جو بغیر اتباع نبوی نمازیں وغیرہ پڑھتے تھے وہ مردود رہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا

پس لیکن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا پس عذاب دوں گا میں ان کو عذاب سخت بیچ دنیا
تو وہ جو کافر ہوئے ہیں انہیں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا
وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
اور آخرت کے اور نہیں ہے واسطے ان کے کوئی مددگار اور لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے اور
اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور وہ جو ایمان لائے اور
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾
عمل کئے انہوں نے اچھے پس پورا دے گا وہ ان کو اجر ان کے اور اللہ نہیں محبت فرماتا ظالموں سے
اچھے کام کئے اللہ ان کا نیگ انہیں بھرپور دے گا اور ظالم اللہ کو نہیں بھاتے
ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾
یہ تلاوت کرتے ہیں ہم اس کو اوپر تمہارے آیتوں سے اور ذکر حکمت والا
یہ ہم تو پڑھتے ہیں کچھ آیتیں اور حکمت والی نصیحت

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کے فیصلے کا اجمالی ذکر تھا فرمایا گیا تھا کہ ہم تمہارے اختلافات کا فیصلہ کریں گے اب اس فیصلے کی تفصیل ارشاد ہو رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں شبہ پیدا ہوتا تھا کہ جب کفار و مومنین کا فیصلہ قیامت ہی میں ہوگا تو انبیائے کرام اور آسمانی کتابوں کے دنیا میں تشریف لانے سے کیا فائدہ۔ وہ حضرات اس فیصلہ ہی کے لئے تو آتے ہیں اب اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ اس فیصلہ سے وہ عملی فیصلہ مراد ہے۔ جس سے ہر مجرم کو اپنے مجرم ہونے کا اقرار کرنا پڑے۔

تفسیر

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ف تفصیلیہ ہے اور امّا شرطیہ اور کفر سے یا تو عام کفر مراد ہے۔ یا یہود کا کفر یعنی مسیح علیہ السلام کی توہین یا عیسائیوں کا کفر یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں حد سے آگے بڑھنا ہے پہلے معانی عام ہیں اور آخری دو معنی موقعہ کے مناسب یعنی لیکن جنہوں نے کسی قسم کا کفر کیا یا عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا یا جو ان کی شان میں حد سے بڑھ کر کافر ہوئے۔ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یہ جملہ امّا کی جزا ہے۔ اور کفر کا نتیجہ۔ عذاب عذب سے بنا بمعنی روکنا۔ اسی لئے میٹھے پانی کو عذب کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روکتا ہے سزا کو عذاب اس لئے کہتے ہیں کہ اس جرم سے رکتا ہے فِى الدُّنْيَا عذاب کی صفت ہے یا اُعَذِّبُ کا ظرف اور دنیا سے یہ ظاہر زندگی مراد ہے۔ اور آخرت سے قبر اور قیامت کی زندگی مقصود۔ دنیا میں سخت عذاب قتل قید اور جز[illegible] سلطنت چھن [illegible] کو [illegible] کیا کہ پہلے یہود کو رب نے عزت' سلطنت سب

کچھ دی تھی مگر ان نافرمانیوں کی وجہ سے وہ ان دونوں نعمتوں سے محروم کر دیئے گئے۔اور اگر تمام کفار مراد ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ کفار کے لئے دنیا کی تکالیف بھی عذاب شدید ہے اور یہاں کی راحتیں عذاب شدید ہیں کہ کفار یہاں کی مصیبت سے گھبرا کر کفر میں اور اضافہ کر لیتے ہیں بلکہ کبھی خودکشی بھی کر لیتے ہیں مگر مومن کے لئے یہاں کے رنج و راحت' صبر و شکر کا ذریعہ بن جاتے ہیں لہٰذا آیت واضح ہے نیز غفلت کی زندگی بھی رب تعالیٰ کا عذاب ہے جو کافر کے لئے ہے قبر کا عذاب وہاں کی تنگی اندھیرا اور موذی جانوروں کی تکیف اور وحشت ہے اگرچہ بعض مسلمانوں کو بھی اپنی بدعملیوں کی وجہ سے عذاب قبر ہو گا۔مگر کفار اور گنہگار مسلمانوں کے عذاب قبر میں دو طرح فرق ہو گا۔ایک یہ کہ کفار کو قبر میں دوزخ کا عذاب ہو گا کہ وہاں کی گرمی اور موذی جانور وغیرہ اس پر مسلط ہوتے ہیں مگر مومن کو خود قبر کی تنگی اندھیرے اور وحشت وغیرہ کا عذاب ہو گا دوسرا یہ کہ کافر کا عذاب قبر قیامت تک ہو گا جو کسی صورت میں موقوف نہیں ہو سکتا مگر مومن کا عذاب قبر جمعہ یا کسی بزرگ کی گذر زندوں کی تسبیح و تہلیل کی برکت سے موقوف بھی ہو سکتا ہے اور آخرت کا عذاب جہنم کی آگ ہے یعنی میں کفار کو دنیا میں بھی سخت عذاب دوں گا اور آخرت میں بھی۔اور اس کے ساتھ ہی وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ناصرین جمع ناصر کی ہے۔بمعنی مددگار یا تو اس لئے جمع لایا گیا کہ کفروا جمع تھا ہر ایک کافر کے مقابلہ میں ایک مددگار یعنی ان میں سے کسی کافر کے لئے کوئی مددگار نہ ہو گا یا یہ جمع اقسام کے لحاظ سے ہے کہ مددگار بہت قسم کے ہوتے ہیں مال سے' جان سے' اپنی عزت آبرو کے ذریعہ مدد کرنے والے یہاں ان سب کی نفی کرنا مقصود ہے۔یعنی کفار کے لئے کسی قسم کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔کیونکہ کفار میں اللہ کے مقرر کردہ مددگاروں سے مدد لینے کی قابلیت نہیں۔جیسے اندھے یا چمگادڑ کی آنکھ میں سورج سے نور لینے کی قابلیت نہیں یا بنجر زمین میں بارش سے فیض لینے کی لیاقت نہیں فیض کے لئے دینے والے میں زور لینے والے میں قابلیت چاہئے خیال رہے کہ کفار کے لئے نہ دنیا میں کوئی مددگار ہے جو انہیں راہ راست پر لگا کر اللہ کے عذاب سے بچالے نہ قبر میں کوئی مددگار جو انہیں ایصال ثواب وغیرہ کر کے وہاں کے عذاب سے بچائے اور نہ کوئی محشر میں ان کا مددگار جو وہاں ان کی شفاعت کرے لہٰذا یہ آیت کریمہ بہت جامع ہے اور مَالَهُمْ فرما کر مسلمانوں کو بچالیا وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ چونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے اس لئے کفار کے مقابل مسلمانوں کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جو ساری ایمانیات پر ایمان لائے خصوصاً عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کمی بیشی سے محفوظ رہے اور انہوں نے ہر ممکن نیکی بھی کی۔ہماری اس تفسیر سے بہت سے اعتراضات اٹھ گئے۔فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ یوفی توفیۃ سے بنا بمعنی پورا دینا۔ھم کا مرجع مومنین ہیں اجور جمع اجر کی ہے۔بمعنی اجر و ثواب یہاں دوسرے معنی زیادہ قوی ہیں۔یعنی انہیں رب تعالیٰ ان نیکیوں کے بدلے یا ان کے ثواب پورے پورے دے گا۔چونکہ ہر نیکی کا ثواب جداگانہ ہے روزہ کا ثواب اور ہے نماز کا اجر اور یا ہر مسلمان کو علیحدہ ثواب ملے گا یا اس لئے کہ مومن کو نیکیوں کا اجر دنیا میں بھی ملتا ہے یعنی حیات طیبہ اور مرتے وقت بھی حسن خاتمہ قبر' حشر میں بھی عذاب سے نجات یا ہر عمل کے بیسیوں اجر ملیں گے۔مثلاً نماز پنجگانہ سے وضو کا ثواب الگ' مسجد میں جانے کا الگ' اس لئے اجور جمع فرمایا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ یہ گذشتہ کلام کا خاتمہ ہے یا اس کی وجہ اور محبت نہ کرنے سے یا ناراض ہونا مراد ہے۔یا ارادہ تعظیم نہ کرنا ظَالِمِيْنَ ظلم سے بنا بمعنی چیز کا بے موقع خرچ کرنا یہاں کفار مراد ہیں کیونکہ وہ اپنی عبادت کو بے موقعہ صرف کرتے ہیں یعنی اللہ کفار کو ناپسند کرتا ہے۔ذٰلِكَ

نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ ذَالِكَ سے عیسیٰ علیہ السلام کے مذکورہ واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ وہ عظیم الشان تھے اس لئے ذَالِكَ فرمایا۔ نَتْلُوْ تلاوت سے بنا۔ اس کی لغوی تحقیق بارہا ہو چکی۔ یہاں خبر دینا ذکر کرنا یا پڑھنا مراد ہے۔ اگرچہ یہ کام جبریل علیہ السلام کے تھے مگر چونکہ رب تعالیٰ کے حکم سے تھے اس لئے اسے رب تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا۔ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ یہ عبارت نَتْلُوْ کی ضمیر سے حال ہے۔ آیات سے مراد یا قرآن پاک کی آیتیں ہیں۔ یا حضور ﷺ کی نبوت کی نشانیاں ذکر سے مراد قرآن شریف ہے اور حکیم یا حکم بمعنی مضبوطی سے بنا یا حکمت سے (خازن) بعض لوگوں نے کہا کہ ذکر حکیم سے مراد لوح محفوظ ہے۔ جہاں سے آسمانی کتابیں آتی ہیں یعنی یہ واقعات اور مضبوط قرآن کی آیات آپ کو ہم ہی بتاتے ہیں۔ نہ آپ نے کسی سے پڑھیں نہ کہیں سنیں یہ آپ کی نبوت کی نشانیاں ہیں قرآن مضبوط یا حکمت والا کہ نہ اس کی کوئی آیت لغو اور نہ اسے کوئی مٹا سکے۔ آپ پر ان چیزوں کا آنا آپ کی نبوت کی دلیل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آیات سے مراد قرآن کی عام آیتیں ہوں۔ اور ذکر حکیم سے مراد نعت انبیائے کرام کی آیات۔

خلاصہ تفسیر

مسلمانوں اور کفار میں اس طرح فیصلہ ہوگا کہ کفار کو تو دنیا میں بھی ہم سخت عذاب دیں گے کہ ان پر جزیہ مقرر کریں گے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کرائیں گے۔ دنیا میں انہیں ذلیل و خوار رکھیں گے۔ اور آخرت میں بھی آگ و تکالیف کی سخت سزا دیں گے۔ اور ان کے لئے کوئی کسی قسم کا مددگار نہ ہوگا۔ کہ انہیں مال و دولت یا اپنی عزت آبرو کے ذریعے ہمارے عذاب سے بچالے۔ ہاں جو ایماندار ہیں اور ہر قسم کی نیکیاں بقدر طاقت کرتے ہیں۔ رب تعالیٰ انہیں ان کا اجر پورا پورا دے گا۔ کسی قسم کی کمی نہ فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں یعنی کافروں کو پسند نہیں فرماتا۔ خیال رہے کہ قرآن کریم میں چار قسم کی آیتیں ہیں بعض وہ جن میں فرمایا گیا کہ کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔ جیسے یہاں۔ بعض وہ جن میں ارشاد ہوا کہ اے مسلمانو تمہارا مددگار کوئی نہیں جیسے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (بقرہ:۱۰۷) بعض وہ جن میں فرمایا گیا کہ مومنوں کے مددگار بہت ہیں جیسے اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ الخ (مائدہ:۵۵) یا جیسے وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء:۷۵) بعض وہ جن میں ارشاد ہوا کہ بعض کفار بعض کے مددگار ہیں۔ جیسے بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (انفال:۷۲) یا جیسے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ الخ (بقرہ:۲۵۷) ان اثبات و نفی کی مختلف آیات میں مختلف امدادوں کا ذکر ہے۔ مثلاً کفار کا آخرت میں کوئی مددگار نہیں۔ یا دنیا میں ان کا راہ نما کوئی نہیں اور مسلمانوں کا اللہ کے مقابل کوئی مددگار نہیں۔ اس لئے وہاں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ارشاد ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ اِنْ يَّمْسَسْكَ مِن رحمة الله فلا مرسل له (آل عمران:۱۶۰) اور اللہ کے بنانے سے مسلمانوں کے مددگار بہت ہیں اور بعض کافر بعض کے کفر و طغیان کے مددگار ہیں۔ کہ جو انہیں اور زیادہ کافر و طاغی بنا دیتے ہیں لہٰذا ان چاروں قسم کی آیتوں میں کوئی تعارض نہیں خیال ہے کہ جب اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے ساتھ آئے گا تو اس سے جنات اور انسان سب ہی مراد ہوں گے۔ اور جب اَلَّذِيْنَ کے بعد ایمان کا ذکر ہوگا تو اس سے صرف مومن انسان مراد ہوں گے کیونکہ دوزخ سارے کافروں کے لئے ہے۔ جنات ہوں یا انسان مگر جنت صرف انسان مومنوں کے لئے ہے۔ نہ جنات کے لئے نہ فرشتوں کے

لئے جیسا کہ سورۂ جن اور سورۂ احقاف میں ہے۔ لہٰذا ان آیات میں پہلے اَلَّذِیْنَ میں جن و انس سب داخل ہیں۔ اور دوسرے الذین میں صرف انسان داخل ہیں ایمان کے معنی ہیں امن دینا یہ رب تعالیٰ کی بھی صفت ہے۔ اور انسانوں کی بھی اللہ تعالیٰ خوش عقیدہ لوگوں کو عذاب سے امن دیتا ہے۔ اور مومن ایمان کا ذریعہ اپنے کو امن دیتا ہے ایمان اور نیک اعمال کا اجمالی ذکر قرآن شریف میں ہے۔ اس کی تفصیل حدیث شریف میں ہے کیونکہ حدیث قرآن کی ہی تفسیر ہے۔ حدیث کا منکر تو اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے معنی بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بھی خیال رہے کہ قرآن کریم میں ظالم کافر کو بھی کہا گیا ہے۔ گنہگار کو بھی اور خطا کار کو بھی اور کسی کا حق مارنے والوں کو بھی اندھیری مچانے والے۔ ظلم بمعنی تاریکی یہاں ظالم بمعنی کافر ہے۔ اور یا بمعنی حق مارنے والا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اعمال ایمان سے خارج ہیں۔ اسی لئے عمل کو ایمان پر معطوف کیا گیا۔ **دوسرا فائدہ:** مومن کے لئے ثواب میں زیادتی ہوگی مگر کمی نہ ہوگی جیسا کہ یُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** کافر کا کوئی مددگار نہیں اور نہ انہیں کوئی عذاب الٰہی سے بچائے مسلمانوں کے لئے انشاء اللہ انبیائے کرام علماء اور اولیاء اللہ دنیا و آخرت میں مددگار ہیں اور انشاء اللہ نیکیاں اور شفاعت اسے عذاب سے بچائیں گے۔ جیسا کہ لَهُمْ کی تقدیم سے معلوم ہوا۔ یعنی صرف کافروں کے لئے کوئی مددگار نہیں۔ **چوتھا فائدہ:** انبیاء کا علم غیب ان کی نبوت کی دلیل ہے۔ اس کا منکر گویا در پردہ ان کی نبوت میں شک کرنے والا ہے۔ جیسا کہ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** ایمان کے ساتھ نیک اعمال کی بھی ضرورت ہے۔ اور نیکی کے لئے ایمان شرط جیسا کہ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** نجات کے لئے بقدر طاقت ہر قسم کی نیکی کرے صرف ایک دو عمل پر ہی قناعت نہ کرے جیسا کہ اَلصّٰلِحٰتِ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس کی کیا وجہ ہے کہ ثواب کو ایمان اور نیک عمل پر موقوف کیا۔ مگر عذاب کو صرف کفر پر موقوف رکھا۔ وہاں بدعملی کا ذکر نہ فرمایا کیا کفر ایمان سے قوی تر ہے۔ **جواب:** عذاب کے لئے صرف کفر ہی کافی ہے خواہ بدعملی کرے یا نہ کرے، مگر پورے ثواب کے لئے ایمان اور عمل دونوں ضروری۔ گنہگار مسلمان ثواب کا تو مستحق ہے مگر پورے ثواب کا مستحق نہیں نفس ثواب اور ہے اور پورا ثواب کچھ اور۔ پورا ثواب تو یہ ہے کہ عذاب بالکل نہ ہو اور کوئی نیکی برباد نہ ہو۔ گنہگار بدعملی سے اپنی بعض نیکیاں برباد کر لیتے ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کافروں کو دنیا میں بھی عذاب ہوگا اور آخرت میں بھی حالانکہ بعض کفار دنیا میں بڑے مزے میں ہیں اور مسلمان تکلیف میں تو آیت کا مطلب کیا؟

جواب: اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں کفار سے صرف یہود مراد ہیں اور دنیوی عذاب سے ان کی سلطنت سے محروم ہونا، ہمیشہ دوسروں کا غلام، دنیا میں ذلیل رہنا مراد ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہودی ہمیشہ اس ذلت میں مبتلا رہے اور رہیں گے۔ دوسرے یہ کہ كَفَرُوْا سے عام کفار مراد ہیں اور دنیوی عذاب سے بیماریاں، تنگ زندگی مراد ہیں، کیونکہ بیماری

مسلمان کے واسطے رحمت ہے اور کافر کے لئے عذاب نیز مسلمان غربت میں بھی خوش رہتا ہے اور کافر غنی ہو کر بھی پریشان راحت مال پر موقوف نہیں۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیک مسلمان کو پورا ثواب ملے گا۔ مگر احادیث سے ثابت ہے کہ بعض اعمال کا ثواب ایک لاکھ گنا تک ملے گا۔ ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں پورے سے مراد کمی نہ ہونا ہے زیادتی اس کے خلاف نہیں دوسرا یہ کہ پورے سے مراد قانون کے مطابق ہے نہ کہ عمل کے مطابق جس نیکی کا ثواب ایک لاکھ ملتا ہے وہ ہی اس کا پورا ثواب ہے۔ کیونکہ قانون کے ماتحت ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان کو پورا ثواب ملے گا مگر بعض آیتوں اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہ نیکیاں برباد کر دیتے ہیں۔ حالانکہ گنہگار مومن ہوتا ہے ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس کا جواب فوائد میں گذر گیا کہ پورا اجر ملنا تقویٰ پر موقوف ہے۔ اور گناہ سے بچنا بھی تقویٰ میں داخل ہے لہٰذا گنہگار اس آیت سے خارج ہے۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اجر و ثواب کا ملنا۔ ایمان و اعمال دونوں پر موقوف ہے۔ تو جن لوگوں کو ان کا وقت ہی نہ ملا۔ تو وہ کہاں جائیں گے جنت میں یا دوزخ میں اگر دوزخ میں گئے تو رب کے کرم کے خلاف ہے۔ اگر جنت میں گئے تو اس آیت کے خلاف یہ سوال مسلمانوں کے چھوٹے بچوں پاگلوں دیوانوں ایمان لاتے ہی مر جانے والوں کے متعلق بھی ہے۔ اور ان کے متعلق بھی جو ابتدائے اسلام میں فوت ہو گئے جبکہ اعمال آئے ہی نہ تھے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک عالمانہ اور دوسرا عاشقانہ علماء فرماتے ہیں کہ ان جیسی آیتوں میں بقدر طاقت کی قید ہے۔ رب فرماتا ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرۃ:۲۸۶) لہٰذا ایسے لوگ بغیر اعمال ہی جنت میں جائیں گے۔ عشاق فرماتے ہیں کہ جنت کسبی بھی ہے اور عطائی بھی ان جیسی آیتوں میں جنت کسبی کا ذکر ہے دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کو دوسروں کے طفیل جنت ملے گی۔ اور بعض آیات سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کو محض اللہ کے کرم سے جنت عطا ہوگی۔ قانون اور ہے اور رب کا فضل کچھ اور۔ لہٰذا آیت واضح ہے نہ تو کوئی شخص عمل سے بے پرواہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اپنے عمل پر اعتماد کر سکتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا مثل کھیتی کے ہے جیسے کھیت میں بھوسہ اور دانہ ایک ہی کھاد پانی پاتے ہیں مگر کٹنے کے بعد دانے کی جگہ اور ہے اور بھوسے کی جگہ دوسری۔ ایسے ہی دنیا میں کفار مومن یہاں کی نعمتوں سے عام فائدہ حاصل کر رہے ہیں مگر قیامت کا دن گویا اس کھیت کے کٹنے کا دن ہوگا جس کے بعد مسلمانوں کی جگہ جنت ہوگی۔ اور کفار کی جگہ دوزخ۔ صوفیائے کرام کے نزدیک کفار کا مقام قلب سے محروم رہنا اور اپنی بدعملی میں پھنسا رہنا حق تعالیٰ سے محجوب رہنا سخت عذاب ہے لیکن وہ لوگ جو ایمان شہودی رکھیں اور ہر طرح نفس کا تزکیہ اور تصفیہ کریں اور نیک عمل سے اسے آراستہ کریں اور نفس کے مقابلہ میں قلب کو توجہ الی اللہ میں امداد کریں۔ حق تعالیٰ انہیں قدسی انوار اور روحانی اشراق سے پورا پورا حصہ دے گا۔ رب تعالیٰ ظالم یعنی اعمال میں کوتاہی کر کے اجر میں کمی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہاں کامل مومن وہ ہے جس کے لئے دنیا رب تعالیٰ سے حجاب نہ بن جائے۔ ہر شخص کو رب سے قدرتی عشق ہے اور عاشق کے لئے محبوب کا وصال انتہائی کامیابی ہے اور محبوب سے محجوبی انتہائی ناکامی۔

دنیاوی الجھنوں میں پھنس کر اس عشق کا ظہور نہیں ہوتا۔ قیامت کے دن آتش عشق انتہائی جوش پر ہوگی۔ اور پھر وہ رب تعالیٰ سے محجوب رہے گا۔ اس وقت کی تکلیف نا قابل برداشت ہوگی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ خدا کفار کو دیکھے گا نہیں یہ نہ دیکھنا جہنم کے عذاب سے سخت تر ہوگا کفار کے لئے دنیوی عذاب یہاں کی الجھنیں ہیں۔ اور اخروی عذاب دیدارِ یار سے محرومی۔ مومن کے لئے پورا اجر یہ ہے کہ دنیا میں یار کی یاد سے محروم نہ رہے۔ اور آخرت میں یار کے دیدار سے محجوب نہ ہو۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ ایمان شہودی بھی ہوتا ہے۔ بالغیب بھی۔ ہم دنیا میں آنے سے پہلے ایمان شہودی رکھتے تھے عالم ارواح میں کوئی کافر نہ تھا اور مرنے کے بعد بھی سب کو ایمان شہودی نصیب ہو جائے گا ہر شخص مرتے وقت ہی ایمان لے آتا ہے یہ دونوں ایمان نجات کے لئے کافی نہیں ایمان بالغیب چاہئے اسی پر نجات کا مدار ہے۔ یوں ہی صالح عمل وہ ہے جس میں عامل بالغیب بھی صالح ہو۔ مولینا فرماتے ہیں شعر

ہر چہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد ملتی ملت شود!

اس آیت میں اٰمَنُوْا اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سے یہی مراد ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ

تحقیق کہاوت عیسیٰ کی نزدیک اللہ کے مثل کہاوت آدم کے ہے کہ بنایا ان کو مٹی سے پھر فرمایا

عیسیٰ کی کہاوت اللہ کے نزدیک آدم کی طرح ہے اُسے مٹی سے بنایا پھر فرمایا

قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۶۰﴾

واسطے ان کے ہو جا پس ہو جاتا ہے وہ سچ ہے طرف سے رب آپ کے پس نہ ہو تم شک کرنے والوں میں سے

ہو جا وہ فوراً ہو جاتا ہے اے سننے والے یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے تو شک کرنے والوں میں نہ ہو

فَمَنْ حَآجَّكَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا

پس جو کوئی جھگڑا کرے تم سے بیچ اس کے پیچھے سے اس کے کہ آیا تمہارے پاس علم پس کہہ دو کہ آؤ

پھر اے محبوب جو تم سے عیسیٰ کے بارے حجت کریں بعد اس کے کہ تمہیں علم آچکا تو ان سے فرما دو آؤ

نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۟ قف

بلائیں ہم بیٹوں اپنوں کو اور بیٹوں تمہارے کو اور عورتوں اپنی کو اور عورتوں تمہاری کو اور جانوں اپنی کو اور جانوں تمہاری کو

ہم تم بلائیں اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۱﴾

پھر دعائے لعنت کریں پس کریں لعنت اللہ کی اوپر جھوٹوں کے

پھر مباہلہ کریں تو جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** دعوے کو چند طرح ثابت کیا جاتا ہے۔ دلائل سے واقعات سے اور معترض کے شبہات دور کر کے۔ پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت دلائل اور واقعات کی روشنی میں دکھائی گئی۔ کہ پیدا ہونا۔ رزق کھانا بندگی کی علامتیں ہیں۔ اب عیسائیوں کے اعتراض کا الزامی جواب دیا جارہا ہے۔ اور ان کے شبہات دور کئے جارہے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** منصف مقابل سے مناظرہ کیا جاتا ہے اور ہٹ دھرم سے مباہلہ یعنی جھوٹے کے لئے بددعا۔ اب تک عیسائیوں سے مناظرہ و گفتگو تھی۔ جس سے منصف فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اب ضدی عیسائیوں کے مقابلہ میں فیصلہ کن مباہلہ کی تعلیم ہے۔ گویا مناظرے کے بعد مباہلے کا ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں عیسیٰ علیہ السلام کے حیران کن واقعات بیان کئے گئے۔ جن سے شاید معترض ان کی الوہیت ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ اب اس غلط فہمی کو دور کیا جارہا ہے اور آدم علیہ السلام کا واقعہ پیش کر کے بتایا جارہا ہے کہ معجزات الوہیت کی علامت نہیں۔

شان نزول

وفد نجران جس کا ذکر شروع آل عمران میں ہو چکا۔ جب حضور ﷺ کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا تو ان کے سردار عاقب اور عبدالمسیح نے حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں فرمایا ہاں اس کے بندے، اسکے رسول، اس کے کلمے جو کنواری بتول مریم کی طرف القاء کئے گئے۔ وہ لوگ غصے ہو گئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ نے کوئی ایسا بندہ بھی دیکھا ہے جو بغیر باپ پیدا ہو۔ عیسیٰ علیہ السلام کا اس طرح پیدا ہونا ان کے ابن اللہ کی دلیل ہے۔ اسی وقت جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر آئے جس میں بتایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام سے غریب تر اور بہت انوکھی آدم علیہ السلام کی پیدائش ہے۔ کہ وہ بغیر ماں و باپ خشک مٹی سے پیدا ہوئے جب تم انہیں خدا کا بیٹا نہیں مانتے اللہ کا بندہ مانتے ہو تو عیسیٰ علیہ السلام کو عبداللہ ماننے میں کیا تعجب ہے۔ (خازن و خزائن)

تفسیر

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ چونکہ اس مضمون کے عیسائی منکر تھے اس لئے اِنَّ سے شروع فرمایا گیا نیز یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور ان کی والدہ کو اس لئے برا کہتے تھے کہ آپ بغیر والد پیدا ہوئے۔ اسی وجہ سے جناب مریم کی تہمت لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ نعوذ باللہ چونکہ آپ ثابت النسل نہیں ہیں اسی لیے آپ نبی تو کیا ولی بھی نہیں ہو سکتے اور ان کی تردید کے لئے بھی اِنَّ فرمایا گیا۔ کہ اگر بغیر باپ پیدا ہونا نبوت کے خلاف ہے۔ تو بے وقوف یہود یو تم حضرت آدم علیہ السلام کو نبی کیسے مانتے ہو ان کا نسب تو نہ باپ کی طرف ہے نہ ماں کی طرف سے جناب مسیح کا نسب ماں کی طرف سے تو ہے نیز رب جانتا تھا کہ مسلمانوں میں بعض ایسے بے دین پیدا ہوں گے جو جناب مسیح کا نسب یوسف نجار سے ثابت کریں گے اور بغیر والد ہونے کا انکار کریں گے۔ ان کی تردید کے لئے بھی اِنَّ ارشاد ہوا غرض کہ ایک اِنَّ سے یہود عیسائی، مرزائی، تینوں فرقوں کی بلیغ تردید فرمادی گئی۔ مَثَلَ کی تحقیق اور مثل و مثل میں فرق ہم پہلے پارے میں عرض کر چکے یہاں یا بمعنی کہاوت ہے یا بمعنی

حالت اور صفت۔ کَمَثَلِ میں اگر مثل تشبیہ کے لئے ہے تو کاف زائدہ ہے اگر بمعنی حالت وصف ہے تو کاف تشبیہ کا (روح المعانی وکبیر) عِنْدَ اللّٰهِ بمعنی فی حکم اللہ یا فی تقدیر اللہ ہے۔ اور ظرف اسی کا ہے جو کمثل آدم کا متعلق ہے۔ اور یہ مضمون ان کی خبر یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی کہاوت یا ان کی حالت عجیبہ یا ان کی صفت آدم علیہ السلام کی صفت کی طرح ہے خیال رہے کہ یہاں عجیب کی عجیب تر سے تشبیہ ہے۔ وجہ مشابہت صرف خلاف عادت بلا باپ پیدا ہونا ہے۔ ایک اعتبار سے آدم علیہ السلام کی پیدائش زیادہ عجیب ہے۔ کہ بغیر ماں باپ کے ہیں اور ایک اعتبار سے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش زیادہ عجیب ہے۔ کہ آدم علیہ السلام میں مٹی پانی وغیرہ تو ہے مگر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں کچھ نہیں بلکہ ماں باپ کا نطفہ بھی نہیں۔ کیونکہ آپ کے باپ تو ہیں ہی نہیں۔ نطفہ ماں کا بھی نہیں کیونکہ حضرت مریم کو حضرت جبریل امین کے دیکھتے ہی پہلے ہیبت طاری ہوئی۔ پھر فرزند کی بشارت پا کر حیرت پھر اپنی آبرو کی فکر لاحق ہوئی۔ نطفہ شہوت سے ہوتا ہے نہ کہ حیرت و ہیبت سے آپ کا ابن مریم ہونا اس لئے ہے کہ بی بی مریم کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور ان کے ہم شکل تھے نہ اس لئے کہ آپ کی پیدائش ان کے نطفہ سے ہے۔ اور نہ اس لئے کہ آپ کے پیٹ میں پرورش ان کے ماہواری خون سے ہے۔ کیونکہ جناب مریم کو خون کبھی نہیں آیا۔ جیسا کہ وَطَهَّرَكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر میں کہا گیا ہے۔ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ یہ اس کی تمثیل کا بیان ہے۔ اور خلق بمعنی صور ہے۔ ہ کا مرجع آدم علیہ السلام ہیں۔ تراب خشک مٹی کو کہتے ہیں اور یہ پیدائش آدم کی ابتداء کا ذکر ہے۔ کہ اولاً خشک مٹی لی گئی پھر اسے پانی میں گوندھ کر طین یعنی گارا بنایا پھر اسے سڑا کر طین لازب یعنی لیسدار بنایا گیا۔ پھر اس کا سلالہ یعنی اصل حاصل کیا گیا پھر اسے خشک کر کے صلصال یعنی آواز دینے والی مٹی بنایا گیا۔ پھر اس میں جلد بازی اور مشقت وغیرہ شامل کی گئیں۔ اس لئے آیتوں میں مختلف چیزوں کا ذکر ہے۔ یہاں فرمایا مِنْ تُرَابٍ کہیں فرمایا خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا (الفرقان: ۵۴) کہیں فرمایا وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (سجدہ: ۷) کہیں فرمایا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (مومنون: ۱۲) کہیں فرمایا اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر: ۲۸) کہیں فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (انبیاء: ۳۷) کہیں فرمایا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ (البلد ۴) چونکہ پیدائش انسان میں یہ تمام چیزیں تھیں۔ اس لئے مختلف آیتوں میں مختلف چیزوں کا ذکر ہوا۔ لہٰذا آیتوں میں مخالفت نہیں (تفسیر کبیر) اگرچہ آدم علیہ السلام کے خمیر میں پانی بھی شامل ہے۔ اور ہوا و گرمی کا بھی خلط ہے مگر چونکہ اصل مٹی تھی۔ اور یہ چیزیں مٹی کا خمیر کرنے کے لئے اس لئے رب تعالیٰ نے مِنْ تُرَابٍ فرمایا اور آپ کا نام آدم ہوا یعنی دوست والے آدم مٹی کو کہتے ہیں جیسے روٹی میں پانی اور آٹا دونوں شامل ہیں اور آگ کی امداد بھی مگر پانی اور آگ آٹے کو روٹی بنانے کیلئے ہیں۔ اس لئے آٹے کی روٹی کہا جاتا ہے پانی یا آگ کی روٹی نہیں کہا جاتا۔ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ چونکہ آدم علیہ السلام کے جسم بنانے اور روح پھونکنے کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔ اس لئے ثم فرمایا گیا جس سے تاخیر معلوم ہوئی۔ قَالَ کا فاعل رب تعالیٰ ہے اور لَهٗ کا مرجع جسم آدم علیہ السلام۔ کُنْ کی پوری تحقیق ہم پہلے کر چکے یہاں مراد ہے كُنْ بَشَرًا یا اِنْسَانًا یکون یا بمعنی کان ہے۔ کیونکہ یہ گذشتہ کی حکایت ہے۔ یا اس کا مضارع ہونا اس وقت کے لحاظ سے ہے جب کن فرمایا تھا (روح المعانی) یعنی رب تعالیٰ نے مٹی سے

ایک جسم بنایا۔ پھر اس جسم سے فرمایا کہ تو مکمل انسان ہو جا۔ یہ فرماتے ہی فوراً ایسا ہو گیا (روح المعانی) اس طرح کہ وہی مٹی جسم انسان بن گئی۔ جس میں پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک سارے اعضاء بن گئے۔ جیسے صابن کا خمیر' میدہ' تیل' ریٹھے وغیرہ سے ہوتا ہے مگر سوڈا کاسٹک کے پڑتے ہی یہ سب چیزیں اپنی حقیقت چھوڑ کر صابن بن جاتی ہیں۔ یا جیسے نطفہ ماں کے پیٹ میں گوشت پوست' ہڈی سب کچھ بن جاتا ہے نیز اس کن سے آپ کے جسم شریف میں روح بھی پڑ گئی۔ اور آپ اس کن سے عالم اسماء بھی ہو گئے۔ یعنی ہم نے کہا سب کچھ ہو جاؤ وہ سب کچھ ہو گئے غرضیکہ اس کن میں تین احتمال ہیں۔ (۱) اے مٹی کے جسم' جسم انسانی ہو جا (۲) اے بے جان جسم جاندار ہو جا (۳) اے آدم تم بشر زندہ خلیفہ عالم' عارف' نبی ساری خلق سے افضل سب کچھ ہو جاؤ ایسے ہی فَیَکُوْنُ میں یہ تینوں احتمال ہیں۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ یا تو اَلْحَقُّ مبتدا ہے۔ اور مِنْ رَّبِّکَ خبر یعنی حق وہ ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے ہو یا اَلْحَقُّ ہٰذا پوشیدہ کی خبر ہے اور مِنْ رَّبِّ حق کی صفت یا دوسری خبر۔ حق مقابل باطل کا ہے جیسے کذب مقابل صدق کا یعنی یہ سارے واقعات حق ہیں۔ آپ کے رب کی طرف سے ہیں۔ لہٰذا فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ اس میں بظاہر خطاب نبی ﷺ سے ہے مگر مقصود ہر قرآن پڑھنے والا ہے۔ مُمْتَرِیْنَ امتراء سے بنا جس کا مادہ مَرِیٌ یا مِریۃٌ ہے بمعنی جذب کرنا اور کھینچنا۔ اسی لئے بولتے ہیں مریت الناقت میں نے اونٹنی کا دودھ دوہ لیا۔ چونکہ شک انسان کے قلب کو کھینچے پھرتا ہے۔ ایک جگہ جمنے نہیں دیتا اسی لئے اسے مریۃ کہا جاتا ہے لہٰذا اے مسلمان تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ یعنی شک کرنا تو کیا تو شک کرنے والوں کی جماعت سے بھی نہ ہو فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْہِ بیان دلائل اور دفع شبہات کے بعد اخیری فیصلہ کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے یہاں مِنْ سے مراد نجران کے عیسائی ہیں کیونکہ اس وقت انہی سے مقابلہ تھا اور فیہ کی ضمیر سے مراد شان عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی عبدیت ہے۔ حَآجَّ مُحَاجَّۃٌ سے بنا بمعنی ایک دوسرے کے مقابل حجت کرنا یعنی اے نبی ﷺ اتنے دلائل کے بعد بھی جو کوئی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ سے جھگڑا کرے مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ مِنْۢ بَعْدِ حَآجَّ کے متعلق ہے علم سے مراد یقینی آیتیں اور مضبوط دلائل ہیں کیونکہ وہ علم کا ذریعہ ہیں اور مِنْ بیانیہ ہے۔ مَا کا بیان نہ کہ تبعیضیہ۔ اس لئے کہ نبی ﷺ کو اس کا پورا علم عطا فرمایا گیا تھا نہ کہ بعض چونکہ مناظرہ تو ہر قطعی و ظنی مسئلہ پر ہو سکتا ہے مگر مباہلہ صرف عقائد قطعی پر ہی ہو سکتا ہے اسی لئے یہ جملہ ارشاد ہوا یعنی جبکہ آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت و نبوت کا آیات قرآنیہ کے ذریعہ قطعی و یقینی علم دیدیا گیا لہٰذا اب جو آپ کے مقابل ان پر ضد کرے تو مباہلہ کرو۔ اس ایک عبارت میں رب تعالیٰ نے ہم کو مباہلہ کے متعلق بہت سے مسائل بتا دیئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اس کے سوا اور چیزوں کا علم نہیں۔ فَقُلْ تَعَالَوْا یہ جملہ مِنْ حَآجَّکَ کی جزا ہے تَعَالَوْا کا مصدر تعالیٰ ہے بمعنی اوپر چڑھنا اس کا مادہ علو بمعنی بلندی ہے۔ اسکے معنی ہیں اوپر آؤ مگر اب مطلقاً آنے کے لئے استعمال ہے یعنی فرما دو کہ خوب پختہ ارادہ کر کے آؤ۔ نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ ندع دعوے سے بنا بمعنی بلانا۔ ابناء کے معنی ہیں بیٹے' مگر یہاں بیٹے' پوتے' نواسے سب ہی مراد ہیں یعنی مذکر اولاد اس لئے کہ نبی ﷺ اس موقعہ پر اپنے ساتھ امام حسن و حسین کو لے گئے تھے رضی اللہ عنہم جو کہ حضور ﷺ کے نواسے ہیں بعض نے فرمایا کہ یہاں ابناء سے مجازاً اولاد اور داماد مراد ہیں۔ کیونکہ حضور ﷺ سیدنا علی کو بھی ساتھ لے گئے تھے جن کا شمار داماد کی وجہ سے حضور ﷺ

کی اولاد میں تھا۔(روح المعانی)وَنِسَآءَ نَا وَنِسَآءَ کُمْ نساء خلاف قیاس برۃ کی جمع ہے بمعنی عورت یہاں اس سے بیویاں مراد نہیں بلکہ بیٹیاں ہیں۔جیسا کہ اَبْنَآءُ سے معلوم ہوا کیونکہ فقط نساء سے مطلق عورتیں مراد ہوتی ہیں۔اور جب نساء کسی کی طرف مضاف ہو تو بیویاں جیسے یَا نِسَآءَ النَّبِیِّ (احزاب:۳۲)اور اگر اَبْنَآءُ سے ساتھ مل کر آئے تو مراد بیٹیاں ہیں جیسے یہاں خیال ہے کہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ اُس وقت نہ ان کی بیویاں تھیں نہ بیٹیاں نہ کوئی اور انہوں نے صرف دعا میں انہیں شریک کرنا تھا۔نیز اس موقعہ پر حضور ﷺ حضرت فاطمہ زہرہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے نہ کہ ازواج مطہرات کو۔ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ انفس جمع نفس کی ہے بمعنی جان اور ذات ظاہر یہ ہی ہے کہ اس سے خود اپنی ذات مراد ہے اور ذات کے بلانے کا مطلب ہے۔موقعہ پر اپنے آپ حاضر ہو جانا بعض نے فرمایا کہ اس سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مراد ہیں۔یعنی جان کی مثل پیارے۔بعض نے فرمایا کہ اس سے عام اہل دین مراد۔مگر یہ دونوں قول ضعیف ہیں۔جیسا کہ انشاء اللہ سوال و جواب میں معلوم ہوگا یعنی فرما دو کہ اے عیسائیو آؤ ہم اور تم اپنی بیٹی بیٹوں اور اپنی جانوں کو ایک جگہ جمع کریں۔ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ ثُمَّ فقط ذکری تاخیر کے لئے ہے نَبْتَهِلْ ابتہال سے بنا جس کا مادہ بہلٌ ہے۔بمعنی دعاء عاجزی اور دعا کے بعد اس کی قبولیت کا انتظار اور بمعنی لعنت بھی آیا ہے۔اسی لئے دعا میں عاجزی کرنے کو ابتہال فی الدعا کہتے ہیں۔مگر یہاں دعاء سے لعنت مراد ہے یعنی ایک دوسرے کو بددعا جیسا کہ اگلا جملہ اس کی تفسیر کر رہا ہے۔فَنَجْعَلْ کی ف یا تعقیبیہ ہے یا تفسیریہ نجعل جعل سے بنا بمعنی کرنا۔یہاں مراد دعا کرنا ہے۔لعنت کے لغوی معنی ہیں دور کرنا رحمت سے دور کرنا اللہ کی لعنت ہے اور اس دوری کی دعا کرنا بندہ کی لعنت الْكٰذِبِیْنَ میں الف لام عہدی ہے اور اس سے عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں جھوٹ بولنے والے مراد ہیں۔یعنی ہم تم اپنے اہل قرابت کے ساتھ جمع ہو کر آپس میں مباہلہ کریں کہ جھوٹے پر رب کی لعنت بھیجیں۔مگر حضور انور ﷺ تو اپنی بیٹی و نواسوں کو ساتھ لے گئے۔لیکن وہ نجرانی عیسائی صرف خود ہی موجود تھے۔ان کے ساتھ ان کی اولاد وغیرہ کوئی نہ تھی۔وہ صرف بددعا میں ہی انہیں شریک کرتے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ پیدا ہونے سے ان کی الوہیت ثابت کرنے والے سخت غلطی پر ہیں۔اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی حالت آدم علیہ السلام کی طرح ہے کہ رب تعالیٰ نے بغیر نطفہ اور بغیر ماں باپ خشک مٹی سے ان کی صورت بنائی اور پھر ان سے کن فرمایا تو وہ اچھے خاصے قوی اور توانا انسان بن گئے۔اگر بغیر باپ پیدا ہونا خدا ہونے کی دلیل ہے تو کیا عیسائی آدم علیہ السلام کو بھی خدا مانیں گے جب انہیں خدا نہیں مانتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کیوں مانتے ہیں اے مسلمان یہ سارے دلائل اور عقائد حق ہیں تیرے رب کی طرف سے ہے لہذا تو شک کرنا تو کیا شک کرنے والوں میں سے بھی نہ ہو یا حق وہ ہوتا ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہو اور جو ان بناوٹی باتیں ہوں وہ سب باطل ہیں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام حق ہیں کہ ان کی ذات صفات حالات سب حق ہیں اور آپ کی پیدائش رب کی طرف سے ہے نہ کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ۔یا لائق قبول وہ عقیدہ ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے ہو اور جو یہود و نصاریٰ کے گھڑے ہوئے ہیں وہ لازم الرک ہیں۔خیال رہے کہ حق یا مقابل باطل کا ہے۔بمعنی درست یا مقابل زائل کے بمعنی باقی و ناقابل زوال یا بمعنی لائق قبول اسی سے ہے۔

حقیق رب فرماتا ہے حَقِیْقٌ عَلٰی اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (اعراف:۱۰۵) اوراس کی حقانیت پر یقین کرواور اے محبوب علیہ السلام ان یقینی دلائل اور منہ توڑ جواب سننے کے بعد بھی جو عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ سے جھگڑا کریں اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا ہی کہیں تو آپ ان سے اب مناظرہ نہ کرو بلکہ انہیں مباہلہ کی دعوت دو۔ اور فرمادو کہ میدان میں آؤ ہم تم اپنی اولاد یعنی بیٹی بیٹے اور اپنے آپ کو ایک جگہ جمع کریں پھر خدا کی بارگاہ میں عاجزی سے دعا کریں۔ کہ مولیٰ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہو اس پر لعنت کر۔ یہ آپ کا اور ان کا اخیری فیصلہ ہے۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی طرف سے حضرات انبیاء کرام کو تین نوعیتوں سے علم عطا ہوتے ہیں۔ پیدائش علم جیسے معرفت الٰہی۔ ایمانیات وغیرہ کے علوم۔ دوسرے وہ جو حسب موقعہ الہام کے ذریعہ عطا ہوتے ہیں۔ تیسرے وہ جو بذریعہ وحی عطا ہوتے ہیں ان تینوں علوم کی آیات قرآنی موجود ہیں یہاں مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ میں علم سے مراد یہ تیسرا علم ہے۔ اور اس عبارت میں ہم کو بتانا مقصود ہے۔ کہ اے مسلمانوں صرف قطعی یقینی مسئلہ پر مباہلہ کرنا ظنی۔ اجتہادی مسئلہ پر کبھی مباہلہ نہ کرنا۔ اس لئے حضور علیہ السلام نے صرف ایک ہی بار مباہلہ کی تیاری فرمائی۔ مناظرے بارہا کئے۔ اور حضور انور علیہ السلام سے پہلے انبیاء کرام نے مناظرے کئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ نمرود سے تو قرآن کریم میں مذکور ہے مگر مباہلہ کسی رسول نے نہ کیا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے نجرانی عیسائیوں کو اس مباہلے کی دعوت دی اور یہ آیت انہیں سنائی وہ بولے کہ ہمیں تین دن کی مہلت دی جائے ہم اس معاملہ میں غور کرلیں ان کی یہ گذارش منظور کی گئی چنانچہ وہ تنہائی میں جمع ہوئے اور بنی نضیر اور بنی قریظہ کو بھی بلایا عاقب نے عبدالمسیح سے کہا کہ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ وہ بولا عیسائیو! تم پہچان چکے کہ محمد رسول اللہ علیہ السلام سچے رسول ہیں اگر تم نے ان سے مباہلہ کیا تو سب ہلاک ہو جاؤ گے اگر اپنا دین قائم رکھنا ہے تو مباہلہ نہ کرو گھر لوٹ چلو۔ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی خبر توریت میں ہے۔ یہ مشورہ ہونے کے بعد یہ لوگ وقت مقررہ پر حضور علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔ ادھر نبی کریم علیہ السلام اس طرح تشریف لائے کہ حضور علیہ السلام کی گود میں امام حسین ہیں اور دست مبارک میں امام حسن کا ہاتھ ہے اور فاطمہ زہرہ وعلی المرتضیٰ حضور علیہ السلام کے پیچھے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور حضور علیہ السلام ان سے فرمارہے ہیں کہ جب میں دعا کروں تو تم سب آمین کہنا گویا ادھر پنجتن پاک تھے اور ادھر عیسائیوں کے چودہ سرداراُن کے ساتھ بہت مخلوق عیسائیوں کے سردار نے ان حضرات کو دیکھ کر کہا کہ اے عیسائیو! میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ اللہ سے پہاڑ ہٹانے کو کہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا سے پہاڑ کو جگہ سے ہٹا دے۔ خدا کے لئے ان سے مباہلہ نہ کرو۔ ورنہ قیامت تک روئے زمین پر کوئی نصرانی باقی نہ رہے گا۔ آخر کار انہوں نے عرض کیا کہ مباہلے کی ہماری رائے نہیں اور ہم آپ سے جزیہ پر صلح کرتے ہیں کہ ہر سال آپ کو دو ہزار جوڑے، تینتیس زرہ، تینتیس اونٹ اور چونتیس گھوڑے دیا کریں گے۔ حضور علیہ السلام نے قبول فرمایا۔ اور فرمایا کہ قسم رب کی نجران والوں پر عذاب قریب ہی آ گیا تھا اگر وہ مباہلہ کرتے تو بندر سور بن جاتے۔ اور ان کا جنگل آگ سے بھڑک اٹھتا۔ اور نجران کے چرند پرند تک نیست و نابود ہو جاتے بلکہ ایک سال کے اندر روئے زمین کے عیسائی ہلاک ہو جاتے۔ (خزائن العرفان وروح المعانی وکبیر وغیرہ) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد ہی حضور علیہ السلام نے اپنے کمبل شریف میں حضرات حسنین وفاطمہ زہرہ وعلی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کو داخل فرما کر دعا کی کہ مولیٰ یہ میرے اہل بیت ہیں انہیں خوب

پاک فرمایا انشاء اللہ اس کا پورا واقعہ سورۂ احزاب میں آئے گا۔

لطیفہ: کسی عالم کا عیسائی پادری سے مناظرہ ہوا عالم نے عیسائی سے پوچھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کی کیا دلیل ہے۔ وہ بولا بغیر باپ پیدا ہونا عالم نے کہا پھر چاہئے کہ آدم علیہ السلام بھی خدا ہوں کہ وہ بغیر ماں باپ پیدا ہوئے عیسائی بولا کہ نہیں بلکہ مردوں کو زندہ کرنا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کی دلیل ہے عالم نے جواب دیا کہ پھر چاہئے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام خدا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے چار مردے زندہ کئے۔ مگر ان کی دعا سے چار ہزار مردے زندہ ہوئے۔ عیسائی بولا کہ نہیں بلکہ ان کا پرندے بنانا' اور اس میں جان ڈالنا ان کے خدا ہونے کی دلیل ہے۔ عالم نے کہا پھر چاہئے کہ رحم میں بچہ بنانے والا فرشتہ خدا ہو کہ وہ دن رات یہ ہی کام کرتا ہے آخر کار عیسائی خاموش ہو گیا۔

نوٹ: ابن عساکر نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ حضور سیّد عالم ﷺ اس مباہلہ میں ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کی اولاد کو بھی ساتھ لے کر گئے تھے مگر یہ روایت جمہور کے خلاف ہے۔ (روح المعانی)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** عیسیٰ علیہ السلام میں حضرت مریم کا نطفہ شامل نہیں۔ آپ صرف حضرت جبریل علیہ السلام کی سانس سے پیدا ہوئے۔ اسی لئے آپ کو آدم علیہ السلام سے تشبیہ دی گئی۔ کہ جیسے ان کی ولادت صرف کن سے تھی ایسے ہی آپ کی۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (انبیاء:۹۱) ہاں فرق یہ ہے کہ آدم علیہ السلام میں کوئی واسطہ نہ تھا عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں حضرت مریم کا واسطہ ہے۔ انہیں ابن مریم صرف اسی لئے کہتے ہیں کہ حضرت مریم کے شکم سے تشریف لائے۔ اور ان کی ہم جنس نہ اس لئے کہ وہ ان کے نطفہ سے پیدا ہوئے۔ **دوسرا فائدہ:** حضور ﷺ سچے نبی اور پیغمبر برحق ہیں۔ کہ حضور ﷺ کی دہشت سے نجران کے عیسائی مباہلہ پر تیار نہ ہوئے۔ **تیسرا فائدہ:** حضرات حسنین و فاطمہ زہرہ و علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بڑے درجے والے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنی دعا پر آمین کہنے کے لئے انہیں منتخب فرمایا۔ **چوتھا فائدہ:** مناظرہ میں (جانبین) کا علم میں برابر ہونا ضروری نہیں۔ اعلیٰ درجہ کا عالم معمولی شخص سے مناظرہ کر سکتا ہے۔ دیکھو حضور انور ﷺ نے جو اعلم الخلق ہیں نجران کے معمولی پادریوں سے مناظرہ کیا۔ مگر کج بحث اور ہٹ دھرم سے مناظرہ نہ کرنا چاہئے۔ کہ اس میں بیکار وقت ضائع کرنا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (اعراف:۱۹۹) خود رب نے ابلیس کے دلائل کا جواب نہ دیا بلکہ فرمایا فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (الحجر:۳۴) **پانچواں فائدہ:** حضور ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کا نسب شریف دختر سے چلا۔ اور حضرات حسنین (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) حضور ﷺ کے بیٹے قرار پائے۔ حضور ﷺ کے سوا اور کسی کو یہ فخر حاصل نہیں۔ **مسئلہ:** اگر سیّد غیر سیّدانی سے نکاح کرے تو اس کی اولاد سیّد ہے۔ کہ انہیں زکوٰۃ لینا حرام اور اگر غیر سیّد سیّدانی سے نکاح کرے تو اولاد سیّد نہ ہوگی۔ انہیں زکوٰۃ حلال غرضیکہ سیّد کی اولاد بہرحال سیّد ہے خواہ لونڈی سے ہو یا غیر سیّدانی بیوی سے۔ (احکام القرآن) **مسئلہ:** اگر کسی نے کسی کی اولاد کے لئے وصیت کی اور اس کے پوتے بھی ہوں اور

نواسے بھی تو وصیت میں صرف پوتے داخل ہوں گے نہ کہ نواسے (احکام القرآن) **چھٹا فائدہ:** کفار سے ضروریات کے وقت مباہلہ کرنا حضور علیہ السلام کی سنت ہے۔ مگر مباہلہ صرف کفار سے کیا جائے اور یقینی عقائد کے بارے میں ہو ظنی مسائل پر نہیں ہو سکتا (ماخوذ از روح المعانی) دنیاوی جھگڑوں اور ظنی مسائل پر مباہلہ نہیں کر سکتے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جبکہ ابھی جسم آدم میں سننے، سمجھنے کی طاقت نہ تھی تو کُن کن سے کہا گیا؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں کُنْ فرمانے سے مراد آدم علیہ السلام کی ہستی چاہنا ہے۔ اور آپ کی پیدائش کا ارادہ کرنا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہاں کن فرمانا ہی مراد ہے۔ اور رب تعالیٰ اپنی ساری مخلوق پر احکام نافذ فرماتا ہے۔ اور سب اس کے فرمان پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ طوفان نوح کے موقعہ پر آسمان سے فرمایا تھا یَا سَمَآءُ اَقْلِعِیْ (ھود: ۴۴) اور زمین سے فرمایا تھا یَا اَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَ کِ (ھود: ۴۴) اور پہاڑوں سے فرمایا تھا یَا جِبَالُ اَوِّبِیْ (سبا: ۱۰) غرضیکہ یہاں بھی رب نے آدم علیہ السلام کی مٹی سے یہ فرمایا۔ رب تعالیٰ کی عطا سے اس کے بعض بندے بھی عالم کی چیزوں کو حکم دیتے ہیں۔ اور وہ چیزیں ان کی اطاعت کرتی ہیں۔ رب تعالیٰ حضرت سلمان علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖ (انبیاء: ۸۱) یعنی آپ کے حکم سے ہوا چلتی تھی۔ ایک بار حضور غوث پاک نے دجلہ کی طغیانی کے موقعہ پر فرمایا کہ اے دجلہ میرے اس قائم کردہ مقام سے آگے نہ بڑھنا چنانچہ وہ آگے نہ بڑھا نبی علیہ السلام نے مرگی کی بیماری سے خطاب فرمایا۔ کہ اے اللہ کے دشمن نکل جا میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس فرمان سے بیمار کو قے ہوئی۔ اور ایک کالا کیڑا اس کے منہ سے نکلا بیمار کو شفاء ہوگئی غرض کہ ساری چیزوں میں حواس ہیں جن سے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے مقبولوں کی بات سنتی ہیں۔ اور اطاعت کرتی ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** حضور علیہ السلام نے اس مباہلہ میں اپنی اولاد و علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو داخل کیوں فرمایا؟ **جواب:** تاکہ اس سے آپ کا پورا یقین ظاہر ہو جائے اور جزم ثابت ہو کیونکہ انسان اور اپنی اولاد کے لئے اس وقت بددعا کرتا ہے جب اسے کسی شی کا پورا یقین ہو۔ کہا جاتا ہے کہ اگر میری بات صحیح نہ ہو تو میرے بال بچے ہلاک ہو جائیں۔ **تیسرا اعتراض:** مباہلہ کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ اگر عیسائی مباہلہ کر لیتے تو ہلاک ہو جاتے حالانکہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ (احزاب: ۳۳) کہ آپ کی موجودگی میں اللہ انہیں عذاب نہ بھیجے گا ان میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** اس آیت میں عام ظاہری عذاب مراد ہے جیسا پچھلی امتوں پر آیا جس سے سارے کفار تباہ ہو گئے ورنہ خاص عذاب اب بھی آ سکتا ہے۔ اور قرب قیامت آئے گا بھی؟ (تفسیر کبیر) **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضرت علی مرتضیٰ تمام صحابہ سے افضل ہیں اور وہ ہی حضور علیہ السلام کے بعد خلافت کے مستحق۔ کہ حضور علیہ السلام نے انہیں اپنا نفس فرمایا۔ کیونکہ انفسنا سے حضور علیہ السلام کی ذات مراد تو ہو سکتی نہیں۔ کہ کوئی بھی اپنے آپ کو نہیں بلاتا تو لامحالہ سیدنا علی ہی مراد ہوں گے۔ اور یقینی بات ہے کہ اس نفس کے حقیقی معنی مراد نہیں۔ بلکہ اس سے مثل اور مساوی مراد ہے اور جو نبی کا مساوی ہو وہ ہی خلافت کا مستحق ہے جیسے حضور علیہ السلام کی موجودگی میں کوئی خلافت کا حق دار نہیں۔ ایسے ہی مثل حضور علیہ السلام کی موجودگی میں کوئی خلافت کا مستحق نہیں؟ (شیعہ) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں نفس سے مراد سیدنا علی نہیں بلکہ خود حضور

ﷺ کی ذات کریم ہے اور ذات کو بلانے کا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو وہاں پہنچا دینا کہا جاتا ہے دَعَوْتُ نَفْسِیْ اِلٰی کَذَا یا اَمَرْتُ نَفْسِیْ اور اَشَاوَرْتُ نَفْسِیْ وغیرہ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِیْهِ (مائدہ:۳۰) بلکہ حضرت علی بیٹوں میں داخل ہیں کیونکہ عرف میں داماد کو بیٹا کہا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر حضرت مولیٰ علی النفس میں داخل بھی ہوں تو اس سے آپ کا حضور ﷺ کی مثل ہونا لازم نہیں قرابت دار اور دینی بھائیوں کو انفس کہہ دیتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ (بقرہ:۸۴) نیز فرماتا ہے وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ (حجرات:۱۱) یا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا (اعراف:۲۳) وغیرہ کہ ان میں فاعل و مفعول ایک ہی ہے چونکہ سیّدنا علی نسب میں بھی حضور ﷺ سے قریب تھے اور دین میں بھی اس لئے انہیں انفس میں داخل فرمادیا گیا۔ اگر علی مرتضیٰ حضور ﷺ کی مثل ہوں تو لازم آتا ہے کہ آپ میں نبوت اور خاتمیت بھی پائی جائے اور آپ کا نکاح حضرت سیّدۃ فاطمہ زہرہ سے جائز نہ ہو۔ لہٰذا آپ کا ہر طرح حضور کی مثل ہونا ناممکن ہے۔ اور بعض صفات میں مثل ہونے سے خلافت کا استحقاق ثابت نہیں ہوتا۔ تیسرا یہ کہ اگر نفس میں داخل ہونے کی وجہ سے حضرت علی امامت کے مستحق ہیں۔ تو چاہئے کہ آپ حضور ﷺ کی موجودگی میں امام ہوں اور اگر بعض وقت میں آپ سے امامت جدا ہوسکتی ہے تو ہمارا مقصد حاصل ہے۔ کہ بے شک وہ خلفائے ثلثہ کے بعد امام برحق ہوئے چوتھا یہ کہ اگر حضور ﷺ کا نفس مولیٰ علی تھے تو بتاؤ ادھر کفار کا نفس کون تھا کیونکہ آیت میں فرمایا گیا اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ لہٰذا چاہئے کہ انفس کے معنی ایسے کئے جائیں جو دو طرفہ بن سکیں۔ **نوٹ:** عام شیعہ اس دلیل پر بہت پھولتے ہیں مگر اس جواب سے ان کی دلیل پاش پاش ہوگئی۔ اسی لئے محققین شیعہ یہ آیت پیش نہیں کرتے دیکھو کتاب اظہار الحق مصنفہ عبداللہ مشہدی (روح المعانی)

پانچواں اعتراض: اگر حضور ﷺ کو خلفائے راشدین سے محبت تھی تو آپ انہیں مباہلہ میں کیوں نہ لے گئے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو صرف سیّدنا علی سے محبت تھی؟ **جواب:** اس وقت عیسائیوں سے مقابلہ تھا اور ایسے موقعوں پر انسان اپنے عزیز اہل قرابت کو پیش کرتا ہے اگر بجائے ان حضرات کے خلفائے راشدین کو لے جاتے تو عیسائی کہہ سکتے تھے کہ شاید حضور ﷺ کو عذاب الٰہی کا خوف ہے اس لئے اپنے بچوں کو بچالیا۔ **چھٹا اعتراض:** حق یہ ہے کہ ماسوائے جناب علی رضی اللہ عنہ سارے صحابہ منافق تھے اور حضور ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد خلافت پر غاصب بھی بن گئے۔ اس لئے حضور ﷺ نے مباہلہ کے موقعہ پر انہیں شریک نہ کیا۔ کہ مباہلہ میں مومنین شریک کئے جاتے ہیں نہ کہ منافقین و کفار (شیعہ) **جواب:** تعجب ہے کہ حضور ﷺ نے ان حضرات کو مباہلہ میں تو شریک نہ کیا اور بیعت الرضوان جیسی اہم نعمت میں شریک کرلیا جس کے بارے میں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے بیعت کررہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ بلکہ بیعت الرضوان کا واقعہ حضرت عثمان کی شہادت کی خبر اڑنے پر ہوا گویا بیعت الرضوان کی بناء حضرت عثمان ہیں۔ یہ بیعت مباہلہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اگر یہ حضرات منافق تھے تو حضرت فاطمہ کا نکاح ان کی گواہی سے کیسے جائز ہوا۔ اس مقام پر گواہ تو یہی لوگ تھے نیز حضرت علی نے ہجرت کی رات حضور ﷺ کو حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ کیوں جانے دیا نہ خود ساتھ گئے۔ کیوں نہ عرض کیا کہ ان کے ساتھ جانے میں خطرہ ہے نیز اگر یہ حضرات غاصب تھے تو جناب علی نے ان کے خلافت کے زمانہ میں ان سے نذرانہ و ہدیہ قبول کیوں کئے۔ مال غصب تو حرام ہوتا ہے حضرت شہربانو کا نکاح

جناب حسین سے کیسے درست ہوا وہ بھی تو اس غصب کا نتیجہ تھیں۔ ذرا ہوش کرو بغض صحابہ میں اہل بیت پر کیوں تبرے کرتے ہو۔ **ساتواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور انور صلی اللہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرہ ہی تھیں چار بیٹیوں والی روایات غلط ہیں۔ ورنہ آپ چاروں بیٹیوں کو مباہلہ میں لے جاتے صرف فاطمہ زہرہ کو کیوں لے گئے؟ **جواب:** حضور ﷺ کی بیٹیاں چار ہیں۔ زینبؓ رقیہؓ کلثومؓ فاطمہ زہرہؓ رب تعالیٰ فرماتا ہے یَآاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنَاتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ (احزاب:۵۹) بنات جمع فرمانے سے معلوم ہوا کہ حضور کی لڑکیاں چند ہیں کیونکہ مسلمان عورتوں کا ذکر تو آگے آ رہا ہے۔ یہاں صرف فاطمہ زہرہ کو لیجانے کی تین وجہ ہوسکتی ہیں یا تو مباہلہ کے وقت دوسری لڑکیاں وفات پا چکی تھیں یا ابھی مکہ معظمہ سے آئی نہ تھیں یا اس لئے کہ فاطمہ زہرا زیادہ پیاری تھیں کہ سب سے چھوٹی تھیں نیز ان ہی کے بچپن میں حضرت خدیجہ نے وفات پائی تھی۔ **آٹھواں اعتراض:** بعض دفعہ کفار نے حضور ﷺ کے مقابل مباہلہ کیا مگر ان پر عذاب نہ آیا رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَالُوا اللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ (انفال:۳۲) اے اللہ اگر قرآن سچا ہو تو ہم پر پتھر برسادے پتھر نہ برسے ممکن تھا کہ یہاں بھی مباہلہ ہوتا اور عذاب نہ آتا؟ **جواب:** وہ مباہلہ نہ تھا مباہلے کے معنی وہ ہیں جو تفسیر میں عرض کئے گئے سرداران قریش قوم پر اپنی پختگی ظاہر کرنے کے لئے صرف منہ سے یہ دعائیں کرلیتے تھے دل ان کے کانپتے تھے اور حضور ﷺ کے مقابل نہ تھے اس کے باوجود جب بھی ان پر مصیبت آتی تو حضور ﷺ سے دعا کراتے۔ اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں غرضیکہ اس دعا کو مباہلے سے کوئی تعلق نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کو مٹی سے بنانے میں چند حکمتیں ہیں۔ (۱) مٹی میں تواضع اور انکسار ہے۔ چاہئے کہ انسان بھی متواضع اور منکسر ہو۔ (۲) مٹی میں عیب پوشی ہے۔ کہ وہ ہر چیز کے لئے آڑ بن جاتی ہے چاہئے کہ انسان بھی عیب پوش ہو۔ (۳) انسان کو زمین کی خلافت کے لئے پیدا کیا گیا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ ۳۰) لہٰذا اسے مٹی سے بنایا۔ تاکہ اس کو زمین سے قوی تعلق رہے۔ (۴) اس میں رب کی قدرت کا اظہار کیا ہے کہ شیاطین کو آگ سے بنایا جس میں روشنی اور نور ہے۔ مگر انہیں گمراہی کی اندھیریوں میں مبتلا کردیا۔ فرشتوں کو ہوا سے بنایا۔ جو تمام جسموں سے زیادہ لطیف ہے۔ مگر انہیں پوری قوت عطا فرمائی۔ ورنہ لطافت میں قوت کیسی۔ آدم علیہ السلام کو کثیف اور تاریک مٹی سے بنایا۔ مگر انہیں محبت' معرفت اور ہدایت کا نور بخشا۔ آسمانوں کو رقیق پانی کی موج سے بنایا اور پھر انہیں معلق لٹکا دیا۔ تاکہ پتہ لگے کہ عطائے الٰہی اسباب پر موقوف نہیں۔ نور میں ظلمت اور ظلمت میں نور کو جلوہ گر کردیتا ہے۔ (۵) مٹی آگ کو بجھا دیتی ہے۔ چونکہ انسان میں حرص' غصہ اور شہوت کی آگ تھی لہٰذا اسے مٹی سے بنایا۔ تاکہ اس آگ کو بجھایا جائے۔ نیز مٹی پانی سے مل کر مختلف صورتیں قبول کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا رب تعالیٰ نے کثیف مٹی کو لطیف پانی سے ملا کر گارا بنایا تاکہ قابل صورت ہو پھر کن فرما کر روح پھونکی۔ جو عالم امر کی چیز ہے۔ تاکہ انسان عالم خلق اور عالم امر کا مجموعہ ہو اور صورتاً بشر ہو اور سیرتاً فرشتہ۔ اس لئے فرمایا خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ یہ اس کی صورت کا بیان ہے۔ اور ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ اس کی سیرت کا تذکرہ انبیائے کرام چونکہ بشریت کے اعلیٰ طبقہ میں

ہوتے ہیں لہٰذا ان کی طاقت وقوت ملکیت سے بالا ہوتی ہے ان کو عالم اجسام کے ساتھ وہ ہی تعلق ہے جو آسمان کو زمین کے ساتھ ہے۔ یا روح کو بدن کے ساتھ جیسے روح جسم پر سلطنت کرتی ہے۔ اور زمین کو سارے فیض آسمان سے ملتے ہیں۔ ایسے ہی یہ حضرات دنیا پر حکومت کرتے ہیں اور فیوض ربانی سب کو انہی کے ذریعے ملتے ہیں۔ ان کے نفوس کو روح القدس سے خاص اتصال ہوتا ہے اور تائید الٰہی سے خصوصی قرب۔ یہ راز نجران کے عیسائی سمجھ گئے۔ اور حضور ﷺ کے مقابل مباہلے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی دعا اور باقی حضرات کی آمین قبول سے قریب ہے ان سے مباہلہ میں ہماری خیر نہیں۔ اس کا یہاں بیان ہے۔ چونکہ اولیاء اللہ مظہر انبیاء ہیں۔ اس لئے ان کی دعا بددعا سے عالم میں انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ (از کبیر ومعانی وبیان وابن عربی) صوفیاء فرماتے ہیں کہ عالم بہت سی قسم کے ہیں۔ سفلی، علوی، عالم اجسام، عالم انوار، عالم امر وغیرہ جو چیزیں کن سے بنیں انہیں عالم خلق کہتے ہیں۔ اور جو بلا واسطہ محض رب تعالیٰ کے حکم سے بنیں۔ وہ عالم امر کہلاتی ہیں۔ حضرات انبیاء کرام خلق وامر کا مجموعہ ہوئے ہیں ان کی جسمانیت کا عالم خلق سے ہے۔ اور نورانیت عالم امر سے اسی لئے رب تعالیٰ نے خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ کے بعد كُنْ فَيَكُوْنُ کا ذکر کیا اور خلق کے ساتھ مٹی کا ذکر فرمایا مگر کن کے ساتھ کسی واسطے کا ذکر نہ کیا۔ خلق میں آدم علیہ السلام کی جسم کی پیدائش کا ذکر ہے کن فیکون میں ان کی نورانیت شامل فرمانے کا تذکرہ سوا پیدائش آدم کے رب تعالیٰ نے خلق اور کن کا اجتماع کہیں نہ فرمایا خیال رہے کہ روح کی حقیقت ہمارے فہم سے وراء ہے کیونکہ ہم عالم اجسام سے ہیں اور روح عالم امر سے اس دیس کی چیز اس دیس والوں کو کیسے پہچانے۔ جب عربی کو عجمی نہیں پہچانتا۔ حالانکہ دونوں زمینی پیدائش ہیں تو ہم سفلی لوگ علوی روح کو کیا جانیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (اسراء:۸۵) اسی طرح ہم لوگ حقیقت انبیاء کو نہیں پہچان سکتے۔ کہ وہ عالم امر کی صفت ہیں۔ سورج سے ہر چیز کو دیکھو سورج کو نہ دیکھو ورنہ آنکھیں پھوٹ جائیں گی یونہی نبی کے ذریعہ تمام ایمانیات کو پہچانو مگر نبی کی حقیقت میں غور وبحث نہ کرو ورنہ ایمانی آنکھیں پھوٹ جائیں گی ہم جس قدر حالات انبیاء بیان کرتے ہیں وہ سب ان کی بشریت کے حالات ہیں ان کی حقیقت کا شمہ ہم تو کیا فرشتے بھی نہیں جان سکتے ان حضرات پر کبھی بشریت کا ظہور ہوتا ہے تو کھاتے پیتے ہیں اور سب سے ملاقاتیں کرتے ہیں اور کبھی ملکیت کا ظہور ہوتا ہے تو کھانے پینے سے بے نیاز ہوتے ہیں اور فرشتوں تک کی ان کی بارگاہ میں پہنچ نہیں ہوتی معراج میں سدرۃ المنتہا سے آگے کوئی فرشتہ حضور کے ساتھ نہ رہ سکا۔ عیسیٰ علیہ السلام ہزاروں سال سے بغیر کھائے پئے آسمان میں جلوہ گر ہیں۔ اس لئے رب نے آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد كُنْ فَيَكُوْنُ کا ذکر کیا اگر وہ ہر طرح ہم جیسے ہوں تو وہ ہمارے لئے وسیلہ کیسے بن سکیں۔

حکایت: ایک ملحد شاعر نے کسی مشاعرے میں حضرات خواجہ شیخ کمال الدین خجندی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا

از کجائی از کجائی اے لوند

آپ نے فوراً جواب دیا

از خجندم از خجندم از خجند

وہ ملحد شاعر اس سلطان الاولیاء کے بگڑے ہوئے تیور نہ پہچان سکا اور بولا

اے ملحد خجندی ریش بزرگ داری کز غایت بزرگی دہ ریش می تواں گفت

اس شعر کا شیخ کے قلب پر بہت اثر پڑا۔ کچھ لبوں کو جنبش دی لب ہلنا تھے کہ شاعر وہیں گر کر مرگیا اسی لئے فرماتے ہیں کہ عاقل وہ جو بزرگوں کو اذیت نہ دے کیونکہ اس کا الٹا اثر اس پر پڑتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: ۴۳) کسی شاعر نے کیا خوب کہا

نائے کند نالہ بدیں قول راست از نفس پیر بترس اے جواں

(روح البیان)

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ عذاب الٰہی بندگان خدا کی ہی بے ادبی سے آتا ہے۔ فرعون نے صدیوں دعوئے خدائی کیا مگر جب تک موسیٰ علیہ السلام کی بد دعا نہ لی ہلاک نہ ہوا۔ دیکھو نجران کے عیسائیوں نے رب تعالیٰ کو عیب لگایا مگر عذاب نہ آیا اگر حضور ﷺ کی بد دعا لے لیتے تو عذاب میں گرفتار ہو جاتے۔ رب غنی ہے مولینا فرماتے ہیں۔

چوں خدا خواہد کہ راز کس درد میلش اندر طعنہ پاکاں دہد

صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

حلیم کے غضب سے اللہ کی پناہ

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ
تحقیق یہ البتہ وہ بیان سچا ہے اور نہیں ہے کوئی معبود سوا اللہ کے اور تحقیق اللہ البتہ وہ
یہ ہی بیشک سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک اللہ ہی
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾
غالب حکمت والا ہے پس اگر منہ پھیریں وہ پس تحقیق اللہ جاننے والا ہے فساد پھیلانے والوں کو
غالب ہے حکمت والا پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ فسادیوں کو جانتا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مناظرے کی انتہائی منزل بیان کی گئی یعنی مباہلہ جس سے ضدی انسان بھی ضد چھوڑ دے۔ اب مباہلہ نہ کرنے کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ یعنی ترک تعلق اور ضدیوں سے علیحدگی اور انہیں خدا کے سپرد کر دینا۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں الوہیت مسیح کے مسئلہ کے متعلق چند شبہات کا جواب دیا گیا تھا اس آیت میں بھی بقیہ شبہات کا جواب دیا جا رہا ہے کہ خدا وہ جو عزیز و حکیم یعنی کامل غلبہ اور علم والا ہو۔ اور چونکہ یہ وصف عیسیٰ علیہ السلام میں نہیں لہٰذا وہ خدا کیسے؟ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں نجرانی عیسائیوں سے مناظرہ و مباہلہ کا ذکر تھا اب اس مناظرہ و مباہلہ کا بہترین نتیجہ بیان ہو رہا ہے۔ کہ اے محبوب ﷺ یہ مباہلہ کریں یا نہ کریں۔ آپ کا

مقصد تو حاصل ہو گیا یعنی حق کا ظہور اور باطل کا بطلان خود یہ عیسائی اور اس انکار مباہلہ کو دیکھنے سننے والے آپ کی حقانیت اور کفار نجران کی ہٹ دھرمی جان گئے۔ مناظرہ کا مقصد یہ ہی ہوتا ہے نہ کہ سامنے والے کو جبراً منالینا۔

تفسیر

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ هٰذَا سے یا تو قرآن کریم کی طرف اشارہ ہے یا عیسیٰ علیہ السلام کے ان واقعات کی طرف جو پہلے مذکور ہوئے تھے۔ یا ان کی بندگی کی جانب لھو میں لام تاکید کا ہے۔ اور ھُوَ ضمیر فصل جو صفت اور خبر میں فرق کرتی ہے۔ قصص قصہ کی جمع بھی آتی ہے اسی لئے ایک سورۃ کا نام سورۂ قصص ہے۔ اور قص یقص کا مصدر بھی بمعنی کسی کے نقش قدم پر چلنا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ (قصص: ۱۱) موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے ان کی بہن سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے جاؤ کہا جاتا ہے اِقْتَصَّ اَثَرَهٗ فلاں اس کے نقش قدم پر گیا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (کہف: ۶۴) بدلہ کو قصاص اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ جرم کے پیچھے اور اس کی مثل ہوتا ہے۔ حکایت کو بھی قصہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ واقعہ کے بعد اور اس کے تابع ہوتی ہے کبھی ہر بیان کو قصص کہہ دیتے ہیں یہاں یہ ہی مراد ہے اَلْحَقُّ قصص کی صفت ہے۔ بعض نے فرمایا کہ مصدر بمعنی حاصل مصدر ہے (روح المعانی) بعض کے خیال میں یہ بمعنی اسم مفعول ہے (روح المعانی) یعنی تحقیق یہ قرآن کریم ہی سچا بیان ہے۔ نہ کہ موجودہ توریت وانجیل وغیرہ اور نہ ان لوگوں کے یہ خیالات کیونکہ اگرچہ توریت وانجیل بلکہ تمام آسمانی کتب حق وصحیح ہیں مگر ان میں یہود وعیسائیوں نے بہت ردوبدل کر دیا۔ اس لئے وہ حق رہیں نہیں یا یہ قرآن مجید ہی حق ثابت و ناقابل تغیر بیان ہے۔ جس میں نہ ترمیم وتبدیل ہو سکے نہ نسخ وغیرہ اس معنی سے وہ کتب آسمانی حق یعنی غیر منسوخ نہیں عیسیٰ علیہ السلام کے یہ واقعات یا ان کا عبداللہ ہونا سچا بیان ہے ہو سکتا ہے کہ ھو سے حصر کا فائدہ ہو اور اس سے حصر اضافی مقصود ہو یعنی عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ہی قصہ (ان کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا اور یہود کا اپنی تدبیر میں ناکام رہنا) سچا ہے نہ وہ جو عیسائی یا ان کے پیروکار مرزائی کہتے ہیں۔ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ یہ عقیدہ نصاریٰ یعنی تثلیث کا رد ہے۔ اور مَا کے بعد اِلَّا فرمانے سے حصر کا فائدہ حاصل ہوا یعنی خدا کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ حضرت مریم نہ کوئی اور کیونکہ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یہ جملہ بظاہر معطوف ہے۔ جس پر کوئی کسی طرح غالب نہ آ سکے اور جو کسی کا حاجت مند نہ ہو اَلْحَكِيْمُ حکمت سے بنا بمعنی احاطہ معلومات (روح المعانی) یعنی سب پر ہر طرح غالب اور سارے غیوب کو ہر طرح جاننے والا صرف رب تعالیٰ ہے عیسیٰ علیہ السلام کا یہودیوں پر غالب آ جانا رب تعالیٰ کے فضل سے ہوا ایسے ہی اس جناب کا علم غیب رب تعالیٰ کے علم کے مقابل ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابل قطرہ بلکہ اس سے بھی کم فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ تَوَلَّوْا کے معنی بارہا بیان ہو چکے۔ اس کا فاعل یا تو نجران کے عیسائی ہیں یا عام عیسائی یا سارے کفار۔ اور جملہ فان اللہ اس شرط کی جزا نہیں بلکہ علت جزا ہے۔ یعنی اگر یہ عیسائی اب بھی آپ کی بات سے منہ پھیریں اور آپ پر ایمان نہ لائیں تو آپ انہیں خدا کے حوالے کیجئے یہ فسادی ہیں رب فسادیوں کو خوب جانتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ یہ قرآن کریم یا عیسیٰ علیہ السلام کا عبداللہ ہونا یا سارے یہ واقعات بالکل صحیح اور سچا بیان ہے۔ جس کا ثبوت اس

سے ملا کہ نجران کے عیسائی اس کے خلاف مباہلہ کرنے پر تیار نہ ہوئے اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں کیونکہ کامل غلبہ اور محیط علم اسی کی صفت ہے اور جس میں یہ صفتیں ہوں وہ ہی لائق عبادت ہے عیسیٰ علیہ السلام بلکہ سارے انبیاء کے علم وقدرت رب تعالیٰ کے مقابل کالعدم ہیں۔لہٰذا وہ خدا کیسے۔اس بیان سے عیسیٰ علیہ السلام کی عبدیت آفتاب کی طرح ظاہر ہوگئی۔اگر اب بھی عیسائی قبول حق سے منہ پھیریں۔اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کہے جائیں۔تو آپ انہیں رب تعالیٰ کے حوالے کرو۔یہ فسادی ہیں۔رب تعالیٰ فسادیوں کو خوب جانتا ہے۔وہ انہیں سخت سزا دے گا آپ کیوں غم کرتے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔**پہلا فائدہ:** ضد کا کوئی علاج نہیں اس کا علاج صرف جوتا ہے۔**دوسرا فائدہ:** دلائل میں نظر نہ کرنا ضد ہے اور ضد فساد اور ضدی اول درجے کا فسادی ہے۔دیکھو رب تعالیٰ نے فَاِنْ تَوَلَّوْا کہہ کر انہیں مفسد قرار دیا۔**تیسرا فائدہ:** دلائل اور رد شبہات اظہار حق کا ذریعہ ہے۔دیکھو رب تعالیٰ نے دلائل وغیرہ بیان فرما کر ارشاد فرمایا اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ **چوتھا فائدہ:** کوئی مخلوق کسی صفت میں رب تعالیٰ کی مثال نہیں۔کیونکہ صفات سے ذات کا پتہ لگتا ہے اسی لئے عزیز وحکیم سے رب تعالیٰ کی توحید ثابت کی گئی۔**پانچواں فائدہ:** ہمیشہ بددعا سے بچنا چاہئے خصوصاً تین شخصوں کی بددعا بڑی خطرناک ہے (۱) اپنے محسن کی جیسے ماں باپ استاد شیخ وغیرہ (۲) مظلوم کی (۳) نبی کی۔دیکھو نجران کے عیسائی جب حضور علیہ السلام کی بددعا سے محفوظ رہے تو ان پر عتاب آیا مگر دنیوی عذاب نہ آیا۔**چھٹا فائدہ:** مقبول بندوں کا سیف زبان ہونا اور جو ان کے منہ سے نکلے۔رب وہ کردے یہ ایسا مسئلہ ہے جس کے کفار بھی قائل تھے۔دیکھو نجرانی عیسائیوں نے ان پنجتن پاک کے چہروں کو دیکھ کر ہی کہہ دیا کہ ان کی بددعا سے بچو یوسف علیہ السلام نے قیدی باورچی وساقی سے فرمایا قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ (یوسف:۴۱) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے سامری فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَکَ فِی الْحَیٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ (طٰہٰ:۹۷) چنانچہ سامری دیوانہ کتے کی طرح خطرناک ہو گیا کہ جو اسے چھو جائے تو وہ بھی اور سامری بھی بیمار پڑ جائے۔اب جو کلمہ گو مسلمان بزرگوں کی صیف زبانی میں شک کرے۔وہ ان عیسائی کفار سے بدتر ہے۔**ساتواں فائدہ:** حضرت فاطمہ زہرا حسنین کریمین وعلی مرتضیٰ کا توسل قبول دعا کے لئے اکسیر اعظم ہے۔انشاء اللہ ان کے وسیلہ سے مانگی ہوئی دعا رد نہیں ہوتی۔دیکھو حضور ﷺ نے اپنی مباہلہ والی دعا پر آمین کہنے کے لئے ان حضرات کو ہی منتخب فرمایا۔حضور ﷺ کے اس انتخاب میں ہم امتیوں کو ان توسل کی تعلیم ہے۔حضرت عمر نے جناب عباس کے توسل سے دعا بارش فرمائی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: حضور ﷺ رحمت عالم ہیں اور آپ نے کبھی کسی کے لئے بددعا نہ فرمائی حتیٰ کہ طائف والوں کے لئے بھی جنہوں نے آپ پر بہت ظلم کئے۔پھر یہاں نجرانیوں کے مقابل بددعاء کی کیوں تیاری فرمائی۔**جواب:** حضور ﷺ نے اپنے ذاتی معاملات میں کسی پر بددعا نہ کی۔ظلم سہے کچھ نہ فرمایا مگر دینی معاملات میں کسی کی رعایت بھی نہ کی۔وہ چونکہ دین کے دشمن تھے اس [illegible] تیاری فرمائی [illegible] بھی فرمایا اور موذی کو ہلاک کرنا عین

رحمت ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اگر اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ میں هُوَ سے حصر کا فائدہ ہو تو مطلب یہ ہوا کہ سارے قرآن میں صرف عیسیٰ علیہ السلام کا بیان ہی حق ہے۔ تو کیا قرآن پاک کی دوسری باتیں حق نہیں؟ **جواب:** یہ حصر اضافی ہے۔ اور عیسائیوں کے بکواس کے مقابلہ میں ہے۔ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ ہی سچی بات ہے۔ جو قرآن نے بتائی نہ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی باتیں۔ **تیسرا اعتراض:** فَاِنْ تَوَلَّوْا شرط ہے اور فان اللہ الخ اس کی جزا۔ مطلب یہ ہوا کہ اگر عیسائی آپ سے منہ پھیریں تب تو خدا مفسدوں کو جانتا ہے ورنہ نہیں تو کیا خدا کا علم ان کے منہ پھیرنے پر موقوف ہے۔ (آریہ) **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گذر چکا کہ فَاِنَّ اللّٰهَ الخ اس شرط کی جزا نہیں بلکہ جزا کی علت ہے یعنی اگر وہ منہ پھیریں تو آپ غم نہ کریں۔ بلکہ انہیں رب تعالیٰ کے حوالے کیجئے۔ کیونکہ رب تعالیٰ مفسدوں کو خوب جانتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ تو نے حکومت کی بغاوت کی۔ تو سمجھ لو کہ حکومت بہت قوی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

بارگاہِ انبیاء رحمت الٰہی کا سمندر ہے۔ جیسے سمندر میں جانے والوں میں سے کوئی تو موتی لاتا ہے کوئی عنبر کوئی محروم لوٹتا ہے۔ اور کوئی اپنی جان بھی گنوا دیتا ہے۔ ایسے ہی بارگاہِ انبیاء میں عقیدت لے جانے والا بے شمار فائدے حاصل کرتا ہے۔ جیسی عقیدت ویسا فیض لیکن بے عقیدہ محروم رہتا ہے۔ اور بری نیت سے جانے والا تباہ ہو جاتا ہے۔ حضرت صدیق و فاروق بھی اسی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اور نجران کے عیسائی بھی۔ لیکن انہوں نے بے شمار فیض لئے اور یہ لوگ مفسد کا خطاب لے کر پھرے۔ مجلس ایک ہی ہے مگر حاضرین کے نصیب مختلف۔ جب تک رب تعالیٰ کا فضل نہ ہو دلائل بھی کام نہیں دیتے بلکہ دماغ اوندھا چلتا ہے۔ نجران کے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ پیدا ہونا دیکھ کر انہیں معبود مان لیا۔ اور انہیں شیطان نے یوں سبق پڑھایا کہ جو بغیر باپ پیدا ہو وہ ایک لحاظ سے مجرد ہے۔ اور ہم لوگ مادی۔ اور تجرد خدا ہونے کی دلیل ہے۔ انہیں یہ نہ سوجھا کہ ہماری روح ملائکہ عالم جبروت وملکوت کی ساری چیزیں بالکل مجرد ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی خدا نہیں۔ تو عیسیٰ علیہ السلام کیونکر خدا ہو سکتے ہیں۔ مگر ہدایت فضل رب سے ملتی ہے۔ نہ کہ عقلی دلیل سے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا

فرماؤ اے کتاب والو آؤ طرف ایسی بات کے جو برابر ہے درمیان ہمارے اور درمیان تمہارے یہ کہ نہ

تم فرماؤ اے کتابیو ایسے کلمے کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہو یہ کہ

نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا

عبادت کریں ہم سوا اللہ کے اور نہ شریک کریں ساتھ اس کے کسی چیز کو اور نہ بنائے بعض ہمارا بعض کو شرکا

نہ عبادت کریں مگر خدا کی اور اس کا شریک کسی کو نہ کریں اور ہم میں کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنائے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

سوا اللہ کے پس اگر منہ پھیریں وہ تو کہہ دو گواہ رہو اس کے کہ ہم مسلمان ہیں
اللہ کے سوا پھر اگر وہ نہ مانیں تو کہہ دو تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ
اے کتاب والو کیوں جھگڑتے ہو تم بیچ ابراہیم کے اور نہ اتاری گئی توریت
اے کتاب والو ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو توریت وانجیل
وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۵
اور انجیل مگر پیچھے ان کے کیا پس نہیں عقل رکھتے تم
تو نہ اتری مگر ان کے بعد تو کیا تمہیں عقل نہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مناظرانہ رنگ میں اہل کتاب سے خطاب تھا اب تبلیغی رنگ میں انہیں دعوت اسلام دی جا رہی ہے۔ کیونکہ بعض مناظرے سے ہدایت پر آتے ہیں اور بعض نرمی سے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں صراحتاً عیسائیت کی تردید تھی۔ اب نہایت لطیف پیرایہ میں عیسائیت کے بطلان اور اسلام کی حقیقت کا بیان ہے کہ عیسائیت کا کلمہ یکساں نہیں اور عیسائیوں کے نزدیک سب بندے ایک حال میں نہیں۔ کوئی معبود ہے کوئی عابد اسلام میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بندوں کے احکام بندگی یکساں ہیں گویا صریحی تردید کے بعد اب لطیف تردید ہو رہی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں اہل کتاب کے سارے شبہات کے نفیس جواب دیئے گئے۔ اب ان کے اس شبہ کا جواب دیا جا رہا ہے جسے وہ مجبور ہو کر اپنے بچاؤ کے لئے پیش کرتے تھے وہ یہ کہ عیسائیت بری ہو یا بھلی مگر چونکہ ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے۔ لہٰذا عیسائی ہونا سنت ابراہیمی ہے۔ غرضیکہ پچھلی آیتوں میں بھی ان کے شبہات کا جواب ہی تھا اور اس میں بھی۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں دین عیسوی' موسوی کی برتری بیان کی گئی تھی کہ عیسائیوں' یہودیوں نے موجودہ عیسائیت اور یہودیت میں ایسے برے عقیدے و اعمال داخل کر لئے ہیں اب دین اسلام کی برتری کا ذکر ہے۔ کہ اس دین میں عقائد و اعمال میں ایسی بے مثالی برابری ہے۔ کہ سبحان اللہ تاکہ اہل کتاب عیسائیت و یہودیت سے متنفر ہو کر اسلام قبول کریں۔ گویا تبلیغ اسلام کے ایک رکن کا ذکر پہلے تھا۔ اور دوسرے رکن کا ذکر اب ہے۔ **پانچواں تعلق:** اس سے پہلی آیت میں اسلام کی حقانیت کا ثبوت اس کے اعمال و عقائد دکھا کر کیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت میں اسلام ہی کی حقانیت اس طرح بیان ہو رہی ہے کہ یہ دین مطابقت ملت ابراہیمی کے ہے۔ یہ مطابقت ملت ابراہیمی اسلام کی حقانیت کی پوری پوری دلیل ہے۔

شانِ نزول

نجران کے عیسائی جن کا واقع پہلے معلوم ہو چکا ان کا یہود مدینہ سے مناظرہ ہوا۔ ان عیسائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام

عیسائی تھے اور مدینہ کے یہودی کہتے تھے کہ نہیں آپ یہودی تھے۔ جب یہ جھگڑا بہت بڑھا تو ان دونوں فریقوں نے حضور ﷺ کو اپنا حکم مانا۔ اور آپ سے فیصلہ چاہا حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں جھوٹے ہو ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ تو حنیف مسلم تھے۔ اور ہم ان کے دین پر ہیں اگر تم ان کی پیروی پسند کرتے ہو تو اسلام قبول کر لو جس پر یہودی بولے کہ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کو رب مان لیں جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو رب مانا۔ اور عیسائی بولے کہ آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے متعلق وہ عقیدہ رکھیں جو یہود نے عزیر علیہ السلام کے بارے میں رکھا تب یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔ (تفسیر خازن)

تفسیر

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ قُلْ میں خطاب یا تو ہر قرآن پڑھنے والے مسلمان سے ہے جیسا کہ آئندہ **قُوْلُوْا** جمع فرمانے سے معلوم ہو رہا ہے۔ تب تو اشارۃً فرمایا گیا کہ ہر مسلمان کو مبلغ ہونا چاہیے۔ کفار کو اپنی طرف لاؤ خود تم ان کی طرف نہ چلے جاؤ۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان رنگ چڑھا دینا بھول گئے خود رنگ جانا سیکھ گئے۔ اور یا حضور انور ﷺ سے خطاب ہے۔ کہ پہلے **قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا** (آل عمران ۶۱) ہونے میں بھی **قُلْ** میں حضور ﷺ سے خطاب تھا۔ چونکہ حضور ﷺ داعی الی اللہ ہیں۔ اور یہ آیت دعوت الی اللہ کی ہے۔ اس لئے اسے قل سے شروع فرمایا۔ نیز گواہ توحید حضور ﷺ ہیں اور گواہ رسالت اللہ تعالیٰ چونکہ یہاں دعوت الی التوحید تھی اس لئے **قُلْ** فرمایا گیا دیکھو اپنی توحید پر رب تعالیٰ نے فرمایا **قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ** اور حضور ﷺ کی رسالت پر قل نہ فرمایا بلکہ فرمایا محمد رسول اللہ عیسائی یہودیوں کو نہ تو **الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** سے خطاب فرمایا کہ یہ خطاب امت محمدی سے خاص ہے۔ نیز کوئی شخص اب حضور ﷺ کو بغیر مانے مومن ہونہ اس خطاب کا مستحق اور نہ انہیں کافرون یا مشرکون کہہ کر پکارا کہ اگر چہ وہ کافر بھی ہیں۔ اور مشرک بھی مگر اپنے سچے نبیوں اور آسمانی کتب کی طرف نسبت تو کرتے ہیں اس لئے ان کے نام بھی کفار سے جداگانہ ہوئے اور احکام بھی کہ ان کا ذبح حلال اور ان کی عورتوں سے نکاح درست معلوم ہوا کہ اچھوں سے نسبت بھی اچھی ہے قرآن شریف کا جزدان بھی چوما جاتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں اہل کتاب سے فقط عیسائی مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک صرف یہودی مگر ظاہر یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا کہ **تَوَلَّوْا** اگر چہ مکانی نقل و حرکت کے لئے آتا ہے مگر یہاں حالت کی نقل کے لئے استعمال ہوا۔ یعنی عیسائیت سے اسلام میں آ جانا۔ چونکہ **تَعَالَوْا** میں لغوی معنی کے لحاظ سے بلندی ہے۔ یعنی چڑھنا اس لئے کہ یہاں یہ کلمہ خوب چسپاں ہے یعنی عیسائیت کی پستی سے اسلام کی بلندی میں چڑھ آؤ چونکہ حضور ﷺ اللہ کی مضبوط رسی ہیں کہ رب نے فرمایا **وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا** (آل عمران: ۱۰۳) اور کنوئیں میں گیا ہوا ڈول رسی ہی کے ذریعہ اوپر بھی آ جاتا ہے اور تازہ پانی بھی بھر کر لاتا ہے۔ رسی سے کھل جائے تو کنوئیں کی کیچڑ میں پھنس جاتا ہے دنیا گہرا کنواں ہے جس میں ایمان و نیک اعمال کا تازہ پانی بھی ہے اور کفر و شرک بدکاریوں کی کیچڑ بھی۔ اگر حضور ﷺ کا دامن پکڑ لیا تو اس کیچڑ سے بچے رہے ورنہ اس دلدل میں پھنس گئے۔ اس لئے ارشاد ہوا **تَعَالَوْا** اوپر آ جاؤ میری طرف آؤ تا کہ عیسائیت کی کیچڑ سے بچ جاؤ نیز ان علماء یہود و نصرانیوں کا خیال تھا کہ اسلام لا کر ہماری سرداری عزت جاتی رہے گی۔ ہم نو مسلم ہو کر ذلیل ہوں گے۔

اسی لئے فرمایا گیا تَعَالَوْا یعنی تم نیچے تو اب ہو اسلام کے قلعہ میں چڑھ آؤ عزت و بلندی پاؤ گے کَلِمَۃ اگرچہ لغتہ ایک لفظ کو کلمہ کہتے ہیں۔ مگر عرف میں قصیدے قصہ شرح اور پورے کلام کو کلمہ کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے اردو میں بات سَوَآء کلمتہ کی صفت ہے۔ یہ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے اس کے معنی وسط عدل اور برابر ہیں یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں کیونکہ یہود و نصاریٰ کے عقائد ظلم تھے۔ کہ ان کے ہاں بعض نبیوں کو تو خدا مان لیا گیا تھا۔ جیسے حضرت عزیر علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بعض نبیوں کی نبوت کا انکار کیا گیا تھا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام اور اسلامی عقیدے عدل نیز اہل کتاب کے عقائد میں افراط و تفریط تھی۔ کہ یہود کے ہاں چوتھائی زکوٰۃ فرض تھی۔ عیسائیوں کے ہاں زکوٰۃ تھی ہی نہیں۔ یا یہود کے ہاں حلال چربیاں بھی حرام تھیں عیسائیوں کے ہاں سور و شراب بھی حلال اسلام میں میانہ روی ہے۔ نیز اہل کتاب میں تفریق تھی۔ کہ ان کے ہاں قوم ملک، زبان کی بنا پر اونچ نیچ تھی اسلام میں یہ کچھ نہیں یہاں عزت و عظمت اعمال و تقویٰ سے ہے۔ اسلام میں برابری۔ لہٰذا جو چاہو اس کے معنی کر لو تفسیر کبیر نے فرمایا کہ سواء کے معنی ہیں انصاف جس کا مادہ نصف ہے بمعنی آدھا انصاف آدھا کرنا۔ چونکہ عدل میں برابری ہوتی ہے۔ اور ہر ایک کو کل میں سے آدھا دیا جاتا ہے اس لئے اسے انصاف بھی کہتے ہیں۔ اور سَوَآءٍ بھی بیننا مع معطوف کے سواء کا ظرف ہے خیال رہے کہ یہاں کلمۃ سواء کے عقائد اسلامیہ اور عام اسلامی اعمال مراد ہیں۔ یعنی اے محبوب ﷺ آپ سارے اہل کتاب سے فرما دو کہ اے کتابیو ان عقائد یا اس دین کی طرف آؤ ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہے یعنی جس میں نہ توریت کا اختلاف ہے نہ انجیل کا یا جس میں سارے بندے برابر ہیں یا جو بالکل عدل و انصاف کی بات ہے کہ اگر تم کلمہ پڑھ لو تو ہم پر اور تم پر یکساں احکام جاری ہوں یا وہ جس میں رسولوں اور کتابوں کا اختلاف نہیں اور کسی کو کسی پر فوقیت خصوصی نہیں۔ وہ کلمہ یہ ہے کہ وَلَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ یہ جملہ کلمۃ سواء کی تفصیل کا پہلا جزو ہے۔ یا تو ھی پوشیدہ کی خبر ہے اور رفعی حالت میں یا کلمتہ کا بدل ہے اور جری حالت میں یعنی وہ کلمہ مساوات یہ ہے کہ ہم رب تعالیٰ کے سوا نہ کسی نبی کی عبادت کریں نہ ولی کی نہ بتوں کی نہ چاند کی نہ سورج کی اس میں عیسائیوں پر چوٹ ہے کہ انہوں نے بعض بندوں کی عبادت شروع کر دی۔ اور وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا عملی شرک کی نفی کے بعد اعتقادی شرک کی نفی کی نُشْرِکَ اشراک سے بنا۔ بمعنی شریک کرنا یا شریک جاننا۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہے۔ شیئاً سے یہ ہر غیر خدا مراد ہے انسان ہو یا کچھ اور بعض نے کہا کہ یہ جملہ لَا نَعْبُدُ کی تاکید ہے مگر صحیح یہ ہے کہ تاسیس ہے۔ یعنی ہم رب تعالیٰ کا کسی کو شریک نہ جانیں اور نہ کسی کو عبادت کا حقدار سمجھیں اس میں بھی عیسائیت اور یہودیت کی تردید ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ و مریم یا عزیر علیہم السلام کو رب تعالیٰ کا شریک جانا اور صلیب وغیرہ کو عبادت کے لائق ٹھہرایا وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ یہ تیسرا جملہ ہے اور کلمۃ سواء کی تفصیل کا تیسرا جز و یَتَّخِذُ اِتخاذ سے بنا بمعنی اختیار کرنا پکڑنا بنانا یہاں بنانا مراد ہے مگر عقیدے کے لحاظ سے بَعْضُنَا سے عام لوگ مراد ہیں اور بعض سے خاص لوگ بعض نے کہا کہ اس سے مراد انبیائے کرام ہیں اور یہ جملہ بھی لَا نَعْبُدُ کی تاکید ہے بعض نے کہا کہ اس سے مراد عیسائیوں اور یہودیوں کے وہ علماء ہیں جنہیں عوام نے حرام و حلال کا اختیار دے رکھا تھا۔ اور جن سے عوام اپنے گناہ معاف کرایا کرتے ہیں۔ یہ ہی قول صحیح ہے ان کو بعض فرما کر اس جانب اشارہ کیا گیا کہ جب وہ ہمارے ہی ہم جنس ہیں تو ان میں یہ خصوصی شان یا الوہیت کہاں سے آئی ارباب رب کی جمع ہے بمعنی

پالنے والا اور مالک سے یہاں معبود مراد ہیں یا حرام و حلال کے مالک یعنی وہ کلمہ سواء یہ بھی ہے کہ ہمارے بعض یعنی تبعین بعضوں یعنی اپنے پیشواؤں کو اللہ کے سوا معبود یا مستقل مالک احکام نہ سمجھیں خیال رہے کہ حضرات انبیاء کرام باذن پروردگار احکام شرعیہ کے مالک بھی بنائے گئے ہیں اور احکام تکوینیہ کے بھی عیسیٰ علیہ السلام کا مردے زندہ کرنا' اندھے' کوڑھے اچھے کرنا یوسف علیہ السلام کی قمیص سے نابینا آنکھ منور ہونا حضرت ایوب علیہ السلام کے دھوون سے شفاء ہونا' صراحۃً قرآن شریف سے ثابت ہے یہ ہے تکوینی احکام میں ان کے اختیار رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ (آل عمران: ۵۰) اور فرمایا وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷) اور فرمایا وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (التوبۃ: ۲۹) اور حضور ﷺ نے حج کے متعلق فرمایا کہ اگر ہم ابھی ہاں کہہ دیتے تو ہر سال حج فرض ہو جاتا اور ایک شخص کو اس کا کفارہ کھلا دیا حضرت خزیمہ کی گواہی دو کے برابر فرما دی یہ ہے ان حضرات کا تشریعی احکام میں اختیار یہ خداداد اختیارات اس آیت کے خلاف نہیں۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ تَوَلَّوْا کی تحقیق بارہا ہو چکی۔ اس کا فاعل سارے اہل کتاب ہیں۔ تَوَلَّوْا میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں سے خطاب ہے۔ اشْهَدُوْا شہادت سے بنا بمعنی گواہ بننا' گواہ رہنا اور گواہی دینا۔ یعنی پس اگر اہل کتاب تمہاری موافقت سے منہ موڑیں تو اے مسلمانو ان سے کہہ دو۔ کہ ابھی گواہ بن جاؤ۔ یا قیامت میں گواہی دینا یا گواہ رہو کہ ہم رب تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار بندے ہیں۔ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ چونکہ اگلا مضمون نہایت اہم تھا اس لئے دوبارہ اہل کتاب سے خطاب کیا گیا یہاں عیسائی یہودی دونوں مراد ہیں تُحَآجُّوْنَ سے ان کے آپس کا جھگڑا مراد ہے۔ نہ کہ مسلمانوں سے کیونکہ وہ اس وقت آپس میں ہی لڑ جھگڑ رہے تھے۔ فی ابراہیم میں ملت یا دین یا شان پوشیدہ ہے یعنی اے یہود و نصاریٰ تم ابراہیم علیہ السلام کے دین یا ان کی شان میں آپس میں ایک دوسرے سے کیوں جھگڑتے ہو اور ان کے یہودی یا عیسائی ہونے کا دعویٰ کرتے ہو یہودیت تو توریت کے بعد بنی۔ اور عیسائیت انجیل کے بعد مگر ابراہیم علیہ السلام کا یہ حال ہے کہ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ چونکہ توریت و انجیل کا نزول یک بارگی ہوا۔ اس لئے اُنْزِلَتِ فرمایا گیا نہ کہ نزلت اور توریت کے بعد علیٰ موسیٰ اور انجیل کے بعد علیٰ عیسیٰ پوشیدہ ہے یعنی توریت موسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد اتریں۔ پھر وہ عیسائی یا یہودی کیسے ہوئے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یہ کلام کا خاتمہ ہے جس سے اہل کتاب کی جہالت و حماقت ظاہر کرنا مقصود ہے۔ یعنی تمہیں اتنی بھی عقل نہیں کہ ایسی موٹی بات سمجھ لو۔

خلاصہ تفسیر

اہل کتاب بمقابلہ مشرکین و دیگر کفار کے اسلام سے قریب تھے۔ کہ اللہ کے رسولوں اس کی کتابوں وغیرہ کو مانتے تھے نیز مدینہ منورہ و اطراف مدینہ میں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ یہ لوگ اہل بھی علم تھے اور اولاد انبیاء بھی ان کے اسلام قبول کر لینے سے دوسروں کے ایمان لے آنے کی قوی امید تھی۔ اس لئے اس آیت میں خصوصی طور پر اہل کتاب ہی کو دعوت اسلام دی گئی کہ یہ ذریعہ اشاعت اسلام ہے لہٰذا ارشاد ہوا کہ اے محبوب ﷺ آپ سارے اہل کتاب سے تبلیغی رنگ میں یوں خطاب کریں کہ اے کتابیو ایسے دین کی طرف آ جاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان برابر ہے۔ جن میں نو مسلم اور پرانے

مسلمان امیر، وزیر، بادشاہ، فقیر، چھوٹے بڑے کالے گورے آقا غلام کا کوئی فرق نہیں۔ اور جو افراط و تفریط سے خالی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم رب کے سوا کسی کو نہ پوجیں انبیاء اولیاء اللہ سب کو اللہ کا بندہ سمجھیں ان میں سے کسی کو معبود نہ بنالیں اور کسی کو خدا کا شریک نہ سمجھیں نہ بتوں کو نہ چاند سورج کو نہ صلیب کو نہ کسی اور شئی کو نیز کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب اور احکام کا مالک نہ بنائے۔ علماء و صلحاء سب کو دین کا پیروکار سمجھیں خیال رہے کہ انسان کے سوا تمام جاندار چیزیں رنگ، شکل، بولی غذا میں برابر ہیں۔ ہر جگہ کے کوے بکری مینڈک کی غذائیں بولی شکل و صورت میں کوئی فرق نہیں انسان وہ مخلوق ہے جو نہ زبان میں متفق ہے نہ غذا میں نہ شکل و شباہت میں نہ لباس میں ان بکھیروں کو ایک کرنے والا اور ان سب کو ایک جگہ جمع کر دینے والا اگر کوئی ہے تو وہ اسلام ہے۔ اس لئے فرمایا گیا سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اگر وہ لوگ اس سے بھی منہ موڑیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے اور صلیب کی پرستش کرنے اور اپنے پادریوں کو احکام کا مالک ماننے پر ضد کریں تو آپ ان سے کہہ دو کہ تم یہاں بھی گواہ بن جاؤ اور آخرت میں بھی گواہی دینا کہ ہم مخلص مسلمان ہیں چونکہ اہل کتاب میں یہ تینوں حرکات تھیں کہ وہ صلیب کی پرستش بھی کرتے تھے حضرت عیسیٰ و مریم کو خدا کا شریک بھی ٹھہراتے تھے کہ انہیں رب کا بیٹا بیوی مانتے تھے اور اپنے پادریوں کو مالک احکام بھی سمجھتے تھے اس لئے یہاں تبلیغ میں ان تین چیزوں کا ذکر ہوا۔ قیامت و فرشتوں وغیرہ کا ذکر نہ ہوا کہ یہ چیزیں تو وہ مانتے ہی تھے کسی کافر کو مسلمان کرتے وقت اس کے کفریات سے توبہ کرانا ضروری ہے۔ دہریہ سے یہ کہلوایا جائے کہ خالق ہے مشرک سے کہلوایا جائے کہ خالق ایک ہے۔ مرزائی سے کہلوایا جائے کہ حضور انور ﷺ آخری نبی ہیں۔ عیسائیوں سے کہلوایا جائے کہ حضرت عیسیٰ و مریم اللہ کے بندے ہیں اے اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آپس میں کیوں جھگڑتے ہو کہ یہودی کہتے ہیں وہ یہودی تھے اور عیسائی کہتے ہیں وہ عیسائی تھے۔ ذرا اتنا سوچو کہ یہودیت توریت آنے کے بعد بنی اور نصرانیت نزول انجیل کے بعد ظہور میں آئی۔ اور ابراہیم علیہ السلام ان دونوں سے بہت پہلے گذرے۔ کہ آپ کا زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار سال اور عیسیٰ علیہ السلام سے تین ہزار سال پہلے ہے۔ (روح المعانی و بیان وغیرہ) پھر وہ یہودی یا عیسائی کیونکر ہو سکتے ہیں کیا کوئی شخص کتاب آنے سے پہلے اس کی پیروی کر سکتا ہے تم میں اتنی بھی عقل نہیں کہ اتنی موٹی بات سمجھ سکو۔ نہ وہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ حنیف و مسلم تھے اسلام ان کی ملت کے موافق ہے اگر تم ان کی پیروی چاہتے ہو تو مسلمان ہو جاؤ۔

خیال رهے: کہ اس آیت میں وہ پیغام ہے جو حضور ﷺ سلاطین روم و شام و فارس وغیرہ کو بھیجتے اور اس کے ذریعہ انہیں دعوت اسلام دیتے تھے چنانچہ آپ نے قیصر روم کو جو فرمان نامہ بھیجا اس کا مضمون یہ تھا کہ فرمان محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے شاہ روم حرقل کی طرف ہے۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت قبول کرے اے شاہ روم میں تجھے دعوت اسلام دیتا ہوں اسلام لے آ۔ سلامت رہے گا تجھے اللہ دگنا اجر دے گا اور اگر منہ پھیرے گا تو تجھ پر پیشواؤں کا گناہ ہوگا پھر يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ سے مُسْلِمُوْنَ تک آیت تحریر فرمائی۔

جب یہ فرمان شاہ روم کے پاس پہنچا تو اس نے حضور ﷺ کے حالات دریافت کئے اور بولا کہ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو ان کے پیر دھوتا۔ بعض روایات میں ہے کہ ان کے قدم چومتا مگر سلطنت کے خوف سے ایمان نہ لایا اسی عظمت کی

برکت سے اس کی سلطنت باقی رہی مگر کسریٰ فارس نے فرمان نامہ کو چاک کر دیا اس کا انجام یہ ہوا اسی رات وہ قتل کیا گیا اور آتش پرستوں کی سلطنت کا قیامت تک کے لئے خاتمہ ہو گیا اور ان کی جماعت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ایمانی احکام سب کے لئے یکساں ہیں۔ کسی کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں جیسا کہ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** اسلام کے سواء کسی دین میں برابری و مساوات نہیں عیسائیوں میں رسول کو معبود اور امت کو عابد مانا گیا۔ اسی طرح ان کے علماء اور رھبان احکام حلال وحرام کے مالک سمجھے گئے۔ کہ جس کے لئے جو چاہیں حلال کر دیں اور جو چاہیں حرام۔ بلکہ عیسائیوں کے گناہ پادری صاحب معاف کریں۔ ان کے ہاں کالے گورے ولایتی دیسی آقا و غلام کا اب تک فرق ہے کہ انگریزوں کے گرجے میں دیسی عیسائیوں کو عبادت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ زندگی میں تو کیا مرے بعد بھی یہ متفق نہ ہو سکے انگریزوں کا قبرستان علیحدہ انگلو انڈین کا گورستان جدا اور چوڑے چمار عیسائیوں کا قبرستان دوسرا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

مالک و بندہ و محتاج و غنی ایک ہوئے اس کی سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

دہلی کے لال قلعہ میں کوئی چپڑاسی تھا کوئی وزیر کوئی شہنشاہ کوئی فقیر وہاں سب کے نام بھی الگ اور کام بھی جدا مگر جامع مسجد میں آ کر یہ سب فرق اٹھ جاتے تھے نہ نام میں فرق نہ کام میں۔ نام سب کا مسلمان کام سب کا عبادت رحمان و تلاوت قرآن اسلام میں مولوی صاحب و پیر صاحب کسی کے گناہ معاف نہیں کر سکتے بلکہ اپنے گناہوں پر سب شرمندہ ہیں جب حضرت ابو بکر صدیق یہ عرض کرتے ہیں۔

حیف مالی یا الٰھی لَیْسَ لِیْ خَیْرُ عَمَل سُوْء اَعْمَالِیْ کَثِیْرٌ زَادَ طَاعَاتِیْ قَلِیْل

اور جناب حیدر کرار فرماتے ہیں

الٰھی عبدک العاصی اتاک مقرا بالذنوب ذقعد دعا کا

اور غوث الثقلین سرکار بغداد کعبہ معظمہ کی بجری پر منہ مل کر کہتے ہیں کہ خدایا مجھے بخش دے اور اگر بخشش کے لائق نہیں ہوں تو مجھے قیامت کے دن اندھا اٹھانا تا کہ نیکوں کے روبرو شرمندہ نہ ہوں تو مادشا کس شمار میں ہیں۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم اور اس پر بڑے بڑوں کا عمل۔ ترمذی نے عدی ابن حاتم سے روایت کی کہ جب یہ آیت کریمہ اتری تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ہم عیسائیت میں علماء کی پوجا تو نہ کرتے تھے تو فرمایا کہ کیا وہ تمہارے حرام وحلال کے مالک نہ تھے اور تم ان کے احکام پر عمل نہ کرتے تھے عرض کیا کہ ہاں فرمایا اربابا من دون اللہ کا یہی مطلب ہے (روح المعانی) اس کی تفسیر دوسری جگہ یوں کی گئی۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ:۳۱) **تیسرا فائدہ:** بزرگان دین سے الزام اٹھانا اور ان کے اوصاف ظاہر کرنا سنت قرآنی ہے۔ دیکھو اہل کتاب نے ابراہیم علیہ السلام پر یہودیت یا عیسائیت کا الزام لگایا رب تعالیٰ نے ان کی صفائی بیان فرما کر انہیں اس الزام سے بری کیا ایسے ہی یہود نے سلیمان علیہ السلام کو جادوگروں کا الزام لگایا۔

رب تعالیٰ نے ان پر سے یہ الزام دور کر کے ان کی نبوت کا اعلان کیا فرمایا وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (بقرہ:۱۰۲) **چوتھا فائدہ:** دینی مناظرے اور حقانیت اسلام پر دلائل قائم کرنا کفار کے شبہات کا جواب دینا واجب ہے۔ **پانچواں فائدہ:** علم تاریخ اعلیٰ علم ہے۔ جس کا جاننا ضروری ہے کہ اس پر بہت سے دینی احکام مرتب ہوتے ہیں۔ دیکھو یہاں اہل کتاب کو تاریخی لحاظ سے جواب دیا گیا کہ چونکہ ابراہیم علیہ السلام توریت و انجیل کے نزول سے پہلے گزرے۔ اس لئے یہودی یا عیسائی نہیں ہو سکتے۔ **چھٹا فائدہ:** اپنے ایمان و نیک اعمال کا لوگوں کو گواہ بنالینا چاہئے۔ تاکہ ان کی گواہی قیامت میں کام آئے جب کفار کو اپنے ایمان کا گواہ بنایا گیا تو مسلمانوں خصوصاً حضرات انبیاء و اولیاء اللہ کو ضرور گواہ بنایا جائے۔ حتیٰ کہ پانی کے قطروں ریت کے ذروں کو اپنا گواہ ایمان بنالے کہ دریا اور جنگلوں میں بھی کبھی بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھے گواہ بنانے کی تین صورتیں ہیں لوگوں پر اپنا ایمان ظاہر کرے اپنے نیک اعمال علانیہ بھی کرے اپنی شکل مسلمانوں کی سی رکھے۔ تاکہ لوگ اس کے ایمان کے گواہ ہوں۔ **ساتواں فائدہ:** اپنی کچھ نیکیاں اعلانیہ بھی کرے۔ ہر نیکی چھپا کر ہی نہ کرے۔ تہجد خفیہ پڑھے مگر نماز پنجگانہ' نماز عید' علانیہ پڑھے۔ **آٹھواں فائدہ:** اسلام و ایمان کبھی ہم معنی ہوتے ہیں۔ کبھی الگ الگ معنی میں یہاں بمعنی ایمان ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ان آیتوں میں تین چیزوں کی نفی کی گئی غیر خدا کی عبادت۔ غیر خدا کو شریک جاننا۔ غیر خدا کو رب ماننا ان تینوں میں کیا فرق ہے تینوں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں؟ **جواب:** کسی کو خدا کی ذات یا صفات میں شریک سمجھنا یہ تو ہے شرک اور غیر خدا کی پرستش کرنا اس کے سامنے جھک جانا۔ یہ ہے عبادت غیر اللہ اور کسی کو خدا کی مثل احکام شرعیہ کا مالک بالذات سمجھنا۔ یہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا اختیار کرنا ہے لہٰذا شرک اور اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا تعلق عقیدہ سے ہے اور عبادت کا تعلق عمل سے جیسے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا اس کی مثل سمجھتے ہیں۔ یہ شرک ہوا۔ پھر ان کا صلیب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا' اسے سجدہ کرنا' یہ ہے غیر خدا کی عبادت پھر پادری صاحب کو شرعی احکام کا مالک سمجھنا' ان سے اپنے گناہ معاف کرانا' کہ چھ دن خوب گناہ کئے۔ اور اتوار کے دن پادری صاحب کے سامنے اقرار کر لیا۔ انہوں نے کہا کہ جاؤ بیٹا معاف ہیں سب کی معافی ہوگئی یہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا اختیار کرنا ہے اسلام ان عیوب سے پاک ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کو چھوڑ کر اوروں کو رب ماننا جرم ہے۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو چاہئے کہ خدا کے ساتھ اوروں کو معبود ماننا جائز ہو کیونکہ وہ اَرْبَابًا مَّعَ اللّٰهِ ہوگا۔ نہ کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ **جواب:** آیت کا مطلب یہ ہے کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وحدہ ایک خدا کے ساتھ کسی کو مالک نہ مانو لہٰذا دوئی توحید کے مخالف ہے اور من دون اللہ میں داخل۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام کے احکام سب کے لئے یکساں ہیں۔ حالانکہ اسلام میں بھی بڑا فرق ہے غریب پر زکوٰۃ و حج اور حائضہ عورت پر نماز' دیوانے پر ساری عبادات فرض نہیں۔ ایسے ہی صحابہ کی معمولی نیکی پر ثواب زیادہ سادات کرام کو زکوٰۃ کھلانا حرام' حضرت علی کو فاطمہ زہرہ کی موجودگی میں دوسرا نکاح حرام اور صدیق اکبر کو جنابت کی حالت میں مسجد میں آنا جائز۔ حضرت [illegible] انصاری کی ایک گواہی دو کی مثل یہ تمام چیزیں احادیث سے ثابت ہیں پھر احکام

اسلام میں برابری کہاں رہی؟ **جواب:** اسلام میں چار چیزیں ہیں (۱) عقائد (۲) عبادات (۳) معاملات (۴) درجات ومقبولیت۔ عقائد میں کوئی فرق نہیں۔ سب پر یکساں واجب ہیں عبادات و معاملات میں ایک حد تک مساوات ہے۔ مگر کہیں کہیں فرق بھی نظر آتا ہے۔ لیکن درجات و مقبولیت میں بہت فرق ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ (الحدید: ۱۰) نیز فرمایا هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر: ۹) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ صحابی کا تھوڑے جو خیرات کرنا تمہارے سونے کے پہاڑ کی خیرات سے افضل ہے۔ یہاں اس آیت میں عقائد مراد ہیں نہ کہ احکام۔ اسی لئے یہاں **کلمة سواء** فرمایا گیا نہ کہ **الی احکام سواء** یا اسلام میں احکام کا فرق بھی دنیوی لحاظ سے نہیں۔ کالے گورے، امیر، فقیر، شاہ و گدا یکساں قرار دیئے گئے۔ ہاں دینی لحاظ سے ضرور فرق ہے کہ متقی فاسق سے افضل صحابی غیر صحابی سے بڑھ کر عالم غیر عالم سے بہتر۔ بخلاف عیسائیوں کے کہ ان میں دنیوی لحاظ سے فرق مراتب تھا۔ غرضیکہ اسلام میں فرق قانون کے ماتحت ہے جو بھی اس قانون کے تحت آئے درجات حاصل کرے سب سے بڑا درجہ صحابیت ہے جو بھی اسلام قبول کر کے حضور انور ﷺ کے دیدار سے مشرف ہو گیا وہ صحابی بن گیا خواہ جناب ابوبکر صدیق ہوں یا حضرت بلال حبشی یا حضرت سلمان فارسی اور صہیب رومی۔ ولایت ایمان و تقویٰ سے نصیب ہوتی ہے۔ جو ایرانی تورانی ان دو صفتوں سے اپنے آپ کو آراستہ کرے۔ وہ ولایت حاصل کر سکتا ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ (یونس: ۶۳) تیسرا یہ کہ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ نو مسلم و پرانے مسلم یکساں ہیں چوتھا یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان احکام میں توریت و انجیل و قرآن کا اختلاف نہیں توحید میں سب مشترک ہیں۔ پانچواں یہ کہ اس سے عبدیت میں مساوات بیان کرنا مقصود ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک بعض بندے معبود اور بعض عابد ہیں۔ مگر اسلام میں سارے بندے بندے ہیں معبود کوئی نہیں جس کی شرح خود اگلے مضمون نے کردی۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ تقلید شرک ہے کیونکہ مقلد عیسائیوں کی طرح اپنے امام کو مالک احکام سمجھتے ہیں کہ حنفی احکام کی نسبت امام ابوحنیفہ کی طرف اور دیگر مذاہب والے اپنے اماموں کی طرف کرتے ہیں کہ فلاں چیز اس لئے فرض ہے کہ امام ابوحنیفہ نے فرمایا یہ ہی اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے معنی ہیں (غیر مقلد) **جواب:** معاذ اللہ تقلید کو اس سے کیا تعلق۔ کوئی مقلد کسی امام کو احکام کا مالک نہیں سمجھتا صرف احکام کا عارف سمجھتا ہے۔ اس کا خیال صرف یہ ہے کہ چونکہ امام اللہ ورسول کے فرمان سے واقف ہے۔ ان کے اشاروں سے احکام نکال سکتا ہے۔ اس لئے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے قرآن وحدیث سے نکال کر کہہ رہا ہے۔ تم بھی صحابہ کرام کے فرمان پر عمل کرتے ہی ہو تو کیا تم بھی اس میں داخل ہو۔ حنفی یہ نہیں کہتا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فلاں چیز کو فرض کیا بلکہ کہتا ہے کہ فرض بتایا۔ فرض کرنے اور فرض بتانے میں بڑا فرق ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء: ۵۹) جاہل غیر مقلد بھی اپنے عالموں کی ہر بات مانتے ہیں کیا وہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ **پانچواں اعتراض:** اللہ تعالیٰ نے صرف ابراہیم علیہ السلام کی براءت کیوں بیان فرمائی دوسرے نبیوں کی براءت کیوں نہ بیان کی۔ **جواب:** اس لئے کہ یہود مدینہ اور نجرانی عیسائیوں نے ان ہی کی ذات کریم پر یہودیت یا عیسائیت کا الزام لگایا تھا۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرکین عرب یہود ونصاریٰ کے مانے ہوئے رسول تھے۔ ہر دین ان کی تعظیم و

احترام تھا۔ اس لئے ہر دین والا یہ ہی کہتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے تاکہ ان کی نسبت سے ہمارے دین کو قوت پہنچے حتیٰ کہ مشرکین عرب نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے نام کے بت خانہ کعبہ میں رکھے۔ جن کے ہاتھوں میں فال والے تیر دیئے تھے۔ اس لئے یہ یہود و نصاریٰ بھی ان کو اپنے دین کی طرف نسبت دیتے تھے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو مالک احکام سمجھنا شرک اور اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں داخل ہے۔ اور عیسائیت کی پیروی (دیوبندی) **جواب:** حضور ﷺ نے بے شک مالک احکام ہیں۔ جس پر بہت سی آیات قرآنیہ احادیث صحیحہ اور علماء کرام کے اقوال گواہ ہیں۔ اس کی تفصیل ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ میں دیکھو کیونکہ ان کا فرمان وحی الٰہی ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم: ۴) اگر وہ بالکل غیر مختار ہوں تو ان میں اور علمائے مجتہدین میں کیا فرق رہے۔ عیسائیوں نے اپنے عالموں کو مالک احکام مانا۔ جنہوں نے کتاب الٰہی کے خلاف حکم دیئے۔ عیسائیوں نے کتاب کو چھوڑا اور علماء کی بات مانی یہ ہوا اربابا من دون اللہ بنانا۔ اور نبی رب کی طرف سے مالک احکام بنائے گئے۔ فرماتا ہے وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف: ۱۵۷) نبی گندی چیزیں حرام کرتے ہیں جیسے تم بادشاہوں اور حکام کو دنیوی احکام کا مالک مانتے ہو بتاؤ یہ بھی شرک ہے یا نہیں لہٰذا اس آیت کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں خلاصہ یہ ہے کہ جسے رب تعالیٰ نے مالک احکام نہ بنایا ہوا سے رب کے مقابل مالک ماننا شرک ہے۔ جیسے عیسائیوں کے پوپ پادری اور جسے رب تعالیٰ نے ہی اپنے فضل سے مالک و مختار بنایا ہوا ہے اسے یہ عطاء الٰہی مالک و مختار ماننا عین ایمان پہلی قسم کے لوگ من دون اللہ ہیں اور یہ حضرات من جانب اللہ ہیں دیکھو کعبہ کی طرف سجدہ کرنا عین ایمان ہے۔ اور گنگا و صلیب کی طرف سجدہ کرنا سراسر شرک کیوں اس لئے کہ کعبہ معظمہ کو رب نے مسجود الیہ بنایا ہے۔ اور صلیب گنگا کو رب نے مسجود الیہ نہ بنایا۔ سچے نبیوں کو نبی ماننا عین ایمان ہے۔ کہ یہ حضرات نبی اللہ ہیں۔ اور غیر نبی کو نبی مان لینا عین کفر ہے۔ **ساتواں اعتراض:** سنیوں کا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ گناہوں سے پاک و صاف فرما سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی ظاہری و باطنی گندگیوں کو دور کر سکتے ہیں یہ بھی شرک و کفر ہے عیسائی اپنے گناہ پادریوں سے معاف کراتے ہیں۔ اور مسلمان نبیوں سے۔ یہ عقیدہ بھی اربابا من دون اللہ میں داخل ہے۔ (دیوبندی) **جواب:** بے شک حضور ﷺ ہم کو ہی گناہوں سے پاک کرتے ہیں اور رب تعالیٰ کے عذاب سے بچاتے ہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ: ۱۰۳) اے محبوب ﷺ آپ ان کے مالوں سے صدقے لے کر اس کے ذریعہ انہیں پاک و صاف کر دو نیز فرماتا ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ الخ (النساء: ۶۴) فرماتا ہے وَيُزَكِّيْهِمْ حضرت ماعز نے ایک گناہ کر کے عرض کیا طَهِّرْنِیْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حضرت عائشہ صدیقہ نے عرض کیا اَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ میں اللہ و رسول اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتی ہوں اگر اس کی تفصیل دیکھنا ہے تو ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ کا مطالعہ کرو میں اپنے حقوق معاف کر کے دوسرے کو اس سے پاک و صاف کر سکتا ہوں اس آیت کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ عیسائی رب تعالیٰ کے گناہ اپنے علماء سے معاف کراتے تھے۔ زنا' چوری شراب خوری کو پادری صاحب معاف کرتے تھے۔ یہ یقیناً کفر ہوا۔ لیکن اگر حضور ﷺ کی دعا سے رب تعالیٰ کے حقوق معاف ہو جائیں۔ یا حضور ﷺ کی جنبش لب سے رب تعالیٰ خود معاف فرمادے تو یہ شرک نہیں۔ نیز حضور ﷺ کو اس معافی کا اختیار رب تعالیٰ

ہی نے دیا ہے۔ تو حضور ﷺ کی معافی رب تعالیٰ کی معافی ہے۔ علماء پر نبیوں کو اور احکام دنیوی پر حقوق اللہ کو قیاس کرنا غلطی ہے۔ انہوں نے غیر مختار گنہگار بندوں کو مستقل مختار مانا۔ بے ایمان ہوئے مسلمانوں نے حبیب کردگار کو جن کا نام ہی ہے۔ احمد مختار ﷺ باذن الٰہی اور بہ عطائے رب مختار مانا یہ خلاف توحید نہ ہوا بلکہ توحید کی جان ہے۔ **آٹھواں اعتراض:** جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اس لئے یہودی یا عیسائی نہیں ہو سکتے۔ کہ وہ توریت انجیل سے پہلے گذرے۔ اسی طرح وہ مسلمان بھی نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ نزول قرآن سے پہلے گذرے۔ پھر انہیں قرآن نے حنیف مسلم کیوں فرمایا۔ اگر کہا جائے کہ دین اسلام کے اصول ان کے مطابق ہیں تو عیسائی و یہودی بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اصول دین ملت ابراہیمی کے موافق ہیں ان کا جواب کیا ہوگا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ توریت و انجیل نے کہیں دعویٰ نہ کیا۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کے اصول دین یہی ہیں۔ یا وہ یہودی یا نصرانی تھے۔ مگر قرآن کریم نے اعلان فرمایا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا (بقرہ: ۱۳۵) اور فرمایا مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (آل عمران ۶۷) لہٰذا اہل کتاب یہ دعویٰ نہیں کر سکتے۔ مسلمان کر سکتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ عیسائیت ہرگز ملت ابراہیمی کے موافق نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی اصل اول الوہیت مسیح اور عبادت مسیح ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں نہ مسیح علیہ السلام تشریف لائے تھے نہ ان کی الوہیت کا کوئی معتقد تھا۔ نہ ان کی پوجا ہوتی تھی جب معبود میں فرق ہو گیا تو دین میں اتحاد کیسا۔ ایک عیسائی سے کسی مسلمان نے پوچھا کہ تمہارا دین کامل ہے۔ یا ابراہیم علیہ السلام کا۔ وہ بولا کہ ابراہیم علیہ السلام کا مسلمان نے کہا غلط ہے۔ ان کا ایمان تمہارے ایمان کا تہائی حصہ ہے کہ ۱/۳ مومن وہ تھے۔ اور پورے مومن تم۔ نیز یہود پر ان کی بدکرداریوں کی وجہ سے وہ تکالیف لازم کی گئیں جو اس سے پہلے نہ تھیں نیز نہ اس وقت حضرت عزیر علیہ السلام پیدا ہوئے تھے نہ ان کی پوجا ہوتی تھی اور نہ کسی نے انہیں ابن اللہ کہا تھا۔ یہودیت اور ملت ابراہیمی عقیدہ الوہیت میں مختلف ہیں۔ بخلاف اسلام کے کہ اس میں یہ اصولی اختلاف نہیں۔ نیز عیسائیوں یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبہ معظمہ تھا۔ آپ کے زمانے میں بیت المقدس کی تعمیر کرنے والے حضرت سلیمان بھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ حضرت سلیمان جناب خلیل سے قریباً تین ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔ نیز حج جناب خلیل کی ملت کی اعلیٰ عبادت تھی۔ جو نہ یہود کے دین میں ہے نہ عیسائیوں کی ملت میں۔ تیسرا یہ کہ جڑ کا پتہ پھل سے لگتا ہے اور اصولی دین کا پتہ اعمال سے۔ اسلام کے اعمال ملت ابراہیمی کے موافق ہیں۔ اور دیگر ادیان اس کے خلاف 'حج' ختنہ' داڑھی' موئے زیر ناف کا لینا یہ سب ملت ابراہیمی کے مسائل ہیں۔ جو اسلام میں رائج ہیں تمہارے ادیان ان سب چیزوں سے خالی ہیں۔ معلوم ہوا کہ صرف دین اسلام ملت ابراہیمی کے موافق ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت' چوتھا یہ کہ سارے پیغمبر حضور ﷺ کے امتی ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ الخ (آل عمران: ۸۱) لہٰذا صرف ابراہیم علیہ السلام ہی نہیں بلکہ اس معنی میں سارے پیغمبروں کو مسلم کہا جا سکتا ہے۔ نہ کہ یہودی و عیسائی۔ پانچواں یہ کہ حنیف کے معنی ہیں جھوٹے دینوں سے منہ پھیرنے والا اور مسلم کے معنی ہیں اطاعت شعار نہ کہ اصطلاحی مسلمان۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ: ۱۳۱) نصرانی کے لغوی معنی ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی امداد کرنے والا یا ناصرہ کا رہنے والا۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام لغوی معنی میں مسلم ہیں۔ مگر یہودی یا عیسائی کسی طرح

نہیں۔ **نواں اعتراض:** اس آیت میں یہودی و نصاریٰ کو ہمارے اسلام پر گواہ بنایا گیا۔ کہ ارشاد ہوا۔ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ حالانکہ وہ کفار ہیں۔ اور کفار کی گواہی مسلمانوں پر شرعاً معتبر نہیں۔ پھر اس آیت کا مطلب کیا۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ گواہی قیامت کے متعلق ہے۔ یعنی اے اہل کتاب تم قیامت میں ہمارے اسلام کی گواہی دینا جیسا کہ ہم تمہارے کفر کی گواہی دیں گے۔ وہاں کفار کی گواہی مسلمانوں کے موافق قبول ہوگی۔ حدیث شریف میں ہے کہ جہاں تک موذن کی اذان کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک کی ہر چیز اس کے ایمان کی گواہی دے گی۔ ہر چیز میں اس علاقہ وایریا کے کفار بھی داخل ہیں۔ یہ بھی مسلمانوں کے ایمان کی گواہی دیں گے۔ قیامت میں کفار تو اپنا کفر چھپائیں گے۔ بلکہ اس سے انکاری ہی ہو جائیں گے کہ کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (انعام: ۲۳) اور مسلمان ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ یہ کفار تھے ان کا کفر ہم نے دیکھا تھا مگر مسلمان اپنے اسلام کے اقراری ہوں گے قبر میں بھی قیامت میں بھی اور کفار سے ان کے ایمان کی گواہی لی جائے گی۔ تو مسلمانوں کی گواہی کفار کے خلاف ہوگی۔ اور کفار کی گواہی مسلمانوں کے حق میں لہٰذا اشھدوا نہایت ہی درست وصحیح ہے۔ اگر مسلمان ان سے یہ نہ بھی کہیں۔ تب بھی انہیں گواہی دینا پڑے گی۔ یہ کہنا اہمیت کے لئے ہے۔ دوسرا یہ کہ کفار کی گواہی کے مقابل اور مسلمانوں کے موافق قبول ہوتی ہے۔ اگر مسلمان مدعی اور کافر مدعیٰ علیہ ہو اور اس مدعیٰ علیہ کا ہم مذہب مسلمان کے حق میں گواہی دے تو مانی جائے گی۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے تیسرا یہ کہ یہاں شہادت سے اصلاحی معنی مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اچھا تم اقرار کرلو کہ ہم دین حق پر ہیں مسلم ہیں اور تم کافر ہو گویا ان سے اپنی بے ایمانی کا اقرار کرانا منظور ہے۔ چوتھا یہ کہ اس سے اپنی پختگی اور اہل کتاب کی کمزوری کا اظہار مقصود ہے۔ شہادت بمعنی معائنہ ہے۔ یعنی دیکھ لو ہم مسلمان ہیں تمہاری طرح اپنے دین کو چھپاتے نہیں تم میں صدہا منافق ہیں جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں ہم میں ایسا کوئی نہیں جو اپنے کو یہودی ظاہر کرے تمہارا اپنے دین کو چھپانا اپنی کمزوری کا اقرار ہے۔ اور ہمارا اسلام کو ظاہر کرنا اپنی قوت کا اعتراف مسلم بمعنی کھلا مومن۔

تفسیر صوفیانہ

تمام آسمانی ادیان طریقہ عبادت میں مختلف ہیں۔ مگر عبودیت سب کی ایک گویا شریعتیں جداگانہ ہیں اور طریقتیں متحد اسی لئے ارشاد ہوا تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ طریقہ تقرب میں اختلاف ہے اور قرب میں اتحاد اور وہ مشترک چیز یہ ہے کہ ہم عبادت میں سواء رضاء الٰہی کے اور کچھ طلب نہ کریں۔ رب سے رب ہی کو مانگیں نہ کہ غیر رب کو نیز طلب رزق میں اسباب ووسائل پر توجہ نہ کریں۔ اور کسی کو اپنا رب نہ مانیں اگر کفار اس قاعدہ سے منہ پھیریں تو تم انہیں اپنی اطاعت وفرمانبرداری' توحید' اخلاص اور شرک جلی وخفی سے براءت پر گواہ بنالو۔ تاکہ قیامت کے دن وہ تمہارے اسلام وتوحید پر گواہ ہوں۔ اور تم ان کے کفر وشرک پر حضور ﷺ نے ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ جب تم جنگل میں ہو اور نماز کا وقت آجائے تو بلند آواز سے اذان کہو کیونکہ جہاں تک تمہاری آواز پہنچے گی وہاں تک کے جن وانس' شجر وحجر اور ساری چیزیں قیامت میں تمہارے ایمان کی گواہی دیں گی۔ انس کے عموم سے معلوم ہوا کہ کفار بھی مسلمانوں کے ایمان کی گواہی دیں گے۔ توحید اصل اصول ہے اور مضبوط رسی۔ یہ عالم غیب سے اس کو ملتی ہے جس پر رب تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے۔ وہ ابراہیم علیہ السلام جو انبیائے کرام کے والد

ماجد ہیں۔ اور جن کے گھر کی یہ ساری بہار ہے۔ کیونکر ممکن ہے کہ وہ توحید کو چھوڑ کر یہودی یا نصرانی رہے ہوں یہودیت اور نصرانیت جہالت اور گمراہی کا نتیجہ ہیں۔

حکایت: مولینا جامی قدس سرہ نے بہت پر لطف واقعہ بیان فرمایا

پیش کسریٰ زخردمند حکیماں می رفت — سخن از سخت ترین موج دریں لجۂ غم

آں یکے گفت کہ بیماری واندوہ دراز — واں دگر گفت کہ ناداری و پیریست بہم

سیوے گفت کہ قرب اجل و سوئے عمل — عاقبت رفت بترجیح سوم حکم حکم

یعنی نوشیرواں بادشاہ کی مجلس میں تین حکیم جمع تھے۔ رومی' ہندی اور بزرجمہر۔ مسئلہ یہ چھڑا کہ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت کونسی ہے۔ حکیم رومی بولا کہ بڑھاپے اور فقیری کا اجتماع' حکیم ہندی نے کہا نہیں بلکہ بیماری ناداری اور رنج وغم میں گرفتاری۔ بزرجمہر بولا۔ نہیں بلکہ سخت مصیبت قرب اجل اور سوءِ عمل ہے' یعنی موت کا قرب اور بدعملی آخر سب نے بزرجمہر کی رائے سے اتفاق کیا۔ عاقل کو چاہئے کہ مٹی میں جانے سے پہلے علم وعمل کا راستہ اختیار کرے (روح المعانی)

صوفیاء فرماتے ہیں کہ دین کی حقانیت کی دلیل یہ ہے کہ اس دین میں اللہ کے مقبول رہے ہوں اور موجود ہوں۔ مقبولین بارگاہ حقانیت ملت کی زندہ دلیلیں ہیں۔ اور بے دینوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب اس طرح اپنی حقانیت ثابت نہیں کر سکتے تو خواہ مخواہ بزرگوں پر الزام لگاتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے دین میں تھے آج بھی وہابی' شیعہ وغیرہ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ حضرات خواجہ بایزید بسطامی اور غوث پاک وہابی تھے وغیرہ وغیرہ جب یہ لوگ اسی قسم کی رکیک حرکت کریں تو ان بزرگوں کی تعلیم ان بے دینوں پر پیش کرو۔ پھر کہو کہ تم اس تعلیم پر نہیں۔ تو وہ تم میں سے کیسے ہوئے۔ مثلاً حضور غوث پاک فرماتے ہیں کہ تمام عالم پر ہماری نظر ہے۔ یا فرماتے ہیں کہ ہر زمانہ اور وقت ہم سے اجازت لے کر گزرتا ہے' یا فرماتے ہیں مصیبت کے وقت نماز اسرار یعنی نماز غوثیہ پڑھو۔ جس میں سرکار بغداد سے استعانت ہے۔ یہ چیزیں وہابیوں کے ہاں شرک ہیں پھر اے وہابیو تم غوث پاک کے طریقہ پر کب ہوئے۔ جیسے یہود وعیسائی۔ طریقہ ابراہیمی پر نہیں کہ ان کے عقائد واعمال وعبادات جناب خلیل سے جدا ہیں۔

هَاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ
خبردار تم وہ ہو کہ جھگڑا کرتے ہو بیچ اس کے کہ واسطے تمہارے اس کا علم ہے پس کس لئے جھگڑتے ہو تم
سنتے ہو یہ جو تم ہو اس میں جھگڑے جس کا تمہیں علم تھا تو اس میں کیوں جھگڑتے ہو
فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا
بیچ اس کے کہ نہیں ہے واسطے تمہارے اس کا علم اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے نہ
جس کا تمہیں علم ہی نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے
كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ

تھے ابراہیم یہودی اور نہ عیسائی اور لیکن تھے وہ باطل سے مائل مسلمان
ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ ہر باطل سے جدا مسلمان تھے
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٦٧﴾
اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے
اور مشرکوں سے نہ تھے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کی بے علمی بتائی گئی۔ کہ یہ تاریخ سے ناواقف ہیں اب ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا بیان ہے۔ کہ انہیں ہر بات میں اڑنے کی عادت ہے خواہ خبر ہو یا نہ ہو۔ گویا ایک عیب کے بعد ان کا دوسرا عیب بیان کیا جا رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ان کے جھگڑے کی ایک وجہ بیان کی گئی تھی یعنی لاعلمی۔ اب دوسری وجہ بیان ہو رہی ہے۔ یعنی عناد اور ہٹ دھرمی گویا ان کی ضد نا معلوم باتوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ جو جانتے ہیں اس کا بھی بلا وجہ انکار ہی کئے جاتے ہیں۔ اے مسلمانو یہ مت سمجھنا کہ تم سے یہ محققانہ جواب سن کر خاموش ہو جائیں گے نہیں بلکہ یہ ہی کہے جائیں گے کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔ **تیسرا تعلق:** کسی بزرگ سے فیض نہ لینے کی دو وجہیں ہوتی ہیں جہالت اور ضد۔ جاہل اور ضدی ہر جگہ سے محروم لوٹتا ہے۔ وہ ہی ڈول کنویں سے پانی لاتا ہے جو خالی جائے جو پہلے ہی پیشاب سے بھرا ہو وہ کنویں کو ہی گندا کرے گا۔ پانی مطلقاً نہ لائے گا پچھلی آیت میں علماء یہود کی جہالت کا ذکر تھا اب ان کی ضد و عناد کا تذکرہ ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو سمجھا دیا جائے کہ اگر ان بدنصیبوں پر تمہاری باتوں کا اثر نہ ہو تو تم ملول نہ ہو اس کی وجہ سے تمہاری تبلیغ کی کمی نہیں بلکہ وجہ ان کی اپنی عدم قابلیت ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام سے یہودیت اور نصرانیت کا الزام نفیس طریقہ سے دور کیا گیا' اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ کون تھے۔ اور ان کا دین کیا تھا گویا پہلے عیوب کی نفی تھی اب صفات کا ثبوت۔

تفسیر

هَا نْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ها حرف تنبیہ ہے۔ اور اَنْتُمْ مبتدا۔ هٰٓؤُلَآءِ خبر اوّل اور حَاجَجْتُمْ خبر دوم' بعض نے فرمایا کہ اَنْتُمْ سے پہلے یا پوشیدہ ہے۔ اور اَنتم اس کا منادا (خازن) اخفش نے کہا کہ یہ اصل میں ءَاَنْتُمْ تھا۔ ہمزہ استفہامیہ ھ سے بدل گئی جیسے ارقت سے ھرقت اور الف زائدہ ہے۔ هٰٓؤُلَآءِ اسم اشارہ ہے۔ اور بعض کے نزدیک اصل میں اولاء بمعنی اَلَّذِیْ اور ھا زائدہ ہے اور حَاجَجْتُمْ اس کا صلہ۔ لہٰذا اس جملہ کے چند معنیٰ ہوں گے۔ اَنْتُمْ میں یہود و نصاریٰ دونوں سے ہی خطاب ہے۔ یعنی خبردار تم ایسے بے وقوف ہو کہ اب تک اس میں تو جھگڑتے رہے جس کا تمہیں علم تھا یا کیا تم وہ لوگ ہو کہ اب تک تم نے اپنی معلومات کے بارے میں جھگڑا کیا یا کیا تم وہ جھگڑالو ہو کہ تم اپنی جانی ہوئی باتوں میں جھگڑے۔ خیال رہے کہ یہاں ما سے مراد یا تو نبی کریم ﷺ کی صفات ہیں اور علم سے مراد توریت و انجیل کا علم یا ما سے مراد حضرت موسیٰ

وعیسیٰ علیہما السلام کے حالات ہیں اور علم سے یہود کا ادعائی علم مراد یعنی نبی آخر الزمان ﷺ کے صفات جن کی حقانیت کا علم تمہیں توریت وانجیل سے دیا گیا تم نے اسے بھی کہاں مانا جھگڑتے ہی رہے۔ یا موسیٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام جن کے حالات جاننے کے تم مدعی ہو تم نے ان کے بارے میں جھگڑا ہی کیا۔ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ۔ یہاں مَا سے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے حالات مراد ہیں۔ اور لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ۔ سے ان کی ادعائی علم کی نفی ہے۔ یا توریت و انجیل میں مذکور ہونے کی نفی یعنی تو تم ان کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ جن کے علم کا تمہیں دعویٰ بھی نہیں یا جن کا ذکر توریت وانجیل میں نہیں ہے بے خبر آدمی کا جھگڑا کرنا اس کی انتہائی حماقت کی دلیل ہے۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ يَعْلَمُ اور تَعْلَمُوْنَ کا مفعول پوشیدہ ہے یعنی اللہ ابراہیم علیہ السلام کے حالات ان کے دین ان کی عبادات کو جانتا ہے کہ ان کا خالق ہے۔ تمہیں ان چیزوں کی کوئی خبر نہیں کیونکہ توریت وانجیل میں ان کا ذکر ہی نہیں۔ تو تمہارے واسطے ذریعہ علم کیا رہا۔ ان کی جہالت ظاہر فرما کر اب اسکا فیصلہ کیا جارہا ہے۔ کہ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا۔ خیال رہے کہ اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام سے یہودیت اور نصرانیت کی نام کے لحاظ سے بھی نفی کی گئی اور کام کے لحاظ سے بھی یعنی نہ وہ عقائد میں یہودی وعیسائی تھے اور نہ اعمال میں۔ نہ نام میں اس لئے کہ یہ عقائد یہ اعمال یہ نام ان کے بعد کی پیداوار ہیں کیونکہ یہودی یا تو یہودا کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے یہودی کہلاتے ہیں یا گائے کی پوجا سے توبہ کرنے کی وجہ سے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں نہ یہود پیدا ہوئے تھے۔ نہ توبہ کا یہ واقعہ ہوا تھا۔ ایسے ہی نصرانی یا نصران میں رہنے کی وجہ سے نصرانی کہلائے یا عیسیٰ علیہ السلام کی امداد کرنے کی وجہ سے اور ابراہیم علیہ السلام نہ نصران کے باشندے تھے نہ عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار۔ پھر وہ نصرانی کیسے ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہے کہ وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔ حنیف کی تفسیر سورہ بقر میں قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔ (بقرہ:۱۳۵) کی تفسیر میں گزر گئی۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ عربی میں حنیف کے معنی ہیں جھکنا اور حنف کے معنی ہیں ہٹنا دور ہونا۔ حنیف کے معنی ہیں ہر برائی سے دور اور ہر برے سے دور۔ حضرت ابراہیم برے عقائد' برے اعمال' برے خیالات' برے حالات۔ غرضکہ ہر اندرونی' بیرونی چھوٹی بڑی ذاتی عارضی برائیوں سے دور تھے اور ہر برائی ان سے دور تھی۔ اسی طرح وہ جناب ہر قسم کے برے لوگوں سے دور تھے۔ حتیٰ کہ بروں کے ملک سے بھی ہجرت کر گئے۔ چونکہ عیبوں سے صفائی پہلے ہے۔ خوبیوں سے متصف ہونا بعد میں اس لئے رب تعالیٰ نے پہلے انہیں حنیف فرمایا پھر مسلم۔ مسلم یا بمعنی مسلمان ہے یا بمعنی مطیع فرمانبردار۔ اطاعت وفرمانبرداری چند قسم کی ہوتی ہے۔ جانی اطاعت' مالی اطاعت' وطنی اطاعت اور اولاد کے متعلق اطاعت۔ حضرت ابراہیم نے یہ ہر اطاعت کامل طور پر کی۔ جان نمرودی آگ میں ڈالی۔ بیٹے کو پہلے خشک جنگل میں چھوڑا پھر ذبح کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ رب کے لئے وطن چھوڑا سارا مال اس کے نام پر قربان کردیا۔ اس لئے آپ کو مسلم فرمایا گیا۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام ہر بے دینی سے دور اور برے عقیدے سے نفور اور رب تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار تھے۔ یہاں کان فرما کر بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بچپن میں جوانی میں' بڑھاپے میں وحی سے پہلے اور نزول وحی کے بعد غرضکہ زندگی کے ہر حصہ میں حنیف بھی تھے مسلم بھی اور زندگی کے کسی حصہ میں یہودی' عیسائی' مشرک نہ رہے۔ وہ پیدائشی صاف ستھرے طیب و طاہر تھے۔ حالانکہ ان کا ماحول گندہ تھا مگر خود ستھرے تھے۔ جیسے ہمارے حضور ﷺ سخت گندے ماحول میں رہ کر صاف و

ستھرے رہے اور اس کے ساتھ ہی وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ یا تو یہ عطف تفسیری ہے اور حنیف و مسلم کا بیان۔ اس صورت میں مشرکین سے مراد عیسائی یہودی ہوں گے کیونکہ یہ صلیب وغیرہ کے پجاری ہیں اور عیسیٰ و عزیر علیہما السلام کو خدا کا شریک مانتے ہیں۔ یا علیحدہ مضمون ہے۔ اس صورت میں مشرکین سے کفار عرب مراد ہوں گے یعنی نہ وہ یہودی تھے نہ عیسائی' نہ بت پرست مشرک۔ کیونکہ یہ چیزیں اسلام اور اطاعت کے خلاف ہیں۔ وہ ان سب سے جدا سچے پکے مسلمان تھے۔ لہٰذا تم دونوں جھوٹے ہو۔

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب اسلام کی حقانیت پیغمبر اسلام ﷺ کی صداقت جس کا تمہیں پورا یقین ہے۔ اور جس کی گواہی توریت و انجیل دے رہی ہیں' تم نے اس کا اقرار کیا۔ توریت و انجیل میں رب کی وحدانیت کا اعلان ہے مگر تم نے دو تین خدا مان لئے اور موحدین سے جھگڑتے رہے۔ توریت و انجیل میں اعلان ہے کہ حضرت عیسیٰ و مریم رب کے بندے ہیں۔ تم نے انہیں رب کی بیوی بچے کہا۔ اور مسلمانوں سے جھگڑے بلکہ تم نے خود موسیٰ علیہ السلام سے جھگڑے کئے...... اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مخالفتیں کیں۔ ہمیشہ جھگڑتے ہی رہے۔ تو اب ابراہیم علیہ السلام کے دین اور ان کی ملت کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ نہ اس کا تمہیں علم ہے اور نہ توریت و انجیل میں ان کا ذکر۔ اس کی خبر اللہ ہی کو ہے جو ان کا خالق و مالک ہے۔ تمہیں کیا پتہ' تمہارے علم کا ذریعہ صرف توریت و انجیل تھیں۔ جب وہ ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں خاموش ہیں تو تم کیوں لڑتے مرتے ہو۔ ہم سے سنو کہ ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے' نہ عیسائی' نہ بت پرست۔ وہ ان تمام دینوں سے دور اور ان تمام بیہودگیوں سے نفور اللہ کے سچے فرمانبردار بندے تھے اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ان میں سے ہوتے کیونکہ یہ عقیدے یہ کام ان کے بعد کی پیداوار ہیں۔ الوہیت مسیح و عزیر کا عقیدہ ان کے زمانہ میں کہاں سے آیا۔ صلیب کی پوجا بیت المقدس کی طرف نماز ان کے زمانہ میں کہاں تھی۔ بیت المقدس کی یہ عمارت ان سے بہت بعد تعمیر ہوئی۔ صلیب وغیرہ جب کہاں تھی۔ ایسے ہی یہودی اور نصرانی نام اس زمانے میں تھے ہی نہیں۔ یہودا کے بعد یہودی بنے اور عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار نصرانی کہلائے۔ جب ان کے زمانہ پاک میں نہ یہودا تھے نہ عیسیٰ علیہ السلام تو ان کا یہ نام کہاں سے آیا۔ نیز وہ شرک و بت پرستی مٹانے کے لئے آئے تھے۔ اسی پر نمرود سے مقابلہ کیا۔ اسی بنا پر آگ میں ڈالے گئے پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ خود ہی شرک کرتے۔ لہٰذا تمہارا یہ قول عقل و نقل دونوں کے خلاف ہے۔ خیال رہے کہ اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تین چیزوں کی نفی کی گئی۔ یہودیت' نصرانیت' شرک اور دو چیزیں آپ کے لئے ثابت کی گئیں۔ حنیف ہونا' مسلم ہونا نفی کی تین چیزوں کے لئے دو جگہ ما کان ارشاد ہوا۔ اور مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ میں یا تو مشرکین مکہ کی تردید ہے جو حضرت ابراہیم کو مشرک کہہ کر اپنے کو دین ابراہیمی پر کہتے تھے اور یا خود یہود و نصاریٰ کی تردید ہے یعنی نہ تو ابراہیم اصلی یہودی و عیسائی تھے جن میں توحید تھی اور نہ موجودہ یہودیت و عیسائیت پر تھے۔ جس میں شرک و بت پرستی ہے کہ تم لوگ مشرک ہو چکے۔ وہ جناب مشرکین میں سے نہ تھے۔

لطیفہ: حضرت قبلہ شاہ سیّد محمد صاحب محدث کچھوچھوی دام ظلہم کی ایک شیعہ سے اس پر گفتگو ہوئی کہ سنی اور شیعہ میں کون مذہب پرانا ہے۔ محدث صاحب نے فرمایا کہ پرانا مذہب وہی ہے اس لئے اس کا نام ہے۔ اہل سنت والجماعت۔ جب سے

سنت رسول اللہ اور جماعت مسلمین دنیا میں قائم ہوئی تب ہی سے یہ مذہب آیا۔ تمہارا نام ہے۔ اثنا عشریہ یعنی بارہ امام والے۔ جب بارہ امام ہوئے تو تم بنے۔ اور یقینی بات ہے کہ یہ بارہ امام عرصہ بعد پیدا ہوئے۔ لہٰذا تمہارا دین بھی پیچھے ہے۔ تمہارا نام تمہاری تاریخ کا پتہ دے رہا ہے۔ اسی طرح ہر دین کے نام سے اس کی تاریخ کا پتہ چلا لو۔ عبدالوہاب سے وہابی بنے۔ یعنی ان کی پیداوار بارھویں صدی میں ہے۔ عبداللہ چکڑالوی سے چکڑالوی فرقہ بنا یعنی ان کی پیداوار گیارھویں صدی میں ہے۔ مرزا قادیانی سے قادیانی بنے یعنی ان کی پیداوار تیرھویں صدی میں ہے۔ دیوبندی تو وہابیوں کی ہی دم ہیں۔ انہی کے ساتھی' غرضکہ ہر مذہب کی تاریخ اس کے نام سے معلوم کرو۔ البتہ سنی وہ فرقہ ہے جو سنت رسول اللہ سے بنا۔ خیال رہے کہ حنفی' شافعی' مالکی' عقاید کا نام نہیں فروعی اعمال کا نام ہے۔ یہ سب عقائد میں سنی ہیں۔ فروعی اور اجتہادی اعمال میں حنفی اور شافعی ہیں۔ ایسے ہی چشتی اور قادری وغیرہ عقائد میں سب سنی ہیں۔ روحانی اعمال کے لحاظ سے یہ چشتی اور قادری ہیں۔ خیال رہے کہ سنت کی دستگیری فرائض سے پہلے ہے۔ پیدا ہوتے ہی نال کٹوانا سنت' عقیقہ سنت' ختنہ سنت' تعلیم و تربیت سنت' اور بالغ ہونے کے بعد نماز فرض اس لئے ہمارا نام اہل سنت ہے نہ کہ اہل فرض۔ نیز مرتے ہی فرائض علیحدہ ہو جاتے ہیں مگر سنت مصطفیٰ قبر میں ساتھ جاتی ہے۔ قبر کی گہرائی سنت' کفن کی مقدار سنت بعد دفن فاتحہ سنت' ایصال ثواب سنت۔ لہٰذا ہم پیدائشی سنی ہیں اور مرے بعد بھی سنی۔ اللہ تعالیٰ اس سنت والے کے زیر سایہ رکھے ﷺ۔ غرضکہ ہمارا نام بھی ہماری تاریخ بتا رہا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** رب کی بارگاہ میں وہ بندہ مقبول ہے جو خالص مخلص ہو۔ جس میں برائی کا گھول میل نہ ہو۔ خالص دودھ' خالص گھی' خالص سونا' اچھا ایسے ہی خالص مومن اچھا جس کے دل میں ہر برائی سے دوری اور ہر برے سے نفرت ہو۔ آج ہم مسلمانوں میں بے دینوں سے نفرت نہ رہی۔ ہر ایک کو اپنا بھائی سمجھنے لگے۔ یہ حنیف کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ حنیف و مسلم بنائے۔ **دوسرا فائدہ:** پچھلوں کا اثر اگلوں پر نہیں پڑتا۔ ہاں اگلوں کا پچھلوں پر پڑ جاتا ہے۔ ہم لوگ ابراہیمی ہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام ہم سے پہلے گذرے مگر ابراہیم علیہ السلام یہودی یا عیسائی یا نصرانی نہیں کیونکہ یہ چیزیں ان کے بعد کی ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** حنفیوں کی احادیث بہت کم ضعیف ہو سکتی ہیں کیونکہ احادیث میں ضعف اسناد سے پیدا ہوا۔ اور جس راوی کی شرکت سے وہ حدیث ضعیف ہوئی وہ امام اعظم ابوحنیفہ سے کہیں بعد میں گزرا۔ لہٰذا امام صاحب کے زمانہ میں یہ حدیث صحیح تھی۔ ہمیں ضعیف ہو کر ملی۔ **لطیفہ:** ایک سنی کا کسی وہابی سے قرأت خلف الامام پر مناظرہ ہوا۔ سنی نے کہا کہ حدیث شریف میں ہے۔ قِرَاۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَاۃٌ۔ یعنی امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے۔ وہابی بولا یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی اسناد میں جابر جعفی ہیں جو نا قابل اعتبار شخص تھا۔ سنی نے پوچھا کہ جابر جعفی کب پیدا ہوا۔ کہا ۲۵۰ھ میں سنی نے کہا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں جابر جعفی اپنے والد کی پشت میں بھی نہ آیا ہو گا کیونکہ امام صاحب کی وفات ۱۵۰ھ میں ہے۔ اس وقت یہ حدیث صحیح تھی۔ ہمیں ضعیف ہو کر ملی۔ ہو سکتا ہے کہ جس حدیث کو امام بخاری یا ترمذی ضعیف فرما دیں۔ وہ حضرت امام کے وقت میں صحیح ہو۔ لہٰذا اس کا امام صاحب پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ وہابی خاموش ہو گیا۔ **نوٹ ضروری:** اہل سنت کو یہ قاعدہ خوب یاد رکھنا چاہئے بہت فائدہ مند ہے۔ **چوتھا**

فائدہ: دینی مسائل پر علمی و عقلی دلائل قائم کرنا اور مخالفین کے شبہات کا رد کرنا اشد ضروری اور باعث ثواب ہے۔ جیسا کہ ان آیات میں کیا گیا۔ **پانچواں فائدہ:** بغیر علم مناظرہ و مجادلہ کرنا سخت برا ہے۔ جاہل اگر اتفاقاً حق بھی کہہ جائے تب بھی خطا کار ہے کیونکہ اگر اسے بغیر علم مسائل بیان کرنے کی ہمت ہوگئی تو بارہا غلطی کر کے لوگوں کو گمراہ کرے گا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کو بغیر علم مناظرہ کرنے پر ملامت فرمائی مناظرے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے مقابل کے مذہب سے بخوبی واقف ہو (از احکام القرآن)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب صاحب علم تھے۔ اور ان کے علمی مناظرے درست و جائز تھے کیونکہ رب تعالیٰ نے ان کے متعلق دو باتیں فرمائیں۔ ایک اپنی معلومات پر مناظرہ کرنا' اس پر کوئی ملامت نہ کی۔ دوسرا بغیر علم کج بحثی کرنا۔ اس پر ملامت کرتے ہوئے فرمایا فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ کیا یہ درست ہے؟ **جواب:** اس کے نفیس جوابات تفسیر میں گذر گئے کہ علم سے ان کا ادعائی علم مراد ہے۔ یا وہ چیزیں جو توریت و انجیل میں جن کا ذکر ہے جیسے حضور ﷺ کے اوصاف حمیدہ یا حضرت عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام کے حالات لہٰذا اس سے ان کی تعریف مقصود نہیں بلکہ ان پر ملامت منظور ہے۔ یعنی جن چیزوں کا تمہیں علم دیا گیا تم نے انہیں بھی قبول نہ کیا۔ ان میں بھی کج بحثی کی اس لئے حَاجَجْتُمْ فرمایا گیا۔ کیونکہ جانی پہچانی بات کو نہ مان کر اس پر کج بحثی کرنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام مسلم تھے اور ان کا دین اسلام تھا۔ آیا ان کا دین صرف اصول عقائد میں اسلام کے مطابق تھا یا اصول و فروع سب میں۔ اگر صرف اصول میں تھا تو وہ یہودی و نصرانی بھی تھے کیونکہ اصل عقائد میں سارے پیغمبر یکساں ہیں اور اگر فروع میں بھی اسلام کے موافق تھے تو ظاہر ہے کہ اسلامی نماز میں تلاوت قرآن فرض ہے۔ ان کی نماز میں نہ تھا کیونکہ اس وقت قرآن اترا ہی نہ تھا۔ اسی طرح اسلام میں حدیث پاک کا درس' تلاوت قرآن کی مجالس عبادت بھی اس زمانہ میں نہ تھے پھر ان کے مسلم ہونے کے کیا معنی؟ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب سورۂ بقر قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (بقرہ:۱۳۵) کی تفسیر میں گذر گیا۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ موجودہ یہودیت و عیسائیت اصولاً بھی دین ابراہیمی کے خلاف ہے نہ کہ اصلی دین موسوی و عیسوی۔ لہٰذا ابراہیم علیہ السلام اصولاً مسلمان تھے نہ یہودی و عیسائی۔ کیونکہ وہ نہ الوہیت مسیح کے معتقد تھے نہ صلیب کے پجاری۔ یا یہ کہ ابراہیم علیہ السلام سارے اصول اور اکثر فروع میں اسلام کے موافق تھے۔ جیسا کہ سورہ بقر میں تفصیل وار بیان ہو چکا۔

تفسیر صوفیانہ

علم مفید بھی ہے مضر بھی۔ جس علم سے ہدایت ملے دل میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہو' عبادت کا شوق ہو اس میں تصوف کی چاشنی ہو۔ وہ مفید ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا۔

کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

جس علم سے کج بحثی' ضد' ہٹ دھرمی پیدا ہو لہٰذا جس میں تصوف کی چاشنی نہ ہو وہ سخت نقصان دہ ہے۔ اسی کے بارے میں فرمایا

گیا۔ العلم حجاب اکبر علم بڑا پردہ ہے۔ فرشتوں اور آدم علیہ السلام کا علم مفید تھا۔ اور ابلیس کا علم مضر علم و عقل گویا جنگی ہتھیار ہیں۔ جنگ میں اگر ہتھیار غازی مومن کے پاس ہو تو کافروں کفر کو تباہ کرتا ہے اور اگر وہ ہی ہتھیار کافر کے ہاتھ میں آ جائیں تو مومن و ایمان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ ہتھیار ایک ہے مگر استعمال کرنے والے دو۔ یوں ہی علم و عقل اگر دل و روح کے قبضہ میں رہیں تو ان سے نفس و نفسانیات شکار کئے جاتے ہیں اور اگر خدا نہ کرے نفس و شیطان کے قبضہ میں آ جائیں تو یہ ایمان کا صفایا کر دیتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے علم و عقل ان کے نفس کے قبضہ میں تھے۔ اس لئے ان سے ایسی حرکات سرزد ہوئیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر ؎

عقل زیر حکم دل یزدانی است ‏ ‏ چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

بلکہ جہالت بھی دو طرح کی ہے۔ مفید اور مضر جو جہالت علماء و صلحاء و اولیاء اللہ سے تعلق پیدا کر دے وہ مفید ہے۔ ناواقف علم حاصل کرنے علماء کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی صحبت سے فیض لیا۔ گویا اسے یہاں تک لانے والی چیز اس کی جہالت ہے۔ یہ اس علم سے بہتر ہے جو عالم میں تکبر پیدا کر کے اسے صالحین کی مجلس سے دور رکھے۔

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

اور جس جہالت کے ساتھ ہٹ دھرمی، کج بحثی ہو وہ سخت خطرناک ہے۔ غرضکہ جس پر رب تعالیٰ کا فضل ہو اس کے لئے علم فائدہ مند ہے اور بے علمی بھی مگر جس پر غضب ہو اس کے لئے دونوں چیزیں بلا۔ اس آیت میں انہی مردودین بارگاہ اہل کتاب کا ذکر ہے جن کے لئے علم وبال اور جہالت باعث نکال تھی۔ فرمایا حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُم بِهِ عِلْمٌ۔ یہ ان کے علم کے نقصان کا بیان ہوا۔ اور فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ۔ میں ان کی جہالت کے عذاب ہونے کا تذکرہ ہے کہ وہ عشق الٰہی کی چاشنی اور تصوف کی لذت سے بے خبر تھے۔ کبھی بے خبری خبرداری سے بہتر ہے۔ نیز اتباع نفس گویا یہودیت ہے اور اتباع رسم و رواج شرک خفی اور مطابقت شیطان گویا نصرانیت ہے ان سب سے علیحدہ ہو کر اطاعت خالق دو جہاں گویا اسلام ہے تو فرمایا جا رہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نہ نفسانی راستہ میں تھے نہ شیطانی و طغیانی خیالات پر نہ مراسم کے پابند بلکہ وہ خاص رب تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ اسی لئے انہوں نے کوئی کام نفس کے لئے کیا ہی نہیں جو کچھ کیا رب تعالیٰ کے لئے کیا۔ صوفیاء کے نزدیک جنت و حور و قصور کے لئے عبادت کرنا بھی اتباع نفس کا شائبہ ہے۔ اگر حق تعالیٰ دوزخ و جنت نہ بناتا تو کیا اس کی عبادت نہ ہوتی ضرور ہوتی۔ لہٰذا کامل وہ ہی ہے جو خاص رب کے لئے عبادت کر کے حنیفاً مسلماً کا مصداق ہو۔

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ

تحقیق زیادہ قریب لوگوں میں ساتھ ابراہیم کے البتہ وہ ہیں جنہوں نے پیروی کی انکی اور یہ نبی اور وہ جو

بے شک سب لوگوں سے ابراہیم کے زیادہ حقدار وہ تھے جو ان کے پیرو ہوئے اور یہ نبی اور

آمَنُوا ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٦٨﴾ وَدَّت طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ

ایمان لائے اور اللہ مددگار ہے مسلمانوں کا تمنا کی ایک گروہ نے

ایمان والے اور ایمان والوں کا والی اللہ ہے کتابیوں کا ایک گروہ
الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶۹
کتاب والوں میں سے کاش گمراہ کردیں وہ تم کو اور نہیں گمراہ کرتے وہ مگر جانوں اپنی کو اور نہیں شعور رکھتے
دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں گمراہ کردیں اور وہ اپنے ہی آپ کو گمراہ کرتے ہیں اور انہیں شعور نہیں

تعلق

ان آیتوں کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا تعین کیا گیا کہ ان کا دین کیا تھا۔ اب ان کے متعین کا تقرر فرمایا جارہا ہے کہ ان کے دین پر کون ہے؟ **دوسرا تعلق:** یہود کے دو دعوے تھے ایک یہ کہ ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے۔ دوسرا یہ کہ ہم لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار ہیں پچھلی آیتوں میں ان کے پہلے دعویٰ کی تردید تھی اور اب ان کے دوسرے دعویٰ کا رد فرمایا جارہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں بتایا گیا کہ یہودی ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ حق قبول کرنے والے نہیں۔ اب بتایا جارہا ہے کہ وہ خود تو ایمان کیا لاتے تمہیں ایمان سے پھیرنے کی کوشش میں ہیں گویا پہلے ان کی گمراہی کا ذکر تھا۔ اب گمراہ گری کا کہ ان کی بیماری متعدی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں یہودیت و نصرانیت کے نام اور ان کے عقائد سے ثابت فرمایا گیا کہ ابراہیم اس دین پر نہیں ہوسکتے کہ ان کے زمانہ میں نہ یہ نام تھے' نہ یہ عقائد۔ اب اس کا ثبوت کام سے دیا جارہا ہے کہ جس کے یہ کام ہوں وہ ابراہیمی ہے ورنہ نہیں اور چونکہ اہل کتاب کے یہ کام نہیں۔ اس لئے وہ ابراہیمی نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہود و عیسائیوں کا کبھی تو یہ کہنا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے اور کبھی کہتے تھے کہ ہم لوگ حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں ان کی اولاد ہیں۔ ہماری جماعت بنی اسرائیل میں ہزارہا انبیاء کرام ہوئے۔ تم بنی اسمٰعیل میں کوئی نبی نہیں ہوا۔ سوائے اسمٰعیل علیہ السلام کے زیادہ نبیوں والا دین بھی افضل' اور زیادہ نبیوں والی قوم بھی بہتر' پہلے کلام کا جواب تو پچھلی آیات میں دیا گیا تھا۔ دوسری گفتگو کا جواب اب دیا جارہا ہے۔ بہرحال یہ آیت کریمہ پچھلی آیات سے پورا پورا تعلق رکھتی ہے۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیات میں اشارۃً اہل کتاب کی ضد اور ہٹ دھرمی کا ذکر تھا کہ یہ اپنی گمراہی میں بڑے پکے ہیں۔ اب ان کی گمراہ گری کا ذکر ہے کہ خود تو ایمان کیا قبول کرتے یہ تو اے جماعت صحابہ تمہیں بہکانے کی کوشش کررہے ہیں۔ ایسے گمراہ گروں کی اصلاح کی امید کیا ہوسکتی ہے۔

شانِ نزول

(۱) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار سرداران یہود نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ اے محمد (ﷺ) آپ جانتے ہیں کہ ہمیں ابراہیم علیہ السلام سے نہایت قرب ہے کیونکہ وہ بھی یہودی تھے۔ ہم بھی یہودی آپ محض حسد سے انکار کرتے ہیں۔ اس پر پہلی آیت اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ الخ نازل ہوئی (روح المعانی)

(۲) کلبی نے عبداللہ ابن عباس اور محمد بن اسحٰق نے ابن شہاب سے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) روایت کی کہ جب بعض مسلمان کفار

مکہ کی تکالیف سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے جن میں حضرت جعفر ابن ابی طالب بھی تھے اور نبی کریم ﷺ نے مدینہ پاک کی طرف ہجرت فرمائی تو کفار قریش کو سخت صدمہ ہوا کہ مسلمانوں کو دنیا میں امن وسکون کیوں مل گیا' چنانچہ انہوں نے کمیٹی کی جس میں پاس ہوا کہ بادشاہ حبشہ نجاشی کو مہاجر مسلمانوں کی طرف سے بھڑکایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے عمرو ابن عاص اور عمارہ ابن ابی معیط کو بہت تحفے تحائف دے کر شاہ حبشہ کی خدمت میں بھیجا۔ ان دونوں نے وہ تحائف شاہی دربار میں پیش کر کے کہا کہ ہماری قوم آپ کی خیر خواہ ہے۔ از راہ خیر خواہی آپ کو خبر دیتی ہے کہ کچھ فسادی لوگ ہمارے ملک میں فتنہ پھیلا کر حبشہ میں آ بسے ہیں۔ اگر یہ حبشہ میں رہے تو ایسا فتنہ پھیلائیں گے کہ آپ کو انتظام کرنا مشکل ہوگا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ آپ پیش بندی کرتے ہوئے انہیں ہمارے حوالہ کر دیں تا کہ ہم انہیں قتل کر کے دنیا کو ان کے فتنہ سے محفوظ کر دیں۔ یہ لوگ بڑے متکبر سخت فسادی ہیں۔ اگر آپ کو ہمارا یقین نہ ہو تو انہیں بلا کر دیکھ لیں۔ یہ کبھی بھی آپ کو سجدہ نہ کریں گے۔ اگر یہ آپ کو سجدہ کر لیں تو ہم جھوٹے ورنہ سچے ہیں۔ نجاشی نے ان بے یار و مددگار مہاجرین کو اپنے دربار میں بلایا۔ یہ حضرات حاضر ہوئے۔ دروازے پر آ کر حضرت جعفر نے آواز دی کہ حزب اللہ یعنی اللہ کی جماعت آ رہی ہے۔ کیا اجازت ہے۔ نجاشی کے منہ سے نکلا ہاں اللہ کی امن میں آ جائے۔ جب یہ لوگ آئے تو نجاشی نے ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ تم نے مجھے سجدہ کیوں نہ کیا اور میرے دربار کی توہین کیوں کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ہمارے سر خالق کے سوا کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔ ہم اسی کو سجدہ کرتے ہیں جس نے تجھے صاحب تخت و تاج کیا اور تجھے یہ دربار دیا۔ نجاشی نے پوچھا تمہارا سردار کون ہے۔ انہوں نے حضرت جعفر کی طرف اشارہ کیا۔ نجاشی نے کہا کہ قریش مکہ نے آپ کی یہ شکایات بھیجی ہیں۔ آپ کے پاس کیا جواب ہے۔ آپ نے فرمایا اے بادشاہ ان مکہ والوں سے پوچھیئے کہ ہم غلام ہیں یا آزاد۔ اگر ہم بھگوڑے غلام ہوں تو واقعی مجرم ہیں۔ مکہ والے بولے کہ یہ لوگ آزاد ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا ہم خون کر کے بھاگے ہیں۔ وہ بولے نہیں۔ آپ نے فرمایا پھر ہمارا جرم کیا ہے۔ اے بادشاہ ہم مجرم عشق ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ اللہ واحد قہار کے عابد ہیں اور شرک و بت پرستی سے نفرت کرتے ہیں۔ نجاشی نے پوچھا کہ تمہارا دین کیا ہے۔ آپ نے اسلام کے ارکان اور حضور ﷺ کی تعلیمات کا ذکر فرمایا نجاشی نے کہا کہ ہمیں اپنا قرآن سناؤ۔ آپ نے سورۂ عنکبوت' سورۂ روم اور سورۂ کہف سنائی۔ نجاشی کے آنسو جاری ہو گئے۔ عمرو ابن عاص نے جب یہ رنگ دیکھا تو نجاشی کو بھڑکانے کے لئے کہا کہ اے بادشاہ یہ لوگ تمہارے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام اور مریم کو گالیاں دیتے ہیں۔ نجاشی نے حضرت جعفر سے پوچھا۔ آپ نے اس کے جواب میں سورۂ مریم شروع کر دی۔ جب حضرت مریم و عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا تو تمام مجلس پر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ سبحان اللہ خدا کا کلام اور صحابی رسول اللہ ﷺ کی زبان۔ نجاشی بہت روئے اور کہا کہ رب کی قسم حضرت مسیح علیہ السلام کی بھی یہ ہی تعلیم تھی پھر کہا کہ تم لوگوں کو میرے ملک میں امن ہے تم لوگ ابراہیمی ہو۔ تمہارے ساتھ برکت و یمن ہے۔ یہ کہہ کر عمرو بن عاص کے ہدیئے واپس کر دیئے اور مسلمانوں کے لئے عام امن کا اعلان کر دیا۔ ادھر حبشہ میں یہ ماجرا ہوا۔ ادھر مدینہ منورہ میں یہ آیت اتری جس میں حضرت جعفر کی تصدیق کی گئی (تفسیر خازن و روح المعانی) اللہ تعالیٰ نے نجاشی بادشاہ کو ایسی عزت دی کہ یہ مسلمان ہوئے اور انہوں نے اسلام کی بڑی خدمات کیں اور بعد وفات رب تعالیٰ نے ان کی ایسی عزت افزائی کی کہ حضور ﷺ نے ان کی نماز جنازہ

غائبانہ ادا کی کہ حضرت جبریل امین نے ان کی نعش شریف حضور انور ﷺ کے سامنے پیش کی اور آپ نے نماز جنازہ ادا کی ان کے سوا حضور انور ﷺ نے کسی کی نماز جنازہ غائبانہ ادا نہ فرمائی اور نہ کسی صحابی نے کسی کا جنازہ غائبانہ پڑھا۔ حتیٰ کہ خود حضور ﷺ کا بھی نماز جنازہ غائبانہ کسی صحابی نے ادا نہ کی۔ حالانکہ اس وقت بہت صحابہ کرام مدینہ منورہ سے دور تھے۔ اس لئے مولانا خسرو نے فرمایا شعر ۔

کششے کہ عشق دارد نہ گذاردت بزیں سان ۔ بہ جنازہ گر نہ آئی بہ مزار خواہی آمد

دوسری آیت: وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ کا شان نزول یہ ہے کہ ایک بار سرداران یہود نے حضرت عمار و حذیفہ و معاذ ابن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر ڈورے ڈالے اور انہیں یہودی بن جانے کی رغبت دی۔ تب آیت وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ الخ نازل ہوئی جس میں اہل کتاب کو مایوس کیا گیا۔ (تفسیر کبیر و معانی وغیرہ)

تفسیر

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ۔ چونکہ اس مضمون کے سارے اہل کتاب سخت منکر تھے اس لئے اسے اِنَّ اور لام تاکید سے مؤکد کیا۔ اَولیٰ ولی سے مشتق ہے بمعنی قرب اور استحقاق یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یہ باب ضرب کا اسم تفضیل ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہوئے قریب ترین یا زیادہ حقدار۔ کہا جاتا ہے فُلَانٌ اَوْلٰى بِكَذَا يَعْنِىْ اَجْدَرُ۔ (روح المعانی) بعض نے اس کے معنی اخص بھی کئے ہیں اگر اولیٰ بمعنی قرب ہو تو قرب سے مراد یا تو قرب مکانی ہے یا قرب روحانی و دلی۔ یعنی قیامت میں حضرت ابراہیم سے قرب ترین یہ لوگ ہوں گے کیونکہ قیامت میں ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس کی محبت دنیا میں رکھتا تھا۔ یا دنیا میں حضرت ابراہیم سے قریب جنانی و ایمانی رکھنے والے یہ لوگ ہیں نہ کہ یہود و عیسائی و مشرکین کہ یہ تینوں دین ہیں۔ ان سے علیحدہ ہو گئے یا حضرت ابراہیم کے دعویٰ دار مستحق یہ لوگ ہیں نہ کہ یہود و عیسائی وغیرہ۔ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا سے ابراہیم علیہ السلام کے ہم زمانہ متبعین مراد ہیں۔ اس کلمہ میں عجیب راز ہے فرمایا جا رہا ہے کہ کوفہ والے جو کہ حضرت ابراہیم کے ہم وطن ہم قوم بلکہ عزیز و اہل قرابۃ بھی تھے مگر وہ آپ کے اقرب نہ ہوں کیونکہ آپ کے متبع نہ تھے۔ اور اہل شام جو نہ آپ کے ہم وطن تھے نہ ہم قوم نہ عزیز مگر متبع تھے وہ آپ سے اقرب ہوئے تو اے یہود و نصاریٰ تم صرف اولاد ابراہیم ہو کر ان سے اقرب کیسے ہو سکتے ہو جبکہ تم دین اعمال سب ہی میں ان کے خلاف ہو۔ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ یہ الَّذِيْنَ پر معطوف ہے اور تخصیص کے بعد تعمیم۔ ھذا سے حضور ﷺ کی طرف اشارہ ہے۔ اٰمنوا کا متعلق پوشیدہ ہے۔ یعنی اٰمنوا باللہ یا بمحمد ﷺ۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام سے بہت قرب رکھنے والے یا ان کے زیادہ حقدار یا ان کے خاص لوگ وہ ہیں جو ان کے زمانہ میں ان کے دین پر تھے اور اب یہ پیغمبر اور ان کے متبعین ہیں خیال رہے کہ هٰذَا النَّبِىُّ کو اتَّبَعُوْا سے علیحدہ کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہ پیغمبر حقیقی معنی میں ابراہیم علیہ السلام کے تابعدار نہیں موافقت اور اتباع میں فرق ہے۔ نیز آئندہ وَالَّذِيْنَ اٰمنوا فرما کر اشارۃً بتایا گیا کہ نبی عام مومنین میں داخل نہیں۔ وہ خصوصی شان کے مالک ہیں کہ عام مومنوں کا ایمان سنا ہوا ہے اور نبی ﷺ کا ایمان دیکھا ہوا عام مومن ایمان لینے والے ہیں اور نبی ﷺ ایمان دینے والے۔ لہٰذا یاایُّھا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ کے خطاب میں حضور داخل نہیں ہوا کرتے۔ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ وَلِىٌّ ولایۃ سے

بنا۔ ضرب یضرب کا صفت مشبہ ہے بمعنی والی و مددگار محافظ یہاں وَلِیُّھُمْ نہ فرمایا بلکہ مومنین کہا تا کہ معلوم ہو کہ سبب ولایت ایمان ہے۔ یعنی اللہ مسلمانوں کا والی ناصر و محافظ ہے۔ انکا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ابھی ارشاد ہوا کہ اللہ مومنوں کا والی وارث اور مددگار ہے۔ اب اس کی تائید میں ارشاد ہو رہا ہے کہ تمام اہل کتاب تمہیں گمراہ کرنا چاہیں گے مگر نہ کر سکیں گے کیونکہ اللہ تمہارا والی وارث ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یُضِلُّوْنَکُمْ۔ وَدَّتْ وَدّ سے بنا بمعنی دلی خواہش۔ محبت اور مودت قریباً ہم معنی ہیں مگر اکثر محبت مودت سے عام ہوتی ہے کہ محبت کو مطلقاً دل کے میلان و خواہش کو کہتے ہیں مگر مودت وہ خواہش کے جس کے حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جائے تو مودت میں دلی میلان کے ساتھ بدنی کوشش بھی ہوتی ہے۔ چونکہ اہل کتاب کی یہ خواہش ہی نہیں کہ مسلمان گمراہ ہوں بلکہ کوشش بھی ہے۔ اس لئے وَدَّتْ کا ذکر فرمایا۔ طائفہ طوف سے بنا بمعنی گھومنا۔ اسی سے طواف ہے۔ جب یہ لفظ انسانوں پر بولا جائے تو اس سے ایک جماعت مراد ہوتی ہے اور کسی چیز کے ٹکڑے اور حصے کو بھی اس کا طائفہ کہہ دیا جاتا ہے جیسے طائفہ اللیل۔ مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے کیونکہ یہ بہکانا ان کے ضدی احبار اور علماء کا کام تھا نہ کہ سب کا۔ ظاہر یہ ہے کہ اہل کتاب سے صرف یہودی مراد ہیں جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوا اور ممکن ہے کہ عیسائی بھی اس میں داخل ہوں۔ لَوْ۔ ان مصدریہ کے معنی میں ہے۔ اور یُضِلُّوْنَ مصدر بن کر وَدَّتْ کا مفعول۔ بعض نے کہا کہ لَوْ شرطیہ ہی ہے مگر وَدَّتْ کا مفعول اور لَوْ کی جزا پوشیدہ ہے اصل عبارت یہ تھی۔ وَدَّتْ اَضْلَالَکُمْ لَوْ یُضِلُّوْنَکُمْ لَسُرُّوْا بِذٰلِکَ (روح المعانی) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یہ لَوْ تمنا کا ہے بمعنی کاش کہ اور وَدَّتْ کا مفعول جیسے یَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ۔ (بقرہ:۹۶) یہ ہی قوی ہے۔ کم سے مراد یا سارے صحابہ کرام ہیں یا صرف حضرت معاذ و عمار و حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جنہیں یہود نے بہکانا چاہا تھا۔ یعنی اہل کتاب کی ایک جماعت دلی خواہش رکھتی ہے کہ وہ تمہیں کسی طرح گمراہ کر دیں اور ہو سکتا ہے کہ کم میں خطاب تا قیامت مسلمانوں سے ہو۔ جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ۔ میں ہے۔ اس صورت میں یُضِلُّوْنَ یعنی بہکانے سے مراد ہے۔ دنیا سے قرآن و اسلامی تعلیم کو غائب و ضائع کر دیں۔ جس سے تمہارے پاس ہدایت کا سامان نہ رہے یا تم کو قرآن و اسلام سے بیگانہ کر دیں کہ تم مسلمان کہلا کر بھی مسلمان نہ رہو یا تمہارے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا کر دیں کہ تم اسلام سے متنفر ہو جاؤ پھر کسی کو نوکری کا لالچ دے کر کسی کو روٹی، عورت کے جال میں پھانس کر عیسائی بنالیں۔ یہ تینوں قسم کی کوشش عیسائی ہمیشہ سے کر رہے ہیں۔ کالج، سکول، ہسپتال اسی مقصد کے لئے ہیں چونکہ یہ کوششیں یقینی ہیں اس لئے وَدَّتْ ماضی ارشاد ہوا۔ گمراہ کرنے سے مراد یا تو عیسائی بنالینا ہے یا کم از کم اسلام سے بیگانہ کر دینا مگر انہیں اطمینان رکھنا چاہئے کہ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ۔ ظاہر یہ ہے کہ واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ طائفہ کا حال۔ یُضِلُّوْنَ اضلال سے بنا بمعنی گمراہ کرنا یہاں یا ہلاک کرنا مراد ہے یا اپنی گمراہی بڑھانا۔ یا اپنے عذاب میں ترقی کرنا کہ اب تک فقط گمراہ تھے اب گمراہ گر ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَھُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِھِمْ۔ (عنکبوت:۱۳) یا یہ سزا ملے گی۔ لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَھُمْ کَامِلَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (النحل:۲۵) یعنی قیامت میں اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کا بھی جنہیں انہوں نے گمراہ کیا یہ توجیہیں اس لئے کی گئیں کہ وہ گمراہ تو پہلے ہی سے تھے یا اپنے کو دھوکا دینا مراد ہے کہ یہ بیوقوف اپنے کو

دھوکا دے رہے ہیں۔ نہ ان کے مٹائے قرآن شریف مٹے نہ سارے مسلمان بہکیں نہ اسلام ختم ہو۔ یعنی یہ یہود اپنی حرکتوں سے اپنی گمراہی میں ترقی دے رہے ہیں اور اپنی ہی جانوں کو ہلاک کر رہے ہیں لیکن بے وقوف ہیں۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ یہ شعور سے بنا جس کی نفیس تحقیق پارہ سیقول میں ہو چکی۔ یعنی انہیں اس کا شعور نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب تم اتباع ابراہیمی کا غلط دعویٰ کیوں کرتے ہو۔ ان سے قرب رکھنے والے وہ لوگ تھے جو اس سے پہلے ان کے مطیع و فرمانبردار رہے اور اب یہ نبی اور ان کے امتی ہیں کہ ان کے عقائد بعینہ عقائد ابراہیمی ہیں اور ان کے مخصوص عمل جیسے ناخن کٹانا' مونچھیں کتروانا اور داڑھی کا حد اعتدال میں رکھنا نہ مشت سے زیادہ نہ اس سے کم' حج کرنا خانہ کعبہ کا طواف' ختنہ' قربانی' روزے وغیرہ انہیں کے دین میں ہیں۔ تمہارے دین میں نہیں۔ لہٰذا ان کے کام سے ان کے حال کا پتہ لگاؤ۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ اللہ ان کا والی وارث ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کفار میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود آخر کار ان پر غالب رہے۔ ایسے ہی یہ بھی صدہا دشمنوں میں گھر کر بھی غالب رہیں گے۔ اے مسلمانو تم ان اہل کتاب کے ایمان کی امید نہ رکھو۔ ان کی گمراہی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ ان میں کا ایک گروہ تمہیں بہکا کر گمراہ کردینے کا خواہشمند ہے جو فرقہ گمراہ اور گمراہ گر ہو اس کے ایمان کی کیا امید مگر اہل کتاب اطمینان رکھیں وہ تم میں کسی کو نہیں بہکا سکتے۔ اپنی ہی گمراہی میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنی ہی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں مگر ایسے اندھے ہیں کہ انہیں اس کا شعور نہیں۔

ضروری نوٹ: حرقل بادشاہ نے دعوت اسلام پہنچنے سے پہلے خواب اور نجومی سے حساب سے پتہ لگایا تھا کہ میرے ملک پر ایک ختنہ کرانے والی جماعت قبضہ کرے گی۔ اس نے اپنے وزیر ناطور کو بلا کر یہ ماجرا سنایا اور کہا کہ بتاؤ اس زمانہ میں ختنہ والی قوم کون ہے۔ وہ بولا کہ صرف یہود ہی ختنہ کرتے ہیں۔ ان سے ہمیں کوئی کھٹکا نہیں۔ اپنے مملکت کے حکام کو لکھ کر بھیجو۔ جہاں کہیں یہود ہوں قتل کر دیئے جائیں۔ یہ ہی مشورے ہو رہے تھے کہ شاہ غسان نے حرقل کے پاس ایک قاصد کے ذریعہ حضور (علیہ السلام) کی خبر بھیجی۔ حرقل نے فوراً حکم دیا کہ تحقیقات کرو وہ ختنہ بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ اس کے محققین نے خبر دی کہ ہاں ختنہ کرتے ہیں۔ حرقل بولا بس میرے ملک پر انہیں کا قبضہ ہوگا۔ پھر حرقل نے اپنے دوست کو خط لکھا جو رومیہ میں تھا کہ میرا یہ خیال ہے۔ تیری کیا رائے ہے اور خود حمص چلا گیا۔ اسے حمص پہنچ کر جواب ملا کہ تیرا خیال صحیح ہے وہ سچے نبی ہیں۔ تب حرقل نے رومیوں کو جمع کر کے کہا کہ اگر تم اپنے ملک کی بقا چاہتے ہو تو اس نبی سے بیعت کر لو اور مسلمان ہو جاؤ۔ جس پر وہ سب بھڑک گئے۔ حرقل سلطنت کے خوف سے ایمان قبول نہ کر سکا۔ (بخاری شریف) اس روایت سے پتہ چلا کہ مسلمانوں کے اعمال ان کے حال کا پتہ ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** پیغمبر کا قرب ان کی اتباع سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ محض ان کی اولاد ہونے سے۔ دیکھو بعض اہل کتاب ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور بعض مومن ان کی اولاد میں نہیں مگر قرآن کریم نے ان کے متبعین اور اہل ایمان کو ان کا قریبی قرار دیا۔ لہٰذا کفار نفس سید نہیں۔ اگرچہ سیدنا علی مرتضیٰ کی نسل میں ہوں۔

دوسرا فائدہ: مسلمانوں کے لئے ان کا ایمان کامیابی کا ذریعہ ہے نہ کہ دنیوی سازو سامان جیسا کہ اَللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ سے ثابت ہوا۔ لہٰذا چاہئے کہ ہم ترقی حاصل کرنے کے لئے اپنے عقائد کی درستی اور اعمال کی اصلاح کریں۔
تیسرا فائدہ: صحابہ کرام گمراہ نہ تھے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے ان کے ورغلانے والوں کو ان کی گمراہی سے مایوس کر دیا۔
چوتھا فائدہ: جو صحابہ کرام کو گمراہ کرنا چاہے یا انہیں گمراہ کہے وہ خود گمراہ ہے جیسا کہ وَمَا یُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ۔ سے معلوم ہوا اور کیوں نہ ہو جس تھیلے پر سرکاری مہر لگ جائے وہ چوری سے محفوظ ہوتا ہے۔ جس قلب پر نگاہِ مصطفیٰ ﷺ کی مہر لگ گئی ہو۔ اس میں سے دولت ایمان کون نکالے ؎

دل پہ کندہ ہو تیرا نام کہ وہ دزد رجیم ۔۔۔ الٹے ہی پاؤں پھرے دیکھ کے طغرا تیرا

پانچواں فائدہ: جسمانی قرب تو مکانی' زمانی یا رشتہ داری قرب سے حاصل ہوتا ہے مگر روحانی قرب ان تمام سے بے نیاز ہے وہ صرف اتباع سے میسر ہوتا ہے۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام کے ہم زمانہ اور ہم وطن ان سے قریب نہ ہوئے مگر تا قیامت مومنین ان سے قریب ہیں۔ اگرچہ زمان و مکان میں ان سے بہت دور۔ **چھٹا فائدہ:** اعمال براہِ راست نجات کا ذریعہ نہیں ورنہ شیطان نجات پاتا کہ وہ بڑا عابد تھا بلکہ اعمال صالحہ قرب پیغمبر کا ذریعہ ہیں اور قرب پیغمبر قرب خدا تعالیٰ کا وسیلہ اور قرب خدا رحمت و مغفرت کا ذریعہ ہے۔ دیکھو آیۃ میں اِتَّبَعُوْا کو اَوْلَی النَّاس۔ ہونے کا ذریعہ بتایا گیا اور اَوْلَی النَّاس کے بعد فرمایا وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ قرب رسول رب کی بڑی نعمت ہے جسے میسر ہو۔ **ساتواں فائدہ:** کفار ہمیشہ مسلمانوں کی تاک میں رہتے ہیں اور انہیں گمراہ کرنے کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ سے معلوم ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں تین ہستیوں کو ابراہیم علیہ السلام سے قریب تر بتایا گیا۔ ایک ان کے متبعین۔ دوسرا یہ کہ پیغمبر تیسرے مومنین۔ یہ تین جماعتیں اِتَّبَعُوْا یا آمنوا میں آ جائیں۔ صرف امنو کہنا کافی تھا **جواب:** اتبعوا سے وہ لوگ مراد ہیں جو بلا واسطہ ابراہیم علیہ السلام کے پیرو کار تھے۔ اور حضور ﷺ ان کے موافق ہیں نہ کہ ان کے مطیع اور مسلمان بواسطہ حضور علیہ السلام کے دین ابراہیمی کے متبع۔ چونکہ اتباع کی تین نوعیتیں تھیں۔ اس لئے تین عبارتیں فرمائی گئیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتباع سے عام معنی مراد ہوں اور نبی و مومن کا ذکر خصوصیت کے لئے ہو جیسا کہ ہم نے تفسیر میں اشارہ کر دیا۔ **دوسرا اعتراض:** اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں نبی داخل ہیں اس لئے عام احکام انبیاء پر بھی جاری ہوتے ہیں۔ جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ میں پیغمبر داخل ہیں پھر نبی کا ذکر علیحدہ کیوں فرمایا گیا؟ **جواب:** لفظ مومن میں نبی داخل ہیں اور لفظ ایمان دونوں پر صادق' مگر حقیقت ایمان میں بڑا فرق ہے۔ حضور علیہ السلام کے ایمان کی حقیقت ہی اور ہے۔ ہمارے ایمان کی حقیقت کچھ اور۔ جس کی پوری تحقیق ہم شرح پارہ الم میں کر چکے۔ اسی لئے نبی کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔ **تیسرا اعتراض:** یہاں وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ کیوں کہا گیا۔ سارے ہی اہل کتاب مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں؟ **جواب** اس لئے کہ اہل کتاب کے تین گروہ تھے۔ ایک علمائے حقانی جو حضور علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ دوسرے جاہل اہل کتاب جن میں گمراہ کرنے کی لیاقت نہ تھی۔ تیسرے ان کے علماء سوء جو حسد و بغض کے باعث ان تمام شرارتوں پر تلے رہتے تھے۔ یہاں انہی کا ذکر ہے۔ وہ

ہی یہ حرکتیں کرتے تھے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا کہ اہل کتاب نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے نفسوں کو وہ تو پہلے ہی سے گمراہ تھے پھر گمراہ ہونے کے کیا معنی؟ تحصیل حاصل ناممکن ہے۔ **جواب:** اس کے چند جواب تفسیر میں گذر گئے کہ یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ہی گمراہ رہیں گے یا یہ کہ وہ اس کوشش میں اپنی جانیں ہلاک کریں گے مگر صحابہ کرام کو بہکا نہ سکیں گے یا یہ کہ اپنے آپ کو گمراہ گر بنالیں گے یا یہ کہ موجودہ گمراہی سے بڑھ کر گمراہی اختیار کریں گے۔

تفسیر صوفیانہ

جسمانی قرب یا مکانی ہوتا ہے یا زمانی مگر روحانی قرب مکان و زمان سے آزاد ہے۔ وہاں اتباع و اطاعت کا لحاظ ہے۔ مسلمان اگرچہ ابراہیم علیہ السلام سے زمانہ میں بھی دور ہیں اور جگہ میں بھی مگر چونکہ ان کے متبع ہیں۔ لہٰذا قریب ہیں۔ نمرود و دیگر کفار اگرچہ زمانہ اور جگہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قریب تھے مگر ان سے بہت دور تھے۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام سے قرب رکھنے والے ان کے پیروکار ہیں۔ خواہ اس زمانہ کے مومنین ہوں یا اس وقت کے۔ نیز وارثت مال جسمانی رشتہ سے ملتی ہے مگر وارثت کمال روحانی رشتہ سے' ناخلف اولاد اگرچہ مال کی وارث ہو جائے مگر کمال کی وارث نہیں۔ لائق شاگرد اگرچہ مال کی میراث نہ پائے گا مگر کمال میں شیخ کا جانشین ہوگا۔ اسی لئے یہاں ارشاد ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ حقدار مومنین نہ کہ ان کی ناخلف اولاد جیسا کہ کفر وغیرہ مالی میراث سے محروم کرنے والے اسباب ہیں۔ ایسے ہی روحانی دوری کمالی میراث کا مانع۔ نیز کفر تاریکی ہے اور ایمان روشنی جیسا کہ تاریکی ہمیشہ نور کو بجھانے کی فکر میں ہے۔ ایسا ہی کفار ہمیشہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی فکر میں لیکن اگر مسلمانوں کو شمع جمال مصطفوی سے تعلق رہا تو یہودیت' نصرانیت' شرک و بت پرستی کی تمام تاریکیاں ناکام رہیں گی اور وہ خود گم ہو کر رہ جائیں گی مگر ہاں اس آفتاب نبوت سے وابستگی چاہیے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن ہم کو حضور ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دولت خانہ میں جمع فرمایا۔ پھر ہم کو دیکھ کر حضور علیہ السلام کے چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور فرمایا کہ فراق کی گھڑی سر پر کھڑی ہے اور اب ہمیں بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونا ہے۔ اللہ تمہیں خوش و خرم رکھے اور تم پر رحمت فرمائے۔ میں تم سب کو تقویٰ و پرہیزگاری کی وصیت کرتا ہوں۔ بعد وفات ہم کو ہمارے اہل بیت غسل دیں۔ اور یمانی حلہ میں کفن دیا جائے' تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر ایک ساعت کے لئے ہمارے پاس سے سب علیحدہ ہو جانا۔ ہم پر اولاً جبریل پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر ملک الموت نماز پڑھیں گے۔ پھر مسلمان فوج در فوج نماز ادا کریں گے۔ یہ سن کر سب لوگ رو کر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ (ﷺ) حضور ہمارے رب کے رسول اور ہماری انجمن کی شمع اور ہمارے دین کے سلطان ہیں اب ہم کس کی طرف رجوع کیا کریں گے۔ فرمایا کہ ہم نے تم میں دو واعظ چھوڑے ہیں۔ ایک خاموش دوسرا بولتا ہوا۔ خاموش واعظ موت ہے۔ ناطق واعظ قرآن۔ اپنی ہر مشکل میں قرآن کی طرف رجوع کرو۔ اور جب تمہارے قلب میں سختی پیدا ہو تو موت کو یاد کرو۔ یہ چیزیں تمہیں راہ حق پر قائم رکھیں گی۔ (روح البیان) اعتقاد و عمل میں۔ انسان تین قسم کے ہیں۔ ایک کامل جو مضبوط ہیں' جنہیں دنیا کے مصائب و آلام راحت و آرام جنبش نہیں دے سکتے۔ دوسرے ناقص جنہیں ہلکے پتہ کی طرح ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں' یہ وہ ہیں جن کی دستگیری رحمت الٰہی نے نہ کی۔ تیسرے درمیانی لوگ۔ اس دوسری آیت میں پہلی جماعت کی استقامات کا ذکر ہے۔ حق تعالیٰ ہم

گنہگاروں کو استقامت بخشے مگر اس کے لئے محنت وہمت درکار ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا۔

بِقَدْرِ الْكَدِّ تُكْتَسَبُ الْمَعَالِي وَمَنْ طَلَبَ الْعُلَى سَهِرَ اللَّيَالِي

تَرُومُ الْعِزَّ ثُمَّ تَنَامُ لَيْلًا يَغُوصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللَّآلِي

یعنی محنت ومشقت کی بقدر تم بلندی حاصل کرو گے جو بلندی وسرفرازی چاہتا ہے وہ راتیں سو کر نہیں گزارتا۔ تعجب ہے کہ تو دائمی عزت کا طالب ہے اور پھر رات بھر سوتا رہتا ہے۔ اے اللہ کے بندے موتی کا متلاشی سمندر میں غوطے لگانے کی مشقتیں جھیلتا ہے۔ اس میں ابدال واوتاد کی مدد اور اپنی کوشش درکار ہے تاکہ یہ دشوار گذار راستہ آسانی سے طے ہو۔

چراغ زندہ می خواہی در شب زندہ داراں زن که بیداری بخت از بخت بیداراں شود حاصل

یعنی اگر تو اپنا چراغ روشن رکھنا چاہتا ہے تو ان کا دروازہ کھٹکھٹا جن کی راتیں زندہ وروشن رہتی ہیں کیونکہ نصیبے کی بیداری بیدار نصیبوں والوں سے میسر ہوتی ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝۷۰ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ

اے کتاب والو کیوں کفر کرتے ہو ساتھ آیتوں اللہ کے حالانکہ تم گواہی دیتے ہو اے کتاب والو

اے کتابیو اللہ کی آیتوں سے کیوں کفر کرتے ہو حالانکہ تم خود گواہ ہو اے کتابیوں

لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۷۱ ع

کیوں ملاوٹ کرتے ہو حق کو ساتھ باطل کے اور چھپاتے ہو تم حق کو حالانکہ تم جانتے ہو

حق میں باطل کیوں ملاتے ہو اور حق کیوں چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں خبر ہے

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ

اور کہا ایک گروہ نے کتاب والوں میں سے ایمان لاؤ ساتھ اس کے جو اتارا گیا اوپر ان لوگوں کے

اور کتابیوں کا ایک گروہ بولا وہ جو ایمان والوں پر اتارا گیا

اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۷۲

جو ایمان لائے شروع دن میں اور انکار کر دو آخر میں اس کے شاید کہ وہ لوگ پھر جائیں

صبح کو اس پر ایمان لاؤ اور شام کو منکر ہو جاؤ شاید وہ پھر جائیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: پچھلی آیت میں اہل کتاب کی اس جماعت کا ذکر تھا جسے توریت وانجیل کی آیتوں کی خبر نہ تھی اور بے خبری میں وہ نبی کریم ﷺ اور اسلام کا انکار کرتے تھے۔ اب اہل کتاب کے

اس گروہ کا ذکر ہے جو دیدہ دانستہ توریت و انجیل سے خبردار ہوتے ہوئے اسلام اور بانیٔ اسلام کے منکر ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے مکر و فریب کا اجمالی ذکر تھا کہ وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب ان کے فریب کی کچھ تفصیل فرمائی جا رہی ہے کہ وہ دیدہ دانستہ آیات الٰہی کا انکار کرتے اور حق کو باطل سے ملاتے ہیں اور مسلمانوں کو بہکانے کی زبردست تدبیریں کرتے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت فرمایا گیا تھا کہ مسلمانوں کو بہکانے والے اہل کتاب مسلمانوں کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے اپنی ہی گمراہی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اب ان آیتوں میں اسی کا ثبوت دیا جا رہا ہے گویا پہلے دعویٰ تھا۔ اب دلیل۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اہل کتاب صحابہ کرام یا تمام مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ لوگ اس کوشش سے خود پہلے ہی اپنی کتاب توریت و انجیل کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ توریت و انجیل میں یہ مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ اس کچی کھیتی کی طرح ہوں گے جن کی حفاظت مالک ہمیشہ کرتا ہے۔ پھر یہ حضرات کیسے گمراہ ہو سکتے ہیں۔ نیز فرمایا ہے **كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ** الخ۔ (الفتح: ۲۹) نیز توریت و انجیل میں ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا دین نہ منسوخ ہو گا نہ مسوخ اسے مٹا سکے گا۔ اب ان اہل کتاب کی یہ کوششیں اپنی آیات کا انکار ہے۔ یہ لوگ ان آیات کا انکار کر کے کفر کرتے ہیں۔

شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول میں دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خیبر کے علمائے یہود میں سے بارہ شخصوں نے آپس میں مشورہ کر کے مسلمانوں کو بہکانے کا یہ مکر سوچا کہ یہود کی ایک جماعت صبح کو اسلام لے آئے اور شام کو مرتد ہو جائے اور لوگوں سے کہے کہ ہم ضدی اور ہٹ دھرم نہیں بلکہ طالب حق ہیں۔ اس لئے ہم لوگ مسلمان ہو گئے تھے مگر کریں کیا۔ جب ہم نے اپنی کتابوں میں دیکھا تو ثابت ہوا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ وہ پیغمبر نہیں ہیں، جن کی ہماری کتابوں نے خبر دی تھی اور نہ اسلام میں کوئی خوبی ہے۔ اس لئے ہم اسلام سے پھر گئے۔ یہ سب تدبیر اس لئے تھی کہ اس حرکت سے مسلمانوں کو حقانیت اسلام میں شبہ پیدا ہو جائے اور وہ سمجھیں کہ واقعی یہ لوگ حق کے طلبگار ہیں، ضدی نہیں۔ اسی لئے تو ایمان لے آئے تھے اور چونکہ یہ اہل کتاب اور اہل علم ہیں واقعی انہوں نے اسلام میں کوئی خرابی ہی دیکھی ہو گی ورنہ یہ مسلمان ہو کر مرتد نہ ہوتے۔ اس موقعہ پر آیت کریمہ **وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ** الخ نازل ہوئی (تفسیر خازن و خزائن العرفان وغیرہ) دوسری روایت میں ہے کہ یہ آیت کریمہ تبدیلی قبلہ کے موقعہ پر نازل ہوئی کہ جب کعبہ معظمہ کو قبلہ اسلام مقرر کیا گیا تو یہود کو بہت گراں گذرا۔ ان کے سردار کعب ابن اشرف اور مالک ابن سیف نے اپنے دوستوں سے کہا کہ مسلمانوں کو بہکانے کی بہتر تدبیر یہ ہے کہ صبح کی نماز مسلمانوں کے ساتھ کعبہ کی طرف پڑھ لو اور دن کے اخیری حصے میں اپنے قبلہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھو اور مسلمانوں سے کہو کہ چونکہ ہمیں تبدیلی قبلہ کا پتہ اپنی کتابوں سے نہیں ملا۔ اس لئے ہم نہیں مانتے' تاکہ مسلمان شک میں پڑ جائیں۔ حالانکہ توریت و انجیل میں حضور ﷺ کی صفات خصوصیہ میں یہ مذکور ہے کہ وہ نبی الحرمین ہوں گے یعنی پیدا ہوں گے ایک حرم میں رہیں گے دوسرے حرم میں اور یہ کہ آپ امام القبلتین ہوں گے کہ دو قبلوں کی طرف نماز پڑھیں گے' پڑھائیں گے اور ان کے مقبول سجدوں سے دونوں قبلوں یعنی کعبہ اور بیت المقدس کو شرف ملے گا۔ مگر جانتے ہوئے ان بدنصیبوں نے یہ حرکات کیں۔ تب یہ آیت کریمہ **وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ**

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ الخ نازل ہوئی۔ یہ ہی مجاہد اور مقاتل اور امام کلبی کا قول ہے۔ (تفسیر روح المعانی وخازن وکبیر وغیرہ) یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ۔ یہاں اہل کتاب سے علماء یہود یا علمائے نصاریٰ یا دونوں مراد ہیں نہ کہ عام کتابی جیسا کہ اگلے مضمون سے معلوم ہو رہا ہے۔ خیال رہے کہ یہاں اہل کتاب کو ندا اظہار غضب کے لئے ہے کیونکہ آگے ان کے کفریات کا ذکر ہے اور اہل کتاب کے معنی ہیں کتاب آسمانی کو ماننے والے یا ان کتابوں کی یعنی عام یہود ونصاریٰ' پادری کیونکہ وہ پوپ پادری ہی کتاب اللہ کی آیات چھپاتے یا ان کا انکار کرتے تھے۔ رہے ان کے عوام وہ یہ حرکتیں کر سکتے ہی نہ تھے' چونکہ اہل علم کا گناہ جاہل کے گناہ سے سخت تر ہے کہ اس کی پیروی میں عام جہلا کرتے ہیں۔ اس لئے خصوصیت سے ان پر عتاب ہوا۔ لِمَ اصل میں لِمَا تھا۔ لام تعلیلیہ اور مَا استفہامیہ کا مجموعہ تخفیف کے لئے الف گرا دیا گیا کیونکہ لام الف کے قائم مقام ہو گیا۔ نیز چونکہ الف کنارہ پر تھا اور میم کا فتح اس پر دلالت کرتا تھا اس لئے الف کی چنداں ضرورت نہ تھی لہٰذا گر گیا۔ جیسے عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ (النباء:۱) یا جیسے فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ۔ (الحجر:۵۴) کہ اصل میں عَمَّا اور فَبِمَا تھے۔ کبھی حالت وقف میں ان کے اخیر میں ہ بھی لگا دی جاتی ہے جیسے فبمہ یا لمہ (تفسیر کبیر) عربی میں لِمَ وجہ پوچھنے کے لئے آتا ہے۔ جیسے اردو میں کیوں اور انگریزی میں وائی فارسی میں چرا رب تعالیٰ کا کیوں فرمانا اظہار غضب اور آئندہ عذاب کی تمہید کے لئے ہوتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں ہے کہ جس سے حساب میں مناقشہ ہوا وہ ہلاک ہو گیا..... تَكْفُرُوْنَ کفر سے بنا کفر کے معنی ہیں انکار کرنا' چھپانا' ناشکری کرنا۔ یہاں سارے معنی بن سکتے ہیں' آیات کا انکار اعتقادی بھی ہوتا ہے۔ قولی بھی عملی بھی قولی یا اعتقادی انکار یا تو الفاظ آیات کا انکار ہو گا یا اس کے معنی کا انکار جو کہے کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ قرآن شریف کی آیت نہیں۔ وہ بھی انکاری ہے۔ اور جو کہے کہ یہ آیت تو ہے مگر اس میں صلوٰۃ سے مراد نماز نہیں بلکہ کوئی اور عمل ہے وہ بھی انکاری ہے اہل کتاب یہ تمام کفر کرتے تھے۔ آیات اللہ سے یا قرآنی آیتیں مراد ہیں۔ تو تکفرون سے ان کا انکار اور نہ ماننا مراد ہو گا یا آیات اللہ سے توریت وانجیل کی وہ آیتیں مراد ہیں جن میں حضور ﷺ کی پیشنگوئی اور حضور علیہ السلام کے اوصاف کا ذکر تھا۔ تو تَكْفُرُوْنَ سے ان آیتوں کا چھپانا یا ان کا بدلنا مراد ہو گا۔ یا آیات اللہ سے حضور علیہ السلام کے سارے معجزات مراد ہیں۔ جن سے آپ کی نبوت کا ثبوت ہوتا تھا۔ اس صورت میں تَكْفُرُوْنَ سے ان کا انکار یا انہیں جادو کہنا مراد ہو گا۔ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔ واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ تَكْفُرُوْنَ کے فاعل سے حال۔ تَشْهَدُوْنَ شہادت سے بنا بمعنی گواہی۔ یا تو اس سے ان کی دلی شہادت اور قلبی اعتراف مراد ہے جو انہیں توریت دیکھ کر حاصل ہوا تھا یا ان کی زبانی گواہی واقرار مراد ہے جو وہ تنہائی میں کر لیا کرتے تھے یا اس سے حاضری مراد ہے۔ یعنی اے علماء اہل کتاب تم آیات قرآنیہ کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تمہارے دل اس کی حقانیت کے گواہ ہیں۔ یا اے علمائے اہل کتاب تم توریت وانجیل کی ان آیتوں کو کیوں چھپاتے ہو جن میں نبی آخر الزمان ﷺ کی پیشنگوئی ہے حالانکہ تم اپنی خاص مجلسوں میں اس کا اقرار بھی کر لیتے ہو اگرچہ مسلمانوں کے سامنے انکار کر دیا تم حضور علیہ السلام کے معجزات کیوں نہیں مانتے حالانکہ تم خود اقرار کرتے ہو کہ گذشتہ انبیائے کرام کے معجزات انکی نبوت کے دلائل تھے۔ اور تم حضور علیہ السلام کے معجزات پر حاضر ہوتے ہو۔ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔ چونکہ علمائے اہل کتاب کے دو گروہ تھے ایک وہ جو جان بوجھ کر حضور علیہ السلام کا انکار کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو صرف انکار ہی پر قناعت نہ کرتے بلکہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات ڈال کر انہیں

اسلام سے پھسلانے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلی آیت میں پہلے گروہ سے خطاب تھا۔ دوسری آیت میں دوسرے گروہ سے خطاب ہے۔ لہٰذا یہاں اہل کتاب سے ان کے وہ علماء مراد ہیں جو توریت وانجیل میں تحریفیں کرتے تھے۔ تَلْبِسُوْنَ لبس سے بنا بمعنی خلط ملط کرنا ملاوٹ کرنا اور چھپانا۔ کپڑے کو اسی لئے لباس کہتے ہیں کہ وہ بدن کو چھپاتا ہے۔ مشابہت کو ملابست اور دھوکے کو التباس اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس سے اصل شے چھپ جاتی ہے۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ چھپانا بھی اور خلط کرنا بھی۔ اگر چھپانا مراد ہو تو بالباطل کی ب استعانت کی ہے۔ یعنی حق کو باطل کے ذریعہ کیوں چھپاتے ہو۔ اور اگر خلط مراد ہو تو ب بمعنی مع ہوگی۔ یعنی حق کو باطل کے ساتھ کیوں ملاتے ہو۔ یا تو حق سے مراد توریت وانجیل کی اصل آیتیں ہیں اور باطل سے مراد ان کی بناوٹی آیتیں یہ حسن اور ابن زید کا قول ہے یا حق سے مراد ان کا اقراری اسلام ہے اور باطل سے مراد دلی کفر یہ ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔ یا حق سے مراد ان کا دلی اعتراف ہے اور باطل سے مراد ان کا زبانی انکار ہے۔ یہ ابو علی اور ابو مسلم کا قول ہے۔ یا حق سے مراد گذشتہ انبیائے کرام پر ایمان کا اظہار ہے۔ اور ان بزرگوں کی تعریف وتوصیف اور باطل سے مراد مشرکین کی سی بدعملیاں' رشوت خوری' شراب نوشی' جوا' زنا وغیرہ جو ان پوپ پادریوں میں مروج تھے۔ یا حق سے مراد توریت کی واضح اور صاف آیتیں ہیں اور باطل سے مراد توریت کے متشابہات کی غلط تاویلیں۔ (روح المعانی وکبیر) یعنی اے علمائے اہل کتاب تم توریت وانجیل کی اصل آیتوں کو اپنی بناوٹی آیتوں سے کیوں خلط ملط کرتے ہو۔ یا اپنے دلی اعتراف کو اپنے زبانی انکار کے ساتھ کیوں ملاتے ہو۔ یا اپنے ایمان کو کفر بالقرآن کے ساتھ کیوں مخلوط کرتے ہو وغیرہ۔ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ حق چھپانے والا دو جرم کرتا ہے ایک شبہات پیدا کرنا۔ دوسرا حق کے دلائل کو لوگوں تک نہ پہنچنے دینا۔ پہلے جرم کا نام تلبیس ہے جس کا لِمَ تَلْبِسُوْنَ میں ذکر فرمایا گیا۔ دوسرے قصور کا نام کتمان حق ہے۔ جس کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ یہ واو عاطفہ ہے اور تَكْتُمُوْنَ تَلْبِسُوْنَ پر معطوف اور وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا واو حالیہ ہے اور یہ جملہ تَلْبِسُوْنَ اور تَكْتُمُوْنَ کے فاعل سے حال ہے۔ یہاں حق سے مراد یا حضور علیہ السلام کی نبوت ہے یا اسلام کی حقانیت یا توریت شریف کی آیات نعت جن کے چھپانے کی علمائے یہود انتہائی کوشش کرتے تھے۔ تَعْلَمُوْنَ کا مفعول پوشیدہ ہے۔ یعنی تم اپنا جھوٹ' اپنا حسد' عناد جانتے ہو۔ یا تمہیں خبر ہے کہ حاسد سخت گنہگار ہے مگر پھر بھی تم اس جرم کی جرأت کرتے ہو۔ یا مطلب یہ ہے کہ تم جاہل نادان اور بے وقوف نہیں۔ اصحاب علم میں سے ہو۔ اس صورت میں تَعْلَمُوْنَ کو مفعول کی ضرورت نہیں۔ یعنی اے علمائے اہل کتاب تم حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں خبر ہے کہ تم حاسد ہو اور حاسد کی سزا جہنم ہے۔ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ علمائے یہود کے چند فریب بیان فرمانے کے بعد ان کا ایک انتہائی مکر بتایا جا رہا ہے جو انہوں نے مسلمانوں کو بہکانے کے لئے کیا۔ طائفہ بمعنی جماعت ہے' جماعت کو طائفہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس سے حلقہ بن سکتا ہے جس کے اردگرد گردش کی جا سکے (طواف بمعنی گردش) (روح المعانی) کعبہ کے اردگرد گھومنے کو طواف کہتے ہیں۔ ایک شہر کا نام طائف ہے کہ وہاں کی زمین کو کعبہ کا طواف کرایا گیا۔ نیز وہاں جانے والا گھومتا ہوا جاتا ہے کہ وہاں کا راستہ پیچیدہ اور خم دار ہے۔ یہاں اہل کتاب سے عام کتابی مراد ہیں۔ اور طائفہ سے ان کے خاص علماء اور قال کا متعلق پوشیدہ ہے یعنی علمائے اہل کتاب نے اپنے بعض لوگوں سے کہا کہ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ۔ اٰمِنُوْا سے یا اظہار ایمان مراد ہے یا کعبہ کی طرف نماز پڑھنا مراد جیسا

کہ شان نزول سے معلوم ہو چکا۔ اَلَّذِیْٓ اُنْزِلَ سے یا سارے اسلامی احکام مراد ہیں یا بعض احکام یا تبدیلی قبلہ اور اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے یا صحابہ کرام مراد ہیں یا نبی کریم ﷺ یا ساری امت (روح المعانی و کبیر) وَجْهَ کے لفظی معنی ہیں سامنے۔ اسی سے مواجہت اور توجہ ہے چیز کا وہ حصہ جو سب سے پہلے نظر آئے اس چیز کا وجہ کہلاتا ہے۔ جسم انسانی میں منہ کو اسی لئے وجہ کہتے ہیں کہ پہلے وہ ہی نظر آتا ہے۔ لہٰذا وجہ النہار کے معنی ہوئے دن کا شروع حصہ یعنی وقت صبح۔ ربیع ابن زیادہ کہتا ہے

مَنْ کَانَ مَسْرُوْرًا بِمَقْتَلِ مَالِكٍ فَلْیَاْتِ نِسْوَتَنَا بِوَجْهِ نَهَارِ

بعض نے فرمایا کہ کسی چیز کے اعلیٰ و اشرف حصہ کو اس کا وجہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا وجہ النہار سے مراد وقت صبح ہے۔ جو دن کا افضل حصہ ہے کہ اس وقت تمام مخلوق رب کی عبادت کرتی ہے اور اسی وقت رات و دن کے محافظ فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (الاسراء:۷۸) نیز صحابہ کرام کی خواہش تھی کہ صبح کو پہلے حضور ﷺ کو دیکھیں۔ ابن اعرابی نے فرمایا کہ وجہ النہار صدر نہار۔ شباب نہار۔ اول نہار ان سب کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی اہل کتاب کے ایک گروہ نے اپنے بعض خاص دوستوں سے کہا کہ مسلمانوں کو اس طرح بہکاؤ کہ تم صبح کے وقت اسلام لا کر مصنوعی مسلمان بن جاؤ اور وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۔ واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ اٰمِنُوْا پر معطوف اور اُكْفُرُوْا سے اظہار کفر مراد ہے۔ ورنہ وہ پہلے ہی کافر تھے۔ آخر دن سے مراد یا وقت ظہر ہے یا شام کا وقت۔ لَعَلَّهُمْ کی ضمیر صحابہ کرام یا عام مسلمانوں کی طرف لوٹتی ہے اور یَرْجِعُوْنَ سے مسلمانوں کا اسلام سے پھر جانا اور مرتد ہو جانا مراد ہے۔ یعنی صبح کو مسلمان بن کے شام کو اپنا کفر ظاہر کر و تا کہ سیدھے مسلمان تمہیں پھرتے ہوئے دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں یا کم از کم شبہات میں پڑ جائیں۔ چونکہ اس وقت تک مرتد کو قتل کرنے کے احکام اسلام میں نہ آئے تھے۔ اس لئے ان کتابیوں کی یہ ہمت و جرأت ہوئی جب قتل مرتد کے احکام آ گئے تو پھر کسی میں ہمت نہ تھی کہ اسلام لا کر پھر کافر ہو جاتا۔ وہ جو حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص اسلام لا کر کچھ روز بعد بولا کہ میری بیعت فسخ کر دیجئے۔ حضور ﷺ نے اسے بہت سمجھایا وہ نہ مانا اور کافر ہو کر چلا گیا تو فرمایا ہمارا مدینہ بھٹی ہے گندے کو نکال دیتا ہے۔ یہ اسی وقت کی حدیث ہے جب کہ مرتد قتل نہ کئے جاتے تھے۔ خیال رہے کہ مرتد کا قتل قرآن شریف سے بھی ثابت اور عقل سے بھی۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ تُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔ (بقرہ:۵۴) احادیث اس بارے میں بہت ہیں آج حکومتیں ملکی قانونی باغیوں کو گولی سے اڑا دیتی ہیں پھانسی دے دیتی ہیں ایسے ہی مرتد اسلام کا باغی ہے۔ قتل کا مستحق ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے علمائے اہل کتاب تم توریت و انجیل کے ماننے کا دعویٰ کرتے ہو تو اس کی ان آیتوں کے منکر کیوں ہو جو نبی آخر الزمان ﷺ کی نعت میں ہیں۔ حالانکہ تمہارے دل گواہی دے رہے ہیں کہ تم اپنے اس کام میں بڑے مجرم ہو اور ظاہر ہے کہ اقراری مجرم سخت سزا کا مستحق ہے۔ اے اہل کتاب غور کرو کہ تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ حق کو باطل کے ساتھ توریت و انجیل کی اصلی آیتوں کو اپنی بناوٹی آیتوں کے ساتھ کیوں ملاتے ہو اور اپنے لوگوں تک حق کیوں نہیں پہنچنے دیتے۔ حالانکہ تم جانتے بھی ہو کہ ایسی حرکتیں کرنے والا کس سزا کا مستحق ہے۔ تم جان بوجھ کر عذاب کے حقدار اور مستحق نار کیوں بنتے ہو۔ اے نبی ﷺ ان کتابیوں کے مکر و فریب اس حد تک بڑھے ہوئے ہیں کہ ان کی ایک جماعت نے مسلمانوں کو بہکانے کی تدبیر یہ سوچی کہ

اپنے خاص لوگوں سے کہا کہ تم صبح کے وقت بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام لے آؤ اور مشرف باسلام ہو کر مسلمان بن جاؤ اور شام کو پوری جماعت کی جماعت اسلام سے پھر کر مرتد ہو جاؤ۔ تاکہ تمہاری جماعت کا لوٹنا سیدھے سادھے مسلمانوں پر برا اثر ڈالے اور وہ یہ سمجھیں کہ یہ لوگ ضدی نہیں بلکہ تلاش حق میں اسلام لائے تھے اور چونکہ یہ اہل علم ہیں۔ اب ان کا لوٹنا اس کی دلیل ہے کہ واقعی انہوں نے اسلام میں کچھ کمی پائی۔ اس لئے پھر گئے۔ لہٰذا تمہارے ساتھ وہ بھی اسلام سے پھر جائیں۔ رب کی قدرت کے قربان کہ ادھر تو انہوں نے یہ خفیہ تدبیر کی۔ ادھر اس نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا۔ اور ان کا راز فاش کر دیا گیا۔ جس سے ان کا یہ وار بھی خالی گیا۔ اور کیا تعجب تھا کہ جو لوگ مصنوعی مسلمان بنتے وہ حضور علیہ السلام کی صحبت سے حقیقی مومن ہی ہو کر اس شعر کے مصداق بنتے ؎

شد غلامے کہ آب جو آرد آب جو آمد و غلام ببرد

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** علم بے عمل وبال اور باعثِ عذاب الٰہی ہے۔ دیکھو علمائے یہود نے جان بوجھ کر حضور علیہ السلام کا انکار کیا۔ لہٰذا وہ سخت عذاب و عتاب کے مستحق ہوئے۔ اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں اَلْعِلْمُ حِجَابٌ اَکْبَرُ خیال رہے کہ علم ایک تلوار ہے جس کا صحیح استعمال مفید اور غلط استعمال خود عالم کے لئے مضر ہے۔ **دوسرا فائدہ:** تمام گواہیوں میں صرف قول کافی ہے مگر ایمانیات کی گواہی میں عقیدہ بھی ضروری یہاں بغیر عقیدت کلمہ پڑھنا اور توحید و رسالت کی گواہی دینا کفر ہے۔ اس گواہی میں لطف یہ ہے کہ بسا اوقات کلام سچا ہوتا ہے مگر بولنے والا جھوٹا ہوتا ہے جیسا کہ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** کفار نے اسلام کے مٹانے میں کوئی کوتاہی نہ کی۔ اسلام کی بقا محض رب تعالیٰ کے کرم سے ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** تقیہ کرنا تمام عیبوں کی جڑ اور انتہاء درجہ کی برائی ہے۔ علماء یہود نے اپنے ان لوگوں کو تقیہ کی تعلیم دے کر اسلام کو برباد کرنا چاہا۔ سب سے پہلا تقیہ ابلیس نے کیا کہ حضرت آدم سے عرض کیا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں حالانکہ بدخواہ تھا۔ جس دین میں تقیہ ہو وہ یہودیت سے نکلا ہے۔ **پانچواں فائدہ:** کفار کی چاپلوسی پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔ بسا اوقات ان کی نمازیں، روزے بلکہ ان کا کلمہ طیبہ پڑھنا سیاسی ہوتا ہے نہ کہ دینی۔ غضب تو دیکھو کہ یہود نے مسلمانوں کو بہکانے کے لئے ایمان قبول کر کے نمازیں پڑھ کر مرتد ہونے کی ٹھان لی۔ خیال رہے کہ کفار کی یہ تدبیریں اب بھی باقی ہیں۔ ہر سال بعض یہودی فرمان مصطفوی کے نام سے اشتہار چھاپتے ہیں۔ جس میں لکھتے ہیں کہ شیخ احمد خادم روضہ رسول اللہ (ﷺ) نے حضور علیہ السلام کی خواب میں زیارت کی کہ ان سے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس ہفتے میں اتنے مسلمان مرے جن میں سے پچانوے فی صدی کافر ہو کر مرے۔ اور پانچ فی صد مسلمان ہیں۔ خدا کے سامنے اپنی امت کی بدعملیوں سے سخت شرمندہ ہوں۔ فلاں سنہ میں سورج مغرب سے نکلے گا اور فلاں سنہ میں یاجوج و ماجوج ظاہر ہوں گے۔ اور فلاں سنہ میں لوگوں کی صورتیں مسخ ہوں گی اور جو اس مضمون کو نہ مانے کافر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب یہود کی حرکتیں ہیں تاکہ مسلمان ان حالات کو سن کر اسلام سے بددل ہوں۔ اور ان پیشنگوئیوں کی غلطی معلوم کر کے بانیٔ اسلام ﷺ سے پھر جائیں [illegible] بارہا ایسی پیشنگوئیاں ہوئیں مگر ظاہر کچھ بھی نہ ہوا حالانکہ

روضۂ مطہرہ کے خدام میں کسی کا نام شیخ احمد نہیں۔ سیدھے سادھے مسلمان اسے وحی الٰہی سمجھ کر چھاپتے اور شائع کرتے ہیں۔ یہ یہودیوں کی وہ ہی پرانی چال ہے۔ بعض مسلمان ووٹ کے بھوکے انتخاب کے زمانہ میں مشہور پیروں کے مرید ہو جاتے ہیں تاکہ ان کے مریدین کے ووٹ حاصل کریں۔ ووٹوں کی خاطر نمازیں' خیرات چندے دینے شروع کر دیتے ہیں بعد انتخاب نہ مریدی رہتی ہے نہ نماز یہ موسمی متقی پرہیز گار اس آیت سے عبرت پکڑیں۔ نفسانی یا شیطانی متقی نہ بنیں بلکہ ایمانی و رحمانی متقی بنیں۔ سیاسی نماز خراب کرے گی۔ **چھٹا فائدہ:** اہل کتاب کو بھی مسلمانوں کی پختگی کا پتہ تھا۔ اسلئے وہ مسلمانوں کے مرتد ہونے پر یقین نہ رکھتے تھے بلکہ اتنی بڑی تدبیر سوچ کر بھی یہ ہی کہتے تھے **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ**۔ مسلمان شاید ہی ایمان سے پھریں جو روافض کہ حضرت صدیق اکبر و فاروق اعظم و دیگر صحابہ کرام کو دنیوی لالچ سے مرتد مانے وہ یہود سے بدتر ہے۔ کہ یہود کو صحابہ کی پختگی پر اعتماد تھا انہیں نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ میں اپنا کلام ملانا طریقہ یہود ہے۔ اور خدا کے غضب کا باعث تو مسلمان قرآن میں سورتوں کے نام رکوع و آیات کی تعداد کیوں لکھتے ہیں۔ نیز مفسرین قرآن کی آیات کے ساتھ اپنی تفسیری عبارتیں کیوں تحریر کرتے ہیں۔ **جواب:** کتاب اللہ میں اپنی عبارتیں بڑھانا' اس طرح کہ اصلی اور اپنی عبادتوں میں فرق نہ رہے یہ حق و باطل کا مخلوط کرنا ہے اور اپنی عبارتوں کو کلام الٰہی بنانا یہ بھی حق و باطل کی تلبیس ہے کوئی مسلمان قرآن شریف میں ایسی حرکت نہیں کرتا۔ حضرت عثمان نے مصحف ابن مسعود وغیرہ اس لئے جلا دیئے کہ ان میں کچھ تفسیری نوٹ جو حضور انور ﷺ نے تفسیر کے طور پر فرمائے تھے وہ شامل تھے۔ خالص اصل قرآن باقی رکھا۔ مسلمان تو ان چیزوں کو الگ شکل میں لکھتے ہیں یا حاشیہ پر تحریر کرتے ہیں بلکہ قرآن کو اردو' انگریزی و ہندی خط میں لکھنا منع کرتے ہیں بلکہ اس کی تلاوت بھی ایسی کرتے ہیں جس سے دوسرے کلاموں سے قرآن ممتاز رہے۔ مسلمانوں کی سی حفاظت قرآن کسی قوم نے نہ کی۔ عیسائیوں نے تو حضرت عیسیٰ کی ہسٹری اور ان کی ملفوظات کو جسے ان کے حواریوں نے جمع کیا تھا انجیل کہنا شروع کر دیا حالانکہ اس میں ایک لفظ بھی کلام الٰہی نہیں معلوم ہوتا۔ **دوسرا اعتراض:** یہاں اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ الخ کیوں فرمایا گیا اَسْلِمُوْا کیوں نہ فرمایا گیا کیونکہ وہاں محض اظہار ایمان تھا جسے اسلام کہہ سکتے ہیں نہ کہ ایمان۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ یہود کا کلام ہے انہوں نے اظہار ایمان کو ایمان ہی کہا۔ رب تعالیٰ نے وہ ہی نقل فرما دیا۔ اگر غلطی ہے تو ان کی۔ دوسرا یہ کہ ان کا مقصود یہ تھا کہ اس عمدگی سے اظہار ایمان کرو کہ مسلمان تمہیں سچا مومن سمجھ جائیں۔ انہیں تمہارے نفاق کا شبہ بھی نہ ہو۔ اس مبالغہ کے لئے امنوا کہا نہ کہ اسلموا۔ **تیسرا اعتراض:** یہود قرآن کے کتاب اللہ ہونے کے منکر تھے پھر انہوں نے اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ کیوں کہا وہ تو اس کے نزول کے معتقد تھے ہی نہیں؟ **جواب:** اس کے بھی دو جواب ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے لحاظ سے انزل کہا گیا۔ نہ کہ خود یہود کے عقیدہ کے لحاظ سے یعنی جس کے نزول کے مسلمان مدعی ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ دل سے قرآن کو کلام اللہ مانتے تھے اگرچہ زبان سے منکر تھے۔ چونکہ یہ گفتگو خلوت میں کر رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے دل کی بات کہہ دی **چوتھا اعتراض:** یہود نے ایمان کے

لئے شروع دن اور کفر کے لئے آخر دن کیوں منتخب کیا کہ کہا صبح کو ایمان لے آؤ اور شام کو کافر ہو جاؤ؟ **جواب:** اس کے بھی چند جواب ہیں ایک یہ کہ شروع دن سے نماز صبح مراد ہے اور آخر دن سے نماز مغرب اور اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ الخ سے کعبہ کی طرف نماز پڑھنا مراد ہے۔ مطلب یہ تھا کہ فجر کی نماز کعبہ کی طرف باقاعدہ اسلامی پڑھ لو اور مغرب کی نماز یہود کے طریقہ پر بیت المقدس کی طرف۔ چونکہ ان دونوں وقتوں میں نمازی زیادہ ہوتے ہیں اس لئے تمہارا ایمان و کفر سب پر ظاہر ہوگا اور تدبیر کارگر رہے گی۔ دوسرا یہ کہ ان کا مطلب یہ تھا کہ صبح کے وقت جب بارگاہ نبوی ﷺ میں صحابہ کرام کا مجمع کافی ہوتا ہے۔ تب سب کے سامنے ایمان قبول کرو۔ پھر شام کو بھی صبح کی سی رونق ہوتی ہے۔ تب سب کے سامنے مرتد ہو جاؤ اور وجہ ارتداد بھی بیان کردو۔ تیسرا یہ کہ صبح شام سے مراد تھوڑی مدت ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ایمان لا کر بہت جلد مرتد ہو جاؤ۔ مسلمانوں میں زیادہ نہ ٹھہرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہیں رہ جاؤ۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کا دل زرخیز زمین کی طرح ہے۔ زرخیز زمین میں اگر پھل پھول کا تخم ڈالا جائے تو وہاں پھلوں پھولوں کے باغ لگ جاتے ہیں اور اگر کانٹوں کا بیج بویا جائے تو وہ تمام خطہ خارستان بن جاتا ہے۔ نیز بارش کا پانی بویا ہوا تخم ہی اگاتا ہے۔ تخم کو بدلتا نہیں۔ اگر انسان کے دل میں سعادت کا بیج ہے تو قرآن و توریت و انجیل کی آیتیں جو کہ رحمت کا پانی ہیں اس سعادت کو ظاہر کردیں گی۔ اور اگر اس میں بدبختی کا تخم ہے تو ان ہی آیات سے بدبختی اور زیادہ ظاہر ہو جائے گی۔ یہاں رب نے فرمایا اے کتاب والو آیات اللہ کے ذریعہ کافر کیوں ہوئے جاتے ہو حالانکہ تم اپنا کفر خود مشاہدہ کررہے ہو۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

اے کہ من زشت و خصالم جملہ زشت	کے شوم گل چوں بمن آں خار کشت
نوبہارا حسن گل دہ خار را	زینت طاؤس دہ ایں مار را!
اے عظیم از ما گناہان عظیم !	می توانی عفو کردن اے کریم !
دستگیرم در چنین بے چارگی !!	شاد گردانم دریں غمخوارگی !!!!
حرمت آنکہ دعا آموختی	در چنین ظلمت چراغ افروختی
دستگیر و رہنما توفیق دہ	جرم بخش و عفو کن بکشا گرہ

صوفیاء فرماتے ہیں کہ دین حق ہے۔ دنیا باطل اور دین کو دنیا سے مخلوط کرنا کہ نماز ریا کے لئے پڑھے۔ علم دین، دولت، شہرت کے لئے سیکھے یہ حق کو باطل سے ملانا ہے۔ اسی طرح مسلمان ہو کر کافروں کے سے اخلاق ان کی سی صورتیں اختیار کرے یہ بھی حق کو باطل سے ملانا۔ جیسے دودھ، گائے، بھینس کے گوبر و خون میں سے آتا ہے مگر صاف ستھرا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں گوبر و خون کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے ہی مومن کے اعمال صالحہ ایسے خالص صاف اور ستھرے، نکھرے ہوئے ہونے چاہئیں کہ ان میں نفس امارہ اور دنیا کا شائبہ بھی نہ ہو۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ میں حق سے مراد حضور ﷺ ہیں کیونکہ حق کے معنی لازوال چیز یا صحیح درست یا حکمت اسرار والی چیز حضور ﷺ کی نبوت لازوال ہے۔ آپ کا ہر قول و فعل درست ہے۔ آپ کی ہر ادا میں حکمت و راز ہے۔ اس لئے آپ کا نام شریف حق ہوا۔ اس آستانہ تک باطل کی رسائی نہیں۔ کفار اندھے چور

کی طرح ہیں۔ اندھا اگرچہ مجمع میں کھڑا ہو مگر اپنے کو تنہا سمجھ کر سب کے سامنے خوش ہو کر چوری کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھتا۔ حالانکہ سب دیکھتے اور اس کی حماقت پر ہنستے ہوتے ہیں۔ کافر بھی خلوت میں اپنے کو اکیلا سمجھ کر اسلام کے خلاف تدبیریں سوچتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت وہ ملائکہ کے مجمع اور رب تعالیٰ کے علم میں ہوتے ہیں۔ دیکھو یہود نے اپنے کو تنہا سمجھ کر یہ تدبیر سوچی مگر چونکہ وہ حقیقتاً تنہا نہ تھے اس لئے ان کا راز فاش ہو گیا۔ کفر و بے دینی۔ بلکہ گناہ کی وجہ رب تعالیٰ سے غفلت ہے تو جو کوئی گناہ کرتے وقت سمجھ لے کہ مجھے رب تعالیٰ دیکھ رہا ہے وہ انشاء اللہ گناہ کر سکتا ہی نہیں۔ مسلمانوں کی دولت ایمان کا رب تعالیٰ محافظ ہے۔ دیکھو یہود نے ڈکیتی کی انتہائی تدبیر سوچی تھی مگر حق تعالیٰ نے ان کا راز فاش کر کے اس تدبیر کو بیکار کر دیا اور مسلمانوں کے ایمان کو ان چوروں سے بچالیا۔ لہٰذا امید ہے کہ وہ ہی مولیٰ آئندہ بھی ہمارے ایمان کو محفوظ رکھے گا۔ اس کے بہت دشمن ہیں۔ نفس امارہ و شیطان برے ساتھی، سب اس کے پیچھے پڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم سے یہ محفوظ رہ سکتا ہے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ
اور نہ تصدیق کرو مگر واسطے اس کے جو اتباع کرے دین تمہارے کی فرما دو کہ تحقیق ہدایت اللہ کی ہدایت ہے
اور یقین نہ لاؤ مگر اس کا جو تمہارے دین کا پیرو ہے۔ تم فرما دو کہ اللہ ہی کی ہدایت، ہدایت ہے
اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ
یہ کہ دیا جائے کوئی مثل اس کے جو دیئے گئے تم یا جھگڑا کریں وہ تم سے نزدیک رب تمہارے کے فرما دو
(یقین کا ہے کا نہ لاؤ) اس کا کہ کسی کو ملے جیسا تمہیں ملا یا کوئی تم پر حجت لا سکے تمہارے رب کے پاس تم فرما دو
اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾
تحقیق فضل قبضہ میں اللہ کے ہے دیتا ہے اس کو جسے چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے
کہ فضل تو اللہ ہی کے ہاتھ ہے جسے چاہے دے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے
يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾
خاص فرماتا ہے ساتھ رحمت اپنی کے جسے چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے
اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** یہ مضمون گذشتہ ان ہدایتوں کا تتمہ ہے جو علمائے یہود اپنے پیروکاروں کو کرتے تھے۔ یعنی انہوں نے اپنے خاص لوگوں سے کہا تھا کہ صبح کو بظاہر ایمان لے آؤ اور شام کو

مرتد ہو جاؤ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی تھی کہ تم سوا اپنے علماء کے کسی کی بات نہ ماننا۔ ایسا نہ ہو کہ تم صحابہ کرام کی باتوں اور نبی کریم ﷺ کی دلکش ہدایتوں کو سن کر انہی کے ہو جاؤ۔ گویا انہیں دو ہدایتیں کی تھیں۔ ایک کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا۔ اور دوسری کا اب ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں علمائے یہود کا کلام نقل فرمایا گیا۔ اب رب تعالیٰ مسلمانوں کو ہدایت فرما رہا ہے کہ تم ہر نو مسلم کی چکنی چپڑی باتوں پر اعتماد نہ کر لیا کرو بلکہ پختہ مسلمانوں کی بات پر اعتماد کرو۔ جیسا کہ اس کی ایک تفسیر سے معلوم ہوگا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ علماء یہود نے اپنے جن ساتھیوں کو ظاہری مسلمان ہو جانے پر آمادہ کیا ان سے یہ بھی کہا تھا کہ **لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ** مسلمان شاید ہی اسلام سے ہٹیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تم یہ کوشش اپنے دینی بھائیوں کی پختگی کے لئے کرو نہ کہ مسلمانوں کو ہٹانے کے لئے۔ ان کا ہٹانا بہت مشکل ہے۔ تمہاری اس حرکت سے خود تمہارے بھائی یہودیت پر پختہ ہو جائیں گے۔ گویا اس فریب کی ایک وجہ پچھلی آیت میں بیان ہوئی تھی اور دوسری وجہ اب بیان ہو رہی ہے۔ خیال رہے کہ علماء یہود کی ان تمام تقریروں کا تعلق شان نبوت سے تھا کہ وہ لوگ حضور ﷺ کی نبوت کے انکاری تھے مگر چونکہ نبوت کا انکار در پردہ رب کی شان کا انکار ہے۔ اس لئے رب تعالیٰ نے انہیں اپنا انکاری قرار دیا۔ اور ان کی تردید میں اپنی صفات عالیہ کا ذکر فرمایا۔ صفات الٰہی کا آئینہ ذات پیغمبر ہے۔ لہٰذا آیت پر یہ سوال نہیں کہ اس آیت کو ان کی تقریر سے کوئی تعلق نہیں۔

تفسیر

خیال رہے کہ یہ آیت کریمہ ترکیب و ترجمہ کے لحاظ سے نہایت دشوار ہے۔ اسی لئے مفسرین کرام نے اس کی چند تفسیریں اور مختلف ترکیبیں کی ہیں۔ نہایت آسان اور قوی اور واضح تر تفسیر یہ ہے کہ **وَلَا تُؤْمِنُوا** سے **عِنْدَ رَبِّكُمْ** تک سارا کلام یہود کا ہے۔ سوا اس جملہ کے **قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ**۔ اور یہ آیت امنوا اور واکفروا پر معطوف ہے اور **وَلَا تُؤْمِنُوا** میں ایمان یا بمعنی تصدیق ہے تو **لِمَنْ تَبِعَ** کا لام زائدہ ہے۔ جیسے **ردف لکم** کا لام اور یا بمعنی اقرار ہے تو لام صلہ کا ہے۔ اور **اَنْ يُّؤْتٰى اَحَدٌ** الخ **لَا تُؤْمِنُوا** کا مفعول ہے۔ اور اؤ عاطفہ ہے۔ **يُحَآجُّوْكُمْ** **يوتى** پر معطوف اور **عِنْدَ رَبِّكُمْ** **يُحَآجُّوْكُمْ** کا ظرف ہے۔ اب معنی بالکل واضح ہو گئے۔ یعنی علمائے یہود نے جنہیں ظاہری مسلمان ہونے پر آمادہ کیا۔ انہیں یہ ہدایت کی کہ تم اپنے دین والے یعنی یہودیوں کے سوا کسی کے متعلق نہ یہ اقرار کرنا کہ کسی کو تم جیسے درجات، تم جیسی ہدایت اور تم جیسی کتاب مل سکتی ہے اور نہ یہ خیال کرنا کہ کوئی قیامت میں رب کے نزدیک تم سے مناظرہ کر سکے کیونکہ حق پر تم ہو۔ اور باقی سب باطل پر خلاصہ یہ ہے کہ بظاہر مسلمان تو بن جاؤ لیکن در پردہ اپنے ایمان پر قائم رہنا۔ درمیان میں جملہ معترضہ کے طریقہ پر رب تعالیٰ نے فرمایا کہ بے وقوفو ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے جسے چاہے ہدایت بتا دے اور جس ذہن کو چاہے گمراہی قرار دے۔ تم ہدایت کو اپنے دین میں محدود کیوں مانتے ہو۔ ایک وقت یہودیت ہدایت تھی۔ اب اسلام ہدایت ہے۔ اسی پر تفسیر کبیر و روح المعانی و خازن وغیرہ نے اعتماد کیا۔ اور اسی تفسیر کی جانب اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ اشارہ کر رہا ہے۔ چونکہ امنوا ایمان سے بنا' ایمان کے لغوی معنی ہیں ماننا' قبول کرنا اصطلاحی معنی ہیں۔ حضور ﷺ کی لائی ہوئی چیزوں کو قبول کرنا اس جگہ دونوں معنی درست ہیں۔ اس لئے اس کے علاوہ کچھ تفسیریں اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ساری آیت رب تعالیٰ کا کلام

ہے۔اور لَا تُؤْمِنُوْٓا میں مسلمانوں سے خطاب یعنی اے مسلمانو تم علمائے اسلام کے سوا کسی اور کی بات نہ مانو۔ نہ تم جیسے فضائل کسی کو دیئے گئے۔کیونکہ تم نبی آخرالزمان کی امت ہو۔(علیہ السلام)اور نہ کوئی تم سے قیامت میں جھگڑا کرسکے۔کیونکہ حق پر تم ہو اور باقی باطل پر(خازن و روح المعانی)دوسرا یہ کہ یہ کلام یہود کا ہے مگر لَا تُؤْمِنُوْٓا ایمان سے بنا۔اور لِمَنْ تَبِعَ کا لام نفع کا ہے۔اور باقی ترکیب وہ ہی ہے جو پہلے عرض کی جاچکی۔یعنی علمائے یہود نے کہا اے دوستو تم یہ حرکت مسلمانوں کو بہکانے کی نیت سے نہ کرو۔وہ اپنے دین سے ہٹنے والے نہیں۔تم یہ سب کچھ اپنے دینی بھائیوں کے لئے کردتا کہ وہ تمہارے اس فعل کو دیکھ کر یہودیت پر پختہ ہو جائیں۔تیسرا یہ کہ لَا تُؤْمِنُوْٓا اَمَنَ سے بنا بمعنی مطمئن ہونا۔اور مطلب یہ ہوا کہ اے دوستو اپنے دین والوں کے سوا کسی پر اعتماد نہ کرو۔چوتھا یہ کہ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى سے اخیر تک رب تعالیٰ کا کلام ہے۔اور علمائے یہود کا کلام دِيْنَكُمْ پر ختم ہو چکا۔وہ اس طرح کہ الہدیٰ مبتدا ہے۔اور هدى الله اس کا بدل اور اَنْ يُّؤْتٰى میں لا پوشیدہ ہے۔اور یہ جملہ اس کی خبر یعنی اے نبی علیہ السلام فرمادو کہ حقیقی ہدایت یعنی اللہ کی ہدایت یہ ہی ہے کہ کسی کو مسلمان جیسے فضائل نہیں دیئے جاسکتے جو کوئی کسی قوم کو مسلمانوں کی طرح ہدایت پر مانے وہ گمراہ ہے۔اور بھی تفسیریں کی گئیں ہیں۔ہم طوالت کے خوف سے چھوڑتے ہیں۔اگر دیکھنا ہو تو تفسیر کبیر و روح المعانی وغیرہ کا مطالعہ کرو۔قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ۔ یہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہوا اور اس سے مراد یا نبوت ہے یا ہدایت اور اس میں یہود کے اس قول کی تردید ہے کہ نبوت و ہدایت ہمارے ساتھ خاص ہے۔یعنی اے محبوب علیہ السلام فرمادو کہ فضل اللہ کے قبضے میں ہے۔خیال رہے کہ فضل کے معنی ہیں مہربانی جو چیز کسی کو اس کے استحقاق کے بغیر دی جائے۔وہ فضل ہے۔رب نے دنیا و آخرت کی نعمت جو بھی جسے دی اپنی مہربانی سے دی۔ ہمارا استحقاق نہ تھا۔ید کے معنی ہیں ہاتھ۔مگر رب تعالیٰ جسمانی ہاتھ پاؤں سے پاک ہے کہ جسمانیت ہزار ہا چیزوں کی محتاج ہے۔لہٰذا اس کی جناب میں ہاتھ سے مراد قبضہ ہوتا ہے۔بندوں کو کوئی چیز دینے سے پہلے بھی وہ چیز اللہ کے قبضہ میں تھی۔اور دے دینے کے بعد بھی اس کے قبضہ میں ہے کہ جسے چاہے دے اور جس سے چاہے دے کر لے لے۔بہر حال مالک بھی وہ ہے قابض بھی وہ لہٰذا يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ جسے چاہتا ہے۔عطا فرماتا ہے اس طرح کہ اب تک نبوت بنی اسرائیل میں رہی۔اب منتقل ہو کر بنی اسمٰعیل میں آگئی۔وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اللہ وسعت والا بھی ہے کہ اس کا فضل کسی قوم پر محدود نہیں۔اور علم والا بھی ہے کہ اہل و نا اہل کو جانتا ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ رب تعالیٰ تو وسعت والا ہے۔اس کے ہاں کسی چیز میں تنگی نہیں مگر وہ اپنے بندوں کی حیثیت و لیاقت کو جانتا ہے۔جو بندہ جس حیثیت کا ہوتا ہے اسے اتنا ہی فضل و کرم دیتا ہے۔سمندر کی دین میں کمی نہیں مگر ہر شخص اپنے برتن کے موافق اس سے پانی لیتا ہے۔کنوئیں میں پانی بہت ہے مگر بھرنے والوں کے ڈول مختلف ہیں۔لہٰذا وسعت کو علم کے ساتھ جمع فرمانا اور وسعت کو علم سے پہلے ارشاد فرمانا بہت ہی موزوں ہے۔اور پھر ان دونوں سے پہلے مشیت کا ذکر فرمانا۔سبحان اللہ بہت ہی بہتر ہے کہ مخلوق کی حیثیت رب کی عطا سے ہے۔يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ يَخْتَصُّ اختصاص سے بنا رحمت مخصوص بہ ہے اور مَنْ يَّشَآءُ مخصوص کیونکہ رحمت مخصوص بہ پر آتی ہے۔یہاں رحمت یا تو فضل سے عام ہے یا خاص۔اس طرح کہ فضل سے مراد نبوت ہو اور رحمت سے مراد ہدایت ہو۔یا اس کے برعکس کوئی دوسرا شخص خدا کی رحمت کو کسی قوم سے خاص نہیں کرسکتا لیکن اگر وہ ہی کسی کو خاص کر دے تو وہ مالک ہے۔عبداللہ ابن عباس رضی

اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس رحمت سے مراد اللہ کا ذکر ہے۔ ابن جریج رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے اسلام اور قرآن مراد ہے۔ قول ہے کہ اس سے نبوت مراد ہے۔ (روح المعانی) اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رب جسے چاہتا ہے۔ اپنی رحمت سے خاص فرماتا ہے کہ اسے مخصوص رحمت عطا فرماتا ہے۔ یا رب جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ذریعہ اپنی نعمتوں سے خاص کرتا ہے۔ یا برحمتہ کی ب یا صلہ کی ہے یا سببیہ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔ فضل اور عظیم کی تفسیر بارہا ہو چکی۔ یہاں ذو یا تو بمعنی مالک ہے۔ جیسے زیدٌ یا بمعنی موصوف جیسے زید ذو علم یعنی اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔ یا اللہ بڑے فضل والا ہے مگر مالک کے معنی زیادہ قوی ہیں کیونکہ بعض لوگوں نے فضلِ عظیم سے دین اسلام مراد لیا ہے اور بعض نے توفیق خیر۔ اور ظاہر ہے کہ خدا پاک اس کا مالک ہے نہ کہ اس سے موصوف (از خازن) خیال رہے کہ فضل بمعنی فضیلت بھی ہوتا ہے۔ اور بمعنی فاضل بھی۔ یعنی اصل پر زائد اور بمعنی تفضل بھی (مہربانی کرنا) یہاں ہر معنی بن سکتے ہیں۔ (خازن)

خلاصہ تفسیر

علمائے یہود نے جب بعض لوگوں کو دھوکے کے لئے اسلام لانے پر آمادہ کیا تو انہیں یہ تعلیم دی کہ اے دوستو اپنے دین والوں کے سوا کسی کے متعلق یہ بات نہ ماننا کہ اس کو تمہاری طرح درجات و بزرگیاں دی جائیں۔ تم موسیٰ علیہ السلام کی امت صاحب توریت اور صاحب درجات ہو۔ تمہارے سوا اور کسی کو یہ بزرگیاں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اور یہ بھی نہ خیال کرنا کہ کوئی قیامت میں رب تعالیٰ کے سامنے تم سے حجت بازی کر سکے' کیونکہ تم ہی سچے اور سب جھوٹے۔ اور جھوٹوں کی کیا طاقت کہ سچوں کے منہ لگیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس جا کر ان کی صحبت میں رہ کر انہیں سچا نہ جان لینا بلکہ اپنے دین پر قائم رہنا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محبوب ﷺ ان بیوقوفوں سے فرما دو کہ حقیقی ہدایت وہ ہے جو اللہ کی طرف سے ملے۔ رب تعالیٰ جب چاہے جس دین کو چاہے ہدایت بنا دے اور جس کو چاہے منسوخ کر کے اسے گمراہی قرار دے۔ اس سے پہلے یہودیت ہدایت تھی اور اب اسلام۔ رات میں چراغ نور کا ذریعہ تھا مگر دن میں سورج۔ دن میں چراغ سے نور نہ لو ورنہ پاگل کہلاؤ گے۔ اب آفتابِ ہدایت طلوع ہو چکا۔ توریت و انجیل کی شمعیں گل ہو چکیں۔ اب ان سے ہدایت لینا حماقت ہے۔ اور اے محبوب ﷺ یہ بھی فرما دو کہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جسے چاہے دے۔ جس پر خدا فضل کرے وہ تمہاری ان فریب کاریوں سے پھسل نہیں سکتا۔ تم لاکھ کوشش کرو' مسلمان اسلام سے نہیں ہٹیں گے۔ اللہ وسعت والا بھی ہے اور علم والا بھی۔ جس شخص کو جس نعمت کا اہل جانتا ہے اسے وہ ہی عطا فرماتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص فرماتا ہے۔ اب تک نبوت سے بنی اسرائیل کو شرف بخشا اور اب بنی اسمٰعیل کو۔ اس کی رحمت پر کسی کا ٹھیکہ نہیں۔ اللہ بڑے فضل و کرم والا ہے۔ اس کے کرم کی حد نہیں۔ پھر تم نے اس کے کرم کو محض اپنے ساتھ کیوں خاص سمجھ لیا۔ تم کو اس کی اطاعت چاہیے نہ کہ اپنی قوم کی پچھ' جس پر وہ فضل فرمائے تم اس کے غلام بن جاؤ۔ یا اللہ تعالیٰ بڑی مہربانی والا ہے۔ کسی کو اپنی خاص رحمت سے مخصوص فرما دینا بھی اس کی مہربانی ہے۔ کسی زمین کو زعفران کی پیداوار کے لئے مخصوص فرماتا ہے' کسی کو تیل و کوئلہ' سونے چاندی کے لئے ایسے ہی کسی انسان کو نبوت کے لئے مخصوص فرما دیتا ہے کسی کو ولایت کے لئے' کسی کو خاص ہدایت کے لئے۔ یا اللہ تعالیٰ بڑی فضیلت سے موصوف ہے۔ اس کی شان مخلوق کے وہم و گمان سے برتر ہے۔ شعر

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا   پہچان گیا میں تیری پہچان یہ ہی ہے

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ہر شخص اپنے دین کو اعلیٰ اور اپنی قوم کو افضل سمجھتا ہے۔ خواہ کتنا ہی گمراہ ہو۔ دیکھو علمائے یہود نے ہدایت کو اپنے میں منحصر سمجھا حالانکہ بدترین گمراہ تھے۔ **لطیفہ** کسی نے ایک چمار سے پوچھا کہ دنیا میں اتنی قومیں ہیں کیا تمہارے سوا کسی کو نجات بھی ہے۔ وہ بولا ہرگز نہیں۔ کہا ذرا غور تو کرکسی کی بھی نجات ہے۔ وہ بولا نجات تو کسی کی نہیں۔ ہاں مسلمان شاید عذاب سے بچ جائیں۔ کیونکہ جب وہ کہتے ہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو اس میں ہمارے لال گرو کا نام آجاتا ہے۔

پیر ما خس است مارا ہمیں بس است

دوسرا فائدہ: ہدایت پر وہ ہی ہے جسے اللہ ہدایت دے۔ رب تعالیٰ جس کی تعریف کرے خواہ اسے سارا جہان برا کہے مگر وہ اچھا ہے۔ اور جو رب تعالیٰ کے نزدیک برا ہو خواہ تمام دنیا اسے اچھا کہے برا ہی ہے۔ جیسا کہ هدی اللہ سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** نبوت جس کسی کو ملتی ہے محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے۔ اس میں استحقاق کا دخل نہیں جیسا کہ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** اللہ کی رحمت تنگ نہیں بہت وسیع ہے۔ اس کو تنگ سمجھنے والا خود تنگ نظر ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبوت کو کسی قوم سے خاص ماننا طریقہ یہود ہے کہ وہ اسے بنی اسرائیل سے خاص مانتے تھے اور حضور (علیہ السلام) کی نبوت کا صرف اس لئے انکار کرتے تھے کہ آپ بنی اسمٰعیل میں سے ہیں۔ لہٰذا جو کوئی نبوت کو اولاد ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ خاص مان کر مرزا قادیانی کو محض اس لئے نبی نہیں مانتا کہ وہ اولاد ابراہیم علیہ السلام سے نہیں۔ وہ درحقیقت یہود کا پیروکار ہے۔ رب تعالیٰ کی رحمت عام ہے جسے چاہے نبوت سے نوازے' اسے خاص کون کر سکتا ہے (مرزائی) **جواب:** اس کا جواب خود اس آیت کریمہ میں موجود ہے۔ کہ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔ بے شک اسکی رحمت عام ہے مگر جب وہ خود ہی کسی رحمت کو کسی قوم کے لئے خاص کر دے تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون۔ نبوت' امامت' قضا صرف مردوں کے لئے خاص کر دی گئیں۔ عورتوں کو اس سے محروم رکھا۔ زمین مکہ کو حج کے لئے خاص کر دیا۔ دوسرے خطوں کو اس سے محروم رکھا کہ سوا مکہ معظمہ کے حج کہیں نہیں ہوتا۔ یہ تو روحانیات کا حال ہے۔ جسمانیت میں دیکھو تو یہ ہی رنگ نظر آئے گا۔ زمین کشمیر کو سرسبزی و شادابی پھل پھول کے لئے خاص فرما دیا۔ زمین حجاز کو خشک ریتلا بنایا۔ ایسے ہی ابراہیم علیہ السلام کے بعد سارے پیغمبر اولاد ابراہیم علیہ السلام سے ہی ہوئے۔ خود انہوں نے دعا فرمائی تھی وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔ (بقرہ: ۱۲۴) خدایا میری ذریت میں نبی پیدا فرمانا۔ خود رب تعالیٰ نے فرمایا وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ۔ (عنکبوت: ۲۷) ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں نبوت اور کتاب خاص فرما دی۔ آپ کے بعد کوئی نبی ایسا نہ آیا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے نہ ہو۔ یہود کا بنی اسرائیل کے لئے نبوت کو خاص ماننا توریت کے خلاف تھا مگر

مسلمانوں کا اولاد ابراہیم علیہ السلام کے لئے نبوت خاص ماننا قرآن کریم سے ثابت ہے۔ رب کی رحمت کو خود رب خاص فرما سکتا ہے نہ کہ کوئی اور۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ بڑے فضل والا ہے اور اس کا فضل ہمیشہ جاری اور نبوت بھی ایک فضل ہے پھر وہ ختم کیوں ہوگئی۔ چاہیے کہ دیگر نعمتوں کی طرح اس کا سلسلہ بھی باقی رہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ یہودیانہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر نبوت ختم مان کر عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرتے تھے۔ (مرزائی) **جواب:** نبوت ختم نہیں ہوئی بلکہ نئے نبی کا آنا بند ہوگیا۔ ہمارے حضور ﷺ کی نبوت قیامت تک ہے۔ آپ کی موجودگی میں کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں، فرمادیا گیا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ (مائدہ: ۳) یہود کا موسیٰ علیہ السلام کو خاتم النبیین ماننا توریت کے خلاف ہے کہ توریت میں حضور علیہ السلام کی آمد کی خبر دی تھی۔ مسلمانوں کا حضور علیہ السلام کو خاتم النبیین ماننا قرآن کریم سے ثابت۔ قرآن کریم میں حضور علیہ السلام کو خاتم النبیین کا لقب دیا اور کسی پیغمبر کو یہ لقب عطا نہ فرمایا۔ ہر چیز اپنے وقت میں نعمت ہے۔ بے وقت ہو تو زحمت و عذاب ہے۔ بارش اس وقت تک رحمت ہے جب تک کہ کھیتی کچی ہو۔ کھیت پک جانے پر عذاب۔ دین کی کھیتی پک چکی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ کا اعلان ہو چکا۔ اب نئی نبوت آنا کھیت کو خراب ہی کرے گا۔ **تیسرا اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ بنی اسرائیل میں صدہا پیغمبر آئے مگر بنی اسمٰعیل میں صرف ہمارے نبی ﷺ۔ اسی لئے تو یہود گھبراتے تھے کہ بنی اسمٰعیل کا خاندان، خاندان نبوت ہی نہیں پھر اس میں نبی کیسے۔ اگر اس خاندان میں بھی نبی آتے رہتے تو اہل کتاب کو اس اعتراض کا موقعہ نہ ملتا۔ **جواب:** سارے پیغمبر تاروں کی مثل ہے اور ہمارے نبی ﷺ سورج ہیں۔ آٹھویں آسمان پر ہزاروں تارے مگر چوتھے آسمان پر صرف سورج ہی ہے۔ ایک ملک میں حکام بہت سے رہ سکتے ہیں مگر بادشاہ ایک ہی رہے گا۔ یہود اس راز کو نہ سمجھے۔

تفسیر صوفیانہ

جیسا کہ ایمان صدہا اوصاف کی جڑ ہے کہ مومن کے جسم اور روح پر اعمال صالح کا باغ لگا دیتا ہے۔ ایسے ہی حسد بدعملیوں کی اصل ہے یہود کی یہ ساری حرکتیں محض حسد سے تھیں۔ اگرچہ حسد جبلت انسانی میں داخل ہے جسے خدا بچائے وہ ہی اس سے محفوظ رہتا ہے مگر علماء سوء کو یہ بیماری خاص طور پر ہوتی ہے کہ وہ جس عالم کو اپنے سے افضل پاتے ہیں جل جاتے ہیں۔ علمائے یہود حاسد ہی تھے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ چندلوگ حساب سے پہلے جہنم میں جائیں گے۔ ظالم حکام، خائن تاجر، حاسد عالم، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ تین چیزیں گناہوں کی جڑ ہیں۔ تکبر، حرص اور حسد۔ تکبر نے عزازیل کو ابلیس بنادیا۔ حرص نے قابیل کو تباہ کیا اور حسد نے بہت سے گھر برباد کردیئے۔ حاسد کی علامت یہ ہے کہ محسود کے سامنے اس کی چاپلوسی کرتا ہے اور پیٹھ پیچھے غیبت، اور مصیبت پر طعن۔ رب تعالیٰ حاسد نہ بنائے، محسود بنائے، حاسدوں کے حسد سے محسود کے فضائل ظاہر ہیں۔ جیسے آگ سے عود کی خوشبو پھیلتی ہے ہم نے حسد کے اسباب اور اس کے علاج دوسرے پارے میں تفصیل سے بیان کئے۔ جسے یہ بیماری ہو اسے چاہیے کہ ذکر اللہ کثرت سے کیا کرے اور آثار قدرت پر نظر رکھے کہ یہ اس کا بڑا علاج ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں برے عیوب سے بچائے اور مسلمانوں کے صفات عطا فرمائے۔ (از تفسیر روح البیان)

صوفیاء فرماتے ہیں کہ اس آیت میں رب تعالیٰ نے اپنے تین نام بیان فرمائے۔ واسع، علیم، ذوالفضل العظیم۔ وَاسِعٌ وسعۃ

سے بنا بمعنی گنجائش یعنی ضیق و تنگی کا مقابل واسع کے معنی ہیں وسعت والا یا وسعت دینے والا۔ پہلے معنی میں یہ حمد الٰہی ہے۔ دوسرے معنی میں حمد کے ساتھ نعت مصطفوی بھی پہلے معنی کی دو توجیہیں ہیں ایک تردیدی دوسری تبلیغی۔ تردیدی کے معنی یہ ہیں کہ اے اسرائیلیو کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی اسرائیل کو کتاب نبوت' یہ ہدایت دے کر ہمارے ہاں اسٹاک ختم ہوگیا۔ اب کسی کو یہ چیزیں دینے کی گنجائش نہ رہی' غلط ہے۔ ہم واسع ہیں' ہمارے خزانہ ہر نعمت سے بھرے ہیں مگر دیتے ہیں جان کر۔ تبلیغی معنی یہ ہیں کہ اے پوپ پادریو اگرچہ تم گناہوں' بدکاریوں' رشوت ستانیوں' میں ڈوبے ہوئے ہو مگر اب بھی توبہ کرلو ہم بڑی وسعت والے ہیں۔ ہر مجرم و بدکار کے لئے ہمارا دروازہ کھلا ہے۔ ہماری جنت بہت بڑی ہے اگر اس کے معنی ہوں' وسعت دینے والا تو مطلب یہ ہے کہ تمام بنی اسرائیلی انبیاء کی نبوتیں محدود تھیں۔ جیسے چراغ وغیرہ کی روشنی' مگر ہم وسعت دینے والے ہیں۔ ہماری مخلوق میں کوئی ہستی وسعت لینے والی بھی چاہیے۔ وہ ہی وسعت لینے والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں کہ اللہ نے انہیں وسعت دی۔ انہوں نے وسعتیں قبول کیں۔ وہ سورج ہیں تمام نبی تارے مگر رب تعالیٰ یہ وسعتیں دیتا اس کو ہے جس میں لینے کی قابلیت ہو کیونکہ وہ علیم ہے۔ اس مخلوق میں ایسی وسعتیں لینے والا صرف یہ ہی بندہ ہے۔ رب دینے میں وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ تو یہ رب سے لینے میں۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ رب فرماتا ہے۔ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ (الضحیٰ: ۱۰) بھکاری کو مت جھڑکو' محروم نہ پھیرو' دے کر بھیجو۔ سائل میں عموم ہے۔ دنیا' آخرت' جنت حتیٰ کہ رب کو بھی تم سے مانگے تو اسے دیدو یہ اسی سے کہا جائے گا جس کے پاس سب کچھ ہوگا۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ ۚ وَمِنْهُمْ
اور کتاب والوں میں سے وہ ہیں کہ اگر امین بناؤ تم انہیں ساتھ ڈھیر مال کے ادا کردے گا اور اسے طرف تمہارے
اور کتابیوں میں کوئی وہ ہے کہ اگر تو اس کے پاس ایک ڈھیر امانت رکھے وہ تجھے ادا کردے گا
مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَیْهِ
اور ان میں سے وہ ہیں کہ اگر امین بناؤ اشرفی کا تو نہ ادا کرے اسے طرف تمہارے مگر جبکہ ہمیشہ رہو تم
اور ان میں سے کوئی وہ ہے کہ اگر ایک اشرفی اس کے پاس امانت رکھے تو وہ تجھے پھیر کر نہ دے گا مگر جب تک
قَآىِٕمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ
اوپر اس کے کھڑے یہ اس سبب سے ہے کہ انہوں نے کہا کہ نہیں ہے اوپر ہمارے بیچ بے پڑھوں کے
اس کے سر پر کھڑا رہے یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں ان پڑھوں کے معاملے میں ہم پر کوئی
سَبِیْلٌ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ
کوئی راہ اور کہتے ہیں اور اللہ کے [illegible] جانتے ہیں [illegible] جو

مواخذہ نہیں اور اللہ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھتے ہیں ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا
اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧٦﴾
پورا کرے عہد اپنا اور پرہیزگار رہو پس تحقیق اللہ محبت فرماتا ہے پرہیزگاروں سے
عہد پورا کیا اور پرہیزگاری کی تو بیشک پرہیزگار اللہ کو خوش آتے ہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ یہود اپنے کو دینی مراتب کا مالک کہتے ہیں اور اپنے سواء سب کو گنہگار جانتے ہیں۔ اب ان کے اعمال کا قبیحہ دکھا کر ان کے اس دعوے کی تردید کی جارہی ہے کہ خیانت' بدعہدی ان کے دن رات کے اعمال ہیں۔ پھر کس منہ سے یہ اپنے کو بڑا کہتے ہیں۔ گویا پہلے ان کا دعویٰ نقل کیا گیا تھا اور اب اس کی تردید ہورہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی دینی خیانتوں کا ذکر تھا کہ انہوں نے توریت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ۔ اب ان کے معاملات کی خیانت کا ذکر ہے۔ گویا دو خیانتوں میں سے ایک کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا اور دوسری خیانت کا ذکر اب ہورہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ یہودی ہمیشہ مسلمانوں کے نقصان کے خواہاں ہیں کہ ان کے ایمان چھیننے کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ مسلمانوں کے مالی دشمن بھی ہیں۔ انہیں جب موقعہ مل جائے تو مسلمانوں کو مالی نقصان پہنچانے میں کوتاہی نہیں کرتے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں یہود کی علمی خیانت کا ذکر تھا کہ یہ توریت کی ان آیتوں کو چھپاتے ہیں جن میں نبی آخر الزمان (علیہ السلام) کی نعت ہے۔ اب ان کی مالی خیانت کا ذکر ہے تاکہ مسلمان سمجھ جائیں کہ یہ ہمارے دینی دشمن بھی ہیں اور دنیوی بھی کیونکہ دنیا دار لوگ دنیوی دشمن سے بہت بچتے ہیں۔ دینی دشمن سے چنداں پرہیز نہیں کرتے۔

شانِ نزول

ایک قریشی نے عبداللہ ابن سلام کے پاس بارہ سو اوقیہ یعنی اڑتالیس ہزار دینار امانت رکھے۔ جب اس نے مانگے تب آپ نے بلاحیل و حجت اس کے حوالے کر دیئے۔ دوسرے شخص نے فنحاص ابن عازورا یہودی کے پاس ایک اشرفی امانت رکھی مگر جب مانگنے گیا تو فنحاص انکار کر گیا کہ مجھے نہ دی تھی۔ تب یہ آیۃ کریمہ نازل ہوئی جس میں عبداللہ ابن سلام کی تعریف اور فنحاص کی مذمت کی گئی (تفسیر کبیر و خازن) ایک روایت یہ ہے کہ کسی شخص نے کچھ یہود سے زمانہ کفر میں لین دین کیا تھا پھر وہ مسلمان ہوگیا اور اسلام لانے کے بعد اس یہودی سے اپنا قرضہ مانگا۔ یہودی بولا کہ چونکہ تم بے دین ہوگئے ہو اس لئے میں تمہارا قرض نہیں ادا کروں گا اگر اپنا قرض چاہتے ہو تو اسلام چھوڑ دو۔ تب یہ آیت کریمہ اتری۔ (تفسیر کبیر)

تفسیر

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ۔ اہل کتاب کے معنی پہلے ذکر ہوچکے ہیں کہ اس کے معنی ہیں آسمانی

کتاب ماننے کا دعویٰ کرنے والا عام یہودی عیسائی یا ان کتابوں کی اہلیت رکھنے والے۔ یعنی علمائے یہود و نصاریٰ۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں اہل کتاب سے سارے کتابی مراد ہیں خواہ عیسائی ہوں یا یہودی کیونکہ خیانت کی بیماری سب ہی میں تھی لیکن حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ اس سے عیسائی مراد ہیں۔ اور اگلے مِنْهُمْ سے یہودی کیونکہ عیسائیوں میں امانت داری غالب تھی اور یہود میں خیانت غالب۔ مگر شان نزول اس قول کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ جملہ حضرت عبداللہ ابن سلام کی تعریف میں نازل ہوا اور وہ پہلے یہودی تھے نہ کہ عیسائی۔ غالب یہ ہے حضرت عبداللہ ابن سلام کی امانت داری کا یہ واقعہ ان کے اسلام لانے سے پہلے کا ہے کیونکہ اگر اسلام کے بعد کا ہوتا تو انہیں اہل کتاب نہ فرمایا جاتا بلکہ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے تذکرہ ہوتا۔ بلکہ اس جناب کی اسی امانت داری کی برکت سے انہیں ایمان' عرفان' تقویٰ صحابیت جیسے مرتبے حق تعالیٰ نے دیئے۔ غیر مسلم کی نیکیاں بھی انہیں دنیا و آخرت میں مفید ہو جاتی ہیں۔ تا منہُ امانت سے بنا۔ باب فتح یفتح کا مضارع ہے مگر باب افتعال کے معنی میں ہے کیونکہ کسی کے پاس امان رکھنے کے لئے ایتمان آتا ہے۔ امین وہ جو امانت لے۔ مؤتمن وہ جو کسی کے پاس امانت رکھے۔ (کبیر و روح المعانی) امانت اصل میں امان تھا۔ چونکہ امین امانت کے مال کو اپنے حفظ و امان میں لے لیتا ہے نیز امانت داری کی برکت سے امین اللہ تعالیٰ کی امان میں آجاتا ہے۔ نیز خود امین پر امانت ضائع ہو جانے پر تاوان لازم نہیں ہوتا۔ وہ تاوان سے امان میں ہوتا ہے۔ ان وجوہ سے اسے امانت کہتے ہیں۔ امانت کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ودیعت بھی امانت کی ایک صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ امانت دار بندے کو کبھی ایمان نصیب کر دیتا ہے۔ امانت داری بڑی اہم و اعلیٰ صفت ہے۔ بعض نے کہا دس لاکھ درہم اور بعض کے خیال میں بارہ سو اوقیہ یعنی اڑتالیس ہزار دینار قنطار ہے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ بیل کی کھال بھر کر مال قنطار کہلاتا ہے۔ (تفسیر کبیر) مگر پہلا قول زیادہ قوی ہے۔ یؤدِّہٖ میں ہ کا مرجع قنطار ہے۔ اور اِلَيْكَ میں ہر مسلمان سے خطاب یعنی اہل کتاب میں بعض ایسے امانت دار بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک ڈھیر مال امانت رکھ دو تو طلب کے وقت بلا حیل و حجت ادا کر دیتے ہیں۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ۔ مِنْهُمْ کا مرجع اہل کتاب ہیں۔ حق یہ ہے کہ دینار عجمی لفظ ہے اصل میں دِنّار تھا۔ پہلے نون کو تخفیف کے لئے ی سے بدل دیا مگر ابن ابی حاتم نے مالک ابن دینار سے نقل کیا کہ یہ لفظ عربی ہے۔ اصل میں دین نار تھا۔ ایک نون گرا دیا گیا۔ دین بمعنی دین اور نار بمعنی آگ اسے دینار اس واسطے کہتے ہیں کہ جو اسے حلال طریقہ سے لے تو اس کے حق میں دین ہے اور جو حرام ذریعہ سے حاصل کرے اس کے حق میں آگ (روح المعانی) رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا۔ (النساء: ۱۰) مال و دولت اگر اچھی راہ سے آئے اور اچھی راہ جائے کہ حلال ذریعہ سے حاصل کیا جائے رضاء الٰہی میں خرچ ہو تو وہ مال دین ہے کہ دین کے بہت سے کام مال سے ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ' حج' جہاد' صدقات' قربانی' خدمت والدین۔ مسجدوں خانقاہوں کی تعمیر مال ہی سے ہوتی ہے۔ دین و دنیا کے بہت سے کام مال پر موقوف ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا۔ (النساء: ۵) اور اگر حرام ذریعہ سے آئے اور حرام جگہ خرچ ہو تو دوزخ کی آگ ہے۔ دین اور آگ ایسا اجتماع دینار و درہم کے سوا اور جگہ نہیں۔ دینار کا وزن چوبیس قیراط ہے۔ ایک قیراط تین جو گویا بہتر (۷۲) جو اس کا وزن ہے۔ پہلے دس درم یعنی ڈھائی روپے کا ہوتا تھا مگر اب سونے کی گرانی کی وجہ سے زیادہ قیمتی

ہے۔اس کا ترجمہ ہے اشرفی۔شاید اس کے موجد کا نام اشرف ہوگا۔اس لئے اسے اشرفی کہا جانے لگا۔یعنی بعض اہل کتاب وہ ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک اشرفی بھی امان رکھ دو تو بھی خیانت کر جائیں ادا نہ کریں۔اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا۔ یہ عام حالات یا عام اوقات سے استثناء ہے۔اس سے پہلے لَا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ کا حال یا ظرف پوشیدہ ہے۔مَا مصدریہ ہے اور یہ جملہ بمعنی مصدر ہو کر ظرف یا حال ہے۔قائم قیام سے بنا جسکے لغوی معنی ہیشگی اور ثبوت ہیں۔رب تعالیٰ فرماتا ہے۔يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ۔ اور فرماتا ہے۔دِيْنًا قِيَمًا۔ (انعام:۱۶۱) بمعنی دائم ثابت غیر منسوخ (کبیر) اصطلاح میں قیام کھڑے ہونے کو کہتے ہیں یا تو یہاں یہ ہی معنی مراد ہیں یا مجازی معنی۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں قیام سے تقاضا' مطالبہ یا مقدمہ مراد ہے۔(کبیر) امام حسن فرماتے ہیں کہ قیام سے مراد پکڑ لینا اور اس کے ساتھ ساتھ پھرنا یا تقاضا کرنا ہے۔تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ اس آیت کی اصل عبارت یوں ہے۔لَا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ فِيْ حَالٍ مِنَ الْاَحْوَالِ يَا فِيْ وَقْتٍ مِنَ الْاَوْقَاتِ اِلَّا حَالَ دَوَامِ قِيَامِكَ يا وَقْتِ دَوَامِ قِيَامِكَ۔یعنی بعضے اہل کتاب ایسے نادہند ہیں کہ وہ کسی صورت میں امانت کی ایک اشرفی بھی ادا نہ کریں سوا اس کے کہ تم ان کے سر پر سوار رہو۔یا ان سے تقاضا کرتے رہو۔یا ان پر مقدمہ کر دو۔یا اسے پکڑ لو کہ بغیر لئے نہ چھوڑو۔ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا۔ ذٰلِكَ سے نادہندگی کی طرف اشارہ ہے جو لَا يُؤَدِّهٖ سے معلوم ہوئی۔یہ مبتدا ہے اور بِاَنَّهُمْ الخ خبر' هُمْ کا مرجع مَنْ ہے۔چونکہ اس سے جماعت مراد تھی۔اس لئے ضمیر جمع لائی گئی۔لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ۔ یہ جملہ قَالُوْا کا مقولہ ہے۔عَلَيْنَا سے سارے اہل کتاب مراد ہیں۔اُمِّيّٖنَ امی کی جمع ہے۔جس کی تحقیق دوسرے پارہ میں ہو چکی۔یہاں اتنا سمجھ لو کہ یا اس سے ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے لوگ مراد ہیں۔یا بے پڑھے لوگ جو تحریر اور حساب کتاب سے ناواقف ہوں یا بے دین۔سبیل کے معنی ہیں۔راستہ یہاں اس سے ذریعہ یا وسیلہ مراد ہے۔تفسیر خازن نے فرمایا کہ یہاں سبیل معنی گناہ اور حرج ہے یعنی یہود کی یہ خیانت اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر مکہ والوں یا بے دینوں کے مال کھا لینے میں کوئی گناہ نہیں۔کیونکہ ہم خدا کے بیٹے اور پیارے ہیں۔یا یہ لوگ بے دین ہیں اور بے دین کا مال ہر طرح حلال۔یا یہ مطلب کہ ہم پر بے پڑھوں کا مال ہضم کر لینے میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ ان کے پاس نہ کوئی تحریر ہے نہ گواہ کسی طرح ہم سے مال وصول نہیں کر سکتے۔غرضکہ یہود اپنے اس جرم کو جائز قرار دیتے تھے۔رب تعالیٰ نے ان کی تردید اس طرح فرمائی کہ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ۔ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔توریت شریف میں اس گناہ کی کہیں اجازت نہیں دی گئی۔پھر نادانی سے نہیں بلکہ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ وہ اپنا فریب خود جانتے ہیں۔بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى۔ بَلٰى نعم اور ای وجیر۔سب جواب کے حروف ہیں بمعنی ہاں مگر فرق یہ ہے کہ نعم نفی کے اثبات کے لئے آتا ہے۔بلیٰ منفی کے اثبات کے لئے یہود نے کہا تھا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ۔ ہم پر مسلمانوں کا مال کھانے میں گناہ نہیں۔رب تعالیٰ نے بلیٰ فرما کر اس منفی کا ثبوت کر دیا۔یعنی ہاں ضرور گناہ ہے۔مَنْ اَوْفٰى الخ نیا جملہ ہے۔جو بَلٰى کے مضمون کو ثابت کر رہا ہے۔مَنْ یا موصولہ ہے یا شرطیہ۔اس سے مراد سارے انسان ہیں۔خواہ کسی خاندان کے ہوں' کسی نسل' کسی ملک کے اور کسی زمانہ کے مَنْ فرما کر یہودی تردید فرمائی کہ نسل موسوی کا آدمی رب کا پیارا ہے۔اَوْفٰى ایفاء سے بنا بمعنی خوب پورا کرنا' عهده کی ضمیر یا من کی طرف لوٹتی ہے جو کہ عہد کا فاعل ہے۔یا رب کی

طرف جو عہد کا فاعل ہے...... یا مفعول ہے۔ اس عہد سے سارے وعدے مراد ہیں خواہ بندوں سے کئے جائیں یا رب تعالیٰ سے لہٰذا یہ جملہ ساری عبادات اور معاملات کو شامل ہے۔ وعدہ عام ہے عہد خاص کہ عہد وہ وعدہ ہے جو مشہور و معلوم ہو۔ اس کے معلوم رہنے کا اہتمام کر لیا گیا ہو۔ تحریر گواہی وغیرہ یہاں عہد فرما کر اشارۃً فرمایا گیا کہ اگر وعدہ بھول جائے اور بھول کی وجہ سے پورا نہ ہو سکے تو وعدہ والا مجرم نہیں۔ علماء یہود توریت میں پڑھتے تھے کہ امانت ادا کرنا بہت ضروری ہے پھر نہ کرتے تھے۔ لہٰذا وہ عہد کی مخالفت کرتے تھے۔ اِتَّقٰی اَوْفٰی پر معطوف ہے۔ وقٰی سے بنا بمعنی ڈرنا اور بچنا یہاں دونوں معنی درست ہیں۔ یعنی جو رب تعالیٰ سے ڈرے یا گناہوں سے بچے۔ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ یہ جملہ مَن اَوْفٰی کی جزا نہیں بلکہ دلیل جزا ہے۔ جزا پوشیدہ ہے۔ بجائے ضمیر کے مُتَّقِيْنَ فرمانے میں اس جانب اشارہ ہے کہ تقویٰ ذریعہ محبوبیت ہے۔ یعنی ہاں غیر کا مال کھانے میں ضرور گناہ ہے۔ جو کوئی اپنے مالی جانی یا عام وعدے یا رب تعالیٰ کے یا نفس کے عہد پورے کرے اور خدا سے ڈرے گناہوں سے بچے وہ خدا کا پیارا ہے کیونکہ اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے نہ کہ گنہگاروں کو۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو یہود اپنے کو خدا کا پیارا اور باقی سب کو بے دین سمجھتے ہیں لیکن ان کی حالت یہ ہے کہ ان میں بعض تو ایسے دیانت دار ہیں کہ اگر تم ان کے پاس بہت سا مال امانت رکھ دو تو وہ طلب کے وقت بلا حیل و حجت تمہیں ادا کر دیں گے نہ ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ مقدمہ بازی کی حاجت اور ان میں بعض ایسے خائن ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک اشرفی بھی امانت رکھ دو تو کسی صورت میں یہ ادا نہ کریں۔ ہاں اگر تم ان کے سر پر سوار رہو اور تقاضا کئے جاؤ انہیں پکڑ لو۔ ان پر مقدمہ چلاؤ تو مجبوراً ادا کر دیں ورنہ خوشی سے دینے والے نہیں۔ ان کی یہ جرأت اس لئے ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان بے پڑھے مکہ والوں کے مال کھا جانے میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ یہ بے پڑھے لوگ ہیں۔ لکھنا پڑھنا جانتے نہیں۔ گواہی شہادت اور مقدمے کے طریقوں سے واقف نہیں۔ کسی طرح ہم سے مال نہیں لے سکتے۔ یا ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا مال کھا جانے میں ہم پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ ہم خدا کے پیارے ہیں۔ دنیا کی ساری چیزیں ہماری ہیں۔ ساری قومیں ہماری غلام ہیں۔ ہم ان کے مولیٰ۔ جیسے مولیٰ اپنے غلام کا مال ہر طرح کھا سکتا ہے۔ ایسے ہی ہم مسلمانوں کا مال جس طرح چاہیں شیر مادر کی طرح ہضم کر جائیں۔ ہم پر کوئی گناہ نہیں کیونکہ مسلمانوں کے جان و مال سب حلال ہیں۔ جس طرح ہو سکے انہیں قتل کر دو۔ اور جیسے ممکن ہو ان کا مال کھا لو۔ خیال رہے کہ یہ لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے توریت میں خیانت کی کہیں اجازت نہ دی۔ یہ جانتے بھی ہیں اور پھر جھوٹ بولتے ہیں ہاں یقیناً غیر کا مال کھا جانے میں سخت گناہ ہے۔ اللہ کا پیارا تو وہ ہے جو اپنے سارے معاہدے پورے کرے۔ خواہ نفس کا ہو یا بندوں کا یا رب تعالیٰ کا اور رب تعالیٰ سے خوف کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے نہ کہ گنہگار و فجار کو یہ لوگ فاسق و فاجر ہوتے ہوئے خدا کے دوست کیسے بن سکتے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** امانت داری انسان کی بہت اعلیٰ صفت ہے اگرچہ کافر میں ہی یہ صفت موجود ہو۔ رب تعالیٰ امانتدار کو کبھی ... دنیاوی آفات بھی دفع فرما دیتا

ہے۔ ہمارے حضور علیہ السلام کو یہ صفت ایسی کامل عطا ہوئی تھی کہ ظہور نبوت سے پہلے کفار آپ کو محمد امین کہتے تھے۔ اب بھی روضۂ مطہرہ کی جالی میں یہ عبارت ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَادِقُ الْوَعْدِ الْاَمِيْنِ۔ حضرت عبداللہ ابن سلام کو امانتداری کی برکت سے ایمان وغیرہ ملا اور حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تین اسرائیلی ایک غار میں پھنس گئے تو انہوں نے اپنے نیک اعمال کے توسل سے دعائیں کیں۔ ایک شخص نے اپنی امانت و دیانت کے صدقہ سے دعا کی کہ مولیٰ میرے کھیت کا مزدور اپنی مزدوری کے دانے چھوڑ گیا تھا۔ بارہ برس کے بعد لینے آیا جبکہ میں نے اس کے دانے بو کر غلہ کے ڈھیر جانوروں کے گلے لونڈی وغلام جمع کر لئے تھے۔ میں نے وہ سب اس کے حوالہ کر دیئے۔ میرے مولیٰ اس امانت داری کے طفیل نجات دے۔ انہیں نجات ملی۔ غرضکہ امانتداری بہت اعلیٰ صفت ہے۔ **دوسرا فائدہ:** بعض کفار مسلمانوں کا مال کھانا' انہیں ایذا دینا ثواب سمجھتے ہیں۔ ہندوستان کے ہندوؤں کا یہ ہی حال ہے۔ اس کا تجربہ ان لوگوں کو خوب ہے جنہیں بنیوں سے لین دین کا اتفاق رہتا ہے۔ یہ ہزار بہانے سے مسلمان سے پیسہ نکلوانا چاہتے ہیں جو کفار اپنا معاملہ صاف بھی رکھتے ہیں۔ وہ فقط اپنی تجارت کے فروغ کے لئے نہ کہ مسلمان کی خاطر۔ **تیسرا فائدہ:** معاملات کا اثر عبادات عقائد پر پڑتا ہے۔ خراب معاملے والا عبادات مکمل نہیں کر سکتا۔ اور عبادات میں سستی کرنے والے کے عقائد بھی خطرہ میں ہیں۔ بے نمازی قرض سے نہیں ڈرتا۔ اور خائن نماز چھوڑنے سے خوف نہیں کرتا کیونکہ نماز بھی رب کا قرض ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کی بددیانتی ان کا مردود ہونا ثابت فرمایا۔ **چوتھا فائدہ:** کفار کو امانت دینا' ان کی امانتیں لینا' ان کے ساتھ قرض وغیرہ مالی معاملات کرنا' جائز ہیں۔ جیسا کہ اِنْ تَاْمَنْهُ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** ادائے امانت بہت ضروری ہے۔ خواہ مسلمان کی امانت ہو۔ خواہ کافر حربی کی یا ذمی کی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جاہلیت کی ساری چیزیں میرے قدم کے نیچے ہیں۔ سوا امانت کے کہ وہ ضرور ادا کی جائے گی۔ خواہ نیک کی ہو یا بد کی (معانی) نیز ہجرت کے وقت حضور علیہ السلام کے پاس ان خونخوار کفار کی امانتیں تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ تم ان کی امانتیں ادا کر کے مدینہ پاک پہنچ جانا۔ **چھٹا فائدہ:** کفار کی گواہی ایک دوسرے پر صحیح ہے کیونکہ گواہی بھی ایک امانت ہے۔ جب مالی امانت جائز تو یہ بھی جائز۔ نیز رب تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو امین فرمایا۔ لہٰذا وہ گواہی کے قابل ہوئے۔ (احکام القرآن)
ساتواں فائدہ: وعدہ پورا کرنا بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ سے معلوم ہوا۔ **مسئلہ:** ناجائز وعدے پورے کرنا حرام' ناجائز مال کی امانت رکھنا سخت جرم ہے۔ مثلاً کسی نے کسی سے شراب پینے یا چوری یا کفر کرنے کا وعدہ کیا ہو تو ہرگز پورا نہ کرے یا چوری کے مال کی ہرگز امانت نہ رکھے بلکہ اسے مالک یا حاکم کے پاس پہنچا دے۔ **مسئلہ:** کسی کا راز اور دینی علم بھی امانت ہے۔ جو عالم ضرورت کے وقت مسئلہ بیان نہ کرے یا جو کسی کا راز ظاہر کر دے وہ خائن ہے۔ **مسئلہ:** غیر ضروری مسائل وخطرناک راز امانت نہیں۔ جس مسئلہ کی ضرورت نہ ہو اور اس کے بیان کرنے سے فتنہ پھیلتا ہو وہ بیان نہ کیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کی تعمیر بنیاد ابراہیمی پر مکمل نہیں مگر درست نہ فرمایا۔ کیونکہ موجودہ کعبہ میں حرج تھا نہیں اور درست کرنے میں فتنہ کا اندیشہ تھا۔ اسی طرح اگر کسی نے مسلمانوں کے خلاف خطرناک سازش کی اور ہم کو پتہ لگ جائے تو ہم پر اس کا اظہار کرنا ضروری ہے تاکہ مسلمان نقصان سے بچیں۔ خود قرآن کریم نے جابجا کفار اور منافقین کی خفیہ

سازشوں کو ظاہر فرمایا۔ **مسئلہ:** مسلمان کا خفیہ عیب بیان کرنا بھی خیانت ہے مگر جس عیب کے چھپانے میں دینی نقصان ہو' اس کا اظہار ضروری ہے۔ اس لئے محدثین راویوں کے عیوب بیان کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی جس لڑکی سے شادی کرنا ہو اس کے اوصاف یا عیوب شوہر سے بیان کر دینا نہ جرم ہے نہ خیانت تا کہ اس سے زوجین کی اگلی زندگی اچھی گزرے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے لازم آتا ہے کہ کفار کی گواہی مسلمان پر جائز ہو کیونکہ گواہی بھی ایک امانت ہے اور کفار کی امانت تو جائز' لہٰذا گواہی جائز ہونی چاہیے؟ **جواب:** بے شک کفار کی گواہی مسلمان کے حق میں کافر کے خلاف جائز ہے کیونکہ یہ ادائے امانت ہے لیکن مسلمان کے خلاف گواہی کا جواز اس آیت سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کی ممانعت دوسری آیات اور احادیث سے ثابت ہے۔ (احکام القرآن) **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر وعدہ پورا کرنیوالا پرہیز گار رب تعالیٰ کو پیارا ہے تو چاہیے کہ اس قسم کے مشرکین و کفار بھی خدا کو پیارے ہوں جو عہد پورے کریں' پرہیز گار ہوں؟ **جواب:** کوئی کافر پرہیز گار نہیں ہو سکتا کہ پرہیز گاری میں ایمان شرط ہے' پرہیز گار وہ مومن ہے جو نیک اعمال کرے' برائیوں سے بچے۔ ہاں وعدہ پورا کرنے والا کافر بد عہد کافر سے ہلکا ہوگا۔ کفر کے درجات مختلف ہیں بلکہ کفار کا اپنے وعدے پورے کرنا' معاملات صاف رکھنا' رضاء الٰہی کے لئے نہیں بلکہ اپنے مفاد کی خاطر ہیں۔ جب کوئی وعدہ ان کے مفاد کے خلاف ہو تو اسے توڑ دیتے ہیں۔ انہیں کوئی خوف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ آج پاکستان میں تجربے ہو رہے ہیں۔ اگر خدا توفیق دے تو صحیح معنی میں خوف خدا کی بنا پر مسلمان ہی ایفاء وعدہ کرتا ہے۔ رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق فرمایا وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی (نجم: ۳۷) اور جو اچھا کام اپنے مفاد کی خاطر کیا جائے نہ کہ رضاء الٰہی کے لئے وہ رب کی محبوبیت کا ذریعہ نہیں۔ **تیسرا اعتراض:** رب تعالیٰ نے عہد پورے کرنے کی تعریف فرمائی نہ کہ وعدے پورے کرنے کی تو کیا وعدہ خلافی بری نہیں؟ **جواب:** اس کا جواب ابھی تفسیر میں گذر گیا کہ بھولے ہوئے وعدے پورے نہ کرنا گناہ نہیں عہد وہ ہی وعدہ ہے جو معہود و معلوم ہو اسی لئے یہاں عہد فرمایا۔ وعدہ عہد' میثاق کا فرق ہم نے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ (آل عمران: ۸۱) کی تفسیر میں عرض کیا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** مسلمان بھی حربی کفار اور مرتدین کا مال حلال سمجھتے ہیں تو اگر یہود نے بھی مسلمانوں کے مال کو اس لئے حلال جانا ہو کہ یہ ہمارے دین کے مرتدین ہیں اور ہماری ان سے جنگ ہے تو کیا مضائقہ۔ ایک ہی چیز مسلمانوں کے لئے حلال ہے اور یہودی کے لئے حرام (آریہ) **جواب:** معاذ اللہ یہ اسلام پر کھلا ہوا بہتان ہے۔ اسلام نے خیانت کی کبھی اجازت نہ دی۔ ہم ابھی فوائد میں عرض کر چکے کہ حضور علیہ السلام نے ان کفار مکہ کی امانتیں ادا فرمائیں جو خون کے پیاسے تھے۔ اسی لئے کافر بھی آپ کو محمد ﷺ امین کہتے تھے۔ بحالت جنگ کفار کے مال بطور غنیمت لینا جائز ہے۔ آج بھی سلاطین دشمن کے مال پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ برطانیہ نے جرمنی کے ہتھیار زمین وغیرہ پر قبضہ کیا۔ یہ کوئی عیب نہیں۔ ایسے ہی مرتد چونکہ حکومت ربانی کا باغی ہے۔ اس لئے اس کا زمانہ کفر کا کمایا ہوا مال بادشاہ اسلام ضبط کر سکتا ہے۔ آج بھی حکومتیں باغیوں کے مال ضبط کر لیتی ہیں۔ کسی مسلمان کو یہ جائز نہیں کہ کفار کی امانتیں مار لیں۔

پانچواں اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کی تعریف مسلمان کی ... کرنا جائز ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ

نے بعض اہل کتاب کی امانت داری کی تعریف فرمائی مگر مسلمان سمجھتے ہیں کہ کافر کو اچھا کہنا کفر ہے۔ (آریہ) **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہ امانتدار وہ ہی تھے جو پہلے یہودی تھے اور اب مسلمان ہو چکے تھے لہٰذا اس میں مسلمانوں کی تعریف ہے نہ کہ کفار کی۔ دوسرا یہ کہ کفار کی ...... واقعی نیکیوں کا ذکر کرنا منع نہیں۔ یہ تو عین انصاف ہے۔ ہم دن رات انگریزوں کے انتظام ان کی پابندی وقت وغیرہ کا ذکر کیا ہی کرتے ہیں۔ کفار کے کفر کی تعریف کرنا کفر ہے اور بلاوجہ خوشامد میں ان کی جھوٹی سچی تعریفیں کرنا ناجائز۔ یہ تو قرآن پاک کی حقانیت ہے کہ وہ دشمن کی واقعی نیکی کا بھی اعتراف فرمالیتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

قالب کا قلب پر صورت کا معنی پر اثر پڑتا ہے۔ عبادات کی درستی کے لئے اپنے معاملات ٹھیک رکھو اور عقائد کی اصلاح کے لئے اپنے اعمال کی اصلاح کرو۔ دل ایک آئینہ ہے۔ کفر اس کا زنگ ہے اور معاملات و عبادات کی خرابی اس کے گرد و غبار۔ کوئی شخص اعمال خراب رکھ کر رب تعالیٰ کا پیارا نہیں بن سکتا۔ دیکھو رب تعالیٰ نے یہود کی مردودیت ان کی خرابی معاملات و عبادات سے ثابت کی۔ ولی وہ ہے۔ جس کی قوت نظری و عملی دونوں درست ہوں۔ اسی طرح عہد پورا کرنا' ولایت کے لئے بہت ضروری ہے کیونکہ عبادات کا مدار دو چیزوں پر ہے۔ رب تعالیٰ کے حکم کی تعظیم اور خلق پر مہربانی اور وفائے عہد میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ لہٰذا اس کے بغیر کوئی عابد ہو سکتا ہی نہیں۔ اسی لئے حدیث شریف میں ارشاد ہوا کہ خیانت' جھوٹ اور بدعہدی منافق کی علامت ہے۔ خیال رہے کہ عہد رب تعالیٰ سے بھی ہے۔ نفس سے بھی اور مخلوق سے بھی۔ وہ ہی شخص وفادار ہے جو سارے عہدوں کو پورا کرے۔ یعنی شریعت پاک کی پوری اتباع کرے (از روح البیان) صوفیاء فرماتے ہیں کہ امین دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جسے صرف امانت کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا ہو کہ ضائع نہ ہونے دے۔ دوسرا وہ جسے امانت میں تصرف کرنے کا حکم دیا گیا ہو کہ مالک کے حکم کے ماتحت اس میں عمل درآمد کرے اور مطالبہ پر بخوشی اس کی امانت واپس کر دے۔ دل پر میل نہ لائے۔ جو اسمیں کھرا نکلا وہ امین ہے۔ جو غلط رو ہوا وہ خائن ہے۔ تمام انسان اللہ تعالیٰ کے امین ہیں۔ اور انسان کے اعضاء' مال' اولاد وغیرہ اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں جن کے متعلق رب تعالیٰ نے احکام نافذ فرمائے ہیں کہ اس طرح ان میں تصرف کرتے رہو۔ اور جب ہم اپنی امانت واپس مانگیں تو بلا عذر ہمارے حوالہ کر دو۔ جو ان ہدایات پر کاربند رہا وہ امین ہے اور جو رب کے فرمان کے خلاف عمل کرتا رہا اور مال یا اولاد یا جان جانے پر بے صبری کرتا رہا وہ ہی خائن ہے۔ امین پر اللہ کی رحمتیں ہیں۔ خائن پر قہر۔ حضرت طلحہ کا پیارا بچہ ان کے پیچھے فوت ہو گیا۔ سفر سے واپس آنے پر ان کی زوجہ نے صبح کے وقت خبر دی کہ اے ابو طلحہ اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی ہے۔ ملول نہ ہو۔ اس خبر پر حضور انور ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی۔ حضرت طلحہ کا اولاد اور اولاد کی اولاد سے اللہ نے گھر بھر دیا۔ سو بچوں کا خاندان دیکھ کر آپ کی وفات ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ
تحقیق وہ لوگ جو خریدتے ہیں بدلے عہد اللہ کے اور قسموں اپنی کے قیمت تھوڑی یہ لوگ
وہ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے ذلیل دام لیتے ہیں

لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ

نہیں ہے حصہ واسطے ان کے بیچ آخرت کے اور نہ کلام کرے گا ان سے اللہ اور نہ دیکھے گا طرف ان کے

آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے بات کرے نہ ان کی طرف نظر فرمائے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

دن قیامت کے اور نہ پاک فرمائے گا ان کو اور واسطے ان کے عذاب ہے دردناک

قیامت کے دن اور نہ انہیں پاک کرے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی مالی خیانت کا ذکر تھا۔ اور ظاہر ہے کہ خائن جھوٹی قسمیں ضرور کھاتا ہے۔ اسلئے اب جھوٹی قسم کے عذاب کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ یہود جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ خدا پر جھوٹ نہ باندھنا اور دین میں خیانت نہ کرنا ہر سمجھدار پر لازم ہے۔ لہٰذا اب جھوٹ اور خیانت کی سزا بیان ہو رہی ہے۔ گویا پہلے جرم کا ذکر تھا۔ اب اسکی سزا کا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی مالی خیانت کا ذکر تھا۔ اب انکی اس خیانت کا ذکر ہے جو انہوں نے عہد الٰہی میں کی۔ گویا امانتیں چند قسم کی ہیں۔ مال کی امانت' علم کی امانت' وعدہ اور عہد کی امانت' کتاب اللہ کی امانت' لہٰذا اس کے مقابل خیانتیں بھی چند قسم کی ہوں گی۔ پچھلی آیت میں انکی ایک خیانت کا ذکر تھا۔ اب دوسری خیانتوں کا ذکر ہے۔

شان نزول

اس آیت کے شانِ نزول میں چند روایتیں ہیں۔ (۱) یہ آیت علمائے یہود اور روسائے یہود یعنی ابو رافع کنانہ ابن ابی حقیق اور کعب ابن اشرف اور حیی ابن اخطب کے بارے میں نازل ہوئی۔ جنھوں نے توریت کے اس عہد کو چھپایا۔ اور ان آیتوں کو بدلا جو حضور علیہ السلام کے بارے میں تھیں اور قسم کھاگئے کہ یہ آیتیں رب کی ہیں۔ محض اس لئے کہ ہماری آمدنی کم نہ ہو جائے (تفسیر خازن وخزائن) (۲) یہود جو کہتے تھے کہ مسلمانوں کا مال مارنے میں ہم پر کوئی گناہ نہیں جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا اور اس پر قسم بھی کھاتے تھے کہ یہ حکم الٰہی ہے۔ اس کی تردید میں یہ آیت اتری۔ (خازن) (۳) اشعث ابن قیس کندی فرماتے ہیں کہ یہ آیت میرے بارے میں اتری کہ میرا ایک شخص سے زمین میں جھگڑا تھا' وہ مدعی تھا۔ میں مدعی علیہ مقدمہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں گیا۔ حضور علیہ السلام نے اس مدعی سے فرمایا کہ گواہ لاؤ۔ اس نے عرض کیا کہ میرے پاس گواہ نہیں۔ پھر مجھ سے فرمایا قسم کھا۔ میں قسم کے لئے تیار ہوا۔ تب یہ آیت کریمہ اتری جس سے میں قسم سے باز رہا۔ اور زمین مدعی کو دے دی۔ یہ ہی قول جریج کا ہے۔ (۴) مجاہد نے فرمایا کہ یہ آیت کریمہ اس تاجر کے بارے میں اتری' جو اپنا مال فروخت کرنے کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتا ہے۔ (۵) ابن ابی اوفی فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے بازار میں سامان رکھا۔ ایک گاہک نے کچھ قیمت لگائی۔ وہ بولا [illegible] میں نے نہ دیا۔ تب یہ آیت

اتری (احکام القرآن) (۶) احمد اور ابن جریر نے عدی ابن ابی عمیرہ سے روایت کی کہ ایک دفعہ امرئ القیس اور حضر موت کے کسی آدمی کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ مقدمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں آیا۔ حضور علیہ السلام نے حضرمی سے فرمایا کوئی گواہ لاؤ۔ اس نے کہا میرے پاس گواہ کوئی نہیں۔ فرمایا تو امرئ القیس کی قسم پر فیصلہ ہوگا حضرمی نے عرض کیا کہ پھر تو امرئ القیس میری زمین لے لیں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کوئی اپنے بھائی کا مال مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائے وہ حق تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس پر ناراض ہوگا۔ امرئ القیس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) جو کوئی سچی قسم بھی نہ کھائے اور اپنا مال چھوڑ دے۔ فرمایا اس کے لئے جنت ہے۔ عرض کیا حضور گواہ رہیں۔ میں نے زمین کو چھوڑ دیا۔ تب یہ آیت کریمہ اتری (روح المعانی' کبیر و خازن وغیرہ)

تفسیر

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ...... انّ اس جگہ بولا جاتا ہے جہاں کسی کو کچھ تردد ہو۔ چونکہ بڑے گناہوں کو تو اکثر لوگ گناہ سمجھتے ہیں۔ گنہگار کو برا جانتے ہیں ہمیشہ نہیں کرتے۔ زنا' چوری' شراب خوری کا یہ ہی حال ہے مگر چھوٹے گناہ جھوٹی قسمیں جھوٹے وعدے وغیرہ ایسے ہیں کہ انہیں عموماً لوگ کم برا جانتے ہیں۔ ان کی پرواہ نہیں کرتے دن رات کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ چھوٹے گناہ اس چھوٹی چنگاری کی طرح ہیں جو کبھی گھر جلا دیتی ہے۔ اس لئے رب نے یہ آیہ کریمہ اِنَّ سے شروع فرمائی۔ حق یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ سے مراد سارے انسان ہیں۔ مومن ہوں یا کافر۔ اونچے خاندان کے ہوں یا نیچے کے اور اگر اس میں جنات بھی داخل ہوں تو تعجب نہیں۔ ہر وعدہ خلاف جھوٹی قسمیں کھانے والا ان پانچوں سزاؤں کا مستحق ہوگا۔ یَشْتَرُوْنَ اشراء" سے بنا بمعنی خریدنا۔ یہاں بدلنا مراد ہے۔ بلاعوض مال دینا ھبہ ہے۔ اگر رضاء الٰہی کے لئے دیا جائے تو صدقہ ہے۔ اور رضاء انسان کے لئے دیا جائے تو ہدیہ اگر چھوٹا بڑے کو دے تو اس ہدیہ کو نذرانہ کہتے ہیں۔ اور بڑا چھوٹے کو دے تو عطیہ اور بالعوض مال دینے کی دو صورتیں ہیں اگر منافع کے عوض دیا ہے تو اجارہ یا کرایہ ہے اور اگر مال کے عوض دیا ہے تو بیع و شرا یعنی خرید و فروخت ایمان متاع روحانی ہے۔ اس کے عوض مال لینا بیع و شرا قرار دیا گیا۔ ایک جگہ رب تعالیٰ نے اسے تجارت فرمایا ہے۔ کہ فرمایا فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ (بقرہ: ۱۶) بِعَهْدِ اللّٰهِ کی ب عوض کی ہے۔ عہد کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے اور اس سے یا تو وہ عہد مراد ہے جو میثاق کے دن رب تعالیٰ نے سب سے لیا۔ یا وہ عہد مراد ہے جو اسلام لاتے وقت بندہ اللہ سے کرتا ہے۔ یا وہ عہد مراد ہے جو یہود سے توریت میں لیا گیا تھا۔ یعنی حضور علیہ السلام پر ایمان لانا۔ اور آپ کی اطاعت کرنا۔ بعض نے فرمایا کہ عہد سے مراد عقل کی ہدایت ہے کہ ہر شخص کی عقل اسے برائی سے روکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ عہد اللہ سے وہ وعدے ہوں جو اللہ کو ضامن دے کر لوگوں سے کئے گئے۔ اس میں جھوٹ بھی ہے اور اللہ کے نام کی توہین بھی۔ ایمان یمین کی جمع ہے۔ اس کی لفظی تحقیق پہلے ہو چکی یا تو اس سے وہ جھوٹی قسمیں مراد ہیں جو تجارت وغیرہ میں کھائی جاتی تھیں یا وہ قسمیں مراد ہیں جو یہود نے حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کی کھائیں۔ ثمن قلیل سے رشوت یا تجارت کا نفع مراد ہے۔ (روح البیان و معانی) اس مال کو ثمن فرمانے میں اس جانب اشارہ ہے کہ دنیا غیر مقصود اور آخرت مقصود ہے کیونکہ تجارت میں قیمت غیر مقصود ہوتی قلیل فرما کر یہ بتایا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت آخرت کے مقابل

تھوڑی ہے کیونکہ یہ فانی ہے اور وہ باقی۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ سے کئے ہوئے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی قیمت خرید لیتے ہیں کہ تھوڑے مال کے لالچ میں رب تعالیٰ کا عہد بھی توڑ دیتے ہیں۔ اور جھوٹی قسم بھی کھا لیتے ہیں۔ خیال رہے کہ اگر سکے کا چلن ہو تو وہ پیارا ہے لیکن اگر اس کا چلن بند ہو جائے کہ اس کے عوض سامان نہ ملے تو یہ محض بوجھ ہے کہ نہ کھانے پینے میں آئے اور نہ اوڑھنے بچھانے میں جیسے موجودہ نوٹ وغیرہ دنیا اگر آخرت کا ذریعہ ہے تو قدر والی ہے۔ اگر اس سے آخرت نہ خریدی جائے تو محض بوجھ ہے۔ ان کے لئے پانچ سزائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ ...... اُولٰٓئِکَ عہد توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کی طرف اشارہ ہے۔ خلاق بمعنی حصہ اگرچہ نصیب اور کفل کے معنی بھی حصہ ہیں اور خلاق کے معنی بھی حصہ مگر اکثر نصیب اور کفل عام حصہ کو کہتے ہیں۔ رحمت کا حصہ ہو یا عذاب کا اور خلاق رحمت کے حصہ کو بولا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا عذاب میں بھی حصہ نہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ رب کی رحمت میں حصہ نہیں۔ آخرت سے مراد دنیا کے بعد کی زندگی ہے خواہ برزخ کی ہو یا قیامت کی یا اس کے بعد یعنی ان لوگوں کے لئے قبر کی راحت' قیامت کی راحت' جنت و حوض کوثر وغیرہ سے کچھ حصہ نہیں۔ سب سے محروم ہیں۔ فِی الْاٰخِرَةِ۔ فرما کر یہ بتایا گیا کہ ایسوں کی محرومی آخرت میں ظاہر ہوگی۔ دنیا میں تو ہر مومن و کافر متقی و مجرم سب ہی اس کی رزاقیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں وہی آخروی حصوں سے محروم ہیں کہ ان کے اعمال آخرت کا توشہ نہیں بنتے۔ یا اس لئے کہ انہیں دنیا میں آخرت کی تیاری کی توفیق ہی نہیں ملتی دنیاوی کام خود رغبت سے کرتے ہیں۔ اخروی کام سے جی چراتے ہیں۔ اور یا اس طرح کہ نیک کاموں میں اخلاص نصیب نہیں ہوتا۔ جس سے ان کی نیکیاں آخرت کا توشہ نہیں بنتیں۔ اگر یہ لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں تو لوگوں کو خوش کرنے کو۔ دوسرا یہ کہ وَلَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ۔ ان سے رب تعالیٰ کلام بھی نہ فرمائے گا۔ یا تو کلام محبت کی نفی ہے یعنی ان سے دل خوش کن کلام نہ فرمائے گا۔ رہا عتاب' حساب' جھڑک۔ وہ یقیناً فرمائے گا۔ یا مطلق کلام کی نفی یعنی بلاواسطہ کلام نہ کرے گا حساب و عتاب فرشتوں کے ذریعہ ہوگا۔ اس صورت میں لا یکلم بمعنی مستقبل ہے اور یہی ظاہر ہے کہ اس سے قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ جملہ بمعنی حال ہے۔ یعنی رب تعالیٰ ان سے دنیا میں کلام نہیں فرماتا۔ کیونکہ وہ قرآنی آیات سے نفع حاصل نہیں کرتے' بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ اس سے بہت سے نفعے پاتے ہیں۔ تو گویا رب تعالیٰ ان سے کلام ہی فرما رہا ہے۔ مگر یہ بعید ہے۔ (روح المعانی) اللہ تعالیٰ دنیا میں بندوں سے کئی طرح کلام کرتا ہے۔ کبھی خواب میں دیدار دے کر کبھی بذریعہ الہام و القاء کبھی نماز و تلاوت قرآن کی حالت میں کہ اچانک بندے کے دل میں درد و سوز و گداز ایسی پیدا ہوتی ہے کہ سبحان اللہ! یہ رب کے کلام فرمانے کا اثر ہوتا ہے۔ اس کا کلام یہاں کے کان نہیں سنتے۔ بلکہ دل سنتا ہے۔ یہ کلام مومن کو نصیب ہوتا ہے۔ کافر اس سے محروم ہیں وہ تڑپ و پھڑک سے بے خبر ہے۔ شعر

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے — مسلمان نہیں خاک کا ڈھیر ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دل مرتضےٰ سوز صدیق دے

وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ یَنْظُرُ نظر سے بنا بمعنی آنکھ پھیر کر دیکھنا۔ رب تعالیٰ کے لئے یہ معنی ممکن نہیں کیونکہ وہ آنکھ وغیرہ سے پاک ہے۔ اس لئے بعض نے فرمایا کہ نظر نہ کرنے سے ان کی اہانت کرنا اور ان پر ناراضی کا اظہار مراد ہے بعض

نے کہا کہ یہاں نظر بمعنی رحمت ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ اُنْظُرْ اِلَیَّ اس سے مطلب ہوتا ہے اِرْحَمْنِیْ۔ مجھ پر رحم کر۔ بعض نے فرمایا کہ اس نظر سے مراد مطلقاً دیکھنا ہے نہ کہ آنکھ سے دیکھنا۔ قیامت میں مسلمان رب تعالیٰ کو دیکھیں گے اور رب تعالیٰ ان پر نظر رحمت فرمائے گا۔ کفار رب تعالیٰ کے دیدار سے بھی محروم اور اس کی نظر رحمت سے بھی بعض نے فرمایا کہ یہاں نظر سے مراد احسان کرنا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں فُلَانٌ لَا یَنْظُرُ اِلَیَّ فلاں مجھ پر احسان نہیں کرتا (کبیر و روح المعانی وغیرہ) بہر حال نظر کے معنی دیکھنا' رحم فرمانا' احسان کرنا' مہلت دینا۔ ان سب معنی سے مسلمانوں پر رحمت نظر ہوگی۔ کفار ان سے محروم رہیں گے۔ چوتھا یہ کہ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ۔ یُزَکِّیْ تزکیہ سے بنا۔ بمعنی پاک کرنا یا پاک کہنا (صفائی بیان کرنا) یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی رب تعالیٰ قیامت میں نہ ان کے گناہ معاف کر کے انہیں اس میل سے پاک کرے گا بلکہ سزا دے گا۔ یا رب تعالیٰ ان کا تزکیہ یعنی تعریف نہ فرمائے گا۔ مسلمانوں کی تعریفیں بہت ہوں گی کہ فرمایا جائے گا' سَلَامٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (الرعد: ۲۴) وغیرہ اور ہوسکتا ہے کہ یہ بمعنی حال ہو۔ یعنی رب تعالیٰ دنیا میں ایسوں کی تعریف نہیں کرتا۔ پرہیزگار مسلمانوں کی تعریف سے قرآن پاک اور دیگر آسمانی کتابیں پر ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ۔ (التوبہ: ۱۱۲) اور فرماتا ہے۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔ (حم السجدہ: ۳۱) (کبیر و خازن وغیرہ) نیز مسلمان دنیا میں بہت طریقوں سے پاک و صاف ہوتا رہتا ہے۔ بیماریاں' تکالیف' پریشانیاں بھی اسے پاک کرتی رہتی ہیں اور عبادات' ریاضات کے پانی سے بھی وہ دھلتا رہتا ہے۔ کفار مصیبتوں میں اور زیادہ کفر کرتے ہیں اور عبادات سے محروم۔ پانچواں یہ کہ۔ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ گزشتہ چار چیزوں میں فضائل کی نفی تھی۔ اب رذائل کا ثبوت ہے۔ لَھُمْ کا مرجع وہ ہی اَلَّذِیْنَ ہیں۔ اس کے مقدم ہونے سے حصر کا پتہ لگا۔ عَذَابٌ عذب سے بنا بمعنی روکنا۔ سزا کو اسی لئے عذاب کہتے ہیں کہ وہ جرم کو روکتی ہے۔ اسی سے ہے عذب یعنی میٹھا پانی کہ وہ پیاس کو روکتا ہے۔ اَلِیْمٌ الم سے بنا بمعنی تکلیف اور درد یعنی ان لوگوں کے لئے تکلیف دہ یا دردناک عذاب ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے عذاب آخرت مراد ہے۔ اور ممکن ہے کہ دنیوی عذاب مراد ہو۔ جیسے رسوائی بدنامی یا جیسے یہود پر جزیہ مقرر ہونا۔ لڑائیوں میں قتل ہونا وغیرہ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دنیا اور آخرت کے دونوں عذاب مراد ہوں۔ (روح المعانی)

خلاصہ تفسیر

اے محبوب ﷺ جو ذلیل مال کی خاطر اور حقیر دنیا کے لئے اللہ سے کئے ہوئے عہد توڑ دیتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھا لیتے ہیں۔ گویا اعلیٰ کے عوض ادنیٰ چیز خرید لیتے ہیں ان کے لئے پانچ سخت سزائیں ہیں۔ ایک یہ کہ دوسری زندگی میں انہیں رحمت الٰہی سے کوئی حصہ نہیں۔ نہ قبر میں آرام پائیں نہ حشر میں راحت نہ جنت میں حور و قصور نہ رضائے رب غفور۔ دوسرا یہ کہ رب تعالیٰ کے شرف کلام سے محروم رہیں گے کہ پروردگار پرہیزگاروں سے کلام رحمت فرمائے گا اور ان سے نہیں یا تو بلا واسطہ کوئی کلام نہ فرمائے گا جو کچھ ہوگا فرشتوں کے ذریعہ سے یا عتاب اور عذاب کا کلام فرمائے گا۔ تیسرا یہ کہ قیامت کے دن ان پر نظر رحمت بھی نہ فرمائے گا۔ یہ خدا تعالیٰ کے دیدار سے بھی محروم ہوں گے اور اس کی نظرِ رحمت سے بھی۔ اور نہ ان کے گناہ معاف کر کے انہیں پاک کرے اور نہ ان کی تعریف فرمائے۔ اتنی محرومیوں کے باوجود ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ جس کی عظمت بیان سے باہر ہے۔

خیال رھے: کہ اگر یہ آیت یہود وغیرہ کفار کے بارے میں ہے جیسا کہ ایک روایت سے معلوم ہوا تو اس میں کسی قسم کی تاویل وتوجیہہ کی ضرورت نہیں۔ ظاہری معنیٰ پر ہے۔ اور اگر گنہگار مسلمانوں کے حق میں ہے تو ان سب سزاؤں میں اول اور بخشش نہ ہونے کی قید لگے گی۔ یعنی اگر ان کی شفاعت وبخشش نہ ہو تو اولاً وہ لوگ ان فضائل سے محروم رہیں گے۔ پھر سزا پا کر جنت' دیدار الٰہی اور ثناء رب اور نظر رحمت کے مستحق ہوں گے کیونکہ ہر مسلمان کا انجام جنت ہے۔ جہنم میں ہیشگی کفار کے لئے خاص ہے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ تین شخص وہ ہیں کہ قیامت میں حق تعالیٰ نہ ان سے کلام فرمائے نہ ان کی طرف نظر رحمت کرے اور نہ انہیں گناہوں سے پاک کرے اور انہیں دردناک عذاب ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے یہ آیت کریمہ پڑھی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) وہ کون لوگ ہیں۔ فرمایا ازار کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا اور احسان جتانے والا اور اپنی تجارت کو جھوٹی قسم سے رواج دینے والا۔ حضرت ابوامامہ کی حدیث میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کسی مسلمان کا حق مارنے کے لئے جھوٹی قسم کھائے اللہ اس پر جنت حرام اور دوزخ لازم کرتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) اگرچہ تھوڑی ہی چیز ہو۔ فرمایا اگرچہ ببول کی شاخ ہی کیوں نہ ہو۔ (تفسیر خزائن العرفان) مسلمانوں کو اس آیت اور ان احادیث سے عبرت پکڑنی چاہیے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جھوٹی قسم بڑا گناہ ہے۔ خصوصاً جبکہ اس سے بندہ کا حق مارا جائے کہ پھر وہ حق العباد ہے جو توبہ سے بھی معاف نہیں ہوتا۔ **دوسرا فائدہ:** قسم سے انسان اس مال کا مالک نہیں ہوسکتا جو بظاہر غیر کا ہو' لہٰذا اگر مال کسی کے قبضہ میں ہے اور دوسرا آدمی اس کا مدعی ہے تو چونکہ قبضہ قبضے والے کی ملکیت کی دلیل ہے۔ لہٰذا دوسرا آدمی گواہی پیش کرے قسم نہیں کھا سکتا۔ جیسا کہ آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** قسم سے حق ثابت نہیں ہوتا بلکہ خصومت دفعہ ہوسکتی ہے۔ (احکام القرآن) **چوتھا فائدہ** جو تاجر جھوٹی قسمیں کھا کر کھوٹے مال کو گاہک کی نظر میں کھرا کر دکھائیں یا اپنے غیر مقبول مال کو جھوٹی قسموں سے مقبول ثابت کر کے بیچیں وہ سخت گنہگار ہیں اور اس آیت میں داخل۔ **پانچواں فائدہ:** مومنوں خصوصاً پرہیزگاروں کو یہ چاروں نعمتیں ملیں گی۔ ان کا آخرت میں حصہ بھی ہوگا۔ ان سے اللہ تعالیٰ کلام رحمت بھی کرے گا۔ ان پر نظر رحمت بھی فرمائے گا۔ انہیں پاک وصاف بھی فرمائے گا اور انہیں دردناک عذاب بھی نہ دے گا کیونکہ یہ پانچوں چیزیں کفار کے لئے بطور عذاب ہیں تو ان شاء اللہ مسلمان اس سے محفوظ ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** سزاو جزا کی جگہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ دنیا میں رب کے دستر خوان پر دوست و دشمن سب ہی کھا رہے ہیں۔ یہاں اس کی رحمانیت کا ظہور ہے۔ اور وہاں اس کی رحیمیت کی جلوہ گری ہوگی۔ جیسا کہ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ فرمانے سے معلوم ہوا کہ ارشاد ہوا ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں یعنی دنیا میں حصہ ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر یہ آیت مسلمانوں کے حق میں ہو تو دوسری آیتوں اور صدہا حدیثوں سے اس کا تعارض ہوگا۔ کیونکہ مسلمان کے لئے آخرت میں [illegible] کے کلا[illegible] مطلب کیا؟ **جواب:** ہم تفسیر

میں عرض کر چکے کہ اس صورت میں اس آیت میں دو قیدیں لگائی ہوں گی۔ ایک اولاً کی دوسرے عدم مغفرت کی یعنی اگر ان کی مغفرت نہ ہو تو اول ہی سے انہیں یہ درجات نہ ملیں گے۔ بلکہ سزا پاکر۔ **دوسرا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا کہ ایسے مجرموں سے نہ رب تعالیٰ بات کرے گا اور نہ انہیں دیکھے گا۔ اور دوسری آیت میں ہے کہ کفار سے فرمایا جائے گا۔ اِخْسَئُوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ (مومنون: ۱۰۸) یاذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ۔ (الدخان: ۴۹) اور کیا خداوند تعالیٰ صرف نیک کاروں کو دیکھے گا بدکاروں سے غافل رہے گا؟ (آریہ) **جواب:** ہم تفسیر میں اس کے دو جواب دے چکے۔ ایک یہ کہ یہاں کلام سے رحمت کا کلام مراد ہے اور کفار سے کلام عقب ہوگا۔ دوسرا یہ کہ یہاں کلام سے بلاواسطہ کلام مراد ہے۔ کفار سے جو کچھ گفتگو ہوگی فرشتوں کے واسطہ سے۔ ایسے ہی نظر سے محض دیکھنا مراد نہیں۔ جس کا مقابل بے خبری اور لاعلمی ہے بلکہ نظرِ رحمت مراد ہے۔ اسی لئے لَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ فرمایا نہ لَا یَنْظُرُهُمْ۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جھوٹی قسمیں کھانے والے کی معافی نہ ہوگی کہ فرمایا گیا۔ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ۔ اور دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ (النساء: ۱۱۶) شرک کے سوا سارے گناہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔ ان میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب:** اگر یہ آیت کفار کے حق میں ہے اور ایمان سے ان کی وہ جھوٹی قسمیں مراد ہیں جو اسلام کے خلاف کھایا کرتے تھے۔ تب تو آیتوں میں تعارض کا احتمال ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ قسمیں کفر ہیں۔ اور کفر کی بخشش کیسی۔ اور اگر یہ آیت گنہگار مسلمانوں کے حق میں ہے اور ایمان سے مراد وہ جھوٹی قسمیں ہیں جو دنیوی معاملات میں لوگ کھالیتے ہیں تب جواب یہ ہے کہ یہاں عدل کا ذکر ہے اور اس آیت میں فضل کا ذکر یعنی تقاضائے انصاف یہ ہے کہ ایسوں کی خطا معاف نہ کی جائے کیونکہ انہوں نے جھوٹی قسموں سے بندوں کے حق مارے ہیں اور معافی گناہوں کی ہوتی ہے نہ کہ حقوق العباد کی۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب رب تعالیٰ فضل کرے گا تو کفر کے سوا ہر جرم معاف کر دے گا۔ اس طرح کہ اپنے حقوق خود معاف فرما دے گا اور حقوق العباد صاحب حقوق سے معاف کرا دے گا یا یہ کہا جائے کہ تزکیہ اور مغفرت میں فرق ہے۔ مغفرت صرف گناہ کی معافی ہے۔ اور تزکیہ میں گناہ سے معافی بھی ہے اور رفع درجات بھی۔ یہاں تزکیہ کی نفی ہے اور وہاں مغفرت کا ثبوت۔ مطلب یہ ہوا کہ حقوق العباد مارنے والے مجرموں کو ابتداءً بلند درجے ملیں گے۔ اگر ملیں گے تو مغفرت کے بعد۔ واللہ اعلم۔ یا کہا جائے کہ یہ سب سزائیں بخشش نہ ہونے کی صورت میں ہیں تو گویا آیت وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ نے ان تمام آیتوں کو نہ چاہنے سے مقید کر دیا۔ **چوتھا اعتراض:** لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ میں لَهُمْ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا کہ دردناک عذاب صرف عہد کے توڑنے والوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کے لئے تو کیا یہ لوگ کفار سے بدتر ہیں کہ صرف ان کے لئے دردناک عذاب ہو نہ کہ کفار کے لئے...... **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ عہد توڑنے والوں میں کفار بھی داخل ہیں بلکہ سب کو عذاب عہد توڑنے ہی کا ہوگا۔ کسی نے ایمان کا عہد توڑا کسی نے نیک کاری اور فرمانبرداری کا۔ دوسرا یہ کہ حصر اضافی ہے نہ کہ حقیقی یعنی بمقابلہ بعض گنہگاروں کے عہد توڑنے والوں کا عذاب سخت ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جو لوگ اپنے میثاق والے عہد کو توڑ کر اور حق سے منہ موڑ کر اور اپنی کھائی ہوئی قسموں سے دل پھیر کر نفسانی صفات اور نفع حواس

کو خرید لیتے ہیں ان کے لئے نسیم روحانی اور اخلاق ربانی میں سے کوئی حصہ نہیں' کیونکہ نفس اور روح اور دنیا و آخرت ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ایک کا سنبھالنا دوسرے کا بگاڑنا ہے۔دنیا سنبھالنے والا اپنی آخرت تباہ کر لیتا ہے اور نفس کو قوی کرنے والا اپنی روح کو کمزور کر لیتا ہے۔نہ ایسوں سے حق تعالیٰ قیامت میں کلام فرمائے اور نہ دنیا میں اپنا کلام سمجھائے۔نفس کا پیروکار قرآن سمجھ سکتا ہی نہیں۔نیز قیامت میں ان پر توجہ اور رحمت کی نظر نہ فرمائے گا تاکہ ان کے گناہ معاف ہوں اور وہ جنت کے مستحق ہوں۔اور نہ انہیں نفسانی صفات سے پاک کرے جو جہنم کے ایندھن بننے کا باعث ہیں۔ایسے لوگ ہمیشہ برے اخلاق میں پھنسے رہیں گے۔اس کے علاوہ انہیں دنیا کی گرفتاری اور مرتے وقت کی بے قراری' قبر کی تنگی' قیامت کی وحشت اور دوزخ کی تپش کا دردناک عذاب ہے۔(روح البیان) خیال رہے کہ ہر روح کو اپنے خالق سے عشق حقیقی ہے۔دنیا میں نفس کی وجہ سے اس عشق کا احساس نہیں۔قیامت میں یہ حجاب اٹھا دیا جائے گا۔وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ۔(اعراف: ۴۳) حسد اور کینہ کا حجاب نہ رہے گا۔تب آتش عشق' انتہائی جوش پر ہوگی۔اس وقت محبوب حقیقی کا حجاب بڑا عذاب ہوگا۔لَا یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ۔ اور وَلَا یُکَلِّمُهُمۡ۔ اس کا بیان ہے کہ ہم ان سے بولیں گے نہیں۔ہم انہیں دیکھیں گے نہیں۔آتش فراق میں تڑپائیں گے۔رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں محجوبین میں سے نہ کرے۔محبوبین میں سے کرے۔صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ دنیا میں انسان تین قسم کے ہیں۔ایک وہ جن کا ہر کام آخرت کے لئے حتیٰ کہ کھانا پینا' سونا جاگنا' چلنا پھرنا بھی کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں رب کے لئے کرتے ہیں۔دوسرے وہ جن کا ہر کام دنیا کے لئے ہے۔حتیٰ کہ نماز و روزہ بھی کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں نفس و شیطان کے لئے کرتے ہیں یا دکھلاوے اور نام و نمود کے لئے۔تیسرے وہ جن کے بعض کام آخرت کے لئے ہیں بعض دنیا کے لئے۔پہلی قسم کے لوگ اول درجہ کامیاب ہیں۔دوسری قسم کے لوگ اول درجہ کے ناکام اور تیسری قسم کے لوگ درمیانی ہیں۔اس آیت کریمہ میں دوسری قسم کے بدنصیبوں کا ذکر ہے کہ ان پر دنیا میں بھی عذاب ہے۔آخرت میں بھی۔صوفیاء کرام کے نزدیک رب تعالیٰ کے کرم کی علامت یہ ہے کہ بندے کو گناہوں سے بچنے' نیک اعمال کرنے کی توفیق ملے۔مال ملنا کمال نہیں۔نیک اعمال ملنا کمال ہے' یہ خاص عطاء ذوالجلال۔میدان کربلا میں مظلوم دشت کربلاء مبتلا و کرب و بلا کے پاس مال نہ تھا۔اور پلید یزید کے پاس مال و منال سب کچھ تھا مگر اللہ کا فضل اس مظلوم جناب حسین پر تھا۔رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡکِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ

اور تحقیق ان میں سے البتہ ایک گروہ ہے جو موڑتے ہیں زبانوں اپنی کو ساتھ کتاب کے تاکہ سمجھو تم اس کو

اور ان میں کچھ وہ ہیں جو زبان پھیر کر کتاب میں میل کرتے ہیں کہ تم سمجھو یہ بھی

الۡکِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡکِتٰبِ ۚ وَیَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ

کتاب سے حالانکہ نہیں ہے وہ کتاب اور کہتے ہیں وہ پاس سے اللہ کے ہے

کتاب میں ہے اور وہ کتاب میں نہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے اور وہ اللہ

وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٨﴾

حالانکہ نہیں ہے وہ پاس سے اللہ کے اور کہتے ہیں وہ اوپر اللہ کے جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں
کے پاس سے نہیں ہے اور اللہ پر وہ دیدہ دانستہ جھوٹ باندھتے ہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں خیانت کی برائیوں کا ذکر تھا۔ اب یہود کی خاص خیانت یعنی تحریف کتاب کا تذکرہ ہے جو کہ تمام خیانتوں سے بدتر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں خیانت کا ذکر تھا۔ اور خیانت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مالک کے مال کا انکار کیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اس کی چیز کو اپنی ملکیت سے اس طرح خلط کر دیا جائے کہ ان میں کچھ فرق نہ رہے۔ یہ سخت تر خیانت ہے کیونکہ یہ خیانت بھی ہے اور دھوکہ بھی۔ اس آیت میں اسی کا تذکرہ ہے کہ اہل کتاب نے کتاب اللہ میں اپنی طرف سے ایسی زیادتی کی کہ ان دونوں میں فرق نہ رہا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں خیانت کی برائی اور خائن کے عذاب کا ذکر تھا۔ اور بدتر خائن وہ ہے جو متقی اور پرہیزگار کی شکل میں ہو اور لوگوں پر اپنی امانتداری کے خطبے پڑھتا پھرے۔ لہٰذا اب فرمایا جا رہا ہے۔ علمائے اہل کتاب اسی قسم کے خائن ہیں کہ کلام الٰہی کو بگاڑیں اور رب تعالیٰ کے احکام بدلیں اور پھر بھی عالم ہی کہلائیں۔

شانِ نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ دونوں کے حق میں نازل ہوئی کہ انہوں نے توریت و انجیل کو بدل دیا اور کتاب اللہ میں اپنی طرف سے جو چاہا ملا دیا۔ جیسے کعب ابن اشرف مالک ابن صیف اور حیی ابن اخطب اور ابو یاسر اور شعبہ ابن عمرو شاعر (تفسیر خزائن العرفان و روح المعانی)

تفسیر

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا. چونکہ اہل کتاب تحریف سے انکاری تھے کہ ان کے علماء نو کہتے تھے۔ ہم نے توریت و انجیل میں کوئی تحریف نہ کی اور ان کے عوام کہتے تھے کہ ہمارے علماء کے پاس نری کھری خالص توریت و انجیل موجود تھے۔ اور ممکن تھا کہ بعض سادہ لوح مسلمان بھی کہنے لگتے کہ قرآن مجید کی طرح یہ آسمانی کتب بھی محفوظ رہیں۔ اس لئے اس کو اِنَّ اور لام تاکید سے مؤکد کیا گیا۔ مِنْهُمْ کا مرجع سارے اہل کتاب ہیں۔ یہودی ہوں یا عیسائی۔ فَرِيْقٌ فرقٌ سے بنا۔ بمعنی جدائی و علیحدگی اصطلاح میں جماعت اور گروہ کے معنی میں آتا ہے کیونکہ وہ بھی دوسری جماعتوں سے علیحدہ ہوتا ہے۔ یعنی یقیناً اہل کتاب میں ایک جماعت وہ بھی ہے۔ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ. یہ جملہ فریقاً کی صفت ہے۔ يَلْوٗنَ لوىً يالَّیٌّ سے بنا بمعنی مروڑنا' پھیرنا کہا جاتا ہے لَوَّيْتَ يَدَهٗ میں نے اس کا ہاتھ مروڑ دیا۔ اور اِلْتَوٰی فلانٌ فلاں آدمی بل کھا گیا۔ اور پھر گیا۔ اسی لئے ٹالنے کو لیٌّ کہا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ لَیُّ الْوَاجِدِ ظُلْمٌ. غنی مقروض کا ٹالنا ظلم ہے۔ السنہ لسان کی جمع ہے۔ لسان مذکر بھی ہے مؤنث بھی۔ ابی عمرو ابن علاء کہتے ہیں کہ جس نے اسے مؤنث مانا۔ اس نے اس کی جمع السن قرار دی اور

جس نے مذکر مانا اس نے السنہ کہا۔ قرآن پاک سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ بالکتاب کی ب یا صلہ کی ہے یا ظرفیت کی یا ملابست کی اور جار مجرور السنۃ کا حال ہے۔ (روح المعانی) خیال رہے کہ زبان موڑنے میں چند احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ کتاب اللہ میں تحریف کرتے ہیں کہ جو آیت اتری تھی۔ اسے نہیں پڑھتے اور جو خود شامل کر دی۔ اسے پڑھتے ہیں۔ اہل عرب جھوٹ بولنے کو لیّ اللسان کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ لَوَيْتُ عَنْهُ الْخَبَرَ يَعْنِي لَغَبَّرْتُهُ بِهِ عَلٰى خَيْرٍ وَجْهِهٖ۔ (معانی) (۲) دوسرے یہ کہ آیتوں کی حرکتوں اور اعراب کو بدلتے ہیں۔ جس سے معنی فاسد ہو جاتے ہیں جیسا کہ عربی جاننے والوں پر پوشیدہ نہیں۔ زبان عبرانی بھی عربی کی طرح ایسی نازک تھی کہ اعراب بدلنے سے اس کے معانی بدل جاتے تھے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ رَاعِنَا بِاَلْسِنَتِهِمْ۔ (النساء:۴۶) کہ راعنا پڑھو تو اور معنی اور عین کو ذرا کھینچ کر راعینا پڑھو تو دوسرے معنی (کبیر) (۳) اپنی ملاوٹی عبارت کو توریت کی طرح تجوید اور ترتیل کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ جس سے دھوکہ پڑے کہ یہ کتاب اللہ ہی پڑھ رہے ہیں۔ یعنی کتاب اللہ میں اپنی زبانوں کو موڑتے ہیں کہ اس کی اصل عبارت یا اعراب بدل دیتے ہیں یا اپنی مخلوط عبارتوں کو توریت کی طرح لہجہ اور ترتیل سے پڑھتے ہیں کیوں لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ۔ یہ جار مجرور یَلْوٗنَ کے متعلق ہے۔ تَحْسَبُوْهُ میں مسلمانوں سے خطاب ہے۔ ہٗ ضمیر محرف اور تبدیل کردہ آیت کی طرف لوٹتی ہے۔ جو یَلْوٗنَ سے معلوم ہوئی تھی۔ بعض قرأتوں میں لیحسبوا ی کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں اس کا فاعل یا مسلمان ہیں۔ یا جہلاء اہل کتاب یعنی یہ حرکتیں اس لئے کرتے ہیں کہ تم ان کی شامل کردہ عبارتوں کو کتاب اللہ کی آیت سمجھو۔ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ واؤ حالیہ ہے اور جملہ لِتَحْسَبُوْهُ کی ضمیر سے حال۔ ھو کا مرجع وہ ہی تبدیل شدہ عبارت ہے۔ یعنی حقیقت یہ ہے کہ وہ عبارت کتاب اللہ کی نہیں بلکہ وہ خود ان کی اپنی ہے۔ وہ خبثا اس فریب پر ہی بس نہیں کرتے بلکہ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ لوگوں سے صراحتاً کہتے پھرتے ہیں کہ ہم نے یہ جو کچھ پڑھا۔ یہ رب تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی عبارت ہے۔ لہٰذا اس پر ایمان لاؤ۔ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ یہ واؤ بھی حالیہ ہے اور یہ جملہ ھُوَ ضمیر سے حال یعنی حال یہ ہے کہ وہ عبارتیں اللہ کی طرف سے نہیں۔ خیال رہے کہ یہ نفی یا واقع کے لحاظ سے ہے۔ یا ان کے عقیدے کے اعتبار سے یعنی حقیقتاً وہ رب کی طرف سے نہیں یا خود ان کے عقیدہ میں بھی رب کی طرف سے نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ ہماری گھڑی ہوئی عبارتیں ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ ان کے فریب دو تھے۔ ایک گھڑی عبارتوں کو اصلی کتاب سے ملا کر پڑھنا۔ دوسرا اس کو آیات ربانی کہنا۔ لہٰذا یہ ان کی تردید کی ہے اور مَاهُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ دوسرے کا رد لہٰذا عبارت میں تکرار نہیں۔ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ یہ پہلے جملہ کی گویا تفسیر ہے یعنی وہ دھوکے سے نہیں غلطی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ پر جھوٹ بولنے کے یہ معنی ہیں کہ جھوٹ بول کر اسے رب کی طرف نسبت دے دیتے ہیں کہ یہ رب کا فرمان ہے یہ سخت جرم ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب میں تین گروہ ہیں۔ ایک امانتدار دوسرا خائن جس کا ذکر پہلے ہو چکا۔ تیسرا وہ ہیں جو کتاب الٰہی میں خلط کر کے مخلوط عبارت کو زبان موڑ کر اس طرح پڑھتے ہیں کہ سننے والا یہ سمجھے کہ یہ عبارت بھی کلام اللہ ہے اور کتاب الٰہی کی آیت حالانکہ نہ وہ اللہ کا [illegible] کی آیت [illegible] ہوئی عبارت [illegible]۔ پھر اس فریب پر ہی بس نہیں کرتے

بلکہ صاف صاف کہتے ہیں کہ رب تعالیٰ کی آیتیں ہیں۔ حالانکہ وہ رب کی آیتیں نہیں بلکہ ان کی اپنی گھڑی ہوئی عبارتیں ہیں۔ یہ لوگ ایسے دلیر ہیں کہ مخلوق پر ہی نہیں بلکہ خالق پر جھوٹ باندھتے ہیں پھر خطاءً یا غلطی سے نہیں بلکہ دیدہ ودانستہ سمجھتے ہیں کہ یہ عبارتیں ہماری ہیں۔ اور کہتے ہیں اللہ کی۔

خیال رھے: کہ تفسیر روح المعانی نے اس جگہ فرمایا کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ خود توریت میں تحریف نہ ہوئی۔ اس کی آیتیں اپنے حال پر رہیں۔ یہود نے ان کے پڑھنے میں تبدیلی کی یا آیتوں کی باطل تاویلیں کیں جیسا کہ یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ سے معلوم ہوا۔ ہاں کچھ کتابیں ان کی اپنی بنی ہوئی تھیں۔ جسے وہ کتاب اللہ کہتے تھے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَيَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ (بقرہ:۷۹) اس سے معلوم بھی یہ ہی ہوا کہ مستقل کتابیں لکھ کر انہیں کتاب اللہ بتایا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ بارہا یہود سے الزامًا فرماتے تھے۔ اِئْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَا اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ اگر سچے ہو تو توریت لاؤ پڑھو۔ اگر توریت بدل چکی ہوتی تو انہیں توریت سے الزام کیوں دیا جاتا۔ مگر حق یہ ہے کہ اصل توریت وانجیل میں ہی تحریفیں ہوئیں۔ اوران میں خلط ملط کیا گیا۔ ہاں کچھ آیتیں اصل بھی تھیں۔ اوراکثر بدلی ہوئی اصل آیات سے یہود کو الزام دیا جاتا تھا۔ حدیث پاک میں ہے کہ جب تم پر یہود توریت پڑھیں تو نہ ان کی تصدیق کرو نہ انہیں جھٹلاؤ۔ اس کا ثبوت بہت سی آیتوں اور حدیثوں سے ہے۔ نیز آج موجودہ انجیلوں کا اختلاف بتارہا ہے کہ یہ انجیلیں تحریف شدہ ہیں۔ چنانچہ آج کل چار انجیلیں زیادہ مشہور ہیں۔ (۱) انجیل متی جو عیسیٰ علیہ السلام کے آٹھ سال بعد سریانی زبان میں لکھی گئی جسے بارہ حواریوں نے لکھا۔ (۲) انجیل مرقس جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ سال بعد مقام رومیہ میں افرنجی زبان میں لکھی گئی۔ (۳) انجیل لوقا جو یونانی زبان میں مقام اسکندریہ میں لکھی گئی۔ (۴) انجیل یوحنا جو عیسیٰ علیہ السلام کے پیارے دوست یوحنا نے عیسیٰ علیہ السلام کے تیس سال بعد ملک روم کے شہر افسس میں لکھی۔ اب اگر ان انجیلوں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں سخت اختلاف ملتا ہے۔

انجیلوں کا اختلاف

چنانچہ متی رسول میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دو چوروں کو بھی سولی دی گئی جن میں سے ایک حضرت مسیح علیہ السلام کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف تھا اور وہ دونوں یہود کے ساتھ مسیح علیہ السلام سے مذاق کرتے تھے مگر انجیل لوقا میں ہے کہ ان میں سے ایک عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑارہا تھا اور دوسرا آپ کی تعریفیں کررہا تھا اوراس نے کہا کہ اے مسیح (علیہ السلام) مجھے اپنی ملکوت میں یاد رکھنا۔ آپ نے فرمایا۔ اے دوست تو جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ خیال تو کرو کہ متی رسول کے لحاظ سے یہ دونوں کافر ہیں۔ اور لوقا کے لحاظ سے ایک کافر اور ایک مومن۔ اور مرقس اور یوحنا میں یہ قصہ ہی ندارد ہے۔ نیز لوقا میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ انسان کا بچہ انسان کو ہلاک کرنے نہیں آیا بلکہ انہیں زندگی بخشنے آیا ہے مگر ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ مسیح علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ انسان کا بچہ زمین پر سلامتی پھیلانے نہیں آیا بلکہ تلوار چلانے اور آگ بھڑکانے آیا ہے۔ خیال تو کرو کہ ایک کہتا ہے کہ انسان رحمت اور دوسرا کہتا ہے کہ انسان عذاب۔ نیز متی رسول میں ایک جگہ

ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بارہ شاگردوں سے فرمایا کہ تم آئندہ زمانہ میں بارہ کرسیوں پر بیٹھو گے اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کی طرح ہر ایک دیندار ہوگا۔ پھر اسی متی میں ہے کہ ان بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا نے تیس روپیہ کے عوض دشمنوں کو عیسیٰ علیہ السلام کا پتہ دے دیا بلکہ پکڑوانے کے لئے پولیس کو ساتھ لے آیا آپ نے فرمایا کہ افسوس۔ یہ شخص بد ترین مخلوق ہے۔ ذرا اختلاف دیکھو۔ ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بارہ حق پر تھے اور دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کافر ہوگیا۔ نیز متی رسول باب پندرہ آیت چوبیس میں ہے کہ جناب مسیح نے فرمایا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سواء کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صرف بنی اسرائیل کے ہی رسول ہیں مگر بعض آیات میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ میری بھیڑیں ان کے علاوہ اور بھی ہیں۔ معلوم ہوا کہ آپ بنی اسرائیل کے سوا اوروں کے بھی رسول ہیں۔ اس قسم کی باتیں دیکھنے کے لئے ہماری کتاب قرآن اور انجیل۔ نیز ہمارے رسول اور انجیل کا مطالعہ فرماؤ۔ غرضکہ انجیلوں کے اختلاف بے شمار ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود ان کتابوں میں جو تحریف ہوئی اور يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ کے یہ ہی معنی ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کتاب اللہ میں انسانی کلام اس طرح ملانا جس سے فرق نہ رہے۔ سخت جرم ہے۔ لکھنے پڑھنے بولنے غرضکہ ہر طرح کلام الٰہی اور کلام انسان میں فرق کرنا ضروری ہے۔ **مسئلہ:** قرآن پاک خط نستعلیق یعنی اردو خط میں لکھنا منع ہے بلکہ عربی خط میں لکھے اور اس میں بھی مصحف عثمانی کی پیروی کرے تاکہ انسانی اور ربانی کلام میں فرق رہے (شامی) **مسئلہ:** قرآن پاک میں سورتوں کے نام آیتوں کی تعداد اس طرح فرق کر کے لکھے۔ جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ قرآن شریف کی عبارت نہیں۔ **مسئلہ:** چونکہ اس میں اختلاف ہے کہ بسم اللہ ہر سورۃ کے ساتھ اتری ہے یا ایک جگہ لہٰذا سورتوں کے اول کی بسم اللہ عبارت کے ساتھ بلا فرق لکھ دے اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ (النمل: ۳۰) کیونکہ وہاں ہی کی آیت ہے۔ **مسئلہ:** تفسیر کو آیت سے امتیاز دے۔ یا تو آیتوں پر خطوط کھینچے یا تفسیر کی عبارت میں اعراب نہ ہوں اور آیت پر اعراب ہوں یا تفسیر کی عبارت فارسی خط میں ہو اور قرآنی آیت عربی خط میں بالکل بغیر فرق کے لکھنا درست نہیں۔ یہ سب مسائل لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ۔ سے مستنبط ہوئے یہ تو کلام اللہ ہے۔ محدثین تو حدیث میں بھی بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ امام مسلم نے باب کے عنوان حاشیہ پر لکھے۔ اصل کتاب میں صرف اسناد اور متن ہی تحریر فرمایا تاکہ ہمارا کلام کلام رسول اللہ سے خلط نہ ہو جائے۔ دیگر محدثین نے اگرچہ سب چیزیں اصل کتاب میں لکھیں مگر فرق کے ساتھ جس سے دیکھنے والا معلوم کر لیتا ہے کہ یہ محدث کی عبارت ہے اور یہ سرکار دو جہان کا فرمان ﷺ۔ **لطیفہ:** اس امت میں بھی بعض لوگ یہود سے پیچھے نہ رہے بلکہ انہوں نے ان سے چار قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اس پر گواہ ہیں کہ کچھ عبارتیں اپنی کچھ قرآن کی آیتیں ملا کر کہتے ہیں کہ یہ مجھے الہام ہوا۔ يَا اَيَّتُهَا الْمَرْءَةُ تُوْبِىْ تُوْبِىْ اِنَّ رَادُّوْهُ اِلَيْكَ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا [illegible] کپڑے میں ٹاٹ کا پیوند۔ اب

ذرا ترجمہ سنئے۔ اے محمدی بیگم (مرزا جی کی عرشی منکوحہ) توبہ کر توبہ کر (تو دوسرے کے نکاح میں کیوں چلی گئی) اے مرزا جی ہم اس عورت کو تم پر لوٹائیں گے اور تمہارے متبعین کو قیامت تک کفار پر غالب رکھیں گے۔ (حالانکہ مرتے وقت تک محمدی بیگم مرزا جی کے ہاتھ نہ آئیں) یہ ہے یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ کی کھلی مثال مگر چونکہ قرآن پاک کا رب تعالیٰ محافظ ہے۔ اس لئے یہ تحریفیں مٹ گئیں۔ قرآن اپنے اصلی نور سے جگمگاتا رہا۔ **دوسرا فائدہ:** گناہ رب کی طرف سے نہیں اور نہ رب تعالیٰ ان سے راضی ہے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا۔ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (احکام القرآن) ہاں گناہ رب کی مخلوق ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بندہ اپنے اعمال کا خود خالق ہے۔ اعمال کا خالق رب نہیں۔ چونکہ تحریف شدہ عبارتیں یہود کی تحریر تھیں۔ رب نے فرمایا مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اگر بندوں کے فعل کا رب خالق ہوتا تو بیان فرمایا جاتا کہ یہ رب کی طرف سے ہے کیونکہ میرے بندوں کا فعل ہے۔ جس کا میں خالق ہوں۔ (معتزلہ) **جواب:** یہاں فعل کی نفی نہیں بلکہ مفعول کی نفی ہے۔ یعنی یہ بناوٹی عبارات رب کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہود کا یہ کام رب کی خلق نہیں (معانی و کبیر) **دوسرا اعتراض:** یہ آیت حنفیوں پر چسپاں ہے کیونکہ وہ امام ابوحنیفہ کے قیاسی مسائل کو دینی احکام اور ربانی فرمان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا تقلید یہودیت ہے۔ (غیر مقلد) **جواب:** استغفر اللہ نہ کسی مقلد نے امام کے کلام کو رب کا کلام کہا نہ ان کے فرمان کو رب کا فرمان مانا۔ نہ ان عبارتوں کو قرآن شریف سے ملایا۔ اس فن کا نام ہی کچھ اور رکھا۔ قرآن کا نام کتاب اللہ اس فن کا نام فقہ۔ فعل یہود سے انہیں کیا تعلق۔ جیسے بے علم آدمی عالم سے کوئی مسئلہ سن کر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کتاب سے دیکھ کر بتایا ہوگا اور پھر اسے دینی حکم سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے۔ نہ عالم کو خدا سمجھتا ہے نہ اس کے کلام کو قرآن۔ ایسے ہی مقلد اپنے امام کے بارے میں یہ نیک گمان کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں قرآن و حدیث سے کہتے ہیں۔ ان کے بتائے ہوئے مسائل درخت قرآن اور شاخ حدیث کے پھل ہیں۔ بتاؤ اس میں کیا قباحت ہے۔ اگر مقلد یہودی ہیں تو ہر جاہل غیر مقلد ضرور یہودی ہے۔ خواہ ثنائی ہو یا غزنوی۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام کے کلمات گویا کتاب الٰہی ہیں اور ان کا علم در حقیقت علم لدنی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان مقبولوں کا زمین و آسمان ہی دوسرا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ لوح محفوظ ساتویں آسمان کے بھی اوپر ہے۔ جس میں سب حالات موجود ہیں مگر یہ حضرات فرماتے ہیں کہ یار کی پیشانی لوح محفوظ ہے۔ جس میں سارے کمالات موجود۔ مولانا فرماتے ہیں شعر ۔

لوح محفوظ است پیشانی یار　　　راز پنہاں می شود زاں آشکار

یہ لوگ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی زبان رب کا قلم ہے۔ ان کے فرمان رب کی کتاب جیسے اللہ کی کتاب میں تبدیلی ناممکن ہے۔ ایسے ہی ان کے منہ سے نکلے ہوئے فرامین ناممکن تبدیل ہیں۔ بعض مدعیان معرفت میں سے وہ بیہودے بھی ہیں جو عارفین کے کلمات کو زبان پھیر کر منہ بھر کر بولتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ یہ وہ ہی علم لدنی ہے۔ جو رب تعالیٰ نے عارفین کو دیا۔ اور وہ مدعیان تصوف دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارا یہ کلام اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ اور علوم لدنیہ میں سے ہے۔ حالانکہ وہ رب تعالیٰ کی طرف

سے نہیں یہ لوگ خدا پر جھوٹی تہمت باندھتے ہیں۔ان کے پاس بے معنی الفاظ اور بے مغز پوست ہے۔اس پر ناز کرتے ہیں اور انہیں پتہ بھی ہے کہ ہم نام کے صوفی اور کام کے دھوکہ باز نام کے عالم اور کام کے جاہل ہیں۔ایسے جاہل صوفی انہی محرفینِ توریت کی طرح ہیں۔شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا:

کرا جامہ پاکست و سیرت پلید　　در دوزخش را نباید کلید

جن کی صورت اچھی اور سیرت گندی ہوا سے دوزخ کے لئے چابی کی ضرورت نہیں۔وہ بلا حساب جہنمی ہے۔ہر عابد جنتی نہیں اور ہر گنہگار جہنمی نہیں۔خاتمہ کا اعتبار ہے۔بہت سے صالحین بد بخت ہو کر مرتے ہیں اور بہت بد بخت صالح ہو کر۔اے دعویٰ دار معانی حاصل کرو۔اے معرفت والو محبت حاصل کرو۔اے محبت والو اطاعت کے میدان میں سبقت کرو۔صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جو معرفت سے خالی اور حقیقت سے دور ہو مگر دنیا کمانے کے لئے تصوف کا لباس پہن کر اپنے کو صوفی مشہور کرے۔اس کا عذاب زانیہ عورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ رنڈی حرامی بچے جنتی ہے اور ایسے پیر حرامی اور نالائق مرید پیدا کر کے دنیائے تصوف کو بدنام کرتے ہیں۔جو کوئی قرآن کو دنیا طلبی کا وسیلہ بنائے وہ مراثی سے بدتر ہے کہ مراثی حرام سے حرام کماتا ہے مگر یہ قرآن سے حرام حاصل کرتا ہے۔ایک شخص طنبورہ پر چڑھ کر طاق میں سے روٹی اتارتا ہے۔دوسرا قرآن پر پاؤں رکھ کر اتارتا ہے۔یقیناً یہ اس سے بدتر ہے۔اس زمانہ کے عام جھوٹے مشائخ کا یہ ہی دستور ہے کہ وہ اپنی ظاہری شکل اور بے معنی الفاظ سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔عاقل پر لازم ہے کہ ان کے ظاہر سے دھوکہ نہ کھائے۔دنیا سے دین خریدو دین کو دنیا طلبی کا ذریعہ نہ بناؤ۔کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

دین فروشی مایہ کردن ہست خسران مبین　　سود مند آں کس کہ دنیا صرف کردو دین خرید

اللہ تعالیٰ ہماری دنیا کو ذریعہ دین بنائے نہ کہ دین کو ذریعہ دنیا۔ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور عبادات کو ریا وغیرہ سے پاک فرمائے۔یہ آیت صرف سننے کی نہیں بلکہ عبرت حاصل کرنے کی ہے۔یہ مت سمجھو کہ ان کا تعلق صرف علمائے یہود سے ہے۔ہم میں سینکڑوں یہودیانہ عیوب موجود ہیں۔ہم سب کو رب تعالیٰ کا خوف چاہیے۔صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے اگر کتاب اللہ میں دوسری عبارت شامل کر دی جائے تو وہ کتاب اللہ نہیں رہتی۔اور اگر اسے غلط طریقہ سے پڑھا جائے تو کتاب اللہ نہیں رہتی۔رب نے یہاں فرمادیا مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ایسے ہی اگر تلاوت میں غلط نیت اور برا ارادہ شامل کر دیا جائے تو وہ کتاب اللہ نہیں۔دیکھو منافقین نے کہا تھا۔نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ۔ (منافقون:۱) ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔اس عبارت کے الفاظ طریقہ ادا سب درست تھا مگر رب نے اعلان فرمایا اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔جھوٹے کیوں ہوئے۔اس لئے کہ انہوں نے فریب دہی کے لئے کلمہ پڑھا نہ کہ مسلمان بننے کے لئے۔اس لئے جو کوئی قرآن شریف پڑھے لوگوں میں فساد پھیلانے انہیں گمراہ کرنے کے لئے وہ اس آیت میں داخل ہے۔حافظ شیرازی نے کیا خوب فرمایا۔شعر

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش دلے　　دام تزویر مکن چوں دگراں قرآن را !!

جیسے نماز میں ظاہری ارکان ضروری ہیں۔ایسے ہی نیت بھی شرط ہے۔یوں ہی قرآن و ایمان میں درستی نیت ضروری' ناپاک

کاغذ، ناپاک قلم قرآن لکھنے کے قابل نہیں۔ ناپاک زبان جنبی وغیرہ کی قرآن پڑھنے کے لائق نہیں۔ یوں ہی ناپاک ذہن ناپاک دل قرآن سمجھنے کے لائق نہیں۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ

نہیں ہے واسطے بشر کے یہ کہ دے اس کو اللہ کتاب اور علم اور پیغمبری پھر

کسی آدمی کا یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور پیغمبری دے پھر

يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا

کہے وہ واسطے لوگوں کے کہ ہو جاؤ پجاری واسطے میرے سوائے اللہ کے اور لیکن کہے کہ ہو جاؤ

وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ ہاں یہ کہے گا

رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

اللہ والے اس لئے کہ تھے تم پڑھتے کتاب کو اور اس لئے کہ تھے تم سبق دیتے

کہ اللہ والے ہو جاؤ اس سبب سے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور اس لئے کہ تم درس کرتے ہو

وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا

اور نہ حکم دے گا تم کو اس کا کہ بناؤ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو رب کیا حکم کرے گا وہ تم کو

اور تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرالو کیا تمہیں

اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

ساتھ کفر کے بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو

کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو لئے

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت فرمایا گیا تھا کہ علمائے اہل کتاب رب تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں کہ اپنا گھڑا ہوا مضمون اس کی طرف نسبت دیتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں پر بھی جھوٹ بولنے سے درگذر نہیں کرتے کہ کہتے ہیں کہ ہمیں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو معبود ماننے کا حکم دیا۔ گویا پہلے ان کی تحریف کتاب کا ذکر تھا۔ اب تحریف کلام انبیاء کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ وہ اپنی کتابوں یعنی توریت وانجیل میں تحریف کرتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ آپ پر جھوٹ باندھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کہتے ہیں محمد ﷺ اپنی پوجا کرانا چاہتے ہیں۔ (جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہوگا) **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل

کتاب کی تحریف کا ذکر اور اب اس کی مذمت فرمائی جارہی ہے کہ رب تعالیٰ نے انہیں کتاب' علم اور نبوت کا فیض دیا اور پھر انہوں نے لوگوں کو خدا کے راہ سے ہٹا کر اپنا بندہ بنالیا۔ گویا ان کی یہ حرکت خلاف انسانیت ہے۔

شانِ نزول

نجران کے عیسائیوں نے کہا تھا کہ ہمیں عیسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا ہے کہ ہم انہیں رب مانیں۔ تب ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خزائن العرفان و خازن) ایک روایت میں یہ ہے کہ ابو رافع یہودی اور عیسائی نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ تو یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو رب مان لیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ خدا کی پناہ نہ میں غیر اللہ کی عبادت کا حکم کرتا ہوں نہ مجھے اس کا حکم دیا گیا اور نہ مجھے اس لئے بھیجا گیا (کبیر و خزائن) خیال رہے ان عیسائیوں نے یہ دیکھا کہ مسلمان کلمہ طیبہ سے لے کر نماز جنازہ بلکہ دفن میت تک ہر عبادت میں حضور ﷺ کا نام مبارک لیتے ہیں۔ ان کی کوئی عبادت' اذان' تکبیر' نماز وغیرہ حضور ﷺ کے ذکر سے خالی نہیں نیز ان عیسائیوں نے صحابہ کرام کو دیکھا کہ ہر جگہ رب کے نام کے ساتھ ملا کر حضور ﷺ کا نام لیتے ہیں۔ کچھ فرق نہیں کرتے۔ نیز دیکھا کہ حضرات صحابہ کرام اٹھتے بیٹھتے بولنے چالنے میں حضور علیہ السلام کا انتہائی ادب کرتے ہیں کہ التحیات کی طرح حضور علیہ السلام کے سامنے بیٹھتے ہیں۔ آپ کی آواز سے اپنی آوازیں اونچی نہیں کرتے۔ نگاہیں آپ سے نہیں ملاتے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ چیخ اٹھے کہ یہ لوگ حضور علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں۔ ہم حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا ہی مانتے ہیں۔ یہ تو حضور علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں۔ ان کم بختوں نے تعظیم و عبادت میں فرق نہ کیا جو لوگ آج کہتے ہیں کہ بریلوی حضور علیہ السلام کو خدا سے ملا دیتے ہیں۔ حد سے بڑھا دیتے ہیں۔ انہوں نے یہ سبق ان ہی عیسائیوں سے پڑھا ہے۔ یہ آج کی گفتگو نہیں بڑی پرانی گفتگو ہے۔ حسن سے روایت ہے کہ ایک شخص نے بارگاہِ نبوی میں عرض کیا کہ ہم آپ پر سلام ایسا ہی کرتے ہیں جیسے ایک دوسرے کو کیا کرتے ہیں۔ ہم آپ کو سجدہ کیوں نہ کیا کریں۔ جس سے آپ کی شان خصوصی ظاہر ہو۔ حضور سیّد عالم ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو جائز نہیں کہ غیر خدا کو سجدہ کرے۔ ہاں اپنے نبی کی تعظیم کرو اور حقدار کا حق پہچانو تو تب یہ آیت کریمہ اتری (کبیر و معانی) ایک روایت یہ ہے کہ یہود کا دعویٰ تھا کہ کوئی شخص بزرگی اور درجہ میں ہمارے برابر نہیں ہو سکتا۔ اس پر یہ آیت کریمہ اتری جس میں فرمایا گیا کہ اگر یہ سچ ہے تو تم پر رب کی اطاعت زیادہ واجب کہ اطاعت بقدر احسان چاہیے۔ پھر تم لوگوں کو راہ راست سے پھیر کر اپنا بندہ کیوں بناتے ہو۔ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (التوبہ:۳۱) (کبیر)

تفسیر

مَا كَانَ لِبَشَرٍ۔ مَا نافیہ ہے اور لِبَشَرٍ کسی پوشیدہ کا متعلق ہو کر کان کی خبر اور کان استمراریہ ہے۔ بَشَرٌ جمع ہے اس کا کوئی واحد نہیں۔ جیسے قوم اور رھط مگر واحد و جمع سب کے لئے استعمال ہو جاتا ہے۔ (تفسیر خازن) اس میں اختلاف ہے کہ لبشر کا متعلق کیا ہے۔ بعض نے کہا کہ لانقا ہے۔ بعض نے کہا ممکنا۔ حق یہ ہے کہ اگر بشر سے مراد یا جناب عیسیٰ علیہ السلام یا حضور ﷺ ہیں تو ممکنا پوشیدہ [illegible] معصیت کرنا ایسا ہی ناممکن

ہے جیسا کہ خدا کا شریک۔ کیونکہ ان کے نفس امارہ نہیں بلکہ مطمئنہ ہیں۔ اور شیطان کی وہاں تک پہنچ نہیں پھر ان سے گناہ کون کرائے۔ اور عوام کو لائق نہیں کہ وہ بندہ ہو کر مالک بن بیٹھیں۔ ورنہ وہ کتے سے زیادہ ناشکرے ہیں اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ بشر سے مراد کون ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ یہود نے ان پر تہمت لگائی تھی۔ بعض کے خیال میں کچھ بشر سے ہر انسان مراد ہے۔ جیسا کہ شانِ نزول کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ...... بعض کے خیال میں بشر سے ہر انسان مراد ہے......

خیال رہے کہ بشر سے اس جانب اشارہ ہے کہ ایسی بکواس انسانیت کے خلاف ہے۔ چہ جائیکہ نبوت و رسالت۔ نبی اور رسول تو بڑے درجے والے ہیں کسی عام انسان کو دعویٰ خدائی زیبا نہیں۔ یعنی کسی انسان کے لئے لائق نہیں۔ یا عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے لئے ممکن نہیں جیسا کہ فرمایا گیا۔ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ۔ (الحاقة: ۴۵) یا نفوس انبیاء اور ان کے ارواح طیبہ ایسے پاک و صاف ہوتے ہیں کہ ان سے یہ دعویٰ ناممکن ہے۔ اس تفسیر سے بہت سے اعتراضات اٹھ گئے۔ جو ہم اعتراض و جواب میں عرض کریں گے۔ چونکہ نبوت اور کتاب و حکمت صرف انسان ہی کو ملی ہے۔ اس لئے یہاں بشر فرمایا۔ فرشتے جنات وغیرہ کا ذکر نہ کیا۔ اگر بشر سے مراد حضرات انبیاء ہوں تو تنوین تعظیمی ہے۔ یعنی ایسے عظیم الشان انسانوں سے یہ بات ناممکن ہے اور اگر اس سے مراد عام لوگ ہیں تو تنوین تحقیر کی یعنی کسی معمولی بشر کو یہ زیبا و لائق نہیں۔ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ۔ (آل عمران: ۷۹) یہ جملہ اپنے معطوف سے مل کر کَانَ کا اسم مؤخر ہے۔ اَلْكِتَابَ سے آسمانی کتاب اور حکم سے حکومت فیصلہ یا فہم یا علم مراد ہے۔ جو علمائے کتاب کے لئے لازم ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا۔ (مریم ۱۲) اور نبوت سے پیغمبری مقصود۔ چونکہ پہلے کتاب اترتی ہے پھر عقل نبی میں حاصل ہوتی ہے۔ پھر وہ لوگوں تک اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس لئے پہلے کتاب کا ذکر ہوا۔ پھر حکم یعنی فہم کتاب کا پھر نبوت کا۔ یہ تمام تقریر اس صورت میں ہے ...... کہ بشر سے مراد انبیائے کرام ہوں۔ اور اگر بشر سے مراد سارے انسان خصوصاً علماء اہل کتاب ہوں تو یہاں کتاب سے مراد علم کتاب ہوگا۔ اور حکم سے حکومت اور نبوت سے نبوت کی روشنی اور اس کا فیضان۔ خیال رہے کہ بشر لفظ تو ایک ہے مگر حسب موقعہ اس کے معنی و مقصد مختلف ہوتے ہیں۔ اگر یہ حضرات انبیاء کرام کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں اللہ کی ہاتھ کی بنائی ہوئی صنعت۔ مباشرت بالید سے ماخوذ ہے۔ رب فرماتا ہے۔ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا۔ (حجر: ۲۸) اور فرماتا ہے۔ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔ (ص: ۷۵) یعنی اے شیطان تو نے اسے سجدہ کیوں نہ کیا جسے میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور اگر بشر عام لوگوں کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں بشرے والا۔ یعنی ظاہری کمال والا جس کے جسم پر نہ پر ہوں نہ زیادہ بال اور اگر خبث لوگوں کے لئے بولا جائے تو اس کے معنی ہوں گے شرارت والا ب بمعنی مع اور شر بمعنی شرارت تو یہ لفظ حضرات انبیاء کے لئے تعظیم کا ہے کفار کے لئے تحقیر کا اس لئے عام محاورہ میں ان حضرات کو ہم بشر کہیں کہ یہ لفظ اچھے برے دونوں معنی رکھتا ہے اگر چہ قرآن کریم سے ثابت ہے جیسے ظالم نبی کو نہیں کہہ سکتے اگر چہ قرآن کریم سے ثابت ہے۔ جیسے آدم و یونس علیہما السلام نے عرض کیا تھا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا۔ (اعراف: ۲۳) یا اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (انبیاء: ۸۷) ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یہ جملہ يُؤْتِيَهُ پر معطوف

ہے۔اور اَنْ سے منصوب۔عباد عبد بمعنی عابد کی جمع ہے۔جو عبادت سے بنا جو عبد عبودیت بمعنی خدمت و اطاعت سے مشتق ہو اس کی جمع اکثر عبید آتی ہے۔اسی لئے زید کے غلاموں کو عرف میں عبید زید کہیں گے نہ کہ عباد زید (روح المعانی) مگر کبھی عابد بمعنی خادم کی جمع بھی عباد آ جاتی ہے۔رب تعالیٰ فرماتا ہے۔مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ۔ (النور: ۳۲) اور فرماتا ہے۔قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا۔ (الزمر: ۵۳) الخ بہرحال یہاں عباد بمعنی پجاری ہے۔نہ کہ بمعنی خادم۔جیسا کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ سے معلوم ہو رہا ہے۔لِیْ پوشیدہ کے متعلق ہو کر عباد کی صفت ہے۔اور مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ یا عباد کے متعلق ہے کیونکہ اس میں فعل کے معنی ہیں یا اس کی دوسری صفت اور ممکن ہے کہ متجاوزین کے متعلق ہو کر عباد کا حال ہو یعنی اللہ سے تجاوز کرتے ہوئے بطورِ شرکت یا خالص میرے پجاری بندے بن جاؤ۔یعنی کسی بشر کے لائق یہ نہیں کہ رب تو اسے اپنے فضل و کرم سے کتاب اور علم اور نبوت عطا فرمائے اور لوگوں کو اس کا امتی بنائے۔اور اسے عالم کا ہادی اور پھر وہ بجائے ہدایت دینے کے لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے پجاری بندے بن جاؤ۔حکومت کا افسر لوگوں کو حکومت کا مطیع بناتا ہے۔نہ کہ باغی وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ۔ یہ جملہ پہلے پر معطوف ہے۔اگر بشر سے مراد علماء یہود تھے تو لٰکِنْ کے بعد قوموا پوشیدہ ہے۔یعنی ان علماء کو یہ مناسب نہ تھا کہ لوگوں سے کہیں کہ ہمارے بندے بن جاؤ بلکہ اے عالمو تم اپنے متبعین سے یہ کہو کہ اللہ والے بن جاؤ۔اس صورت میں یہ تا قیامت علماء کو تعلیم ہے کہ کتاب اللہ پڑھانے سے محض دنیا کمانے کی نیت نہ کریں۔نہ محض ترجمے سکھانے پر کفایہ کریں بلکہ لوگوں کو اللہ والا اور دیندار بنائیں اور اگر بشر سے مراد حضرات انبیاء کرام ہیں تو لٰکِنْ کے بعد یَقُوْلُ پوشیدہ ہے ربانی یا تو ربان کی طرف منسوب ہے۔جیسے عطشان اور سکران یا رب تعالیٰ کی طرف اور رب سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔اور ربانی بمعنی اللہ والا یا رب بمعنی پرورش کرنے والا تو ربانی وہ جو اپنے نفس اور لوگوں کی پرورش کرے۔سیبویہ نے کہا کہ ربانی وہ عالم ہے جو رب تعالیٰ کی ذات و صفات کا جاننے والا اور اس کی اطاعت و عبادت کا پابند ہو۔اور مبالغہ کے لئے الف نون زائد کیا گیا۔جیسے بڑی داڑھی والے کو لحیانی اور موٹی گردن والے کو رقبانی اور زیادہ بال والے کو شعرانی کہا جاتا ہے۔اور معمولی کو شعری اور رقبی کہتے ہیں۔جرد نے کہا کہ ربانی وہ علمائے کرام ہیں جو لوگوں کی روحانی پرورش کریں۔ابن زید کہتے ہیں کہ ربانی امت ہیں۔رب تعالیٰ فرماتا ہے۔لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ (مائدہ: ۶۳)۔قفال نے فرمایا کہ ربانی بمعنی والی اور حاکم کیونکہ رب کی طرح اس کی بھی اطاعت کی جاتی ہے۔ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ یہ لفظ عربی نہیں سریانی یا عبرانی ہے۔بمعنی علم و عمل کا جامع (کبیر و معانی و خازن وغیرہ) یعنی لیکن انبیائے کرام تو یہ فرماتے ہیں کہ اے اللہ کے بندو اللہ والے علم و عمل کے جامع بن جاؤ۔خیال رہے کہ حضرات انبیاء کرام کی تعلیمیں فروعاً قدرے مختلف تھیں کہ ان کے دینوں کے فروعی مسائل جداگانہ تھے مگر اصولاً تمام کی تعلیم یکساں تھیں۔اس لئے یہاں یَقُوْلُوْنَ پوشیدہ سے سارے انبیاء کرام کا قول مراد ہے۔سب نے مخلوق کو اللہ والا بننے کی ہدایت کی۔اس لئے حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ حضرات انبیاء کرام علاتی بھائی ہیں۔ماں سب کی جداگانہ باپ ایک یعنی فروعی مسائل میں مختلف اصول عقائد میں سب ایک۔کسی نبی نے شرک و کفر کی تعلیم نہ دی۔بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ الخ (آل عمران: ۷۹) یہ جار مجرور كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ کے متعلق ہے۔ب سببیہ اور مَا مصدریہ ہے۔ایک قرأت میں تَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ باب سمع یسمع سے جمعنی جاننا مگر ہماری قرأت میں تُعَلِّمُوْنَ تعلیم سے

ہے۔ بمعنی سکھانا۔ کتاب سے مراد کتاب الہٰی ہے۔ تدرسون درس یا دراستہ سے بنا۔ بمعنی تکرار اور بار بار کرنا۔ اسی لئے مٹنے کو اندراس کہا جاتا ہے کہ اس پر دن رات بار بار گذر کر اسے فنا کر دیتے ہیں چونکہ سبق بھی بار بار پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے اسے درس کہتے ہیں۔ یعنی تم عالم ربانی اس لئے بنو کہ تم لوگوں کو کتاب الہٰی پڑھاتے ہو اور اس کا درس دیتے ہو۔ خیال رہے کہ یا تو تعلیم کتاب سے مراد سبقاً سبقاً کتاب پڑھانا ہے اور درس کتاب سے مراد بطور وعظ لوگوں تک احکام پہنچانا اور ممکن ہے کہ تدرسون سے مراد درس کتاب نہ ہو۔ بلکہ دوسرے احکام کی تعلیم مراد ہو۔ اور ممکن ہے کہ تعلیم کتاب سے مراد کتاب پڑھانا ہو۔ اور درس کتاب سے مراد سبق لینا ہو کیونکہ درس سبق دینے کو بھی کہتے ہیں اور سبق لینے کو بھی۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں درس بمعنی دراست ہے۔ بمعنی فہم و سمجھ بہر حال تَعْلَمُوْنَ اور تَدْرُسُوْنَ میں تکرار نہیں۔ یعنی اے اہل کتاب چونکہ تم کو رب تعالیٰ نے خصوصی نعمت بخشی ہے کہ تم لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے ہو۔ انہیں کتاب کا درس بھی دیتے ہو۔ سبق بھی پڑھاتے ہو۔ لہٰذا تم ربانی بن کر رہو۔ ربانی بننا اس نعمت کا شکریہ ہے۔ نیز تمہارا ربانی بننا تمہارے ماتحتوں کو ربانی بنا دیگا۔ تمہارا عمل بھی تبلیغ ہونا چاہیے۔ وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا۔ ہماری قرأت میں لا یَأْمُرَ رے کے فتح سے ہے۔ ثُمَّ يَقُوْلَ پر معطوف اور مَا كَانَ لِبَشَرٍ کی تحت میں داخل لایا تو زائدہ نفی کی تاکید کے لئے یا غیر زائدہ (معانی و کبیر) بعض قراتوں میں لا یَأْمُرُ رے کے پیش سے ہے اس صورت میں یہ نیا جملہ ہے۔ ارباب جمع رب کی ہے۔ بمعنی پالنے والا یعنی خدا۔ چونکہ مشرکین فرشتوں کا۔ اور اہل کتاب بعض پیغمبروں کا خدائی میں دخل مانتے تھے کہ مشرکین تو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور بعض اہل کتاب پیغمبروں کو خدا کا بیٹا۔ اس جملہ میں ان سب کی تردید کی گئی۔ یعنی نہ یہ ممکن ہے کہ پیغمبر تمہیں اس کا حکم دیں کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا کا شریک مان لو۔ وہ تو ان باتوں سے روکنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یہ استفہام تعجب یا انکار ہے۔ کفر سے مراد غیر خدا کی عبادت ہے۔ جس کا ذکر پہلی عبارت میں ہو چکا۔ اگر اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہو اور ان کے بارے میں آئی ہو تب مُّسْلِمُوْنَ بمعنی مسلمان ہے جیسا کہ خطیب کا قول ہے اور اگر خطاب اہل کتاب سے ہو اور ان کے بارے میں آیت اتری ہو تو مسلم بمعنی مطیع، فرمانبردار اور دین کا مستحق ہے۔ (کبیرو معانی) یعنی کیا یہ ممکن ہے کہ تم تو رب کی اطاعت کے ارادے سے ان کے پاس حق کی تلاش کے لئے حاضر ہو اور وہ تمہیں بجائے ایمان کے کفر کی تعلیم کریں۔ وہ حضرات تو انبیاء ہیں یہ حرکت تو عام انسان بھی نہیں کر سکتے۔

خلاصہ تفسیر

تمام مخلوق سے زیادہ انسان کو اللہ نے نعمتیں بخشی ہیں کہ غذائیں، لباس رہائش کی بے شمار چیزیں انسان ہی کو دیں نیز نبوت، ولایت، معرفت سے اسی کو نوازا۔ آخرت میں جنت اسی کے لئے رکھی۔ پھر نوع انسان میں سے مومنوں پر بہت احسان کئے اور پھر مومنوں میں سے حضرات اولیاء اللہ پر بہت سے خصوصی احسانات فرمائے پھر ایسی پاک جماعت میں حضرات انبیاء کرام پر تو بے حد احسانات فرمائے اور قاعدہ ہے کہ شکر بقدر نعمت چاہیے جس قدر رب کی نعمتیں زیادہ ہوں اسی قدر اس کا شکر یہ ضروری ہے تو سب سے زیادہ شکر حضرات انبیاء کرام کرتے ہیں چونکہ یہود و نصاریٰ نے ان اعلیٰ درجہ کے شاکروں کو بد ترین کفر کا بہتان لگایا کہ بولے کہ ہم کو انبیاء کرام فرما گئے ہیں کہ ہمیں خدا کا بیٹا مانو۔ لہٰذا ان کی پر زور تردید رب تعالیٰ نے

فرماتے ہوئے ارشاد کیا کہ یہ ممکن ہی نہیں اور کسی انسان کی شان ہی نہیں کہ رب تعالیٰ تو اس پر فضل فرما کر اسے اپنی کتاب علم ظاہری و باطنی اور نبوت عطا فرمائے اور اسے لوگوں کا ہادی بنا کر بھیجے پھر وہ بندہ بجائے ہدایت دینے کے لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف دعوت دے اور یہ کہے کہ خدا کو چھوڑ کر یا خدا کے ساتھ میرے پجاری بن جاؤ یہ ناممکن ہے۔ دنیوی بادشاہ اسی کو حاکم بناتے ہیں جس پر انہیں اعتماد ہو کہ وہ لوگوں کو حکومت کا وفادار بنائیں گے تو کیونکر ممکن ہے کہ حق تعالیٰ ایسوں کو نبوت دے دے' جو لوگوں کو اس سے باغی کر دیں۔ ہاں حضرات انبیاء تو یہ ہی تعلیم دیتے ہیں کہ اے لوگو اللہ والے اور علم و عمل کے جامع اور رب تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بن جاؤ کیونکہ تم دوسروں کو کتاب الٰہی سکھاتے ہو اور اس کا درس دیتے ہو اور معلم خیر کو چاہیے کہ پہلے خود خیر پر عمل کرے تاکہ اس کی تعلیم فائدہ مند ہو۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ پیغمبر لوگوں کو یہ تعلیم دے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو رب تعالیٰ کا شریک مان لو۔ بھلا یہ ہوسکتا ہے کہ تم راہ الٰہی حاصل کرنے کے لئے اطاعت کرتے ہوئے۔ انبیاء کی بارگاہ میں حاضر ہو' اور وہ تمہیں بجائے ایمان کے کفر کی تعلیم دے کر رب تعالیٰ سے اور بھی دور کر دیں۔ وہ حضرات تو بندوں کو رب تعالیٰ سے قریب کرنے کے لئے آتے ہیں نہ دور کرنے کے لئے۔ یہ چیزیں جب ایمان کے ساتھ مجتمع نہیں ہوسکتیں تو نبوت کے ساتھ کیونکر جمع ہوسکتی ہیں لہٰذا تم جھوٹے ہو۔ انبیائے کرام پر جھوٹی تہمت لگاتے ہو۔ اس زمانہ کے بعض مفسرین یہ آیات کریمہ مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی ولی کو غیب دان' حاجت روا' مشکل کشا جاننا انہیں اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنانا ہے۔ حضرات انبیاء کی تعلیم یہ نہیں ہے مگر یہ غلط ہے۔ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ بنانا وہ ہے جو مشرکین عرب فرشتوں کو رب کی بیٹیاں مانتے تھے۔ کعبہ معظمہ میں حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے بت بنا کر پوجتے تھے یا یہود و نصاریٰ' حضرت عزیر و مسیح علیہما السلام کو رب کا بیٹا کہتے تھے۔ ورنہ خود منکرین بوقت ضرورت اپنی حاجتیں امیروں' حاکموں سے مانگتے ہیں۔ شیطان تمام جہان کو بیک وقت دیکھتا ہے۔ حضرت ملک الموت ہر جگہ تصرف کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض جناب ایوب علیہ السلام کا غسالہ دافع بلا شافی الامراض ہے۔ حضرت آصف برخیا پلک جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس یمن سے شام میں لے آئے کیا یہ سب رب بن گئے۔ نعوذ باللہ رب تعالیٰ قرآن کی سچی فہم عطا فرمائے آمین۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** انبیائے کرام کی بارگاہِ الٰہی میں بڑی عزت ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ ان سے اہل کتاب کے الزامات دور فرماتا ہے۔ دیکھو علمائے یہود نے حضرات انبیاء پر تہمت لگائی۔ رب تعالیٰ نے ان کی صفائی بیان فرماتے ہوئے ان علماء کو جھٹلا دیا اور ظاہر ہے کہ اپنے پیارے کی صفائی بیان کی جاتی ہے نہ دشمن کی' اور نہ اجنبی کی۔ **دوسرا فائدہ:** کفر سے راضی ہونا اور اس کا حکم دینا کفر ہے۔ جیسا کہ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ سے معلوم ہوا۔ یعنی اگر وہ تمہیں کفر کا حکم دیتے تو خود مومن نہ رہتے چہ جائیکہ نبی۔ **تیسرا فائدہ:** عالم کے لئے سخت ضروری ہے کہ اس کی تعلیم و تدریس تبلیغ و ہدایت کے لئے ہو نہ کہ محض دنیا کے لئے جو عالم محض دنیا کی خاطر تعلیم کا کام کرے۔ وہ اس باغبان کی طرح ہے جو ہرا بھرا باغ لگائے مگر اس کا پھل نہ کھا سکے جیسا کہ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** علماء و پیشوایان قوم کو متقی پرہیزگار ہونا لازمی ہے کہ عالم کے بگڑنے سے عالم بگڑ جاتا ہے۔ عالم کے عمل کے ساتھ بہت لوگوں

کے عمل وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** انبیاء پر اعتراض درحقیقت رب تعالیٰ پر اعتراض ہے کہ اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ رب کا انتخاب غلط ہے۔ اس نے باغی و مجرم کو نبوت جیسا اعلیٰ عہدہ عطا فرمادیا یہ ہی اس آیت کا مقصود ہے کہ ناممکن ہے کہ جس کو رب تعالیٰ نبی بنائے وہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ۔ (انعام: ۱۲۴) **چھٹا فائدہ:** انبیائے کرام کا کافر یا گمراہ ہونا غیر ممکن ہے جیسا کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ کی تفسیر سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** کوئی پیغمبر شرک و کفر کی تعلیم نہیں دے سکتے جو چیز کسی نبی کے دین میں کبھی رہی ہو وہ شرک نہیں جیسا کہ اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ سے معلوم ہوا۔ لہٰذا غیر اللہ کو سجدہ تحیہ کہ اسلام میں حرام ہے مگر شرک نہیں کیونکہ دیگر انبیائے کرام کے دین میں جائز تھا۔ **آٹھواں فائدہ:** غلط تعلیم کو انبیائے کرام کی طرف نسبت دینے والا عملاً یہودی ہے کہ انہوں نے اپنے تراشے ہوئے عقیدے پیغمبر کی طرف نسبت کردیئے۔ مشرکین عرب بھی بت پرستی کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت دیتے تھے۔ **نواں فائدہ:** غیر خدا کو سجدۂ عبادت کرنا شرک ہے جیسا شانِ نزول کی ایک روایت سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو سجدہ کرنا چاہا۔ اس پر یہ آیت کریمہ اتری اور اسی سجدہ کو کفر فرمایا گیا۔ **دسواں فائدہ:** کتاب اللہ پڑھانے والے علماء کو چاہیے کہ ربانی عالم بنیں تب ان کی تعلیم سے لوگ ربانی بنیں گے۔ نفسانی و شیطانی عالم لوگوں کو بھی نفسانی و شیطانی ہی بنائے گا۔ علم کی تاثیر کے لئے زبان کا فیض بھی ضروری ہے۔ سامری نے حضرت جبریل کی گھوڑی کی خاک فرعونی سونے کے بچھڑے کے منہ میں ڈالی اس مٹی نے اپنا اثر تو دکھایا کہ اسے زندگی بخش دی۔ اس میں آواز پیدا کی مگر اس آواز سے لوگ گمراہ ہوئے ہدایت پر نہ آئے۔ ایسے ہی گمراہ عالم کے وعظ سے لوگ گمراہ ہوں گے۔ ہدایت پر نہ آئیں گے۔ ایسے ہی کتاب اللہ پڑھنے والوں کو چاہیے کہ ربانی عالم سے قرآن سیکھیں ورنہ گمراہ ہوں گے۔ یہ فائدہ بما کنتم کی ب سے حاصل ہوا۔ نماز کے لئے اچھا امام علاج کے لئے اچھا قابل طبیب۔ مشین کے لئے لائق مستری تلاش کرو۔ ایسے ہی اصلاحِ نفس کے لئے ربانی عالم تلاش کرو۔ یہ جملہ عالم متعلم واعظ اور وعظ سننے والوں سب ہی کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جسے خدا نبوت دے اس کو تو شرک کی تعلیم دینا لائق نہیں۔ باقی دیگر لوگ شرک یا کفر پھیلائیں تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہاں فرمایا گیا کہ جسے خدا نبوت دے اسے تعلیم شرک کا حق نہیں (بعض بے دین) **جواب:** اس کا نہایت نفیس جواب تفسیر میں گزر گیا کہ یا تو لبشر سے پہلے ممکناً پوشیدہ ہے یعنی پیغمبر کے لئے تعلیم شرک ناممکن ہے کیونکہ ان کے معجزات ان کی حقانیت کے دلائل ہیں۔ نیز وہ حضرات علم و عمل کے جامع ہیں۔ نیز ان کے نفوس برے اخلاق سے بھی پاک ہیں پھر کیونکر ممکن ہے کہ جنہیں رب تعالیٰ نے ہدایت کے لئے منتخب کیا ہو اس سے ایسا جرم صادر ہو۔ یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم شرک بشریت کے منافی ہے کہ محسن کا احسان ماننا فطرتِ انسانی ہے۔ اور انبیائے کرام افضل البشر ہیں۔ پھر ان سے یہ حرکت کیونکر صادر ہو سکتی ہے یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شرک و کفر کی تعلیم دے اسے نبی بنانا رب تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ یہاں جواز و عدم جواز کا ذکر نہیں بلکہ امکان اور استحقاق کی نفی ہے۔ **دوسرا**

اعتراض: آیت کریمہ میں ارشاد ہوا کہ کسی بشر کو تعلیم شرک لائق نہیں تو کیا جن وفرشتہ کو یہ تعلیم حق و درست ہے۔ **جواب:** چونکہ نبوت' کتاب' حکمت وغیرہ انسان ہی کو بخشی گئیں اور جسے نعمتیں زیادہ ملیں۔ اسے رب کی اطاعت زیادہ چاہیے۔ اس لئے یہاں بشر کا خصوصیت سے ذکر ہوا۔ نیز فرشتے اور دیگر حیوانات سے اس کا احتمال ہی نہیں۔ انسان ہی میں مدعی خدائی گذرے اور دجال بھی دعویٰ خدائی کرے گا۔ یہ انسان ہی ہوگا۔ ان وجوہ سے بشر فرمایا گیا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ عبدالنبی یا عبدالرسول نام رکھنا شرک ہے اور جو لوگ قُلْ یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا۔ (الزمر: ۵۳) کے معنی یہ کرتے ہیں کہ اے محبوب (ﷺ) آپ فرما دو اے میرے بندو وہ کھلے ہوئے مشرک ہیں کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کو یہ ممکن نہیں کہ کسی کو اپنا بندہ بننے کی دعوت دے۔ لہٰذا عبدالنبی عبدالرسول' نبی بخش و پیر بخش نام رکھنا صریح شرک اور اس آیت کے خلاف ہے۔ (دیوبندی) **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ عبد کے دو معنی ہیں عابد اور خادم۔ عبد بمعنی عابد کی نسبت صرف رب کی طرف ہی ہو سکتی ہے اور عبد بمعنی خادم کی نسبت غیر خدا کی طرف بھی جائز ہے۔ شرح جامی میں ہے۔ ع

اَلْوَاهِبُ الْمِائَةُ الْهِجَانِ وَعَبْدُهَا

دیکھو یہاں عبد کی نسبت اونٹنیوں کی طرف ہے۔ فقہاء عام طور پر فرمایا کرتے ہیں۔ عَبْدِیْ حُرٌّ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَائِكُمْ۔ (النور: ۳۲) یہاں عباد کی نسبت انسانوں کی طرف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ كُنْتُ اَنَا عَبْدُهٗ وَخَادِمُهٗ۔ میں حضور علیہ السلام کا عبد اور آپ کا خادم تھا۔ صاحب درمختار کے شیخ کا نام عبدالنبی ہے۔ دیکھو دیباچہ درمختار۔ قل یا عبادی کے بہت سے مفسرین نے یہ ہی معنی فرمائے کہ یا حبیب اللہ فرما دو اے میرے بندو۔ مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ۔

بندۂ خود خواند احمد در رشاد جملہ عالم را بخواں قل یا عباد

مولوی محمود الحسن صاحب دیوبندی نے مرثیہ رشید احمد لکھا ہے ۔

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں عبید سود کا ان کے لقب ہے یوسف ثانی

اس کی زیادہ تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو۔ یہاں عِبَادًا لِّیْ میں عباد بمعنی پجاری ہے۔

تیسرا اعتراض: مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے معلوم ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے بندہ کا بننا شرک ہے لیکن رب کے ساتھ اور کا بندہ بن جانے میں حرج نہیں کیونکہ وہ تو مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ نہیں۔ **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ میں متجاوزاً پوشیدہ ہے یعنی رب تعالیٰ سے تجاوز کرتے ہوئے اس کی دو صورتیں ہیں۔ خالص غیر کا بندہ ہونا یا رب تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کا بھی بندہ بننا۔ یہ ہی لَا نَعْبُدُ وَمِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے معنی ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اسلام نے حضور انور کے نام کو ساری عبادات میں داخل ہی کیوں کیا اور ان کے نام کو رب کے نام سے ملایا ہی کیوں اور صحابہ کرام حضور ﷺ کی ایسی تعظیم کیوں کرتے تھے۔ جس سے لوگوں کو اس اعتراض کا موقعہ ملتا تھا کہ مسلمان نبی کو خدا مانتے ہیں۔ **جواب:** حضور ﷺ کا احسان مسلمانوں پر بعد خدا سب سے زیادہ ہے اور محسن کا احسان ماننا انسان کا فریضہ ہے۔ نیز حضور ﷺ

نائب خدا قدوس ہیں کہ اسلامی قانون بنانے والا اللہ تعالیٰ ہے اور چلانے والے حضور ﷺ ہیں اس لئے قانون بنانے والے کے ساتھ قانون چلانے والے کا نام فطرت کے مطابق ہے۔ خیال رکھو کہ قانون چلانے والا اگر تگڑا نہ ہو تو قانون طاق کی زینت بنا رہتا ہے۔ لوگوں کی اصلاح نہیں کرتا۔ اگر حضور ﷺ نہ آتے تو قرآن نہ تو کعبہ سے بت نکالتا نہ عرب کے مشرکوں کو مومن و عارف بناتا۔ قرآن کے ذریعہ سب کچھ حضور ﷺ نے کیا۔ دیکھ لو آج قرآن' حدیث' فقہ سب کچھ موجود ہے مگر عہد فاروقی جیسے مسلمان نظر نہیں آتے۔ کیوں! اس لئے کہ اگرچہ قانون بنانے والا رب وہ ہی ہے۔ قرآن وہ ہی ہے مگر قانون چلانے والا فاروق دنیا میں نہیں۔ پھر جب حضرت مسیح و مہدی آئیں گے اور اس قانون کو چلائیں گے تو لوگ پھر عہد فاروقی جیسے ہو جائیں گے۔ ہمارے پاکستان میں ہر سال شب برات پر قانون کا اعلان ہوتا ہے کہ آتشبازی نہ چلائی جائے مگر چلتی ہے لوگ اور مکان جلتے ہیں۔ دو سال سے یعنی ۱۹۶۱ اور ۱۹۶۲ سے گجرات میں ہر طرح امن ہے کیونکہ ایک دیندار حاکم رب نے بھیج دیا ہے۔ اے ڈی ایم مہابت خاں جس سے آتش بازی سے ہر طرح امن ہے یہ ہے قانون چلانا۔

تفسیر صوفیانہ

اہل حقیقت پر فرض ہے کہ اپنے متبعین اور مریدین کو ربانی بنائیں۔ یعنی حق تعالیٰ کے اخلاق سے موصوف کریں کیونکہ یہ حضرات کتاب اللہ یعنی قرآن شریف کی ظاہری تعلیم بھی دیتے ہیں اور حقیقی درس بھی شیخ کامل وہ ہی ہے جو مرید کے ظاہر و باطن کی اصلاح کرے۔ صرف الفاظ سکھانے پر قناعت نہ کرے۔ کیونکہ علم درخت ہے اور عمل اس کے پھل۔ علم بے عمل اور عمل بغیر علم بے کار ہیں۔ جس علم کو رب تعالیٰ سے تعلق نہ ہو وہ جہل سے بدتر ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دو شخصوں نے میری پیٹھ توڑ دی۔ عالم بے عمل نے اور جاہل باعمل نے کیونکہ بے عمل عالم لوگوں کو علم و علماء سے نفرت دلاتا ہے اور جاہل عامل غلط عمل کے ذریعہ لوگوں کو جہالت کی طرف رغبت دیتا ہے۔ عالم ربانی وہ ہے جو اپنے علم کے ذریعہ رب تک پہنچ جائے۔ جس کے قلب میں علم کا تخم بویا جائے اور اس کی شاخیں قلب و قالب کی طرف پہنچیں کہ اس کے ہر عضو پر تقویٰ کے آثار نمودار ہو جائیں اور جنہیں دیکھ کر رب یاد آ جائے انہی کو راسخین فی العلم بھی کہتے ہیں انہی کے حق میں فرمایا گیا۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (فاطر: ۲۸) اس زمانہ میں بعض مدعیان ولایت جاہل پیر اور بدعمل عالم وہ ہیں جن کی خواہش نفسانی ان پر غالب ہے اور وقت سے پہلے شیخوخت کے سجادہ اور علم کی پگڑی پر قبضہ کرتے ہیں۔ علماء اور صوفیاء کی کچھ باتیں یاد کر کے لوگوں کو پھانستے پھرتے ہیں۔ گویا انہوں نے تصوف و علم کو انسانی شکار کا جال بنایا۔ ہمیشہ اپنے مریدوں کو پیر کی خدمت کے آداب ہی سکھاتے ہیں کہ پیر کی یوں خدمت کرو۔ اس طرح اس کی دعوت کرو۔ یوں نذرانہ پیش کرو یہ نہیں بتاتے کہ رب تعالیٰ کی عبادت کس طرح کرو۔ اپنے معاملات اس طرح صاف رکھو اپنے میں سے حرام رسمیں اس طرح دور کرو۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے انہی کے لئے فرمایا ؎

دمادم بشویند چوں گربہ رو طمع کردہ در صید موشان کوئے

ریاضت کش از بہر نام و غرور کہ طبل تہی را رود بانگ دور

ایک ڈھول خالی ہوتا ہے جس کی آواز دور جاتی ہے مگر اندر سے خالی۔ طالبان حق اور واصلان رب گوشہ نشینی کو پسند کرتے ہیں

اور خلق سے متنفر رہتے ہیں۔ ماسوا اللہ سے پرہیز اور اللہ کی طلب ان کا شیوہ۔ نہ شہرت کے طالب ہیں نہ مال کے طالب وہ خلقت سے بھاگتے ہیں مگر خلقت ان کے پیچھے بھاگتی ہے۔ گویا وہ مرغوب ہیں اور خلق راغب اور جعلی پیر خلقت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ گویا وہ راغب ہیں اور خلق مرغوب شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ؎

کسے را کہ نزدیک ظنت بد اوست　　چہ دانی کہ صاحب ولایت خود اوست

درِ معرفت بر کسان است باز　　کہ درہا است بر روئے ایشاں فراز

(از روح البیان)

حضرات اولیاء مظہر ذاتِ انبیاء ہیں جیسے نبی شرک وکفر کی تعلیم نہیں دے سکتے۔ ایسے ہی ولی ماسوا اللہ کی تعلیم نہیں دے سکتے۔

دوسری تفسیر

نبوت' ولایت سے اعلیٰ ہے۔ اور حضرات انبیاء فنا فی التوحید ہیں۔ رب تعالیٰ نے ان کی بشریت کو فنا فی الذات کر کے مٹا دیا۔ اور انہیں وجود نورانی حقانی عطا فرمایا جو قابل کتاب وحکمت ہے پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ خلق کو اپنے نفس کی طرف دعوت دیں دعوت نفس تو وہ دے گا۔ جو نفس کے حجاب میں ہو۔ جیسے فرعون اور نمرود وغیرہ۔ جو شخص توحید کے الفاظ یاد کرلے اور اس کے ذوق سے بےخبر ہو نبی تو کیا ولی بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ بیان سے عیان کی طرف منتقل نہیں ہوا۔ اس نے فنا کی لذت چکھی نہیں۔ وہ خود بھی حجاب میں ہے۔ اور اس کا مرید بھی آڑ میں۔ اس حدیث کا یہ ہی مطلب ہے کہ لوگوں میں بدترین وہ ہے جس پر قیامت قائم ہو۔ حالانکہ وہ زندہ ہو۔ صوفیائے کرام کے نزدیک ربانی وہ ہے جس پر ربوبیت کا غلبہ ہو۔ اس کی بشریت مٹ چکی ہو عالم ہو عامل ہو۔ معلم ہو کتاب اللہ کا تلاوت کرنے والا ہو۔ عابد ہو علم وعمل میں ریاضت کرے اطاعت پر ہمیشگی کرے۔ یہاں تک کہ اس کی ظلمت نور پر غالب آجائے۔ وہ اپنے متبعین کو حجاب سے نکال کر نور کی طرف لائے گا۔ اللہ تعالیٰ ایسوں کی صحبت نصیب فرمائے۔ اس کی صحبت کیمیا ہے۔ جیسے تانبہ کو آگ پر رکھ کر بوٹی کا عرق ڈال کر سونا بنایا جاتا ہے۔ ایسے ہی ان کی بارگاہ کیمیا ہے اور ریاضتیں آگ (از ابن عربی) خیال رہے کہ ربانی عوام کی بھی صفت ہے اور علماء ومشائخ کی بھی اگر عوام کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے۔ اللہ والے بننے والے اس طرح کہ ان کی زندگی نفسانی نہ ہو۔ شیطانی نہ ہو ربانی ورحمانی ہو نفسانی زندگی وہ ہے جو غفلت اور دنیا طلبی میں گذرے۔ ایسا شخص جانور سے بدتر ہے کہ جانور تو زندگی میں بھی اپنے دودھ یا خدمت سے لوگوں کو نفع دیتا ہے اور بعد موت بھی اس کا گوشت پوست' ہڈی سے لوگ نفع اٹھاتے ہیں مگر یہ زندگی میں اللہ کی زمین پلید کرتا رہا۔ بعد موت دوگز زمین گھیر بیٹھا۔ اور شیطانی زندگی وہ ہے جو گناہ وفساد وغیرہ میں گذرے یہ شخص بدترین مخلوق ہے کہ اشرف الخلق ہو کر ارذل کے کام کر گیا۔ ربانی زندگی وہ ہے جو یار کے منانے اور رب کی رضاء میں گذرے یہ زندگی ملائکہ کی زندگی سے افضل ہے۔ اس زندگی کو فنا نہیں وہ ابد تک باقی ہے۔ رب فرماتا ہے۔ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ (بقرہ: ۱۵۴) اور اگر ربانی علماء ومشائخ کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوں گے لوگوں کو اللہ والا بنانے والے۔ یہ وہ علماء ومشائخ ہیں جن کا علم ان کے دل میں اتر گیا کیونکہ ان کے دلوں میں خوف خدا اور عشق جناب مصطفیٰ کی نرمی تھی۔ نرم زمین میں بویا ہوا بیج ہی پھل پھول لاتا ہے۔ سخت مٹی سے برتن اور ٹھنڈے لوہے سے ہتھیار سخت وٹھنڈے سونے سے زیور نہیں بنتے۔ مٹی کو پانی سے اور

لوہے سونے کو آگ سے نرم کر کے ان سے چیزیں بناتے ہیں۔ ایسے ہی سخت اور ٹھنڈے دل کا کچھ نہیں بنتا۔ جب دل عشق کی آگ سے نرم ہو جائے تو سبحان اللہ عارف، متقی وغیرہ سب کچھ بن جاتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ
اور جب لیا اللہ نے عہد پیغمبروں کا کہ جب دوں میں تم کو کتاب
اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب
وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ
اور حکمت پھر آئے تمہارے پاس رسول سچا کرنے والا واسطے اس کے جو ساتھ ہے تمہارے البتہ ضرور ایمان لاؤ گے
حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ
اس کے اور ضرور مدد کرو گے اس کی فرمایا کیا اقرار کیا تم نے اور لیا تم نے اوپر اس کے ذمہ میرا
اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا فرمایا کیوں تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا بھاری ذمہ
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾
کہا انہوں نے اقرار کیا ہم نے فرمایا پس گواہ ہو جاؤ اور میں ساتھ تمہارے گواہوں میں سے ہوں
سب نے عرض کیا ہم نے اقرار کیا فرمایا تو ایک دوسرے پر گواہ ہو جاؤ اور میں آپ تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں
فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾
پس جو اعراض کرے بعد اس کے پس یہ لوگ اطاعت سے خارج ہیں
تو جو کوئی اس کے بعد پھرے تو وہی فاسق ہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ کی توحید اور اس کے دلائل کا ذکر تھا۔ اب حضور ﷺ کے فضائل ارشاد ہو رہے ہیں۔ جو عقیدہ توحید کے لئے شرط ہے۔ گویا اسلام کے ایک رکن (توحید) کا پہلے ذکر ہوا۔ اور دوسرے رکن یعنی حضور ﷺ کی رسالت عامہ کا اب ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے اس اتہام کی تردید تھی۔ جو انہوں نے پچھلے انبیاء پر لگایا یعنی تعلیم کفر اب بھی اس کی تردید ہے مگر دوسری طرح گویا پہلے فرمایا گیا تھا کہ وہ حضرات نبی تھے اور نبی کفر و شرک کی تعلیم دے سکتے ہی نہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ وہ حضرات میثاق کے دن ہم سے نبی آخر الزمان (ﷺ) پر ایمان لانے کا وعدہ کر گئے ہیں۔ وہ تو ان پیغمبر کی بھی مخالفت نہیں

کر سکتے چہ جائیکہ رب تعالیٰ کی مخالفت کریں۔ نیز انبیائے کرام لوگوں کو وہ وعدہ یاد دلانے آتے ہیں تو ناممکن ہے کہ اسے خود بھول جائیں۔ گویا ایک اعتراض کے دو جواب دیئے گئے۔ ایک پچھلی آیت میں اور دوسرا اس آیت میں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ انبیائے کرام لوگوں کو اللہ والا بننے کی تعلیم دیتے تھے۔ اب اس کی دلیل دی جا رہی ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ ان سب کے تصدیق فرمانے والے ہیں۔ ان کی تعلیم کو دیکھ کر ان حضرات کی تعلیم کا پتہ لگا لو۔ اگر وہ حضرات آج بظاہر زندہ ہوتے تو ان رسول کی اس ہی تعلیم پر ایمان لاتے اور اس کی امداد کرتے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ گذشتہ انبیاء کرام نے لوگوں کو ربانی بننے کا حکم دیا تھا۔ اب ربانی بننے کے طریقہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ ربانی بننا ہے تو اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ جن پر حضرات انبیاء کرام میثاق کے دن ایمان لا چکے ہیں اور ان کی مدد و نصرت کرو جس کا وعدہ حضرات انبیاء کرام کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ آیت گذشتہ آیت کی تفصیل ہے۔

تفسیر

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ۔ اذ یا تو اذکر پوشیدہ کا ظرف ہے اور اس میں حضور ﷺ سے خطاب ہے۔ یا اذکروا پوشیدہ کا اور یہود سے خطاب۔ یعنی اے محبوب (ﷺ) انہیں یاد دلاؤ۔ یا اے اہل کتاب یاد کرو۔ چونکہ توریت و انجیل میں اس عہد کا تفصیلی ذکر تھا۔ اس لئے اہل کتاب کو وہ پڑھا ہوا عہد یاد دلایا گیا۔ یاد کرنا قولی بھی ہوتا ہے عملی بھی ظاہر یہ ہے کہ یہاں قولی یاد کرانا مراد ہے۔ بقر عید کے دن قربانی و حج جناب خلیل کی عملی یادگار ہے۔ میثاق وثوق سے بنا۔ جو وثق یثق کا مصدر ہے۔ بمعنی پختگی اور مضبوطی۔ میثاق مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت مضبوط عہد چھ لفظوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ (۱) اقرار (۲) دعویٰ (۳) وعدہ (۴) عہد (۵) میثاق (۶) اصر۔ گذشتہ زمانہ کی کسی چیز کو اپنے ذمہ لینے کا نام اقرار ہے۔ اور گذشتہ بات کو دوسرے کے ذمہ لگانا دعویٰ۔ آئندہ زمانہ کے متعلق کسی بات کو اپنے ذمہ لینے کا نام وعدہ ہے پھر اگر یہ معمولی طور پر زبانی کر لیا جائے تو محض وعدہ کہلاتا ہے اور اگر تحریر میں آ جائے اور اس پر کچھ پختگی کر لی جائے تو عہد بن جاتا ہے یعنی محفوظ وعدہ اور اگر گواہی و رجسٹری وغیرہ سے اس کی اور زیادہ پختگی کر دی جائے جس سے انکار ناممکن ہو جائے۔ تب میثاق ہے اور اگر اس کے خلاف کرنے پر کوئی سزا بھی مقرر کر دی جائے کہ اگر میں اس کے خلاف کروں تو فلاں سزا کا مستحق ہوں تب اصر کہا جائے گا۔ یعنی بو جھل وعدہ' غرضکہ وعدہ میں بھول کا احتمال ہے۔ اور عہد میں انکار کی گنجائش کہ معاہد کہہ دے کہ یہ میری تحریر نہیں۔ لیکن میثاق اور اصر میں نہ بھول کا احتمال نہ انکار کی گنجائش۔ یہاں میثاق فرمایا کیونکہ انبیاء کے اس عہد پر سارے فرشتے اور خود پیغمبر ایک دوسرے پر گواہ تھے۔ رب تعالیٰ کی شاہی گواہی بھی اس میں شامل تھی۔ پھر آسمانی کتابوں' لوح محفوظ اور قرآن کریم میں اس کی تحریر بھی ہوئی۔ لہٰذا یہ میثاق ہوا نہ کہ محض وعدہ و عہد اور چونکہ اس کے خلاف ورزی کرنے پر سزا بھی تجویز ہو چکی۔ فَمَنْ تَوَلّٰى۔ الخ لہٰذا یہ اصر بھی ہوا۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے اسے میثاق اور اصر فرمایا۔ خیال رہے کہ اس آیت کریمہ میں اس وعدے کو میثاق بھی فرمایا گیا ہے اور اقرار بھی اصر بھی کہ ارشاد ہوا۔ اَقْرَرْتُمْ اور فرمایا وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ۔ یا تو اقرار بمعنی وعدہ ہے اور یا اپنے ہی معنی میں ہے۔ چونکہ اس کا ذکر رب نے فرما دیا اور اس مذکور و معہود کو حضرات انبیاء نے اپنے ذمہ لیا۔ اس لحاظ سے اسے اقرار فرمایا۔ تحقیق یہ ہے کہ النبیین سے سارے پیغمبر مراد ہیں نہ کہ بعض پیغمبر اور نہ صرف ان کی

امتیں۔ گویا رب تعالیٰ نے سارے پیغمبروں سے حضور ﷺ پر ایمان لانے کا عہد و میثاق لیا۔ اور ان سب پیغمبروں کی امتیں بھی تبعًا اس میں داخل ہوئیں کہ وہ پیغمبر اس عہد میں اپنے اصیل اور امتوں کے نمائندے تھے۔ جیسے نماز کا امام۔ یہ ہی قول حضرت علی و ابن عباس، قتادہ، سدی رضی اللہ عنہم اجمعین کا ہے۔ (خازن و کبیر و معانی وغیرہ) اس لئے النبیین جمع اور معرف باللام۔ ارشاد ہوا نبی رسول اور مرسل دونوں سے عام ہے۔ نبیوں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ مرسلین کی تعداد چار نبی میں رسول و مرسل بھی شامل ہیں۔ لہٰذا میثاق کی اضافت اپنے مفعول کی طرف ہے۔ اس صورت میں آیت بلا تاویل و توجیہہ درست ہے اور اس پر جو سوال و جواب کیے گئے ہیں ان شاء اللہ العزیز ہم اعتراض و جواب میں عرض کریں گے اس کے علاوہ اس کی دیگر تفاسیر بھی ہیں۔ چنانچہ سعید ابن جبیر، حسن اور طاؤس رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے فرمایا کہ یہ سارے پیغمبروں کا عہد ہے۔ جس میں حضور ﷺ بھی داخل ہیں۔ یعنی ہر ایک سے کہا گیا کہ تم کسی کا زمانہ پاؤ تو ایمان لانا۔ اسی قول کی بنا پر آیت میں بہت تاویلیں کرنی پڑیں گی۔ بعض نے فرمایا کہ میثاق کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے امتوں سے پیغمبروں کا عہد لیا۔ یعنی ان کے بارے میں عہد لیا گیا کہ اے لوگو تم ان پر ایمان لانا۔ یہ تفسیر بھی نہایت بعید ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں نبیین سے پہلے امم یا اولاد پوشیدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے نبیوں کی امت اور ان کی اولاد یعنی بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ یہ بھی بہت بعید تفسیر ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہاں نبیین سے مراد بنی اسرائیل ہیں چونکہ وہ اپنے آپ کو نبوت کا مستحق سمجھتے تھے۔ اس لئے بطور طعن انہیں نبی فرما دیا گیا۔ یہ اور زیادہ بعید تفسیر ہے۔ (معانی و خازن و کبیر) مگر تفسیر اول نہایت قوی ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی نبی نہ آیا مگر رب تعالیٰ نے ان سے حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کا عہد لیا۔ پھر اس پیغمبر نے اپنی قوم سے عہد لیا کہ اگر تم ان کا زمانہ پاؤ تو ان پر ایمان لانا۔ اور ان کی خدمت کرنا (خازن و معانی) جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ۔ یہ میثاق کی تفصیل ہے۔ ہماری قرأت میں لَمَا لام اور میم کی فتح سے ہے۔ لام توطیہ کا ہے اور مایا موصولہ ہے اور اٰتَيْتُكُمْ اس کا صلہ۔ سب مل کر مبتدا اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ خبر یا ماشرطیہ ہے اور اٰتَيْتُكُمْ شرط اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ جزا۔ یا لَمَا بمعنی لما ہے۔ اس کا نہایت نفیس ترجمہ وہ ہے جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ ایک قرأت میں لِمَا ہے لام کا کسرہ اور میم کا فتح بمعنی چونکہ اس صورت میں یہ جملہ لَتُؤْمِنُنَّ کی علت ہے۔ کتاب سے آسمانی کتاب اور سارے صحیفے مراد ہیں۔ خواہ بالواسطہ ملے ہوں یا بلا واسطہ۔ کیونکہ سارے پیغمبروں کو بلا واسطہ کتاب نہیں ملی اور حکمت سے یا کتاب کا علم مراد ہے یا دیگر وحی یا حرام و حلال کے مسائل مِنْ كِتٰبٍ میں مِن یا تبعیضیہ ہے یا بیانیہ۔ یعنی اے نبی ﷺ انہیں یاد دلاؤ یا اہل کتاب تم توریت و انجیل میں پڑھتے ہوئے اس واقعہ کو بھی یاد کرلو کہ جب رب تعالیٰ نے پیغمبروں سے ایک پختہ عہد لیا کہ جب میں تمہیں اپنی کتاب اور اپنا علم خاص عطا فرماؤں۔ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ۔ ثُمَّ عاطفہ اور یہ جملہ اٰتیتکم پر معطوف ہے۔ جَآءَكُمْ سے مراد جَآءَ فِيْ زَمَانِكُمْ ہے۔ رسول کی تنوین عظمت کی ہے اور اس سے ہمارے نبی ﷺ مراد ہیں کیونکہ عظیم الشان نبی اور ساری خلقت کے مطلق رسول حضور علیہ السلام ہی ہیں۔ نیز قرآن کریم میں جہاں رسول بغیر قید کے ارشاد ہوتا ہے۔ وہاں حضور علیہ السلام ہی مراد ہوتے ہیں جیسے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (التوبہ: ۱۲۸) یا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا

الرَّسُوْلَ یا (النساء: ۵۹) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ۔ (آل عمران: ۱۷۹) نیز وہ حضرات انبیاء کرام مختلف ملکوں‘ مختلف خاندانوں میں آئے ان سب پر اسی رسول کی اعانت و مدد لازم ہے جو سب انسانوں کا نبی و رسول ہے۔ وہ صرف حضور ﷺ ہیں۔ دیگر انبیاء کرام خاص ملکوں خاص قوموں کے رسول ہوتے تھے۔ سارے نبیوں پر ان کی اطاعت کیونکر لازم ہو سکتی ہے۔ نیز تمام کتابوں نبیوں کی تصدیق کرنا کسی نبی کی بشارت نہ دینا صرف حضور انور ﷺ کی صفت ہے۔ دیگر انبیاء مصدق بھی تھے‘ مبشر بھی ان چار پانچ وجہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے حضور ﷺ ہی کے لئے یہ عہد و پیمان لیا۔ کُمْ میں خطاب بلا واسطہ پیغمبروں سے ہے۔ اور بالواسطہ ان کی امتوں سے۔ مصدق رسول کی صفت ہے۔ یہ تصدیق سے بنا بمعنی سچا کرنا اور سچا کہنا اور سچا کہلوانا۔ یہاں تینوں معنی درست ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام نے ساری کتابوں کو سچا فرمایا۔ یہاں تک کہ ان سب پر ایمان لانا لازم کر دیا۔ اور سب کو سچا بھی کر دیا کیونکہ سب کتابوں نے حضور علیہ السلام کی پیشینگوئی کی تھی۔ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے وہ سب سچی ہوئیں۔ نیز حضور ﷺ نے ہی تمام کتابوں کو مخلوق سے سچا کہلوالیا۔ اگر حضور ﷺ ان کتب کا ذکر نہ کرتے تو کوئی انہیں آج جانتا پہچانتا بھی نہیں۔ لِمَا مَعَکُمْ کا لام صلہ کا ہے۔ اور مَا موصولہ اور مَعَکُمْ اس کا صلہ ہے۔ مَا سے مراد انبیائے کرام کی کتابیں ہیں۔ یعنی پھر آئے پیغمبرو تمہارے زمانہ میں وہ رسول مطلق حبیب مختار جناب احمد مجتبےٰ محمد ﷺ تشریف لے آئیں۔ جن کی نبوت نہ زمانہ سے مقید ہے نہ جگہ سے نہ کسی قوم سے ساری خلقت کے رسول فرش و عرش پر ان کا سکہ جاری جن کی صفت یہ ہے کہ وہ تمہاری تمام کتابوں کو سچا کر دکھائیں گے کیونکہ وہ سب کے بعد ہوں گے۔ سب کی تصدیق وہ ہی کر سکتا ہے جو سب کے بعد ہو۔ خیال رہے کہ اگلا پیغمبر پچھلوں کی بشارت دے گا اور پچھلا نبی اگلوں کی تصدیق کرے گا۔ آدم علیہ السلام سب کے مبشر ہیں کسی نبی کے مصدق نہیں کیونکہ ان سے پہلے کوئی نبی گذرا ہی نہیں اور حضور ﷺ سب کے مصدق ہیں۔ مبشر کسی کے نہیں۔ اور درمیان کے پیغمبر اگلوں کے مصدق اور پچھلوں کے مبشر ہوئے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ۔ (الصف: ۶) سب کی تصدیق حضور علیہ السلام ہی کی صفت ہے۔ اس جملہ نے سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تفسیر کی تائید کی۔ لِمَا مَعَکُمْ سے مراد ان حضرات کی کتابیں اور معجزات و صفات وغیرہ سب ہی ہیں کہ حضور ﷺ نے ان سب ہی کی تصدیق فرمائی۔ اس لئے لِمَا مَعَکُمْ ارشاد ہوا۔ کُتُبُکُمْ نہ فرمایا۔ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ۔ لام قسم کا ہے یہاں واللہ پوشیدہ ہے اور ایمان سے اصطلاحی ایمان مراد ہے جو امت کا نبی پر ہوتا ہے۔ (کبیر) اور جو دنیا میں آ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ جو مدار نجات ہے۔ ورنہ میثاقی ایمان جسے فطری ایمان بھی کہتے ہیں۔ یہ تو ان حضرات کو وہاں ہی میسر ہو گیا تھا بلکہ سارے انسانوں کو رب کی توحید حضور ﷺ کی نبوت پر وہاں ایمان دے دیا گیا تھا۔ اسی میثاقی ایمان پر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ لَتَنْصُرُنَّ سے ان کی خدمت‘ اطاعت اور مدد مراد ہے یعنی تم تمام حضرات باوجود پیغمبر ہونے کے ان کا کلمہ پڑھنا ان پر ایمان لے آنا اور ان کو اپنا پیغمبر تسلیم کر کے اپنے کو ان کا امتی مان لینا۔ اور ہر طرح ان کی خدمت ان کی اطاعت اور ان کی مدد کرنا۔ اب انبیائے کرام کے جواب کا موقعہ تھا مگر انہیں موقعہ نہ دیتے ہوئے خود رب تعالیٰ نے فرمایا قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ۔ اقرار قرؔ سے بنا بمعنی ثبوت اور لزوم۔ اسی لئے ٹھہر جانے کو قرار کہا جاتا ہے۔ اور اپنی جگہ دوسرے کو ٹھہرانے کو اقرار چونکہ اس سے کسی چیز کو اپنے پر لازم کیا

جاتا ہے۔ اس لئے اسے اقرار کہتے ہیں۔ (کبیر) حقیقتاً گذشتہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور کبھی آئندہ کے لئے بھی بمعنی معاہدہ۔ یہاں دوسرے معنی میں ہے۔ اَخَذْتُمْ بمعنی قَبِلْتُمْ ہے قرآن کریم میں بہت جگہ اخذ بمعنی قبول آیا ہے۔ لَا یُؤْخَذُ مِنْهَا یعنی لَا یُقْبَلُ۔ (انعام: ۷۰) اور فرمایا وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ۔ (التوبہ: ۱۰۴) یعنی رب تعالیٰ صدقے قبول فرماتا ہے۔ ذالکم سے اس عہد کی طرف اشارہ ہے چونکہ یہ ہر پیغمبر کے حق میں مستقل عہد تھا اس لئے ذالکم بطریقہ جمع فرمایا گیا۔ اصر کی تحقیق سورۂ بقر کے اخیر میں وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا۔ (بقرہ: ۲۸۶) کی تفسیر میں ہو چکی کہ اس کے معنی بوجھ اور ثقل ہیں تاکیدی عہد کو اس لئے اصر کہتے ہیں کہ وہ معاہد پر ایک بوجھ ہوتا ہے کہ اس کے توڑنے پر سزا مرتب ہوتی ہے۔ یعنی رب تعالیٰ نے فرمایا۔ اے گروہ انبیاء! فرماؤ کیا تم نے اس کا اقرار کیا ہے اور میرے اس بوجھل عہد کو قبول کیا۔ قَالُوْا اَقْرَرْنَا۔ حضرات انبیائے کرام نے اس عہد کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے صرف بلیٰ نہ کہا بلکہ اَقْرَرْنَا کہا۔ یعنی ان سب نے عرض کیا کہ اے مولیٰ ہم نے اقرار کرلیا۔ ہم اس معاہدہ کی ضرور پابندی کریں گے۔ معمولی چیزوں کا اقرار بلکہ ایجاب وقبول صرف ہاں کہہ دینے بلکہ کبھی خاموش رہ جانے سے بھی ہو جاتا ہے مگر بہت اہم وضروری چیز کا اعتراف ان چیزوں سے نہیں ہوتا وہاں اقرار یا قبول کے صریحی الفاظ بولنا پڑتے ہیں۔ خرید وفروخت میں ہاں کہہ دینا کافی ہے۔ بلکہ فقط لین دین سے بھی ہو جاتی ہے۔ جسے بیع تعاطی کہتے ہیں مگر نکاح کے قبول کے لئے قَبِلْتُ کہنا لازم ہے۔ توحید کے اقرار سے نبوت کا اقرار زیادہ اہم تھا۔ اس لئے توحید کے لئے بلیٰ کہنا کافی ہوا مگر یہاں اقررنا کہلوایا گیا۔ نیز قَالُوْا جمع فرما کر بتایا گیا کہ صرف ایک دو نبی نے دوسروں کا نمائندہ بن کر سب کی طرف سے یہ نہ کہا بلکہ سب نے صراحۃً خود کیا وکالۃً نہ کہا اور سجدہ ملائکہ کی طرح سب انبیاء نے بیک وقت یہ عرض کیا غرضکہ قالوا جمع فرماتے ہیں۔ عجیب راز ہیں۔ صرف اسی پر کفایت نہ فرمائی بلکہ ارشاد ہوا۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ پیغمبروں سے خطاب ہے اور اِشْهَدُوْا سے بعض کا بعض پر گواہ بن جانا مراد ہے کہ آدم علیہ السلام نوح علیہ السلام پر گواہ بنیں۔ اور نوح علیہ السلام آدم علیہ السلام کے وغیرہ وغیرہ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اشھدوا میں سارے فرشتوں سے خطاب ہے۔ یعنی اے فرشتو تم اس اقرار پر گواہ رہو۔ بعض نے فرمایا کہ اس میں خطاب تو پیغمبروں سے ہی ہے مگر شہادت سے مراد گواہی دینا ہے نہ کہ گواہ بننا یعنی اے پیغمبرو تم دنیا میں اپنی امتوں کے سامنے اس عہد کی گواہی دو اور انہیں خبر پہنچاؤ تا کہ کسی کو بے خبری کا عذر نہ رہے۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے ہر نبی کا اپنے نفس پر گواہ بننا مراد ہے یعنی ہر ایک اپنے پر گواہ رہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ (اعراف: ۱۷۲)۔ اور فرماتا ہے۔ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰی اَنْفُسِنَا (انعام: ۱۳۰)۔ یہ ایک قسم کا مبالغہ ہے۔ بعض نے فرمایا کہ اشْهَدُوْا شہود سے بنا بمعنی یقین۔ یعنی اس پر یقین کرلو۔ جیسے معائنہ اور مشاہدہ کی ہوئی چیز پر یقین ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر) پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ۔ میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ایک گواہ ہوں۔ خیال رہے کہ حضرات انبیاء کی گواہی اس واقعہ پر ہوئی اور رب تعالیٰ کی گواہی اس گواہی پر یعنی میں تمہاری گواہی پر گواہ ہوں۔ یہ گواہی ایسی تھی جیسے شہنشاہ ایک واقعہ کو دیکھے اس پر گواہ بن جائے کہ وہ حاکم بھی ہے اور گواہ بھی۔ فَمَنْ تَوَلّٰی بَعْدَ ذٰلِكَ۔ یہ میثاق کا نتیجہ ہے ظاہر یہ ہے کہ مَنْ سے مراد عہد وپیمان کرنے والے انبیاء کرام ہیں۔ تب یہ مطلب ہے کہ حضرات انبیاء عبدیت کے اعلیٰ منزل پر ہیں جس کے بعد الوہیت ہی ہے۔ پھر ان میں بعض کو

خصوصی صفات بخشے گئے کسی کو خلت کسی کو کلیمی وغیرہ اور کفار انتہائی پستی میں کہ جانوروں سے بدتر ہیں۔ اگر بفرض محال ان اعلیٰ درجہ والوں میں سے کوئی اس نبی آخر الزمان کی اطاعت سے منہ موڑے گا تو انتہائی پستی میں پہنچے گا۔ نبوت' ولایت' صحابیت' تقویٰ' ایمان سب نیچے ہوگا۔ یہ فرضی گفتگو ہے اور ہم کو بتانا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کی مخالفت سے نہ کوئی سیّد رہتا ہے نہ عالم نہ پیر نہ صوفی نہ مسلمان جب حضرات انبیاء اس مخالفت سے کچھ نہیں رہتے تو تم کس شمار میں ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ مَنْ سے مراد ساری مخلوق ہو۔ انسان ہو یا جن' یا فرشتے تو یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کی نبوت ایسی عام ہوگی کہ کوئی ان کی اطاعت سے باہر نہیں ہو سکتا اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے متعلق عہد لیا گیا کیونکہ حضور ہی کی نبوت عام ہے۔ تولی کے معنی بارہا بیان ہو چکے۔ ذٰلِکَ سے اسی میثاق کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ عہد دینے کے بعد یا یہ عہد سننے کے بعد پہلی صورت میں روئے سخن حضرات انبیاء سے ہے۔ دوسری صورت میں سارے بندوں سے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ رب تعالیٰ نے اس میثاق کو تین تاکیدوں سے مضبوط کیا۔ (۱) تمام کو گواہ بنانا (۲) پھر خود اپنی گواہی قائم فرمانا (۳) پھر اس کی مخالفت پر سزا مقرر کرنا تو گویا یہ میثاق کی تیسری تاکید ہے۔ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. یہ مَنْ تَوَلّٰی کی جزا ہے چونکہ مَنْ سے جماعت مراد تھی۔ لہٰذا اُولٰٓئِکَ جمع سے اس کی طرف اشارہ کیا گیا۔ هُمْ سے حصر کا فائدہ حاصل ہوا۔ فَاسِقُوْنَ فسق سے بنا بمعنی نکل جانا۔ تقویٰ و پرہیزگاری سے نکلنے کو بھی فسق کہتے ہیں۔ اور اسلام سے نکل جانے کو بھی یہاں دوسرے معنی مراد ہیں کیونکہ پیغمبر کا انکار کفر ہے۔ یعنی اس عہد و میثاق کی گواہی شاہدی کے بعد جو کوئی اس نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے سے منہ پھیرے گا وہ کافر ہے۔ خیال رہے کہ سزا مقرر کرنے سے صرف میثاق کا اہتمام مقصود ہے۔ ورنہ انبیائے کرام شرک و کفر سے معصوم ہیں۔ یہ ایسا ہی فرض ہے جیسے لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ (الزمر: ۶۵) (تفسیر روح المعانی) اور اگر مَنْ سے خطاب بندوں سے ہوں تو ظاہر معنی مراد ہیں اور اس صورت میں تَوَلّٰی کی تین صورتیں ہیں۔ حضور ﷺ کے احکام سے اپنے کو باہر جاننا یہ دونوں صورتیں کفر ہیں۔ تیسرا حضور ﷺ کے احکام پر عمل نہ کرنا اپنے کو گنہگار ماننا یہ فسق عملی ہے جو قابل معافی ہے۔

خلاصہ تفسیر

اللہ تعالیٰ نے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرایا پھر انہیں جنت میں رکھا وہاں ہی حضرت حوا کی پیدائش ہوئی پھر ان دونوں بزرگوں کو زمین پر بھیجا۔ پھر تین سو برس کی جدائی کے بعد ان دونوں کو مقام عرفات میں ملایا...... واقعہ یہ ہوا کہ رب تعالیٰ نے انسان سے تین عہد لئے ایک اپنی ربوبیت کا جو سب سے لیا گیا۔ جس کا ذکر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی۔ (اعراف: ۱۷۲) میں فرمایا گیا۔ دوسرا اظہار دین کا جو خاص علماء اہل کتاب سے لیا گیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَهٗ۔ (آل عمران: ۱۸۷) تیسرا عہد حضور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی خدمت و اطاعت کرنے کا جو بلاواسطہ سارے نبیوں سے اور بالواسطہ ان کی امتوں سے لیا گیا۔ اسی کا ذکر اس آیت میں ہے۔ چوتھا عہد سارے انبیائے کرام سے لیا گیا جس میں ہمارے حضور ﷺ بھی داخل ہیں۔ وہ تھا تبلیغ دین اور ہدایت خلق کا ذکر اس آیت میں ہے وَمِنْکَ وَمِنْ نُّوْحٍ۔ (احزاب ۷) یہ چار عہد ہیں جن میں عہد کرنے والے مختلف غرض کہ یہ عہد بھی عہد ربوبیت کی طرح عام تھا مگر انبیاء سے بلاواسطہ اور ان کی امتوں سے بالواسطہ کہ آدم

علیہ السلام کو جنت سے ہندوستان کولمبو کے پہاڑ سراندیپ پر اتارا گیا۔ اور حضرت حوا کو جدہ میں تین سو سال تک ان میں جدائی رہی۔ اور آدم علیہ السلام معافی کے لئے گریہ زاری فرماتے رہے۔ پھر حضور علیہ السلام کے نام کی برکت سے توبہ قبول ہوئی۔ اور عرفات میں حضرت حواء سے ملاقات کی۔ پھر نعمان پہاڑ پر آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام روحوں کو نکالا گیا جو باریک چیونٹیوں کی شکل میں تھیں۔ کفار کی روحیں سیاہ مسلمانوں کی سفید اور انبیائے کرام کی ارواح روشن تھیں۔ ان سے یہ عہد لئے گئے جن میں تیسرا عہد وہ تھا جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اے نبی ﷺ ان اہل کتاب کو نبیوں کا وہ عہد میثاق یاد دلا دو جس کا ذکر توریت وانجیل میں ہے تاکہ انہیں عبرت حاصل ہو۔ اور ان کے دلوں میں آپ کی عظمت پیدا ہو۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے سارے پیغمبروں سے خواہ وہ محض نبی ہو یا رسول یا مرسل بھی۔ سب کے سامنے یہ عہد لیا کہ اے گروہ انبیاء جب میں تمہیں دنیا میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنی کتاب یا صحیفہ اور اپنا علم و حکمت عطا فرماؤں۔ تمہیں تمغہ نبوت سے سرفرازی بخشوں۔ پھر اسی حال میں جبکہ تمہاری نبوت کا آفتاب خوب چمک رہا ہو اور تمہارا کلمہ پڑھا جا رہا ہو تمہارے نام کے ڈنکے بج رہے ہوں وہ پچھلا پیغمبر دعائے خلیل اور بشارت مسیح ساری خلقت کا ہادی۔ عرش و فرش کا بادشاہ احمد مجتبیٰ محمد ﷺ تمہارے پاس تشریف لے آئے تو تم ان کا کلمہ پڑھ کر ان پر ایمان لانا اور ہر طرح ان کی امداد کرنا اور اعانت کرنا۔ بولو کیا اقرار کرتے ہو اور اس بھاری ذمہ کو اٹھاتے ہو۔ تمہیں یہ بات منظور ہوگی۔ سب نے عرض کیا۔ اے مولیٰ ہم سب کو اس کا اقرار ہے تجھ سے عہد کرتے ہیں اور اس کی پابندی کریں گے۔ فرمایا اچھا تم سب ایک دوسرے پر گواہ بن جاؤ۔ صرف تمہاری گواہی پر ہی بس نہیں بلکہ ہماری شاہی گواہی بھی اس میں شامل ہے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ گواہ ہیں۔ خیال رہے کہ جو کوئی اس عہد و پیمان کے بعد اس نبی پر ایمان لانے سے منہ موڑے گا وہ کافر ہو گیا۔

فضیلت سید الانبیاء ﷺ

ساری امت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ تمام نبیوں کے سردار ہیں۔ اس کے بیشمار دلائل ہیں جن میں سے بطور اختصار کچھ عرض کئے جاتے ہیں۔ (۱) یہی آیت کریمہ جس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نبیوں کے بھی نبی ہیں اور سارے پیغمبر آپ کے امتی۔ سب سے آپ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا۔ اور عہد بھی نہایت پختگی سے کہ عہد ربوبیت میں صرف اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی۔ (اعراف: ۱۷۲) پر کفایت ہوئی مگر یہاں بجائے بلیٰ کے اقرار نا کہلوایا۔ سب کو اس پر گواہ بنایا۔ رب تعالیٰ نے اپنی شاہی گواہی کو بھی شامل فرمایا۔ پھر اس کی مخالفت پر سزا مقرر فرمائی۔ (۲) کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ (آل عمران: ۱۱۰)۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ امت مصطفیٰ ﷺ تمام امتوں سے افضل ہے اور ظاہر ہے کہ امت کی افضلیت اس کے پیغمبر کی افضلیت سے ہوگی۔ (۳) یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ۔ (احزاب: ۳۲) جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے ازواج مطہرات جہان بھر کی عورتوں سے افضل ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انہیں یہ افضلیت حضور علیہ السلام سے ملی۔ لہٰذا حضور علیہ السلام بھی سب سے افضل ہیں۔ (۴) وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔ (احزاب: ۴۰) اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام آخری نبی اور آپ کا دین غیر منسوخ ہے اور ظاہر ہے کہ باقی فانی سے

افضل ہے۔ لہٰذا اسلام دیگر ادیان سے بہتر اور یہ بہتری حضور علیہ السلام کی برکت سے ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ تمام دین والے پیغمبروں سے افضل۔ (۵) مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے ذریعہ تمام کتابیں سچی ہوئیں۔ لہٰذا ساری کتابیں اور کتاب والے حضور علیہ السلام کے حاجت مند ہوئے اور حاجت والے سے وہ افضل ہے۔ جس کی طرف حاجت ہو۔ (۶) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا۔ الخ (بقرہ: ۱۲۹) (۷) مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِىْ مِنْ بَعْدِى اسْمُهٗ اَحْمَدُ۔ (الصف: ۶) ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام دعائے خلیل اور بشارت مسیح ہیں۔ گویا وہ حضرات داعی ہیں اور آپ مدعیٰ۔ وہ حضرات اسناد ہیں اور حضور علیہ السلام متن۔ وہ حضرات مبشر ہیں اور حضور علیہ السلام اصل بشارت۔ وہ حضرات چمن ہیں اور حضور علیہ السلام پھول۔ وہ حضرات طفیلی ہیں اور حضور علیہ السلام مقصود۔ وہ سب براتی ہیں اور حضور دولہا ﷺ۔ اور ظاہر ہے کہ پھول درخت سے افضل۔ دولہا براتیوں سے اعلیٰ اور متن اسناد سے بڑھ کر کہ اسناد مبدا ہے اور متن اس کی انتہا۔ (۸) سُبْحٰنَ الَّذِىْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا الخ۔ (الاسراء: ۱) (۹) مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى الخ (النجم: ۱۷) ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو رب تعالیٰ نے معراج دی اور اپنے دیدار سے سرفراز فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ درجہ اور کسی پیغمبر کو نہ ملا۔ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام سب سے بڑھ کر قرب والے ہیں۔ (۱۰) فَاَوْحٰىٓ اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى۔ (النجم: ۱۰) رب تعالیٰ نے ان تمام باتوں کا اعلان فرما دیا جو طور پر موسیٰ علیہ السلام سے فرمائیں۔ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى الخ (طٰہٰ: ۱۷) مگر اس کلام کو صیغہ راز میں رکھا جو معراج میں اپنے حبیب علیہ السلام سے فرمایا۔ فَاَوْحٰىٓ اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى۔ (النجم: ۱۰) ہم نے اپنے اس بندہ کو خاص اس وقت جو وحی کی وہ کی تمہیں کیوں بتائیں۔ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام صاحب اسرار ہیں اور ظاہر ہے کہ اندرونی دوست بیرونی دوستوں سے افضل ہیں۔ (۱۱) يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ الخ۔ (۱۲) يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ الخ (۱۳) يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ الخ (۱۴) يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ الخ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو نام پاک سے کہیں نہ پکارا بلکہ آپ کے پیارے اوصاف سے۔ دیگر پیغمبروں کو ان نام سے پکارا گیا۔ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى الخ (طٰہٰ: ۱۷) يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ الخ (آل عمران: ۵۵) وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ الخ۔ (الصافات: ۱۰۴) وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ الخ وغیرہ اور بجائے نام شریف کے خطابات سے پکارنا کہ اے غیب کی خبریں دینے والے۔ اے ہمارے خاص پیغمبر اے چادر اوڑھنے والے۔ اے کپڑے پہننے والے۔ وغیرہ دلیل محبوبیت ہے۔ (۱۵) لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ (فرقان: ۱) (۱۶) قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (اعراف: ۱۵۸) (۱۷) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ (سباء: ۲۸) ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ سارے عالم کے پیغمبر اور سب پر آپ کی اطاعت واجب۔ یوں سمجھو کہ آدم علیہ السلام کی ابوت سے حضور علیہ السلام کی نبوت زیادہ عام ہے کہ وہ صرف انسان کے لئے ہے اور یہ ہر ماسوی اللہ کے لئے۔ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کا رقبہ سلطنت وسیع ہے اور ظاہر ہے کہ بڑی سلطنت کا مالک بڑا بادشاہ ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ تمام نبیوں سے افضل ہیں۔ خیال رہے کہ عالمین اور ناس میں انبیائے کرام بھی داخل ہیں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ خضر و ادریس و الیاس علیہم السلام جو اب تک زندہ ہیں سب حضور علیہ السلام پر ایمان لائے بلکہ مفسرین فرماتے ہیں کہ بیعت رضوان میں خضر علیہ السلام نے بھی حضور علیہ السلام سے بیعت کی

(روح البیان) بلکہ اگر وفات یافتہ پیغمبر بھی اس میں داخل ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ ان حضرات نے اپنی قبروں میں حضور علیہ السلام کا کلمہ پڑھا ہو۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں بہت سے پیغمبروں نے حج کیا۔ معراج کی رات سارے پیغمبروں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیچھے نماز پڑھی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نماز و حج اسلامی تھے لہٰذا وہ سب حضرات حضور علیہ السلام کے پیروکار ہوئے (۱۸) وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (انفال:۱۷) (۱۹) اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح:۱۰) (۲۰) يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ الخ۔ (الفتح:۱۰) ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کا فعل رب تعالیٰ کا فعل ہے۔ حضور علیہ السلام سے بیعت رب تعالیٰ سے بیعت۔ حضور علیہ السلام کا ہاتھ رب تعالیٰ کا دستِ قدرت اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب حضور علیہ السلام کو رب تعالیٰ سے قرب خاص حاصل ہو۔ (۲۱) عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ (الاسراء:۷۹) اس آیت سے معلوم ہوا کہ مقام محمود صرف حضور ﷺ کے لئے ہے۔ جہاں سب اولین و آخرین حضور علیہ السلام کی حمد و ثنا کریں گے۔ (۲۲) وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ (الشرح ۴) لَکَ سے معلوم ہوا کہ یہ بلندی ذکر حضور (ﷺ) سے خاص ہے کہ رب تعالیٰ کے نام کے ساتھ حضور علیہ السلام کا نام عرش و فرش، جنت و طوبیٰ میں آپ کا چرچا ہے۔ بہت اختصار کے ساتھ بائیس آیتیں پیش کی گئیں۔ ورنہ حضور علیہ السلام کی افضلیت مطلقہ بہت آیتوں سے ثابت ہے۔ **تعجب ھے** کہ حضرت مولانا احمد جیون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حضور انور ﷺ کی افضلیت کی کوئی صریح آیت نہ ملی جیسا کہ وہ اس جگہ فرماتے ہیں۔

احادیث: حضور علیہ السلام کی افضلیت بے شمار احادیث ہیں جن میں سے چند عرض کی جاتی ہیں۔

(۱) حضور علیہ السلام اولاد آدم کے سردار ہیں۔ قیامت میں اول حضور علیہ السلام کی ہی قبر انور کھلے گی۔ پہلے شفیع حضور ہی ہیں۔ (مسلم و مشکوٰۃ) (باب فضائل سید الانبیاء) (۲) حضور علیہ السلام کی امت تمام امتوں سے زیادہ ہے اور جنت میں سب سے پہلے حضور ہی تشریف لے جائیں گے (مسلم) (۳) حضور علیہ السلام کے لئے غنیمتیں حلال ہوئیں۔ تمام روئے زمین آپ کی مسجد بنائی گئی۔ حضور علیہ السلام ساری خلق کے نبی ہیں۔ حضور خاتم الانبیاء ہیں (مسلم) (۴) فرماتے ہیں (ﷺ) کہ ہمیں خزائن زمین کی کنجیاں عطا فرمائی گئیں۔ (مسلم و بخاری) (۵) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم اس وقت نبی تھے جب آدم علیہ السلام روح و جسم کے درمیان تھے۔ (ترمذی و مشکوٰۃ) (۶) فرماتے ہیں (ﷺ) کہ میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا ہمارے ہاتھ لواء الحمد ہوگا کہ اس جھنڈے کے نیچے آدم و اولاد ہوں گے۔ (ترمذی) (۷) فرماتے ہیں ﷺ کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں۔ موسیٰ کلیم اللہ ہیں۔ عیسیٰ روح اللہ ہیں۔ آدم صفی اللہ ہیں۔ علیہم السلام۔ مگر ہم حبیب اللہ ہیں۔ ہم شفیع المذنبین ہیں۔ ہم ہی جنت کا دروازہ کھلوائیں گے۔ ہم اللہ کے نزدیک سارے اولین و آخرین سے افضل ہیں۔ (ترمذی، دارمی و مشکوٰۃ) اس کی شرح مرقات میں ہے کہ خلیل مرید ہے۔ حبیب مراد خلیل سالک ہے حبیب مجذوب۔ خلیل طالب ہے۔ حبیب مطلوب۔ خلیل وہ جو رب کی رضا چاہے۔ حبیب وہ کہ رب اس کی رضا چاہے۔ خلیل وہ ہے جسے مغفرت کی امید ہو۔ حبیب وہ جس کی مغفرت درجہ یقینی میں ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ۔ (شعراء:۸۲) حبیب کے لئے فرمایا گیا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ۔ (الفتح:۲) اس لئے فرمایا گیا کہ

ابراہیم خلیل ہیں اور ہم حبیب (مرقاۃ) (۸) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب لوگ اٹھیں گے تو سب سے اول ہم ہوں گے۔ جب چلیں گے تو سب کے پیشوا ہم ہوں گے۔ جب سب خاموش ہوں گے تو ہم کلام فرمائیں گے۔ جب سب محبوس ہوں گے تو ہم شفاعت کریں گے۔ جب سب مایوس ہوں گے تو ہم خوشخبری دیں گے۔ اس دن کنجیاں اور حمد کا جھنڈا ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ (ترمذی و دارمی) (۹) عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو سارے انبیاء اور سارے آسمان والوں پر بزرگی دی (دارمی) (۱۰) عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ توریت میں حضور علیہ السلام کی صفت موجود ہے اور وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ دفن ہوں گے۔ عقل کا تقاضا بھی ہے کہ حضور علیہ السلام حضرات انبیاء سے افضل ہوں کیونکہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرایا اور ہمارے حضور ﷺ کے لئے نبیوں سے عہد و پیمان لئے۔ اس سجدہ اور میثاق میں کئی طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ سجدہ صرف فرشتوں نے کیا یہ عہد و پیمان نبیوں نے کیا۔ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں۔ دوسرا یہ کہ سجدہ عمل تھا اور یہ میثاق عقیدہ عمل سے عقیدہ اعلیٰ ہے۔ تیسرا یہ کہ سجدہ ایک وقتی چیز تھی۔ اور یہ عہد و میثاق دائمی چیز اس لئے فرشتے آدم علیہ السلام کے امتی نہ بن گئے مگر تمام انبیاء حضور کے امتی بن گئے۔ بعض تو بلاواسطہ جیسے حضرت خضر و الیاس و عیسیٰ علیہم السلام اور بعض بالواسطہ جیسے دوسرے انبیاء کرام کہ ان بزرگوں نے معراج کی رات حضور علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھی۔ یہ لِتُؤْمِنُنَّ کی عملی تفسیر تھی۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے پچاس نمازوں کی پانچ کرادیں۔ یہ نصرت و مدد کی عملی تفسیر ہے۔ مسجود الیہ ساجد کا نبی نہیں ہو جاتا۔ کعبہ ہمارا مسجود الیہ ہے۔ حضرت یوسف جناب یعقوب علیہ السلام کے مسجود لہٗ تھے مگر نہ کعبہ ہمارا نبی ہے نہ یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے نبی بن گئے تھے۔ نیز آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے سجدہ کرایا مگر ہمارے حضور ﷺ پر تمام خلق سے درود بھجوایا۔ بلکہ رب تعالیٰ بھی اس درود بھیجنے والوں میں شریک ہے۔ یہ درود اس سجدے سے افضل ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** رب تعالیٰ نے سارے نبیوں سے حضور علیہ السلام کا عہد لیا کہ حضور کو پائیں تو ان پر ایمان لائیں نہ کہ حضور علیہ السلام سے کسی اور کا۔ اس کے چند دلائل ہیں۔ (۱) قرآن کریم میں جہاں کہیں رسول بغیر قرینہ اور بغیر قید آتا ہے۔ اس سے حضور علیہ السلام ہی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (التوبہ: ۱۲۸) یاوَاذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا۔ (بقرہ: ۱۲۹) وغیرہ یہاں چونکہ رسول بغیر قرینہ ہے اس لئے حضور علیہ السلام ہی مراد ہیں۔ (۲) اس آیت میں رسول کی صفت یہ بیان کی کہ وہ ساری کتابوں کی تصدیق کریں گے۔ یہ صرف حضور علیہ السلام ہی کی صفت ہے کیونکہ کسی پیغمبر نے ساری کتابوں کی تصدیق نہ کی۔ جگہ جگہ حضور علیہ السلام کے لئے فرمایا گیا۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ۔ (۳) نبیوں پر واجب نہ تھا کہ اپنے ہم زمانہ پیغمبروں پر ایمان لائیں اور ان کے امتی بن جائیں۔ دیکھو حضرت موسیٰ و ہارون ہم زمانہ ہیں۔ حضرت ابراہیم و لوط و اسمٰعیل و اسحٰق ہم زمانہ ہیں۔ ایسے ہی حضرت یحییٰ و عیسیٰ ہم زمانہ ہیں۔ علیہم السلام۔ ان میں سے کوئی کسی پر ایمان نہ لایا بلکہ بعض بادشاہ ہوئے اور بعض وزیر۔ حضور علیہ السلام ہی کی صفت ہے کہ جو نبی آپ کا زمانہ پائے آپ کا امتی [illegible] جیسا کہ لَتُؤْمِنُنَّ [illegible] معلوم ہوا موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام کے پاس

تشریف لے گئے تو حضرت خضر نہ تو موسیٰ علیہ السلام کے امتی بنے نہ آپ کے مطیع بلکہ آپ سے عرض کیا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے اور پھر آپ نے جتنے کام کیے وہ شریعت موسوی کے خلاف تھے۔ جیسے کشتی توڑنا' بے قصور بچہ کو ہلاک کر دینا وغیرہ۔ اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شریعت کے مطابق آپ پر اعتراض کیے تو آپ نے رخصت تو فرما دیا مگر دین موسوی کی پیروی نہ کی۔ مگر اب حضور ﷺ کے پیرو ہیں۔ بیعت رضوان میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کر گئے ہیں۔ (۴) اگر ہر نبی کا اپنے ہم زمانہ نبی پر ایمان لانا واجب ہوتا تو دور لازم آتا۔ اس لئے کہ پھر ابراہیم علیہ السلام تو لوط علیہ السلام کے امتی بنتے اور لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے وغیرہ اور یہ باطل ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ عہد حضور ﷺ کے متعلق لیا گیا ہو کہ حضور مطاع ہیں۔ اور سب مطیع (ﷺ)۔ **دوسرا فائدہ:** حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام سب پیغمبروں کے مصدق ہیں کسی کے مبشر نہیں۔ جیسا کہ **مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ** سے معلوم ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ تصدیق کرنے والا مصدقین کے بعد ہوتا ہے۔ اگر حضور علیہ السلام کے بعد کوئی نیا نبی آنے والا ہوتا تو حضور ﷺ اس کے مصدق نہ ہوتے مبشر ہوتے۔ پھر دیگر انبیاء میں اور حضور علیہ السلام میں کیا فرق ہوتا۔ **تیسرا فائدہ:** ہندوستان اصل میں اسلامستان ہے کہ پہلے پیغمبر یعنی آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اترے۔ اب بھی حضرت شیث ابن آدم علیہ السلام کا مزار شریف اجودھیا ضلع فیض آباد میں موجود ہے میں نے خود زیارت کی اور تاریخ اجودھیا میں اس قبر کا تاریخی ثبوت بھی دیا گیا ہے۔ نیز علماء و مشائخ اور علم و معرفت کے لحاظ سے یہ ملک دیگر اسلامی ممالک سے پیچھے نہ رہا۔ اسے ہندوستان کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب اسلامی سلاطین غزنوی وغیرہ یہاں آئے تو انہوں نے یہاں ڈکیتی و چوری دیکھی۔ اسلامی ممالک میں اسلامی سزائیں رائج ہونے کی وجہ سے ان جرموں کا نام و نشان نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اسے ہندوستان کہا فارسی میں ہندو چور ڈاکو کو کہتے ہیں۔ اور ستان بمعنی جگہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا ۔۔۔ بہ خال ہندواش بخشم سمر قند و بخارا را

چوتھا فائدہ: نبی رسول و مرسل سے عام ہے کہ ہر رسول نبی ہے مگر ہر نبی کا رسول ہونا لازم نہیں جیسا النبیین سے معلوم ہوا۔ رب تعالیٰ نے سارے نبیوں سے عہد لیا جس میں رسول و مرسل بھی داخل ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** اہم اقرار میں صرف ہاں یا جی ہاں کافی نہیں بلکہ صاف الفاظ کہنا چاہئیں۔ جیسا کہ **اَقْرَرْنَا** سے معلوم ہوا۔ اسی لئے نکاح کے وقت شوہر سے کہلواتے ہیں۔ میں نے قبول کیا صرف جی ہاں پر کفایت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہاں اور جی ہاں کے معنیٰ لہجہ وغیرہ بدلنے سے بدل جاتے ہیں کہ بجائے اقرار کے انکار بن جاتا ہے۔ امت کا نبی کے ساتھ روحانی نکاح ہو جاتا ہے۔ یہ نکاح موت سے بھی نہیں ٹوٹتا۔ نکاح کے معنی ہیں ملنا۔ **چھٹا فائدہ:** گواہی پر گواہی درست ہے جیسا کہ **وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ** سے معلوم ہوا رب تعالیٰ کی گواہی ان حضرات کی گواہی تھی۔ **ساتواں فائدہ:** محفل میلاد شریف سنت الٰہیہ ہے۔ دیکھو مجلس میثاق میرے حضور (علیہ السلام) کی محفل میلاد تھی۔ جس میں حق تعالیٰ حضور ﷺ کا میلاد فرمانے والا بزم انبیاء سننے والی تھی۔ نبوت کی شیرینی اس مجلس کا تبرک تھا۔ جو بقدر قابلیت انبیاء کو تقسیم ہوا۔ خیال رہے کہ ذکر ولادت ہی کا نام محفل میلاد ہے۔ خواہ آئندہ کے لحاظ سے ہو یا گذشتہ زمانہ کے اعتبار سے۔ **آٹھواں فائدہ:** کوئی شخص کسی مرتبہ پر پہنچ کر حضور ﷺ سے مستغنی نہیں

ہوسکتا اور آپ کے احکام سے علیحدہ نہیں ہوسکتا۔ دیکھو جناب خلیل و مسیح تمام انبیاء کرام پر آپ کی اطاعت لازم فرمائی جارہی ہے۔**نواں فائدہ:** ہر مسلمان کو بقدر طاقت دینی خدمت کرنی چاہیے۔ مسجد کی علم کی خدمت حضور ﷺ ہی کی خدمت ہے۔ جیسا کہ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ سے معلوم ہوا۔**دسواں فائدہ:** حضور ﷺ کی نافرمانی کرنے والا نہ سیّد ہے نہ عالم نہ پیر نہ مسلمان کہ جب حضور کی مخالفت سے نبی نبی نہیں رہتے تو اس کے ہوتے ہوئے مسلمان مسلمان کیسے رہیگا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دیگر انبیاء سے حضور کا عہد لیا گیا بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر نبی سے عہد لیا گیا۔ جس میں حضور ﷺ بھی داخل ہیں کہ جو کوئی دوسرے پیغمبر کا زمانہ پائے وہ اس کی تصدیق کرے کیونکہ دوسری جگہ فرمایا گیا وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى الخ (احزاب: ۷) معلوم ہوا کہ حضور ﷺ سے بھی یہ عہد لیا گیا تھا۔**جواب:** اس آیت میں دوسرے میثاق کا ذکر ہے یعنی تبلیغ احکام وغیرہ اور یہ دوسرا میثاق ہے۔ اس میں حضور ﷺ کو داخل ماننے میں وہ دشواریاں پیش آئیں گی جن کا ذکر ہم نے فوائد میں کیا۔ (تفسیر احمدی)

دوسرا اعتراض: اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دیگر انبیاء حضور ﷺ کے امتی ہیں اور حضور ﷺ نبی الانبیاء کیونکہ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ سے صرف تصدیق لازم ہے نہ کہ امتی بن جانا۔ ہم سارے پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہیں حالانکہ ان کے امتی نہیں۔ حضور ﷺ نے بھی تمام رسولوں کی تصدیق کی مگر ان کے امتی نہ ہوئے؟ **جواب:** ایمان کے لغوی معنی تصدیق ہیں مگر شرعاً شریعت کی پیروی کو ایمان کہتے ہیں۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں نہ کہ پہلے ورنہ ثُمَّ جَآءَكُمْ فرمانا بیکار ہوگا کیونکہ تصدیق تو ہر اگلے پچھلے پیغمبر کی ہوسکتی ہے۔ ہم زمانہ ہونے کی قید کیوں لگائی۔ البتہ اتباع شریعت اسی رسول کی ہوگی جس کا زمانہ پایا جائے۔ اس معنی سے نبی پر ایمان لانا اس کا امتی بن جانا ہے۔**تیسرا اعتراض:** رب کو علم تھا کہ کوئی پیغمبر حضور ﷺ کا زمانہ نہ پائیں گے پھر ان سے یہ عہد کیوں لیا؟ **جواب:** اظہارِ عظمت مصطفیٰ کے لئے کہ انبیاء کرام حضور علیہ السلام کا زمانہ پائیں یا نہ پائیں مگر انہیں حضور علیہ السلام کی عظمت کا پتہ چل جائے کہ اللہ اکبر۔ یہ ایسے اولوالعزم پیغمبر ہیں کہ رب تعالیٰ نے اپنی ربوبیت اور ان کی رسالت کا عہد لیا۔ اور پھر وہ اپنی امتوں کو یہ واقعہ یاد دلا کر انہیں مسلمان بننے پر آمادہ کریں کہ ان میں سے جو کوئی حضور علیہ السلام کو پائے ایمان لائے حکم کے لئے امکانِ عمل شرط نہیں۔ سب روحوں سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا۔ حالانکہ ان میں سے بعض وہ بھی ہوں گی جو ماں کے پیٹ سے ہی واپس جائیں گی۔ بعض نابالغی میں مریں گے۔ بعض دیوانے ہوکر رہیں گے۔ معراج میں پچاس نمازیں فرض فرما کر پانچ رکھیں۔ حالانکہ رب تعالیٰ کو علم تھا کہ پانچ رہیں گی اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ مسلمان یہ عقیدہ رکھیں کہ اگر وہ حضور علیہ السلام کا زمانہ پاتے تو ایمان لاتے۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام انبیاء کی طرف سے نمائندگی فرماتے ہوئے اخیر زمانہ میں اتریں گے اور حضور علیہ السلام کی اطاعت کریں گے۔

چوتھا اعتراض: انبیائے کرام کفر شرک تو کیا گناہوں سے بھی پاک ہیں۔ پھر ان سے یہ کیوں فرمایا گیا کہ جو کوئی رو گردانی کرے وہ کافر ہے۔ ان کے متعلق تو یہ احتمال تھا ہی نہیں؟ **جواب:** قضیہ شرطیہ میں کسی جز کا امکان ضروری نہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ (زخرف: ۸۱) نیز فرماتا ہے۔ لَئِنْ اَشْرَكْتَ

لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ (الزمر: ۶۵) نیز اس میں امتوں کو دکھایا گیا کہ جب مقربین سے یہ خطاب ہے تو تم کس شمار میں ہو اگر تم نے اسلام سے منہ پھیرا تو اپنا انجام سمجھ لو۔ **پانچواں اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ جتنا اہتمام عہد نبوت کا کیا گیا اتنا ربوبیت کے عہد کا نہ کیا گیا۔ وہاں صرف بلیٰ پر کفایت ہے۔ یہاں اقرور نا کہلوایا۔ اس پر گواہی قائم فرمائی۔ اپنی گواہی شامل کی اور اس کی مخالفت پر سزا تجویز کی۔ کیا حضور کا درجہ اللہ سے بڑا ہے؟ **جواب:** رب تعالیٰ کو معلوم تھا کہ توحید ماننے والے بہت ہوں گے مگر رسالت ماننے والے تھوڑے۔ اور پھر رسالت کے ماننے والوں میں بھی کوئی بغیر سوچے سمجھے ان کی بشریت کی رٹ لگائے گا کوئی ان کی توہین کرے گا۔ اس لئے اتنا اہتمام فرمایا گیا تا کہ معلوم ہو کہ عقیدہ توحید بغیر رسالت معتبر نہیں۔ توحید سکہ ہے اور رسالت اس کی مہر۔ بازارِ قیامت میں شیطانی توحید کی کوئی قیمت نہیں۔ نیز ایمان کا مدار توحید پر نہیں بلکہ نبوت پر ہے۔ اگر توحید سے ایمان مل جاتا تو شیطان اور سارے کفار مومن ہوتے۔ نیز دین بدلتا ہے نبوت بدلنے سے تمام آسمانی دینوں میں عقیدہ توحید یکساں رہا مگر نبوت کے عقیدے بدلتے رہتے ہیں۔ دین بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا توحید سے اقرار نبوت کا اقرار بہت ہی اہم ہے۔ اس لئے یہاں اتنے اہتمام سے اقرار نبوت کرایا۔ **چھٹا اعتراض:** اگر اس آیت میں انبیاء سے خطاب ہے تو لَمَا اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ۔ کیسے صحیح ہوا۔ سب پیغمبروں کو کتاب نہیں ملی؟ **جواب:** یہاں کتاب سے لغوی کتاب مراد ہے جس میں صحیفے بھی داخل ہیں اور کتاب ملنے سے بلا واسطہ اور بالواسطہ ہر طرح ملنا مراد ہے اور واقعی اس معنی سے ہر نبی کو کتاب وصحیفہ ملا۔ کسی کو بلا واسطہ اور کسی کو بالواسطہ۔ نیز انبیاء میں اہل کتاب نبی افضل ہیں اور ان کے وزراء ان کے تابع افضل کا ذکر فرما کر تابعین کو اس میں داخل فرما لیا گیا۔ (کبیر) **ساتواں اعتراض:** اگر اس آیت میں پیغمبروں سے خطاب ہے تو ثُمَّ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ۔ کے کیا معنی پیغمبر امت کی طرف آتے ہیں نہ کہ نبیوں کی طرف؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ جَآءَ کُمْ سے مراد جَآءَ فِیْ زَمَانِکُمْ ہے۔ یعنی آخری رسول تمہارے زمانہ میں آئیں گے (کبیر) دوسرا یہ کہ اگر حضور ﷺ انبیائے کرام کے زمانہ میں تشریف لاتے تو وہ انبیاء حضور علیہ السلام کے امتی ہوتے۔ لہٰذا آپ کا آنا امت ہی میں ہوتا۔ **آٹھواں اعتراض:** یہاں فرمایا گیا مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ۔ یعنی وہ آخری پیغمبر تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنے والے ہیں حالانکہ حضور علیہ السلام تو ان کے ناسخ ہیں نہ کہ مصدق؟ **جواب:** اس کے جوابات بارہا دیئے جا چکے کہ نسخ تصدیق کے خلاف نہیں۔ حضور علیہ السلام نے سب کتابوں کو سچا کہا۔ ہاں ان کے احکام باقی نہ رکھے کہ وہ اس وقت تک کے لئے تھے۔ اس کی مکمل تحقیق اس تفسیر کے پہلے پارہ نسخ کی بحث میں دیکھو یا یہ مطلب ہے کہ ان کتابوں نے حضور علیہ السلام کی پیشینگوئی کی۔ حضور علیہ السلام نے دنیا میں جلوہ گری فرما کر ان سب کو سچا کر دیا۔ اگر آپ نہ آتے تو وہ کیسے سچی ہوتیں۔ جنتریاں چاند کی خبر دیتی ہیں کہ فلاں تاریخ کو ہوگا۔ چاند چمک کر سب کو سچا کر دیتا ہے۔ پچھلی کتابیں اس ماہ نبوت کی خدائی جنتریاں تھیں جو اس کے چمکنے سے سچی ہوگئیں۔ ﷺ **نواں اعتراض:** جب وہ عہد و میثاق ہمیں یاد ہی نہ رہا تو اس سے فائدہ کیا ہوا بے کار رہا۔ **جواب:** بے کار جب رہتا ہے جب یاد دلایا بھی نہ جاتا۔ انبیائے کرام اور آسمانی کتابوں سے یاد دلا دیا' کافی ہوگیا۔ سرکاری محکموں میں معاہدوں کی تحریر رجسٹری اس لئے کی جاتی ہے کہ بھول جانے پر ان کے ذریعے یاد آ جائے۔ ہمیں والدہ کے شکم میں رہنا' اس کا دودھ پینا' اس کے پاس پلنا' بڑھنا کچھ بھی

یاد نہ رہا تھا۔ ماں اور دیگر لوگوں نے یاد دلا کر اس کا حقِ خدمت' حق مادری اور حکم میراث ثابت کر دیا۔ جب مخلوق کے یاد دلانے پر احکام جاری ہو گئے تو کیا رب تعالیٰ کے یاد دلانے پر احکام جاری نہ ہوں گے۔ **دسواں اعتراض:** رب تعالیٰ کو انبیاء کی قلبی حالت معلوم تھی کہ یہ حضرات اقراری ہیں انکاری نہیں۔ پھر ءَ اَقْرَرْتُمْ۔ کیوں فرمایا گیا۔ کہ کیا تم نے اقرار کیا؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ حکم اور عہد میں فرق یہ ہے کہ حکم میں مخاطب کا سن لینا کافی ہے مگر عہد میں منہ سے اقرار کرنا بھی ضروری ہے۔ اقرار کرا کے یہ بتایا کہ یہ امر نہیں ہے جس میں فقط سننا کافی ہو بلکہ عہد و میثاق ہے۔ منہ سے کہو اَقْرَرْنَا۔ دوسرا یہ کہ لوگوں کو سنانے کے لئے اقررنا کہلوایا گیا نہ کہ اپنے جاننے کے لئے۔ کبھی استاد لائق شاگرد کا امتحان لوگوں کے سامنے لیتا ہے تا کہ ان پر اس کی قابلیت ظاہر ہو۔ تیسرا یہ کہ یہاں سب کو گواہ بنانا مقصود تھا۔ اگر وہ حضرات اَقْرَرْنَا نہ کہتے تو گواہی کس چیز کی ہوتی۔ اسی لئے نکاح وغیرہ میں قَبِلْتُ کہلوایا جاتا ہے۔ **گیارھواں اعتراض:** فَاشْهَدُوْا سے معلوم ہوا کہ حضراتِ انبیاء خود ہی مقربین اور خود ہی شاہد۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اور اَنَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ حاکم بھی ہے اور گواہ بھی۔ یہ بھی ناممکن ہے حاکم و گواہ اور مقر علیحدہ علیحدہ چاہئیں' کیونکہ ان کے احکام جداگانہ ہیں؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ فَاشْهَدُوْا میں ملائکہ سے خطاب ہے۔ لہٰذا انبیاء' اقراری اور فرشتے گواہ۔ دوسرا یہ کہ انبیاء سے ہی خطاب ہے مگر مطلب یہ کہ ایک دوسرے پر گواہ بن جاؤ۔ تمہارے اقرار پر وہ گواہ' ان کے اقرار پر تم گواہ لہٰذا مقر اور ہے گواہ دوسرا۔ تیسرا یہ کہ تم اپنے پر گواہ بن جاؤ' رب تعالیٰ کی بارگاہ میں خود مقر بھی گواہ بن سکتا ہے۔ قیامت میں مجرمین کے ہاتھ پاؤں اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ چوتھے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنی امتوں پر گواہ بن جاؤ۔ یعنی دنیا میں جاؤ اور امتوں کے سامنے اس عہد کی گواہی دو یا اپنی امتوں سے اسلام کا اقرار کراؤ اور اس اقرار کے تم گواہ بنو (روح المعانی) حاکم کی گواہی معتبر ہے۔ رجسٹری تحریر اور مہر عدالت حاکم کی گواہی تو ہے مگر یہ گواہی پر گواہی ہوگی۔

تفسیر صوفیانہ

انبیائے کرام میثاق کے دن صفِ اول میں تھے۔ اور دیگر لوگ باقی صفوف میں۔ لہٰذا ہر نبی کو سارے پیغمبروں کا مقام معلوم تھا۔ اسی لئے ان سے دو عہد لئے گئے۔ ایک تو وہ جس کا اس آیت میں ذکر ہے کہ اے پیغمبرو تم سب صفِ اول میں ہو۔ تم نے ہر ایک کا درجہ و مقام معلوم کر لیا۔ خصوصاً اس صدر نشین صدر الوریٰ کہف الہدیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کا مرتبہ پہچان لیا۔ اب تم ہم سے عہد کرو کہ دنیا میں پہنچ کر ایک دوسرے کے اس مرتبے کو پہچاننا اور گواہی دینا۔ اور دوسرا عہد وہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ الخ (احزاب: ۷) یہ عہد آپس میں محبت رکھنے دین قائم کرنے ایک دوسرے کی تصدیق کرنے۔ رب تعالیٰ کی عبادت کرنے اور خلق کو اطاعت نبی اور عقیدہ توحید کی طرف بلانے کا عہد تھا وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی معرفت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک مظاہر اور صفات اور تفصیل کی صورت میں' اور دوسری تجلیات صفات اور احکام مخصوص کی صورت میں پہلی معرفت میں سب یکساں ہیں اور دوسری معرفت میں فرق۔ ہر ایک پیغمبر کو اسکے درجہ کے بقدر یہ معرفت عطا فرمائی گئی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انبیائے کرام مظہر صفات اور حضور ﷺ مظہر ذات ہیں۔ جو

کوئی اس عہد الٰہی کا جو نبیوں سے لیا گیا جان بوجھ کر انکار کرے گا۔ وہ رب تعالیٰ کے دین سے خارج ہے۔ جو حقیقی دین ہیں۔ باقی ادیان وہمی اور اعتباری ہیں۔ (ابن عربی)

دوسری تفسیر

سارے پیغمبر حضور علیہ السلام کے نائب ہیں اور ازل میں حضور علیہ السلام سب کی اصل۔ نائب کے لئے ضروری ہے کہ اپنی اصل کو پہچانے کہ اس کے پردے میں رہنے کے وقت اس کی نیابت میں حکومت کرے اور اس کی موجودگی میں اپنے کو گم کر دے۔ سارے پیغمبر ظل ہیں۔ حضور علیہ السلام اصل۔ سارے پیغمبر تیمم ہیں حضور علیہ السلام وضو۔ سارے پیغمبر دریا ہیں حضور علیہ السلام سمندر سارے پیغمبر چاند تارے ہیں حضور علیہ السلام سورج۔ سارے پیغمبر فیض لینے والے ہیں حضور ﷺ دینے والے۔ جہاں سمندر کا ظہور نہ ہو وہاں دریاؤں کی بادشاہت ہے۔ جب آفتاب درون پردہ ہوتا ہے تو چاند تاروں کی سلطنت ہے۔ جب وضو ناممکن ہو تو تیمم کی حکومت ہے مگر سمندر پر پہنچ کر دریا گم' سورج کے نکلتے ہی تارے غائب۔ پانی کے آتے ہی تیمم برخاست۔ فرمایا گیا تھا کہ اے گروہ انبیاء تم اپنے کو بھی پہچانو اور اپنے اس سیّد کو بھی ہم سے عہد کرو کہ اگر تم ان کا زمانہ پاؤ تو ان کے دامنِ نور میں تاروں کی طرح چھپ جانا اور اپنے کو ان میں ایسا گم کر دینا جیسے دریا سمندر میں پہنچ کر۔ اعلیٰ حضرت نے کیا خوب فرمایا ؎

مشتِ خاک اپنی ہو اور نور کا اہلا تیرا ۔۔۔ آب آمد وہ کہے اور میں تیمم برخاست

بولو تم اس کا اقرار کرتے ہو۔ اگر اقرار کرو گے تو نبوت کا تاج' نیابت کا تخت جوڑا' ولایت سب کچھ تمہارے لئے ہے اور اگر اس سے منہ پھیرا تو نبوت و ولایت اور عنایت کا ذکر ہی کیا۔ کسی کو اسلام بھی نصیب نہیں ہو سکتا بلکہ **فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ**

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں ۔۔۔ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا ۔۔۔ تصور میں تیرے رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں
تجھ ہی کو دیکھنا تیری ہی سننا تجھ میں گم ہونا ۔۔۔ حقیقت معرفت اہل طریقت اس کو کہتے ہیں

صوفیاء فرماتے ہیں کہ پچھلے پیغمبر دنیا میں آئے بھی اور چلے بھی گئے مگر حضور نبی کریم ﷺ آئے تو لیکن گئے نہیں۔ وہ آئے اور یہاں ہی رہے کہ ان کا دین تا قیامت بلکہ بعد قیامت بھی باقی ہے۔ اسی لئے ثُمَّ جَآءَكُمْ فرما کر ان کے آنے کا ذکر فرمایا مگر یہ نہ کہا کہ جب وہ چلے جائیں تو تم پر ان کی اطاعت لازم نہیں۔ زمانہ نبی اور ہے زمانہ نبوت کچھ اور پھر دوسرے انبیاء کرام زمین میں آئے مگر حضور ﷺ دلوں' جانوں' ایمانوں میں بھی آئے۔ اس لئے جَآءَكُمْ فرمایا جَآءَ فِیْ زَمَانِكُمْ یا جَآءَ فِی اَرْضِكُمْ نہ فرمایا۔ قرآن کریم میں حضور ﷺ کی آمد پر رسول نبی' نور برہان فرمایا گیا۔ مگر معراج میں بلانے پر عبد فرمایا کیونکہ حضور دنیا میں شانِ رسالت سے آئے اور رب کے پاس شان عبدیت سے گئے۔ حاکم دفتر میں ڈی سی بن کر آتا ہے مگر اپنے گھر میں بیٹا باپ بھائی بن کر جاتا ہے۔ دنیا میں حضور ﷺ کا دفتر ہے وہ جگہ حضور ﷺ کا گھر ہے۔

تفسیر روح المعانی نے فرمایا کہ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حضور نبی مطلق رسول حقیقی اور مستقل صاحب شریعت ہیں باقی انبیاء حضور علیہ السلام کے تابع' یہ اقرار نامہ انبیائے کرام کی نبوت کی تمہید تھا۔ جس پر سارے انعام موقوف تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم

لوگوں کو اسی اقرار پر قائم رکھے۔ اسی پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰينَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ بِرَحْمَتِهٖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا

کیا پس سوا دین اللہ کے تلاش کرتے ہیں وہ حالانکہ واسطے اسی کے تابع حکم ہیں وہ جو بیچ آسمانوں اور زمین کے ہیں چار

تو کیا اللہ کے دین کے سوا اور دین چاہتے ہیں اور اس کے حضور گردن رکھے ہیں جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے

وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ

ونا چار اور طرف اسی کے لوٹائے جائیں گے۔ فرماؤ تم ایمان لائے ہم ساتھ اللہ کے اور اسکے جو اتارا گیا اوپر ہمارے اور اسکے جو اتارا گیا

اور مجبوری سے اور اس کی طرف پھیریں گے یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اسپر جو ہماری طرف اترا اور جو

عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ

اوپر ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور بیٹوں ان کے اور اس پر جو دیئے گئے

اترا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ ملا

مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫

موسیٰ اور عیسیٰ اور پیغمبر طرف سے اپنے رب کے نہیں فرق کرتے ہم درمیان کسی کے ان میں سے

موسیٰ اور عیسیٰ اور انبیاء کو ان کے رب سے ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم واسطے اس کے اطاعت کرنے والے ہیں

اور ہم ہیں واسطے اس کے مسلمان

تعلق

آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں معلوم ہوا کہ حضور ﷺ پر ایمان اللہ کا دین ہے۔ یہ ہی سارے پیغمبروں اور ان کی امتوں کا دین تھا اور اس دین کی ابتدا میثاق کے دن سے پڑی۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ اسلام کے سوا جو دین ہے وہ غیر خدا کا ہے۔ شیطان کا ہو یا نفس امارہ کا گویا پچھلی آیت میں اسلام کی حقانیت کا ذکر تھا۔ اور اب غیر اسلام کے بطلان کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں معلوم ہوا تھا کہ میثاق کے دن سب حضور ﷺ پر ایمان لائے [illegible] فرمایا جارہا ہے کہ اب بھی سب [illegible] حضور علیہ السلام ہی ہیں مگر کوئی تو بخوشی انہیں مان لیتا

ہے اور کوئی مجبوراً۔ زندگی یا موت کے وقت انہیں مانے گا۔ غرضکہ انتہا ابتدا کے موافق ہے۔ اگرچہ درمیان میں کچھ فرق ہو۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ حضور علیہ السلام تمام کے مصدق یہ ہیں۔ اب قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ میں اس تصدیق کا اظہار ہے کہ حضور علیہ السلام سے سارے پیغمبروں کی حقانیت کا اعلان کرایا گیا۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ ہم نے حضرات انبیاء کرام سے فرمایا تھا کہ جو کوئی نبی آخر الزمان ﷺ کی اطاعت سے منہ موڑے گا وہ فاسق ہوگا۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع عین دین ہے۔ اور دین سے نکل جانے والا فاسق ہی ہوتا ہے۔ گویا حکم پہلے بیان ہوا۔ وجہ حکم اب بیان ہو رہی ہے۔

شانِ نزول

ایک دفعہ اہل کتاب کے دو گروہ آپس میں جھگڑتے ہوئے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے فیصلہ چاہا۔ ہر ایک کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارا دین' دین ابراہیمی سے قریب تر ہے۔ حضور علیہ السلام نے فیصلہ فرمایا کہ تم دونوں (یہود و عیسائی) دین ابراہیمی سے دور ہو۔ اس سے تمہیں کوئی تعلق نہیں کیونکہ تمہارے عقائد و اعمال ان کے عقائد و اعمال سے بالکل مخالف ہیں جس پر وہ بولے کہ نہ ہم آپ کے فیصلے سے راضی ہیں اور نہ ہم آپ کا دین اختیار کریں گے۔ تب یہ آیت کریمہ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ الخ اتری۔ (کبیر و خازن و معانی)

تفسیر

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ۔ ہمزہ استفہام انکاری کا ہے اور ف عاطفہ یا تو یہ جملہ پچھلی شرط و جزا فَمَنْ تَوَلّٰی الخ پر معطوف ہے اور انشاء کا عطف خبر پر جائز یا پوشیدہ عبارت پر معطوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی اَیَتَوَلَّوْنَ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ (معانی) غَیْرَ یَبْغُوْنَ کا مفعول ہے۔ اس کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ حاصل ہوا۔ یَبْغُوْنَ بغیٌ سے بنا بمعنی تلاش کرنا اور میانہ روی سے تجاوز چاہنا۔ دین اللہ سے اسلام مراد ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا۔ اگرچہ سارے پیغمبروں کے دین اپنے وقت میں دین اللہ تھے۔ مگر چونکہ اب وہ سب منسوخ ہو چکے تھے۔ اس لئے اب صرف اسلام ہی دین اللہ ہے یا دین اللہ سے اللہ کا اصل دین مراد ہے کیونکہ پچھلے ادیان اللہ کے دین تھے مگر عارضی قابل نسخ اور ضروریات وقت کے لحاظ سے اور اسلام حقیقی باقی دائمی دین ہے۔ خیال رہے کہ دین اللہ میں اضافت لام کی ہے یعنی اللہ کا پسندیدہ دین۔ چونکہ اسلام میں میانہ روی ہے اور باقی ادیان میں افراط و تفریط۔ اس لئے یہاں یَبْغُوْنَ فرمایا گیا نہ کہ یطلبون۔ غیر و یَبْغُوْنَ کا فاعل سارے اہل کتاب ہیں۔ یعنی کیا یہ یہود و عیسائی اللہ کا پسندیدہ دین اسلام چھوڑ کر اور دینوں ہی کو تلاش کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ خود حضور انور ﷺ دین اللہ ہیں کہ آپ کا ماننا عین دین ہے۔ اس میں توحید و رسالت حشر و نشر سب کا ماننا آ جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے جسم کے حالات شریعت ہیں۔ دل مبارک کے حالات طریقت' روح پاک کے حالات حقیقت' سر شریف کے حالات معرفت انہی چار چیزوں یعنی شریعت' طریقت' حقیقت' معرفت کا نام دین ہے اور حضور ﷺ دین اللہ۔ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ گزشتہ انکار کا حال مؤکدہ لَهٗ اَسْلَمَ کا متعلق ہے۔ اس کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ حاصل ہوا۔ فکام جمع حق تعالیٰ سے۔ اَسْلَمَ اسلام سے بنا بمعنی استسلام و اطاعت فرمانبرداری۔

غالباً یہاں یہ ہی وسیع معنی مراد ہیں کیونکہ اس میں بہت گنجائش ہے۔آسمانی چیزوں سے فرشتے' حضور' غلمان' بلکہ چاند' تارے' سورج وغیرہ سب مراد ہیں اور زمین کی چیزوں سے انسان' جنات' چرند' پرند وغیرہ ساری مخلوق مراد کیونکہ ہوا میں رہنے والی چیزیں درحقیقت زمین کی چیزیں ہیں کہ ہوا زمین پر ہے اور وہ پرندے ہوا میں یا سارے پرندے رات کو زمین پر ہی بسیرا لیتے ہیں۔مَنْ عقل والی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے چونکہ عاقلین غیر عاقل سے افضل تھے۔اس لئے مَنْ ارشاد ہوا۔غیر عاقلوں کو ان کا تابع فرما کر اس مَنْ میں داخل کر دیا گیا۔تفسیر کبیر نے فرمایا کہ ماسوی اللہ کا اسلام یہ ہے کہ ہر چیز ممکن ہے اور رب واجب۔ہر چیز مجبور ہے اور وہ قادر۔ہر شئی محتاج ہے اور وہ مختار لہٰذا سب اس کے حضور گردن جھکائے ہیں جو بنا اسکے بنانے سے بنا۔اور جو فنا ہوگا اس کے فنا کرنے سے فنا ہوگا۔اس صورت میں سب کا اسلام یکساں ہے اور ممکن ہے کہ اسلام سے مراد دین اسلام ہو۔چونکہ حضور ﷺ ہر ماسوی اللہ کے نبی ہیں۔لہٰذا ہر چیز آپ کی امتی۔اس صورت میں ہر مخلوق کا اسلام و احکام اس کے لائق فرشتوں کی عبادت اور ہے۔انسانوں کی کچھ اور۔جانوروں اور چاند تاروں کی کچھ اور۔دیکھو انسانوں میں بھی غریب وامیر شاہ وزیر' عورت ومرد کے احکام میں بہت فرق ہے۔طَوْعًا وَّ كَرْهًا۔ طوعًا طاع یطوع کا مصدر ہے۔یعنی رضا اور رغبت واختیار جیسے اطاعت' اطاع یطیع کا مصدر ہے بعض نے فرمایا کہ طوع اور اطاعت ہم معنی ہیں۔یعنی فرمانبرداری۔بعض کے خیال میں طوع بمعنی فرمانبرداری ہے اور اطاعت بمعنی حکم جاری کرنا اور مطاوعت بمعنی موافقت طاع فرمانبرداری کی اطاعت اس کا حکم اپنے پر جاری کیا اور طاوعہٗ اس کی موافقت کی (روح المعانی) مگر پہلی بات صحیح ہے کرھًا طوعًا کی ضد ہے۔بمعنی بے رغبتی' ناراضی اور مجبوری۔یہاں یہ دونوں مصدر بمعنی اسم فاعل ہیں۔اور مَنْ کا حال (طائعین اور کارھین) بمعنی چار وناچار' یا بخوشی بجبوری۔راضی ہوکر یا ناراض ہوکر۔اس طوعًا اور کرھًا میں چند احتمال ہیں (۱) خوشی کا اسلام وہ ہے جو دلائل وعلم سے حاصل ہو۔جیسے مومنین اور ملائکہ کا ایمان۔مجبوری اسلام وہ ہے جو تلوار یا دنیوی خوف یا نزع کا عذاب دیکھ کر حاصل ہو۔جیسا کفار کا ایمان کہ مرتے وقت سب مومن ہو جاتے ہیں۔(معانی) (۲) الوہیت کا عقیدہ طوعًا اسلام ہے۔جس کے کفار بھی معتقد تھے۔اور تکلیف دہ احکام کی اطاعت کرھًا اسلام (کبیر) (۳) میثاق کے وقت کا ایمان کرھًا تھا اور دنیا میں شرعی اسلام قبول کرنا طوعًا ہے۔(کبیر) (۴) امام حسن فرماتے ہیں کہ آسمانوں والوں کا اسلام طوعًا یعنی خوشی سے ہے۔اور زمین والوں کا اسلام بعض کا طوعًا ہے۔بعض کا مجبورًا ہے۔(کبیر) (۵) آسمان وزمین کا اسلام خوشی سے ہے اور زمین والوں کا اسلام بعض کا خوشی سے بعض کا مجبورًا۔رب تعالیٰ فرماتا ہے فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ۔ (حم السجدہ:۱۱) (کبیر) (۶) اسلام سے مراد ارادہ الٰہی کی اتباع ہے۔اور اس کے قضاء وقدر کے احکام قبول کرنا۔جیسے بیماری فقیری موت وغیرہ مسلمان راضی برضا ہے اور ہر چیز خوشی سے قبول کرتا ہے۔لہٰذا وہ بخوشی مسلم ہے۔کافر کو مجبورًا قانونِ قدرت برداشت کرنا پڑتے ہیں۔لہٰذا وہ بجبوری مسلم صوفیائے کرام اس طوع وکرہ کے کچھ اور ہی معنی کرتے ہیں جس کا ذکر انشاء اللہ تفسیر صوفیانہ میں ہوگا۔تفسیر خازن نے فرمایا کہ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں سب نے بلیٰ کہا تھا مگر نیک بختوں نے بخوشی لہٰذا انہوں نے فائدہ اٹھایا اور بدبختوں نے مجبورًا۔اسی لئے وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔اس آیت میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔یعنی اللہ ہی کے مطیع فرمانبردار ہیں۔تمام آسمان وزمین کی چیزیں خوشی یا ناخوشی سے یا آسمان زمین کی

ساری چیزیں اللہ کے لئے اسلام لائے اور سب مومن ہو گئے مگر بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً۔ خوشی والا اسلام فائدہ مند ہے اور ناخوشی والا بے فائدہ۔ غرضکہ اسلام عالمگیر مذہب ہے۔ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ۔ واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ لَهٗۤ اَسْلَمَ پر معطوف الیہ کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ یُرْجَعُوْنَ کا نائب فاعل یا اہل کتاب ہیں یا سارے انسان یا آسمان وزمین کی ساری چیزیں اور یہ ہی ظاہر ہے۔ لہٰذا اس کا مرجع مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ ہے۔ یعنی سب رب تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ خیال رہے کہ یہاں رب کی طرف لوٹنے سے یا تو اس کے دین کی طرف لوٹنا مراد ہے یا اس کی سزا و جزا کی طرف ورنہ رب تعالیٰ جگہ سے پاک ہے اور اٰمنا جمع فرما کر یہ بتایا گیا کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ اکیلے نہیں بلکہ جماعت مومنین کے ساتھ ہیں۔ وہ ہی عقیدے ہم نے اختیار کئے ہیں۔ جو تمام امت کے ہیں ایمان وہ دھاگہ ہے جو گھاس کے پھولوں کے ساتھ باندھ دیتا ہے۔ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْنَا۔ ظاہر یہ ہے کہ قُلْ میں حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ اور اٰمَنَّا اور عَلَیْنَا کی ضمیریں بھی حضور ہی کے لئے ہیں۔ تعظیم کے لئے جمع فرمایا گیا۔ (معانی) اور ممکن ہے کہ قل میں ہر قرآن پڑھنے والے سے خطاب ہو۔ پچھلی آیت میں گذشتہ آسمانی دینوں کو غیر دین اللہ فرمایا گیا تھا جس سے شبہ ہوتا تھا کہ گذشتہ دینوں کی طرح گذشتہ نبیوں کو ماننا بھی ممنوع ہوگا۔ نیز پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ یہود و نصاریٰ اس لئے حضور کو نہیں مانتے کہ آپ بنی اسرائیل سے نہیں ان کی تردید کے لئے ارشاد ہوا۔ بعض نے یہ بھی فرمایا کہ قل میں خطاب حضور علیہ السلام سے ہے لیکن اٰمنا سے سارے مسلمان مراد گویا حضور علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ آپ اپنی طرف سے اصالتاً اور اپنی امت کی طرف سے وکالتاً فرما دیں کہ ہم سب ایمان لائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قُلْ میں چار احتمال ہیں ایک یہ کہ حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ یہود و نصاریٰ سے ان کے جواب میں فرما دیں کہ تم بنی اسمٰعیل کے نبی پر ایمان نہیں لائے مگر ہم بنی اسرائیل کے انبیاء پر ایمان لاتے ہیں۔ تم نسبت پرست ہو۔ ہم خدا پرست ہیں۔ دوسرے یہ کہ اے محبوب آپ تا قیامت مسلمانوں سے فرما دیں تاکہ انہیں مومن بننا آ جائے۔ تیسرا یہ کہ اے قرآن پڑھنے والے تجدید ایمان کرتے ہوئے یہ کہا کرتا کہ تیرے دل کی صفائی ہوتی رہے۔ گھر میں جھاڑو لگتی رہے تو اچھا۔ چوتھے یہ کہ اے مسلمان لوگوں سے یہ کہا کرتا کہ تیرے ایمان کا اعلان ہوتا رہے۔ چونکہ اللہ کا ماننا سب سے مقدم تھا۔ اس لئے پہلے اس کو بیان کیا۔ اور مَاۤ اُنْزِلَ میں مَا سے مراد یا قرآن شریف ہے یا سارے وحی الہام۔ اگر عَلَیْنَا سے حضور ﷺ مراد ہیں تب تو معنی بالکل ظاہر ہیں اور اگر امت مراد ہے تو چونکہ نبی پر کلام کا آنا امت پر آنا ہے۔ اس لئے عَلَیْنَا فرما دیا گیا۔ چونکہ قرآن پاک نے ہی سارے پیغمبروں اور کتابوں کا پتہ دیا اور ہم نے سب کو اسی کی رہبری سے مانا۔ لہٰذا قرآن کا ذکر پہلے کیا گیا اور دیگر کتب کا بعد میں وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ ...... یہ پہلے مَاۤ اُنْزِلَ پر معطوف ہے اور اس مَا سے یا تو صحیفے مراد ہیں یا ان حضرات کی ساری وحی۔ چونکہ اہل کتاب ان حضرات کو بالاتفاق مانتے تھے اور ان کی نبوت کے معتقد تھے۔ اس لئے ان کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا۔ ورنہ النبیون میں یہ سب داخل تھے۔ ابراہیم اسمٰعیل اسحٰق اور یعقوب کے لفظی معنی اور ان حضرات کے تاریخی واقعات پہلے سیپارے میں بیان کر چکے۔ اسباط کے معنی بھی ہم نے پہلے سیپارہ میں بیان کئے کہ یہ سبط کی جمع ہے۔ بمعنے شاخوں والا درخت۔ اصطلاح میں خاندان اور قبیلہ کو سبط کہتے ہیں بلکہ نسل کی اصل اور قبیلہ کے جد امجد کو بھی سبط کہا جاتا ہے۔ اس لئے

امام حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو سبطین کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں اسباط یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کو کہا جاتا ہے۔ جن میں سے یوسف علیہ السلام کی نبوت قطعی اور یقینی ہے جس کا انکار کفر ہے اور دیگر گیارہ کی نبوت میں اختلاف ہے جوان کی نبوت کے قائل ہیں ان کے نزدیک بلاواسطہ ان پر صحیفے آئے اور جوان کی نبوت کے منکر ہیں ان کے نزدیک اسباط پر صحیفوں کا آنا ایسا ہے جیسے ہم مسلمانوں پر قرآن اترا یعنی ہم اس پر بھی ایمان لائے۔ جو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کے بیٹوں پر اترا وَمَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ۔ یہ واؤ بھی عاطفہ ہے اور ما پچھلے ما پر معطوف۔ اس ما سے ان پیغمبروں کی کتابیں اور ان کے معجزات عصا وغیرہ مراد ہیں چونکہ حضرت موسیٰ پہلے صاحب کتاب پیغمبر ہیں اور حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کے خاتم النبیین۔ اس لئے خصوصیت سے ان کا ذکر کیا گیا۔ یہاں تک تفصیل تھی۔ اس کے بعد اجمالاً فرمادیا گیا کہ وَالنَّبِیُّوْنَ الخ یعنی ہمارا ایمان ان پر ہی محدود نہیں بلکہ رب کے جتنے پیغمبر ہیں انہیں جو کچھ رب کی طرف سے ملا ہمارا سب پر ایمان۔

نوٹ: یہ آیت مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ کی تفصیل ہے کہ حضور علیہ السلام نے سارے پیغمبروں کی تصدیق کی لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ (بقرہ: ۲۸۵) اس میں اہل کتاب پر طعن ہے کہ وہ بعض پیغمبروں پر ایمان لاتے تھے بعض پر نہیں۔ لَا نُفَرِّقُ کے معنی ہم سورۂ بقرہ کے آخر میں تفصیل سے بتاچکے کہ فرق کرنے سے یا تو ایمان میں فرق کرنا مراد ہے کہ بعض کو مانے بعض کو نہ مانے یا اپنی طرف سے فرق کرنا مراد کہ محض اپنی رائے سے ان کے مراتب مقرر کرلے۔ یا اس طرح فرق کرنا جس سے بعض حضرات کی توہین ہوجائے یعنی ہم پیغمبروں میں سے کسی کے ایمان میں فرق نہیں کرتے اور کیوں کریں ہمارا حال تو یہ ہے کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ لَهٗ کے تقدیم سے حصر کا فائدہ ہے۔ اور مُسْلِمُوْنَ بمعنی مستسلمون ہے یعنی ہم صرف رب تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار ہیں۔ اور سارے پیغمبر اس کے نبی۔ لہٰذا ہم سب کے معتقد تم لوگ نفس کے تابع ہو۔ جس کی نبوت نفس نے مانی اس کو تم نے مان لیا۔ باقی کا انکار کردیا۔ تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ سارے ادیان والے اپنے کو مومن تو کہتے تھے مسلم نہ کہتے تھے۔ مسلمانوں سے وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ کہلوا کر انہیں سب سے ممتاز کردیا۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ جب عقلاً ونقلاً ہر طرح معلوم ہوچکا اور ان کی کتابوں نے بھی گواہی دے دی کہ صرف اسلام ہی اللہ کا پسندیدہ دین ہے اور اس کے سوا سارے دین یا شیطانی ہیں یا نفسانی۔ تو یہ اہل کتاب جان بوجھ کر غیر اللہ کا دین تلاش کرتے ہیں۔ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں قانونِ فطرت میں رب تعالیٰ کی فرمانبردار ہیں۔ رضا ورغبت سے ہوں یا ناراضی سے کہ مسلمان رب کی ہر چیز پر خوش ہے اور کافر ناخوش یا آسمان زمین کی ساری چیزیں آخر کار اسلام میں داخل ہیں۔ خوش ہو کر یا ناخوش۔ کہ کفار نزع کے وقت ایمان لے آتے ہیں۔ اور باقی چیزیں پہلے ہی سے مومن ہیں۔ سب کو رب تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔ پھر یہ اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ آپ اعلان فرمادو کہ ہم مع اپنی مسلمان جماعت کے اللہ اور اس قرآن پر ایمان لے آئے جو ہم پر اترا نیز ان تمام کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لے آئے جو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل و اسحٰق و یعقوب اور اولاد یعقوب پر اتریں علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اس پر بھی ہمارا ایمان ہے جو حضرت موسیٰ وعیسیٰ اور سارے نبیوں کو ان کے رب

کی طرف سے ملیں۔ ہم انبیاء کرام کے درمیان تمہاری طرح ایمان میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کا انکار کریں بلکہ سب پر ایمان لاتے ہیں اور کیوں نہ لائیں۔ ہم تو رب تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ نہ اپنے نفس کے' جب رب تعالیٰ نے ان سب کو نبوت سے سرفراز فرمایا پھر بعض کے نہ ماننے کے کیا معنی لہٰذا ہم سارے رسولوں ساری کتابوں اور سارے صحیفوں اور انبیائے کرام کے سارے معجزات پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ہی اسلام کی حقیقت ہے اور اسی پر نجات کا مدار۔ خیال رہے کہ ہمارا ایمان قرآن شریف پر بھی ہے اور پچھلی ساری آسمانی کتابوں پر بھی مگر فرق یہ ہے کہ قرآن کریم پر ایمان بھی ہے اور عمل بھی۔ پچھلی کتابوں پر ایمان ہے عمل نہیں کہ وہ سب منسوخ شدہ ہیں۔ اس طرح ہمارا ایمان حضور ﷺ پر بھی ہے اور پچھلے تمام رسولوں پر بھی مگر حضور ﷺ پر ہمارا ایمان بھی ہے اور ہم حضور ﷺ کے امتی بھی ہیں۔ پچھلے انبیاء کرام پر ایمان تو ہے مگر ہم ان کی امت نہیں۔ اس لئے کلمہ صرف حضور ﷺ کا ہی پڑھتے ہیں۔ اس لئے مَا اُنْزِلَ میں فرق فرمایا گیا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** رب تعالیٰ کا پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ باقی سارے ادیان مردود ہیں۔ ان میں رہ کر کوئی عبادت قبول نہیں۔ جیسا کہ دین اللہ سے معلوم ہوا۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامَ۔ (آل عمران ۱۹) اسلام ہی وہ دین ہے جس سے ہر قوم ہر زمانہ میں ہر طرح فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ کسی دین میں یہ خوبی نہیں۔ اسلام کے پیغمبر ﷺ اول نبی بھی ہیں اور اخیری بھی کہ اگلوں نے آپ کی بشارتیں دیں اور آپ نے ان سب کی تصدیق فرمائی۔ **دوسرا فائدہ:** اگرچہ بعض لوگ شرعی قوانین کی مخالفت کریں مگر فطری قانون کے سب پابند ہیں۔ موت' زندگی' بیماری' تندرستی' فقیری اور مالداری سب رب تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور سب کو یہ چیزیں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ اس طرح زندگی میں اگرچہ بعض لوگ اسلام قبول نہ کریں مگر مرتے وقت بلکہ مصیبتوں میں سب کو اسلام کی پناہ پکڑنی پڑتی ہے۔ فرعون بھی ڈوبتے ہو کہہ گیا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ۔ (یونس ۹۰) لیکن اس وقت کا ایمان معتبر نہیں بلکہ اب تو تعلیم یافتہ قومیں آہستہ آہستہ اسلامی قوانین کی طرف مائل ہو رہی ہیں آریوں میں چند بیویاں رکھنے کا مسئلہ زیر غور ہے۔ ہندوؤں نے کوشش کی ہے کہ ان کے دھرم میں طلاق کا قانون جاری ہو جائے۔ بعض سمجھدار عیسائی پردے پر بہت زور دے رہے ہیں کہ عورتیں پردہ میں رہیں۔ غرضکہ اسلام کو برا کہتے ہوئے بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس کی پناہ میں آ رہے ہیں۔ یہ ہے کرشما اسلام۔ **تیسرا فائدہ:** حضور ﷺ ہر عرشی و فرشی کے پیغمبر ہیں جیسا کہ اسلم من فی السموات کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کیونکہ وہ سب مسلمان ہیں اور حضور ﷺ ہر مسلمان کے نبی۔ بلبل کہے میرے نبی۔ پھول پکارتا ہے میرے نبی۔ چاند سورج کو کہتے ہیں ہمارے نبی۔ جن و انس کہتے ہیں ہمارے نبی۔ لوح و قلم کہتے ہیں ہمارے نبی اور رب تعالیٰ فرماتا ہے میرا نبی ﷺ۔ غرض خدا کے نبی ہیں' خدائی کے نبی' خالق کے نبی' مخلوق کے نبی' بحر و بر' شجر و حجر' خشک و تر' شمس و قمر' شام و سحر سب کے نبی ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ **چوتھا فائدہ:** اکثر نفلی نیکیاں چھپا کر کرنا بہتر مگر فرائض و عقائد کا اظہار ضروری جیسے کہ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔ سے معلوم ہوا۔ انسان کو چاہیے کہ اپنا دین سب پر ظاہر کرے بلکہ اپنے لباس' صورت و سیرت سے اسلام ظاہر کرتا رہے تا کہ بعد موت دشواری واقع نہ ہو کبھی مردہ پہچان

میں نہیں آتا کہ مسلمان ہے یا ہندو۔ اس پر نماز پڑھیں یا نہ خصوصاً فی زمانہ فیشن ایبل لوگ کہ ان کا ختنہ دیکھ کر کام نکالنا پڑتا ہے۔ **پانچواں فائدہ:** ہر واعظ مبلغ کو ضروری ہے کہ جو کچھ کہے خود بھی اس پر عمل کرے تاکہ کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ ملے۔ یہ بھی آمنا باللہ سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے جہاں مسلمانوں کو تبلیغ اسلام کا حکم دیا۔ وہاں یہ بھی فرمایا کہ اپنے ایمان کا اعلان کردو۔ **چھٹا فائدہ:** حسد گناہوں کی جڑ ہے۔ علمائے بنی اسرائیل اس عہد و میثاق سے باخبر تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام کی مخالفت دائمی عذاب کا سبب ہے مگر محض حسد سے مسلمان نہ ہوئے۔ شیطان جانتا تھا کہ آدم علیہ السلام رب تعالیٰ کے خلیفہ ہیں۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ رب تعالیٰ ہی نے انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ وہ اس سے بھی باخبر تھا کہ حکم الٰہی کی اطاعت واجب ہے۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ رب تعالیٰ کی مخالفت مردود ازلی بنا دیتی ہے مگر اس نے حسد سے کسی بات کی پروا نہ کی۔ درحقیقت حاسد شیطان کا پیرو ہے۔ جیسا کہ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ. کے استفہام تعجب سے معلوم ہوا۔ **ساتواں فائدہ:** نبوت منسوخ نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ نبی کی شریعت منسوخ ہو جائے۔ جیسا کہ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ الخ سے معلوم ہوا کہ ان انبیاء کے دین منسوخ مگر ان پر ایمان لانا ضروری۔ جن لوگوں نے نبوت کو منسوخ مانا ان کی مراد نبوت کے احکام ہیں کیونکہ نبی اپنے مراتب و درجات سے کبھی معزول نہیں ہوتے۔ ہاں بعد نسخ ان کے احکام کی تبلیغ بند ہو جاتی ہے۔ ہمارے حضور ﷺ کے مراتب بھی قائم اور تبلیغ بھی باقی۔ **آٹھواں فائدہ:** تبرائی روافض کافر ہیں جیسا کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ. سے معلوم ہوا۔ کیونکہ یہاں سارے پیغمبروں کو ماننا اور ان میں فرق نہ کرنا علامت اسلام قرار دی گئی۔ جب سارے پیغمبر رب تعالیٰ کے ہیں تو بعض کے نہ ماننے کی وجہ کیا۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کے سارے صحابہ اور اہل بیت کو ماننا علامت اسلام ہے۔ جب حضور ﷺ سچے تھے تو ان کی بیویاں ساری اولاد سارے ساتھی جن کے درجات قرآن کریم سے ثابت ہیں سچے کیوں نہ ہوں۔ **نواں فائدہ:** حضور علیہ السلام آخری نبی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں کیونکہ یہاں آمنا انزل اور اوتی سارے صیغے ماضی کے فرمائے گئے۔ معلوم ہوا کہ سارے رسول اور ان کی کتابیں آچکیں۔ اگر کوئی اور نبی آنے والا ہوتا تو یہاں مستقبل کا صیغہ بھی فرمادیا جاتا۔ (کبیر)

اعتراضات

پہلا اعتراض: دین و اسلام و ایمان میں کیا فرق ہے؟ یہاں دین کو تو اللہ کی طرف نسبت دیا گیا اور اسلام کو آسمانی و زمینی مخلوق کی طرف کہ فرمادیا گیا۔ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. اور ایمان کو صرف مسلمانوں کی طرف قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ. اس کی کیا وجہ ہے۔ **جواب:** ان میں چند لحاظ سے فرق ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ مجموعہ سچے عقائد اللہ کا دین ہے۔ اور ان عقائد کا مان لینا ایمان اور اسکا اظہار و اقرار اسلام۔ اور بھی بہت سے فرق ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** عقائد کا مسئلہ ہے کہ جبر یا مشاہدہ کا اسلام معتبر نہیں۔ اسی لئے نزع والا ایمان مفید نہیں ہوتا۔ اور منافقین مسلمان نہیں۔ کیونکہ مجبوراً اسلام لائے۔ پھر یہاں رب تعالیٰ نے ان کی تعریف کیوں فرمائی کہ فرمایا طوعاً و کرھاً مجبوراً اسلام کا تو ذکر بھی نہ چاہیے تھا۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں اسلام سے احکام قضا و قدر کی اطاعت مراد ہے نہ کہ شرعی اسلام۔ اور اس سے کفار کی برائی کرنا مقصود ہے کہ جب احکام قضا و قدر میں رب تعالیٰ کے مطیع ہیں اور اس کا ہر فیصلہ مانتے ہیں تو اس

کے شرعی احکام کیوں نہیں مانتے۔ سلطان کے بعد قوانین ماننا' بعض نہ ماننا بغاوت ہے۔ خیال رہے کہ ارادہ الٰہی کی مخالفت نا ممکن ہے۔ امر الٰہی کی مخالفت ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہے۔ لاکھوں آدمی نماز پڑھتے' دوسرے یہ کہ یہاں اسلام سے شرعی اسلام مراد ہو۔ تب بھی اس سے کفار کی حماقت بیان کرنا مقصود ہے کہ آخر کار انہیں پٹ کٹ کر اسلام لانا ہی ہے۔ تو ابھی بخوشی مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔ پھر پٹیں گے بھی اور وہ اسلام معتبر بھی نہ ہوگا۔ **تیسرا اعتراض:** کیا یہ ممکن ہے کہ رب اپنے ارادے کے خلاف حکم دے کہ ابو جہل کے کفر کا ارادہ کرے اور اسے ایمان کا حکم فرمائے۔ **جواب:** ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے دنیا کے سارے کام اس کے ارادہ کے موافق ہیں۔ اور صدہا کام حکم کے خلاف۔ قتل' خونریزی اور کفر وغیرہ حکم کے مخالف ہیں۔ ارادے کے موافق دن رات۔ ہم بھی اپنے رضاء و ارادے کے خلاف حکم دیا کرتے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** جب موت کے وقت کا ایمان معتبر نہیں تو حضور علیہ السلام کے والدین کا بعد وفات والا ایمان کیوں قبول ہو گیا؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ وہ قاعدہ اور قانون ہے اور یہ واقعہ خصوصی۔ خصوصیات پر قانون حاوی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ وہ حضرات زندگی میں ہی مومن تھے جس کے صدہا دلائل ہیں۔ انہیں زندہ فرما کر کلمہ پڑھا کر صحابی بنایا گیا۔ **پانچواں اعتراض:** قرآن کریم دیگر کتابوں سے پیچھے آیا۔ تو یہاں اس کا ذکر پہلے کیوں کیا گیا کہ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَا اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ. **جواب:** اگرچہ قرآن نزول میں پیچھے ہے لیکن ہمارے ایمان میں پہلے کہ ہم نے پہلے اسے مانا۔ پھر اس کی راہبری سے دیگر کتب کو۔ گویا راہبر کا ذکر پہلے ہوا۔ بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ میں پہلے محمد رسول اللہ ہونا چاہیے تھا اور پھر لا الہ الا اللہ۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کی راہبری سے ہمیں توحید ملی۔ مگر منشاء الٰہی یہ تھا کہ پہلے ذکر الٰہی رب تعالیٰ کے نام سے انسان کا منہ پاک و صاف کر دیا جائے تاکہ اس پاک و ستھرے منہ سے سید الطاہرین ﷺ کا نام لے اس نام پاک کے لئے ذکر اللہ کی پاکی چاہیے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

چھٹا اعتراض: یہاں انزل علینا فرمایا گیا۔ اور سورۂ بقر میں انزل الیک فرمایا گیا تھا۔ اس علیٰ اور الیٰ کی کیا وجہ ہے؟ **جواب:** وحی آسمان سے آتی ہے اور نبی تک آتی ہے ابتدا کے لحاظ سے علیٰ فرمادیا جاتا ہے۔ انتہا کے لحاظ سے اِلیٰ ان میں اعتباری فرق ہے بعض لوگوں نے کہا رسول کے لئے اِلیٰ فرمایا جاتا ہے۔ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ. اور امت کے لئے علیٰ کیونکہ امت رسول کے ذریعہ وحی پہنچتی ہے۔ گویا امت وحی کی انتہاء ہے مگر یہ غلط ہے۔ یہاں خود موجود ہے۔ اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ اور وہاں تھا۔ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ. (از کبیر و معانی)

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ دنیا و دین دونوں کا مدار اثبات ونفی پر ہے۔ مفید چیزیں اختیار کرنا' مضر غذاؤں وغیرہ سے بچنے پر جسمانی زندگی قائم ہے۔ یوں ہی نیک اعمال کرنے گناہوں سے بچنے کا نام تقویٰ ہے اس ہی طرح لا الہ نفی اور الا اللہ اثبات سے توحید قائم ہے۔ یوں ہی حضرات انبیاء کرام کے متعلق اثبات ونفی سے عقیدہ رسالت برقرار ہے۔ آمنا باللہ میں اثبات تھا۔ اور لا نفرق بین احد الخ میں نفی اس ایک کلمہ لانفرق نے رسالت کے متعلق نفی مکمل طور پر بیان فرمادی۔ تفرق بین الانبیاء کی چار

صورتیں ہیں۔ تین تو کفر ہیں ایک ایمان' ایمان لانے میں فرق کرنا کہ بعض کو ماننا بعض کو نہ ماننا۔ کسی کی ایسی بزرگی ماننا کہ دوسرں کی اہانت ہو جائے۔ اپنی طرف سے فرق مراتب کرنا یہ سب سخت جرم ہے۔ رہا انکے مختلف مراتب ماننا یہ عین ایمان ہے۔ جیسے زمین کے طبقے زمانہ کی ساعتیں مہینے۔ کعبہ معظمہ کے ارکان۔ قرآن کریم کی سورتیں آیتیں یکساں نہیں تو حضرات انبیاء کرام کے مراتب یکساں کیسے ہوں گے۔ ان میں کوئی کلیم اللہ ہے۔ کوئی روح اللہ کوئی حبیب اللہ مگر ایمان سب پر ہے۔ ایسے ہی حضرات اولیاء اللہ بلکہ حضرات صحابہ کے درجات مختلف ہیں مگر ہمارا ایمان سب پر ہے۔ شیطان اور انسان کے سوا ساری چیزیں بخوشی مسلم ہیں اور انسان و شیطان مجبوراً مطیع کیونکہ ان دونوں کے سوا کسی میں کفر کی گنجائش ہی نہیں۔ سب رب تعالیٰ کے مطیع ہیں۔ انسان اپنے ارادے کے حجاب اور عہد الٰہی کے بھول جانے کیوجہ سے کفر کے قابل ہوا۔ اور شیطان ظلمتِ نفسانی اور فخر وانانیت وتکبر کی وجہ سے کافر ہوا۔ مگر لطف یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے کو کافر جانتا ہے۔ اور کافر جاننا ایمان ہے۔ نیز اس کا عقیدہ ہے کہ میری گمراہی رب تعالیٰ کے ارادے سے ہے۔ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ۔ (اعراف:۱۶) رب تعالیٰ کا خوف' ملائکہ کی دہشت' اپنے جہنمی ہونے کا یقین یہ ایمانی عقیدے ہیں۔ خود رب تعالیٰ نے شیطان کا کلام نقل فرمایا۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (انفال:۴۸) دوسری جگہ فرمایا وَمَا كَانَ لِیَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ۔ (ابراہیم:۲۲) ایک جگہ فرمایا۔ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ (ابراہیم:۲۲) ان تمام آیتوں سے شیطان کا ایمان معلوم ہوتا ہے کہ وہ درست عقیدے رکھتا ہے مگر غیر نافع اس لئے فرمایا گیا۔ طوعًا و کرھًا۔ جب مجبوری ایمان شیطان کے لئے ثابت ہے تو اس کے مطیع انسانوں کے لئے بدرجہ اولیٰ ثابت (ابن عربی) صوفیائے کرام کے نزدیک بغیر مقابلہ نفس رب تعالیٰ کی اطاعت اور بغیر حجاب' انانیت رب تعالیٰ کا ماننا خوشی کا اسلام ہے۔ جیسے ملائکہ اور مقبول انسانوں کا ایمان وساوس نفس حجاب انانیت شیطانی شبہات کے باوجود رب تعالیٰ کی اطاعت مجبوری اسلام جیسا ضعیف الاعتقاد لوگوں کا ایمان اللہ والوں کے نزدیک کفار۔ دوسری قسم کے مومن ہیں کہ اگرچہ وہ رب تعالیٰ کو خالق رازق مانتے ہیں مگر نفسانی حجابوں میں رہ کر ان کے حق میں فرمایا گیا۔ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ۔ (یوسف:۱۰۶) ابن جریر نے ابو العالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا کہ جو کوئی حق تعالیٰ کی ربوبیت اور اپنی بندگی کا زبانی اقرار کرے لیکن اس کی عبادتیں ریا سے خالی نہ ہوں۔ اس کا اسلام بھی مجبوراً ہے۔ طوعی اسلام اس کا ہے جس کا عقیدہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور عمل بھی۔ صوفیائے کرام کے نزدیک عالم ارواح' عالم نفوس' عالم ملک' عالم ملکوت کی تمام چیزیں اپنے اختیار و شعور سے مسلم ہیں۔ لہٰذا ان کا اسلام طوعی ہے مگر چونکہ انہیں اپنے ایمان اور ایمانیات کی حقیقت سے بے خبری ہے پھر بے خبری سے بھی بے خبری۔ اس لحاظ سے وہ ایمان مجبوری ہے (روح المعانی) امام شاذلی فرماتے ہیں کہ اطاعت بغیر فنا اسلام طوعی ہے اور اطاعت مع الفنا اسلام کرھی۔ جس کو رب تعالیٰ نے اطاعت فنا عطا فرمائی۔ اس پر ظاہری و باطنی نعمتیں مکمل فرما دیں۔ کسی نے ابراہیم ادھم سے کہا کہ آپ وعظ کہو فرمایا میں چار فکروں میں گرفتار ہوں اس لئے کوئی مضمون ذہن میں نہیں آتا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ کیا فکر ہیں...... فرمایا میثاق کے دن روحوں کے دو حصے کئے گئے۔ ایک کے لئے فرمایا گیا یہ جنتی ہیں۔ دوسرے کے لئے فرمایا گیا یہ جہنمی ہیں۔ مجھے خبر نہیں کہ میں کس گروہ میں تھا۔ دوسرے یہ کہ کاتب تقدیر فرشتہ ماں کے پیٹ میں بچوں کی نیک بختی اور بد بختی لکھ جاتا ہے۔ مجھے خبر نہیں کہ میرے متعلق قلم کیا چل گیا ہے۔ بد نصیبی کا یا خوش نصیبی کا۔ تیسرے یہ کہ

جان قبض کرتے وقت ملک الموت رب تعالیٰ سے پوچھتے ہیں کہ مولیٰ اسے اسلام پر اٹھاؤں یا کفر پر۔ مجھے خبر نہیں کہ اس وقت میرے متعلق کیا جواب آئے گا۔ چوتھے یہ کہ قیامت میں فرمایا جائے گا۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ۔ (یٰسین ۵۹) اے مجرمو! نیک کاروں سے الگ ہو جائے مجھے خبر نہیں کہ میں کسی فریق میں ہوں گا۔ کوئی شخص اپنے متعلق فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میرا ایمان طوعی ہے یا کرہی فائدہ مند ہے یا بے فائدہ اس لئے حضرت شیخ صفی فرماتے ہیں کہ منازل سلوک طے کرنے کے بعد بھی بندہ اپنی مقبولیت کا یقین نہیں کر سکتا کیونکہ بہت لوگ اوپر سے بھی گر جاتے ہیں۔ بہت ولی بے دین ہو جاتے ہیں۔ شیطان کے واقعہ سے عبرت پکڑو۔ (روح البیان)

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ
اور وہ جو تلاش کرے سوا اسلام کے کوئی دین پس ہرگز نہ قبول کیا جاوے گا اس سے اور وہ بیچ
اور جو اسلام کے سوا کوئی دین چاہے گا وہ ہرگز اس سے قبول نہ کیا جاوے گا اور وہ آخرت
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝٨٥ كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ
آخرت کے نقصان والوں میں سے ہے کیسے ہدایت دے اللہ اس قوم کو جو کافر ہوئے بعد ایمان لانے ان کے
میں زیاں کاروں سے ہے کیونکہ اللہ ایسی قوم کی ہدایت چاہے جو ایمان لا کر کافر ہو گئے
وَشَهِدُوْا أَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَاۗءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
اور گواہی دی انہوں نے کہ تحقیق رسول سچے ہیں اور آئیں ان کے پاس نشانیاں اور اللہ نہیں ہدایت دیتا
اور گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور انہیں کھلی نشانیاں آ چکی تھیں اور اللہ ظالموں
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٨٦
قوم ظالم کو
کی ہدایت نہیں کرتا

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں سے کہلوایا گیا تھا وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ کہ صرف ہم ہی مسلمان ہیں۔ ہمارے سوا کوئی مسلم نہیں۔ اب اس کی دلیل دی جا رہی ہے کہ صرف مسلمانوں کا ہی دین مقبول ہے۔ چونکہ قبولیت صرف اسلام کی ہے۔ لہٰذا اللہ کے مقبول بندے صرف مسلمان ہیں۔ گویا پہلے دعویٰ تھا اب دلیل ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا تھا کہ اسلام عالم گیر مذہب ہے کیونکہ یہ ہی آسمان و زمین والوں کا دین ہے اور اس میں سارے پیغمبروں، ساری آسمانی کتابوں کی تصدیق ہے گویا خوبیوں کا جامع ہے۔ اب اس کا نتیجہ بیان ہو

رہا ہے کہ جب اسلام میں یہ خوبیاں ہیں تو جو اسلام کو چھوڑے گا وہ مردود ہوگا۔ اس صورت میں یہ آیت گذشتہ مضامین کا نتیجہ ہے۔ کسی طبی نسخے کی خوبی تین طرح بیان کی جاتی ہے۔ اس کے ترکیبی اجزاء کی عمدگی دکھا کر اس کے فوائد بتا کر اس کے چھوڑنے کے نقصانات بیان کر کے۔ یوں ہی ایمانی نسخوں کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں۔ پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے اسلام کے ترکیبی اجزاء بیان فرمائے کہ اس میں تمام انبیاء کرام پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اب اسلام کے ماننے کے فوائد نہ ماننے کے نقصانات بیان فرما کر اسکی خوبیاں بیان ہو رہی ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں پکے کافر اور پکے مومنوں کا ذکر تھا۔ اب وَمَنْ يَبْتَغِ میں پہلے لوگوں کا ذکر ہے۔ جنہیں دین میں شک ہوا اور كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ الخ میں مرتدین کا تذکرہ جو اسلام لا کر کافر ہو جائیں۔ گویا چار جماعتوں میں سے دو کا ذکر پہلے ہو چکا تھا اور دو کا اب ہو رہا ہے۔

شان نزول

اس کے شانِ نزول میں چند روایتیں ہیں۔ (۱) یہودی و نصاریٰ حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے آپ کے وسیلہ سے دعائیں کرتے تھے اور آپ کی تشریف آوری کے منتظر تھے۔ لوگوں کو بشارتیں دیتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام تشریف لے آئے تو حسد سے آپ کے منکر ہو گئے۔ ان کے بارے میں آیت كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا الخ نازل ہوئی (خازن و خزائن و عرفان و کبیر وغیرہ) (۲) حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بارہ شخص جن میں ابوعامر راہب' حارث ابن سوید انصاری طعمہ ابن مبارک' حجوج ابن اسطت بھی داخل ہیں۔ مرتد ہو کر کفار مکہ سے جا ملے پھر انہوں نے اہل مدینہ کے پاس خطوط لکھے کہ کیا اب ہماری توبہ قبول ہو سکتی ہے تب یہ آیت نازل ہوئی (خازن و کبیر و روح المعانی) تفسیر کبیر نے فرمایا کہ حارث ابن سوید انصاری بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر دوبارہ مسلمان ہو گئے۔

خیال رہے کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ واقعات دونوں آیتوں کا شانِ نزول ہیں۔ یعنی ان موقعوں پر وَمَنْ يَبْتَغِ سے القوم الظلمین تک دو آیتیں اتریں اور بعض کے خیال میں ان موقعوں پر صرف پچھلی آیت کیف یھدی اللہ سے ظلمین تک نازل ہوئی (تفسیر کبیر) پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیتیں اہل کتاب کے بارے میں آئیں یا مرتدین کے حق میں (کبیر)

تفسیر

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا۔ مَنْ شرطیہ ہے جو عقل والوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مَا غیر عقل والوں کے لئے۔ چونکہ سواء انس و جن کے کوئی مخلوق کفر کرتی ہی نہیں۔ اس لئے یہاں مَنْ ارشاد ہوا۔ اس من میں تمام انسان و جنات کسی جگہ کے ہوں کسی زمانہ کے ہوں سب شامل ہیں۔ نماز کے موقعہ پر اگر من استعمال ہو تو اس سے کچھ لوگ مراد ہوتے ہیں۔ جن سے دیوانے بچے۔ حائض نفساء خارج ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کے موقعہ پر من سے غرباء اور مساکین خارج' حج کے موقعہ پر من سے بہت سے لوگ خارج مگر ایسے موقعہ پر من سے سب ہی مراد ہوتے ہیں۔ دین موسوی و عیسوی خاص علاقوں کے لئے تھے مگر اسلام تمام جہان کے لئے۔ اس لئے یہاں من سے مراد ہر جن و انس ہے۔ يَبْتَغِ بغیٌ سے بنا بمعنی حد سے بڑھنا اور درمیانی چیز کو چھوڑ کر افراط تفریط تلاش کرنا۔ غیر الاسلام یا یبتغ کا مفعول ہے اور دینًا اس کی تمیز یا دینًا کا حال مقدم ہے اور دینًا یبتغ

کا مفعول اسلام سے یا توحید و اطاعت مراد ہے۔ اس صورت میں اس آیت میں سارے آسمانی ادیان داخل ہیں کہ ان میں سے ہر دین اپنے وقت میں اسلام تھا۔ اور یہ حکم دائمی ہے یا شریعت مصطفےٰ ﷺ مراد ہے۔ تب یہ حکم اس وقت کے لحاظ سے ہے۔ دین کے معنی اور اسلام و دین میں فرق ہم پچھلی آیت میں بیان کر چکے۔ اور اس کی مکمل تحقیق سورۂ فاتحہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی تفسیر میں ہو چکی۔ یعنی یہ حکم دائمی ہے کہ جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین تلاش کرے یا نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اب جو کوئی ان کی شریعت کے علاوہ کسی اور دین کو تلاش کرے خواہ شرک و کفر کو یا یہودیت و نصرانیت کو کہ وہ ادیان اپنے وقت میں اسلام تھے۔ اب ان کا اختیار کرنا گمراہی ہے۔ غرض کچھ بھی سہی اس کا انجام یہ ہوگا کہ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ۔ یہ جملہ من یبتغ کی خبر ہے چونکہ اس میں شرط کے معنی تھے۔ لہٰذا اس پر ف آئی۔ لن یقبل قبول سے بنا۔ اس کا نائب فاعل یا غیر اسلام یا دین یا ابتغاءٌ ہے۔ جو یبتغ سے معلوم ہوا یا نیکیاں ہیں جو اشارۃً اسلام سے معلوم ہوئیں۔ منہ کا مرجع من ہے یعنی اس کا یہ تلاش کرنا یا وہ دین یا ماسوائے اسلام یا اس شخص کی نیکیاں کبھی قبول نہ کی جائیں گی بلکہ وہ اور اس کا دین اور اس کے نیک اعمال سب مردود ہوں گے جن کا نہ ثواب اور نہ اس سے رفع درجات اور اس پر کفایت نہیں بلکہ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۔ یا تو یہ نیا جملہ ہے اور واؤ ابتدائیہ اور یا فیہ کی ضمیر سے حال ہے۔ اور واؤ حالیہ یا فلن یقبل پر معطوف ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ جیسا اس کا حال ویسا ہی اعراب۔ ھو کا مرجع من ہے۔ آخرت سے مراد دنیوی زندگی کے بعد کی حالت ہے۔ جس میں برزخ اور قیامت اور اس کے بعد کے سارے اوقات داخل ہیں۔ خاسرین خسران سے بنا جس کے معنی ہیں ثواب سے محرومی بلکہ لغت میں خسران اصل پونجی کے جاتے رہنے کو کہتے ہیں۔ خاسرہ وہ تاجر ہے جو بجائے نفع کے اپنا اصلی مال بھی کھو بیٹھے۔ چونکہ کافر اپنا فطری دین کھو بیٹھتا ہے جو وہاں سے لایا تھا۔ اس لئے اسے خاسر فرمایا گیا۔ یعنی ایسا شخص آخرت میں ان نقصان پانے والوں میں سے ہوگا۔ جو اپنی اصل پونجی کھو بیٹھے کہ نیکیوں کا ثواب تو کیا پاتا اپنا فطری دین بھی کھو بیٹھا۔ كَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ۔ یہدی ہدایت سے بنا۔ بمعنی راہ دکھانا یا منزل مقصود پر پہنچانا۔ یہاں یا جنت کا راہ دکھانا مراد ہے۔ یا دین حق کا راستہ دکھانا یا منزلِ مقصود پر پہنچانا یا توفیق خیر دینا یا ان کے دل میں معرفت پیدا کرنا مراد (کبیر و معانی وغیرہ) لہٰذا اس کا متعلق پوشیدہ ہے۔ یعنی اِلَى الدِّیْنِ الْحَقِّ یَا اِلَى الْجَنّٰتِ یَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ۔ قومًا یہدی کا مفعول ہے ایمان سے ان کا اسلام قبول کرنا مراد ہے یا توریت و انجیل سے حضور ﷺ کو ماننا جیسا کہ شانِ نزول کی روایتوں سے معلوم ہوا۔ لہٰذا کفر میں بھی دو احتمال ہو گئے۔ ارتداد اور اصلی کفر یعنی اللہ اس قوم کو جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئی جنت کا راہ یا دین حق کا راہ کیسے دکھائے یا ان کے دلوں میں معرفت کیسے پیدا کرے یا انہیں توفیق خیر کیسے دے۔ وَشَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ۔ واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ ایمان پر معطوف کیونکہ ایمان میں فعل کے معنے تھے گویا بَعْدَ مَا اٰمَنُوْا تھا۔ بعض نے فرمایا کہ یہ ایمان کے معنے پر معطوف ہے نہ کہ لفظ پر جیسے۔ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ۔ کہ یہاں اقرضوا مصدقین کے معنے پر معطوف ہے۔ بعض نے فرمایا کہ شہدوا سے پہلے اَنْ پوشیدہ ہے جس سے یہ بمعنی مصدر ہو گیا یعنی و شہادتہم۔ شاعر کہتا ہے ؎

وبس عباءة وتقر عینی احبّ الیّ من بس الشفوف

اس میں تقدیر فعل بس پر معطوف ہے۔ غرض یا شهدوا کو مصدر بنایا جائے یا ایمان کو فعل تا کہ معطوف علیہ و معطوف میں موافقت ہو جائے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ جملہ کفروا پر معطوف ہے اور واؤ ترتیب کے لئے نہیں اب معنی یہ ہوئے کہ جنہوں نے گواہی دی اور کافر ہوئے۔ (روح المعانی) رسول سے مراد نبی کریم ﷺ ہیں۔ حق مقابل باطل کا ہے۔ خیال رہے کہ گواہی سے یا اسلام کی گواہی مراد ہے یا وہ گواہی جو اہل کتاب حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے دیا کرتے تھے۔ وَجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ۔ یہ جملہ بھی شهدوا پر معطوف۔ بینات بینة کی جمع ہے۔ بمعنی ظاہر چیز اس لئے گواہوں کو مبینہ کہتے ہیں کہ وہ خود بھی ظاہر ہوتی ہے اور دعویٰ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں بَيِّنٰتُ سے یا توریت وانجیل کی آیتیں مراد ہیں یا حضور علیہ السلام کے معجزات یا قرآنی آیات یا دلائل حقانیت۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ یہ نیا جملہ ہے اور لا یھدی میں وہ ہی تین احتمال ہیں جو کیف یھدی میں تھے۔ ظالم سے مراد کافر ہے کیونکہ وہ اپنے نفس کا حق مارتا ہے کہ کفر کے ذریعہ اسے جہنم تک پہنچاتا ہے یا رب کی چیز کو غیر جگہ صرف کرتا ہے یا بجائے ایمان کفر استعمال کرتا ہے غرضکہ ظلم کے تین معنی ہیں حق مارنا کسی کی چیز بغیر اجازت خرچ کرنا۔ چیز کو غیر مرتبہ میں رکھنا۔ یہ تینوں معنی کافر پر صادق ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ظالموں (کفار) کو ہدایت نہیں فرماتا۔ خیال رہے کہ چونکہ ہدایت نہ دینے کی علت ظلم اور کفر ہے۔ اس لئے لا یھدیھم نہ کہا بلکہ نام لیا۔

خلاصہ تفسیر

جو کوئی شریعت محمدی یعنی اسلام کے سواء کسی دین کو تلاش کرے خواہ شرک وکفر کو یا گذشتہ منسوخ دینوں میں سے ایک تو اس کا دین یا تلاشِ دین یا اس دین میں رہ کر اس کے نیک اعمال رب تعالیٰ کی بارگاہ میں کبھی قبول نہ ہوں گے۔ وہ خود اور اس کی نیکیاں اور اس کا دین تلاش کرنا سب مردود ہیں۔ اور صرف اس پر بس نہیں بلکہ وہ آخرت میں ان ٹوٹے والوں میں سے ہوگا۔ جس کی اصل پونجی بھی برباد ہو جائے۔ خیال رہے کہ اسلام میں عقائد واعمال سب ہی آ گئے جو اسلامی عقیدوں کے سواء اور عقیدے اختیار کرے۔ وہ بھی مردود ہے اور جو عقائد تو اسلامی رکھے مگر اعمال غیر اسلامی اختیار کر کے ان کے ذریعہ رب سے ملنا چاہے وہ بھی بے ایمان ہے۔ بھنگی' چرسی' پوستی' فقیر۔ یوں ہی نماز وروزے کے تارک' گانا بجانا' سننے والے پیر جو نماز کے قریب نہ جائیں۔ گانے بجانے کو خدا رسی کا ذریعہ جانیں۔ سب بے ایمان ہیں۔ ایک سنت پر عمل ہزار ہا چلوں' وظیفوں سے افضل ہے وہ جو کہا جاتا ہے کہ حضرت بابا شیخ فرید پاک پتن والے بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے بارہ برس کنوئیں میں لٹک کر چلا کیا کہ کنوئیں سے باہر آئے ہی نہیں۔ بالکل غلط ہے۔ ورنہ بتاؤ کہ اس زمانہ کی نمازیں جماعتیں کیسے ادا کیں۔ یعنی اے محبوب ﷺ اللہ تعالیٰ اس قوم کو جنت کی ہدایت کیسے کرے یا اس کی ہدایت کیونکر چاہے یا اس کے دل میں معرفت کیسے پیدا کرے یا اسے منزلِ مقصود تک کیسے پہنچائے جو ایمان لا کر اور اس رسول برحق کی گواہی دے کر اور کھلے ہوئے واضح دلائل دیکھ کر کافر ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ہدایت دیتا ہی نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اسلام ایمان ایک ہے کیونکہ اگر ایمان غیر اسلام ہوتا تو وہ بھی قبول نہ ہوتا۔ جیسا آیت نے فرمایا کہ غیر اسلام کوئی دین قبول نہیں **مسئلہ:** جنہوں نے اسلام کو غیر ایمان مانا وہ فرماتے

ہیں کہ اس آیت میں غیر سے مغایرت اور مخالفت مراد ہے یعنی جو کوئی اسلام کے خلاف دیگر ادیان یہودیت وغیرہ کو اختیار کرے گا وہ مردود ہے۔ اسلام اور ایمان ذاتًا ایک ہے۔ مفہوم میں فرق۔ **دوسرا فائدہ:** کافر کی کوئی نیکی قبول نہیں کیونکہ ایمان شرط قبولیت ہے۔ جیسے بے وضو کی نماز مردود ایسے ہی کافر کی نیکیاں باطل خواہ کسی قسم کی ہوں۔ کسی کے ثواب کا مستحق نہیں۔ جیسا کہ فلن یقبل سے معلوم ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** عالم کا جرم جاہل کے جرم سے سخت تر ہے کہ وہ جان بوجھ کر قصور کرتا ہے۔ نیز اس کے جرم میں ضد کا شائبہ ہے۔ نیز اس کا جرم دوسروں کو مجرم بنادے گا۔ جیسا کہ جَآءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** گمراہ عالم کی ہدایت سخت دشوار ہے۔ جاہل کی ہدایت آسان جیسا کہ کیف یھدی اور لا یھدی سے معلوم ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** ایمان اور شہادت میں فرق ہے کیونکہ یہاں شھدوا کو ایمان پر معطوف کیا گیا۔ ایمان تصدیق کا نام ہے اور شہادت اقرار کا۔ ایمان دل کا فعل ہے اور شہادت زبان کا۔ لہٰذا اسلام اور ایمان میں مفہومًا فرق ہے کیونکہ معطوف معطوف علیہ کا غیر ہوتا ہے۔ **لطیفہ:** اس آیت سے اسلام و ایمان کا اتحاد بھی معلوم ہوتا ہے اور اختلاف بھی کیونکہ حضور علیہ السلام کی حقانیت کی گواہی دینا اسلام ہے مگر ایمان پر معطوف۔ ثابت ہوا کہ یہ دونوں ذاتًا ایک ہیں مفہومًا جداگانہ۔ **چھٹا فائدہ:** مسلمان کا اسلام اور طلب اسلام اور اس کے نیک اعمال سب قبول۔ جیسا کہ لن یقبل سے معلوم ہوا کہ کافر کا دین اور تلاش دین اور نیکیاں مردود۔ مومن کا حال اس کے خلاف ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں بہت دراز عبارت کیوں ارشاد فرمائی گئی کہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا. صرف الکفار فرما دینا ہی کافی تھا؟ **جواب:** اس لئے کہ اس میں پانچ قوموں کو شامل کرنا منظور ہے۔ نیکیاں کرنے والے کفار جیسے سخی، عادل کافر اور وہ مسلمان جو مسلمان کہلا کر دوسرے مذاہب کی حقانیت کا شک کریں اور ان میں حق تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہر دین کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ طالب حق کہلائیں۔ گویا انہیں اسلام کی حقانیت میں تردد ہے۔ وہ مسلمان جو دعوے اسلام کر کے تمام ادیان کو سچا جانیں اور کہیں کہ ہر مذہب والا اپنے مذہب کے اصول کی پابندی کر کے رب کو پا سکتا ہے اور ہر مذہب میں رہ کر نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ وہ مسلمان جو کفر کا ارادہ کرے اگرچہ اسے کافر ہونے کا موقعہ نہ ملے وہ جاہل مسلمان جو اسلامی عبادات سے منہ موڑیں اور اپنی ایجادات اور بیہودہ کاموں کو عبادت سمجھیں۔ جیسے بے نماز، بھنگی، چرسی، فقیر اور گانے بجانے والے مسلمان سادھو۔ محرم میں پیٹنے والے جہلاء یہ سب من یبتغ میں داخل ہیں۔ الکفار یا کافر فرما دینے سے یہ فوائد حاصل نہ ہوتے۔ **مسئلہ:** ارادۂ کفر کفر ہے اگرچہ کفر بکنے کا موقعہ نہ ملے۔ **دوسرا اعتراض:** کیف یھدی اور لا یھدی الخ سے معلوم ہوا کہ مرتد کو اسلام کو توفیق نہیں ملتی اور خدا اسے ہدایت کبھی نہیں دیتا۔ حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ بہت مرتد دوبارہ اسلام لے آتے ہیں؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں خاص ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا گمراہ رہنا اور حق پر نہ آنا علم الٰہی میں آ چکا تھا۔ جیسے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (بقرہ:٦) کہ اس سے خاص کفار مراد ہیں نہ کہ عام۔ دوسرے یہ کہ ہدایت سے مراد راہ جنت کی ہدایت دینا ہے۔ یعنی آخرت میں رب تعالیٰ کفار کو جنت کی راہ نہ دکھائے گا اور ظالمین سے وہ لوگ مراد ہیں جو کافر ہو کر مر

جائیں (مدارک) تیسرے یہ کہ ہدایت سے مراد معرفت پیدا کرنا ہے یعنی اللہ کافر کے قلب میں معرفت پیدا نہیں کرتا خواہ کتنا ہی مجاہدہ اور مشقت کرے۔ معرفت مومن کی عبادت سے پیدا ہوتی ہے۔ چوتھے یہ کہ اللہ ظالم کو ظالم رہتے ہوئے ہدایت نہیں دیتا اور جب وہ نادم ہو کر توبہ کرلے تب ظالم نہ رہا۔ **خلاصہ** یہ کہ حق تعالیٰ انسان کے ارادے کے بعد خلق فعل فرماتا ہے۔ ارادہ کفر کے بعد خلق کفر اور ارادہ ہدایت کے بعد خلق ہدایت فرماتا ہے۔ پانچویں یہ کہ یہاں ہدایت سے منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہے۔ یعنی ظالم کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ راہ دکھانا مراد نہیں۔ اس لئے آگے توبہ کا ذکر آ رہا ہے۔ یعنی بغیر توبہ ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں کفار کے خسارے کو آخرت کے ساتھ کیوں خاص کیا کہ فرمایا وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. **جواب:** اس لئے کہ اس نقصان کا ظہور آخرت میں ہی ہوگا اور وہ لوگ اس کا وہاں ہی اقرار کریں گے۔ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ. دنیا میں بہت سے کافر عیش میں ہیں اور اپنے کو کامیاب سمجھے ہوئے لہٰذا فی الآخرۃ فرمایا گیا۔ **چوتھا اعتراض:** ومن يبتغ سے معلوم ہوا کہ جو کوئی اسلام کے سوا دوسرا دین تلاش کرے وہ نقصان میں ہے اور جسے بغیر تلاش ہی دوسرا دین مل جائے تو چاہیے کہ وہ نقصان میں نہ ہو۔ خاندانی کافر جن کا کفر بچپن سے ہے۔ انہوں نے کفر کہاں تلاش کیا تو کیا وہ اس حکم سے خارج ہیں؟ **جواب:** اس کا جواب اسی آیت میں دے دیا گیا۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. جس سے معلوم ہوا کہ ان سزاؤں کی وجہ کفر ہے خواہ تلاش سے حاصل ہو یا بغیر تلاش۔ ومن يبتغ فرما کر اس جانب اشارہ ہے کہ جو دین کی جستجو کرے اور تلاش حقانیت کے بعد بھی کفر میں پھنسے وہ بھی نقصان میں ہے تو جو بے پرواہی سے کافر ہے اور تلاشِ حق کی کوشش ہی نہ کرے وہ بدرجہ اولیٰ سے سزا کا مستحق کیونکہ وہ کافر بھی ہے اور بے پرواہ بھی۔ اور ہوسکتا ہے کہ يبتغ فرما کر کفار کے ان بچوں کو نکالا گیا ہو جو بچپن میں فوت ہو جائیں کہ وہ ان سزاؤں کے مستحق نہیں کیونکہ انہوں نے نہ کفر تلاش کیا نہ اسے اختیار کیا۔ لہٰذا یہ آیت ان لوگوں کی دلیل ہے جو کفار کے بچوں کو ناجی مانتے ہیں۔ **نوٹ ضروری:** کفار کے فوت شدہ بچوں میں تین قول ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ جہنم میں رہیں گے کہ اولاد ماں باپ کے تابع ہوتی ہے۔ نبی کا نابالغ بچہ نبی کے ساتھ ولی کا ولی کے ساتھ عام مسلمانوں کا ان کے ساتھ ایسے ہی کافر کا بچہ کافر کے ساتھ (۲) دوسرے یہ کہ ان کی نجات ہوگی اور وہ اہل جنت کے خدام بن کر جنت میں رہیں گے کیونکہ انہوں نے کفر نہیں کیا۔ اور اگرچہ کفار کے بچوں پر دنیا میں کفر کے احکام جاری ہوتے ہیں کہ نہ ان کا کفن دفن ہو نہ نماز جنازہ مگر آخرت میں ایسا نہ ہوگا کیونکہ یہاں ظاہر پر حکم ہے اور وہاں حقیقت پر (۳) تیسرے یہ کہ اس مسئلہ میں خاموشی چاہیے کیونکہ اس بارہ میں روایتیں مختلف ہیں اور دنیا میں بھی ان پر کفر کے سارے احکام جاری نہیں۔ جہاد میں انہیں قتل کرنا جائز نہیں مگر جن کافروں پر عذاب الٰہی آیا ان کے بچے بھی عذاب سے نہ بچے۔ یہ ہی قول امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ (از شامی) اس آیت میں دوسرے قول والوں کی دلیل ہے۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے لازم ہوتا ہے کہ سارے گنہگار مسلمان جو اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں مردود ہوں کیونکہ غیر اسلامی کام کرتے ہیں۔ جوا شراب خواری وغیرہ۔ **جواب:** اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو غیر اسلام کو دین سمجھیں اور غیر اسلامی کاموں وعقیدوں کو رب تک پہنچنے کا ذریعہ جانیں۔ گنہگار مسلمان اپنے کو مجرم اپنے ان کاموں کو گناہ سمجھتا ہے اس لئے یہاں ارشاد ہوا غیر الاسلام دیناً برا کام

کرنا اور ہے برے کام کو دین سمجھنا کچھ اور۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام کے نزدیک اسلام توحید حقیقی ہے جو ماسوی اللہ کے خیال کو ختم کر دے وہ ہی دین اللہ ہے۔ اس کی جانب اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ۔ (آل عمران: ۲۰) میں اشارہ ہے اس توحید کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان رب تعالیٰ کا کامل مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے کیونکہ سارے اعضاء قلب کے تابع ہیں۔ جب قلب میں غیر خدا کا دھیان نہیں تو اعضائے ظاہری پر مخالفت رب تعالیٰ کا احتمال نہیں۔ اس درجہ میں پہنچ کر انسان مسلم حقیقی بنتا ہے۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (بقرہ: ۱۳۶) میں اسی جانب اشارہ ہے اور حدیث مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ۔ اس درجہ کا بیان ہے کہ جو کوئی ولی ارادہ کے ساتھ نماز چھوڑ دے وہ غیر اللہ یعنی نفس و شیطان کا مطیع ہو گیا۔ جو اس توحید کے خلاف ہو کر اس توحید حقیقی کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے۔ خواہ شیطان کی اطاعت میں یا نفس امارہ کی پیروی میں وہ ہرگز مقبول بارگاہ نہ ہو گا کیونکہ اس کا یہ دن اسے رب تعالیٰ تک نہیں پہنچا سکتا۔ وہ رب تعالیٰ سے ہمیشہ محجوب ہی رہے گا۔ اور آخرت میں سخت نقصان میں کیونکہ اس نے اپنے نفس کو حجابات کے عوض فروخت کر دیا۔ رب تعالیٰ نے اولاً سب کو ایمان میثاق کا نور دیا پھر انہیں نور استعدادی عطا فرمایا پھر ان میں سے بعض کو نورِ ایمانی بخشا یہاں تک کہ انہوں نے پیغمبر کی حقانیت کا مشاہدہ کر لیا اور اس کے ساتھ دلائل عقلیہ بھی انہیں مل گئے۔ جس سے انہیں کوئی شک باقی نہ رہا۔ پھر نفس کی ظلمت نے ان کے عقل و دل کے انوار کو ڈھانک لیا اور ان کے مشاہدہ کرنے والی روح کو پردے میں لے لیا۔ ایسے بدنصیبوں کو اب خدا تعالیٰ کیسے ہدایت دے کہ جنہیں نور الانوار بلکہ نور فوق نور حاصل تھا اور پھر ظلمات بعضها فوق بعض میں پھنس گئے۔ ایسے لوگ بڑے ظالم ہیں کیونکہ کوئی ظلم کرتا ہے غیروں پر یہ ظلم کرتے ہیں اپنے پر اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حجاب و ظلمت اور حق سے دوری دو قسم کی ہے ایک وہ جس میں نفس امارہ دل پر پورا غلبہ حاصل کر لے جس سے سرکشی انتہاء کو پہنچ جائے اور حق سے انتہائی دوری ہو جائے۔ یہ کبھی دور نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ گلے ہوئے لوہے کی طرح ہیں جنہیں کوئی صیقل صاف نہیں کرتی۔ اسی کو ختم کہتے ہیں۔ دوسرے وہ جس میں نفس امارہ نے دل پر پورا قبضہ نہ کیا ہو اور نور لم یزل کی شعاعیں بالکل بند نہ ہوئی ہوں۔ اور ان کے قلب میں منور ہونے کی قابلیت ہو۔ یہ اس زنگ آلودہ لوہے کی طرح ہیں جو کامل کاریگر اور اعلیٰ صیقل سے صاف ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ رحمت الٰہی ان کی دستگیری کرے وہ نادم ہو کر توبہ کر لیں ان کی طرف اگلی آیت میں اشارہ ہے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا الخ (آل عمران: ۸۹) (از ابن عربی) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ کفر چند قسم کا ہے۔ بے پرواہی کا کفر جیسے عام کفار کا بے جا محبت کا کفر جیسے عیسائیوں کا رب کی عداوت کا کفر، عداوت انبیاء کا کفر جیسے یہود کا عداوت ملائکہ کا کفر جیسے ابن سوریا کا جس نے کہا کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں۔ صحابہ کرام کی عداوت کا کفر مگر ان سب میں کفر عداوت سخت تر ہے۔ دشمن پیغمبر کو ایمان کی توفیق نہیں ملتی۔ رب چاہتا ہی نہیں کہ میرے محبوبوں کے دشمن جنت میں جائیں۔ انہی کے بارے میں فرمایا گیا كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا الخ اے محبوب ﷺ ہم اس ظالم قوم کو جنہوں نے جان بوجھ کر آپ کا انکار کیا جن کے دلوں میں آپ کی عداوت کی آگ بھڑک رہی ہے کیسے ہدایت دے دیں اور انہیں اپنی جنت میں کیسے آنے دیں۔ جنت تمہاری خاطر بنی۔

تمہارے غلاموں کے واسطے بنی۔ اللہ تعالیٰ کفر حسد سے بچائے۔ شیطان عداوت کا کافر تھا جس سے اس کی ساری عبادت برباد ہوگئی۔ عداوتِ پیغمبر وہ آگ ہے جو ساری نیکیوں کو صرف برباد ہی نہیں کر دیتی بلکہ قلب کو ایمان کے قابل نہیں چھوڑتی۔ مولینا فرماتے ہیں ۔

چوں خدا خواہد کہ راز کس درد　　میلش اندر طعنۂ پاکاں دہد

جب رب تعالیٰ کسی کو رسوا کرنا چاہتا ہے تو اسے اللہ کے مقبول بندوں میں عیب نکالنے کی سوجھتی ہے یہ آیتیں قابل عبرت ہیں۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾
یہ لوگ بدلہ ان کا یہ ہے کہ تحقیق اوپر ان کے لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی
ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ اور فرشتوں اور آدمیوں سب کی
خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ
ہمیشہ رہنے والے بیچ اس کے نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ وہ مہلت دیئے جائیں گے سوا ان کے جنہوں نے
ہمیشہ اس میں رہیں نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہو اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی مگر
تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾
اس کے بعد توبہ کی اور درست کیا انہوں نے پس تحقیق اللہ بخشنے والا مہربان ہے
جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور آپا سنبھالا تو ضرور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مرتدین یا معاندین کا ذکر تھا۔ اب ان کی جزا کا تذکرہ ہے۔ گویا جرم اور مجرم کے ذکر کے بعد اس کے نتیجے اور سزا کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار کی مردودیت کا ذکر تھا۔ اب اس کی تفصیل ارشاد ہو رہی ہے کہ مردودیت کا ظہور اس طرح ہوگا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مرتدین یا معاندین کی روحانی و دنیاوی سزا کا ذکر تھا کہ رب تعالیٰ انہیں دنیا میں ہدایت نہیں دیتا۔ اب ان کے جسمانی اور اخروی عذاب کا ذکر ہے۔ یعنی لعنت اور جہنم کا عذاب وغیرہ گویا اس جرم کی چند سزاؤں میں سے بعض کا ذکر پہلے ہو چکا۔ بعض کا اب ہو رہا ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں معاندین کی محرومی کا ذکر تھا کہ وہ نعمت ہدایت سے محروم ہیں۔ اب ان کے عذاب کا تذکرہ ہے چونکہ نعمت سے محرومی عذاب پر مقدم ہے۔ اس لئے اس کا ذکر پہلے ہوا اور اس کا بعد میں۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں ایک مہلک بیماری کا ذکر تھا۔ یعنی کفر اور عناد اب اس کی دوا بتائی جا رہی ہے۔ توبہ اور اپنے گناہوں پر ندامت گویا مصیبت کے ذکر کے بعد اس کے دفعیہ کا ذکر ہے۔

شانِ نزول

حارث ابن سوید انصاری کو کفار کے ساتھ جاملنے کے بعد سخت شرمندگی ہوئی جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا۔ تب انہوں نے اپنی قوم کے پاس پیام بھیجا کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کرو کہ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ ان کے حق میں آیت اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک اتری۔ حضور ﷺ نے ان کے بھائی جلاس کے ذریعہ یہ آیت ان تک پہنچائی۔ تب وہ مدینہ منورہ میں آ کر تائب ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اس کے بعد ان کا اسلام نہایت کامل ہوا (تفسیر خزائن عرفان وخازن)

تفسیر

اُولٰٓئِکَ جَزَآءُ هُمْ اَنَّ عَلَیْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ اولئک سے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کے عیوب پہلے بیان ہو چکے۔ چونکہ وہ لوگ ان عیوب کی وجہ سے گویا محسوس ہو گئے تھے۔ اسلئے بجائے ضمیر کے اسم اشارہ لایا گیا۔ جزاء جزی یجزی کا مصدر ہے۔ بمعنی برابر ہونا' کافی ہونا' ہر بدلہ کو جزا کہا جاتا ہے۔ خواہ بدلہ نیکی کا ہو یا برائی کا جیسے وَجَزَآءُ هُمْ بِمَا صَبَرُوْا (الدھر: ۱۲) اور جیسے فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ (النساء: ۹۳) یہاں بمعنی سزا ہے۔ اولئک مبتدا اول ہے اور جزاءھم دوسرا مبتداء۔ اگلا جملہ جزا کی خبر۔ پھر یہ پورا جملہ اولئک کی خبر۔ لعنت کے معنی ہیں دور کرنا' رحمت سے دور کرنا رب کی لعنت ہے اور اس دوری کی دعا کرنا بندوں کی لعنت۔ یہاں اللہ کے لحاظ سے بمعنی دوری رحمت ہے اور فرشتوں اور لوگوں کے لحاظ سے بمعنی دعائے دوری۔ یہاں لعنت کو جملہ اسمیہ سے بیان فرمایا گیا اور عذاب میں کمی یا مہلت نہ دینے کو مضارع سے جس سے معلوم ہوا کہ لعنت تو دنیا کی زندگی' مرتے وقت اور قبر وحشر میں ہمیشہ ہر جگہ ہے مگر عذاب میں کمی وغیرہ نہ ہونا آخرت میں ہوگا۔ دنیا میں اللہ کی لعنت یہ ہے کہ بندہ کو آخرت کی نعمتوں ایمان' عرفان' نیک اعمال کی توفیق نہ ملے اور دنیاوی نعمتیں اگر ملیں تو عذاب ورحمت بن کر ملیں کہ بندہ مال واولاد وعزت وسلطنت پا کر اور زیادہ سرکش ہو جائے۔ مرتے وقت کی لعنت یہ ہے کہ جوں جوں عمر زیادہ گذرے بندے کو دنیا میں مشغولیت زیادہ ہو۔ ورنہ چاہیے یہ کہ بڑھاپے میں انسان دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی تیاری کرے۔ پرندہ دن بھر کھیتوں میں چگتا ہے' شام کو اپنے آشیانے کی طرف اڑتا ہے۔ قبر کی لعنت یہ ہے کہ بندہ کو منکر نکیر کے سوالات کے جوابات نہ سوجھیں' آخرت کی لعنت یہ کہ بندے کا منہ کالا ہاتھ بندھے بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال ہوں۔ ظاہر یہ ہے کہ ملائکہ سے سارے فرشتے مراد ہیں اور ممکن ہے کہ اس سے صرف وہ فرشتے مراد ہوں جو جہنم پر مقرر ہیں یا وہ جو جان نکالنے کے لئے آتے ہیں یا وہ جو انسانوں کی حفاظت کرتے ہیں کہ یہ محافظ فرشتے اس کافر کی وجہ سے بتخانہ' جوئے شراب کے اڈوں' کھیل تماشوں کے ٹھکانوں [illegible] جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہاں بادل نخواستہ جاتے ہیں مگر اس پر لعنت کرتے ہوئے اور ممکن ہے کہ اس سے حاملین عرش اور عرش کا طواف کرنے والے فرشتے مراد ہوں کہ وہ حضرات مومنوں کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور کافر کے لئے لعنت کی بددعا کرتے ہیں۔ ایسے ہی الناس میں بظاہر سارے لوگ مراد ہیں اور ممکن ہے کہ صرف مسلمان مراد ہوں۔ اجمعین یا تو صرف الناس کی تاکید ہے یا ملائکہ اور ناس دونوں کی پہلی صورت میں اس کے معنی ہوں گے سب لوگوں کی لعنت۔ دوسری صورت میں اس کے معنی

ہوں گے فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت۔ گویا یہ فرشتوں اور انسانوں کے شمول کے لئے ہے۔ یعنی یہ لوگ جن کے عیوب تم سن چکے ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی بھی لعنت ہے اور فرشتوں کی بھی اور سب انسانوں کی بھی۔ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا۔ یہ علیھم کی ضمیر سے حال ہے۔ خلود بمعنی ہمیشگی بھی آتا ہے اور بمعنے مدت دراز بھی۔ یہاں پہلے معنی میں ہے کیونکہ کفار جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ فیھا کی ضمیر یا لعنت کی طرف ہے یا جزا کی طرف یا آگ کی جانب جو اس جزا سے اشارۃً سمجھ میں آئی۔ یعنی یہ کفار اس سزا میں یا آگ میں یا اس لعنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے یا تو اس طرح کہ ان پر ہمیشہ لعنت ہوتی رہے گی یا اس طرح کہ لعنت خاص وقت میں ہوگی مگر اس کا اثر یعنی عذاب ہمیشہ۔ پھر اس کے ساتھ ہی لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَ لَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ...... یہ جملہ یا تو نیا ہے یا علیھم کا دوسرا حال۔ یخفف تخفیف سے بنا بمعنی ہلکا کرنا۔ ینظرون انظار سے مشتق ہے بمعنی مہلت دینا اور دیر لگانا' رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ فنظرۃٌ الٰی میسرۃ (بقرہ: ۲۸۰)۔ یعنی ان کفار سے نہ تو کبھی عذاب ہلکا کیا جائے گا کہ راحت پائیں اور نہ بھی انہیں مہلت ملے کہ آرام لیں۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ۔ یہ جملہ پچھلے جملے کے مضمون سے استثناء ہے یا تو متصل ہے یا منقطع جیسا لا یھدی القوم الظلمین کی تفسیروں سے معلوم ہوا کہ اگر ظالمین سے وہ کفار مراد ہیں جن کا کفر پر مرنا علم الٰہی میں آچکا تو یہ استثناء منقطع ہے اور اگر ہر کافر مراد ہے تو متصل کہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل ہے۔ خیال رہے کہ اِلَّا گذشتہ کا مضمون توڑنے کے لئے آتا ہے۔ اگر گذشتہ میں ثبوت تھا تو اِلَّا ثبوت توڑ کر نفی کر دیتا ہے اور اگر گذشتہ میں نفی کا مضمون تھا تو نفی کو توڑ کر ثبوت کر دیتا ہے یہاں لطف یہ ہے کہ پچھلی آیت میں تین لعنتوں کا ثبوت تھا۔ اب اِلَّا کے بعد ان لعنتوں کی نفی ہوگی اور پہلے عذاب ہلکا ہونے اور مہلت ملنے کی نفی تھی۔ لہٰذا اب اِلَّا کے بعد ان کا ثبوت ہوگا۔ تابوا توبٌ سے بنا بمعنی رجوع کرنا عذاب سے رجوع رب تعالیٰ کی توبہ ہے اور گناہوں سے رجوع بندے کی توبہ۔ اس لئے اس کا فاعل کبھی اللہ آتا ہے کبھی بندے۔ جیسے لَقَدْ تَابَ اللّٰہُ (التوبہ: ۱۱۷) اور اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا ذالک سے ظلم اور کفر کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر الظلمین میں ہو چکا۔ من بعد ذالک فرما کر بتایا گیا کہ اتنے بڑے جرموں کے بعد بھی توبہ سے گناہ بخش دیئے جائیں گے تو چھوٹے گناہ تو بدرجہ اولیٰ قابل بخشش ہوں گے یعنی یہ لوگ دائمی جہنمی ہیں سوا ان کے جو اس کفر کے بعد توبہ کر لیں اور صرف زبانی توبہ نہیں بلکہ وَاَصْلَحُوْا۔ یہ جملہ تابوا پر معطوف ہے۔ اصلحوا اصلاح سے بنا جس کا مادہ صلاح ہے بمعنی درستی (فساد کا مقابل) لازم بھی آتا ہے۔ متعدی بھی' اصلاح صلح اور درستی میں داخل ہونا جیسے اصبح بمعنی صبح پائی۔ اصلاح بمعنی درست کرنا' یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ دوسری صورت میں اس کا مفعول پوشیدہ ہوگا کہ اپنے کو درست کر لیں یا گذشتہ جرموں کو درست کر دیں کفارہ وغیرہ دے کر یا آئندہ کو درست کر دیں کہ جو خرابیاں ان کی بد عملی سے پیدا ہونے کا خطرہ ہو اس کا انتظام کرا دیں کہ اگر ان کے وعظ سے غلط عقیدے پھیلنے کا اندیشہ ہو تو اس سے رجوع کر لیں۔ یعنی توبہ کے ساتھ درستی میں داخل ہو جائیں یا اپنے اعمال ٹھیک کر لیں اگر انہوں نے یہ دونوں کام کر لئے تو فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ ف یا جزائیہ ہے اور یہ جملہ پوشیدہ شرط کی جزا یا تعلیلیہ ہے اور یہ جملہ پوشیدہ جملے کی علت ہے غفور رحیم کے معنی بارہا بیان ہو چکے کہ یہ غفرٌ سے بنا بمعنی ڈھانپنا' چھپانا غفور فرما کر اشارۃً بتایا کہ ہم توبہ کرنے والے کے گناہ اس طرح چھپا لیں گے کہ دنیا و آخرت میں کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں گے تا کہ بندہ کو شرمندگی نہ ہو جیسے حضور انور ﷺ نے حضرت ابو

سفیان و ہندہ کے قصور ایسے چھپائے کہ پھر ذکر بھی نہ ہونے دیا۔ یہاں یا تو مغفرت سے گناہوں کا معاف کرنا مراد ہے یا ثواب دینا مقصود یا مغفرت سے قیامت کے دن اُن کے عیب چھپانا مراد ہے اور رحمت سے اُن کی نیکیاں ظاہر کرنا مقصود۔ اس صورت میں یہ دونوں آخرت کے متعلق ہیں۔ بعض نے فرمایا کہ مغفرت سے دنیا میں پردہ پوشی مراد ہے اور رحمت سے آخرت کی معافی مقصود۔ اس صورت میں یہ دونوں چیزیں دو جہانوں کے متعلق ہیں۔ مغفرت دنیا میں رحمت آخرت میں۔ مگر یہ توجیہہ بعید ہے یعنی اگر یہ اپنا حال درست کرلیں تو اللہ ان کے لئے غفور رحیم ہے۔ یا اللہ ان کے گناہ معاف کردے گا کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہ لوگ جو مومن ہوکر رسول کی حقانیت کی گواہی دے کر دلائل تو یہ دیکھ کر محض عناد و حسد سے کافر ہوگئے چونکہ ان کی بغاوت سخت ہے۔ اس لئے ان کی سزا بھی سخت کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ فرشتوں کی لعنت اور سارے انسانوں کی لعنت اور پھٹکار کہ رب تعالیٰ انہیں آخرت میں ہر رحمت سے دور رکھے گا اور سارے فرشتے اور سارے انسان ان پر لعنت اور پھٹکار اور دوری کی بددعا کریں گے۔ پھر یہ نہیں کہ اس ذلت و مصیبت کی کبھی انتہا ہوجائے بلکہ اس لعنت میں یا لعنت کے عذاب میں ہمیشہ ہی گرفتار رہیں گے۔ اس طرح کہ ہر وقت لوگ انہیں لعنت کرتے رہیں گے یا ہر وقت عذاب ہوتا رہے گا۔ نہ کبھی ان کا عذاب ہلکا ہو نہ احساس عذاب میں کچھ فرق پیدا ہو اور نہ کبھی مہلت دی جائے کہ کچھ دن کے لئے عذاب موقوف ہوجائے تاکہ راحت پاکر تازہ دم ہوجائیں بلکہ مسلسل اور یکساں عذاب رہے گا مگر جو ان جرموں کے بعد سچے دل سے توبہ کرلیں اور اپنے آپ کو اور اپنے اعمال کو سنبھال لیں یا اپنی بگاڑی چیزوں کو درست کردیں تو ان کی بخشش ہوجائے گی کیونکہ اللہ بخشنے والا بھی ہے۔ بہت رحم و کرم والا بھی اپنے دروازے پر آنے والوں کو درکار تا نہیں۔

توبہ

توبہ بڑی عبادت ہے۔ قرآن کریم میں اس کا بارہا حکم دیا گیا۔ نیز اس کے بارے میں احادیث بیشمار وارد ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ توبہ وہ تریاق ہے جو گناہ' کفر' شرک غرضکہ ہر روحانی زہر کو دور کرتا ہے۔ قرآن کریم میں کہیں فرمایا گیا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ. (النور:۳۱) کہیں فرمایا گیا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا. غرضکہ توبہ ہر دلی بیماری کا علاج اور ہر دکھ، درد، رنج و غم کی دوا ہے۔ اس کے بارے میں بیشمار حدیثیں وارد ہیں جن میں سے ہم کچھ نقل کرتے ہیں۔ (۱) فرماتے ہیں ﷺ کہ ہم دن میں ستر بار سے زیادہ توبہ کرتے ہیں (بخاری و مشکوٰۃ باب الاستغفار والتوبہ) (۲) فرماتے ہیں ﷺ کہ اے لوگو رب سے توبہ کرو۔ ہم روزانہ سو بار توبہ کرتے ہیں (مسلم و مشکوٰۃ) (۳) حضور ﷺ فرماتے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا اے میرے بندو تم دن رات خطائیں کرتے ہو اور ہم گناہ بخشتے ہیں۔ لہٰذا تم ہم سے مغفرت مانگا کرو ہم بخش دیا کریں گے۔ (مسلم و مشکوٰۃ) (۴) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم گناہ کرو تو اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو پیدا کرے جو گناہ کرکے توبہ کریں اور وہ معاف کرے۔ (مسلم) تاکہ اس کی شان غفاری ظاہر ہو۔ (۵) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر رات کو اپنا دستِ قدرت پھیلاتا ہے

تا کہ دن کا گنہگار توبہ کر کے اس کی امن میں آ جائے اور ہر دن کو دستِ قدرت پھیلاتا ہے کہ رات کا گنہگار توبہ کر کے اس کی پناہ میں آ جائے۔ یہ جب تک ہوگا جبکہ آفتاب مغرب سے طلوع ہو۔ (مسلم ومشکوٰۃ) (۶) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب گنہگار بندہ گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرے تو رب تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ (۷) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب کوئی گنہگار پکارتا ہے۔ اے رب میں نے گناہ کیا۔ معاف فرما تو رب تعالیٰ فرماتا ہے کیا میرا بندہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے جو اسے بخشنے اور پکڑنے پر قادر ہے۔ جاؤ میں نے اپنے بندہ کو معاف کر دیا۔ پھر بندہ گناہ کر کے تڑپ کے رب تعالیٰ کو پکارتا ہے پھر یہ ہی فرما کر معافی ہو جاتی ہے۔ بارہا ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ (مسلم بخاری) (۸) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ رب تعالیٰ فرماتا ہے اے انسان جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور میری بارگاہ سے امید رکھے گا میں تیرے گناہ معاف کرتا رہوں گا کیسے ہی ہوں اور کچھ پرواہ نہ کروں گا۔ اے انسان اگر تیرے گناہ بادل تک پہنچ جائیں اور تو مجھ سے معافی چاہے تو میں بخش دوں گا اور کچھ پرواہ نہ کروں گا۔ اے انسان اگر تو میرے پاس زمین بھر خطائیں لائے تو میں تجھے زمین بھر بخشش دوں گا بشرطیکہ مشرک ہو کر میرے پاس نہ آ۔ (ترمذی احمد دارمی) (۹) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر انسان خطا کار ہے اور خطا کاروں میں بہتر توبہ کرنے والے ہیں۔ (ابن ماجہ وترمذی) (۱۰) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ پیدا ہوتا ہے۔ اگر توبہ کر لے تو صیقل ہو کر اس کا قلب صاف ہو جاتا ہے اور اگر توبہ نہ کرے بلکہ گناہ کئے جائے تو اس کے دل کی سیاہی بڑھتی رہے گی یہاں تک کہ قلب کو ڈھک لے گی اسی کا نام رین ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (مطففین: ۱۴) (۱۱) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شیطان نے عرض کیا تھا اے مولیٰ تیری عزت کی قسم میں تیرے بندوں کو اس وقت تک بہکاؤں گا جب تک کہ ان کے جسموں میں جان رہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا میری عزت وجلال کی قسم میں انہیں جب تک بخشوں گا جب تک کہ وہ توبہ کرتے رہے۔ .... (احمدی) (۱۲) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے مغرب میں ایک دروازہ بنایا جس کی چوڑائی ستر سال کا راہ ہے۔ یہ دروازہ توبہ کا ہے۔ جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہو تب تک وہ دروازہ بند نہ ہوگا۔ (۱۳) حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مبارک ہے وہ شخص جس کے نامۂ اعمال میں توبہ واستغفار زیادہ پائی جائے۔

توبہ کی اقسام

توبہ کے معنی تفسیر میں عرض کئے جا چکے کہ گناہ سے باز آنے کا نام توبہ ہے۔ چونکہ گناہ صدہا اقسام کے ہیں اس لئے توبہ کی بھی بہت سی قسمیں ہوئیں اور ہر قسم کے گناہ کی توبہ مختلف۔ (۱) کفر شرک بدمذہبی اور بدعقیدگی سے توبہ (۲) بداعمالی سے توبہ (۳) شریعت کی حق تلفی سے توبہ (۴) حقوق العباد سے توبہ (۵) نیکیوں میں کوتاہی اور سستی کرنے سے توبہ (۶) خطا اور بھول چوک سے توبہ (۷) محض اظہار عبدیت اور بندوں کی تعلیم کے لئے توبہ۔ انبیائے کرام کی توبہ اخیری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا طریقہ علیحدہ اور تاثیر جداگانہ ہے۔ چنانچہ پہلی قسم کی توبہ سے دینداری وخوش اعتقادی پیدا ہوتی ہے۔ دوسری قسم کی توبہ سے نیک اعمال کی توفیق ملتی ہے۔ تیسری قسم کی توبہ سے ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے۔ اخیر دو قسم کی توبہ سے رب تعالیٰ راضی

ہوتا ہے اور درجے بلند ہوتے ہیں۔ پھر توبہ کے مختلف درجے ہیں۔ (۱) وہ توبہ جس سے گناہ معاف ہو جائیں۔ (۲) وہ توبہ جس سے گناہ کی بخشش ہو کر توبہ کرنے والے کو ولایت حاصل ہو جائے۔ غرض جیسی توبہ اور جیسا توبہ کرانے والا ویسا اس کا اثر۔ حضور غوث پاک اور حضرت رابعہ بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے چور ایک دم ولی بن گئے۔ یہ توبہ کرانے والوں کا فیض تھا۔

توبہ کے شرائط و مستحبات وغیرہ

جیسے نماز کے لئے کچھ فرائض ہیں' کچھ واجبات' کچھ سنن' کچھ مستحبات۔ ایسے ہی توبہ کے لئے بھی اور جیسے نماز کے لئے کچھ ادا کی شرطیں ہیں' کچھ قبولیت کی۔ ایسے ہی توبہ کے لئے کچھ شرائط جواز ہیں کچھ شرائط قبولیت اور جیسے کہ نماز کے لئے کچھ اوقات مستحبہ ہیں' کچھ وقت مکروہ۔ ایسے ہی توبہ کے لئے **چنانچہ** توبہ کے شرائط یہ ہیں۔ (۱) وقت پر توبہ کرے۔ توبہ مشرک کا وقت غرغرہ سے پہلے ہے۔ (۲) توبہ کرتے وقت گناہ کا ارادہ نہ ہو بلکہ گناہ سے باز رہنے کا پورا قصد ہو۔ (۳) توبہ کے وقت گذشتہ گناہوں پر پشیمانی ہو۔ (۴) قبولیت توبہ کا یقین نہ ہو بلکہ رب تعالیٰ کے کرم سے امید اور اس کے قہر سے خوف ہو۔ (۵) جیسا گناہ ہو ویسی توبہ کرے کہ علانیہ گناہ کی علانیہ توبہ۔ چھپے گناہ کی چھپی توبہ۔ مگر یہ شرط شریعت کے لحاظ سے ہے۔ جس پر شرعی احکام جاری ہوتے ہیں۔ اگر کافر دل سے توبہ کر کے مرے اور کسی کو ظاہر نہ کرے وہ شرعاً کافر ہے کہ اس کی تجہیز و تکفین وغیرہ نہ ہوگی مگر عند اللہ مومن ہے۔ (۶) اگر ممکن ہو تو گذشتہ گناہ کا بدلہ کرے۔ لہٰذا چھوڑی ہوئی نمازیں قضا کرے۔ مارا ہوا قرض ادا کرے۔ (۷) جن گناہوں کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا کفارہ دے۔ حضرت وحشی نے زمانہ کفر میں سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا تھا تو مسلمان ہو کر مسیلمہ کذاب کو مار کر اس کا کفارہ ادا کیا۔ حضرت خالد ابن ولید و عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی تلوار سے جیسے مسلمان شہید ہوئے ویسے ہی اسلام لانے کے بعد کافر مارے گئے۔ یہ کفارہ ہوا۔ (۸) توبہ کا وقت مستحب یہ ہے کہ گناہ کی طاقت ہوتے ہوئے توبہ کرے۔ مثل مشہور ہے کہ بڑھیا رنڈی اور معزول حاکم۔ زنا اور ظلم سے توبہ نہ کریں تو کیا کریں۔ مجبور کی توبہ اگرچہ مقبول ہے مگر قادر کی توبہ کا درجہ بلند۔ شعر۔

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری است وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار

توبہ کے یہ اجمالی مسائل بیان کئے گئے۔ انشاء اللہ اس کے تفصیلی احکام اس آیت کی تفسیر میں آئیں گے۔ **اِنَّمَا التَّوْبَۃُ عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَھَالَۃٍ** الخ (النساء:۱۷)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار پر نام لے کر اور گنہگار مسلمان پر بغیر نام لئے صرف اس کے وصف کے ساتھ لعنت کرنا جائز ہے مثلاً کہہ سکتے ہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت' یہ نہیں کہہ سکتے کہ زید پر خدا کی لعنت۔ جیسا کہ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ سے معلوم ہوا۔ مرے بعد کسی کافر پر بھی لعنت جائز نہیں جب تک کہ اس کا کفر پر مرنا یقین سے معلوم نہ ہو۔ لہٰذا اسوائے ابوجہل' ابولہب' امیہ ابن خلف فرعون وغیرہ ان کافروں کے جن کا کفر پر مرنا نص سے ثابت ہے اور کسی پر لعنت نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندگی میں ملعون تھا۔ انشاء اللہ لعنت کی پوری تحقیق اٹھارویں سیپارہ آیت لعان میں آئے

گی۔ **دوسرا فائدہ:** توبہ سے بدتر سے بدتر جرم معاف ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا۔ سے معلوم ہوا کہ بد ترین مجرموں کو توبہ کا موقعہ دیا گیا۔ **تیسرا فائدہ:** جہنم میں ہمیشگی عذاب کا ہلکا نہ ہونا۔ رب تعالیٰ کا نظر رحمت نہ فرمانا کفار کے ساتھ خاص ہے۔ جیسا کہ وَلَا هُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ۔ سے معلوم ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** معافی کے لئے فقط زبانی توبہ کافی نہیں بلکہ اصلاح نفس اور اصلاح عمل بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ وَاَصۡلَحُوۡا۔ سے معلوم ہوا۔ اصلاح نفس تو یہ ہے کہ گذشتہ گناہوں پر نادم ہو۔ اور آئندہ بچنے کا عہد کرے۔ اور اصلاح عمل یہ ہے کہ اس کے جرم سے جو فساد پھیلے تھے ان کو دور کرے۔ اگر کسی عالم کی غلط کتاب سے فساد پھیلا ہے تو اس کی تردید کرے۔ اگر لوگوں کو نیکیوں سے روکا ہے تو انہیں اب رغبت دے۔ نمازیں قضا کرے۔ قرض ادا کرے۔ یہ سب باتیں واصلحوا سے معلوم ہوئیں۔ چنانچہ ان علمائے یہود کے بارے میں فرمایا گیا جنہوں نے حق چھپایا تھا۔ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَاَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا۔ معلوم ہوا کہ حق چھپانے کی توبہ اظہار حق ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار پر سارے انسانوں کی لعنت ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جو ان کے ہم مذہب ہیں۔ وہ تو ان کی تعریف کرتے ہیں نہ کہ لعنت؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ واقعہ قیامت میں ہوگا کہ کفار کو ان کے ہم مذہب بھی لعنت کریں گے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ کُلَّمَا دَخَلَتۡ اُمَّةٌ لَّعَنَتۡ اُخۡتَهَا۔ (اعراف: ۳۸) اور فرماتا ہے۔ ثُمَّ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یَكۡفُرُ بَعۡضُكُمۡ بِبَعۡضٍ وَ یَلۡعَنُ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا۔ (عنکبوت: ۲۵) دوسرے یہ کہ دنیا میں ہر کافر بھی جھوٹوں اور کافروں پر لعنت کرتا ہے مگر سمجھتا یہ ہے کہ میں کافر و جھوٹا نہیں اور چونکہ وہ خود کافر بھی ہے اور جھوٹا بھی۔ اس لئے وہ لعنت اس پر ہی پڑتی ہے۔ لہٰذا کافر پر سب کی لعنت ہوئی۔ تیسرے یہ کہ مومن ہی انسان ہیں۔ کفار جانوروں سے بدتر۔ لہٰذا مسلمانوں کی لعنت گویا سارے انسانوں کی لعنت ہے چوتھے یہ کہ یہاں الناس سے صرف مسلمان مراد ہیں اور اجمعین انسان اور ملائکہ کے لئے ہے نہ کہ انسان کے افراد کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار پر فرشتوں اور انسانوں سب کی لعنت ہے نہ کہ صرف انسانوں کی اور نہ صرف فرشتوں کی۔ **دوسرا اعتراض:** خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا۔ سے معلوم ہوا کہ کفار سب کی لعنت میں ہمیشہ رہیں گے تو کیا سب لوگ ہمیشہ لعنت کا وظیفہ پڑھیں گے اور دوسرا کام ہی نہ کریں گے؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ فیھا کا مرجع دوزخ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا مرجع لعنت کا اثر ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کا مرجع لعنت ہی ہے مگر اس لعنت کا بقا ایسے ہوگا کہ ہر وقت کچھ نہ کچھ انسان لعنت کرتے ہی رہیں گے۔ یعنی نوع انسان کی لعنت ہمیشہ رہے گی نہ کہ ہر فرد کی۔ مثلاً کہا جاتا ہے ہر وقت کعبہ کا طواف ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر شخص ہر وقت طواف کرتا رہتا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی جماعت طواف کرتی رہتی ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مغفرت کے لئے توبہ اور اصلاح عمل دونوں ضروری ہیں۔ تو جس شخص کو اخیر عمر میں توبہ نصیب ہو اور اسے اصلاح عمل کا موقعہ نہ ملے تو اس کی مغفرت نہ ہونی چاہیے۔ حالانکہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ غرغرے سے پہلے ہر گناہ کی توبہ مقبول ہے؟ **جواب:** ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ اصلحوا سے مراد اصلاحِ نفس بھی ہے اور اصلاح عمل بھی جسے اصلاح عمل کا موقعہ نہ ملے اس کے لئے اصلاح نفس ہی کافی ہے اور اصلاح نفس گذشتہ پر ندامت اور آئندہ گناہ سے بچنے کا عہد ہے

کیونکہ تکلیف بقدر طاقت ہے نہ کہ طاقت سے زیادہ۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ کی ف سے معلوم ہوا کہ اگر لوگ توبہ کریں تب تو خدا غفور رحیم ہے ورنہ نہیں تو کیا اس کے صفات شرائط پر موقوف ہیں کہ ہم توبہ کریں تو وہ غفور رحیم ہو ورنہ نہ ہو۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک وہ جو تفسیر میں گذر گیا کہ یہ ف تعلیلیہ ہے اور ان اللہ الخ پوشیدہ جملے کی علت اور وہ جملہ پوشیدہ شرط کی جزا ہے۔ یعنی فَيَغْفِرُ لَهُمْ فَاِنَّ اللّٰهِ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ دوسرے یہ کہ ف جزائیہ ہے اور غفور رحیم سے ان کا گناہ بخشنا اور ان پر رحم کرنا مراد ہے یعنی جو توبہ کرلے اللہ اس کے لئے غفور رحیم ہے۔ خلاصہ یہ کہ صفات اور ہیں افعال کچھ اور خدا کی صفتیں قدیم ہیں مگر ان کے تعلقات حادث۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت کے شانِ نزول سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت مرتد ہوگئی۔ جن میں حارث ابن سوید اور ان کے کچھ ساتھی دوبارہ اسلام لائے۔ باقی کفر پر قائم رہے اور مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سارے صحابہ متقی پرہیزگار ہیں۔ ان میں فاسق کوئی نہیں۔ اس واقعہ سے پتہ لگا کہ صحابہ فاسق تو کیا مرتد بھی ہوئے۔ (رافضی) **جواب:** صحابی وہ ہیں جو بحالت اسلام حضور علیہ السلام کی زیارت کریں اور اسلام پر ہی ان کا خاتمہ ہو۔ مرتد ہو کر مرنے والے صحابی نہیں کفار ہیں۔ نیز صحابہ کرام معصوم نہیں۔ عادل و متقی ہیں یعنی وہ گناہ پر اڑتے نہیں۔ اگر گناہ ہو جائے تو توبہ کر لیتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

گناہ حجاب ہیں۔ اور توبہ ان کی قینچی۔ نیک اعمال و اصلاح نفس اس قینچی کی دھار مضبوط حجاب کے پھاڑنے کے لئے نہایت تیز قینچی چاہیے۔ معمولی حجاب کے لئے معمولی قینچی کافی ہے۔ اسی طرح حجاب کفر پھاڑنے کے لئے خاص توبہ کی قینچی اور اس پر اصلاح نفس و اصلاح اعمال گذشتہ پر ندامات۔ آئندہ کے لئے عہد پرہیزگاری کی دھار ضروری ہے۔ اس آیت کریمہ میں اسی کا ذکر ہے کہ کفار کا عذاب نہایت سخت ہے لیکن توبہ اور اصلاح عمل و تزکیہ نفس ان سب کا دفعیہ ہے مگر مرد کامل کی نگاہ سب سے زیادہ تاثیر والی ہے کہ آن میں گنہگار کو پرہیزگار اور فساق و فجار کو صاحب اسرار بنا دیتی ہے۔ ان کی بات ان کی ملاقات گناہوں کو برباد کر دیتی ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کفار پر رب کی لعنت یہ ہے کہ ان کے دل سخت کر دیئے جاویں' ان کے کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہو جاویں کہ نہ کان حق سن سکیں نہ آنکھیں حق دیکھ سکیں۔ جیسے کہ نرم زمین میں دانہ بویا جاتا ہے۔ لوہا نرم کر کے کوٹا پیٹا جاتا ہے۔ آٹا پانی کے ذریعہ نرم کر کے روٹی وغیرہ بنتا ہے۔ مٹی پانی سے نرم ہو کر برتن وغیرہ بنتی ہے۔ سونا آگ سے نرم ہو کر زیور بنتا ہے۔ ایسے ہی انسان نرم دل ہو کر مومن عارف وغیرہ بن سکتا ہے۔ روئی میں جب تک سخت بنولہ موجود ہے نہ اس کا تار بنے نہ کپڑا وغیرہ۔ یونہی جب تک دل میں تکبر و کفر وغیرہ کی سختی ہے۔ انسان کچھ نہیں بن سکتا۔

حکایت: سری سقطی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن کہا۔ تعجب ہے اس ضعیف پر جو قوی کی مخالفت کرے۔ دوسرے دن جب میں نماز فجر سے فارغ ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خوبصورت مالدار نوجوان اپنے غلاموں کے ساتھ گھوڑے پر سوار مسجد میں آیا اور پوچھا تم میں سری سقطی کون ہیں۔ لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا' کل تم نے کہا تھا کہ اس کمزور سے تعجب ہے جو قوی کی مخالفت کرے۔ اس کا مطلب کیا میں نے کہا کہ انسان بہت کمزور ہے اور رب تعالیٰ قوی مگر اس کمزوری کے باوجود وہ رب تعالیٰ کی مخالفت کی ہمت کرتا ہے جوان بہت رویا اور بولا کہ کیا پروردگار مجھ

جیسے ڈوبے ہوئے کی بھی دستگیری کرے گا۔ میں نے کہا اے فرزند رب تعالیٰ کے سوا ڈوبتوں کو نکالنے والا کون ہے۔ وہ بولا اے سری مجھ پر لوگوں کے حقوق بہت ہیں۔ ان سے چھٹکارا کیسے پاؤں۔ میں نے کہا اگر تو رب تعالیٰ کو راضی کرلے تو خدا تیرے حق والوں کو تجھ سے راضی کر دیگا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن بعض اولیاء اللہ پر اہل حقوق دعویٰ کریں گے۔ فرشتے ان سے کہیں گے کہ اس اللہ کے بندے کو مت پریشان کرو۔ تمہارے حقوق اللہ کے ذمہ کرم پر ہیں۔ جاؤ اس سے وصول کرو۔ چنانچہ رب تعالیٰ ان سب کو بلند درجے دے کر ولی کے حقوق معاف کرا دے گا۔ یہ سن کر جوان بہت خوش ہوا اور بولا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے۔ میں نے کہا متوسطین کا راستہ روزے نماز اور گناہوں سے بچنا ہے اور اولیاء اللہ کا راستہ دنیوی تعلقات کا توڑنا اور رب تعالیٰ سے علاقہ عبدیت جوڑنا ہے۔ سالک پر لازم ہے کہ تمام گناہوں سے توبہ کرے اور اپنے دل کو مشاہدہ رب کے سوا کسی اور چیز میں مشغول نہ کرے۔ نیستی کے دوزخ پر گذر کر ہستی کے جنت تک پہنچ سکتے ہیں۔

بہشت　تن آسانی آنگاہ خوری　　کہ بر دوزخ نیستی بگذری

جب یہ باریک صراط طے کرو گے تب بارگاہِ قادر بے چون تک پہنچو گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ دنیا میں ایسے رہو جیسے مسافر یا راستہ گذرنے والا۔ اور اپنے آپ کو قبر والوں میں سے شمار کرو۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ بدن روح کے لئے ایسا ہے جیسے میت کے لئے قبر۔ جیسے میت قبر میں پہنچ کر اپنے کو بالکل مولیٰ کے سپرد کر دیتی ہے۔ رب تعالیٰ کے سوا کسی طرف توجہ نہیں کرتی۔ مال، اولاد، گھر بار سب سے منہ موڑ کر چل دیتی ہے۔ ایسے ہی بندہ کو لائق ہے کہ بدنی و قلبی آفتوں، جسمانی و روحانی بلاؤں اور دنیوی جھگڑوں سے دور رہے اور بارگاہِ یار کا طواف کرے۔ تھوڑے گناہ کو بہت سمجھے۔ سیلاب کی ابتداء قطرے سے ہے اور گناہوں کی ابتداء خطرے سے ہے۔ اس قطرہ اور خطرہ سے بچو۔ جیسے سیلاب روکنے کے لئے مضبوط دیوار بناتے ہو۔ ایسے ہی گناہوں کا سیلاب روکنے کے لئے اپنے قلب کے آس پاس توبہ کی دیوار قائم کرو۔ دنیا کو آخرت کا وسیلہ بناؤ اور رب سے رب ہی کو مانگو (روح البیان) ہمیشہ توبہ کرتے رہو توبہ گناہ کی توڑ ہے۔ جیسے اینٹ توڑنے کے لئے بسولی ہے۔ حق تعالیٰ اس قال کو حال بنا دے۔ یہ چیزیں ہمارے لئے مشکل ہیں مگر وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ (ابراہیم: ۲۰)

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ
تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا پیچھے ایمان اپنے کے پھر زیادہ کیا انہوں نے کفر کو ہرگز نہ قبول کی جائے گی توبہ ان کی
بے شک وہ جو ایمان لا کر کافر ہوئے پھر اور کفر میں بڑھے ان کی ہرگز توبہ قبول نہ ہوگی
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ
اور یہ لوگ وہ ہی ہیں گمراہ تحقیق وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے حالانکہ وہ کافر ہیں پس ہرگز نہ قبول کیا جائے گا
اور وہی ہیں بہکے ہوئے وہ جو کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ان میں سے کسی سے
مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ

ایک سے ان میں سے بھر کر زمین سونا اگرچہ فدیہ دے وہ اس کا یہ لوگ ہیں کہ واسطے ان
زمین بھر سونا ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ اپنی خلاصی کو دے ان
عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾
کے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے واسطے ان کے کوئی مددگار
کے لئے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یار نہیں

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں توبہ کا ذکر تھا۔ اب توبہ مردود کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** کفار تین قسم کے ہیں۔ ایک وہ جنہیں رب تعالیٰ کے فضل سے توبہ مقبول نصیب ہو جائے۔ دوسرے وہ جو توبہ کریں مگر توبہ مردود۔ تیسرے وہ جنہیں توبہ نصیب ہی نہ ہو اور بغیر توبہ مر جائیں۔ پچھلی آیت میں پہلی جماعت کا ذکر تھا۔ اب لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ میں دوسری جماعت کا اور وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ میں تیسری جماعت کا ذکر ہے۔ گویا مجرمین کا ترتیب وار ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں گناہ مٹانے والی دوا یعنی توبہ کا ذکر تھا۔ اب توبہ برباد کرنے والے گناہوں کا ذکر ہے۔ گویا بعض گناہ وہ ہیں جو توبہ سے مٹتے ہیں اور بعض وہ جو توبہ کو مٹاتے ہیں۔ پہلی قسم کا ذکر پہلی آیت میں ہوا۔ اور دوسری کا ذکر اب ہے۔

شان نزول

یہود نے موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ پھر کفر میں یہاں تک بڑھے کہ سید الانبیاء ﷺ اور قرآن کریم کے بھی منکر ہوئے ان کے حق میں پہلی آیت هُمُ الضَّآلُّوْنَ تک اتری (خازن وخزائن عرفان) (۲) یہود اور عیسائیوں نے حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے لوگوں میں آپ کی نبوت کا اعلان کیا پھر آپ کو دیکھ کر کافر ہوئے اور پھر کفر میں اتنے بڑھے کہ حضور ﷺ کے معجزات اور قرآن کریم کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ ان سب کے متعلق یہ پہلی آیت هُمُ الضَّآلُّوْنَ۔ تک اتری (تفسیر خزائن عرفان وخازن وروح المعانی) (۳) ابو صالح سوئی اصبہانی فرماتے ہیں کہ جب حارث ابن سوید کے ساتھیوں نے دیکھا کہ حارث مرتد ہونے کے بعد مسلمان ہو گئے اور ان کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے سوچا کہ اسلام کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ جب تک دل چاہے کافر رہو۔ اور جب دل چاہے مسلمان ہو جاؤ۔ جب ہم دوبارہ مسلمان ہوں گے تو حارث کی طرح ہمارے بارے میں بھی یہ آیتیں اتریں گی۔ ان کے حق میں دوسری آیت وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ تک نازل ہوئی۔ چنانچہ فتح مکہ کے دن حارث کے ساتھیوں میں سے بعض اسلام لے آئے۔ جن کی توبہ قبول ہوئی اور بعض بحالت کفر ہی مرے۔ (تفسیر خازن و روح المعانی) (۴) بعض علماء نے فرمایا کہ حارث ابن سوید کے کچھ ساتھیوں نے کفر و اسلام کو کھیل سمجھ رکھا تھا کہ کبھی کافر ہو جاتے کبھی مسلمان۔ ان کے بارے میں پہلی آیت اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الضَّآلُّوْنَ تک اتری۔ (روح المعانی)

تفسیر

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ۔ ظاہر یہ ہے کہ کفروا سے مراد ارتداد ہے۔ اور ایمان سے مراد شرعی ایمان ہے یعنی اسلام اور یہ آیت سارے مرتدین کے لئے ہے کہ اگرچہ شانِ نزول خاص ہے مگر عبارت عام اور عبارت کے عموم کا لحاظ ہوتا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا یعنی جو لوگ مسلمان ہو کر کافر ہو جائیں اور ممکن ہے الذین سے یہود مراد ہوں اور کفروا سے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل شریف کا انکار مراد ہو۔ اور ایمان سے موسیٰ علیہ السلام کا ماننا مقصود یعنی یہودی جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہو گئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الذین سے سارے اہل کتاب مراد ہوں خواہ یہودی ہوں یا عیسائی۔ اور کفروا سے حضور ﷺ اور قرآن پاک کا انکار مراد ہو اور ایمان سے ان کا وہ ایمان مراد ہو جو انہیں حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے حاصل تھا کہ لوگوں کو حضور علیہ السلام کی خوشخبریاں دیتے تھے۔ یعنی وہ اہل کتاب جو پہلے آپ کو مان کر لوگوں کو آپ کی خوشخبریاں دے کر آپ کے منکر ہو گئے۔ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا۔ ثم حرف عطف ہے اور ازْدَادُوْا كُفْرًا کفروا پر معطوف۔ ثم کی تراخی رتبی ہے کیونکہ زیادتی کفر کفر سے بدرجہا بدتر ہے اور ممکن ہے کہ تاخیر زمانی ہو کہ زیادتی کفر کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ازدادوا باب افتعال کا ماضی ہے جس کا مصدر ازدیاد ہے۔ ازدادوا اصل میں ازتادوا تھا چونکہ پہلے ز ہے اس لئے ت کو دال سے بدل دیا۔ یہاں افتعال زیادتی کے لئے ہے۔ عجیب لطف ہے کہ ازدادوا کا مادہ بھی زیادتی ہے اور باب بھی زیادتی کا مفید یعنی انہوں نے خوب کفر بڑھایا۔

زیادتی کفر میں چند احتمال ہیں (۱) ایک یہ کہ حقانیت اسلام کا انکار کفر ہے اور اس پر مرتے دم تک قائم رہنا زیادتی کفر۔ (۲) دوسرے یہ کہ اسلام کا نہ ماننا کفر اور اس پر طعن کرنا۔ اس کے احکام میں خرابیاں نکالنا زیادتی کفر۔ (۲) دوسرے یہ کہ اسلام کا نہ ماننا کفر اور اس پر طعن کرنا۔ اس کے احکام میں خرابیاں نکالنا زیادتی کفر۔ (۳) تیسرے یہ کہ اسلام کا نہ ماننا کفر اور لوگوں کو اسلام سے روکنا زیادتی کفر۔ (۴) چوتھے یہ۔ مرتد ہونا کفر اور پھر اسلام کو ہلکا سمجھنا کہ جب چاہیں گے مسلمان ہو جائیں گے۔ اسلام کوئی بڑی چیز نہیں۔ یہ زیادتی کفر ہے۔ (۵) پانچویں یہ کہ حضور علیہ السلام کا انکار کفر۔ پھر قرآنی آیات اور حضور علیہ السلام کے معجزات کا انکار زیادتی کفر ہے۔ (۶) چھٹے کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل شریف کا انکار کفر۔ پھر حضور ﷺ اور قرآن پاک کا انکار زیادتی کفر (۷) ساتویں یہ کہ ایک بار مرتد ہونا کفر اور بار بار اسلام لا کر مرتد ہو جانا زیادتی کفر (۸) آٹھویں یہ کہ اسلام کا انکار کفر اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرنا زیادتی کفر۔ غرضکہ جیسے کفر کے بعد ایمان میں بہت احتمال تھے ایسے ہی زیادتی کفر میں بہت احتمال ہیں۔ اور زیادتی کفر کے ہر احتمال کو کفر کے بعد ایمان کے مناسب احتمال کے ساتھ ملانا چاہیے۔ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ یہ جملہ الذین کفروا کی خبر بمعنی جزا ہے چونکہ کفر بعد ایمان اور زیادتی کفر توبہ قبول نہ ہونے کا مستقل سبب نہیں۔ بہت صورتوں میں زیادتی کفر کے بعد بھی توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس پر ف نہ لائی گئی۔ لن تقبل سے یا شرعاً توبہ قبول نہ ہونا مراد ہے۔ یا اللہ کے نزدیک۔ ھم کا مرجع الذین کفروا ہے۔ یعنی جنہوں نے یہ دو جرم کئے کہ بعد ایمان کافر ہوئے اور پھر اپنے کفر کو بڑھالیا۔ ان کی سزا یہ ہے کہ ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی یا تو اس کے لئے انہیں توبہ کی توفیق ہی نہ ملے گی۔ اور وہ توبہ کریں گے ہی نہیں۔ پھر قبول کیا چیز ہو۔ یا اس لئے کہ یہ لوگ دل سے نہیں بلکہ منافقت سے

زبانی توبہ کرتے ہیں۔ قبول کیسے ہو۔ یا اس لئے کہ نزع کے وقت توبہ کرتے ہیں۔ یا اس لئے کہ وہ کفر سے توبہ کرتے نہیں۔ زیادتی کفر یا گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور کفر کے ہوتے ہوئے گناہوں سے توبہ کیسی۔ ان سب صورتوں میں عنداللہ توبہ مردود ہے۔ یا اس لئے کہ وہ بارہا کفر کر کے توبہ کر چکے۔ یا اس لئے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی توہین کی ہے۔ اور توہین کی توبہ قبول نہیں۔ ان صورتوں میں شرعاً مردودیت مراد ہے۔ (از معانی و کبیر و خازن وغیرہ) وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الضَّآلُّوْنَ۔ یہ یا تو دوسری سزا ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُھُمْ پر معطوف۔ یا توبہ قبول نہ ہونے کی علت ہے۔ اور ان الذین پر معطوف۔ تب یہ جملہ مستقل ہے۔ (روح المعانی) یعنی ان کافروں کی دوسزائیں ہیں۔ ایک ان کی توبہ قبول نہ ہونا کہ رب تعالیٰ کو کیسے راضی کرنا چاہیے۔ ھم سے حصر کا فائدہ ہوا۔ اور الضآلون سے کامل گمراہ مراد ہیں۔ یعنی کامل گمراہ صرف یہ ہی لوگ ہیں۔ دیگر کفار اگرچہ گمراہ ہیں مگر ان سے کم درجہ کے۔ ناقص توبہ کرنے والوں کے بعد اب ان بدنصیبوں کا ذکر ہے جنہیں ظاہری توبہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ۔ یہاں بھی کفروا سے یا مرتدین مراد ہیں یا اہل کتاب یا عام کفار زیادہ قوی یہ ہی ہے کہ کفر دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو حضرت آدم علیہ السلام سے قیامت تک کفر ہے۔ جیسے شرک یا توہین نبی یا فرشتوں وغیرہ کا انکار اور بعض وہ جو کبھی ایمان تھے کبھی کفر بن گئے۔ جیسے بہن سے نکاح کا جواز ماننا شریعت حضرت آدم میں ایمان تھا۔ زمانہ نوحی سے کفر بن گیا۔ یا شراب وغیرہ کی حلت یا پچھلے نبیوں کے خصوصی مسائل جو اپنے اپنے زمانوں میں حق تھے۔ اب منسوخ ہو جانے کے بعد باطل ہو گئے اور ان کا ماننا کفر قرار دیا گیا۔ وماتوا کا واؤ عاطفہ ہے اور ماتوا کفروا پر معطوف وھم کفار کا واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ مَاتُوْا کے فاعل سے حال یعنی جو کافر ہوئے اور کافر ہی مر گئے۔ اس طرح کہ انہوں نے کفر سے توبہ کی ہی نہیں۔ لوگ چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو مومن جیسے مومن مرے دوسرے وہ جو کافر مرے۔ کہ تیسرے خواہ مومن جئے ہوں یا کافر اور کفر پر مرنے سے مراد یہ ہے کہ غرغرہ کے وقت تک کافر ہے۔ ورنہ بحالت غرغرہ سارے کافر ایمان لے آتے ہیں۔ اگرچہ غرغرہ کے وقت کا ایمان مقبول نہیں۔ لہٰذا آیت پر اعتراض یہ نہیں ہو سکتا کہ مرتے وقت کوئی کافر نہیں ہوتا۔ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِھِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَھَبًا۔ یہ جملہ الذین کفروا کی خبر بمعنی جزا ہے اور چونکہ کفر پر موت فدیہ قبول نہ ہونے کی مستقل علت تھی۔ ممکن نہیں کہ کافر کا فدیہ قبول ہو کر اس کی بخشش ہو جائے اس لئے یہاں ف لائی گئی۔ احدھم سے اس جانب اشارہ ہے کہ کفار کی جماعت نہیں بلکہ اگر ان میں سے ہر ایک زمین بھر سونا دے تو قبول نہ ہو۔ ملء الارض۔ لن یقبل کا نائب فاعل ہے اور ارض سے مراد ساری زمین ہے از مشرق تا مغرب از جنوب تا شمال۔ ذھبًا ملء الارض کی تمیز ہے۔ یعنی ان میں سے کسی کا زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا کہ وہ دے کر اپنے کو عذاب سے چھڑا لے۔ وَلَوِ افْتَدٰی بِہٖ۔ یہ واؤ وصلیہ ہے اور لو شرطیہ۔ ابن منیر کہتے ہیں کہ واؤ وصلیہ درحقیقت عاطفہ ہے۔ اس سے پہلے ایک عبارت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اور واؤ کا مابعد اس کا معطوف ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کہے کہ تو زید کی تعظیم کر اگرچہ وہ تیرے ساتھ برائی کرے یعنی بھلائی کرے تو بھی اور برائی کرے تو بھی۔ بہرحال تعظیم کر۔ ایسے ہی یہاں ہے کہ دنیا میں صدقہ کرے تو بھی مردود اور آخرت میں فدیہ دے تو بھی مردود۔ افتدیٰ فدیہ سے بنا جس کی تفسیر ہم پہلے سیپارہ میں کر چکے۔ بہ کا مرجع یا ذھبًا ہے یا ملء الارض (روح المعانی) اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۔ یہ اگرچہ مستقل

جملہ ہے مگر الذین کے جزاؤں سے ایک جزا ہے۔ عذاب اور الیم کے معنی بار ہا بیان ہو چکے۔ وَمَا لَهُمْ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ پر معطوف ہے۔ اور من نٰصرین کی من زائدہ ہے۔ بعد نفی استغراق کا فائدہ دیتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ من استغراقیہ صرف واحد پر آتا ہے جمع پر نہیں۔ یہاں ناصرین صورتاً جمع اور معناً واحد ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا ایک بھی مددگار نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ تین مددگار نہیں ایک یا دو ہو سکتے ہیں۔ محض وزن کی مناسبت سے ناصرین جمع فرمایا گیا کہ اس سے پہلے خٰسرین اجمعین رحیم پر آیتیں ختم ہوئی تھیں۔ اگر مِنْ نَاصِر فرمایا جاتا تو آیت کی خوبی جاتی رہتی مگر صحیح یہ ہے کہ من استغراقیہ واحد پر بھی آتا ہے اور جمع پر بھی۔ اور یہاں ناصرین لفظاً معناً ہر طرح جمع ہے۔ (روح المعانی) اور انشاء اللہ اس سوال کا جواب اعتراض و جوابات میں دیا جائے گا۔

خلاصہ تفسیر

جو لوگ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہوئے پھر اس نبی آخر الزمان ﷺ کے منکر ہو کر اپنے کفر کو اور بڑھا بیٹھے۔ یا جو لوگ نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے انہیں مان کر پہچان کر ان کی خوشخبریاں دے کر ان کے تشریف لانے پر منکر ہو گئے پھر ان کے قرآن ان کے معجزات کا انکار کر کے اپنے کفر میں اور بڑھ گئے۔ عند اللہ ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی اور یہ ہمیشہ گمراہ رہیں گے یا تو اس لئے کہ انہیں توبہ کی توفیق ہی نہ ملے گی یا اس لئے کہ ان کی توبہ شرائط قبول سے خالی ہے اور وہ لوگ جو کافر ہو کر کافر ہی مر گئے۔ انہیں توبہ کی توفیق نہ ملی اگر دنیا میں زمین بھر سونا خیرات کریں یا قیامت کے دن زمین بھر سونا فدیہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کریں اور یہ چاہیں کہ مال دے کر جان وبال سے بچ جائے یہ بھی قبول نہ کیا جائے گا۔ ان لوگوں کے لئے سخت عذاب ہے۔ اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔ اس لئے چاہیے کہ وقت پر توبہ کریں۔ خیال رہے کہ دنیا میں انسان مصیبت کے موقعہ پر سب کچھ دے دینے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ایک مقدمہ لگ جائے تو گھر بیچ کر اس میں خرچ کر دیتا ہے۔ کوئی لاعلاج بیماری پیچھے پڑ جائے تو کہتا ہے کہ چاہے میری تمام جائیداد حکیم لے لے مجھے اچھا کر دے۔ عذاب الٰہی کا تو پوچھنا کیا وہاں جو عذاب میں گرفتار ہوگا وہ پچاس زمینوں بھر سونا دینے پر بھی آمادہ ہو جائے گا۔ مال کی محبت اسی وقت تک ہے جب تک کہ مزاج درست ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مرتد کے احکام کافر اصلی سے سخت تر ہیں۔ جیسا کہ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ سے معلوم ہوا۔ **دوسرا فائدہ:** کفر میں زیادتی کمی ہوتی ہے جیسا کہ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا سے معلوم ہوا مگر یہ زیادتی کیفیت کی ہوگی۔ بعض اہل دل کہتے ہیں کہ جتنا سخت انکار اتنا ہی سخت کفر اور جس قدر اعلیٰ چیز کا انکار اسی قدر اعلیٰ درجہ کا کفر۔ موسیٰ علیہ السلام کے منکر بھی کافر اور عیسیٰ علیہ السلام کے منکر بھی۔ مگر خاتم النبیین ﷺ کا منکر سخت کافر ہے۔ کیونکہ اس نے بہت بڑی ذات کا انکار کیا۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرا فرعون یعنی ابو جہل فرعونِ موسیٰ سے سخت تر ہے یا تو انکار میں سخت ہے یا اس لئے کہ خاتم النبیین ﷺ کا منکر ہوا۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی امت سے امت مصطفیٰ ﷺ افضل۔ ایسے ہی موسیٰ علیہ السلام کے منکر سے حضور علیہ السلام کا منکر اکفر (بڑا کافر) **تیسرا فائدہ:** بعض وہ لوگ بھی ہیں جن کی

توبہ قبول نہیں جیسا کہ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ سے معلوم ہوا۔ اس کی نفیس تحقیق تفسیر میں ہو چکی۔ **مسئلہ:** شامی باب المرتدین میں ہے کہ گیارہ شخصوں کی توبہ قبول نہیں۔ (۱) جو بار بار مرتد ہو جائے۔ (۲) حضور علیہ السلام کی توہین کرنے والا۔ (۳) صدیق اکبر فاروق اعظم میں سے کسی کو گالیاں دینے والا۔ (۴) جادوگر (۵) زندیق (جس کا کوئی دین نہ ہو) (۶) خناق (جو لوگوں کو گلا گھونٹ کر مار ڈالتا ہو) (۷) کاھن (نجومی جو غیب کی خبریں دے) (۸) ملحد (وہ مدعی اسلام جو کفری عقائد کو اسلام بتائے۔ (۹) اباحی (جو ہر چیز کو حلال جانے) (۱۰) منافق (۱۱) ضروریات دین کا دل میں منکر اور زبان سے مدعی۔ خیال رہے کہ ان میں سے بعض کفار ہیں۔ بعض مرتدین اور بعض گنہگار ایسے ہی ڈاکو اہل ہوا۔ زانی' چور' شرابی وغیرہ کی توبہ قبول نہیں۔ یعنی یہ لوگ توبہ کر کے سزاؤں سے نہیں بچ سکتے مگر ان کی توبہ شرعاً نامقبول ہے نہ کہ عند اللہ **چوتھا فائدہ:** جو توبہ شرائط قبول سے خالی ہو وہ اللہ کے نزدیک نامقبول ہے۔ **پانچواں فائدہ:** کفر پر موت دائمی عذاب کا سبب ہے۔ جو کوئی مومن ہو کر مرے۔ زندگی میں کافر رہے' ناجی ہے۔ جیسا کہ وَمَا تُوا وَهُمْ كُفَّارٌ۔ سے معلوم ہوا۔ **چھٹا فائدہ:** قیامت میں فدیہ قبول نہ ہونا اور مددگار نہ ہونا کافروں کے لئے خاص ہے۔ انشاء اللہ مسلمان کا فدیہ بھی قبول ہوگا اور اس کی نیکیاں صدقات گناہوں کا کفارہ بنیں گے اور مسلمان کے مددگار بھی بہت ہیں۔ انبیاء اولیاء و علماء وغیرہ جیسا کہ وَمَالَهُمْ مِنْ نّٰصِرِيْنَ۔ اور مِنْ اَحَدِهِمْ۔ سے معلوم ہوا۔

لطیفہ: دیوبندی وہابی کہتے پھرتے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ ان سے کہنا چاہیے کہ بے شک کافروں کے لئے رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (بقرہ: ۲۷۰) اور فرماتا ہے وَمَالَهُمْ مِنْ نّٰصِرِيْنَ۔ مسلمانوں کے لئے رب تعالیٰ نے بہت مددگار پیدا فرمائے۔ خود فرماتا ہے۔ وَاَلْحَقْنٰهُمْ ذُرِّيَّتَهُمْ بِاِيْمَانٍ۔ (طور: ۲۱) ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء نہیں سنتے۔ ان سے کہہ دو بے شک وہ تمہاری نہیں سنتے ہماری سنتے ہیں۔ دشمنوں کی کوئی نہیں سنتا نہ انہیں کوئی دیکھے۔ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ۔ (آل عمران: ۷۷) خود رب تعالیٰ فرمائے گا اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ۔ (مومنون: ۱۰۸) وہیں پڑے رہو بات مت کرو۔ نیز یہ کہتے ہیں کہ کفنی لکھنا قبر پر اذان تلقین دعا بعد نماز جنازہ حرام ہے۔ کہہ دو کہ تمہیں تو کفن دینا اور تم پر نماز جنازہ پڑھنا بھی حرام ہے کیونکہ یہ چیزیں مسلمانوں کے لئے ہیں نہ کہ کفار کے لئے۔ اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو۔ **ساتواں فائدہ:** کافر کی توبہ گناہ نامقبول ہے۔ اسے چاہیے کہ پہلے کفر سے توبہ کرے پھر گناہوں سے جیسا کہ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ کی ایک تفسیر سے معلوم ہوا۔ **آٹھواں فائدہ** ہر کافر شرعی احکام کا مکلف ہے۔ اس پر واجب ہے کہ مسلمان ہو کر نماز پڑھے۔ قیامت میں کفر کا بھی عذاب پائے گا۔ اور نماز وغیرہ نہ پڑھنے کا بھی۔ یہ بھی لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ کی اسی تفسیر سے معلوم ہوا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب جنتی جہنمی سے پوچھیں گے۔ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ۔ (مدثر: ۴۲) تمہیں دوزخ میں کون چیز لائی تو وہ جواب دیں گے۔ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَ لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۔ الخ (مدثر: ۴۴) **نواں فائدہ:** کافر کی نیکیاں مردود ہیں جیسا کہ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ۔ سے معلوم ہوا کیونکہ اس کے معنے ایک یہ بھی ہیں کہ اگر کافر نے زندگی میں زمین بھر سونا خیرات کیا ہو تو بھی مردود اور فدیہ دے تو بھی نامقبول (کبیر) **دسواں فائدہ:** شفاعت برحق ہے۔ کفار کیلئے فرمایا گیا کہ ان کا کوئی مددگار نہیں

اور شفاعت بھی ایک مدد ہی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی نفی بھی کافروں سے خاص ہے۔ (کبیر)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اَزْدَادُوْا کُفْرًا۔ سے معلوم ہوا کہ کفر میں زیادتی کی ہوتی ہے اور عقائد کا مسئلہ یہ ہے کہ ایمان و کفر میں زیادتی کی ناممکن۔ پھر ان دونوں میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** کفر کی نوعیت' کیفیت' حیثیت اور وقت میں زیادتی کی ہوتی ہے۔ وہ ہی اس آیت کا مطلب ہے۔ رب تعالیٰ کا انکار رسول اکرم ﷺ کا انکار کتاب کا انکار یہ مختلف نوعیتوں کے کفر ہیں۔ ایسے ہی سخت انکار' ہلکا انکار کفر کی کیفیت ہے۔ ایک دن انکار' عمر بھر انکار زمانہ کفر کی مقدار ہیں۔ ایک آیت کا انکار اور ساری آیتوں کا انکار یہ کفر کی حیثیتیں ہیں۔ ان میں زیادتی کی ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہے۔ ابو طالب اور ابو جہل کا یکساں حال نہیں لیکن کفر کی مقدار اور کمیت میں زیادتی کی ناممکن۔ ایک آیت کا منکر بھی ویسا ہی کافر ہے جیسا کہ پورے قرآن کا منکر۔ کوئی بھی آدھا یا پاؤ کافر نہیں۔ سب پورے ہی کافر ہیں۔ یہ ہی علم عقائد کے مسئلہ کا مطلب ہے۔ لہٰذا اس آیت میں اور اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ مرتد کی توبہ قبول ہے کہ فرمایا گیا۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس کی توبہ قبول ہی نہیں کہ فرمایا گیا لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ نیز بے شمار مرتدین مسلمان ہوئے اور ہوتے میں کسی کو اسلام سے روکا نہ گیا۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ **جواب:** اس کے چند جواب تفسیر میں گذر گئے۔ (۱) یا تو اس توبہ سے توبہء گناہ مراد ہے جو کفار دن رات کرتے ہیں۔ کافر کی توبہ گناہ مردود ہے۔ پہلے مسلمان ہو پھر گناہ معاف ہوں گے۔ (۲) یا ان کا ایمان یاس یعنی نزع کے وقت کی توبہ مراد ہے۔ یعنی ملائکہ عذاب کو دیکھ کر اسلام لانا قبول نہیں۔ (۳) یا منافقت کی توبہ مراد ہے کہ دل میں کفر ہو اور بظاہر توبہ کرلے۔ (۴) یا بار بار مرتد کی توبہ مراد ہے۔ جو چند بار مرتد ہو اور بار بار مسلمان۔ اس کی توبہ شرعاً قبول نہیں۔ قاضی قتل کرائے گا۔ (۵) یا ایسی توبہ مراد ہے جو شرائط قبول سے خالی ہو۔ (۶) یا یوں کہو کہ یہ قضیہ سالبہ ہے جو دو طرح صادق آتا ہے۔ موضوع نہ ہونے سے اور محمول ثابت نہ ہونے سے یہاں پہلی صورت مراد ہے کہ توبہ کریں گے ہی نہیں۔ پھر قبول کیا چیز ہو۔ (۷) یا روز قیامت کی توبہ مراد ہے کہ کفار وہاں کفر سے توبہ کریں گے مگر نامقبول۔ اس کی تفسیر وہ آیت ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ (النساء: ۴۸) اس سے وہ شرک و کفر مراد ہے جس سے دنیا میں توبہ نہ کی جاوے۔ ورنہ توبہ سے شرک و کفر ضرور معاف ہوتا ہے۔ (۸) یا اَزْدَادُوْا کُفْرًا۔ سے نبی ﷺ کی توہین مراد تھی۔ اس کے بارے میں فرمایا گیا۔ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ یعنی اس توہین سے توبہ قبول نہ ہوگی کیونکہ قاضی کے نزدیک نبی علیہ السلام کے گستاخ کی توبہ قبول نہیں۔

تیسرا اعتراض: تمہاری ایک تفسیر سے معلوم ہوا کہ اگر کفار اپنی زندگی میں زمین بھر سونا خیرات کریں تو بھی قبول نہیں اور نہ انہیں آخرت میں اس کا ثواب اور قرآن کریم بھی فرماتا ہے۔ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۔ (فرقان: ۲۳) حالانکہ تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ کفار کو بعض نیکیوں کا فائدہ مل جاوے گا۔ چنانچہ نوشیرواں کو عدل کی وجہ سے اور حاتم طائی کو سخاوت کی وجہ سے عذاب ہلکا ہوگا۔ ابولہب کو حضور ﷺ کی ولادت کی خوشی منانے اور ابو طالب کو حضور ﷺ کی خدمت کی وجہ سے عذاب ہلکا ہوتا ہے۔ تمہاری یہ تفسیری تمہارے عقیدے کے خلاف ہے؟ **جواب:** اس آیت کریمہ میں کفار کے عذاب سے بچ جانے

اور جنت میں پہنچ جانے کی نفی ہے اور احادیث میں تخفیف عذاب کا ثبوت لہٰذا آیات واحادیث میں تعارض نہیں۔ ملزم کو جیل سے رہا کر دینا اور ہے اور سی کلاس سے بی کلاس میں منتقل کر دینا کچھ اور بعض کفار کا عذاب بعض نیکیوں کی وجہ سے ہلکا ہو جاوے گا مگر ختم نہ ہو گا۔ **چوتھا اعتراض:** تمہاری گفتگو سے معلوم ہوا کہ نبی کے گستاخ اور بار بار مرتد ہونے والے جادوگر وغیرہ کی توبہ قبول نہیں مگر دوسری آیت میں ارشاد ہوا۔ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ (النساء: ۴۸) کفر کے سوا سارے گناہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا۔ نیز نبی کریم ﷺ نے اپنے دشمنوں گستاخوں بدگویوں کا اسلام قبول فرمایا۔ ان کی توبہ منظور ہوئی۔ اگر گستاخ نبی کی توبہ مردود ہوتی تو ابوجہل وغیرہ کو دعوت اسلام کیوں دی جاتی اور حضرت عکرمہ اور ابو سفیان کی بیوی ہندہ کا ایمان کیوں قبول ہوتا (بعض بے علم) **جواب:** اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی توبہ قاضی کے نزدیک قبول نہیں کہ یہ لوگ توبہ کر کے شرعی سزا سے نہیں بچ سکتے اور چونکہ حضور ﷺ خود صاحب حق ہیں۔ لہٰذا اپنے گستاخ کو معافی دے سکتے ہیں۔ قاضی اسلام حضور علیہ السلام کے گستاخ کو معاف نہیں کر سکتا۔ دیگر حقوق العباد کا بھی یہ ہی حال ہے کہ خود صاحب حق معاف کرے نہ کہ قاضی۔ خیال رہے کہ نبی کے گستاخ کا اسلام قبول ہے۔ رہی سزا' یہ دوسری وجہ سے ضرور ہو گی۔ لہٰذا اب بھی گستاخانِ رسول کو دعوتِ اسلام دی جائے گی اور پہلے بھی دی گئی اور جب وہ مسلمان ہو جائیں تو ان پر احکام اسلام جاری ہوں گے مگر سزائے توہین سے نہیں بچ سکتے۔ (درمختار باب المرتدین) **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کافر کا زمین بھر سونا فدیہ میں قبول نہ ہو گا تو اس دن کفار کے پاس مال کہاں ہو گا کہ وہ پیش کریں اور وہ رد کیا جاوے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہ فرضی اور تقدیری صورت ہے کہ اگر فرض کرو کافر کے پاس اتنا سونا ہو اور وہ اس سے فدیہ ادا کرنا چاہے تو منظور نہ ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ رب تعالیٰ ہلکے عذاب والے کافر سے فرمائے گا کہ اگر آج تیرے پاس دنیا بھر کی دولت ہوتی تو تو وہ سب عذاب کے فدیہ میں دے دیتا۔ وہ عرض کرے گا' ہاں رب تعالیٰ فرمائے گا کہ دنیا میں ہم نے تجھ سے بہت سہل چیز طلب فرمائی تھی کہ تو شرک نہ کر تو نہ مانا (بخاری و مسلم) گویا یہ حدیث اس آیت کی تفسیر ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے دنیاوی صدقات و خیرات مراد ہیں کہ کفار کے دنیاوی صدقات و خیرات خواہ زمین' بھر سونا ہوں قبول نہ ہوں گے۔ (خازن و کبیر) کیونکہ کفار کی اطاعت مردود ہے۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت میں فرمایا گیا۔ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۔ کفار کے لئے بہت سے مددگار نہیں تو کیا ان کے ایک دو مددگار ہوں گے۔ یہاں جمع کی نفی ہے نہ کہ ہر فرد کی؟ **جواب** من استغراقیہ کی وجہ سے افراد ناصر کی نفی ہوئی نہ کہ جماعت ناصرین کی یعنی یہ عموم سلب ہے نہ کہ سلب عموم ہے کہ من استغراقیہ نے ناصرین کو عام کیا اور ما نے اس عام کی بطریق عموم نفی کی۔ دوسرے یہ کہ ناصرین سے مددگاروں کے اقسام مراد ہیں یعنی ان کے لئے انبیاء' اولیاء' شہداء' علماء' نابالغ بچے اعمال صالح کوئی مددگار نہ ہو گا۔ گویا جمیعت انواع کے لئے ہے۔ تیسرے یہ کہ لہم بھی جمع اور ناصرین بھی جمع اور جب جمع کے لئے جمع آوے تو تقسیم افراد ہو جاتی ہے کہ اس جمع کی ہر فرد دوسری جمع کی ہر فرد کے لئے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے لوگ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے یعنی ہر ایک آدمی ایک گھوڑے پر۔ اب آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ کسی کافر کے لئے کوئی مددگار نہیں۔ **ساتواں اعتراض:** لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ سے معلوم ہوا کہ صرف کفار کو تکلیف دہ عذاب ہو گا تو کیا گنہگار مسلمانوں کو عذاب کی

تکلیف نہ ہوگی۔ جہنم تو سب ہی کے لئے تکلیف دہ ہے مسلمان ہو یا کافر؟ **جواب:** بے شک انتہائی تکلیف صرف کفار کو ہوگی کہ نہ انہیں وہاں موت آئے نہ کبھی اس سے نجات ملے اور عذاب کے ساتھ رسوائی لعن طعن بھی ہو۔ مسلمان بعض تو دوزخ میں جاتے ہی مر جائیں گے پھر زندہ کرکے بہشت میں بھیجے جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے جب جان نکل گئی تو تکلیف کیسی۔ اور جو زندہ رہیں گے وہ بھی آخر کار نجات پائیں گے۔ اور رسوائی سے محفوظ رہیں گے۔ ان پر لعن طعن نہ ہوگا۔ نیز ان کا عذاب بمقابلہ کفار کے ہلکا ہوگا۔ اتنی تکالیف کا اجتماع کہ جان نہ نکلے عذاب دائمی ہو۔ وغیرہ وغیرہ کفار کے ساتھ خاص ہے۔ باقی مصیبت فانی سے سخت تر ہے۔ دنیا کے انقلابات رنج و غم' تندرستی' بیماری' فقر و غنا' جوانی' بڑھاپا' غافل کو جگانے والی چیزیں ہیں جو شخص ان میں سے کسی چیز سے نہ جاگے کافر غافل جئے اور کفر یا غفلت پر مرے اس کا زمین بھر سونا بھی فدیہ نہیں بن سکے گا کہ اس نے وقت نکال دیا۔

تفسیر صوفیانہ

جب دل سے نور نکل جائے اور ظلمت وہاں گھر کرے تو پھر اس کا کوئی عمل قبول نہیں' نہ توبہ نہ کوئی اور چیز اس لئے کہ مقبولیت نورانیت سے ملتی ہے اور وہ اس سے خالی۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اس دنیا کی ہر چیز مادی اور تاریک اور فانی ہے اور اس عالم کی ہر چیز نورانی اور باقی ہے کیونکہ وہ عالمِ انوار اور عالمِ بقا ہے۔ اور یہ عالم ظلمت اور عالم فنا۔ ریاء کے روزے' نماز منافق کا کلمہ پڑھنا مادی چیزیں ہیں کہ یہ نور سے خالی ہیں۔ مومن کا نیت خیر سے کھانا پینا' سونا جاگنا' چلنا پھرنا بھی نورانی کہ وہ ایمان اور اخلاص کے ساتھ ہے۔ جیسے کھوٹا پیسہ اس بازار میں نہیں چلتا اور بغیر شاہی مہر والا سکہ یہاں رد ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی کھوٹی عبادتیں اور مصطفےٰ ﷺ کے ذکر سے خالی مجاہدے بازار قیامت میں بے کار ہوں گے۔ جس کے بارے میں فرمایا گیا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا۔ اور بتایا گیا کہ لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ۔ ان چیزوں کی مردودیت کی وجہ یہ ہے کہ ان پر نہ سلطنت مصطفےٰ ﷺ کی مہر ہے اور نہ نورانیت۔ نیز کفار کے یہ مال دنیا میں ان کی محبوبیت کا سبب تھے۔ ان ہی نے کفار کو رب تعالیٰ سے روکا تو کیونکر ممکن ہے کہ یہ ہی مال قیامت میں ان کے لئے محبوبیت کا ذریعہ بن جائے۔ جن لوگوں نے مال کے ذریعہ یہاں محبوبیت حاصل کی وہ وہاں بھی محبوبیت حاصل کریں گے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے خوب فرمایا ؎

ترا شہوت و کبر و حرص و حسد چو خوں در رگ اند و چو جاں در جسد
گریں دشمنان تقویت یافتند سر از حکم رایت بر تافتند
ہوا و ہوس را نہ ماند ستیز چو بیند سر پنجۂ عقل تیز

جو شخص شریعت کے تابع ہو اور عقل سے کام لے وہ اپنے نفس اور ہوا پر سوار ہے' ورنہ نفس اس پر سوار۔ خیال رہے کہ نفس برے اخلاق کی کان ہے اور اس کا اثر تمام جسم میں ہے۔ یہ ہی روح کا ہر وقت مقابلہ کرتی ہے۔ اسکے مددگار شیطان اور برے ساتھی ہیں۔ یہ سب مل کر انسان کو بھلائیوں سے روکتے اور برائیوں کی رغبت دیتے ہیں۔ روح عالم ملکوت کی چیز ہے۔ اس کے مددگار فرشتے' علماء' اولیاء اللہ اور اچھے ساتھی ہیں۔ نفس مثل جہنم کے ہے۔ جیسے جہنم کے سات طبقے ہیں۔ ایسے ہی اس میں سات عیب ہیں۔ (۱) حرص (۲) حسد (۳) شہوت (۴) غصہ (۵) بخل (۶) کینہ (۷) تکبر۔ گویا یہ سات صفات جہنم کے سات

طبقوں کے سات دروازے ہیں۔ جیسے کہ جنت میں وہ پہنچے گا جو جہنم کے ان ساتوں طبقوں کو طے کر جائے۔ ایسے ہی جنت قرب تک وہ پہنچے گا جو نفس کے ان سات عیبوں سے گذر جائے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ (الشمس: ۹) کفار کی نیکیوں میں چونکہ ان سات عیوب کا دخل ہوتا ہے اس لئے وہ قابلِ قبول نہیں۔ مسلمان کی نیکیاں ان ساتوں عیبوں سے بفضلہٖ تعالیٰ صاف ہوتی ہیں۔ لہٰذا دربار یار تک پہنچ جاتی ہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ۔ (فاطر: ۱۰) ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ عبادت کی کنجی فکر ہے اور نیکی کی علامت مخالفت نفس (از روح البیان وابن عربی) حق تعالیٰ اس کو قال حال بنائے اور ہمارے اعمال کو ریاء فخر بڑائی اور نام ونمود کے خیال سے بچائے۔ اپنے مقبولوں کے طفیل ہمیں اعمال مقبول کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تفسیر نعیمی کی یہ تیسری جلد سولہ شوال ۱۳۶۴ ہجری یوم دوشنبہ کو شروع ہو کر ستائیس جمادی الآخرہ ۱۳۶۵ ہجری یوم پنجشنبہ کو ختم ہوئی۔ رب تعالیٰ بقیہ جلدیں پوری کرنے کی توفیق دے اور انہیں قبول فرما کر میرے گناہوں کا کفارہ اور توشہ آخرت اور میرے لئے صدقہ جاریہ بنائے اور جن حضرات نے اس میں کوئی بھی امداد دی انہیں جزاء خیر دے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَیْرِ خَلْقِهٖ وَزِیْنَتِ عَرْشِهٖ وَ عُرُوْسِ مُمْلِكَتِهٖ سَیِّدِنَا وَ شَفِیْعِنَا وَحَبِیْبِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِیْنَ اٰمِیْنَ بِرَحْمَتِهٖ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ۔

ناچیز

احمد یار خان نعیمی اشرفی اوجھانوی غفرلہ

والوالدیہ یا وعفی عنہ وعن والدیہ